فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرة: ٢٥٦)

تفسیر

عروۃ الوثقیٰ

سورۃ آل عمران اور النساء

جلد دوم

از افادات رہبانیت مشاہیر علماء اسلام

عبدالکریم اثری

مکتبۃ الأثریۃ جناح اسٹریٹ گجرات پاکستان

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (البقرۃ ۲۵۶)

پس جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا
اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں

تفسیر عُروۃُ الوُثقیٰ

سُورہ آلِ عمران اور النّساء

جلد دوم

از افادات وعبارات مشاہیر عُلماء اسلام

عبدالکریم اثری

مکتبۃ الأثریۃ
جناح اسٹریٹ گجرات: پاکستان

نام کتاب	.....	عروۃ الوثقیٰ
جلد	.....	دوم
تالیف	.....	عبدالکریم اثری
اشاعت اول	.....	جولائی ۱۹۹۵ء
کمپوزنگ	.....	خالد کمپیوٹرز (مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور)
مطبع	.....	احد پرنٹنگ پریس لاہور
طابع	.....	مکتبہ الاثریہ جناح اسٹریٹ گجرات
تعاون	.....	جامع مسجد اہلحدیث جناح اسٹریٹ گجرات
ہدیہ جلد دوم	.....	۴۰۰ روپے

ملنے کے پتے

1. مکتبہ الاثریہ جناح اسٹریٹ، گجرات
2. نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار، لاہور
3. ایچ - ایم - سعید کمپنی ادب منزل پاکستانی چوک، کراچی

سرٹیفکیٹ

ہم نے اس قرآن کریم کو حرفا" حرفا" بغور پڑھا ہے اور ہم تصدیق کرتے ہیں کہ اس کے متن میں کوئی کمی بیشی اور کتابت میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

محمد رمضان

۱- عبدالکریم ۲- محمد رمضان- 95 - 6 - 1

رجسٹرڈ پروف ریڈر حکومت پاکستان۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ کی بات

تفسیر عروۃ الوثقیٰ کی یہ دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پہلی جلد میں میں نے "اپنی بات" کے عنوان میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ ذہن میں موجود ہوگا اس وقت "آپ کی بات" کے عنوان میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یقیناً عروۃ الوثقیٰ کے قاری کی بات ہے اس لئے کہ جب تک دین اسلام کی حقیقی روح سے کوئی شخص ناواقف ہوگا اس کتاب کا مطالعہ اس کیلئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا رہی یہ بات کہ دین اسلام کی حقیقی روح کیا ہے؟ تو وہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس بات کا یقین کرنا کہ دین اسلام اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے جس کی بنیاد خالص علم ہے جو سراسر عقل کو اپیل کرتا ہے اور اس کا اصل مقصد انسان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا ہے تاکہ وہ کائنات میں اپنی اصل حیثیت سے واقف ہو۔ موجودات کے ساتھ اپنے تعلق کی حقیقی نوعیت کو سمجھے اور علم و فہم کی روشنی میں اپنی تمام ظاہری و باطنی قوتوں اور مادی و روحانی وسائل کو اس مقصد تک پہنچنے میں استعمال کرے جو درحقیقت انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے یعنی اس دنیا میں اس خدمت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر اس کے سپرد کی ہے اور آخرت میں اپنے مالک کی خوشنودی سے سرفراز ہونا جو ادائے فرض کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو نظریہ بھی اس "روح" کے خلاف ہوگا وہ اسلام کا نظریہ نہیں کہلا سکتا خواہ اس کا کہنے والا کوئی ہو۔ اس لئے کہ وہ رسولوں میں سے کسی ایک رسول کا بھی لایا ہوا نظریہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کسی دوسرے کا ایجاد کردہ ہوگا جو اسلام کے ذمہ لگا دیا گیا ہے خواہ ناواقفی سے خواہ شرارت سے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ "دین اسلام" انسان کی کسی قوت کو بیکار نہیں کرتا بلکہ ہر ایک قوت کو صرف کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ وہ انسان کی کسی خواہش کو پامال نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کیلئے ایک جائز اور معقول حد مقرر کر دیتا ہے۔ وہ تخیل کو بلند پروازی سے روکتا نہیں بلکہ اس کی پرواز کیلئے ایک بہتر فضا اور ایک صحیح رخ متعین کرتا ہے وہ انسان کی عملی قوتوں کو مادی وسائل و اسباب کے اکتشاف اور ان سے انتفاع کرنے سے باز نہیں رکھتا بلکہ اس اکتشاف و انتفاع کو صحیح مقاصد کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کام میں لگاتا ہے جس کی اہلیت لے کر وہ پیدا ہوا ہے خواہ اس کا میلان روحانیت کی طرف ہو یا مادیت کی طرف لیکن ان دونوں قسم کے انسانوں کو وہ ایسے علم و تعقل سے بہرہ ور کر دینا چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ افراط و تفریط کو چھوڑ کر

ایک صراط مستقیم پر چل سکیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو سمجھیں اور بجا لائیں ان کی ذات پر اللہ اور مخلوقات اور خود ان کے اپنے نفس کے جو حقوق ہیں ان کو جانیں اور ادا کریں روحانیات کی طرف جائیں تو ان میں اس قدر گم نہ ہو جائیں کہ تمامتر مکاشفات اور لذات روحانی ہی ان کی جدوجہد کا محور بن کر رہ جائیں اور مادیت کی طرف متوجہ ہوں تو ادھر بھی ان کا انہماک اس قدر نہ بڑھ جائے کہ وہ بالکل حسّی لذتوں اور جسمانی آسائشوں اور مادی کامیابیوں ہی کو اپنا کعبہ مقصود بنا لیں۔

یہ سراسر علمی و عقلی دین ہے' اس لئے اس کا صحیح اتباع بھی علم اور عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہر قدم پر تفقہ اور تدبر کی ضرورت ہے۔ جو شخص اس دین کی روح سے ناآشنا ہو' اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو' اس کے اصول کو نہ سمجھتا ہو' اس کی تعلیم میں غور و فکر نہ کرتا ہو' وہ اس راہ راست پر استقامت کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جس کی طرف یہ دین راہنمائی کر رہا ہے۔ اس کا عقیدہ بے قیمت ہے جب تک کہ وہ زبانی اقرار سے گزر کر فکر و شعور پر حاوی نہ ہو گیا ہو۔ اس کا عمل بے اثر ہے جب تک کہ وہ علم اور فہم کی روح سے معمور نہ ہو جائے۔ اس کا اتباع قانون بے معنی ہے جب تک کہ قانون کی سپرٹ اس کے جوارح سے گزر کر اس کے دل و دماغ پر چھا نہ گئی ہو۔ اگر محض تقلید کی راہ سے وہ بغیر سمجھے بوجھے اس دین کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا اتباع کر رہا ہو' تو اس کا ایمان اور اتباع بالکل ایک ریت کے تودے کی طرح ہو گا جسے ہوا کا ہر جھونکا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ جما سکتا ہے۔ ایسے جاہل کے ایمان اور اندھے کے اتباع میں کوئی پائیداری نہیں ہو سکتی۔ ہر گمراہ کرنے والا اس کو صحیح مرکز سے ہٹا سکتا ہے۔ ہر خوش نما راستہ اس کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔ ہر توہم' ہر مفروضہ' ہر نظریہ اس کے اعتقاد کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتا ہے۔ ہوائے نفس کی ہر لہر اور ضلالت عام کی ہر رو اس کو بہا کر کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔ اگر وہ قدامت پسند ہو گا تو اعتقاد اور عمل کی ہر اس گمراہی پر اصرار کرے گا جو آباؤ و اجداد سے اس کو میراث میں ملی ہو۔ اگر تجدد کا ذوق رکھتا ہو گا تو خواہشات نفس کو اپنا خدا بنا کر ہر اس نئے راستہ پر بھٹکتا پھرے گا جسے اس کے نفس کا شیطان اس کے سامنے مزین بنا کر پیش کر دے۔ اگر کمزور طبیعت کا ہو گا تو ہر اس راہرو کے پیچھے چل کھڑا ہو گا جو اسے زندگی کے راستے پر کسی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ قطع منازل کرتا نظر آئے۔ اگر خود اپنے اجتہاد سے کوئی راہ نکالنے کی اس میں صلاحیت ہو گی تو دین میں صحیح بصیرت نہ رکھنے اور الٰہی قانون کے اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زندگی کے سفر میں ہر دوراہے پر پہنچ کر وہ علم کے بجائے ظن و تخمین سے کام لے گا اور آخر کہیں نہ کہیں جا کر سیدھے راستے سے بھٹک ہی جائے گا۔ غرض اس الٰہی دین کا صحیح اتباع اور اس اتباع میں استقامت' جہل اور نافہمی کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کیلئے علم اور سمجھ بوجھ اور غور و فکر ناگزیر ہے اور انہی چیزوں کے کمال پر کمالی درجات مترتب ہوتے ہیں۔

انبیاء سابقین کے بعد محمد ﷺ کو ایسی کتاب اور ایسی ہدایت دے کر بھیجا گیا جس کو پچھلی کتابوں کی طرح مسخ اور محرف ہونے کا تو کوئی خطرہ نہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح صورت میں باقی رکھنے کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اگر انسان اس کو بدلنے اور مٹانے کی کوشش بھی کرے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب بھی اس کتاب اور اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے اور دین کے سیدھے راستے پر قائم رہنے اور اعتقاد و عمل کی گمراہیوں سے بچنے کا انحصار کلیتہً اسی چیز پر ہے جس پر ابتدا سے دین الٰہی کی بنا رکھی گئی ہے' یعنی علم اور عقل۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہر زمانے اور ہر حال میں بہترین رہنما ہے' مگر ان کیلئے جو علم اور عقل رکھتے ہوں' اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کو سمجھیں' اس میں غور و خوض کریں' اس سے اکتساب نور کریں اور زندگی کی ہر راہ میں اس نور کو لے کر چلیں۔ رہے وہ لوگ جو تفقہ و تدبر کی نعمت کھو چکے ہیں اور صرف اس لئے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا ان کو مسلمان چھوڑ گئے ہیں' تو درحقیقت ان کیلئے دین میں کوئی استقامت ہے ہی نہیں۔ وہ ہر وقت گمراہی کے خطرہ میں ہیں۔ گمراہی ان کے اندر سے پھوٹ سکتی ہے اور باہر سے بھی حملہ کر سکتی ہے ممکن ہے کہ ان کی اپنی جہالت اور نافہمی ان کو راہ راست سے بھٹکا دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے گرد و پیش میں جو ضلالتیں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے کسی کے پیچھے وہ بغیر جانے بوجھے لگ چلیں۔ کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے ہی نہیں جو ان کو دین کے سیدھے رستے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

قرآن مجید میں انسان کی گمراہی کا اصل سبب صرف ایک چیز کو قرار دیا گیا ہے اور وہ آیات الٰہی کو نہ سمجھنا ہے' چنانچہ وہ بار بار اس پر متنبہ کرتا ہے اور نہایت شدت کے ساتھ اس کی مذمت کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (الانفال ۸ ' ۲۲)

"اللہ کے نزدیک بدترین چلنے پھرنے والوں میں سے وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ :

"ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔" (الاعراف ۷ : ۱۷۹)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔"

(التوبہ ۹ : ۱۲۷)

اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی بلکہ اصلی مصیبت یہی ہے کہ ان میں تفقہ فی الدین اور تدبر فی الکتٰب والسنۃ نہیں ہے۔ اسی چیز کے فقدان نے ان کے اعتقادات کو کھوکھلا' ان کی عبادت کو بے روح' ان کی مساعی کو پراگندہ و پریشان اور ان کی زندگیوں کو بے ضابطہ و بدنظم کر دیا ہے۔ اسلام کے شیدائی ان میں بہت ہیں' مگر اسلام کو سمجھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ قرآن اور محمد ﷺ کے نام پر مرمٹنے والوں کی کمی نہیں' مگر قرآن اور محمد ﷺ نے جس دین کو پیش کیا ہے اس کی روح اور اس کے اصول کو سمجھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں بلکہ اتنے بھی نہیں۔ یہ اسی نافہمی کے نتائج ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں ان میں بدترین قسم کے توہمات اور مشرکانہ عقائد سے لے کر الحاد' دہریت اور کفر کی حد کو پہنچے ہوئے خیالات تک پائے جاتے ہیں اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ جس اسلام کی پیروی کے وہ مدعی ہیں اس میں اور ان خیالات میں کلی تباین ہے۔ اس سے بدتر حالت اخلاقی و عملی زندگی کی ہے۔ بت پرستانہ رسوم و رواجات سے لے کر جدید مغربی تہذیب کے بدترین ثمرات تک ہر قسم کے اطوار اس قوم میں رائج ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کا پیرو کہتی ہے۔

اور یہی جہالت ہم ایک نہایت قلیل جماعت کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں خواہ ان پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علماء یا خرقہ پوش مشائخ یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ سب یکساں ہیں۔ اس جہالت عامہ و خاصہ کو مٹانے کیلئے یہاں کوشش کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ وہ اس کوشش کو قبول و منظور فرماتے ہوئے کور چشموں کو بینا آنکھ عطا فرما دے اور اس حقیر خدمت کو حسن قبول عطا فرمائے۔ میری' میرے بچوں' میرے والدین اور اساتذہ اور ان تمام دوست و احباب کی جو اس تالیف میں مالی حیثیت سے معین و مددگار ہوئے مغفرت فرمائے ہم سب اور پوری امت مسلمہ پر رحمت کی بارش نازل فرمائے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس دعا پر آمین کہہ دیں۔

ٹھٹھہ عالیہ۔ گجرات
۱۰/ جولائی ۱۹۹۵ء

عبدالکریم اثری
صفر المظفر ۱۴۱۶ھ

مصادر و مراجع

۱۔ التفسیر المنسوب الی ابن عباسؓ
۲۔ تفسیر ابن ابی شیبہ ابوبکر عبداللہؒ
۳۔ جامع البیان الطبری ابو جعفر محمد بن جریرؒ
۴۔ تفسیر بحر العلوم ابو الیث السمرقندیؒ
۵۔ معالم التنزیل البغوی حسینؒ
۶۔ تفسیر القرآن العظیم ابن کثیرؒ (ک)
۷۔ الدر منثور فی التفسیر الماثور السیوطیؒ
۸۔ فتح القدیر شوکانی محمد بن علی رح
۹۔ تفسیر الکشاف جاء اللہ محمود زمخشریؒ
۱۰۔ مفاتیح الغیب فخر الدین ابو عبداللہ محمد الرازیؒ (ک)
۱۱۔ الجامع الاحکام القرآن ابو عبداللہ محمد القرطبیؒ
۱۲۔ غرائب القرآن نظام الدین حسنؒ
۱۳۔ البحر المحیط ابو عبداللہ محمدؒ
۱۴۔ تفسیر الجلالین المحلیؒ السیوطیؒ
۱۵۔ السراج المنیر شمس الدین محمد الشربینیؒ
۱۶۔ ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم ابو السعودؒ
۱۷۔ روح المعانی محمود آلوسیؒ
۱۸۔ فتح البیان، نواب صدیق حسن خانؒ
۱۹۔ مواہب الرحمٰن سید امیر علی صاحبؒ
۲۰۔ ترجمان القرآن نواب صدیق حسن خانؒ
۲۱۔ تفسیر ثنائی مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ (ک)
۲۲۔ تفسیر ستاری مولانا عبدالستار صاحب امیر غربا اہلحدیث
۲۳۔ البیان القرآن محمد علی لاہوری
۲۴۔ البیان القرآن شاہ اشرف علی تھانویؒ
۲۵۔ تفسیر القرآن سر سید احمد خانؒ (ک)
۲۶۔ تفسیر عثمانی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
۲۷۔ تفہیم القرآن ابو الاعلیٰ مودودیؒ (ک)
۲۸۔ ماجدی عبدالماجد دریا آبادیؒ (ک)
۲۹۔ معارف القرآن مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ (ک)
۳۰۔ تدبر القرآن امین احسن اصلاحی لاہور
۳۱۔ ضیاء القرآن جسٹس پیر محمد کرم شاہ بھیرہ
۳۲۔ تفسیر القرآن خواجہ عبدالحی لکھنوی رح
۳۳۔ بائبل پرانا عہد نامہ، نیا عہد نامہ (اناجیل)
۳۴۔ ترجمان القرآن ابو الکلام آزادؒ (ک)
۳۵۔ جواہر القرآن حسین علیؒ صاحب غلام اللہ خانؒ
۳۶۔ آیات المسائلین علامہ حافظ عنائت اللہ اثریؒ (ک)
۳۷۔ المعجم المفہرس بالفاظ القرآن الکریم
۳۸۔ ابوداؤد سلیمان بن داؤد الطیالسیؒ
۳۹۔ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی المروزیؒ
۴۰۔ البخاری محمد بن اسماعیل بن ابراہیمؒ
۴۱۔ الترمذی محمد بن عیسیٰ الضحاک السلمیؒ
۴۲۔ مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوریؒ
۴۳۔ البزار احمد بن عمرو بن عبدالخالق البصریؒ
۴۴۔ ابوبکر الشافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم رح
۴۵۔ البغوی عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز رح
۴۶۔ الشافعی الامام ابو عبداللہ محمد بن ادریس رح
۴۷۔ ابن ماجہ ابو عبداللہ محمد بن یزیدؒ
۴۸۔ النسائی ابو عبدالرحمان احمد بن علی بن شعیبؒ
۴۹۔ ابوداؤد سلیمان بن العشث بن اسحاق رح
۵۰۔ عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری رح
۵۱۔ ابن تیمیہ احمدؒ مجموع فتاوی طبع الریاض
۵۲۔ ابن خلدون عبدالرحمان المقدمہ مؤسسہ الاعلمی
۵۳۔ ابن الجوزی عبدالرحمان نواسخ القرآن بیروت
۵۴۔ ابن تیمیہ اصول تفسیر مکتبہ علمیہ لاہور

۵۵۔ ابن خلکان ابو العباس احمد وفیات الاعیان بیروت
۵۶۔ ابن الصلاح ابو عمرو عثمان حلب
۵۷۔ ابن عبدالبر' ابو عمر یوسف۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ
۵۸۔ ابن حجر' احمد بن علی العسقلانی' دار الکتب الحدیث
۵۹۔ ابن قتیبہ ابو محمد عبداللہ بن مسلم تفسیر غریب القرآن
۶۰۔ ابن کثیر۔ ابو الفدا اسماعیل بن عمر البدایہ والنہایہ
۶۱۔ ابو بکر احمد بن الحسین النیشاپوری الریاض طبع اول
۶۲۔ ابو حیان اثیر الدین ابو عبداللہ محمد بن یوسف البحر المحیط الریاض
۶۳۔ السیوطی جلال الدین عبدالرحمان الاتقان فی علوم القرآن القاہرہ
۶۴۔ الشاہ عبدالعزیز۔ بستان المحدثین۔
۶۵۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر و حجتہ اللہ البالغہ (ک)
۶۶۔ شمس الحق افغانی علوم القرآن امجد اکیڈمی لاہور
۶۷۔ محمد حنیف الندوی مطالعہ قرآن ادارہ ثقافت اسلامیہ
۶۸۔ محمد مالک التحریر فی اصول التفسیر قرآن محل کراچی
۶۹۔ معین الدین ندوی تاریخ اسلام مطبع اعظم گڑھ
۷۰۔ موریس بکائے۔ بائبل' قرآن اور سائنس مترجم دار العلوم کراچی
۷۱۔ سید سلیمان ندوی' ارض القرآن دار الاشاعت کراچی
۷۲۔ شبلی نعمانی' الکلام۔ علم الکلام۔ نفیس اکیڈمی کراچی
۷۳۔ ابو الاعلیٰ مودودی' تفہیمات
۷۴۔ حیات جاوید الطاف حسین حالی
۷۵۔ حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمتہ اللہ اثبات توحید
۷۶۔ شاہ اشرف علی تھانوی۔ التکشف۔ یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور
۷۷۔ حافظ علامہ عنایت اللہ اثری۔ البیان المختار دار الحدیث گجرات
۷۸۔ مرزا حیرت دہلوی' مقدمہ تفسیر۔
۷۹۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ قصص القرآن
۸۰۔ عبدالوہاب نجدی' ہدایۃ المستفید' عطاء اللہ ثاقب
۸۱۔ سر سید احمد خان۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ انڈیا
۸۲۔ مولانا حالی مسدس۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۸۳۔ خطبات احمدیہ۔ اللہ والوں کی قومی دکان کشمیری بازار لاہور
۸۴۔ محمد بن علی الشوکانی در السحابہ مکتبہ سید احمد شہید
۸۵۔ الدکتور عبدالروف ظفر تفسیر القرآن کا مفہوم مجلس التحقیق الاثری جہلم
۸۶۔ الدکتور محمد اقبال' مجموعہ اشعار' غلام علی اینڈ سنز لاہور
۸۷۔ حافظ شیرازی۔ دیوان حافظ۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۸۸۔ مولانا محمد حسین بٹالوی۔ اشاعت السنہ
۸۹۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ البریلویہ
۹۰۔ تسہیل القرآن غلام احمد پالوا صاحب کراچی

(ک) کثیر فائدہ حاصل کیا گیا

فہرست عنوانات تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد دوم مع حوالہ جات

نمبر	سورہ آل عمران - ۳	صفحہ	آیت
۱	الٓمٓ حروف مقطعات میں سے ہے	۴۱	۱
۲	اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں	۴۲	۲
۳	اللہ وہ ذات ہے جس کو فنا و زوال نہیں	〃	〃
۴	"الکتاب" کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے	۴۳	〃
۵	قرآن کریم تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے	۴۴	۳
۶	قرآن کریم کی تصدیق کا مطلب کیا ہے؟	〃	〃
۷	تورات وہی کتاب ہے جو سیدنا موسیٰؑ پر نازل ہوئی	۴۵	۴
۸	انجیل وہی کتاب ہے جو سیدنا عیسیٰؑ پر نازل ہوئی	۴۶	〃
۹	قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جو "الفرقان" کہلانے کی مصداق ہے	۴۸	〃
۱۰	اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والے کون ہیں؟	۴۹	〃
۱۱	اللہ تعالیٰ مجرموں کو سزا دینے پر قادر ہے	〃	〃
۱۲	علم الٰہی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے	۵۰	۵
۱۳	یہاں آسمانوں اور زمین کا مخصوص ذکر کیوں؟	۵۱	〃
۱۴	اللہ ہی وہ مصور ہے جس نے سب کی تصویریں بنائیں	۵۳	۶
۱۵	مصور حقیقی اللہ ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں	۵۴	۶
۱۶	محکمات و متشابہات کی حقیقت کیا ہے؟	۵۶	۷
۱۷	کتاب اللہ کی اصل و بنیاد کا مطلب کیا؟	۶۰	〃
۱۸	متشابہات کیا ہیں اور کیوں؟	۶۱	〃
۱۹	فتنہ سے کیا مراد ہے اور فتنہ کیوں چاہتے ہیں؟	۶۲	〃
۲۰	اصلیت اور حقیقت صرف ان چیزوں کی معلوم ہو سکتی ہے جو مشاہدہ میں آئیں	۶۳	۷
۲۱	علم میں پکے لوگ کون ہیں؟	۶۴	۷
۲۲	عقل مند ہی ہمیشہ نصیحت قبول کرتے ہیں	۶۵	〃

۲۳	صاحب عقل لوگوں کی صدائے حال اس طرح ہوتی ہے	۶۷	۸
۲۴	"الوھاب" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے یعنی "عطا کرنے والا" ہے	۶۸	"
۲۵	سب لوگوں کا جمع ہونا موعود ہے اور اللہ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا	۶۹	۹
۲۶	کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا	"	"
۲۷	ایک غلط فہمی کا ازلہ	۷۰	۱۰
۲۸	موسیٰؑ کے مقابلہ میں قوم فرعون تھی اور آپ ﷺ کے مقابلہ میں اہل کتاب	۷۱	۱۱
۲۹	گناہ سے یہاں وہی گناہ مراد ہیں جو ان سے سرزد ہوئے بلکہ انہوں نے جان بوجھ کر کئے	۷۲	۱۱
۳۰	مخالفین کو للکارا جا رہا ہے کہ اپنا پورا زور لگا لو	۷۳	۱۲
۳۱	دنیا کی رسوائی کے ساتھ آخرت کے انجام سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے	"	"
۳۲	میدان بدر میں دونوں پارٹیوں کا آمنا سامنا	۷۴	۱۳
۳۳	ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کفر کی راہ میں	۷۶	"
۳۴	میدان بدر کا نقشہ قرآن کریم کی نظر میں	۷۷	"
۳۵	اہل کتاب کے ان لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جو صاحب دانش ہیں	۷۸	"
۳۶	انسان کا دل لبھانے والی چیزیں کیا ہیں؟	۷۹	۱۴
۳۷	دنیا کی ہر چیز دنیوی فائدہ ہی کیلئے ہے جبکہ دنیا ہی کی خاطر ہو	۸۱	"
۳۸	حسن انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے	۸۳	۱۵
۳۹	آخرت کی زندگی عارضی نہیں اور نہ ہی اس کی نعمتیں عارضی ہیں	"	"
۴۰	نیک و بد ہر ایک کے حال سے اللہ واقف ہے	۸۵	۱۶
۴۱	جن لوگوں کی پکار ایک اور صرف ایک ہی ہے	"	"
۴۲	نیک لوگ ہی دراصل صبر کرنے والے ہیں	۸۶	۱۷
۴۳	یہی لوگ ہیں جو دل کے سچے ہیں	۸۸	۱۷
۴۴	یہی لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں	۸۹	"
۴۵	یہی لوگ ہیں جن کو صبح خیزی کی عادت ہے	۹۰	"
۴۶	الٰہ صرف اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے	۹۱	"
۴۷	اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر کوئی عادل نہیں	۹۴	۱۸
۴۸	فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود حقیقی ہے	۹۶	۱۸

۴۹	صاحب علم لوگوں کی بھی شہادت یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں	۹۷	"
۵۰	معبود وہی ہے جو حقیقت میں طاقت و غلبہ والا اور حکمت والا ہے	۹۸	۱۸
۵۱	"دین" کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کر دی	۹۹	۱۹
۵۲	اللہ تعالیٰ کا ٹھہرایا ہوا دین "اسلام" ہی ہے	۱۰۱	"
۵۳	اہل کتاب "اہل کتاب" کہلانے کے باوجود کتاب کے اہل نہ تھے	۱۰۵	"
۵۴	دعوت انبیاء ایک تھی اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا	۱۰۶	"
۵۵	منکرین حق کو یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ "سریع الحساب" بھی ہے	۱۰۸	"
۵۶	جھگڑنے والوں سے مراد اہل کتاب اور خصوصاً نصاریٰ ہیں	۱۰۹	۲۰
۵۷	اے اہل کتاب اور مکہ کے لوگو کیا تم بھی اپنی پوزیشن بتا سکتے ہو	۱۱۰	"
۵۸	اگر انہوں نے مان لیا اور ہاں کہہ دی تو راہ پالی	۱۱۱	"
۵۹	اللہ ان کی حالت سے خوب اچھی طرح واقف ہے	۱۱۱	"
۶۰	اللہ سے مقابلہ کرنے والوں کو جان لینا چاہئے کہ مقابلہ کس سے ہے	۱۱۲	۲۱
۶۱	آپ ﷺ ان کے کان تک عذاب الٰہی کی خبر پہنچا دیں! بس	۱۱۳	"
۶۲	عوام کے بگاڑ کا اصل سبب علمائے قوم ہوتے ہیں	۱۱۴	۲۲
۶۳	ان کو جب کتاب اللہ کی خبر دی جاتی ہے تو منہ پھیر جاتے ہیں	۱۱۵	۲۳
۶۴	انہوں نے کہا دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہو چکی ہے	۱۱۶	۲۴
۶۵	نجات کا دارومدار کسی کی وہم پرستی پر نہیں بلکہ اس کیلئے مستقل قانون ہے	۱۱۷	۲۵
۶۶	اب طریقہ دعا سکھایا جاتا ہے جس میں ان کے وہم کا علاج بھی ہے	۱۱۸	۲۶
۶۷	عزت کے خواہش مند اچھی طرح جان لیں کہ عزت بھی اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے	۱۱۹	"
۶۸	ہر طرح کی بھلائی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے	۱۲۰	۲۷
۶۹	تصرفات الٰہی کی ایک مثال پیش کی جا رہی ہے	"	"
۷۰	"بے حساب" رزق دینے کا مطلب کیا ہے؟ اور روزی رساں کون ہے؟	۱۲۲	"
۷۱	ایمان والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ منکرین حق کو رفیق و مددگار نہ بنائیں	۱۲۴	۲۸
۷۲	اللہ اور اس کی ممانعت کو قبول نہ کرنے والوں کا حال	۱۲۶	"
۷۳	ہاں! غیر مسلموں کے شر سے بچنے کیلئے ظاہری میل جول دوسری بات ہے	"	"
۷۴	انجام کار انسان کو اپنے کئے کا جواب دہ ہونا ہے وہ بھی علیم و خبیر کے سامنے	۱۲۷	"

۷۵	اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس کیلئے چھپا اور ظاہر برابر ہے	۱۲۸ ۲۹
۷۶	عمل نیک ہو یا بد اس کا نتیجہ عمل کرنے والے کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا	۱۲۹ ۳۰
۷۷	وہ وقت آنے والا ہے کہ عامل عمل اور اس کے نتیجہ میں دوری کا طالب ہو گا لیکن یہ ممکن نہیں	۱۳۱ ۳۰
۷۸	اللہ کا اپنے قانون مواخذہ سے ڈرانا محض اپنے بندوں کے پیار سے ہے	۱۳۲ ۳۱
۷۹	اللہ کی محبت سچے لوگوں کی پہچان قرآن کریم کی زبان میں	〃 〃
۸۰	کھرے اور کھوٹے کا معیار محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی ہے	۱۳۳ 〃
۸۱	رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے اللہ کی محبت حاصل ہوگی	۱۳۴ 〃
۸۲	اللہ کی بخشش اور اللہ کا پیار کرنا یہی ہے کہ وہ بندہ کے گناہ معاف فرما دے	〃 〃
۸۳	نبی اعظم و آخر ﷺ کی اہمیت	۱۳۵ ۳۲
۸۴	اطاعت رسول اللہ ﷺ کی مزید وضاحت	۱۳۷ ۳۲
۸۵	اللہ نے جن لوگوں کو برگزیدگی عطا فرمائی تھی ان کا ذکر	۱۳۸ ۳۳
۸۶	یہ سب انبیاء کرام ایک نسل اور اصل سے تعلق رکھتے تھے	۱۴۰ ۳۴
۸۷	عمران کی بیوی یعنی سیدہ حنہ کی دعا بارگاہ قاضی الحاجات	۱۴۱ ۳۵
۸۸	عمران کی بی بی نے نذر ماننے والوں کیلئے ایک مثال قائم کردی	۱۴۲ 〃
۸۹	سیدہ حنہ کے ہاں لڑکے کی بجائے لڑکی کی پیدائش ہوئی	۱۴۴ ۳۶
۹۰	علم الٰہی میں تیرا وہ لڑکا جس کے متعلق تجھے خیال تھا اس لڑکی سے اچھا نہیں تھا	〃 〃
۹۱	والدہ مریم کا اپنی نومولودہ کا نام "مریم" رکھنا	۱۴۵ 〃
۹۲	مریم کو اللہ نے اس کی والدہ ماجدہ کی دعا کے مطابق قبول فرما لیا	۱۴۶ ۳۷
۹۳	وہ بہتر نشوونما کیا تھی جو سیدہ مریم کے حصہ میں آئی؟	۱۴۷ 〃
۹۴	زکریاؑ نے مریمؑ کیلئے ایک الگ تھلگ حجرہ تعمیر کرا دیا	۱۴۸ 〃
۹۵	اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا فرما دیتا ہے	۱۴۹ 〃
۹۶	زکریاؑ کے دل سے ایک آہ اٹھی اور سیدھی قبول کرنے والے کے ہاں پہنچ گئی	۱۵۰ ۳۸
۹۷	قبولیت کا وقت ہو تو دیر کب ہوتی ہے؟ ہاں! اس وقت کو بھی تو کوئی نہیں جانتا	۱۵۱ 〃
۹۸	یحییٰؑ کی بشارت زکریا علیہ السلام کو سنائی گئی	۱۵۲ ۳۹
۹۹	کیا عقل مند کیلئے اشارہ کافی ہوتا ہے یا نہیں؟	۱۵۳ 〃

	یحییٰؑ کے کمالات کا ذکر قرآن کریم میں	۱۵۵	"
۱۰۰	زکریا علیہ السلام لڑکے کی بشارت سن کر متعجب کیوں ہوئے؟	۱۵۷	۴۰
۱۰۱	ہر ہونے والے کام کیلئے قانون الٰہی میں ایک وقت طے ہے	۱۵۹	"
۱۰۲	اس خاص موقع پر خاص طرح کا شکریہ ادا کرنے کا شوق	۱۶۰	۴۱
۱۰۳	سیدہ مریمؓ کو اللہ کی طرف سے برگزیدگی و قبولیت کی بشارت	۱۶۲	۴۲
	کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟	"	"
	کیا سیدہ مریم رضی اللہ عنہا نبی تھیں؟	۱۶۳	"
	واصطفک علی نساء العلمین کا مطلب کیا ہے؟	"	"
۱۰۴	سیدہ مریمؓ کو مزید سرگرم عمل رہنے کی ہدایت	۱۶۴	۴۳
۱۰۵	یہ ساری خبریں ایسی ہیں جو آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہیں	۱۶۶	"
۱۰۶	سیدہ مریم کی کفالت کا فیصلہ اول یا ثانی	۱۶۷	۴۴
۱۰۷	سیدہ مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے لڑکے کی بشارت دی	۱۶۹	۴۵
۱۰۸	مسیحؑ کے متعلق بشارت تھی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی ہوں گے	۱۷۱	"
۱۰۹	بشارت عیسیٰؑ ہی میں ان کی عمر بھی رجسٹر کر دی گئی	۱۷۳	۴۶
۱۱۰	اللہ کے نیک بندوں میں سے ایک بندہ ہونے کی بشارت	۱۷۵	"
۱۱۱	سیدہ مریم نے اس موعود لڑکے کی بشارت پر تعجب کیا! آخر کیوں؟	۱۷۷	۴۷
	عیسائیوں کا مسیحؑ کو بن باپ ماننا کس طرح ہے؟	۱۷۹	"
	پھر غور کرو کہ سیدہ مریمؓ نے بیٹے کی بشارت سن کر کیا کہا؟	۱۸۱	"
	مشاہیر علمائے کرام کی تفسیر مع حوالہ جات	۱۸۲	"
	مسیحؑ کی شخصیت پر ایک نظر	۱۸۶	"
	نبی اعظم و آخر ﷺ کا ارشاد گرامی اور شخصیت مسیحؑ	۱۸۹	"
۱۱۲	اللہ کا حکم کرنا کہ "اے چیز موجود ہو جا" کا مطلب کیا ہے؟	۱۹۴	"
۱۱۳	انبیاء کرام کی تعلیم براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے	۱۹۵	۴۸
۱۱۴	سیدہ مریمؓ کے مبشر بیٹے کے دوسرے اوصاف کا ذکر	۱۹۵	"
۱۱۵	آیات بینات کیا ہیں؟ عیسیٰؑ کیا نشانی لائے تھے	۱۹۷	۴۹
۱۱۶	عیسیٰؑ جن اندھوں کو بینا اور جن مردوں کو زندہ کرتے رہے	۲۱۲	"

۱۱۷	عیسیٰؑ کا یہ خبر دینا کہ تم نے کیا کچھ کھایا اور کیا ذخیرہ کیا	″	″
۱۱۸	عیسیٰؑ نے یہود کی حلت و حرمت میں دخل اندازی کی نشاندہی فرما دی	۲۱۳	۵۰
۱۱۹	متقی وہی ہے جو رسول کی اطاعت کرے	۲۱۴	″
۱۲۰	عیسیٰؑ کا اعلان کہ ربوبیت صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے	۲۱۵	″
۱۲۱	مسیحؑ کی گزشتہ تمثیل کی وضاحت	۲۱۷	۵۲
۱۲۲	عیسیٰؑ کے حواریوں کی شہادت سے کیا سبق حاصل ہوا؟	۲۱۹	″
۱۲۳	عیسیٰؑ کے حواریوں کی مناجات کیا ہی مناجات ہے	۲۲۰	۵۳
۱۲۴	عیسیٰؑ کے خلاف بنی اسرائیل کی خفیہ سازشیں اور ہواریوں کا قبول حق	۲۲۱	۵۴
۱۲۵	بنی اسرائیل کی ان خفیہ سازشوں کا ناکام ہو جانا	۲۲۳	″
۱۲۶	سیدنا مسیحؑ کی پوری زندگی کا خاکہ بدل کر رکھ دیا گیا	۲۲۵	۵۵
۱۲۷	تیرے منکر یعنی یہود تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے	۲۲۶	″
۱۲۸	اور عیسیٰؑ کے متبعین یقیناً کامیاب و کامران ہوں گے	۲۲۷	″
	عیسیٰؑ کی زندگی میں ان سے کئے گئے وعدوں کا بیان	۲۲۸	″
	مرزا جی کا ایک پھندا اور علمائے اسلام کی سادگی	۲۳۰	″
۱۲۹	کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کا انجام	۲۳۱	۵۶
۱۳۰	ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا	۲۳۱	″
۱۳۱	عیسیٰؑ کا تذکرہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے	۲۳۲	۵۸
۱۳۲	عیسیٰؑ کی الوہیت کے عقیدہ باطلہ کا مکمل رد	۲۳۳	۵۹
۱۳۳	دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا اور آئندہ ہوگا سب کلمہ "کن" ہی سے ہے	۲۳۷	۶۰
۱۳۴	رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے پوری امت کو سبق دیا جا رہا ہے	″	″
۱۳۵	علم و یقین کی باتوں کو جھٹلا دیا جائے تو جھگڑے کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے؟	۲۳۸	۶۱
۱۳۶	حکم ہوتا ہے کہ جھگڑا کرنے کی بجائے ان عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دو	″	″
۱۳۷	اوپر بیان کیا گیا واقعہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالکل پاک ہے	۲۴۰	۶۳
۱۳۸	حق سے منہ پھیرنے والے مفسدین علم الٰہی میں موجود ہیں آپ فکر نہ کریں	″	″
۱۳۹	اختلافی باتوں کو چھوڑ کر فریقین کے درمیان مسلم باتوں کی دعوت جاری رکھنے کا حکم	۲۴۱	۶۴
۱۴۰	حق سے روگردانی کرنے والوں سے آخری بات کیا ہوگی؟	۲۴۲	″

۱۴۱	اہل کتاب سے خطاب کہ ابراہیمؑ کے متعلق تمہارا جھگڑا کیوں اور کیسے؟	۲۴۳	۶۵
۱۴۲	اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ ہر بات میں ٹانگ اڑانا تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟	۲۴۴	۶۶
۱۴۳	ابراہیمؑ کیا تھا؟ وہ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ تھا جو شرک سے بہت بیزار تھا	۲۴۵	۶۷
۱۴۴	ابراہیمؑ کے قریب ترین تو وہی تھے جو حقیقت میں آپ کے متبع تھے	〃	〃
۱۴۵	محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے سچے متبعین کا طریقہ بھی وہی ہے جو ابراہیمؑ کا تھا	۲۴۶	۶۸
۱۴۶	اہل کتاب خود تو گمراہ ہیں ہی لیکن ان کی کوشش ہے کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ	۲۴۷	۶۹
۱۴۷	اہل کتاب سے خطاب کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو؟	۲۴۹	۷۱
۱۴۸	اہل کتاب سے خطاب کہ تم حق و باطل کو کیوں ملاتے ہو اور خصوصاً حق کو کیوں چھپاتے ہو	۲۴۹	۷۱
۱۴۹	اہل کتاب کی سادہ لوح مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی ایک سکیم کا بیان	۲۵۰	۷۲
۱۵۰	اہل کتاب کی مذکورہ اسکیم کا بقیہ حصہ	۲۵۲	۷۳
۱۵۱	اصل ہدایت تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے	۲۵۳	〃
۱۵۲	اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ فضل و بخشش تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے	۲۵۴	۷۴
۱۵۳	اللہ جس کو چاہتا ہے حسب مصلحت تکوینی اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے	〃	〃
۱۵۴	اسلام ہی دین فطرت ہے وہ اہل کتاب کی خوبی کو خوبی تسلیم کرتا ہے	۲۵۵	۷۵
۱۵۵	جو بددیانت ہیں انہوں نے اپنی بددیانتی چھپانے کیلئے حیلہ بنا رکھا ہے	۲۵۶	〃
۱۵۶	ہر بددیانتی کرنے والا جانتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں؟	۲۵۷	۷۶
۱۵۷	عہد کو پورا کرنے والے اور دیانتدار ہی متقی لوگ ہیں	〃	〃
۱۵۸	اللہ کے عہد توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کا حال	۲۵۸	۷۷
۱۵۹	خیانت کرنے والوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا	۲۶۰	〃
۱۶۰	دردناک عذاب میں کون کون لوگ ہو سکتے ہیں اور آج مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟	۲۶۱	〃
۱۶۱	اہل کتاب کی یہ گمراہی کہ وہ کتاب اللہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے رہتے ہیں	۲۶۳	۷۸
۱۶۲	عصمت انبیاء علیہم السلام کی ایک دلیل اور علمائے اسلام کو تنبیہ	۲۶۴	۷۹
۱۶۳	کسی فرشتہ یا نبی کو بھی رب بنا لینا کفر ہے اور کوئی اللہ کا بندہ کفر کی تعلیم نہیں دے سکتا	۲۶۵	۸۰
۱۶۴	اس میثاق سے کیا مراد ہے اور یہ کہاں ہوا؟	۲۶۶	۸۱
	سارے عالم انسانیت کی طرف مبعوث ہونے والے رسول بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں	۲۶۸	〃
۱۶۵	آخری رسول ﷺ کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل ہے	۲۶۹	〃

۱۶۶	انبیاء کرام سے لئے گئے عہد کے تاکیدی الفاظ	"	"
۱۶۷	شہادت الٰہی نے انبیاء کرام کے عہد کو مزید موکد کر دیا	۲۷۰	۸۲
۱۶۸	جو شخص بھی اس سے اعراض کرے گا وہ نافرمانی کا مرتکب ہوگا	"	"
۱۶۹	دین الٰہی یعنی اسلام میانہ روی سکھاتا ہے	۲۷۱	۸۳
۱۷۰	اب اعلان کرایا جا رہا ہے کہ سب نبیوں کی نبوت کا اقرار ایمان کی شرط ہے	۲۷۳	۸۴
۱۷۱	دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین قبول کرنے والوں کا حال	۲۷۵	۸۵
۱۷۲	ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کیلئے کامیابی کی راہ نہیں کھولی جاتی	۲۷۶	۸۶
۱۷۳	لعنت الٰہی برسنے کا صحیح مفہوم اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا مطلب	۲۷۷	۸۷
۱۷۴	ان کا عذاب ان سے کبھی ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی	۲۷۸	۸۸
۱۷۵	ہاں! توبہ کرنے والوں کیلئے رحمت الٰہی پھر تیار نظر آتی ہے	۲۷۹	۸۹
۱۷۶	وہ لوگ کون ہیں جن کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی اور وہ توبہ کیسی توبہ ہے؟	۲۸۰	۹۰
۱۷۷	کفر پر قائم رہنے والے جب دارالعمل سے نکل گئے تو اب ان کے ایمان کی کوئی صورت باقی نہ رہی	۲۸۲	۹۱
۱۷۸	جن کیلئے دردناک عذاب ہے اور جن کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا	۲۸۴	"
۱۷۹	اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے وقت کس بات کا خیال رکھنا ضروریات دین میں سے ہے؟	۲۸۵	۹۲
۱۸۰	علم الٰہی میں کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں کہ اس کو انسان کی نیت کا بھی علم ہے	۲۸۷	۹۲
۱۸۱	وہ طعام جو مسلمان کھاتے ہیں وہ سب کے سب بنی اسرائیل کیلئے بھی حلال تھے	۲۸۸	۹۳
۱۸۲	کسی چیز کو بیماری یا مرغوب نہ ہونے کے باعث ترک کر دینا فی الواقع حرام نہیں ہوتا	"	"
۱۸۳	الہامی کتاب توراۃ ہے اس میں کہاں تحریر ہے کہ اونٹ حرام ہے؟	۲۸۹	"
۱۸۴	میں نہ مانوں کہنے والوں کیلئے کوئی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوتی	۲۹۰	۹۵
۱۸۵	اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے طریقہ کی وضاحت فرما دی اب تو یہ طریقہ اختیار کر لو	"	"
۱۸۶	پہلا گھر جو عبادت کیلئے بنایا گیا وہ مکہ ہی میں ہے	۲۹۱	۹۶
	بیت اللہ کی فضیلت کا مختصر بیان اور بیت العتیق ہونے کا شرف	۲۹۲	"
	مکہ مکرمہ کے ناموں اور بیت اللہ کے ناموں کا ذکر	۲۹۳	"
۱۸۷	بیت اللہ کی مختلف نشانیاں اور خصوصاً مقام ابراہیمؑ	۲۹۴	۹۷
۱۸۸	بیت اللہ کی دوسری اور تیسری خصوصیات	۲۹۵	"

۱۸۹	منکرین کو خیال رہے کہ اللہ کی ذات ایک بے نیاز ذات ہے	۲۹۷	۹۸
۱۹۰	اہل کتاب کو تنبیہہ کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والا باز آجائے	″	″
۱۹۱	اہل کتاب کی یہ کوتاہی کہ وہ صرف خود ہی انکار نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں	۲۹۸	۹۹
۱۹۲	اہل کتاب تم جانتے ہو کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے	″	″
۱۹۳	مسلمانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ تم اہل کتاب کی باتوں میں کیوں آتے ہو؟	۲۹۹	۱۰۰
۱۹۴	تم کفر کی راہ کیسے اختیار کرتے ہو جبکہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جارہی ہیں	۳۰۱	۱۰۱
۱۹۵	پھر یہ بھی کہ ان آیتوں کو پڑھنے اور سمجھانے والا اللہ کا رسول ہے	″	″
۱۹۶	یاد رکھو کہ جو اللہ کا ہو گیا اس پر سیدھی راہ کھل گئی	۳۰۲	۱۰۱
۱۹۷	مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا پہلا اصول	۳۰۳	۱۰۲
۱۹۸	مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا دوسرا اصول	۳۰۵	۱۰۳
۱۹۹	اس نعمت الٰہی کا ذکر جس سے سب بھائی بھائی بن گئے	۳۰۹	۱۰۳
۲۰۰	اسلام نے گروہ در گروہ تقسیم ہونے کو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہونے سے تشبیہ دی ہے	۳۱۷	″
۲۰۱	اس ہدایت پر قائم رہنے کیلئے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟	۳۱۹	۱۰۴
۲۰۲	دعوت الی الاسلام دینے والوں کا فرض اولین کیا ہے؟	۳۲۰	″
۲۰۳	اسلام کے اندر الگ الگ گروہ بندیاں اختیار کرنے کی واضح الفاظ میں ممانعت	۳۲۲	۱۰۵
۲۰۴	گروہ بندی اختیار کرنے والوں کو عذاب عظیم کی اطلاع سنائی جاتی ہے	۳۲۴	″
	گروہ بندی اختیار کرکے شرک مت کرو	″	″
	تم سب ایک امت ہو مختلف گروہ بندیاں مت بناؤ	۳۲۵	″
	ایک دوسرے سے کٹ کر الگ الگ مت ہو جاؤ	″	″
	اختلاف کرنے والوں کو قیامت کے روز معلوم ہو گا کہ انہوں نے کیا کیا؟	″	″
	علم آنے کے بعد آپس میں اختلاف کرنے والوں کا انجام	″	″
	اے پیغمبر اسلام! دین میں تفرقہ ڈالنے والوں سے آپ ﷺ کو کچھ سروکار نہیں	۳۲۶	۱۰۶
۲۰۵	وہ دن کیسا ہو گا جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ نظر آئیں گے؟	″	″
۲۰۶	جن لوگوں کے چہرے بداعمالیوں کی وجہ سے سیاہ ہوں گے ان کی سزا کا اعلان الٰہی	۳۲۸	″
۲۰۷	جن کے چہرے گورے ہوں گے ان کا مختصر حال	۳۲۹	۱۰۷

۲۰۸	اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے وہ کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا	۳۳۰	۱۰۸
۲۰۹	ہر شے کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے	۳۳۱	۱۱۰
۲۱۰	تم صحیح معنوں میں ایمان لانے والے اور اچھے عمل کرنے والے ہو تم ہی بہتر امت ہو	〃	〃
۲۱۱	مذکورہ فضیلت کس بات اور کس صلہ میں ہے؟	۳۳۳	〃
	کیا اس دعویٰ پر کوئی دلیل بھی ہے!	۳۳۴	〃
۲۱۲	دوسروں کی فکر کا نچوڑ الفاظ کی صورت میں	〃	〃
۲۱۳	ہاں ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں لیکن زیادہ تعداد شریروں کی ہی ہے	۳۳۵	〃
۲۱۴	ان کی مخالفت سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا ہاں معمولی تکلیف فطری چیز ہے	۳۳۶	۱۱۱
	ایک پیش گوئی کا اعلان		
۲۱۵	یہود کے متعلق دوہری پیش گوئی کا اعلان خداوندی	۳۳۸	〃
۲۱۶	اس سلسلہ کی تیسری پیش گوئی جس کا اعلان اس آیت میں موجود ہے	۳۳۹	〃
۲۱۷	یہود مغضوب الٰہی ہو چکے ہیں ان پر ذلت کی مار ہی پڑے گی	۳۴۰	۱۱۲
۲۱۸	یہود کو دنیا میں زندگی کے دن گزارنے کیلئے کوئی نہ کوئی سہارا پکڑنا ضروری ہو گیا	۳۴۱	۱۱۲
	مدینۃ النبی اور اس کے مضافات میں بسنے والے یہود کا پس منظر	۳۴۳	۱۱۲
۲۱۹	اہل کتاب یعنی یہود ہی کے اندر اللہ کے نیک بندے بھی تھے جو رحمت الٰہی کے مستحق ٹھہرے	۳۵۱	۱۱۳
۲۲۰	ان اہل کتاب کے نیک لوگوں کے مزید اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں	۳۵۲	۱۱۴
۲۲۱	ان لوگوں نے جو نیک اعمال کئے ہیں ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی	۳۵۳	۱۱۵
۲۲۲	کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کے کام نہ دولت آئے گی اور نہ اولاد	۳۵۶	۱۱۶
۲۲۳	دنیوی زندگی کی ہو ہوا کیلئے خرچ کئے گئے مال کی قرآنی مثال	۳۵۸	۱۱۷
۲۲۴	مسلمانوں کو ہدایت کہ اپنے لوگوں کے سوا غیروں کو ہم راز مت بناؤ	۳۵۹	۱۱۸
۲۲۵	مخالفین کی دشمنی باتوں سے ظاہر ہے اور دلوں کی نہ بجھنے والی آگ سے بھی	۳۶۱	〃
۲۲۶	قرآن کریم اس سے زیادہ فصاحت اور کیا کرے؟	۳۶۲	۱۱۸
۲۲۷	تعجب ہے کہ وہ تم سے جتنی دشمنی رکھتے ہیں تم اتنا ہی ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو	۳۶۳	۱۱۸
۲۲۸	جو اپنی جان کا خود دشمن ہے اسے تم کیا کہو گے؟	۳۶۴	۱۲۰
۲۲۹	تمہاری خوشی سے وہ ناخوش اور تمہاری ناخوشی سے وہ خوش ہو تو تمہیں کیا کرنا چاہئے؟	۳۶۴	〃
۲۳۰	ان کی مکاری سے آپ ﷺ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا وہ قانون الٰہی کے شکنجے میں ہیں	۳۶۵	〃

۲۳۱	غزوہ احد کا تذکرہ، پس منظر اور تحریک اسلامی پر اس کے اثرات	۳۶۶	۱۲۱
۲۳۲	ہاں! تم میں سے دو جماعتوں نے ہمت ہارنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ نے ان کی ہمت بندھا دی	۳۶۶	۱۲۲
۲۳۳	اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کامل ایمان کی ایک نشانی ہے	۳۷۰	"
۲۳۴	ذرا میدان بدر کا نقشہ اپنے ذہن میں لاؤ کہ تمہاری کیا حالت تھی اور اللہ نے کیا کر دکھایا؟	۳۷۱	۱۲۳
۲۳۵	تم نہایت کمزور تھے لیکن اللہ نے زور آوروں کے مقابلہ میں تم کو کامیاب کر دیا	۳۷۵	۱۲۳
۲۳۶	تمہارے مقابلہ میں کفار تین ہزار ہیں تو تمہاری مدد کیلئے تین ہزار فرشتے نازل ہوں گے	۳۷۶	۱۲۴
۲۳۷	جب مخالفین کی تعداد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعداد کو بھی بڑھا دیا	۳۷۷	۱۲۵
۲۳۸	اس طرح تم کو فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں	۳۷۸	۱۲۶
۲۳۹	مدد و نصرت جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے جو سب طاقتوروں سے زیادہ طاقتور ہے	۳۷۹	۱۲۶
۲۴۰	جنگ احد کے انجام کا ذکر کہ اس نصرت الٰہی کا نتیجہ کیا رہا؟	۳۸۲	۱۲۷
۲۴۱	آیت لیس لک من الامر شئی کا شان نزول	۳۸۳	۱۲۸
۲۴۲	رحمت و مغفرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے؟	۳۸۵	۱۳۰
۲۴۳	مسلمانوں کو سود کی کمائی سے باز آنے کا حکم دیا جاتا ہے	۳۸۵	"
۲۴۴	آگ کا عذاب ان ہی کیلئے ہے جو حق کا انکار کرتے ہیں	۳۸۸	۱۳۲
۲۴۵	اطاعت رسول اللہ ﷺ ہی رحمت کا باعث ہے	"	"
۲۴۶	بھلائیوں کی طرف دوڑو کی بھلائی ہی جنت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے	۳۸۹	۱۳۳
۲۴۷	وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے فی سبیل اللہ مال خرچ کرتے ہیں	۳۹۱	۱۳۴
۲۴۸	وہ غصہ میں بے قابو نہیں ہوتے اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں	"	"
۲۴۹	اپنی برائی کو خود دیکھ کر اپنے ضمیر کو ملامت کرنے والے لوگ	۳۹۴	۱۳۵
۲۵۰	وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو بخشنے والا ہو	۳۹۵	"
۲۵۱	جس شخص نے جنت حاصل کر لی گویا وہ صحیح معنوں میں کامیاب ہو گیا	۳۹۶	۱۳۶
۲۵۲	حق جھٹلانے والوں کا انجام نگاہ میں رکھو اور اپنا انجام سمجھ جاؤ	۳۹۷	۱۳۷
۲۵۳	ایک بار پھر سن لو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے	۳۹۸	۱۳۸
۲۵۴	گزشتہ پر افسوس کرنے کی بجائے آئندہ کیلئے احتیاط ضروری ہے	"	"
۲۵۵	مومن کون ہے؟ وہی جو نہ ہمت ہارے اور نہ دل چھوڑے	۳۹۹	۱۳۹
۲۵۶	آج جس دکھ میں تم مبتلا ہو کل دشمنوں کو بھی تم ایسے ہی دکھ میں مبتلا کر چکے ہو	۴۰۰	۱۳۹

۲۵۷ مصیبت کے وقت دوست و دشمن کی پہچان ہو جاتی ہے	۴۰۱	۱۴۰
۲۵۸ جنگ احد کے نتائج نے کھرے اور کھوٹے میں نکھار پیدا کر دیا	۴۰۲	۱۴۱
۲۵۹ آزمائش کے وقت ثابت قدم رہنا ہی دعویٰ ایمان کی تصدیق ہے	۴۰۳	۱۴۳
۲۶۰ تمنا موت کی دو صورتیں اسلام میں جائز اور درست رکھی گئی ہیں	۴۰۴	۱۴۳
۲۶۱ پھر جب وہ وقت آگیا کہ جہاد میں نکلنے کا بگل بجنے لگا تو تم میں سے کچھ لوگ ششدر رہ گئے	۴۰۵	۱۴۳
۲۶۲ محمد ﷺ کیا ہیں؟ اللہ کے ایک رسول ہیں	۴۰۶	۱۴۴
۲۶۳ رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اس کیلئے ہمیشہ زندہ رہنا نہیں	۴۰۸	〃
۲۶۴ آپ ﷺ کی وفات کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ آپ ﷺ کی زندگی ہی میں کر کے دکھا دیا	۴۰۹	〃
۲۶۵ ہر ذی نفس کیلئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے وہ اس میعاد سے پہلے نہیں مر سکتا	۴۱۱	۱۴۵
۲۶۶ دنیا کے طلب گار کو دنیا اور آخرت کے طلبگار کو آخرت مل جائے گی	۴۱۲	〃
۲۶۷ سابق انبیاء کرام کے ساتھ ہو کر بھی اللہ کی راہ میں لوگوں نے جہاد کیا	۴۱۳	۱۴۶
۲۶۸ گزشت مجاہدین نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا لیکن عجز و بے چارگی کا اظہار نہ کیا	۴۱۴	۱۴۷
۲۶۹ وہ مجاہدین بھی ایسے تھے کہ جہاد کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے تھے	〃	〃
۲۷۰ جن کو دین و دنیا میں کامیاب ہونے کی ضمانت دے دی گئی	۴۱۶	۱۴۹
۲۷۱ مسلمانوں کو غیروں کی چالوں میں نہ آنے کی ہدایت الٰہی	۴۱۶	۱۴۹
۲۷۲ جب تمہارا کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اس سے بہتر کون کارساز ہو سکتا ہے؟	۴۱۷	۱۵۰
۲۷۳ گزشتہ آنچہ گزشت کفار مکہ کے دلوں میں اب بھی تمہارا رعب موجود ہے	۴۱۸	۱۵۱
۲۷۴ وہ واقعہ یاد کرو جب کہ ہم نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا تھا اور تم کفار کو تہہ تیغ کر رہے تھے	۴۲۱	۱۵۲
۲۷۵ جنگ احد کی دوسری حالت کا ذکر کہ تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا	۴۲۲	۱۵۲
۲۷۶ کچھ لوگوں کی نظر دنیا کی خواہش پر تھی	۴۲۳	〃
۲۷۷ کچھ لوگوں کی نظر آخرت پر ٹک گئی اور وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے	۴۲۴	〃
۲۷۸ انجام کار جن سے غلطی سرزد ہوئی تھی ان کی غلطی کی معافی کا اعلان کر دیا گیا	〃	〃
۲۷۹ غزوہ احد کا تیسرا مرحلہ جس میں لشکر اسلام کو ہزیمت کا سامنا ہوا	۴۲۵	۱۵۳
۲۸۰ احد کی ان مشکل گھڑیوں میں ایک مزید مشکل کا اضافہ	۴۲۷	〃
۲۸۱ علم الٰہی میں انسانوں کے سارے کاموں کی حقیقت موجود ہے	〃	〃

۲۸۲	مصیبت کو برداشت کر جانا بھی اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے	۴۲۸	۱۵۴
۲۸۳	بہانے تراشنے والوں کو بھی ایک بہانہ مل گیا	۴۳۰	"
۲۸۴	منافقین کہہ رہے تھے کہ ہمارا کوئی اختیار چلتا ہے؟	۴۳۱	"
۲۸۵	جس شخص کو جہاں مرنا ہے وہ دوڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے	۴۳۲	"
۲۸۶	آزمائش ہی سے کھرا اور کھوٹا نکھرتا ہے اور قومی زندگی کیلئے نکھار ضروری ہے۔	۴۳۳	"
۲۸۷	جن لوگوں سے لغزش ہوئی تھی ان کی معافی کا اعلان الٰہی	۴۳۵	۱۵۵
۲۸۸	جس طرح کفر و نفاق برا ہے اسی طرح ان کی مصاحبت بھی بری ہے	۴۳۷	۱۵۶
۲۸۹	رحمت الٰہی اور بخشش خداوندی کے مقابلہ میں جان کیا شے ہے؟ کچھ بھی نہیں	۴۳۹	۱۵۷
۲۹۰	طبعی موت مرنا بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرنا ہو سکتا ہے	۴۴۰	۱۵۷
۲۹۱	تم قتل کر دیئے جاؤ یا طبعی موت مرو انجام کار اللہ کے ہاں جمع ہو گے	۲۴۱	۱۵۸
۲۹۲	نبی اعظم و آخر ﷺ کے نرم مزاج ہونے کی قرآنی شہادت	"	"
۲۹۳	محمد رسول اللہ ﷺ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی سخت مزاج اور ترش رو نہ ہوتے تھے	۴۴۳	۱۵۹
۲۹۴	قصور واروں کا قصور معاف کرنے اور ان سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت	۴۴۶	۱۵۹
	مشورہ کی اہمیت اسلام میں	۴۴۸	"
	پہلی بات = لفظ امر اور شوریٰ کی تحقیق	"	"
	دوسری بات = مشورہ کی شرعی حیثیت	۴۴۹	"
	تیسری بات = رسول کریم ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ	۴۵۰	۱۵۹
	چوتھی بات = حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے؟	۴۵۲	"
	پانچویں بات = مشورہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی؟	۴۵۴	"
	ایک اشکال اور اس کا جواب	۴۵۵	"
	چھٹی بات = ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا	"	"
	اہمیت مشورہ کا ایک اختصاری خاکہ	"	"
۲۹۵	مشورہ سے طے شدہ بات کے خلاف کرنے کا کسی کو حق نہیں	۴۵۸	"
۲۹۶	مسلمانوں کو ہدایت کہ اگر تم اللہ کے ہو جاؤ اللہ تمہارا ہو جائے پھر کاہے کا غم	۴۶۱	۱۶۰
۲۹۷	نبی اور خیانت، عقل کے ناخن لو تم کون ہو اور کیا کر رہے ہو؟	۴۶۳	۱۶۱
۲۹۸	خائن اپنی خیانت کو کب تک چھپا سکتا ہے؟	۴۶۵	"

	غل کا استعمال قرآن کریم میں چند مقامات پر ملاحظہ فرمائیں	۴۶۶	"
۲۹۹	اللہ کی رضاء کیلئے کام کرنے والے اور اس کے نافرمان اَیک جیسے نہیں ہو سکتے	۴۶۷	۱۶۴
۳۰۰	سچوں کی سچائی ظاہر ہوگی تو جھوٹوں کا جھوٹ بھی کھل جائے گا	۴۶۸	۱۶۴
۳۰۱	رسول اللہ ﷺ رحمت عام بھی ہیں اور رحمت خاص بھی	۴۷۰	"
۳۰۲	نبی کریم ﷺ کے بعد کام نبوت کا جاری رہنا	۴۷۲	۱۶۴
۳۰۳	احد کی مصیبت ہم پر کہاں پڑی؟ جواب ملتا ہے تمہارے اپنے ہاتھوں سے	۴۷۴	۱۶۵
۳۰۴	میدان احد میں جو کچھ تم کو پیش آیا وہ "باذن اللہ" تھا	۴۷۶	۱۶۶
۳۰۵	ہر نقصان سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اسی طرح اس نقصان کا بھی تم کو فائدہ ہوا	۴۷۷	۱۶۷
	عبداللہ سردار المنافقین کا مختصر حال	۴۷۸	۱۶۷
۳۰۶	شاطر و چالاک اتنے ہیں کہ سوال سننے سے پہلے ہی جواب تیار رکھتے ہیں	۴۸۴	۱۶۷
۳۰۷	ان کی زبانوں پر وہ آتا ہے جس سے دل انکار کرتے ہیں	"	"
۳۰۸	اللہ ہی وہ ذات ہے جو دلوں میں پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے	۴۸۵	۱۶۸
۳۰۹	اب تم ان سخن سازوں کے دل کا حال سن لو کہ وہ کیا ہے؟	"	"
۳۱۰	اچھا اگر موت کے ڈر نے تم کو جہاد سے باز رکھا تو اب بالکل نہ مرنا	۴۸۶	"
۳۱۱	شہید کبھی نہیں مرتا بلکہ صحیح معنوں میں زندہ ہو جاتا ہے	۴۸۷	۱۶۹
۳۱۲	شہداء کو اللہ تعالیٰ نے جو انعامات دیئے ہیں وہ ان کو حاصل کر کے بہت خوش ہیں	۴۹۱	۱۷۰
۳۱۳	ان کو مشاہدہ ہو چکا ہے کہ اللہ ایمان والوں کا اجر کبھی اکارت نہیں کرتا	۴۹۲	۱۷۱
۳۱۴	رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہنے والے ہی متقی ہیں	۴۹۳	۱۷۲
۳۱۵	منافقین نے شرارتاً مجاہدین کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید رواں دواں ہو گئے	۴۹۵	۱۷۳
۳۱۶	مجاہدین کی صدا کیا ہے؟ "جس کا کارساز اللہ ہو کیا ہی اچھا کارساز ہے۔"	۴۹۶	"
۳۱۷	جب کہنا اور کرنا ایک جیسا ہو جائے تو اللہ کا فضل ہو جاتا ہے	۴۹۷	۱۷۴
۳۱۸	مکی لشکر کی دوبارہ چڑھائی کی خبر دینے والا کون تھا؟ شیطان	۴۹۸	۱۷۵
۳۱۹	مسلمانوں کو ہدایت کر دیکھو تم شیطان کے ہتھے مت چڑھو	۴۹۹	"
۳۲۰	منافقین کی آخرت برباد ہو اور یہ عذاب میں پڑے رہیں	۵۰۱	۱۷۶
۳۲۱	ایمان کی پونجی دے کر کفر کا سودا چکانے والے خود فیصلہ کر لیتے تو بہتر ہوتا	۵۰۳	۱۷۷
۳۲۲	کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو جو مہلت دی جا رہی ہے یہ ان کیلئے کبھی مفید نہیں ہوگی	۵۰۴	۱۷۸

۳۲۳	مسلمانوں کی حالت ایسی ہی نہیں رہے گی بلکہ پاک ناپاک سے الگ کر دیا جائے گا	۵۰۶	۱۷۹
۳۲۴	غیب کی خبریں ہر ایک کو نہیں دی جا سکتیں کیونکہ یہ قانون الٰہی کے خلاف ہے	۵۰۷	"
۳۲۵	جب تک دارفانی میں ہو توبہ کا وقت ہے جب دارالبقاء میں گئے وقت ختم ہو گیا	۵۰۹	"
۳۲۶	منافق خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخیل بناتے ہیں	۵۱۰	۱۸۰
۳۲۷	اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کا حال ان کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا	۵۱۴	"
۳۲۸	وارث حقیقی ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے انسان کی ملکیت عارضی اور مستعار ہے	۵۱۵	"
۳۲۹	جن لوگوں نے اللہ کے فقیر ہونے کی پھبتی کسی ہے اللہ نے ان کی بات سن لی ہے	۵۱۶	۱۸۱
۳۳۰	یہود کی یہ بات کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی لکھ لی گئی ہے۔ یہ خود اس کا جواب ہوں گے	۵۱۹	"
۳۳۱	جو لوگ انبیاء کرام کے قتل سے باز نہ رہے ان کو نبی سے استہزاء میں کیسے شرم آتی؟	۵۲۱	"
۳۳۲	ان کو اپنے کئے کی اور تم کو اپنے کئے کی سزا بھگتنا ہوگی' اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا	۵۲۳	۱۸۲
۳۳۳	بے دلیل باتیں بنانے والوں کے جو منہ میں آئے وہ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں	۵۲۵	۱۸۳
۳۳۴	یہود کو رد در رد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اس کا جواب دلوا دیا	۵۲۷	"
۳۳۵	پیغمبر اسلام ﷺ سے خطاب کہ یہود نے آپ ﷺ کو جھٹلا کر کوئی نیا کام نہیں کیا	۵۲۹	۱۸۴
۳۳۶	دنیوی زندگی کا حجاب اٹھے گا تو اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا	"	"
۳۳۷	جو آتش دوزخ سے ہٹا لیا گیا گویا کامیابی اس کا مقدر ہو گئی	۵۳۰	۱۸۵
۳۳۸	دنیا کیا ہے؟ خواہشوں اور ولولوں کا کارخانہ فریب ہے اس کے سوا کچھ نہیں	۵۳۱	۱۸۵
۳۳۹	جان و مال کی آزمائش میں تم بھی مبتلا ہو گے اور اہل باطل کی تلخ کلامی بھی سننا ہوگی	۵۳۳	۱۸۶
۳۴۰	مشرکین اور یہود کی ایذا رسانیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھو	۵۳۴	"
۳۴۱	یہود کو کتاب اللہ دی گئی تھی لیکن انہوں نے اس کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا	۵۳۵	۱۸۷
۳۴۲	حق فروشی کے دام اس کو جہنم ہی میں پہنچائیں گے کیونکہ یہ راستہ جہنم ہی کو جاتا ہے	۵۳۸	۱۸۷
	کیا دینی مصلحت کے لئے حکم الٰہی چھپایا جا سکتا ہے اور دلایا بھی؟	۵۳۹	۱۸۷
۳۴۳	کچھ لوگ اپنے اس کرتوت پر خوش ہیں کہ کام لوگ کریں اور مدح سرائی ان کی ہو	۵۴۰	۱۸۸
۳۴۴	دنیا ہی کے ہو کر رہ جانے والے رسوا کن عذاب میں پھنس کر رہ جائیں گے	۵۴۳	"
۳۴۵	آسمانوں اور زمین کی اصل بادشاہی تو اللہ ہی کی ہے باقی سب بکھیڑے ہیں	۵۴۴	۱۸۹
۳۴۶	کائنات کے ذرہ ذرہ میں توحید الٰہی کے نشانات موجود ہیں	۵۴۵	۱۹۰
۳۴۷	ہر حال میں اللہ کی یاد رکھنے والے ہی صاحب عقل و دانش ہیں	۵۴۷	۱۹۱

۳۴۸	غور و فکر کرنے والے وہی ہیں جو اللہ کی پیدائش کو عبث و بیکار نہیں سمجھتے	۵۵۰	"
۳۴۹	غور و فکر کا آخر میں نتیجہ عذاب و دوزخ سے پناہ طلب کرنا ہے	۵۵۳	"
۳۵۰	اے ہمارے رب دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا جو دوزخ میں گیا وہ رسوا ہوگیا	۵۵۵	۱۹۲
۳۵۱	نبی اعظم و آخر ﷺ کی دعوت سن لینے کی شہادت	۵۵۶	۱۹۳
۳۵۲	ہر منادی کرنے والا کیا منادی کرتا ہے؟ یہ فرمایا گیا کہ وہ ایمان کی دعوت دیتا ہے	"	"
۳۵۳	اے ہمارے رب! ہمارے گناہ معاف فرما کہ ہمیں نیک کرداروں کے ساتھ ملا دے	۵۵۷	"
۳۵۴	اے ہمارے رب! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دے جس کا تو نے وعدہ فرمایا ہے	۵۵۹	۱۹۴
۳۵۵	شکر گزاروں کو مزید ملتا ہے اور کفران نعمت کرنے والوں کیلئے عذاب الٰہی تیار ہے	۵۶۰	"
۳۵۶	اے اللہ! تیری ہی وہ ذات ہے کہ جس کا کیا ہوا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا	۵۶۱	"
۳۵۷	اللہ کے ہاں ہر عمل کرنے والے کا اجر محفوظ ہے وہ مرد ہو یا عورت	۵۶۲	۱۹۵
۳۵۸	جن کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور ان کے اجر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے	۵۶۳	"
۳۵۹	کفر کی راہ چلنے والے آپ کیلئے دھوکا کا باعث نہ ہوں	۵۶۶	۱۹۶
۳۶۰	دنیا کا فائدہ قلیل مدت کیلئے اور جہنم کا عذاب ابدالآباد	۵۶۸	۱۹۷
۳۶۱	جو لوگ نیک کردار ہوئے وہ ابدی باغات اور ان کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے	۵۶۹	۱۹۸
۳۶۲	اہل کتاب میں وہ بھی موجود ہیں جو کتاب الٰہی کو مانتے ہیں وہ تورات ہو یا قرآن کریم	۵۷۰	۱۹۹
۳۶۳	ایسے اہل کتاب کا اجر بھی یقیناً اپنے رب کے ہاں محفوظ ہے	۵۷۲	۱۹۹
۳۶۴	تم یہ بات یاد رکھو کہ اللہ کا قانون مکافات ست رفتار نہیں ہے	۵۷۳	"
۳۶۵	خلاصہ کلام سن لو اور ہدایات پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ دین و دنیا کی بھلائی اسی میں ہے	۵۷۴	۲۰۰

سورہ النساء - ۴

۱	سلسلہ حسب و نسب باپ سے ہے ماں سے نہیں لیکن کنیت ماں سے بھی ہو سکتی ہے	۵۸۵	۱
۲	جوڑا اپنی جنس ہی سے ہو سکتا ہے غیر جنس سے نہیں	۵۸۹	"
۳	اللہ کے نام سے سوال کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس جگہ اس کی ضرورت کیوں؟	۵۹۰	"
۴	رشتہ داریوں اور قرابت داریوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ	۵۹۲	"
۵	مکلفین کی ہر حرکت سے اللہ بذاتہ واقف ہے اور ایک سلسلہ نگرانی کا اس نے قائم کر دیا ہے	۵۹۴	"

۶	معاشرہ اسلامی کے حقوق میں سے بے باپ بچوں کے حقوق کا تذکرہ کیا جا رہا ہے	۵۹۵	۲
۷	یتیموں کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانا معمولی قسم کی برائی نہیں بلکہ جرم عظیم ہے	۵۹۷	″
۸	یتیم لڑکوں کا مخصوص حکم کہ ان کے معاملہ میں بھی انصاف سے کام لو	۵۹۹	۳
۹	ضرورت ہو تو تم مرد ایک سے زیادہ چار کی حد تک عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو	۶۰۰	″
۱۰	ایک سے زیادہ بیویوں کی جو اجازت تم کو دی گئی ہے وہ پابندیوں کے ساتھ ہے	۶۰۱	″
	اسلام نے عدل و انصاف بین النساء پر بہت زور دیا لیکن علماء نے تفہیم صحیح نہ کرائی	۶۰۲	″
۱۱	برابری کی ہمت نہ ہو اور ضرورت کا احساس بھی ہو تو دوسری جگہ ملک یمین سے نکاح کر لو	۶۰۸	۳
۱۲	ملک یمین کے ساتھ نکاح کرنے سے تم اس گناہ سے بچ سکتے ہو جس کا اس جگہ احتمال ہے	۶۱۰	″
	ملک یمین کے موضوع پر ایک مختصر مگر جامع نوٹ	″	″
	ملک یمین کیا ہے؟ کیا یہ اسلام کی لائی ہوئی چیز ہے؟	۶۱۱	″
	۱... عقد النکاح	۶۱۲	″
	۲... حلالہ النکاح	″	″
	۳... بدل ازواج	″	″
	۴... استبضاع یا نیوگ	۶۱۳	″
	۵... ملک یمین	۶۱۳	۳
۱۳	عورتوں کا حق مہر ادا کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ نکاح کی شرائط میں سے یہ ایک شرط ہے	۶۲۳	۴
۱۴	عورت اگر خوش دلی سے کچھ چھوڑ دے تو اس کو اختیار ہے اس کے لینے میں کوئی گناہ نہیں	۶۲۵	″
۱۵	یتامیٰ جب تک مال سنبھالنے کے قابل نہ ہوں ان کے مال واپس نہ کرو۔	۶۲۶	۵
۱۶	ان بے باپ یا بن ماں باپ بچوں کو آزماتے رہنے کا حکم تاکہ ان کو تجربہ حاصل ہو	۶۲۷	۶
۱۷	صرف بلوغت شرط نہیں بلکہ صلاحیت کار بھی ضروری ہے تاکہ مال کی واپسی ان کے لئے مفید ہو	۶۲۸	″
۱۸	نگرانوں کیلئے مزید ہدایت کہ جب تم نگران بن گئے ہو تو بندر بانٹ سے کام نہ لینا	۶۲۹	″
۱۹	نگران اگر صاحب استطاعت ہیں تو بقدر طاقت ان بے باپوں پر صرف کریں	″	″

۲۰	نگران اگر محتاج ہے تو بقدر اس کی حاجت کے لے سکتا ہے	۶۳۰ / "
۲۱	بلوغت اور رشد آنے کے بعد جب مال کو لوٹانا ہو تو اس پر گواہ مقرر کرنا بھی ضروری ہے	۶۳۱ / "
۲۲	بات یتیموں اور بے سہارا بچوں کی ہو رہی تھی کہ وراثت کی تقسیم کا حکم عام آگیا	۶۳۲ / ۷
۲۳	متوفی کا ترکہ تقسیم ہونے لگے تو ورثاء کو کیا کرنا چاہئے؟	۶۳۴ / ۸
۲۴	وہ قرابت دار جو متوفی کے مال میں وارث نہیں ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ	۶۳۷ / "
۲۵	متوفی کے ورثاء کیلئے ایک مزید تنبیہ کہ جو آج بچو گے کل وہی کاٹو گے	۶۳۸ / ۹
۲۶	بے سہاروں اور بے باپوں کا مال کھانے والے اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں	۶۳۹ / ۱۰
۲۷	وراثت کے مال کی تقسیم میں پہلا اصول یہ ہے کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا	۶۴۱ / ۱۱
۲۸	میت کے جب کوئی لڑکا نہ ہو اور لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں یا صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حکم	۶۴۳ / ۱۱
۲۹	میت کے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی ہوں تو اس کا حکم	۶۴۴ / "
۳۰	میت کے کوئی اولاد نہ ہو لیکن اس کے ماں باپ موجود ہوں تو ان کا حکم	" / "
۳۱	میراث تقسیم کرنے سے پہلے مرنے والے کی وصیت اور قرض ادا کرنا ضروری ہے	۶۴۶ / "
۳۲	دنیا کے سارے نادان دانشمندوں کے سوال کا الٰہی جواب	۶۴۷ / "
۳۳	مرنے والی اگر بیوی ہو تو اس کے ترکہ میں میاں کا حصہ مقرر ہے	۶۵۰ / ۱۲
۳۴	عورت کا ترکہ بھی اس کے قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد تقسیم ہوگا	۶۵۱ / "
۳۵	میاں کے ترکہ سے بیوی کا شرعی حصہ بھی کتاب اللہ میں مقرر کر دیا گیا ہے	" / "
	بیوی کو اگر طلاق دے دی لیکن ابھی عدت پوری نہ ہوئی تھی کہ خاوند وفات پاگیا تو میراث کا حکم	۶۵۲ / "
۳۶	ترکہ جس کا بھی تقسیم ہوگا اس کی وصیت اور اس کے قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگا	۶۵۳ / ۱۲
	حدیث کے متعلق ایک بہت بڑی غلطی کا ازالہ جو اچھی طرح سمجھنے کی چیز ہے	۶۵۴ / "
۳۷	کلالہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس طرح ہے	۶۵۶ / "
۳۸	کلالہ کی میراث تقسیم کرنے کی تفصیل اس طرح ہے	" / "
۳۹	وصیت کی تاکید پر مزید تاکید تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے	۶۵۷ / "
	مقالہ برائے وراثت	۶۶۰ / ۱۲

	علم فرائض کی فضیلت	"	"
	علم فرائض کی حقیقت	"	"
	جو چیزیں میراث پر مقدم ہیں ان کا بیان	"	"
	وارثوں کی اقسام۔ وارثوں کی ترتیب وار آٹھ اقسام ہیں	۶۶۱	"
	جو چیزیں میراث پانے سے محروم کر دیتی ہیں	۶۶۲	"
	ذوی الفروض کا بیان	۶۶۳	"
	ذوی الفروض کی مختلف حالتوں کا بیان	"	"
	اخیافی بھائیوں اور بہنوں کی تین حالتیں ہیں	۶۶۴	"
	شوہر کی دو حالتیں	"	"
	زوجہ کی دو حالتیں	"	"
	بیٹی کی تین حالتیں	۶۶۵	"
	پوتی کے حصوں کا بیان	"	"
	حقیقی ہمشیرہ یعنی سگی بہن کی پانچ حالتیں	"	"
	علاتی بہن کی آٹھ حالتیں	۶۶۶	"
	ماں کی چار حالتیں	۶۶۷	"
	جدہ یعنی دادی اور نانی کی میراث کا بیان	۶۶۷	۱۲
	دادی اور نانی کی چھ حالتیں	۶۶۸	"
	عصبات کا بیان	۶۶۹	"
	باب الحجب	۶۷۰	"
	ایک دریافت طلب مسئلہ جو فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے	۶۸۳	"
۴۰	میراث کے متعلق جو احکام تم کو دیئے گئے ہیں ان کی پابندی دینی اور دنیاوی زندگی کے لئے مفید ہے	۶۸۴	۱۳
۴۱	قانون میراث کی پابندی نہ کرنا دین و دنیا دونوں کا خسارہ ہے	"	۱۴
۴۲	جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں ان کی سزا کا حکم اور بدچلنی سے کیا مراد ہے؟	۶۸۶	۱۵
۴۳	دو شخص بے حیائی اور بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا کیا ہے؟	۶۸۸	۱۶
۴۴	توبہ کا جو گر اس "جگت گرو" نے سکھایا وہ کوئی اور نہ سکھا سکا۔ (ﷺ)	۶۹۲	۱۷

۴۵	اللہ جانتا ہے کہ تائب کون ہوا اور دفع الوقتی کون کر رہا ہے؟	۶۹۳	〃
۴۶	موت کو سامنے کھڑا دیکھ کر توبہ توبہ کرنے والوں کی کوئی توبہ نہیں ہے	۶۹۴	۱۸
۴۷	عورتوں کو جو کچھ تم نے دیا ہے ان سے بزور لینے کی کوشش نہ کرو اور اپنا مقام مت بھولو	۶۹۶	۱۹
۴۸	مردوں کو مزید ہدایت کہ عورتوں سے حسن سلوک کرو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو	۶۹۸	۱۹
۴۹	اگر ازدواجی زندگی کی بحالی کی کوئی صورت نہ ہو تو نقصان کو بخوشی قبول کر لو	۷۰۰	۲۰
۵۰	مردوں کیلئے تاکیدی حکم کہ اس طرح دیا ہوا مال واپس لینا صریح ظلم ہے	۷۰۱	〃
۵۱	حق مہر کی واپسی کے ظلم و گناہ ہونے کے مزید دو مراحل کی طرف اشارہ	۷۰۳	۲۱
۵۲	باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے اس لئے کہ وہ ماں کے حکم میں داخل ہے	۷۰۴	۲۲
۵۳	حرام رشتوں کی پوری وضاحت فرما دی تاکہ کوئی بات مبہم نہ رہے	۷۰۶	۲۳
	دودھ عورت نے پلایا جس سے رضاعت قائم ہو گئی لیکن اسکے خاوند سے کیا تعلق ہوا؟	۷۰۷	〃
۵۴	وہ عورتیں جو دوسروں کے نکاح میں موجود ہیں تمہارے نکاح میں نہیں آسکتیں	۷۱۰	۲۴
	المحصنت اور المحصنین کے الفاظ شادی شدہ عورتوں اور مردوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں	۷۱۲	〃
۵۵	مذکورہ عورتوں کے سوا باقی عورتوں سے تم نکاح کر سکتے ہو	۷۱۳	〃
۵۶	حق مہر کی ادائیگی کی تاکید کہ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا	۷۱۴	〃
۵۷	زوجین اپنی رضامندی سے حق مہر زیادہ یا کم کر سکتے ہیں	۷۱۹	〃
۵۸	آزاد مومن عورت نہ مل سکتی ہو تو باندی اور مومنہ سے نکاح کر لو وہ تمہاری جنس ہی ہیں	۷۲۱	۲۵
۵۹	کنیزوں سے شادی کی جو اجازت دی جا رہی ہے اس میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے	۷۲۳	〃
۶۰	کنیز اگر برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کیلئے آزاد عورت کے مقابلہ میں آدھی سزا ہوگی	۷۲۴	۲۵
۶۱	کنیز سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے ضروری نہیں ٹھہرایا گیا	〃	〃
۶۲	جن رشتوں سے نکاح حرام ہے یہ پچھلی امتوں میں بھی حرام تھے' بداعتدالی رسوم و رواج نے پیدا کی	۷۲۶	۲۶
۶۳	اللہ کا چاہنا وہی ہے جو اس نے قانون بنا کر اس کا اعلان کر دیا ہے	۶۲۸	۲۷
۶۴	انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کی کمزوری کیا ہے؟ یہی کہ وہ مجموعہ اضداد ہے	۷۳۰	۲۸
۶۵	مسلمانوں کو ہدایت کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ	۷۳۲	۲۹
۶۶	ایسے پاپیوں کیلئے اللہ کی آگ تیار ہے جو چور بھی ہیں اور چتر بھی	۷۳۴	۳۰
۶۷	کبائر سے بچنے والوں کے صغائر کی معافی کا اعلان عام	〃	۳۱

۶۸	اللہ تعالیٰ نے تم کو جو فضیلت ایک دوسرے پر دی ہے اسکا خیال رکھو اور تجاوز نہ کرو	۷۳۷	۳۲
۶۹	مردوں کی کمائی مردوں کیلئے اور عورتوں کی عورتوں کیلئے' یہ ایک اصولی بات ہے	۷۳۹	"
۷۰	میراث میں بھی ایک خاص طریقہ ہے اس کا لحاظ رکھو اور عہد و پیمان کو پورا کرو	۷۴۱	۳۳
۷۱	جس معاملہ میں مردوں کو مزیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا	"	۳۴
۷۲	مردوں کو جو مزیت حاصل ہے وہ کس درجہ میں ہے؟	۷۴۳	"
۷۳	عورت اگر نیک شعار ہوگی تو وہ اطاعت گزار بھی ہوگی اور خاوند کا شکریہ بھی ادا کرے گی	۷۴۴	"
۷۴	عورت اگر سرکش ہو جائے تو اس کا علاج اس کی تفہیم اور نظر خاص سے پرہیز ہے	۷۴۵	"
۷۵	تادیبی کارروائی سے اگر عورت سنبھل جائے تو اب تم الزام تراشی نہ شروع کر دو	۷۴۸	"
۷۶	اگر پہلی تینوں تدبیریں ناکام ہو چکی ہوں تو یہ ایک چوتھی تدبیر بھی آزما دیکھو	۷۴۹	۳۵
۷۷	اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ	۷۵۱	۳۶
۷۸	والدین کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ اگر وہ مسلمان نہیں تو بھی انکے ساتھ اچھا سلوک کرو	۷۵۳	"
۷۹	قریبی رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو کہ ان کے متعلق سوال کئے جاؤ گے	۷۵۶	"
۸۰	یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کو بھی ادا کرو کہ تمہارے مال میں وہ حصہ دار ہیں	۷۵۷	"
۸۱	پڑوسیوں کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے دکھ سکھ میں آسانی سے شریک ہو سکتے ہیں	۷۵۸	"
۸۲	اٹھنے بیٹھنے والوں سے بھی تعلق ہو جاتا ہے اس کی پاسداری کی ضروری ہے	۷۵۹	"
۸۳	مسافروں اور قصبے میں آنے والوں کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو	۷۶۱	"
۸۴	یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ڈینگیں مارنے والوں کو دوست نہیں رکھتا	۷۶۲	"
۸۵	بخل سے کام لینے والے عذاب الٰہی کے مستحق ہیں اس لئے بخل کرنا ترک کر دو	۷۶۵	۳۷
۸۶	دکھاوے کیلئے مال خرچ کرنا مال کو ضائع کرنے کے برابر ہے	۷۶۶	۳۸
۸۷	اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ رکھنے کا نقصان کیا ہوا! کاش یہ بات وہ سمجھ جاتے	۷۶۷	۳۹
۸۸	اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے	۷۶۸	۴۰
۸۹	ہر امت سے گواہ طلب کرنے کے بعد ان گواہوں پر نبی اعظم و آخر ﷺ کی گواہی کا مطلب	۷۶۹	۴۰
۹۰	رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے والوں کا انجام	۷۷۴	۴۲
۹۱	حالت سکر میں نماز ادا کرنے کی ممانعت	۷۷۵	۴۳
۹۲	نمازی جو کچھ زبان سے کہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے کیا کہا؟	۷۷۶	۴۳
۹۳	غسل فرض ہو تو غسل کر کے مسجد میں آنا چاہئے ہاں! عند الضرورت مسجد سے گزرا جا سکتا ہے	۷۷۷	"

۹۴	بال کی کھال اتارنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے	۷۷۸	"
۹۵	اہل کتاب خصوصاً یہود کی طرح نیکی سے محبت کرنے کی بجائے اس سے عداوت نہ بنالو	"	۴۴
۹۶	اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہے لیکن تم نہیں جانتے	۷۷۹	۴۵
۹۷	یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر جو وہ وقتاً" فوقتاً" کرتے رہتے تھے	۷۸۰	۴۶
۹۸	اپنی بنائی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اللہ کی دی ہوئی ہدیات کی طرف آؤ	۷۸۲	۴۷
۹۹	دعوت پیش کرنے کے بعد منکرین دعوت کو ساتھ ہی سزا بھی سنائی جا رہی ہے	۷۸۳	"
۱۰۰	شرک سے بڑا کوئی گناہ اور مشرک سے بڑا کوئی گنہگار نہیں ہوتا	۷۸۵	۴۸
۱۰۱	شرک کی ایک اور راہ کہ "ہم چوما دیگرے نیست" جس میں یہود و نصاریٰ بھی مبتلا تھے	۷۸۷	۴۹
۱۰۲	اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارنے والے اس طرح اللہ پر گویا بہتان باندھ رہے ہیں	۷۸۸	۵۰
۱۰۳	وہ جن کو کتاب اللہ دی گئی لیکن اس کے باوجود وہ شرک کے مرتکب ہوئے	۷۸۹	۵۱
۱۰۴	یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی مار کے مستحق ٹھہرے اب ان کا مددگار کون ہو سکتا ہے؟	۷۹۱	۵۲
۱۰۵	یہود کو اگر دنیا کی سیادت مل جاتی تو وہ اس میں کسی کو شریک نہ کرتے	۷۹۲	۵۳
۱۰۶	الٰہی فیصلے ایسے نہیں جن کو دنیا کے حاسد روک لیں	۷۹۳	۵۴
۱۰۷	آل ابراہیمؑ میں سے کچھ لوگوں نے مان لیا اور کچھ نے انکار کیا	۷۹۵	۵۵
۱۰۸	منکرین کے عذاب کی کیفیت کا ایک منظر	۷۹۵	۵۶
۱۰۹	ایمان لانے والوں کے انعام الٰہی پانے کا منظر	۷۹۷	۵۷
۱۱۰	مسلمانوں کیلئے ہدایت کہ جس کی امانت ہو اس کو لوٹا دو	۷۹۹	۵۸
	مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکمائے اسلام کی بھی	۸۰۲	"
	اطاعت و فرمانبرداری کی تین عملی صورتیں جن کا سمجھنا ضروری ہے	۸۰۴	"
۱۱۱	اگر کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حال کیا ہے؟	۸۰۶	۵۹
۱۱۲	دعوت اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ قبول نہ کرنے والوں کا فیصلہ	۸۰۸	۶۰
۱۱۳	اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کرنے والے منافق ہیں	۸۱۰	۶۱
۱۱۴	اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے آئی ہوئی مصیبت کا کوئی حل؟	۸۱۱	۶۲
۱۱۵	اللہ انکے دلوں سے خوف واقف ہے آپ ایسی بات کریں کہ انکے دلوں میں اتر جائے	۸۱۳	۶۳
۱۱۶	اطاعت کا جو حکم انکو دیا گیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی ہر ایک فرستادہ کی اطاعت لازم تھی	۸۱۴	۶۴
۱۱۷	اپنے ہاتھوں اپنے نقصان کرنے والوں کا اصل حق اور اس کا نقصان کا ازالہ کیا تھا؟	۸۱۶	"

۱۱۸	جھگڑوں کے فیصلوں کی عدالت اور عدلیہ کا سب سے بڑا جج ایک ہی ہے	۸۱۷	۶۵
۱۱۹	ان لوگوں کو اپنے آپ کو قتل کرنے، گھروں سے نکلنے کا حکم دیا جاتا تو کیا یہ بجا لاتے؟	۸۲۰	۶۶
۱۲۰	جو چیز مشکل سے حاصل کی جائے اس کی قدر و منزلت دل میں بڑھ جاتی ہے	۸۲۱	"
۱۲۱	بعض چیزوں کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ خرچ کرنے ہی سے بڑھتی ہیں	۸۲۳	۶۷
۱۲۲	اس طرح دین کی شاہراہ پر وہ بھی گامزن ہو جاتے	"	۶۸
۱۲۳	اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اصل ثمرہ	۸۲۳	۶۹
	جنت میں ملاقات کی چند صورتیں	۸۲۶	"
	قرب کی شرط محبت ہے	۸۲۷	"
	صدیقین کی تعریف قرآن کریم میں	"	"
	شہداء کی تعریف قرآن کریم میں	۸۲۸	"
	صالحین کی تعریف قرآن کریم میں	۸۲۹	"
	ایک غلطی کا ازالہ	۸۳۰	"
۱۲۴	نیک لوگوں کی رفاقت کا میسر آنا اللہ کا فضل و کرم ہے	۸۳۳	۷۰
۱۲۵	مسلمانوں کو نور بصیرت سے کام لینے کی ایک خاص ہدایت	۸۳۴	۷۱
۱۲۶	فائدے کے ساتھی نقصان کا نام سنتے ہی دم بخود ہو جائیں گے کہ ہم ساتھ نہیں تھے	۸۳۶	۷۲
۱۲۷	اللہ کا فضل تمہارے شامل حال ہوگا تو وہ بھی محبت کا رشتہ تم سے جوڑیں گے	۸۳۷	۷۳
۱۲۸	دنیوی زندگی کے بدلے آخرت کی زندگی کو پسند کرنے والے جہاد فی سبیل اللہ سے نہیں گھبراتے	۸۳۸	۷۴
۱۲۹	جو لوگ دین کیلئے ستائے جا رہے ہوں ان کی آزادی کیلئے جہاد فی سبیل اللہ فرض اول ہے	۸۳۹	۷۵
۱۳۰	اللہ والوں کو شیطان کے حمائتیوں کے خلاف برسرپیکار رہنا ضروری ہے	۸۴۱	۷۶
۱۳۱	تم حافظے کے کتنے کمزور ہو کہ ابھی تم کیا کہہ رہے تھے اور اب کیا؟	۸۴۲	۷۷
۱۳۲	جب جہاد فرض ہوا تو تم نے پادنا شروع کر دیا اور تمہارے پیٹ میں بل پڑنے لگے	۸۴۳	"
۱۳۳	کیا یہ آواز تمہاری ہی ہے کہ اے اللہ! تو نے ہم پر جنگ فرض کیوں کر دی؟	۸۴۴	"
۱۳۴	ان کو سمجھاؤ کہ دنیا کیا ہے؟ یہ "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات" ہے	۸۴۵	۷۷
۱۳۵	موت سے فرار؟ سوچ لو! اس کی کوئی صورت ممکن بھی ہے	"	۷۸
۱۳۶	بھلائی کی نسبت تو یہ لوگ اللہ کی طرف کرتے ہیں لیکن مصیبت کی نسبت تیری طرف کیوں؟	۸۴۶	"

۱۳۷	اصلاح کا پہلو اس میں تھا کہ بھلائی کی نسبت اللہ کی طرف اور برائی کی نسبت اپنی طرف کرتے	۸۴۸	۷۹
۱۳۸	رسول کی رسالت مان لینے سے رسول کا فائدہ؟ اور نہ ماننے سے اس کا کوئی نقصان؟	۸۴۹	〃
۱۳۹	اللہ کی اطاعت کا دعویدار رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرکے خود اپنے دعویٰ کی تردید کرتا ہے	۸۵۰	۸۰
۱۴۰	اسلام اس کو جھوٹا کہتا ہے جو جھوٹا ہے اور پھر اس کو اس کے گھر تک پہنچا دیتا ہے	۸۵۲	۸۱
۱۴۱	یہ بھول نہ جائیں ہم ان کے کئے ہوئے مشورہ کو لکھ رہے ہیں	۸۵۳	〃
۱۴۲	انکی ان ہونیوں کو آپ ﷺ اپنے دل میں جگہ نہ دیں کہ نیش زن کا کام نیش مارنا ہے	〃	〃
۱۴۳	اللہ کی باتوں میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا	۸۵۴	۸۲
۱۴۴	رسالت کا درجہ تو بہت بڑا ہے لیکن بات کی تہ تک پہنچ جانے والے لوگ بھی یقیناً ہوتے ہیں	۸۵۶	۸۳
۱۴۵	اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا تو شیطان تو اپنی شہد بھری انگلی لگا ہی گیا تھا	۸۵۷	〃
۱۴۶	تم جہاد کیلئے ہر وقت تیار رہو اور اللہ کے زور کو اپنی کمزوری کا سہارا بنا لو	۸۵۸	〃
۱۴۷	نیکی میں تعاون نیکی ہے اور برائی میں تعاون برائی ہر تعاون کرنے والا خوب سمجھ لے	۸۵۹	۸۵
	سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہی ہے جو حرام ہے	۸۶۶	〃
۱۴۸	السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ویسا ہی جواب ہے جیسا کہ اس نے دیا	۸۶۳	۸۶
۱۴۹	اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا اور اللہ سے زیادہ کون سچا ہے؟	۸۶۷	۸۷
۱۵۰	قانون الٰہی جس کو فیل کردے تم اسکو پاس کرنے والے کون ہو؟ بے فائدہ جھگڑا چھوڑ دو	۸۷۳	۸۸
۱۵۱	قانون الٰہی میں ہدایت حاصل کرنے کے دو ہی راستے ہیں غور و فکر اور مشاہدہ و نظر	۸۷۴	〃
۱۵۲	جو کچھ وہ ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی وہی ہو جاؤ یہ دوست بنانے کے قابل نہیں	۸۷۵	۸۹
۱۵۳	اگر وہ تم کو چھوڑ کر تمہارے دشمنوں سے مل گئے ہیں تو تم بھی انکو دین کا دشمن سمجھو	۸۷۶	۹۰
۱۵۴	ہاں! جو لوگ تمہارے معاہدین کی پناہ میں ہوں ان کا حکم الگ ہے	〃	۹۰
۱۵۵	کچھ لوگ ہیں جو جنگ سے بھاگتے ہیں اگر وہ سلامتی کے طالب ہیں تو ان سے درگزر کرو	۸۷۷	〃
۱۵۶	کچھ لوگ ہیں جو اسلام کے قریب تو نہیں آئے لیکن مسلمانوں سے رحمت کے طالب ہیں	۸۷۸	۹۱
۱۵۷	ایسے لوگوں کو محاورہ میں "غریب ظالم" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے	۸۷۹	〃
۱۵۸	کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جائز نہیں اور اتفاقاً قتل ہو جائے تو اس کی سزا؟	۸۸۰	۹۲
۱۵۹	مقتول کے وارثوں کو حق ہے کہ وہ چاہیں تو خون بہا معاف کر دیں	〃	〃
۱۶۰	مقتول دشمن حکومت کا فرد ہو تو اس کا حکم کیا ہے؟	۸۸۱	〃

۱۶۱	مقتول اگر معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا حکم	۸۸۲	〃
۱۶۲	اگر مسلمان غلام میسر نہ آئے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟	〃	〃
۱۶۳	پہلے قتل خطاء اور اس کی سورتوں کا ذکر تھا پھر اس کی سزا کا اور اب قتل عمد کا ذکر ہے	۸۸۴	۹۳
۱۶۴	سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ہدایت کہ جتنا معاملہ اہم ہوگا اتنی ہی سوچ گہری ہوگی	۸۸۵	۹۴
۱۶۵	ناجائز ذریعہ سے سامان زندگی حاصل کرنا ایمان باللہ کے سراسر خلاف ہے	۸۸۶	۹۴
۱۶۶	جہاد میں شریک ہونے والے اور شریک نہ ہونے والے لوگ برابر نہیں ہو سکتے	۸۸۷	۹۵
۱۶۷	انعام الٰہی اس کے علاوہ بھی ان کے لئے موجود ہے	۸۸۹	۹۶
۱۶۸	زیاں کاروں کی موت کا منظر	۸۹۰	۹۷
۱۶۹	بے مقصد عذر کرنے والوں کا عذر قابل قبول نہیں ہوگا لیکن معذوروں کا خیال رکھا جائے گا	〃	〃
۱۷۰	یہ وہ لوگ ہیں جو معذر متصور ہو سکتے ہیں	۸۹۱	۹۹
۱۷۱	جو ہجرت کے پیش نظر گھر سے نکل کھڑا ہوا اللہ اس کا حامی و ناصر ہوگا	〃	۱۰۰
۱۷۲	گھر سے نکلنے والے نے ہجرت کا اجر پالیا اگرچہ وہ دارالہجرت پہنچنے سے پہلے وفات گیا	۸۹۲	〃
۱۷۳	نماز قصر کرنے کے حکم سے دو باتوں کی اہمیت معلوم ہوگئی نماز کی بھی اور جہاد کی بھی	۸۹۳	۱۰۱
۱۷۴	نماز کا بیان جو صرف جنگ ہی سے مخصوص ہے	۸۹۴	۱۰۲
۱۷۵	اس طرح نماز کی ادائیگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم دشمن سے چوکنے رہو	۸۹۵	〃
۱۷۶	حالت جنگ میں نماز ادا کرنے کے بعد ذکر الٰہی کی مشغولیت	۸۹۶	۱۰۳
۱۷۷	بلاشبہ نماز ہر مسلمان پر وقت مقرر کے ساتھ فرض کی گئی	۸۹۷	〃
۱۷۸	منکرین سے تم کو جو دکھ پہنچا ہے اس سے زیادہ تم ان کو دکھ پہنچا چکے ہو	〃	۱۰۴
۱۷۹	قرآن کریم حق و باطل میں فرق کر کے الگ کر دینے والا ہے	۸۹۸	۱۰۶
۱۸۰	خیانت کرنے والا خائن ہے ہے خواہ وہ کوئی ہو اور خائن کی حمایت ہر حال میں گناہ ہے	۹۰۰	۱۰۷
۱۸۱	راتوں کو چھپ چھپ کر مشورے کرنے والے اللہ سے پوشیدہ نہیں	۹۰۱	۱۰۸
۱۸۲	پارٹی کیلئے جھگڑا کرنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ آخرت میں یہ جھگڑا کون کرے گا؟	۹۰۲	۱۰۹
۱۸۳	اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر بیٹھنے والوں کیلئے ہدایت الٰہی	۹۰۴	۱۱۰
۱۸۴	برائی کرنے والا ہمیشہ اپنا نقصان کرتا ہے کیونکہ یقیناً وہ اس کے نتیجہ سے دوچار ہوگا	〃	۱۱۱
۱۸۵	بہتان کیا ہے؟ خود گناہ کرنا اور دوسرے کے ذمہ لگا دینا	۹۰۵	۱۱۲
	یوسف علیہ السلام پر بہتان کا الزام عظیم غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟	۹۰۶	〃

۱۸۶	رسول اللہ ﷺ کو اطلاع کہ آپؐ کو راہ سے ہٹانے کی کوششوں میں وہ مصروف ہیں	۹۰۹ / ۱۱۳
۱۸۷	یہ صیاد اپنے دام میں خود ہی پھنس کر رہ جائیں گے آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے	″ / ۱۱۳
۱۸۸	پوشیدہ مشورے کرنے والوں کے مشوروں میں بھلائی کم ہی ہوا کرتی ہے	۹۱۱ / ۱۱۴
۱۸۹	راہ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد جو گمراہی کی طرف بڑھیں تو ہمارا قانون ان کو نہیں روکتا	۹۱۳ / ۱۱۵
۱۹۰	شرک پر مرنے والے کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا اس لئے وہ راہ ہدایت سے بہت دور نکل جاتا ہے	۹۱۴ / ۱۱۶
۱۹۱	مشرکین مکہ اللہ کے سوا جن کو اپنا حاجت روا مانتے تھے ان کو "اناث" کہتے تھے	۹۱۵ / ۱۱۷
۱۹۲	غیر اللہ کو پکار کر وہ شیطان مردود کے تابع ہوگئے کیونکہ یہ فرمان اس کا ہے	۹۱۷ / ″
۱۹۳	شیطان ہی وہ جنس ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا جا چکا ہے	۹۱۹ / ۱۱۸
۱۹۴	شیطان کا عزم و ارادہ اور اس کی تکمیل کے طریقوں کا اعلان	۹۲۰ / ″
	شیطان کے مقررہ حصہ کے بندوں کے اوصاف تاکہ تم پہچان سکو	″ / ″
۱۹۵	شیطان کا اعلان عام اور اس کے نتائج	۹۲۲ / ۱۱۹
۱۹۶	خلقت الٰہی میں ردوبدل کر دینے کی شیطانی چال	۹۲۳ / ۱۱۹
۱۹۷	اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا مددگار بنانے والا ایسے گڑھے میں گرا جہاں سے نکلنا ممکن نہیں	۹۲۴ / ″
۱۹۸	شیطان کا وعدہ ایک فریب ہے اس کے سوا کچھ نہیں اور اس کو بھی اس کا اقرار ہے	″ / ۱۲۰
۱۹۹	شیطان کے یاروں کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ اس سے بھاگ نہیں سکیں گے	۹۲۵ / ۱۲۱
۲۰۰	ایمان لانے والے اور اچھے اعمال کرنے والے باغات میں داخل ہوں گے	۹۲۶ / ۱۲۲
۲۰۱	جنت کیا ہے؟ انعام خداوندی کا ایک وعدہ اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا	۹۲۷ / ″
۲۰۲	جنت ایک حقیقت ہے وہ خالی آرزوؤں کا نام نہیں	۹۲۸ / ۱۲۳
۲۰۳	اچھے عمل کا بدلہ اچھا ہوتا اور اچھا عمل وہی ہے جو ایمان کے ساتھ ہو	۹۲۹ / ۱۲۴
۲۰۴	اللہ کے آگے سر اطاعت جھکانے والا ہی وہ شخص ہے جو نیک عمل کہلا سکتا ہے	۹۳۱ / ۱۲۵
۲۰۵	ابراہیمؑ وہ شخصیت ہیں جو سب سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ کے ہو رہے تھے	″ / ″
۲۰۶	آسمان و زمین کی ہر شے کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے	۹۳۲ / ۱۲۷
۲۰۷	لوگ آپ ﷺ سے عورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو آپ ان کے جواب دے دیں	۹۳۳ / ۱۲۷
۲۰۸	یتیم عورتوں کو کسی کی سرپرستی میں دیئے جانے کا مطلب کیا ہے؟	۹۳۴ / ″
۲۰۹	یتیموں کی نسبت جو حکم تم کو قبل ازیں سنایا گیا تھا اس میں کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی	″ / ″

۲۱۰	میاں بیوی میں ایک دوسرے سے کنارہ کشی کا اندیشہ ہو تو اس میں اصلاح کا پہلو تلاش کرو	۹۳۶	۱۲۸
۲۱۱	مال کے لالچ سے بھی اس طرح کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اس معاملہ میں بھی غور کرو	〃	〃
۲۱۲	دو یا زیادہ بیویوں کے درمیان عدل اتنا آسان بھی نہیں کہ تم اس کو معمولی بات سمجھ لو	۹۳۷	۱۲۹
۲۱۳	اختیاری باتوں میں درستگی سے عمل پیرا رہو اور اللہ کو غفور و رحیم سمجھو	۹۳۸	〃
۲۱۴	اگر اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو انجام کیا ہوگا؟ جدائی ہو جائے گی	〃	۱۳۰
۲۱۵	تم کو اور تم سے پہلوں کو تقویٰ کی وصیت کی اور کہا کہ اگر کفر کرو گے تو نقصان تمہارا ہی ہوگا	۹۴۰	۱۳۱
۲۱۶	کارساز حقیقی وہی ہے اور آسمان و زمین کی حکومت اس کی ہے یہ بات ایک مثال سے سمجھ لو	۹۴۱	۱۳۲
۲۱۷	لوگو! غافل نہ ہو تم کو لے جاکر دوسروں کو لابسانے کا قانون بھی اسکے ہاں موجود ہے	۹۴۲	۱۳۳
۲۱۸	اللہ کے پاس دنیا و آخرت کا ثواب موجود ہے وہ دیکھتا ہے کہ تمہاری چاہت کیا ہے؟	۹۴۴	۱۳۴
۲۱۹	مسلمانوں کو ہدایت کہ انصاف اور سچی گواہی کیلئے تیار رہو آزمائش کسی وقت بھی ہو سکتی ہے؟	۹۴۵	۱۳۵
۲۲۰	گواہی کی اہمیت کو سمجھنے کیلئے زیر نظر آیت کا پڑھنا ہی نہیں سمجھنا بھی ضروری ہے	۹۴۶	〃
۲۲۱	مسلمانوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کرنے کی حقیقت کیا ہے؟	۹۴۸	〃
۲۲۲	اقرار بالسان کا اعتبار اس صورت میں ہوگا جب تصدیق بالقلب بھی ہوگی	۹۵۰	۱۳۶
۲۲۳	بندوں میں جو اپنا اعتبار کھو دیتا ہے اس پر قیاس کر لو جس کا اعتبار اللہ کے ہاں نہ رہا	۹۵۱	۱۳۷
۲۲۴	منافقین کیلئے دردناک عذاب کی بشارت ہے وہ اچھی طرح سن لیں	〃	۱۳۸
۲۲۵	حقیقی عزت تو اللہ' اس کے رسول اور ایمان والوں ہی کیلئے ہے	۹۵۲	۱۳۹
۲۲۶	جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو اس مجلس میں مت بیٹھو	۹۵۳	۱۴۰
۲۲۷	ایسی دل لگی میں تم بھی لگ گئے تو گویا تم بھی وہی کچھ ہوگئے جو کچھ وہ ہیں	۹۵۴	〃
۲۲۸	منافقین ہر وقت اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہارے متعلق کیا خبر گرم ہوتی ہے؟	۹۵۵	۱۴۱
۲۲۹	اس طرح کی چالیں چل کر کیا منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں؟	۹۵۷	۱۴۲
۲۳۰	یہ لوگ نمازوں میں شریک ہوتے ہیں تو ایسے جیسے کوئی مار باندھ کر ان کو لے آیا ہے	۹۵۷	۱۴۲
۲۳۱	یہ مطلب کے یار ہیں نہ ادھر کے ہیں اور نہ ادھر کے	۹۵۹	۱۴۴
۲۳۲	مسلمانوں کو ہدایت کہ کافروں کو دوست مت بناؤ	۹۵۹	۱۴۴
۲۳۳	منافقین کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو دوزخ کے سب سے نچلے حصے کا مستحق ہے	۹۶۰	۱۴۵

۲۳۴	جو نفاق کے مرض سے شفا پاگیا اور سچا مومن ہوگیا اس کا اجر یقیناً محفوظ ہے	۹۶۱	۱۴۶
۲۳۵	اگر تم شکر گزاری اختیار کر لو تو اللہ آخر تم کو عذاب کیوں دے گا	۹۶۲	۱۴۷
۲۳۶	اللہ کے نزدیک منہ کھول کر کسی کی برائی پسندیدہ نہیں۔ ہاں! مظلوم کا حق محفوظ ہے	۹۶۳	۱۴۸
۲۳۷	مسلمانوں کیلئے مزید ہدایت کہ بھلائی کی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو لیکن بدی پر پردہ ہی بہتر ہے	۹۶۴	۱۴۹
۲۳۸	مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کا نسخہ الٰہی کوئی استعمال کر کے تو دیکھے	۹۶۵	۱۴۹
۲۳۹	اللہ اور اس کے رسولوں سے انکار کرنے والوں کا کردار کیا ہے؟	۹۶۶	۱۵۰
۲۴۰	یہ لوگ اپنا نام کچھ رکھیں لیکن عنداللہ پکے کافر ہیں	۹۶۸	۱۵۲
۲۴۱	انکے کفر کا فیصلہ کسی اسمبلی یا عدالت ملکی میں نہیں ہوا دوزخ ان پر لازم کر دی گئی ہے	۹۶۸	۱۵۲
۲۴۲	ایمان والوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ تفریق "بین الرسل" کے قائل نہیں	۹۶۹	۱۵۳
۲۴۳	اہل کتاب کا سوال پیغمبر اسلام سے اور ان کے سوال کا جواب خداوندی	"	"
۲۴۴	انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور نشانات الٰہی کی کوئی پرواہ نہ کی	۹۷۱	۱۵۳
۲۴۵	یہود کی شقاوت کا بیان کہ انہوں نے سیدہ مریم پہ بہتان باندھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی	۹۷۳	۱۵۶
۲۴۶	یہود نامسعود کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے سراسر جھوٹ ہے	۹۶۴	۱۵۷
۲۴۷	یہود تو قتل کے دعویدار تھے ہی تعجب تو یہ ہے کہ نصاریٰ نے بھی اسکی تصدیق کر دی	۹۷۵	"
۲۴۸	حقیقت تو یہ ہے کہ ان پر حقیقت مشتبہ ہوگئی کیا دال میں کچھ کالا تھا؟	۹۷۷	"
۲۴۹	اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کی مکاریوں کا نشانہ بنانے سے بچا لیا	۹۷۹	۱۵۸
۲۵۰	اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے اس پر یقین نہ لے آئے	۹۸۲	۱۵۹
۲۵۱	یہود کی اس گمراہی کا ذکر جس کے نتیجہ میں ان پر حلال چیزوں کو حرام کر دیا گیا	۹۸۴	۱۶۰
۲۵۲	یہودوں کو سود سے منع کیا گیا تھا لیکن وہی دنیا کی پہلی قوم ہے جس نے سود کے طریقے ایجاد کئے	۹۸۵	۱۶۱
۲۵۳	"راسخ فی العلم" لوگ ایمان لاتے ہیں اور ہر ہدایت کو "من اللہ" سمجھتے ہیں	۹۸۷	۱۶۲
۲۵۴	محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت بھی وہی تھی جو دوسرے انبیاء کرام لائے تھے	۹۸۸	۱۶۳
۲۵۵	قرآن کریم میں بعض انبیاء کرام کا ذکر نام بنام آیا ہے اور بعض کا نہیں آیا	۹۹۰	۱۶۴
۲۵۶	انبیائے کرام کا ہر امت میں آنا اس لئے ضروری تھا کہ لوگوں کا کوئی عذر باقی نہ رہے	۹۹۱	۱۶۵
۲۵۷	اگر یہ لوگ سچائی کے منکر ہیں تو اس سچائی کے گواہ اللہ اور اس کے فرشتے ہوں گے	۹۹۳	۱۶۶
۲۵۸	دین حق کے انکاری لوگ اللہ کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں	۹۹۵	۱۶۷

۲۵۹	جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور ظلم کیا ان کیلئے سیدھی راہ گم ہوگئی	۹۹۶	۱۶۸
۲۶۰	ہاں! جہنم کی راہ ان کیلئے کھلی ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رکھے جائیں گے	۹۹۷	۱۶۹
۲۶۱	سارے انسانوں کا رسول آگیا ماننے والے فائدہ میں اور منکرین خسارہ میں رہے	۹۹۸	۱۷۰
۲۶۲	اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرو	۱۰۰۰	۱۷۱
۲۶۳	اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو ورنہ قانون خداوندی کی زد میں آجاؤ گے	۱۰۰۲	۱۷۱
۲۶۴	مسیح عیسیٰ بن مریم سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے	۱۰۰۲	"
۲۶۵	مسیح کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے کلمہ بشارت کا ظہور ہے	۱۰۰۴	"
۲۶۶	یہ کلمہ وہی تو ہے جو سیدہ مریم پر "القا" کیا گیا تھا	۱۰۰۵	"
۲۶۷	وہ ایک "روح" ہے جو اس کی جانب سے بھیجی گئی تھی	۱۰۰۶	"
	"روح منہ" سے جزئیت ثابت نہیں ہوتی غور کریں	۱۰۰۷	"
	"احصنت فرجھا" قرآن کریم کے الفاظ ہیں اور انجیل میں اس طرح بیان ہے	۱۰۰۸	"
	مشاہیر علمائے اسلام کے ارشادات مسیح علیہ السلام کی پیدائش میں	"	"
	اردو خواں حضرات کیلئے مشاہیر علمائے اسلام کے ارشادات	۱۰۰۹	"
	علامہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ پیدائش عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق	۱۰۱۱	"
	قرآن کریم کا بیان موجودہ انسانوں کی پیدائش کے متعلق	"	"
	حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی کے ارشادات پیدائش عیسیٰ کے متعلق	۱۰۱۲	"
	سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح لفظ "ولد" کے متعلق کہ وہ کیا ہے؟	۱۰۱۳	"
	سیدی مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تفہیمات برائے تفہیم حقیقت	۱۰۱۳	"
	دو تحریکوں کا مقابلہ جو موجودہ تحریکوں پر روشنی ڈالتا ہے	۱۰۱۴	"
۲۶۸	پس چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا کہا گیا ہے	۱۰۱۵	"
۲۶۹	باز آجاؤ ایسی بات نہ کہو کہ اللہ تین ہیں یاد رکھو کہ اللہ ایک ہی ہے	۱۰۱۷	"
۲۷۰	اللہ ہی اکیلا معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو	۱۰۱۹	"
۲۷۱	آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اس کا کارساز ہونا بس کرتا ہے	۱۰۲۲	"
۲۷۲	مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بندہ ہونے سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی فرشتوں کو	۱۰۲۳	۱۷۲
۲۷۳	جو لوگ ایمان اور اچھے عمل کریں انکا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا بلکہ وہ انعام بھی پائیں گے	۱۰۲۵	۱۷۳
۲۷۴	جن لوگوں نے انکار و تکبر کی راہ اختیار کی ان کیلئے عذاب الٰہی بھی تیار کھڑا ہے	۱۰۲۵	"

۲۷۵	تکبر کرنے والے جن سہاروں پر تکبر کرتے رہے وہ سب توڑ کر رکھ دیئے جائیں گے	۱۰۲۵	〃
۲۷۶	اے لوگو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان آچکی ہے	۱۰۲۶	۱۷۵
۲۷۷	مخصوص رحمت انہی لوگوں کیلئے ہے جو ایمان لائے اور اس پر قائم رہے	۱۰۲۸	۱۷۵
۲۷۸	کلالہ کیا ہے اور اس کا حکم کیا؟	۱۰۳۰	۱۷۶
۲۷۹	کلالہ کے اگر صرف ایک بہن ہو تو اس کا حکم حصہ میراث میں	〃	〃
۲۸۰	کلالہ اگر عورت ہے اور اس کا صرف ایک بھائی موجود ہو تو اس کا حکم	۱۰۳۱	〃
۲۸۱	کلالہ کے اگر دو بہنیں ہوں تو ان کا حکم حصہ میراث میں	〃	〃
۲۸۲	کلالہ کے اگر بہنیں اور بھائی دونوں ہوں تو اس کی میراث کا حکم	۱۰۳۲	〃

تمت بالخیر

تفسیر عُروۃ الوُثقیٰ

آل عمران
۳

آل عمران

نام سورۃ اس سورہ مبارکہ کا نام "آل عمران" ہے۔ اس سورۃ کی آیت ۳۳ میں "آل عمران" کا لفظ آیا ہے اور یہی اس سورت کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس سورت کا نزول نمبر ۸۹ ہے اور موجودہ ترتیب نمبر ۳ ہے۔ اس سورت میں بیس رکوع اور دو سو آیات کریمات ہیں۔ اس سورت میں ۳۵۴۲ کلمات اور ۱۵۳۲۶ حروف ہیں۔

موضوع سورت نجران سے عیسائیوں کی ایک جماعت نبی اعظم و آخر ﷺ سے مذہبی بحث و مناظرہ کیلئے آئی اکثر حصہ ان کے جوابات کیلئے نازل ہوا اور پھر یہود کی غلط کاریوں سے بھی مطلع کیا گیا اور غزوہ احد کی ہزیمت کے بعد مسلمانوں کی تسلی کیلئے بھی اس میں مضامین دیئے گئے۔

چنانچہ آیت ۱ سے آیت ۹۰ تک جو نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ کا ذکر ہے جس میں اللہ کی توحید اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اللہ کے ایک بندہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کا بیان حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم والدہ عیسیٰ علیہ السلام اور سیدہ مریم کے والد عمران کا ذکر کر کے عیسیٰ علیہ السلام کے بندہ ہونے کی وضاحت کی گئی ہے اور الوہیت عیسیٰ علیہ السلام کا مکمل طور پر رد کیا گیا ہے اور انجام کار عیسائیوں کو دعوت مباہلہ دی گئی ہے۔

آیت ۹۱ سے ۱۱۰ تک کعبہ کی فضیلت اور حج کی فرضیت کا حکم بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۱۱ سے ۱۲۰ تک یہود کی عام خرابیوں کا بیان ہے پھر آیت ۱۲۱ سے ۱۲۹ تک جنگ بدر کا بیان ہے اور آیت ۱۳۰ سے ۱۴۸ تک سود کی صریح ممانعت، دین پر ثابت قدم رہنے اور جنت کے طول و عرض کا بیان ہے اور اس کے انعامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ آیت ۱۴۹ سے ۱۷۹ تک جنگ احد اور اس کے بعد جنگ سویق جس کو بدر صغریٰ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے کا مختصر ذکر کیا گیا ہے پھر آیت ۱۸۰ تا ۱۸۹ بخل کی وعید اور صبر کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے بعد آیت ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ مختلف اشیاء میں وعظ و نصیحت اور کافروں سے مرعوب نہ ہونے اور میدان جہاد میں ثابت قدم رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر سورت کے مضامین کو ختم کر دیا گیا ہے۔

اٰیاتہا ۲۰۰ (۳) سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ (۸۹) رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ۞ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۞ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ

الف[1] لا....م می....م-۱

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں[2]۔ کوئی نہیں مگر اسی کی ایک ذات وہ ہمیشہ زندہ[3] ہے اس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں وہ "القیوم" ہے یعنی ہر چیز اس کے حکم سے قائم ہے اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ ۲

اس نے آپ پر اے پیغمبر اسلام! سچائی کے ساتھ کتاب[4] نازل کی اس سے پہلے

"الٓمّٓ" حروف مقطعات میں سے ہے

[1] حروف مقطعات کی بحث سورہ بقرہ کے حاشیہ "۱" میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ حروف جن سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں ان کے مضامین میں اس بات کی زندہ شہادت موجود ہے کہ ان حروف سے قارئین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آنے والے مضامین پر غور کرو۔ ان کو سرسری نظر سے پڑھ کر آگے مت نکل جاؤ۔ زیر نظر سورۃ ہی پر غور کرو کہ کتنا اہم مضمون ابتدائے سورت ہی سے شروع ہوگیا ہے کہ عیسائی قوم کے لوگو! ذرا خیال کرو کہ تم نے کس طرح مسیح علیہ السلام کو اللہ' اللہ کا بیٹا یا اللہ کا ایک جزء تسلیم کر لیا جب کہ اللہ خالق ہے اور مسیح اس کی مخلوق ہے۔

چنانچہ احادیث اور کتب تفسیر میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے کہ کچھ عیسائی رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے متعلق مناظرہ کرنے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے اس سورہ مبارکہ کی ابتدائی ۸۴ آیات کریمات نازل فرمائیں۔

ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ مجھ سے محمد بن سہل بن ابی امامہ نے کہا کہ جب نجران کے نمائندے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت عیسیٰ بن مریم کے متعلق سوال کرنے کیلئے حاضر ہوئے تو ان کے متعلق سورہ آل عمران کی شروع سے ۸۴ آیات تک نازل ہوئیں۔

پھر اس کی تفصیل بھی تفاسیر میں موجود ہے کہ ان کی تعداد ساٹھ تھی جن میں سے ۱۴ شخص سردار تھے اور پھر ان میں سے تین ان کے لیڈر اور ایک ان سب کا بڑا امیر تھا۔ پھر اس مناظرہ کی پوری تفصیل بھی کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ ہم انشاء اللہ انہی آیات کی تفسیر میں آگے چل کر اس کا مفصل بیان کریں گے۔

عرب کا نقشہ سامنے ہو تو جنوب میں جو علاقہ یمن کے نام سے موسوم ہے اس میں ایک مقام نجران کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت یہ آبادی مسیحیوں کی تھی ۱۰ھ میں ان کے ۱۴ اکابر وفد کی صورت میں جن کی کل تعداد ساٹھ کے قریب تھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دوران گفتگو ان کے عقائد تثلیث و ابنیت کی تردید ان ہی کی زبان سے واضح طور پر کرا دی۔ جس مقصد کو لے کر وہ حاضر ہوئے اس میں بری طرح ناکام ہوئے اور ایسے بھاگے کہ پھر کبھی اس بحث کو اٹھانے کا نام بھی نہ لیا۔ سورہ آل عمران میں جابجا اشارے اسی طرف پائے جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں جس طرح اصل خطاب بنی اسرائیل کی شاخ یہود سے تھا اسی طرح اس سورہ مبارکہ میں خطاب بنی اسرائیل کی شاخ نصاریٰ سے ہے اور اکثر مسیحیوں ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں

۲ نادان لوگوں نے اپنی اپنی جگہ چاہے کتنے ہی الٰہ اور معبود بنا رکھے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلا شرکت غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے زندہ ہے اور صرف یہی نہیں کہ وہ بذاتہ زندہ ہے بلکہ اس کے بل بوتے پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا خواہ وہ کوئی ہو' نہ اس کی صفات میں اس کا شریک ہے نہ اس کے اختیارات میں اور نہ ہی اس کے حقوق میں۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر زمین و آسمان میں جہاں بھی کسی اور کو معبود یعنی الٰہ بنایا جا رہا ہے سراسر ایک جھوٹ گھڑا جا رہا ہے جس کا سر ہے نہ پاؤں بلکہ یہ حقیقت کے خلاف ایک جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اللہ وہ ذات ہے جس کو فنا و زوال نہیں

۳ اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جس کو فنا و زوال نہیں۔ ہر چیز اس سے قائم ہے۔ وہ اپنے قیام کیلئے کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے حَیٌّ وَقَیُّوْمٌ ہونے کا مقتضیٰ یہی تھا کہ انسان کی زندگی و قیام کی تمام احتیاجات مہیا کر دے۔ پھر ظاہر ہے کہ احتیاجات دو طرح کی ہیں۔ جسمانی اور روحانی اس نے جس طرح پہلی کا انتظام کیا اسی طرح دوسری کا بھی سروسامان کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے روحانی احتیاجات کیلئے انسان کو دو چیزیں دیں "اَلْکِتَابُ" "اَلْفُرْقَانُ"۔ "الکتاب" اللہ

تعالیٰ کی وحی ہے جو ہدایت و سعادت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ "الفرقان" جوہر عقل ہے جو اسے سمجھتا اور قبول کرتا ہے۔ پہلی چیز تعلیم ہے اور دوسری کو تعلیم کی استعداد کہا جاتا ہے۔ پہلی ہدایت کی قوت فاعلہ ہے اور دوسری قوت منفعلہ۔

"اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" سے توحید کی عقلی دلیل بیان کی گئی ہے جس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عبادت نام ہے اپنے آپ کو کسی کے سامنے انتہائی عاجز و ذلیل کر کے پیش کرنے کا اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس کی عبادت کی جائے وہ عزت و جبروت کے انتہائی مقام کا مالک ہو اور ہر اعتبار سے وہ کامل بھی ہو اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے اپنے وجود اور اس کی بقاء میں دوسروں کی محتاج ہو اس کا عزت و جبروت میں کیا مقام ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جب دنیا میں جتنی چیزیں ہیں نہ خود اپنے وجود کی مالک ہیں اور نہ ہی خود اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں۔ وہ خواہ کون ہوں؟ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں یا وہ شخصیتیں جن کے یہ بت بنائے گئے۔ وہ پانی اور درخت ہوں یا فرشتے اور رسول ان میں سے کوئی ہے جو خود اپنے وجود کا مالک ہو؟ کون ہے جو خود اپنے وجود کو قائم رکھ سکے؟ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ان میں کوئی لائق عبادت بھی نہیں۔ لائق عبادت تو وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے زندہ اور موجود ہے اور ہمیشہ زندہ اور قائم رہے گی۔ وہ تو صرف اور صرف وہی ہے جس کو ہم "اللہ" کے نام سے پکارتے ہیں اور یاد کرتے ہیں۔ اس لئے اس کے سوا کوئی نہیں جو عبادت کا لائق ہو۔

"الکتاب" کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے

۴ رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی "الکتاب" وہی ہے جس کو قرآن کریم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دنیا میں اس وقت ہدایت و سعادت کی طرف راہنمائی کرنے والی کتاب صرف اور صرف قرآن کریم ہی ہے۔ کیونکہ اس میں اس سے پہلے نازل شدہ کتابوں کی تعلیم بھی مکمل طور پر آگئی ہے۔ پہلی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل کی گئیں تھیں لیکن ان کے ماننے والوں نے ان میں اس قدر تحریف کی کہ حق و باطل کو ملا کر رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کی زبان بھی محفوظ نہ رہی۔ آج وہ اپنی اصل شکل و صورت میں موجود ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن کریم نازل فرما کر جس قدر ان گزشتہ کتابوں میں حق باقی رہ گیا تھا اس کو اسی "الکتاب" میں محفوظ کر دیا ہے۔ قرآن کریم گویا مجموعہ ہے ان سب تعلیمات کا جو اس سے پہلے آسمان کی طرف سے دنیا میں منتقل ہوئی تھیں۔ تورات میں ہو یا انجیل اور زبور ہو یا صحائف ابراہیمی ان کی وہ الٰہی تعلیم اس قرآن کریم "الکتاب" میں موجود ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اب خود نازل کرنے والے نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس کتاب میں تحریف ممکن ہی نہیں۔ ترجمہ و تفسیر میں خواہ جو کچھ ہو لیکن اس کو اصل متن قرآنی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی اور "الکتاب" وہی قرآنی متن ہے نہ کہ ترجمہ و تفسیر۔ اسی چیز کو قرآن کریم نے دوسری جگہ

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۞ مِن

جس قدر کتابیں[۵۵] نازل ہو چکی ہیں ان سب کی تصدیق[۵۶] کرنے والی یعنی توراۃ و انجیل کی تصدیق کرنے والی ہے۔ ۳

بیان فرمایا ہے :

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المائدہ ۵ : ۴۸)

"اور اے پیغمبر اسلام! اس طرح ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو پہلے سے موجود ہیں اور یہ کتاب قرآن کریم ان پر جو اس سے پہلے کتابیں نازل ہو چکی ہیں نگہبان ہے۔

قرآن کریم تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے

۵۵ یہ گویا قرآن کریم کی نقلی دلیل بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا مضمون جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے یہ کچھ قرآن کریم کی یا پیغمبر اسلام ﷺ کی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تورات و انجیل اور دوسری کتب آسمانی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہیں ان سب کا یہی دعویٰ ہے اور یہی کچھ ان سب میں بیان کیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے کیا کیا؟ یہی کہ آکر ان سب کی تصدیق کر دی اور کوئی نیا دعویٰ نہیں کیا جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی الجھن پیش آئے۔ اب اگر کوئی اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتا تو وہ خود سوچے کہ اس نے تسلیم نہ کر کے قرآن کریم کا کیا بگاڑا۔ جو بگاڑا اس نے اپنا ہی بگاڑا کیونکہ اس نے جو قرآن کریم کی مخالفت کی تو گویا دراصل اس نے مخالفت اپنی ہی کتاب کی کی۔ اگر وہ تورات کو مانتا ہے تو اس کی اور انجیل کو مانتا ہے تو اس کی اور اس طرح وہ "اپنا منہ اپنی چپیڑ" کا مصداق ہوا ہے اور ان سب مخالفین کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے کہ "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" انہوں نے قرآن کریم کو جھٹلا کر خود اپنی تسلیم شدہ کتابوں پر اپنے ہاتھوں لکیر کھینچ دی ہے۔

قرآن کریم کی تصدیق کا مطلب کیا ہے ؟

۵۶ وضاحت اس کی کیا ہے؟ اہل کتاب کی طرف سے یہ سوال بطور اعتراض کیا جاتا تھا کہ تورات و انجیل کے ہوتے ہوئے قرآن کریم کی کیا ضرورت تھی؟ آگے چل کر اس سورت میں اس کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ آئے گا مگر یہاں بھی اس کی اصل اور مین (Main) وجہ بتا دی ہے اور اس طرح بتائی ہے کہ

قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

اور قرآن کریم سے پہلے توراۃ[۶] و انجیل[۷] بھی لوگوں کی ہدایت ہی کے لئے نازل کی گئی تھیں۔ یہ کتاب یعنی قرآن کریم حق و باطل میں امتیاز کرنے والی نازل فرمائی[۹] ہے لیکن

اب ان دونوں فریقوں کو سر کھجلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ جواب دیا ہے اور ایسا دیا ہے کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور سوال پر سوال کرنے کے عادی اوپر نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکے۔ قرآن کریم کا یہی وہ معجزہ ہے جس نے دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کو سرگرداں کر دیا' وہ سوچتے ہیں اور سوچتے ہی چلے جاتے ہیں ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور زبانیں ہیں کہ کچھ بول نہیں سکتیں۔ اب جواب کو دیکھو کہ کتنا مختصر اور کتنا جامع؟ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس کے نازل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو رسول اللہ ﷺ کے متعلق پیش گوئیاں تھیں ان کی تصدیق کیلئے ضروری تھا کہ یہ کتاب نازل ہوتی گویا سابقہ وحی الٰہی یعنی تورات و انجیل بغیر نزول قرآن خود سچی نہ ٹھہرتی تھیں۔ قرآن کریم نے نازل ہو کر ان پیش گوئیوں کی تصدیق کر کے جو تورات و انجیل میں بیان کی گئی تھیں ان کے سچا ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا اور تم بھی عجیب لوگ ہو کہ تم ہی یہ اعتراض کرتے ہو کہ قرآن کریم کے نازل ہونے کی ضرورت کیا تھی؟ کوئی کہتا جو کچھ کہتا لیکن تم کو تو یہ بات زیبا نہیں تھی۔ تم ہی سوچ لو کہ تم نے کیا کہہ دیا؟ افسوس کہ تم نے اس شیشہ میں ذرا اپنا منہ دیکھ لیا ہوتا۔

تورات وہی کتاب ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی

۶ "التوراۃ" اس لفظ کے عبرانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن عربی اور عبرانی زبانیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یہ لفظ بھی ان دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک توریت "وری" سے ہے اور کوفیوں کے نزدیک اصل میں "تفعلة" کے وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فوعل کے وزن پر جس کا اصل "ووراۃ" تھا اور و ت سے قاعدہ کے مطابق بدل گئی اور "وری" کے معنی آگ نکلنے کے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے "اَلنَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ" (الواقعہ ۵۶ : ۷۱) اور واریت کے معنی "سترت" ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا جس سے قرآن کریم میں ہے کہ "لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ" (الاعراف ۷ : ۲۶) یا "حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ" (ص ۳۸ : ۳۲) پس توریت کو توریت یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثل ہے یعنی بڑی مشقت سے اس میں کچھ روشنی پیدا ہوتی ہے جیسے ابتدائے تاریخ عالم میں پتھر سے آگ نکالی جاتی تھی اور اس کے بالمقابل قرآن کریم کو اللہ نے ایسا نور بیان فرمایا کہ "يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ" (النور ۲۴ : ۳۵) کہ اس کا تیل اتنا صاف و شفاف ہے کہ خود بخود جل اٹھتا ہے گو اسے آگ نہ بھی چھوئے اس

لئے توریت کو توریت کہتے ہیں کہ اس میں بعض مضامین مستتر یعنی چھپے ہوئے اور مخفی حالت میں تھے۔ اس طرح اس پر جتنا غور کرتے جاؤ گے اتنے ہی حجاب کھلتے جائیں گے اور توریت کا توریت ہونا اور قرآن کریم کا قرآن کریم ہونا واضح ہوتا جائے گا اور یہ بات بھی بالکل سچ ہے کہ توریت کے مخفی مضامین کو قرآن کریم نے کھول کھول کر رکھ دیا ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس کے آنے کے بعد دنیا میں ایک قسم کی روشنی ہوگئی ہے اگرچہ آج اس کے ماننے والے خود اندھیرے میں رہ گئے ہیں لیکن اگر ہم اپنے اسلاف پر نظر کریں تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ ہمارے ہی آباء تھے اور اس قرآن کریم کے پڑھنے والے تھے جن کے توسط سے یہ روشنی پیدا ہوئی۔ ان شاطر قوموں نے ہمارے ہی "دیئے" سے اپنا "دیا" روشن کیا تھا مگر چالاکی یہ کی کہ اپنا "دیا" روشن کر کے ہمارا "گل" کر دیا۔

توریت اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ قرآن کریم نے ایک جگہ اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر نازل ہونے کا بھی ذکر فرمایا ہے "وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ" (والصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۱۷) "اور ہم ان دونوں کو واضح کتاب عطا کی" جیسا کہ آج بھی یہ موجود کل پانچ کتابیں ہیں جو بائبل کی ابتداء ہی میں موجود ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں :-

"پیدائش" جس کا دوسرا نام تکوین بھی ہے۔ "خروج" ۔ "احبار" ۔ "اعداد" جس کا دوسرا نام "گنتی" ہے۔ "استثناء" البتہ پرانے نسخوں میں پانچ کتابوں کی تقسیم نہیں ہے بلکہ پیدائش سے لے کر استثناء تک ایک ہی مجموعہ ہے جس کو کئی چھوٹے اور بڑے ابوابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اسی تورات کو نور و ہدایت فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷ : ۲)

"اور اس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کیلئے ہدایت کا ذریعہ ٹھہرایا اور حکم دیا کہ دیکھو! میرے سوا اور کسی کو اپنا کارساز نہ ٹھہراؤ۔" اور ایک جگہ ارشاد ہوا :

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (المائدہ ۵ : ۴۴)

"بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اللہ کے نبی جو احکام الٰہی کے فرمانبردار تھے اسی کے مطابق یہودیوں کو حکم دیتے رہے۔ نیز ربی و احبار یعنی یہود کے علماء و مشائخ بھی اس پر کاربند رہے کیونکہ وہ کتاب اللہ پر محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کے حکموں پر گواہ تھے۔"

انجیل وہی کتاب ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی

۸ "الانجیل" عربی اور سریانی دونوں زبانوں میں یہ لفظ اسی تلفظ سے استعمال ہوتا ہے جس کے معنی

خوشخبری کے ہیں۔ اہل عرب نے انجیل کا مادہ "نجل" سے لیا ہے اور "نجل" کے معنی نسل اور ولد کے بھی ہیں۔ نجلت الارض کے معنی ہیں کہ میں نے زراعت کیلئے اس کو پھاڑا۔ انجیل کی جمع اناجیل ہے اور حدیث میں صحابہ کرامؓ کی صفت میں آتا ہے "صُدُوْرُهُمْ اَنَاجِيْلُهُمْ" ان کے سینے ان کی انجیلیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ انجیل بمعنی بشارت سے ہی ماخوذ ہو اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "صحابہ کے سینے بشارتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔" یا یہ کہ جو عظیم الشان بشارت انجیل لائی تھی وہ اب صحابہؓ کے سینوں میں ہے۔ کیونکہ وہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کے ظہور کی تھی۔

انجیل قرآن کریم کے نزدیک وہ کتاب ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور جس شکل و صورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے۔ گو وہ چار کتابیں جو عیسائیوں کی اصطلاح میں اناجیل کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے کوئی بھی عیسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار الگ الگ اشخاص کی تصنیفات ہیں۔ ایک "متی" کی۔ ایک "مرقس" کی۔ ایک "لوقا" کی اور ایک "یوحنا" کی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بائبل صرف توریت و اناجیل کے مجموعہ کا نام نہیں یہودیوں کے نزدیک تو بائبل اس مجموعہ کا نام ہے جس کے شروع میں حضرت موسیٰؑ کی پانچ کتابیں ہیں اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں انبیاء کی وہ اس میں شامل کرتے ہیں ایوب، یونس، حزقیل، دانیال وغیرہ کی کتاب کے علاوہ حضرت داؤد کی زبور بھی اس مجموعہ میں شامل ہے اور بعض کتب کی شمولیت کے متعلق اختلاف بھی چلا آیا ہے یعنی عام مروج نسخہ میں ۳۵ کتابیں شامل ہیں جو سپٹو ایجنٹ نسخہ میں ہیں اور عیسائی اس مجموعہ کا نام تو پرانا عہد نامہ رکھتے ہیں اور ہر چہار اناجیل اور "اعمال" "حواریین" اور "پولوس" اور دیگر رسولوں کے خطوط اور مکاشفات یوحنا کے مجموعہ کو نئے عہد نامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پھر پرانے اور نئے عہد نامہ کل کو بائبل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس الہامی کتاب کی بھی عجیب کیفیت ہے کہ کتابوں کی کتابیں بعض نسخوں میں شامل ہیں اور بعض سے خارج کر دی گئی ہیں۔

اناجیل کے متعلق جیسا کہ ذکر ہوا عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ صرف مسیح ہی کی کوئی انجیل نہیں بلکہ وہ چار اناجیل جو ان کے پاس ہیں وہ بھی ان لوگوں کی لکھی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں پر وہ مشہور ہیں بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور لوگ ہیں۔ متی کی انجیل کی تصنیف پر بحث کرتا ہوا پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھا ہے "جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے۔" (ص ۶۲۰) اور آگے چل کر دکھایا ہے کہ متی نے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کئے ہوں گے جس کو اسی مصنف نے استعمال کیا ہے اور اس کا تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں ۷۰ عیسوی ہے مگر واقعات سے ۱۵۰ عیسوی سے پیشتر مروجہ اناجیل اربعہ میں سے کسی کی انجیل کا کتاب کی صورت میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لوقا اور مرقس کی اناجیل کو عموماً ان مصنفوں کا سمجھا گیا ہے مگر نئی تحقیقات کی رو سے ان اناجیل کے

مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال یوحنا کی انجیل کا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے آخر میں لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود توریت و انجیل کا لفظ اپنی ظاہری صورت سے ان کتابوں پہ بولا جا سکتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں بلاشبہ وہ محرف ہو چکی ہیں اور اس بات پر خود اہل کتاب کو بھی اتفاق ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں اب بھی کچھ نہ کچھ سچ موجود ہے۔ جو ان عبارات کو پڑھنے سے واضح ہوتا جاتا ہے اور سب سے بڑی ہدایت ان میں یہی موجود ہے کہ دونوں کتابیں نبی کریم ﷺ کی آمد کی پیش گوئیاں بیان کرتی ہیں اور انجیل تو صاف طور پر کہتی ہے کہ "کامل ہدایت کی راہیں سکھانے والا میرے یعنی مسیح کے بعد آنے والا ہے۔" اس لئے قرآن کریم نے انجیل کی بہت جگہ پر تصدیق کی چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے :

قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (المائدہ ۵ : ۴۶) "پھر ان نبیوں کے پیچھے انہی کے نقش قدم پر ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تورات کی جو پہلے سے موجود تھی سراسر تصدیق ہے اور متقی انسانوں پر سعادت کی راہ کھولنے والی ہے اور یکسر پند و نصیحت۔"

قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جو "الفرقان" کہلانے کی مصداق ہے

۹ قرآن کریم الفرقان کیسے؟ "الفرقان" یعنی نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والی قوت قرآن کریم ہی ہے۔ "فرقان" دراصل حق و باطل میں فرق کو کہتے ہیں جیسے امام راغب نے المفردات میں بیان کیا ہے کہ قرآن کریم میں جنگ بدر کو بھی فرقان کہا ہے "يَوْمَ الْفُرْقَانِ" (الانفال ۸ : ۴۱) اور خود قرآن کریم کو بھی فرقان کہا گیا ہے۔ "تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ" (الفرقان ۲۵ : ۱) مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنے کا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان ہی کہا "اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا" (الانفال ۸ : ۲۹) قرآن کریم کے ناموں میں سے ایک نام "فرقان" بھی ہے۔ گو پہلے قرآن کریم کے نزول کا ذکر فرمایا جا چکا ہے مگر دوبارہ دوسرے لفظ کو لا کر بیان کرنے سے خاص مقصود ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کتاب مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوئی ہے یعنی ضرورت حقہ کو پورا کرنے والی ہے۔ اس جگہ توریت و انجیل کا ذکر کر کے ان کی تحریف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس کو بتفصیل سورہ بقرہ میں بیان کر دیا تھا تو اس لئے جب تحریف ہو گئی تو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کوئی کتاب نہ رہی پس اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کو نازل کیا کہ اس سے حق و باطل میں فرق واضح ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہو گیا اور اس وجہ سے قرآن کریم کو "الفرقان" کہا گیا ہے۔

اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۞ إِنَّ اللّٰهَ

جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں[۱۰] یقیناً انہیں سخت عذاب ملنے والا ہے اور اللہ سب پر غالب اور مجرموں کو سزا دینے والا ہے[۱۱]۔ ۴

اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والے کون ہیں؟

۱۰ اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کو اللہ کی کتاب ماننے سے انکار کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول ماننے سے منکر ہوگئے۔ اس لئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنی کتابوں نے پیش گوئی کے طور پر بتا دیا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت ہوگی۔ یہ وہی لوگ ہیں جو لوگوں کے سامنے وقتاً" فوقتاً" یہ بیان کرتے رہتے تھے۔ سورہ بقرہ میں اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے اب ان ہی لوگوں نے انکار کرنے میں پہل کر دی حالانکہ ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی موجود نہ تھی۔ ایک ایک کرکے وہ سب نشان دیکھ چکے تھے جو نبی کریم ﷺ کی بعثت کے متعلق ان کو بتائے اور پڑھائے جاتے تھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ان لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پہچان لیا ہے جس طرح انسان اپنی اولاد کو پہچانتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ پختہ دلائل سے ان کو معلوم ہے۔ اس وقت یہ جو تسلیم نہیں کر رہے تو صرف ان کو یہ دکھ کھا گیا ہے کہ آنے والے رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا تعلق بنی اسرائیل سے کیوں نہیں۔ حالانکہ یہ بات بھی ان پر واضح کر دی گئی تھی کہ اس کا تعلق "تمہارے بھائیوں" سے ہوگا تم سے نہیں اور ظاہر ہی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی تو بنی اسماعیل ہی تھے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا تعلق بھی بنی اسماعیل ہی کے ساتھ تھا اور آپ ﷺ ذریت ابراہیمؑ ہی سے متعلق تھے۔

اللہ تعالیٰ مجرموں کو سزا دینے پر قادر ہے

۱۱ اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات میں سے ایک اسم "منتقم" اور "ذوانتقام" ہے یعنی سزا پہنچانے والا۔ سزا دینے والا۔ مجرم کیلئے اس وقت تک تو گنجائش موجود ہے جب تک کہ وہ زندہ ہے کیونکہ کسی وقت بھی وہ اپنے جرم سے تائب ہو سکتا ہے اور تائب کے متعلق اسلام کا فیصلہ ہے کہ توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے جرم کیا ہی نہیں اور توبہ نام ہے اقرار جرم کرنے کے بعد آئندہ وہ کام نہ کرنے کا اقرار کرنا اور اس طرح معافی اس چیز کا نام ہے کہ جو اس فعل کی سزا اس کو ملنا تھی وہ نہ دے کر اس کو معافی دی جائے۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے اور بخش دے اور معاف فرما دے اس کو کون روک سکتا ہے؟ ہاں! جہاں اس نے اعلان فرما دیا کہ اس مجرم نے اگر جرم سے توبہ نہ کی اور بغیر توبہ کئے جرم کرتا ہی مرگیا تو اس کو معاف نہیں کیا جائے

لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ

بلاشبہ اللہ کے علم سے کوئی بات پوشیدہ[۱۲] نہیں وہ زمین میں ہو یا آسمان میں ہو۔[۱۳] ۵

یہ اسی کی کارفرمائی[۱۴] ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق ماں کے

گا جیسے شرک کرنے والا تو یقیناً ایسا ہی ہوگا کیونکہ فیصلہ الٰہی کے خلاف ممکن نہیں ہو سکتا۔ مجرموں کیلئے سزا اس لئے لازم ہے کہ انہوں نے توبہ نہ کی اور جرم کرتے کرتے مر گئے۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جہاں وہ رحمٰن، رحیم اور رؤف ہے وہاں وہ عادل بھی ہے اور صفت معدلت کا اظہار مجرموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں سزا و انتقام ہی ہو سکتا ہے۔ اسے سزا دینے میں ہرگز کوئی عار نہیں آتا کہ اس عار سے بچنے کیلئے اسے مسیحیت کے عقیدہ کی طرح مصلوبیت اور کفارہ کے پیچ در پیچ راستے اختیار کرنے پڑیں۔ جن لوگوں نے اپنے خدا کو صرف رحیم ہی رحیم مانا ہے ان کا خدا کامل نہیں بلکہ ناقص ہے۔

خیال رہے کہ سورہ کا اصل موضوع مسیحیت کی تردید ہے اس لئے عموماً ایسی ہی صفات کا اثبات کیا گیا ہے جن سے مسیحیت ہی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرب لگے۔ عزیز یعنی سزا دینے پر قادر ہے اور ہر حال میں سب سے بالادست اور قوی تر ہے۔ وہ مسیحیوں کا خدا نہیں کہ انسانی قالب اختیار کر کے طرح طرح کی کمزوریوں اور بیچارگیوں کا شکار بن جائے اور دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر سولی پر موت تک پائے۔ اس کی صفت عزیزیت اس تخیل ہی سے انکار کرتی ہے۔

علم الٰہی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے

۱۲ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کو مخصوص الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے اور غرض دراصل حضرت مسیح کی صفات باری سے عاری ہونے کا بیان ہے۔ قرآن کریم کا یہ معجزہ ہر وقت اور ہر حال میں ذہن نشین رہنا چاہئے کہ وہ جس بات کو بیان کرنا چاہتا ہے اس کو ہمیشہ ایسے لطیف طریق پر بیان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ناگوار نہ گزرے اور جو کچھ اس کو کہنا ہے وہ کہہ بھی دے۔ پھر وہ ایک لفظ میں بہت سا مضمون بیان کر دیتا ہے۔ اس جگہ غور کرو کہ بجائے اس کے کہ یہ بیان فرماتا کہ مسیح کو کوئی علم نہ تھا مگر اتنا ہی جتنا کہ ایسے برگزیدہ انسانوں کو ہوتا ہے اور پھر اناجیل سے اس طرح کی مثالیں پیش کرتا جو یقیناً اب بھی مل سکتی ہیں۔ لیکن اس موضوع کو اس طرح بیان فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے گویا عیسائیوں کو یہ بتا دیا کہ مسیح پر بہت سی چیزیں مخفی تھیں۔ اگر اس طرح بیان کرتا تو بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے

نہایت ہی میٹھا اور پیارا انداز بیان اختیار کیا کہ مسیح علیہ السلام کا نام بھی نہیں لیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہا جا سکتا تھا کہ مسیح انسان ہے مخلوق ہے نہ خالق و الٰہ۔ حالانکہ ان کی اپنی کتاب انجیل میں ایسا بیان موجود ہے جو یہ بتاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر بہت کچھ مخفی تھا مثلاً انجیر کے وقت کا واقعہ جو آج بھی انجیل میں ان الفاظ کے اندر موجود ہے کہ :

"دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور اس نے دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر اس کی طرف گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔" (مرقس ۱۱ : ۱۲، ۱۳)

اس واقعہ پر غور کرو اور ان الفاظ کو دیکھو کہ "شاید اس میں کچھ پائے۔" اور "انجیر کا موسم نہ تھا" قابل غور ہیں یا نہیں؟ حضرت مسیح کو باوجود انجیر کا موسم نہ ہونے کے یہ خیال تھا کہ شاید وہاں کچھ انجیریں مل جائیں کس قدر علم کی عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تو عملی اعتراف عجز ہے دوسری جگہ لفظوں میں بھی اپنے علم کے ناقص ہونے کا اظہار کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ :

"لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے، نہ بیٹا مگر صرف باپ۔"
(متی ۲۴ : ۳۶)

قرآن کریم نے یہ للکار کر بتایا کہ جو کچھ جانے اور کچھ نہ جانے وہ "الٰہ" اور "رب" نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ جاننا ایک نقص ہے اور اللہ ہر نقص سے پاک ہے وہ اللہ کاہے کو اللہ ہوا جس کو کچھ علم ہو اور کچھ نہ ہو۔ یاد رکھو کہ علم باری ہر حیثیت سے کامل ہے اور ہر چھوٹی اور بڑی چیز پر حاوی ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا :

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (ابراہیم ۱۴ : ۳۸) "اے ہمارے رب! ہم جو کچھ چھپاتے ہیں وہ بھی تو جانتا ہے جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ بھی تو جانتا ہے۔ آسمان و زمین کی کوئی چیز نہیں جو تجھ سے پوشیدہ ہو۔"

یہاں آسمان و زمین کا مخصوص ذکر کیوں؟

۱۳ "الارض والسماء" آسمان و زمین کے نام اس سلسلہ میں اسلیے لئے گئے ہیں کہ علم انسان کی وسعت گرفت انہی حدود کے اندر محدود ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ دراصل خطاب مسیحیوں سے ہے کہ تم جو مسیح کو خدا مانتے ہو تو بتاؤ ان کا علم کامل کیسے تھا؟ اور خدا نے بندہ کی شکل اختیار کر کے کیسے اتنا بڑا نقص اپنے اندر گوارا کر لیا؟ گویا اللہ کو جس نے اپنے وہم کے مطابق کوئی شکل و صورت دی جیسے مسیحیوں نے مسیح کو رب بھی کہا اور انسان کی شکل و صورت بھی دی انہوں نے اللہ کو ناقص بنا دیا کیونکہ وہ شکل و صورت کا محتاج ہوا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو محتاج ہو وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ سورۃ کے شروع میں ذکر کیا گیا ہے کہ ان آیات کریمات کا اصل نکتہ نظر سیدنا مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی نفی اور اس کی عبدیت کا اثبات ہے اور اس کیلئے پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں کا دل بھی نہ دکھے اور بات بھی سچ سچ کہہ دی جائے نہ تو بات میں کسی قسم کی لچک ہو کہ اس کو ذو معنی بنایا جائے اور نہ ہی طریقہ بیان ایسا اختیار کیا جائے کہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی بڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آیات کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مسیح کی خدائی کے خلاف استدلال بھی ہو اور نصاریٰ "نہ" کا لفظ بھی استعمال نہ کر سکیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مسیح کی الوہیت کا رد اس انداز سے فرمایا کہ سرداران مسیحیت اس رد الوہیت میں شریک ہو کر "ہاں" "ہاں" کی صدائیں بلند کرتے رہے اور انجام کار جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ "پھر تم ہی بتاؤ کہ جو تم دعویٰ کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے؟" تو وہ ایسے دم بخود ہوئے کہ ان کو بھاگنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا اور ایسے گئے کہ پھر کبھی آنے کا نام بھی نہ لیا۔ چنانچہ ابن جریر نے ربیع سے روایت بیان کی ہے کہ :

"نصاریٰ کی جماعت کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ ابن مریم کے متعلق آپ ﷺ سے بحث کی اور آپ ﷺ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے؟ اور اللہ پر بہتان اور جھوٹ کہا۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس نے اپنی بیوی بنائی ہے اور نہ ہی بیٹا تو نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا مگر وہ اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا اور عیسیٰ علیہ السلام پر فنا آئے گی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے پھر فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے اور اس کی نگہبانی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چیزوں پر اختیار رکھتا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان و زمین کی کوئی چیز پوشیدہ و مخفی نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں! فرمایا کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چیزوں میں سے کچھ جانتا تھا سوائے اس کے جس کا علم اسے دیا گیا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰ علیہ السلام کی صورت جس طرح چاہا اس کی ماں کے رحم میں بنائی اور آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھانا نہیں کھاتا اور پانی نہیں پیتا اور نہ ہی قضائے حاجت کرتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے۔ پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے۔ پھر اس کو غذا دی گئی جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے اور پھر وہ کھانا کھاتا تھا۔ پانی پیتا تھا۔ قضائے حاجت کرتا تھا انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا پھر جو تم دعویٰ کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے؟

غور کریں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت، پیدائش اور ان کی بندگی کے متعلق کون سی بات تھی جس کی

وضاحت نہ فرما دی اور الوہیت عیسیٰ کی کس طرح تردید کر دی لیکن افسوس کہ اہل اسلام کے علماء نے بھی کیا سمجھا اور کس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو مافوق الفطرت بنانے کی کوشش کی اور رسول اللہ ﷺ کے ان واضح ارشادات کو کس طرح پس پشت ڈال دیا اور لکیر کے فقیر ہو کر اکیر پیٹتے چلے گئے۔

اللہ ہی وہ مصور ہے جس نے سب کی تصویریں بنائیں

۱۴ "یصور" تصویر صورت بنانے کا نام ہے اور صورۃ وہ ہے جس سے کسی چیز کے "عین" کا نقش ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ دوسری اشیاء سے الگ ہو جاتی ہے او ریہ دو طرح پر ہے ایک محسوس جسے خاص و عام بلکہ حیوان بھی پہچانتے ہیں اور دوسرے معقول جسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں جیسے وہ صورت جس سے انسان مخصوص ہے یعنی عقل و رویہ اور وہ معانی جن سے ایک شے دوسری سے مخصوص ہوتی ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کی صورت بنانے کا ذکر ہے وہاں یہ دونوں صورتیں مراد ہوتی ہیں (امام راغب) جیسے خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف ۷ : ۱۱) "ہم نے تمہیں پیدا کیا تمہاری صورتیں بنائیں اور بہتر سے بہتر صورتیں بنائیں۔"

فِیْ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار ۸۲ : ۸) "پھر جیسی صورت بنانا چاہی اس کے مطابق ترکیب دے دی۔" اور ایک حدیث میں فرمایا "ان اللہ خلق ادم علی صورتہ" یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک خاص صورت پر پیدا کیا۔ یعنی انسان کی ایک مخصوص صورت بنائی یعنی وہ ہیئت جس کا ادراک آنکھ سے اور عقل سے ہوتا ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت ہے۔ (راغب)

یاد رہے کہ اس جگہ صورۃ میں "ہ" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ کیلئے نہیں یا اس لئے نہیں کہ نعوذ باللہ اللہ کی بھی کوئی صورت ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ صورت سے بھی پاک ہے اور تشبیہ سے بھی پاک ہے بلکہ علی سبیل الملک ہے یعنی اس کی ملک ہونے کے لحاظ سے اور علیٰ سبیل التشریف یعنی اس کی عزت کے لحاظ سے جیسے بیت اللہ' ناقۃ اللہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کہ وہ انسان کی صورت رحم میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ تمہاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے نہ تم خود جان سکتے ہو لہٰذا اس کی راہنمائی پر اعتماد کئے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس نے تمہارے استقرار حمل سے لے کر بعد کے تمام مراحل تک ہر موقع پر تمہاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا ہے کس طرح ممکن تھا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمہاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو تو وہ یہی ہے۔

اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ وہ ذات کیسی ذات ہے جس نے کئی قسم کی تاریکیوں میں انسان کی نہ صرف جسمانی بلکہ اس کی اخلاقی اور روحانی تصویر بھی بنا دی ہے جیسے دوسری جگہ

يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ

شکم میں تمہاری صورت بنا دیتا ہے یقیناً کوئی معبود یعنی صورت بنانے والا نہیں ۱۵ مگر وہی جو

ارشاد الٰہی ہے :

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (الزمر ۳۹ : ۶) "وہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں یعنی پردوں میں ایک شکل کے بعد دوسری شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے اس کی سلطنت ہے۔"

ایک طرح سے یہ بھی الوہیت مسیح کے بطلان کی دلیل ہے جیسا کہ گزشتہ حاشیہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو حالات دوسرے انسانوں پر گزرتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی گزرے ہیں ان پر بھی رحم مادر میں وہ سب حالتیں یکے بعد دیگرے آئیں جیسا کہ دوسرے انسانوں پر آتی ہیں۔

مصور حقیقی اللہ ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں

۱۵ "الٰہ" کے معنی اس جگہ یہی ہو سکتے ہیں کہ وہی "مصور حقیقی" ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جو صورت بنانے والا ہو۔ وہی سب کی تصویریں بنانے والا ہے اور وہی خالق ہے اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ ہر ایک جملہ گویا کہ الوہیت عیسیٰ کے انکار میں بیان ہوا ہے اور اس طرح بیان ہوا ہے کہ اس کو تسلیم کرنے پر فطرت مجبور کرتی ہے اور جو اس کو تسلیم نہ کرے وہ گویا فطرت کے تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

ابن جریر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے اس روایت کا بھی اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ انسانی پیدائش اس طریقہ پر ہوتی ہے کہ پہلے وہ نطفہ ہوتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نطفہ سے لے کر وہ تمام حالات انسانی پیدائش کے آئے ہیں جو دوسرے انسانوں پر آتے ہیں کوئی خصوصیت بر بنائے پیدائش ان کے حالات میں نہیں۔ ان کی طرف قرآن کریم نے خود اشارہ فرمایا ہے جہاں ارشاد ہوا "فَحَمَلَتْهُ" پس مریم نے عیسیٰ علیہ السلام کو حمل میں لے لیا (مریم ۹ : ۲۲) اور اس کی تشریح میں خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "ان عیسی حملته امراة كما تحمل المراة ثم وضعته كما تضع المراة" یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورتوں کو حمل ہوتا ہے اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنتی ہیں۔ پھر انسانی پیدائش کی تفصیل خود قرآن کریم کی آیات نے بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ○ (المومنون ۲۳ : ۱۲، ۱۶)

"اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے "نطفہ" کو ہم نے "علقہ" بنایا ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں پھر ..... "علقہ" کو ایک گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔ پھر دیکھو کس طرح اسے بالکل ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا؟ تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی۔ پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا۔ پھر دیکھو اس پیدائش کے بعد تم سب کو ضرور مرنا ہے اور مرنے کے بعد ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اٹھائے جاؤ۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟ اور اسے ایک مقررہ اندازے تک محفوظ مقام پر نہیں رکھا؟ پھر ہم نے اس کا اندازہ کیا سو ہم کیا ہی اچھا اندازہ کرنے والے ہیں؟" (المرسلات ۷۷ : ۲۰، ۲۲)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"وہ پروردگار! جس نے تمہارا وجود مٹی سے پیدا کیا پھر "نطفہ" سے۔ پھر "علقہ" سے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ تم طفولیت کی حالت میں مادر شکم سے نکلتے ہو۔ پھر بڑے ہوتے ہو اور سن تمیز تک پہنچتے ہو اس کے بعد تمہارا جینا اس لئے ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچو۔ پھر تم میں سے کوئی تو ان منزلوں سے پہلے ہی مرجاتا ہے اور کوئی چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اپنے مقررہ وقت تک زندگی بسر کرتا رہے اور تم عقل و فکر سے کام لو۔"

(مومن ۴۰ : ۶۷)

ایک جگہ فرمایا :

"لوگو! اگر تمہیں اس بات میں شک ہے کہ آدمی دوبارہ کیسے جی اٹھے گا؟ تو اس بات پر غور کرو کہ ہم نے تم کو کس چیز سے پیدا کیا؟ مٹی سے پھر اس طرح کہ پہلے "نطفہ" ہوتا ہے پھر "عقلہ" بنتا ہے پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کا ایک ٹکڑا اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تم پر اپنی قدرت کی کار فرمائیاں واضح کر دیں پھر دیکھو جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں تکمیل تک پہنچائیں اسے عورت کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر جب نطفہ تکمیل کے تمام مراحل طے کر لیتا ہے تو طفولیت کی حالت میں تمہیں باہر نکالتے ہیں تم پر یکے بعد دیگرے ایسی حالتیں طاری کرتے ہیں کہ بالآخر اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جاتے ہو۔ پھر تم میں کوئی تو ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے سے پہلے ہی مرجاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے تک پہنچتا ہے اور پھر عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پڑ جائے۔" (الحج ۲۲ : ۵)

الْحَكِيمُ ۞ هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ

غالب آنے والا حکمت والا ہے۔ ۶

وہی ذات ہے جس نے تم پر کتاب یعنی قرآن کریم نازل فرمایا جس میں ایک قسم تو محکم آیتوں[۱۶] کی ہے اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں[۱۷] دوسری قسم متشابہات[۱۸] کی ہے تو جن

تعجب ہے کہ ایسی صراحت کے ہوتے ہوئے مفسرین نے بعض عجیب عجیب قصے بنا لئے ہیں اور بعض مفسرین نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایک ہی گھڑی کیلئے حضرت مریم صدیقہ کو حمل ہوا تھا اور فوراً حضرت مسیح پیدا بھی ہوگئے۔

اب عیسائیوں کیلئے غور کا مقام ہے کہ جس شخصیت کو ماں نے حمل میں لیا اور پھر وہ رحم مادر میں خلقاً بعد خلق بڑھتا رہا اور اپنے وقت مقرر پر ماں نے اس کو جنم دیا پھر اس کی پرورش کی جس طرح مائیں اپنی اولاد کی پرورش کرتی ہیں۔ پھر وہ اللہ۔ اللہ کا بیٹا یا تین میں سے ایک اقنوم ہونے کے بعد تین ایک کیسے ہوگیا؟ آخر اس گورکھ دھندہ کا مطلب کیا؟ کیا عیسیٰ علیہ السلام مخلوق نہیں؟ پھر جو مخلوق ہے وہ خالق کیسے ہوگیا؟ مختصر یہ کہ اس آیت نے بھی سیدنا مسیحؑ کی الوہیت کا مکمل طور پر رد کر دیا اور واضح کر دیا کہ وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق تھا۔ معبود نہیں بلکہ عبد تھا اور یہی اس سورۃ کا اصل مضمون ہے۔

محکمات و متشابہات کی حقیقت کیا ہے؟

۱۶ یہاں اس اصل عظیم کو بیان کیا جا رہا ہے کہ کتاب اللہ کی تعلیم دو اصولی قسموں پر مشتمل ہے۔ ایک قسم محکمات کی ہے اور دوسری متشابہات کی۔ محکمات سے مراد وہ مطالب ہیں جو اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے انسانی عقل کیلئے صاف صاف اور کھلے احکام ہیں مثلاً توحید و رسالت، اوامر و نواہی، حلال و حرام اور متشابہات سے مراد وہ مطالب ہیں جن کا تعلق ماوراء عقل حقائق سے ہے اور انسانی علم و حواس کے ذریعہ ان کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اللہ کی ذات، مرنے کے بعد زندگی، عالم آخرت کے احوال، عذاب و ثواب کی اصل حقیقت، پس ناگزیر طور پر ان کا بیان ایسے پیرایہ میں کیا جاتا ہے کہ فہم انسانی کیلئے ناقابل برداشت نہ ہو اس لئے وہ تشبیہ و مجاز سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں اگر ایک شخص کج فہمی سے کاوش کرنی چاہے تو طرح طرح کے معانی و مباحث کے احتمالات پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے تاکہ

بات سمجھ میں آسکے۔

مختصر بات یہ ہے کہ عربی زبان میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آئے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے اور متشابہ اس بات کو کہتے ہیں جس کے کئی مطلب سمجھ میں آتے ہوں اور بخوبی سمجھ میں نہ آتے ہوں اور بخوبی تمیز بھی نہ ہو سکتی ہو کہ کونسا مطلب مقصود ہے یا جو معنی اس کے الفاظ سے متبادر ہوتے ہوں وہ مقصود نہ ہوں بلکہ وہ الفاظ بطور تمثیل یا بطور مجاز و استعارہ کے آئے ہوں۔

اس پر لوگوں نے بہت بحث کی ہے کہ قرآن کریم میں آیات متشابہات کیوں لائی گئی ہیں۔ مگر ہر ایک سمجھ دار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب قرآن کریم انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس سے عوام و خواص سب کو ہدایت مقصود ہے تو اس میں آیات متشابہات کا نہ ہونا ناممکن ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کو انسان کے حواس خمسہ ظاہری و باطنی نے محسوس نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کی کیفیت کو جانا ہے۔ پس امکان ہی نہیں ہے کہ وہ مطلب آیات محکمات میں بیان ہو سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمثیل کے پیرایہ میں آیات متشابہات کے ذریعہ بیان کیا جائے۔ علاوہ اس کے قرآن کریم تمام لوگوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ذی علم و دانش مند اس سے ہدایت پائیں اسی طرح جاہل و نادان عوام بھیڑوں' بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے بھی ویسی ہی ہدایت پائیں۔ عوام اکثر حقائق امور کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ بلحاظ زمانہ اور بلحاظ اس قدر ترقی علم و معلومات کے جو اس زمانہ میں ہوئی ہے اکثر ذی علم بھی حقائق اشیاء یا حقیقتہ الامر کے سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں۔ صاحب مذہب کو یا یوں کہو کہ روحانی ہادی یا پیغمبر کو جب تک نبوت قائم تھی ان امور سے چنداں بحث نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ روحانی اصلاح و تربیت کو مدنظر رکھ کر ان مطالب کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر اس کے ایک پہلو پر خیال کرو تو اس سے وہ مطلب پایا جاتا ہے جو عوام کے خیالات یا اس زمانہ کے اہل علم کی معلومات کے مناسب ہوتا ہے لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو بھی مخفی ہوتا ہے اور جب علم کی اور معلومات کی ترقی ہوتی جاتی ہے جب سمجھ میں آتا ہے۔ پس ایک ایسی کتاب میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہو جیسے قرآن کریم آیات متشابہات کا ہونا امرلازمی و ضروری ہے بلکہ ان کا ہونا ہی دلیل ان کی صداقت اور منزل من اللہ ہونے کی ہے اور قرآن کریم کا بھی بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس کے ساتھ بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل اصول اور دارومدار اس روحانی تربیت کے ہیں جن کے بغیر روحانی تربیت کا ہونا جو مقصود اصل ہے ناممکن ہے۔ وہ امور بالضرور اس طرح پر بیان ہونے چاہئیں جن کا ایک ہی مطلب ہو اور نہایت صفائی سے سمجھ میں آسکے اور دوسرے مطلب کو اس میں آنے کی گنجائش ہی نہ ہو اور یہی مطالب وہ ہیں جن پر آیات محکمات کا اطلاق ہوا ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا اصول توحید ہے اور اس کے بعد اعمال حسنہ وہ اس خوبی و عمدگی اور صفائی سے قرآن کریم کی آیات محکمات میں بیان ہوئے ہیں جن میں کسی طرح دوسرا احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو سورہ الانعام میں فرمایا :

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (الانعام ۶ : ۱۰۲)

"یہی ہے اللہ! تمہارا پروردگار۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا۔ سو دیکھو اس کی بندگی کرو۔ ہر چیز اس کے حوالے ہے۔"

ایک جگہ فرمایا "اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے اس کی عبادت کرو۔" (الانعام ۶ : ۱۰۲)

ایک جگہ فرمایا "اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود مت بناؤ۔" (البقرہ ۲ : ۲۵۵)

ایک جگہ فرمایا "کہ جو شخص اللہ پر ایمان لایا بیشک اس نے مضبوط ذریعہ پکڑ لیا جس کیلئے ٹوٹنا ہی نہیں ہے۔" (البقرہ ۲ : ۲۵۶)

ایک جگہ فرمایا "اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک مت کرو۔ ماں باپ کے ساتھ۔ رشتہ داروں کے ساتھ۔ یتیموں کے ساتھ۔ ہمسایہ میں جو رشتہ دار رہتے ہوں ان کے ساتھ۔ ہمسایہ میں جو اور لوگ رہتے ہوں ان کے ساتھ۔ جو غیر لوگ ساتھی ہوں ان کے ساتھ۔ مسافر غریب الوطن کے ساتھ احسان کرو۔"

اور ایک جگہ فرمایا "غلاموں کے آزاد کرانے اور کرنے میں مال خرچ کرو۔"

ایک جگہ فرمایا "اللہ صرف مشرک ہی کو نہیں بخشنے کا اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں اگر چاہے گا تو بخش دے گا۔"

ایک جگہ فرمایا "جس شخص نے تابعداری کے ساتھ اپنا منہ اللہ کے سامنے کیا اور وہ نیکی کرنے والا ہوا تو اس کا اجر و ثواب اس کے پروردگار کے پاس ہے ان کو کچھ خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس طرح کی سینکڑوں آیات کریمات ہیں جو محکمات ہیں جن کا مطلب سوائے ایک کے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

ذات الٰہ کی تعبیر بجز اس کے کہ موجود ہے "احد لا ند ولا شریک لہ ولیس کمثل شی" نہ تو آیات محکمات سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی متشابہات سے۔ اس لئے قرآن کریم میں جا بجا اس کی صفات کو بیان کیا ہے مگر جہاں جہاں صفات باری بیان ہوئی ہیں وہ سب از قبیل آیات متشابہات کے ہیں۔ غور کرو کہ "هُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ" کے الفاظ سے ہم اس زندگی اور موت کا خیال کر سکتے ہیں جو ہم انسانوں اور حیوانوں میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ذات باری اس حیات و ممات سے جس کو ہم جانتے ہیں پاک ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات میں سمیع و بصیر و علیم ہونے کی صفات تسلیم کرتے ہیں لیکن ان صفات کو بجز اس قوت اور حس کے جو ہم کو بذریعہ کانوں، آنکھوں اور بعد

وجود معلومات کے ان کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے اور کچھ نہیں جانتے حالانکہ ذات باری اس قسم کی صفات سے بری ہے۔ رحم و غضب اور قہر سے ہم انہیں صفات کو سمجھتے ہیں جو ہمارے دل میں کسی کی حالت زار کو دیکھ کر لاحق ہوتی ہیں اور ہمارا دل اس سے متاثر ہو کر مضطر و رقیق ہو جاتا ہے یا کسی مخالف کی مخالفت یا خلاف طبع امر سرزد ہونے کے سبب ہمارے دل میں ایک جوش انتقام لینے کا اور ایسے فعل کے کرنے کا جس سے ہمارے جوش قلب کو تسکین ہو پیدا ہوتا ہے مگر ذات باری اس قسم کی صفات رحم و قہر سے پاک و مبرا ہے۔ خدا کی نسبت عرش پر بیٹھنا۔ اس کے ہاتھ ہونا۔ اس کا منہ ہونا بیان ہوا ہے۔ ان الفاظ سے بجز ایسے تخت کے جس کو ہم نے دیکھا ہے اور بجز ان ہاتھوں کے جو ہمارے بدن میں ہیں اور بجز اس منہ کے جو زیادہ سے زیادہ شان و شوکت والا ہم نے دیکھا ہے اور کوئی معنی ہمارے خیال میں نہیں آسکتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس طرح کے تخت پر بیٹھنے اور ایسے ہاتھوں اور اس طرح کے منہ کے ہونے سے مبرا ہے۔ حشر اجساد، نعیم جنت، عذاب دوزخ کا جن آیتوں میں بیان ہوا ہے وہ سب آیات متشابہات میں سے ہیں۔ جسد کے موجود ہونے کا خیال بجز اس طریقہ کے جس کو ہم دیکھتے ہیں اور طرح پر آ ہی نہیں سکتا اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہے حشر اجساد سے اسی معمولی اور عرفی طریقہ پر محشور ہونا مقصود ہے تو ہمارے ذہن میں وہ کس طرح سما سکتا ہے چنانچہ ان سب باتوں کو تماثیل ہی میں بیان کرنا ممکن ہے ویسے بھی ان دیکھی چیزوں کو سوائے تماثیل کے بیان کیا ہی نہیں جا سکتا ان کا جو بیان بھی ہو گا وہ تمثیل ہی ہو گا۔

یہ سب باتیں ہمارے ایمان کا جز ہیں۔ ہم ان کو ایمانیات کی حد تک تسلیم کرتے ہیں اور حقیقت حال کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ ہمیں بحث ان چیزوں سے ہوگی جو مشاہدہ میں آسکتی ہیں اور آتی ہیں اور یہی باتیں ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں پوری وضاحت بھی فرما دی ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو مافوق العقل ہو ہاں! ماوراء العقل ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ اور کجی ہے وہ خرابی ڈالنے کیلئے ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی غلط تاویل کرتے ہیں اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب اللہ ہی کے پاس سے آیا ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کی تاویلوں کے درپے نہیں ہوتے۔

اب بات سمجھنا آسان ہوگئی آپ ذرا غور کریں گے تو انشاء اللہ حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔ وہ باتیں جو مشاہدہ میں آتی ہیں اور روزمرہ زندگی میں سب لوگوں کو پیش آتی رہتی ہیں وہ سب کی سب محکمات ہیں اور جو چیزیں انسانی دسترس سے باہر ہیں اور مشاہدہ میں آ ہی نہیں سکتیں وہ سب کی سب متشابہات ہیں۔ ایک بات کو سنتے ہی سب سے پہلا اور بنیادی فیصلہ یہ کرنا ہوگا کہ آیا یہ بات مشاہدہ کی ہے یا نہیں۔ اللہ نے اس کا کوئی اصول و قاعدہ مقرر فرما کر اعلان کر دیا ہے یا نہیں۔ اس کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ فرما دیا ہے یا نہیں۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو وہ یقیناً محکمات میں داخل ہے اور اگر نہیں تو وہ متشابہات ہیں۔ محکمات اپنی جگہ پر اٹل ہیں

اس لئے کہ وہ صرف اور صرف ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں اور متشابہات میں بات کرنے سے بحث کرنے کی گنجائش باقی ہے لیکن جو بات یا بحث ہوگی وہ افہام و تفہیم کیلئے ہوگی جھگڑے اور مناظرے کیلئے نہیں۔ جب کسی جگہ ایسی صورت پیش آئے گی تو خاموش ہونا ضروری ہے اور اپنا کام کرتے جانے کا حکم ہے۔ شک و تردد میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

وہ مسبب الاسباب اور علۃ العلل جس کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ وہ وحدہ لا شریک ہے۔ وہی سب چیزوں کا خالق حقیقی ہے۔ ایسے مسبب الاسباب کیلئے ضروری ہے کہ اس میں ایسی چیز بھی ہو جس کو ہم زندگی کہتے ہیں اور ایسی چیز اس میں بالکل نہ ہو جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ اس میں کوئی چیز ایسی بھی ہونی ضروری ہے جس کو ہم لفظ سمع و بصر و علم حلم اور رحم و غضب اور قہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا امر بھی ہونا ضروری ہے کہ جن کاموں کو ہم ہاتھ پاؤں اور منہ وغیرہ کے ساتھ منسوب کر سکیں کیونکہ اس کے علۃ العلل اور مسبب الاسباب اور خالق جمیع اشیئا کے ہونے کو ایسی چیزوں کا اس میں ہونا لازم ہے اس لئے ہم اسی کے حی لا یموت' سمیع و بصیر' علیم' رحمٰن و رحیم' قہار و جبار ہونے پر یقین کرتے ہیں مگر اس امر کی کہ اس کی حیات کیا ہے؟ اور عدم موت کیا ہے؟ اس کا سمیع و علیم و بصیر و رحمان و رحیم اور جبار و قہار ہونا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ کچھ تاویل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ "لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ" ہاں! اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارا سا نہیں۔ ہمارے نزدیک آیات متشابہات پر ایمان لانے کے یہی معنی ہیں اور فطرت انسانی کا یہی مقتضیٰ ہے۔

کتاب اللہ کی اصل و بنیاد ہونے کا مطلب کیا؟

۷ا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ اصل و بنیاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم جس غرض کیلئے نازل ہوا ہے اس غرض کو یہی آیات پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے۔ ان ہی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان ہی میں گمراہیوں کی تردید اور راہ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ ان ہی میں دین کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ان ہی میں عقائد و عبادات' اخلاق و فرائض اور اوامر و نواہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں اور خصوصاً مسیح کی الوہیت کا مسئلہ بھی اصولی و بنیادی ہے یہ فروعی اور متشابہ بات نہیں کیونکہ اللہ ایک ہی ہے اور وہ بہت سی اقنوم یا صرف تین اقنوموں سے مل کر نہیں بنا بلکہ وہ وحدہ لا شریک ذات ہے جس کے اجزاء ممکن ہی نہیں۔

پس جو شخص طالب حق ہو اور یہ جاننے کیلئے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ کے قریب بھی نہ جائے۔ اس کی پیاس بجھانے کیلئے آیات محکمات ہی اصل مرجع ہیں جن کو عقل کی کسوٹی پر بھی رکھا جا سکتا ہے اور فطرۃً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ انہی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور وہی اس کو سیدھی راہ پر قائم رکھ سکتی ہے۔

متشابہات کیا ہیں اور کیوں؟

۱۸ تفہیم کیلئے ضروری ہے کہ ایک بات کو پکڑ لیا جائے اور اس پر بات کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے پھر جب وہ نتیجہ سامنے آجائے تو باقی ساری چیزوں اور باتوں کو اس پر محمول کر لیا جائے ورنہ بات سے بات نکلتی جائے گی اور کسی کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکے گا اور نہ ہی باقی چیزوں کو اس پر محمول کیا جا سکے گا مثلاً آپ جنت کے انعامات ہی کو لے لیں۔ قرآن کریم کو کسی جگہ سے کھولیں تو سورتوں کی سورتیں اور آیتوں کی آیتیں اور رکوعات کے رکوعات ان انعامات جنت کے بیان سے بھرے ہوئے ہیں جن کو پڑھنے سے ایک سرور طبیعت میں محسوس ہوتا ہے اور ایک خاص حالت طاری ہوتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب ہی ایسی ہے کہ مطلب نہ جاننے والا بھی حظ اور لطف محسوس کرتا ہے اور یہی قرآن کریم کا زندہ و جاوید معجزہ ہے اور اس لئے اس کو معجزانہ کلام کہا جاتا ہے۔ سب صحیح اور سب درست لیکن اس کے باوجود جب ہم حقیقت پر غور کرتے ہیں تو قرآن کریم ہم کو یہ بات بتاتا ہے کہ :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (الم السجدہ ۳۲ : ۱۷) "پھر جو کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کیلئے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی نفس کو بھی خبر ہے؟"

دوسری طرف نبی کریم ﷺ نے خود اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "انی اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔" میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے وہ کچھ تیار کیا ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں اس کا تصور پیدا ہونا بھی ممکن نہیں۔"

اس طرح کی آیات کریمات اور احادیث ہم کو بتاتی ہیں کہ جنت کے جن انعامات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کیلئے جو الفاظ اور مفہوم متعین کیا گیا ہے وہ صرف اور صرف اس لئے ہے کہ اگر ان کو اس طرح بیان نہ کیا جاتا تو انسان کی سمجھ میں ان چیزوں اور ان انعامات کا آنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس کی اصل حقیقت انسانی مشاہدہ اور احاطہ عقل دونوں سے باہر ہے اور اس چیز کو بیان کرنے کیلئے جو فطرۃ انسانی کے مشاہدہ اور احاطہ عقل سے باہر ہو ان ہی تمثیلات میں بیان کیا جا سکتا تھا اور ان کی حقیقت کو سوائے اللہ کے انسان خواہ وہ کوئی ہو نہیں جان سکتا تھا' لہٰذا ان کو انہی تمثیلات میں بیان کیا گیا۔ اس لئے ان آیات کا مفہوم متشابہات میں سے ہے۔ رہی یہ بات کہ متشابہات کیوں ہیں؟ اس لئے کہ محکمات کا پتہ چل جائے اور وہ معلوم ہو سکیں۔

کیونکہ ان انعامات کا انسانی گرفت میں آنا جب تک کہ انسان اس عالم میں موجود ہے ناممکنات میں سے ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں۔ جو انسانی علم میں نہ کبھی آئی ہیں اور نہ ہی آسکتی ہیں جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا' نہ چھوا' نہ چکھا۔ ان کیلئے انسانی زبان میں نہ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ
وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ

وقف لازم
وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وقف ممنوع

لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ محکم آیتوں کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ فتنہ پیدا کریں[۱۹] اور ان کی حقیقت معلوم کر لیں[۲۰] حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ ان کا تعلق مابعد الموت سے ہوتا ہے

ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کیلئے وضع کئے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان ہی مل سکتے ہیں جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح اور اصل تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کیلئے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کئے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کیلئے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبعی مسائل کے بیان میں قرآن کریم کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور متشابہات سے وہ آیات مراد ہیں جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

فتنہ سے کیا مراد ہے اور وہ فتنہ کیوں چاہتے ہیں؟

۱۹ فتنہ کے معنی ہر جگہ ایک ہی جیسے نہیں بیان کئے جا سکتے کیونکہ یہ لفظ ہی بہت سے مفہومات کا متحمل ہے۔ اس جگہ فتنہ کے معنی کیا ہیں؟ اس جگہ اس کا مفہوم حق سے پھیر دینا ہے فتن الرجل یعنی جس حالت پر وہ تھا اس سے اس کو ہٹا دیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (بنی اسرائیل ۱۷ : ۷۳) "اور اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں نے تو اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے فریب دے کر اس تبلیغ کے کام سے روک دیں جو ہم نے بذریعہ وحی نازل کیا ہے۔"

پس "ابتغاء الفتنة" کے معنی ہوئے حق سے پھیر دینے کو چاہتے ہوئے یا گمراہی چاہتے ہوئے یا اختلاف چاہتے ہوئے پھر تینوں ہی کا نتیجہ ایک ہے۔ گویا متشابہات ہی میں الجھے رہنے سے ان کی غرض حق کی بجائے گمراہی کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ دین حق سے پھیرنا یا اختلاف ڈالنا۔ رہی یہ بات کہ وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ منافق منافقت کیوں کرتا ہے؟ کافر کفر کیوں کرتا ہے؟ جو جواب ان کا ہے وہی ان کا بھی ہے۔ خود محکمات پر عمل کرنا نہیں چاہتے اور اس جھگڑے اور بحث و مباحثہ میں مسلمانوں کو بھی محکمات پر عمل کرنے سے روک دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ آدمی ایک طرف مصروف ہو تو دوسری طرف متاثر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ اس طرح سے سچے مسلمانوں کے دلوں میں بھی شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہی ان کی مراد اور یہی ان کا مطلوب ہے۔

اصلیت اور حقیقت صرف ان چیزوں کی معلوم ہو سکتی ہے جو مشاہدہ میں آئیں

۲۰ "تاویل" اول سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا اصل کی طرف رجوع کرنا اور "تاویل" کے معنی ہوئے ایک چیز کا اس غایت کی طرف لوٹانا جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہو علمی طور پر یا فعلی طور پر (امام راغب) یہاں تاویل بلحاظ علم مراد ہے۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ (الاعراف ۷ : ۵۳) اور ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۵) تاویل فعلی یعنی مآل یا انجام مراد ہے اس جگہ "ابتغاء تاویلہ" سے مراد مخصوص تاویل ہے یا ایسی تاویل ہے جو محکمات کے خلاف ہے اور تاویل کرنے والا اپنی خواہش کے مطابق تاویل کرے۔ جس طرح وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل ۷۳ : ۲۰) "اور اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو" کی اہل کتاب نے یہ تاویل کی کہ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ (المائدہ ۵ : ۶۴) "اللہ کا ہاتھ تنگ ہوگیا" کیونکہ وہ قرض کی اپیل کر رہا ہے۔ حالانکہ صدقہ و خیرات کو قرض اس لئے کہا گیا تھا کہ وہ قابل واپسی ہے ایسا نہیں کہ تمہارا خرچ کیا اکارت چلا جائے۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی یا ٹیڑھا پن تھا انہوں نے اس کو اپنی مرضی کے معنی پہنا لئے اور اس کو ایک بحث کا موضوع بنا لیا۔ اس کی مثالیں قرآن کریم میں بیسیوں موجود ہیں۔

مسیح علیہ السلام کے متعلق اناجیل میں بھی محاورات و استعارات کثرت سے استعمال ہوئے تھے اور قرآن کریم نے بھی ان کا استعمال کیا ہے جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہی وہ طریقہ کلام ہے جس میں بڑے بڑے مضامین چند الفاظ میں بیان کئے جا سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہی محاورات و استعارات کلام کی روح و جان ہوتے ہیں لیکن کچھ لوگوں نے ان کی تاویل اس طرح کی کہ مسیح علیہ السلام کو مخلوق سے اٹھا کر خالق' عبد سے اٹھا کر معبود اور پروردہ سے اٹھا کر پروردگار بنا دیا۔

مفسرین نے عموماً "طلب تاویل الذی یشتھونہ" یعنی اس تاویل کو چاہتے ہوئے جو ان کی اپنی خواہش ہوتی ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کی تاویل کی طلب میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور وہ حد سے تجاوز کرنا یہ ہے کہ اسے محکمات کی طرف نہیں پھیرتے متشابہ الفاظ کے معنی میں "ابتغاء" یہی ہے کہ انسان ان الفاظ کے پیچھے اس طرح پڑے کہ دوسرے الفاظ یا اصول کی طرف توجہ ہی نہ کرے اور اکثر متشابہ کی پیروی کرنے والوں کو یہی غلطی لگتی ہے کہ وہ ان الفاظ کے پیچھے اس طرح پڑتے ہیں کہ باقی بڑی بڑی روشن اور واضح اور غیر مبہم باتوں کی پرواہ تک نہیں کرتے اور اس میں شک نہیں کہ یہ محض اپنی خواہش کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اپنی خواہش کیا ہے؟ یہ کہ جس جماعت یا فرقہ یا گروہ سے انسان وابستہ ہوتا ہے اس جماعت فرقہ اور گروہ کے کسی بزرگ نے کوئی بات کہی اور ایک مدت گزرنے کے بعد اس گروہ کا آدمی اس بات پر محض اس

فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ

مگر جو لوگ علم میں پکے ہوتے[۵۲۱] ہیں وہ بول اٹھتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تعلیم الٰہی سے دانائی

لئے ڈٹ گیا کہ اس کے بزرگوں سے یہ منقول ہے اور یہ اس کی خواہش ہوگئی کہ ہمارے بزرگوں کا کہنا غلط نہیں ہو سکتا۔ اس کے سامنے ہزار دلائل رکھو لیکن وہ سب کی طرف سے آنکھیں بند کرے گا کوئی جواب نہ آیا تو وہ یہ راگ الاپتا رہے گا کہ یہ ہمارے بزرگوں نے کہا ہے اور ان کا کہا غلط نہیں ہو سکتا۔ ان سے زیادہ آپ سمجھدار کیسے ہوگئے؟ ان کو وہ بات کیوں معلوم نہ ہوئی جو آپ کو معلوم ہوگئی؟ قرآن کریم میں اس کی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ سورہ شعراء میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا گیا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! انہیں ابراہیمؑ کا قصہ پڑھ کر سنائیں۔ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور ہم انہیں کے گرد معتکف بیٹھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا جب تم ان کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری پکار سنتے ہیں یا تمہیں کوئی نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔" بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (الشعراء ۲۶ : ۷۴)

اسی مضمون کی وضاحت کیلئے مزید دیکھنا مقصود ہو تو ان مقامات کا مطالعہ کرو۔ (الاعراف ۷ : ۲۸) (یونس ۱۰ : ۷۸) (الانبیاء ۲۱ : ۵۳) (لقمان ۳۱ : ۲۱) اور (الزخرف ۴۳ : ۲۰، ۲۲)

علم میں پکے لوگ کون ہیں؟

۵۲۱ "رسوخ" کے معنی ہیں کسی چیز کا نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا اور "راسخ فی العلم" علم میں متحقق کو کہا جاتا ہے (راغب) یہاں "الا اللہ" اور "راسخون فی العلم" دونوں جگہ پر وقف ہے اس لئے "وراسخون فی العلم" کا جملہ دونوں طرف ملتا ہے۔ یعنی اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور راسخون فی العلم کے اور یہ بتانے کیلئے کہ وہ راسخون فی العلم کس طرح اس تاویل کو جانتے ہیں یہ الفاظ فرمائے گئے کہ "يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا" یعنی متشابہات اور محکمات دونوں اللہ کی طرف سے مانتے ہیں۔ گویا ان کا اصول یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر عرض کرتے ہیں اور ان کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ بخاری میں اس طرح پر ان الفاظ کے معنی کئے گئے ہیں۔ بخاری میں ہے والراسخون یعلمون یقولون امنا بہ یعنی راسخ بھی ان معنوں کو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر

إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ ۞ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا

حاصل نہیں کرتے مگر وہی جو عقل و بصیرت رکھنے والے ہیں[۲۲]۔ ۷

ان لوگوں[۲۳] کی صدائے حال ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں سیدھے رستے پر لگا

متشابہات کے معنی راسخون فی العلم کو بھی معلوم نہیں ہو سکتے تو ان کا انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ رہی وہ چیزیں جو جنت کے انعامات اور دوزخ کے عذاب نار وغیرہ کے متعلق ہیں تو اس کے معلوم کرنے کی یہاں ضرورت کیا؟ کیونکہ جب وہ مشاہدہ میں آ ہی نہیں سکتے تو بس ان کو ماننا اور تسلیم کرنا ہی مراد ہو سکتا ہے جس کو "ایمان بالغیب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہاں! جب اس عالم سے کوچ کر کے دوسرے عالم میں منتقل ہوں گے تو ان کی حقیقت بھی یقیناً کھل جائے گی۔

عقل مند ہی ہمیشہ نصیحت قبول کرتے ہیں

۲۲ محاورہ ہے کہ "عاقل را اشارہ کافی است" زیر نظر آیت میں محکم اور متشابہ کا ایک اصول بیان فرمایا ہے اور اس سورت کے ان مضامین کی مناسبت ہی سے یہ بیان اس جگہ درج کیا گیا ہے کہ اس میں عیسائیت کے بطلان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عیسائیوں نے محکمات اور متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی غلطی کھائی ہے۔ عیسائی مذہب کی بنیاد خصوصاً اس وقت جس کو عیسائیت کہا جاتا ہے اس کی بنیاد صرف متشابہات پر ہے۔ سب سے بڑی دلیل حضرت مسیح کی خدائی کی یہ دی جاتی ہے کہ پیش گوئیوں میں آپ کو خدا کہا گیا ہے اور آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا گیا ہے۔ غور کرو کہ یہ کس قدر لغو بنیاد ہے کیوں؟ اس لئے کہ پیش گوئی تو خود متشابہات میں سے ہوتی ہے اور پیش گوئیوں کی زبان میں استعارہ اور مجاز کا استعمال بکثرت ہوتا ہے چنانچہ خود مسیح علیہ السلام کی آمد کے جو نشانات تھے یعنی کتب سابقہ میں ان ہی کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس قدر استعارہ و مجاز ہے کیونکہ ان کا استعمال بکثرت ہوا ہے حق تو یہ ہے کہ جن پیش گوئیوں میں خدا کا لفظ آیا ہے وہ حضرت مسیح کیلئے نہیں بلکہ وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی آمد کے متعلق ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود حضرت مسیحؑ نے بھی خدا کے آنے کی پیش گوئی کا ذکر کیا ہے (متی ۲۱ : ۳۳، ۴۰) جہاں انگورستان کے مالک کی تمثیل میں بیٹے کے آنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ پھر انگورستان کا مالک خود آئے گا اور آگے چل کر آیت ۴۳ میں صفائی سے بتا دیا کہ "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک اور قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔" پس وہ خدا جس کے آنے کی پیش گوئی بائبل میں ہے وہ بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہیں مگر باوجود ان پیش گوئیوں کے وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے کیونکہ آپ ﷺ کے نزدیک ان استعارات

کا مطلب ہی یہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ محکمات اور بدیہی کے خلاف ہے اور جو بدیہی کے خلاف ہو وہ مطلب صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

کیونکہ بائبل میں لفظ "خدا" کا استعمال بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں موجود ہے۔ "میں نے تو کہا کہ تم الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔" (زبور ۸۲ : ۶)' (یوحنا ۱۰ : ۳۴) میں حضرت مسیحؑ اس قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں جب کہ اس نے انہیں جس کے پاس خدا کا کلام آیا "خدا" کہا پس اول پیشگوئی خود ایک استعارہ تھی اس لئے اس میں "خدا" کی آمد کا ذکر ایک استعارہ سے بڑھ کر نہیں۔ پھر وہ پیشگوئیاں بھی حضرت مسیح کیلئے نہیں بلکہ نبی کریم حضرت محمد ﷺ کیلئے ہیں پھر بغیر پیش گوئیوں کے بھی اسی بائبل میں لفظ "خدا" بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں استعمال ہوا ہے اس لئے اس کے معنی دوسری جگہ بھی یہی مراد ہوں گے۔ پس ایک متشابہ امر کی بنیاد پر تمام محکمات کا رد کرنا یہ عیسائی مذہب کی خطرناک غلطی ہے۔ پھر خود مسیح علیہ السلام نے بھی ان کو بتا دیا تھا کہ وہ جو لفظ "خدا کا بیٹا" اپنے لئے استعمال کرتے ہیں تو اسی مجازی معنی کی رو سے جس مفہوم کو مدنظر رکھ کر سارے راست بازوں کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت مسیح نے ان سے دریافت کیا کہ میں نے خدا کی طرف سے بہت نیک کام کئے ہیں میرے کس نیک کام کے عوض مجھے سنگسار کرتے ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اچھے کام کیلئے ہم تم کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ تو کفر کہتا ہے اور "انسان ہو کر اپنے تئیں خدا بناتا ہے۔" (یوحنا ۱۰ : ۳۳) تو حضرت مسیح نے اس کا جواب یہ دیا "کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم "خدا" ہو جب کہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا..... تم اسے جس کو خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔" (یوحنا ۱۰ : ۳۴' ۳۶)

اس سوال و جواب پر غور کرو کہ اگر حضرت مسیحؑ کا دعویٰ واقعی خدائی کا ہوتا تو جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا کہتے ہو تو اس کا جواب یوں دیتے کہ میں تو خدا ہی ہوں اور تمہاری پیشگوئیوں میں خدا کا آنا لکھا ہے مگر بجائے اس کے آپ نے یہ جواب دیا کہ تمہارے بزرگوں کو بھی "خدا" کے کلام میں "خدا" کہا گیا ہے۔ اگر ان کا خدا کہلانا کفر نہیں تو میرا خدا کا بیٹا کہلانا کفر کیوں ہو گیا؟ بالفاظ دیگر جن معنوں میں وہ خدا کہلائے انہیں معنوں میں میں خدا کا بیٹا ہوں۔ نہ وہ حقیقت میں خدا تھے نہ میں حقیقت میں خدا کا بیٹا ہوں مگر مجازی طور پر ان کو بھی خدا کہا گیا ہے۔ مجازی طور پر ہی میں بھی خدا کا بیٹا ہوں۔ اس قدر صفائی کے ہوتے ہوئے عیسائیوں نے متشابہات کو لیا اور محکمات کو چھوڑ دیا۔ اس لئے ان کے عقیدہ کے بطلان میں اس مسئلہ کی توضیح کرنی ضروری تھی۔ پس اس بحث کی ابتداء میں اصولی طور پر بیان کر کے خدا کی صفات مسیح میں نہ پائی جاتی تھیں اب بتایا جا رہا ہے کہ ان کو ٹھوکر متشابہات سے لگی تھی اور یہ ٹھوکر ٹھوکر ہی نہیں

بلکہ یہ ان کے دلوں کی سراسر کجی کا نتیجہ ہے کہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات میں الجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو بھی متنبہ فرمایا گیا تھا کہ تم ایسی غلطی میں نہ پڑنا مگر افسوس ہے کہ آج بعینہ یہی غلطی مسلمانوں نے کی اور کرتے ہی چلے جا رہے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی پوری زندگی کو ایک اعجوبہ بنا کر رکھ دیا ہے لیکن یاد رہے کہ عقل مند وہی ہے جو دوسروں کی ٹھوکر سے فائدہ اٹھا کر خود گرنے سے بچ جائے۔

صاحب عقل لوگوں کی صدائے حال اس طرح ہوتی ہے

۲۳ مطلب یہ ہے کہ صاحب عقل لوگ اپنے رب سے اس طرح پکار پکار کر دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو اس راہ مستقیم پر قائم رکھ اور ہمارا حال بھی یہود و نصاریٰ کا سا نہ ہو جائے جو کتاب و نبوت کے بعد گمراہ ہوگئے اور متشابہات میں ہی الجھ کر رہ گئے۔ یہ ساری دعا اور اسی طرح کی دوسری دعائیں الراسخون فی العلم ہی کی زبانوں سے نکلتی ہیں جو دعا کرتے وقت بھی سمجھ سوچ کر دعا کرتے ہیں اندھے بہرے ہو کر دعا نہیں کرتے۔ جن کے دل اس حقیقت پر یقین کر گئے ہیں ان کے دلوں میں یہ دعائیں اٹھ کر زبان سے جاری ہو جاتی ہیں اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ علم دین میں پختہ کاروں کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ لوگ اپنے رسوخ فی العلم اور پختہ کاری پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ اس نعمت کے زوال سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔ انہیں خود اپنے کسی عمل پر ناز یا دعویٰ نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہتے کہ ہمیں ہمارے حسن عمل کے انعام میں راہ راست پر قائم رکھ بلکہ کہتے ہیں کہ محض اپنے فضل و کرم سے اور لطف و عنایت سے راہ راست پر مستقیم رکھ اور یہی ادب دعا ہے جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ (ال عمران ۳ : ۱۹۱، ۱۹۴)

"وہ ارباب عقل و دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، کھڑے ہوں۔ بیٹھے ہوں۔ لیٹے ہوں۔ ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے دلوں میں بسی ہوتی ہے۔ جس کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ خدایا! یہ سب کچھ جو تو نے پیدا کیا ہے بلاشبہ بیکار و عبث نہیں پیدا فرمایا۔ یقیناً تیری ذات اس سے پاک ہے کہ ایک بیکار کام اس سے صادر ہو۔ خدایا! ہمیں عذاب آتش سے بچا لیجئو۔ اے اللہ! اے ہمارے رب! جس بدبخت کیلئے ایسا ہوا کہ تو نے اسے دوزخ میں ڈال دیا تو بلاشبہ تو نے اسے بڑی ہی خواری میں ڈالا یعنی یقیناً وہ بڑی ہی خرابی میں گر پڑا اور جس دن ایسا ہوگا تو اس

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۞ رَبَّنَا
إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ

دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ڈانوا ڈول نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما یقیناً تو ہی بخشش عطا کرنے والا ہے۔[۲۴] ۸

اے ہمارے رب! بلاشبہ تو ایک دن ہم سب کو اپنے حضور جمع کرنے والا ہے۔ یقیناً تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔[۲۵] ۹

دن ظلم کرنے والوں کیلئے کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اے ہمارے رب! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ لوگو! اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے ہماری برائیاں مٹا دے اور اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔

"الوھاب" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے یعنی "عطا کرنے والا"

---

۲۴ "ھبہ" کے معنی ہیں اپنی ملک بغیر عوض کے غیر کو دے دینا (غ) وھاب یعنی ہر ایک کو بقدر استحقاق دینے والا۔ جس سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو گئی کہ اللہ کی ذات ہی اس کی مستحق ہے کہ اس سے دعا کی جائے اس لئے کہ عطا کرنے والا صرف اور صرف وہی ہے۔ کیونکہ ہر ایک چیز کا مالک بھی وہی ہے اور مالک ہی کو حق ہے کہ وہ جس کو چاہے عطا کر دے، رزق دینا، صحت دینا بھی اسی سے خاص ہے اور خصوصاً دلوں کی کجی کو دور فرما کر ہدایت عطا کرنا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔

نبی کریم ﷺ کے دل میں اپنی امت کیلئے اس قدر رحمت جوش مارتی تھی کہ ان کی تعلیم کیلئے آپ ﷺ اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ سیدہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ :

ان النبی ﷺ کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک ثم قراء رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ رسول اللہ ﷺ اس طرح دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھ پھر آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے ربنا لا تزغ قلوبنا الخ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت بھی روایت ہے کہ آپ سورہ فاتحہ کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس میں ایک مومن کو سکھایا گیا ہے کہ اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے بلکہ ہر حال میں اپنے رب ذوالجلال کی مدد کا طالب ہو۔

الْمِيعَادَ ۞ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا ع ۹

بلاشبہ ۲۶ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے انہیں اللہ کی پکڑ سے نہ تو ان کی

سب لوگوں کا جمع ہونا موعود ہے اور اللہ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا

۲۵ اوپر جو دعا سکھائی گئی ہے یہ آیت بھی اسی دعا کا حصہ ہے۔ جس میں سب انسانوں کے جمع ہونے کا اعتراف ہے۔ یہ جمع ہونا کیا ہے؟ اس لئے کہ سب لوگ اپنے اپنے کئے کا جواب دیں۔ گویا اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمیں اپنے اعمال کی جزا سزا ضرور مل کر رہے گی ہمیں اس میں کسی طرح شک نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ یہ جمع کرنا تیرا وعدہ ہے اور تیرا وعدہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ مومنین کاملین کی یہ دعائیں خوف آخرت سے ہوتی ہیں کسی مادی اور دنیوی غرض سے نہیں۔ جاہل قوموں کے عجیب عجیب اعتقادات ہوتے ہیں ان ہی عقیدوں میں سے ایک یہ عقیدہ بھی ہے کہ خدا کیلئے جائز ہے کہ وہ وعدہ کر کے بھول جائے یا وعدہ کا ایفاء اسے خلاف مصلحت نظر آئے اور اس لئے اسے وہ ٹال جائے اور افسوس ہے کہ بعض مسلمان کہلانے والے لوگ بھی ان خرافات میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور نہ ہی خلاف ہونے دیتا ہے جاہل ہیں وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ اپنے کسی وعدہ کا پابند نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کو کسی نے کسی وعدہ کا پابند نہیں کیا اور نہ ہی اس سے کوئی وعدہ کرایا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنے فیصلے سے لوگوں کو آگاہ فرمایا ہے اور وہی اس کا فیصلہ اس کا وعدہ ہے پھر اللہ وعدے کا خلاف کیوں کرے گا؟ مجبور اس کو کہتے ہیں جس سے کوئی دوسرا وعدہ لے یا کرائے اللہ سے نہ کسی نے کوئی وعدہ لیا اور نہ کرایا بلکہ اللہ نے خود ہی اپنے فیصلوں اور وعدوں کا اعلان فرمایا ہے اور پھر خود ہی وعدہ کر کے خود ہی اس کے خلاف نہیں کرے گا بلکہ ایسا کہنا اور ایسا سمجھنا سراسر جہالت اور لاعلمی ہے۔

قرآن کریم میں یہ مضمون بہت دفعہ آیا ہے اور ہر جگہ یہی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کئے ہوئے وعدوں کا خلاف نہیں کرتا اور نہ ہی کرے گا۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے اور آئندہ بھی اس کا ذکر ہوتا رہے گا اور اسلام کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف وزری نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس نے خود ہی اس کا اعلان کیا ہے۔

کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا

۲۶ جاہل قوموں نے ایسے عقائد خود ہی گھڑ لئے ہیں جن کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ان عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ان کا یہ بھی ہے کہ اولاد اپنے مرے ہوئے باپ کی طرف سے کچھ "پن دان" کرے تو

اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ كَدَاْبِ

دولت بچا سکے گی نہ آل اولاد[۲۷] یقیناً یہی وہ لوگ ہیں کہ آتش عذاب کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ۱۰

والدین کی نجات ہو جائے گی خواہ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال نہ بھی ہوئے ہوں۔

تعجب ہے کہ اسلام نے ماں باپ کی موجودگی میں اولاد کو مجبور کیا ہے کہ وہ ان کی ضروریات زندگی کو پورا کریں اور ان کو ہر لحاظ سے خوش رکھیں اور دنیوی زندگی میں ان کی ہر طرح مدد کریں۔ مالی امداد بھی ان کو دیں اور روحانی امداد کے طور پر ان کی اصلاح کی اسی طرح کوشش کریں کہ ان کو اف تک بھی نہ کہیں اور تبلیغ کا فرض ادا کرتے ہوئے بھی نرم لہجہ اختیار کریں اور پاکیزہ گفتگو کریں اور اگر وہ کفر ہی پر مرجائیں تو ان کیلئے دعائے مغفرت سے باز رہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی میں ان سے سلام و دعا تک کو بند کر دیں اور ان کی ضروریات کا ہرگز خیال نہ کریں اور ان کے کام بالکل نہ آئیں لیکن اگر ہماری موجودگی میں وفات پا جائیں تو پھر ان کی بخشش کے سامان کریں اور آئے دنوں ان کیلئے ثواب کی مجلسیں قائم کریں۔ قرآن خوانی کرائیں، قل پڑھائیں اور ان کی قبر پر حفاظ کو بٹھا کر قرآن پڑھاتے رہیں۔

افسوس کہ یہ دین کہاں سے نکل آیا؟ قرآن کریم تو بار بار کہتا ہے کہ مرنے والے کا عمل منقطع ہو جاتا ہے جو کچھ اس نے کرنا تھا وہ کر چکا اب اس کے کرنے کا کوئی کام باقی نہ رہا۔ ہاں! وہ اگرچہ وفات پا گیا لیکن اس کا کوئی زندہ عمل اگر باقی ہے تو اس کا اجر و ثواب بوجہ اس کے اپنے عمل ہونے کے ملتا رہے گا اور چونکہ اس کی اولاد اور اس کا مال بھی اس کا عمل ہے اگر اس کی اولاد اچھے کام کرے گی تو یقیناً اس کا عمل ہونے کی وجہ سے اس کو فائدہ پہنچے گا لیکن اس میں بھی یہ بات کہ فلاں شخص اس کو اجر و ثواب پہنچائے تب ہی اجر مل سکتا ہے بالکل بے اصل ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین کا خاص تعلق قوم عیسائیت سے ہے اس لئے اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے مالوں اور قومی جمعیت پر جس قدر فخر عیسائی قوم کو ہے شاید ہی کسی قوم کو ہوا ہو۔ خصوصاً اس لحاظ سے بھی کہ وہ انبیاء کی اولاد میں سے تھے مگر الفاظ عام ہیں اس لئے ہر قسم کے کافر خواہ پہلی امتوں کے ہوں یا بظاہر مسلمان کہلا کر کفر کرنے والے سب اس کے اندر شامل ہیں جو حقیقی اسلام کو نابود کرنا چاہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

۲۷ "کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی پکڑ سے نہ تو ان کی دولت بچا سکے گی اور نہ ہی آل و

اِلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

ان لوگوں[۲۸] کا بھی وہی حال ہے جو فرعون کے گروہ کا تھا اور ان لوگوں کا تھا جو اس

اولاد" اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ جو لوگ کفر کی راہ تو اختیار نہیں کرتے لیکن دوسرے برے کام کرنے کے عادی ہیں اگرچہ وہ کافر نہ ہوں تو گویا ان کا مال یا اولاد کام آسکیں گے۔ ہرگز نہیں اور اس آیت کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی کافر اپنے کفر کے سبب اگر اتنا حد سے بڑھ گیا ہے کہ بظاہر اس کو اس کے کفر سے اس وقت کوئی باز نہیں رکھ سکتا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کی یہ حالت اس کو اللہ کے عذاب سے بھی بچا لے گی خواہ وہ حالت مال کی وجہ سے ہو خواہ آل و اولاد کی وجہ سے۔ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا یہ جو اس کو وقتی طور پر کفر کرتے دیکھ کر اللہ کی پکڑ نہیں آرہی تو یہ اس کا دراصل قانون ہے کہ وہ کسی مجرم کو جرم کرتے ہی نہیں پکڑ لیتا بلکہ اکثر اوقات اس کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اس لئے کہ اس کا قانون مشیت یہ نہیں چاہتا کہ اس کو فوراً پکڑ لیا جائے لیکن جب اس کی پکڑ کا وقت آجاتا ہے تو اس کو اس طرح دھر لیا جاتا ہے کہ نہ تو اس کو وہ طاقت ہی کچھ کام آتی ہے جو آل و اولاد کی وجہ سے تھی اور نہ ہی اس کے کام وہ خزانے اور دولت کے ڈھیر آسکتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (ال عمران ۳ : ۱۱۶) "بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تو نہ تو مال و دولت کی طاقت انہیں عذاب الٰہی سے بچا سکے گی اور نہ آل و اولاد کی کثرت ہی ان کے کچھ کام آئے گی۔ وہ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے۔"

موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں قوم فرعون تھی اور آپ ﷺ کے مقابلہ میں اہل کتاب

۲۸ "داب" کے اصل معنی ہیں کہ کوشش اتنی کی کہ کوشش کر کر کے تھک گیا۔ یہاں مراد ہے ان کا کفر میں سخت زور لگانا اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مقابلہ یا مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار بننا۔ جیسا کہ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ یا مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار ہوئے تھے۔ پھر فرمایا کہ فرعون اور اس کے لوگوں نے بھی تو موسیٰ علیہ السلام کے خلاف وہی کچھ کیا تھا جو اس سے بھی پہلی قوموں کے لوگ اپنے اپنے نبی کے ساتھ کرتے آرہے تھے۔ ان سب نے کیا کیا تھا؟ یہی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی تعلیم کو ٹھکرا دیا وقت کے نبی اور اس پر نازل شدہ آیات کریمات کو جھٹلایا اور آج یہی کام خود بنی اسرائیل کے دونوں گروہ یعنی یہود و نصاریٰ اسلام اور بانی اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

پھر ان کو یہ بھی تو یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح ان لوگوں کو اللہ نے عذاب میں مبتلا کیا یعنی فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو اور پہلی قوموں کے رؤسا اور مترفین کو بالکل اسی طرح ان کو بھی پکڑ لیا جائے گا جو اس نبی

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝
قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ

سے پہلے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے اللہ کی نشانیاں جھٹلائیں تو اللہ نے انہیں مکافات[۲۹] عمل میں پکڑ لیا اور یاد رکھو کہ وہ بہت ہی سخت سزا دینے والا ہے۔ ۱۱

اے پیغمبر اسلام! جن لوگوں نے کفر کی[۳۰] راہ اختیار کی ہے ان سے کہہ دو "وہ وقت دور نہیں جب تم بھی مغلوب ہو جاؤ گے اور دوزخ کی طرف ہنکائے جاؤ گے ذرا خیال

امی ﷺ کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اس لئے کہ اللہ کی طرف سے جب پکڑ آتی ہے تو وہ بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے جتنی کہ اس نے پہلے ڈھیل دے رکھی تھی۔

گناہ سے یہاں وہی گناہ مراد ہیں جو ان سے سرزد ہوئے بلکہ انہوں نے جان بوجھ کر کئے

۲۹ "ذنوب" جمع ہے ذنب کی اور اس کے معنی بہت وسیع ہیں دراصل یہ ہر ایک اس فعل پر استعمال ہوتا ہے جس کا انجام ناگوار اور گراں ہو۔ جس طرح "اثم" ہر ایک فعل کا نام ہے جو ثواب سے انسان کو روکتا ہے اور "ذنب" کے معنی الزام کے بھی ہوتے ہیں۔ جو فرق ملزم اور مجرم میں ہے وہ سب پر واضح ہے کہ ملزم بعض اوقات مجرم نہیں ہوتا اس پر فقط ایک الزام ہوتا ہے جو دلائل و براہین سے رفع بھی ہو سکتا ہے اور مجرم جرم کا مرتکب ہوتا ہے جو جرم سے بری نہیں ہو سکتا۔ اس لئے "ذنب" کی نسبت نیک اور بد دونوں کی طرف ہو سکتی ہے۔ چونکہ "ذنب" کے معنی دم اور پچھلے حصے کے بھی ہوتے ہیں اس لئے "ذنب" کبھی اس گناہ پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی انسان کے پیچھے دم کی طرح لگا دیئے جاتے ہیں جس طرح پراپیگنڈہ کرنے والے فرضی دلائل دے کر کسی کی ذات کو مجروح کر دیتے ہیں حالانکہ وہ شخص اس فعل کا مرتکب نہیں ہوتا بالکل اسی طرح بعض نیک لوگوں کے پیچھے بھی بدبخت لوگ کچھ ایسے الزام لگا دیتے ہیں جن کے وہ بالکل مرتکب نہیں ہوتے اور آج کل یہ مرض عام ہے اس لئے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اس جگہ وہ گناہ مراد ہیں جن کے وہ لوگ مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ ان "ذنوب" کا نتیجہ یہ بات واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اندھیر تو نہیں ہے کسی نے ایک گناہ نہ کیا ہو اور اللہ اس کی سزا دے دے۔ ہاں لوگوں کی طرف سے کوئی سزا ہوتی تو ممکن تھا۔ یہاں الفاظ خود اس کی وضاحت کر رہے ہیں کہ وہ لوگ ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور بار بار ہوئے ہیں اور ان کو کافی مدت تک ڈھیل دی جاتی رہی ہے لیکن

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا

کرو کہ جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو[۳۱] اس کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۱۲

تمہارے لئے ان دو گروہوں[۳۲] میں بڑی ہی نشانی تھی جو میدان بدر میں ایک

انجام کار جب وہ ان گناہوں سے باز نہیں ہوئے بلکہ روز افزوں ترقی ہی کرتے گئے تو آخر کار قانون الٰہی کے مطابق اپنے وقت پر اللہ نے ان پر گرفت کر لی اور اللہ کی گرفت جب آتی ہے تو کوئی اس کو نہ تو روک سکتا ہے اور نہ ہی ٹال سکتا ہے مگر وہ خود ہی۔

مخالفین کو للکارا جا رہا ہے کہ اپنا پورا زور لگا لو

۳۰ کہا جاتا ہے کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" للکارتا کون ہے؟ جس میں پوری طاقت و قوت ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ "بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں" اس جگہ اعلان اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جا رہا ہے اور حکم الٰہی ہو رہا ہے کہ ان کفر کی روش اختیار کرنے والوں کو بتاؤ کہ خوب کان کھول کر سن لو کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ تم مغلوب کر دیئے جاؤ گے اور تمہارا یہ زور اس طرح بیٹھ جائے گا جس طرح پانی کا جھاگ کہ پانی کا زور ختم ہوا اور جھاگ کا نشان تک باقی نہ رہا۔ گویا اس طرح ان پر یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اس دنیا میں بھی تمہارا زور اب زیادہ دنوں تک نہیں چلے گا اور یہ بات تمہیں اس وقت بتائی جا رہی ہے جب تم کو اپنے زوال کا خیال تک بھی نہیں تاکہ اگر سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ اور وقت ہے توبہ کر لو اگر نہیں تو دنیا کی جن چیزوں پر تم کو انحصار ہے ان کو اور جمع کر لو تاکہ کل تم کو پچھتاوا نہ رہے کہ ہم سے سستی ہو گئی اور ہم یہ نہ کر سکے نہیں تم خوب چوکس ہو جاؤ اور کان کھول کر سن لو کہ تمہاری ڈھیل کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا معجزہ قرآنی ہے کہ مخالفین کے ساتھ کوئی داؤ اور فریب نہیں لگایا جا رہا بلکہ ان کو بطور نصیحت آگاہ کیا جا رہا ہے اس پروگرام سے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے ہو چکا ہے۔

دنیا کی رسوائی کے ساتھ آخرت کے انجام سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے

۳۱ دوہرے مجرموں کو دوہری سزا سنائی جا رہی ہے لیکن اس وقت جب مجرم ابھی بپھرے ہوئے ہیں اور جرم پر مصر ہیں۔ اسی حالت میں ان کے کانوں تک صدا پہنچائی جا رہی ہے کہ "تحشرون" کہ تمہاری جماعت کو اکٹھا کر کے تمہاری جائے قرار سے نکال کر اور تم کو بے آرام کر کے ایک بار میدان جنگ کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا اور پھر تمہاری دوسری سزا کیلئے جہنم کے دروازوں تک بھی اسی حالت میں جانا ہو گا جس طرح دنیوی ذلت تمہارا مقدر بن چکی ہے اسی طرح تمہاری آخرت بھی تمہارے لئے پھانسی کے پھندے سے

کم نہیں ہوگی اور وہ حالت اتنی بری ہے کہ اس حالت سے تو نکلنے کی صورت کم از کم یہ ہوئی کہ موت آگئی خواہ میدان جنگ میں ذلت ہی کی موت سہی لیکن وہاں کی رسوائی تو ایسی رسوائی ہے کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں اس لئے کہ وہاں تو موت کا کوئی تصور ہی نہیں۔

میدان بدر میں دونوں پارٹیوں کا آمنا سامنا

۳۲ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے ۸/ ربیع الاول ۱۳ نبوی مطابق ۲/ ستمبر ۶۲۲ کو قباء میں داخل ہوئے۔ اس جگہ آپ ﷺ نے چودہ روز قیام کیا اور ازیں بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ قریش مکہ یہاں بھی امن سے بیٹھنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ آئے دنوں شرارتوں پر شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ بار بار مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ جہاد فی سبیل اللہ کی اجازت دے دی۔ ادھر قریش مکہ نے عبداللہ بن ابی کو لکھ بھیجا کہ یا تو "محمد" کو قتل کر دو یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔

لڑائی کی سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا اس لئے مکہ کے لوگوں نے مل کر ایک تجارتی قافلہ شام کو روانہ کیا اور مکہ کی تمام آبادی میں جتنی رقم تھی سب کی سب اسی سامان تجارت میں لگا دی۔ قریش مکہ کا قافلہ شام سے روانہ ہوا ہی تھا کہ مکہ میں یہ خبر گرم ہوگئی کہ اس قافلہ کو لوٹنے کیلئے مدینہ میں تیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ خبریں گرم کرنے والے دراصل منافق تھے جو چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے جن کو مسلمان کہا جاتا ہے۔

ادھر مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ مکہ والے پوری تیاری کر کے مدینہ پر حملہ آور ہو رہے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے بھی اپنے دفاع کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور واقعہ کی اطلاع دی مہاجرین پوری طرح جہاد کیلئے تیار تھے لیکن آپ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے تھے۔ اسی اثناء میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو سردار خزرج تھے اٹھے اور کہا کیا حضور ﷺ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم آپ ﷺ فرمائیں تو ہم سب جان نثار کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا خدا جا کر لڑیں ہم لوگ آپ ﷺ کے داہنے' بائیں' آگے اور پیچھے ہر طرف سے لڑیں گے آپ ﷺ کا چہرہ دمک پڑا۔ غرض ۱۲/ رمضان المبارک ۲ھ کو آپ ﷺ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر مدینہ سے نکلے تقریباً ایک میل دور نکل کر لوگوں کا جائزہ لیا جو کم عمر نکلے ان کو واپس کیا لیکن عمیر بن ابی وقاص ایک کم عمر صحابی تھے جب ان کو واپسی کیلئے کہا گیا تو وہ رو پڑے آخر کار نبی کریم ﷺ نے اجازت دے دی اور ان کے حقیقی بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے کم عمر مجاہد بھائی کے گلے میں تلوار لٹکائی۔ گنتی کی گئی تو ۳۱۳ آدمی تعداد میں ہوئے جن میں سے ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ ان میں سے بھی ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرما کر واپس مدینہ جانے کا حکم فرمایا۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ

دوسرے کے مقابل ہوئے تھے اس وقت ایک گروہ[۳۳] تو اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا دوسرا منکرین حق کا تھا جنہیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے دوچند[۳۴] ہیں

آپؐ اس قلیل لشکر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ۱۷/ رمضان المبارک کو بدر کے قریب پہنچے خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر نبی ﷺ یہیں رک گئے اور فوج کو اتر پڑنے کا حکم دیا۔

قریش بڑے ساز و سامان سے نکلے تھے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی اور رؤسائے قریش سب کے سب ساتھ تھے سوائے ابولہب کے۔ رسد کا یہ حال تھا کہ ہر ایک سردار روزانہ دس اونٹ ذبح کیا کرتا تھا جو لوگوں میں پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔ یہاں بدر کے میدان میں پہنچ کر قریش کو معلوم ہوگیا کہ ابوسفیان کا قافلہ بخیریت خطرہ کی زد سے نکل کر مکہ کی طرف نکل گیا ہے اور مسلمانوں نے ان کو چھیڑا تک نہیں تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا اب لڑنا ضروری نہیں لیکن ابوجہل نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے لیکن باقی فوج آگے بڑھی۔

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب جگہ پر قبضہ کر لیا بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ پاؤں ریت میں دھنس جاتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام منتخب کیا گیا ہے کیا وحی کی رو سے ہے؟ یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا وحی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جگہ ہی کونسی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی تائید چونکہ ساتھی تھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں مینہ برسا دیا جس سے گرد جم گئی اور ریت سخت ہوگئی جس سے قدم جم گئے اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے تاکہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرمایا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ (الانفال ۸ : ۱۱) "اور جب اللہ نے آسمان سے تم پر پانی برسایا تاکہ تم کو اس سے پاک و صاف کر دے۔"

اس آیت میں بھی مخاطب اہل کتاب ہی ہیں کہ اہل کتاب اس نبی کریم ﷺ کی بشارات جو تم اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہو ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا مطالعہ کر کے دیکھو کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی پہلے ہی خبر دے دی کہ جنگ بدر میں کفار ناکام اور مسلمان کامیاب ہوں گے۔ پھر نتیجہ کیا رہا؟ وہی جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو کامیابی ہوگی اور وہ بھی اتنے صاف الفاظ میں اور قریش مکہ کے سرداروں کے نام لے لے کر نشاندہی فرما دی کہ ابوجہل اس جگہ مرے گا اور عتبہ کی نعش اس جگہ تڑپے گی اور وہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے زیر نظر آیت میں بیان فرمایا ہے کہ "ان دونوں گروہوں میں جن کی آپس میں مڈبھیڑ ہوگئی تمہارے لئے ظاہر نشان تھا۔"

ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کفر کی راہ میں

۳۳ دونوں فریق ہی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ آزما تھے لیکن ایک فریق حق کی راہ میں جان دینے کی خاطر میدان میں نکلا تھا اور دوسرا کفر کو طاقتور کرنے کیلئے۔ پھر حق کی راہ میں لڑنے والے یعنی مسلمان دیکھ رہے تھے کہ کفار ہم سے دوچند یا اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور ان کے پاس ہر قسم کا سامان حرب بھی موجود ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ ہم نہتے بھی ہیں اور تھوڑے بھی لیکن اس کے باوجود ان کی ہمتیں بلند تھیں اس لئے کہ وہ جس مقصد کیلئے جنگ آزما تھے وہ مقصد دنیوی زندگی سے بڑھ کر آخرت کی کامیابی کا مقصد تھا۔ جاں نثار صفیں باندھے گروہ مخالفین سے لڑ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ بارگاہ رب ذوالجلال سے دست بدعا تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ :

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال وھو فی قبہ لہ یوم بدر انشدک عھدک ووعدک اللھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابدا فاخذ ابوبکر بیدہ وقال حسبک یا رسول اللہ فقد الحت علی ربک وھو فی الدرع فخرج وھو یقول سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ۔ (صحیح بخاری)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ ایک چھوٹے سے خیمے میں تھے اور بارگاہ ایزدی میں یوں دعا کر رہے تھے۔ میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں اے اللہ اگر تیری ایسی ہی مشیت ہے تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش نہیں کی جائے گی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ اپنے رب پر الحا یعنی عاجزی و زاری کی۔ آپ ﷺ نے زرہ پہنی ہوئی تھی پس آپ ﷺ اس خیمہ سے باہر نکلے اور زبان اقدس پر جاری تھا سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (القمر ۵۴ : ۴۶) "عنقریب یہ لوگ شکست خوردہ ہوں گے اور سب پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ جنگ بدر میں وہ ہزیمت اٹھا کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہیں پر ان کا معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان سے نمٹنے کا اصل دن تو قیامت کا دن ہے جو بڑا سخت اور نہایت ہی تلخ ہے۔"

غور کرو کہ نزول آیت کے وقت مسلمانوں کی بے بسی اور بے سروسامانی و زبوں حالی کو دیکھ کر کوئی بھی انسانی دماغ یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ حکومت مکہ یا دولت یہود کسی سے بھی یہ ایسی زبردست ٹکر لے سکتے

تھے۔ اس سے قرآن کریم کی پیش گوئی کا اعجازی رنگ ہر صورت میں عیاں ہے۔ کیونکہ گروہ مومنین تعداد میں قلیل اور سروسامان میں حقیر یعنی تعداد کے لحاظ سے کل ۳۱۳ آدمی تھے اور وہ بھی بغیر سامان حرب کے۔ اونٹ اتنے تھے کہ چار پیادوں کیلئے ایک اونٹ سواری کیلئے نکلتا تھا اور گھوڑے کل دو تھے اور آہنی زرہیں سب لوگوں میں صرف سات تھیں اور تعداد کے لحاظ سے تیسرا حصہ تھے اللہ تعالیٰ کا یہ احسان کہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی آنکھوں میں صرف دوچند کر کے دکھایا تاکہ عام مسلمانوں کے حوصلے بھی بلند ہوں۔

"وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ" یہ لشکر حکومت مکہ کا تھا۔ تعداد میں مسلمانوں سے سہ چند یعنی ۹۵۰ آدمی اور قریش کے بہترین سواروں کی زیر قیادت اور ہر ضروری سامان سے آراستہ۔ ان میں تقریباً سات سو اونٹ تھے اور ان میں سے تقریباً ایک صد زرہ پوش بھی تھے۔ کیا کثرت تعداد ان کفار کے کام آئی؟ ہرگز نہیں بلکہ ان کیلئے ان کی جمعیت ہی شکست کا باعث ہوئی اور مٹھی بھر مسلمانوں کو وہ کامیابی نصیب ہوئی کہ ان کا نام رہتی دنیا تک روشن کر دیا۔

میدان بدر کا نقشہ قرآن کریم کی نظر میں

۳۴ "مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ منکرین حق ان کے دوچند ہیں" اس کے باوجود منکرین حق کو شکست ہوئی۔ معاملہ اس طرح ہوا کہ تیرے رب نے سچائی کے ساتھ تجھے تیرے گھر سے باہر نکالا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ اس بات سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ سے امر حق میں جھگڑنے لگے باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ وہ باہر نکل کر مقابل ہونے سے اس درجہ ناخوش تھے گویا انہی زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے اور وہ اپنی موت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اور مسلمانو! جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا کہ دشمنوں کی دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی اور تمہارا حال یہ تھا کہ تم چاہتے تھے جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہیں یعنی قافلہ والی ہاتھ آجائے اور اللہ کا چاہنا دوسرا تھا۔ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے وعدے کے ذریعہ حق کو ثابت کر دے اور دشمنان حق کی جڑیں ہی کاٹ کر رکھ دے اور یہ اس لئے تاکہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر کے اگرچہ ظلم و فساد کے مجرم ایسا ہونا پسند نہ کریں۔

یہ دن وہ دن تھا کہ تم ادھر قریب کے کنارے پر تھے اور دشمن ادھر دور کے کنارے پر تھا اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں یعنی سمندر کے کنارے کنارے نکل گیا اور اگر تم نے آپس میں لڑائی کی بات ٹھہرائی ہوتی تو ضرور اس جنگ سے لوگ گریز کرتے کیوں؟ اس لئے کہ تمہیں دشمنوں کی کثرت سے اندیشہ تھا اور تم میں سے بہتوں کی نظریں تو قافلہ پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو آپس میں بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے نیز اس لئے بھی کہ جسے ہلاک ہونا تھا اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ

رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ

اس کے باوجود منکرین حق کو شکست فاش ہوئی اور جس کو چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق اپنی نصرت سے مددگاری فرماتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں اس معاملہ میں بڑی ہی عبرت[۳۵] ہے۔ ۱۳

عام انسان کے لئے مرد و عورت کے رشتہ میں' اولاد میں' چاندی سونے کے ذخیروں

رہنے والا ہے اتمام حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

اور اے پیغمبر اسلام! یہ وہ دن تھا کہ اللہ نے تجھے خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھا دی اور اگر انہیں بہت کر کے دکھاتا تو مسلمانو! تم ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملہ میں جھگڑنے لگتے۔ اللہ نے تمہیں اس صورتحال سے بچا لیا۔ یقین کرو جو کچھ انسان کے سینے میں چھپا ہوتا ہے وہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں اور پھر کیا ہوا کہ جب تم دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہوئے تھے اور اللہ نے ایسا کیا تھا کہ دشمن تمہاری نظروں میں تھوڑے دکھائی دیتے اور ان کی نظروں میں تم تھوڑے دکھائی دیتے کیونکہ بظاہر تعداد میں وہی زیادہ تھے اور یہ اس لئے کیا کہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے اور سارے کاموں کا دارومدار اللہ ہی کی ذات پر ہے۔ مسلمانو! جب حملہ آوروں کی کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو لڑائی میں ثابت قدم رہو اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

سورۃ الانفال کی ان آیات کریمات میں جنگ بدر کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ فرمایا اللہ کی مخفی تدبیروں کی کرشمہ سازی دیکھو ادھر دشمنوں کا گروہ بڑھا چلا آتا تھا ادھر تم شہر سے نکل کر ایک قریبی نالے میں پہنچے تھے اور ابوسفیان کا قافلہ تھا کہ نشیب میں گزر رہا تھا۔ تم اپنی کمزوری کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اس سے مقابلہ ہو لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قافلہ تو نکل گیا اور مقابلہ ہوا حملہ آوروں سے اور تمہاری مٹھی بھر کمزور جماعت نے اسے ہرا کر بھگا دیا اور اس ضمن میں اس خواب کا بھی ذکر فرما دیا جو جنگ بدر کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تھا اور جس میں دشمن ناکام اور مسلمان فتح مند دکھائے گئے تھے یہ خواب مسلمانوں کیلئے مزید تقویت کا باعث ہوا تھا۔

اہل کتاب کے ان لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جو صاحب دانش ہیں

۳۵ آیت کے آخری حصہ میں بھی اہل کتاب کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر تم عقل سلیم اور بینا آنکھ

الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

میں' خاص نسلی گھوڑوں میں' دوسرے مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دل لبھانے والی

رکھتے ہو تو دیکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ اس مٹھی بھر گروہ مسلم کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ کیا یہی بات نہیں کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو سچے دل سے اللہ کا رسول تسلیم کیا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی اس پیشگوئی پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہیں اور ایمان کی طاقت ہی وہ طاقت ہے جو سب طاقتوں سے بازی لے جانے والی ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ کی نصائح ہی وہ نصائح ہیں جن کو بطور نصیحت قبول کر لینے سے کامیابی و کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی زبان اقدس سے چھ باتوں پر زور دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ فتح و کامرانی کا اصل سرچشمہ یہی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ :

۱۔ ثابت قدم رہو کیونکہ میدان جنگ کی ساری کامیابی اسی کیلئے ہوتی ہے جو آخر تک ثابت قدم رہے۔

۲۔ بہت زیادہ اللہ کو یاد کرو کیونکہ جسم کا ثبات دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل اس کا مضبوط رہے گا جو اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور رسول کے بعد اپنے امام و سردار کی کیونکہ بغیر اطاعت یعنی ڈسپلن کے کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۴۔ باہمی نزاع سے بچو' ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور بات بگڑ جائے گی اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

۵۔ کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں جھیلتے رہو۔ بالآخر جیت اسی کی ہے جو زیادہ جھیلنے والا ہوگا۔

۶۔ کافروں کا سا چلن اختیار نہ کرو جو ایمان و راستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تمہارے کاموں کی بنا پر خدا پرستانہ عجز و اخلاص پر ہونی چاہئے۔

یہی وہ اصول ہیں جن میں اسلام کی کامیابی کا اب بھی راز ہے۔ ان پر غور کر کے مسلمان قوم کو انہی سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور آج بھی یہ کلید کامیابی ہے اور اہل بصیرت وہی ہیں جو ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا دل لبھانے والی چیزیں کیا ہیں ؟

۳۶ اس آیت میں دنیا کی چند اہم مرغوب چیزوں کا نام لے کر بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوش نما بنا دی گئی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھلا

بیٹھتے ہیں۔ جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر انسانی رغبت و محبت کا مرکز ہیں جن کو بالکل اسی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے جو فطرت کے اندر مرغوب ہونے کے درجہ کے عین مطابق ہے دیکھو سب سے پہلے عورت کو اور اس کے بعد اولاد کو بیان کیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان جتنی چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے ان سب کا اصل سبب عورت یا اولاد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد سونے چاندی اور مویشی اور کھیتی کا ذکر ہے کہ یہ دوسرے نمبر میں انسان کی رغبت و محبت کا مرکز ہوتے ہیں۔

زیر نظر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسانوں کے دلوں میں ڈال دی گئی ہے جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر انسان طبعی طور پر ان چیزوں کی طرف مائل اور ان سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا کسی کو کیا غرض تھی کہ وہ کھیتی کرنے کی مشقت اٹھاتا یا مزدوری و صنعت کی محنت برداشت کرتا یا تجارت میں اپنا روپیہ اور محنت صرف کرتا۔ دنیا کی آبادی اور بقاء اس میں مضمر ہے کہ لوگوں کے طبائع میں ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی گئی ہے جس سے وہ خود بخود ان چیزوں کو مہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں ہر وقت اور ہر آن لگے ہوئے ہیں۔

مالدار اس فکر کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے کہ پیسے خرچ کر کے کوئی مزدور لائے جس سے اپنا کام نکالے۔ تاجر بہتر سے بہتر سامان مہیا کر کے گاہک کے انتظار میں بیٹھتا ہے کہ پیسے حاصل کرے۔ گاہک سو کوشش کر کے پیسے لے کر بازار پہنچتا ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کا سامان خریدے۔ غور کرتے جاؤ اور دیکھتے جاؤ کہ دنیا کی انہیں مرغوبات کی محبت نے انہیں اپنے اپنے گھر سے نکالا اور دنیا کے تمدنی نظام کو نہایت مضبوط و مستحکم اصولوں پر قائم کر دیا۔

ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ اگر دنیوی نعمتوں سے رغبت و محبت انسان کے دل میں نہ ہو تو اس کی اُخروی نعمتوں کو نہ ذائقہ معلوم ہوگا نہ ان میں رغبت ہوگی تو پھر اس کو کیا ضرورت کہ وہ نیک کام کرے اگرچہ اس کیلئے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اور وہ برے کام سے بچے اگرچہ وہ اس کیلئے کتنا ہی مرغوب کیوں نہ ہو تاکہ وہ عذاب دوزخ سے نجات پائے اور پھر یہ بھی حق ہے کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں پیدا کر کے انسان کا امتحان لیا جائے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتا ہے اور کون ہے جو ان چیزوں کی اصل حقیقت اور ان کے آنی فانی ہونے پر مطلع ہو کر ان کی فکر بقدر ضرورت کرتا ہے ان کو آخرت کی درستگی کے کام میں لاتا ہے قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ خود اس تزئین کی یہی حکمت بتلائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الکھف ۱۸ : ۷) "ہم نے ہر اس چیز کو جو زمین میں ہے اس کی زینت بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون ہے جو اچھے عمل کرتا ہے۔"

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ

خوشنمائی رکھ دی گئی ہے لیکن یہ جو کچھ ہے صرف اور صرف دنیوی زندگی کا فائدہ[۳۷] اٹھانا

دنیا کی ہر چیز دنیوی فائدہ ہی کیلئے ہے جب کہ دنیا ہی کی خاطر ہو

۳۷ "متاع" دراصل اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی حیثیت سے کچھ مدت کیلئے نفع حاصل کیا جائے اور "مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" سے مقصود یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں بہت زیادہ دل لگانے کے قابل نہیں اگرچہ دنیوی زندگی کے برتنے میں مفید و معین ہوں۔ سو ان کی قدر اس حد تک ہی کرنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ یہ مقاصد حیات بن جائیں۔ جب کہ دنیا خود ہی فانی ہے اور اس کے یہ سارے سازوسامان آخر کیوں فانی نہ ہوں گے؟

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانعام ۶ : ۳۲) "اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے مگر ایک طرح کا کھیل اور تماشہ جو متقی ہیں ان کیلئے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے۔ افسوس تم پر کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

ایک جگہ ارشاد ہے :

"جو کوئی صرف دنیا کی زندگی اور اس کی دل فریبیاں ہی چاہتا ہے تو ہمارا بنایا ہوا قانون یہ ہے کہ اس کی کوشش و عمل کے نتائج یہاں پر پورے پورے دے دیتے ہیں ایسا نہیں ہوتا کہ دنیا میں اس کے ساتھ کمی کی جائے۔ لیکن یاد رکھو یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے آخرت کی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے یہاں بنایا ہے سب اکارت جائے گا یعنی یہیں کا ہو کر رہ جائے گا اور جو کچھ کرتے رہے ہیں سب کا سب نابود ہونے والا ہے۔" (ھود ۱۱ : ۱۵، ۱۶) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اللہ جس کی روزی چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے۔ لوگ دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کے عارضی فوائد پر شادمانیاں کرتے ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی تو آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے محض تھوڑا سا فائدہ ہے جو عارضی طور پر برت لینا ہے۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"جو کوئی فوری فائدہ اس دنیا میں چاہتا ہے تو جس کسی کو ہم دینا چاہتے ہیں اور جتنا دینا چاہتے ہیں اسی دنیا میں دے دیتے ہیں۔ پھر آخر کار اس کیلئے جہنم بنا دی ہے اس میں داخل ہوگا بدحال ٹھکرایا ہوا۔ لیکن جو کوئی آخرت کا طالب ہوا اور اس کیلئے جیسی کچھ کوشش کرنی چاہئے ویسی کوشش کی نیز وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو اس

وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ط لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا

ہے اور بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے جو مرنے کے بعد نصیب ہوگا جس کو نصیب ہوگا۔ ۱۴

اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو میں تمہیں بتاؤں زندگی کے ان فائدوں سے بھی

کیلئے دائمی کامیابیاں ہیں اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی۔ ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری بخشائشوں سے دنیا میں مدد دیتے ہیں ان کو بھی کہ جو صرف دنیا ہی کے پیچھے پڑ گئے اور ان کو بھی کہ جو آخرت کے طالب ہوئے اور راہ حق پر چلے اور پیغمبر اسلام! تیرے رب کی بخشش عام کسی بندے پر بند نہیں ہے۔

"دیکھو ہم نے کس طرح یہاں بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر برتری دے دی ہے کہ کوئی کسی حال میں نظر آتا ہے کوئی کسی حال میں اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے درجے سب سے بڑھ کر ہیں اور سب سے برتر۔"

(بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۸ تا ۲۱)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"مال و دولت اور آل و اولاد دنیوی زندگی کی دل فریبیاں ہیں وہ بھی چند روزہ بناؤ پائیدار اور جو نیکیاں باقی رہنے والی ہیں وہی تمہارے رب کے نزدیک بہ اعتبار ثواب کے بہتر ہیں اور وہی ہیں جن کے نتائج سے بہتر امید رکھی جا سکتی ہے۔" (الکہف ۱۸ : ۴۶)

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ محض دنیوی زندگی کا سروسامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور باقی رہنے والا ہے کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔"

(القصص ۲۸ : ۶۰)

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور یہ دنیا کی زندگی جو تعلق باللہ سے بالکل خالی ہے اس کے سوا اور کیا ہے کہ فانی خواہشات کے بہلانے کا ایک کھیل ہے اصل زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے کاش وہ جانتے۔" (العنکبوت ۲۹ : ۶۴)

ایک جگہ ارشاد ہے :

"خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری آرائش اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر

عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا

بہتر تمہارے لئے کیا ہے؟ جو لوگ متقی ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے۔ ان کی پاک بیویاں

جتانا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش، کہ اس سے پیدا ہونے والی نباتات کاشت کاروں کو خوش کرتی ہیں پھر وہ پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہیں اور آخرت میں تو سخت عذاب ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضامندی ہے اور دنیا کی زندگی کیا ہے؟ بس ایک سرمایہ فریب ہے۔" (الحدید ۵۷ : ۲۰)

حسن انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے

۳۸ دائمی اور غیر فانی راحت کیلئے فکر و اہتمام صرف اللہ کی رضا کا رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی لذت بھی بے بساط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں دنیوی زندگی میں صرف کام چلانے کیلئے ہیں دل لگانے کیلئے نہیں اور اچھا ٹھکانہ تو اللہ ہی کے پاس ہے یعنی وہ ٹھکانا جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اور جس کی نعمتیں اور لذتیں نہ فنا ہونے والی ہیں نہ کم یا ضعیف ہونے والی ہیں۔ جیسا کہ آگے ارشاد فرمایا:

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ (ال عمران ۳ : ۱۵) اس میں نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ان لوگوں سے جو دنیا کی ناقص اور فانی نعمتوں میں مست ہو گئے ہیں فرما دیجئے کہ میں تمہیں ان سے بہتر نعمتوں کا پتہ دیتا ہوں جو اللہ سے ڈرنے والوں اور اس کے فرمانبرداروں کو ملیں گی وہ نعمتیں سرسبز و شاداب باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ہر قسم کی گندگی سے پاک و صاف بیبیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے۔

آخرت کی زندگی عارضی نہیں اور نہ ہی اس کی نعمتیں عارضی ہیں

۳۹ اہل جنت کیلئے جو جو انعامات قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ نام صرف انہی چیزوں کا لیا جا سکتا ہے جن سے انسان مانوس ہے اور ان کو جانتا اور سمجھتا ہے اس لئے قرآن کریم نے وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ کے الفاظ بیان فرما کر واضح کر دیا کہ وہ اس وقت جو چاہیں گے۔ کیونکہ ہماری خواہشات وہی ہیں جو اس دنیا کے متعلق ہیں اور وہاں پہنچ کر خواہشات کیاں ہوں گی؟ کسی کو

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۵

اُن کے ساتھ ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کا حال دیکھ رہا ہے۔ ۱۵

معلوم نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جب تک ہم نے اس دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا تو ان خواہشات سے ناواقف تھے اس دنیا میں آئے تو یہ خواہشات ہمارے ساتھ آئیں اور جوں جوں ہم ترقی کرتے گئے خواہشات ساتھ ساتھ بدلتی رہیں۔ وہاں جائیں گے تو وہاں کی خواہشات سے مانوس ہوں گے اور جو وہاں خواہشات ہوں گی ان کے مطابق یقیناً سب کچھ ملے گا۔

یعنی جنت والوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے۔ اس جامع اعلان کے بعد کسی خاص نعمت کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان میں سے جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہی الفاظ اور انہی اشیاء کے ساتھ کیا گیا ہے جن چیزوں اور جن اشیاء سے ہم اس وقت مانوس ہیں جیسے یہ کہ وہاں سرسبز باغات اور حسین و جمیل عورتیں اور سب سے بڑھ کر اس محبوب حقیقی اور ان دیکھی ذات کی دائمی رضا اور خوشنودی کے ساتھ دیدار رب ذوالجلال والاکرام۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب سب اہل جنت جنت پہنچ کر مسرور و مطمئن ہو چکیں گے اور کوئی تمنا نہ رہے گی جو پوری نہ کر دی گئی ہو تو اس وقت حق تعالیٰ خود ان اہل جنت کو خطاب فرمائیں گے کہ اب تم راضی و مطمئن ہو، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں وہ عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار آپ نے اتنی نعمتیں عطا فرما دیں کہ ان کے بعد اور کسی چیز کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے؟ حق تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے گی کہ اب تم کو ان سب نعمتوں سے بالاتر ایک نعمت دیتا ہوں وہ یہ کہ تم سب کو میری رضا اور قرب دائمی طور پر حاصل ہے۔ اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔

متقین لوگوں کا ذکر قرآن کریم نے بار بار کیا ہے اور ان کے انعامات کا بھی لیکن اپنے پروردگار سے ڈرنے والوں کا ذکر پہلے صحائف میں بھی بکثرت موجود ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے اور آج بھی وہ مقدس نوشتے باوجود تحریف ہونے کے ان کے ذکر سے خالی نہیں چنانچہ انجیل میں آج بھی موجود ہے کہ :

"اور اس کا رحم ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں پشت در پشت رہتا ہے۔" (لوقا ۱ : ۵)

"آؤ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی آلودگی سے پاک کر دیں اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں۔" (کرنتھوں ۷ : ۱)

اور وہ وقت آپہنچا ہے کہ بڑے بڑے نبیوں اور مقدسوں اور ان چھوٹے بڑوں کو جو تیرے نام سے ڈرتے ہیں اجر دیا جائے۔"

الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَ

یہ متقی انسان وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم تجھ پر ایمان لائے پس ہمارے گناہ بخش دے اور عذاب جنہم سے ہمیں[۴۱] بچا لے۔ ۱۶
صبر کرنے[۴۲] والے نہایت ہی[۴۳] سچے لوگ، نیکی کی راہ میں خرچ کرنے[۴۴] والے اور رات

نیک و بد ہر ایک کے حال سے اللہ تعالیٰ واقف ہے

۴۰ "اللہ اپنے بندوں کے ہر حال کو اچھی طرح دیکھنے والا ہے۔" اور ان کے احوال و اقوال اور اعمال کے ایک ایک جزئیہ سے پوری طرح خبردار ہے پس اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی حساب یا صدور جزاء سے رہ جائے۔ اس کی تفصیل پیچھے جگہ جگہ گزر چکی ہے اور آئندہ بھی بیان ہوگی کیونکہ اس کا ذکر قرآن کریم کے صفحات میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

جن لوگوں کی پکار ایک اور صرف ایک ہی ہے

۴۱ "اے ہمارے رب! ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں پس ہمارے گناہ بخش دے اور عذاب جنہم سے ہمیں بچا لے۔" یہ کہنے والے کون ہیں؟ وہی ہیں جن کا ذکر الذین اتقوا کے ماتحت چل رہا ہے۔ یہ اپنے اعمال و احوال پر نازاں ہونا تو الگ رہا الٹے فرط خشیت و ہیبت سے اپنی مغفرت اور حسن خاتمہ کیلئے مناجات کرتے رہتے ہیں اور مناجات میں سب سے پہلے اقراری ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول اور اس کی شریعت پر ایمان لائے ہیں اور پھر ایمان پر معاً طلب مغفرت کو مرتب کرتے ہیں اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ مغفرت میں اصل حائل عدم ایمان ہی ہوتا ہے۔ جب یہ مانع نہ رہا بلکہ رفع ہوگیا تو اب کیا ہے؟ اب ہماری انسانی اور فطری خطائیں ہیں اور لغزشیں ہیں جو عزم و ارادہ نہ ہونے کے باوجود سرزد ہو ہی جاتی ہیں اور یہ بھی ہمارے ایمان ہی کا جزو ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا معاف کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ایمان بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی انتہائی اہمیت اس آیت سے ظاہر ہو رہی ہے۔ نیک لوگوں کی یہی ایک پکار ہے کہ ان کو جب بھی دیکھو وہ اللہ ہی کی پکار میں لگے ہوئے ہیں اور ان کو جو کچھ طلب کرنا ہے سب اس سے طلب کرنا ہے اور غیر کی طرف ان کا کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ تفصیل کیلئے تفسیر کبیر کو دیکھو کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت بہت بڑی شاندار تقریر کی ہے۔

نیک لوگ ہی دراصل صبر کرنے والے ہیں

۴۲ "وہ صبر کرنے والے ہیں" صبر کی حقیقت پر عوام و خواص کی غلط فہمی نے تو پردے ڈال رکھے ہیں الاماشاء اللہ۔ صبر اکثر لوگوں کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہے۔ لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی' دل کی مضبوطی' اخلاقی جرات اور ثبات قدم کے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی جو خضر کے نام سے معروف ہیں کے قصہ میں ایک ہی جگہ میں تین بار یہ لفظ آیا ہے اور ہر بار یہی معنی مراد ہیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہتے ہیں۔

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (الکھف ۱۸ : ۶۷، ۶۸)

"موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے کہا مگر تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکو گے۔ جو بات تمہاری سمجھ کے دائرہ سے باہر ہے تم دیکھو اور صبر کرو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (الکھف ۱۸ : ۶۹) موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن کریم اس طرح کرتا ہے :

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (الفرقان ۲۵ : ۴۲) "اگر ہم اپنے معبودوں کی عبادت پر مضبوطی سے جمے نہ رہتے تو اس نے ہمیں ہمارے معبودوں سے گمراہ کر کے چھوڑ دیا ہوتا۔" یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے "اَنْ صَبَرْنَا" اور یہی مفہوم ہے اس آیت میں کہ :

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ (ص ۳۸ : ۶) "یہ کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو۔"

قرآن کریم میں صبر کا لفظ اس ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے بایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے یعنی ثابت قدمی اور استقامت صبر کے یہ مختلف مفہوم ہیں جن میں قرآن کریم نے اس کو استعمال کیا ہے درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ نبی کریم ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک

ایک ذرہ گویا آپ ﷺ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہوگیا۔ ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں تو اس وقت بشریت کے اقتضاء سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل ابھی ویسے دور تھی اور دور ہی نظر آنے لگی۔ اس وقت تسلی کا یہ پیغام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں۔ اللہ آپ ﷺ کا نگہبان ہے اس کا فیصلہ یقیناً اپنے وقت پر آئے گا چنانچہ ارشاد ہوا :

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (الطور ۵۲ : ۴۸) "اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ اپنے رب کے فیصلہ آنے تک صبر سے کام لیجئے۔ آپ ہماری نگاہ میں ہیں۔"

۲۔ صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو بلکہ ان کو اللہ کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی ہے۔ جیسے ارشاد ہوا وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ (الحج ۲۲ : ۳۵) "جو لوگ ہر طرح کی مصیبتوں میں صبر کرنے والے ہیں یعنی برداشت کرنے والے ہیں۔"

۳۔ صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں۔ دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن و تشنیع کریں ان میں سے کسی چیز کو بھی خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کی بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو۔ بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کو اس لئے دوسری وحی میں جب تبلیغ و دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ ﷺ کو باخبر کر دیا گیا۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ ..... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۷۴ : ۱ و ۷) "اے چادر اوڑھ کر سونے والے اٹھ پھر لوگوں کو ڈرا..... اپنے رب کے پاس پامردی یعنی صبر و استقامت کر۔"

۴۔ صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن کریم کی کئی آیتوں میں صبر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوا :

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ○ (النحل ۱۶ : ۱۲۶، ۱۲۷) "اور مخالفین کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہاری ساتھ کی گئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کیلئے صبر ہی بہتر ہے۔ اے پیغمبر اسلام!

صبر کر، تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا اور نہ ہی ان کی مخالفانہ تدابیر سے دل تنگ ہو۔"

۵۔ صبر کا پانچواں مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے قرآن کریم نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا سو اس وعدہ کو پورا کیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ :

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا الخ (البقرہ ۲ : ۱۷۷) "تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر کرنے والے اپنی راہ میں ثابت قدم ہوتے ہیں تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہوئے جو نیکی کی راہ میں سچے ہوئے اور اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے انسان ہیں۔

یہی لوگ ہیں جو دل کے سچے ہیں

۴۳ "نہایت ہی سچے لوگ" صدق کیا ہے؟ صدق کذب کی ضد ہے اس کے معنی ہیں دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں یا تو وہ بات صدق کے ساتھ متصف ہی نہیں ہوگی یا دو مختلف حیثیتوں سے کبھی صدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگی۔ مثلاً ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف محمد رسول اللہ ﷺ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صدق یعنی سچ بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے دل اور زبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کذب یعنی جھوٹ بھی کہہ سکتے ہیں "الصدیق" بہت ہی سچ بولنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ صدیق اسے کہتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ جھوٹ کسی قسم کا بھی ہو وہ جھوٹ ہی ہے لیکن سب سے بڑا اور برا جھوٹ وہ افتراء ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق باندھا جائے۔

اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے؟ جبکہ اسے حق کی طرف دعوت دی جائے اور اس افتراء و کذب سے مراد اس کا لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرنا ہے؟ یا وہ کہے کہ اس پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آتی ہو؟ اور جو یہ کہے کہ میں بھی ایسا ہی قرآن اتاروں گا جیسا اللہ نے اتارا ہے یقیناً ایسا شخص سب سے بڑا ظالم ہے اور اس کے برعکس اس شخص سے بڑا سچا اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آیات کی فوراً تصدیق کر دے؟ جب اس کو اللہ کے رسول کی طرف سے دعوت دی جائے تو فوراً قبول کر لے۔ لوگوں کو علم و حکمت کی باتیں سکھائے۔ اچھے اعمال کرے اور دوسروں کو کرنے کا حکم دے۔ وحی الٰہی کے مقابلہ میں کسی پیشوا کے کلام کو کوئی وقعت نہ دے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت قرآن کریم کو اللہ کی طرف سے آخری ہدایت کی کتاب تسلیم کرے اور نبی اعظم و آخر ﷺ کی

نبوت پر سچا ایمان لائے۔ ایسے سچے لوگ بحکم الٰہی اس دنیا میں بھی کامیاب ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کیلئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انشاء اللہ دونوں جہانوں میں سرخرو ہوں گے۔

یہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں

۴۴ "نیکی کی راہ میں خرچ کرنے والے" یہ اس جگہ متقین کی تیسری صفت بیان کیا جا رہی ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو راہ خدا میں خرچ کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ جو کچھ کماتے ہیں اس کمائی میں غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں، ناداروں، مسافروں اور محتاجوں کو برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو ان کے رشتہ دار بھی ہوں تو ان کی مدد کیلئے وہ ہمہ وقت تیار موجود ہوتے ہیں۔

ان کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ ہر لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے۔ نادار، یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا صحیح سامان نہیں کر پاتے۔ یہ وہ مصارف ہیں جو تقریباً ہر قوم و مذہب میں ضروری سمجھے جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ والوں کی سینکڑوں ایسی داستانیں ملتی ہیں کہ وہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے سے وہ خوشی محسوس کرتے ہیں کہ اتنی خوشی وہ خود کھا کر بھی حاصل نہیں کرتے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی یہی حالت تھی کہ سوالی آیا اور جو کچھ موجود ہے کھانے پینے کے سامان سے اٹھا کر سارے کا سارا اس کو دے دیا اور اتنی خوشی و فرحت حاصل ہوئی کہ خود نہ کھا کر بھوک کا احساس تک نہ کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ قرآن کریم نے نیک لوگوں کی پہچان ہی ایسی مقرر فرمائی تھی چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ال عمران ۳ : ۹۲) "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔"

اس سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو وہ "نیکی" کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصور بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارث سے "تشرع" کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اتار لے اور علماء کی قانونی موشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا تھا اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی و فروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے جس سے رائے عامہ ان کو نیک سمجھتی رہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ "نیک انسان" ہونے کا مقام ان چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدار خیر و صلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل روح خدا کی محبت ہے ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے اللہ کی محبت پر قربان نہ کر سکتا ہو۔ بس وہی بت ہے اور جب تک اس بات کو آدمی نہ توڑ دے نیکی کے دروازے اس پر بند ہی رہیں

الْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۞ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ

کی آخری گھڑیوں[۴۵] میں اللہ کے حضور کھڑے ہونے والے اور اس کی مغفرت طلب کرنے والے۔ ۱۷

اللہ نے اس بات کی گواہی آشکارا کر دی کہ کوئی معبود نہیں[۴۶] ہے مگر صرف اسی کی

گے۔ اس روح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری "تشرع" کی حیثیت محض اس چمک دار روغن کی سی ہے جو گھن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو ہاں! بلاشبہ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتا ہے مگر وہ بذات الصدور ذات ہرگز ہرگز دھوکا نہیں کھا سکتی۔

اللہ والوں کی داستانیں بھی بڑی عجیب ہیں "لن تنالوا" آیت کے نزول پر سچے عاشقان رسول ﷺ کے ایک ایک فرد نے اپنی محبوب سے محبوب چیزوں پر نظر ڈالی اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے نبی کریم ﷺ کے سامنے درخواستیں ہونے لگیں۔ اس وقت انصار مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مسجد نبوی ﷺ کے بالکل مقابل اور متصل ان کا باغ تھا جس میں ایک کنواں بیئر حاء کے نام سے موسوم تھا۔ یہ باغ گویا آج کل کے حساب سے باب مجیدی کے سامنے ایک عمارت بنی ہوئی ہے لیکن اس کے شمال مشرقی گوشہ میں یہ بیئر حاء کی جگہ اس نام سے اب تک موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی اس باغ میں تشریف لے جاتے اور بیئر حاء کا پانی پیتے تھے۔ آپ ﷺ کو اس کنوئیں کا پانی بہت ہی پسند تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ باغ بڑا قیمتی اور زرخیز تھا اور ان کو اپنی جائیداد میں یہ سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اس آیت کے نزول پر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میرے تمام اموال میں بیئر حاء مجھے بہت محبوب ہے۔ میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو صرف فرمالیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تو عظیم الشان منافع کا باغ ہے میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ اس کو تم اپنے اقرباء میں تقسیم کر دو۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا (صحیح بخاری) اور اس طرح کے بیسیوں واقعات بخاری و مسلم اور دیگر احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتقاء کا سبق ان صحابہ کرامؓ ہی سے ہم سیکھ سکتے ہیں۔

یہی لوگ ہیں جن کو صبح خیزی کی عادت ہے

۴۵ "رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور کھڑے ہونے والے" صبح خیزی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نماز تہجد کیلئے صبح صادق سے پہلے اٹھا جائے اور رات کی تاریکی میں چپکے چپکے اللہ کی یاد میں غور و فکر اور گہرے تدبر کے ساتھ قیام کیا جائے جس میں قرآن کریم کی تلاوت کی جائے۔ ایک ہی آیت کو بار بار

سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی جائے۔ ایک ہی سورت کو بار بار دہرایا جائے جس میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا مفہوم سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا عہد و پیمان اپنے رب کریم سے باندھا جائے اور یہ سب کچھ اس طرح خاموشی اور آہستگی سے کیا جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سوئے ہوؤں کو ہرگز بیدار اور بیزار نہ کیا جائے۔ ہاں! اگر کوئی خود بیدار ہونا چاہے یہ دوسری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی نماز زہے قسمت کہ کسی کو نصیب ہو۔

صبح خیزی کی دوسری صورت یہ ہے کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کی صدا کانوں میں پڑتے ہی بستر چھوٹ جائے۔ رات کی تاریکی' سردی کی رات کی ٹھنڈک اور گرمی کی رات کی کم خوابی اس کو بیدار ہونے سے ہرگز مانع نہ ہو۔

اگر آپ غور کریں گے تو طب اور حفظان صحت کے اصول سے بھی رات کو جلدی سونا اور صبح طلوع فجر کے ساتھ ہی بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے۔ جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھلے گی اس لئے نبی کریم ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے جو ان کو بے تابانہ اپنے خواب بستر سے اٹھا دے اور ان ہی لوگوں کیلئے رسول اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص عشاء کی نماز باجماعت ادا کر کے سو جائے اور صبح کی نماز باجماعت اٹھ کر ادا کرے گویا اس نے ساری رات کا قیام پالیا۔ کتنی رعایت ہے ان لوگوں کیلئے جو سارا دن مزدوری میں بسر کرتے ہیں اور راتوں کو اٹھ کر تہجد ادا کرنے سے قاصر ہیں وہ اگر چاہیں تو ساری رات کے قیام کا ثواب مفت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ اس طرح کی عادت ڈال کر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں کو حاصل کرتے رہتے ہیں اور اس سے مغفرت طلب کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔

اللہ صرف اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے

۴۶ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" ھُوَ بھی اسم ذات باری تعالیٰ ہے اور اسمائے حسنیٰ میں سب سے پہلے واقع ہوا ہے۔ ھُوَ صرف اشارہ ہے اور اشارہ اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ مشار الیہ نظر آئے یا اس کی بابت کوئی اطلاع و خبر دی جا رہی ہو۔ اسم ھُوَ ایک حرف ہے اس میں جو حرف "واؤ" نظر آتا ہے وہ پیش کو کھینچ کر پڑھنے کے سبب پیدا ہوا ہے۔ اس لئے بھی یہ اسم مقدس دراصل وحدت مسمّٰی کی دلیل ہے اس کے سوائے کسی اور اسم میں ایسی مشابہت نہیں ہے۔

ھُوَ وہ اسم اعظم ہے جس کے انوار کی تجلیات سے پروردگار کے خصوصی اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور جب کہ یہ اسم اشارہ ہے تو بیان کی وضاحت کیلئے اسم "اللہ" کو اس کے ساتھ لگا دیا جو "ھو اللہ" ہوگیا۔ اسم "ھو

" کا مسمی تمام کیفیات سے منزہ اور ابتدا و انتہاء سے بالاتر و مقدس ہے کوئی ابتداء اس تک نہیں پہنچ سکتی اور کسی انتہاء کی اس تک رسائی نہیں "اللہ" کی سب سے بڑی صفت یہی ہے کہ اس کی اولیت سے ابتداء عاجز اور اس کے آخری ہونے سے نہایت و انتہاء قاصر ہے۔

"اللہ" یہ اس ذات کا عَلَم (نام) ہے جو الوہیت کی تمام صفات کی جامع ہے۔ یہ اسم اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے۔ حقیقۃً یا مجازاً کسی دوسرے کے حق میں نہیں بولا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اسم ایسا جامع ہے کہ اس کے حروف میں سے کسی حرف کو ہٹا دینے سے بھی مراد ذات باری تعالیٰ ہی رہتی ہے مثلاً اگر پہلا حرف "ا" ہٹا دیا جائے تو "لله" باقی رہ جاتا ہے جس کے معنی ہیں "اس یعنی اللہ کیلئے" اور اگر "الف" کے بعد ایک "لام" کو بھی ہٹا دیا جائے تو "لہ" رہ جاتا ہے جس کے معنی ہیں اس یعنی اللہ کیلئے اور اگر دوسرا "لام" بھی ہٹا دیا جاتا ہے تو "ہ" باقی رہ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے جیسا کہ اوپر "ھو" میں بیان کیا گیا۔

اس لئے انسان کو چاہئے کہ دل کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مستغرق رہے۔ اس کے سوا کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے کسی غیر سے کوئی امید نہ رکھے اس کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔

اور "الٰہ" کا مفہوم و مطلب بڑا وسیع ہے اور اس کی وسعت قرآن کریم میں جگہ جگہ ارشاد فرمائی گئی ہے "الٰہ" کا معنی صرف "معبود" کیا جاتا ہے جو کسی صورت اور کسی حال میں بھی درست نہیں۔ بلاشبہ الٰہ کے معنی معبود کے ہیں لیکن ہر جگہ صرف اور صرف یہی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے۔ اس کی تفصیل کیلئے چند آیات کریمات بیان کی جاتی ہیں جو قابل غور ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے :

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا اَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ○ (النمل ۲۷ : ۶۰) وہ کون ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا۔ پھر اس آبپاشی سے خوش نما باغ اگا دیئے حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگائے کیا ان کاموں کے کرنے والے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ مگر یہ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ برابری کرتے ہیں۔" اس جگہ "الٰہ" کے معنی کیا ہوئے؟

۱۔ آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا۔ ۲۔ آسمانوں سے پانی برسانے والا۔ ۳۔ باغات کے درخت اگانے والا۔ یہ تینوں کام کرنے والا کون ہے؟ "اللہ اور اللہ کے سوا ظاہر ہے کہ کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی "الٰہ" ہے۔

اب آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا اللہ ہو اور جو کچھ آسمان و زمین میں موجود ہے سب کا خالق بھی اللہ ہو تو انسان کہاں رہتا ہے؟ اس زمین کے اندر اور اسی آسمان کے نیچے پھر انسان اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خالق سمجھے تو انسان نے کیا کیا؟ اللہ کے ساتھ دوسرے کو برابر کر دیا اور یہی شرک ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اچھا بتاؤ وہ کون ہے جس نے زمین کو زندگی و معیشت کا ٹھکانہ بنا دیا۔ اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں۔ اس کی درستی کیلئے پہاڑ بلند کر دیئے اور اس نے سمندر کے اندر دو پانیوں میں نہ نظر آنے والی ایسی دیوار حائل کر دی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں کیا اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بھی ہے جو یہ سارے کام یا ان میں کوئی کام سرانجام دینے والا ہے۔ مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہے جو نہیں جانتے۔" الٰہ مع اللہ (النمل ۲۷ : ۶۱) الٰہ کون ہوا؟ ۱۔ زمین کو قرار بخشنے والا۔ ۲۔ زمین میں دریاؤں کو بہانے والا۔ ۳۔ پہاڑوں کو بلند کرنے والا۔ ۴۔ دو پانیوں کے درمیان پردہ حائل کرنے والا۔

بات واضح ہوگئی کہ زمین کو قرار بخشنے والا۔ دریا بہانے والا۔ پہاڑوں کو بلند کرنے والا۔ دو پانیوں کے درمیان آڑ بنانے والا اللہ ہی ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے اور یہ سارے کام کرنے والے ہی کو "الٰہ" کہا جاتا ہے۔ گویا اس جگہ الٰہ کے معنی ایسے سارے کام کرنے والے کے ہیں۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ لوگ ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

پھر ارشاد الٰہی ہوا :

"اچھا بتاؤ وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اسے پکارنے لگتے ہیں اور کون ہے وہ جو ان کے درد دکھ ٹال دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تم کو زمین کا جانشین بنایا؟ کوئی ہے جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بھی ہو افسوس تمہاری غفلت پر' بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔" (النمل ۲۷ : ۶۲)

"الٰہ" کون ہوا؟ ۱۔ بے قرار دلوں کی پکار سننے والا۔ ۲۔ دکھ درد اور تکلیف کو دور کرنے والا۔ ۳۔ اس زمین میں بسانے والا۔ جس نے ان سارے کاموں میں سے کسی ایک کام کا کرنے والا بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کو جانا تو گویا اس نے اللہ کے سوا "الٰہ" بنا لیا۔ خواہ وہ کون ہو کیونکہ "الٰہ" کے یہ معنی مرادف ہیں اور "الٰہ" ہی معبود حقیقی ہے۔ فرمایا یہ بہت ہی کم ہوتا ہے کہ تم نصیحت حاصل کر سکو۔ کیونکہ اکثر انسان سنی بات کو ان سنی کر دیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا :

"اچھا بتاؤ وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو یہ کام کرتا ہو کہ اس کو معبود کہا جائے۔ اللہ بہت بلند ہے اس سے جس طرح یہ لوگ شریک بناتے ہیں۔" (النمل ۲۷ : ۶۳)

"الٰہ" کون ہوا؟ وہی جو باران رحمت لاتا ہے اور ان ہواؤں کو بھی جو ان بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں اور یہی ہے جو عبادت کے بھی لائق ہے۔ اب بادل کو کسی دوسرے کے حکم کے تابع سمجھ کر بارش کرنے کیلئے جس

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ

ذات یگانہ عدل کے[۴۷] ساتھ تدبیر و انتظام کرنے والی۔ فرشتے بھی اس کی شہادت دیتے[۴۸] ہیں اور وہ لوگ بھی جو علم رکھنے والے ہیں[۴۹]۔ ہاں! کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی ایک طاقت و

کو بلایا گیا گویا وہ "الٰہ" قرار دے دیا حالانکہ "الٰہ" اللہ ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ لوگ کیسے ہیں جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے سے باز نہیں آتے۔ اس طرح کی آیات کریمات بے شمار ہیں جن میں "الٰہ" کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں اور "الٰہ" ہی سب معنوں کے مرادف ہے۔ جس نے ایسی کوئی صفت کسی غیر سے متصف کی تو اللہ کے ساتھ ایک طرح کا شریک بنایا حالانکہ وہ ہر طرح کے شرک سے پاک و منزہ ہے۔

یہ اور اس طرح کی بیسیوں آیات کریمات یہ بتاتی ہیں کہ "الٰہ" کے معنی صرف معبود ہی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر کوئی عادل نہیں ہے

[۴۷] "وہ عدل کے ساتھ تدبیر و انتظام کرنے والا ہے۔" "عادل" برابری یا انصاف کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ ایسا عادل ہے جس کا ہر فعل عدل محض ہے۔ یعنی اس کا ہر کام بے عیب اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بہترین ہے۔ ایک سچے مومن کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے عمدہ ترین ہے تو اس کا فرض ہے کہ کسی مصیبت اور رنج میں اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے۔ جو اس پر گزرے اس پر صابر رہے۔ تیوری نہ چڑھائے بلکہ اس کا شکر بجا لائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے مظہر پر لازم ہے کہ عدل و انصاف کرے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانعام ۶ : ۱۱۵) "اور تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہو کر رہے گی۔ اس کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے :

"اے مسلمانو! اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو "يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ" اور سب کے ساتھ بھلائی کرو اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور تمہیں روکتا ہے کن باتوں سے؟ بے حیائی کی باتوں سے۔ ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے اور وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ سمجھو اور نصیحت پکڑو۔"

عدل تمام محاسن کی اصل ہے۔ جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی کہ جو بات کرنی چاہے انصاف کے ساتھ کرے اس نے گویا سب کچھ پا لیا اور حاصل کر لیا۔ "وَالْاِحْسَانِ" احسان سے یہاں مقصود حسن عمل ہے۔ جو بات کرو حسن و خوبی کی کرو۔ نیکی اور بھلائی کی کرو۔ یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو' برائی نہ ہو۔ جس نے یہ بات پالی اس کیلئے اور کیا باقی رہا؟ پھر جو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں وہ ہمارے حسن و سلوک کے زیادہ حق دار ہیں اس لئے "اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی" کی رعایت بھی ضروری ہوئی اور اس حکم پر اوامر کا معاملہ پورا ہوگیا۔ پھر "فحشاء" "منکر" اور "بغی" سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کر دیئے۔ "فحش" سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجہ کی برائیاں تسلیم کر لی گئی ہیں مثلاً زنا' افتراء پردازی' کنجوسی وغیرہ۔ "منکر" میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آگئیں "بغی" میں ہر طرح کی زیادتی آگئی خواہ وہ کسی گوشہ اور کسی شکل میں کی گئی ہو جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو۔ جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں۔ جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت' رحمت اور بشارت نہیں ہے تو اور کس نام سے اسے پکارا جا سکتا ہے؟ اور یہ سب کیا ہے؟ عدل ہی عدل تو ہے۔

یہ تمام کام عدل و انصاف کے ہیں اور اللہ تعالیٰ "عادل" ہونے ہی کے باعث ان کا حکم دیتا ہے چنانچہ ارشادات ملاحظہ ہوں :

۱۔ "اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ جب تم فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے کرو۔ یہ بات اچھی بات ہے اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (النساء ۴ : ۵۸) (المائدہ ۵ : ۴۲) (الاعراف ۷ : ۲۹)

۲۔ بات جب کہو عدل کی کہو چاہے کسی رشتہ دار ہی کے خلاف پڑتی ہو۔ (الانعام ۶ : ۱۵۲)

۳۔ جب تم کو حکومت ملے تو لوگوں میں انصاف کرو اور اپنی خواہشات نفسانی پر مت چلو ورنہ تم اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے اور جو کوئی اللہ کے راستے سے بھٹک جائے تو ایسے لوگوں کو سخت عذاب ہوگا۔ بسبب اس کے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔ (ص ۳۸ : ۲۶)

۴۔ ایسا نہ ہو کہ کسی شخص یا قوم کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ کر دے۔ عدل کرو' یہی بات تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے باخبر ہے۔ (المائدہ ۵ : ۸)

احادیث میں بھی "عدل" کی بہت فضیلت آئی ہے :

۱۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کو سب سے زیادہ محبوب امام عادل ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیٹھنے والوں میں سب سے زیادہ امام عادل ہی ہوگا۔" (ترمذی)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عادل اور منصف بادشاہ کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ (ترمذی)

۳۔ حضرت عیاض بن عمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امام عادل جنت کا مستحق ہے۔

(مسلم)

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : قیامت کے روز عرش الٰہی کے سایہ میں سات قسم کے لوگ ہوں گے اور ایک ان میں سے امام عادل ہوگا۔ (بخاری)

فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود حقیقی ہے

۴۸ "فرشتے بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔" "الملئکۃ" فرشتوں کا تصور ہر قوم میں موجود رہا ہے اور اس طرح اہل کتاب اور مشرکین مکہ میں بھی یہ تصور موجود تھا اور یہ وہی مخلوق ہے جسے اکثر مشرک قومیں دیوتا کا لقب دے کر شریک خدائی سمجھ رہی ہیں۔ کسی گروہ نے ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا اور مقصد سب کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی بنانا ہی تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہیں جو مجسمہ بھلائی ہیں ان سے تو برائی سرزد ہی نہیں ہوتی اور شرک سے بڑھ کر تو کوئی بڑی برائی اور ہے ہی نہیں لہٰذا تم خود ہی غور کرو کہ فرشتے ان اوصاف سے متصف کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ تو خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہیں اور اللہ کے حکم کے پابند ہیں ایسے پابند کہ اس کے حکم کے سوا وہ کوئی حرکت بھی نہیں کرتے چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (النحل ۱۶ : ۴۹، ۵۰) "اور آسمانوں میں جتنی چیزیں ہیں اور زمین میں جتنے جانور ہیں سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور نیز فرشتے بھی اور وہ کبھی سرکشی نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے اور جو کچھ حکم انہیں دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔"

ایک جگہ اہل کتاب اور خصوصاً نصاریٰ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے جو اس سورہ مبارکہ میں اصل مخاطبین ہیں :

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ إِنِّيْٓ إِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۲۶، ۲۸)

"اور دیکھو انہوں نے کہا ہے کہ خدائے رحمٰن نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے۔ پاکیزگی ہے اس کیلئے یہ لوگ جنہیں اس کی اولاد بناتے ہیں وہ تو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں اور وہ اس کے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے وہ اس کے حکم پر سرتاسر کاربند رہتے ہیں۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے سب اللہ جانتا ہے۔ ان کی مجال نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی سفارش سے بخشوا لیں مگر ہاں! جس کی بخشش اللہ پسند فرمائے اور وہ تو اس کی ہیبت سے خود ہی ڈرتے رہتے ہیں اور ان میں سے اگر کوئی ایسی جرات کرے اور کہے کہ اللہ کے سوا میں معبود ہوں تو اس کی پاداش میں ہم اس کو جہنم کی سزا

دیں ہم اس طرح ظلم کرنے والوں کو ان کے ظلم کا بدلہ دیتے ہیں۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ ○ (الاعراف ۷ : ۲۰۶) "جو اللہ کے حضور مقرب ہیں وہ کبھی بڑائی میں آکر اس کی بندگی سے نہیں جھجکتے وہ اس کی پاکیزگی و ثناء میں زمزمہ سنج رہتے ہیں اور اس کے آگے سر بسجود ہوتے ہیں۔"

صاحب علم لوگوں کی بھی شہادت یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

۴۹ "جو لوگ علم رکھنے والے ہیں" اولوا العلم "علم" سے مراد علم حقائق ہے نہ کہ کوئی اور علم۔ جو علم والے سمجھتے ہیں وہ جاہل کہاں سمجھ سکتے ہیں' کیوں؟ اس لئے کہ حقیقت ان کی عقل سے ہی وراء ہے۔ جیسے بعض جاہل قوموں نے خدا کا وجود تو تسلیم کیا ہے لیکن وجود معطل "جو لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے" سمجھا ہے یا ایسی صفات سے موصوف جانا ہے جو کمالات الٰہی کے منافی ہے۔ اسلام کا خدا خدائے معطل نہیں۔ ہاں! منظم ہے' کارساز ہے۔ ہر ایک کا اور ہر کام جو اس کی ذات کے لائق ہے بنانے والا ہے اور جو اس کی ذات کے منافی ہے وہ کبھی نہیں کرتا اور ہرگز نہیں کرتا۔ کوئی نہیں جو اس کو چڑ چڑائے۔

اہل علم وہی ہیں جو اہل ذکر ہیں۔ اس لئے ایک جگہ ارشاد فرمایا فَسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "اے منکرین حق! اگر خود تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو ان لوگوں سے دریافت کر لو جو آسمانی کتابوں کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں یعنی اہل کتاب۔"

اس کی تفصیل ایک جگہ اس طرح ارشاد فرمائی قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (ال عمران ۳ : ۶۴)

"اے پیغمبر اسلام تم یہود و نصاریٰ سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم اختلاف نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کیلئے یکساں طور پر مسلم ہے۔ وہ کیا ہے؟ یہی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے کہ خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنا لے۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ انکاری تم ہو اور ہم تو اللہ وحدہ لا شریک لہ کو ماننے والے ہیں۔"

"العلیم" بغیر کسی کے بتائے جاننے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو ہر چیز کے اول' آخر' ظاہر' باطن' ماضی' حال اور مستقبل کے ذرہ ذرہ حالات سے پورے طور پر آگاہ ہے۔ بلکہ اس کیلئے ماضی اور مستقبل کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور یہ علم اس کا ذاتی علم ہے یعنی اشیاء کے موجود ہونے اور دیکھنے بھالنے کے بعد کا نہیں ہے بلکہ چیزوں کے وجود سے پہلے ہی تھا اور یہ علم خاصہ خدائے قدوس وحدہ لا شریک لہ ہے۔

النصف

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

غلبہ والا اور حکمت[۵۰] والا۔ ۱۸

بلاشبہ "الدین[۵۱]" یعنی اصل دین اللہ کے نزدیک "الاسلام[۵۲]" ہے اور یہ جو اہل کتاب[۵۳]

یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اس کا ذاتی ہے اور ساری مخلوقات کا علم خواہ کوئی نبی و رسول ہو' ولی اللہ ان سب کا علم اس کا عطا کردہ ہے اور ان سب میں سے کسی کا علم بھی اس کا ذاتی علم نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ :

"جب انسان اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو کان اور سماعت' آنکھیں اور بصارت' دل اور سمجھ سوچ جیسی نعمتوں سے نوازتا ہے تاکہ وہ (انسان) شکر کرے۔ (النحل ۱۶ : ۷۸)

انسان کو بولنا سکھاتا ہے۔ (الرحمٰن ۵۵ : ۴)

اور قلم کے ذریعے سے اس کو علم سکھاتا ہے۔ (العلق ۹۶ : ۲)

غرض کہ اس کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو وہ نہ جانتا تھا۔ (العلق ۹۶ : ۵)

معبود وہی ہے جو حقیقت میں طاقت و غلبہ والا اور حکمت والا ہے

۵۰ اصل میں "اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" کے الفاظ ہیں۔ "العزیز" دراصل عزیز وہ ذات ہے جس کی نظیر نہ ہو اور جس کی طرف حاجت بے حد ہو۔ جس کو ہر چیز پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

"عزت اور غلبہ تو سب اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔" (یونس ۱۰ : ۶۵)

"جو لوگ عزت حاصل کرنے کیلئے مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں وہ سن لیں کہ عزت تو سب اللہ ہی کیلئے ہے۔" (النساء ۴ : ۱۳۹)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کو معبود بناتے ہیں تاکہ وہ ان کیلئے مدد اور غلبہ کا ذریعہ بن جائیں وہ لوگ خوب سن لیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ باطل معبود تو ان کی عبادت سے بھی منکر ہو جائیں گے۔" (مریم ۱۹ : ۸۱' ۸۲)

"الحکیم" دانا۔ حکمت کے معنی ہیں بہترین چیز کا بہترین علم کے ذریعے پہچان لینا۔ تمام چیزوں سے بہترین خدائے قدوس وحدہ لا شریک لہ کی ذات اقدس ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ اس مالک الملک عزاسمہ وجل مجدہ کی حقیقت اصلیہ کو سوائے اس کی ذات کے اور کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا حکیم مطلق ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ہاں! مجازی طور پر حکیم کا لفظ ایسے شخص پر بولا جاتا ہے جو کسی صنعت و حرفت میں پورا کمال رکھتا ہو۔ جس شخص کو وہ حکیم کل اللہ رب العزت والجلال حکمت عطا فرمائے اس کی نظر دنیا سے اٹھ جاتی ہے اور عاقبت

پر پڑ جاتی ہے۔ اس کی زبان سے کلمات بھی اس ذوق سلیم کے مطابق ہی نکلتے ہیں چنانچہ سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کے کلمات حکمت ساری مخلوق کے کلمات سے بڑھ کر ہیں کیونکہ وہ وہی کلمات ہیں جو براہ راست اس "حکیم کل" ذات نے آپ ﷺ کے سینہ پر نازل فرمائے۔ ارشاد باری ہے : "اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت مل جائے تو یقیناً اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی۔" (البقرہ ۲ : ۲۶۹)

"جس بندے کو اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے اور وہ بندہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو یہ شکر اس کے اپنے ہی فائدے کیلئے ہے اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔" (لقمٰن ۳۱ : ۱۲)

"اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو کتاب اور نبوت کے ساتھ ساتھ حکمت سے بھی نوازا ہے بھلا ان سے کیسے ممکن تھا کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بجائے اپنی اور فرشتوں کی عبادت کرنے کو کہتے؟ وہ تو یہی کہتے رہے کہ اللہ والے بن جاؤ اور فرشتوں اور پیغمبروں یا کسی اور کو بھی رب قرار نہ دو بھلا وہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو کفر کی تعلیم کیوں دیتے؟" (ال عمران ۳ : ۷۹، ۸۰)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"یہ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے ہیں جن کو اس نے کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائی اور ہدایت سے نوازا۔ پس تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔" (النحل ۱۶ : ۱۲۵)

مختصر یہ کہ عبادت بدنی ہو، مالی ہو یا قولی ہر طرح کی عبادت کا مستحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے سوا کوئی بھی نہیں جو عبادت کے لائق ہو اور وہی سب طاقتوروں سے زیادہ طاقتور ہے اور سب داناؤں سے زیادہ دانا تر ہے وہی حکمت والا ہے۔ وہی خالق و مالک حقیقی ہے انسانوں کو چاہئے کہ وہ بلا شرکت غیرے اس کی اور صرف اس کی عبادت کریں۔

"دین" کے لفظ نے جزاء کی حقیقت واضح کر دی

۵۱ قرآن کریم نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزاء کیلئے "الدین" کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی لئے وہ قیامت کو بھی عموماً "یوم الدین" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جزاء کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا اس کیلئے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی ہی تعبیر تھی وہ جزاء کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیروان مذہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خدا کی خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج بھی اکثر لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود یہی اعتقاد رکھتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ تمام مذہبی تصورات کی طرح اس معاملے میں بھی گمراہی فکر کا موجب ہوا تھا اور موجب ہے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے اور کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لئے

خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے۔ کبھی غیظ و غضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اس اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوش غضب ٹھنڈا کرنے کیلئے قربانیاں کرتے اور ان کی نظر التفات حاصل کرنے کیلئے نذریں چڑھاتے تھے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصور ذرا اس سے بلند ہوا لیکن جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے ان کے تصور نے بھی کوئی خاص ترقی حاصل نہ کی۔ یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ خاندان اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے لیکن پرانے دیوتاؤں کی طرح یہ خدا بھی شاہ اور مطلق العنان خدا تھا۔ وہ کبھی خوش ہو کر انہیں اپنی چہیتی قوم بنا لیتا کبھی جوش انتقام میں آکر ان کو بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ مطلب اس کلام کا یہ ہے کہ یہودیوں کا یہ ایک تصور تھا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوب ہو گئی اور جب تک خدا نے اپنی صفت ابنیت کو بشکل مسیح قربان نہیں کر دیا اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا جو کائنات ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو بلکہ اس کا ایک قدرتی گوشتہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح اللہ نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کیلئے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں معنوی موثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں سزا و جزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب و عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحی الٰہی نے ہماری فہم و استعداد کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے۔ ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم ان کیلئے ہیں جن کے اعمال اچھے ہوں گے دوزخ کی عقوبتیں ان کیلئے ہیں جن کے اعمال برے ہوں گے۔

اس مضمون کو سمجھنے کیلئے قرآن کریم کی اس آیت پر غور کرنا چاہئے پھر اس مضمون کی دوسری آیات پر نظر رکھنے سے بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔ ارشاد الٰہی ہے :

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (الحشر ۵۹ : ۲۰)

"اصحاب جنت اور اصحاب دوزخ اپنے اعمال و نتائج میں یکساں نہیں ہو سکتے کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحاب جنت ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کا ٹھہرایا ہوا دین "الاسلام" ہی ہے

۵۲ یقیناً دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے نہ کہ مطلقاً ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ جیسا کہ تمام مذاہب نے کیا اور آج بدقسمتی سے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور دراصل اس آیت میں رد کیا جا رہا ہے بد دینوں کے اس عقیدہ کا کہ ہر دین دین حق ہے اور ہر مسلک خدا ہی کی راہ ہے اور دیر و حرم۔ کفر و ایمان میں فرق صرف لفظی و اصطلاحی ہے اور آج کل پاپولر لوگ کہتے ہیں کہ "اجی جہاں کوئی لگا ہوا ہے صحیح لگا ہوا ہے۔" کیا کوئی شخص دن کو رات کہہ دے اور رات کو دن کہہ دے تو وہ ٹھیک ہے؟ اونٹ کو بکری اور بکری کو اونٹ کہہ دے تو ٹھیک ہے؟ روشنی کو اندھیرا اور اندھیرے کو روشنی کہہ دے تو ٹھیک ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔

ذرا غور کرو کہ خط مستقیم کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دو نقطوں کے درمیان ایک سیدھا خط صرف ایک ہی ممکن ہے اور وہی خط مستقیم ہے اور یہ صرف اور صرف ایک ہی ممکن ہے۔ باقی سب خطوط جتنے بھی ڈالتے جاؤ گے سب کے سب منحنی اور کج ہوں گے۔ راہ مستقیم اللہ اور بندے کے درمیان صرف ایک ہے اور اس کا نام اسلام ہے اور یہی وہ دین ہے جو تمام ھادیان حق کا ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح کی جا سکتی ہے۔

"الاسلام" کیا ہے؟ دین اسلام۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہاں! جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس تم خدا پرستی اور عمل صالح کی اصل، جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے اس پر جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آجاؤ۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے

"تم ہر طرف سے منہ پھیر کر "الدین" کی طرف رخ کرو یہی خدا کی بناوٹ ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی "الدین القیم" ہے یعنی سیدھا اور سچا دین۔ لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔ دیکھو اسی ایک اور صرف ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اس کی نافرمانی سے بچو۔ نماز قائم کرو اور مشرکوں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس میں مگن ہے۔" (الروم ۳۰ : ۳۰)

اس نے دین کیلئے "الاسلام" کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کو مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے دین کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ نے جو قانون سعادت انسان کیلئے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے یہ سب کچھ انسان ہی کیلئے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اس اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کیلئے اللہ نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرایا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں اگر ایک لمحہ کیلئے بھی روگردانی کریں تو کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :

"پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چاروناچار اس کے ٹھہرائے ہوئے قانون عمل کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور بالاخر سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔" (ال عمران ۳ : ۸۲)

وہ جب کہتا ہے کہ "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک اور صرف ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے۔ انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورہ آل عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دین حقیقی کی راہ تمام مذہبی راہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے کہ :

"جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو کہ اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ یقیناً تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔" (ال عمران ۳ : ۸۵)

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام پیروان دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں اور اس گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن کریم نے نجات دلائی ہے۔ کیا ہم نے ایسا ہی کیا؟ کیا ہم گروہ بندی سے بچ گئے؟ کیا آج ہم صرف اسلام کے نام پر اکتفا کرتے ہیں؟ کیا آج ہماری پہچان وہی ہے جو قرآن کریم چاہتا ہے؟

وہ کہتا ہے میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جاں نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیحؑ کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا۔ ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا۔ ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے۔ ایک عرب جو اپنے سوا سب کو اس انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا۔ ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ ایک دوسرے کے مذہبی راہنماؤں کی تصدیق کرتے اور سب کی بتلائی ہوئی متفقہ راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔ اگر ایسا ہے؟ تو اسلام یقیناً ان کا دین ہے کیونکہ اسلام کا یہی منشاء ہے۔

اگر آج پھر وہی 'تشتت' وہی تفرقہ' وہی نفرت' وہی گروہ بندی ہے جو قبل از اسلام تھی تو اسلام کاہے کو ہوا؟ کیا اسلام اسلام کے شور کا نام اسلام ہے؟ کیا اسلامی نام رکھ لینے کا نام اسلام ہے؟ مذہب کے خانہ میں اسلام لکھ لینے کا نام اسلام ہے؟ ہرگز نہیں اور یقیناً نہیں بلکہ اسلام ایمان یعنی دلی یقین اور اعمال صالح کا نام ہے اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر اس کی تشریح کر دی گئی ہے کہ اسلام اس وقت سے ہے جب سے انسانیت نے اس دنیا میں قدم رکھا اور انبیاء کرام کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا اور ہر نبی کی دعوت "دین اسلام" ہی کی دعوت تھی۔

بلاشبہ یہ مسئلہ خود اہل اسلام و اہل علم کے درمیان مختلف فیہ رہا اور بڑے بڑے جید علمائے اسلام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "دین اسلام" صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے لائے ہوئے دین کا نام ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کوئی نیا دین نہیں لائے بلکہ آپ ﷺ اس "دین" کے آخری داعی ہیں جو سارے انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی اپنی امتوں کے سامنے پیش کرتے رہے جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۸۵ میں اس کی تشریح موجود ہے۔ کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان درج ہے کہ :

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (ال عمران ۳ : ۸۵) "جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور یہ بات دوسرے انبیاء کرام کے ذکر کے بعد ارشاد فرمائی گئی۔ ملاحظہ ہو سورہ ال عمران کی آیت ۸۵ کی تشریح۔

غور کیجئے سیدنا آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول بنا کر بھیجے گئے رسول کا نام نوح علیہ السلام ہے اور ان کا یہ اعلان قرآن کریم میں آج بھی موجود ہے :

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ (یونس ۱۰ : ۷۲) "میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد خداوندی ہوتا ہے :

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (البقرہ ۲ : ۱۳۱، ۱۳۲) "اس وقت کا ذکر کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم یعنی فرمانبردار ہو جاؤ اس نے کہا میں مسلم ہو گیا یعنی تمام جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہو گیا اور اس بات کی وصیت کی تھی ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اور یعقوبؑ نے بھی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اس نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ تم کس کی بندگی کرو گے میرے بعد؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم بندگی کریں گے آپؑ کے معبود آپؑ کے باپ دادا ابراہیمؑ" اسمٰعیلؑ" اسحٰقؑ کے معبود کی اس کو اکیلا معبود مان کر اور اس پر اس کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں۔" مزید تشریح کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۱ تا ۱۳۳ ملاحظہ کریں۔

سیدنا لوط علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (الذاریات ۵۱ : ۳۶) "ہم نے قوم لوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔"

سیدنا یوسف علیہ السلام بارگاہ رب ذوالجلال میں اپنی عرض اس طرح پیش کرتے ہیں کہ :
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف ۱۲ : ۱۰۱) "اے رب کریم! مجھے مسلم ہونے کی حالت میں صالحین کا ساتھ پورا پورا عطا فرما دے۔"

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ :
یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ (یونس ۱۰ : ۸۴) "اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اس پر بھروسہ کرو اگر تم "مسلم" ہو۔"

مرتے وقت فرعون کی زبان سے اس طرح اعلان کرایا گیا کہ
اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (یونس ۱۰ : ۹۰) "میں مان گیا کہ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں "مسلموں" میں سے ہوں۔"

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا اور اس بات کو دوست و دشمن سب جانتے تھے۔ یہودیت تو بعد کی اختراع ہے اور جب انہوں نے اپنے مذہب کا نام یہودیت رکھ لیا تو ظاہر ہے جو بھی اس کے بعد ان کو مخاطب کرے گا اسی نام سے کرے گا جو انہوں نے خود اپنا نام رکھ لیا اور اس نام سے انہوں نے "مکمل" دین بھی گھڑ لیا۔ یعنی صرف اپنا نام ہی نہیں بلکہ پورا دین ہی بدل کر رکھ دیا اور بدقسمتی سے آج مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا جو پچھلی قومیں کرتی آئی تھیں کہ "اسلام" کے نام پر متفق نہ ہوئے بلکہ بریلوی، دیوبندی، مقلد اور غیر مقلد کے بہت سے اور نام رکھ لئے اور پھر صرف نام ہی نہیں رکھے بلکہ نقشہ اسلام کو بھی بدل کر اپنی اپنی گروہ بندی کے مطابق تشکیل دے لیا اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔

دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کا بھی یہی دین تھا چنانچہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :
اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىۃَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا (المائدہ ۵ : ۴۴)
"ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اس کے مطابق وہ نبی جو مسلم تھے ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی ہوگئے تھے۔"

یہی "دین" سیدنا سلیمان علیہ السلام کا تھا چنانچہ ملکہ سباء کا بیان قرآن کریم میں ہے کہ :
اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (النمل ۲۷ : ۴۴) "میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین کی "مسلم" ہوگئی۔"

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے متعلق ارشاد الٰہی ہوتا ہے :
وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْھَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○ (المائدہ

۵ : ۱۱۱) "اور جبکہ میں نے حواریوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ایمان لاؤ مجھ (اللہ) پر اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم سب "مسلم" ہیں۔"

اس معاملہ میں اگر کسی صاحب کو یہ شک ہو کہ عربی زبان کے الفاظ "اسلام" اور "مسلم" ان مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک ناسمجھی کی بات ہے کیونکہ اصل اعتبار عربی کے ان الفاظ کا نہیں بلکہ اس معنی کا ہے جس کیلئے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو حقیقت ان آیات میں سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیت، یہودیت، موسویت، محمدیت یا کسی اور نام سے آیا ہوا نہیں بلکہ انبیائے کرام اور کتب آسمانی کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمان الٰہی کے آگے سر اطاعت جھکا دینا ہے اور یہ رویہ جہاں جس بندہ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر، ازلی و ابدی دین حق کا متبع ہے۔ پھر اس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے ان کیلئے موسیٰ علیہ السلام کے بعد مسیح" اور مسیح" کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو ماننا تبدیلی مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے بخلاف اس کے جو لوگ انبیائے کرام کے بعد ان کے ناموں سے بے سوچے سمجھے گھس گئے یا پیدا ہوگئے اور قومی، گروہی و نسلی تعصبات نے جن کیلئے ان کے ناموں سے ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لی وہ بس یہودی یا عیسائی بن کر رہ گئے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر ان کی اس جہالت کی کلی کھل گئی اس لئے کہ انہوں نے نبی اعظم و آخر ﷺ کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کیلئے مسلم رہنا قبول نہ کیا بلکہ اپنے اس فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پہلے ہی "مسلم" نہ تھے محض کسی اپنے ہی بنائے ہوئے گروہ کے افراد تھے اور اسی کے رہنا چاہتے ہیں۔

اہل کتاب "اہل کتاب" کہلانے کے باوجود کتاب کے اہل نہ تھے

۵۳ یہودی کیا تھے؟ تورات کو کتاب الٰہی مان لینے اور تسلیم کر لینے کی وجہ سے اہل کتاب تھے۔ نصاریٰ کیا تھے؟ انجیل کو کتاب الٰہی مان لینے اور تسلیم کرنے کی وجہ سے اہل کتاب۔ یہ دونوں گروہ آج بھی اہل کتاب ہی کے نام سے معروف ہیں۔ یہودی کھلم کھلا کہا کرتے تھے کہ نصاریٰ کا کوئی دین و مذہب نہیں اور نصاریٰ باوجود تورات کو ماننے کے ببانگ دہل کہتے تھے کہ یہودیوں کا کوئی دین و مذہب نہیں۔

اسلام آیا تو وہ دونوں گروہ باوجود اپنے سارے اختلافات کے اسلام کے مقابلہ میں اکٹھے ہوگئے اور کہنے لگے کہ جنت میں کوئی آدمی داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہودی یا نصرانی نہ ہو یعنی جب تک کوئی شخص یہودیت یا نصرانیت کی گروہ بندی میں داخل نہ ہو اور ان کی بنائی ہوئی گروہ بندی کا پٹا اپنی گردن میں نہ ڈالے وہ جنتی نہیں ہو سکتا۔ کیا اب ان کے ذاتی اور دونوں جماعتوں کے اندرونی اختلافات ختم ہوگئے؟ ہرگز نہیں! یہ تو اسلام کی مخالفت میں ان کا متحدہ محاذ تھا۔ ان کے اپنے رگ و ریشہ میں سارے اختلافات موجود تھے یہ تو ایک ظاہر داری تھی جو انہوں نے اسلام کے مقابلہ میں بنائی۔ پیروان مذہب نے اسلام کی مخالفت کیوں کی؟ اس لئے

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ

نے آپس میں اختلاف کیا یہ محض اس لئے ہوا کہ وہ علم پانے کے بعد اس پر قائم نہیں رہے اور آپس کی ضد و عناد سے الگ الگ ہو گئے[۵۴] اور یاد رکھو کہ جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ کا قانون جزا بھی حساب لینے میں سست رفتار نہیں[۵۵]۔ ۱۹

کہ وہ انہیں جھوٹا کہتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ ان کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ انہیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اصل مخالفت ان کی اسی وجہ سے تھی کہ وہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بالکل ایسا ہی ہوا' ان کی مخالفت محض اس لئے تھی کہ وہ جھٹلاتا کیوں نہیں۔ یہ اس طرح کہ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہ رہ سکا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرتا ہے اور ان کو اولوالعزم نبی تسلیم کرتا ہے لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا اور یہیں آکر اس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتا تھا۔ عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی پاکیزگی و صداقت کا اعلان کیا جائے؟ لیکن قرآن کریم صرف اتنی ہی بات نہیں کرتا تھا وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفارہ و اصطباغ پر اور قانون نجات کی یہ عالمگیر وسعت عیسائی کلیسا کیلئے ناقابل برداشت تھی کیونکہ یہ دونوں عقیدے ان کے مذہب کی جان تھے اگرچہ انہوں نے ان کو خود گھڑا اور وضع کیا تھا لیکن وہ ان کو مذہبی امتیازی حیثیت سے مان چکے تھے۔

اسی طرح قریش مکہ کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی دل خوش صدا نہ تھی کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کریم اور پیغمبر اسلام! جس طرح ان دونوں بزرگوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے اسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے تو ان کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں جو ان کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑا کرتے ہیں؟

دعوت انبیاء ایک تھی اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا

۵۴ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ ﷺ تک سارے انبیاء کرام کی دعوت اصولی

طور پر ایک ہی تھی لیکن ہر دور میں پیروان دعوت اس دعوت کی سچائی سے خود منحرف ہوگئے۔ وہ اپنے نبی کی تصدیق کرتے رہے اور اپنی کتاب کا نام لیتے رہے لیکن اس کے باوجود اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی ہدایت کے بجائے انہوں نے اپنی اہوا و خواہشات کی پیروی کی۔ ہر نبی کی دعوت دراصل یہی تھی اور خود نبی کریم ﷺ کی بھی دعوت یہی ہے کہ سب کو ان کی گم شدہ سچائی پر از سر نو جمع کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے ہی نبی کی لائی ہوئی سچائی پر جمع ہو جائیں تو وہ دوسرے نبی کی لائی ہوئی سچائی سے انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اسلام کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ کسی ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے انکار کے مرادف ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان سب کی دعوت اور ان سب کی لائی ہوئی سچائی ایک تھی۔

اس سلسلہ میں اس نے تمام پیروان مذاہب کی تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے گنوائی ہیں جو اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہیں پھر منجملہ ان سب کے ایک گمراہی سب سے بڑی گمراہی رہی ہے جس پر جا بجا زور بھی دیا گیا ہے وہ گمراہی وہی ہے جس کو اس نے تشتت و گروہ بندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یعنی الگ الگ جتھے بنا لینا اور ان میں ایسی روح کا پیدا ہو جانا جسے اردو زبان میں "گروہ پرستی" کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود پیغمبر اسلام ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

"جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے اے پیغمبر اسلام! تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے جیسے کچھ ان کے اعمال رہے ہیں اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ انہیں بتلا دے گا۔" (الانعام ۶ : ۱۶۰)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا مذہب بنا لئے اور ہر ٹولی کے پلے پر جو کچھ پڑ گیا ہے وہ اس میں مگن ہے۔" (المومنون ۲۳ : ۵۲)

یہ اختلاف کیوں ہوا؟ وہ کہتا ہے اختلاف کی وجہ صرف اور صرف اپنی اپنی ضد و عناد ہے۔ سب کے پاس ایک ہی تعلیم تھی لیکن تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ اس پر قائم نہیں رہے اور اصل تعلیم بھلا دی ان کو ایک ہی دعوت دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ آپس میں الگ الگ ہوگئے اور انہوں نے اللہ کی آیتوں سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کا قانون جزاء ان سب پر لاگو ہوگیا۔ حالانکہ سب کی بنیادی تعلیم صرف ایک تھی اس لئے کہ اس کا چشمہ ایک ہی تھا اس لئے ہر آنے والے کو ایک ہی جیسا پیغام دیا گیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ :

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۲۵)

"اور اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو۔"

وہ کہتا ہے دنیا میں کوئی بانی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے کی اور تفرقہ و

اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کیلئے ہے۔ الگ الگ کر دینے کیلئے نہیں ہے پس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یکجہتی کی راہ اختیار کرو۔

اس کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں ایک ہی جامہ انسانیت دیا تھا لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لئے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں اس لئے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں اس لئے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریباں ہو رہی ہے۔ تمہارے رنگ یکساں نہیں اور یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بڑی حجت بن گئی ہے پھر ان کے علاوہ امیر و فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف، ضعیف و قوی اور ادنیٰ و اعلیٰ بے شمار اختلاف پیدا کر لئے گئے ہیں اور سب کا منشاء یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سر نو آباد ہو جائے؟ وہ کہتا ہے کہ غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارا خدا تو الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو تم سب کی بندگی و نیاز کیلئے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے۔ تم بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتہ عبدیت میں جکڑے ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی نسل ہو۔ تمہارا کوئی وطن ہو۔ تمہاری کوئی قومیت ہو۔ تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے اور تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم سب ایک ہی رب العالمین کی عیال ہو۔

منکرین حق کو یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ "سریع الحساب" بھی ہے

۵۵ اہل کتاب ہوں یا مشرکین مکہ ان سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ بھی دعوت حق کا مقابلہ کر رہے ہیں ان سب کیلئے بالآخر نامرادی و تباہی ہے۔ گویا یہ ایک پیش گوئی ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ اقدس کے وقت سے برسوں پہلے کرائی جا رہی ہے جب انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہے اسے چاہئے کہ اس پر اکتفا کرے اور سب کاموں میں اس کی حسن تدبیر پر بھروسہ کرے اور جب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سانس بھی گنتا جا رہا ہے یعنی اس کے قانون میں اس کی ہر حرکت شمار کی جا رہی اور وہ ہر ایک چیز کا حساب لے گا تو اسے چاہئے کہ اپنے تمام افعال اور حالات کو نقائص اور عیوب سے پاک رکھے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ "اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے۔" (الانبیاء ۲۱ : ۴۷) (الاحزاب ۳۳ : ۳۹)

الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ
اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۚ

پھر اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں[۵۶] تو اے پیغمبر! تم کہہ دو میرا اور میرے پیروؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا ہے اور اہل کتاب[۵۷] اور ان پڑھ لوگوں سے پوچھو تم بھی اللہ کے سامنے جھکتے ہو یا نہیں؟ اگر وہ اب بھی اللہ کے

"وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ وہ بہت جلد حساب چکا دیتا ہے۔"
(ال عمران ۳ : ۱۹۹) (المائدہ ۵ : ۴) (یوسف ۱۲ : ۱۳) (حم السجدہ ۴۱ : ۱۴)
"اللہ تعالیٰ نے پیغام پہنچانا پیغمبر اسلام ﷺ کے ذمہ اور حساب لینا اپنے ذمہ رکھا ہے۔" (الانعام ۶ : ۵۲)
(الرعد ۱۳ : ۴۰)

"پس اے مسلمانو! اللہ سے ڈرتے رہو یعنی اس کے قانون مکافات سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو چاہئے کہ وہ دیکھ بھال لے کہ کل قیامت کیلئے اس نے کیا ذخیرہ آگے بھیجا ہے اور اللہ کے قانون مکافات سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے باخبر ہے اور ان لوگو کی طرح مت ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی جانوں سے بھی غافل کر دیا اور وہی لوگ فاسق ہیں۔" (الحشر ۵۹ : ۱۸، ۱۹)

جھگڑنے والوں سے مراد اہل کتاب اور خصوصاً نصاریٰ ہیں

۵۶ اہل کتاب ہی وہ لوگ تھے جن کو پیغمبر اسلام ﷺ سے جھگڑنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں تورات و انجیل میں نبی اعظم و آخر ﷺ کے نشانات اپنی آنکھوں دیکھ اور کانوں سے سن چکے تھے اور اس بات کے طلبگار بھی تھے کہ وہ نبی اعظم و آخر ﷺ جلد آئے تاکہ اس کی رسالت کا اقرار کر کے اس کی ہدایت پر عمل کر کے ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔ لیکن جب وہ موعود نبی اعظم و آخر ﷺ مبعوث ہوگیا اور انہوں نے اس کو اچھی طرح پہچان بھی لیا کیونکہ ان کے پاس نشانات و علامات اس نبی اعظم و آخر ﷺ کی موجود تھیں تو انہوں نے بجائے اقرار کے انکار کر دیا کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ بنی اسرائیل سے کیوں نہیں اور وہ بنی اسمٰعیل سے کیوں ہے؟

پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ تم کہہ دو میرا اور میرے پیروؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا ہے اور اس کے قانون مشیت پر راضی ہیں جو ہو سو ہو۔ جھگڑا ہمارا شیوہ نہیں ہے اور یہی نہیں کہ ہم جھگڑا نہیں ڈالتے بلکہ ہم جھگڑنے والوں کو کوئی جواب بھی نہیں دیتے کیونکہ جھگڑا تب ہی

ہوتا ہے جب کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ جس کے پاس دلیل موجود ہو اس کو جھگڑنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ ہمارے پاس دلیل موجود ہے۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کی علامات کی دلیل موجود ہے۔ پھر دلیل بھی ایسی جو تمہاری کتابوں میں ہو اگر تم نبی آخر کا انکار کرتے ہو تو نبی کا انکار ہی کیوں ہوا؟ خود تمہاری اپنی کتابوں کا انکار کیوں نہ ہوا؟ اور پھر جب تم اپنی ہی کتابوں کو ماننے کیلئے تیار نہیں تو اس سے ہمارا کیا نقصان ہوگا؟ جو نقصان ہوگا ظاہر ہے کہ وہ تمہارا ہی ہوگا۔ سورج طلوع ہو جائے اور کوئی ضدی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر سورج کا طلوع ہونا تسلیم نہ کرے تو آخر سورج کا کیا نقصان ہوگا؟ جو نقصان ہوگا وہ اس کا ہوگا جو اس کے طلوع ہونے سے انکاری ہے اگر کوئی اندھا ہے اس کو سورج نظر نہیں آتا تو بھی اس کے انکار کا سورج کو کوئی نقصان نہیں۔

اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں وہ بھی۔ اب تم مانو یا نہ مانو تمہیں اختیار ہے یہ کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ جب وضوح حق کی پوری پوری کوشش ہو لے اور مخاطب پھر بھی قبول نہ کرے تو اب بحث مباحثہ بالکل فضول ہے اس سے قیل و قال ترک کر دینا ہی مناسب ہے۔

اے اہل کتاب اور مکہ کے لوگو! کیا تم بھی اپنی پوزیشن بتا سکتے ہو؟

۵۷ اب اہل کتاب اور خصوصاً اہل کتاب کا گروہ نصاریٰ اور دوسرے معاندین سے مخاطب ہو کر پوچھا جا رہا ہے کہ ہم نے تو پوزیشن واضح کر دی کیا تم بھی اپنی پوزیشن بتا سکتے ہو یا نہیں؟ تمہارا کیا ارادہ ہے کیا تم بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری قبول کرتے ہو یا نہیں؟ "اسلمتم" کے معنی تو وہی ہیں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں کہ "کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟" "کیا تم بھی اللہ کے سامنے جھکتے ہو یا نہیں؟" لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "اسلام لاؤ" یعنی صیغہ امر کے لحاظ سے اور نحویین نے کہا ہے کہ الف استفہام کبھی امر کے بھی معنی دیتا ہے بلکہ امر کے معنی میں زور اور زیادہ پیدا کر دیتا ہے قال النحویون انما جاء الامر فی صورۃ الاستفہام (کبیر) پھر استفہام کی صورت میں بھی استفسار محض مراد نہیں بلکہ مقصود تہدید ہے جیسے اردو محاورہ میں بھی تہدید کے موقع پر کہتے ہیں "کیوں جی سنتے ہو کہ نہیں" "الامیین" مطلقاً ان پڑھ اور یہ لقب ہے مکے والوں کا خصوصاً کیونکہ وہ اسی لقب سے ملقب تھے۔ ان پڑھ اور اجڈ قسم کے لوگ۔ بدو' آسمانی کتابوں سے نابلد اور لاعلم۔ مراد بہرحال مشرکین مکہ ہیں۔

مختصر الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ میں اور میرے پیرو تو اس دین "الاسلام" کے ماننے والے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اب تم بتاؤ کیا تم اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اصل و حقیقی دین کی طرف آتے ہو؟

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ

سامنے جھک[58] جائیں تو انہوں نے راہ پالی۔ اگر روگردانی کریں تو پھر تمہارے ذمے جو کچھ ہے وہ پیام حق پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے غافل نہیں وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے[59]۔ ۲۰

جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں[60] اور اس کے نبیوں کے ناحق قتل کے

اگر انہوں نے مان لیا اور "ہاں" کہہ دی تو راہ پالی

۵۸ ان کو ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا۔ انہوں نے ہر سُنی کو اَن سُنی کر دیا۔ آخر کب تک ان کی اس حرکت کو برداشت کیا جائے گا؟ نبی اعظم و آخر ﷺ کی رسالت کو تسلیم بھی نہ کیا اور تسلیم نہ کرنے کا کوئی عذر بھی پیش نہ کر سکے۔ اب اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو چکا انجام کار اس کا فیصلہ ہونا بھی تو لازمی ہے۔ آخر کچھ تو بتاؤ؟ اچھا ان سے آخری بات یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جھک جائیں تو انہوں نے راہ راست پالی اور اگر روگردانی کریں تو اے پیغمبر اسلام! آپ زیادہ غمگین نہ ہوں آپ ﷺ کے ذمہ جو کچھ ہے وہ صرف پیغام پہنچانے کی حد تک ہے وہ آپ ﷺ نے پہنچا دیا اور بار بار پہنچایا۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری پوری ہوگئی وہ "ہاں" کریں گے یعنی مان لیں گے تو ان کا اپنا فائدہ ہے اور اگر نہیں مانتے تو نہ ماننے والوں کا علاج ہمارے پاس موجود ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے ہاں ایک کام کیلئے ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ آجاتا ہے تو جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ ان کا مقررہ وقت بھی آئے گا تو یقیناً ان کا کام بھی تمام ہو جائے گا۔

اللہ ان کی حالت سے خوب اچھی طرح واقف ہے

۵۹ "بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ" اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات کو دیکھنے والا ہے۔" بصیر" یعنی وہ ذات پاک ہے جو زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ہر ایک کے ذرہ ذرہ کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ گہرے سمندر کی تہہ میں جو چیز ہو یا سر بفلک پہاڑ کی جڑ میں جو چیز پوشیدہ ہو ہر ایک اس کی نظر کے سامنے موجود ہے۔

انسان کو چاہئے کہ اپنے دل کے شیشہ کو ہر عیب سے پاک رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی حق تلفی' آبرو ریزی' دل آزاری کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ ہر وقت اس تصور کو ایک لمحہ میرے دل پر ہر وقت ہر گھڑی اس ذات کی نگاہ پڑ رہی ہے۔ میری کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ حرکت بھی اس سے مخفی نہیں۔ میں اپنے دل کے راز کو بھی اس سے چھپا نہیں سکتا کہ وہ بذات الصدور ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آدمی گناہوں سے

پرہیز کرتا کرتا انشاء اللہ بالکل ہی پاک ہو جائے گا۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ اللہ کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اللہ تعالیٰ نے تم کو آنکھیں دی ہیں تاکہ تم اس کی آیات تکوینیہ جو کھلی کائنات میں موجود ہیں اور آیات تنزیلیہ جو کتب آسمانی کے اندر ہیں کو دیکھ کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تم میں شکر گزار بہت کم ہیں۔" (المومنون ۲۳ : ۷۸)

"زمین و آسمان میں کتنی نشانیاں ہیں جن پر تمہارا گزر ہوتا ہے اور تم ان سے اعراض کرتے ہو۔" (یوسف ۱۲ : ۱۰۵)

"جو لوگ اپنی آنکھوں سے حق کو نہیں دیکھتے۔ وہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔" (الاعراف ۷ : ۱۷۹)

"جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں خواہ وہ انکار قولی ہو یا علمی ان کی آنکھیں بھی ان کے کام نہیں آتیں اور بصیرت بھی وہ ضائع کر چکے ہیں۔" (الاحقاف ۴۶ : ۲۶)

"اللہ تعالیٰ تو تمہاری آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہے وہ بھی اس کو معلوم ہے۔" (المومن ۴۰ : ۱۹)

اب پوری آیت کا ماحصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے اتمام حجت کہ اصل دین خدا پرستی ہے ساری باتیں چھوڑو یہ بتاؤ کہ تمہیں خدا پرستی سے اقرار ہے یا انکار؟ اگر اقرار ہے تو سارا جھگڑا ختم ہوگیا۔ کیونکہ اسلام کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگر انکار ہے تو پھر جن مدعیان مذہب کو خدا پرستی ہی سے انکار ہو ان سے بحث و نزاع کیا سود مند ہو سکتی ہے؟

اللہ سے مقابلہ کرنے والوں کو جان لینا چاہئے کہ مقابلہ کس سے ہے؟

۶۰ کتاب الٰہی خصوصاً قرآن کریم سے یا اس کے کسی جز سے انکار یہ سب "کفر بایت اللہ" ہے۔ جو لوگ اتنے چھوٹ ہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کا انکار کر دیا ہے ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اب ان کا مقابلہ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ بس ان کو خود ہی جان لینا چاہئے کہ اللہ سے مقابلہ کر کے کیا وہ کامیاب ہو سکتے ہیں؟ جو خود ہی موت کو ماسی کہے اس کو مرنے ہی دو۔

ایسے ہی تو لوگ تھے جو انبیاء اللہ تک کے قتل کے مرتکب ہوئے اور ان کو بے دریغ قتل کیا۔ وہ ان ہی کے آباء تھے اور آج یہ بھی کیا کر رہے ہیں؟ کہ جو لوگ حق و صداقت کا حکم دینے والے ہیں یہ ان کو قتل کے درپے ہیں۔ اے پیغمبر اسلام! کیا آپ ﷺ کے قتل کی سازشیں انہوں نے نہیں کیں؟ ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے اس میں کوئی کسر اٹھا رکھی؟ وہ حق و صداقت کے دشمن ہیں اور ان کی یہ دشمنی بہت پرانی ہے۔ ان کی حق بیزاری کی تصریح ان کی اپنی کتب آسمانی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً

النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ
النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ۲۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ۲۲ اَلَمْ تَرَ

مرتکب رہ چکے ہیں نیز ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو حق و عدالت کا حکم دینے والے ہیں تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری پہنچا دو۔[۶۱] ۲۱

یہی لوگ[۶۲] ہیں جن کا سارا کیا دھرا' دنیا و آخرت دونوں میں اکارت گیا اور کوئی نہیں جو ان کا مددگار ہوگا۔ ۲۲

"وہ اس کا کینہ رکھتے ہیں جو دروازہ پر سرزنش کرتا ہے اور وہ اس سے نفرت رکھتے ہیں جو حق بات کہتا ہے۔" (عموس ۵ : ۱۰)

آپ ﷺ ان کے کان تک عذاب الٰہی کی خبر پہنچا دیں! بس

۶۱ "آپ ﷺ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری پہنچا دیں۔" یہ طنزیہ انداز بیان ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت نازاں اور بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں۔ برائی کے بھی مرتکب ہیں اور پاک بازوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں آپ ﷺ انہیں بتا دیں کہ تمہارے ان اعمال بد کا انجام کیا ہونے والا ہے؟

"عَذَابٌ اَلِيْمٌ" ایسے مجرموں اور خطا کاروں پر دنیوی لعنت کی خبر آپ ﷺ سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے بھی ہم ان کو سنا چکے ہیں جس کا مفصل ذکر کتاب مقدس میں موجود ہے۔

"وہ جلد ہی گھاس کے مانند کاٹ ڈالے جائیں گے اور ہرے سبزے کی طرح مرجھا جائیں گے اور شہر میں نہ ہوگا تو غور کرکے اس کا مکان ڈھونڈے گا اور وہ نہ ہوگا۔ ان کی تلوار انہی کے دلوں میں بیٹھے گی ان کی کمانیں ٹوٹ جائیں گی۔ الخ۔" (زبور ۳۷ : ۷، ۲۰)

گویا اس آیت ۲۱ میں اہل کتاب کی قومی گمراہیوں اور بد عملیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جس گروہ کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہوگئی ہو کہ حق و عدالت کی دشمن اور ظلم و فساد کی پرستار ہو اس سے قبولیت حق کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ

اے پیغمبر اسلام! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جنہیں کتاب اللہ کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے یعنی یہود و نصاریٰ انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا گیا کہ

عوام کے بگاڑ کا اصل سبب علماء قوم ہوتے ہیں

۶۲ قوم کو تعلیم الٰہی سے ہٹا کر اہواء و خواہشات کے پیچھے لگا دینا عوام کا کام نہیں یہ ہمیشہ سے علماء کے گروہ ہی کا کام رہا ہے اور اب بھی ہے۔ تاریخ مذاہب عالم کا مطالعہ کر لو اگر نہیں تو خود قرآن کریم ہی کی آیات پر غور و فکر کر کے دیکھو آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ عوام کے بگاڑ کا اصل سبب خواص قوم ہی ہوتے ہیں۔ خواص قوم کون ہیں؟ علمائے قوم اور مترفین قوم۔ مترفین کون ہیں؟ قوم کے وڈیرے یعنی سیاستدان۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۳ : ۶۷، ۶۸) "اور وہ کہیں گے اے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں، چودھریوں اور علماؤں اور بڑوں اور سرغنوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے گمراہ کر دیا، ہم بے قصور ہیں نظر کرم فرما اے ہمارے آقا و پروردگار! ان سرداروں، چودھریوں، علماؤں، بڑوں اور سرغنوں کو جنہوں نے ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکایا انہیں دوہرا عذاب دے اور لعنت زدہ قرار دے کر اپنی رحمت سے دور اور بہت ہی دور کر دے۔"

یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صرف کی ہیں جس کا نتیجہ دنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔ ان کا مددگار کوئی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو ان کے اس غلط کو صحیح بنا دے یا کم از کم بد انجامی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسہ رکھتے تھے کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہوں میں ان کے کام آئیں گے ان میں سے فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی کیونکہ یہ طے شدہ بات ہے اور طے بھی کس نے کی؟ خود اللہ تعالیٰ نے اس لئے اس میں ترمیم نہ کی جا سکتی ہے نہ کرائی جا سکتی ہے۔

اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ

ان کے درمیان فیصلہ کر دے اس پر بھی ایک گروہ اس سے صاف روگرداں ہے اور اصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کی طرف سے یعنی تورات کی طرف سے ان کے رخ ہی پھرے ہوئے ہیں۔ ۲۳

اور ان کی یہ حالت اس لئے ہوئی کہ انہوں نے کہا دوزخ کی آگ ہمیں کبھی نہیں چھوئے گی اور اگر چھوئے گی بھی تو گنتی کے چند دنوں کے لئے اس طرح سے وہ جو اللہ

ان کو جب کتاب اللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو منہ پھیر جاتے ہیں

۶۳ تم نے دیکھا کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے ان کا حال کیا ہے؟ وہ کون ہیں جن کو کتاب سے کچھ حصہ ملا ہے؟ ظاہر ہے کہ علماء قوم ہی ہیں۔ انہیں جب بلایا جاتا ہے۔ کہاں بلایا جاتا ہے؟ کتاب اللہ کی طرف بلوایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے یعنی ان سے کہا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کو آخری سند مان لو۔ اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دو اور جو کچھ اس کی رو سے حق ثابت ہو اسے حق اور جو اس کی رو سے باطل ثابت ہو اسے باطل تسلیم کر لو تو وہ منہ پھیر جاتے ہیں۔

یہ گمراہی عوام کی گمراہی نہیں بلکہ علمائے اہل کتاب کی گمراہی تھی کہ جس کتاب کو وہ کتاب الٰہی مانتے تھے یعنی تورات کو انجیل کو اور اس کے علم و عمل کے وہ مدعی تھے۔ جب اس کتاب پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی تو صاف انکار کر گئے کیونکہ اس کے احکام پر عمل کرنا ان کی نفسانی خواہشوں اور مطلب براریوں کے خلاف تھا۔ یہ تو اہل کتاب کا حال ہے کیا آج اہل اسلام کا یہ حال نہیں؟ وہ مختلف مکاتب فکر میں تقسیم ہوگئے اور مکتب فکر کے ساتھ وابستہ اپنے مکتبہ فکر سے ہٹ کر کوئی بات کرنے پر تیار ہے؟ اچھا جس عذاب کے مستحق اہل کتاب ہوئے' کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنی کتاب سے منہ موڑ کر اپنی اہوا و خواہشات کے پیچھے لگ گئے تھے آج اس عذاب کے مستحق مسلمان کہلانے والے نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بھی اپنی کتاب یعنی قرآن کریم سے منہ موڑ کر اپنی اہواء و خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اگر اعمال ایک طرح کے ہوں تو کیا نتائج ایک طرح کے نہ ہوں گے؟

فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۲۴ ۞ فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ

پر افتراء پردازی کرتے رہے ہیں اس نے انہیں دین کے متعلق مبتلائے فریب کر دیا ہے۔[۶۴] ۲۴

لیکن اس وقت ان کا حال کیا ہوگا جب قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی

انہوں نے کہا کہ دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہو چکی ہے

۶۴ ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہیں کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز تک کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ ہی کریں بہرحال جنت ہماری ہے۔ ہم اہل ایمان ہیں۔ ہم فلاں فلاں کی اولاد ہیں اور فلاں کی امت اور پھر فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ۔ سگان درگاہ فلاں۔ بھلا دوزخ کی کیا مجال ہے کہ ہمیں چھو جائے اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے۔ دوزخ کیا ہے؟ ایک شفاخانہ ہی تو ہے وہاں داخل ہوں گے تو شفا یقینی ہے پھر صحت یاب ہوتے ہی جنت پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری اور بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کھلم کھلا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خوف خدا ان کے دلوں میں نہیں آتا۔ دراصل ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملہ میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔

وہ پوچھتا ہے یہ بات تمہیں کہاں سے معلوم ہوگئی کہ یہودی کہلوانے والا ہر فرد نجات یافتہ ہے؟ اور عذاب اخروی سے اسے چھٹکارا مل چکا ہے؟ کیا تمہیں اللہ نے غیر مشروط نجات کا کوئی پٹہ لکھ دیا ہے کہ جہاں ایک انسان یہودی ہوا اور آتش دوزخ اس پر حرام ہوگئی؟ اگر نہیں دیا ہے تو پھر بتلاؤ ایسا اعتقاد رکھنا اللہ پر افتراء نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے :

"نہیں اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو لیکن جس کسی نے بھی برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہنے والا۔" (البقرہ ۲ : ۸۱)

وہ صاف صاف لفظوں میں خدا کے قانون عمل کا اعلان کرتا ہے وہ کہتا ہے جس کسی نے بھی اپنے عمل

لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۲۵ ۞
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ

شبہ نہیں ہم انہیں اپنے حضور جمع کریں گے اور ہر جان نے جیسا کچھ کمایا ہے اس کے مطابق اسے پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی کے ساتھ ظلم یعنی ناانصافی نہ[۶۵] ہوگی۔ ۲۵

اے پیغمبر اسلام! تم کہو اے اللہ! شاہی و جہانداری کے مالک[۶۶]! تو اپنے قانون کے

سے برائی کمائی اس کیلئے برائی ہے جس کسی نے بھی بھلائی کمائی اس کیلئے بھلائی ہے۔ یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے خواہ یہودی یا غیر یہودی اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے خواہ پینے والا کسی نسل و قوم اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو اس طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا ایک خاصہ ہے اور وہ اس لئے بدل نہیں سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا گروہ بندی کیا ہے۔ ہاں! اگر کوئی فرق ہے تو وہ اس دنیا کے نظام سے فارغ ہو کر دوسرے نظام میں داخل ہونے کے ساتھ خاص ہے اور وہ بھی صرف اور صرف "ایمان" کی شرط ہے اور "ایمان" بھی کسی نسل یا قوم سے تعلق نہیں ہے۔

نجات کا دارومدار کسی کی وہم پرستی پر نہیں بلکہ اس کیلئے مستقل قانون ہے

۶۵ ان بدبختوں، وہم پرستوں اور شامت زدوں کا حال اس روز کیا ہوگا جس روز کے آنے میں ذرا بھی شک نہیں "يَوْمٌ لَّا رَيْبَ فِيْهِ" یعنی قیامت کے دن۔ اس طرز سے مقصود محض قیامت کا ذکر کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے وقوع کی قطعیت کو ذہن نشین کرا دینا ہے۔ بڑے تاسف اور افسوس سے کہا جا رہا ہے کہ کیا بنے گا ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس روز کا آنا یقینی ہے۔ اس روز تو ہر ایک شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ کسی کو سزا بلا جرم یا زائد از جرم مل جائے یا کسی کی کوئی نیکی بغیر اجر کے چھوٹ جائے۔

"مَا كَسَبَتْ" جو کچھ اس نے کمایا ہے یا حاصل کیا ہے خواہ وہ حسنات ہوں یا سیئات ہوں۔ ہاں! کسی کو اس کے عمل کے برابر دینے کے بعد اس پر انعام کے طور پر زیادہ دے دیا جائے خواہ وہ کتنا ہو یا کسی کو اس کے عمل کے برابر دینے کے بعد اس کے نتیجہ پر لکیر پھیر دی جائے یہ دوسری بات ہے کیونکہ اس کے قانون میں وضاحت موجود ہے کہ انعام بھی دیا جا سکتا ہے اور "حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ" کے مطابق ان کے نیک اعمال پر لکیر بھی پھیری جا سکتی ہے جس سے ان کا کیا کرایا سب اکارت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ظلماً نہیں بلکہ عدلاً ہوگی۔

اب طریقہ دعا سکھایا جاتا ہے جس میں ان کے وہم کا علاج بھی ہے

۶۶ رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے طریق دعا کی تعلیم امت کو دی جا رہی ہے اور اس کا انداز ایسا اختیار کیا جا رہا ہے کہ ان سارے وہم پرستوں کے وہم کا علاج بھی اس میں مضمر ہے کہ ملک کس کا ہے اور مالک کون ہے؟ آج اگر کوئی بادشاہ ہے تو وہ کل کیا تھا اور آئندہ کل کو کیا ہوگا؟ کس کو معلوم ہے؟ قیامت کے روز جن کے پلو پکڑنے کی' امیدیں ہیں آخر ان کی دلیل کیا ہے؟ کون ہے جس کو یہاں ہمیشگی جو آج اور کل نہیں ہوگا۔ جو کل تھا اور آج نہیں۔ جس کے اپنے ہی وجود کو ثبات نہیں وہ کسی کا سہارا کیونکر ہو سکتا ہے؟ جو خود مصیبت میں مبتلا ہے وہ دوسرے کی مصیبت کو کیا دور کرے گا۔ جو خود محتاج ہے کیا وہ دوسرے کی حاجت کو پورا کر سکتا ہے؟ "مالک الملک" کون ہے؟ ملک سے مراد سارا جہان ہے۔ مالک کا لفظ دعا کے شروع ہی میں لا کر یاد دلا دیا کہ مالکانہ تصرف کا حق و اختیار اس کو ہے جس سے دعا کی جا رہی ہے اس جگہ کوئی بھی کسی شے کا مستقل مالک نہیں۔ یہاں ہر مالک کو بھی فنا ہے اور ہر ملکیت کو بھی۔ فنا نہیں تو صرف ایک کو اور ہر چیز کا مالک ہے تو صرف وہی۔ جس چیز کے آج تم مالک ہو کل اس کا کوئی اور مالک تھا۔ جس چیز کے آج تم مالک ہو کل کوئی اس کا اور مالک ہوگا۔

کیا یہ ملکیت تم خود بدل رہے ہو۔ اپنی مرضی سے بدل رہے ہو۔ سوچ کر جواب دو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر وہ کون ہے جو اس کو بدل رہا ہے؟ ہاں! وہ وہی ہے جو دراصل مالک ہے اس نے ایک چیز تمہاری ملک میں دی اور کل کسی دوسرے کی ملکیت میں دے دے گا۔ تم کو اختیار نہیں۔ نہیں' نہیں یہاں کسی کو بھی اختیار نہیں۔ جن کا تم اختیار سمجھتے ہو ان کا بھی اختیار نہیں۔ تم کو دھوکا ہوا ہے۔

"تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ" اس مرضی کا مالک کون ہے؟ اقرار لیا جا رہا ہے کہ اللہ ہی اس مرضی کا مالک ہے "تو جسے چاہے ملک بخش دے۔" لیکن یہ بخشش عارضی طور پر ہے کیونکہ جس کو تو بخشش ہوئی ہے وہ بھی عارضی ہے اور جو بخشا گیا وہ بھی عارضی۔

"وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ" تو جس سے چاہے ملک واپس لے لے۔ اگر اس میں دینے لینے کا قانون ہے تو وہ بھی اسی عطا کرنے والے نے خود بنایا ہے وہ بیشک اپنے قانون کے مطابق عطا کرے اور قانون کے مطابق لے لے۔ اس قانون پر بھی کسی کا اختیار نہیں۔ حکومت جیسی نعمت کو دینا یا اس نعمت کو واپس لے لینا تمام تر اس احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے اور نفس بادشاہت یا حکومت میں تقویٰ یا الوہیت ذرا سی بھی نہیں اور بالکل نہیں۔ اس میں کثرت سے پھیلے ہوئے اس جاہلی عقیدہ کا رد آگیا کہ بادشاہ خود ایک درجہ الوہیت یا نیم الوہیت کا ہے اور کسی کا بادشاہ ہو جانا گویا خدا کے اوتار کے مرتبہ پر پہنچ جانا ہے۔ جیسے مصر میں فرعون کی پرستش ہوتی رہی۔ ہندوستان میں چندر بنسی اور سورج بنسی۔ راجہ مہاراجہ خدائی اوتار سمجھے جاتے تھے۔ جاپان میں میکاڈو کل تک مظہر خدا کی حیثیت رکھتا تھا۔

الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط
بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ۲۶ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي

مطابق جسے چاہے ملک بخش دے' جس سے چاہے ملک لے لے' جسے چاہے عزت[۶۷] دے دے' جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے[۶۸] اور تو نے ہر بات کے لئے ایک انداز مقرر کر دیا ہے۔ ۲۶

ہاں ہاں[۶۹]! تو ہی ہے جو رات کو دن میں لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جاندار کو

سب اسی عقیدہ شاہ پرستی کے مظاہر اور علامات ہیں۔ اسلام نے آکر بتایا کہ بادشاہی بھی دوسری نعمتوں کی طرح ایک الٰہی تصرف ہے اور بادشاہ بھی بندگی۔ بے بسی۔ بے چارگی میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے سارے دوسرے انسان اور سارے دوسرے بندے۔ حقیقت ہمیشہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس وقت اس کا نظارہ پوری قوت و شدت کے ساتھ مسولینی آمر اٹلی اور ہٹلر آمر جرمنی کے انجام کار سے کرایا جا سکتا ہے اور اب بھی باوجود جمہوریت کے دعویٰ کے ان آمروں کی کمی نہیں جن سے یہ درس لیا جا سکتا ہے کہ مالک ہر شے کا خدا وحدہ لا شرک لہٗ ہی ہے۔ باقی سب نام ہی نام ہیں۔ ایک گیا اور دوسرا آگیا۔ اور یہ "گیا" اور "آگیا" کا مسلسل عمل جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عمل جاری ہے تو کوئی اس عمل کا عامل بھی ضرور ہے کیونکہ کوئی عمل بغیر عامل کے ممکن نہیں۔

عزت کے خواہش مند اچھی طرح جان لیں کہ عزت بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے

۶۷ اے ہمارے رب! تو جسے چاہے اپنی حکمت کاملہ کے مطابق عزت دے "جسے تو چاہے" کی وسعت میں قومیں بھی آگئیں اور افراد بھی۔ عزت کا سب سے بڑا مرتبہ جو بڑے سے بڑا ہو سکتا ہے یاد کیا جائے کہ وہ کیا ہے؟ خوب غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ نبوت ہے جب تک وہ جاری تھی۔ اس طرح گویا اہل کتاب کو یہ یاد دلا دیا کہ جس قوم کے جس فرد کو وہ چاہے جب تک نبوت جاری تھی مرتبہ نبوت سے سرفراز کر دے اس لئے یہ اعتراض تمہارا بالکل بے معنی اور بے محل ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ بنی اسمٰعیل سے کیوں آگیا؟ وہ بنی اسرائیل سے کیوں نہ ہوا؟ نبوت نہ تو بنی اسرائیل کے اختیار میں تھی اور نہ ہی بنی اسمٰعیل کے اختیار میں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جاری تھی جب تک کہ جاری تھی اور اب بالکل بند ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جو وقت اس نے اس کے بند کرنے کا مقرر کیا تھا اس پر اس کو بند کر دیا۔

"وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ" تو جسے چاہے ذلت دے اس کی پاداش عمل میں۔ اس کا اطلاق بھی فرد و قوم دونوں

پر حاوی تھا۔ کوئی فرد تو مرتبہ نبوت سے معزول نہیں ہوا اور نہ ہی معزول ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ نعمت قوموں سے سلب ہو سکتی تھی جب تک نبوت جاری تھی۔ اب نبی اعظم و آخر ﷺ کے بعد کسی قوم سے یہ نعمت سلب نہیں ہوئی بلکہ منصب نبوت ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ قوم بنی اسرائیل صدیوں تک اس نعمت سے سرفراز رہنے کے بعد معزول کی گئی اور یہ نعمت اپنی انتہائی اور آخری شکل میں عرب قوم کے ایک ممتاز فرد کے حصے میں آئی جو بنی اسمٰعیل سے تعلق رکھتا تھا۔

ہر طرح کی بھلائی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے

۶۸ "تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔" اہل کتاب اس پر حیرت زدہ کیوں ہیں کہ نعمت نبوت سے عرب قوم کا ایک فرد سرفراز کیا جا رہا ہے۔ "الخیر" یعنی بھلائی ہر قسم کی اور ہر مرتبہ' درجہ کی۔ کائنات میں وجود ایجابی صرف خیر کا ہے اس لئے ذکر اس کا کیا گیا اس کے مقابل کی چیز یعنی شر محض ایک سلبی چیز کا نام ہے۔ اس جگہ صرف "خیر" کا ذکر ہے "شر" کا نہیں کیوں؟ اس لئے کہ جس چیز میں بندہ کے ارادہ اور اختیار کو دخل نہ ہو وہ محض خیر ہی خیر ہے۔ اسے ناگوار نہ جاننا چاہئے اور اسے اپنے حق میں عذاب و مصیبت نہ سمجھنا چاہئے۔

تصرفات الٰہی کی ایک مثال پیش کی جا رہی ہے

۶۹ پیچھے تصرفات الٰہی کا ذکر کیا تھا اب اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے تاکہ بات کی وضاحت ہو جائے اور اچھی طرح انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ جو کچھ ہے سب قبضہ قدرت الٰہی میں ہے اس سے باہر کچھ نہیں۔ "تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔" غور طلب بات یہ ہے کہ جب رات دن میں داخل ہوتی ہے تو کیا رات رات بھی رہتی ہے اور دن میں بھی داخل ہو جاتی ہے؟ نہیں جتنی رات دن میں داخل ہوتی ہے وہ دن ہو جاتا ہے اور رات نہیں رہتی۔ اسی طرح جب دن رات میں داخل ہونا شروع ہوتا ہے تو جتنا دن رات میں داخل ہو جاتا ہے وہ دن دن نہیں رہتا بلکہ رات ہو جاتا ہے۔ گویا یہ بیان ہے رات دن کے گھٹنے اور بڑھنے کا۔ پھر ایسا کیوں ہے؟ یہ سب کچھ خالی از حکمت نہیں اس کمی بیشی میں انسانی زندگی کے کتنے فائدے ہیں موسم کے اس تغیر و تبدل میں کیا کچھ راز پنہاں ہیں؟ اگر یہ کچھ نہ ہوتا تو کیا انسانی زندگی کا قیام ممکن تھا؟

اس پر قوموں کے عروج و زوال پر قیاس کر لو۔ جب کوئی قوم عروج پر ہوتی ہے تو اس کو قومی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس کو اس کی قومی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح موسموں کا تغیر بغیر کسی مقصد کے نہیں بالکل اسی طرح قوموں کا عروج و زوال بھی بغیر کسی مقصد کے نہیں۔ جس طرح رات دن کی کمی بیشی میں ایک الٰہی قانون کام کر رہا ہے بالکل اسی طرح قوموں کے عروج و زوال میں بھی الٰہی قانون جاری و ساری ہے۔ یہاں بغیر ضرورت اور بغیر مقصد کے کچھ نہیں۔ انسان کی سمجھ

میں وہ مقصد اور ضرورت آئے یا بالکل نہ آئے۔ انسان اس مقصد اور ضرورت پر غور کرے یا بالکل نہ کرے۔ یہاں جو کچھ ہے سب کا سب باقاعدہ ایک نظم و نسق کے تحت ہے۔ اس سے کیا سمجھایا جا رہا ہے؟

جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتوت دیکھتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں دوسری طرف اہل ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور پھر ان کو اس فقر و فاقہ اور ان مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے جن میں خود نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام ۳ ھ کے لگ بھگ زمانے میں مبتلا تھے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز استفہام گردش کرنے لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی استفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرائے میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اچھا! اس قانون قدرت پر ذرا غور کرو کہ دن رات میں کمی بیشی، تسلیم، کیا تم نے کبھی ایسا بھی دیکھا کہ آج رات ۱۴ گھنٹے کی اور دن ۱۰ گھنٹے کا ہے لیکن معاً کل دن ۱۴ گھنٹے کا اور رات ۱۰ گھنٹے کی ہو جائے؟ نہیں اور ہرگز نہیں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ اس قانون قدرت کے خلاف ہے جو اس ذات الٰہ نے دن کی کمی بیشی کیلئے مقرر فرمایا ہے۔ پھر تم یہ ضد نہ کرو کہ ہم رب کو تب ہی رب مانیں گے کہ آج اور کل میں معاً دو یا چار گھنٹے کا فرق کر کے دکھائے۔ بالکل اسی پر قیاس کر لو آج جو قوم من حیث القوم مردہ نظر آتی ہے حالانکہ اس کے اندر خود اللہ کا نبی اور رسول موجود ہے اور جو قوم من حیث القوم زندہ نظر آتی ہے حالانکہ اس کے اندر اللہ اور اس کے رسول کے سارے دشمن جمع ہیں۔ یہ حالت خود بخود اس بات کی دلیل ہے کہ جو قوم تم کو آج مردہ نظر آ رہی ہے وہ دراصل زندہ ہے اور جو قوم من حیث القوم تم کو زندہ نظر آ رہی ہے وہ زندگی کے آخری سانس پر ہے دن گزرنے دو۔ وقت نکلنے دو تم خود دیکھو گے کہ کونسی قوم زندہ ہے اور کونسی قوم مردہ۔

پھر غور کرو کہ ابھی ٹھیک سات سال بھی نہیں گزرے تھے کیا یہ بات روشن ہو گئی تھی یا نہیں؟ سو یاد رکھو کہ قوموں کی حیات و ممات کا اصول بھی اللہ کے ہاں طے شدہ اصول ہے۔

بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ دنیا ہی میں حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے جسے اٹھنا ہے وہ اٹھ کھڑا ہو اور جسے گرنا ہے وہ گرا دیا جائے۔ پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اٹھنا کس کیلئے تھا اور گرنا کس کا مقدر بن گیا۔

"اے اللہ تو بے جان سے جاندار نکالتا ہے۔" اس کی مثالیں کائنات کی کھلی کتاب میں عام ہیں اور کتب آسمانی کے اندر بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھنا ہی ہے تو اس مثال کو دیکھو۔ قرآنی اوراق میں اس کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (الانعام ۶ : ۷۴) "اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کیا تم ان بتوں کو معبود مانتے ہو؟

النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے اور جسے چاہتا ہے اپنے قانون فطرت کے مطابق بے حساب بخش دیتا ہے[۷۰] یعنی جس کو عطا کرتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ ۲۷

میرے نزدیک تو تم اور تمہاری ساری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔"

ابراہیم علیہ السلام کا باپ کفر کی موت مر چکا تھا اللہ نے اس مردہ باپ سے ابراہیم جیسا زندہ و تابندہ انسان پیدا فرما کر "تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ" کی مثال پیش فرما دی جس میں غور کرنے والوں کیلئے سینکڑوں نشانیاں موجود ہیں۔

سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی داستان سے کون ناواقف ہے ذرا قرآن کریم کی اس آیت پر غور کرو۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ○ (ھود ۱۱ : ۴۲، ۴۳) "اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا وہ کنارے پر کھڑا تھا کہ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا کافروں کے ساتھ نہ رہ۔ اس نے کہا' میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی کی زد سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے کہا تو کس خیال خام میں پڑا ہے؟ آج اللہ کی ٹھہرائی ہوئی اس بات سے بچانے والا کوئی نہیں مگر ہاں! وہی جس پر رحم کرے اور دیکھو! دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی پس وہ انہیں میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے۔"

نوح علیہ السلام جیسے زندہ بلکہ اسلامی زندگی کے داعی جیسے باپ سے آپ کے اس بیٹے جیسا مردہ انسان پیدا فرما کر اللہ تعالیٰ نے "تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ" کی مثال پیش فرما دی جس میں غور کرنے والوں کیلئے ان گنت نشانیاں موجود ہیں۔

اس طرح کی مزید مثالوں پر غور کرنا ہو تو سورہ الکہف کی پچاسی آیت اور سورہ الاحقاف کی آیت سترہ کا بغور مطالعہ کرو اور انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈے کی مثال تو آپ پڑھتے اور دیکھتے ہی رہتے ہیں۔

"بے حساب" رزق دینے کا مطلب کیا ہے؟ اور روزی رساں کون؟

۷۰ اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ جس کو چاہے اتنا رزق دے دیتا ہے کہ اس کو حساب

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ

جو لوگ ایمان والے ہیں ان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو اپنا رفیق و مددگار[۱] بنائیں اور جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں[۲] رہا۔ ہاں! اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ تم ان کے شر سے بچنے کے لئے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور کر لو تو یہ دوسری بات[۳] ہے اور دیکھو اللہ بھی

بھی نہ ہو کہ میں نے کتنا دے دیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جس کو رزق دیا گیا ہے اس کو یہ حساب نہ رہے کہ اس کو کتنا رزق دیا گیا ہے کیونکہ رزق دینے والا اللہ ہے اور جس کو رزق دیا گیا ہے وہ انسان ہے۔ انسان کے حساب میں ایک چیز نہ آئے ممکن ہے لیکن اللہ کے حساب میں نہ رہے یہ ممکن نہیں۔

لیکن یہاں بغیر حساب کے رزق دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو کسی کام سے اتنا رزق عطا فرما دے جتنا کہ اس کام سے رزق حاصل کرنے کا انسان کو وہم و گمان بھی نہ ہو اور ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ خود قرآن کریم نے اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ جہاں فرمایا :

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق ۶۵ : ۳) "اور اللہ اسے ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں سے کچھ ملنے کا اسے خیال تک نہ تھا۔" کیوں اور کیسے؟

اس لئے رزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

۱۔ "اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو روزی دیتا ہے۔" (الروم ۳۰ : ۴۰)

۲۔ "اسی نے تمہارے لئے معیشت کے سامان پیدا کئے اور جانوروں کی قسم سے بھی ایسی ایسی چیزیں پیدا فرما دیں جن کو تم روزی نہیں دیتے۔" (الحجر ۱۵ : ۲۰)

۳۔ "ذرا بتاؤ تو سہی کہ کتنے جانور ہیں جو اپنی اپنی روزی اٹھائے پھرتے ہیں۔ اللہ ہی تو ہے جو ان کو بھی اور تم کو بھی روزی دیتا ہے۔" (العنکبوت ۲۰ : ۶۰)

۴۔ "اللہ تعالیٰ تم سے رزق نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہے کہ تم اسے کھلاؤ۔ وہ تو خود روزی دینے والا صاحب قوت اور متین ہے۔" (طہ ۲۰ : ۳۲) (الذاریات ۵۱ : ۵۷، ۵۸)

۵۔ "ذرا بتاؤ تو سہی کہ کون ہے جو تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے۔ ارے وہی اللہ تو ہے۔" (النساء ۳۴ : ۴۲)

ایمان والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ منکرین حق کو رفیق و مددگار نہ بنائیں

۱۷ مومنوں کو چاہئے کہ وہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں نہ ظاہری طور پر اور نہ باطنی طور پر۔ کیونکہ جسے دوستی کا علاقہ کہتے ہیں وہ ایک کیفیت قلب و دماغ اور پھر عملی برتاوا ہے۔ مسلمانوں کو کافروں، منکروں اور اللہ کے باغیوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور عقلاً بھی یہ ملّی خود داری اور قومی تشخص کے بالکل منافی ہے۔

لیکن افسوس کہ آج کل یہ نفرت مختلف مکاتب فکر نے اسلام کے اندر رہتے ہوئے ایک دوسرے سے کرنا شروع کر دی ہے اور پھر وہ اس کو اپنی اپنی جماعت اور گروہ بندی کیلئے اتنا ہی ضروری قرار دیتے ہیں جتنا کہ اسلام نے کفر کے مقابلہ میں ضروری قرار دیا تھا جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس گروہ بندہ کو پکا کرنے کیلئے ایک دوسرے کو کھلم کھلا کافر کہنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ منافرت پھیلانے والا وہی طبقہ ہے جو علمائے کرام کے نام سے معروف ہے۔ کیا یہ علم ہے یا سراسر جہل؟

قرآن کریم نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ کافروں کو دلی دوست بنا لیں اور اپنے رازوں سے ان کو واقف کریں اور اپنوں کی طرح انحصار ان پر رکھیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ○ (المائدہ ۵ : ۵۱، ۵۲) "مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق و مددگار نہ بناؤ وہ تمہاری مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دیکھو اب تم میں سے جو کوئی انہیں رفیق و مددگار بنائے گا تو وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا اللہ اس گروہ پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھولتا جو ظلم کرنے والا گروہ ہے۔ پھر اے پیغمبر اسلام! تم دیکھو گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا روگ ہے وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے کسی مصیبت کے پھیر میں نہ آجائیں۔ تو یقین کرو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تمہیں فتح دے گا یا اس کی طرف سے کامیابی اور غلبہ کی کوئی اور بات ظاہر ہو جائے گی اور اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

"اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ اور کفار میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے یعنی تحقیر و تذلیل کیلئے اس کی ہنسی اڑاتے رہتے ہیں تم انہیں اپنا مددگار و رفیق نہ بناؤ اور اللہ کی نافرمانی کے نتیجوں سے ڈرتے رہو اگر فی الحقیقت تم ایمان رکھنے والے ہو۔" (المائدہ ۵ : ۵۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو جو تمہارے خلاف لڑ رہے ہیں اور تمہاری بربادی پر

تلے ہوئے ہیں اپنا رفیق و مددگار بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو؟" (النساء ۴ : ۱۴۴) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اپنے آدمیوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہم راز اور معتمد بناؤ۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ تمہارے خلاف فتنہ انگیزی میں کمی کرنے والے نہیں۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہی انہیں اچھی لگتی ہے۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں ہی سے ظاہر ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔" (ال عمران ۳ : ۱۱۸)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اگر یہ تم مسلمانوں میں گھل مل کر نکلتے تو تمہارے اندر کچھ زیادہ نہ کرتے مگر ہر طرح کی خرابی اور ضرور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑاتے کہ ادھر کی بات ادھر لگاتے اور ادھر کی ادھر اور تم جانتے ہو کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتوں پر کان دھرنے والے ہیں اور اللہ جانتا ہے کون ظلم کرنے والا ہے۔" (التوبہ ۹ : ۴۷)

ایک جگہ وضاحت سے فرما دیا کہ :

"مسلمانو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو انہیں اپنا رفیق و کارساز نہ بناؤ اور جو کوئی بنائے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ اے پیغمبر اسلام! مسلمانوں کو کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ اللہ کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسقوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔" (التوبہ ۹ : ۲۳، ۲۴)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"وہ لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو اپنا رفیق و مددگار بناتے ہیں اور مسلمانوں کی دوستی پر دشمنوں کی دوستی کو ترجیح دیتے ہیں تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کے پاس عزت ڈھونڈیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھیں عزت جتنی بھی ہے سب کی سب اللہ ہی کیلئے ہے یعنی اس کے اختیار میں ہے جسے چاہے اپنے قانون کے مطابق دے دے۔ دشمنان حق کے ہاتھ میں نہیں ہے اگرچہ وہ اس وقت عارضی طور پر دنیوی عزت اور شوکت رکھتے ہیں اور پیروان حق بے سروسامان اور کمزور ہیں۔" (النساء ۴ : ۱۳۸)

"مسلمانو! اللہ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا دوست مت بناؤ کہ ان کے ساتھ محبت و اعانت سے پیش آنے لگو حالانکہ اللہ نے جو سچائی تمہاری طرف بھیجی ہے وہ اس سے انکار کر چکے ہیں اور اس

کے دشمن ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اور تم کو یعنی صحابہ کرامؓ کو محض اس بناء پر جلا وطن کیا کہ تم اپنے پروردگار یعنی اللہ پر ایمان لائے ہو لہٰذا اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا جوئی کی خاطر اپنے گھروں سے نکلے ہو تو یہ دوستی مت کرو۔ تم پوشیدہ ان کو دوستی کے پیغامات بھیجتے ہو حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو اعلانیہ کرتے ہو ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں اور جو کوئی بھی تم میں سے ایسا کرے گا تو یقین جانو کہ وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔" (الممتحنہ ۶۰ : ۱)

اللہ اور اس کی ممانعت کو قبول نہ کرنے والوں کا حال

۲۷ اور یاد رکھو کہ جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں کسی شمار میں نہیں یعنی دشمنان خدا کے ساتھ دوستی رکھنے والے کی دوستی اللہ کے ساتھ کسی درجہ میں بھی معتبر اور مقبول نہیں۔ کیونکہ اس نے گویا اللہ تعالیٰ کا کہنا نہ مان کر شیطان کی پیروی کی اور شیطان کو دوست بنایا چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق و مددگار بناتا ہے تو یقیناً وہ تباہی میں پڑ گیا ایسی تباہی جو کھلی تباہی ہے۔" (النساء ۴ : ۱۱۹)

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"کیا تم مجھے یعنی اللہ کو چھوڑ کر کہ میں تمہارا پروردگار ہوں اسے یعنی شیطان کو اور اس کی نسل کو اپنا کارساز بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ دیکھو! ظلم کرنے والوں کیلئے کیا ہی بری تبدیلی ہے۔" (الکہف ۱۸ : ۵۰)

ہاں! غیر مسلموں کے شر سے بچنے کیلئے ظاہری میل جول دوسری بات ہے۔

۲۸ مگر ایسی صورت میں کہ تم کو ان سے کچھ ضرر کا اندیشہ ہو تو رفع ضرر کیلئے بقدر ضرورت ظاہری تعلقات میل جول کے ہوں تو یہ دوسری بات ہے یعنی اس میل جول میں مواخذہ نہ ہوگا کیونکہ یہ کوئی جرم نہیں ہے اور نہ ہی اس میل جول کو دوستی کہا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ حسن سلوک کی تین ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ ۱۔ موالات یعنی دوستی اور محبت و یگانگت۔ ۲۔ مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی جس کو ہنس مکھ سے تعبیر کرتے ہیں اور خاطرداری کہتے ہیں۔ ۳۔ مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی۔

صورت اول جس کو موالات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے معاندین اسلام کے ساتھ کسی حال میں جائز اور درست نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اس سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہئے۔

صورت دوم جس کو "مدارات" کے نام سے یاد کیا گیا ہے یہ تین حالتوں میں درست ہے۔ اول نفع ضرر کیلئے۔ دوم خود اس کافر و غیر مسلم کی مصلحت دینی ہو یعنی یہ توقع ہو کہ شاید وہ میرے حسن سلوک سے ہدایت پا جائے یا کم از کم دین اسلام کو اچھی نظروں سے دیکھے۔ تیسرے اکرام ضیف کے طور پر یعنی کافر ہے لیکن وہ

ثُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ اِنْ

تمہیں اپنے قانون مواخذہ سے ڈرا رہا ہے اور آخر کار تم سب کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔ ۲۸

مہمان بھی ہے گویا یہ رواداری ہے کہ وہ کافر ہو کر مسلمان کا مہمان ہو سکتا ہے تو مسلمان کو بھی مسلمان ہو کر کافر کی میزبانی کرنا جائز و درست ہے اس میں امان بھی داخل ہے۔

صورت سوم جس کو "مواسات" کہا گیا ہے یعنی احسان کرنا اور اس کو نفع پہنچانا حربی کافروں کو جائز نہیں اور غیر حربی کے ساتھ جائز ہے۔ یعنی جب کسی غیر مسلم ملک سے جنگ جاری ہو تو اس کو نفع پہنچانا اور اس پر احسان کرنا درست نہیں۔ ہاں! اگر حالت امن ہو اور کسی طرح کا جنگ و جدال جاری نہ ہو تو ایسی صورت میں انسانی ہمدردی سے روکا نہیں جا سکتا کیونکہ غیر مسلم بے شک غیر مسلم ہے لیکن بہرحال انسان تو ہے لہٰذا انسانی حقوق بحال رکھنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔

ہاں! یہ بات ہر حال میں یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے ذاتی فائدہ اور حصول مال و جاہ پر قومی فائدہ اور قومی عزت و جاہ کو ہمیشہ اوّلیت دینی چاہئے کیونکہ قومی نفع کے سامنے کسی کے ذاتی نفع کی کوئی حیثیت نہیں اور اس طرح قومی نقصان کے سامنے ذاتی نقصان کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گویا کسی انسان کا ذاتی فائدہ ہو رہا ہو لیکن اس کے ساتھ قومی نقصان بھی تو اس ذاتی فائدہ کو ہرگز حاصل نہ کرنا چاہئے جس سے قومی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔

انجام کار انسان کو اپنے کئے کا جواب دہ ہونا ہے وہ بھی علیم و خبیر کے سامنے

۲۸ یہ بات ہر وقت اور ہر آن یاد رہنی چاہئے کہ اس دنیا کی زندگی بالکل عارضی ہے اور ہر ایک انسان کو اپنے کئے ہوئے کاموں کا اپنے مالک حقیقی کے سامنے جوابدہ ہونا ہے لہٰذا اس کے احکام کی ظاہری اور باطنی ہر مخالفت سے باز رہنا چاہئے۔ اللہ ہی وہ ذات ہے جو بذات الصدور ہے اور وہ سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (النحل ۱۶ : ۱۰۶) "جو کوئی ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے منکر ہوا اور اس کا دل اس انکار پر رضامند ہو گیا پھر ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے۔" مگر ہاں! جو کوئی کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل اندر سے ایمان پر مطمئن ہو تو ایسے لوگ مواخذہ سے بری ہوں گے اگرچہ یہ بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔

تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی

اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہہ دو[۷۵] تمہارے دلوں کے اندر جو کچھ ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو' ہر حال میں اللہ اسے خوب جانتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آسمان و

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ یعنی مقابلہ سے بھاگ نہ جاؤ بلکہ سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھائے گا تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا اور جس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا تو اس کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے مگر ہاں! جو کوئی لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے یا اپنے گروہ سے کسی کے پاس جگہ لینی چاہے یعنی جماعت سے الگ ہو گیا ہو تو جماعت سے مل کر لڑنا چاہے تو اس میں مضائقہ نہیں۔" (الانفال ۸ : ۱۵' ۱۶)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

اور اپنی لونڈیوں کو کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہیں محض دنیا کے فائدے کیلئے حرام کاری پر مجبور نہ کرو جو انہیں مجبور کرے گا وہ اپنے آپ کو حالت بے بسی میں پائیں گی تو ایسی حالت میں جو گناہ ہے وہ سارے کا سارا مجبور کرنے والوں پر ہے اور لونڈیاں رحمت سے مایوس نہ ہو جائیں اللہ بخشنے والا اور نہایت ہی پیار کرنے والا ہے۔ (النور ۲۴ : ۳۳)

اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس کیلئے چھپا اور ظاہر برابر ہے

۷۵ گزشتہ آیت میں معاندین ومخالفین اسلام کا ذکر تھا اور اہل اسلام کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ انہیں اپنا ولی و دوست نہ بنائیں اس آیت میں مخالفین اسلام کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنی خفیہ تدابیر کو جو اسلام کی بیخ کنی کیلئے کر رہے ہو اپنے دلوں کے اندر مخفی رکھو اور خواہ ان کو ظاہر کرو یعنی خواہ پوشیدہ طور پر دشمنی کرو یا ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو سب علم ہے کیونکہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ یاد رکھو کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف تمہاری کسی تدبیر کو بھی کارگر نہ ہونے دے گا بلکہ یقیناً وہ اس کی سزا بھی تمہیں دے گا۔ یہ گویا اعلان ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اعلان کرایا جا رہا ہے خود پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان اقدس سے تاکہ معاندین و مخالفین مزید چوکنے ہو کر جو کچھ کرنا چاہتے ہیں یا وہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں پورا زور لگا کر کر لیں تاکہ ان کو کوئی پچھتاوا باقی نہ رہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ سو فیصدی پورا ہوا۔

اس سے مخالفین کو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن نصیحت پکڑنے کے سو

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ یَوْمَ تَجِدُ
كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ

زمین میں جو کچھ ہے سب اس پر روشن ہے اس کی قدرت علم کے اندازہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ ۲۹
اس آنے والے دن کو یاد کرو جس دن ہر انسان دیکھے گا کہ جو کچھ اس نے دار العمل میں نیک عملی کی تھی اس کے سامنے موجود ہے اور جو کچھ برائی کی تھی وہ بھی اس کے

دلائل موجود ہوں نصیحت تو پھر بھی وہی پکڑیں گے جو نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہ دار العمل ہے اور اس کیلئے انسانی سعی و کوشش لازم کی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اس وقت مخالفین تقریباً علی الاعلان ہی دشمن تھے سوائے منافقین کے جو پردہ میں رہ کر مخالفت کر رہے تھے اس لئے مخفی دشمنی میں ان کی طرف ہی اشارہ ہے جو آج بھی مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں مگر درحقیقت وہ ہر وقت ایسی تدابیر کے سوچنے میں مصروف ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کی بے چینی بڑھے اور ان کی بیخ کنی ہو۔ کاش کہ آج بھی مسلمان اس کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مخفی تدبیروں کا وہی حشر کرے گا جو اس وقت ان کی کھلی تدابیر کا کیا تھا۔

عمل نیک ہو یا بد اس کا نتیجہ عمل کرنے والے کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا

۷۶ گویا یہ وعدہ خداوندی ہے جو قرآن کریم کے صفحات میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ اعمال اور ان کے نتائج لازم و ملزوم ہیں اگر عمل ہے تو نتیجہ ہے اور پھر اس کی وضاحت بھی فرما دی کہ یاد رکھو کہ نتیجہ عمل کے مطابق ہوگا۔ اگر عمل درست ہے تو نتیجہ خراب نہیں ہو سکتا اور اگر عمل خراب ہے تو نتیجہ درست ممکن ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب دنیا میں ان کو کہا جاتا تھا کہ :

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ○ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ○ (الذاریات ۵۱ : ۵، ۶) "کہ جس چیز کا تمہیں وعدہ دیا جا رہا ہے یا جس چیز سے تمہیں خوف دلایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے۔" تُوْعَدُوْنَ اگر "عد" سے ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے" اور "وعید" سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ "جس چیز سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے" زبان و ادب کے لحاظ سے دونوں ہی مطلب صحیح ہیں لیکن موقع و محل کے ساتھ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ مخاطب وہی لوگ ہیں جو کفر و شرک اور

فسق و فجور میں غرق تھے اور یہ بات ماننے کیلئے تیار نہ تھے کہ کبھی ان کو محاسبے اور جزائے اعمال سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے ہم نے "تُوْعَدُوْنَ" کو وعدے کے بجائے "وعید" کے معنی میں لینا زیادہ صحیح تصوّر کیا ہے۔ اور "جزائے اعمال ضرور پیش آنے والی ہے۔" یہ بات گویا حتماً" بیان کی جا رہی ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جس طرح دنیا کا نظام باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور جو حکمتیں اور مصلحتیں اس میں صریح طور پر کار فرما نظر آتی ہیں وہ اس بات پر گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کوئی بے مقصد اور بے معنی کھیل نہیں ہے جس میں لاکھوں' کروڑوں برس سے ایک بہت بڑا کھیل بس یونہی الل ٹپ ہوئے جا رہا ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں بلکہ درحقیقت یہ ایک کمال درجے کا حکیمانہ نظام ہے جس میں ہر کام کسی مقصد اور کسی مصلحت کیلئے ہو رہا ہے۔

اس نظام میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ یہاں انسان جیسی ایک مخلوق کو عقل و شعور اور تصرف کے اختیارات دے کر اس میں نیکی و بدی کی اخلاقی حس پیدا کر کے اور اسے ہر طرح کے اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے مواقع دے کر زمین میں ترکتا زیاں کرنے کیلئے محض فضول اور لایعنی طریقے سے چھوڑ دیا جائے اور اس سے کبھی یہ باز پرس نہ ہو کہ دل و دماغ اور جسم کی جو قوتیں اس کو دی گئی تھیں دنیا میں کام کرنے کیلئے جو وسیع ذرائع اس کے حوالے کئے گئے تھے خدا کی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات اسے دیئے گئے تھے ان کو اس نے کس طرح استعمال کیا۔ جس نظام کائنات میں سب کچھ بامقصد ہے اس میں صرف انسان جیسی مخلوق کی تخلیق کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے؟ جس نظام میں ہر چیز مبنی بر حکمت ہے اس میں تنہا ایک انسان ہی کی تخلیق کیسے فضول اور عبث ہو سکتی ہے؟

مخلوقات کی جو اقسام عقل و شعور نہیں رکھتیں ان کی تخلیق کی مصلحت تو اسی عالم طبعی میں پوری ہو جاتی ہے اس لئے اگر وہ اپنی مدت عمر ختم ہونے کے بعد ضائع کر دی جائیں تو یہ عین معقول بات ہے کیونکہ انہیں کوئی اختیارات دیئے ہی نہیں گئے ہیں کہ ان سے محاسبے کا کوئی سوال پیدا ہو مگر عقل و شعور اور اختیارات رکھنے والی مخلوق جس کے افعال محض عام طبیعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ اخلاقی نوعیت بھی رکھتے ہیں اور جس کے اخلاقی نتائج پیدا کرنے والے اعمال کا سلسلہ محض زندگی کی آخری ساعت تک ہی نہیں چلتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اس پر اخلاقی نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اسے صرف اس کا طبعی کام ختم ہو جانے کے بعد نباتات و حیوانات کی طرح کیسے ضائع کیا جا سکتا ہے؟ اس نے تو اپنے اختیار و ارادہ سے جو نیکی یا بدی بھی کی ہے اس کی ٹھیک ٹھیک مبنی بر حق و انصاف جزاء و سزاء اس کو لازماً ملنی ہی چاہئے کیونکہ یہ اس مقصد کا بنیادی تقاضا ہے جس کے تحت دوسری مخلوقات کے برعکس اس کو ایک ذی اختیار مخلوق بنایا گیا ہے اس سے محاسبہ نہ ہو اس کے اخلاقی اعمال پر جزاء و سزا نہ ہو اس کو بھی بے اختیار مخلوقات کی طرح عمر طبعی ختم ہونے پر ضائع کر دیا جائے تو لامحالہ اس کی تخلیق سراسر عبث ہوگی اور ایک حکیم پھر ہو بھی حکیم کل جو عالم الغیب بھی ہے سے فعل

تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ
ع ۳ ۱۰ ۱۱
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۳۰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

سامنے ہے اس دن وہ آرزو کرے گا کہ اے کاش! اس دن[۷۷] میں اور اس دن میں ایک بڑی مدت حائل ہو جاتی اور دیکھو اللہ تمہیں اپنے قانون مواخذہ سے ڈراتا ہے[۷۸] اور یہ اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے لئے بڑی ہی مہربانی رکھنے والا ہے۔ ۳۰

اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہہ دو اگر تم واقعی اللہ سے محبت[۷۹] رکھتے ہو تو

عبث کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

وہ وقت آنے والا ہے کہ عامل عمل اور اس کے نتیجہ میں دوری کا طالب ہوگا لیکن یہ ممکن نہیں

۷۷ جرم کرنے والے انسان جب جرم کے نتیجہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو حسرت و افسوس سے کہیں گے کہ کاش آج مجھ میں اور اس میرے عمل میں ایک بہت بڑی دوری کر دی جائے اور میں اس کے نتیجہ کو نہ دیکھوں اور پھر وہ پکار کر کہیں گے کہ اے اللہ! ایک بار ہمیں دارالعمل میں دوبارہ لوٹا دے لیکن ان کی یہ پکار بالکل لاحاصل ہوگی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور ان منکروں کا حال ایسا ہی ہوگا یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سرہانے موت آکھڑی ہوگی تو اس وقت وہ کہنے لگے گا خدایا مجھے پھر دنیوی زندگی میں لوٹا دے کہ زندگی کے جو مواقع میں نے کھو دیئے شاید اس دفعہ ان میں نیک کام کر سکوں۔ حکم ہوگا ہرگز نہیں۔ یہ محض ایک کہنے کی بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے۔ اب ویسا ہی ہونے والا ہے ان لوگوں کے مرے پیچھے ایک آڑ ہے جو اس دن تک رہے گی کہ دوبارہ اٹھائے جائیں۔

پھر جب وہ گھڑی آجائے گا کہ نرسنگا پھونکا جائے یعنی تمام انسانی ہستیوں کو دوبارہ کھڑا ہونے اور اکٹھا ہو جانے کا حکم ہوگا تو اس دن نہ تو ان لوگوں کی باہم رشتہ داریاں باقی رہیں گی نہ کوئی ایک دوسرے کی بات ہی پوچھے گا۔ اس دن جن لوگوں کے نیک عملوں کا پلہ بھاری نکلا بس وہی ہیں جو کامیاب ہوں گے اور جن کا پلہ ہلکا ہوگا تو وہی ہیں جنہوں نے اپنے کو بربادی میں ڈال دیا ہمیشہ جہنم میں رہنے والے۔ آگ کے شعلوں کی لپیٹ ان کے چہروں کو جھلستی ہوگی اور وہ اسی میں منہ بگاڑے پڑے ہوں گے۔

کیا ایسا نہیں ہو چکا کہ میری آیتیں تمہارے آگے پڑھی جاتی تھیں اور تم انہیں جھٹلاتے رہتے تھے؟ یعنی ان سے یہ بات کہی جائے گی کہ وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! دراصل ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہمارا

گروہ گمراہوں کا گروہ تھا۔ اب ہمیں اس حالت سے نکال دے اگر ہم پھر ایسی گمراہی میں پڑیں تو بلاشبہ نافرمان ہوئے۔"

اللہ فرمائے گا جہنم میں جاؤ اور زبان مت کھولو۔ ہمارے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا خدایا! ہم ایمان لے آئے پس ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تجھ سے بہتر رحم کرنے والا کوئی نہیں لیکن تم نے انہیں اپنے تمسخر کا مشغلہ بنا لیا تھا یہاں تک کہ اسی مشغلہ نے ہماری یاد بھی بھلا دی تھی۔ تم ان لوگوں کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ آج دیکھو ہم نے انہیں ان کے صبر کا بدلہ دے دیا وہی ہیں جو آج فیروزمند ہوئے۔" (المومنون ۲۳ : ۹۹، ۱۱۱)

اللہ کا اپنے قانون مواخذہ سے ڈرانا محض اپنے بندوں کے پیار سے ہے

۷۸ اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ قابل عظمت اور صاحب اقتدار ذات صرف اسی کی ہے۔ اسی کا قانون بھی اَن ٹل ہے اور اس کو اپنے بندوں سے محبت بھی بے پناہ ہے۔ لہٰذا اس کی رضا تو یہی ٹھہری کہ اس کے قانون مواخذہ سے بچ کر رہو لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نہیں بچتا تو اس کا قانون مواخذہ بھی لچک نہیں رکھتا۔

اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے اس لئے یہ بار بار کی تنبیہہ و تہدید کی جا رہی ہے جو دراصل اسی شفقت و رافت کا نتیجہ ہے کہ کاش بندے اب بھی سنبھلیں اور راہ ہلاکت پر چلنے سے باز رہیں۔

اللہ کی محبت سچے لوگوں کی پہچان قرآن کریم کی زبان میں

۷۹ اہل کتاب کی دونوں جماعتوں یعنی یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں اس لئے سب کچھ معاف ہے کیونکہ ہم انبیاء کرام کی اولاد ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ :

قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ ۵ : ۱۸) "اور دیکھو یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ ہم جو کچھ بھی کریں ہمارے لئے نجات ہی نجات ہے۔"

ان کو ایک جواب تو یہ دیا گیا کہ تمہارے لئے نجات ہی نجات ہے تو دنیوی زندگی میں تم کو عذاب دیا جاتا ہے اور خصوصاً جب تم کو دوسری قومیں دبا لیتی ہیں اور تمہارا تہس و نہس کر دیتی ہیں تو اس وقت کیا تم اللہ کے محبوب نہیں رہتے اور مرنے کے بعد فوراً تم اللہ کو محبوب ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ ۵ : ۱۸) اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اللہ تمہاری بد عملیوں کی وجہ سے تمہیں وقتاً" فوقتاً" عذاب کیوں دیتا رہتا ہے۔" جس کا تمہیں خود بھی اعتراف ہے اور تمہاری کتاب بھی خدا کی سرزنشوں اور عذابوں کی سرگزشتوں سے بھری ہوئی ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیدا کردہ انسانوں میں سے تم بھی انسان ہو اور انسانوں کی بخشش و نجات کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے نہ بخشے کیونکہ اس نے نجات پانے اور عذاب دیئے جانے کیلئے

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾

تمہیں چاہئے کہ میری پیروی کرو۔[۸۰] اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے[۸۱] محبت کرنے لگے گا اور وہ تمہاری خطائیں بخش دے گا وہ بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔[۸۲] ۳۱

قانون بنا دیا ہے۔ پھر اس قانون میں تمہارے لئے یہ گنجائش کہاں سے نکل آئی کہ تم جو کچھ بھی کرو بس نجات یافتہ ہو۔ اگر تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل ہے تو وہ لے کیوں نہیں آتے اس نجات کے پٹے کی تحریر کہاں ہے؟

چنانچہ زیر نظر آیت میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے اور اپنے اسی زعم کی بناء پر جو توقع رکھتے ہو کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا تو اس کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم میری پیروی کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمہاری اپنی کتابوں میں میرے رسول ہونے کی بشارات موجود ہیں اور یہ بھی کہ میری پیروی کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ اس راستے سے اللہ کی محبت کسی کو حاصل ہو یا اللہ کسی کو محبت کرنے لگے اور یہ بات بھی تمہاری اپنی مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔ اگر تم یہ نہیں کرتے یا اس بات کو سچا نہیں سمجھتے تو گویا اپنی ہی الٰہی کتابوں کی تکذیب کرتے ہو؟ تم ہی بتاؤ کہ الٰہی کتابوں کی تکذیب کرنے والے اللہ کی نظر میں محبوب ہو سکتے ہیں؟

کھرے اور کھوٹے کا معیار محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی ہے

۸۰ محمد رسول اللہ ﷺ سے اعلان کرایا جا رہا ہے کہ آپ فرما دیجئے "میری پیروی کرو" کیوں؟ اس لئے کہ دنیا میں اب میں ہی جامع کمالات انسانی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری زندگی ساری کائنات انسانی کیلئے دین کے کاموں میں معیار اور نمونہ کا کام دے گی۔ محبت الٰہی کے دعویٰ کی جانچ کیلئے کیا اچھا معیار بتا دیا گیا یعنی اتباع رسول جو شخص جتنا زیادہ متبع رسول ہوگا اسی قدر اس کی محبت الٰہی مسلم و معتبر ہوگی۔ اس معیار پر صرف یہود و نصاریٰ ہی کو نہیں پوری دنیا کے انسانوں کو بشمول مسلمان کہلانے والوں کو پرکھا جائے گا۔ کون اس پر پورا اترتا ہے اور کون نہیں اترتا یہ بات صرف دعویٰ سے ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ اس کیلئے معیار اور کسوٹی رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہے۔ گویا کھرے اور کھوٹے کیلئے اس کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔

اگر خالی دعویٰ کی بات ہو تو وہ تو یہود و نصاریٰ کو بھی ہے۔ لیکن اگر اس معیار پر آج بڑے بڑے مدعیان میبشیت اور مدعیان محبت الٰہی اور عشاقان رسول کے ناموں سے یاد کئے جانے والوں کو جانچئے تو بہتوں کی کلی کھل جائے گی اور سارے دعویٰ دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ ان خالی برتنوں کی طرح بولنے والوں کو اپنا اندازہ خود لگا لینا ہی بہتر ہے تاکہ وہاں رسوائی نہ ہو جہاں ساری پوشیدہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے اللہ کی محبت حاصل ہوگی

۸۱ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا کیونکہ اس کے آگے اور کوئی درجہ کمال نہیں۔ یہ طریقہ جو پچھلوں کو بتایا گیا یعنی یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہی سے اللہ کی محبت حاصل ہوگی یہی آواز اگلوں کے کان میں ڈال دی گئی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے جو الفاظ اناجیل مروجہ میں نقل ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں باپ سے درخواست کروں گا وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔" (یوحنا ۱۴ : ۱۵، ۱۶)

یہ مددگار کا لفظ اردو انجیلوں کے متن میں ہے اور حاشیہ پر وکیل اور شافع دونوں لفظ درج ہیں گویا اصل لفظ یونانی کے یہ سب معنی ہو سکتے ہیں اور انگریزی انجیل میں لفظ "کمفارٹر" (Comforter) آیا ہے جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں تو چوتھا مفہوم اس لفظ کا یہ ہوا۔ بہرحال وہ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سب کا مددگار یعنی دین الٰہی کی طرف دعوت دینے والا اور وکیل اور شافع اور تسلی دہندہ اس پیشین گوئی کرنے والے رسول یعنی مسیح علیہ السلام کے پانچ صدی بعد آیا اور ایک ابدی اور غیر منسوخ شریعت لے کر ابد تک من حیث النبوۃ ساتھ رہنے ہی کیلئے آیا۔ گویا جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے رسالت محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی ہے اور آپ ﷺ ہی کی رہے گی اس لئے آپ ﷺ نبی اعظم و آخر قرار پائے۔ وہ نبی آخر الزمان تشریف لائے پر صلیب کے پرستاروں اور مسیح کو اللہ، اللہ کا بیٹا یا اللہ کا تیسرا جزء قرار دینے والوں نے اللہ کو چھوڑ کر مسیح کی عبادت شروع کر دی اور اس آخر الزمان نبی ﷺ کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ خود جھوٹے قرار پائے۔

"یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" اللہ کی محبت بندہ کے ساتھ کیا ہے؟ یہی ہے کہ اسے یعنی اپنے بندہ کے گناہ معاف فرما دے اور اسے مغفرت سے سرفراز فرما دے اور یہی بات اللہ نے ارشاد فرمائی۔

اللہ کی بخشش اور اللہ کا پیار کرنا یہی ہے کہ وہ بندہ کے گناہ معاف فرما دے

۸۲ اللہ "الغفور" بھی ہے اور "الغفار" بھی غفور بمعنی غفار ہی ہے لیکن غفور میں ایک طرح کا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ غفار میں بلحاظ مغفرت کے مبالغہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار مغفرت فرماتا ہے اور غفور سے مراد نام الغفران ہے کہ انتہائی سے انتہائی مغفرت کا درجہ عطا فرماتا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ اللہ کے بندوں سے ان کی بے اعتدالیوں پر عفو و درگزر کرے اور ان کے قصور معاف کر دیا کرے۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا کہ جب وہ اللہ سے مغفرت طلب کرے گا تو اس کو فوراً معاف کر دیا جائے گا کیونکہ اس نے اس کے بندوں سے بھی درگزر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اعلان کر دو کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تو سب کے گناہ بخش دیتا ہے کہ اس کی بخشش قانون عام ہے کیونکہ وہ واقعی بڑا بخشنے والا بہت ہی پیار کرنے والا ہے۔" (الزمر ۳۹ : ۵۳)

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ۵۸۳ کرو پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں ۵۸۴ رکھتا۔ ۳۲

پھر وہ اللہ تعالیٰ "الرحیم" بھی ہے نہایت ہی رحم کرنے والا یعنی پیار کرنے والا۔ رحمت سے مراد یہ ہے کہ محتاجوں سے بھلائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کون ہے وہ جو محتاج نہیں۔ ساری مخلوق اللہ کے سامنے محتاج ہے اور محتاجوں سے بھلائی اس کا اپنا حکم ہے اور یہ بھی کہ اللہ کی رحمت دنیا اور آخرت کی نعمتوں پر شامل ہے اور یہ محض اس کی عنایت ہے جس میں کوئی غرض اور کسی معاوضہ کا خیال نہیں ہے۔

جب انسان کو معلوم ہوگیا کہ ساری نعمتوں کا منعم حقیقی فقط وہی ہے تو اس کا فرض ہے کہ اسی پر توکل کرے کسی دوسرے سے مدد نہ مانگے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر رحم کھائے جہاں تک ہو سکے محتاجوں کی حاجت روائی کرے اور اس خدمت میں سوائے نیکی کے ارادے کے کسی معاوضہ کا خیال نہ کرے۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "مسلمان تو آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔" (الفتح ۴۸ : ۲۹)

"مانگنے اور نہ مانگنے والے حاجت مندوں کیلئے اپنے مال میں سے حصہ بطور ان کے حق کے نکالتے ہیں۔" (ق ۵۰ : ۱۲)

"اللہ تعالیٰ کی محبت سے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو محض رضائے الٰہی کیلئے کھانا پیش کرتے ہیں اور ان کی طرف سے کسی قسم کا بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے۔" (الدھر ۷۶ : ۸، ۹)

زیر نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ دونوں صفات یکجا کر دیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے والے اچھی طرح جان لیں کہ اللہ یقیناً ان کی تقصیروں کو نظر انداز کر دے گا اور ان کے مراتب قرب میں ذرا بھی کمی نہیں فرمائے گا۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کی اہمیت

۵۸۳ رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے عامۃ الناس کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو کیونکہ اللہ ہی کی اطاعت اصالۃً اور بطور مقصود ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو جو تبعاً و نیابتہً بطور آلہ و واسطہ کے ہے۔ یعنی اس حیثیت سے کہ پیغمبر ﷺ اللہ ہی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کی شخصیت کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اللہ نے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو "مقرون" کر دیا ہے یعنی خدا کی

اطاعت اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اہمیت کو بڑھانے کی غرض سے ہے۔ کیا اس اہمیت پر زور دینے کا مقصد صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھ دیا کریں تو تم ان کی اطاعت کر لیا کرو؟ کیوں کہ اس کیلئے تو صرف "اطیعوا اللہ" ہی کافی تھا اور اس کے ساتھ " اطیعوا الرسول" کے الفاظ کو بڑھا دینا لاحاصل تکرار ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے " اطیعوا اللہ اطیعوا الرسول " کے الفاظ قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی اطاعت کرنا ہی اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی۔" اللہ کی اطاعت تب ہی ممکن ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جائے۔ اس کو سمجھنے کیلئے ایک مثال پر غور کرو بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔

نبی اعظم و آخر ﷺ حدیبیہ کے مقام پر مومنین کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ ہم کو مر مٹنے کیلئے آمادہ ہو جانا چاہئے یعنی ہم سب کو یہاں مرنا چاہئے یا کامیاب ہو کر واپس لوٹنا چاہئے۔ اس غرض کیلئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت علی الموت کی جس سے آپ ﷺ کا دل باغ باغ ہوگیا اور صحابہؓ کی اس اطاعت رسول ﷺ اور اس بیعت الی الموت پر اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوا اور فرمایا :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح ۴۸ : ۱۸) "بلاشبہ اللہ ان مومنوں سے راضی ہوگیا جو درخت کے نیچے آپ ﷺ سے بیعت کر رہے تھے۔"

اللہ رب العزت ان مومنین کو اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے بیعت علی الموت کی۔ اللہ نے رسول کی اس اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا اور اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ بس یہی معنی ہیں " اطیعوا الرسول" کے۔

اس جگہ ان لوگوں کو مزید غور کرنا چاہئے جو "حدیث رسول" کو کوئی مقام دینے کیلئے تیار نہیں کہ اگر حدیث رسول خاکم بدہن کوئی چیز نہیں تو پھر قرآن کریم کیا ہے؟ اور یہ کہ اگر کھرا اور کھوٹا مل جائے تو کھرے کو بھی چھوڑ دینا عقل مندی کی دلیل ہے؟ اگر نہیں تو پھر تم بھی علم کی بات کرو جہالت کی کیوں کرتے ہو؟

یاد رکھو کہ اللہ کی اطاعت کرنا اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنا دو علیحدہ علیحدہ احکام الٰہی ہیں اگر ان کو اکٹھا کریں گے تو رسول ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت قرار دی جا سکتی ہے کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں جب تک رسول کی اطاعت کا پٹا گلے میں نہ لٹکایا جائے۔ اس اجلال کی مزید تائید ذیل کے حکم سے ہوتی ہے فرمایا :

"وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ" نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کو مدنظر رکھنا بھی ازبس ضروری ہے یہ نص صریح ہے جس کا رد کرنا قرآن کریم کے رد کرنے اور قرآن کریم جیسی کتاب نازل کرنے والے کے رد کر دینے کے مترادف ہے۔

اس نص صریح کے خلاف یہ عقیدہ رکھنا کہ رسول کریم نعوذ باللہ محض ایک ڈاکیہ کی حیثیت رکھتے ہیں مستلزم کفر ہوگا۔ جب ڈاکیہ یا اردلی کوئی مراسلہ یا کوئی حکم لے کر آتا ہے تو اس ڈاکیہ یا اردلی کا اکرام ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ وہ مراسلہ جو پہنچایا جاتا ہے قابل احترام اور قابل توجہ ہوتا ہے اور اگر ڈاکیہ یا اردلی کا کوئی اکرام کیا بھی جائے تو وہ اس پیغام یا پروانہ سے کیا جائے گا۔ ہاں! اگر اس طرح کا کوئی نام رکھنا ہی ہے تو آپ سفیر کہہ سکتے ہیں ڈاکیہ یا اردلی نہیں۔ آج کون ہے جو سفیر کے مفہوم اور سفارت کے عہدہ کو نہ جانتا ہو؟

اطاعت رسول اللہ ﷺ کی مزید وضاحت

۸۴ اس ہدایت کے باوجود اگر وہ روگرداں رہیں تو اللہ کافروں سے ذرا محبت نہیں رکھتا اور یہ لوگ کافر ہی تو ہیں جو اطاعت رسول ﷺ سے منہ موڑے ہوئے ہیں خواہ محبت الٰہی کے وعدے کیسے ہی ان کی زبانوں پر ہوں۔ اس کی مزید وضاحت خود قرآن کریم نے ایک تیسری اطاعت کا حکم دے کر فرما دی جیسا کہ ارشاد فرمایا :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (النساء ۴ : ۵۹)

"مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو' اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں حکم اور اختیار رکھتے ہوں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں اس تیسری اطاعت میں باہم جھگڑا پڑ جائے یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے تو چاہئے کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اسے تسلیم کر لو۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو تمہارے لئے راہ عمل یہی ہے اس میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اس میں انجام کار کی خوبی۔"

جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں' اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں اولی الامر اور دوسرے مسلمانوں میں نزاع پیدا ہو جائے تو چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کریں کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں اختلاف و نزاع ایمان و اسلام سے خارج کر دیتا ہے ان کی اطاعت مستقل اطاعت ہے اور پھر وہاں سے جو فیصلہ ملے اس کے آگے حاکم و محکوم سر تسلیم خم کر دیں۔

اس حکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے تمام مذہبی اختلافات کیلئے قرآن و سنت کی طرف

الْكٰفِرِيْنَ ۝ ۳۲ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ

بلاشبہ یہ واقعہ سچ ہے[۸۵] کہ اللہ نے آدمؑ نوحؑ ابراہیمؑ اور عمرانؑ کے گھرانوں کو تمام

رجوع کرنا چاہئے نہ کہ عام انسانوں کے اقوال و آراء کی طرف خواہ وہ انسان کتنے ہی مکرم و معظم ہوں۔ یہی حیثیت رسول کو دوسرے تمام انسانوں سے خواہ وہ کتنے ہی زیرک اور پاکباز کیوں نہ ہوں الگ کر دیتی ہے اور رسول کا درجہ اتنا بلند و بالا ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ کا کام دیتا ہے اور اسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کاش کہ آج اگر مسلمانوں نے اس حکم قرآنی پر عمل کیا ہوتا تو مذہبی اختلاف و تفرقہ سے محفوظ ہوگئے ہوتے اور ان کی ایک اور صرف ایک ہی جماعت ہوتی بہت سی جماعتوں اور مذہبوں میں متفرق ہو کر شرک کی اس لعنت سے بھی بچ جاتے۔ تفصیل و تشریح اس کی اپنے مقام پر ملے گی اور خصوصاً سورۃ النساء میں۔

زیر نظر آیت یعنی اس سورہ کی آیت ۳۲ جس کی تفسیر کی جا رہی ہے کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝" یعنی اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔" یہ روگردانی کس سے کرنا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے۔ پھر یہ بات پہلے ثابت ہو چکی کہ اللہ کی اطاعت وہی اطاعت ہے جو رسول کی اطاعت ہے۔ بات بالکل صاف ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کرنے والا کافر ہے اگرچہ اس کا نام مسلمانوں والا ہو۔ اگرچہ اس کے مذہب کے خانہ میں اسلام درج ہو۔ اگرچہ وہ زبان سے کلمہ اسلام بھی پڑھتا ہو اور مسلمانوں کے معاشرہ میں مسلمان ہونے سے متعارف بھی ہو اور لوگ اس کو مسلمان ہی سمجھیں لیکن عند اللہ وہ کافر ہی ٹھہرے گا۔

اس پوری آیت کا ماحصل یہ ہے کہ جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے خواہ وہ کوئی ہو اسے چاہئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہدایت خلق کیلئے اپنے رسولوں کو مبعوث کرتا رہا ہے اور جس سلسلہ کے خاتمہ پر اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اب جو ان کی پیروی اور اطاعت کریں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو انکار و سرکشی سے مقابلہ کریں گے وہ اللہ کی نصرت سے محروم رہیں گے اور جو اللہ کی نصرت سے محروم کر دیا گیا وہ مسلمان کیسے ہوا؟

اللہ نے جن لوگوں کو برگزیدگی عطا فرمائی تھی ان کا ذکر

۸۵ سلسلہ انسانی کی اور نبوت کی پہلی کڑی سیدنا آدم علیہ السلام اور سلسلہ نبوت کی آخری کڑی محمد

رسول اللہ ﷺ ہیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام کا مفصل تذکرہ سورہ البقرہ میں گزر چکا وہاں سے ملاحظہ کر لیا جائے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جو "باوا آدم" کے نام سے معروف ہیں۔

سیدنا نوح علیہ السلام بھی ایک عظیم الشان نبی گزرے ہیں اور آدم علیہ السلام کے بعد نبوت سید نوح علیہ السلام ہی کی ذریت کے ساتھ خاص کر دی گئی تھی جن کی پیدائش بائبل کے بیان کے مطابق کوئی تین ہزار سال قبل مسیح بیان کی گئی ہے لیکن نئے مفسرین بائبل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے واقعات کے متعلق کوئی صحیح تاریخی اندازہ موجود نہیں اور قرآن کریم ایسے تاریخی حقائق کے پیچھے بالکل نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک تذکیر و نصیحت کی کتاب ہے اور اس مضمون میں ان بکھیڑوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں! قرآن کریم سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا آدمؑ کے بعد ایک عظیم الشان نبی حضرت نوح ہوئے ہیں جن سے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ یعنی نبوت کا سلسلہ ان کے ساتھ خاص کر دیا اور ان کا تذکرہ انشاء اللہ سورہ ہود میں بتفصیل آئے گا۔

اور پھر نبوت کا یہ سلسلہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تک نوحؑ کے ساتھ خاص تھا اور بعد ازیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب نبوت عطا ہوئی تو یہ سلسلہ انہی کے ساتھ خاص کر دیا گیا جو موسیٰ علیہ السلام تک بدستور جاری رہا اور موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت عطا ہوئی تو یہ سلسلہ انہی کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔

"عمران" یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے والد گرامی کا نام عمران بن یصہر تھا۔ اس لئے جو سلسلہ نبوت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ چلا تھا وہ آل عمران کے اندر داخل ہے گویا عمران سلسلہ موسویہ کے قائم مقام ہیں۔ مفسرین نے بھی اس جگہ انہی عمران کو مراد لیا ہے جو سیدنا موسیٰ اور ہارونؑ کے والد ماجد تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سیدہ مریمؑ کے والد ماجد کا نام عمران بن ماتان ہے اگرچہ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں تاہم سیدہ مریمؑ مسیح علیہ السلام جو مریم کے بیٹے تھے آل عمران ہی میں شامل ہیں خواہ مریم کے والد ماجد ہونے کی حیثیت سے یا موسیٰ علیہ السلام کی ذریت میں داخل ہونے کی وجہ سے اور تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

آدم علیہ السلام سے شروع کرنے میں اور پھر بعد کے قومی نبیوں کا ذکر کرنے میں ایک یہ اشارہ بھی ہے کہ جس طرح آدم اول کا پیغام بتقاضائے ضرورت تمام انبیاء کرام سے ایک الگ نوعیت کا تھا اسی طرح نبی اعظم و آخر محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام بھی بتقاضائے ضرورت تمام انبیاء کرام سے الگ نوعیت کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح آدمؑ کا پیغام اس کی ساری ذریت جو اس وقت موجود تھی کی طرف تھا گو وہ محدود تھا کیونکہ وہ موجودہ نسل انسانی کی ابتداء تھی اور حضرت آدمؑ اپنی ہی ذریت کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس طرح نبی اعظم و آخر ﷺ کا پیغام بھی ساری نسل آدم یعنی نسل انسانی کی طرف ہوا گو وہ اس وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہو گیا کیونکہ آپ ﷺ کے وقت نسل انسانی تمام روئے زمین پر پھیل چکی تھی۔ آدم علیہ السلام اور نبی اعظم و

عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ

دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی تھی۔ ۳۳

یہ ایک ہی ۸۶ نسل تھی جس میں سے بعض بعض سے پیدا ہوئے تھے اور اللہ سننے

آخر ﷺ کا پیغام تمام نسل انسانی کی طرف تھا اور درمیان میں جس قدر نبی ہوئے ان کا پیغام ایک ایک قوم کی طرف تھا۔

برگزیدگی جس کا ذکر انبیاء کرام کے ذکر کے ساتھ کیا گیا جس کو اصطفی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کے معنی اکثر چن لینا اور پسند کرنا کے لئے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان انبیائے کرام کو اپنے اپنے زمانے کے لوگوں یا قوموں میں سے چن لیا گیا یعنی انتخاب کر لیا گیا۔ کل دنیا لازمی طور پر مراد نہیں کیونکہ کل دنیا پر اصطفاء کیلئے ضروری تھا کہ ایک اور صرف ایک کا ذکر کیا جاتا۔ زیادہ کا ذکر خود دلیل ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر ہی اصطفا مراد ہوگا اور پھر کل انبیاء کرام میں سے انتخاب شدہ یعنی نبی اعظم و آخر محمد ﷺ ہی ہیں۔

یہ سب انبیاء کرام ایک نسل اور اصل سے تعلق رکھتے تھے

۸۶ مذکورہ بالا انبیاء کرام اور اللہ کے برگزیدہ بندے ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ ذریۃ اس لفظ کا وزن "فعلة" اور "فعولة" ہے صورت اول میں اس کا مادہ وہ "ذر" چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کو کہتے ہیں اور دوسری صورت میں ذرء مادہ ہوگا اور ذرء کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔

ذریت کا اطلاق اولاد پر بھی ہوتا ہے اور باپ دادا پر بھی۔ اولاد پر تو عام اور عام بول چال میں بھی لوگ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کی ذریت یعنی اولاد سے ہے اور دوسری صورت کیلئے بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (یاسین ۳۶ : ۴۱) اولاد ذریت اس لئے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو باپ سے پیدا کرتا ہے اور آباء کو ذریت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اولاد کا مبداء تخلیق ہوتے ہیں اور آدم علیہ السلام پر اگر ذریت کا لفظ اطلاق کرے گا تو اس صورت میں کرے گا کہ وہ مبداء تخلیق ہیں۔ ذریت کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔ "بَعْضًا مِّنْۢ بَعْضٍ" بعض بعض کی ذریت سے ہیں مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا جیسے آل عمران ابراہیم کی نسل ہے اور آل ابراہیم آل نوحؑ کی نسل سے ہے اور آل نوح سیدنا آدم علیہ السلام کی نسل سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اشارہ اتحاد نسل کی طرف نہیں بلکہ ایک اور قسم کی یگانگت کی طرف ہے جو دین سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ یہ تفسیر قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ

والا اور صحیح علم رکھنے والا ہے۔ ۳۴

اور اس واقعہ کا ذکر کرو جب عمران ۸۷ کی بیوی نے دعا مانگی تھی کہ "اے اللہ! میرے

اللہ تعالیٰ کی خاص صفت "سَمِيعٌ عَلِيمٌ" کے یہاں لانے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ "سننے والا ہے تمام زبان سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات کا" اور "جاننے والا ہے تمام اندر کے جذبات و خیالات کا" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور پھر جانتا ہے کہ کون شخص کس بلند مقام پر کھڑا کئے جانے کے لائق ہے اور دونوں ہی باتیں صحیح اور درست ہیں۔

عمران کی بیوی سیدہ حنہ کی دعا بارگاہ قاضی الحاجات

۸۷ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عمران موسیٰ و ہارون کے والد ماجد کا نام بھی ہے اور اسی عمران سے کچھ مفسرین نے اسی عمران کو مراد لیا ہے اور انہوں نے " امرۃ عمران" کا ترجمہ کیا ہے کہ عمران کے گھرانے کی ایک عورت یعنی حنہ اور بعض بلکہ زیادہ مفسرین نے عمران مریمؑ کے والد ماجد کا نام بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ عمران بن ماثان کا ذکر ہے اور ہم نے بھی یہی مراد لی ہے جو عمران والد مریمؑ ہیں۔ چونکہ مسیحی نوشتوں میں ان کا نام حنہ (Hannae) آیا ہے بعض مفسرین نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ شام وغیرہ میں کلیسا کلیسائے حنہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا مقبرہ دمشق میں ہے۔

قرآن کریم کا یہ خاص اعجاز ہے کہ وہ کسی واقعہ کو بیان کرتے وقت ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے کہ چند ہی لفظوں میں سارا واقعہ بھی نظروں میں گھوم جائے اور پڑھنے اور دیکھنے والوں کیلئے وہ نصیحت کا کام بھی دے۔ اب غور کرو کہ " امراۃ عمران" کہہ کر پھر اسی دعا کا مختصر الفاظ میں ذکر کر کے کیا کچھ ہے جو سمجھا نہیں دیا؟ "عمران کی بیوی" کے الفاظ نے پورا نقشہ سامنے کھینچ دیا کہ عمران کیا برگزیدہ انسان تھے کہ ماشاء اللہ ان کی بیوی تھیں۔ عورت حاملہ ہوتی ہے تو اس کو جس اولاد کا تصور ہوتا ہے اس اولاد کیلئے اپنے تصور ہی تصور میں وہ کیا کیا سوچتی ہے۔ اس کے پیدا ہونے پر اپنی خوشیوں کے متعلق اور ان تقریبات کے متعلق اس کے چھوٹے ہونے کے تصور میں اس کے کپڑوں، خوراک اور تعلیم و تربیت کے متعلق اور پھر جوان ہو کر اس کی شادی اور عہدوں کے متعلق اگرچہ یہ سب کچھ تصور ہی تصور اور خیال ہی خیال میں ہوتا ہے لیکن ہوتا کیا کیا اور کیسا کیسا ہے؟

ادھر اس کی ماں کو دیکھو کہ وہ نہ معلوم کتنی مدتوں کے بعد حاملہ ہوئی ہے لیکن اس کا تصور کیا ہے؟ کہ "اے اللہ! میرے پیٹ یعنی رحم میں جو بچہ ہے اس کو ترے گھر کی خدمت کیلئے مخصوص کرتی ہوں۔" کیا اب

مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۵

پیٹ یعنی رحم میں جو بچہ ہے میں اسے دنیا کے دھندوں اور اپنی خدمت سے آزاد کر کے تیرے لئے نذر کرتی ہوں[۸۸] یعنی تیرے مقدس ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرتی ہوں سو میری طرف سے یہ نیاز قبول فرما لے بلاشبہ تو دعائیں سننے والا اور نیتوں کے حال جاننے والا ہے۔" ۳۵

عورتیں حاملہ ہوتی ہیں یا نہیں کہیں یہ تصور موجود ہے؟ کیا اس تصور کو اچھا تصور خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کا بچہ اپنی معصومیت کے دور میں مسجد میں آنا شروع کر دے تو کتنے گھروں میں اس کو فال بد سمجھا جاتا ہے کہ بچے کو کیا ہو گیا۔

کتنے پیارے انداز کے ساتھ یہ بات سمجھا دی کہ حنہ حاملہ ہو چکی تھیں کہ انہوں نے یہ دعا مانگی۔ کتنا فرق ہے اس کلام میں کہ ایک عورت بانجھ ہے اس کو کوئی امید نہیں کہ اسے اولاد ہو گی لیکن پھر بھی وہ منتیں مانتی ہے کہ اگر میرے اولاد ہو جائے تو میں یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔ اگرچہ جو کچھ وہ کہے گی وہ بھی شرک ہی ہو گا الا ماشاء اللہ۔ مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ عرف عام میں نذر کہتے ہی اس کو ہیں کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو یہ کروں گی اور ایسا کروں گی۔ یہ نذر اس طرح کی مشروط نذر نہیں۔ یہاں اللہ اور اس کے گھر کی محبت کا تقاضا ہے۔ حنہ حاملہ ہو جاتی ہیں کتنی مدت کے بعد؟ کتنی دعاؤں اور آرزوؤں کے بعد لیکن جب حاملہ ہو چکتی ہیں تو کتنے نیک ارادہ کا اظہار کرتی ہیں وہ بھی اپنے مالک حقیقی کے سامنے تخلیہ کے اندر کس محبت اور کس پیار کے ساتھ۔

اپنی اولادوں کو دنیا کے دھندوں میں لگانے والوں اور دنیاوی خواہشات کی وا.ستگیاں کرنے والے لوگوں کی کوئی کمی نہیں لیکن اس اللہ کی نیک بندی کے دل میں جو پوشیدہ راز تھا اپنی اس اولاد کے متعلق جس کے متعلق ابھی وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ بچی ہے یا بچہ اس نے اپنے مالک پروردگار کے سامنے اپنے پوشیدہ راز کو کھول دیا۔ اگرچہ وہ چھپے رازوں کو بھی جاننے والا ہے لیکن انسان کے ارادے کا انسان کو تو اس وقت ہی پتہ چلتا ہے جب وہ اس کو اپنی زبان کی نوک پر لے آتا ہے۔ سیدہ حنہ کی نطق جو گویا ہوئی تو اس کے پوشیدہ راز سے ساری دنیا واقف ہو گئی کہ ایک اللہ کی بندی اپنے بطن کے بچہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر رہی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ اللہ میری اس دعا کو قبول فرما لے۔

عمران کی بی بی نے نذر ماننے والوں کیلئے ایک مثال قائم کر دی

۸۸ انسان کو چاہئے کہ وہ نذر جب بھی مانے تو صرف اور صرف بارگاہ ایزدی یعنی رب ذوالجلال

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

پھر جب ایسا ہوا کہ لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی[۸۹] تو بولی: اے اللہ! میرے تو لڑکی پیدا ہوئی ہے اب میں کیا کروں؟ حالانکہ جو وجود پیدا ہوا تھا اللہ اسے بہتر جاننے والا تھا

والاکرام کیلئے مانے۔ غیر کیلئے ہرگز ہرگز نہ مانے پھر مشروط طور پر نہ مانے بلکہ اس انداز سے مانے کہ گویا وہ دعا کر رہا ہے شرط نہیں لگا رہا۔ اللہ سے طلب کرنے اور مانگنے کی ہر وقت ضرورت محسوس کرے اور پھر طلب کرنے کا ڈھنگ بھی سیکھے۔ جیسے سیدہ حنہ نے کہا کہ "اے اللہ میں اس کو جو کچھ میرے بطن میں ہے تیرے نام پر آزاد کرتی ہوں۔" یعنی اس کو تیرے گھر کی خدمت کیلئے مختص کرتی ہوں میں اپنی دنیوی خواہشات کو اس سے پورا نہیں کرنا چاہتی بلکہ تیری عطا کردہ چیز کو تیرے ہی نام پر چھوڑنے کیلئے تیار ہوں۔ ہاں! فطرت انسانی کے مطابق ان کے دل میں بے شک یہ خواہش ہوگی کہ یہ میری نرینہ اولاد ہوگی جو ہیکل کی خدمت میں سرگرم عمل رہے گی۔ "فَتَقَبَّلْ مِنِّي" میرے اللہ! "میری طرف سے یہ نیاز قبول فرما لے۔" مسلمانوں کیلئے اس جملہ میں ایک خاص لمحہ فکر ہے۔ کاش کہ کوئی فکر کرنے والا بھی ہو۔

وہ یہ کہ اس بیان میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس گئی گزری حالت میں بھی ان کے اندر ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو محض خدمت دین الٰہی کیلئے اپنی اولاد وقف کر دیتے تھے یہی وجہ تھی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی سینکڑوں سال تک اپنی تاریخ کو زندہ رکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دین قائم ہی نہیں رہ سکتا جب تک اس کے اندر وہ لوگ موجود نہ ہوں جو اپنی زندگیوں کو دین کی خاطر وقف کر دیں۔ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں؟ کاش کہ! مسلمان قوم بھی اس سے سبق حاصل کرے اور خصوصاً وہ لوگ جو دنیوی عزت و جاہ بھی رکھتے ہیں تاکہ اولاد کی صحیح تربیت کر کے دین کی خدمت ان سے لے سکیں افسوس کہ آج اللہ کے دین کو دکانداری بنا دیا گیا پھر جس کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو اور کوئی علم حاصل نہ کر سکا ہو' لولا لنگڑا ہو اس طرح کے سارے لوگ دین کے پیشوا و امام بن گئے۔ انہوں نے اللہ کے دین کو "برباد" کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اللہ کا دین دین نہ رہا بلکہ ہنسی اور مذاق بن گیا۔

آج بدقسمتی سے مساجد کو مساجد نہ رہنے دیا گیا بلکہ کاروباری مرکز بنا دیا گیا ہے جہاں ثواب کے ٹھیکیدار رہ رہے۔ رقمیں وصول کر کے ثواب عطا کرتے ہیں۔ دین کیا ہے؟ موم کی ناک ہے چاہو جدھر موڑ کر لے جاؤ۔ اللہ ان ٹھیکیداروں سے بچائے۔ ہاں! ہاں! قوم مسلم یاد رکھو اگر تم ساری دنیا کے بادشاہ بھی بن جاؤ تو بھی دین اسلام کی شوکت و عظمت دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تم میں وہ لوگ کثرت سے نہ ہوں جو اللہ کے دین کیلئے اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ج وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ
وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا

اور لڑکا مثل لڑکی کے نہیں ہے۔[۹۰] اب میں نے[۹۱] اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی ذریت کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ وہ شیطان رجیم سے محفوظ رہیں۔ ۳۶

سیدہ حنّہ کے ہاں لڑکے کی بجائے لڑکی کی پیدائش ہوئی

۸۹ سیدہ حنّہ نے اپنے پیٹ کے حمل کو بارگاہ ایزدی میں وقف کرنے کی نذر مانی تھی یقیناً ان کو خیال ہوگا کہ میرے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوگا کیونکہ بچہ ہی اس خدمت کو زیادہ مناسب طریقے سے سرانجام دے سکتا تھا۔ پس جب حنہ کا حمل وضع ہوا تو معلوم ہوا کہ اس حمل میں لڑکا نہیں لڑکی تھی۔ ظاہر ہے کہ خیال میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ اگر یہ لڑکا ہوتا تو اس خدمت کیلئے موزوں تھا جو خدمت اس سے لینے کا میرا خیال تھا اب معلوم نہیں مشیت ایزدی کا یہ فیصلہ کس رنگ میں پورا ہوگا؟ اس نے فطرۃً یہ کہا کہ اے میرے اللہ! مجھے تعجب ہے کہ میرے ہاں! تو لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ "اللہ خوب جانتا جو اس کے پیدا ہوا" اللہ نے اس ایک ہی جملہ میں یہ بتا دیا کہ جس خدمت کیلئے تو نے اپنے حمل کو وقف کیا تھا اس خدمت کو لڑکی بھی ادا کر سکتی ہے گویا اس کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس میں تعجب کی کوئی ضرورت نہیں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہود کی رسم و رواج کے مطابق لڑکی ہیکل کی خدمت گزار نہ ہو سکتی ہو کیونکہ ہیکل کے وقف ہونے والا شادی نہیں کر سکتا تو یہ ان کی رسم ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ شدہ بات نہیں۔ قانون الٰہی اس بات کا مخالف نہیں پاکیزگی اور طہارت میں اگر مرد کا کوئی مقام ہے تو عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مرد نیک اور پاکباز ہو سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں ہو سکتی؟

علم الٰہی میں تیرا وہ لڑکا جس کے متعلق تجھے خیال تھا اس لڑکی سے بہتر نہیں تھا

۹۰ انسان کی سوچ محدود ہے اور مشیت ایزدی کے فیصلے لامحدود ہیں یعنی انسان کی ہر سوچ سے وہ ذات اللہ واقف اور ہر خواہش کو جانتی ہے لیکن اس ذات الٰہ کے فیصلوں سے کوئی بھی واقف نہیں۔ وقتاً" فوقتاً" وہ جتنا چاہتا ہے کسی کے علم میں ڈال دیتا ہے۔ وہی ذات ہے جو علیم بھی ہے اور سمیع بھی اس کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور وہ سب کے علموں سے واقف ہے۔ وہ پوشیدہ سے پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے اور کسی کے لبوں پر بات آئے یا نہ آئے وہ سب کچھ جانتا ہے کیونکہ وہ دلوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ اے عمران کی بی بی! تیری تمنا لڑکے کی تھی! کیوں؟ اس لئے کہ تیرے خیال میں لڑکی سے یہ نذر پوری ہوتی نظر نہیں

آتی؟ کیونکہ اسرائیلی قانون اجازت نہیں دیتا۔ قانون الٰہی میں یہ بات موجود نہیں ہے اس لئے قانون الٰہی غالب آیا ہے اور یاد رکھ اے عمران کی بیوی! اس لڑکی کی عظمت و منزلت تو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ تو بیشک اس کی ماں ہے لیکن ماں اتنا ہی جانتی ہے جتنا کہ تو نے اظہار کر دیا۔ یعنی اس مولود سے جو جو عظمتیں وابستہ ہیں ان کی خبر غریب ماں کو کیسے ہو سکتی ہے؟ ان سے تو بس اللہ ہی خوب واقف ہے۔ اس لئے یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ جن رسومات اور رواجات کو اس لڑکی کے ذریعے توڑا جا سکتا ہے ان کو لڑکے سے توڑنا ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن یہ بات علم الٰہی کے اندر تھی ایک انسان اس سے کیسے آگاہ ہو سکتا تھا جب تک اس کو اللہ نہ بتا دے۔

والدہ مریم کا اپنی نومولودہ کا نام "مریم" رکھنا

۹۱ سیدہ حنہ کے اس بیان میں کتنی نشانیاں اور کتنی نصائح ہیں اگر کوئی مستفید ہونے والا ہو۔ دیکھو انہوں نے اپنے ذہن میں ایک بات رکھی تھی کہ میرے لڑکا پیدا ہوگا لیکن ان کے ذہن کے مطابق نہیں ہوا کیونکہ لڑکی پیدا ہوگئی۔ لیکن اپنے خیال کے خلاف پا کر وہ شکایت زبان پر نہیں لائیں کہ اللہ نے یہ کیا کیا؟ میرے دل کی حسرت پوری نہ ہوئی وغیرہ۔ نہیں بلکہ وہ صرف اظہار خیال کر کے اس پر قانع ہوگئیں جو عطا کرنے والے نے عطا کیا۔ وہ قطعاً بد دل نہیں ہوئیں بلکہ مشیت ایزدی پر وہ بہرحال راضی ہیں۔ اب اللہ سے اپنے دل ہی دل میں کہہ رہی ہیں کہ میرے اللہ! میں نے اس کا نام مریم رکھا گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل میں "مریم" نام ڈال دیا گیا اور وہ اپنے دل کی بات کو اس ڈالنے والے ہی پر اظہار کر رہی ہیں کہ مجھے وہ نام قبول ہے جو تو نے ہی میرے دل میں ڈالا ہے ہاں! اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نومولود کا نام رکھنے کا حق ماں کو بھی ہے۔ اے میرے رب! میں اسے یعنی اپنی بچی کو اور اس کی ذریت یعنی اولاد کو تیری ہی پناہ میں دیتی ہوں۔ سبحان اللہ! یہ اس بات کا اظہار ہے کہ میری خواہش میں لڑکا تھا اور تیرے قانون مشیت میں لڑکی تھی۔ تیرا لکھا غالب آیا اور میں تیرے قانون مشیت پر دل و جان سے راضی ہوگئی اور اب میں اس کو اور اس کی ہونے والی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کیونکہ شیطان لعین تو ہر آن انسان کو بہکانے اور پھسلانے کے کام سرانجام دے رہا ہے اور یہ بھی تیرا ہی قانون مشیت ہے کہ تو نے اس کو یہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ میری بچی بھی آخر انسان ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیری امان میں رہی تو اس کو شیطان کا چوکا متاثر نہیں کر سکے گا اور تو ہی عالم الغیب اور حی و قیوم ہے۔ جب تو نے اس کو لڑکی بنایا ہے اور عام معاشرہ کے خلاف اس کے مقام کو میرے خیالی لڑکے سے بڑھ کر مقام عطا فرمایا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تو نے اس پر کوئی بڑی ہی بھاری ذمہ داری ڈالنے کا ارادہ کیا ہے اور اب ان بھاری ذمہ داریوں کو نبھانے کی توفیق بھی تیرے سوا کسی کے پاس نہیں۔ تو ہی ہے جو اس کے حال اور مستقبل دونوں سے ہر وقت ایک جیسا واقف ہے اور میں تیری رضا پر بالکل راضی ہوں۔ میں نے تو صرف اپنے دل کی خواہش کا اظہار تیرے سامنے کر دیا ہے تو ہی ہے جو میری نیت

رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

پس ایسا ہوا کہ مریم کو اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت[۹۲] کے ساتھ قبول کیا اور ایسی نشوونما دی جو بہت ہی بہتر نشوونما[۹۳] تھی۔ اور زکریاؑ کو اس کا نگران حال بنا دیا۔

سے بھی واقف ہے اور مریم کی معصومیت سے بھی آگے جو کچھ ہونے والا ہے تو سب سے واقف ہے میرے دل کی تمنا تو یہی ہے کہ وہ خود اور اس کی ساری اولاد اور اولاد در اولاد جو کچھ ہو سب تیری ہی امان میں رہیں۔ دعاؤں کا سننے والا بھی تو ہی ہے میری یہ مناجات قبول فرما۔ صحیح بخاری میں مس شیطان کے متعلق جو بیان ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

سیدہ مریم کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر مانی تھی اور جو باتیں ان پر ظاہر ہوئی تھیں اس کی بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگان کلیسا نے جب کانٹ چھانٹ کر کے مستند اناجیل اربعہ مرتب کرنا شروع کی تو ان مضامین اور بیانات کو ان سے خارج کر دیا اور اس کی شہادت آج ان کے اکابر دے رہے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ ملاحظہ ہو۔ کھولک ڈکشنری ص ۴۸ اور ہیسٹگز کی ڈکشنری آف دی بائبل ج ۳ ص ۲۸۸۔ تفسیر ماجدی انگریزی ص ۱۸۰۔

قرآن کریم کے ان چند ہی الفاظ سے بھی اس کی وضاحت ہو رہی ہے کہ والدۂ مریم نہایت ہی عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں اور توحید ان کے دل میں پیوست تھی کیونکہ ان کی مناجات کے لفظ لفظ سے وہ نمایاں ہے اور "وَذُرِّيَّتَهَا" میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ والدہ مریم اللہ سے امید رکھتی تھیں کہ لڑکی کا سلسلہ نسل سے آگے چلے گا اور یہ بھی کہ جس طرح ہر انسان اپنی نرینہ اولاد سے اولاد کی خواہش رکھتا ہے بالکل اسی طرح اپنی نسوانی اولاد سے بھی اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے اگرچہ وہ اس کا برملا اظہار نہ کرتا ہو۔

مریم کو اللہ نے اس کی والدہ ماجدہ کی دعا کے مطابق قبول فرما لیا

۹۲ پھر اس کے پروردگار نے اس کو بوجہ احسن قبول کر لیا۔ یعنی والدہ مریم کی نذر کو اس لڑکی کی شکل میں بھی اللہ نے قبول کر لیا جو تاریخ خدمت ہیکل میں ایک نئی بات تھی۔ مسیحی نوشتوں کے مطابق سیدہ مریمؑ تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کر لی گئی تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے خادم جن کی تعداد ستائیس کے قریب تھی سب کے سب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ وہ نہایت ہی کم سن اور پھر وہ بچی ہونے کی صورت میں ہیکل میں رکھی گئی تھیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیدہ مریمؑ جب سن شعور کو پہنچیں تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے۔ زیادہ قرین قیاس یہ دوسری بات ہے اگرچہ یہ بھی ممکن ہو کہ تین سال کی

عمر میں عام کفالت ہیکل کے سپرد کر دی گئی اور بلوغت کے بعد کی کفالت خاص قسم کی کفالت ہو جس میں از سر نو سب نے خواہش کی ہو کہ کفیل ہم ہوں اور بالاخر فیصلہ زکریا علیہ السلام کے متعلق ہوا ہو۔ کیونکہ دلائل ان کے زیادہ وزنی تھے۔

وہ بہتر نشوونما کیا تھی جو سیدہ مریم کے حصہ میں آئی

۹۳ بہتر نشوونما سے کون واقف نہیں؟ جس بچے کو ماحول اچھا میسر آجائے۔ مادی اور اخلاقی یعنی جسم اور روح کو جن چیزوں کی فطرۃً ضرورت ہوتی ہے وہ اچھی طرح دستیاب ہوں۔ خوراک کا اچھا بندوبست ہو۔ اصول صحت اور حفظان صحت اور ماحول کی نگہداشت مل جائے۔ ان حالات میں بچہ کی جو نشوونما ہوتی ہے اس سے کون واقف نہیں؟ اور یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح اور سچ ہے کہ اس طرح کا ماحول ہر بچے کو میسر نہیں آتا۔

اب اس سے اگر کوئی یہ مراد لے کہ مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا کہ عام بچے ایک سال میں بڑھتے ہیں تو یہ خوش فہمی اور تعجب کا موجب تو ہو سکتی ہے اور جن لوگوں نے ہر بات میں ایک تعجب پیدا کرنا ہو ان کیلئے درست ہے لیکن قرآن کریم کی عبارت اور سیاق کلام دونوں میں ایسے تعجب کی کوئی بات موجود نہیں۔ ہاں! اگر اس معاملہ میں غور و فکر کی اجازت ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مریم اس طرح دس بارہ دن میں جوان ہوگئی ہوں گی اور دو ماہ کی مدت کے اندر اندر وہ ساٹھ برس کی ہو کر اس دنیا سے رخصت بھی ہوگئی ہوں تو پھر اس کفالت کے بکھیڑے کی یقیناً ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہوگی جو عام بچوں کیلئے پیش آتی ہے لیکن اس کا ذکر نقلی روایات میں موجود ہے اور نہ ہی عقلی دلائل میں اور سینہ گزٹ اگر بعد کی تحریرات میں نقل بھی ہو جائے تو اس کی کوئی حیثت نہیں ہوتی مگر یہ حکایت میں چاشنی ڈالنے اور باتوں کو نمک مصالحہ سے چٹ پٹا کرنے کیلئے اس طرح کے بیانات دیئے جاتے ہیں۔ وہ پہلے بھی تھے اب بھی ہیں اور جب تک قوم بوڑھی ماں کی کہاوتوں کو اسلام سمجھتی رہے گی ایسی حکایات بیان ہوتی ہی رہیں گی۔

قرآن کریم کے الفاظ ہیں "اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا" اور نبات دراصل نامیات یعنی بڑھنے والی چیزوں میں سے وہ ہیں جو زمین سے اگتی ہیں اور خاص کر استعمال اس کا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی ساق یعنی تنا نہ ہو پھر اس کا استعمال ہر بڑھنے والی شے پر ہونے لگا خواہ وہ سبزی میں سے ہو یا درخت ہو یا حیوان ہو یا انسان۔

كَفَّلَ۔ كِفْلٌ اور کفیل وہ حصہ ہے جس میں کفالت ہو اس لئے کفالۃ بمعنی ضمانت ہے اور تکفیل دوسرے کی کفالت میں دے دینا ہے۔

"زَكَرِيَّا" زکریا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد ماجد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم ہی میں زمرہ انبیاء علیہم السلام میں بھی آتا ہے اور یہ وہ زکریا ہیں جو سیدہ مریم کے کفیل مقرر ہوئے تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کاہنوں میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے۔ لیکن اس امانت کا اہل سیدنا زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا؟ کیوں اس لئے کہ وہ

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ

جب کبھی ایسا ہوتا کہ زکریاؑ اسکے پاس محراب ۹۴ میں جاتے تو اسکے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کی چیزیں موجود پاتے اس پر کبھی وہ امتحاناً یوں بھی پوچھتے کہ اے مریم یہ چیزیں تجھے

مریم کی خالہ ایشاع جس کو انجیل کی زبان سے الیشبع کہا جاتا ہے خاوند بھی تھے اور وقت کے نبی بھی اور مقدس ہیکل کے سردار بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب حقوق میں سب سے بڑا حق قرابت داری کا تھا اور یہی وجہ تھی کہ کفالت کا حق انہیں کے حصے میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ مریمؑ کی کفالت کا یہ معاملہ اس لئے پیش آیا کہ وہ یتیم ہوگئی تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لئے کفالت کا سوال پیدا ہوا جیسا کہ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰ میں ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا اس لئے کہ مریمؑ اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذر ہیکل" یعنی منذورہ ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لئے ازبس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

زکریا علیہ السلام نے مریمؑ کے لئے ایک الگ تھلگ حجرہ تعمیر کرا دیا

۹۴ غرض زکریا علیہ السلام نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کیلئے تعمیر کروا دیا تاکہ وہ ان میں وہاں رہ کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہیں شب بسر کرتیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع سیدہ مریمؑ کی ہمشیرہ تھیں اور حدیث معراج میں نبی کریم ﷺ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے متعلق یہ فرمایا ہے "وهما ابنا خالة" کہ وہ دونوں خالہ زاد ہیں اس سے بھی جمہور کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن کریم اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے مریمؑ کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ سیدہ مریم کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھے۔ (قصص القرآن ج ۴ ص ۲۰)

حقیقت حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت موجود نہیں کہ حنہ اور عمران سیدہ مریمؑ کی پیدائش سے پہلے اولاد سے بالکل محروم تھے اور نہ ہی اس بات کی کوئی صراحت یا اشارہ پایا جاتا ہے کہ ان کے ہاں مریمؑ کی پیدائش سے پہلے یا بعد کوئی اور اولاد ہوئی۔ ہاں! تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع مریمؑ کی خالہ تھیں اور اس کے پیش نظر مفسرین قرآن اور مورخین اسلام کی کثیر

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ

کہاں سے مل گئیں؟ وہ کہتی اللہ سے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب[۹۵] کے رزق دے دیتا ہے یعنی جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے وہ مہیا فرما دیتا ہے۔ ۳۷

اس جگہ کا یہ واقعہ[۹۶] ہے کہ زکریاؑ نے اپنے رب کے حضور دعا مانگی تھی کہ اے

تعداد نے اور اصحاب سیر نے ایشاع زوجہ زکریا علیہ السلام اور حنہ زوجہ عمران کی ہمشیرہ لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایشاع سیدہ مریمؑ کی خالہ تھیں۔

مختصر یہ کہ مریمؑ شب و روز عبادت الٰہی میں رہتیں اور جب خدمت ہیکل کیلئے ان کی نوبت آتی تو اس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور ان کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔

زکریا علیہ السلام بھی مریمؑ کی خبر گیری اور ضروری نگہداشت کیلئے کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے اکثر جب وہ ان کے خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریمؑ کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پھل اور میوہ جات پاتے جیسا کہ اللہ کے نیک بندوں کے پاس ان چیزوں کی کثرت و فراوانی رہتی ہے۔ سیدنا زکریا علیہ السلام اللہ کے نبی بھی تھے اور سیدہ مریم کے کفیل بھی انہوں نے غالباً امتحاناً سیدہ مریم سے دریافت فرمایا "يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا" اے مریم! یہ چیزیں تجھے کہاں سے مل گئیں؟ مریم بھی ماشاء اللہ اپنے اس امتحان میں پاس نکلیں اور فرمانے لگیں "هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کہ یہ رزق اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ کتنا شاندار جواب تھا؟ وہ بھی اتنی کم عمری میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اللہ ہی کو داتا جانتا ہو اور علاوہ ازیں وہ کسی کو داتا نہ سمجھے۔ اس جواب نے سیدنا زکریا جو اللہ کے نبی بھی تھے ان کے دل اور رگ و ریشہ میں جو اثر کیا اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا فرما دیتا ہے

[۹۵] سیدہ مریم نے رزق دہندہ صرف اللہ کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا "اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ بغیر حساب کے رزق دینے کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جہاں سے بندہ کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے رزق وافر مہیا فرما دیتا ہے اور یہ بھی کہ جتنا وسیع رزق ملنے کی امید نہیں ہوتی وہ اتنا وسیع رزق عطا فرما دیتا ہے کہ انسان کی سمجھ میں کبھی وہاں سے اتنا رزق ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ گویا اس بات کو اللہ نے دوسری جگہ خود اس طرح فرمایا ہے :

ذٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق ۶۵ : ۲، ۳) "اس سے ہر اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے مخلصی کی کوئی صورت پیدا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں سے کچھ ملنے کا اسے خیال تک نہ تھا اور جس نے اللہ پر بھروسہ کیا سو اللہ کی اعانت و نصرت اس کیلئے بس کرتی ہے۔" بس یہی مطلب ہے اس جملہ کا جو سیدہ مریمؑ نے زکریا علیہ السلام کے جواب میں فرمایا۔ گویا اس اللہ کی بندی نے وہ جواب دیا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ اس جملہ کا سننا تھا کہ سیدنا زکریا علیہ السلام کو اپنی کمی یاد آگئی اور دل سے ایسی آہ اٹھی کہ اس نے عرش والے کا دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ پھر کیا ہوا؟

ع دل سے جو آہ اٹھتی ہے اثر رکھتی ہے

بادل بنتے ہی رہتے ہیں لیکن برسنے کا وقت اللہ ہی جانتا ہے کہ کب ہے؟ انسان دعائیں کرتا ہی رہتا ہے لیکن قبولیت کا وقت وہی جانتا ہے کہ کب ہے؟ اللہ کے بندوں کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ غیر اللہ سے طلب نہیں رکھتے وہ جو کچھ مانگتے ہیں صرف اسی ایک سے مانگتے ہیں جو ارض سماء کا مالک حقیقی ہے۔

زکریاؑ کے دل سے ایک آہ اٹھی اور سیدھی قبول کرنے والے کے ہاں پہنچ گئی

۹۶ مریم جو مجسمہ نیکی تھیں اور وہ بھی اس دور شباب میں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے جملے نے زکریا علیہ السلام جیسے نبی کے دل کو ہلا کر رکھ دیا اور قدرت الٰہی کے اس تازہ مشاہدہ سے جو وہ اپنی آنکھوں دیکھ رہے تھے متاثر ہو کر ایک آہ کھینچی کہ اللہ! اولاد اور پھر وہ بھی نیک اور صالح۔ عرض کی مولا! اے میرے رب! اے میرے خالق و مالک! مجھے بھی اپنے پاس سے ایسی پاکیزہ اور ایسی ستھری اولاد عطا فرما جیسی تو نے عمران کو عطا فرمائی۔

سبحان اللہ! مریم بھی کیا ہی مریم تھیں؟ کہ نبوت کی زبان سے ضرب المثل بن گئیں۔ آپ کی مثل طلب کرنے کیلئے نبی کی زبان گویا ہوئی۔ کیوں نہ ہوتا؟ خود اللہ نے جو فرمایا تھا کہ اے مریم کی ماں! تو کس زعم میں ہے "لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى" تیرا طلب کردہ لڑکا بھی ایسا نہ ہوتا جیسی تجھ کو لڑکی عطا کر دی گئی۔ جب اس لڑکی کے کمالات کھلیں گے تو فرشتے بھی اس کی پاکیزگی و طہارت کی قسمیں کھائیں گے اور نبی بھی اس کی مثل طلب کرنے کیلئے زبان کھولیں گے۔ زکریا علیہ السلام کی دعا جاری ہے فرماتے ہیں "اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ" اے میرے اللہ! دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا تو صرف تو ہی ہے۔ تو نے عمران کے گھرانے کی کیسی سنی۔ جیسی ان کی سنی ایسی ہی میری بھی سن لے۔ ہاں! ہاں! تیرے سوا کون ہے جو کسی کے دل کی سننے والا ہو؟ اور کون ہے جو پکارنے کے لائق ہو؟ اور کون ہے جو قبولیت بخشنے والا ہو؟ کوئی نہیں صرف تو ہے اور تجھ ہی سے میں التجائیں کرتا کرتا بوڑھا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ میرا سفید سر دیکھ لے۔ میری کھوکھلی ہڈیاں ملاحظہ فرما۔

رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾
فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ۙ أَنَّ

میرے رب! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک اولاد عطا فرما جو مریم کی طرح نیک اور لائق فائق ہو بلاشبہ تو ہی دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے۔ ۳۸
پھر ایسا ہوا[۹۷] کہ فرشتوں نے زکریاؑ کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ

میری بیوی کے بڑھاپے پر رحم فرما۔ تیری بزرگی و الوہیت کی قسم تیرے سوا کوئی نہیں جس سے ہم التجا کریں۔ پھر دیکھ کہ تیرے اس پیغام کا وارث کون ہوگا جو تو نے میرے ذمہ لگایا۔

اولاد کی خواہش امر طبعی ہے جو زہد و تقویٰ و طہارت کے بھی منافی نہیں بلکہ تقویٰ و طہارت کا باعث ہے۔ نکاح' اولاد اور ضروریات زندگی کو زہد اور تقویٰ و طہارت کے خلاف خیال کرنا ایک جہالت ہے۔ قرآن کریم نے بار بار پیغمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں اور التجائیں نقل کر کے بتا دیا ہے کہ وہ مذاہب حقیقت سے کتنے دور ہیں جنہوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں ایک جنجال قرار دیا ہے۔

شریعت اسلامی میں اولاد کی خواہش تو سنت انبیاء و صدیقین بتائی گئی ہے اور کتب حدیث اور خصوصاً صحیح بخاری میں تو ایک مستقل عنوان "طلب اولاد" کے فضائل میں باندھ کر بات کو مزید واضح کر دیا۔ دعا قبول ہو جائے تو لازم نہیں آتا کہ اسی وقت اس کا نتیجہ سامنے آجائے۔

پھر "ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً" طیبہ کے اضافہ نے اسے اور بھی صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر ہر حال میں آخرت پر رہتی ہے اولاد کی خواہش میں بھی مطلق کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن حضرت زکریا علیہ السلام تو محض اولاد ہی نہیں چاہتے اولاد صالح چاہتے ہیں جس طرح کی اولاد انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھ لی تاکہ ان کے مشن تبلیغ کو اور درس توحید کو جاری رکھ سکے۔ اللہ کے بندوں اور پھر وہ بھی خاص بندوں کی نگاہ میں اخلاق اور روحانی فضائل ہر حال میں مقدم رہتے ہیں جو قوم کیلئے درس عبرت ہوتے ہیں۔

قبولیت کا وقت ہو تو دیر کب ہوتی ہے؟ ہاں! اس وقت کو بھی تو کوئی نہیں جانتا

[۹۷] زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی اور ان کو فرشتوں نے آواز دی اس حال میں کہ وہ حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ "فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ" بعض مفسرین نے اس سے مراد جبرئیل علیہ السلام فرشتہ کو لیا ہے اور بعض کے نزدیک ایک جماعت ملائکہ نے پیغام بشارت سنایا تھا۔ بہرحال اگر وہ پوری جماعت فرشتوں کی ہو تو بھی ظاہر ہے کہ ان کے قائد نے پیغام الٰہی پہنچایا ہوگا۔ مقصد اصلی پیغام بشارت پہنچانا ہے اس کی جو صورت

اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ

اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت[۹۸] دیتا ہے وہ حکم الٰہی سے ایک ہونے والے ظہور[۹۹] کی تصدیق کرنے والا، جماعت کا سردار، پارسا اور اللہ کے بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔ ۳۹

زکریاؑ نے جب یہ سنا تو کہا اے میرے رب! میرے ہاں! لڑکا کیسے ہو[۱۰۰] سکتا ہے جب

بھی تھی پھر زکریا علیہ السلام صرف کاہن ہیکل ہی نہ تھے بلکہ اللہ کے نبی بھی تھے انبیاء کو وحی کا پیغام پہنچانے کے لئے جو طریقہ تھا اس طریقہ سے یہ پیغام وحی جو ایک بشارت کا درجہ رکھتا تھا پہنچا دیا گیا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا "يَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيٰى" (مریم ۱۹ : ۷) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں کہ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔" عہد جدید میں ان کا نام یوحنا آتا ہے۔ چنانچہ انجیل میں ہے کہ: "فرشتہ نے اس سے کہا اے زکریا! خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سنی گئی اور تیری بیوی الیشع تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی۔" (لوقا ۱ : ۴۱)

یحییٰ علیہ السلام کی بشارت زکریا علیہ السلام کو سنائی گئی

۹۸ "یحییٰ" مفردات امام راغب میں ہے کہ سماہ بذلک من حیث انہ لم تمتہ الذنوب کما اماتت کثیراً من ولد آدم یعنی "اس کا نام یحییٰ رکھا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ گناہ سے اس پر موت نہیں آئے گی جیسا کہ بہت سے آدم کے بیٹوں پر آئی" بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یحییٰ نام بتانے میں اشارہ یہ تھا کہ جس طرح بنی اسرائیل کی عامہ حالت اس وقت تھی کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور نہایت سچے اور راست باز انسان ان میں عموماً نہ رہے تھے۔ یہ لڑکا ایسا نہ ہوگا بلکہ وہ بھی اپنے والد سیدنا زکریا علیہ السلام کی طرح روحانی زندگی کا وارث ہوگا۔ گویا بیٹے کی خوشخبری کے ساتھ ہی بیٹے کی عمر کی رجسٹریشن بھی کر دی کہ پیدا ہونے کے بعد جلد ہی نہیں مرجائے گی بلکہ اتنی زندگی پائے گا کہ اس کو نبی بنا دیا جائے اور وہ نبوت کا پیغام لوگوں تک پہنچائے گا اور سب سے بڑی اور یقینی بات یہ ہوئی کہ اس طرح گناہ کی موت اس پر نہ آئے گی۔

بعض نے یہ بھی کہا کہ یحییٰ نام اس طرف اشارہ کیلئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایمان سے زندہ کرے گا یا اس لئے کہ وہ علم و حکمت سے زندہ ہوگا۔ (لسان العرب) یا اس لئے کہ اس کے ذریعے سے لوگ ہدایت کے ساتھ زندہ کئے جائیں گے اور وہ کفر کی موت سے نکال لئے جائیں گے۔

اناجیل میں ان کا نام یوحنا آتا ہے اور یوحنا بپتسمہ دینے والے کے نام سے یہ مشہور ہیں۔ انجیل کے مطابق انہوں نے ہی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بپتسمہ دیا تھا حالانکہ وہ اناجیل کے بیان کے مطابق ہی عیسیٰ علیہ السلام سے صرف ۶ ماہ بڑے تھے۔ اس طرح ان کا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کا زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کا ظہور کچھ حضرت مسیح سے پہلے ہوا یہ عجیب بات ہے کہ سلسلہ موسوی کی ابتداء بھی دو نبیوں سے موسیٰ اور ہارون سے ہی ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ بھی دو نبیوں یعنی یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر ہی ہوتا ہے۔ جس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کا سارا کام اکیلے نہ کر سکتے تھے بالکل اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی اکیلے یہ کام نہ کر سکتے تھے اور اس بات کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ جو کام سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا جانے والا تھا علم الٰہی میں موجود تھا کہ وہ اکیلے اس کام کو نباہ نہیں سکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہی اس کام کو یحییٰ علیہ السلام کے سپرد کر دیا تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کیلئے آسانی پیدا ہو جائے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے کام کا کچھ حصہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا اس طرح حضرت یحییٰ نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کیلئے لوگوں کو تیار کرنا شروع کر دیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں کیلئے کتب سابقہ میں کچھ پیش گوئیاں تھیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کیلئے پیش گوئی ان الفاظ میں ملاکی نبی کی کتاب میں موجود تھی "دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں الیاہ نبی کو تمہارے بھیجوں گا۔" (ملاکی ۴ : ۵) بظاہر اس پیشگوئی میں الیاس کے آنے کا ذکر ہے اور الیاس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہے کیونکہ ان کی کتاب میں اس طرح بھی لکھا تھا کہ "ایلیاہ بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا۔" (پہلا طین ۱ : ۱۱)

جب حضرت مسیحؑ نے دعویٰ رسالت کیا تو یہودیوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہماری پیشگوئیوں میں لکھا ہے مسیح سے پیشتر ضروری ہے کہ الیاس آئے چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے یہ اعتراض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا "ایلیاہ تو آچکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا اس طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے گا۔" اس کے بعد لکھا ہے کہ :

"تب شاگرد سمجھ گئے اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا ہے۔" (متی ۱۷ : ۱۲، ۱۳)

اور دوسری جگہ اس کی وجہ اس طرح بیان کی ہے "اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا۔"

کیا عقل مند کیلئے اشارہ کافی ہوتا ہے یا نہیں ؟

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لینا چاہئے کہ بائبل کا وہ بیان جو سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے متعلق ابھی اوپر گزرا ہوا آپ نے پڑھ لیا کہ یہود کے زعم میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے ایلیاہ نبی کا آنا ضروری تھا اور ایلیاہ نبی کا آنا ضروری تھا اور ایلیاہ کون ہیں؟ بائبل ہی نے بتا دیا کہ وہ الیاس ہیں اور پھر آپ

نے الیاس علیہ السلام کے متعلق پڑھا کہ یہود کا خیال تھا کہ وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور ان کو مسیح علیہ السلام سے پہلے آسمان سے اترنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہود نے حضرت مسیح کو نبی ماننے سے انکار کیا۔ لیکن یہ بات اعتراضاً حضرت مسیح سے پوچھی گئی تو انہوں نے یحییٰ علیہ السلام کو مثیل یا بزور الیاس کہہ کر یہود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی دراصل و ایلیاہ یا الیاس جس کی آمد کے تم منتظر ہو وہ تو آگیا۔ کیسے؟ اس لئے کہ میرے سے پہلے یحییٰ علیہ السلام جو آئے وہی دراصل الیاس یا الیاہ ہیں۔

ہمارے پنجابی نبی علیہ ما علیہ نے یہود کا یہ بنا بنایا معاملہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے سہارے سے اپنے اوپر فٹ کر لیا اور اس طرح انہی کے دلائل کو جو بقول مرزا جی مسیح نے یہود کے خلاف استعمال کئے تھے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے۔ کیونکہ مسلمان بھی ایک تصور رکھتے تھے کہ مہدی موعود آنے والے ہیں اور اس طرح یہ خیال عام ہے کہ مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ ان کا نزول ہوگا۔ ان دونوں نظریوں کو مرزا جی نے اپنی نبوت کیلئے سہارا بنا لیا اور اس سہارا کی بنیاد پر کبھی وہ مہدی موعود کہلائے اور کبھی وہ مثیل مسیح یا بزور مسیح موعود بنتے رہے۔ حکومت وقت چونکہ دیار غیر سے آئے ہوئے لوگوں کی تھی یعنی انگریز کی ان کو ہر وقت اس بات کی فکر رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں تاکہ ان کا شیرازہ بکھرا رہے۔ اس وقت کی تاریخ کو اگر آپ اٹھا کر دیکھیں تو آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اِس وقت جتنی گروہ بندیاں موجود ہیں وہ ساری کی ساری اُس دور کی پیداوار ہیں۔

خلافت راشدہ کے دور کے بعد عبداللہ بن سباء جو دراصل ایک یہودی تھا اسلام کا لبادہ پہن کر مسلمانوں میں گھس گیا اور اس کا کمال یہ تھا کہ مسلمانوں کو مستقل دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ایک شیعان علی کے نام سے موسوم ہو کر آج تک شیعہ کہلاتے ہیں اور دوسرے اہل سنہ کے نام سے منسوب ہوئے اور اس فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی جماعت ... تقسیم ہو کر دو گروہوں میں بٹ گئی اور اس طرح جو طاقت انہوں نے غیر مسلموں پر خرچ کرنا تھی وہ دونوں گروہ آپس میں خرچ کرتے رہے۔

حکومت انگلیسیہ نے ان دو گروہ کو مزید بیسیوں گروہوں میں تقسیم کر دینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مرزا جی نے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کے متعلق جو پوری امت کا متفقہ مسئلہ تھا جس کی وضاحت قرآن و حدیث میں واضح الفاظ میں موجود تھی اس کے خلاف ان ہی پیش گوئیوں کے سہارے جو بائبل میں الیاس اور مسیحؑ کے متعلق تھیں وہیں سے اٹھا کر نظریہ مہدی موعود کے سہارے مسلمانوں میں تفریق کیلئے ایک نیا دروازہ کھول دیا اور شاطر انگریز نے ان کی دل کھول کر مدد کی۔ جس کی شہادتیں آج بھی تحریری طور پر موجود ہیں۔ یہ ایک اشارہ ہے جو عقلمندوں کے کام آئے گا۔

یحییٰ علیہ السلام کے کمالات کا ذکر قرآن کریم میں

۹۹ "وہ حکم الٰہی سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا ہوگا" قرآن کریم کے الفاظ اس طرح ہیں "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" یحییٰ علیہ السلام کی جو بشارت سیدنا زکریا علیہ السلام کو سنائی جا رہی ہے اس میں یحییٰ علیہ السلام کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سے یہ پہلی صفت ہے جو قرآن کریم میں درج ہے اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ "كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" کیا ہے؟ قرآن کریم میں "کلمة" کا لفظ وسیع معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام معنوں میں بھی استعمال ہے جس کو عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے جس طرح مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دینے والے مسیحیوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا "كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ" (الکہف ۱۸ : ۵) "ان لوگوں نے کیسی سخت بات منہ سے نکالی ہے کہ اللہ بھی اولاد رکھتا ہے۔" یہ کلمہ تو عام معنوں میں ہے۔ اس جگہ کس کلمہ کی تصدیق ہے اس کے متعلق تین اقوال بیان کئے گئے ہیں کہ یہ کلمہ التوحید یعنی توحید کی بات ہے۔ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور یہ کہ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے "كَلِمَةٌ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ" وہ کلمہ ہے کہ مریم کی طرف ڈالا گیا۔ گویا اس طرح یہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے جس طرح جبرئیل علیہ السلام کا لقب "روح اللہ" ہے۔

اس طرح "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یعنی یحییٰ علیہ السلام مسیح علیہ السلام کے مصدق بھی ہوں گے اور مسیحیوں کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی اصل حیثیت مسیح کے پیش رو اور نقیب ہی کی تھی۔

سَيِّدًا "جماعت کا سردار" مسیحی تو خیر آپ کے تقدس کے قائل ہی ہیں یہود جو آپ کے منکر اور آپ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی آپ کی مرجعیت اور مقبولیت سے انکار نہیں کرتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیدا کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا حلیم جس کو کسی وجہ سے غصہ نہ آئے اور کہا گیا ہے کہ سید وہ ہے جس نے دونوں جہان دے کر خالق جہاں کو لے لیا ہے۔

"حصوراً" یعنی لذات و شہوات پر اسے قابو حاصل ہوگا اور وہ نہایت حد تک محتاط اور متقی ہوگا۔ انجیل میں بھی ان کے زہد و تبتل کا ذکر تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ "وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔" (لوقا ۱ : ۱۶) "اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ انبیاء کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کیلئے ایک مستعد قوم تیار کرے۔" (لوقا ۱ : ۱۷ تا ۱۸) "اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل کے ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا۔" (لوقا ۱ : ۸۰)

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں کہ اللہ کے سامنے بغیر گناہ

کئے جائے سوائے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے متعلق فرما دیا ہے " سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا " آپ معصوم تھے اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام معصوم ہی ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام ابن آدم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جائیں گے تو اس گناہ کے ساتھ جائیں گے جو ان کے ذمہ لگایا گیا ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے ان کے ذمہ قوم کوئی گناہ بھی نہ لگا سکے گی۔ وہ صالحین میں سے تھے اور صالحین کی اولاد میں سے بھی تھے۔

عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں قتادہ رحمہ اللہ کا قول موقوفاً اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ یحییٰ بچپن میں کچھ بچوں کی طرف سے گزرے۔ لڑکوں نے ان کو کھیلنے کیلئے بلایا آپ نے فرمایا "ہم کھیلنے کیلئے نہیں پیدا ہوئے۔"

" وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ " حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نبوت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں تو مسلم ہے لیکن خود مسیحیوں کے مقابلہ میں بھی ہے جن کے نزدیک عصمت تقویٰ لازمہ نبوت ہے۔ نبی تو سب کے سب ہی صالحین ہوتے پھر یہ تخصیص کیوں؟ ابھی اوپر بیان ہوا ہے کہ وہ نہایت حد تک پاکباز تھے اور خصوصاً یہ کہ وہ "حصور" تھے۔ اس لفظ حصور کی تشریح میں لوگ بہت دور نکل گئے اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ دراصل اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عورت کے قابل نہ تھے اور یہ کہ وہ مرد نہیں بلکہ دراصل وہ نا مرد تھے۔ حالانکہ اگر کوئی ایسی بات کسی میں ہو بھی تو یہ کوئی خوبی نہیں بلکہ نقص ہے اور ایسا انسان اگر نفسانی خواہشات سے بچتا ہے تو یہ اس کا کوئی کمال نہیں ہے۔ کیونکہ ایک چیز جب اس کے اندر موجود ہی نہیں تو پھر اس سے بچنے کے معنی ہی کیا ہیں؟ اس آخری فقرہ کو بول کر اللہ تعالیٰ نے خود وضاحت فرما دی کہ ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ اس قابل نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت حد تک پاکباز تھا اور اس کی وضاحت دوسری جگہ خود قرآن کریم نے کر دی ہے۔ فرمایا گیا "وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا " اور وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخش دی۔ (مریم ۱۹ : ۱۲) گویا دوسرے انبیاء کرام کے مقابلہ میں سیدنا یحییٰ علیہ السلام اور سیدنا مسیح علیہ السلام کو پہلے نبی بنا دیا گیا۔

انجیل میں ہے کہ ان کی تمام ابتدائی زندگی صحرا میں بسر ہوگئی۔ پھر وہیں ان پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انہوں نے دریائے یردن کے نواح میں توبہ و انابت کی منادی شروع کر دی۔ وہ پکارتے تھے کہ آنے والے وقت کیلئے تیار ہو جاؤ۔ (لوقا باب ۳)

عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کمال بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ قرآن کریم ان کی تفہیم کس پیارے انداز میں کرا رہا ہے کہ کچھ کہا بھی نہیں اور سب کچھ کہہ بھی دیا۔ کیونکہ قرآن کریم نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بالمقابل یحییٰ علیہ السلام کو پیش کر دیا کہ اگر یہ کوئی خوبی ہے تو پھر حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کچھ کم نہیں ہیں۔ حضرت یحییٰ کی زندگی دنیا کی ان معمولی معمولی آسائشوں سے بھی

خالی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر تھیں۔ چنانچہ انجیل میں ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ "وہ مے نہ پیتے تھے اور نہ زیادہ کھاؤ پیو تھے۔"

قرآن کریم نے تو یحییٰ علیہ السلام کو انبیاء ہی میں سے ایک نبی بیان کیا ہے مگر حضرت مسیحؑ نے یوحنا کو نبیوں سے بھی بڑھ کر کہا ہے۔ جو مسیحؑ نے یحییٰؑ کے متعلق کہا اگر یحییٰؑ نے مسیحؑ کے متعلق کہا ہوتا تو نہ معلوم عیسائی مسیحؑ کو کیا کچھ بنا دیتے؟ مسیحؑ نے یوحنا کے متعلق فرمایا "تو پھر کیوں گئے تھے؟ ایک نبی دیکھنے کو ہاں! میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔" (متی ۱۱ : ۹، ۱۱) سوال یہ ہے کہ کیا مسیح عورت سے پیدا نہیں ہوئے؟ پھر اس صریح بیان کے مطابق بڑا کون ہوا؟ یحییٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام؟ ہاں! یہ عیسائیوں کیلئے بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ خود جواب دیں اور جہاں فرشتہ زکریا علیہ السلام کو بشارت دیتا ہے وہاں ان الفاظ میں بشارت ہے "اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہوں گے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز مے نہ پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔" (لوقا ۱ : ۱۴، ۱۵) اور احادیث میں آتا ہے کہ ما من عبد یلقی اللہ الا ذنب الا یحییٰ ابن زکریا کوئی بندہ نہیں جو خدا کو ملے گا مگر وہ قصور وار نہ ٹھہرایا گیا ہو سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔"

یہ باتیں محض تحریر ہی نہیں کر دی گئیں بلکہ تورات میں موجود ہیں جو حوالے درج کئے گئے ہیں وہاں سے نکال کر دیکھیں یہ اور اس طرح کی دوسری آیات جو تورات میں ہیں ان کو اگر ظاہر پر محمول کیا جائے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یحییٰ علیہ السلام نہ اللہ ہیں نہ اللہ کا بیٹا اور نہ ہی اللہ کا تیسرا جزو۔ ہاں! اللہ کے بندے ہیں اور بعض فضیلتوں میں دوسرے نبیوں سے بڑھ کر بھی ہیں خصوصاً مسیح علیہ السلام پر جیسا کہ انبیاء کرام کے متعلق قرآن کریم نے خود نظریہ دیا ہے کہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ یہ رسولوں کی جماعت ہے ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کئے ہیں اگرچہ رسول ہونے کے لحاظ سے سب ہی کو رسالت دی گئی۔

زکریا علیہ السلام لڑکے کی بشارت سن کر متعجب کیوں ہوئے؟

۱۰۰ زکریا علیہ السلام نے لڑکے کی بشارت سن کر فرمایا "اے اللہ! اے میرے رب! میرے ہاں! لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟" اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب مریم رضی اللہ عنہا کے حجرہ اطہر میں زکریا علیہ السلام نے مناجات کی تھیں جس میں لڑکے کیلئے دعا تھی اس میں اور اس بشارت میں کچھ مدت یقینی طور پر گزر چکی تھی خواہ وہ پانچ سات سال ہو یا آٹھ دس سال۔ تب ہی تو آپ کو تعجب ہوا کہ مدت دراز تک تو دعائیں کرتا رہا لیکن اب تو ظاہری حالات مایوس کن حد تک

پہنچ چکے ہیں۔ پھر سوال تعجب کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعظام پر اور ایک ایسے بڑے نشان کے ظاہر ہونے پر ہے جو انسان فطرتاً کرتا ہے۔ کیونکہ ظاہر حالات اس کے مخالف تھے اور ایک مدت مدید شادی کو گزر چکی تھی۔ اگرچہ اب بھی فی زمانا ہمارے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں اور جن کو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ شادی ہوئے اٹھارہ بیس سال گزر گئے اور حالات مایوسی کی حد تک پہنچ گئے جوانی گئی اور کہل آنے لگا اور اولاد ہوگئی۔

لیکن ان کے ہاں! اولاد کی خبر پاکر ہر سننے والے کو ایک بار تعجب سا ہوا کیونکہ یہ فطری بات ہے۔ ہاں! یہ بات ضروری ہے کہ اگر دعا کرنے کے دنوں ہی میں یعنی دو چار یا سات آٹھ روز بلکہ ایک ماہ تک بھی یہ بشارت آئی ہوتی تو یقیناً اتنا تعجب یا ایسا استفسار بھی نہ ہوتا۔ جو بات بنتی نظر آتی ہے کیونکہ اگر دعا کی قبولیت اتنی جلدی ہوئی ہوتی تو جواب یقیناً یہ ہوتا کہ کل تو بچے کیلئے دعائیں کر رہے تھے اور آج خوشخبری پر اظہار حیرانی کیوں؟

بالکل اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے وطن مالوف سے ہجرت کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے ہیں کہ "رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ" (الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۰) "اے میرے رب! مجھے نیک اولاد عطا فرما" اور ایک مدت کے بعد دعا کی مقبولیت کا نتیجہ برآمد ہونے کی آپ کو خوشخبری دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرستادہ کہتے ہیں اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (الحجر ۱۵ : ۵۳) "اے ابراہیم! ہم آپ کو بیٹے کی خوشخبری دینے کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔" تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ○ (الحجر ۱۵ : ۵۴) "تم مجھے اس بات کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہوگیا ہے۔ کوئی امید اب رہ گئی ہے کہ یہ خوشخبری مجھے سناؤ؟"

اللہ تعالیٰ کے فرستادہ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ "بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (الحجر ۱۵ : ۵۵) "ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ خوشخبری سنائی ہے۔ تمہیں نا امید نہ ہونا چاہئے۔"

بالکل اس طرح کا معاملہ سیدنا زکریا علیہ السلام کے ساتھ بھی ہوا۔ چونکہ ایک مدت گزر چکی تھی اور حالات مایوس کن تھے اس لئے زکریا علیہ السلام نے بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرح جواب فرمایا۔ حالات کا مایوس کن ہونا اور بات ہے اور خود انسان کا مایوس ہو جانا دیگر امر ہے۔ نہ ابراہیم علیہ السلام ہی مایوس تھے اور نہ ہی زکریا علیہ السلام ہاں! حالات کا تقاضا ایسا تھا کیونکہ ایک مدت گزر چکی تھی کہ اولاد نہ ہوئی۔ جب حالات و وقت کا تقاضا تھا اس وقت تو اولاد نہ ہوئی اور اب؟ حالانکہ اب تو بیوی بھی بانجھ ہو چکی ہے۔ اللہ نے ارشاد فرمایا زکریا یہ بھی علم الٰہی میں موجود ہے کیونکہ "وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ" ہم نے تیری بیوی کی اصلاح کر دی ہے۔

غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا

کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟ حکم الٰہی ہوا اسی طرح اللہ جو[۱۰۱] چاہتا ہے کرتا ہے یعنی علم الٰہی میں جو کچھ ہونا ہے بس اس کو ہونا ہی ہے۔ تیری روک سب دور ہو جائے گی۔ ۴۰

ہر ہونے والے کام کیلئے قانون الٰہی میں ایک وقت طے ہے

[۱۰۱] ارشاد الٰہی ہوا کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے یعنی علم الٰہی میں جس کام کا ہونا تحریر ہے وہ ہو کر ہی رہے گا اور پھر ہر کام کیلئے ایک وقت مقرر ہے اگر سویر سے دینے والا وہ ہے تو دیر سے دینے والا بھی وہی ہے اور جو بات قانون الٰہی میں طے ہے اس کا وقت بھی یقیناً معین ہے اور جو روک تیرے ذہن میں ہے ہم بھی اس کو اچھی طرح جانتے ہیں ہم تجھے یہ بات بھی بتا دیں کہ آپ کی وہ روک بھی دور کر دی گئی ہے اس لئے کہ آپ کی بیوی کو بھی آپ کیلئے تندرست کر دیا گیا ہے۔

"غُلٰمٌ" آپ قرآن کریم کے قصص پر غور کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جہاں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے لڑکوں کی خوشخبری دی ہے وہ جس نبی کو بھی دی ہے "غُلٰمٌ" کے لفظ ہی سے دی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یکے بعد دیگر دو بچوں کی خوشخبری دی گئی تو ایک کے متعلق فرمایا "فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ" اور دوسرے بیٹے کی خوشخبری کے ساتھ فرمایا فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ زیر نظر آیت میں "غُلٰمٌ" کا لفظ آیا ہے اور سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو جس لڑکے کی بشارت دی گئی تھی فرمایا "لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا" جس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ چونکہ یہ سب ایک طرح کی پیش گوئیاں ہیں لہٰذا ان پیش گوئیوں میں ان کے والدین کو یہ بات بھی ضمناً بتا دی ہے کہ جن بچوں کی تم کو خوشخبری دی جا رہی ہے یہ یقیناً جوانی کو پہنچیں گے اور ان میں کوئی بچہ بھی ایسا نہیں ہوگا جو پیدا ہو کر جوانی تک پہنچنے سے پہلے ہی وفات پا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ وضاحت اس لئے عرض کرنا پڑی کہ دراصل غلام کہتے ہیں اس لڑکے کو ہیں جس کی مونچھیں نکل چکی ہوں یعنی جوانی کو پہنچ چکا ہو گویا ان بشارات کے ساتھ ہی ان کی زندگی کیلئے بھی ارشاد کر دیا گیا۔

"كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" اصل ترکیب اس جملہ کی اس طرح ہے کہ "الامر كذلك" یعنی ایسا ہی ہونا ہے "اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پس یہ دو الگ جملے ہیں اور پہلے میں مبتدا محذوف ہے۔ (راغب)

يَشَآءُ ۞ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ

زکریاؑ نے عرض کی اے میرے رب! اس کے متعلق میرے لئے کوئی بات بطور شکریہ نشانی ٹھہرا دے۔[۱۰۲] ارشاد الٰہی ہوا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن رات تک عام

اس خاص موقع پر خاص طرح کا شکریہ ادا کرنے کا شوق

[۱۰۲] زکریا علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ اے میرے رب! اس بشارت کے متعلق میرے لئے کوئی بات بطور شکریہ نشانی ٹھہرا دے۔ جس طریقہ سے میں تیرے اس انعام بے پایاں کا شکریہ ادا کر سکوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی خبر میں کوئی شک اور ابہام تو رہ نہیں جاتا اب یہ بات تو نہیں کہی جا سکتی کہ شاید بچہ ہو یا نہ ہو۔ ظاہر ہی ہے کہ بچہ تو ہوگا اور پھر بچہ بھی کوئی معمولی بچہ نہیں ہوگا بلکہ ایک شاندار بچہ ہوگا جس کی عمر کی بھی ایک حد تک وضاحت فرما دی گئی ہے اور پھر یہ بھی ہوا کہ وہ بچہ تیرا نبی بنے گا۔ گویا "يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ" کی دعا کو قبولیت بخشی گئی۔ اے میرے رب! تیرے اس انعام کا میں شکریہ کس طرح ادا کروں اس کا کوئی طریقہ تو میرے دل میں ڈال دے یعنی مجھے الہام فرما دے جو تیرے اس شاندار عطیہ کی شان کے مطابق ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا میرے شکریہ کا طریقہ یہ ہے کہ تین دن کا قیام مسجد میں رہ کر اعتکاف کے طریقہ پر پورا کر دے تیری طرف سے یہ بطور شکریہ ہم نے قبول کر لیا اور جس طرح اعتکاف کی حالت میں عام بول چال بند کر دی جاتی ہے تو بھی بند کر دے اور یہ گویا نشانی ہوئی اس بات کی کہ تو نے اللہ کی اس نعمت کا شکریہ ادا کیا اور تیرے اس اعتکاف سے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو جائے گی جب یہ بات کھلے گی کہ آپ نے یہ معمول کی عبادت کے علاوہ عبادت کا طریقہ کیوں اختیار کیا؟ اس میں عام بول چال تو بند رہے گی مگر ہاں! کسی سے کوئی بات کرنا لازمی اور ضروری ہو تو اشارہ کنایہ سے کی جا سکتی ہے جس طرح اعتکاف کے دوران کیا جاتا ہے۔

"ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ" تین دن تک یعنی آپ کا یہ اعتکاف تین دن تک برابر چلتا رہے گا دن ہو یا رات اس لئے سورہ مریم میں "ثَلٰثَ لَيَالٍ" یعنی تین راتیں کہہ کر ذکر کیا گیا اور حقیقت یہی ہے کہ جب دن فرمایا تو رات ساتھ شامل تھی اور رات فرمایا تو دن خود بخود شامل ہو گیا۔ یعنی برابر تین دن رات اعتکاف کی حالت میں رہو اور قرآن کریم نے اس بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ تین دن رات کی خاموشی صرف بطور خاموشی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خاص مقصد ہے یہ مقصد چپ رہنا نہیں ہے اور جو مقصد ہے وہ یہ ہے کہ عبادت الٰہی میں پوری گرم جوشی دکھائی جائے اور نبوت کے پروگرام اور اس کے بوجھ کو خوب اچھی طرح اٹھانے کا عہد اپنے

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ ۴۱

بات چیت نہ کر مگر اشارہ کنایہ سے اور اپنے رب کا کثرت کے ساتھ ذکر کر اور صبح و شام اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہ۔ ۴۱

مالک حقیقی سے تازہ کیا جائے اور صبح و شام اللہ کا ذکر جاری رہے۔ دل سے بھی اور زبان سے بھی۔ گویا اس جملہ کو ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تردید کر دی جنہوں نے یہ کہا کہ زکریا علیہ السلام نے نشانی طلب کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان کو تین رات تک بند کر دیا تھا تاکہ وہ کسی سے بات چیت نہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی وضاحت فرما دی کہ ایسا بالکل نہیں کہ آپ کی زبان بطور مرض یا سزا بالکل بند ہو جائے اور آپ بالکل گونگے ہو جائیں جیسا کہ انجیل میں بتایا گیا ہے بلکہ ذکر و تسبیح میں آپ برابر لگے رہیں گے البتہ لوگوں سے عام گفتگو نہ کریں گے اور کمال بھی اسی میں ہے کہ انسان کی زبان بند نہ ہو بلکہ وہ عام گفتگو کو بند کر دے۔ بولنے کی طاقت ہونے کے باوجود انسان لغویات سے بچے یہ تو کمال ہے لیکن اگر کوئی بات لغو منہ سے نکال لینے پر قادر ہی نہ رہے اور پھر وہ کوئی لغو بات نہ کرے تو کمال کیونکر ہوا وہ تو مجبوری ہوئی۔

نہ معلوم ہمارے ہاں ہر بات کا بتنگڑ بنانے کی کیوں عادت ہے؟ انسان کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ کسی کی کوئی بات سنے تو اس کو خود بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ جو کوئی کہے مان لینا تو کوئی کمال کی بات نہیں۔ ہم اس بات کے بالکل پابند نہیں کہ جو کچھ تورات و انجیل میں اس وقت موجود ہے اس کے ماننے پر مجبور ہوں ہاں! تورات و انجیل کا وہ حصہ جو قرآن کریم نے محفوظ کر لیا ہمارا ایمان ہے کہ وہ انجیل میں تھا۔ اس وقت موجود ہو تو بھی اور اگر نہ موجود ہو تو بھی کیونکہ تورات و انجیل میں تحریف یہی نہیں کہ ایک بار ہوئی ہو بلکہ بار بار ہوتی رہتی ہے۔ آج بھی اگر آپ تورات و انجیل کے مختلف نسخے اکٹھے کر کے ان کو آپس میں ملائیں تو بہت فرق نکلے گا۔ کیونکہ جب ایک بار کمی بیشی ہو گئی تو اب ہوتی ہی رہے گی اور اس سے ان کا محفوظ رہنا ممکن ہی نہ رہا۔

چونکہ انجیل کی یہ عبارت تھی کہ "اور دیکھو جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس رویا دیکھی اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور وہ گونگا ہی رہا۔" (لوقا ۱ : ۲۲، ۲۳)

قرآن کریم جو تمام صحیفوں پر مہیمن و نگران اور نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جاتا ہے یہاں بھی اس نے حسب معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریاؑ سے یہ بہتان رفع کر کے صحیح صورت حال کو بیان کر دیا کہ ایک شکریہ ادا کرنے کی علامت غیبی تھی کہ انہوں نے خود درخواست کی تھی جس

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ

اور پھر اس واقعہ کا ذکر کرو۔ جب فرشتوں[۱۰۳] نے کہا تھا۔ اے مریم اللہ نے تجھے اپنی قبولیت کے لئے چن لیا ہے اور ہر برائی کی آلودگی سے پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی

پر یہ ہدایت الٰہی نازل ہوئی تھی آپ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل میں لگے رہو اور عام بول چال بند کر دو اور یہ حالت اعتکاف کی مدت بھی خود ہی متعین فرما دی اور زکریا علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور تسبیح و تہلیل کے اوقات میں دو اوقات کا خاص ذکر فرما دیا پہلا وقت "عشی" تھا جو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک کا سارا وقت اس میں اور "ابکار" طلوع فجر سے دن چڑھے تک کا وقت اس میں شامل ہے اور محاورہ میں مراد صبح و شام کے اوقات کی تعین و تخصیص ہی نہیں بلکہ اس سے مراد دوام بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی صبح سے شام اور شام سے صبح گویا پورے اوقات حوائج و ضروریات انسانی کے علاوہ سارا وقت اس طرح صرف کرو۔

سیدہ مریم کو اللہ کی طرف سے برگزیدگی و قبولیت کی بشارت

۱۰۳ حضرت مریم رضی اللہ عنہا جب کہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور علم الٰہی میں عن قریب ان کو ایک جلیل القدر نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بحق دار رسید کا مصداق ہے۔ تاہم علمی و تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و حدیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی مراد کیا ہے؟ اور کیا درحقیقت سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور پھر یہی نہیں بلکہ اس آیت فضیلت نے مریمؑ کی ذات سے متعلق علمائے سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنا دیا ہے مثلاً ۱۔ کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ ۲۔ کیا سیدہ مریم رضی اللہ عنہا نبی تھیں؟ ۳۔ اگر نبی نہیں تھیں تو زیر نظر آیت کے جملہ کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟

مشاہیر علمائے اسلام میں اس مسئلہ میں دو رائیں رکھتے ہیں۔ کچھ کی رائے میں اس سوال کا جواب "ہاں" میں ہے اور کچھ کی رائے میں "نہیں"۔ ابن حزم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حواء، سارہ، ہاجرہ، ام موسیٰ، آسیہ اور مریم "علیہن السلام" یہ سب نبیات تھیں اور محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں اور دوسری طرف بھی بہت سے مشاہیر علمائے اسلام ہیں جن میں قاضی عیاض کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے

عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۴۲ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ

عورتوں پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ ۴۲

اے مریم! اب تو اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری میں مزید[۱۰۴] سرگرم ہو جا اور

سیدہ مریم رضی اللہ عنہا بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی۔ دلائل دونوں طرف موجود ہیں تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ (الملل والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ ج ۵ ص ۱۲ تا ۱۴)

کیا سیدہ مریم رضی اللہ عنہا نبی تھیں؟

پہلے سوال کے جواب کے بعد ہی اس سوال کا جواب ممکن ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں بحث نہیں کی اور نہ ہی مقام اس بحث کا متحمل ہے۔ ہاں! عورتوں کی نبوت کے انکار پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں خواہ اس کو کوئی کہے کیوں؟ اس لئے کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں اور جس مسئلہ میں اختلاف رائے موجود ہو اس کے متعلق جمہور کے اجماع کا لفظ صحیح نہیں۔ ہاں! قلت و کثرت رائے کی بات کی جا سکتی ہے کہ قلت کس طرف ہے اور کثرت کس طرف اور اب اس بحث کی یوں بھی کوئی ضرورت نہیں کہ اب جب کہ نبوت ختم ہو چکی اور کوئی مرد اب نبی نہیں ہو سکتا تو عورتوں کی تو بہرحال حیثیت ثانوی ہے وہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور گزشتہ نظریات کی نبی اعظم و آخر ﷺ کے بعد اشاعت کی چنداں ضرورت ہی نہیں اور یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ موضوع بحث بنایا جائے۔

وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ کا مطلب کیا ہے؟

جو بزرگ عورتوں کی نبوت کے قائل ہیں اور سیدہ مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں ان کے مسلک کے مطابق تو زیر نظر آیت کے اس ٹکڑے کا صاف مطلب ہے وہ یہ کہ سیدہ مریم کو تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر بھی کیونکہ وہ یعنی مریمؑ نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر بھی کیونکہ ان کے فضائل و کمالات قرآن و حدیث میں زیادہ تر بیان ہوئے ہیں۔

لیکن جن لوگوں نے عورتوں کی نبوت کا انکار کیا ہے اور مریم علیہا السلام کو بھی نبیہ نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ زیر نظر آیت کا جملہ "نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے اس لئے بلاشبہ حضرت مریمؑ کو بغیر کسی استثناء کے کائنات انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل کیلئے اس آیت میں

اختیار کی گئی ہے۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الدخان ۴۴ : ۳۲) "اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو ان کی حالت جانتے ہوئے دوسری قوموں پر ترجیح دی۔"

اور یہ بات بالاتفاق تسلیم ہے کہ بنی اسرائیل کی فضیلت "الْعٰلَمِيْنَ" سے ان کی معاصر امم و اقوام مراد ہیں کہ ان میں سے امت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

ہاں! یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ باب فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اسی طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسرے حقائے بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اس طرح اس کے برعکس بیان فضیلت کیلئے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیان حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقت شے نہیں بلکہ فضیلت شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اس طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیان حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعت بیان ازبس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہار فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشیں اور موثر ہو سکے۔

اس صورت میں "عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ" کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریم کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی بھی اس طرح سے تصدیق ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران واسیة امراة فرعون یعنی سابق امتوں میں سے مردوں نے تو بہت بڑے بڑے مقامات روحانی حاصل کئے ہیں مگر عورتوں میں سے بہت کم ہی ایسی عورتیں ہیں جن کی کمالیت ضرب المثل ہوئی ہے سوائے مریم بنت عمران اور آسیہ بی بی فرعون کے۔

سیدہ مریم کو مزید سرگرم عمل رہنے کی ہدایت

۱۰۴ سیدہ مریم بھی ان شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے متعلق لوگ مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ یہود مریم کے متعلق ان کے بچپنے کے متعلق تو بہت اچھے خیالات رکھتے تھے لیکن جب مریمؑ جوان ہوئیں تو یہود کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تسلیم نہ کی جا سکتی ہو کیونکہ سارے انبیاء کرام کے متعلق ان کی اپنی اپنی اقوام کے لوگ اچھے خیالات رکھتے تھے لیکن نبوت مل جانے کے بعد وہ لوگ جو

نہایت اچھے خیالات رکھنے والے ہوتے تھے اتنے ہی مخالف ہو جاتے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے برادری اور خاندان ہی کے لوگ نہیں بلکہ مکہ کے تمام لوگ آپ ﷺ کو "الامین" اور "الصادق" کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن نبوت کے بعد کیا ہوا؟ سب کو معلوم ہے اور اس طرح آپ ﷺ کے صحابہؓ و جاں نثاروں کا حال بھی یہی ہے۔ بالکل اسی طرح جب سیدہ مریم جوان ہو کر یہود کی عملی اور علمی خرابیوں کی اصلاح کرنے لگیں تو وہ ایسے مخالف ہوئے کہ طرح طرح کے الزامات لگانے لگے۔ دوسری طرف جن لوگوں یعنی نصاریٰ نے آپ کو برگزیدہ اور پاکباز سمجھا انہوں نے خدا کی ماں اور بعض نے اللہ کا ایک حصہ اور جز تک تسلیم کر لیا گویا یہود نے تفریط کی تو نصاریٰ نے بھی افراط میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

چنانچہ اس آیت بلکہ گزشتہ آیت میں بھی ان دونوں گروہوں کا ایک طریقہ سے رد کیا گیا۔ یہود کو صاف صاف بتا دیا کہ مریمؑ اللہ کی نیک کردار بندی اور اس کے منتخب شدہ انسانوں میں سے ایک انسان تھیں۔ لہٰذا تمہارے سارے الزامات و اتہامات خود تراشیدہ ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ تم خود بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو۔ جہاں یہود کو یہ بتایا گیا کہ آپ نہایت حد تک عبادت گزار اور اطاعت شعار خاتون تھیں وہاں نصرانیوں کو بھی یہ جتلا دیا گیا کہ مریم نعوذ باللہ نہ خدا کی ماں تھیں اور نہ ہی کوئی دیوی کہ ان کی پرستش کی جائے یا انہیں اللہ کے ساتھ شریک عبادت کیا جائے بلکہ ان کی ساری بزرگی و برگزیدگی تو بس یہ تھی کہ وہ اپنے مالک و مولیٰ کی نہایت ہی مخلص پرستار، فرمانبردار اور نہایت درجہ عبادت گزار و طاعت شعار تھیں۔ وہ ایک بندہ تھیں اور ایک بندہ کی ماں تھیں تم نے ان کو دیوی اور اوتار کیسے سمجھ لیا؟

فرمایا گیا اے مریم! تم اللہ کی فرمانبرداری میں مزید سرگرم عمل ہو جاؤ اس لئے کہ نیکی اور اچھائی کی کوئی حد مقرر نہیں کہ اس سے آگے نیکی نہ کی جا سکتی ہو۔ بھلائی میں جتنی زیادہ سعی و کوشش کی جائے اتنی ہی کم ہے کیونکہ اس زندگی کی مدت متعین ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ ؎

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
کہ بانگ بر آید کہ فلاں نہ ماند

یہ فرمانبرداری جس کی تم کو ہدایت کی جا رہی ہے یہ صرف اور صرف اپنے رب کی ہونی چاہئے اور یاد رکھو کہ سجدہ و رکوع کرو تو دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کیا کرو یعنی نماز باجماعت ادا کیا کرو۔ اور نماز میں لمبا قیام کیا کرو خصوصاً جب تم اکیلی نماز میں مصروف ہو اور اشارۃً یہ بات بھی سمجھا دی کہ کسی نیکی کا حکم صرف ان ہی لوگوں کو نہیں دیا جاتا جو پہلے نیکی نہ کرتے ہوں بلکہ نیکو کاروں کو مزید نیکی کا حکم کرتے رہنا بھی تبلیغ ہے۔ اس سے عیسائیوں کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ وہ جو نبی اکرم ﷺ کو کوئی حکم ہوتا ہے تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کے خلاف کیا تھا اس لئے یہ حکم ہوا کہ ایسا کرو۔ اس موقعہ پر ان کو اس

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا

رکوع و سجود کرنے والوں کے ساتھ تو بھی رکوع و سجود کرتی رہ۔ ۴۳
اے پیغمبر اسلامؐ یہ غیب[۱۰۵] کی خبریں ہیں جن کو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ یہ بات

طرح غور کرنا چاہئے کہ کیا مریم پہلے اللہ کی فرمانبردار اور عبادت گزار نہ تھیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے رب کی فرمانبردار رہو؟ حالانکہ بات دراصل یہ ہے کہ بعض اوقات مشکلات کے لحاظ سے ایک بات کی بار بار تاکید کی جاتی ہے جس سے مشکلات کا سامنا کرنے والے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا دل بڑھتا ہے اور ان مشکلات کا مزید ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے مریم علیہا السلام پر بھی بڑے ابتلاؤں کا وقت آنے والا تھا جو علم الٰہی میں موجود تھا اور اس طرح ہدایت فرما کر گویا اس وقت کیلئے ان کو تیار کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری میں مزید آگے بڑھو اور جب دل تنگ ہو تو اپنے مالک حقیقی کے سامنے گڑگڑاؤ کہ سارے دکھوں کا مداوا اسی میں ہے۔

یہ ساری خبریں ایسی ہیں جو آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہیں

[۱۰۵] غیب کیا ہے؟ غیب کا استعمال ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو حاسہ سے مخفی ہو یا انسان کے علم میں موجود نہ ہو۔ واقعات گزشتہ بھی اس لحاظ سے غیب ہو جاتے ہیں جب ان کا جاننے والا کوئی موجود نہ ہو۔ ہر وہ چیز جو پوشیدہ ہو نہ تو اس کے متعلق علم ہو اور نہ ہی وہ مشاہدہ میں آ رہی ہو غیب ہے۔ پھر جب اس کا علم حاصل ہو جائے اور وہ مشاہدہ میں آ جائے تو اب وہ غیب نہ رہی۔

تاریخی واقعات کو قرآن کریم نے "اَنْبَآءِ الْغَيْبِ" کہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب ان کا جاننے والا کوئی نہ رہا اور خصوصاً جب اس علاقہ کی بات بھی نہ ہو تو مزید اس کیلئے مشکل ہے کہ وہ جان جائے۔ جب تک کہ ان کو بتانے والا کوئی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اسلام! آپ ان باتوں کو نہیں جانتے جن کو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں اور اصل بات بھی یہی ہے کہ سیدہ مریم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق واقعات دنیا میں دوست و دشمن دونوں پر نہایت ہی غلط طور پر رواج پا گئے تھے اور قرآن کریم نے اصل واقعات پر عالم کو مطلع فرما کر واقعی ایک غیب پر سے پردہ اٹھایا ہے اور اس طرح سیدہ مریم اور حضرت مسیح علیہما السلام کی اصل حیثیت کو دنیا میں ظاہر فرمایا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے واقعات کو جو اس جہان کے بسنے والوں نے اس قدر گڈ مڈ کر دیئے ہوں اور ان کو سینکڑوں سال بھی گزر چکے ہوں تو ان کی اصلیت پر اطلاع پانا کسی عام انسان تو کیا کسی خاص انسان کا کام بھی نہیں تھا چہ جائیکہ عرب کا ایک امی ان اصل حالات کو ان واقعات کی جگہ سے بھی سینکڑوں میل دور بیٹھ کر کرتا۔ یہی بات دلیل ہے اس بات کی کہ ایسے واقعات اور وہ بھی ان الفاظ میں بیان کر دینا ایک رسول ہی کا کام ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے وحی پا کر بات کرتا ہو۔

كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ

تو بالکل واضح ہے کہ تم اس وقت ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب ہیکل کے مجاور اپنے اپنے قلم پھینک[۱۰۶] رہے تھے یعنی دلائل دے رہے تھے کہ کون مریم کا کفیل ہو اور

اصل انجیل جس میں خالص سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تھی وہ دنیا سے بالکل ناپید بلکہ نابود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بہت سی اناجیل لے چکی تھیں۔ جن میں سے بعض کو کلیسا نے بغیر کسی دلیل کے الہامی مان لیا اور بعض کو وضعی قرار دے کر رد کر دیا اور مسیح کو خدائی کا مرتبہ دے کر اس کے خون کے کفارہ کو نجات کا موجب قرار دیا۔ شریعت کو ایک لعنت قرار دیا اور اعمال کی ضرورت باقی نہ سمجھی۔ یہودیوں نے بوجہ اپنی عداوت کے جو ان کو مسیح کے ساتھ تھی کوئی بھی صحیح حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے باقی نہ رکھے تھے اور ان پر طرح طرح کے ناپاک الزام لگائے تھے۔ اس طرح اہل کتاب کے دونوں گروہ ایک شخص کے معاملہ میں اس طرح ساری حد بندیاں توڑ کر دور نکل چکے تھے اور کوئی صحیح علم سیدنا مسیح کے متعلق باقی نہ رہا تو اب سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ان واقعات کا صحیح علم دنیا پر دوبارہ نہ آسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیب ہی کی خبریں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی محمد رسول اللہ ﷺ پر ظاہر فرمائی اور آج دنیا آہستہ آہستہ اس بات کی قبولیت کی طرف چلی آتی ہے جس کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے ایک امی نے جو ایک ناخواندہ قوم میں سے تھا دنیا میں کیا۔ ﷺ

سیدہ مریم کی کفالت کا فیصلہ اول یا ثانی؟

۱۰۶ اے پیغمبر اسلام! آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ سیدہ مریم کی کفالت پر قلمیں ڈال رہے تھے یا اس وقت کہ جب وہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ سیدہ مریم کی کفالت کا فیصلہ ایک تو اس وقت ہوا تھا جب وہ پہلے پہل ہیکل میں لائی گئیں۔ آیا یہ اسی کفالت کا ذکر ہے یا یہ کوئی دوسری کفالت ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اسی کفالت کا ذکر ہے جب سیدہ مریم ہیکل میں لائی گئی تھیں جس کے فیصلہ پر سیدنا زکریا علیہ السلام کی کفالت میں دے دیا گیا تھا اور اس جگہ دوبارہ ضمناً اس کا ذکر کر دیا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کے نزدیک یہ اشارہ کسی ایسی کفالت کی طرف ہے جو سیدہ مریم کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد وقوع میں آئی۔ صاحب روح المعانی نے اس قول کو مرجوع کہا ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کو ترجیح دی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے اس واقعہ کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلے سیدہ مریم کی پیدائش کا ذکر کیا پھر اس کی کفالت زکریا علیہ السلام کا ذکر کیا اور پھر اس ذکر میں زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ علیہ السلام کی بشارت کا ذکر ضمناً آگیا۔ اس کے بعد اصل ذکر کی طرف رجوع کیا تو مریم

کے اصطفاء و پاکیزگی اور برگزیدگی کا ذکر آیا تو اس کو مزید فرمانبرداری اور نماز کے قائم کرنے کا حکم دیا اور یہ واقعات یقیناً زمانہ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس کے بعد پھر ایک گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بلاغت قرآن کے خلاف ہے۔ پس یہ آیت یقیناً اس وقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مریم صدیقہ سن رشد کو پہنچ چکی تھیں اور ان کی تربیت کا زمانہ گویا گزر چکا اور اب ضرورت پیش آئی کہ ان کی کفالت کی ذمہ داری مزید کسی کے سپرد کی جائے کیونکہ اب وہ ہیکل کے حجرہ میں مستقل رہنے کے دن ختم کر چکی ہیں یعنی عورتوں کی بلوغت میں جو خاص اذیت کے دن ہوتے ہیں وہ ہیکل میں نہیں گزار سکتی تھیں۔ پس جہاں جس کفالت کا ذکر ہے وہ کفالت نکاح ہے۔

چونکہ یہود کے ہاں رواج تھا کہ وہ اس طرح کے تمام امور کا فیصلہ قرعہ اندازی پر کیا کرتے تھے اور اس قرعہ کا جو طریقہ بھی ان کے ہاں رواج پا چکا تھا جس کی مختلف اشکال کا تذکرہ مفسرین نے اپنی اپنی تفاسیر میں کیا ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ قلم کی جمع اقلام ہے جو اس تیر کا نام ہے جو اس طرح کے کاموں کیلئے انہوں نے بنا رکھا تھا اور قلم تیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ کاٹا جاتا ہے اور قلم کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں اور اسی وجہ سے مفسرین نے "اقلام" سے مراد "قداح" یعنی قرعہ اندازی کے تیر ہی لئے ہیں اور بعض نے وہ قلمیں مراد لی ہیں جن سے کاہن لوگ لکھا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "سبق القضاء و جفت الاقلام" یعنی قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا اور قلمیں خشک ہو چکیں جس کا مطلب واضح ہے کہ جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا اس لئے لوح و قلم سے بغیر کسی تشبیہ کے مراد قضا و قدر ہے۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ آپ ﷺ اس وقت ان کے پاس نہ تھے تو اس میں یا تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مریم علیہا السلام کی بریت کی شہادت ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جس کا تعلق کم از کم فریق مقدمہ سے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہایت ہی سچی بے لوث شہادت ہے یا اس لحاظ سے کہ وہ واقعات آپ ﷺ کے ذریعہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں جن کا علم دنیا میں مفقود ہو چکا تھا تو تم ان کے پاس تو نہ تھے پس یہ علم غیب سوائے اللہ کی ذات کے کون ظاہر کر سکتا تھا؟ یعنی کوئی بھی ظاہر نہیں کر سکتا اور وہی ہے جو آپ پر وحی کے ذریعے ان خبروں کو پہنچا رہا ہے اور وہی ہے جو آسمان و زمین کی ساری چیزوں کو جانتا ہے۔" (۶۴ : ۴) اور "زمین و آسمان میں ایک ذرے کے برابر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔" (۳۴ : ۳) "جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں سے باہر آتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے سب اسی کو معلوم ہے۔" (۵۷ : ۴) "غیب کی کنجیاں تو بس اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا غیب کا علم نہیں رکھتا۔" (۶ : ۵۹) "زمین و آسمان کے تمام غیب اسی کے پاس ہیں۔" (۱۱ : ۲۳)' (۱۶ : ۷۷) "قیامت کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی۔" (۷ : ۱۸۷) (۴۳ : ۸۵)

لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾ إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ

تم اس وقت بھی موجود نہ تھے جب وہ آپس میں مریم کی کفالت پر جھگڑ رہے تھے۔ ۴۴

پھر اس وقت کا ذکر کرو جب فرشتوں نے کہا تھا۔ اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام[۱۰۷] کی

سیدہ مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے لڑکے کی بشارت دی

۱۰۷ سیدہ مریم ہیکل کی کفالت اول سے نکل کر کفالت ثانی میں داخل ہو چکی تھیں ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ایک جماعت کو اپنے کلام کے ذریعے ایک لڑکے کی بشارت دے کر بھیجا اور ساتھ ہی اس ہونے والے لڑکے کا لقب اور نام بھی تجویز فرما دیا اور اس ہونے والے بچے کی کنیت بھی مقرر فرما دی فرمایا کہ اس ہونے والے لڑکے کا لقب مسیح' نام عیسیٰ اور کنیت ابن مریم رکھی گئی ہے اور وہ انہی ناموں سے یاد کیا جائے گا۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے اس بچے کی جو سیدہ مریمؑ کے ہاں جنم لینے والا تھا۔ گویا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ان مبارک بچوں میں سے ایک تھے جن کے متعلق ان کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی تھی جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خبر دی تھی بلکہ اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہی ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی خبر دی اور اس کا نام بھی رکھ دیا گیا کہ اسحٰق علیہ السلام کے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو بیٹے کی خوشخبری دی اور اس کی زندگی بچانے کی اطلاع دے کر باقاعدہ اس کیلئے ایک پروگرام مرتب کر کے موسیٰ کی والدہ کو سمجھا دیا اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی خبر سیدہ مریم کو دے کر اس کا لقب' نام اور کنیت بھی رکھ دی۔

قرآن کریم میں اس ہونے والے لڑکے یعنی مسیح علیہ السلام کو "إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ" کہا گیا ہے اور ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تجھے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے" اس لحاظ سے گویا سیدنا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے۔ پھر عیسائیوں کا اس پر بہت زور ہے کہ مسیح علیہ السلام کو "کلمہ" کہہ کر قرآن کریم نے ایک ایسی خصوصیت دے دی ہے جو دوسرے نبی کو نہیں دی گئی۔ پھر اس خصوصیت کو بنیاد بنا کر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے۔ کبھی خدا کا بیٹا اور خدا کا ایک تیسرا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو ہم مسلمانوں کے ہاں مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو "بن باپ" ثابت کرنے کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کی اور یہی وہ دلیل ہے جو آج بھی عیسائی قرآن کریم سے مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

وفد نجران کا سوال اور نبی کریم ﷺ کے جواب کی تفصیل "عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ ابن مریم" نامی کتاب میں مل جائے گی اور اسی طرح ہم مسلمانوں کے ہاں مسیح علیہ السلام کی "بن باپ" پیدائش کے متعلق

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

کے ذریعے ایک لڑکے کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا اور مریم کا بیٹا کہلائے

بھی وہیں ذکر کیا گیا ہے وہاں سے ملاحظہ فرمالیں۔ اس جگہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ مسیح علیہ السلام کو "کلمة من اللہ" کہا گیا ہے اور کسی دوسرے نبی کا نام لے کر اس کے ساتھ "کلمة اللہ" کا لفظ نہیں بولا گیا تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہوتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتے ہیں۔ اگر یہ دعویٰ ہے تو آخر اس کی دلیل کیا ہے؟ کوئی دلیل نہیں تو کیونکر صرف اسی خصوصیت سے مسیح علیہ السلام دائرہ بشریت سے نکل کر خدا بن جاتے ہیں؟ جب کہ قرآن کریم میں مسیح علیہ السلام کو "کلمة منه" کہا ہے یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ جس سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ اکیلا ہی "کلمہ" نہیں بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمات کے متعلق قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا "قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي" (الکھف ۱۸ : ۱۰۹) "اے پیغمبر اسلام! اعلان کر دیجئے کہ اگر میرے رب کے کلمات لکھنے کیلئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سب سمندروں کا پانی جو سیاہی بن چکا ہے وہ ختم ہو جائے گا مگر میرے رب کے کلمات نہ ختم ہوں گے اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کیلئے ایسے ہی اور سمندر بھی پیدا کر دیں جب بھی وہ کفایت نہ کریں۔"

پھر یہ جو زور دے دے کر کہا جاتا ہے کہ صرف کلمہ ہی نہیں کہا بلکہ "کلمة منه" کہا یعنی "منه" کہہ کر اس کلمہ کو اللہ تعالیٰ سے ہونے کا شرف عطا فرمایا گیا ہے۔ ہاں! تو مسیح علیہ السلام کے اس اعزاز سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے یہ بات جو بیان کی گئی ہے کہ اس سے "اللہ سے ہونا" قرار پاتا ہے یہ کہاں تک صحیح ہے قرآن کریم ہی سے پوچھ لیتے ہیں تاکہ قرآن کریم کے الفاظ کیلئے کم از کم باہر کی مدد کی ضرورت نہ رہے اور جو مطلب اس جگہ لیا جائے وہی اس جگہ بھی لے لیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ۴۵ : ۱۳) "اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ سارے کا سارا تمہارے لئے اس نے مسخر کر دیا ہے اپنی طرف سے۔"

اگر "كَلِمَةً مِّنْهُ" کا اللہ سے ہونا نکلتا ہے تو اس آیت سے یعنی الجاثیہ کی آیت ۱۳ سے "جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب کا سب اس سے ہونا" ثابت ہوگا۔

حالانکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ جس طرح آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا خالق اللہ ہے اس سے ثابت ہوتا ہے بالکل اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے سیدنا مسیح علیہ السلام بھی اسی طرح اللہ کی مخلوق اور بندہ ہیں جس طرح دنیا کی ہر چیز اللہ ہی کی مخلوق ہے۔ اور جس طرح دوسرے انسان اللہ نے پیدا کئے ہیں اسی طرح سیدنا مسیحؑ کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ہاں! جس طرح دوسرے بہت سے انسانوں کو اللہ نے نبی و

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ

گا۔ وہ دنیا و آخرت دونوں میں ارجمند[۱۰۸] ہوگا۔ ۴۵
اور بچپنے اور ادھیڑ عمر میں یکساں طور پر نبوت کا کلام کرے گا[۱۰۹]

رسول بنایا تھا اسی طرح مسیح علیہ السلام کو بھی نبی و رسول بنایا تھا۔

مسیح علیہ السلام کے متعلق بشارت تھی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی ہوں گے

۱۰۸ مسیح علیہ السلام کے اس لقب "مسیح" میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنا نبوت کا ہاتھ پھیر کر لوگوں کی بد رسومات کا خاتمہ کریں گے اور نام "عیسیٰ" سے بھی اسم بامسمیٰ ہوں گے کہ بہت سے علاقہ میں سیرو سیاحت کرتے اور نبوت کا پیغام پہنچاتے جائیں گے اور یہ دونوں باتیں بھی تورات و انجیل سے ثابت ہوتی ہیں اور خود قرآن کریم میں بھی اس کی تصریحات پائی جاتی ہیں۔

وجیہ کے معنی ہیں "ذوجاھة" یعنی عزت و مرتبہ والا اور بلند مقام و وجاہت والا ہوگا۔ جو کبھی ذلیل و رسوا نہیں ہوگا۔ جدھر جائے گا ضرور عزت و تکریم پائے گا۔ اس جگہ ان کے ذکر کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ یہود و نصاریٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی بہت خراب طریقوں سے گزرتی ہوئی بتائی تھی قرآن کریم نے ان کا رد فرما دیا کہ یہ سب تمہاری اپنی اختراع ہے وہ تو پیدا ہونے سے بھی پہلے عزت و وجاہت والا بتایا گیا تھا اور اس دنیا میں بھی اس نے ایک بلند مقام حاصل کیا۔ ہاں! اس کی مخالفت ضرور ہوئی لیکن ان ساری مخالفتوں کے باوجود اس نے ایک بہت بلند مقام پایا۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ کسی انسان کی جتنی زیادہ مخالفیں ہوں گی اس کا کردار اتنا ہی نکھرتا چلا جائے گا۔ جس طرح سونا بھٹی میں ڈالنے سے مزید کھرا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر جو میل کچیل ہوتی ہے وہ ساری کی ساری جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ سچے انسان کی مخالفتیں اس کی سچائی میں مزید نکھار پیدا کر دیتی ہیں۔ انبیاء کرام تو مجسمہ سچائی ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی مخالفت کرنے والے بھسم ہوگئے لیکن انبیاء کرام کی سچائی کی داستانیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں اور اب بھی ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گی۔

یہ تو دنیا کا حال تھا کہ ان کی سچائی کا نور چمکتا رہا۔ چمکتا ہے اور چمکتا رہے گا اور رہا آخرت کا معاملہ سو اس کے متعلق بھی ارشاد فرما دیا کہ "وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ" اور آخرت میں بھی یقیناً وہ مقربوں میں سے ہوں گے۔ اور انبیائے کرام تو سارے ہی مقرب ہوتے ہیں لیکن امت محمدیہ کے ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت سے نوازا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے "وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ" (الواقعہ) اور ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا: "عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ" (التطفیف) نبی اعظم و آخر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت

پر پہلے پہلے ایمان لانے والے سارے کے سارے لوگ مقرب الٰہی ہیں۔ قرآن کریم نے یہ اعزاز ان لوگوں کو بھی نوازش کر دیا جو بعثت نبوی ﷺ کا سنتے ہی ایمان لے آئے اور یہ بشارت تھی جو ان نیک نفوس کو دنیا ہی میں سنا دی گئی۔

پھر اخروی وجاہت کے ساتھ جو دنیوی وجاہت بھی عطا فرمائی جانے کا وعدہ فرمایا تھا جیسا کہ پیچھے گزر چکا وہ بھی حرف بھی حرف پورا ہوا کیونکہ دنیوی وجاہت میں خاندان کی عزت و ناموس کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت سے کون واقف نہیں؟ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ سب ہی آپ کی دنیوی عزت و وجاہت کے قائل ہیں اور اس طرح سیدنا داؤد علیہ السلام کی عزت و ناموس کون نہیں جانتا؟ یہود و نصاریٰ دونوں ہی گروہ زبور کے ثنا خوان ہیں اور داؤد علیہ السلام کی نبوت کو بھی مانتے اور تسلیم کرتے ہیں اور سیدنا مسیح علیہ السلام کا حسب نسب بھی داؤد علیہ السلام کے واسطے سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے مل جاتا ہے چنانچہ اناجیل میں ہے کہ "یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہیم" اور اس طرح لوقا اور متی کے نسب ناموں میں اس کی وضاحت موجود ہے اور مسلمانوں کے ہاں بھی سیدنا مسیح علیہ السلام ذریت ابراہیم میں شمار کئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے۔

"اور ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی ہم اس طرح نیک کرداروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی کہ یہ سب ہی نیک انسان تھے۔" (الانعام ۶ : ۸۴)

اس طرح قرآن کریم کی زبان میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام "ذریۃ طیبۃ" اور "غلام زکیا" کے الفاظ سے یاد کئے گئے ہیں ان الفاظ سے بھی آپ کی دنیوی وجاہت اور خاندانی عزت و تکریم ہی کی طرف اشارات ہیں کیونکہ دنیوی حالات کے مطابق بھی جس شخص کے ماں باپ بلکہ باپ دادا اوپر تک عزت و شرف کے مالک ہوں ان کی پہچان بہت آسان ہوتی ہے اور اس طرح ہر کس و ناکس ان کی عزت و تکریم پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے سارے انبیاء کرام اپنے اپنے وقت میں حسب و نسب کے لحاظ سے مشہور و معروف اور جانے پہچانے انسان ہوتے تھے۔ بلکہ یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ نبی کی اصل و نسل میں کفر و شرک تو ہو سکتے ہیں جن کی امثال موجود ہیں لیکن حسب و نسب میں دنیوی عزت و شرف اور جان پہچان اچھی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں جن انبیاء کرام کا تذکرہ موجود ہے تقریباً سب ہی میں یہ پہلو نظر آتا ہے کیونکہ ان کے حسب و نسب میں کسی مخالف سے مخالف آدمی نے بھی انگشت زنی نہیں کی۔ اگر کسی بد طینت نے کہیں زبان کھولی بھی ہے تو الٰہی قانون نے اس کی زبان کو فوراً کھینچ لیا ہے اور ایسا جواب دیا کہ وہ انگشت بدنداں رہ گیا ہے۔

بشارت عیسیٰ علیہ السلام ہی میں ان کی عمر کی بھی رجسٹری کر دی گئی

۱۰۹ سیدہ مریم علیہ السلام کو جس بچہ کی بشارت دی جا رہی ہے اس کے لقب' نام اور کنیت کے ساتھ اس کی صفت کو ملا دیا گیا اور اس کی عمر کی بھی قانون الٰہی نے رجسٹری کر دی تاکہ مریم علیہ السلام اپنے ہونے والے بچے کے سارے پہلوؤں سے واقف ہو جائیں۔ اور جہاں جہاں جیسے جیسے خطرات ہوں ان کا دفاع بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہے تاکہ انسانی سعی و کوشش کے قانون الٰہی کی پابندی بھی ساتھ ساتھ کی جا سکے۔

فرمایا تیرا موعود بیٹا اپنے بچپنے ہی میں نبوت کے کلام سے سرفراز کر دیا جائے گا اس کو چالیس سال تک کی مدت کا انتظار نہیں کرنا ہوگا اور پھر یہ بھی کہ اس کے بچپنے اور ادھیڑ عمر کی باتوں میں کوئی تناقض نہیں ہوگا کیونکہ اس کی زبان ایک عام انسان کی زبان نہیں ہوگی بلکہ ہوش سنبھالتے ہی وہ لسان الٰہی کا ترجمان نظر آئے گا اور دنیا گواہ ہے کہ بالکل ایسا ہی ہوا۔

"اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے مطابق یروشلم کو گئے۔ جب وہ ان دونوں کو پورا کر کے لوٹے تو وہ لڑکا یسوع یروشلم میں رہ گیا اور اس کے ماں باپ کو خبر نہ ہوئی۔ مگر وہ یہ سمجھ کر کہ وہ قافلہ میں ہے ایک منزل نکل گئے۔ اور اس کو اپنے رشتہ داروں اور جان پہچان والوں میں ڈھونڈنے لگے۔ جب نہ ملا تو اسے ڈھونڈتے ہوئے یروشلم تک واپس آگئے اور تین روز کے بعد ایسا ہوا کہ انہوں نے اسے ہیکل میں استادوں کے بیچ میں بیٹھے ان کی سنتے اور ان سے سوال کرتے ہوئے پایا۔ اور جتنے اس کی سن رہے تھے اس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اس سے کہا بیٹا! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔ اس نے ان سے کہا تم مجھے کیوں ڈھونڈتے تھے؟ کیا تم کو معلوم نہ تھا کہ مجھے اپنے باپ کے ہاں ہونا ضروری ہے؟ مگر جو بات اس نے کہی اسے وہ نہ سمجھے۔ اور وہ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ناصرہ آیا اور ان کے تابع رہا اور اس کی ماں نے یہ سب باتیں اپنے دل میں رکھیں۔" (لوقا باب ۲ درس ۴۰ تا ۵۰)

یہ صرف ایک حوالہ ہے جو انجیل ہی سے لیا گیا ہے۔ غور سے پڑھو اور ساتھ ہی قرآن کریم کی وہ پیش گوئی بھی دیکھو جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ پر نازل فرمائی ہے کہ "اے مریم تیرا یہ بیٹا بچپنے اور ادھیڑ عمر میں یکساں طور پر نبوت کا کلام کرے گا۔" کس طرح صحیح ثابت ہو رہی ہے اور ان دونوں کلاموں میں چھ سات ہو سالوں کا وقفہ پایا گیا ہے۔

"وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا" یہ الفاظ تو اس بشارت کے ہیں جو سیدہ مریم علیہا السلام کو دی گئی تھی اور جو حرف بہ حرف پوری بھی ہوئی اس جگہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ جو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ "وہ لوگوں سے باتیں کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی" پھر گہوارہ سے مراد "جھولا" اور عمر کے

فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ
لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا

نیز اللہ کے حضور پہنچا ہوا اور اس کے بندوں میں سے ایک صالح انسان[۱۱۰] ہوگا۔ ۴۶
مریم نے یہ بشارت سنی تو کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیوں کر[۱۱۱] ہوگا؟ جب
کہ مرد یعنی خاوند نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا (اور تو خوب جانتا ہے کہ بدکار میں نہیں)
ارشاد الٰہی ہوا یہ بات اسی طرح ہے اللہ تیری روک دور کر دے گا اللہ جو چاہتا ہے پیدا

لحاظ سے ایک دو دن یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شیر خوارگی میں باتیں کریں گے۔ حالانکہ صاف صاف مطلب اس کا یہی نکلتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں جس زمانہ میں عام بچے کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں وہ اس مدت عمر میں کھیل کود میں بھی نہیں مصروف ہوں گے بلکہ بڑی عمر کے لوگوں کی طرح پختہ اور وزنی باتیں کریں گے ایسی پختہ اور وزنی باتیں جو سارے لوگ بڑی عمر میں بھی پہنچ کر نہیں کر سکتے بلکہ یوں کہوں کہ ان کے یہ بچپنے کی عمر اور پختہ عمر دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔

ویسے سارے بچے عموماً جھولے ہی میں باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو تین سال کی عمر تک جھولے میں ہی ان کو عموماً رکھا جاتا ہے لیکن سیدنا مسیح علیہ السلام کے متعلق جو یہ الفاظ بیان ہوئے ہیں تو ان سے مراد اکثر یہ لی جاتی ہے کہ آپ کا بچپن میں باتیں کرنا معجزہ تھا۔ انبیاء کرام کے معجزات کا انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا کیونکہ معجزہ اور نبوت تو لازم و ملزوم ہیں کیونکہ نبوت آخر تھی ہی کیا چیز؟ جواب بالکل واضح ہے کہ معجزہ۔ کیونکہ انبیائے کرام کی زبانوں سے ان باتوں کا اظہار اور اعلان جو بعد میں ہونے والی تھیں اور پھر ان باتوں کا بالکل اس طرح ہونا جس طرح انبیاء کرام نے ان کے ہونے کا اعلان کیا سب معجزات سے بڑا معجزہ ہے۔ مسیح علیہ السلام کا یہ کلام بھی تب ہی معجزہ ہوا جب آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے کام کے لے چن لئے گئے۔ اگرچہ یہ زمانہ عام بچوں کی عمر کے لحاظ سے ابھی کھیل کود کا زمانہ تھا۔ اور اب تو مہد اولیٰ اور مہد ثانی کے الفاظ بھی عام ہیں جو ہر کس و ناکس کی زبان پر جاری ہیں پھر اس ضد کا فائدہ؟

قرآن کریم نے وہ کلام بھی جو آپ نے بچپنے میں کیا مختلف مقامات پر درج کیا ہے۔ وہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ جب یہ کلام آپ نے کیا اس وقت آپ نبوت کے پیغام سے سرفراز فرما دیئے گئے تھے۔ جو کلام آپ نے کیا اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ وہ کلام کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ "میں اللہ کا بندوں ہوں۔ مجھے کتاب دی گئی ہے۔ مجھے نبی بنایا گیا ہے۔ اور مجھے بابرکت بنایا گیا ہے جہاں

کہیں بھی میں جاؤں۔ مجھے نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ زکوٰۃ ادا کروں۔ والدہ ماجدہ سے نیکی کا بھی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں نیکی کرتا رہوں۔" (مریم ۱۹: ۳۰، ۳۱)

اللہ کے نیک بندوں میں سے ایک بندہ ہونے کی بشارت

۱۱۰ قرآن کریم نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے بھی پہلے آپ کی شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کر دیا تاکہ مسیح علیہ السلام کی انسانیت کا کوئی پہلو بھی اندھیرے میں نہ رہے کیوں؟ اس لئے کہ علم الٰہی میں موجود تھا کہ لوگ ان کی ذات میں کس کس طرف سے غلو کرنے والے ہیں۔ یہود ان میں کیا تفریط کریں گے اور عیسائی ان کے متعلق کس افراط میں مبتلا ہوں گے اور دوسری قومیں ان کو کیا کیا کہیں گی۔ اس لئے ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پوری طرح وضاحت سے بیان کر دیا گیا۔ اس آیت میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ایک "پاکباز انسان" ہونے کا فرمایا جا رہا ہے اور یہ تو ان کی پیدائش سے بھی پہلے اعلان کیا تھا جب وہ دنیا میں تشریف لائے تو ان کی زبان سے بھی بالکل اسی طرح کا اعلان کرایا "قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ" "عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"مسیحؑ کو ہرگز اس بات میں عار نہیں کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے اور نہ ہی خدا کے مقرب فرشتوں کو اس بات سے ننگ و عار ہے جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گھمنڈ کرے تو وہ گھمنڈ کر کے آخر جائے گا کہاں؟ وہ وقت دور نہیں کہ خدا سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔" (النساء ۴: ۱۷۲)

یہودیوں کی باتوں کو فی الحال چھوڑ دو کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم ہی نہ کیا لیکن جن لوگوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانا اور نصاریٰ کہلائے انہوں نے جو مسیح علیہ السلام کے متعلق عقائد و نظریات گھڑے ان میں سے صرف ایک عقیدہ یا نظریہ کا اس جگہ جائزہ لو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جب کوئی قوم کسی نظریہ کو اپنا لیتی ہے تو وہ کس طرح اس پر پختگی سے قائم ہو جاتی ہے اور پھر اس کو چاہے جتنے دلائل پیش کرو وہ کبھی ان دلائل کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے متعلق ایک عقیدہ تراش لیا کہ وہ انسان یعنی بشر نہیں بلکہ بشر سے ماوراء کوئی چیز ہیں۔ پھر وہ چیز کیا ہیں؟ کچھ نے کہا کہ وہ اللہ ہیں۔ کچھ نے کہا کہ وہ تین اقنوم میں سے ایک اقنوم ہیں اور یہ تین اقنوم مل کر یعنی اتحاد ثلاثہ کا نام اللہ ہے اور کچھ نے کہا نہیں وہ اللہ کا بیٹا ہیں۔

بنی اسرائیل کا وہ گروہ جس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو "اللہ" مانا تھا ان کی تردید قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی۔ ارشاد الٰہی ہوا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدہ ۵: ۱۷، ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا اللہ مریم کا بیٹا مسیحؑ ہے۔"

پھر سورہ مائدہ کی آیت سترہ کے اس نظریہ کفر کا ان کو اس طرح جواب دیا کہ : قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ

مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (المائدہ ۵ : ۱۷)

"اے پیغمبر اسلام! تم ان لوگوں سے کہو یہ کیسی بے عقلی کی بات ہے جو تم کہتے ہو؟ اگر اللہ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور اتنا ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر جتنے انسان بستے ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کو روک سکتا ہے؟"

اور سورہ مائدہ کی آیت ۷۲ کے اس نظریہ کفر کا ان کو مسیح علیہ السلام کی زبان میں اس طرح جواب دیا کہ:

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (المائدہ ۵ : ۷۲) "اور مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے! بلاشبہ جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا تو اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی۔ اس کا ٹھکانہ آتش دوزخ ہوا اور ظلم کرنے والوں کیلئے کوئی نہیں جو مددگار ہوگا۔" بنی اسرائیل کا وہ گروہ جس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو "اتحاد ثلاثہ" میں سے ایک اقنوم مانا تھا ان کی تردید قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمائی:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ ۵ : ۷۳) "یقیناً وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا "اللہ تین میں کا ایک ہے" یعنی باپ' بیٹا اور روح القدس" ایک اللہ دوسرا مسیح اور تیسرا جبرئیل۔

پھر ساتھ ہی ان کو اس طرح جواب بھی دے دیا۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (المائدہ ۵ : ۷۳) "حالانکہ کوئی معبود نہیں مگر وہی معبود یگانہ! اور دیکھو جو کچھ یہ کہتے ہیں اگر اس سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار حق کیا ہے انہیں عذاب دردناک پیش آئے گا۔"

اور ایک جگہ اس طرح ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء ۴ : ۱۷۱)

"اور یہ بات نہ کہو کہ اللہ وہ تین ہے۔ دیکھو' ایسی بات کہنے سے باز آجاؤ کہ تمہارے لئے بہتری ہو۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ ہی اکیلا معبود ہے۔ وہ اس سے بھی پاک ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔"

بنی اسرائیل کا وہ گروہ جس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" مانا تھا ان کی تردید اللہ نے قرآن کریم میں فرما دی۔

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○ (التوبہ ۹ : ۳۰) "عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبان سے نکلی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی انہی کی سی بات کہی جو ان سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں ان پر اللہ کی لعنت! یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (البقرہ ۲ : ۱۱۶) "اور عیسائیوں کو دیکھو انہوں نے کہا اللہ نے مسیح کو اپنا بیٹا بنایا۔ حالانکہ ذات الٰہ اس سے پاک ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کا ہے اور سب ہی اس کے فرمان کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔" ان کے رد میں ایک جگہ اس طرح ارشاد فرمایا کہ :

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (الانعام ۶ : ۱۰۱) "وہ آسمان و زمین کا موجد ہے بغیر میٹریل کے پیدا کرنے والا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو؟ جب کہ کوئی اس کی بیوی نہیں ہے۔"

غور کرو بنی اسرائیل کے ان تین گروہوں کے اس عقیدہ کفریہ کا اللہ تعالیٰ نے کتنے واضح اور صاف الفاظ میں رد کیا ان کے اس باطل عقیدہ پر ان سے دلیل طلب کی لیکن ان تینوں ہی نے اپنے عقیدہ کو مزید پختہ کرنے کیلئے نئے نئے طریقے اختیار کئے تاہم وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے اور نہ ہی اپنے اس عقیدہ کفریہ سے توبہ کی۔ عیسائیوں کی ان جماعتوں میں کیا کوئی علم رکھنے والا نہیں؟ ان میں کوئی ایک بھی سمجھ دار انسان نہیں؟ انہوں نے زمین و آسمان اور اس کی فضا میں کیا ہل چل مچا دی کیا کبھی انہوں نے اپنے ان عقائد پر نظر ثانی کرنے کی کوشش کی؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ جب کوئی قوم کسی نظریہ و عقیدہ کو مان لیتی ہے وہ خواہ کتنا ہی لچر اور بیہودہ کیوں نہ ہو اس کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتی اور اس جماعت کے علماء کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوم کے نظریات کی ترجمانی کرتے رہیں اور ان نامعقول نظریات کو معقول بناتے رہیں جس طرح عیسائی پادریوں نے تین کو ایک اور ایک کو تین بنایا۔

سیدہ مریم نے اس موعود لڑکے کی بشارت پر تعجب کیا؟ آخر کیوں؟

۱۱۱ قبل اس کے کہ اس بات کا جواب دیا جائے کہ سیدہ مریم علیہ السلام بیٹے کی بشارت سن کر متعجب کیوں ہوئیں؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا سیدہ مریم علیہ السلام بیٹے کی بشارت سن کر ملول خاطر ہوئیں؟ ہرگز نہیں اس بات کی نفی خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مبین میں کر دی۔ کیونکہ یہ صرف بیٹا دیئے جانے کی خبر نہیں تھی بلکہ بشارت یا خوشخبری تھی۔ ظاہر ہے کہ خوشخبری اور بشارت کسی انسان کو بھی ملول خاطر نہیں کرتی بلکہ جس بات کو سن کر آدمی کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور دل خوش ہوتا ہے نفس و سرور رگ رگ میں دوڑ جاتا ہے اس کو بشارت یا خوشخبری کا نام دیا جاتا ہے۔

آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا زکریا علیہ السلام نے بیٹے اور وہ بھی صالح بیٹے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ ان کی دعا کبھی رد نہ ہوگی۔ پھر زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی خوشخبری ملی اگرچہ وہ چند سالوں کے بعد ملی ہوگی تاہم اس وقت آپ کا خیال اس طرف گیا کہ اس قدر رکاوٹ کے باوجود کہ

میں بوڑھا ہوا جا رہا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے بچہ کب ہوگا یا کس طرح ہوگا؟ بالکل اس طرح سیدہ مریم علیہ السلام کو جب بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو وہ تعجب کرتی ہیں کہ بچہ کب ہوگا یا کس طرح ہوگا؟ کہ ابھی تک مرد یعنی خاوند کے ساتھ تو تعلق پیدا ہی نہیں ہوا۔ دیکھو' اللہ نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے یا جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے پھر فرمایا "اللہ تعالیٰ جس بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" پھر جیسا کہ وہ چاہتا ہے ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔" اس ایک ہی جملہ سے سیدہ مریم کا تعجب دور ہوگیا۔ اور بالکل یہی ہوا کہ جو روک سیدنا زکریا علیہ السلام کو حائل تھی وہ دور کر دی گئی اور اسی طرح جو روک سیدہ مریم علیہا السلام کو تھی وہ بھی اللہ نے دور فرما دی۔ اور اس کا ثبوت یہی ہے کہ زکریا علیہ السلام کے ہاں یحییٰ تولد ہوگئے اور سیدہ مریم کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوگئی۔ مبارک ہیں زکریاؑ جن کو یحییٰؑ جیسا فرزند ارجمند نصیب ہوا اور اس طرح مبارک ہیں مریمؑ جن کو عیسیٰؑ جیسا بیٹا عطا کیا گیا اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا اور دونوں ہی میں یہ خصوصیت بھی رکھ دی کہ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی عمروں کے مقابلہ میں ان کو پہلے ہی نبوت سے نوازا گیا۔ گویا کم عمری کی فضیلت دوسرے انبیاء کرام کی نسبت ان میں زیادہ تھی اور مجموعی طور پر سارے انبیاء کرام پر نبی اعظم و آخر ﷺ کی فضیلت اعلیٰ و ارفع ہے۔

قوم بنی اسرائیل میں عیسائی سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش "بن باپ" مانتے ہیں اور ہم مسلمان بھی عموماً ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ ہاں! عیسائیوں کا بن باپ ماننا بھی بڑے عجیب طریقہ سے ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا لیکن بعض عیسائی بن باپ تسلیم نہیں کرتے اور اس طرح مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایسا نہیں مانتے۔ ہاں! فی الواقع اگر مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو مسلمانوں کے عقیدہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی عقائد کا نہیں بلکہ نظریاتی ہے لیکن اگر ایسا مان لیا جائے مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو عیسائیت کی ساری عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے کیوں؟ اس لئے کہ موجودہ عیسائیت کے بنیادی عقائد ہی یہ ہیں :

۱۔ مسیح بن باپ اس لئے ہیں کہ مریم روح القدس سے حاملہ ہوئی تھیں۔

۲۔ مسیح بن باپ پیدا ہونے میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ وہ گنہگار انسانوں کی آمیزش سے پاک اور بے گناہ ہوں۔

۳۔ مسیح بن باپ پیدا ہو کر گناہوں سے پاک و صاف ہوگئے اور اس طرح وہ گناہ گار انسانوں کی طرف سے کفارہ ہوگئے گویا جس نے صلیب کو مان لیا جس پر مسیح لٹکائے گئے تھے تو صلیب کے مانتے ہی انسان گناہوں سے پاک و صاف ہوگیا۔

۴۔ مسیح بن باپ پیدا ہوئے تھے اس لئے وہ اللہ کے بیٹے کہلائے اور جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہوتا ہے مسیح اللہ کے وارث ہو کر الوہیت میں داخل ہوگئے۔ کیونکہ باپ بیٹے کا جزو ہوتا ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔

لیکن مسلمان ان ساری باتوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں مانتے اور نہ ہی یہ باتیں اپنی کوئی اصل رکھتی ہیں بلکہ یہ سب کی سب فرض کر لی گئی ہیں اور ان فرضی مفروضوں پر عیسائیت بحیثیت مذہب قائم ہے۔ جس کا وجود نہ تورات میں ہے اور نہ ہی انجیل میں ہے۔

عیسائیوں کا مسیح علیہ السلام کو بن باپ ماننا کس طرح ہے؟

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق اناجیل میں اس طرح تحریر ہے۔

"اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھا ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ رہا تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا اے یوسف ابن داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ اس کے بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔" (متی باب اول ۱۸ تا ۲۰)

"جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا۔ جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اسی کنواری کا نام مریم تھا۔" (لوقا باب اول درس ۲۶، ۲۷)

"فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا اور اس کا نام یسوع رکھنا۔" (لوقا باب اول ورس ۳۰، ۳۱)

"مریم نے فرشتہ سے کہا یہ کیونکر ہوگا کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ اور فرشتے نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی، اس سبب سے وہ مولود مقدس خدا کا بیٹا کہلائے گا۔" (لوقا باب اول ورس ۳۵، ۳۶)

انجیل کی اس طرح کی عبارات سے عیسائیوں نے وہ عقائد اخذ کئے جن کا ذکر پیچھے کیا گیا ہے اور انہی عبارات کے انحصار پر وہ مسیح کو "بن باپ" مانتے ہیں۔ عقیدہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مسیح علیہ السلام کے نسب نامہ یوسف بن ہیلی سے چلا کر ذریت داؤد اور پھر ان سے آگے ذریت ابراہیم میں داخل کرتے ہیں۔ اناجیل میں یوسف کو مسیح کا باپ بار بار بیان کیا جاتا ہے ملاحظہ ہوں چند حوالہ جات۔

۱۔ "کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا جس کے ماں باپ کو ہم پہچانتے ہی نہیں ہیں۔" (یوحنا باب ۶ درس ۴۲)

۲۔ "کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ کیا اس کی ماں مریم نہیں کہلاتی؟" (متی باب ۱۳ درس ۵۵)

۳۔ "دیکھ تیرا باپ اور میں غمگین ہو کر تجھے ڈھونڈتے تھے۔" (لوقا باب ۲ و درس ۴۸)

۴۔ "خدا نے اس سے (یعنی داؤد سے) قسم کھا کر کہا کہ میں تیرے تخت پر بیٹھنے کے لئے جسم کے طور

پر تیری کمر سے مسیح کو پیدا کروں گا۔" (اعمال باب ۲ درس ۳۰)

۵۔ "پس یوسف اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی۔" (متی ۱ : ۲۴، ۲۵)

۶۔ "جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا کہ دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے کسی نے اس سے کہا کہ دیکھو تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔" (متی ۱۲ : ۴۶، ۴۷)

۷۔ "کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب، شمعون اور یہوداہ نہیں؟ اور کیا اس کی بہنیں ہمارے ہاں نہیں۔" (متی ۱۳ : ۵۵)

ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ عیسائیوں نے جب اپنے عقائد میں یہ عقیدہ بنیادی طور پر داخل کر لیا کہ یوسف اور مریم کی منگنی ہو گئی تھی لیکن ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی کہ مریم حاملہ پائی گئی اور یہ حمل اس کو روح القدس کی قدرت سے قرار پایا۔ جب یوسف کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مریم کو گھر لانے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن خواب میں اس فرشتہ نے یوسف سے کہا کہ دیکھ مریم کو اپنے گھر لے آ کیونکہ وہ تیری پاکباز بیوی ہے اور جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے لہٰذا یہ خواب دیکھنے کے بعد یوسف مریم کو لے آیا اور وہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے لگے اس طرح مسیح یوسف کا بیٹا کہلایا چونکہ وہ درحقیقت اس کا بیٹا نہ تھا لہٰذا وہ روح القدس کی قدرت کے ہونے کے سبب اللہ کا بیٹا کہلایا۔ اس طرح عیسائیوں نے مسیح کو عرف عام کے طور پر "مسیح بن یوسف" کہا اور حقیقت کے طور پر وہ "ابن اللہ" کہتے تھے۔ اور اپنی خاص مجلسوں میں "بن باپ" کہتے تھے۔

عیسائیوں کے اس گورکھ دھندا کو سمجھنے کیلئے عمر نوح درکار ہے۔ اناجیل کے مطالعہ اور پھر ان کے اختراعی عقیدوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد عیسائی علماء نے اپنے اپنے خیال کے مطابق جو چاہا اور جیسے چاہا کہتے رہے اور ان سب کے ہاں اصل عقیدہ صرف یہ تھا کہ مسیح ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکا ہے اور اب ہم جو کچھ بھی کریں ہمیں گرفت نہیں کی جا سکتی ہاں! جو گناہ کسی سے سرزد ہوتا ہے وہ پوپ کو اس کا معاوضہ جو پوپ کی طرف سے ہر گناہ کی نشاندہی کے ساتھ بتا دیا گیا ہے وہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی پکڑ ہو گئی تو صرف اس معاوضہ کے نہ ادا کرنے کی ہوگی۔ من حیث القوم ہمارا کوئی گناہ ہمیں متاثر نہیں کر سکتا۔

بس عقیدہ کی وضاحت کیلئے وہ نئے نئے عقائد اور نئی نئی تشریحات اپنے اپنے وقت میں کرتے رہے اور جوں جوں وقت گزرتا رہا اس کی کئی صورتیں بدلتی رہیں اور یہ صورتحال اب تک ان کے ہاں جاری و ساری ہے۔

ہم مسلمانوں نے ان کے باقی عقائد کا تو خواب مذاق اڑایا ہے لیکن ایک بات اسلامی نظریات میں داخل کر لی گئی کہ مسیح "بن باپ" پیدا ہوئے لیکن وہ تشریح جو عیسائیوں نے کی تھی اس کا سمجھنا سمجھانا چونکہ مشکل تھا لہٰذا علماء کی سطح پر تو اس کو من و عن تسلیم کر لیا گیا کہ مسیح روح القدس کی قدرت کے اظہار سے جو اس نے سیدہ مریم میں پھونکی تھی مریم حاملہ ہوئیں اور اس طرح گویا روح القدس بمنزلہ والد مسیح ٹھہرے لیکن چونکہ مریم مس انسانی سے پاک رہیں لہٰذا مسیح "بن باپ" ہوئے لیکن عوام میں زیادہ تر یہی مشہور و معروف کیا گیا کہ مسیح کی پیدائش معجزانہ رنگ میں ہوئی اور اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے جو اس نے اپنی قدرت کے اظہار کیلئے صادر فرمایا۔ اور اگر کسی نے پوچھ لیا کہ جناب عالی! معجزہ تو نبوت کے ساتھ خاص ہے اور یہ پیدائش عیسیٰؑ کا معاملہ ہے لہٰذا ان کا تو معجزہ ہو نہیں ہو سکتا پھر اتنا تو بتا دیا جائے کہ آخر یہ معجزہ کس نبی کا ہے؟ پھر معجزہ کیلئے تحدّی یعنی چیلنج لازم و ضروری قرار دیا گیا ہے اور سارے اہل اسلام کے ہاں یہ شرط بنیادی طور پر تسلیم ہے صرف یہ بات فرما دیں کہ مسیح علیہ السلام کی اس طرح پیدائش کا چیلنج کس نے کیا؟ اور کہاں کیا؟ پھر غور کرو کہ سیدہ مریمؑ نے بیٹے کی بشارت سن کر کیا کہا؟

سورہ مریم مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی ہجرت حبشہ کے موقع پر اس کی آیات کریمات دربار نجاشی میں پڑھی گئی تھیں۔ اس سورہ مبارکہ میں سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ سورۃ مریم کے شروع میں سیدنا زکریا علیہ السلام کی دعا اور بیٹے کی درخواست بارگاہ رب کریم کا ذکر ہے دعا کی قبولیت اور سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ ہے۔ پھر یحییٰ علیہ السلام کے لڑکپن ہی میں نبوت عطا کر دینے کی اطلاع ہے اور اس کے بعد سیدہ مریم کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی زمانہ کا ذکر کئے بغیر سیدہ مریم کا پہلی کفالت سے نکل کر کفالت ثانی کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اپنے اہل سے الگ ہونے کے معاً بعد اس بشارت دینے والے فرشتہ یعنی فرستادہ کا بیان آتا ہے اور فرشتہ اللہ تعالیٰ کا پیغام سیدہ مریم کو ان الفاظ میں سناتا ہے۔

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم ۱۹ : ۱۹) "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لئے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند کی بشارت دے دوں۔"

سیدہ مریم نے فرستادہ کی یہ بشارت سن کر اس کو جواباً فرمایا کہ :

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (مریم ۱۹ : ۱۹) "میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ مرد یعنی خاوند نے مجھے چھوا تک نہیں اور میں بدچلن بھی نہیں۔"

غور کرو کہ سیدہ مریم علیہ السلام نے فرستادہ سے بیٹے کی خبر پا کر دو باتوں کی نفی کی ہے۔ ایک "مسّ بشر" کی اور دوسری "بدچلنی" کی۔ مسّ بشر کیا ہے؟ ازدواجی زندگی میں حلال فعل یا تعلق خاص کو "مسّ" سے تعبیر کرتے ہیں اور حرام فعل یا تعلق خاص اگر کسی مرد سے ہو جائے تو اس کو "بغی" کہتے ہیں بات بالکل صاف ہے کہ ازدواجی زندگی میں تعلق خاص پیدا کرنے والا "بشر" موجود ہے لیکن "مس" نہیں ہوا اور "بغی"

کسی صورت میں بھی سیدہ مریم سے اس کا صدور ممکن نہیں ہے کہ لوگ اس کی پاک دامنی کی قسمیں کھاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کی پاکدامنی کا بیان دیتا ہے اور اس کو خود بھی اعتراف ہے کہ میں "بدچلن" نہیں۔

اب غور کرو کہ ایک عورت سے تعلق خاص جس کو ازدواجی تعلق سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اللہ اولاد جیسی نعمت عطا فرماتا ہے جس "بشر" سے یہ تعلق قائم ہوتا ہے وہ "بشر" کون ہوتا ہے۔ کیا اس کو زوج یا خاوند نہیں کہتے؟

ویسے تو بشر ہر انسان کو کہا جاتا ہے۔ وہ مرد ہو یا عورت جس طرح انسان کا لفظ دونوں پر بولا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح بشر کا لفظ بھی عورت اور مرد دونوں پر بولا جاتا ہے۔ لیکن جب "بشر" کے ساتھ "مس" کا لفظ بھی لگ گیا اور اس طرح وہ بھی "مس بشر" ہوگیا اور "مس" کا تعلق خاص پر استعمال ہونے کی وجہ سے معرفہ ہوا اور اس نے "بشر" کو بھی معرفہ کر دیا۔ "مس بشر" خاوند ہی کے تعلق زنا شوئی قائم کرنے کو کہتے ہیں۔ جس کو عرف میں جماع بھی کہا جاتا ہے۔ بغیر نکاح کے اگر کسی مرد عورت کا تعلق خاص قائم ہو تو اس کا نام "بغی" یعنی زنا ہے۔ اور یہ بات اتنی عام ہے کہ ہر انسان اس کو سمجھتا ہے وہ مسلم ہو یا کافر۔ مرد ہو یا عورت۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفسرین نے جنہوں نے عربی زبان میں تفاسیر لکھیں اس بات کی ایک حد تک وضاحت کر دی چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

مشاہیر علمائے کرام کی تفسیر مع حوالہ جات

۱ - قَالَتْ مریم اَنّٰی من این یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ لم یقربنی زوج وَلَمْ اَکُ بَغِیًّا ○ فاجرۃ ای ان الولد انما یکون من حلال او حرام من نکاح او سفاح لم یکن ھذا واحد منھا (معالم التنزیل ج ۳ ص ۵۶۷)

۲ - قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّالحلال اننی لَمْ یَمْسَسْنِیْ لم یقربنی بَشَرٌ زوج بنکاح وَلَمْ اَکُ بَغِیًّا ای فاجرۃ فجعلت المس عبارۃ من النکاح الحلال لانہ کنایۃ عنہ والزنا لیس کذلک وانما یقال فیہ فجربھا وخبث بھا وما اشبہ ذلک والبغی ھی الزانیۃ التی تبغی الرجال (فتح البیان سید محمد صدیق حسن خاں ج ۱ ص ۱۱' سورہ مریم)

۳ - قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ لم یباشرنی بَشَرٌ من الحلال وَلَمْ اَکُ بَغِیًّا لست بزانیۃ (جامع البیان ص ۲۶۶)

۴ - قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ یتزوج وَلَمْ اَکُ بَغِیًّا زانیۃ (جلالین سورہ مریم ص ۵'۶) ۵ قولہ یتزوج اشارۃ الی ان المس کنایۃ عن الوطی الحلال واما الزنا فانما یقال خبث بھا او فجر اوزنی کما فی روح البیان (جلالین سورہ مریم ص ۵'۶)

۵ - قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ رجل حلال ولا حراما فاذا لم یکن احد

الامرین موجوداً فکیف اذا ذاک بعیدا جدا او محال عادۃ (آیات للسائین سورہ ال عمران ص ۱۳۴)

ان حوالہ جات پر بغور نظر ڈالیں ان سب عبارات میں مفسرین اسلام نے "بشر" سے مراد "زوج" ہی لیا ہے اور پھر اس کی تشریح "من حلال" کر دی ہے جب یہ بات طے ہوگئی اور دلائل سے ثابت بھی ہوگئی کہ سیدہ مریم علیہ السلام کی نسبت فعل حرام محال ہے اور اس کی نسبت سیدہ کی طرف ممکن ہی نہیں تو پیچھے کیا بات رہ گئی؟ یہی کہ سیدہ مریم کو روک یہ ہے کہ "مس بشر" نہیں۔ بس اسی رکاوٹ کے اٹھانے کیلئے فرشتہ نے سیدہ مریم علیہ السلام کو جواب دیا کہ : كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ "اس طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔"

اس طرح ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے ہونے کا کہہ دیا یعنی جس طرح جو بشارت آپ کو دی گئی وہ اسی طرح پوری ہوگی یہ بات اللہ تعالیٰ کے قانون میں طے ہے اور آپ کی روک یقیناً دور ہو جائے گی اللہ جس کو پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا پیدا ہونا رک نہیں سکتا۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی بچہ پیدا ہونے کا جو اعلان کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بچہ کوئی مبارک بچہ ہی ہو سکتا ہے اور مبارک وہی ہوتا ہے جو حلال عمل سے ہو اور خوشی بھی اسی کی کی جاتی ہے ورنہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

پھر بات کو یہاں ختم نہیں کیا بلکہ مزید فرمایا اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" پھر جیسا کچھ وہ چاہتا ہے ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔" جس رکاوٹ کو اللہ دور کر دینا چاہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دور نہ ہو؟

دیکھ تیرے سے بہت پہلے ہمارے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ اپنے ہی مکان کے دروازہ میں کھڑی ہوئی تھی کہ ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اس کے بعد (اسحاق کے بیٹے) یعقوب کی بشارت اس کو دے دی لیکن وہ بشارت سن کر کہنے لگی :

يٰوَيْلَتٰى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ (ھود ۱۱ : ۷۲) تعجب مجھ پر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے اولاد ہو حالانکہ میں بڑھیا ہوگئی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے!"

لیکن ہمارے فرستادوں نے اس کو اس طرح جواب دیا تھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے جب اللہ نے اس کے ہونے کی اطلاع دی تو پھر تعجب کیوں؟ کیا پیغام بھجوانے والا تمہاری اس رکاوٹ کو نہیں جانتا؟

اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (ھود ۱۱ : ۷۳)

"کیا تو اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تجھ پر ہوں' اے اہل خانہ ابراہیم! بلاشبہ اس کی ذات ہے جس کی ستائش کی جاتی ہے اور وہی ہے جس کیلئے ہر طرح کی بڑائیاں ہیں۔"

دوسری جگہ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا :

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ (الذاریات ۵۱ : ۲۹) "ابراہیم کی بیوی سامنے آئی اور اس نے اپنے چہرہ پر تعجب سے ہاتھ مارا اور کہنے لگی میں تو بڑھیا بانجھ ہوں۔" اور ہمارے فرستادوں نے اس کو اس طرح جواب دیا :

كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ (الذاریات ۵۱ : ۳۰) "تیرے رب نے اسی طرح فرمایا ہے بلاشبہ وہ حکیم و علیم ہے۔" یہ تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بی بی کا حال تھا۔ ذرا خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بھی حال ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے :

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر ۱۵ : ۵۳) "انہوں نے کہا اے ابراہیم! ڈر مت ہم تو تمہیں ایک علم والے فرزند کی پیدائش کی خوشخبری سناتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ کے فرستادوں کی یہ خبر سن کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے بھی نہ رہا گیا اور ان کو اس طرح کہنے لگے۔

اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤی اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (الحجر ۱۵: ۵۴) "تم مجھے اس بات کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہوگیا ہے۔ کونسی امید اب رہ گئی ہے کہ یہ خوشخبری مجھے سناتے ہو۔" فرستادگان الٰہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جواب دیتے ہیں۔

بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ (الحجر ۱۵ : ۵۵) "ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ خوشخبری سنائی ہے پس تمہیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔"

سیدنا زکریا علیہ السلام کا ذکر پیچھے گزر چکا۔ انہوں نے اللہ سے اولاد طلب کی اور وہ اس وقت بھی اپنا بڑھاپا اللہ کو دکھاتے رہے یعنی اس کا ذکر کرتے رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب قبولیت دعا کا وقت آیا اور آپ کو خوشخبری دی گئی کہ بس اب بیٹا آیا کہ آیا یعنی آپ کی بیوی حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ بیٹے کی خوشخبری سن کر تعجب ہوا کیوں؟ اس لئے کہ "بڑھاپے" کی رکاوٹ پیش نظر تھی۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ جس اللہ نے تجھے بیٹے جیسی نعمت کی خوشخبری بھجوائی ہے وہ تیری حالت اور تیری رکاوٹ سے خوب واقف ہے اور اس کو کوئی رکاوٹ بھی دور کرتے کوئی دیر نہیں لگتی تو تعجب میں کیوں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہوا۔

قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْـًٔا (مریم ۱۹ : ۹) میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا حالانکہ تیری ہستی کام نام و نشان بھی موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم نے تجھ کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا تو اب تو بڑھاپے پر کیوں تعجب کرتا ہے۔ بلکہ سیدنا زکریا علیہ السلام کے ظاہری تعجب کا جواب دیا ہے کہ ماں باپ کیا ہیں ایک ضابطہ الٰہی کی نشانی ہی تو ہیں ورنہ ماں باپ کا کام اولاد پیدا کر لینا کب ہے؟ کیونکہ اولاد کیا ہے؟ ایک تخلیق الٰہی ہے۔ اور اس تخلیق الٰہی کیلئے ماں باپ ایک ضابطہ الٰہی ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آجائے تو تعجب کیوں ہو؟ ہاں! جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب کوئی تعجب نہ رہا۔

یہی بات سیدہ مریم کو پیش آئی جب ان کو بیٹے کی خوشخبری سنائی گئی تو وہ کہنے لگیں رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ

وَلَدٌ "خدایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا پیدا ہو؟" لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ کہ "زوج نے مجھے چھوا نہیں" اور سورہ مریم میں اس کی مزید تشریح اس طرح کر دی ہوئی تھی کہ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا "اور بدچلن میں نہیں" فرمایا اللہ جانتا ہے کہ تو بدچلن نہیں تو بدچال چلنے والوں کو بشارت ہی کب ہوتی ہے؟ رہی وہ بات جو رکاوٹ کا باعث ہے تو ہم جانتے ہیں جب بشارت ہماری طرف سے دی جا رہی ہے تو کیا ہم تیری رکاوٹ دور نہیں کر سکتے؟ كَذَٰلِكِ اللَّهُ "اس طرح اللہ نے چاہا ہے کہ اس کے حکم کے سامنے کوئی رکاوٹ رکاوٹ نہ ہو" يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ "وہ جس کو پیدا کرنا چاہتا ہے پیدا کر ہی دیتا ہے۔" إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا "وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے" فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ "تو حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" پھر جیسا کچھ اس نے چاہا ہوتا ہے ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔"

مشیت ایزدی کے فیصلے اپنی ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ غور کرو کہ سیدہ مریم کی پیدائش کن حالات میں ہوئی والدہ ماجدہ مریم کی کیا خواہش تھی انہوں نے کیسے نذر مانی لیکن قانون الٰہی کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ہوا وہی جو اللہ کے ہاں ہونا تھا۔ ماں کی خواہش لڑکے کی تھی لیکن اللہ کے قانون کے مطابق لڑکی تھی۔ لڑکی پیدا ہوئی تو ماں نے اپنی خواہش کا اظہار اسی تعجب کے طور پر کیا کہ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ "خدایا میرے تو لڑکی ہوئی ہے اب میں کیا کروں؟" کیا یہ تعجب نہیں؟ ہاں تعجب تو ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ کو تعجب کیوں ہے وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ "حالانکہ جو وجود پیدا ہوا تھا اللہ اسے بہتر جاننے والا تھا۔" فرمایا مریم کی ماں تو نہیں جانتی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یاد رکھ تو نے جس لڑکے کی خواہش کی تھی لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ "وہ لڑکا اس لڑکی کا مثل نہ ہوتا۔"

انجام کار مریم کو ہیکل کی نذر کر دیا گیا اور وہاں بڑی لے دے کے بعد سیدنا زکریا علیہ السلام سیدہ مریم کے کفیل اول مقرر ہوئے۔ وہاں کیا قانون الٰہی کی کرشمہ سازیاں دکھائی گئیں اور سیدہ مریم کی پاکبازی اور طہارت ظاہری و باطنی کا اعتراف کن کن شخصیتوں کو کرنا پڑا۔ سیدنا زکریا علیہ السلام اللہ کا نبی ہونے کے باوجود آپ کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے خصوصاً جب طرح طرح کے پھلوں اور مختلف قسم کے غلہ جات اور کھانے پینے کی فراوانی مریمؑ کے پاس دیکھی حالانکہ وہ آپ ہی کی کفالت میں تھیں تو استحاناً پوچھ لیا يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا "اے مریم! یہ چیزیں تجھے کہاں سے مل گئیں؟" مریمؑ نے زکریا علیہ السلام کے اس سوال کا فی البدیع جواب دیا اور کتنا شاندار جواب دیا۔ فرمایا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ "اللہ سے" سبحان اللہ جواب کتنا مختصر اور کتنا جامع اور ہر پہلو سے واضح ہے۔ پھر انکساری کرتے ہوئے کہ کہیں اس کا مطلب یہ نہ لیا جا سکے کہ یہ احسان میرے ساتھ کوئی مخصوص قسم کا ہے جو کسی دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا اور کوئی اس کا مطلب غرور کا نہ لے لے مزید فرمایا إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "اللہ جسے چاہتا ہے اپنے خاص قانون کے مطابق بغیر حساب کے رزق دے دیتا ہے۔" اس جملہ کا سننا تھا کہ زکریا علیہ السلام کے دل میں ایک ہل چل مچ گئی اور جو بے اولاد تھے اور اولاد بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بطور رزق دی جاتی ہے زکریا علیہ السلام کے اس تخیل نے اس دروازہ الٰہی پر دستک دے دی۔

مریمؑ زکریا علیہ السلام کی کفالت میں ہیکل کی خدمت میں مصروف رہیں جب تک اللہ کے ہاں اس خدمت میں لگے رہنا منظور تھا۔ انجام کار وہ وقت آگیا جب بحکم الٰہی سیدہ مریمؑ کو زکریا علیہ السلام کی کفالت سے نکال کر ایک دوسری کفالت میں دے دیا گیا اور یہ وہی تبدیلی کفالت تھی جو آدم زادیوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے خاص کر دی ہے۔ ہر باپ اپنی بیٹی اور ہر بھائی اور ہر کفیل اپنی کفالت سے نکال کر دوسروں کی کفالت میں دینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

سیدہ مریم جب کفالت ثانی میں دے دی گئیں تو ظاہر ہے کہ اب ہیکل کا حجرہ خاص جو آپ کیلئے مخصوص تھا خالی کرنا لازم و ضروری تھا لہٰذا آپ وہاں سے نکل کر مکاناً شرقیاً" اپنے مشرقی مکان کی طرف منتقل ہوگئیں یعنی ہیکل کو چھوڑ کر جہاں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں پوری ہوتی رہیں اور ساتھ ہی وہ ہیکل کی خدمات میں مصروف تھیں اب وہاں سے نکل کر اپنے آبائی وطن یعنی ناصرہ میں چلی گئیں اور یہ جگہ یروشلم سے جہاں ہیکل تھا شمال مشرق میں واقع ہے اور یروشلم کے باشندوں کیلئے مشرق ہی کا حکم رکھتا ہے۔ انجیل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ وہ اس معاملہ کا محل وقوع ناصرہ ہی بتاتی ہے۔ (لوقا ۱ : ۲۶)

یہی وہ مقام اور یہی وہ وقت تھا کہ سیدہ مریم اپنے دوسرے گھر والوں سے الگ ہو کر ایک پردہ کے مکان میں سونے کی غرض سے گئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرستادوں نے یعنی ان فرشتوں کی جماعت کے سردار جبرئیل علیہ السلام نے سیدہ مریمؑ کو لڑکے کی بشارت سنا دی۔ یہ بشارت سن کر جو مکالمہ سیدہ مریمؑ اور فرستادہ الٰہی میں ہوا اس کا ذکر آپ پڑھ چکے۔

مسیح علیہ السلام کی شخصیت پر ایک نظر

قبل ازیں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش "بن باپ" ہوئی اور اس کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ "بن باپ" کو انہوں نے کس طریقہ سے تسلیم کیا اور کس طرح سیدنا مسیح علیہ السلام کی پوری زندگی کو انہوں نے ایک گورکھ دھندہ بنا کر رکھ دیا ہے اور ہم مسلمانوں کی اکثریت کا نظریہ و عقیدہ بھی یہی ہے کہ مسیح علیہ السلام کی پیدائش "بن باپ" ہوئی لیکن ہم مسلمانوں کے ہاں اس طرح کی اس پیدائش کو معجزہ پر محمول کیا جاتا ہے اور اگر کوئی پوچھ لے کہ یہ معجزہ کس کا تھا کیونکہ مسیح علیہ السلام کی تو پیدائش کا معاملہ ہے ان کا تو معجزہ ہو نہیں سکتا تو اس پوچھنے والے کو سخت سست سننا پڑتی ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس سخت سست کے سوا اس کا جواب آخر ہو بھی کیا سکتا ہے؟

بلاشبہ قرآن کریم میں یہ الفاظ کہیں نہیں ملتے کہ حضرت مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے یعنی کوئی ایسی مثبت تصریح نہیں جو اپنے منطوق میں ظاہر اور قطعی ہو ہاں قرآن کریم کی آیات سے اس طرح کے اشارات نکل رہے ہیں یا کم از کم نکال لئے گئے ہیں اور پھر ان کو عقیدہ تواتر اور اجتماع امت جیسے سہاروں سے پختہ کر لیا گیا ہے جس سے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے جو مسلمانوں کے ہاں بھی بہرحال "مقبول" ہے۔

قرآن کریم کے بعد دوسرا درجہ صحیح احادیث کا ہے۔ یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود نہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش "بن باپ" کے ہوئی تھی۔ اس پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے باپ کی تصریح قرآن و حدیث میں موجود ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ فلاں تھا؟ اگر نہیں تو آخر کیوں؟ حالانکہ یہ سوال اس وقت درست ہوتا جب انسانوں میں دونوں طرح کے انسان موجود ہوتے کہ ایسے انسان بھی موجود ہیں جن کے باپ نہیں اور ایسے انسان بھی ہیں جن کے باپ ہیں اور اس طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا مسئلہ درپیش آجاتا کہ آیا مسیحؑ کا باپ ہے یا نہیں یعنی کہ مسیح علیہ السلام کا ان انسانوں سے تعلق ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں یا ان سے جو باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ جب انسانوں کی پیدائش کا مسئلہ کتاب و سنت میں طے ہے کہ انسان اول کے جوڑے کے بعد جو اس ضابطہ الٰہی سے پہلے پیدا کیا گیا تھا جن کو آدم و حوا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انسانی پیدائش کا ضابطہ یہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ وہ مرد و عورت سے پیدا ہوں گے تو استثناء اس میں لازم تھی کہ "سب انسانوں کو مرد و عورت سے پیدا کیا جائے گا سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے کہ ان کی پیدائش صرف عورت سے ہوگی تو بات صاف ہو جاتی۔" جب کہ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ ہدایت فرما دی گئی کہ :

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (الاحزاب ۳۳ : ۵) "جن لوگوں کے باپوں کے متعلق تم کو معلوم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست و رفیق ہیں۔"

ایسا نہیں فرمایا کہ جن لوگوں کے باپوں کا تم کو معلوم نہ ہو ممکن ہے کہ ان کے باپ موجود ہی نہ ہوں بلکہ فرمایا کہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہیں اس کی ضرورت نہیں کہ ان کے باپوں کا کھوج لگاتے پھرو۔ اور پھر بات صرف یہی نہیں بلکہ ان عیسائیوں کا رد اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا جن عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" قرار دیا تھا کہ شرم کرو جب تم اللہ کیلئے بیٹا قرار دیتے ہو تو اس کی بیوی کیوں نہیں بتاتے ہو؟ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (الانعام ۶ : ۱۰۱) "وہ آسمان و زمین کا موجد ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو جب کہ کوئی اس کی بیوی نہیں؟"

کیونکہ بیٹا ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ایک اس کا باپ ہو تو دوسری اس کی ماں بھی لازمی و ضروری ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کو باپ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود تعجب کا اظہار فرماتے ہوئے ان سے پوچھتا ہے کہ عجیب بات ہے کہ جب تم نے مجھے یعنی اللہ کو عیسیٰ علیہ السلام کا باپ قرار دیا تو میری بیوی کونسی ہوئی اور جب میری بیوی کو تم بھی نہیں مانتے تو پھر یہ میرا بیٹا کیوں کہتے ہو؟ حالانکہ معجزات کا صدور تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ عیسائیوں کی طرح ہم مسلمانوں کے علمائے کرام کی اکثریت نے بھی سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا سبب جبرئیل علیہ السلام ہی کو قرار دیا اور ان کو بمنزلہ والد قرار دے کر باپ کی طرف کو پورا

کر دیا اور پھر مسیح علیہ السلام کو "بن باپ" بھی کہا اس لئے کہ جبرئیل علیہ السلام انسان نہیں تھے بلکہ اللہ کے ایک فرستادہ بندہ و فرشتہ تھے۔ چنانچہ علمائے اہلحدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث ایک جگہ رقم طراز ہیں :

"عربی زبان میں لفظ ولد کا حقیقی اطلاق جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اس کیلئے اصلین کا ہونا ضروری ہے اور ولد کیلئے اگر اس کی ماں کی طرف نسبت ہو تو دوسرا اس کا باپ ہونا چاہئے۔ پس اولاد کی ماں ولد کے باپ کیلئے صاحبہ (بیوی) ہوگی نیز ولد کیلئے ضروری ہے کہ اصلین کے مادہ سے منفک ہو کر تیار ہو یعنی ولد کیلئے اصلین کی ضرورت ہے اور مادہ منفک بھی لازم ہے۔ پس لفظ ولد کے معنی ہیں جزء خاص یعنی جس کی جزئیت میں دو شخصوں کو دخل ہو اسی طرح لفظ ابن بھی عربی زبان میں حقیقی طور پر ولد کا مترادف ہے اس کے اطلاق کیلئے بھی یہی شرائط ہیں چونکہ مسیح" کو ابن مریم سے قرآن کریم میں تعبیر کیا گیا ہے اس کیلئے بھی اصلین کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ان کی ماں مریم' دوئم جبرئیل علیہ السلام جن کو دوسرے لفظوں میں روح القدس سے تعبیر کرتے ہیں جو حمل مسیح کا باعث ہوئے۔" پھر آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

"سنئے! ولد بلا والدہ نہیں ہو سکتا اور ولد بلا اصلین متصورہ نہیں اور ولد کیلئے اصلین کے ساتھ انفکاک مادہ کی بھی ضرورت ہے گویا ولد کا لفظ بلحاظ استعمال یہ معنی دیتا ہے کہ دو اصلین کے توسط سے بانفکاک مادہ پیدا ہونے والا۔ جہاں کہیں لفظ ولد کا کلام عرب میں استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں اصلین اور انفکاک مادہ ضروری ہے۔ ایک اصل اگر والد ہے تو دوسری اصل جو ولد ہونے کیلئے ضروری ہے۔ وہ عرف میں اس کی والدہ ہوگی جو اس کے باپ کی جورو ہوگی۔ پس مسیح پر چونکہ ولد مریم کا اطلاق کرتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کی والدہ ہو اور وہ مریم ہے۔ اور دوسرا اصل جس کے اتصال کے علاوہ مسیح نہ پیدا ہوا ہم اہل اسلام کے نزدیک جبرئیل ہے جسے دوسری جگہ قرآن کریم میں روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ بمنزلہ والد کے ہے کیونکہ نفخ جبرئیل کے قبل اور روح القدس کی قوت کے ظہور سے پہلے مریم" سے مسیح" ظاہر اور متولد نہ ہوئے۔"
(اثبات توحید میں ۱۹ ص ۴۵)

حافظ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ پر بار بار غور کرو ایک ایک لفظ کر کے سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ الفاظ بے شک حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ہیں لیکن یہ نظریہ ہم سب مسلمانوں کا ہے یا کم از کم ہم مسلمانوں کی اکثریت کا ہے۔ خصوصاً "اصلین" اور "انفکاک مادہ" "ایک اصل مریم" اور "دوسری اصل جبریل علیہ السلام" کے الفاظ پر پھر غور کرو "روح القدس" "بمنزلہ والد" کے الفاظ پر خصوصاً فکر کرو۔ ازیں بعد لفظ "بن باپ" کو ذہن میں رکھ کر موازنہ کرو اور اب عیسائیوں کا عقیدہ بھی دوبارہ سن لو تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے چنانچہ انجیل میں ہے کہ۔

"اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو

ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ اس کا بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔" (متی ۱ : ۱۹ تا ۲۱)

ان دونوں عبارتوں میں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے مقامی علمائے کرام سے دریافت کر لیں۔ ہاں! سیدنا مسیح علیہ السلام کو "بن باپ" نہ ماننا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے کیونکہ ہم مسلمانوں کی اکثریت کا مسئلہ بھی ہے اور دنیائے عیسائیت کی اکثریت کا مسئلہ بھی۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کا ارشاد گرامی اور شخصیت مسیح علیہ السلام

دنیائے تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک بہت بڑا وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا جس میں اس وقت کی عیسائی دنیا کے احبار و رہبان یعنی علماء و مشائخ موجود تھے۔ کتب احادیث میں بھی اس وفد کی آمد کا ذکر موجود ہے اور تفسیر ابن جریر المعروف طبری میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ :-

" ان النصاریٰ اتو رسول اللہ ﷺ فخاصموہ فی عیسیٰ ابن مریم" جو وفد نجران سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان کی آمد کا مقصد رسول اللہ ﷺ سے عیسیٰ ابن مریم کے متعلق جھگڑا ڈالنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے جھگڑے کی بنیاد اس طرح شروع کی کہ :

" وقالوا لہ من ابوہ " انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ آپ ﷺ کا خیال مسیح علیہ السلام کے باپ کے متعلق کیا ہے؟ کہ وہ کون ہے؟ ہر ایک سننے والے کے ذہن میں ایک جگہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے دو ہی جواب میں سے ایک جواب ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ "مسیح کا کوئی باپ نہیں تھا" دوسرا یہ کہ "مسیح کا باپ فلاں تھا" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی روایت میں بھی اور خصوصاً اس زیر نظر روایت میں ان دونوں جوابوں میں سے ایک بھی جواب آپ ﷺ نے ارشاد نہیں فرمایا۔ کیوں؟ اس لئے آج جن جوابوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں سے ایک جواب دینے سے بات صاف ہو جاتی ہے اس وقت کے حالات میں ان میں سے جو بھی صحیح سمجھ کر جواب دیا جاتا جھگڑے کا باعث بن جاتا اور نجران والوں کا تو ارادہ ہی جھگڑا کرنا تھا۔ جس کی طرف روایت کے الفاظ نے بھی اشارہ کر دیا کہ "فخاصموہ فی عیسیٰ ابن مریم"

آپ ﷺ صاحب وحی و الہام تھے آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ جواب باعث مخاصمت ہیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا اور ایسا دیا کہ ان جھگڑا کرنے والوں کو جھگڑا کرنے کا کوئی راستہ ہی نہ مل سکا اور باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ہر اس بات کا اعتراف کر لیا جس کا وہ اعتراف کرنا ہی نہ چاہتے تھے۔ لسان نبوت و رسالت گویا ہوئی

اور فرمایا "الستم تعلمون لا یکون ولد الا وھو یشبہ اباہ" کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ بیٹا اپنی جان و جسم اور شکل و صورت کے لحاظ سے ہمیشہ اپنے باپ ہی کے مشابہ ہوتا ہے۔

عیسائیوں کا دعویٰ "ابن اللہ" ہونے کا تھا۔ "اللہ" ہونے کا تھا "تین میں سے تیسرا" ہونے کا تھا اور "جبرئیل کی قوت" "دوسری اصل جبرئیل" ہونے کا تھا سارے دعوے اپنے اندر مخاصمت کا پہلو رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو اگر "فلاں باپ" سے جواب دیا جاتا تو وہ سیخ پا ہو جاتے اور میدان ان کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ میں اور آپ یا کوئی عام انسان ہوتا تو یقیناً ایسا ہی ہوتا لیکن انہوں نے جس سے سوال کیا تھا وہ "اللہ کا رسول" تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو جواب اس طرح دیا کہ تم ہی بتاؤ۔ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی غور کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے اللہ سے مشابہت رکھتے ہیں؟ جبرئیل سے یا انسان سے؟ ظاہر ہے کہ جس سے مشابہت ہوگی وہی ان کا باپ ہوگا۔ غور کرو کہ عیسائیوں نے آپ ﷺ کے جواب کو کس طرح تسلیم کیا۔

"قالوا بلیٰ" وہ سب کے سب بیک زبان پکار پکار کر کہنے لگے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہر بیٹا اپنے باپ ہی سے مشابہت رکھتا ہے۔ انسان کا بیٹا کبھی فرشتہ نہیں ہو سکتا اور کوئی دوسرا حیوان بھی نہیں بلکہ انسان ہی ہوگا۔ کیونکہ عیسائی بھی عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی مشابہت سے انکار نہیں کر سکتے اور کوئی آنے والا انسان بھی اس مشابہت سے انکار نہیں کر سکتا اور آج ہم مسلمان بھی "بن باپ" تو کہتے ہیں لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی مشابہت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اب تم ہی بتاؤ کہ جو لسان رسالت نے جواب دیا کہ وہ کتنا وزنی، کتنا درست اور کتنا واضح ہے؟ کیا اس سے زیادہ وضاحت کبھی ممکن بھی ہے؟ پھر جواب ایک ہی ہے اور ان سارے مختلف عقائد و نظریات رکھنے والوں کے لئے کافی ہے جن کا پیچھے ذکر کیا گیا۔ گویا سارے زہروں کا ایک ہی تریاق ہے۔

پھر نبی رحمت ﷺ نے مبارک شفتین کو حرکت دی اور بڑے پیارے انداز سے فرمایا نجران والو! تم کس سوچ میں ہو ذرا بتاؤ تو "الستم تعلمون ان ربنا حی لا یموت وان عیسی یاتی علیہ الفنا" کیا تم کو معلوم نہیں کہ بلاشبہ ہمارا رب ہمیشہ سے ہے اور اس پر کبھی موت نہیں آئے گی اور رہے عیسیٰ علیہ السلام تو تم کو معلوم ہے کہ فانی وجود رکھتے ہیں۔ اب کون ہے جو اس کا انکار کر سکے؟ وہ چار و ناچار گویا ہوئے اور علاوہ ازیں کچھ نہ کہہ سکے۔

"قالوا بلیٰ" کہنے لگے ہاں! یارسول اللہ۔ اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور عیسیٰ تو سارے انسانوں کی طرح مرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے۔ نبی اعظم و آخر ﷺ نے توحید الٰہی کا بیان اس طرح جاری و ساری فرمایا کہ منکرین و معاندین اور توحید الٰہی میں شرک کی میخیں لگانے والے دم بخود ہو گئے اور ترجمان الٰہی ﷺ کی زبان پھر حرکت میں آئی۔ "قال الستم تعلمون ان اللہ عزوجل لا یخفی علیہ شئی

فی الارض ولا فی السماء" رسول عربی ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ بلاشبہ اللہ جو صاحب عزت و جلال ہے اس پر کوئی چیز آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی نہیں ہے۔

سرداران وفد نجران کیا جواب دیتے؟ ہاں وہی جو انہوں نے دیا اور اس کے علاوہ اور کچھ اور جواب دے بھی نہ سکتے تھے۔ ان کو پھر وہی کہنا پڑا جو وہ کہتے چلے آرہے تھے کہ "قالوا بلیٰ۔"

نبی مکرم و رسول معظم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا "فھل یعلم عیسیٰ من ذلک شیئا الا ما علم" نجران والو بھلا بتاؤ تو کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی ان باتوں میں سے کچھ جانتے تھے سوائے اس کے جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا گیا؟ کیونکہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کا ذاتی علم ہے اس کو کسی کے بتانے سے معلوم نہیں ہوتا باقی سارے انبیاء میں سے ایک بھی علم ذاتی نہیں رکھتا ہاں! وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی کو بتایا گیا ہو اور کسی کو بتایا ہوا علم کبھی علم ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ جتنا چاہتا ہے اپنے نبی کو بتا دیتا ہے اور اللہ ہی کے بتانے سے انبیاء کرام کو معلوم ہوتا ہے اور اسی کو نبوت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی نجران والوں کو یہی کہنا پڑا جو روایت میں موجود ہے کہ " قالوا لا" وہ کہنے لگے کہ یہ بات تو فی الحقیقت صحیح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام وہی کچھ جانتے تھے جو اللہ کی طرف سے آپ کو بتا دیا جاتا رہا۔ یعنی ان کا علم بھی علم ذاتی نہیں تھا۔

احمد مجتبیٰ ختم رسول ﷺ نے اس موقع سے بحکم الٰہی مزید فائدہ اٹھایا اور اپنے الٰہ واحد کی تخلیق کا اعتراف کرا لینا مناسب خیال فرمایا۔ ارشاد ہوا "قال فان ربنا صور عیسیٰ فی الرحم کیف شاء" نجرانیوں ذرا بتاتے جاؤ کہ ہمارے رب نے عیسیٰ علیہ السلام کی تصور رحم مادر میں جس طرح چاہا تخلیق نہیں فرمائی تھی؟ پھر سوچ کر جواب دو کہ کبھی خالق اور مخلوق کا آپس میں جوڑ لگ سکتا ہے عیسیٰ علیہ السلام تو خود مخلوق ہے اور اس ذات کی مخلوق ہے جو سب کا خالق حقیقی ہے اور ایسی ہی مخلوق جیسی اس کی باقی مخلوق ہے۔ پھر کائنات میں جو خود اپنے وجود کا بھی خالق نہ ہو وہ خالق کے ساتھ کیونکر مل گیا؟

پیغمبر اسلام ﷺ کتنے میٹھے اور پیارے انداز میں ربوبیت الٰہی کا درس دے رہے ہیں فرمایا نجران کے فقیہو! الستم تعلمون ان ربنا لا یاکل الطعام ولا یشرب الشراب ولا یحدث الحدث "ذرا بتاتے چلو کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ ہمارا رب تو وہ رب ہے جو کھانے اور پینے سے پاک ہے اور اس کو کبھی قضائے حاجت بھی نہیں ہوئی کہ وہ دوسروں سے پردہ کر کے لیٹرین گیا ہو؟"

جواب آیا "قالوا بلیٰ" ہاں یارسول اللہ! واقعی ہمارا رب ایسا ہے جو کھانے' پینے اور قضائے حاجت جیسی ساری مجبوریوں سے پاک ہے۔ اب عیسائیت کے اس عقیدہ پر آخری ضرب لگنے کو ہے کہ عیسیٰ "ابن اللہ" عیسیٰ "اللہ" عیسیٰ "ثالث ثلاثہ" عیسیٰ "جبریل کے قوت" یا کوئی خاص جزو "سوائے باپ" کے ہے۔ فرمایا جا رہا ہے:

الستم تعلمون ان عیسیٰ حملة امه کما تحمل المراة ثم وضعته کما تضع المراة ولدها ثم غذی کما یغذی الصبی ثم کان یطعم الطعام و یشرب الشراب ویحدث الحدث "کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو ماں نے ایسے ہی جائز طور پر حمل میں لیا جیسا کہ ساری مائیں اپنے اپنے حمل کو جائز طور پر حمل میں لیتی ہیں اور عیسیٰ کو ماں نے اس طرح جنم دیا جیسا کہ ساری مائیں اپنے اپنے بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ایسے ہی اپنی ماں کا دودھ پیتے رہے جیسا کہ ساری مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ پھر عیسیٰ دودھ پینے کی عمر سے بڑے ہو کر کھانے کی حلال و طیب چیزیں کھاتے رہے پینے کی حلال و طیب چیزیں پیتے رہے اور قضائے حاجت بھی کرتے رہے۔

سرداران عیسائیت کے پاس اتنی واضح اور کھلی کھلی باتوں کا بھی علاوہ ازیں کوئی جواب نہ تھا کہ وہ کہنے لگے "قالوا بلیٰ" ہاں! یارسول اللہ ﷺ! بات تو کچھ اس طرح ہے۔ جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ تو بالکل سچ ہے۔

رحمتہ للعالمین ﷺ کی لسان صدق و صفا سے جب یہ الفاظ نکلے عیسائیت پر کیا گزری ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "فکیف یکون هذا کما زعمتم" پھر تم وہ بات کیسے کہتے ہو جس کو اٹھا کر اتنا بڑا سفر تم نے اختیار کیا۔ کیا اتنی بات کو تم خود نہ سوچ سکے کہ ہم کس نظریہ کو لئے جا رہے ہیں اور پھر یہ کہ کس کے پاس جا رہے ہیں؟ (یہ پورا واقعہ تفسیر ابن جریر الجزء الثالث ص ۱۸۰، ۱۸۱ پر درج ہے ملاحظہ کریں۔)

سچ یہ ہے کہ جب کوئی قوم من حیث القوم ایک نظریہ اور ایک عقیدہ اپنا لیتی ہے اس پر کچھ سوچنا حرام ہو جاتا ہے اور پھر چونکہ من حیث القوم ہر قوم میں کچھ نہ کچھ عقائد و نظریات ایسے موجود ہوتے ہیں جن کی کوئی اصل موجود نہ ہونے کے باوجود ہر زبان پر جاری ہوتے ہیں اور علمائے قوم کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ ان قومی نظریات و عقائد کی حفاظت کے لئے دلائل اکٹھے کرتے ہیں اور ہر دور میں سب سے بڑی اور آخری دلیل یہ رہی ہے کہ "عقل کو مذہب میں دخل نہیں۔" لہٰذا جو مذہب کہتا ہے اس کو ماننا ہے۔

عیسائیت نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو نظریات و عقائد اپنائے ہیں ان کی اصلیت موجود اناجیل میں بھی نہیں ملتی تاہم علمائے عیسائیت ہیں کہ اپنے اپنے فرقے کی ترجمانی میں ہر وقت رطب اللسان ہیں اور ان کے لئے دلائل مہیا کرتے ہی رہتے ہیں۔ پھر ان کے اپنے مذہب عیسائیت کے اندر مختلف عقائد و نظریات ہیں۔ وہ اپنا اپنا نظریہ و عقیدہ بدستور قائم رکھنے کے لئے ایک دوسرے کا رد کرتے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتویٰ صادر کرتے رہتے ہیں اور اسلام کے مقابلہ کے لئے سب اکٹھے ہو کر اس کی بیخ کنی کے لئے ہر وقت کوشاں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اور نجرانی عیسائیوں کی گفتگو آپ نے پڑھی۔ کیا نجران کے عیسائی نبی کریم ﷺ کی باتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے عقائد و نظریات کو چھوڑ گئے تھے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس روایت کے آخر میں یہ

الفاظ آج بھی موجود ہیں کہ" فعر فواثم ابو الاجحوداً" بات کو وہ سمجھ گئے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ ہاں! ہاں! بھی کہتے رہے تھے لیکن انجام کار انہوں نے انکار کیا اور اپنے کفریہ عقائد پر اڑے رہے۔ ہاں! آپ ﷺ کی مجلس سے ایسے گئے کہ دوبارہ آنے کی جرات ان کو نہ ہو سکی۔

بزرگوں کے نام پر ایسے عقائد پچھلی قوموں میں بھی موجود تھے اور اب بھی تقریباً ہر قوم میں کچھ نہ کچھ اس طرح کے عقائد و نظریات پائے جاتے ہیں اگر ایک دوسرے کے متعلق کسی طرح کی زبان کھولتا ہے تو دوسرا بھی اس کے عقائد میں سے اسی طرح کی باتوں کو نکال کر بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور آج بھی یہ تصور موجود ہے کہ من حیث القوم جو نظریات کسی نے اپنائے ہیں وہ ان کے قومی نظریات ہیں اس لئے ان سے صرف نظر کرنا ہی چاہئے تاکہ مذہبی آزادی برقرار رہے اور ہر جگہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید انہی باتوں کا نام مذہب ہے۔ اور ہم مسلمان بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام ہی کو لے لیجئے جن کا اس جگہ تذکرہ ہو رہا ہے۔ ایک جگہ مولانا مودودی رحمہ اللہ اس طرح رقم طراز ہیں کہ:

"دنیا کے پیشوائے دین کو لے لو، تم دیکھو گے کہ اس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے انہوں نے اس پر اپنے تخیلات و اوہام کے اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا ہی محال ہو گیا ہے صرف یہی نہیں کہ ان کی محرف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل تعلیم کیا تھی بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا ہے؟ اس کی پیدائش میں اجو بگی اس کی طفولیت میں اجو بگی اس کی جوانی اور بڑھاپے میں اجو بگی اس کی زندگی کی ہر بات میں اجو بگی اور اس کی موت تک میں اجو بگی۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہاء تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے اور اس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خود خدا تھا۔ یا خدا کا بیٹا تھا یا خدا اس میں حلول کر گیا تھا یا کم از کم وہ خدائی میں کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔" (تفہیمات)

لیکن جب وقت آتا ہے تو کون ہے جو اس عجائب پرستی کی زد سے بچ سکے؟ یہود نے سیدنا عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اس طرح عیسائیوں نے عزیر کو تو اللہ کا بیٹا نہ مانا لیکن سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہہ دیا۔ مسلمان یہ جسارت نہ کر سکے تو دبی زبان میں اس طرح کہہ دیا کہ "جو احد تھا وہ احمد بن کر مدینہ میں آگیا" اور "میم کا پردہ" ہٹا کر دیکھنے کی ہدایت کی۔ اور مسلمانوں ہی کے ایک گروہ شیعہ نے ایک جست لگائی تو "علی" کو "اللہ" کہہ دیا۔ اب کون ہے جو کسی کے عقائد پر زبان کھولے؟ کیونکہ مذہبی آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔



يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ

کر دیتا ہے یعنی اللہ کے ہاں طے شدہ بات کبھی غلط نہیں ہوتی وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا پھر جیسا کچھ وہ چاہتا ہے ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔ ۱۱۲ ۴۷

اللہ کا حکم کرنا کہ "اے چیز موجود ہو جا" کا مطلب کیا ہے؟

۱۱۲ "اِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" وہ حکم دیتا ہے ہو جا پس ہو جاتا ہے۔ مطلب بالکل صاف ہے کہ وہ کسی چیز کو ظہور میں لانے کے لئے نہ تو کسی سروسامان کا محتاج ہے۔ نہ کسی دوسری ہستی کی موجودگی کا۔ گویا سیدہ مریم ہی سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا ہے کہ تجھ کو اس پر تعجب کیوں ہے جب مشیت ایزدی میں کسی کام کا ہونا موجود ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو کس طرح انجام پانا ہے وہ بھی موجود ہے۔ اس کا ارادہ ہی ہر طرح کی علت ہے۔ ہر طرح کا سروسامان ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کہ ایک چیز ظہور میں آجائے تو بس اس کا چاہنا ہی سب کچھ ہے۔ جونہی اس کی مشیت کا فیصلہ ہوا ہر چیز ظہور میں آگئی۔ اس طرح ہر ایک انسان و حیوان کا پیدا ہونا بھی اس کے کلمہ "کن" سے باہر نہیں۔

یاد رہے کہ "اَنَّ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ" کا مطلب یہ نہیں کہ عربی کا لفظ "کن" جو کاف اور نون سے مرکب ہے وہ بولنے میں آتا ہے یا کلمہ خطاب و امر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزیں وجود میں آجاتی ہیں۔ بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ صرف اس کا ارادہ تخلیق کے لئے کافی ہے۔ اس کی قدرت کا یہ حال ہے کہ جس بات کا حکم دیتا ہے وہ بمجرد حکم ظہور میں آجاتی ہے۔ یعنی وہ اپنے ارادہ و حکم کے نفاذ میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں اس کا اپنا قانون ہی ہر حال میں کافی و وافی ہے اور جس کام کے لئے جو قانون اس نے بنایا ہے مختار کل ہونے کی حیثیت ہی سے بنایا ہے۔ کونسی چیز ہے جو اس کے کلمہ "کن" سے آخر باہر ہے؟

غور کرو کس طرح چند لفظوں میں اللہ کی خالقیت و قدرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے؟ ایسی تصویر کہ اس سے زیادہ انسانی تصور نہ کچھ سوچ سکتا ہے نہ ہی سوچ سکنے کی قدرت رکھتا ہے اس نے تمام کارخانہ ہستی کیونکر پیدا کیا؟ اور اب بھی وہ جو کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے کس طرح ظہور میں آجاتا ہے؟ اس طرح کہ اس کا حکم ہوتا ہے اور اس کا حکم ہی ساری علتوں کی علت اور سارے سببوں کا آخری سبب ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات موجود نہیں ہے جس سے تخلیق عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے انسانوں اور تمام دوسری چیزوں کی تخلیق سے الگ حیثیت قائم کی جائے اور نہ ہی حکم الٰہی کے سامنے کسی چیز کے انکار کی کوئی مجال ہے۔ جس طرح دوسرے انبیاء کرام کے ہاں بشارات الٰہی کے مطابق بچے پیدا ہوئے اسی طرح تیرا بچہ بھی بشارت الٰہی کے مطابق ضرور پیدا ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ ظہور میں آنا ہوتا ہے وہ آکر ہی رہتا ہے وقت وہی خوب سے خوب تر جاننے والا ہے کہ

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۴۸ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ

اللہ اس تیرے[۱۱۳] لڑکے کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمائے گا نیز توراۃ اور انجیل کا بھی۔ ۴۸

اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول[۱۱۴] بنا کر مبعوث کرے گا وہ لوگوں میں یہ منادی

کس چیز کو کب ظہور میں آنا ہے؟

انبیائے کرام کی تعلیم براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے

۱۱۳ نبی کی تعلیم کا بندوبست اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی اور عطائی طور پر کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ دنیا والوں پر یہ بات ثابت کر دی جائے کہ نبوت کسبی چیز نہیں ہے کہ کوئی انسان ترقی کرتے کرتے اس ترقی کے آخری زینہ تک ترقی کر جائے اور ایک وقت آئے کہ وہ نبی ہو جائے۔ نہیں بلکہ نبوت خالصتہ" وہبی چیز تھی۔ اللہ نے جہاں نبوت کا عہدہ عطا کرنا ہوتا تھا اس کی حفاظت و نگہبانی کا خاص انتظام الٰہی اس طرح ہوتا تھا کہ خود اس شخص کو بھی جس کو نبی بنانا مقصود ہوتا تھا یہ بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ گویا طبعی طور پر نبی ان باتوں سے متنفر ہوتا تھا جو بعد میں نبوت کے عہدہ کے خلاف ہوتی تھیں۔ یا نبی سے ان کا اعلان کرانا مقصود الٰہی ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت کا میلان عام انسانوں سے ہٹ کر خاص اسی نہج کی طرف جاتا تھا جو نبوت کے لئے مخصوص تھا۔ جس کی ظاہری طور پر اگر کوئی علامت نظر آتی تھی تو وہ غور و فکر اور تدبر فی الکائنات کے سوا کچھ نہ تھا۔

سیدہ مریم کو جس موعود بیٹے کی بشارت دی جا رہی تھی اس کے اوصاف بھی بتائے گئے تھے کہ تیرا لڑکا جس کی بشارت تجھے دی جا رہی ہے وہ ایسا لڑکا ہوگا جس کو کتاب و حکمت کا علم عطا کیا جائے گا یہ گویا وعدہ الٰہی ہے اور تورات جو اس سے بہت پہلے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی اس کا کامل علم بھی اس کو عطا ہوگا اور انجیل بھی اس کو عطا کی جائے گی۔

سیدہ مریمؑ کے مبشر بیٹے کے دوسرے اوصاف کا ذکر

۱۱۴ "اللہ تعالیٰ اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر مبعوث کرے گا۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے انفرادی اور اجتماعی عیوب و نقصائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو۔ وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے۔ یہود کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرت ناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور

اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لئے کیا کہ وہ حضرت یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کی نہی عن المنکر کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرت ناک سانحہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک ہی میں پیش آچکا تھا۔

پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جز و مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بد اخلاقیوں کو تو عملاً اخلاق کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اس بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علماء احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ یعنی توارت تک کو تحریف کئے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہ کیا اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔ یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو یشیعا علیہ السلام کی زبانی خود تورات نے اس طرح دکھایا ہے:

"خداوند فرماتا ہے یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔" ایک جگہ اس طرح تحریر ہے:-

"سن اے آسمان اور کان لگا اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میں نے لڑکوں کو پالا اور پوسا پر انہوں نے مجھ سے سرکشی کی۔ بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے صاحب کی چرنی کو لیکن بنی اسرائیل نہیں جانتے۔ میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے۔ آہ خطا کار گروہ۔ بد کرداری سے لدی ہوئی قوم۔ بد کرداروں کی نسل! مکار اولاد جنہوں نے خداوند کو ترک کیا۔ اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہوگئے۔ تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اور مار کھاؤ گے؟ تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل ست ہے۔" (یسعیاہ ۱: ۱ تا ۵)

بہرحال انہی تاریک حالات میں جب کئی ایک نبیوں کے قتل کے واقعات بھی ہو چکے تھے اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تھی تب وہ وقت سعید آپہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم کی آغوش میں پرورش پا کر اپنے بچپنے کے زمانہ ہی میں حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا سن رشد کو پہنچتے ہی اس نے یہ اعلان کر کے کہ "وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایت خلق اس کا فرض منصبی ہے۔" قوم میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ شرف رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیل دنیا پر چھا گیا۔ اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں، بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ کوچہ، محلوں اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغام حق سنایا:

"لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت

إِسْرَآءِيلَ ۙ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم

کرے گا کہ لوگو! میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی[۱۱۵] لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ وہ استعارات کے رنگ میں ان سے کہے گا کہ میں تمہارے لئے مٹی سے ایسی چیز بنا

میرے سپرد فرمائی ہے اس کی جانب سے پیغام ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون یعنی توراۃ ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کجروی سے پس پشت ڈال دیا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لئے خدا کی کتاب انجیل لے کر آیا ہوں۔ یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لئے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کریم کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے الفاظ کا ترجمہ سنئے اور "احقائق حق و ابطال باطل" کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے کیونکہ "تذکیر بایام اللہ" سے قرآن کریم کا مقصد عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے "اور پھر دیکھو ہم نے تمہاری راہنمائی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی پھر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہدایت کا سلسلہ پے درپے رسولوں کو بھیج کر جاری رکھا اور بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا لیکن ان میں سے ہر دعوت کی تم نے مخالفت کی پھر کیا تمہارا شیوہ ہی یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کا کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو تم اس کے مقابلہ میں سرکشی کر بیٹھو اور کسی کو جھٹلاؤ اور کسی کو قتل کر دو۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی کی وجہ سے نہیں بلکہ انکار حق کے تعصب کی پھٹکار ہے اس لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعوت حق سنیں اور قبول کریں۔ (البقرہ ۲: ۸۶، ۸۷) ایک جگہ ارشاد ہے: "اس دن اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعام کئے ہیں انہیں یاد کرو۔ جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے روح القدس سے تمہیں قوت دی تھی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے چھوٹی عمر میں بھی جبکہ ابھی بچہ کے جھولا جھولنے کا وقت ہوتا ہے اور بڑی عمر میں بھی کہ تم جوان ہوگئے تھے جب مجمعوں میں منادی کیا کرتے تھے اور جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل سکھلا دی تھی۔" (المائدہ ۵: ۱۱۰)

آیات بینات کیا ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کیا نشانی لائے تھے؟

[۱۱۵] حق و صداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ ہی سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے

ایک یہ کہ مدعی حق کی حقانیت و صداقت دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعے ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں امور عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام و خواص اس کے مقابلہ سے عاجز اور درماندہ ہو جائیں اور ان دونوں طرح کے دلائل و براہین نبوت کے لئے مخصوص رہے ہیں کیونکہ پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل و فکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعی یعنی نبی و رسول کا یہ عمل خود اس کا عمل نہیں بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے۔ اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی دلیل ہوتی تھی۔

قرآن کریم نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریق دلیل کو "حجۃ اللہ" اور "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے طریق دلیل کو "آیات بینات" اور "مبصرہ" وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ خواہ وہ توارت و انجیل و زبور ہوں یا قرآن کریم سب کی آیات کو "آیات بینات" ہی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور عوام کی زبان میں ان ہی کو "معجزات" کا نام دیا جاتا ہے اور اس طریق میں وہ تمام "پیشین گوئیاں" "تحدّیات" یعنی چیلنج وغیرہ بھی آتے ہیں جن کا وقتاً فوقتاً لسان انبیاء سے اعلان کرایا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے معجزہ کیلئے تحدّی یعنی چیلنج لازم و ضروری قرار دیا ہے۔ پھر ان سب معجزات میں سے بڑا معجزہ خود "منصب نبوت و رسالت" اور دوسرا بڑا معجزہ "پیغام رسالت" ہے' کیوں؟ اس لئے ایک عام انسان جس نے کسی کے سامنے تعلیم و تعلم کے لئے زانو تہ بھی نہ کئے ہوں یکایک "منصب نبوت و رسالت" کا اعلان کر دے اور پھر اپنے اعلان کے ساتھ ہی جس چیز کا اعلان کر رہا ہے حجتہ و دلیل اور برہان بھی پیش کر دے تو گویا دونوں کام بیک وقت ہو گئے اعلان بھی اور تحدّی یعنی چیلنج بھی اور پھر اپنے چیلنج کے ساتھ ہی دلیل و برہان بھی۔ پھر جو وہ "پیغام رسالت و نبوت" پیش کرے اس پر تحدّی پیش کر دے کہ "جو میں پیغام لایا ہوں تم سب مل کر اس کی مثل پیغام بنا کر لے آؤ" "جس طرح میں خالصتہً اللہ کے لئے پیغام الٰہی پیش کرتا ہوں اور تم سے کچھ مزدوری اور صلہ طلب نہیں کرتا" تم بھی ایسا ہی کرو۔ لیکن اس کے زمانہ میں ایک بھی ایسا نہ ہوا جو اس کے اس چیلنج کو قبول کرے اور پھر رہتی دنیا تک ایک بھی اس کی مثل نہ پیش کی جا سکے۔

رہی یہ بات کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کیا نشانی لائے تھے؟ ظاہر ہی ہے کہ وہ "منصب نبوت و رسالت" بھی لائے تھے اور "پیغام رسالت" بھی۔ کیا یہ نشانی نہ تھی؟ بالکل یہ نشانی تھی لیکن اس کا ذکر کر لینے کے بعد جو ارشاد فرمایا کہ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ کہ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں حالانکہ قبل ازیں آپ نے اعلان کر دیا تھا کہ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عیسیٰ علیہ السلام کا اعلان نہیں ہے بلکہ یہ بشارت کا حصہ ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے تولد ہونے سے پہلے سیدہ مریم کو دی گئی تھی اور اس میں مریم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا تھا کہ

"اسے یعنی تیرے بیٹے کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر مبعوث بھی کروں گا" گویا یہ بشارت کا حصہ تھا۔ جو سیدہ مریم کو عیسیٰ جیسے بیٹے کے تولد ہونے کو دی گئی۔ آگے عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے اور پرورش پانے کے تذکرہ کو چھوڑ دیا گیا کیونکہ اس جگہ اس کے تذکرہ کی ضرورت نہ تھی اور یہ جو فرمایا کہ وہ منصب رسالت پر فائز کیا جائے گا اور ساتھ ہی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کا تذکرہ کر دیا کہ وہ "پیغام رسالت" جو لے کر آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی ہو گی رہی یہ بات کہ وہ پیغام رسالت کیا ہے جس کو اس جگہ نشانی فرمایا گیا ہے؟ وہ ہے اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ میں تمہارے لئے مٹی سے ایسی چیز بنا دوں جو پرند کی سی صورت رکھتی ہو پھر اس میں پھونک ماروں اور وہ اللہ کے حکم سے پرند ہو جائے۔" یہ گویا ان نشانات نبوت یعنی "پیغام رسالت" میں سے ایک پیغام یا ایک نشانی ہے بالکل اسی طرح جس طرح انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ سے نشانیاں دی جاتی رہیں اور ان کو تمثیلات میں بیان کیا جاتا رہا۔ یہ بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تمثیلات میں سے ایک تمثیل ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کئی ایک جگہ پر کیا ہے اور یہ بات بھی قبل ازیں بتائی جا چکی ہے کہ کلام الٰہی جو لسان نبوت سے جاری کیا جاتا رہا اس میں تمثیلات کثرت سے استعمال کی گئیں تاکہ ایک بہت بڑا مضمون چند الفاظ میں بیان کر دیا جائے جس کو ہمارے ہاں محاورۃ یوں کہا جاتا ہے کہ "فلاں نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا" اور خصوصاً سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کو زیادہ ہی تمثیلات میں بیان کیا گیا ہے کیوں؟ اس لئے کہ انجیل میں اس کو انہی تمثیلات میں بیان کیا گیا تھا اور پھر قرآن کریم میں بھی بالکل اسی طرح بیان کیا جس طرح انجیل میں بیان کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے سوال بھی کیا تھا کہ آپ تمثیلوں میں باتیں کیوں کرتے ہیں؟ جس طرح انجیل میں بیان کیا گیا تھا۔

"شاگردوں نے پاس آکر اس سے کہا تو ان تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے؟ اس نے جواب میں ان سے کہا اس لئے کہ تم کو آسمان کی بادشاہی کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے مگر ان کو نہیں دی گئی۔ کیونکہ جس کے پاس ہے اسے دیا جائے گا اور اس کے پاس زیادہ ہو جائے گا اور جس کے پاس نہیں ہے اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں ان سے تمثیلوں میں اس لئے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔" (متی ۱۳: ۱۰ تا ۱۴)

متی اور لوقا کی انجیل ان تماثیل سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک جگہ تحریر ہے کہ:

"اس نے ایک اور تمثیل ان کو سنائی کہ آسمان کی بادشاہی اس خمیر کی مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانہ آٹے میں ملا دیا اور وہ ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا۔ یہ سب باتیں یسوع نے بھیڑ سے تمثیلوں میں کہیں اور بغیر تمثیل کے وہ ان سے کچھ نہ کہتا تھا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ میں تمثیلوں میں اپنا منہ کھولوں گا۔ میں ان باتوں کو ظاہر کر دوں گا جو بنائے عالم سے پوشیدہ رہی ہیں۔" (متی ۱۳: ۳۳، ۳۴)

قرآن کریم کی زیر نظر آیت میں "اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ" کے جو الفاظ ہیں وہ دراصل اس تمثیل ہی سے متعلق ہیں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خلق کے معنی دراصل التقدیر المستقیم کے ہیں یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے۔ ایک کسی چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہو اور نہ کوئی نمونہ جیسے ارشاد الٰہی ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ "پیدا کرنے والا آسمان اور زمین کا" اور دوسری جگہ خود ہی قرآن کریم نے اس کی وضاحت فرما دی کہ "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی بغیر کسی میٹریل کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا" معلوم ہوا کہ یہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے اور دوسرا ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ" کہ انسان کو اس نے پیدا کیا نطفہ سے۔ ان دونوں طرح کے خلق کا تعلق گویا نیستی سے ہستی میں لانے کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے اور کسی بھی مخلوق کا یہ فعل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ فعل اللہ کا ہے اور اس کے سوا کسی دوسرے کا یہ فعل نہیں ہو سکتا خواہ وہ کوئی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الرعد ۱۳ : ۱۶) "کیا یہ بات ہے کہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اس طرح مخلوقات پیدا کیں جس طرح اللہ نے پیدا کی ہے اس لئے پیدا کرنے کا معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا؟ تم ان سے کہو اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اپنی ساری باتوں میں یگانہ ہے سب کو مغلوب رکھنے والا۔"

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الروم ۳۰ : ۴۰) "اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے۔ پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو۔ پاک ہے وہ ذات اور بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔"

ایک جگہ فرمایا گیا:

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (فاطر ۳۵ : ۳) "کہا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر اس کی ذات تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو۔" ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (لقمن ۳۱ : ۱۰، ۱۱) "اس اللہ نے آسمانوں کو پیدا کیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی

ستون نہیں تھامے ہوئے اور زمین میں مضبوط پہاڑ ڈال دیئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلکے نہیں اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس میں ہر قسم کی عمدہ چیزیں اگائیں۔ یہ سب چیزیں تو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اب مجھے یہ تو دکھاؤ کہ اس کے سوا اوروں نے کیا پیدا کیا دراصل یہ ظالم صریح گمراہی میں مبتلا ہیں۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (فاطر ۳۵ : ۴۰) "اے پیغمبر اسلام آپ ﷺ ان سے کہہ دیں بھلا دیکھو تو جن خود ساختہ شریکوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے بھی بتاؤ کہ انہوں نے زمین میں کونسی چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کس قدر شرکت ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی بناء پر وہ کوئی واضح سند رکھتے ہیں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے کو نرے فریب کے وعدے دے رہے ہیں۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج ۲۲ : ۷۳) "اے لوگو! ایک مثال سنائی جاتی ہے غور سے سنو اللہ کے سوا جن خود ساختہ معبودوں کو تم پکارتے ہو انہوں نے ایک مکھی تک پیدا نہیں کی۔ اگر تمہارے یہ سارے معبود اکٹھے ہو کر زور لگائیں جب بھی وہ پیدا نہ کر سکیں اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ اگر ایک مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو ان میں قدرت نہیں کہ اس سے چھڑا لیں تو دیکھو طلب گار بھی یہاں درماندہ ہوا اور مطلوب بھی درماندہ یعنی مرید بھی عاجز اور پیر بھی عاجز۔"

اس طرح کی آیات کو اگر جمع کیا جائے تو بیسیوں سے بھی زیادہ قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں جن سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ خالق صرف اور صرف اللہ ہی کی ذات ہے اور اس کے سوا کوئی بھی نہیں جس نے اس کائنات میں کوئی ادنیٰ سی چیز بھی پیدا کی ہو اور نہ ہی کوئی پیدا کر سکتا ہے۔ خالق کل وہی ہے جو اللہ ہے اور اللہ وہی ہے جو خالقِ کل ہے۔

انسانوں کے حق میں بھی لفظ خلق دو معنوں میں بولا جاتا ہے ایک اندازہ کرنے کے حق میں دوسرا جھوٹ موٹ کسی چیز کے گھڑ لینے کے معنی میں والخلق لا یستعمل فی کافۃ الناس الا علی وجھین احدھما فی معنی التقدیر ..... والثانی فی الکذب (امام راغب)

اندازہ کرنے کے معنی کی مشہور مثال شاعر کا قول ہے ولا نت تفری ما خلقت و بعض القوم یخلق ثم لا یفری یعنی تو جو ارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ارادے' اندازے اور تجویزیں تو کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے اس طرح ضرب المثل ہے ما خلقت الا فریت وما وعدت الا وفیت یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں

لا دکھلیا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کر دکھلیا اور جھوٹ کے معنوں میں تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (العنکبوت ۲۹: ۱۷) "تم جھوٹ گھڑتے ہو۔"

مسیح علیہ السلام بھی ایک انسان ہی تھے بلاشبہ وہ اللہ کے رسول بھی تھے لیکن ان کے مخلوق ہونے سے آخر کون انکار کر سکتا ہے؟ پھر مخلوق اللہ کی صفت خالقیت کا کیونکر مظاہرہ کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ آیت تمثیلات قرآنی میں سے ایک تمثیل ہی ہو سکتی ہے اور تمثیل ہی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں تمہارے غور و فکر اور تفہیم کے لئے تمہاری فطرت اور جبلت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر بیان کرتا ہوں کہ جیسے پرندوں میں اڑنے کی قابلیت ہوتی ہے مگر وہ پیدا ہوتے ہی نہیں اڑتے ہاں! کچھ دنوں کے بعد پر پرزے پیدا ہونے پر اڑنے لگتے ہیں اسی طرح تمہارا حال ہے کہ میں تمہارے اندر کلام نبوت پھونکتا ہوں تو اس کا اثر پاک طینت لوگوں پر ہوتا ہے اور وہ ایمان لے آتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اللہ کے دین کے مددگار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ہی کے نفخہ نبوت کا یہ اثر تھا کہ کچھ لوگ اس طرح پکار اٹھے:

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ○ (آل عمران ۳: ۵۲، ۵۳) "ہم اللہ کے کلمہ حق کے مددگار ہیں۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اے عیسیٰ علیہ السلام آپ گواہ رہیں کہ اس یعنی اللہ کی فرمانبرداری میں ہمارا سر جھک گیا۔ خدایا! جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اور ہم نے تیرے رسول کی پیروی کی پس ہماری گنتی بھی ان لوگوں میں ہو جو حق کی شہادت دینے والے ہیں۔"

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ○

(المائدہ ۵: ۸۴)

"اور کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس کے کلام پر جو سچائی کے ساتھ ہمارے پاس آیا ہے ایمان نہ لائیں اور اللہ سے اس کی توقع نہ رکھیں کہ وہ ہمیں نیک کردار انسانوں کے گروہ میں داخل کر دے؟"

بلاشبہ مفسرین اسلام کی کثیر تعداد یہ کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی پرند بنایا کرتے تھے اور مشہور یہ ہے کہ آپ نے سوائے چمگادڑ کے اور کوئی پرند پیدا نہیں کیا۔ پھر اس جگہ ہمارے مفسرین دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں کچھ مفسرین کا خیال یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے تو آپ کچھ گیلی مٹی لے کر اس کی پرند کی سی شکل بنا کر بچوں کے سامنے اس میں پھونک لگاتے تو وہ پرند واقعی اڑ جاتے۔ اور کچھ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ ایک اختراعی معجزہ تھا کیونکہ بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ چمگادڑ بنا کر اڑاؤ تب ہم ایمان لائیں گے اس لئے عیسیٰ علیہ السلام نے چمگادڑ کو بنایا۔ یہاں پہنچ کر ہمارے ان مفسرین کے پھر دو

گروہ ہوئے ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ بنائے گئے چمگادڑ جب تک نظر آتے رہتے زندہ اڑائی دیتے تھے اور جب نظر سے غائب ہو جاتے تو مر کر گر جاتے تھے تاکہ اللہ کے بنائے گئے چمگادڑوں میں مل کر اشتباہ پیدا نہ کریں اور کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ چمگادڑ سیدنا مسیح علیہ السلام ہی کی پیدائش میں سے ہیں جو آج بھی اڑتے پھرتے نظر آتے ہیں یہ انہیں چمگادڑوں کی نسل ہے۔ مفسرین کا یہ اختلاف کیوں ہوا؟ وجہ اختلاف بالکل واضح ہے کہ ایک صاحب شعور جب "اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ" اور "اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ" "قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ" اور "هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ" اور "لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ" جیسے ارشادات خداوندی پڑھے گا تو اس کو "اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ" کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنا ہو گی جب کہ وہ قرآن کریم میں تاویل کو جائز سمجھتا ہے۔ اور ہمارے مفسرین کی اکثریت تاویل کو جائز ہی سمجھتی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی نے کوئی تاویل کی اور کسی نے کوئی جس کا نتیجہ اختلاف ہی تھا اور وہی ہوا۔ چونکہ ہماری تفہیم کے مطابق تو قرآن کریم میں کوئی تاویل جائز ہی نہیں جیسا کہ اصول تفسیر میں ۱۵ نمبر پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ہم اس پوری آیت مبارکہ کو اور اس جیسی بہت سی آیات کریمات کو تمثیلات قرآنی میں سے ایک تمثیل سمجھتے ہیں جیسا کہ اصول تفسیر ہی کے نمبر ۱۳ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

قرآن کریم کی سولہویں سورت جس کو النحل کا نام دیا گیا ہے کی آیت نمبر ۲۰ اور ۲۱ میں ارشاد الٰہی اس طرح ہوا ہے وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ "اللہ کے سوا جن ہستیوں کو یہ پکارتے ہیں ان کا تو حال یہ ہے کہ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے وہ خود کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں وہ مردے ہیں نہ کہ زندگی رکھنے والے انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ کب موت سے اٹھائے جائیں گے۔"

اس محولہ بالا آیت سے صرف ایک آیت قبل اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ "کیا جو خلق کرتا ہے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خلق نہیں کرتا؟" اب اگر مسیح علیہ السلام کا "خلق طیور" مانا جائے اور اللہ تعالیٰ تو "خالق طیور" ہے ہی تو مسیح علیہ السلام "مَنْ یَّخْلُقُ" ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہوا بلکہ خدا جیسا ہوا کیونکہ خدا بھی خالق طیور ہے اور مسیح علیہ السلام بھی تو وہ آیات کریمات جن سے صاف صاف واضح ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق کسی شے کا نہیں ہے۔ پھر صرف یہی نہیں بلکہ اس طرح خود قرآن کریم میں اختلاف ہو جائے گا اور ایسا ہونا محال ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا من عنداللہ ہونا اسی سبب سے ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف ہوتا۔ اس لئے یہ کسی حال میں بھی تسلیم نہیں کہ اللہ تعالیٰ بار بار اسی قانون کا اعلان کرے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کا خالق نہیں اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے انہوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا پھر خود ہی یہ کہہ دے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا

کئے تھے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ ایک تمثیل ہے جو محض تفہیم قوم کے لئے بیان کی گئی ہے کہ میرا کام نفخہ نبوت ہے اور میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے گا اپنے قانون مشیت کے مطابق دے گا اور جس کو ہدایت پانا مشیت ایزدی میں موجود ہے وہ میرے اس نفخہ نبوت سے فائدہ حاصل کر کے طیر یعنی پرند کی طرح اوپر کو پرواز کر کے جنتی زندگی کو حاصل کر لے گا اور جس کو ہدایت پانا مشیت ایزدی میں نہیں ہے وہ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ (بقرہ ۲) زمین کے ساتھ لگ کر یعنی زمین کی طرف مائل ہو کر صرف اور صرف دنیوی زندگی کا ہو کر رہ جائے گا۔ پھر جنہوں نے نفخہ نبوت کو قبول کیا ان کا ذکر قرآن کریم نے "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" جیسی آیات کریمات میں کر دیا اور جو زمین کی طرف مائل ہوئے ان کا ذکر "فَلَمَّا اَحَسَّ مِنْهُمُ الْكُفْرَ" "فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" جیسی آیات میں کر دیا گیا جو عن قریب آگے آرہی ہیں۔

رہی یہ بات کہ مسیح علیہ السلام کا پیدا کرنا بذاتہ نہ تھا بلکہ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" تھا تو یہ بات اس وقت ہی کہی جا سکتی ہے جب یہ تسلیم ہو جائے کہ کچھ کام دنیا میں بغیر اذن اللہ کے بھی ہوتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کی تعلیم سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ تو یہی ہے کہ پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے' ہو رہا ہے یا ہوگا سب "باذن اللہ" تھا' ہے اور ہوگا۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں خود قرآن کریم نے "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا لفظ بیسیوں بار استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم ہی کے دیکھ لینے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ کتاب اللہ میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر یہ لفظ کبھی "بِاِذْنِ اللّٰهِ" "بِاِذْنِیْ" "بِاِذْنِ رَبِّهٖ" "بِاِذْنِ رَبِّهَا" "بِاِذْنِ رَبِّهِمْ" اور "فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے استعمال ہوا ہے لیکن معانی و مفہوم کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں۔ ہمارے مفسرین کا سارا زور اسی بات پہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ پیدا کیا وہ چونکہ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" تھا اس لئے دراصل وہ تخلیق اللہ ہی کی تھی عیسیٰ علیہ السلام تو صرف درمیان میں ایک نشانی کے طور پر تھے۔ اس طرح بات سے بات نکالی گئی فرضی باتیں اور قصے گھڑے گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تفصیل میں گئے بغیر ہم قرآن کریم کی ان آیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیں کہ وہ خود براہ راست قرآن کریم پر غور کریں اور جس نتیجہ پر وہ پہنچیں وہی ان کے لئے یقیناً مفید ہوگا اور اس خاکہ کے بعد ہم اپنی تفہیم بھی بیان کر دیں گے۔ انشاء اللہ

"بِاِذْنِ اللّٰهِ" کے الفاظ:

۱۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ البقرہ ۲: ۹۷) (اے پیغمبر اسلام! یہ اللہ کا کلام ہے جو جبرئیل نے "اللہ کے حکم سے" تمہارے دل میں اتارا ہے پھر جبرئیل سے دشمنی ان کی کیسی؟)

۲۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۰۲) "وہ کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے ہاں! یہ ہو سکتا تھا کہ "اللہ کے حکم سے" کسی کو نقصان پہنچنے والا ہو اور نقصان پہنچ جائے۔"

۳ - كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۲: ۲۴۹) "کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر "اللہ کے حکم سے" غالب آگئیں۔"

۴ - فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ "انہوں نے "اللہ کے حکم سے" اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی۔"

۵ - وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (ال عمران ۳: ۱۴۵) "اور یاد رکھو "اللہ کے حکم کے بغیر" کوئی جان مر نہیں سکتی۔"

۶ - وَمَا اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (ال عمران ۳: ۱۶۶) "اور دیکھو دو گروہوں کے مقابلے کے دن یعنی جنگ احد میں جو کچھ پیش آیا تھا تو "اللہ ہی کے حکم سے" پیش آیا تھا۔"

۷ - وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴: ۶۴) "اے پیغمبر اسلام! ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا تو اس لئے کیا کہ "اللہ کے حکم سے" اس کی اطاعت کی جائے۔"

۸ - وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (الانفال ۸: ۶۶) "اب اگر تم میں ایک سو آدمی ہوں گے تو "اللہ کے حکم سے" اپنے سے دوگنی تعداد یعنی دو سو دشمنوں پر غالب رہیں گے۔"

۹ - وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یونس ۱۰: ۱۰۰) اور یاد رکھو کہ کسی جان کے اختیار میں نہیں کہ وہ ایمان سے آئے مگر یہ کہ "اللہ کے حکم سے۔"

۱۰ - وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (الرعد ۱۳: ۳۸) "کسی رسول کے لئے یہ بات نہ ہوئی کہ وہ خود کوئی نشان لا دکھاتا مگر "اللہ کے حکم سے" ایسا ہوا۔"

۱۱ - وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (فاطر ۳۵: ۳۲) "اور ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو "اللہ کے حکم سے" تمام اعمال حسنہ اور اعمال صالحہ میں اوروں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔"

۱۲ - وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (المومن ۴۰: ۷۸) "کسی رسول کے لئے یہ بات نہ ہوئی کہ وہ خود کوئی نشانی دکھائے مگر "اللہ ہی کے حکم سے" ایسا ہوا۔"

۱۳ - لَيْسَ بِضَاۤرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (المجادلہ ۵۸: ۱۰) "حالانکہ بغیر "اللہ کے حکم کے" یعنی مشیت الٰہی کے یہ سرگوشیاں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔"

۱۴ - مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۤىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر ۵۹: ۵) "اے مسلمانو! جن کھجوروں کے درختوں کو تم نے کاٹ ڈالا یا جن کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا یہ سب "اللہ ہی کے حکم سے" ایسا ہوا ہے۔"

۱۵ - مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (التغابن ۶۴: ۱۱) "کوئی مصیبت نہیں آتی مگر "اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے" آتی ہے۔"

۱۶۔ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳ : ۴۹) "پھر میں اس میں پھونک ماروں اور وہ "اللہ کے حکم سے" پرند ہو جائے۔"

"باذنه" کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

۱۷۔ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (البقرہ ۲ : ۲۱۳) "پس جو لوگ انبیاء کرام پر ایمان لے آئے انہیں "اللہ نے اپنے حکم سے" اس حق کا راستہ دکھا دیا۔"

۱۸۔ وَاللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرہ ۲ : ۲۲۱) "اللہ اپنے حکم سے" تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔"

۱۹۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ ۲ : ۲۵۵) "کون شخص ہے جو اس کے سامنے "اس کے حکم" کے بغیر کسی کی شفاعت کے لئے زبان کھولے۔"

۲۰۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (اٰل عمرٰن ۳ : ۱۵۲) "اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدہ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم "اس کے حکم سے" دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے تھے۔"

۲۱۔ وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ (المائدہ ۵ : ۱۶) "اور "اپنے حکم سے" انہیں تاریکیوں سے نکالتا ہے۔"

۲۲۔ یَوْمَ یَاْتِ لَا تُكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (ھود ۱۱ : ۱۰۵) "جب وہ دن آپہنچے گا تو کسی جان کی مجال نہ ہوگی کہ بغیر "اس کے حکم کے" زبان کھولے۔"

۲۳۔ وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (الحج ۲۲ : ۶۵) "اس نے آسمانوں کو تھام رکھا ہے کہ زمین پر گریں نہیں اور گریں تو "اس کے حکم سے" جب بھی گریں۔"

۲۴۔ وَدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ (الاحزاب ۳۳ : ۴۶) "اور اے پیغمبر اسلام! تو "اس کے حکم سے" اللہ کی وفاداری کی دعوت دینے والا ہے۔"

۲۵۔ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ (الشوریٰ ۴۲ : ۵۱) "اور وہ "اپنے حکم سے" جو کچھ چاہے وحی کر دے یا کسی فرشتے کو وحی دے کر بھیج دے۔" بِاِذْنِ رَبِّهٖ" "بِاِذْنِ رَبِّهِمْ" "بِاِذْنِ رَبِّهَا" اور "بِاِذْنِیْ"

۲۶۔ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (الاعراف ۷ : ۵۸) "اور دیکھو اچھی زمین "اپنے پروردگار کے حکم سے" اچھی پیداوار ہی نکالتی ہے۔"

۲۷۔ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا ۳۴ : ۱۲) "اور جنات میں سے بعض وہ تھے جو سلیمانؑ کے "رب کے حکم سے" اس کے سامنے کام کرتے تھے۔"

۲۸۔ وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (ابراہیم ۱۴ : ۲۳) "اور دیکھو جو لوگ ایمان لائے تھے جنہوں نے نیک کام کئے تھے وہ نعیم ابدی کے باغوں میں

داخل ہوگئے ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ "اپنے پروردگار کے حکم سے" ہمیشہ انہیں میں رہیں گے۔"

۲۹۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (القدر ۹۷: ۴) "ملائکہ سماوی اور روح الٰہی یعنی جبریلؑ کا اس میں "ان کے رب کے حکم سے" ہر طرف سے نزول ہوتا ہے۔"

۳۰۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم ۱۴: ۲۵) "وہ درخت" اپنے رب کے حکم سے" ہر وقت پھل پیدا کرتا رہتا ہے۔"

۳۱۔ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ (المائدہ ۵: ۱۱۰) "اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم اے عیسیٰ "میرے حکم سے" مٹی سے ایک پرندے جیسی شکل کی چیز بناتے تھے پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو "میرے حکم سے" وہ پرندہ بن جاتا تھا۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم "میرے حکم سے" اندھوں اور برص والوں کو درست کرتے تھے اور جب ایسا ہوا تھا کہ "میرے حکم سے" مردوں کو موت کی حالت سے باہر لے آتے تھے۔"

اوپر درج کی گئی آیات کو قرآن کریم سے دیکھ کر پڑھو اور ان کے ترجمہ پر غور کرو اور دیکھو کہ کوئی کام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ دکھ ہے تو اللہ کے حکم سے سکھ ہے تو اللہ کے حکم سے۔ مصیبت کا پہنچنا ہے تو اللہ کے حکم سے۔ موت کا آنا ہے تو اللہ کے حکم سے۔ فتح ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے۔ شکست کھانا ہے تو اللہ کے حکم سے کوئی غالب آتا ہے تو اللہ کے حکم سے کوئی مغلوب ہوتا ہے تو اللہ کے حکم سے۔ کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے تو اللہ کے حکم سے۔ رسول پر کوئی نشانی اترتی ہے تو اللہ کے حکم سے۔ کوئی جنت میں جائے گا تو اللہ کے حکم سے اور کسی کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا تو اللہ کے حکم سے آسمان سے فرشتے نازل ہوتے ہیں تو اللہ کے حکم سے اور زمین کا کوئی ٹکڑا فصل پیدا کرتا ہے تو اللہ کے حکم سے کیا یہ سارے کام معجزات ہیں۔ کیا یہ سب کام قانون قدرت کے مطابق نہیں ہو رہے؟ بلاشبہ یہ سارے کام قانون قدرت کے مطابق ہیں اور سارے کام ہی "باذن اللہ" ہیں کسی کام کے "باذن اللہ" ہونے کے یہ معنی ہرگز ہرگز نہیں کہ وہ قانون قدرت کے خلاف ہے اس لئے "باذن اللہ" ہے۔ بالکل اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نفخہ نبوت و رسالت بھی اللہ کے اذن سے ہے اور کفر کے موت مرنے والوں کو جب اسلامی زندگی نصیب ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے حکم سے ہوگی۔ منافقین ملت کا اگر نفاق سے نکلنا ہے تو وہ اللہ ہی کے حکم سے ہو سکتا ہے ورنہ کسی نبی و رسول کے اختیار میں اللہ نے کسی کی ہدایت نہیں دی کہ وہ جب چاہے کسی کو ہدایت دے دے۔ رسول کا کام پیغام رسالت پہنچانا ہے بس پھر جو کوئی اس کی لائی ہدایت کو مانتا ہے تو فائدہ اس کا اپنا ہے اور بالکل اسی طرح نہ ماننے والے کا نقصان بھی اپنا ہی ہے۔ قانون الٰہی سے کوئی چیز بھی باہر نہیں اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔

ہمیں ان معجزات کے معجزات ہونے سے نہ انکار ہے نہ کوئی شک ہے ہمیں انکار ہے تو صرف اس بات

سے ہے کہ اللہ کی صفات خاص بندہ میں تسلیم کی جائے ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی صفات ایک بندہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتیں اور نہ ہی کوئی انسان ان کی کلی صفات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مسیح علیہ السلام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ "اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" اور سارے رسولوں کا یہی حال ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کا ہے۔

یاد رہے کہ نبی و رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی تھا اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اس فرض منصبی کو انجام دیتے تھے اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہ صداقت دکھاتے تھے۔ وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ فطرت اور ماورائے فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی ان کا کار منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتے رہے کہ ہم خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آئے ہیں۔ ہم انسان ہیں اور اللہ کے نبی و رسول اس سے زائد اور کچھ نہیں تو پھر ان کے دعوئے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لئے ان کی تعلیم ان کی تربیت اور ان کی شخصیت کا زیر بحث آنا یقیناً معقول لیکن ان سے ماوراء فطرت عجائبات غرائب کا مطالبہ خلاف عقل اور بے جوڑ سی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیب حاذق کے دعویٰ حذاقتِ طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی طور پر ایک لوہے کی الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا صندوق بنا کر دکھائے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ایک ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراض جسمانی ہی کا ہے۔ اسی طرح کسی نبی و رسول نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ ہر نبی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ تمام امراض روحانی کے لئے ایک طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔ پس دعویٰ نبوت اور ان فرضی کہانیوں کے درمیان کوئی تعلق قائم نہیں ہوتا اور نہ ہی ان باتوں کو معجزات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ہاں! ان امراض روحانی کے علاج کے لئے انبیاء کرام آتے رہے جن بیماروں نے انبیاء کرام کا لایا ہوا علاج قبول کیا اور پرہیز بھی کی وہ یقیناً صحت مند ہوئے ہاں! ان کا صحت یاب ہونا بھی من جانب اللہ ہی تھا اور اب انبیاء کرام کا سلسلہ ہمارے نبی اعظم و آخر پر ختم کر دیا گیا اور انبیاء کرام کی اسی وراثت کے حق دار علمائے حق قرار دیئے گئے لیکن بدقسمتی سے علمائے حق کا سلسلہ روز بروز تنگ ہوتا گیا اور اس کی جگہ علمائے سُوٗ نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔

بلاشبہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام سے معاندین تو معاندین ماننے والوں نے بھی خلاف عقل اور ماورائے فطرت باتوں کا مطالبہ کیا اور ایسے ایسے بوگس مطالبات کئے جن کا انبیاء کرام کی دعوت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر یہ بات بھی یقینی ہے کہ معاندین کے ان مطالبات کا مقصد راہ ہدایت قبول کرنا نہیں تھا بلکہ الٹا مذاق اور تمسخر ہوتا تھا۔ اسی جگہ ہم دونوں قسم کے لوگوں کی ایک ایک مثال پیش کرتے ہیں اس کو مدنظر رکھ کر قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے بیسیوں مثالیں خود تلاش کر سکیں گے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے ماننے والوں نے یہ مطالبہ کیا اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (المائدہ ۵ : ۱۱۲) "اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے۔ عیسیٰؑ نے کہا خدا سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔"

مسیح علیہ السلام کے حواریوں یعنی ماننے والوں نے جو سوال کیا تھا ذرا بغور پڑھ لو "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تمہارا پروردگار آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار سکتا ہے؟" پھر عیسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی غور سے پڑھ لو کہ "خدا سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" گویا حواریوں کا سوال سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے سمجھا کہ ایمان کے منافی ہے۔ ایمان والے آدمی ایسا سوال نہیں کرتے کیوں؟ اس لئے کہ اس سوال کا تعلق نبوت و رسالت کے پیغام کے ساتھ مطلق نہیں۔ یہ سوال اس دعوت کے متعلق نہیں جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کی تھی اور غیر متعلق سوال اگر ایمان کے منافی نہ بھی ہو تو اس کو اچھا بہرحال نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی یہ سوال عقل مندی اور سمجھ داری کا سوال کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ دعویٰ نبوت و رسالت کے متعلق نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں ہوا اگر ہوا تو کیسے اور اگر نہیں نازل ہوا تو کیوں؟ اور آیت کی مکمل تشریح تو ان ساری باتوں کا جواب تو اپنے مقام ہی پر ہوگا۔

ہاں! اس وقت تو غور کرنے کی یہ بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انہوں نے قوم کے سامنے کیا تھا ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کے چار معجزوں کا بصراحت ذکر کیا ہے کہ ۱۔ وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تھے ۲۔ اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے ۳۔ وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی ۴۔ وہ یہ بھی بتا دیتے تھے کہ کسی نے کیا کھایا ہے اور کیا خرچ کیا ہے اور کیا کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟ مسیحا کے یہ چار معجزات ملاحظہ کر چکنے والے یہ سوال کر رہے ہیں کہ "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے" گویا آسمان سے ایک خوان کا اتارنا اتنا بڑا کام ہے جو مردوں کو زندہ کرنے۔ پیدائشی نابینوں کو بینا کرنے اور جذامیوں کو چنگا کرنے اور مٹی سے پرند بنا کر ان میں روح پھونک کر زندہ کرنے۔ اس بات کی خبر دینے سے کہ آج تم نے کیا کھایا اور کیا ذخیرہ کیا کوئی بڑا کام ہے کہ اب جب خوان اترے گا اور وہ خوان کے اترنے کا مشاہدہ کریں گے تو ان کی ایمانی قوت بڑھ جائے گی۔ غور کرو کہ جن لوگوں کے ایمان کو مردوں کے زندہ ہونے' نابینوں کے بینا ہونے کوڑھیوں کے چنگا ہونے اور پرندے بنا کر ان میں روح پھونکے سے تقویت نہیں ہوئی وہ اگر خوان کو دیکھ لیں گے تو کیسے تقویت مل جائے گی؟ ہاں! اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بھی مردوں کے زندہ کرنے وغیرہ کے الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہیں۔ بلکہ یہ ایک تمثیلی بیان ہے پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ حواریوں کی زبان سے یہ جملہ سن کر "گیا

آپ کا رب طاقت رکھتا ہے کہ آسمان سے خوان نازل کرے" حواریوں کو فرماتے ہیں کہ "خدا سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" یہ نہیں فرماتے کہ میں تمہارے مردے زندہ کر دیتا ہوں۔ تمہارے نابینا بینا کر دیتا ہوں اور تمہارے کوڑھیوں کو چنگا کر دیتا ہوں اتنے معجزات دیکھنے کے بعد تم یہ کیوں کہتے ہو کہ "کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ خوان نازل کر دے۔" بلکہ عیسیٰ علیہ السلام ان کو جواب دیتے ہیں کہ "خدا سے ڈرو اور ایسی فرمائشیں نہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔"

عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہتے ہیں کہ "ہمارا مقصود اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں غذا میسر آئے تو اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے جو کچھ بتلایا وہ سچ تھا "وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا" اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔" (المائدہ ۵ : ۱۱۳)

پھر عیسیٰ علیہ السلام اللہ سے درخواست کرتے ہیں "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لئے اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے فضل و کرم کی ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔" (المائدہ ۵ : ۱۱۴) اس درخواست ہی سے خوان کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ خوان سے مراد کیا ہے؟ خصوصاً یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام حواریوں کی فرمائش کے لئے کیا چاہتے ہیں؟ "وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ"

اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا جواب اس طرح دیتے ہیں "میں تمہارے لئے خوان بھیج دوں گا لیکن جو شخص اس کے بعد بھی راہ حق سے انکار کرے گا تو میں اسے پاداش عمل میں عذاب دوں گا ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ایسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔" (المائدہ ۵ : ۱۱۵) یہ الفاظ خود اس کی وضاحت کر رہے ہیں کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حواریوں کا ایسا سوال غیر معقول نظر آیا تھا اور ان کو جواب دیا تھا کہ "اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو" اللہ تعالیٰ کو بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا سوال بھلا معلوم نہ ہوا اس لئے ان کو خوب ڈانٹ پلا دی جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۵ کے حوالے سے اوپر درج ہو چکا۔

یہ تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت ماننے والوں کے ایک مطالبہ کا بیان تھا۔ پھر ان کے اس غیر معقول مطالبہ کا جو حشر ہوا وہ آپ پڑھ چکے اب آپ نبی اعظم و آخر ﷺ کا حال پڑھیں کہ جب آپ ﷺ کی دعوت ارشاد و تبلیغ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازراہ تعنت و سرکش عجائبات اور خوارق عادت امور کا مطالبہ کرنے لگے حالانکہ ان کے مطالبہ کا تعلق نبوت و رسالت سے کچھ بھی نہ تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کو اطلاع دی کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں۔ میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے' خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لئے "نبی و رسول" ہوں۔ قرآن کریم

مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ

دوں جو پرند کی سی صورت رکھتی ہو پھر اس میں پھونک ماروں اور وہ اللہ کے حکم سے پرند ہو جائے۔ اللہ کے حکم سے[۱۱۶] اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کر دوں اور کفر کی موت

نے اسی طرح اس کا ذکر فرمایا:

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۰، ۹۳) "اور مخالفین نے کہا ہم تو اس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں جب تک کہ تو اس طرح کی باتیں کر کے نہ دکھا دے مثلاً ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے یا جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لئے مہیا ہو گیا ہے یا ایسا ہو کہ تو بلند ہو کر آسمان پر چلا جائے اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا تو بھی ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک کہ تو ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر نہ اتار لائے اور ہم خود اسے پڑھ کر جانچ لیں۔ اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہہ دے "سبحان اللہ! میں نے کچھ خدائی کا دعویٰ تو کیا نہیں میں اس کے سوا کیا ہوں؟ کہ ایک آدمی ہوں پیغام حق پہنچانے والا۔"

ان دونوں مثالوں سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ تعلیم حق کی روشنی وحی الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین اور اصول دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلب معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول وحی الٰہی کی روشنی میں حجۃ و برہان کے ذریعہ تعلیم حق جاری رکھیں اور مخالفین یا ماننے والوں کی بے وقوفی کے سوالات کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماورائے فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیم حق کے دلائل و براہین کی روشنی حجت و بینہ سے اس لئے منہ پھیرے اور اس لئے اس کا انکار کر دے کہ اس کی طلب پر انبیاء اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ

مرے ہوؤں کو زندہ اور جو کچھ تم کھاتے[۱۱۷] ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے جمع کرتے ہو سب تمہیں بتلا دوں۔ اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو تو یقیناً ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی ہی نشانی ہے۔ ۴۹

وہ یہ بھی کہے گا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے

عیسیٰ علیہ السلام جن اندھوں کو بینا اور جن مردوں کو زندہ کرتے رہے

۱۱۶ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تمثیلات و استعارات میں جن مردوں کو زندہ' جن اندھوں کا بینا' جن کوڑھیوں کو چنگا اور جن کی ہیئت میں پرندوں کی سی پرواز کا ذکر ہے وہ وہی مردے' اندھے اور کوڑھی ہیں جن کے علاج کے لئے وحی الٰہی کا بندوبست کیا گیا تھا اور جن بیماروں کے لئے ابوالبشر آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اعظم و آخر محمد رسول اللہ ﷺ تک سارے انبیاء کرام مختلف ادوار میں مختلف قوموں کے پاس بھیجے جاتے رہے۔ ان مردوں' اندھوں' بہروں اور کوڑھیوں کا ذکر پہلے تفسیر البقرہ کے حاشیہ نمبر ۳۹ میں تفصیل سے گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ کر لیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کا یہ خبر دینا کہ تم نے کیا کچھ کھایا اور کیا ذخیرہ کیا

۱۱۷ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے جمع کرتے ہو سب تمہیں بتلا دوں۔" بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوت رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کی پیش کردہ آیات بینات کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازراہ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدا کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ علیہ السلام ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحی الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دے دیا کرتے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲) لیکن قرآن کریم کے بیان کے مطابق یہاں کسی نے کوئی سوال نہیں اٹھایا جس کا آپ نے جواب دیا بلکہ قرآن کریم نے جس انداز سے اس کو بیان کیا ہے اس کو غور کر ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کے بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پیغام ہدایت و تبلیغ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک' دولت و ثروت کے لالچ اور عیش پسند زندگی کی

مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ

تصدیق کروں اور بعض چیزیں جو تم پر حرام ہو گئی ہیں یعنی تم نے حرام کر لی ہیں انہیں تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تمہارے رب کی طرف سے[۱۱۸] نشانی یعنی نبوت لے کر

رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیب بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان ان کے مواعظ حسنہ سے نفرت و اعراض کے باوجود باور کراتے کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ لہٰذا قدرت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا "نشان" عطا کیا یعنی ان کے حال سے باخبر کر دیا گویا یہ پیغام نبوت تھا جو عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچایا گیا اور اس طرح عیسیٰ علیہ السلام ان کو حقوق اللہ اور حقوق انسانی کے اتلاف پر جو وہ کھاتے اور جو ذخیرہ اندوزی کرتے اس کی حلت و حرمت سے ان کو آگاہ کر دیتے جس سے ان کے سارے کئے دھرے کا پردہ چاک ہو جاتا۔

عیسیٰ علیہ السلام نے یہود کی حلت و حرمت میں دخل اندازی کی نشاندہی فرما دی

[۱۱۸] نبوت کے اجراء سے لے کر ختم نبوت تک جتنے انبیاء کرام اس دنیا میں تشریف لائے وہ کسی قوم کی طرف اور کسی علاقہ میں بھی مبعوث ہوئے چونکہ ان سب کا مخرج انبعاث ایک تھا لہٰذا ان کے اصول تعلیم ایک ہی طرح کے تھے اور ہر آنے والا اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا تھا۔ ہر نبی نے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ یہ تعلیم نبی کی ہے اور یہ یہ باتیں تم نے یعنی اس کی قوم نے اپنی طرف سے داخل تعلیم کر دی ہیں جن کا نبوت کی لائی ہوئی تعلیم کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی اصول کے مطابق سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی یہود سے یہی کہہ رہے ہیں کہ میں شریعت موسوی کو مٹانے کے لئے نہیں اس کی تجدید و تصدیق کے لئے آیا ہوں اور اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں موجود ہیں مثلاً: "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔" (متی ۵: ۱۷) "آسمان و زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے مٹ جانے سے آسان ہے۔" (لوقا ۱۶: ۱۷) ہاں! علمائے یہود نے فقہی موشگافیوں سے بعض حلال چیزیں حرام کر لی ہیں اور حرام چیزیں حلال کر لی ہیں اور ان کی نشاندہی کر کے قانون الٰہی میں جو حلال ہیں ان کو حلال اور جو حرام ہیں ان کو حرام بیان کرتا ہوں اس سے شریعت موسوی کی تصدیق ہوتی ہے تکذیب نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام قوم یہود کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں مثلاً: "اے محنت اٹھانے والو! اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دوں گا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھ لو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا نرم

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ
رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَلَمَّآ اَحَسَّ

تمہارے پاس آیا ہوں دیکھو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت و فرمانبرداری کرو۔ ۵۰

بلاشبہ اللہ میرا اور تمہارا سب کا رب ہے پس اس کی بندگی کرو۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ ۵۱

پھر جب ایسا ہوا کہ عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل میں کفر یعنی اپنی دعوت کے خلاف کام

ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۲ : ۲۸، ۳۰) یعنی تمہارے حبروں اور ربیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں اس سارے بوجھ کو تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

متقی وہی ہے جو رسول کی اطاعت کرے

۱۱۹ "میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔" سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کردہ بہت سے نشانات کے بعد دوبارہ ارشاد فرمانا کہ میں تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں کا مطلب کیا ہوا؟ یہی کہ سارے نشانات میں سے بڑی نشانی تو خود منصب نبوت و رسالت ہے۔ جس سے بڑھ کر کوئی بڑی نشانی نہیں ہو سکتی۔ انبیائے کرام کو جو "آیات بینات" دیئے گئے ان کا ماحصل کیا تھا؟ یہی کہ تم میرے نبی و رسول کی نبوت و رسالت کو قبول کر لو۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ خدا کی طرف سے رسول اس لئے نہیں آتا کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور اب اطاعت و فرمانبرداری بھی صرف اور صرف اسی کی کرنا ہے اور اس چیز کا نام رسول کی رسالت پر ایمان لانا ہے۔ یہ نہیں کہ زبان سے اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور بار بار منہ سے کہتے رہو کہ ہم تو ایمان لے آئے نبوت و رسالت کو ہم نے مان لیا۔ رسول کی رسالت پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ایمان لے آئے تو اب اطاعت و فرمانبرداری بھی صرف اور صرف اسی کی کرنا ہے اور اسی چیز کا نام رسول کی رسالت پر ایمان لانا ہے یہ نہیں کہ زبان سے اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ فقہی مسالک اختیار کرنے والوں کو گوش ہوش سے سن لینا چاہئے کہ رسول کے آنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اس کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی مزید تشریح سورہ الشعراء میں ملے گی جہاں پر رسول کی مختصر تعلیم کے بعد یہ جملہ بار بار دہرایا گیا ہے۔ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ"

مختصر یہ کہ نبی و رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی بیان ہوا کہ مَنْ

یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴ : ۸۰) "جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی" اس لئے کہ اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں جب تک کہ رسول کی اطاعت نہ کی جائے کیونکہ رسول ہی وہ ذات ہے جو یہ بتاتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے خواہ وہ حکم نفی ہو یا اثبات ہو انسان ہر معاملہ میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا اور کامیابی کا انحصار بھی اس بات پر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (الاحزاب ۳۳ : ۷۱) "اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی۔" اور یہی بات اس آیت میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمائی۔

عیسیٰ علیہ السلام کا اعلان کہ ربوبیت صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے

۱۲۰ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زبان رسالت سے اس کا اعلان کرایا جا رہا ہے کہ "میری قوم کے لوگو! اللہ میرا اور تمہارا سب کا رب ہے۔ پس اس کی بندگی کرو یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔" جب سے نظام کائنات مشیت ایزدی نے ترتیب دیا اس وقت سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جتنے انبیاء کرام آئے سب کی دعوت یہی تھی کہ "اللہ کی ذات کے سوا کوئی الٰہ اور معبود نہیں وہی ساری کائنات کا رب بھی ہے۔" لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قوموں اور امتوں نے ہمیشہ انہی لوگوں کو جو یہ صدا بلند کرنے والے تھے الٰہ اور معبود بنایا اور رب بنا کر ان کی پوجا و پرستش کرنی شروع کر دی۔

قرآن کریم سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں بھائیوں کو رسول بنا کر جب فرعون کی طرف بھیجا تو ان سے کہا کہ تم دونوں بھائی جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے الٰہی پیغام جب فرعون تک پہنچا دیا تو فرعون بڑا متعجب ہوا اور کہنے لگا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بزبان رسالت جواب دیا اور فرمایا "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور پھر اس کو راستہ بھی بتا دیا۔"

فرعون کے اس سوال کا منشا کیا تھا؟ یہی کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو۔ مصر اور اہل مصر کا رب تو میں ہوں۔ اس نے ایسا کیوں کہا؟ اس لئے کہ وہ اہل مصر سے اپنی ربوبیت کو منوا چکا تھا۔ اور وہ استفساراً ان سے اس سے پہلے بھی دریافت کر چکا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اے اہل مصر کیا تمہارا رب اعلیٰ میں ہوں؟ (سورہ نازعات) اور ایک جگہ اس کی زبان سے قرآن کریم نے یہ جملہ بھی درج کیا ہے کہ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (سورہ زخرف) اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ خیال رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی اس لئے فرعون کا دعویٰ "واحد مرکز پرستش"

عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ

دیکھا تو وہ پکار اٹھا کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہو؟ اس پر اس کے چند حواریوں نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں ہم

ہونے کا نہ تھا بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ربوبیت و خداوندی کا مدعی تھا اور یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرمانروا ہو جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔ بعض لوگوں کو اس کی لن ترانیوں سے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ اللہ کی ہستی کا منکر تھا اور خود خدا ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا مگر یہ بات قرآن کریم سے ثابت ہے کہ وہ عالم بالا پر کسی اور کی حکمرانی مانتا تھا۔ اس کی تصدیق مطلوب ہو تو سورہ المومن آیت ۲۸ تا ۳۴ اور سورہ زخرف آیت ۵۳ ملاحظہ کریں۔ یہ آیات اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ہستی سے اس کو انکار نہ تھا البتہ جس چیز کو وہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا وہ یہ تھی کہ اس کی سیاسی خدائی میں اللہ کا کوئی دخل ہو اور اللہ کا کوئی رسول آکر اس پر حکم چلائے۔ علمائے امت مسلمہ ایسی آیات پر غور و فکر کر کے اپنی حیثیت نائبین رسالت کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے ان فرعونوں کو جو حکومت کے ایوانوں تک مال و دولت اور دھونس و دھاندلی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں اور آج بھی وہ اپنی سیاسی خدائی میں اللہ کا کوئی دخل عملاً تسلیم نہیں کرتے ان کو وہی درس دیتے جو سارے انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کو دے چکے ہیں تو آج اس ملک کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی اور علمائے امت مسلمہ بھی اپنے منصب کے صحیح ترجمان ہوتے۔ کاش کہ آج تک ایسا نہ ہو سکا بلکہ علمائے امت ایک بار بھی اجتماعی قدم نہ اٹھا سکے اور اس المیہ کا اصل سبب تشتت و تفریق کے سوا کچھ بھی نہیں حالانکہ یہ شیطان کا علم تھا جو علما نے تھام لیا۔

زیر نظر آیت میں بتایا گیا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم اسی عبدیت اور اسی توحید الٰہی کی تھی ظالموں نے اسے مسخ کر کے تثلیث بنا دیا جو شرک کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے۔ "ربی و ربکم" میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کی مخلوق مربوب اور عبد ہونے کے اعتبار سے پیغمبر اور امتی سب یکساں ہیں کیونکہ نبی و رسول بھی اس طرح کی مخلوق ہے جس طرح کے سارے انسان مخلوق ہیں پھر مخلوق کی صفات خالق کی صفات سے کیونکر مل سکتی ہیں اور خالق کی صفات کا متحمل ایک انسان کیسے ہو سکتا ہے؟ تثلیث کا شرک جن ظالموں کی بھی ایجاد ہو بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کا دامن اقدس اس آلودگی سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔ اسی طرح ساری دنیا عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرائے لیکن مسیح علیہ السلام اللہ ہی کی الوہیت اور خالقیت کا اعلان کرتے رہے تھے انہوں نے کبھی بھی اپنے خالق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

مسیح علیہ السلام کی گزشتہ تمثیل کی وضاحت

۱۲۱ غور کرو کہ اگر ایک شخص مردوں کو زندہ کر دے' کوڑھیوں کو چنگا کر دے اور نابینوں کو بینا کر دکھائے تو اس کے اس طرح کے کاموں کو انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ نبوت کوئی مانے یا نہ مانے۔ ان مشاہدہ میں آنے والی باتوں کا وہ انکار نہیں کر سکے گا؟ پھر یہ کام جو سارے کے سارے اللہ ہی کے متعلق ہیں کسی انسان کے اختیار میں نہیں جب انسان سے ان کا ظہور ہونے لگے تو اس کو لوگ کیا مانیں گے؟

قرآن کریم نے صاف صاف بتا دیا کہ مسیح علیہ السلام نے کفر کی موت مرے ہوؤں کو زندہ اور منافقت کے کوڑھیوں کو چنگا کرنے کے لئے جب تعلیم دینا شروع کی تو جن لوگوں نے اس پر دھیان دیا اللہ نے ان پر ایمانی زندگی کا راستہ کھول دیا اگرچہ وہ چندے معدودے ہی تھے لیکن اکثریت نے مسیح علیہ السلام کی اس تعلیم سے انکار کر دیا اور یہی ان کا کفر تھا۔ فرمایا فَلَمَّا اَحَسَّ مِنْهُمُ الْكُفْرَ "جب مسیح علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا" واضح کر دیا کہ ان کا کفر بھی ایسا کفر تھا جس کو مسیح علیہ السلام نے محسوس کیا یعنی ان کا کفر واضح اور ظاہر تھا کیوں کہ وہ مسیح کی ہر طرح کی مخالفت کا کفر تھا اور مسیح علیہ السلام بھی ان کی اس مخالفت کو اچھی طرح بھانپ گئے اور ان ایمانی زندگی اختیار کرنے والوں کو پکار پکار کر کہا کہ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری معاونت کرے یعنی اللہ کے دین کی اشاعت کے لئے میرا کھلا کھلا ساتھ دے۔

ان الفاظ نے ایک طرف یہ وضاحت کر دی کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان تھے اللہ' اللہ کا بیٹا یا اللہ کا جز نہیں تھے۔ اس لئے اللہ کے دین کی نصرت کے لئے لوگوں کو پکارا اور دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نبی کی دعوت کا منشا ہی اصل یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلایا جائے اور ایک اللہ کی الوہیت کے پیغام کو عام کیا جائے اس طرح کہ دوسروں کی الوہیت کی نفی بھی ہو۔

دوسری طرف اس بات کی بھی وضاحت ہو گئی کہ اہل دین کی نصرت کے لئے معاونت طلب کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں! معاونت کرنے والا کوئی نہ ہو تو دین سے منحرف ہونا توکل کے بھی خلاف ہے اور ایمان کے بھی۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے انحراف نہ ہو کیونکہ وہ جان سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ (ال عمران ۳ : ۵۲) کی تشریح ابن جریر نے اس طرح کی ہے کہ من اعوانی علی المکذبین بحجۃ اللہ "یعنی کون ہے جو تکذیب کرنے والوں کے خلاف اللہ کی حجت کے ساتھ میرا مددگار ہوگا" اور مزید فرمایا ہے کہ "الی اللہ" اس جگہ بمعنی "مع اللہ" ہے اور پھر مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جو جواب "نحن انصار اللہ" دیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ "ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں" اور اس سلسلہ میں اللہ کے رسول کی مدد کرنا اللہ کے دین کی مدد کرنا ہے کیونکہ یہ بات اصول دین میں ہے کہ اللہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔

الحواریین۔ حواری کی جمع ہے جو دراصل حور سے مشتق ہے اور حور کے معنی ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا کے ہیں اس سے "یحور" ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے "اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ" (الانشقاق ۸۴ : ۱۴) اس نے سمجھ رکھا تھا کہ وہ پلٹ کر نہیں جائے گا۔ اور پھر اس سے "تحاور" ہے اور تحاور ایک دوسرے کی طرف لوٹانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے "وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا" (المجادلہ ۵۸ : ۱) اور اللہ تم دونوں کی بات کو جو ایک دوسرے سے کر رہے تھے سن رہا تھا۔ حور سفیدی کو بھی کہتے ہیں اس لئے "حوراء" اس عورت کو کہتے ہیں جس کا رنگ بھی سفید ہو اور اس کی آنکھوں کی سفیدی بہت سفید اور سیاہی نہایت سیاہ ہو۔

اہل لغت کے نزدیک لفظ حواری اس سے مشتق ہے رہی یہ بات کہ یہ لفظ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ احباب پر کیوں بولا گیا تو اس کی وجہ یہی معروف و مشہور ہے کہ حواری قصاء کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑوں کو دھو کر سفید کرتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے یہ احباب چونکہ دھوبی کا کام کرتے تھے یہی لوگ سب سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور اس لئے ان کے بعد ایمان لانے والوں کو بھی اسی نام سے پکارا جانے لگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ والزبیر ابن عمتی وحواری من امتی یعنی زبیر میری پھوپھی کا بیٹا اور میری امت سے مرا حواری ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خلوص نیت اور سیرۃ کی پاکیزگی کی وجہ سے ان کو حواری کہا گیا یعنی تن من دھن کو قربان کر دینے والے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ انجیل میں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو لوقا ۶ : ۱۴ اور مرقس ۱۰ : ۳۔

ان میں سے بارہویں حواری کا نام یہودا اسکریوطی تھا اور اسی نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑوا بھی دیا تھا۔ ان بارہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ "اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت بہت نزدیک آگئی ہے۔" (متی ۱۰ : ۷) ان کے ذمہ جو کام لگایا گیا اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ "بیماروں کو اچھا کرنا' مردوں کو جلانا' کوڑھیوں کو پاک و صاف کرنا' بد روحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔" (متی ۱۰ : ۸ ۔ ۹)

قرآن کریم کی اس معجزانہ تعلیم میں حواریوں کی خوبی کا ذکر تو کیا گیا لیکن ان کی کمزوریوں کا نام تک نہ لیا گیا حالانکہ انجیل کے مطالعہ سے ان حواریوں کی کمزوریوں کا بڑی وضاحت سے ذکر کا گیا ہے۔ دیکھنے کا شوق ہو تو متی اور لوقا کی انجیل کا مطالعہ کریں۔ خصوصاً متی کا باب ۱۶ اور لوقا کا باب ۲۲ ۔ ۵۷ ۔ ۶۲۔

پھر غور کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام نے جو کام اپنے حواریوں کے ذمہ لگائے وہ وہی تھے خود سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سرانجام دیتے رہے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جو نبوت کے ساتھ خاص تھی جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر ان کو روحانی بیمار' کفر کی موت مرے ہوئے مراد نہ لیا جائے تو معلوم ہو گیا کہ بیماروں کا اچھا کرنا'

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَا

اس پر ایمان لاتے ہیں اور تم گواہ رہو کہ ہم اس کی فرمانبرداری میں مکمل طور پر داخل ہو گئے۔ ۱۲۲ ۵۲

انہوں ۱۲۳ نے مزید کہا اے ہمارے رب! جو کچھ تو نے اپنے نبی عیسیٰؑ پر نازل کیا ہے

مردوں کا زندہ کرنا' کوڑھیوں کو چنگا کرنا اگر عیسیٰ علیہ السلام باذن اللہ کرتے تھے تو اس طرح وہ اپنے اذن سے اپنے حواریوں سے بھی کرایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے ذمہ بھی انہوں نے بالکل وہی کام لگائے ہیں جس سے یہ بات مزید صاف ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ وہی امثال و استعارات ہیں جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اختیار کئے اس لئے کہ اس سے کلام کا وزن زیادہ اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ خود عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ حواریوں کو کہا اس کی آخری تلقین اس طرح تھی کہ "اگر تم کو کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری باتیں نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے باہر نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دینا۔" (متی ۱۰: ۱۵)

"دیکھو میں تم کو بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بے آزار بنو مگر آدمیوں سے خبردار ہو کیونکہ وہ تم کو عدالتوں کے حوالے کریں گے۔" (متی ۱۰: ۱۸)

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی شہادت سے کیا سبق حاصل ہوا؟

۱۲۲ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ "اے عیسیٰ علیہ السلام آپ گواہ رہئے گا کہ ہم اللہ کی فرمانبرداری میں مکمل طور پر داخل ہو گئے۔" اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ مسلم کا لفظی ترجمہ فرمانبردار ہے۔ یاد رہے کہ مسلم کا اطلاق ہر نبی کے پیرو پر ہوتا ہے کہ حقیقتاً ہر نبی کی دعوت اللہ کی فرمانبرداری ہی کی ہوتی ہے پھر غور کرو کہ حواریوں کا سارا زور ایمان باللہ پر ہے وہ زبان کھولتے ہی کہتے ہیں کہ امنا باللہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ جس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ "ابن اللہ" کا تخیل مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں سے بہت بعد کا تخیل ہے وہ یقیناً اس سے آشنا ہی نہ تھے۔ اگر یہ بات ذہن میں راسخ ہو جائے کہ ہر نبی کے ماننے والوں نے نبی کا زمانہ حیات گزرنے کے بعد نبی کی تعلیم میں بہت کچھ اپنی طرف سے ملا کر نبی کے ذمہ لگا دیا تو آج کل کے بدعتیوں کے کارہائے نمایاں خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

اس جگہ عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح بیان فرمائے کہ آپ نے حواریوں کو کہا کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ" کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہو؟ اور دوسری جگہ اللہ نے ارشاد فرمایا اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (المائدہ ۵: ۱۱۱) "اور جب

اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۵۳

اس پر ہمارا ایمان ہے اور ہم نے تیرے رسول کی پیروی کی۔ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو جو حق کی شہادت دینے والے ہیں۔ ۵۳

ایسا ہوا تھا کہ میں نے حواریوں پر الہام کیا تھا کہ مجھ پر اور میرے رسول یعنی مسیح پر ایمان لاؤ۔ انہوں نے کہا تھا ہم ایمان لائے اور اے اللہ! تو گواہ رہیو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔"

واضح ہوگیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو بات حواریوں تک پہنچائی گئی اس جگہ اس کو براہ راست حواریوں پر وحی کرنے سے تعبیر کیا گیا اگر اس عبارت پر غور کیا جائے تو بہت سی باتیں ہیں جو ازخود صاف ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں تدبر کرو گے تو بہت کچھ پاؤ گے۔ انشاء اللہ

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی مناجات کیا ہی مناجات ہے؟

۱۲۳ مسیح علیہ السلام کے حواری ابھی مسیح علیہ السلام سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ دفعتہ" براہ راست حق سبحانہ و تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے۔ قرآن کریم کا معجزانہ انداز اکثر مقامات پر یہی ہے کہ اچانک بندوں کے خطاب کا رخ والہانہ انداز میں اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے جس سے توحید کا اعلیٰ درس ملتا ہے کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ سبحان اللہ! پھر "وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ" کے الفاظ بول بول کر شہادت دے رہے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کے معاصر آپ کی تعلیم پر ایمان لانے والے آپ کو رسول ہی تسلیم کرتے تھے ابن اللہ نہیں مانتے تھے اور نہ ہی کہتے تھے اور یہ تخیل کی مسیح "ابن اللہ" ہیں یا تین اقنوم مل کر اللہ کی واحد ذات قرار پاتی ہے بالکل ایک من گھڑت اور مدت بعد کے نظریات ہیں جن کا عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں کم از کم نام و نشان تک موجود نہیں تھا۔ "الشاھدین" کی تفسیر میں ایک سے زیادہ قول درج کئے گئے ہیں زیادہ واضح بات یہی ہے کہ "گواہ تیری توحید کے اور تیرے رسولوں کی رسالت کے۔" اس پوری آیت کی مناجات بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی ہے لیکن ہم میں سے ہر ایک کے دل کی آواز اس طرح ہونا چاہئے۔ سچائی ہر حال میں سچائی ہے اس کا کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ قرآن کریم نے حواریوں کی اس مناجات کا ذکر کر کے واضح کر دیا ہے کہ ع

ہو غیروں کا غیر کوئی اس کو غیر نہ سمجھئے

کاش کہ آج مسلمان بھی یہ اصول ملحوظ خاطر رکھتے۔ ہمارے یہاں کیا ہے؟ کسی کی بات کے رد و قبول کے لئے سارے اصول بدل کر رکھ دیئے۔ اپنی پارٹی کا ہو' اپنی گروہ بندی کا ہو تو سب کچھ قبول اور دوسری پارٹی اور دوسری گروہ بندی کا ہو تو سب کچھ رد اور کسی گروہ بندی اور پارٹی کو قبول کرنے والا نہ ہو تو بالکل مردود

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ

اور بنی اسرائیل نے عیسیٰؑ کے خلاف مکاریاں یعنی خفیہ تدبیریں[۱۲۴] شروع کر دیں اور اللہ نے ان کی خفیہ تدبیروں کو بالکل[۱۲۵] موثر نہ ہونے دیا اور اللہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو مکاروں کی مکاریوں کا اثر زائل کر دے؟ ۵۴

گویا وہ انسان انسان ہی نہ رہا دھوبی کا کتا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۳ ہے اس کو بار بار پڑھو۔ اپنی دعاؤں میں اس کو شامل کرو خوب سمجھ کر اور دل لگا کر ورد زبان بھی بناؤ اور حرز جان بھی۔ کیا پیاری دعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۔ آمین یا رب العلمین

عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف بنی اسرائیل کی خفیہ سازشیں اور حواریوں کا قبول حق

۱۲۴ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے۔ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقے پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لئے کیا کہ وہ حضرت یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کے نہی عن المنکر یعنی برائی سے بچنے کی ترغیب کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرت ناک سانحہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔ اس کی مزید وضاحت بھی تاریخ کے صفحات میں موجود ہے کہ مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزو مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بد اخلاقیوں کو تو عملاً اخلاق کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بنا پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علما و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ یعنی توراۃ تک کو تحریف کئے بغیر نہ چھوڑا تھا۔ اور درہم و دینار پر اللہ کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کر ڈالا چنانچہ توراۃ ہی میں موجود ہے کہ

"خداوند فرماتا ہے یہ امت بنی اسرائیل زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے

ہیں۔"

لیکن بدبخت یہود اپنی فطرت کج' صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہوگئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے ان کے دلوں کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لئے انبیاء کی سنت راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی۔ ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش اور مغرور حلقہ ان پر اور اللہ کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا' توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جدوجہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (الزخرف ۴۳ : ۶۳' ۶۵) "اور جب عیسیٰؑ کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اس نے کہا' لوگو! میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے سامنے بعض ان باتوں کی حقیقت واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ پس اس کی بندگی کرو یہی صراط مستقیم ہے۔ مگر ان لے بہت سے گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا سو ایسے ظالموں کے لئے ایک دردناک عذاب کے دن کی تباہی ہے۔"

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

"اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا۔ اے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں۔ تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا کہ نام اس کا احمد ہے۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام آیا ان کے پاس روشن دلائل لے کر تو وہ بنی اسرائیل کہنے لگے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" (الصف ۶۱ : ۶)

مگر عیسیٰ علیہ السلام معاندین و مخالفین کی ان دریدہ دہنیوں اور ہرزہ رسائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی دعوۃ الی الحق میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات کے ذریعے لوگوں کو قبول حق اور صداقت پر آمادہ کرتے رہے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھیں۔ انہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ کے شرف صحبت سے فیض یاب ہو کر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی

سربلندی اور کامیابی کے لئے انہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمت دین کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" اور "انصار اللہ" کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی حیات پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔

ان محدودے چند آدمیوں کے سوا جو "حواری" کے لقب سے یاد کئے گئے یہود کے اکابر اور سرداروں نے مخالفت و ایذا کے بہت سے درجے طے کرنے کے بعد بالآخر یہ طے کر لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ختم کر ہی دینا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اپنی مذہبی عدالت میں الحاد کا الزام لگایا جس کے نتیجہ میں آپ کو واجب القتل قرار دیا پھر رومی حاکموں کی ملکی عدالت میں لا کر ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے مخالفین کا یہ معرکہ اس وقت کے ملک شام کے صوبہ فلسطین میں پیش آیا تھا۔ شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک جزء تھا اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں نیم آزادی اور نیم خودمختاری حاصل تھی۔ اس وقت شہنشاہ رومہ کی طرف سے ایک نائب السلطنت یعنی وائسرائے شام کا تھا اور اس کے ماتحت ایک والی یا امیر فلسطین کا تھا۔ رومیوں کا مذہب شرک و بت پرستی کا تھا۔ تاہم یہود کو اتنا اختیار حاصل تھا کہ اپنے لوگوں کے مقدمات اپنی مذہبی عدالتوں میں لائیں لیکن سزاؤں کے نفاذ کے لئے انہیں پھر انہیں مجرموں کو ملکی عدالتوں کے سامنے لانا پڑتا تھا۔ جرم الحاد میں فتویٰ قتل خود یہود کی مذہبی عدالت دے سکتی تھی لیکن واقعتہ "سزائے موت کا نفاذ صرف رومی ملکی عدالت کے قبضہ میں تھا اور سزائے موت رومی حکومت کے قانون میں سولی کے ذریعہ سے دی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے مکروا کے الفاظ سے یہود کی اسی گہری اسکیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بنی اسرائیل کی ان خفیہ سازشوں کا ناکام ہو جانا

۱۲۵ وَمَكَرُ اللّٰهِ کے الفاظ نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسیح علیہ السلام کے مخالفین و معاندین کی ساری سازشوں اور خفیہ کاریوں کو ناکام بنا دیا اور کسی ایک سازش کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ یعنی ان کی ساری سازشوں اور مکاریوں میں بڑی سازش اور مکاری مسیح علیہ السلام کو سولی چڑھوانے کی تھی اس کے باوجود کہ ان کی مذہبی عدالت نے یہ فیصلہ دے دیا کہ مسیح واجب القتل ہے اس لئے ملکی عدالت اس کو سولی چڑھا دے لیکن ملکی عدالت نے اس پر عمل درآمد روک دیا۔ اس طرح اللہ نے ان کی اس آخری سازش کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا اور مسیح علیہ السلام کو سولی کی موت سے بچا لیا اور سولی چڑھنے نہیں دیا۔ اس بات کو دوسری جگہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (النساء ۴ : ۱۵۷)

اور ان کا یعنی یہود کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو اللہ کے رسول تھے سولی پر چڑھا کر قتل کر دیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا بلکہ اس واقعہ کی اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہوگئی اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا یعنی عیسائیوں نے تو بلاشبہ وہ بھی شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ظن و گمان کے سوا کوئی علم ان کے پاس نہیں اور یقیناً یہودیوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا۔"

مکر اللہ کے الفاظ کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بھی بجنسہٖ اس فعل کے لفظ سے ادا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس کا جواب دیا تو عربی محاورہ میں اس طرح کہیں گے کہ فلاں نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا حالانکہ زید کا "حملہ" مطلق نہ ہوگا بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی یا زیادہ سے زیادہ وہ جوابی حملہ" یا کوئی کسی کو ٹھگ لے اور وہ اس سے انتقام لے لے تو عربی میں پیرایہ ادا یہ ہوگا کہ اس نے فلاں کو ٹھگا لیکن اس فلاں نے اسے ٹھگ لیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس فلاں نے تو صرف ٹھگنے کی سزا ہی اس کو دی۔ اس اصول کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن کریم کی آیتوں سے کہ ۱۔ **مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ** "انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی "مکر" کیا یعنی ان کے مکر کی سزا دی۔" ۲۔ **اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا**۔ کہ وہ کید سے کام لیتے ہیں اور میں بھی ان کے کید کی ان کو خوب سزا دوں گا۔ ۳۔ **قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِءُ بِهِمْ** وہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض ہنسی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ہنسی کی یقیناً سزا دے گا۔ ان امثال میں جوابی اور سزائی "مکر" نہ مکر ہے نہ کید "کید" ہے اور نہ استہزاء "استہزاء" ہے۔ بلکہ مراد صرف اور صرف سزائے مکر۔ سزائے کید اور سزائے استہزاء ہے۔ اس لئے یہ بات جان لینا چاہئے کہ جس کسی نے اردو کے مکر و فریب پر قیاس کر کے "مکر اللہ" پر حرف گیری کی ہے اس نے خود اپنی جہالت کا اظہار کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود نے ہر ممکن خفیہ تدبیروں سے کام لیا تاکہ کسی نہ کسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دینے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اللہ نے ان سب خفیہ تدبیروں کو ناکام بنا دیا اور **واللہ خیر الماکرین** اور اللہ ہی کی تدبیریں دراصل کامیاب ہونے والی ہیں اس لئے اللہ نے ان کی خفیہ تدبیروں کو بالکل موثر نہ ہونے دیا اور وہ اپنے پختہ ارادہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بالکل صاف کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود کلیسا کا آج عام عقیدہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور صلیب پر وفات پانے اور پھر تیسرے روز جی اٹھنے کا ہے جس کا نہ کوئی سر ہے اور نہ پیر۔ بس ایک عقیدہ ہے جو من حیث القوم عیسائیت نے قبول کر لیا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ کوئی قوم من حیث القوم جب کسی عقیدہ کو مان لیتی ہے تو اس کے لئے وہ خود ہی دلیل ہو جاتی ہے۔ جس کا چھوڑنا ممتنع نہیں تو ممکن بھی نہیں کہا جا سکتا۔

يٰعِيسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ

اس وقت کا ذکر کرو جب اللہ نے فرمایا تھا اے عیسیٰ[۱۲۶]! میں تیرا وقت پورا کروں گا[۱۲۷] تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا' تیرے منکروں[۱۲۸] سے تجھے پاک کر دوں گا اور جن لوگوں نے

سیدنا مسیح علیہ السلام کی پوری زندگی کا خاکہ بدل کر رکھ دیا گیا

۱۲۶ "جن بزرگوں کی نبوت معلوم و مسلم ہے ان میں سب سے بڑھ کر ظلم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے سب انسان ہوا کرتے ہیں۔ بشریت کی تمام خصوصیتیں ان میں بھی اس طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ نے ان کو حکمت و نبوت اور اعجاز کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لئے معمور فرمایا تھا لیکن اول تو ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجود مسعود کو برداشت نہ کر سکی یہاں تک کہ عین عالم شباب میں انہیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر جب وہ ان کے بعد ان کی عظمت کے قائل ہوئے تو اس قدر حد سے تجاوز کر گئے کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا اور یہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیح کی شکل میں اس لئے نمودار ہوا تھا کہ صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے کیونکہ انسان فطرتاً گنہگار ہے اور خود اپنے عمل سے اپنے لئے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔"

"تم دیکھو گے کہ اس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے انہوں نے اس پر اپنے تخیلات و اوہام سے اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا ہی محال ہو گیا ہے صرف یہی نہیں کہ ان کی محرف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل تعلیم کیا تھی بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا ہے؟ اس کی پیدائش میں اعجوبگی اس کی طفولیت میں اعجوبگی اسکی جوانی اور بڑھاپے میں اعجوبگی۔ اس کی زندگی کی ہر بات میں اعجوبگی اور اس کی موت تک میں اعجوبگی۔ غرض ابتداء سے انتہاء تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے اور اس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خدا تھا یا خدا کا بیٹا یا خدا اس میں حلول کر گیا تھا یا کم از کم خدائی میں وہ کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔"

"اس کے متعقدوں نے جوش عقیدت میں اس پر یہ بہتان اٹھایا اور اس کی تعلیمات میں اپنے ہوائے نفس کے مطابق اتنی تحریف کی کہ آج دنیا کی کسی کتاب میں سوائے قرآن کریم کے مسیح کی اصل تعلیم اور خود ان کی حقیقت کا نشان نہیں ملتا۔ بائیبل کے عہد جدید میں جو کتابیں اناجیل اربعہ کے نام سے موجود ہیں انہیں

اٹھا کر دیکھو تو سب کی سب طول انسیت اور عینیت کے فاسد تخیلات سے آلودہ ہیں۔ کہیں حضرت مریمؑ کو بشارت ہوتی ہے کہ "تیرا بچہ خدا کا بیٹا کہلائے گا" (لوقا: ۳۵) کہیں "خدا کی روح کبوتر کی' مانند یسوع پر اتر آتی ہے اور پکار کر کہتی ہے کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے" (متی ۱۶: ۱۷) کہیں مسیح خود کہتا ہے کہ "میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم مجھے قادر مطلق کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے دیکھو گے۔" (مرقس ۱۴: ۶۲) کہیں خود مسیح علیہ السلام کے منہ سے کہلوایا گیا کہ "باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں ہوں۔" (یوحنا ۸ : ۴۲) کہیں اس کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا" اور وہ باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے۔" (یوحنا ۱۴: ۹' ۱۰)

لیکن افسوس کہ "جب قرآن کریم نے اس قوم کے انبیاءؑ کی صفائی پیش کی اور ان کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں سے دھویا تو یہ خوش ہونے کی بجائے مقابلے پر اتر آئے اور انہوں نے ان سب داغوں کو جنہیں قرآن کریم نے دھویا تھا پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو مدینہ میں یہودی موجود تھے اور نزول قرآن سے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر پھیلتے چلے گئے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے ہر نبی کے متعلق وہی تمام پرانے قصے جو ان کے ہاں موجود تھے مسلمانوں میں بھی پھیلا دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر جو مسلمانوں نے لکھیں ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئی اور یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

توفی کے معنی میں پورا پورا دینے کا مفہوم شامل ہے اس لئے اشارۃً" یہ بات سمجھا دی کہ تمہیں طول حیات پورا پورا ملے گا یعنی تمہاری وفات تو اپنے وقت پر جب ہوگی یقیناً ہوگی تمہارے دشمن تمہاری ہلاکت کے کسی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور یقیناً وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

تیرے منکر یعنی یہود تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے

۱۲۷ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو پیش گوئی کے طور پر گویا یہ بتا دیا گیا کہ تیرے خون کے پیاسے نہ صرف یہ کہ تجھے قتل نہیں کر سکیں گے بلکہ ان کو تہس نہس کر دیا جائے گا اور پوری قوم کی قوم تیرے مقابلہ میں خائب و خاسر ہوگی۔ اس سے زیادہ اور بڑی کونسی رسوائی ہوگی کہ جب پوری قوم کی قوم عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تھی اور آپ کو ان سے اس طرح نکال دیا گیا جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ انبیاء کرام سب کے سب پاک و مطہر ہی ہوتے ہیں مگر لوگ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان الزامات کی قرار واقعی تردید بھی ہوتی رہی ہے اور آج بھی بتوفیقہ ان بدباطنوں کے لگائے گئے الزامات رد کرنے والے موجود ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک موجود رہیں گے۔ اگر انبیاء کرام کے مخالفین و معاندین زندہ ہیں تو ان کو ہر طرح سے زک پہنچانے

كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ

تیری پیروی کی ہے[۱۲۸] انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا اور بالآخر تم سب کو میری طرف لوٹنا ہے۔ اُس دن ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں لوگ ایک دوسرے

والے بھی بحمد اللہ موجود ہیں۔ ان کا منہ کھلنے کی دیر ہوتی ہے کہ ان کی زبان نکالنے والے ان کے سروں پر پہنچ جاتے ہیں جو ان کے کہے کا مزا چکھا کر دم لیتے ہیں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بھی اس تطہیر کا ذکر یہاں فرمایا گیا کہ تیرے دشمنوں کی طرف سے آپ پر الزامات تراشیاں ہوں گی یقیناً ان کا دفاع ہوتا رہے گا اور تیرے دشمن کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین یقیناً کامیاب و کامران ہوں گے

۱۲۸ "اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے یہاں پہلی اور واضح مراد یہی ہے جیسا کہ اوپر بھی وضاحت کی گئی ہے اور "اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ" یعنی جو عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت و نبوت کے قائل ہیں مراد مسلمان اور سچے عیسائی ہیں۔ سچے عیسائیوں سے مراد اس وقت کے عیسائی ہیں جو مسیح علیہ السلام کو نبی مان گئے اور یہود کے ان الزامات کی تردید کرتے رہے جو انہوں نے اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر لگائے۔ اور ایک مسلمان تو آج بھی تب ہی مسلمان ہو سکتا ہے کہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرے اور دل و جان سے قبول کرے جو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار نہ کرے وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام کا یہ متفق علیہ عقیدہ ہے کہ کسی ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کرام کے انکار کے مترادف ہے جن کی نبوت کا اعلان قرآن کریم میں ہو چکا کیونکہ نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی اور قرآن کریم کے بعد کوئی وحی آسمان سے نازل نہ ہونے کا اعلان قرآن کریم میں کر دیا گیا ہے۔

آیت کریمہ کے جس حصہ کا یہ ترجمہ ہے کہ "جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا" اس کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور غیر تو غیر اپنے بھی اس میں مبہوت ہوتے دکھائی دیتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ دن بدن اسرائیلی حکومت قدم جماتی نظر آتی ہے اور مسلمان جو صحیح معنوں میں اس آیت کا مصداق ہیں وہ دن بدن دبتے چلتے جا رہے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہود من حیث القوم پوری دنیا میں مالدار قوم ہونے کے باوجود اب بھی دوسروں کے سہارے زندہ ہے اور جو قوم بھی کسی کے سہارے زندہ ہو اس کو زندہ نہیں کہا جا سکتا عرف اسلام میں وہ مردہ ہی ہوتی ہے۔ اس نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو یقیناً آج بھی نہ کہیں یہود کی حکومت قائم ہے اور نہ ہی

قائم ہونے کا امکان ہے۔ بلکہ وہ آج بھی اور کل بھی جب تک اس کا وجود قائم ہے دوسروں کے سہارے پر ہے۔ ابھی سہارا ٹوٹا اور ابھی حکومت دھڑام سے گر جائے گی اور ایسا یقیناً ہوگا یہ ممکن نہیں کہ ایسا نہ ہو۔ ظاہری طور پر جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ایک طرف مسلم قوم کی فرقہ بندی اور گروہی سیاست کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف ان سہارا دینے والوں کے لئے ایک عذاب الٰہی تیار ہو رہا ہے اور وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کر رہے ہیں۔

ایک سچے مسلمان کا یہ حق نہیں کہ وہ ڈانواں ڈول ہو بلکہ اس کا ایمان تو اتنا ہی پختہ اور مضبوط ہونا چاہئے کیوں؟ اس لئے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب کسی قوم کو اللہ تعالیٰ عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو وہ قوم اپنی ہلاکت کے سامان خود تیار کرنا شروع کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ تہ و بالا کر کے رکھ دی جاتی ہے اور ان لوگوں کو جو زمین میں نہایت ہی کمزور، گرے پڑے نظر آتے ہیں ان کی حیات کا سامان وہیں سے پیدا ہو جاتا ہے کسی چیز کا دھڑام سے گرنا کتنا وقت لیتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے بینا آنکھ رکھنے والوں سے ذرا بھی پوشیدہ نہیں۔

عیسائی قوم جو بظاہر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مانتی اور تسلیم کرتی ہے دراصل عیسیٰ علیہ السلام کی متبع نہیں رہی کیونکہ انہوں نے بالکل ایک نیا دین بنا کر عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے شائع کر دیا ہے تاہم ظاہری طور پر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے اقراری ہیں یہی وجہ ہے کہ ظاہری طور پر دنیا میں ان کی فوقیت بھی موجود ہے۔ جس طرح صرف ظاہری طور پر ایمان آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا اسی طرح ظاہری طور کی یہ فوقیت بھی چند روزہ ہے۔ مسلمان یقینی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مانتے ہیں اور دوسرے انبیاء کرام کی طرح ان کی حیثیت بھی صرف ایک نبی ہی کی تسلیم کرتے ہیں نہ ان کو خدا اور نہ خدا کا بیٹا اور نہ ہی خدائی میں کوئی حصہ دار مانتے ہیں۔ ہاں! محمد رسول اللہ ﷺ کو خوشخبری دینے والا قوم بنی اسرائیل کا آخری رسول تسلیم کرتے ہیں اس لئے سچے متبع وہی کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ یقیناً وہ وقت آئے گا کہ عیسائی قوم بھی ایک دن اپنے کئے کے نتیجہ میں اسی طرح نیست و نابود ہو گی جس طرح یہود ہو چکے اور مسلمان اپنا آپ سنبھالیں گے اور اپنی اصلی حیثیت کو پہچان جائیں گے کہ وہ کیا تھے اور آج کیا ہو گئے؟ یہ وقت کب آئے گا اور کون اس تحریک کا بانی ہوگا جو مسلمانوں کو من حیث القوم ایک اور صرف ایک ہونے کی دعوت دے گا۔ یہ ساری باتیں مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں جس کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو ہے جس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی جیسا ہے۔ ہم سنت اللہ کے تحت یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں اور کہہ رہے ہیں اور آیت زیر نظر اسی نظریہ کے متقاضی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان سے کئے گئے وعدوں کا بیان

مختصر یہ کہ زیر نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے چار کئے گئے الٰہی وعدوں کا ذکر کیا

ہے اور اللہ تعالیٰ کبھی اپنے وعدوں کا خلاف نہیں کرتا اور نہ ہی خلاف ہونے دیتا ہے۔ وہ سب طاقتوروں سے زیادہ طاقت ور اور سارے قوت والوں کی قوت کو زائل کرنے والا ہے۔ وہ سب تدبیر کنندوں سے زیادہ تدبیر کندہ اور سارے مکاروں کی مکاریوں کو زائل کر دینے والا ہے۔

اس کا سب سے پہلا وعدہ یہ تھا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ یا سولی پر چڑھانے سے نہیں ہونے دے گا بلکہ طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی۔ اس آیت نے "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا" کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی۔ یہود لاکھ کہیں کہ ہم نے عیسیٰ کو سولی چڑھا دیا یہ بات اس سے بھی زیادہ غلط ہے جتنی یہ بات کہ کوئی کہے گدھے کے سر پر سینگ۔ اور پھر بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کہہ کر اس کی مزید توثیق کر دی۔

دوسرا گروہ دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے یہود کے سارے غلط الزامات کو صاف کر دیا۔ مثلاً یہود سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نسب کو مطعون کرتے تھے قرآن کریم نے اس کی پوری پوری وضاحت کر دی اور ان کو وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ بیان کیا۔ یہود نامسعود نے آپ کی والدہ ماجدہ کے متعلق دریدہ دہنی سے کام لیا اللہ تعالیٰ نے مریم کو اس وقت کی ساری دنیا کی عورتوں پر فضیلت دینے کا اعلان کیا۔ یہود نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعویٰ کا الزام لگایا تھا قرآن کریم کی کثیر التعداد آیات و مقامات پر عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف بیان نقل کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی عبدیت اور بشریت کا اعلان کرتے تھے اور ایک اللہ کی بندگی کا اقرار کرتے تھے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔

تیسرا وعدہ یہ ہے کہ تیرے متبعین کو تیرے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا۔ یہ وعدہ بھی یقیناً پورا ہوا اور پورا رہے گا کہ یہاں اتباع سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار و اعتقاء ہے اسی طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہوگئے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے معتقد ہیں اور یہ اعتقاد دنیوی سیادت و کامیابی کے لئے کافی تھا کیونکہ اس سے یہود کی عداوت و دشمنی واضح ہو جاتی ہے اور دنیوی کامیابی و کامرانی آج بھی نصاریٰ ہی کی تسلیم ہے اور آخرت کی کامیابی کا ذکر ہی اس میں موجود نہیں بلکہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے اور عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء ﷺ پر بھی ایمان لائیں چونکہ نصاریٰ نے اس پر اعتقاد و ایمان اختیار نہ کیا اس لئے وہ یقیناً نجات آخرت سے محروم رہے۔ مسلمانوں نے اس کو بھی قبول کیا اس لئے وہ نجات آخرت کے مستحق ہوگئے۔ لیکن دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرنے پر موقوف تھا وہ آج بھی یہود کے مقابلہ میں نصاریٰ اور مسلمانوں کو حاصل ہے اور یقیناً تاقیامت حاصل رہے گا جیسا کہ پیچھے اس کا بیان گزر چکا۔ یہود کو ان کے کئے کا نتیجہ مل رہا ہے تو

فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۞ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

سے اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۵۵

پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں جگہ سخت سزا

انشاء اللہ نصاریٰ کو بھی ان کے کئے کا نتیجہ مل کر رہے گا جس کا متعین وقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

چوتھا وعدہ قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ فرمانے کا ہے اور یہ وعدہ بھی انشاء اللہ یقیناً اور حتماً اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا جیسا کہ زیر نظر آیت میں فرمایا گیا کہ "اس دن ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں "ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ۔

مرزا جی کا ایک پھندا اور علمائے اسلام کی سادگی

ہمیں معلوم ہے کہ آیت زیر نظر یعنی سورہ آل عمران کی آیت ۵۵ پر پچھلے سو سال سے ایک معرکہ بپا رہا جس کی اصل وجہ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک خواہ مخواہ بحث میں مُبتلا کر دیا جس میں ان کا اپنا فائدہ تو نظر آتا ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنی نبوت کی عمارت کھڑی کی لیکن علمائے اسلام کو کیا ہوا انہوں نے اس مسئلہ کو مرزا جی کی نبوت کی بنیاد کیوں تسلیم کر لیا جبکہ نبوت کا منصب ختم ہو جانے کے بعد کسی کی نبوت کا جواز ہی نہ تھا اور مرزا جی کے پاس نبوت کے لئے کوئی بنیاد ہی نہ تھی جس چیز کو انہوں نے بنیاد بنایا وہ کسی صورت بھی بنیاد نہ بن سکتی تھی۔ متوفیک کے معنی ممیتک کے صدر اول سے ہوتے چلے آرہے تھے۔ مرزا جی نے صرف ایک شاطرانہ چال چلی اور علمائے اسلام کی اکثریت اس پھندے میں پھنس گئی۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب اس بھان متی کے تماشا کے اختتام کا وقت آیا تو اس وقت بھی علمائے اسلام نے "احمدی غیر مسلم" کے الفاظ ملک کے قانون میں تحریر کروانے پر رضامندی ظاہر کر دی اور یہ الفاظ تحریر کرا دیئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزائی قادیانی قوم کو "احمدی" کسی صورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور مرزائیوں یا قادیانیوں کے پاس "احمدی" کہلانے کی کوئی دلیل نہ تھی اور نہ ہے۔

مسیلمہ کذاب سے لے کر آنجہانی مرزا قادیانی تک بائیس تئیس لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا جن کا ذکر آج بھی تاریخ اسلام میں موجود ہے لیکن الحمد للہ کہ مسلمانوں نے کسی ایک کو بھی چند یوم یا چند مہینوں سے زیادہ وقت نہیں دیا کہ اس کو واصل جہنم کر دیا۔ صرف مرزا جی واحد وہ شخص ہیں جنہوں نے اسلام کو اتنی مدت تک نقصان پہنچایا یہاں تک کہ وعدۂ الٰہی نے اسے آلیا۔ اس کے کیا وجوہ تھے ایسا کیوں ہوا؟ تاریخ میں یہ سب کچھ روشن ہے اور تفسیر کے موضوع سے یہ بات ضمنی طور پر باہر ہے اس لئے اس سے صرف نظر کی جا رہی ہے۔

شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٥٦﴾ وَأَمَّا
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا
يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ

دوں گا اور پھر کوئی بھی ان کا مددگار نہیں ہوگا[۱۲۹]۔ ۵۶

اور ہاں! جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کے عمل بھی نیک ہیں تو ان کا اجر ان کو پورا پورا مل جائے گا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا[۱۳۰]۔ ۵۷

اے پیغمبر اسلام! یہ اللہ کی آیتیں اور حکمت والے تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا

کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کا انجام

۱۲۹ اس جگہ کفر کی راہ اختیار کرنے والوں سے مراد وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرنے سے انکار کیا اور وہ یہود کے نام سے پکارے گئے۔ تاریخ یہود کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحات میں قلمبند ہیں وہاں کوئی ورق الٹ کر دیکھ لیجئے کہ کونسی تباہیاں ہیں جو دو ہزار سالوں میں ان پر نہیں آچکی ہیں۔ اور آج بھی دولت و ثروت کے باوجود کیسی نکبت ان پر سوار ہے۔ مسلمانوں کو بار بار یاد دلایا جا رہا ہے کہ کسی کے سہارے زندہ رہنا ہرگز ہرگز زندگی نہیں ہے بلکہ عرف قرآن میں وہ موت ہے کل سے یہود اگر کسی کے سہارے زندہ رہ کر مردہ کہلاتے ہیں تو آج تم بھی ہوشیار رہو اگر دوسروں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرو گے تو تم بھی مرجاؤ گے۔ یاد رکھو کہ زندگی کا سہارا ایک اور صرف ایک ہی ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے اور پھر یاد رکھو کہ سنت اللہ ہرگز تبدیل ہونے والی نہیں۔ یہ تو دنیا کا معاملہ ہے اور رہی آخرت تو سزا و جزا کا پورا پورا ظہور تو وہیں ہوگا۔

ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا

۱۳۰ ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والوں کے اعمال کو دیکھا جائے گا۔ ان کے اعمال بھی نیک ہوں گے تو ان کے ایمان لانے کا دعویٰ یقیناً سچا ہوگا اگر اعمال اچھے نہ ہوئے تو ان کے ایمان کا اعتبار کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ نہیں نہیں بلکہ دعویٰ کے مطابق دلیل نہ رکھنے والے ہی وہ لوگ ہیں جو ظالم ہوتے ہیں اور ظلم کی حقیقت افراط و تفریط ہے۔ آیت زیر نظر میں ظالموں سے مراد یہود کا ہونا تو ظاہر ہی ہے کیونکہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و صداقت بلکہ شرافت نسب تک کے منکر تھے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے لیکن دوسری

الْحَكِيمِ ﴿۵۸﴾ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن

رہے ہیں۔ ۵۸ [۱۳۱]

بلاشبہ اللہ کے نزدیک تو عیسیٰؑ ایسا ہی ہے جیسا آدمؑ [۱۳۲] یعنی انسان کہ اس کو مٹی سے

طرف اس کے تحت نصاریٰ بھی آجاتے ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کو عبد کے بجائے معبود اور رسول کے بجائے اللہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ کا تیسرا جزو قرار دے رہے ہیں۔ یہود نے تفریط سے کام لیا ہے تو نصاریٰ افراط میں مبتلا ہیں یعنی مقام عدل و اعتدال سے دونوں ہی ہٹے ہوئے ہیں اور اسلام کی زبان میں یہ سب ظلموں سے بڑھ کر ظلم ہے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ضابطہ الٰہی ایسی شے نہیں جو ہر ایک قوم کے لئے الگ الگ ہو بلکہ ضابطہ الٰہی سب کے لئے یکساں ہے۔ جو بھی خلاف ورزی کرے گا وہ ضابطہ الٰہی کی زد میں آئے گا یہود و نصاریٰ اگر افراط و تفریط کے سبب ظالم قرار پا گئے ہیں تو کل تم بھی افراط و تفریط کے سبب ظالم قرار پاؤ گے اس لئے ضروری ہے کہ ظلم کی پاداش سے بچنے کے لئے افراط و تفریط سے بچا جائے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے

۱۳۱ آیت زیر نظر میں "آیات" یعنی دلائل کا لفظ لانا اور پھر ان باتوں کو پر حکمت قرار دینا اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ صرف دعویٰ نہیں بلکہ دلائل ہیں اور دلائل بھی ایسے جو اپنے اندر حکمت رکھتے ہیں۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش' ان کا بچپن' ان کی نبوت کا پورا زمانہ اور ان کا اٹھایا جانا سب کے سب حالات و واقعات ایسے ہیں جن میں انسانوں کی زندگی کے لئے بے شمار نشانات اور دلائل موجود ہیں اور یہ وہ پر حکمت باتیں ہیں جو اپنے اندر بے شمار اسباق رکھتی ہیں۔ جو لوگ ان باتوں کو محض قصہ کہانی کی حد تک سمجھتے ہیں وہ لوگ ان "روشن دلائل" و نشانات سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ واقعہ ایسا نہیں کہ گزشت آنچہ گزشت بلکہ یہ ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں انسانی زندگی کے لئے بے حد و شمار اسباق رکھ دیئے گئے ہیں اور قرآن کریم میں کسی نبی کا بھی کوئی واقعہ ایسا نہیں بیان کیا گیا جو صرف بطور قصہ یا کہانی سن لیا جائے یا سنا دیا جائے بلکہ ہر نبی کے قصہ یا کہانی کا اتنا حصہ ہی بیان کیا گیا ہے جس کا ہماری زندگی سے ہر حال میں تعلق ہو یعنی ہماری زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی سبق اس میں موجود ہوتا ہے اور وہی سبق سکھانے کے لئے اس واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے۔

"الذکر" قرآن کریم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے اور "الذکر" اصل میں یاد کرنے یا یاد دلانے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم کو بھی ذکر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کا جو فطرت انسانی میں

رکھی گئی ہیں ان کو یاد دلاتا ہے اور اس لئے بھی کہ وہ انسان کو شرف و بزرگی کے اصل مقام تک پہنچا دیتا ہے بشرطیکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

گویا یہاں ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے حالات و واقعات جن پر یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں کی تاریخوں نے گہرے پردے ڈال دیئے ہیں اور دونوں گروہوں میں سے ایک نے افراط سے کام لیا ہے تو دوسرے نے تفریط سے۔ اب آپ جو کچھ اس میں سے سنا رہے ہیں وہ بالکل صحیح و معتبر طور پر سنا رہے ہیں۔ آپ کا سنایا ہوا خود اس کی دلیل ہے کہ آپ موید من اللہ ہیں اور آپ وہی کہہ رہے ہیں جو عالم الغیب و الشہادہ آپ سے سنوانا چاہتا ہے اور "الذکر الحکیم" کہہ کر یہ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ آپ کی رسالت پر دلیل ہونے کے قطع نظر یہ مضامین بجائے خود بھی پر حکمت اور پر معرفت ہیں۔ ہاں جو ئندہ یا بندہ کا اصول اپنی جگہ اٹل ہے کہ پاتا وہی ہے جو تلاش کرتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے عقیدہ باطلہ کا مکمل رد

۵۹ اس آیت میں عیسائیوں کی اس گمراہی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے من حیث القوم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا اعتقاد باطل پیدا کر لیا حالانکہ تمام بنی نوع انسان کی طرح وہ بھی ایک انسان تھے اور اللہ نے انہیں اپنی رسالت کے لئے چن لیا تھا جیسا کہ دوسرے انبیاء کرام کو رسالت و نبوت کے لئے چن لیا گیا۔

تعجب ہے کہ اس آیت کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے لئے دلیل کس طرح بنا لیا گیا اور یہ مسئلہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مختلف فیہ کب رہا؟ قرآن کریم کا مطالعہ کرو اور احادیث کی کتابوں کو ایک ایک کر کے دیکھ جاؤ تاریخ کی ورق گردانی کر لو کسی ایک جگہ بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان زیر بحث نہیں آئی۔ یہود و نصاریٰ کے درمیان جو اختلاف تھا وہ بھی نسب عیسیٰ علیہ السلام میں تھا۔ یہود نامسعود عیسیٰ علیہ السلام کے حسب و نسب میں طعن و تشنیع سے کام لیتے تھے جس کا ان کو جواب دیا گیا نصاریٰ کی طرف سے بھی اور اسلام کی طرف سے بھی لیکن یہ اختلاف بھی یہود و نصاریٰ کا تھا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کا نہیں تھا۔

زیر نظر آیت میں یہود مخاطب نہیں بلکہ نصاریٰ مخاطب ہیں اور نصاریٰ اور اسلام کے درمیان مسئلہ مختلف "الوہیت" عیسیٰ علیہ السلام کا ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کے "ابن اللہ" ہونے اور "تین میں سے تیسرا" ہونے کا ہے۔ اور ان باتوں کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق نہیں ہے۔

بلاشبہ وہ شخص انعام کا مستحق ہے جو یہ ثابت کر دے کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس لئے "الٰہ" مانا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ یا یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" کہا تو اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تھا یا "تین میں تیسرا" ہونے کا دعویٰ کیا تو اس لئے کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں

تھا۔

یہ ثابت کرنے کے لئے دلیل کیا ہے؟ قرآن کریم اور صحیح حدیث رسل علیہم السلام تو اصل حجت ہیں لیکن اس میں وسعت سے کام لیتے ہوئے صحیح حدیث کے بعد حدیث کی مشہور اقسام اور صحابہ کرامؓ کے آثار تاریخ کی شہادت اور اناجیل سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ مسئلہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا یا بلا باپ تھے اس بحث کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بات کو خلط ملط کرنے سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے اور الجھاؤ ہم نہیں چاہتے۔

نصاریٰ کے یہ تینوں نظریات جو اس وقت زیر بحث ہیں قرآن کریم نے بڑی تحدی سے بیان کئے ہیں اور ان کو چیلنج کیا ہے کہ ان تینوں ہی نظریات میں تم غلط ہو اور تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا اور نہ عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کسی سند سے تم اس کا جواز پیش کر سکتے ہو اور یہ کفر جو تم بکتے ہو اس سے باز آجاؤ ورنہ عذاب الٰہی کے لئے تیار رہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام خدا نہیں تھے قرآن کریم میں مسیحیوں کے اس عقیدہ کا رد کیا گیا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدہ ۵ : ۱۷، ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا خدا مریم کا بیٹا مسیح ہے۔" (اور یہی الفاظ آیت نمبر ۷۲ میں ارشاد فرمائے گئے)

سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ سیدہ مریم کو بھی مسیحیوں نے "الٰہ" مانا جن کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی قرآن کریم فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ ۵ : ۱۱۶)

"اور پھر جب ایسا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو؟" مسیحیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو "اللہ کا بیٹا" تسلیم کیا تو قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبہ ۹:۳۰)

اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ (البقرہ ۲: ۱۱۶)

اور عیسائیوں کو دیکھو کہ انہوں نے کہا مسیح کو اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔

مسیحیوں نے مسیح علیہ السلام کے متعلق "تین میں سے تیسرا" ہونے کا دعویٰ کیا جس کی قرآن کریم نے دو ٹوک الفاظ میں تردید کر دی فرمایا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ ۵ : ۷۳)

"یقیناً وہ لوگ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا "خدا تین میں کا ایک ہے" یعنی باپ بیٹا اور روح القدس۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء ۴ : ۱۷۱)

"اور یہ بات نہ کہو کہ خدا تین ہیں دیکھو ایسی بات کہنے سے باز آجاؤ کہ تمہارے لئے بہتری ہو حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ اکیلا معبود ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کیلئے کوئی بیٹا ہو۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں فریق یہ آواز بلند کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ ۵ : ۱۸) "اور دیکھو یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔"

ان آیات کے اس جگہ درج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خوب اچھی طرح غور کرو عیسائیوں نے جب ان عقائد کا اعلان کیا تو کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو "اللہ" "اللہ کا بیٹا" یا "تین میں کا تیسرا" اس لئے مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تھا اور نہ ہی کہیں قرآن کریم نے یہ اشارہ دیا ہے کہ عیسائیوں نے یہ عقائد اس لئے اختیار کئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا چونکہ کوئی باپ نہیں تھا۔

پھر اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ "مریم اور عیسیٰ علیہما السلام دونوں کو جو خدا قرار دے رہے ہیں کبھی نہ دیتے اس لئے کہ مریم کے متعلق تو اس کے باپ نہ ہونے کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔

مزید یہ کہ جب یہود و نصاریٰ کے بزرگوں نے یہ اعلان کیا کہ "ہم اللہ کے بیٹے ہیں" تو کیا ان سب کے باپ نہیں تھے تب انہوں نے یہ اعلان کیا تھا۔ حالانکہ ان سب کے باپ موجود تھے۔ باپ نہ ہونے سے یہ نظریہ انہوں نے اختیار ہی نہ کیا تھا بلکہ اس کے وجوہ کچھ اور ہی تھے اور وہی تھے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ دے دیا کہ "وہ اللہ کا محبوب اور دوست" ہونے کی بنیاد پر یہ الفاظ اختیار کرتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے وہ استعارۃً کہتے تھے لیکن اسلام نے ان کے اس استعارہ کو کبھی قبول نہیں کیا بلکہ اس کا دو ٹوک الفاظ میں رد کیا کہ تمہارا یہ کہنا کسی حال میں بھی درست نہیں ہے اور ایسا استعارہ استعمال کرنا صرف برائی ہی نہیں بلکہ صاف صاف کفر ہے جس کے کفر ہونے میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

مثال دیتے ہوئے ان کو اس طرح تفہیم کرایا کہ جس کو تم اللہ کہتے ہو' اللہ کا بیٹا مانتے ہو اور تین میں سے تیسرا قرار دیتے ہو وہ ان اوصاف کا کبھی بھی متحمل نہیں ہو سکتا وہ کیا تھا؟ فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حالت اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی حالت کی طرح ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا کہ ہو وہ ہوگیا۔ آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو طرح سے ملتا ہے ابوالبشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں موجود تھے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک بندہ ہونے کے لحاظ سے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں بھی انہیں دو باتوں کا ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں بھی بشر

تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ

پیدا کیا اور پیدا کیا گیا معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر اس انسان کی بناوٹ کے لئے حکم فرمایا کہ ہو جا[۱۳۳] اور وہ ہو گیا اور ہر چیز اس کے کلمہ کن سے پیدا کی گئی۔ ۵۹

اے پیغمبر اسلام! مسیح کے انسان ہونے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یہ تمہارے

ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک بندہ ہیں۔ وہ پیدا ہوئے' طفولیت میں رہے' کہولت میں آئے اور انجام کار اٹھا لئے گئے اور ان پر یہ سارے ادوار اسی طرح گزرے جیسے نسل آدم کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ اس طرح آدم علیہ السلام کی ذریت قرار دیئے گئے جس طرح باقی انسان آدم علیہ السلام کی ذریت قرار دیئے گئے ہیں۔ آخر وہ کونسی بات ہے جو دوسرے انسانوں سے ان کو جدا کرتی ہے اور انسانوں کے زمرہ سے اٹھا کر اللہ۔ اللہ کا بیٹا یا اللہ کا تیسرا حصہ بنا دیتی ہے۔ عقل کے ناخن لو۔ غور و فکر کرو اور جواب دو کہ آخر کس بناء پر عیسیٰ علیہ السلام کو ذریت آدم سے باہر نکال کر اللہ کی ذریت قرار دے رہے ہو پھر ایسے بوکھلا گئے ہو کہ کبھی اللہ کہتے ہو کبھی اللہ کا بیٹا اور کبھی اللہ کا تیسرا حصہ۔ عیسائیوں کے پاس نہ اس وقت کوئی جواب تھا اور نہ اب ہے لیکن ڈھیٹ قومیں اپنے عقائد کا کوئی جواب نہ رکھنے کے باوجود ڈٹی رہتی ہیں ان کے پاس ان ساری باتوں کا ایک اور صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ آج تک ہماری قوم اس طرح مانتی چلی آرہی ہے کیا وہ سارے کے سارے لوگ غلط تھے۔ کیا ہم یہ مان لیں؟ نہیں نہیں یہ قوم کے دشمن کب پیدا ہوگئے۔ کیا اللہ قادر نہیں وہ جس کو چاہے اپنے جیسا اللہ بنا دے یا اپنا بیٹا بنا لے یا تین اقنوم مل کر ایک اللہ ہو جائے۔ ان عقائد کی مخالفت کرنے والے تو سراسر عقل کی باتیں کرتے ہیں بھلا دین و مذہب کا بھی کوئی تعلق عقل سے ہے پھر ہر قوم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ من حیث القوم کبھی غلط نہیں ہوتی۔ یہ عقائد تو ہماری قوم کے لئے حیات جاوداں ہیں اور ساری قوم ان کو تسلیم کرتی چلی آرہی ہے۔

قرآن کریم جو سراسر دعوت عقل و فکر ہے وہ کہتا ہے عیسائی قوم کے لوگو! اچھی طرح سن لو پیدا ہونا بشریت کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے اور جس طرح پیدا ہونا تقاضا ہے اسی طرح مرنا بھی اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے ماتحت آنا ہے جو طفولیت سے لے کر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے نہ اس پر تغیرات آتے ہیں کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو جائے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے اس بات کا اعلان کرا دیا کہ:

مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

رب کی طرف سے بالکل حق ہے۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ شک و شبہ کرنے والوں سے ہو ۱۳۴ جاؤ۔ ۶۰ پھر جو شخص تم سے اس بارے میں جھگڑا کرے ۱۳۵ حالانکہ علم و یقین تمہارے سامنے

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (مریم ۱۹ : ۳۳) "اور مجھ پر اس اللہ کی طرف سے سلامتی کا پیام ہے جس دن پیدا ہوا جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔"

دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا اور آئندہ ہوگا سب کلمہ "کن" ہی سے ہے

۱۳۳ اور قرآن کریم کی آیات میں "کن فیکون" کے الفاظ تعریف آیات میں مختلف جگہوں پر بیان کر کے یہ بات واضح کر دی کہ دنیا میں جو کچھ ہے آپ ہیں اور سب بلکہ دنیا کی ہر چیز خواہ جاندار ہو یا بے جان متحرک ہو یا جامد سب کی سب اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن ہی سے پیدا ہوئی ہے اور پیدا ہو رہی ہیں اور پیدا ہوتی رہیں گی کوئی چیز بھی اس کے کلمہ کن سے باہر نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہاں! جس کے لئے جو ضابطہ اس نے مقرر فرمایا ہے وہ بھی اس کلمہ کن ہی سے ہے اس سے باہر ہرگز نہیں اس لئے وہ اس ضابطہ کے تحت ہوتی رہیں گی اس کے خلاف ممکن نہیں کہ ضابطہ الٰہی کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں اور اللہ کے بنائے ہوئے طریقوں میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔

رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے پوری امت کو سبق دیا جا رہا ہے

۱۳۴ اے پیغمبر اسلام! سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ سب کا سب حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے اعلان کیا جا رہا ہے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں! آپ ﷺ کے توسط سے پوری دنیائے انسانیت کو یہ درس دیا جا رہا ہے انسان ہونے کے رشتہ سے تم سب کا حق ہے کہ خوب غور و خوض کر لو اور اگر غور و فکر سے کام لو گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اس کے سوا کچھ بھی ثابت نہیں ہوگی جو بیان کی جا رہی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (مریم ۱۹ : ۳۴) "یہ ہے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت۔ سچائی کی بات جس میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ جو بیان کیا گیا ہے اس سے زیادہ جو کچھ ہے وہ عیسائیوں نے خود بنا لیا ہے اس لئے دراصل وہ جہل و گمراہی ہے۔ یاد رہے کہ سینٹ پال کی طرف جو ابنیت کی تعلیم منسوب ہے اس کی تمام تر بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ نوع انسانی کی سرشت میں گناہ ہے پس اس کی نجات کے لئے ضروری تھا کہ کفارہ

الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى

آچکا ہے تو تم اس سے برملا کہو کہ آؤ ہم دونوں فریق میدان میں اپنے اپنے بیٹوں' عورتوں کو بلائیں اور خود بھی شریک ہوں پھر عجز و نیاز کے ساتھ اللہ کے حضور التجا کریں کہ ہم دونوں سے جس کا دعویٰ جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت یعنی پھٹکار ہو۔ ۱۳۶ ۶۱

ہو اور کفارہ کی یہی صورت ہو سکتی تھی کہ خدا کی صفت رحمت ابن اللہ کی شکل میں اترے اور اپنی قربانی کے خون سے اولاد آدم کا گناہ دھو ڈالے۔ قرآن کریم اس اصناعی تخیل کا رد کرتے ہوئے خدا کی بے نیازی اور قدرت کا اثبات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے خدا کو اتنا ہی بے بس اور محتاج کیوں سمجھ لیا ہے کہ جب تک ایک انسان کو اپنا بیٹا بنا کر سولی پر نہ چڑھائے وہ اپنے بندوں کو نجات دینے کی راہ نہیں پا سکتا؟ یہ تو وہ کرے جو اپنے کاموں کی انجام دہی میں دوسروں کا محتاج ہو لیکن جب تم خود بھی مانتے ہو کہ خدا محتاج نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا چاہنا ہی انجاموں کا قرار پایا جاتا ہے تو پھر ایسے تخیلات اور فرضی کہانیاں کیوں گھڑتے ہو۔ یاد رہے کہ گھڑی ہوئی بات اور حقیقی بات میں فرق ہی یہ ہے کہ حق بات کے لئے دلیل کیا دلائل موجود ہوتے ہیں اور گھڑی ہوئی بات بے دلیل اور صرف لاٹھی کے ذریعہ پر منوائی جاتی ہے۔

علم و یقین کی باتوں کو جھٹلا دیا جائے تو جھگڑے کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔

۱۳۵ اصل جھگڑا کیا؟ یہ کہ ایک فریق سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ' اللہ کا بیٹا اور اللہ کا تیسرا جزو قرار دیتا ہے اور دوسرا فریق عیسیٰ علیہ السلام کو ایک راست باز انسان' اللہ کا رسول اور نبی قرار دیتا ہے۔ پہلے فریق سے دلیل طلب کی جاتی ہے تو دلیل پیش کرنے کی بجائے اپنی قومی اپج میں جھگڑے پر اتر آتا ہے دوسرا فریق اپنے نظریہ کے اثبات میں دلائل کی بوچھاڑ کر دیتا ہے لیکن فریق اول دلائل کو تسلیم کرنے کی بجائے الجھاؤ شروع کر دیتا ہے اس طرح کیا دوسرا فریق بھی الجھنا شروع کر دے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہرگز نہیں آپ ﷺ کے پاس "العلم" یعنی دلائل برہان آپہنچے جو حتمی و قطعی اور یقینی باتیں ہیں اگر وہ ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں بلکہ جھگڑا اور محض جھگڑا ہی یہ لوگ چاہتے ہیں تو بھی آپ ﷺ جھگڑا نہ کریں بلکہ ان کو مباہلہ کی دعوت دیں۔

حکم ہوتا ہے کہ جھگڑا کرنے کی بجائے ان عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دو

۱۳۶ مباہلہ کیا ہے؟ جب دلائل و برہان کو ٹھکرا دیا جائے اور فریقین میں نزاع ہو جائے تو اس نزاع

کو ختم کرنے کے لئے بشرطیکہ فریقین اللہ پر یقین رکھنے کے دعویدار ہوں تو سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں فریقین کے درمیان باعث نزاع ہے باطل پر ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال و ہلاکت پڑے کیونکہ لعنت کے معنی رحمت حق سے دور ہو جانا ہے اور رحمت الٰہی سے دور ہونا قہر ربی اور عذاب الٰہی سے نزدیک ہونا ہے۔ پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر الٰہی نازل ہو سو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ یقیناً اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ اس طور پر دعا کرنے کو "مباہلہ" کہا جاتا ہے اور اس میں اصل خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دعا کرنا ہے ہاں! اگر اپنے اعزہ و اقرباء کو بھی جمع کر لیا جائے تو اس کا اہتمام مزید بڑھ جاتا ہے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس نجران سے ایک وفد آیا تھا اس نے خواہ مخواہ نبی کریم ﷺ سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے الوہیت عیسیٰ اور ربوبیت عیسیٰ پر بحث چھیڑ دی اور بحث کو چھیڑتے ہی اتنی تعلّی کی کہ نازیبا الفاظ تک وہ لوگ استعمال کر گئے اور یہ سوال بھی اٹھایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ اور رسول کریم ﷺ کے سامنے اللہ تعالیٰ کے حق میں بیہودہ الفاظ تک استعمال کر ڈالے اور شروع ہوتے ہی اس طرح برس پڑے کہ باتوں ہی باتوں میں اپنی دھاک بٹھا دیں۔ رسول اللہ ﷺ بڑی خاموشی سے ان کی ساری گفتگو سنتے رہے۔ ان کی زیادتی کی باتوں کا زیادتی سے مطلق جواب نہ دیا بلکہ تقریر کا موضوع ایسا رکھا کہ وہ ساری باتیں جو وہ ماننے کے لئے کبھی تیار نہ تھے نرم گوئی سے ان کو منوا لیں اور انجام کار وہ بھاگنے پر تیار ہوگئے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل سورۃ کے شروع میں آچکی ہے۔

ازیں بعد رسول اللہ ﷺ نے نجران کے نصاریٰ کی طرف ایک فرمان بھیجا جس میں تین چیزیں ترتیب وار ذکر کی گئی تھیں۔ ۱۔ اسلام قبول کر لو یا ۲۔ جزیہ ادا کرو یا ۳۔ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس روانہ کیا اور ان لوگوں نے آکر پھر مذہبی بحث شروع کر دی یہاں تک کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے میں انتہائی کوشش کی۔ رسول پاک ﷺ کے دلائل کا جواب نہ دینے کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے اس وقت رسول اللہ ﷺ کو حکم الٰہی ہوا کہ تم ان لوگوں سے کہو "کہ آؤ ہم دونوں فریق میدان میں اپنے اپنے بیٹوں' عورتوں کو بلائیں اور خود بھی شریک ہوں پھر عجز و نیاز کے ساتھ اللہ کے حضور التجا کریں کہ ہم دونوں میں سے جس کا دعویٰ جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت و پھٹکار پڑے۔"

عیسائیوں نے الگ ہو کر مشورہ کیا اور آپس میں ایک نے دوسروں سے کہا کہ "تم کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ یہ اللہ کا نبی ہے نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت ہے اس لئے نجات کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کی جائے۔ چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا اور انجام کار رسول اللہ ﷺ نے ان پر جزیہ مقرر کر کے ان کو امان دے دی۔ اس کی تفصیل ابن کثیر میں موجود ہے۔

الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ

بلاشبہ یہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے بالکل حق ہے اور کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اور صرف اللہ کی ذاتِ واحد اور یقیناً اسی کی ذات ہے جو سب پر غالب اور حکمت رکھنے والی ہے۔[۱۳۷] ۶۲

پھر بھی اگر یہ لوگ حق قبول نہ کریں تو اللہ ایسے مفسدوں کا حال خوب[۱۳۸] جانتا

سر ولیم مسلمان نہیں بلکہ انیسویں صدی کا مسیحی تھا اور پھر محض مسیحی نہیں مشنری بھی تھا۔ اس کے قلم سے اس واقعہ کو اس طرح قلم بند کیا گیا "اس سارے واقعہ میں محمد (ﷺ) کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم الغیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے حق تمام تر انہیں کے ساتھ ہے۔ درآنحالیکہ ان کے خیال میں مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے اور کچھ نہ تھا۔" (میور کی لائف آف محمد ﷺ ص ۲۶۰)

اوپر بیان کیا گیا واقعہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالکل پاک ہے

۱۳۷ یہ جو واقعہ بیان کیا گیا بالکل حق ہے اور اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں یہ سارے انبیاء علیہم السلام کا اعلان ہے جو صرف مسیح علیہ السلام ہی کا یہ اعلان نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو سب پر غالب اور نہایت حکمت رکھنے والی ہے۔

حق سے منہ پھیرنے والے مفسدین علم الٰہی میں موجود ہیں آپ ﷺ فکر نہ کریں

۱۳۸ اگر حق واضح ہو جانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں تو بلاشبہ ان مفسدین کو اللہ خوب جانتا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر وہ اپنی سرتابی جاری رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔ حق پہنچانے والے کا کام صرف حق بیان کر دینا ہے کسی کو حق پر چلانے کی ذمہ داری اس پر مطلق عائد نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ نے حق پہنچا دیا اور ان کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دیا اگر وہ نہیں مانتے تو اے پیغمبر اسلام آپ ﷺ زیادہ فکر مند نہ ہوں اپنا کام کئے جائیں اور ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں وہ قانون الٰہی کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔

بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ

ہے ۱۳

اے پیغمبر اسلام! تم یہود و نصاریٰ[۱۳۹] سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اختلاف چھوڑ کر اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر مسلم ہے کہ ہم سب اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں کسی ہستی کو بھی اس کا شریک نہ

اختلافی باتوں کو چھوڑ کر فریقین کے درمیان مسلم باتوں کی دعوت جاری رکھنے کا حکم

۱۳۹ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ اہل کتاب سے فرما دیں کہ اے نصاریٰ کی جماعت تم سب اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور تم کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ یہی ہے کہ ہم سب سوائے اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں' نہ فرزند کہہ کر' نہ اقنوم ٹھہرا کر' نہ مظہر یا اوتار بنا کر اور نہ کسی اور حیثیت سے۔ ہم میں سے کوئی بھی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کو اپنا رب بنا لے۔

رسول اللہ ﷺ کے معاصر جو مسیح تھے وہ کیتھولک فرقہ یا کلیسائے رومی کے قبیح تھے پروٹسٹنٹ فرقہ کئی صدیوں بعد کی پیداوار ہے جس نے اسلام سے متاثر ہو کر مسیحیوں کی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ کیتھولک فرقہ یا کلیسائے رومی کے لوگ مسیح پرستی' روح القدس پرستی' مریم پرستی' پاپا پرستی' ولی پرستی اور شہید پرستی میں مبتلا تھے اور ان سب کو اس توحید کی طرف عوت دی جاتی ہے جس کی دعوت خود عیسیٰ علیہ السلام دیتے رہے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کی بھی یہی دعوت تھی۔ اس لئے یہی وہ کلمہ ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مشترک ہے اگرچہ عیسائی اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

آیت زیر نظر سے تبلیغ و دعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینا چاہے جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اس چیز پر جمع ہونے کی دعوت دے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہے غور کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب شاہ روم ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے ہی مسئلہ کی طرف دعوت دی جو فریقین کے درمیان متفق علیہ تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور آپ ﷺ نے یہی آیت اپنے دعوت نامہ میں تحریر فرمائی۔ آپ ﷺ کا نامہ اقدس آج بھی صحیح بخاری کے اندر مندرج ہے جس کا ترجمہ اس طرح ہے۔

بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا

ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے کہ اللہ کو چھوڑ کر اسے اپنا رب بنا لے۔ پھر بھی اگر یہ لوگ اس بات سے روگردانی کریں[۱۴۰] تو تم

"اللہ کے نام سے جو نہایت ہی مہربان اور بہت ہی پیار کرنے والا ہے۔ یہ دعوت نامہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے روم کے بادشاہ ہرقل کی طرف تحریر کیا جاتا ہے۔ سلامتی ہر اس شخص پر جو راہ ہدایت کی پیروی کرے" سلام علی من اتبع الھدیٰ" ازیں بعد تجھے اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تو سلامت رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب لینے والوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں۔ اے اہل کتاب! اختلاف چھوڑ کر اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں مسلم ہے اگرچہ عملاً تم نے اس کو فراموش کر دیا ہے اور ہم سب مل کر اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی ہستی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے کہ اللہ کو چھوڑ کر اسے اپنا رب بنا لے۔" جیسا کہ تم نے عیسیٰ علیہ السلام کو بنا لیا۔

حق سے روگردانی کرنے والوں سے آخری بات کیا ہوگی؟

۱۴۰ "تم کہہ دو کہ گواہ رہو" اس حکم میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک اس پر ظاہر کر کے کلام کو ختم کر دو اور زائد بحث و تکرار کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب بھی کسی سے مذہبی گفتگو کرو تو دلائل و برہان پیش کرو ہٹ دھرمی اور ضد سے کام نہ لو۔ اگر کوئی دلائل و براہین کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو لیکن اپنی طرف سے اس کے ساتھ بول چال منقطع نہ کرو باقی معاملات میں اس سے بات چیت اور میل جول رکھو۔ اس سے منہ مت پھیرو اس لئے کہ اس نے دلائل اور حقائق کو تسلیم نہیں کیا تو اس طرح تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کیا ہے تو پھر آخر تمہاری ناراضگی کیوں؟

زیر نظر آیت نمبر ۶۴ نے انسانوں کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی اور یہیں سے ان گمراہ فرقوں کی بھی تردید نکل آئی ہے جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوگئے وہ اپنے ان اماموں کے مجرد قول کو بلا دلیل شرعی واجب القبول ٹھہراتے ہیں۔ کسی کو "رب" قرار دینے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس لفظ کا بھی اطلاق اس پر کیا جائے بلکہ اس کے اندر اگر صفات ربوبیت مان لئے گئے تو عملاً وہ "رب" ٹھہرا لیا گیا۔ اس آیت پر گہری نظر ڈالی جائے تو مسلمانوں کو اپنی اصلاح کر لینے کا سبق یاد ہو جائے۔ کاش کہ ایسا ممکن بھی ہو! اے اللہ! ہم مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔

يٰٓاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم صرف اور صرف ایک اللہ کو ماننے والے ہیں۔ ۶۴

اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل تو اس کے بہت بعد نازل ہوئی ہیں؟ کیا تم اتنی صاف بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟ ۱۴۱ ۶۵

اہل کتاب سے خطاب کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تمہارا جھگڑا کیوں اور کیسے؟

۱۴۱ "اہل کتاب" کہہ کر خطاب یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں سے کیا جا رہا ہے اور دونوں کو دعوت عقل دی جا رہی ہے اور ان کو کہا جا رہا ہے کہ بات کرنے سے پہلے اس کو اچھی طرح سوچ سمجھ بھی لینا چاہئے کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں؟ تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی تھے؟ قرآن کریم نے اس بات کی وضاحت سورہ بقرہ میں فرما دی جہاں ارشاد ہوا کہ:

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (البقرہ ۲: ۱۴۰)

کیا تمہارا یہود و نصاریٰ کا دعویٰ یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب بھی یہودی اور نصرانی تھے؟

اس دعویٰ پر کوئی دلیل بھی تمہارے پاس ہے؟ کیا بعد میں آنے والا پہلے کے دین و مذہب پر ہوتا ہے یا پہلے آنے والا بعد میں آنے والے کے دین و مذہب پر؟ غور کرو کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پہلے آئے تھے یا تمہاری یہودیت و نصرانیت پہلے آئی تھی؟ یعنی جن کتابوں پر تم اپنی نام نہاد یہودیت اور نصرانیت کی بنیاد قرار دیتے ہو وہ تو خود ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد کی کتابیں ہیں۔ اب بتاؤ کہ دین ابراہیمی کے متعلق کیوں کٹ حجتی پر تلے ہو جس کے بارہ میں ذرا بھی علم تمہارا پاس موجود نہیں۔ کجا یہ کہنا کہ ہم ملت ابراہیمی ہیں اور کجا یہ کہنا کہ ابراہیم ہماری ملت اور ہمارے دین ہی کے ایک آدمی تھے؟

قومی اور مذہبی بیچ میں جب کوئی عقیدہ بنا لیا جاتا ہے تو جو منہ میں آتا ہے کہہ دیا جاتا ہے عقل و فکر سے ہاتھ دھو لئے جاتے ہیں۔ جو بات اہل کتاب سے کہی جا رہی ہے آج بدقسمتی سے اس بات کے خود مسلمان شکار نظر آتے ہیں۔ کہیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کو معراج میں کندھا دلوایا جاتا ہے اور کہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے آدمؑ کی توبہ قبول کرائی جاتی ہے۔ کہیں رسول کا مرتبہ اللہ سے بڑھایا جاتا ہے تو کہیں امام کا رتبہ رسول پر سبقت لے جاتا ثابت کیا جاتا ہے اور کہیں اس کائنات کا سارا نظام کسی ولی اللہ کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا ہے۔

هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ

تم وہ لوگ ہو کہ تم نے ان باتوں میں جھگڑا کیا جن کے لئے تمہارے پاس علم بھی موجود تھا۔ یعنی تم نے جان بوجھ کر شرارتاً ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو اب اس بارے میں بھی جھگڑا کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے تم کچھ نہیں جانتے۔ ۱۴۲ ۶۶

اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ ہر بات میں ٹانگ اڑانا تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟

۱۴۲ "هَاأَنْتُمْ" میں ها قائم مقام ہمزہ استفہام کے ہے اور استفہام اس جگہ تعجب کے لئے ہے۔ تم وہ لوگ ہو کہ ان باتوں میں بھی تم نے جھگڑا کیا جن کا تم کو علم تھا" جس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ تم نے جان بوجھ کر ٹانگ اڑانے کی کوشش کی۔ مراد اس سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اور ان کی تعلیم ہے کہ یہود سیدنا عیسیٰ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اور نصاریٰ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کر چکے۔ یہود کے جھگڑوں کا ذکر سورہ بقرہ میں بتفصیل گزر چکا اور نصاریٰ کے جھگڑے کا ذکر اس سورہ آل عمران میں پیچھے پڑھتے آرہے ہو حالانکہ ان دونوں نبیوں کے اصل حالات واقعات اور حسب و نسب سے یہ لوگ اچھی طرح واقف تھے انہوں نے جہاں جہاں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی صرف شرارۃً" اور استہزاء کی اور خصوصاً "فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ" سے مراد وہ پیش گوئیاں بھی ہو سکتی ہیں جو ان کی کتابوں میں ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق تھیں یعنی پیش گوئیوں کے بارے میں تم نے جھگڑا کر لیا جن کے متعلق تم کو علم تھا۔ "تو اب اس بارے میں بھی جھگڑا کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے" یعنی اب دین ابراہیمی اور دعائے ابراہیمی کے بارے کیوں جھگڑا کرتے ہو اور کیوں کٹ حجتیوں پر تلے ہوئے ہو جس کے بارہ میں کوئی شائبہ علم بھی تمہیں حاصل نہیں۔ پھر یہ کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ من اللہ ہے کسی انسان کی طرف سے نہیں بیان کیا جا رہا ہے نہ کوئی تاریخی واقعہ کے طور پر بیان ہو رہا ہے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا جا رہا ہے جو یقینی اور حتمی ہے اور یہ بات تم بھی مانتے ہو کہ "اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔"

مختصر یہ کہ توحید و خدا پرستی کا یہی طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا۔ یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندیاں اور ان کے عقائد و رسوم سب بعد کی پیداوار ہیں اور دراصل دین ابراہیمی سے انحراف کا نتیجہ ہیں

إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ

ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھا اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو اللہ کا ایک فرمانبردار بندہ تھا اور بلاشبہ اس کی راہ شرک کرنے والوں کی راہ نہ تھی۔[۱۴۳] ۶۷

فی الحقیقت ابراہیمؑ سے نزدیک تر لوگ تو وہ تھے جو اس کے قدم بقدم[۱۴۴] چلے نیز اللہ

اگر یہود و نصاریٰ اس سلسلہ میں حجت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا طریقہ یہودیت و نصرانیت کا طریقہ تھا تو یہ جہل و تعصب کی انتہا ہوگئی کیونکہ یہ بات تو کسی بحث و دلیل کی محتاج نہیں کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں یہ گروہ بندیاں مطلق نہیں تھیں اور نہ ہی ہو سکتی تھیں۔ یہ گروہ بندیاں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر کی گئی ہیں اور یہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد ہوئے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کیا تھا؟ وہ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ تھا جو شرک سے بہت بیزار تھا

۱۴۳ ابراہیم علیہ السلام تو "حَنِيفًا مُّسْلِمًا" ایک سیدھا سادھا مسلم یعنی ایک فرمانبردار بندہ تھا۔ وہ نہ تو یہود تھا اور نہ نصرانی اس لئے کہ یہودیت و نصرانیت تو بعد میں آئی اور ابراہیم علیہ السلام پہلے ہو چکے اور پھر یہ بھی کہ موجودہ یہودیت و نصرانیت وہ ادیان بھی نہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے اس لئے کہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی بنایا ہوا ہے اس میں سوائے نام کے کوئی مشابہت بھی موجود نہیں۔ ہاں! اگر اصل دین جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے اس پر تم قائم ہوتے تو بھی یہ کہنے کا کوئی جواز ہوتا کیونکہ جو دین ابراہیم علیہ السلام کا تھا وہی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تھا۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی یہود و نصاریٰ دونوں کے ہاں مسلم تھی۔ تم وہ لوگ ہو کہ تم میں سے یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا یہ ایک کھلا شرک ہے جس کے تم دونوں فریق مرتکب ہو چکے اور ابراہیم علیہ السلام "شرک کرنے والوں کی راہ پر نہیں تھا۔" "حنیف" اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے رخ پھیر کر ایک خاص راستہ پر چلے۔

ابراہیم علیہ السلام کے قریب ترین تو وہی تھے جو حقیقت میں آپ کے متبع تھے

۱۴۴ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے قریب بہ لحاظ دین و عقائد تو وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کے زمانے میں آپ کی پیروی کی تھی جن کا ذکر قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾

کا یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ جو اس نبیؐ پر ایمان لائے ہیں۔[۱۴۵] یاد رکھو اللہ انہی کا مددگار ہے جو ایمان رکھنے والے ہیں۔ ۶۸

کہ: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (الممتحنة ۶۰: ۴) "تم لوگوں کے لئے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی طور پر بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔"

ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مخصوص صفت جس کا یہاں خاص کر ذکر کیا گیا وہ صرف اور صرف یہی ہے کہ انہوں نے برملا قوم سے خطاب کیا اور بے دھڑک کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔" پھر جب قوم نے ہٹ دھرمی کی تو انہوں نے اپنی قوم اور اپنے علاقہ سے عملاً بیزاری کا اظہار کر دیا اور سب کچھ چھوڑ کر فی سبیل اللہ ہجرت کر آئے۔

قوم کو برملا یہ کہنا کہ ہم تمہارے کافر ہیں نہ تمہیں حق پر مانتے ہیں نہ تمہارے دین کو اس لئے کہ اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا طاغوت سے کفر ہے ایمان دراصل وہی ایمان ہے جو طاغوت سے کفر کرنے کے بعد ہو۔ گویا ایمان باللہ کے لئے پہلے کفر بالطاغوت لازم و ضروری ہے۔ یہی درس و وعظ ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کا تھا اور یہی وعظ و درس قرآن کریم میں محمد رسول اللہ ﷺ نے دیا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ ۲: ۲۵۶)

"پس جو کوئی طاغوت سے انکار کرے یعنی سرکش اور فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں۔"

محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے سچے متبعین کا طریقہ بھی وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا

[۱۴۵] اور اس وقت "یہ نبی" یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ماننے والے یعنی مسلمان بھی اسی نسبت کے حق دار ہیں اور بحمد اللہ فرنگی مورخین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم اسرائیلی مذہب کا جانشین اب اگر کوئی ہے تو وہ مسیحیت نہیں جس کے اندر یونانی اور رومہ کے جاہلی مشرکانہ عقائد جمع ہو گئے ہیں

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۹ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ

اے پیروان اسلام! اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو اس بات کا خواہش مند ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ حق سے بھٹکا دے لیکن یاد رکھو وہ تمہیں گمراہ کرنے کی سازشیں کر کے تمہیں نہیں خود اپنے آپ ہی کو گمراہی میں ڈالے ہوئے ہیں اگرچہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔[۱۴۶] ۶۹

اے اہل کتاب! یہ کیا بات ہے کہ تم اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہو حالانکہ اس

بلکہ اسلام ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مورخین کی تاریخ عالم" قدیم اسرائیلی مذہب وہی تھا جو اس گروہی مذہب جس کو یہودیت اور نصرانیت کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے پہلے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد موجود پایا جاتا تھا۔

اہل کتاب خود تو گمراہ ہیں ہی لیکن ان کی کوشش ہے کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ

۱۴۶ یہ دراصل مسلمانوں کو چونکا دینے اور جاگتا رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ اہل کتاب خود تو گمراہ ہیں ہی لیکن ان کو یہ فکر بھی دامن گیر ہے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔ روایات میں یہ بات واضح ہے کہ یہود کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے اور انہیں باطل کی قوت پر اتنا غرّہ تھا کہ خود اسلام قبول کرنا تو الگ رہا۔ مسلمانوں کو بھی ان کے عقائد سے برگشتہ کر دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آج بھی کتنے مسیحیوں کے دل میں یہ تمنا جیتی جاگتی موجود ہے کہ مسلمان عیسائیت کو قبول کر لیں اور اس کے لئے جو جو راستے وہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور جن جن طریقوں سے وہ اس کام میں مصروف ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لٹریچر مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ مذہبی کتب کی عبارات اور قصص بیان کر کے سوالنامے تحریر کئے جاتے ہیں پھر ان سوال ناموں کو حل کر کے بھیجنے والوں میں انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جو جس لالچ میں پھنسنے کے لئے تیار ہو اس کو پھنسانے کے لئے وہی ضرورت اس کی پوری کی جاتی ہے۔ جس کی داستانیں بہت لمبی اور سازشیں بہت گہری ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ جو سچا اور پکا مسلمان ہو گا وہ ان کے لالچ میں کیوں پھنسے گا؟ کیونکہ وہ تو اپنے دین میں اس قدر پکا ہو گا کہ اس کو کوئی لالچ بھی متاثر نہیں کر سکتا ہاں جو مسلمان ہی نہیں بلکہ صرف لالچ کا بندہ اور اپنی

خواہش کا غلام ہے وہ اگر جھک بھی گیا تو اس سے اسلام کا کیا بگڑا؟ جو نقصان ہوا ان لالچ دینے والوں ہی کا ہوا اگرچہ ان کی سمجھ میں آنے والی یہ بات نہ ہو۔ اہل کتاب کے اس عمل کی قرآن کریم نے بھی بار بار اطلاع مسلمانوں کو دی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بناء پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نافذ فرما دے۔" (البقرہ ۲: ۱۰۹)

راہ حق سے بھٹکانے کے لئے ایک تدبیر انہوں نے مزید سوچی جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح ہے کہ: "اور دیکھو اہل کتاب میں سے ایک گروہ ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے ایسا کرو کہ صبح ان کی کتاب پر ایمان لے آؤ اور شام کو انکار کر دو اس طرح عجب نہیں وہ لوگوں کو اسلام سے پھرتے ہوئے دیکھ کر خود بھی پھر جائیں۔" (ال عمران ۳: ۷۲)

ایک جگہ قرآن کریم نے اس طرح مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے کہ:

"مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اپنے آدمیوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہم راز اور معتمد بناؤ۔ ان لوگوں یعنی اہل کتاب کا حال تو یہ ہے کہ تمہارے خلاف فتنہ انگیزی میں کمی کرنے والے نہیں جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہی انہیں اچھی لگتی ہے۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں ہی سے ظاہر ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہم نے فہم و بصیرت کی نشانیاں تم پر واضح کر دی ہیں۔" (ال عمران ۳: ۱۱۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"ان لوگوں کی دلی تمنا تو یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے خود کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تم بھی کر لو اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔" (النساء ۴: ۸۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"اور وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے بھٹک جاؤ۔ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہے تمہارے لئے اللہ کی دوستی اور اس کی مددگاری کافی ہے۔" (النساء ۴: ۴۵، ۴۶) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

"اور اے پیغمبر اسلام! اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت کارفرما نہ ہوتی تو واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک جماعت نے تو پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تمہیں غلط راستہ پر ڈال دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ غلط راستہ پر نہیں ڈال رہے مگر خود اپنے آپ کو۔ یہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کر دی ہے اور جو باتیں تمہیں معلوم نہ تھیں وہ تمہیں سکھا دی ہیں اور تم پر اس کا بہت ہی بڑا فضل ہے۔" (النساء ۴: ۱۱۳)

سورہ بقرہ میں بھی جا بجا ان لوگوں کی اس خواہش اور اس طرح کی تدبیروں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ عروۃ الوثقیٰ جلد اول میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ
بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ

کی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں۔ ۱۴۷ ۷۰

اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملا جلا کر مشتبہ کر دیتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔ ۱۴۸ ۷۱

اور اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ ایسا کرو کہ صبح ان کی کتاب

اہل کتاب سے خطاب کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو

۱۴۷ اہل کتاب کی اس شقاوت کا بیان کہ وہ حق کو حق سمجھتے ہوئے اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ حق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی آیات جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہو رہی تھیں اور جن کی صداقت وہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے اور خود اس بات کے گواہ بھی تھے کہ ان کی کتابوں میں ایک رسول کے آنے کا ذکر موجود ہے اور اس آنے والے رسول کی بہت سی نشانیاں بھی وہ اپنی کتب سماوی میں پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ نبی اعظم و آخر پر منطبق ہوئی دیکھ بھی رہے تھے لیکن اس کے باوجود اتنے ڈھیٹ تھے کہ صاف صاف انکار کر دیتے تھے اور پھر اس کی مزید وضاحت اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرما دی کہ ان کا یہ انکار کچھ ناواقفیت اور لاعلمی کی بناء پر نہیں بلکہ جان بوجھ کر ان آیتوں میں تحریف کر رہے ہیں لفظی تحریف بھی اور معنوی تحریف بھی۔

اہل کتاب سے خطاب کہ تم حق و باطل کو کیوں ملاتے ہو اور خصوصاً حق کو کیوں چھپاتے ہو؟

۱۴۸ اس آیت زیر نظر یعنی سورہ آل عمران کی آیت ۷۱ میں یہود پر تین الزامات متعین طور پر لگائے گئے اور وہ ایک کی بھی تردید نہیں کر سکے اس لئے کہ تینوں الزامات صحیح اور واضح ہیں۔ ۱۔ حق کو باطل کے ساتھ ملا جلا کر مشتبہ کر دینا یعنی اپنی الہامی کتابوں کے احکامات کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ حق بالکل باطل کے تحت میں دب کر رہ جاتا ہے۔ باطل حق کو ڈھانپ لیتا ہے اور تاویل تاویل نہیں رہتی بلکہ تاویل سے بڑھ کر صریح تحریف بن جاتی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہیں اور پھر باز بھی نہیں آتے۔ دوسرے یہ کہ حق کو سرے سے چھپا ڈالتے ہیں اور کتب آسمانی میں جہاں جہاں بشارتیں پیغمبر اسلام کی صاف صاف موجود ہیں وہاں ان عبارتوں کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور ذرا نہیں جھجکتے کہ یہ ہم کیا کر رہیں ہیں اور کس سے کر رہے ہیں؟ تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ اپنے قصد و ارادہ سے کر رہے ہیں۔ محض اتفاقی طور پر نہیں ہو رہا ہے۔

مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا

یعنی قرآن پر ایمان لے آؤ اور شام کو انکار کر دو۔ اس طرح عجب نہیں وہ یعنی مسلمان اسلام سے پھر جائیں۔[۱۴۹] ۷۲

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرنے والے

تحریفات اہل کتاب پر پوری بحث سورہ بقرہ آیت نمبر ۴۲ تا ۴۶ کے تحت گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج یہ تینوں بیماریاں علمائے اسلام کی اکثریت میں پائی جارہی ہیں اور زمرہ علماء ہے کہ وہ ٹس سے مس بھی نہیں۔ قرآن و حدیث کو بالکل چھوڑ کر قوم کو قصوں اور کہانیوں پر لگا دیا گیا ہے ضمناً اگر قرآن کریم کی کوئی آیت اگر پیش بھی کی جاتی ہے تو اپنے اصل مطلب و مفہوم سے بالکل الگ کر کے اپنی خواہشات کی بھینٹ اسی کو چڑھا دیا جاتا ہے۔ عوام بیچارے تو ناواقف ہیں لیکن علماء جن کو علماء کہا جا سکتا ہے سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے ہیں ہاں! دو رکعت کے امام جن کو عرف عام میں "ملانے" کہا جاتا ہے وہ زمرہ علماء میں شامل نہیں بلکہ وہ تو چھوٹے چھوٹے دکاندار اور دیہات کے ساتویں کمین ہیں جو ملاں کا بچہ ملاں کے لحاظ سے کام کر رہے ہیں اور علاقائی رسومات کی ادائیگی کے لئے رکھے گئے ہیں جو مذہبی رسوم کے نام سے ادا کی جاتی ہیں۔

اہل کتاب کی سادہ لوح مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی ایک اسکیم کا بیان

[۱۴۹] اس آیت کا مفہوم ایک سے زیادہ طریقوں سے سمجھا دیا گیا ہے اور ہر مفہوم اپنے اپنے مقام پر صحیح اور درست ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ کے قریب تو مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب نے دین اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یہ تجویز کی کہ اپنے کچھ لوگوں کو تیار کیا کہ صبح جا کر منافقت کرتے ہوئے وہ مسلمان ہو جائیں اور شام کو کہہ دیں کہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس دین میں کوئی بات بھی حق نہیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ سادہ لوح مسلمان بھی متاثر ہوں گے اور مشکوک ہو کر دین سے پھرنا شروع ہو جائیں گے یعنی اس طرح وہ سمجھیں گے کہ اہل کتاب کو کوئی دشمنی نہیں تھی وہ تو مسلمان ہو ہی گئے تھے لیکن انہوں نے جب اس دین کے اندر داخل ہو کر اس کو جھوٹا پایا تب ہی تو اس کو چھوڑا ہے اگر اس میں کوئی صداقت ہوتی تو وہ مسلمان ہی رہتے۔ اس لئے وہ بھی اسلام چھوڑ کر پھر کفر کی طرف لوٹ آئیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ یہودی مذہب کی طرف ہی لوٹ آئیں۔ یہ اسکیم انہوں نے اس لئے بنائی کہ وہ دیکھ رہے تھے

کہ جو شخص اسلام کے اندر داخل ہوتا ہے وہ واپس پھرنے کا نام ہی نہیں لیتا خواہ اس کو جان کے لالے پڑ جائیں بلکہ جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں۔ جیسا کہ ہرقل والی حدیث میں ابوسفیان کی زبان سے بھی یہ شہادت موجود ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے سوال کیا تھا کہ کیا اس دین کو قبول کرنے والے پھر اس دین سے برگشتہ بھی ہو جاتے ہیں اس نے جواب دیا تھا کہ آج تک یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ جو شخص اسلام لایا پھر اس نے اسلام سے کبھی انحراف کیا ہو۔ ہرقل نے اس کو کہا تھا کہ پھر تو یقیناً دین اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ اسلام کی صداقت پر ایک بڑی بھاری اور وزنی دلیل و شہادت تھی۔ مسلمانوں کی اس مضبوطی کو دیکھ کر ہی اہل کتاب نے یہ حیلہ سوچا تھا کہ شاید اس طرح دین اسلام بدنام ہو حالانکہ یہ اسکیم ان کی دلائل میں عاجز ہونے کی ایک واضح دلیل تھی۔ انہوں نے جب دین اسلام کو ہر پہلو سے کامیاب ہوتا دیکھا تو ایسی ایسی مخفی تدبیروں پر اتر آئے کہ شاید اس طرح اسلام کا غلبہ ٹوٹ جائے۔ وہ وقت تو وہ تھا آج بھی اہل کتاب اس طرح کی تدبیریں اسلام کو تباہ کرنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ایران و عراق کو لڑا کر انہوں نے کیا کیا جب ان کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی تو عراق کو کویت پر حملہ کی شہ انہوں نے خود دی پھر کویت سے ہمدردی کا اظہار کر کے عراق کو کمزو سے کمزور تر کر دیا اور کویت و سعودیہ کی دولت کو کئی طرح سمیٹ لیا اب پاکستان کو ہڑپ کرنے کی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں اور اسرائیل کو بڑھا کر مسلمانوں کو اس سرطان کی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس وقت جب کہ ابھی خود رسول اللہ ﷺ موجود تھے ان کی اسکیم کارگر نہ ہوئی اگرچہ نقصان انہوں نے اس وقت بھی پہنچایا لیکن افسوس کہ اس وقت اہل یہود اور نصاریٰ کی ملی جلی اسکیمیں مسلمانوں پر کارگر ثابت ہو رہی ہیں لیکن مسلمان ہیں کہ ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی کہ ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان اسکیموں کو یقیناً فیل کرے گا نہیں بلکہ ان ہی اسکیموں کو ان کی تباہی کا باعث بنا دے گا یہ وقت کب آئے گا اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

ایک مطلب یہ بھی اس آیت کا بیان کیا گیا ہے کہ "دن کے پہلے حصے میں ایمان لے آؤ اور پچھلے حصے میں انکار کر دو" کا مفہوم یہ کہ نفاق کے طور پر مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو مگر فی الواقع اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہو گویا جب مسلمانوں سے ملو تو ان کو باور کرائے رکھو کہ ہم مسلمان ہی ہیں اور جب اپنے لوگوں سے ملو تو ان کی یقین دہانی کے لئے ان کے ساتھ ہونے کا عہد کرو اور اس پر مضبوطی سے قائم رہو۔ یہ مفہوم ابومسلم اصفہانی نے بیان کیا ہے اور اس کی تصدیق میں یہ آیت بھی پیش کی ہے جو خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے کہ:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (البقرہ ۲: ۱۴)

جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے سرداروں کے پاس آتے ہیں تو

إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ ۙ أَنْ

ہوں اور کسی کی بات نہ مانو۔[150] تم ان لوگوں سے کہہ دو ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت[151] ہے۔ ہاں! ان کے سازشی یا اسکیمران کو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بات بھی نہ مانو کہ جیسا

کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہے اور احادیث و تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ محض نفاق کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے تاکہ اس طرح دین اسلام کو بدنام کریں۔

ایک تیسرا مطلب اس کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ اسکیم بنائی کہ احکام اسلام میں تفریق کر کے ان کو دو قسم کے ٹھہرایا جائے وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا کہ اگر تم اسلام کو اس کی ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو سب لوگ تم کو جھوٹا سمجھیں گے کیونکہ بہت سی باتیں جو وہ لایا ہے وہ حق ہیں اور عوام بھی ان کو حق مانتے اور تصور کرتے ہیں اگر تم اس کو ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو عوام تم کو جھوٹا سمجھیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کی کچھ باتوں کی تم تصدیق کرو اور ان کو سچ کہو اور بعض باتوں کو جھوٹا کہو تاکہ لوگ تمہارے کلام کو انصاف پر محمول کریں اور تمہاری بات کو قبول کریں اور اس طرح خود بخود وہ دین اسلام کی طرف میلان کرنے سے باز آجائیں گے یہ مفہوم "اصم" سے منقول ہے۔

اہل کتاب کی مذکورہ اسکیم کا بقیہ حصہ

[150] اہل کتاب کی اسکیم کا بقیہ حصہ اس طرح ہے کہ "وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرنے والے ہوں اور کسی کی بات نہ مانو" مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو اس طرح تفہیم کراتے کہ حقیقی ایمان تمہارا صرف اس نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو۔ پس جبکہ ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لئے تیار کیا کہ وہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں یا کچھ حصہ کو صحیح تسلیم کر لیں تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہہ دیا کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور اس طرح نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے روکا کیونکہ آپ ﷺ کی شریعت میں بہت سی باتیں ان کی بنائی ہوئی شریعت موسوی کے خلاف تھیں اور ان کا یہ قول قرآن کریم کی اس آیت کے بھی مطابق ہے "قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ" (البقرہ ۲: ۹۱) "وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف وہی بات مانیں گے جو ہم پر اتری ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس سے انہیں انکار ہے۔" انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس لئے کہ دراصل ان کا کہنا یہ ہے کہ جو نبی آئے شریعت موسوی اور قوم یہود یعنی بنی اسرائیل ہی میں سے آئے بنی اسمٰعیل سے آیا ہوا نبی ہم نبی نہیں مان سکتے۔

يُؤْتَىٰٓ أَحَدٌ مِّثْلَ مَآ أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَآجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ

کچھ دین تمہیں دیا گیا ہے ویسا ہی کسی دوسرے انسان کو ملا ہو یا یہ کہ تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہو۔ اے پیغمبر اسلام! تم ان لوگوں سے کہو

اصل ہدایت تو وہی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے

۱۵۱ اہل کتاب کا یہ کہنا تھا کہ "سوائے اس نبی کے جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور کسی کی نہ مانو" اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بات بھی نہ مانو کہ جیسا کچھ دین تمہیں دیا گیا ہے ویسا ہی کسی دوسرے انسان کو بھی دیا جا سکتا ہے۔" ارشاد ہوتا ہے کہ اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو کہ ہدایت تمہاری اسکیموں کے تحت نہیں ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے قانون کے مطابق دیتا ہے جس کو دیتا ہے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ان یہود کو اتنا خیال بھی نہیں رہتا کہ ہم کم از کم ایسی باتیں تو نہ کریں جو خود ہماری تسلیم شدہ کتابوں کی ہدایت کے خلاف ہوں۔ اسی رسالت کے متعلق تو یہ رہنمائی ان کی اپنی کتاب میں موجود ہے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ:

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔" (استثناء ۱۸: ۱۵)

یہ جو فرمایا کہ "تیرے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی" یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو بنی اسرائیل کے نبی تھے بنی اسمٰعیل میں سے آنے والے نبی کی اطلاع دی تھی۔ اور مثیل موسیٰ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی ویسی ہی ہدایت دی گئی جیسی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ اب یہود یہ کہیں کہ "تم یہ بات نہ مانو کہ جیسا کچھ دین تمہیں دیا گیا ہے ویسا ہی کسی دوسرے انسان کو بھی دیا جا سکتا ہے" تو بات ان یہود کی درست ہے یا اس اللہ کی جو اصلی ہدایت دینے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہود اس طرح سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے اپنے ہی دین کے وہ خلاف ہے۔

اس بات کو سورہ بقرہ آیت ۷۶ میں بھی بیان کیا ہے جہاں فرمایا گیا کہ "جب یہ لوگ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے ہیں لیکن جب اکیلے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں جو کچھ تمہیں خدا نے علم دیا ہے وہ ان لوگوں پر کیوں ظاہر کرتے ہو؟ کیا اس لئے کہ وہ تمہارے خلاف تمہارے پروردگار کے حضور اس سے دلیل پکڑیں۔" تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ کی آیت ۷۶

قرآن کریم نے علمائے یہود کی یہ گمراہی کہ وہ کتاب اللہ کے احکام پر اپنی رائیوں اور خواہشوں کو ترجیح دیتے اور پھر اپنے گڑھے ہوئے حکموں اور مسئلوں کو کتاب اللہ کی طرح واجب العمل بتلاتے تھے۔ آج بدقسمتی

إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾ وَمِنْ

فضل و بخشش تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق اپنے فضل و کرم سے مالا مال کر دیتا ہے۔[۱۵۲] وہ بڑی ہی وسعت رکھنے والا جاننے والا ہے۔ ۷۳

وہ جس کسی کو چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق اپنی رحمت کے نزول کے لئے چن لیتا ہے، اس کا فضل بڑا ہی فضل ہے۔[۱۵۳] ۷۴

سے علمائے اسلام کی اکثریت بھی وہی کچھ کر رہی ہے جو کبھی علمائے یہود کے ذمہ لگایا جاتا تھا۔

اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ فضل و بخشش تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے

۱۵۲ انعامات الٰہی میں سے سب سے بڑا انعام نبوت کا انعام تھا جب تک کہ نبوت جاری تھی۔ اب جب نبوت ختم ہوگئی جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انعام اب کسی کو نہیں دیا جا سکتا کہ یہ انعام جس جس کو دیا جانا تھا دیا جا چکا کیا یہ انعام ختم ہو چکا؟ نہیں بلکہ انعام پانے والے ختم ہوگئے اس لئے کہ اب کوئی اس انعام کا مستحق پیدا ہی نہیں ہو سکتا تو انعام کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ یہود سے کہلوایا جا رہا ہے کہ "تم ان لوگوں سے کہو فضل و بخشش تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق اپنے فضل و کرم سے مالا مال کر دیتا ہے۔" تمہاری طرف سے پابندی کیسے لگائی جا سکتی ہے جب کہ ایک چیز تمہارے اختیار ہی کی نہیں ہے۔ تم کو تو چاہئے تھا کہ تم وہی کرتے جو تمہارے اختیار میں ہے۔ اختیار سے تجاوز تو انسانیت سے تجاوز کا دوسرا نام ہے۔

اللہ جس کو چاہتا ہے حسب مصلحت تکوینی اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے

۱۵۳ فضل و رحمت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنی مصلحت تکوینی کے مطابق عطا کر دیتا ہے۔ سب کام اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہی داتا ہے اس کے سوا کوئی داتا نہیں جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق ایمان و عمل اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق راہ حق سے اندھا اور کلمہ اسلام سے بہرا اور صحیح سمجھ سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کے سب کام اپنے قانون کے مطابق ہوتے ہیں جو کبھی بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتے وہ وسعت علم رکھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی بھی علم نہیں رکھتا۔ وہ جسے چاہے اپنے رحمت سے خاص کر دے اس نے ہر کام کے لئے ایک قانون مقرر کر دیا ہے اس کا فضل و کرم سب پر بھاری ہے۔

اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ

اور اہل کتاب میں سے کچھ آدمی تو ایسے دیانتدار ہیں کہ اگر تم چاندی سونے کا ڈھیر بھی ان کی امانت میں چھوڑ دو تو وہ تمہاری طلب پر تمہارے حوالے کر دیں لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ اگر ایک روپے کے لئے بھی ان پر بھروسہ کرو تو کبھی تمہیں واپس نہ کریں جب تک تقاضے کے لئے ہمیشہ ان کے سر پر کھڑے نہ رہو۔ یہ ۱۵۴

اے مسلمانو! اس خالق حقیقی نے بے حد و بے پایاں انعامات تم پر کئے اور سارے انعامات سے بڑا انعام اس نے تم پر یہ کیا کہ تمہارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء کرام پر فضیلت دی اور ہر لحاظ سے کامل اور ہر حیثیت سے مکمل شریعت اس نے تم کو دی اور فائدہ حاصل کرنے کا اختیار بھی تم کو دے دیا۔

اسلام ہی دین فطرت ہے وہ اہل کتاب کی خوبی کو خوبی تسلیم کرتا ہے

۱۵۴ اسلام ہی وہ دین فطرت ہے جس میں کسی مخالف سے مخالف انسان کی خوبی کو بھی چھپانے کا درس نہیں دیا جاتا بلکہ یہی سمجھایا جاتا ہے کہ نیکی نیکی ہے اور خوبی خوبی ہے خواہ کوئی کرے۔ برائی برائی ہے اور کمزوری کمزوری ہے خواہ وہ کسی سے ہو۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کسی غیر مسلم کے اچھے اوصاف کی مدح کرنا جائز اور درست ہے۔ زیر نظر آیت میں بعض اہل کتاب کے امانت دار ہونے پر ان کی مدح کی گئی ہے۔ اگر اس بعض سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو ایمان لا چکے تھے تو ان کی تعریف کرنے میں کوئی اشکال ہی نہیں لیکن وہ مراد ہوں جو ایمان نہیں لائے تھے تو پھر خیال پڑتا ہے کہ ان کے کفر کے باوجود ان کی مدح کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کی مدح کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ مسلم ہو غیر مسلم کی مدح بھی کی جا سکتی ہے جب کہ اس میں وہ خوبی موجود ہو۔ ان اہل کتاب میں یہ خوبی موجود تھی کہ وہ اتنے دیانت دار ہیں کہ "اگر تم چاندی سونے کا ایک ڈھیر بھی ان کی امانت میں چھوڑ دو تو وہ تمہاری طلب پر تمہارے حوالے کر دیں گے۔" سوال یہ ہے کہ جب کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا تو پھر ان کی مدح کا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ دیانت و امانت کا تعلق صرف آخرت ہی سے نہیں بلکہ اس دنیا کی زندگی سے بھی ہے۔ کسی کی مدح کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس فعل کا تعلق آخرت ہی سے ہو اس سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ اچھی بات اگرچہ کافر کی ہو وہ بھی اچھی ہے جس کا فائدہ اس کو دنیا میں "نیک نامی" سے ملتا رہتا ہے اور آخرت میں بھی عذاب کی کمی سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ اس سے تو یہ سبق ملتا ہے کہ اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیتا بلکہ کھلے دل سے اپنے

عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ

اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمارے لئے کوئی مواخذہ[۱۵۵] نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر اللہ پر تہمت باندھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ حقیقت حال کیا ہے[۱۵۶]؟ ۷۵

مخالف کے ہنر و خوبی کی بھی اس کے مرتبے کے مطابق داد دیتا ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ جس قوم میں ایسے دیانت دار لوگ موجود ہیں اس قوم میں ایسے بددیانت بھی ہیں کہ صرف ایک دینار دے کر دیکھ لو کبھی وہ واپس کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے گویا انہوں نے واپس دینے کے لئے لیا ہی نہ تھا۔ ہاں اگر واپس دیں گے بھی تو آسانی سے نہیں بلکہ جب تم تقاضا پر تقاضا کرتے رہو گے اور ہر حال ان کا پیچھا نہیں چھوڑو گے گویا ہر وقت تم ان کے سر پر بیٹھ گئے اور ان کا ناطقہ بند کر دیا وہ اتنے مجبور ہو گئے کہ اب ادائیگی کے سوا کوئی چارا نہ رہا تو چار و ناچار ان کو واپس دینا پڑا۔ یہ مال تو ایک چھوٹی سی رقم کا ہے اگر ان کے ہاتھ بڑی رقم لگ گئی تو پھر کیا ہو گا؟ فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے لئے انہوں نے حیلہ گھڑا ہوا ہے وہ کبھی واپس کرنے کے نہیں بلکہ ہر حال میں وہ ہضم کریں گے اور پھر ہضم کرنے کے لئے اس حیلہ سے کام لیں گے۔

جو بددیانت ہیں انہوں نے اپنی بددیانتی چھپانے کے لئے حیلہ بنا رکھا ہے

۱۵۵ فرمایا حق دار کا حق ادا نہ کرنے کے لئے انہوں نے ایک حیلہ اختیار کر رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ "اُمّیوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمارے لئے کوئی مواخذہ نہیں ہے" امی سے مراد ان پڑھ اور جاہل بھی ہو سکتا ہے لیکن اس جگہ مراد مکہ کے وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور وہ اسی لقب یعنی امی سے پہچانے جاتے تھے۔ اہل کتاب کہا کرتے تھے کہ ان اُمّیوں کا مال کھا جانے میں کوئی گناہ نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ اللہ پر کھلا جھوٹ اور بہتان ہے۔ اس کا علم ان کو بھی ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ ناحق مال کھانا حرام ہے لیکن یہ ان لوگوں نے اپنی خواہش نفس سے بات گھڑ لی ہے یا ان کے پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کی کارستانی ہے اس لئے کہ یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے یہ اتنے شاطر لوگ ہیں کہ خود بات گھڑتے ہیں اور شریعت کے رنگ میں اس کو اس طرح رنگ دیتے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہود غیر یہود کے ساتھ کاروباری تعلق کے سلسلہ میں بدمعاملگی کے لئے برابر بدنام رہے ہیں قومی مفاخرت اور نسلی نخوت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے۔ گوروں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ آج بھی دنیا کے ہر علاقے میں کیا ہے؟ سب پر

اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ

ہاں! جو شخص اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور پرہیزگاری اختیار کرتا ہے تو اللہ کی پسندیدگی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں۔[۱۵۷] ۷۶

واضح ہے۔

اہل کتاب کے اس گروہ کا ذکر ان کی ذم کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی بددیانتی کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا جائے تاکہ مسلمان اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ بددیانتی بہرحال بددیانتی ہے خواہ کسی سے بھی کی جائے اور اس کو کوئی حیلہ جائز و درست نہیں کر سکتا۔

شومئی قسمت کہ آج مسلمانوں نے بھی ایسے بیسیوں حیلے گھڑ لئے ہیں اور انہی حیلوں بہانوں سے ایک دوسرے کا مال ہڑپ کیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کی روحوں کو مال پہنچانے کے ٹھیکہ دار جو ثواب کی صورت میں منی آرڈر پہنچاتے ہیں ان کی تو کوئی کمی نہیں کوئی قصبہ یا شہر ان کی زد سے نہیں بچا۔

زیر نظر آیت میں دینار کا لفظ آیا ہے سوال پوچھا جا رہا ہے کہ دینار کو دینار کیوں کہتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ دینار کو اس لئے دینار کہتے ہیں کہ وہ دین یعنی ایمان بھی ہے اور نار یعنی آگ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جائز طریقہ سے لو گے تو دنیا میں تو کام دے ہی گا لیکن آخرت میں کوئی نقصان نہیں کرے گا۔ لیکن اگر ناحق لو گے تو نار یعنی آتش دوزخ ہے دنیا میں اگرچہ اس سے کام لے لو گے لیکن آخرت میں آتش دوزخ بھی ملے گی اس لئے اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے ذرا سوچ لو کہ کیا لے رہے ہو اور یاد رکھو کہ ناحق جس سے بھی لو گے فی الواقع نار ہی ہوگی۔

ہر بددیانتی کرنے والا جانتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں

۱۵۶ قرآن کریم کہتا ہے کہ دیانت تو ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔ دین و مذہب کے اختلاف سے اچھائی اور برائی کے حقائق معطل نہیں ہو جاتے۔ جو شخص بددیانتی کرتا ہے خواہ وہ کسی گروہ یا کسی اعتقاد والے آدمی کے ساتھ کرے گناہ ہے اور وہ قیامت کے روز اللہ کی بخشش و رحمت سے محروم رہے گا اور یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں جو کرتا ہے بالکل جان بوجھ کر کرتا ہے اور ایک برائی کی بجائے دو برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے ایک بددیانتی اور دوسری دھوکہ بازی اور دونوں ہی برائی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔

عہد کو پورا کرنے والے اور دیانتدار ہی متقی لوگ ہیں

۱۵۷ اس آیت میں اسلام کی پوری وسعت بیان فرما دی گئی۔ ذکر تو صرف امانت کا تھا مگر ایک قسم

يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک حقیر قیمت کے لئے اللہ کا عہد اور خود اپنی قسمیں فروخت[۱۵۸] کر ڈالتے ہیں یعنی دیانت داری کی جگہ خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں تو

کی ذمہ داری کو اس کے اندر داخل کرنے کے لئے پہلے عہد کے پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی اور پھر تقویٰ کی طرف اس کو منتقل کر دیا گیا۔ عہد کو تو ہر ایک شخص سمجھتا ہے یعنی کوئی بھی ذمہ داری جو انسان علی الاعلان اپنے اوپر لے لیتا ہے عہد میں داخل ہو جاتی ہے مگر تقویٰ کے اختیار کرنے میں اشارہ زیادہ تر باریک امور کی طرف ہے جس کا تعلق امانت اور دیانتداری سے ہے کیونکہ امانت کی ادائیگی میں ہر قسم کے ان حقوق کی ادائیگی داخل ہے جو انسان کے ذریعہ امانت ہوں خواہ وہ عہد کے اندر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ گویا کھلا عہد ہو یا بطور امانت کوئی ذمہ داری خواہ کسی کے متعلق ہو تو ان عہدوں اور امانتوں کو ادا کرنا ضروری و لازمی ہے اور اس طرح انسان اللہ کا محبوب بنتا ہے اور اتقی کا مرتبہ ایسا کامل ہے کہ ایفائے عہد بھی اس میں آجاتا ہے اس لئے آخر آیت میں صرف "يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ" کے الفاظ فرما دیئے اور انہی عہود میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان جن کو "عہد میثاق" کا نام بھی دیا جاتا ہے داخل ہیں۔ کیونکہ اس کے احکام جن کو ایمان لا کر انسان علی الایمان قبول کر چکا ہے اس لئے ان کی تعمیل بھی ضروری ہے اور اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ ہی کے عہد کا ذکر شروع بھی ہو رہا ہے۔

اللہ کے عہد توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کا حال

۱۵۸ عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے بخلاف وعدہ کے کہ وہ صرف جانب واحد سے ہوتا ہے یعنی عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے۔ ایفائے عہد کی قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بہت تاکید آئی ہے چنانچہ اس آیت میں بھی عہد کے خلاف ورزی کرنے والے پر پانچ وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ ان کو جنت کی نعمتوں میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن بات نہیں کرے گا۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے روز رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا کیونکہ عہد کے خلاف کرنے کی وجہ سے عبد کا حق تلف ہوا ہے اور حق العبد کو اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کرنے کا خود عہد فرمایا ہے۔ ۵۔ اور ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

یہ گویا آیت کا ماحصل تھا اب ذرا تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

"ابووائل رضی اللہ عنہ کی وساطت سے عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو

شخص کسی مسلمان کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ایسی حالت میں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا اور یہ بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے یہ پوری آیت ولھم عذاب الیم تک تلاوت فرمائی۔ حضرت عبداللہ یہ حدیث بیان کر چکے تو حضرت اشعث رضی اللہ عنہ جو قیس کے بیٹے تھے باہر سے اندر تشریف لائے اور لوگوں سے دریافت کیا کہ ابو عبدالرحمٰن نے تم سے کیا حدیث بیان کی تھی۔ لوگوں نے بتا دیا کہ یہ یہ بیان کیا تھا حضرت اشعث کہنے لگے کہ یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی تھی۔ بات اس طرح ہوئی کہ میرا ایک کنواں میرے چچا کے بیٹے کی زمین میں تھا میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی آپ ﷺ نے فرمایا اپنے گواہ پیش کرو ورنہ اس کی قسم کو تسلیم کر لو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ تو اس پر قسم کھالے گا آپ ﷺ نے فرمایا جس نے مسلمان آدمی کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائی جب کہ وہ اس قسم کے کھانے میں جھوٹا ہو تو قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ کی پیشی میں حاضر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

ایک حدیث میں حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح منقول ہے کہ میرے اور ایک یہودی کے درمیان کچھ زمین کا نزاع تھا یہودی میرے حق کا منکر تھا میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ نے یہودی سے فرمایا تو قسم کھا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ یہ تو قسم کھالے گا اور میرا مال لے جائے گا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (ابوداؤد، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص کچھ تجارتی سامان بازار میں لایا اور کسی گاہک کو پھانسنے کے لئے اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ مجھے اس کی اتنی قیمت ملتی ہے حالانکہ اس کو اتنی قیمت نہیں ملتی تھی۔ یا اس طرح کہا کہ میں نے اس سامان کی اتنی قیمت دی ہے اور اس پر تاکیداً قسم بھی کھائی حالانکہ اس نے اتنی قیمت نہیں دی تھی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری)

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں کوئی تضاد نہیں اس لئے کہ بات تقریباً ایک ہی جیسی ہے اور مختلف واقعات بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ ایک آیت کے نزول کے دو سبب بھی ہو سکتے ہیں اور ایک بار آیت نازل ہوئی ہو تو اس جیسے دوسرے واقعہ پر وہ آیت تلاوت کی جا سکتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول یہ تھا۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اگر آج کوئی ایسا واقعہ پیش آئے تو بھی اس پر آیت کی تلاوت کی جا سکتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام یا یہ بات اس آیت کے خلاف ہے۔

"ثَمَنًا قَلِيلًا" سے مراد متاع دنیا ہے وہ کثیر ہو یا قلیل کیونکہ جنت کی نعمتوں کے بالمقابل پوری دنیا کی دولت بھی ہیچ ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ادائے امانت کے عہد اور جھوٹی قسموں کے عوض مال حاصل کرتے ہیں وہ ثمن قلیل ہی ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ آیت کا شان نزول کوئی بھی ہو اور کسی واقعہ کے متعلق بھی

لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

یہی لوگ ہیں کہ آخرت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں[۱۵۹] ہوگا نہ تو قیامت کے دن اللہ ان سے کلام کرے گا' نہ محبت بھری نظر سے ان کو دیکھے گا' نہ وہ گناہوں کی آلودگی سے

ہو پہلی بار نازل ہوئی ہو اس جیسے ہر واقعہ پر اس کا اطلاق جائز اور درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتب تفاسیر میں اس کے کئی ایک شان نزول درج ہوئے ہیں اور مقام و حکم کے لحاظ سے سب صحیح ہیں جن میں سے یہاں دو کا ذکر اوپر کر دیا گیا۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر فریقین میں اختلاف ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ایک ان میں سے مدعی ہوگا اور دوسرا مدعا علیہ۔ مدعی کو گواہ پیش کرنا ہوں گے اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ پر قسم ہوگی اور مدعا علیہ قسم کھالے تو مدعی کو تسلیم کرنا ہوگا اور حقیقت حال اللہ کے سپرد کرنا ہوگی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ فریقین میں سے ایک مسلم اور دوسرا غیر مسلم ہو تو بھی فیصلہ قسم پر ہی ہوگا اور قسم اللہ کی کھائی جائے گی غیر اللہ کی قسم نہیں کھائی جا سکتی۔

خیانت کرنے والوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا

۱۵۹ "جو لوگ دنیا داری کی جگہ خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں تو یہی لوگ ہیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا" ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارا اللہ نے اس کے لئے دوزخ لازم کر دی اور جنت حرام کر دی ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اگرچہ تھوڑی سی چیز ہو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ درخت پیلو کی ایک ٹہنی ہو ایک روایت میں ہے کہ یہ آخری لفظ رسول اللہ ﷺ نے تین بار دہرایا (مسلم) تاکید کے لئے آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ ایک لفظ کو بار بار یا کم از کم تین بار دہراتے تھے۔

احادیث و آثار سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انسانی اعمال نامہ کے تین حصے ہوں گے۔ ایک حصہ وہ جس کی پرواہ سختی کے ساتھ نہیں ہوگی۔ دوسرا حصہ وہ جس میں سے کوئی چیز نہیں چھوڑی جائے گی اور بعد میں وہ معاف ہو یا نہ ہو اور تیسرا حصہ وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ جو معاف نہیں فرمائے جائیں گے وہ تو شرک ہے اور جس حصہ کا کوئی خاص پروا نہیں فرمائے گا وہ انسان کا خود اپنی جان پر ظلم ہے یعنی وہ حقوق جو براہ راست خدا کے انسان پر ہیں اگر ان کو ادا نہ کیا گیا جیسے روزہ یا نماز کا ترک ہو گیا۔ اور جس میں کوئی چیز بھی نہیں چھوڑی جائے گی وہ حقوق العباد ہیں یعنی انسانوں کی باہم حق تلفیاں ہیں جن کا لامحالہ بدلہ دینا ہوگا ہاں! جس کی حق تلفی ہوگی اگر وہ معاف کر دے یہ دوسری بات ہے۔

وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۷﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ

پاک کئے جائیں گے۔ پس ان کے لئے دردناک قسم کا عذاب[۱۶۰] ہوگا۔ ۷۷

اور اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اس میں الٹ پھیر

دردناک عذاب میں کون کون لوگ ہو سکتے ہیں اور آج مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟

[۱۶۰] ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کی طرف نظر شفقت سے دیکھے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا اور ان ہی کے لئے عذاب دردناک ہے۔ آپ ﷺ نے یہ آیت تین بار تلاوت فرمائی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ ناکام و نامراد ہوں گے مگر وہ ہیں کون لوگ؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک تو وہ جو غرور و تکبر کی وجہ سے تہبند نیچی لٹکانے والے ہیں یعنی ٹخنوں سے نیچے اور دوسرے وہ جو احسان جتلانے والے ہیں کہ جب کسی کو کوئی چیز احساناً دے دی پھر بار بار جتلاتے رہے اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے مال کو فروخت کرنے والے (مسلم' ابوداؤد' نسائی' ترمذی)

مقام غور ہے کہ آج خود مسلمان ان تینوں چیزوں کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ آگے گزرنے سے پہلے اپنا جائزہ لے لیں کہ کیا آپ میں بھی ان تینوں چیزوں میں سے کوئی موجود تو نہیں؟ یاد رہے کہ اس کا علاج بھی یہی ہے کہ ہر آدمی خواہ وہ کوئی ہو خود اپنا جائزہ لے بجائے اس کے کہ ہم سب ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہیں اس سے مسئلہ کا حل نہیں نکل سکتا۔ مذکورہ تینوں باتیں ایسی ہیں کہ کسی دوسرے سے پوچھنے اور سوال کرنے کی نہیں بلکہ ہر انسان بغیر کچھ پوچھے اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ میرا تہبند' شلوار یا پاجامہ و پینٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ احسان جتانا بھی بالکل عام ہے اور ہر آدمی کو اس سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور یاد رہے کہ دکھاوا بھی دراصل احسان جتلانے کی ایک صورت ہے بلکہ احسان جتلانے کی ساری صورتوں سے زیادہ اور نہایت بری صورت۔ لیکن آج ہمیں محسوس بھی نہیں ہو رہی بلکہ جو دکھاوا نہ کرے وہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا اور نہ کرنے والے کو برا سمجھا جاتا ہے کیا اپنی عزیز بیٹی کو رخصت کرتے وقت دکھلوا نہیں کیا جاتا؟ عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں کوئی چیز لے جاتے وقت دکھلاوا نہیں ہوتا معمولی باتوں میں بھی اور بڑے بڑے کاموں میں بھی آخر کیوں؟ اس لئے کہ سب کو معلوم ہو کہ فلاں نے یہ کیا اور یہ کیا' اگر یہ معلوم نہ ہو تو بے عزتی ہے انا للہ وانا الیہ راجعون پھر آج دیا تو کل واپسی کا مطالبہ جو واپس نہ کر سکے یا اس قدر واپس نہ کرے اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟ سب کو معلوم ہے۔ بھائیو اور بہنو یہ سب بری رسومات ہیں جن کا تعلق اسلام سے نہ ہے۔ اپنا اپنا جائزہ لے کر ہی ان کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ خرید و فروخت میں مال بیچنے کی جو صورت

اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ

کرنے کا عادی ہے تاکہ تم خیال کرو کہ جو کچھ یہ سنا رہے ہیں کتاب اللہ میں سے ہے حالانکہ وہ قطعاً کتاب اللہ میں سے نہیں ہوتا اور وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ جو کچھ تمہیں بتایا گیا ہے یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کے

آج کل رائج ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ قسموں پر قسمیں خدا کی اور غیر خدا کی اور یہ بات تو آج کل اتنی عام ہے کہ اس سے کوئی بھی شاید مستثنیٰ نہ کیا جا سکے کہ مجھے اس چیز کے اتنے دام ملتے ہیں یا یہ چیز میں نے اتنے کی خود خریدی ہے حالانکہ نہ اتنے دام ملے ہوتے ہیں اور نہ ہی اتنے کی خرید ی ہوتی ہے۔

یاد رکھو کہ کسی چیز کے صرف پڑھ لینے یا سن لینے میں نجات نہیں جب تک اس کے مطابق عمل نہ ہو بلکہ پڑھ لینا اور سن لینا اور پھر اس کے مطابق عمل نہ کرنا نتیجہ عمل کو لازم و ضروری کر دیتا ہے۔ ان تینوں چیزوں کو عمل میں نہ لانے کا نتیجہ کیا ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے۔ اس لئے یہ معمولی باتیں نہیں ہیں بلکہ نہایت اہم ضروری باتیں اور ہر انسان کا اپنا فرض ہے کہ وہ خود اپنا عمل نگاہ میں رکھے کہ میں کیا کر رہا ہوں یا مجھ سے کیا سرزد ہو رہا ہے۔

یہ جو فرمایا کہ "تین ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ کلام نہیں فرمائے گا" تین ہیں سے مراد ہے کہ تین قسم کے لوگ ہیں اور پھر یہ "تین ہیں" بہت سی احادیث میں مختلف کلاموں سے بھی نظر آتے ہیں مثلاً کسی حدیث میں "تین ہیں" کے بعد ہوگا کہ ایک ان میں سے وہ جو ضرورت سے زائد پانی رکھتا ہے اور بیابان کے اندر پانی کی ضرورت رکھنے والے کو وہ پانی نہ دے اور دوسرا وہ جو امام کی بیعت کرے لیکن صرف دنیا کے لئے کہ اگر امام نے کچھ دے دیا تو وفادار ورنہ غدار وغیرہ وغیرہ تو یہ کوئی اختلاف نہیں بلکہ کسی موقع پر کوئی تین باتیں ارشاد فرمائیں اور کسی موقع پر کوئی سی تین باتیں اور یہ انداز گفتگو ہوتا ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے اس کے پیچھے پڑ کر کسی بات کو جھٹلانا یا شک کرنا جہالت اور نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مثلاً کسی حدیث میں آیا کہ تین بچوں نے بات کی ہے اور پھر ان کی وضاحت کرتے وقت کبھی کوئی تین بیان فرمائے اور کبھی کوئی بیان فرما دیئے در اصل وہ حسب ضرورت بیان ہوتا ہے جو ضرورت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ پھر تین بچوں سے مراد بھی تین ہی بچے نہیں بلکہ تین قسم کے بچے ہوتے ہیں اس طرح بولنے سے مراد بھی بزبان قال نہیں بلکہ بزبان حال مراد ہوتا ہے۔ جس کو بیان کرتے وقت اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ

نام پر جھوٹ بولتے ہیں اور یہ جانتے بھی ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ۷۸

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب' حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ یقیناً

جس طرح زمین بولتی ہے آسمان بولتا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز بولتی ہے جاندار بولتے ہیں اور بے جان اور ٹھوس چیزیں بولتی ہیں حتیٰ کی درخت اور دیواریں بھی بولتی ہیں لیکن ان سب کے بولنے کا مطلب ہر کوئی سمجھتا ہے کہ ان کا بولنا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ ایسی باتیں ٹھوکر کا باعث نہ ہوں بلکہ جس سے جو مراد ہے وہی مراد لینا عقل مندی ہے لفظی بحث اور تکرار بے کار ہوتا ہے۔ اس طرح کچھ احادیث میں سات سات آدمیوں کا ذکر ہے اور کچھ احادیث میں دس دس آدمیوں کا جس سے مراد بھی اتنی اقسام ہی ہوں گی۔

ایک حدیث میں تین آدمیوں کی تفصیل اس طرح ارشاد فرمائی گئی ہے جو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک بوڑھا زانی' دوسرا شیخی خوار مفلس اور تیسرا وہ جس کا سرمایہ ہی قسم ہے کہ بیچے گا تو قسمیں اور خریدے گا تو قسمیں۔" مطلب یہ ہے کہ بیچے گا تو قسمیں کھا کھا کر کہے گا کہ مجھے اتنے دام ملتے ہیں اور خریدے گا تو کہے کہ یہ چیز مجھے اتنے کی ملتی تھی اور اس بات پر قسموں پر قسمیں کھاتا رہے گا۔

اہل کتاب کی یہ گمراہی کہ وہ کتاب اللہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے رہتے ہیں

۱۶۱ "اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو کتاب اللہ کو پڑھتے ہوئے الٹ پھیر کر جاتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ گروہ علماء و مشائخ ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ وہی ایسا کام کر سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اہل کتاب کے علماء و مشائخ کی گمراہیوں نے پوری کی پوری قوم کو روح ہدایت سے محروم کر رکھا ہے ان عالموں اور فقیہوں کا ایک گروہ ہے جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتا اور اس کی شرح و تفسیر بیان کرتا ہے لیکن ہوائے نفس سے اس کے معانی میں تحریف کر دیتا ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کا بیان ہے حالانکہ وہ اللہ کی کتاب کا بیان نہیں ہے بلکہ ان کی رایوں کی افتراء پردازیاں اور ان کی اپنی گھڑی اور بنائی ہوئی وہ کہانیاں ہیں۔ اگر غور کرو گے تو آج یہ بیماری علماء و مشائخ اسلام میں بھی عام ہے اور ہو بہو وہ بھی انہی کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ اس کی تفصیل سورہ بقرہ آیت ۷۵' حاشیہ نمبر ۱۰۱' ۱۰۲ میں ملاحظہ فرمالیں۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا

کہے گا تو یہی کہے گا کہ تم ربانی انسان بن جاؤ اس لئے تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے بھی کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔ ۱۶۲ ۷۹

ایک ربانی انسان کبھی تمہیں اس بات کا حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں یا نبیوں کو تم

عصمت انبیاء علیہم السلام کی ایک دلیل اور علمائے اسلام کو تنبیہہ

۱۶۲ ابن اسحٰق، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور دلائل بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ابورافع قرظی نے جو مدینہ ہی کا ایک فرد تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "محمد کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری ایسی ہیں پوجا کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی پناہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو پوجنے کی تلقین کروں؟ اللہ نے اس لئے مجھے نہیں بھیجا نہ اس کا مجھے حکم دیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی اور اس طرح سے اور بھی اس کے شان نزول تفاسیر میں مذکور ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب و حکمت اور قوت فیصلہ عطا کرتا ہے اور خصوصاً پیغمبری کے منصب جلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغام الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اس کی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسرے کا بندہ بنانے لگے۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا فی الواقعہ وہ اس کا اہل ہی نہ تھا۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں اچھی طرح سوچ لیتی ہے۔

۱۔ یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں۔

۲۔ حکومت کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے۔ کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب سلطنت یا سفیر مقرر نہیں کرتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ بھی ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبہ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو لیکن خداوند قدوس کے ہاں یہ

الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۸۰

اپنا رب بنا لو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کفر کرنے کا حکم دے؟ خصوصاً جب کہ تم مسلم ہو چکے ہو۔[۱۶۳] ؟ ۸۰

بھی احتمال ممکن نہیں اگر کسی انسان کی نسبت اس کو یہ علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر بھی تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے العیاذ باللہ۔ یہیں سے عصمت انبیاء کرام کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے پھر جب انبیائے کرام عصیان سے پاک اور معصوم ہیں تو شرک اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے؟

اس آیت سے نصاریٰ کے اس دعویٰ کا بھی رد ہو گیا جو کہتے تھے کہ ابنیت و الوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا تھا اور ان مسلمانوں کو بھی اس سے نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کی بجائے آپ ﷺ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے؟ جبکہ بادشاہوں کے دربار میں ایسا کیا جاتا ہے اور اہل کتاب سے بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس لئے کہ اہل کتاب کے علماء و مشائخ نے بندگان الٰہی کو اپنا غلام اور بندہ سمجھ رکھا تھا اور ہدایت دینے کی جگہ خدائی کرنے لگے تھے عوام سمجھتے تھے کہ نیک و بد، حلال و حرام اور جنت و دوزخ کا تمام اختیار انہی کے قبضہ و اختیار میں ہے حالانکہ کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی جگہ انسان کے گھڑے ہوئے احکام کی اطاعت کرے اگر اللہ نے اپنے کسی بندہ کو کتاب و نبوت عطا فرمائی ہے تو اس لئے عطا فرمائی ہے کہ احکام الٰہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے اس لئے نہیں کہ اپنی بندگی کرائے اور آج علماء و مشائخ اسلام کو بھی اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے کہ وہی کچھ نہ کریں جو ان سے قبل یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کر چکے ہیں۔

کسی فرشتہ یا نبی کو بھی رب بنا لینا کفر ہے اور کوئی اللہ کا بندہ کفر کی تعلیم نہیں دے سکتا

۱۶۳ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک اللہ کا سچا بندہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم توحید الٰہی چھوڑ کر میرے پرستار بن جاؤ اس لئے کہ عبادت خداوندی کا حق صرف توحید میں ہے اور اگر غیر اللہ کو عبادت میں شریک کیا تو عبادت اللہ نہیں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو عطاء کتاب اور نبوت ہو اور بندہ کی طرف سے غیر اللہ کی عبادت کا حکم ہو ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ کوئی نبی غیر اللہ کی پوجا کا حکم نہیں دے سکتا اس لئے کہ نبوت اور غیر اللہ کی عبادت کا حکم "متضاد چیزیں ہیں پہلی دعوت توحید ہے اور دوسری دعوت شرک۔ بلکہ وہ تو جب کہے گا یہی کہے گا کہ رب والے ہو جاؤ۔" "ربانیین" کون ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ

اور اس واقعہ کا بھی ذکر کرو جب ہم نے نبیوں کے بارے میں عہد[۱۶۴] لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کوئی دوسرا رسول اس کتاب کی

فرمایا فقہاء و علماء۔ قتادہؒ نے کہا حکماء و علماء۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت میں فقہاء و معلمین۔ عطاءؒ نے کہا باوقار دانش مند علماء جو اللہ کی طرف سے مخلوق کے خیر خواہ ہوں۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا جو حلال و حرام اور امر و نہی کو جانتے ہوں اور امت کے احوال سے صحیح طور پر آگاہ ہوں اور بعض نے یہ بھی کہا کہ حبر سے ربانی کا درجہ بڑا ہے اس لئے کہ حبر صرف عالم کو کہتے ہیں اور ربانی وہ ہے جو عالم باعمل بھی ہو اور صاحب بصیرت بھی۔

ماحصل سب کا یہ ہوا کہ ربانی وہ ہوگا جو علم، عمل، اخلاص اور درجات قرب میں خود بھی کامل ہو اور لوگوں کو بھی اپنی تعلیم سے کامل بنا دینے والا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "ربانیین" وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال سے علم کی تکمیل کرتے ہیں اور علاوہ ازیں بھی اقوال پائے جاتے ہیں اور آج کل بعض خاندان ایسے ہیں جو اپنے آپ کو خاندانی طور پر ربانی کہلاتے ہیں جو اس خاندان کی طرف منسوب ہوگا وہ ربانی ہوگا۔ ربانیوں کی بستیاں اور محلے آباد ہونا شروع ہوگئے ہیں اور اس طرح ہر گدھا ہانکنے والا ربانی ہو گیا ہے۔

فرمایا ایک اللہ کا بندہ کسی کو فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لینے کی دعوت کیوں دے گا؟ اس لئے کہ یہ دعوت تو کھلا کفر ہے کیا کوئی اللہ کا بندہ بھی کفر کی دعوت دیتا ہے یا دے سکتا ہے؟ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دینے کا ذکر بھی موجود ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں پھر فرمایا گیا ہے کہ ان سے پوچھو کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے ان کو پیدا کر کے اپنی بیٹیاں قرار دیا تھا۔ خدا سے ڈرو اور اللہ پر بہتان نہ باندھو اور یہود و نصاریٰ کا ذکر بھی فرمایا کہ انہوں نے عزیر و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے اور عیسائیوں کی ایک جماعت نے عیسیٰ علیہ السلام کو "اللہ" بنا لیا اور یہ جو کچھ ہوا سب کا سب ان لوگوں کے اختراعی عقیدے تھے اور سب کے سب کفر کے عقائد تھے ان کی تعلیم کوئی اللہ کا بندہ نہیں دے سکتا تھا اور نہ کسی نے دی بلکہ یہ شیطان کی فریب کاری تھی جو اس نے اپنے چیلوں اور ملنگوں کو سکھائی اور انہوں نے عام لوگوں میں پھیلا دی۔ فرمایا تمہارے اسلام لانے کے بعد ایسی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو دی ہی نہ جا سکتی تھی اور نہ کبھی دی گئی۔

اس میثاق سے کیا مراد ہے اور یہ کہاں ہوا؟

[۱۶۴] میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو خود قرآن کریم کی اس آیت کے اندر موجود ہے کہ "ہم نے

تمہیں کتاب اور حکمت دی پھر اگر ایسا ہو کہ کوئی دوسرا رسول اس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا تمہارے پاس آئے تو ضروری ہے کہ تم اسے مانو اور اس کی تائید کرو" یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک نبوت ختم نہ کر دی گئی اور یہ عہد کہاں ہوا؟ عالم ارواح میں ہوا یا دنیا میں بذریعہ وحی الٰہی ہوا دونوں احتمال ہیں اور جو بھی مراد لیا جائے بالکل صحیح اور درست ہے۔

میثاق کیا ہے؟ کا مطلب بھی دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے یہ پختہ وعدہ لیا تھا کہ اپنے بعد آنے والے نبی کی تصدیق کرنا اور اپنی امت کو بھی حکم دینا کہ وہ آنے والے نبی کی پیروی کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو تشریح کی ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام اور آدمؑ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا کہ تم اور تمہاری امت محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنا اور اگر تمہاری زندگی میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو جائے تو تم سب ان کی مدد کرنا۔ گویا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول پر رسول سے مراد عام پیغمبر ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تشریح پر صرف رسول اللہ ﷺ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک مراد ہے۔

ہمارے خیال میں پہلا مطلب زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے اور متواتر قرات کے موافق ہے اگرچہ دوسرے مطلب کا بھی احتمال ہے اور زیادہ تر دوسرا مطلب ہی مراد لیا گیا ہے پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا تھا کہ تم خود عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرو اور اپنی امت کو بھی حکم دو کہ وہ بھی ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں اور اس طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے بھی عہد لیا تھا کہ تم خود محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرو اور اپنی امت کو بھی حکم دو کہ وہ ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا خود قرآن کریم میں دوسری جگہ اس طرح موجود ہے کہ:

يَا بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصف ۶۱ : ۶) "اے بنی اسرائیل! میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا تمہاری طرف آیا ہوں میں کوئی نئی شریعت نہیں لایا بلکہ میرا کام صرف یہی ہے کہ کتاب تورات کی جو مجھ سے پہلے آچکی ہے تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا"

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "میں تورات کا مصدق ہوں" اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق تورات میں موجود ہیں لہٰذا میری مخالفت کی بجائے تمہیں چاہئے کہ میرا خیر مقدم کرو اور اس کے بعد والے فقرے کو ملا کر پھر پڑھو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں اللہ کے رسول احمد ﷺ کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ تورات میں جو بشارت ہمارے نبی کریم ﷺ کے متعلق مذکور ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے دی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی تصدیق کا اعلان کیا ہے چنانچہ استثناء میں وہ آج بھی موجود

ہے۔ جو اس طرح مذکور ہے کہ:

"میں ان کے لئے انہیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں حکم دوں گا وہ وہی ان سے کہے گا۔" (استثناء ۱۸: ۱۸)

سارے عالم انسانیت کی طرف مبعوث ہونے والے رسول بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں

دو مواقع کے لئے جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک امت میں ایک رسول مبعوث فرمایا ہے یا بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی بھیجے گئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جس قدر رسول محمد ﷺ سے پہلے آئے تھے وہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے کل دنیا اور پوری عالم انسانیت کی طرف مبعوث ہونے والا نبی ایک اور صرف ایک ہی مخصوص رکھا گیا تھا جو سب سے آخر اور سب سے اعظم اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لئے آیا۔ چونکہ اسی رسول نے ساری قوموں کو جمع کرنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں کو بذریعہ ان کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس دین پر چلنا ہوگا کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفریقوں کو مٹایا جائے اور سب کو ملا کر بھائی بھائی بنا دیا جائے گو مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیازات ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے کیونکہ ہر قوم ہدایت کے لئے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی سے کوئی سروکار نہ تھا اگرچہ ان سب کی تعلیم بھی ایک ہی جیسی تھی اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اس وقت نہ تھے سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں اس لئے ان حالات کا اقتضاء بھی یہی تھا کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قوموں کی حد بندی سے قائم ہوئی ہمیشہ رہنے والی نہ تھی اس لئے یہ ضروری ہوا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو ان قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو یہی وجہ ہے کہ ایک رسول پوری دنیا میں ایسا ہوا جس نے علی الاعلان بار بار کہا کہ میں کل عالمین کی طرف آیا ہوں اور جس کے متعلق ارشاد ہوا کہ ہم نے آپ کو "كَآفَّةً لِّلنَّاسِ" بھیجا ہے جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان سب کو بھائی بھائی بنانے والا تھا چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۴۹ : ۱۳) "اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد و عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں اور امتیاز شرف اس کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔"

چونکہ اس رسول محمد رسول اللہ ﷺ نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا اس لئے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا ہوگی اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ

تصدیق کرتا ہوا تمہارے پاس آئے جو کتاب تم کو دی گئی ہے تو ضروری ہے کہ تم اسے مانو اور اس کی تائید[۱۶۵] کرو' ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو؟ اور اس کا ذمہ لیتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا کہ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں[۱۶۶]۔ اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ

اس کے نبی کے لیا گیا اور یہی مضمون ہے جس کو اس آیت زیر نظر میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اعظم و آخر کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل ہے

۱۶۵ اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بیان ہوئی ہے وہ "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" یعنی اس کی تصدیق کرتا ہے جو پہلی قوموں کے پاس ہے یہ وہ امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ ابی و امی میں پایا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا جس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار آیا ہے۔ الم شروع کرتے ہیں ارشاد ہوا یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ ۲ : ۴) وہ ایمان لانے والے ہیں اس چیز پر جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اور اس چیز پر جو آپ ﷺ سے پہلے انبیاء کرام پر بھی نازل ہوا۔ اور پھر بار بار یہ ارشاد بھی فرمایا گیا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" ان آیات میں واضح کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی وہ نبی و رسول ہیں جو کل نبیوں کی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ کے علاوہ دوسرا کوئی نبی نہیں جو پوری عالم انسانیت کے لئے مبعوث ہوا ہو اور جس نے دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہو اور ان سب پر ایمان لانا ضروری و لازمی قرار دیا ہو۔

انبیاء کرام سے لئے گئے عہد کے تاکیدی الفاظ

۱۶۶ انبیاء کرام کو مخاطب کر کے ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ "کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو؟ اور اس کا ذمہ لیتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں" وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ۔ "اصر" کے اصلی معنی بوجھ اور مضبوط باندھ دینے کے ہیں اور کسی عہد کے توڑنے کے گناہ کو بھی کہا جاتا ہے جو عہد توڑنے والے کو ثواب سے پیچھے رکھتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اصر" کے معنی اس جگہ مطلق بوجھ یا ثقل کے ہوں جو اس کے اصل معنی ہیں۔ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ کا مطلب ہی یہ ہو کہ یہ بوجھ جو میں تم پر ڈال رہا ہوں کہ رسول موعود کی نصرت کرنا ہوگی اس بوجھ کو تم قبول کرتے ہو کیونکہ دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ (الاعراف ۷ : ۱۵۷) وہ ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر پڑے

فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ

ہاں! گواہ رہو اور یاد رکھو تمہارے ساتھ میں خود بھی اس پر گواہ ہوں۔ ۱۶۷ ۸۱

تو اب جو شخص اس عہد و قرار کے بعد اس سے روگرداں ہو تو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔ ۱۶۸ ۸۲

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں؟

ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد کی پیش گوئیاں توراۃ و انجیل کے مندرجہ ذیل مقامات پر آج بھی بالکل صاف صاف الفاظ میں موجود ہیں (استثناء ۱۸: ۱۵ تا ۱۹ متی ۲۱: ۳۳ تا ۴۶' یوحنا ۱: ۱۹ تا ۲۱' یوحنا ۱۴: ۱۵ تا ۱۷ اور ۲۵ تا ۲۶ اعمال ۳: ۲۳)

شہادت الٰہی نے انبیاء کرام کے عہد کو مزید مؤکّد کر دیا

۱۶۷ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق لئے گئے عہد انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ویسے ہی اقرار صالح اور حلف مؤکد کے برابر تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی گواہی نے اس مؤکد عہد کو مزید مؤکد تر کر دیا جب ارشاد الٰہی ہوا کہ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کی اتباع کی دعوت بنی اسرائیل کو بار بار دی گئی اور ان کو یاد دلایا گیا کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے لئے جو شرائط موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عائد کی گئی تھیں وہی آج تک قائم ہیں اور دراصل یہ انہیں شرائط کا تقاضا ہے تم نبی اعظم و آخر پر ایمان لاؤ۔ زیر نظر آیت کا یہ آخری حصہ بھی اس بات کا تقاضا کر رہا ہے جس پر الٰہی گواہی قائم ہے کہ اگر اب بھی نہ مانو گے تو یقیناً ہلاک ہو گے۔

جو شخص بھی اس سے اعراض کرے گا وہ نافرمانی کا مرتکب ہو گا

۱۶۸ اس آیت نے اس بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ مذکورہ عہد انبیاء کرام سے اور پھر ان کی وساطت سے ان کی امتوں کے لوگوں سے بھی لیا گیا تھا کہ "تم ضرور اس رسول موعود یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنا" اور یہ کہ اگر تم کو اس کا زمانہ مل جائے تو خود اس کی مدد کرنا اور اگر وہ تمہارے زمانہ میں نہ آئے تو اپنے متبعین کو نصیحت کر دینا کہ جو بھی اس کے زمانہ میں موجود ہو اس کی مدد کرے۔" اب زیر نظر آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ "اب اس اقرار کے بعد جس شخص نے بھی پیغمبروں کی اتباع سے اپنا رخ پھیرا یہ

أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

حالانکہ آسمان و زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے خوشی سے یا ناخوشی سے سب اس کے حکم کے فرمانبردار ہیں اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۱۶۹ ۸۳

رخ پھیرنے والا خواہ کوئی ہو پس وہی ایمان سے خارج ہو جائے گا۔" فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ چونکہ پیشواؤں کے ذکر کے بعد متبعین کے ذکر کی ضرورت نہ تھی اس لئے پیشواؤں ہی کے ذکر پر اکتفا کیا۔

دین الٰہی یعنی اسلام میانہ روی سکھاتا ہے

۱۶۹ کیا وہ اللہ کے دین سے بغاوت چاہتے ہیں؟ بغا کے معنی میانہ روی سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنے کے ہیں۔ جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ دین الٰہی یعنی اسلام میانہ روی سکھاتا ہے اور جو اس کو چھوڑ کر کچھ اور چاہتا ہے وہ میانہ روی سے تجاوز کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح اسلم۔ اسلام کے اصلی معنی فرمانبرداری کرنے کے ہیں اور یہی وسیع معنی یہاں مراد لئے گئے ہیں جیسا کہ تمام مخلوق ارض و سماء کی طرف اَسْلَمَ منسوب کرنے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ "طوعًا وَّ كَرْهًا" دونوں مصدر ہیں جو حال کی جگہ استعمال ہوئے ہیں یعنی مراد ان سے طائعین و کارھین ہیں اور "طوع" کے معنی ہیں فرمانبرداری اختیار کرنا یعنی رضا و رغبت سے اور "کرہ" اس کی ضد ہے۔

اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی طرف بھی اس سے اشارہ ہے کیونکہ اسلام ہی وہ دین ہے جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا موعود دین ہے اس لئے وہ ساری نسل انسانی کا مذہب ہے اور یہی اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اپنی حقیقت میں کل عالم کا مذہب ہے پھر یہ کہ زمین میں صرف انسانوں ہی کا نہیں بلکہ جو آسمان و زمین میں ہے سب اس کے فرمانبردار ہیں اور یہ بھی کہ مذہب کے رنگ میں قوانین اسلام یعنی شریعت اسلامی کی فرمانبرداری کا نام اسلام ہے اور عام رنگ میں قوانین الٰہی کی فرمانبرداری بھی اسلام ہی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام جمیع مخلوقات کا مذہب ہے کیونکہ اس وسیع عالم میں جو چیز قوانین الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرے گی اس کا وجود ہی نہیں رہ سکتا اور بالفاظ دیگر ہر شے کا وجود ہی قوانین کی فرمانبرداری پر ہے۔ پس حقیقی معنی میں اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لے کر بڑے سے بڑے کرہ ارضی یا سماوی تک سب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں اور کوئی چیز اس کی فرمانبرداری سے باہر نہیں۔

طَوْعًا وَّ كَرْهًا سے یہ بھی مفہوم واضح ہوتا ہے کہ خواہ کچھ ہو کوئی چیز قانون الٰہی کی فرمانبرداری سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ فرمانبرداری تو طَوْعًا ہی ہوتی ہے یعنی اپنی رضا و رغبت سے لیکن اگر ان چیزوں کو اختیار ہوتا کہ وہ فرمانبرداری کریں یا نہ کریں اور اپنی رضاء و رغبت سے وہ فرمانبرداری نہ کرتیں تو "كَرْهًا" بھی ان کو

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ

اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور اللہ کے دوسرے نبیوں کو اللہ کی طرف سے ملا ہے اس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے اور

فرمانبرداری اختیار کرنا ہی پڑتی یا طَوْعًا وَّكَرْهًا میں دو قسم کی فرمانبرداری کا ذکر ہے ایک تو وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش فرمانبرداری کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی جیسے فرشتے یعنی ملائکہ یا خود زمین و آسمان اور ان کی طاقتیں جیسا کہ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (حم السجدہ ۴۱ : ۱۱) سے ظاہر ہے۔ طبعی امور میں انسان بھی اس طرح فرمانبرداری اختیار کرتا ہے مگر وہ امور جن کا تعلق اختیار اور ارادہ سے ہے ان میں "کرہ" بمعنی مشقت کے ساتھ فرمانبرداری ہے یعنی اس کام کو انسان طبعاً نہیں کرتا بلکہ مشقت اس کے لئے درکار ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "كَرِهَ" بمعنی ناخوشی سے اس طرح فرمانبرداری ہے کہ کافر جب خوشی سے ان قوانین کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو ناخوشی سے بھی اس کو کرنا پڑتی ہے کیونکہ ایسے قوانین میں فرمانبرداری دو طرح پر ہے جو شخص ان قوانین پر چلتا ہے وہ سکھ پاتا ہے جو نہیں چلتا وہ دکھ اٹھاتا ہے پس جس نے قانون کی فرمانبرداری طَوْعًا نہ کی اس کو كَرْهًا یعنی دکھ اور سزا کے رنگ میں کرنی پڑی۔ اس لحاظ سے مفسرین اسلام نے "طوعاً" فرمانبرداری مومن کے لئے اور "کرھاً" کافر کے لئے قرار دی ہے۔

اس کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت ہے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے سب قوانین الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے پھر اگر تمہیں اللہ کے قانون فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کونسا قانون ہو سکتا ہے؟ کیا تمہیں اس راہ پر چلنے سے انکار ہے جس پر تمام کارخانہ ہستی چل رہا ہے؟

لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ

ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ ۸۴

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا تو اس کا وہ دین کبھی

اب اعلان کرایا جا رہا ہے کہ سب نبیوں کی نبوت کا اقرار ایمان کی شرط ہے

۱۷۰ "اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو" الخ یہ خطاب یا تو رسول اللہ ﷺ کو ہے اور آپ ﷺ کی عظمت کے پیش نظر شاہانہ طریقہ کلام کا حکم دیا اور یا یہ حکم دیا کہ اپنے ساتھ اپنے متبعین کو بھی شامل قرار دے کر اظہار ایمان کرو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب تو ہر مومن کو ہے اور حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے ساتھ دوسرے مومن بھائیوں کو شامل سمجھ کر اظہار ایمان کرو۔

"ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو کچھ ہم پر نازل ہوا" یعنی قرآن کریم پر جو ہم پر اتارا گیا ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بھی قرآن کریم میں ہے اور اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو آپ ﷺ نے قرآن کریم کی تشریح و تفسیر میں امت کو سمجھایا اور بتایا ہے۔ یعنی جو کچھ ہمارے رسول ﷺ پر نازل ہوا وہ ہم پر بھی نازل ہوا ہے اس لئے جو کچھ اترا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک ہی جیسا ہے اور سب اس کے پابند اور اس کے تابع ہیں۔ رسول بھی اور ایمان والے بھی ہاں! جو باتیں اور ہدایتیں رسول کے لئے مخصوص ہیں ان کی پہلے اس میں وضاحت کر دی گئی ہے اور جو کچھ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر نازل ہوا ہے۔ ان دونوں رسولوں کا خاص کر ذکر کیا گیا اس لئے کہ ان کے متبعین ہی اس وقت زیادہ تر موجود تھے اور انہی کو یہ اعتراض تھا کہ مسلمان ان نبیوں کی تعلیم کو نہیں مانتے حالانکہ حقیقت یہ تھی ان کے ماننے والوں نے ان کی تعلیم ہی کو بگاڑ دیا تھا اس لئے سب کچھ اپنے پاس سے گھڑ کر ان کے ذمہ لگا دیا گیا تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار کیا گیا اور ان دونوں گروہوں کو دعوت دی گئی کہ جو باتیں آج تم ان کے نام منسوب کرتے ہو انہوں نے ان کی کہاں تعلیم دی ہے ذرا اس جگہ کی نشاندہی کرو لیکن وہ اس کی نشاندہی نہ کر سکے اس لئے کہ دراصل وہ ان دونوں کی تعلیم ہی نہ تھی۔ اور یہ بھی کہ انبیاء کرام کی تعلیم ایک ہی جیسی ہوتی ہے اس لئے کہ ان کا مخرج ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کی تعلیم خود محمد رسول اللہ ﷺ دے رہے ہیں۔

فرمایا کہ جن انبیاء کرام کے ناموں کا اس جگہ ذکر کیا گیا ہے ان کی تعلیم پر بھی ہمارا ایمان ہے اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ان سب کی تعلیم پر ہم ایمان رکھتے ہیں اس لئے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کی تعلیم میں کوئی تضاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب کی تصدیق کرتے ہیں اور کسی ایک کی

مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ كَيْفَ يَهْدِي

قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔ ۱۷۱ ۸۵

یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ ایک ایسے گروہ پر کامیابی کی راہ کھول دے جس

بھی تکذیب نہیں کرتے۔ ہاں! محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے آنے والوں کی تعلیم پر ہمارا ایمان ہے اور اس کے ساتھ ہی ہم اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور اگر کوئی دعویٰ نبوت کرے گا تو وہ جھوٹا اور کذاب ہی ہوگا اس لئے اس کی یقیناً تکذیب کریں گے اور ببانگ دہل کریں گے اور اس کو کذاب کہیں گے اور سمجھیں گے اور تحریر کریں گے۔

دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین قبول کرنے والوں کا حال

۱۷۱ اگر کوئی تاجر راس المال ہی کو ضائع کر دے تو وہ کیا تجارت کرے گا۔ دین اسلام کو چھوڑنے والوں کا بھی ایسا ہی حال ہے کہ گویا انہوں نے راس المال ہی کو ضائع کر دیا۔ دین اسلام ہی تو وہ دین ہے جو سب انبیاء کرام کا موعود دین ہے اور یہی دین ہے جو سارے رسولوں کی تصدیق کا ضامن ہے اور بلحاظ اپنے معنی کے سارے ذرات عالم کا مذہب بھی ہے تو جو شخص ایسے کامل اور مکمل دین کو چھوڑ کر کسی ناقص دین کو قبول کرے گا وہ واقعی خسارہ میں ہے اور خسارہ بھی وہ جو راس المال میں ہو اس لئے اس نے اپنے راس المال کو تباہ کر دیا اور یاد رہے کہ دین اسلام میں راس المال انسان کی فطرت ہے اور حدیث رسول ﷺ گواہ ہے کہ "کل مولود یولد علی الفطرۃ" ہر ایک انسانی بچہ اس فطری دین پر پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص اسلام یا کامل فرمانبرداری کی راہوں کو ترک کر کے ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے اس نے دراصل اپنی فطرۃ ہی کو بگاڑ دیا۔ زیر نظر آیت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کامل راہیں نجات کی صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں گو قرآن کریم دوسرے مذاہب کی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے اور اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ سب مذاہب کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس امر حق کا بھی اظہار فرماتا ہے کہ سب مذاہب میں غلطیوں کے راہ پا جانے سے اب انسان ان کے ذریعہ سے گناہ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھورد "جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔" ہاں! ہر ایک نیکی کے کام پر خدا اور اس کے رسول کا امر موجود ہے پس نیکی کا کام کوئی بھی کرے وہ مردود نہیں اور اس لئے یہ ضروری ہے ہر نیکی کا کام رسول اللہ ﷺ نے خود کیا اور کرنے کا حکم دیا اور ہر نیکی کے عمل پر آپ ﷺ کی مہر ثبت ہے اور اس لئے یہ بھی ضروری ہے

کہ سب لوگ دین واحد پر جمع ہو کر گناہ کی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں اور دنیا میں ایک عظیم الشان اخوت نسل انسانی کے قائم کرنے کا موجب بھی ہوں۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھو کہ یہی دین نوع انسانی کے لئے ہدایت کی عالمگیر راہ ہے لیکن لوگوں نے اسے چھوڑ کر اپنی الگ الگ گروہ بندیاں بنا لیں ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلانے لگا ہے۔ قرآن کریم اس لئے آیا ہے کہ اس گمراہی سے دنیا کو نجات دلائے وہ کہتا ہے کہ سچائی کی راہ یہ ہے کہ تمام راہنمایان عالم کی یکساں طور پر تصدیق کرو اور سب کی متفقہ اور مشترکہ تعلیم کو دستور العمل بناؤ یہی راہ ہدایت اور دین اسلام کا ماحاصل ہے لیکن افسوس کہ آج اس دین اسلام کو دین تسلیم کرنے والے خود گروہ بندیوں کی سب سے بڑی لعنت میں مبتلا ہو کر متفرق ہوگئے۔ اس کا جتنا ماتم کیا جائے اتنا ہی کم ہے کہ ادرک باد مٹانے کے لئے تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جب ادرک خود ہی باد ہوگیا تو وہ باد کو کیا مٹائے گا۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھو (عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ ۲ : ۱۷۳۔ سورہ بقرہ ۲ : ۲۵۸)

دین اسلام کی راہ سے انحراف کرنے والوں کا حال قرآن کریم نے مختلف طریقوں اور حالتوں سے بیان فرمایا ہے ایک دو جگہوں کو زیر نظر کر لو اور غور کرتے رہو کہ غور و فکر ہی سے حق کی راہ واضح ہو جاتی ہے لکیر کا فقیر راہ راست پر کم ہی گامزن ہو سکتا ہے جیسے لکیر پیٹنے والے کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور جس شخص پر ہدایت کی راہ کھل جائے اور اس پر بھی وہ اللہ کے رسول سے مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے تو ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے جس طرف کو اس نے جانا پسند کر لیا ہے اور اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے اور یاد رکھو کہ جس کے پہنچنے کی جگہ دوزخ ہوئی تو یہ کیا ہی بری جگہ پہنچنے کی ہے۔ (النساء ۴ : ۱۱۵) ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہوا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! جب منافق آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بیشک آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹ بولتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے اس طرح یہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں بیشک یہ برے کام ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر کرنے لگے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اب یہ لوگ حق بات کو نہیں سمجھ پاتے۔" (المنافقون ۶۳ : ۱ تا ۳)

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لئے بخشش کی دعا کرے تو یہ لوگ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور آپ ﷺ ان کو دیکھیں گے کہ متکبرانہ انداز میں بے رخی برتتے ہیں۔ اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ ان کے لئے بخشش کی دعا کرو یا نہ کرو ان کے حق میں یکساں ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کو معاف نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کبھی حق سے تجاوز کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (المنافقون ۶۳ : ۵، ۶)

اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کرلی۔ حالانکہ اس نے گواہی دی تھی کہ اللہ کا رسول برحق ہے اور روشن دلیلیں اس کے سامنے واضح ہوگئی تھیں؟ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ وہ ظلم کرنے والے گروہ پر کبھی سعادت[۱۷۲] کی راہ نہیں کھولتا۔ ۸۶

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اے پیغمبر اسلام! تم ان کے لئے دعا مغفرت کرو یا نہ کرو اب ان کی بخشش ہونے والی نہیں۔ تم اگر ستر مرتبہ بھی ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو جب بھی اللہ انہیں کبھی نہیں بخشے گا۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ دائرہ ہدایت سے نکل جانے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھولتا۔" (التوبہ ۹: ۸۰)

ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کے لئے کامیابی کی راہ نہیں کھولی جاتی

۱۷۲ جنت کی راہ ان لوگوں کے لئے کیسے کھولی جا سکتی ہے جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہوگئے اور مشرکین مکہ سے جا ملے اور ان میں سے اکثر مفسرین نے ابوعامر راہب کا نام بھی لیا ہے مگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس میں اہل کتاب ہی کا ذکر ہے اور اس رکوع کا سیاق و سباق بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ اس رکوع میں اصل مخاطب تو اہل کتاب ہی ہیں۔ اسلام لانے کے بعد کفر کرنے کے ایک معنی تو یہ ہیں یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد پھر اپنے دین میں لوٹ گئے لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے انبیاء کرام پر ایمان لائے اور اس کے بعد جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو ان کا انکار کر دیا یہ بھی ہر لحاظ سے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ ایک اس لحاظ سے کہ پہلے وہ انبیاء کرام کو مانتے تھے اور ظاہر ہے نبی کی نبوت کو تسلیم کرنے والا اللہ تعالیٰ کو مانتا ہی ہے لیکن جس نبی کی نبوت کو بھی وہ مانتے تھے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یا ان کے بعد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ان پر سچا ایمان لانے کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو بھی تسلیم کر لیتے اور اس طرح وہ اپنی ہی کتابوں اور اپنے ہی انبیاء کی تصدیق کرتے کیونکہ ان کی کتابوں اور ان کے انبیاء کرام نے محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کی پیش گوئیاں بیان کی تھیں۔ بیشک انہوں نے سابق انبیاء کو نبی مانا لیکن آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر کے پھر وہ کافر ہی ہوگئے کہ انہوں نے جن

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ

ان لوگوں کو جو بدلہ ملنے والا ہے وہ تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور انسانوں سب کی لعنت برس رہی ہے۔ ۸۷ ۱۷۳

وہ اس حالت میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے نہ تو ان کا عذاب کبھی کم ہوگا نہ وہ کبھی

کتابوں اور نبیوں کو مانا تھا ان کا بھی انکار ہوگیا اس لحاظ سے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرنے کے زمرہ میں وہ خود بخود داخل ہوگئے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام اختیار کرنے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیا ایسے گروہ پر کامیابی کی راہ کیسے کھولی جا سکتی ہے؟ گویا یہ استفہام انکاری ہے کہ ایسے لوگوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھل سکتی اس لئے کہ انہوں نے خود ہدایت کی راہ چھوڑ کر کفر کی روش اختیار کر لی۔ حالانکہ اس گروہ نے گواہی دی تھی سابق کتابوں اور سابق نبیوں سے تعلیم پا کر اللہ کا رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ برحق ہے۔ اور اس کے برحق ہونے کی وہ روشن دلیلیں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے جو پہلے انبیاء کرام کی پیشگوئیوں میں موجود تھیں پھر یہ سب کچھ دیکھ سن لینے کے بعد انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا حالانکہ اب ان کے پاس انکار کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔

جب انہوں نے جان بوجھ کر کفر کی روش کو پسند کر لیا تو پھر اللہ کے قانون تو پہلے ہی موجود تھا کہ کفر کی روش اختیار کرنے والوں کو وہ کبھی راہ ہدایت نہیں عطا کرتا۔ جس ظلم کے مرتکب ہوئے تھے جان بوجھ کر اور سمجھ سوچ کر ہوئے تھے اس لئے ان کی ہدایت کی اب کوئی راہ کھلی نہ رہ گئی اس لئے کہ انہوں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا جو کفر کا راستہ تھا اور اس طرح دیکھ سمجھ کر انہوں نے اس راستہ سے منہ پھیرا جو سیدھا جنت کو جا رہا تھا ایسے ظالموں کے لئے قانون الٰہی میں بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی اور قانون الٰہی یہی ہے کہ جو اپنی حالت کے بدلنے کی خود نہ سوچے اس کی حالت کو اللہ کبھی نہیں بدلتا۔ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جاگتے کو کون جگائے۔ جو جان بوجھ کر سویا ہوا بن چکا ہو۔

لعنت الٰہی برسنے کا صحیح مفہوم اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا مطلب

۱۷۳ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کے عمل کا نتیجہ یا رد عمل کیا ہوگا؟ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی لعنت اس کے فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت کے مستحق ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ

وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۞ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ

مہلت پائیں گے[۱۷۴]۔ ۸۸

ہاں! جن لوگوں نے اس حالت کے بعد بھی توبہ کرلی اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو

کی لعنت کا مطلب جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق قرار پائے اور پھر اللہ تعالیٰ کا غضب یہی کہ اس کی رحمت سے دوری ہو جائے یعنی رحمت الٰہی سے محروم ہوگئے اور اللہ کی لعنت کا مطلب یہی قرار پایا کہ وہ اس کی رحمت سے دور کر دیئے گئے اور فرشتوں کی لعنت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور رہنے کی وہ بددعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ایسے انسانوں کو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کی روش اختیار کرلی تھی اپنی رحمت سے دور رکھ اور سب انسانوں کی لعنت کا مفہوم یہ ہوا کہ کوئی شخص بھی ان کو پسند نہ کرے گویا کہ وہ ایسے برے ہیں کہ برے بھی ان کو برا کہتے ہیں۔ جیسے یہودیوں کے لئے ان کی لعنتوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ

"لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی دونوں لعنتی ٹھہریں گے تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکریوں کے بچے لعنتی ہوں گے۔ تو اندر آتے لعنتی ٹھہرے گا اور باہر جاتے بھی لعنتی ٹھہرے گا۔ خداوند ان سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور اضطراب اور پھٹکار کو تجھ پر نازل کرے گا جب تک کہ تو ہلاک ہو کر جلد نیست و نابود نہ ہو جائے۔"

(استثناء ۲۸: ۱۵ تا ۲۰)

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زیر نظر آیت میں دونوں جگہ لعنت کو دوزخ قرار دیا جائے کیونکہ رحمت الٰہی سے محرومی کا نتیجہ یقیناً دوزخ ہوگا اور اس جگہ الفاظ بھی اس کی تاکید کرتے ہیں کیونکہ فرمایا گیا ہے خَالِدِينَ فِيهَا یعنی وہ اس لعنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یعنی دوزخ کے عذاب کے ہمیشہ کے لئے مستحق ہو جائیں گے۔

ان کا عذاب ان سے کبھی ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان کو مہلت ملے گی

[۱۷۴] جس طرح وہ اسلام سے نکلے اور کفر میں داخل ہوئے اور پھر کفر ہی پر ان کو موت آگئی یعنی ان کا خاتمہ کفر ہی پر ہوا اسی طرح ان کے لئے عذاب بھی اب ہمیشہ ہمیشہ ہی کے لئے رہے گا اور وہ کبھی ہلکا نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ اس سے نکل سکیں گے کیونکہ ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی یعنی نہ ایسا ہوگا کہ کچھ دیر کے لئے عذاب سے چھوٹ گئے اور پھر گرفتار ہوگئے بلکہ یہاں

وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ

بلاشبہ اللہ رحمت والا اور بخش دینے والا ہے۔ ۸۹

البتہ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی اور اپنے کفر میں بڑھتے ہی گئے تو ایسے لوگوں کی توبہ کبھی قبول ہونے والی نہیں یعنی ان کو سچی توبہ نصیب ہی نہیں ہوگی اور یہی لوگ ہیں جو سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ ۹۰

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہے تو ان میں

سے چھوٹنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کیونکہ دنیا کی زندگی کے بعد موت یقینی تھی لیکن اس زندگی میں موت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا گویا یہ غیر متغیر عذاب ہے جس میں تبدیلی کا کوئی امکان ہی نہیں۔

ہاں! توبہ کرنے والوں کیلئے رحمت الٰہی پھر تیار نظر آتی ہے

۱۷۵ ٹھوکر کھائی اور گر گئے جو نقصان ہونا تھا وہ ہوگیا۔ صبح کا روٹھا شام کو بھی گھر آجائے تو خیر ہے۔ جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اپنے آپ کو سنوار لیا یعنی اصلاح نفس کرلی' دوبارہ ایمان میں داخل ہوگئے اور کفر کی راہ کو ترک کر دیا اور جو بگاڑ کیا تھا اس کو درست کر لیا تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے یقیناً ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان سے جو جو حق تلفیاں ہوئی ہیں ان کو معاف کر دے گا بلاشبہ اس کی ذات کے سوا کوئی بخشش کرنے والا نہیں جتنی چھوٹ وہ دے سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی ایسے ہی لوگوں کے متعلق جو بھول کر پھر سنبھل جاتے ہیں دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

"بلاشبہ منافقوں کے لئے یہی ہوتا ہے کہ دوزخ کے سب سے نچلے درجہ میں ڈالے جائیں اور اس دن کسی کو بھی تم ان کا رفیق و مددگار نہ پاؤ گے پھر بھی کیا تم چاہتے ہو کہ ان کی سی روش تم بھی اختیار کرو؟ ہاں! ان میں سے جن لوگوں نے توبہ کرلی' اپنی عملی حالت سنوار لی اللہ کے حکم پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور اپنے دین میں صرف اس کے لئے ہوگئے تو بلاشبہ ایسے لوگ منافقوں میں سے نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ مومنوں کی صف میں ہوں گے اور قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کا اجر عطا فرمائے ایسا اجر جو بہت ہی بڑا

اجر ہوگا۔ لوگو! اگر تم شکر کرو اور اللہ پر ایمان لاؤ تو اللہ تعالیٰ نے تم کو عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ یعنی وہ تم کو عذاب کیوں دے گا؟ اللہ تعالیٰ تو انسانی اعمال کا قدر شناس اور ان کی ہر طرح کی حالت کا علم رکھنے والا ہے۔" (النساء ۴: ۱۴۶، ۱۴۷)

وہ لوگ کون ہیں جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور وہ توبہ کیسی توبہ ہے؟

۱۷۶ گزشتہ آیت ۸۹ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "جن لوگوں نے کفر کے بعد توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو بلاشبہ اللہ رحمت کرنے والا بخش دینے والا ہے۔" اور اس آیت ۹۰ میں ہے کہ "ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی" ہاں ہاں! ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی؟ کیسے لوگوں کی؟ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور برابر کفر میں بڑھتے ہی گئے اور منہ سے توبہ توبہ بھی کرتے رہے تو آخر ان کی توبہ توبہ کرنے کو کیوں کر قبول کر لیا جائے گا جبکہ ان کا عمل بتا رہا ہے کہ انہوں نے توبہ نہیں کی۔ پہلے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنے آپ کو سنوار لیا یعنی سچے دل سے کفر سے توبہ کر کے ایمان و اسلام قبول کر لیا اور ایسی توبہ کی کہ دوبارہ اس کفر اور اس گناہ کے مرتکب نہ ہوئے اور دوسرے لوگ وہ ہوئے جو منہ سے توبہ توبہ کرتے رہے لیکن عملاً پہلے سے بھی بدتر ہوتے گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو سنوارنے کی بجائے مزید بگاڑا اس لئے ارشاد الٰہی ہوا کہ "جن لوگوں کا حال ایسا ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا یعنی کفر کی راہ اختیار کی اور اپنے کفر میں بڑھتے ہی گئے "ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا" "لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ تو ایسے لوگوں کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوگی اس لئے کہ ان کو سچی توبہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور وہ اپنے توبہ کرنے میں سچے نہیں بلکہ جھوٹے ہیں اور سیدھی راہ سے ایسے بھٹکے ہیں کہ بھٹکتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول یہودیوں کے حق میں ہوا جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس طرح انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ سے عملاً انکار کر دیا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی پیش گوئیاں بھی توراۃ میں موجود تھیں جن کو انہوں نے توراۃ ماننے کے دعویٰ کے باوجود جھٹلایا اور اس طرح عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کر کے کفر پر ایک اور کفر کے مرتکب ہوئے۔ بعد ازیں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان کو اور ان کی لائی ہوئی آخری ہدایت کو ماننے سے انکار کر کے مزید کفر میں ترقی کی گویا وہ ایمان لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور برابر کفر میں بڑھتے ہی گئے اور ایمان لانے کے دعویٰ کو بھی ساتھ دہراتے رہے تو ان کے اس دعویٰ کو کیونکر قبول کر لیا جائے جبکہ ان کا دعویٰ ایمان سو فی صدی غلط ہے۔

بلاشبہ شان نزول یہود ہی کے حق میں ہوگا لیکن بظاہر یہ حالت جس شخص کی بھی ہو آیت کا مفہوم اس پر چسپاں ہوگا اس لئے کہ حکم عام ہے صرف یہودیوں سے خاص نہیں۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اور

انجیل کو مانا لیکن جب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے باوجود اس کے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع دو ٹوک الفاظ میں دی تھی اور آج بھی وہ انجیل میں موجود ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا لیکن انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو نہیں مانا اس طرح وہ عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو بھی جھٹلانے والے ہوئے اور محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم سے پھر اعراض کرنے کا کفر اختیار کیا تو آخر وہ اس آیت کے مفہوم میں کیوں نہیں آئیں گے بالکل آئیں گے اس لئے کہ جو ان کا دعویٰ ہے وہ اس دعویٰ میں بالکل جھوٹے ہیں اور اس کفر میں وہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

"اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سے مراد وہ منافق بھی ہو سکتے ہیں اس لئے اعلانیہ کافروں سے منافقوں کا کفر زیادہ خطرناک ہے اور ان کا دعویٰ بھی کفر کی بجائے ایمان کا ہے نہ وہ منافقت سے باز آئیں اور نہ ہی دعویٰ ایمان سے تو وہ دعویٰ ایمان میں آخر کیوں کر سچے ہوئے؟ اور ان کے دعویٰ ایمان کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ روز بروز اپنے کفر میں ترقی ہی کرتے جائیں گے منہ سے سو بار وہ ایمان کا دعویٰ کریں اور کفر سے توبہ کا اظہار کریں ان کی یہ توبہ کبھی مقبول نہیں ہوگی اور قرآن کریم نے ان گنت مقامات پر اس کی وضاحت فرما دی ہے اور ان کی اس توبہ کا انکار کیا ہے اور ان کے دعویٰ ایمان کو قبولیت نہیں بخشی اگرچہ وہ مسلمان قوم میں شمار بھی ہوتے رہے اور کاغذی پوزیشن میں وہ مسلمان گنے جاتے رہے لیکن باوجود اس کے کہ وہ نماز' روزہ کی مشقت بھی برداشت کرتے رہے اور کفر میں بھی ترقی پذیر ہی رہے اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود شرک کرتے ہیں اور دن بدن اس کفر میں بڑھتے ہی جاتے ہیں اور مرتے دم تک اس کفر پر قائم رہتے ہیں۔ مجاہد نے اس آیت سے ایسے ہی کافر مراد لئے ہیں جو شرک کے کفر میں مبتلا ہیں اور ایمان کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر مزید وضاحت فرما دی ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

"جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے' پھر ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے اور پھر برابر کفر میں ہی بڑھتے رہے تو فی الحقیقت ان کا ایمان لانا ایمان لانا نہ تھا۔ اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ انہیں کوئی راہ دکھائے۔" (النساء ۴: ۱۳۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم میں بے باک ہوگئے اور مرتے دم تک اسی حالت میں رہے تو اللہ تعالیٰ انہیں کبھی بخشنے والا نہیں نہ انہیں کامیابی کی کوئی راہ دکھائے گا۔ بجز جہنم کی راہ کے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کے لئے ایسا کرنا بالکل مہمل ہے کوئی نہیں جو اس کے قانون میں رکاوٹ ڈال سکے۔" (النساء ۴: ۱۶۸' ۱۶۹)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

"کتنے ہی چہرے اس روز یعنی قیامت کے روز کالے پڑ جائیں گے اور جن لوگوں کے چہرے کالے پڑ

كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى

سے اگر کوئی شخص پورا کرۂ ارض سونے سے بھر کر دے دے جب بھی اس کے فدیہ

جائیں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی تو جیسی کچھ تمہاری منکرانہ چال تھی اب اس کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھ لو۔" (ال عمران ۳: ۱۰۶) ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"دراصل جو لوگ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد پھر اس ہدایت سے پھر گئے ان کے لئے شیطان نے یہ بات آراستہ کر دکھائی ہے اور جھوٹی امیدوں کا سلسلہ ان کے لئے دراز کر رکھا ہے۔" (محمد ۴۷: ۲۵)

مزید تفصیل کے لئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۲۱۷۔

کفر پر قائم رہنے والے جب دار العمل سے نکل گئے تو اب ان کے ایمان کی کوئی صورت باقی نہ رہی

۱۷۷ "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہے" ان کی حالت کا بیان ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء۔ دار العمل یعنی دنیا میں جو کچھ انسان کرے گا آخرت میں اس کا بدلہ پائے گا۔ دار الآخرۃ' دار العمل نہیں اس لئے اس میں پہنچ کر کوئی ہزار حیلے کرے کہ اب اس کے لئے کوئی عمل کی صورت نکل آئے اور اب وہ اچھے اعمال کرے تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ اس احکم الحاکمین کا فیصلہ ہے جو نہ اپنے فیصلہ کو بدلتا ہے اور نہ ہی بدلنے دیتا ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ فرض کرو کہ ایسے لوگوں کے لئے زمین و آسمان کے خلا کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اس وقت فدیہ میں دے کر عذاب سے نجات چاہیں تو ان کو نجات نہیں ملے گی اس لئے کہ وہ مقام جزاء ہے مقام عمل نہیں اور یہ سونا اس وقت پیش کرنا اس کا ایک عمل ہوا اور اب اس کے عمل کا وقت نہیں بلکہ عمل کا وقت دنیا تھی اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

ذرا غور کرو بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی بچہ پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ بڑھتا جاتا ہے ایک وقت آتا ہے کہ اس کے مکتب میں داخل ہونے کا وقت آجاتا ہے لیکن اسے مکتب میں داخل نہیں کیا گیا وہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کو کچھ پچھتاوا نہیں ہوتا تاکہ اب ہی اس کا کچھ مداوا ہو جائے۔ اب جوان ہو جاتا ہے شادی ہوتی ہے محنت مزدوری کر کے وہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتا ہے پھر آہستہ آہستہ بوڑھا ہو جاتا ہے کہ اب مزدوری کے قابل بھی نہیں رہتا اور اب اس کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ کاش وہ بچہ بن جائے اور اب مکتب میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرے' جوان ہو کر اور تعلیم سے فارغ ہو کر فلاں مقام پر جچ لگ جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا اس کی سوچ صحیح ہے؟ اس کے لئے جو کچھ بھی وہ خرچ کر سکتا ہے کر دے کامیاب ہو جائے گا؟ ہرگز ہرگز نہیں معلوم ہو گیا کہ گیا ہوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا یہی بات اس آیت زیر نظر میں سمجھائی جا رہی ہے کہ اے انسان جب وقت نکل جائے تو وہ دوبارہ لوٹ کر واپس نہیں آتا۔ لیکن افسوس کہ آج جس قوم کو یہ درس

دیا گیا تھا اس نے اس اصول سے مکمل طور پر انحراف کر دیا اور اس نے وقت کی کوئی قدر نہ کی اور راہنمایاں قوم نے قوم کو ایسے راستہ پر ڈال دیا کہ انہوں نے اس تیزی سے گزرنے والے وقت کے متعلق کبھی سوچا تک بھی نہیں بلکہ انہوں نے ایسے طریقے اختیار کئے کہ قوم کی سوچ کبھی اس طرف منتقل ہی نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ قوم کو ایسی گہری نیند سلا دیا گیا کہ وہ کبھی جاگ ہی نہ سکے اگر کسی کی آنکھ کھل گئی تو اس کو ایسی تھپکیاں دیں کہ وہ پھر سو گیا اگر کسی کی آنکھ پھر بھی کھلی دیکھی تو اس کو ایسی گولی کھلا دی کہ اس کی ہوش گم ہو گئی۔

راہنمایانِ قوم نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ انگریز سرکار اور امریکہ بہادر نے ان کے [illegible] کر دیئے اور ان کے کان میں یہ پھونک دیا کہ تمہاری قوم سوئی رہی تو مزے میں رہو گے اگر یہ جاگ گئی تو تمہاری خیر نہیں اس لئے کہ اس قوم کے جاگنے کا وقت ان کو اب تک یاد ہے۔ اللہ کرے کہ کوئی ایسا جرنیل اٹھے جو ان راہنمایانِ قوم پر ہاتھ صاف کرے اور قوم کو جگا کر اس تیزی سے گزرنے والے وقت کا احساس دلا دے۔

مختصر یہ کہ انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ اے انسان! جب تک تو دارالعمل میں ہے تیری کوتاہیوں کا مداوا ممکن ہے اور جب تو دارالعمل سے نکل کر دارالجزاء میں داخل ہو گیا اس وقت تیری کوتاہیوں کا کوئی مداوا ممکن نہیں۔ اس لئے جو کرنا ہے کر لے آخر موت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمیں مذہبی رہنماؤں نے باور کرا دیا کہ کوتاہیاں کرتے رہو اور کرتے کرتے ہی مر جاؤ مداوا ہم کرا لیں گے تم مر کر دیکھو ہم تمہاری قبر پر ڈیرہ ڈال دیں گے اور عذاب کے فرشتوں کو ایسی نتھ ڈالیں گے کہ وہ تمہارے قریب نہیں جانے پائیں گے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ گیا ہوا کبھی واپس نہیں آسکتا اس لئے نہ وہ آئے گا نہ کچھ بتائے گا' لہٰذا انہوں نے اپنی دکانداری ایسی چلائی کہ اس دارالعمل میں رہنے والوں کو اپنے اپنے دارالجزاء میں جانے والوں کیلئے کچھ کرنے کی سوچ دے دی کہ ان کے لئے کچھ کر لو تاکہ تمہارے دارالجزاء میں جانے کے بعد دارالعمل میں آنے والے تمہارے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ اب یہ مذہبی راہنما اتنی ترقی کر گئے اور ان کا کاروبار اتنا چل گیا جس کے بند ہونے کا ان کو کوئی فکر نہیں اس لئے کہ نہ ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری اور لاکھوں کماتے ہیں جانے والے جائیں جہنم میں ان کی بلا سے لیکن آخر یہ خود کب تک رہیں گے۔

جس طرح پچھلی اقوام میں یہ دکانداریاں ہوتی آئی ہیں اور اب بھی دنیا کی ساری قوموں میں ہو رہی ہیں اسی طرح قوم مسلم میں بھی چل رہی ہیں اور چلتی رہیں گی تم کو خود سوچنا ہے معاملہ کا حل اسی میں ہے اللہ توفیق دے تو خود سوچو قرآن کریم کو پڑھو اور سمجھو اور اس کے مطابق عمل کی کوشش کرو۔ دیکھو قرآن کریم پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہے اور اب مرنے کے بعد ان کی طرف سے کوئی کرۂ ارض بھی سونے سے بھر کر دے کہ اس کا فدیہ دے کر اس کو چھڑا لیا جائے جب بھی اس کا فدیہ قبول نہیں ہو گا۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور کوئی شخص بھی ان کا مددگار نہیں ہو سکتا جو ان کو اس عذاب سے نجات دلوا دے۔"

بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۹۱

میں قبول نہ ہوگا یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے عذاب دردناک ہے اور کوئی شخص بھی ان کا مددگار نہیں ہوگا۔ ۹۱

یہ تیسرے، چوتھے، ساتویں، دسویں، چالیسویں اور برسیاں تو ہمارے مذہبی راہنماؤں کی دکانداری کا راس المال ہیں دارالجزاء میں جانے والوں کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا اور یقیناً نہیں ہوگا۔

بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن خفیف ترین عذاب والے دوزخی سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تیرے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں تو کیا آج عذاب سے چھوٹنے کے لئے تو وہ سب چیزیں دے دے گا وہ دوزخی کہے گا جی ہاں! دے دوں گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا جب تو آدم کی پشت میں تھا تو اس وقت میں نے تجھ سے اس سے بہت زیادہ آسان چیز کی خواہش کی تھی کہ پیدا ہونے کے بعد میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا مگر تو بغیر شرک کرنے کے نہ رہا" اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا۔

جن کیلئے دردناک عذاب ہے ان کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا

۱۷۸ جو لوگ کفر کی راہ پر گامزن ہوئے اور اس پر گامزن رہے کہ موت نے کام تمام کر دیا یقیناً ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور اس عذاب سے نکالنے کے لئے کوئی بھی اب ان کی مدد نہیں کر سکتا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے اس مضمون کی اس طرح وضاحت فرما دی:

"بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکا پھر وہ کفر ہی کی حالت میں مر گئے تو اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔" (محمد ۴۷: ۳۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"لیکن ان لوگوں کی توبہ کوئی توبہ نہیں جو ساری عمر تو برائیاں کرتے رہے لیکن ان میں سے جب کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں اس طرح ان لوگوں کی توبہ بھی کوئی توبہ نہیں جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے" جو انہیں پاداش عمل میں پیش آئے گا۔ (النساء ۴: ۱۸) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

کفر کی موت مرنے والے کیلئے "کوئی نہیں کہ اس کی شفاعت کر کے اسے بچا لے اور جس قدر بھی بدلے ہو سکتے ہیں اگر وہ سب دے دے تو بھی اس سے وصول نہیں کئے جائیں گے کیونکہ بدعملی کے نتیجہ سے کوئی بھی فدیہ نہیں بچا سکتا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیئے گئے ان کے لئے کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب جو انکار حق کی پاداش میں بھگتنا ہوگا۔" (الانعام ۶: ۷۰)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

یاد رکھو تم نیکی کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ مال و دولت میں سے جو کچھ تم محبوب رکھتے ہو اسے راہ حق میں خرچ کرو اور

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ:

"اگر ہر ظالم انسان کے قبضہ میں وہ سب کچھ آجائے جو روئے زمین میں ہے تو وہ ضرور اسے اپنے فدیہ میں دے دے" جو کسی حال میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ (یونس ۱۰: ۵۴)

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

"جن لوگوں نے حکم الٰہی قبول نہیں کیا ان کے تمام اعمال رائیگاں جائیں گے وہ نامرادی اور بدحالی سے کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے اگر کرہ ارض کی تمام دولت ان کے اختیار میں آجائے اور پھر اسے دوگنا بھی کر دیا جائے تو یہ لوگ اپنے بدلہ میں ضرور اسے بطور فدیہ کے دے دیں لیکن وہ نہیں بچ سکیں گے یہی لوگ ہیں جن کے لئے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جہنم کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔" (الرعد ۱۳: ۱۸)

ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے کہ:

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اگر ان کے قبضہ میں وہ تمام مال و متاع آجائے جو روئے زمین میں موجود ہے اور اتنا ہی اور بھی وہ پالیں پھر یہ سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لئے فدیہ میں دے دیں جب بھی اسے قبول نہیں کیا جائے گا ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔" (المائدہ ۵: ۳۶)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

"اگر ان ظالموں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی اور بھی ہو تو یہ لوگ قیامت کے روز بڑے عذاب سے بچنے کے لئے سب کچھ فدیہ میں دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا وہ وہم و گمان بھی نہ رکھتے تھے۔" (الزمر ۳۹: ۴۷)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

"لہٰذا آج کے دن نہ تو کوئی فدیہ تم سے قبول کیا جائے گا اور نہ ہی ان لوگوں سے جو کھلے کافر تھے اور تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے وہی تمہارے لوٹنے کا مقام ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔" (الحدید ۵۷: ۱۵)

مزید تفصیل کے لئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۲۳۔

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے وقت کس بات کا خیال رکھنا ضروریات دین میں سے ہے؟

۱۷۹ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرتے وقت یہ خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مال حلال و طیب ہو اور اچھی قسم کا ہو ادنیٰ قسم کا مال چھانٹ چھانٹ کر نہ دیا جائے۔ "بر" کے معنوں میں بہت وسعت

ہے اس کے مطلب و مفہوم میں انعام' جنت' بھلائی' احسان کی وسعت' سچائی اور طاعت سب آتے ہیں۔ اگر "بر" کی نسبت بندہ کی طرف کی جائے تو اس سے مراد طاعت' سچائی اور احسان کی وسعت ہوگی اور اس وقت اس کے مقابل فجور اور عقوق کا لفظ آئے گا لیکن جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد رحمت' جنت اور رضائے الٰہی ہوگی اور اس کے مقابل غضب اور عذاب کا لفظ آئے گا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "سچائی اختیار کرو کیونکہ سچائی "بر" کی طرف لے جاتی ہے اور "بر" جنت کی طرف۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ ہی کی نیت کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو "صدیق" لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری دوزخ کی طرف جب آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی نیت کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کو "کذاب" لکھ دیا جاتا ہے۔" (رواہ مسلم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ صدق کو اختیار کرو صدق "بر" کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ دونوں جنت میں لے جاتے ہیں اور کذب سے پرہیز کرو کذب فجور کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ دونوں دوزخ میں لے جاتے ہیں۔ (رواہ احمد وابن ماجہ والبخاری فی الادب)

پیچھے سے سلسلہ مضمون اس رنگ میں چل رہا تھا کہ اہل کتاب اگر ساری زمین کو بھی سونے سے بھر دیں تو وہ ان کی بدیوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا اس لئے اب مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ "البر" یعنی خیر کثیر یا سب قسم کی خیر کے ابواب میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سونے سے زمین بھرنے والوں کے بالمقابل جنہوں نے اپنی ساری طاقتوں کو اس سفلی زندگی پر لگا دیا ہے اس گروہ کا ذکر بھی ضروری تھا جو ہر قسم کی خیر اور نیکی کو حاصل کرے تو اس کا گر یہ بتایا کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے وہ خرچ کر دو تو جمیع ابواب خیر میں داخل ہو جاؤ گے۔ "البر" کے مختلف معنی لئے گئے ہیں اور سارے کے سارے ہی اپنے اپنے مقام پر صحیح ہیں۔ "البر" کے معنی جنت بھی لئے گئے ہیں مگر ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے کیونکہ جس نے جمیع خصال خیر حاصل کر لئے وہ اس دنیا میں جنت کا مستحق ہوگیا۔ مِمَّا تُحِبُّوْنَ سے مراد صرف مال و زر ہی نہیں بلکہ ضرورت ہو تو اپنے اوقات عزیز کو اللہ کی راہ میں لگانا اپنی عزت اور مرتبہ کو جس سے انسان یقیناً محبت کرتا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کو راہ الٰہی یعنی رضائے الٰہی میں لگا دینا یہ سب کچھ اس کے اندر داخل ہے۔ ہاں مال و جائیداد سب سے زیادہ محسوس ہونے والی چیزیں ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر جب ہوگیا تو سب کچھ اس میں داخل ہوگیا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس آیت کو حکم زکوٰۃ والی آیت سے منسوخ تسلیم کیا ہے حالانکہ اس آیت میں بیان کیا گیا اصول اتنا پختہ اور اتنا ہی مضبوط اصول ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔ نسل انسانی کی ساری ترقیات کا مدار ہی محبوب اشیاء کے خرچ کرنے پر ہے۔ صحابہ

مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٩٢﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ اللہ کے علم سے چھپا نہیں۔ ۱۸۰ھ ۹۲

کھانے کی تمام چیزیں بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں۔ ہاں! وہ چیزیں جو

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس اصول کو خوب سمجھا تھا اور اپنی جانیں مال اور جائیدادیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دی تھیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بڑائی اور بزرگی کے وارث قرار پائے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تمام انصار میں سے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ زیادہ مال دار تھے وہ اپنے تمام مال اور جائیداد میں "بیئر حاء" نامی باغ جو مسجد نبوی ﷺ کے سامنے تھا سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی اکثر اسی باغ میں جایا کرتے تھے اور اس کے کنوئیں کا میٹھا اور عمدہ پانی پیا کرتے تھے جب یہ آیت زیر نظر نازل ہوئی تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر آپ ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور میرا سب سے زیادہ عزیز مال یہی "بیر حاء" ہے لہٰذا میں اس کو اس امید میں کہ جو بھلائی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بھی میرے لئے جمع رہے میں اس باغ کو راہ خدا میں صدقہ کرتا ہوں لہٰذا آپ ﷺ کو اختیار ہے کہ جس طرح مناسب سمجھیں اس کو تقسیم کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا کہ "واہ واہ یہ بہت فائدہ مند مال ہے اس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم اس باغ کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔" حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ بہت اچھا اور پھر اس باغ کو اپنے رشتہ داروں' چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔" (بخاری و مسلم' مسند احمد)

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات کتب احادیث میں ملتے ہیں اور سارے کے سارے صحیح اور سچے ہیں اس لئے کہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جو محبت اللہ تعالیٰ کی کتاب اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تھی وہ کسی دوسری چیز کی ہرگز نہ تھی اس کے سامنے دنیا کے مال کی حقیقت ہی کیا ہے؟

علم الٰہی میں کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں کہ اس کو انسان کی نیت کا بھی علم ہے

۱۸۰ھ ہر عمل کا مدار نیت پر ہے اور اللہ تعالیٰ انسانوں کی نیتوں سے بھی خوب واقف ہے اس پر کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی مخفی نہیں مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لئے جو کچھ بھی لگاؤ گے اس کا اجر تو بہرحال ملے گا' باقی خیر کامل کا جو درجہ اعلیٰ ہے وہ تو اسی وقت حاصل ہوگا جب راہ حق میں اپنے محبوبات و مرغوبات کی قربانی پیش کرو گے۔ مِنْ شَيْءٍ یعنی عام اس سے کہ وہ محبوب ہو یا محبوب نہ ہو۔

مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۷۷' ۲۱۵' ۲۶۷

حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَىٰةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا۟ بِالتَّوْرَىٰةِ فَٱتْلُوهَآ

اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے خود اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں[۱۸۱] وہ ان کے رواج میں حرام ہی سمجھ لی گئی تھیں اللہ نے ان کو حرام نہیں[۱۸۲] کیا تھا۔ اے پیغمبر اسلام!

وہ طعام جو مسلمان کھاتے ہیں وہ سب کے سب بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے

۱۸۱ طعام ہر وہ چیز ہے جو بطور غذا کھائی جاتی ہے نہ کہ بطور دوا۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف قرآن کریم میں یہ دعویٰ شائع و ذائع ہے کہ ہم متبع ملت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس سے یہود نے علت نکالی کہ تم ملت ابراہیمی کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو جب کہ تم اونٹ کا گوشت کھاتے ہو اس لئے اونٹ کا گوشت تو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھا۔ تو یہ آیت گویا ان کی تکذیب کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ اس اعتراض کے جواب میں ہیں کہ کھانے کی چیزوں میں مسلمانوں کا ملت ابراہیمی سے کوئی اختلاف نہیں۔ ان یعنی یہود کو جواب دینے کے بعد پھر اپنا دعویٰ بیان کیا ہے کہ جو چیزیں ابراہیم علیہ السلام کے لئے حلال تھیں وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں مگر ہاں! جو کچھ اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے لئے حرام قرار دے لیا تھا۔ وہ کیا تھا؟ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ اونٹ کا گوشت تھا جو سیدنا یعقوب علیہ السلام نے ایک لمبی بیماری کے باعث اس کو حرام ٹھہرالیا تھا یا بعض روایات کے مطابق اپنے محبوب ترین طعام کو جو اونٹ کا گوشت تھا بطور نذر ترک کر دیا تھا۔ کچھ مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے عبادت کے رنگ میں اس کو ترک کیا تھا اور اجازت الٰہی سے ایسا ہوا تھا۔ بہرحال اہل کتاب کا جو اعتراض تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں اور ملت ابراہیمی میں بھی حرام تھیں اس کا جواب دیا ہے کہ اس پر جو دلیل تمہارے پاس ہے وہ پیش کرو اس لئے کہ دعویٰ بغیر دلیل صحیح نہیں ہوتا۔ آج بھی تورات تمہارے پاس موجود ہے اگر کوئی ایسی بات اس میں ہے تو سامنے لاؤ۔ یہود کے پاس نہ کوئی اس کی دلیل تھی نہ وہ پیش کر سکے۔

آج بھی کچھ لوگ اونٹ کی حلت و حرمت میں بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اونٹ اس اس وجہ سے حرام ہے لیکن ان کی اس بحث کی تار عنکبوت کی طرح کوئی وقعت نہیں۔

کسی چیز کو بیماری یا مرغوب نہ ہونے کے باعث ترک کر دینا فی الواقع حرام نہیں ہوتا

۱۸۲ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام نہیں کیا تھا صرف یعقوب علیہ السلام کے ترک کرنے سے بنی

إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٣﴾ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ

کہہ دو اگر تم لوگ اپنے خیال میں سچے ہو تو تورات لاؤ اور اسے کھول کر پڑھو۔ ۱۸۳ ۹۳

پھر جو شخص اب اس اعلان کے بعد بھی باز نہ آئے اور اللہ پر بہتان باندھے تو

اسرائیل نے اپنے رواج میں ان کا کھانا ترک کر دیا تھا اس سے اس کی حقیقی حرمت ثابت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ایسا تو اکثر ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ کسی بیماری کی وجہ سے کسی شخص کے لئے کسی چیز کی ممانعت ہوگئی یا اس کی طبیعت کی کراہت کی وجہ سے کسی نے کسی چیز کو کھانا ترک کر دیا۔ بحیثیت انسان ہر شخص کو حق ہے کہ جس چیز کو طبیعت مانتی ہے کھائے جس کو نہیں مانتی نہ کھائے لیکن اس کا حلت و حرمت سے کوئی تعلق نہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی جانور کا گوشت پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کھاؤ میری طبیعت اس کو کھانے کی نہیں ہے۔ اس طرح سے آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ کوئی چیز جو حلال و طیب ہو پکا کر جب تمہارے سامنے لائی جائے تو طبیعت چاہے کھاؤ نہ چاہے مت کھاؤ لیکن اس کا غلط نام مت رکھو اور منہ مت چڑھاؤ۔

الہامی کتاب توراۃ ہے اس میں کہاں تحریر ہے کہ اونٹ حرام ہے؟

۱۸۳ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور بعض روایتوں میں اس کا ذکر بھی آتا ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء جو ایک بیماری کا نام ہے کی شکایت تھی اس وجہ سے آپ نے بعض غذائیں ترک کی تھیں جن میں اونٹ کا گوشت اور اونٹ کا دودھ بھی شامل تھا۔ ظاہر ہے کہ طبعی پرہیز کا حرمت شرعی کے ساتھ کچھ تعلق نہیں تھا۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ توراۃ کو لے آؤ اور اس کو پڑھ کر سناؤ کہ کہاں لکھا ہے کہ اونٹ کا گوشت یا دودھ حرام ہے اور اگر توراۃ میں نہیں تو آخر تمہارے پاس کیا دلیل ہے جس سے یہ بات ثابت ہو کہ ابراہیم علیہ السلام پر یہ چیزیں حرام تھیں۔

آج کل جو بعض صوفیہ کا یہ کہنا ہے کہ بعض جانوروں کا گوشت یا بعض غذائیں ترک کرنے سے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے یہ بھی بالکل من گھڑت باتیں ہیں جن کا شریعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر ان کی نادانی اور جہالت ہے۔ ان لوگوں کی مشقتیں اور ریاضتیں سب اختراعی چیزیں ہیں جو غذائیں انسان کی روحانی ترقی میں مانع تھیں وہ سب کی سب حرام کر دی گئیں ہیں۔ کسی غذا کے حلال و طیب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس راہ میں مانع نہیں۔ توراۃ میں تو آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ "وہ سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے لئے ہیں میں نے ان سب کو نباتات کی مانند تمہیں دیا ہے۔" (پیدائش ۹: ۳)

ہاں! یہود ان واضح اور صریح شہادتوں کے بعد بھی اپنے جھوٹ پر قائم ہیں اور یہ کہے جا رہے ہیں کہ

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

ایسے لوگ ہی ہیں جو فی الواقعہ مجرم ہیں۔[۱۸۴] ۹۴

اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہو اللہ نے سچائی ظاہر کر دی پس ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف اللہ ہی کا ہو رہا تھا یقیناً ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔[۱۸۵] ۹۵

فلاں فلاں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی گئی ہیں تو آخر اس کا بھی کوئی علاج ہے؟ ظاہر ہے کہ ضد و ہٹ دھرمی کا نہ کوئی پہلے علاج تھا اور نہ ہی آج ہے۔ نہ ماننے والوں کے لئے کوئی دلیل بھی کارگر نہیں ہوتی اس لئے کہ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"۔

"میں نہ مانوں" کہنے والوں کے لئے کوئی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوتی

۱۸۴ کہاوت ہے کہ کسی نے ماں سے کہا تھا کہ ماں میں شرط لگا کر آیا ہوں کہ کوا سفید ہوتا ہے۔ ماں نے کہا بیٹا! یہ شرط تو آپ ہی کو ادا کرنا ہوگی۔ کیوں؟ ماں نے کہا اس لئے کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ کوا سفید نہیں ہوتا بلکہ سیاہ ہوتا ہے۔ بیٹے نے جواب دیا کہ واہ ماں! میں مانوں گا تو شرط پڑے گی۔ میں مانوں ہی گا کب؟ جو مجھے شرط پڑے گی سو جن لوگوں نے نہ ماننے کی قسم کھائی ہے ان کا کوئی علاج؟

قرآن کریم نے امر حق واضح کر دیا اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے نوشتوں کی بابت گھڑ رکھے تھے ان کی کلی کھول دی اور ظاہر ہے کہ جھوٹ گھڑنے والے ہی ظالم ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کی وضاحت فرما دی اب تو یہ طریقہ اختیار کر لو

۱۸۵ اللہ تعالیٰ نے سچائی ظاہر کر دی اور اس کی وضاحت فرما دی کہ یہود و نصاریٰ جھوٹے ہیں جو اپنے اپنے گروہوں کو دین ابراہیمی پر بتاتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی تھے۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی اس لئے کہ یہودیت اور عیسائیت تو ابراہیم علیہ السلام سے ہزاروں برس بعد میں معرض وجود میں آئی۔ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ آجانے کے بعد کسی کی گواہی ہوگی جو تمہاری باتوں کی تصدیق کر دے گی؟ تم ہی بتاؤ کہ "مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (النساء ۴: ۸۷) وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا" (النساء ۴: ۲۲) اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں کون سچا ہو سکتا ہے؟

پس اے طلبگارانِ دین ابراہیم یاد رکھو کہ ملت ابراہیم ہی دراصل دین اسلام ہے اب اگر ملت ابراہیمی

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ

بلاشبہ پہلا گھر جو انسان کے لئے عبادت کا مرکز بن گیا وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا ہے اور تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔[۱۸۶] ۹۶

اس میں ہدایت کی روشن نشانیاں ہیں جن میں ایک مقام ابراہیم[۱۸۶] بھی ہے۔ جو کوئی

کے دعویدار ہو تو یہی وہ ملت ہے جس کا دوسرا نام دین اسلام ہے اور ابراہیم علیہ السلام چونکہ تمہارے سب کے مسلم بزرگ ہیں ان کے اصول دین سے تمہارا انحراف کرنا کسی صورت بھی جائز اور درست نہیں یاد رہے کہ ملت کا اطلاق دین کی طرح ان امور پر ہوتا ہے جو بندوں کو مرتبہ قرب تک پہنچانے اور دونوں جہان میں کامیاب بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی معرفت بندوں تک بھیجے اور ان کا مکلف کیا ہے دین اور ملت کا فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف انبیاء کرام ہی کی طرف ہوتی ہے اور دوسرے افراد کی طرف نہیں اس لئے ملت خدا بھی نہیں کہہ سکتے اور نہ ملت زید و عمرو کہی جا سکتی ہے ملت کی اضافت ہر حال میں نبی ہی سے ہوتی ہے جیسے ملت محمد ﷺ، ملت موسیٰ علیہ السلام، ملت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے یہ کہ ملت کا اطلاق پوری شریعت کے مجموعہ پر ہوتا ہے جیسے ملت اسلام لیکن ایک ایک رکن کو ملت نہیں کہہ سکتے۔ لفظ ملت املت سے ماخوذ ہے، املت "میں نے لکھوایا" گویا ہر ملت جس نبی کی لکھوائی ہوئی ہوگی اس کی اضافت بھی اسی نبی ہی کی طرف ہوگی۔

"حَنِيفًا" وہ جو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ ہی کا ہو رہا تھا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے تمام باطل مذاہب سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف رخ کر لیا تھا اور یہ بھی کہ وہ افراط و تفریط سے رخ پھیر کر اعتدال کی طرف مائل تھا۔

"اور یقیناً ابراہیم علیہ السلام شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے" یہ گویا یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے کیونکہ یہ دونوں گروہ شرک کرنے کے باوجود دین ابراہیم پر ہونے کے دعویدار تھے۔"

پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا وہ مکہ ہی میں ہے

۱۸۶ یعنی زمانہ کے لحاظ سے عبادت کے لئے بنایا گیا پہلا گھر بیت اللہ ہی ہے اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ سب عبادت خانوں پر فوقیت رکھتا ہے اور آخری مرجع عالم بھی وہی قرار پایا۔ "وُضِعَ" کا استعمال ایجاد اور خلق کے معنی میں ہوا ہے۔ "بَكَّة" اور "مکہ" ایک ہی نام کی دو مختلف صورتیں ہیں اور ایک ہی شہر کو مکہ اور

بکہ کے نام سے بلایا گیا ہے جو مکہ ہے وہی بکہ ہے اور جو بکہ ہے وہی مکہ ہے۔ "مُبَارَکًا" برک سے ہے یعنی برکت والا مبارک وہ ہے جس کی طرف خیر کثیر آتی رہی ہو اور بکہ کو "مُبَارَکًا" اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہے گی۔ یہ خیر کثیر صرف عبادت میں اور اس کے ثواب میں یا قبولیت دعا میں عرف میں اس کو یوں سمجھ لو کہ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ انسانوں کے لئے تمام خیرات دینی کا یہ مرکز رہے گا۔ اس جگہ سے وہ سرچشمہ توحید بھی پھوٹا جو قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔ "بکہ" کیا ہے؟ فرمایا "ھدی" مراد ہے "ذاھدی" یعنی ہدایت والا کیونکہ اس جگہ سے وہ ہدایت نکلی جو تمام دنیا و جہان کے لئے تھی۔ باقی ہدایتیں ایک ایک قوم کے لئے آئیں صرف ایک ہی ہدایت ایسی ہے جو علی الاعلان ساری دنیا کے لئے آئی اور وہ ہدایت اس مقام مبارکہ سے نکلی۔

کیا خانہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے؟ قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں میں تو یہ بالکل واضح ہے کہ بیت اللہ ہی دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ ہے لیکن مخالفین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں چنانچہ سر ولیم میور ایک مخالف اسلام عیسائی یہ تسلیم کرتا ہوا رقم طراز ہے "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لئے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پیشتر لکھتا ہوا عرب کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزت کرتے ہیں۔" بائبل میں بیت ایل کا ذکر آتا ہے جس کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہے اگرچہ بائبل کا بیان اس مقام کی تعیین میں قابل اعتبار نہیں۔ بس دنیا میں آج صرف ایک ہی مقام ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس پر بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بولا گیا ہے اور وہ خانہ کعبہ ہی ہے۔

تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ آیت ۱۲۵۔

بیت اللہ کی فضیلت کا مختصر بیان اور بیت العتیق ہونے کا شرف

"حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مکہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جس جابر نے اصحاب فیل کی طرح کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ کیا اللہ نے اس کی گردن توڑ دی" کہا جاتا ہے کہ مکہ کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ "مَکٌّ" کا معنی ہے پانی کی قلت چونکہ مکہ میں پانی بہت کم تھا اس لئے اس کا نام ہی مکہ ہوگیا۔ اور "مَکٌّ" کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چوسنے کے بھی ہیں اور یہ وجہ بھی بیشک صحیح ہے۔

حضرت علی بن الحسین یعنی امام زین العابدین نے فرمایا کہ اللہ کے عرش کے نیچے ایک مقام ہے جس کو بیت المعمور کے نام سے پکارا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین پر آنے والے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ بیت المعمور کی طرح زمین پر ایک مقام بنائیں فرشتوں نے حسب الحکم کعبہ کی تعمیر کی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے بھی دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے کعبہ کی عمارت بنائی تھی اور آدم علیہ السلام نے بھی اس کا حج کیا تھا اور فرشتوں نے کہا کہ آپ کا حج مبرور ہے اور ہم نے بھی آپ سے دو ہزار سال پہلے اس کا حج کیا تھا۔

اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی نے اس کی تعمیر کی تھی اور ایک عمارت بنائی تھی۔ یہ سب روایات تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور صحیحین میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ زمین پر کونسی مسجد سب سے پہلے قائم کی گئی آپ ﷺ نے فرمایا "مسجد حرام" میں نے عرض کیا پھر کونسی فرمایا "مسجد اقصیٰ" میں نے عرض کی کہ دونوں میں کتنا فصل تھا فرمایا چالیس سال۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کعبہ کی عمارت سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام نے بنائی تھی جو طوفان نوح کے وقت اٹھائی گئی یعنی طوفان نوح سے مٹ گئی پھر اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا پھر مٹ گئی تو قبیلہ جرہم نے بنائی پھر عمالقہ نے بنائی اور پھر قریش نے تعمیر کی۔

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ بعض عبادتیں تو کعبہ کے ساتھ خاص ہیں کسی دوسری جگہ وہ نہیں ہو سکتیں جیسے حج اور حج کی قربانی اور دوسرے مناسک حج اور عمرہ۔ اور بعض عبادتیں اس جگہ ادا کرنے کا اتنا اجر و ثواب ہے کہ کسی اور جگہ اس کے برابر نہیں۔ جیسے نماز، روزہ اور اعتکاف۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر کے اندر آدمی کی نماز ایک نماز ہی کے برابر ہے اور محلہ کی مسجد میں ایک نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ (ابن ماجہ)

مکہ مکرمہ کے ناموں اور بیت اللہ کے ناموں کا ذکر

مکہ مکرمہ کے بہت سے نام ہیں جن میں سے بعض کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے جیسا کہ زیر نظر آیت میں "بَکَّۃَ" کا لفظ آیا جو دراصل مکہ ہی کا ایک نام ہے۔ اسی طرح "اُمُّ الْقُرٰی" (الانعام ۶ : ۹۲) یعنی بستیوں کی ماں اور یہ نام مکہ کی وجہ تسمیہ سے ملتا ہے کیونکہ مکہ بھی مک سے ہے جس کے ایک معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چوسنے کے ہیں اور "اُمُّ الْقُرٰی" اس لئے اس کو کہا گیا کہ علم الٰہی میں موجود تھا کہ اس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چوسے گی اس لئے ساری دنیا کا یہی حقیقی مرکز ہے اور مفسرین نے اس کو زمین کا مرکز بھی بیان کیا ہے جس سے مراد روحانی مرکز ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کاش کہ مسلمان اس بات کو مدنظر رکھ کر دشمنان اسلام کو بتا دیتے کہ ہمارا دارالخلافہ مکہ مکرمہ ہے اور ہمارے ممالک اسلامی کا مرکز اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے اور وہ پورے عالم اسلامی کا مرکز صحیح معنوں میں اس کو مان لیں اور وہاں کا حکمران پورے عالم اسلامی کا حکمران قرار پا جائے اور باقی تمام ممالک اسلامی اس کے صوبہ جات ملے پا جائیں اور پورے عالم اسلام کا دفاعی ادارہ ایک اور صرف ایک ہی ہو باقی سب ضمنی چھاؤنیاں بن جائیں۔ اور اس کو شہر خاص یعنی "اَلْبَلَدَ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور "اَلْبَلَدُ الْاَمِیْنِ" یعنی امن والا شہر بھی کیونکہ اس جیسی کوئی جائے امن باقی دنیا میں نہیں اور احادیث میں دو عظیم فتنوں کا ذکر کر کے

بتایا گیا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون داخل نہیں ہوں گے یعنی ہر طرح کے فتنوں سے امن ہی میں رہے گا۔ اللہ کرے مسلمان بھی اس کی پاسبانی کے لئے ایک ہو جائیں اور جن فتنوں کا اس وقت خدشہ ہو رہا ہے ان سے بھی اللہ اس کو محفوظ رکھے۔

خانہ کعبہ کے جتنے نام ہیں وہ سبھی گویا مکہ ہی کے نام ہیں جیسے "مقام ابراہیم" بیت اللہ کا نام بھی ہے اور بیت اللہ میں ایک خاص مقام کا بھی نام ہے۔ "البیت" یعنی خاص گھر اور "بیت العتیق" یعنی پرانا گھر "البیت الحرام" پاک گھر۔ "البیت الحرام" عزت والا گھر۔ "الکعبۃ" عام ہے اور "الحاطمۃ" یعنی توڑ دینے والا۔ القادس" "المقدس" "البینۃ" "الدارس" "المامون" "ام رحم" "صلاح" "عرش" وغیرہ۔

بیت اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا آخری عبادت گاہ بھی ہے اس لئے کہ "اول بیت" خود اللہ تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے اور "مبارکا" میں یہ اشارہ بھی ہے کہ نبی اعظم و آخر کا یہ قبلہ وہ قبلہ ہے جس سے خیر و برکت کبھی منقطع نہیں ہوگی گویا جس طرح دوسرے قبلے ایک وقت کے لئے تھے اور آخر ایک وقت آیا کہ ان کی خیر و برکت منقطع ہونے والی تھی یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہوگی اور تاریخ گواہ ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا اور یقیناً اب بھی رہتی دنیا تک نہیں بنے گا اور پھر یہ کہ سب سے بڑھ کر وہ "هُدًى لِّلْعَالَمِينَ" بھی ہے اس لئے کہ اس کی ہدایت صرف عرب والوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کی کل قوموں کے لئے ہدایت کا مرکز یہی ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے حقیقت یہی ہے۔

بیت اللہ کی مختلف نشانیاں اور خصوصاً مقام ابراہیم

۱۸۷ "اس میں روشن نشانیاں ہیں جن میں سے ایک مقام ابراہیم بھی ہے۔" وہ روشن نشانیاں کیا ہیں؟ قرآن کریم نے خود ان کا ذکر کر دیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "بلاشبہ صفا اور مروہ نامی دو پہاڑیاں اللہ کی حکمت و رحمت کی نشانیاں ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ ادا کرے اس کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کے درمیان طواف کرے۔" (البقرہ ۲: ۱۵۸) اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"پس جب عرفات نامی مقام سے انبوہ در انبوہ واپس لوٹو تو "مشعر الحرام" جو مزدلفہ میں ایک خاص مقام ہے میں ٹھہر کر اللہ کا ذکر کرو۔" (البقرہ ۲: ۱۹۹) ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اور اونٹ تو ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے جو تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمہارے لئے بہتری کی بات ہے پس چاہئے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو۔" (الحج ۲۲: ۳۶)

مقام ابراہیم کیا ہے؟ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی دیواریں اونچی کی تھیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور خصوصاً بہت بڑی نشانی کیونکہ آثار انبیاء علیہم السلام میں سے ایک اثر ہے جو اتنے لمبے زمانہ سے محفوظ چلا آرہا ہے اور یہ بیت اللہ کی تین خصوصیات

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ

اسکے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آگیا اور اللہ کی طرف سے لوگوں کیلئے یہ بات ضروری ہوگئی کہ اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں۔[۱۸۸] اس پر

میں سے پہلی ہے۔ جو بیت اللہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہے۔

بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے اور ہر لحاظ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جب تک وہ خود کسی پر حملہ نہ کرے کوئی اس پر حملہ نہیں کر سکتا اور کوئی اس کو قتل نہیں کر سکتا۔

بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر اس بیت اللہ کا حج فرض ہے بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور قدرت رکھتے ہوں۔

بیت اللہ کی پہلی خصوصیت کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں اس کی توضیح یہ ہے کہ جب سے بیت اللہ قائم ہوا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو مخالفین کے حملوں سے محفوظ فرما دیا۔ ابرہا نے ہاتھیوں کے لشکر سے اس پر چڑھائی کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کاملہ سے ان کو پرندوں کے ذریعے تباہ و ہلاک کر دیا۔ حرم مکہ میں داخل ہونے والا انسان بلکہ جانور تک محفوظ ہے اور تعجب ہے کہ جانوروں کو بھی اس کا احساس ہے اور حدود حرم کے اندر جانور بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ وہاں وحشی جانور بھی انسان کو دیکھ کر نہیں بھاگتا۔ مقام ابراہیم کی نشانی آج بھی بیت اللہ کے سامنے بیئر زمزم کے قریب رکھی ہوئی ہے اور اس پر ایک چھوٹی سی عمارت کی نشانی بنا دی گئی ہے جو بلوری خول سا نظر آتا ہے اور حجاج کرام طواف کے بعد کی دو رکعتیں اس کے قریب اگر جگہ مل جائے تو ادا کرتے ہیں اور اس مقام کے قریب یہ دو رکعت ادا کرنا زیادہ افضل مانا گیا ہے تاہم مقام ابراہیم لفظی معنی کے اعتبار سے تمام مسجد حرم کو حاوی ہے لہٰذا یہ دو رکعت جہاں جگہ میسر آئے ادا کر لینے سے ادا ہو جاتی ہیں۔

بیت اللہ کی دوسری اور تیسری خصوصیات

[۱۸۸] آیت زیر نظر میں بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ ذکر کی گئی ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کا "مامون و محفوظ ہونا ایک تو شرعی اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ حکم ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے اس کو ہرگز ہرگز نہ ستاؤ نہ قتل کرو۔" اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے اس کو بھی اس جگہ

الْعٰلَمِيْنَ ۞ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۞

بھی جو کوئی انکار کرے تو خیال رہے' اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔[۱۸۱] ۹۷

اے پیغمبر اسلام! تم ان اہل کتاب سے کہو کہ اے اہل کتاب! یہ کیا ہے کہ تم اللہ

سزا نہ دی جائے بلکہ اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکلے اور باہر نکال کر سزا دی جائے مگر ہاں جب کوئی مجبوری لاحق ہو جائے۔ دوسرے حرم میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا اس طرح بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر ہر قوم و ملت کے دلوں میں بیت اللہ کی تعظیم و تکریم ڈال دی ہے اور وہ سب عموماً ہزاروں اختلافات کے باوجود اس عقیدے پر متفق ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا اگرچہ مجرم یا ہمارا دشمن ہے تاہم حرم کا احترام اس کا مقتضی ہے کہ وہاں اس کو کچھ نہ کہیں اور حرم کو عام جھگڑوں اور لڑائیوں سے بھی محفوظ رکھا جائے۔

تعجب ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اور ان کے مختلف قبائل خواہ کتنی ہی عملی خرابیوں میں مبتلا تھے مگر بیت اللہ اور حرم محرم کی عظمت پر سب کے سب جان دیتے تھے ان کی جنگ جوئی اور تند خوئی ساری دنیا میں مشہور ہے لیکن حرم کے احترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اپنی آنکھیں نیچی کر کے گزر جاتا تھا اور اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

تاریخ میں ایک دو واقعات جو بیت اللہ یا حرم میں قتل و غارت کے ملتے ہیں ان میں بھی کسی حد تک مبالغہ پایا جاتا ہے تاہم سیاست و حکومت کے مصالح سے جو کچھ ہوا اس کو بھی مستحسن اور جائز سمجھ کر نہیں کیا گیا بلکہ حرام اور ناجائز سمجھتے ہوئے خاص حالات کے تحت ہوا۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ عامہ خلائق بیت اللہ اور حرم کو اس درجہ واجب الاحترام سمجھتے رہتے ہیں اور اب بھی بحمد اللہ سمجھتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز قیامت تک سمجھا جائے گا کہ اس میں قتل و قتال اور لڑائی جھگڑے کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں اور یہ ساری دنیا میں صرف اور صرف بیت اللہ اور حرم محترم ہی کی خصوصیت ہے۔

بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم و واجب قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت و استطاعت رکھتے ہوں جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پاس ضروریات زندگی سے فاضل اتنا مال ہو جس سے وہ بیت اللہ تک آنے جانے اور وہاں کے قیام کا خرچ برداشت کر سکے جس کی مقدار فی زمانا حکومت یعنی ہر ملک کی حکومت مقرر کر دیتی ہے۔ ہاں علاوہ ازیں حاجی حضرات کو اپنے اہل و عیال کا بھی انتظام' نان و نفقہ کا کرنا لازم و ضروری ہے۔

وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

کی آیتوں سے انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسکا شاہد حال ہے۔[۱۹۰] ۹۸

اے اہل کتاب! یہ کیا ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان لانا چاہتا ہے تم اسے اللہ کی

حج کی باقی تمام تفصیلات تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۵۸، ۱۵۹ اور ۱۹۳ سے ۲۰۳ تک میں ملاحظہ کریں۔

منکرین کو خیال رہے کہ اللہ کی ذات ایک بے نیاز ذات ہے

۱۸۹ "اس پر بھی جو کوئی انکار کرے تو خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔" یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ بڑے بڑے لوگ اس کا کفر بھی کریں گے مگر وہ اس کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور آیت ۹۷ صاف بتا رہی ہے کہ بڑے بڑے کفر کرنے والے بھی اہل کتاب ہی ہوں گے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس وقت اہل کتاب کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ یہود و نصاریٰ کا یہ گٹھ جوڑ انشاء اللہ ان ہی کے لئے ایک ایسا عذاب بن کر سامنے آئے گا کہ ان کو جان کے لالے پڑ جائیں گے اور وہ جو کنواں کھود رہے ہیں انشاء اللہ دنیا دیکھے گی کہ وہ خود اس میں کس طرح دھڑام سے جا گریں گے۔ مسلمان اگر سو گئے ہیں تو اللہ کی ذات تو نہیں سو سکتی کیونکہ اس پر تو نیند حرام ہے نیند تو نیند وہ تو کبھی اونگھتا بھی نہیں اس لئے ہمارا ایمان ہے کہ ایک دن عذاب الٰہی ان کو اپنی لپیٹ میں ضرور لے لے گا۔

اہل کتاب کو تنبیہہ کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والو باز آجاؤ

۱۹۰ اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اے اہل کتاب تم اللہ کی آیات کا کیونکر انکار کرتے ہو یعنی تمہارے پاس محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی آیات بینات کے انکار کی آخر کیا دلیل ہے؟ اس لئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نبی اعظم و آخر کو تسلیم کرنے اور ماننے کی تلقین تو تمہاری مذہبی کتابوں توراۃ و انجیل میں تاکیداً درج ہے۔ دوسری قومیں انکار کریں تو ان کے انکار کی وجہ تو لاعلمی اور نادانی ہو سکتی ہے لیکن تمہارے انکار کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کیا تم کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم نے محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری وحی ہے انکار کر کے اپنے اپنے نبی یعنی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور اپنی اپنی کتب سماوی یعنی تورات و انجیل کا انکار کیا ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حق کو پہچان کر اور سمجھ کر پھر اس سے انکار کرنا حق کو حق نہ سمجھ کر انکار کرنے سے زیادہ برا ہے۔ دوسرے لفظوں میں علماء کا تساہل دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت بڑا جرم ہے مزید فرما دیا کہ تم کو بھی یہ بات معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کفر اور تحریف کتاب کے عمل سے اچھی طرح باخبر ہے اس لئے یقینی بات ہے کہ وہ

تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا

راہ سے روکتے ہو اور اس کو ٹیڑھی چال چلانا چاہتے ہو حالانکہ تم حقیقت حال سے بے خبر نہیں ہو[۱۹۱] یقین رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے[۱۹۲]۔ ۹۹

تم کو اس کی سزا بھی دے گا اس لئے حق کو پوشیدہ رکھنے کی تمہاری یہ خواہش تمہارے ہی لئے وبال جان بن جائے گی۔

اہل کتاب کی یہ کوتاہی کہ وہ خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں

۱۹۱ اہل کتاب کی یہ کوتاہی کہ وہ خود تو انکار کرتے ہی ہیں اور پھر ان کو اس بات پر بس نہیں بلکہ دوسروں کو اسلام سے روکنے کا باعث بھی ہیں کیونکہ وہ طرح طرح کی اسکیمیں لڑاتے رہتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ جس طرح پیچھے گزر چکا کہ انہوں نے یہ اسکیم بھی شروع کی تھی کہ اپنے لوگوں کو منافقت کی بناء پر اسلام قبول کرنے کی تلقین کی کہ تم لوگ دن کے پہلے حصہ میں ایمان لاؤ اور دن کے پچھلے حصہ میں ایمان سے برگشتہ ہو جاؤ اور یہ پروپیگنڈا جاری کرو کہ ہم نے اسلام میں داخل ہو کر دیکھ لیا جو کچھ وہ ہے؟ یعنی وہ کچھ بھی نہیں صرف پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

زیر نظر آیت میں گویا ان سے باز پرس کرنے کا حکم ہے اور وہ بھی پوری قوت کے ساتھ کہ آخر تمہارے پاس ان حرکتوں کا کیا جواز ہے جو تم آئے دنوں کر رہے ہو۔ جو لوگ ایمان قبول کر چکے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں تم ان کو برگشتہ کرنے کے لئے جو مختلف طریقے اختیار کر رہے ہو ہم ان سے اچھی طرح باخبر ہیں ان سے باز آجاؤ ورنہ تمہارے اس عمل کا نتیجہ تم کو بھگتنا پڑے گا یاد رکھو کہ ہم سوئی ہوئی قوم نہیں کہ تمہاری ان حرکتوں سے واقف نہ ہوں جن کو تم چھپ چھپا کر کرتے آرہے ہو۔ تمہارے ان ہتھکنڈوں کا وبال تم پر پڑنے والا ہے اور تمہاری اس ٹیڑھی راہ سے ہم پوری طرح باخبر ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو جان بوجھ کر کر رہے ہو تم خود اس پر گواہ ہو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو جان بوجھ کر اور سمجھ بوجھ کر کر رہے ہو اور اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ان اعمال کی خبر رکھتا ہے اور ہم بس اس کے حکم ہی کے منتظر ہیں وہ وقت دور نہیں کہ تمہاری ان شرارتوں کا مزا تم کو چکھا دے گا۔

اہل کتاب تم جانتے ہو کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے

۱۹۲ اہل کتاب کو مزید تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ "یقین رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ

اے مسلمانو! اگر تم اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی باتوں پر کاربند ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں راہ حق سے پھرا دیں گے اور تم ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔[۱۹۳] ۱۰۰

اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ

نہیں ہے۔" یہ بات بھی تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے وہ جب بدلہ لینا چاہتا ہے تو حالات کو اس طرح بدل دیتا ہے کہ بڑے بڑے اسکیمر اپنی موت کو خود دعوت دینے لگتے ہیں۔ تم بھی ان باتوں سے باخبر ہو کہ ایک وقت تھا کہ فرعون کے ہاتھوں تم پر ظلم پر ظلم جاری تھے کہ اس اللہ نے ظالم فرعون کو اس کے ظلم کا مزا چکھانے کے لئے گھر سے نکال کر تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کر کے رکھ دیا اور تم مظلومین کو اس ظالم کے سارے خزانوں کا وارث بنا دیا۔ آج تم کو وہ وقت یاد نہیں رہا اور تم خود فرعون کے بھیس میں ظالم بن کر ظلم پر اتر آئے ہو ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر تم بھی دیکھ لو۔

فرعون اور اس کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ستایا تھا اس لئے اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آج تم محمد رسول اللہ ﷺ کو جو نبی اعظم و آخر ہیں اور ان کی امت مسلمہ کے درپے آزار ہو اور طرح طرح سے ان کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہو تو کیا تم اپنے انجام کو نہیں پہنچو گے؟ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام کے لئے ایک وقت متعین ہے اور جب وہ وقت متعین آجاتا ہے تو پھر اس میں تاخیر ممکن نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ تم اہل کتاب کی باتوں میں کیوں آتے ہو؟

---

[۱۹۳] "باتوں میں آنا" ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ ناسمجھی کی بناء پر کسی سے دھوکہ کھا جانا۔ مسلمان اور ایسی ناسمجھی آخر کیوں؟ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اسلامی روشنی سے دیکھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک کافر اندھا، بہرا اور گونگا ہوتا ہے۔ کیا نابینا بینا کو راہ دکھائے گا تم بھی عقل کے ناخن لو اور اپنی حیثیت کو سمجھو تم مسلمان ہو تم کو ان کے دھوکا میں آنا نہایت شرم کی بات ہے۔

قرآن کریم کی ہدایات جب سے وہ نازل ہوا اس وقت سے اس دنیا کے نظام کے قیام تک باقی رہنا تھیں اس لئے وہ صرف ان ہی لوگوں کے لئے نہ تھیں جو نزول کے وقت موجود تھے بلکہ آج بھی ہمارے لئے اسی

طرح ہیں جیسے آج ہی نازل ہوئی ہیں اور ہر آنے والے زمانے میں نئے آنے والوں کے لئے بھی ایسی ہی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل کتاب اور خصوصاً یہود کی اتباع سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ حاسد لوگ ایمان و اسلام کے پکے دشمن ہیں اور عرب کی رسالت ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اگرچہ کفر تم سے بہت دور ہے کیونکہ تم خود ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تاہم تمہارا ان کی چالوں میں آجانا تمہیں زیبا نہیں دیتا اگر تم ان سے دھوکا کھا گئے تو گویا تم ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس لئے کہ ان کی چال تو یہ تھی' ہے اور رہے گی کہ تم کو تمہارے ایمان سے پھیر دیں اور اس طرح پھیریں کہ تم کو معلوم بھی نہ ہو۔ اس لئے آج تک کوئی مذہبی دھوکا باز ایسا تو نہیں آیا کہ اس نے یہ اعلان کیا ہو کہ ایمان کو چھوڑ کر کفر قبول کرلو بلکہ ہمیشہ اس نے ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان بنانے کی کوشش کی اور اس طرح ناواقفوں کو اپنے پھندے میں پھنسا لیا۔ یہی کچھ یہود و نصاریٰ کرتے آئے ہیں' کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

یاد رکھو کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے وہ صرف رسم و رواج کا نام نہیں۔ اسلام ایک ایسا راہ مستقیم ہے جس پر وہ ہر مسلمان کو چلنے کی دعوت دیتا ہے اس کی خوب سمجھ رکھو۔ وہ جانتا ہے کہ ایک سچے مسلمان کی زندگی اور موت اور زندگی کے سارے طور طریقے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہیں اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کا دیا ہے کسی اور کا نہیں وہ طلب کرتا ہے تو صرف اسی سے طلب کرتا ہے کسی اور سے نہیں۔ وہ خرچ کرتا ہے تو صرف اسی کی رضا کے لئے کسی اور کی رضا کے لئے نہیں۔ وہ اپنے اموال کا مالک خود اپنے کو نہیں سمجھتا بلکہ اصل مالک اللہ ہی کو تصور کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ جو کچھ میرے پاس ہے میں صرف اس کا امین ہوں اور اس امانت کو امانت دینے والے کی رضا کے مطابق صرف کرنا ہے۔

مسلمانوں کو جو تنبیہہ کی جا رہی ہے صرف ایک ہی بار نہیں بلکہ بار بار قرآن کریم میں دہرائی گئی ہے تاکہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے چوکنے رہیں اور اپنی حیثیت کو بھول نہ جائیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

"مسلمانو! اگر تم ان لوگوں کے کہنے میں آگئے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو یاد رکھو وہ تمہیں راہ حق سے الٹے پاؤں پھرا دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم تباہی و نامرادی میں جا گرو گے۔ تمہارا کارساز و رفیق تو اللہ ہے مدد کرنے والوں میں اس سے بہتر مددگار کون ہو سکتا ہے؟" (اٰل عمران ۳: ۱۴۹)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ:

"ان لوگوں کی دلی تمنا تو یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تم بھی کرلو اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔" (النساء ۴: ۸۹) کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اگر وہ تم پر قابو پالیں تو تمہارے دشمن بن جائیں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں دکھ پہنچائیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح کافر ہو جاؤ۔" (الممتحنہ ۶۰: ۲)

تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ

کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں[۱۹۴] اور اس کا رسول تم میں موجود ہے[۱۹۵]۔ اور یاد رکھو جو

مزید وضاحت کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۰۹، ۲۱۷ پر ایک نظر ڈال لیں۔

تم کفر کی راہ کیسے اختیار کرتے ہو جبکہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں؟

۱۹۴ "کیف" استفہامیہ تعجب کے لئے ہے یعنی تعجب ہے کہ تم کفر کی طرف جاؤ حالانکہ اللہ کی آیات تم کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں اور کسی چیز کا سننا اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب اس کو سن کر اس کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی جائے ورنہ بھینس کے سامنے بین بجانے کے مترادف ہے۔ تم انسان ہو پھر اس سے آگے بڑھ کر تم مسلمان بھی ہو اس پر طرہ یہ کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تم ان کو سمجھو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

مقام غور ہے کہ آج ہم میں کتنے ہیں جو قرآن کریم کو پڑھتے یا سنتے ہیں؟ پھر پڑھنے اور سننے والوں میں کتنے ہیں جو سمجھنے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؟ اور پھر کتنے ہیں جو سمجھ جانے کے بعد اس پر عمل کرتے ہیں؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت کو یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ قرآن کریم صرف پڑھنے کے لئے ہے بس پڑھا اور مردوں کو بخش دیا۔ گویا قرآن کریم زندوں کے لئے نہ ہوا بلکہ مرنے والوں کو بخشوانے کے لئے ہوا۔ تعجب پر پھر تعجب ہے کہ ایسا کیونکر سمجھ لیا گیا؟ اور کس نے سمجھا دیا؟ سارے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ بہت سے مذہبی پیشواؤں نے۔ اس لئے کہ یہی تفہیم کرا دینا ان کا سرمایہ حیات ہے اور یہ لوگ ان انشورنس کمپنیوں کے مالک ہیں جہاں مردوں کی بخشش کی انشورنس کرائی جاتی ہے۔ جس کو تعجب ہوتا ہے ہوا کرے ان کی بلا سے ان کو گاہک ملتے ہیں اور ملتے رہیں گے۔ رہیں اللہ کی آیتیں وہ تو وہ بھی پڑھتے ہیں اور دن رات پڑھتے ہیں اور اسپیکر لگا کر پڑھتے ہیں اور قبرستان میں جا جا کر پڑھتے ہیں۔

پھر یہ بھی کہ ان آیتوں کو پڑھنے اور سمجھانے والا اللہ کا رسول ہے

۱۹۵ مطلب یہ ہے کہ تم کفر کی راہ کیونکر اختیار کر سکتے ہو کہ "تم میں اللہ کے رسول بنفس نفیس موجود ہیں؟" یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سردست تو بنفس نفیس تشریف فرما ہیں وہ تمہارا ہر شبہ مٹا سکتے ہیں اور راہ بتا سکتے ہیں باقی ان کے بعد ان کے آثار و سنن بھی یہی کام دیں گے جو وہ خود انجام دے رہے ہیں اس لئے کہ اب نبوت تو ختم ہو چکی جب تک دنیا باقی ہے اس وقت تک محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت قائم ہے اور قائم رہے گی۔ کتاب اللہ کا نزول بھی اس وقت تک جاری رہا جب تک خود نبی اعظم و آخر ﷺ زندہ موجود تھے اور آپ ﷺ کے اٹھا لئے جانے کے بعد گویا نزول قرآن کریم ختم ہو گیا۔ وہ آیتیں جو اس وقت پڑھی جاتی تھیں

فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا

شخص مضبوطی کے ساتھ اللہ کا ہو رہا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ[۱۹۶] کھل گئی۔ ۱۰۱

اب بھی اسی طرح پڑھی جائیں گی اور ان آیات سے جو کام اس وقت لیا جاتا تھا اب بھی لیا جائے گا بالکل اسی طرح جب تک محمد رسول اللہ ﷺ موجود تھے آپ ﷺ کا ہر ارشاد فیصلہ کن اور اسلام میں حجت تھا بالکل اسی طرح آپ ﷺ کے اٹھائے جانے کے بعد بھی آپ ﷺ کے ارشادات فیصلہ کن اور دین اسلام میں حجت ہیں اور رہیں گے۔

"وَفِيكُمْ رَسُولُهُ" کے الفاظ سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ حاضر و ناظر ہیں تو یہ اس کی یا تو جہالت ہوگی یا دھوکہ دہی۔ اس لئے کہ کسی حاضر و ناظر انسان کے لئے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ حاضر و ناظر ہے یہ الفاظ ادا ہی اس جگہ ہوں گے جہاں کوئی انسان حاضر و ناظر نہ ہو اور عقیدۃً اس کو حاضر و ناظر بتایا جائے اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم ﷺ انسان تھے۔

یاد رکھو کہ جو اللہ کا ہو گیا اس پر سیدھی راہ کھل گئی

[۱۹۶] "جو شخص مضبوطی کے ساتھ اللہ کو پکڑتا ہے" یعنی مضبوطی کے ساتھ اللہ کا ہو کر رہتا ہے تو اس کے لئے سیدھی راہ کھل جاتی ہے کسی کا ہو کر رہنے کا مطلب ہر شخص جانتا ہے۔ عصمت کے معنی ہیں حفاظت اور کسی چیز کی حفاظت کرنے سے اس کا بچاؤ ہو جاتا ہے لہٰذا عاصم کے معنی ہوئے بچانے والا یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے ذریعہ سے اپنا بچاؤ کرنے والا۔ اعتصام باب افتعال کے معنی ہوئے مضبوطی سے کسی چیز کو پکڑ لینا تاکہ ہلاکت سے محفوظ ہو جائے۔ مطلب واضح ہو گیا کہ جس شخص نے بھی اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیا وہ یقیناً کامیاب ہو گیا اور آگ دوزخ سے وہ بچا لیا گیا۔ اس لئے کہ یہی وہ کامیابی ہے جو ساری کامیابیوں سے بڑی کامیابی ہے۔ بلاشبہ لوگ مال اور دولت عہدہ و اقتدار کو کامیابی تسلیم کرتے ہیں حالانکہ یہ ساری چیزیں آزمائش بھی ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں اسی لئے قرآن کریم کی روشنی میں اس چیز کا اعلان کیا گیا ہے کہ "جو شخص آگ سے بچا لیا گیا وہ حقیقی طور پر کامیاب ہو گیا اس لئے کہ اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی" فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا۔

اس لئے زیر نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی" اور وہ یقیناً کامیاب و کامران ہو گیا۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا:

"لوگو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان آگئی اور ہم نے تمہاری طرف چمکتی ہوئی روشنی بھیج دی پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سائے میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھا دے گا ایسی راہ جو بالکل

اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو ایسا ڈرنا جو واقعی ڈرنا ہے اور دیکھو دنیا سے نہ جاؤ مگر اس حالت میں کہ اسلام پر ثابت قدم ہو۔ ۱۹۷ ۱۰۲

سیدھی راہ ہے۔" (النساء: ۱۷۴، ۱۷۵)

اس آیت میں دین حق کو "برہان" فرمایا یعنی سرتاسر دلیل و حجت اور قرآن کریم کو "نور مبین" کہا یعنی واضح اور آشکارا روشنی۔ ظاہر ہے کہ "برہان" کے ساتھ جہل و گمان اکٹھا نہیں ہو سکتا اور "نور مبین" کے ساتھ تاریکی و کوری راہ نہیں پا سکتی۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:

"جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنی عملی حالت سنوار لی اللہ کے حکم پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور اپنے دین میں صرف اسی کے ہو گئے تو بلاشبہ ایسے لوگ مومنوں کی صف میں شامل ہو گئے اور قریب ہے کہ اللہ مومنوں کو اجر عطا فرمائے ایسا اجر جو بہت ہی بڑا اجر ہو گا۔" (النساء ۴: ۱۴۶)

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا پہلا اصول

۱۹۷ زیر نظر آیت میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا پہلا اصول بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے مطابق ہو۔ لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اسی مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں اور ان سے عذاب الٰہی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس ڈرنے کی چیز یعنی تقویٰ کے بہت سے درجات ہیں جن میں سے ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے۔ ان معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے اگرچہ وہ گناہوں میں مبتلا ہو۔ ان معنوں میں بھی قرآن کریم میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک غیر پسندیدہ ہو۔ تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ ﷺ میں آتے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔ تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور دوسرے اللہ کے خاص بندوں کو نصیب ہوتا ہے کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور ہونا۔ زیر نظر آیت کریمہ میں "اِتَّقُوا اللّٰهَ" کے بعد "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کے الفاظ بڑھائے گئے ہیں یعنی تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو تقویٰ کا حق ہے۔ اس لحاظ سے یہ دیکھنا چاہئے کہ حق تقویٰ کیا ہے؟

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ربیع رضی اللہ عنہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ

فرمائی ہے اور یہی مرفوعاً خود رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے جس کا ترجمہ اس طرح ہے کہ "حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے' کوئی کام طاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی نہ بھولیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی بھی ناشکری نہ کریں۔"

اس مفہوم کو آئمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے مثلاً بعض نے فرمایا ہے کہ "حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور برائی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو" اور بعض نے کہا کہ "کوئی آدمی اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔"

قرآن کریم ہی کی ایک دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ "اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت میں ہے اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ اور طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ درحقیقت یہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کی ہی تفسیر و تشریح ہے اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دے تو حق تقویٰ ادا ہو گیا اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے بعد کسی ناجائز ہی میں مبتلا ہو گیا تو وہ حق تقویٰ کے خلاف نہیں۔

اسی آیت کے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ جس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درحقیقت پورا اسلام ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت اور اس کی نافرمانی سے مکمل پرہیز ہی کا نام تقویٰ ہے اور ظاہر ہے کہ اسی کو اسلام بھی کہا جاتا ہے۔ رہا حکم کہ تمہاری موت اسلام ہی پر آنی چاہئے اسلام کے سوا کسی حال پر موت نہ آنی چاہئے تو اس جگہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موت تو کسی آدمی کی اختیاری چیز نہیں کسی وقت اور کسی حال میں بھی آسکتی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

کما تحبون تموتون وکما تموتون تحشرون یعنی "جس حالت پر بھی تم اپنی زندگی گزار دو گے اس پر موت آئے گی اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کئے جاؤ گے۔"

تو جو شخص اپنی پوری زندگی اسلام پر گزارنے کا پختہ عزم رکھتا ہے اور مقدور بھر اس پر عمل کرتا ہے اس کی موت انشاء اللہ العزیز اسلام ہی پر آئے گی ہاں! بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمال صالحہ کرتے ہوئے گزر گئی آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال حبط و برباد ہو گئے تو یہ ایسے ہی لوگوں کو پیش آسکتا ہے جن کے عمل میں اول اخلاص اور پختگی نہیں ہوتی یا جو کچھ وہ کرتے نظر آتے ہیں وہ بالکل ظاہر داری ہوتی ہے اور ان کی اندرونی حالت صحیح نہیں ہوتی اگرچہ دوسروں کو معلوم نہ ہو سکے۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا پہلا اصول یہی ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک مسلم کو ذمہ داری کا احساس ہو اور اجتماع درست کرنے کے لئے افراد کا درست ہونا لازمی و ضروری۔ افراد درست ہوں گے تو یقیناً

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۠ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ

اور یاد رکھو کہ سب مل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور گروہ گروہ نہ ہو جاؤ۔[۱۹۸] اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو وہ وقت یاد کرو جب تمہارا

ان افراد کامل کر اجتماع جب بھی اور جیسے بھی ہوگا وہ درست ہی ہوگا۔ افرادی اکائیاں درست نہ ہوں تو ان کا اجتماع کبھی بھی درست نہیں ہو سکتا۔ اسلام اسی اصول کا داعی ہے اسی لئے اس نے اجتماع کرنے سے پہلے افراد کی حالت اور قوت ایمانی کی اصلاح کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے ہر ایک مسلم بچا رہتا ہے۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا دوسرا اصول

۱۹۸ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا دوسرا اصول یہ قرار دیا کہ "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور الگ الگ گروہوں میں تقسیم نہ ہو جاؤ" گویا پہلے وہ اصول اور گر بتلائے جو انسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخہ اکیسر ہے ازیں بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اتفاق و اتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مسلک و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے اور اس میں دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں۔ دنیا میں شاید کوئی ایک انسان بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کے بذاتہ مفید اور بہتر جانتا ہو۔ اس لئے دنیا کی ہر جماعت ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہے لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں، گروہوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے اور روز بروز بٹتی ہی چلی جا رہی ہے۔ پھر فرقہ کے اندر نئے نئے فرقے اور ہر پارٹی کے اندر نئی نئی پارٹیوں کا لامحدود سلسلہ ایسا جاری ہے کہ صحیح معنوں میں دو آدمیوں کا اتفاق و اتحاد بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ وقتی اغراض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں، اغراض پوری ہو جائیں یا ان میں ناکامی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہو جائے بلکہ افتراق اور عداوتوں کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ اور ہر فرقہ بلکہ ہر شخص لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ ان سے متفق ہونے کی بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں اس لئے لازمی طور پر ہر دعوت اتحاد کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور وہ افتراق و انتشار ہوتا ہے۔ کرنا کیا چاہا تھا اور ہو کیا۔ چاہا تھا کہ اتحاد ہو

لیکن نتیجہ کیا ہوا کہ مزید انتشار و افتراق ہوا اور اس طرح اختلاف کی دلدل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس لئے قرآن کریم نے صرف اتحاد و اتفاق اور اجتماع و تنظیم کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ اور عادلانہ اصول بھی بتلا دیا جس کے صحیح معنوں میں مان لینے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے وہ کیا ہے؟

وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں کے بنائے ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ سب اس پر متفق ہو جائیں گے عقل و انصاف کے خلاف ہے اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہاں! البتہ رب العلمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا ہی چاہئے' کوئی عقلمند اس سے اصولاً انکار نہیں کر سکتا۔ اب اگر اختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہو سکتی ہے کہ احکم الحاکمین رب العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کونسا ہے۔ یہودی نظام تورات کو نصاریٰ نظام انجیل کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا نظام اور واجب التعمیل بتلاتے ہیں یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ لیکن اول تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہو کر اپنی عقل خداداد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ جاتی ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرآن کریم کی صورت میں لائے ہیں آج اس کے سوا کوئی نظام اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اس وقت مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر ایمان ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تغییر تحریف کا بھی امکان نہیں اس لئے سردست ہم غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتے ہیں کہ ان کے لئے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی اور وطنی اختلافات ایک لمحہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت اور خصوصاً اسلام کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تعبیر قرآن میں رہ سکتا ہے اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسانوں کی اور خصوصاً مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر ہے بلکہ ایسا اختلاف رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے۔

پھر یہ بھی کہ اس اختلاف پر قابو پانا اور اس کو حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہو کر ہماری اسلامی پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلاف جدال کا کوئی علاج نہیں رہتا اور

اسی اختلاف و انتشار کو قرآن کریم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری اس پوری ملت انتشار و افتراق میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکیسر اس طرح بتلایا ہے کہ "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو" اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟

دور اول سے لے کر آج تک سب مسلمانوں میں متفق یہ کلام ہے کہ اس رسی سے مراد "قرآن کریم" ہے اور جتنے فرقے اور جماعتیں اس وقت اسلام کے اندر موجود ہیں کسی ایک کو بھی اس سے اختلاف نہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کتاب اللہ ھوحبل اللہ الممد ود من السماء الی الارض" یعنی کتاب اللہ ہی اللہ تعالیٰ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے" اور اسی طرح زید بن ارقم کی روایت میں "حبل اللہ ھو القران" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سارے مفسرین اسلام بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

بلاشبہ محاورہ عربی میں "حبل" سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔ قرآن کریم کو دین اسلام میں رسی سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بنا دیتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ قرآن کریم کے اسی ایک جملہ میں حکیمانہ اصول بتلائے گئے ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات یعنی قرآن کریم پر مضبوطی سے عامل ہو دوسری یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوگا کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظم ہو جائیں گے جیسے کوئی جماعت ایک رسی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جسم واحد بن جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح طریقے سے بیان کر دیا ہے جہاں ارشاد فرمایا کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۱۹: ۹۶) بلاشبہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عملوں میں لگ جائیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت اور دوستی پیدا کر دے گا۔"

یعنی جو لوگ ایمان و عمل کی راہ اختیار کریں گے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے انسانوں کے دل کھول دے گا اور وہ قوموں اور ملکوں کے محبوب ہو جائیں گے اور یہ بھی کہ وہ دولت ایمانی کے باعث اور عمل صالح کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی محبت کے اصول پر ایک جسم و جان ہو جائیں گے۔

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جو کسی بلندی پر چڑھتے وقت ایک مضبوطی رسی کو پکڑ لیں اور ہلاکت سے محفوظ رہیں

لہٰذا اشارہ فرما دیا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے تو کوئی شیطان بھی شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل تسخیر ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کر لیتی ہے اور اس سے ہٹ کر ان کی قومی و اجتماعی زندگی تو تباہ ہو ہی جائے گی اور اس کے بعد انفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے کہ وحدت و اتفاق کے لئے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو پھر مرکز وحدت کے بارے میں اقوام عالم کی رائیں مختلف ہیں کہیں نسلی اور نسبی رشتوں کو مرکز وحدت سمجھا گیا جیسے قبائل عرب کی وحدت تھی کہ قریش ایک قوم اور بنو تمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی اور کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے تھے۔ کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکز بنایا ہوا تھا کہ ہندی ایک قوم اور عربی دوسری قوم کہیں آبائی رسم و رواج کو مرکز وحدت بنایا گیا تھا کہ جو ان رسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جو ان کے پابند نہیں وہ دوسری قوم جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج۔ قرآن کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکز وحدت "حبل اللہ" یعنی قرآن کریم یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام محکم کو قرار دیا اور دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ مومن ایک قوم ہیں جو "حبل اللہ" سے وابستہ ہے اور کافر دوسری قوم جو اس "حبل اللہ" سے وابستہ نہیں "فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ" جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکز وحدت بنایا جائے کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری امور ہیں جن کو کوئی انسان اپنے سعی و عمل سے حاصل نہیں کر سکتا۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا اس لئے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہو سکتی ہیں ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے مرکز وحدت "حبل اللہ" یعنی قرآن کریم یا اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو قرار دیا جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا۔ گورا ہو یا کالا۔ عربی زبان بولتا ہو یا ہندی و انگریز، کسی قبیلہ کسی خاندان کا ہو ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکز وحدت کو اختیار کر سکتا ہے اور دنیا بھر کے پورے انسان اس مرکز وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں اور اگر وہ آبائی رسم و رواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں اور اس کا اتباع کر کے "حبل اللہ" کو مضبوطی سے تھام لیں جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت سے مربوط ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کرے گا یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری

عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ

حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے لیکن اس کے خاص فضل و کرم سے تم سب بھائی بھائی بن گئے[۱۹۹] تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری ہوئی خندق

دنیا کی اقوام کو للکار سکتا ہے کہ یہی صحیح راستہ ہے اس طرف آؤ اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا اور درست ہے لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے صدیوں سے چل رہی ہے وہ خود اسلام کے دعویداروں میں کامیاب ہوگئی۔ اب امت اسلامیہ کی وحدت عربی، مصری، ایرانی، افغانی، عراقی، افریقی، ہندی اور سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی۔

قرآن کریم کہ یہ آیت ہر وقت ہر جگہ اور ہر ایک کو بآواز بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت نہ امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے اس لئے "اِعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ" کی وحدت اختیار کریں جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سربلند بنایا تھا اور اب بھی اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اس راستہ سے مل سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کے پابند ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ مل کر سب کے سب مضبوطی کے ساتھ اس کو تھام لیں تاکہ ملت اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظم ہو جائے جیسا کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اس کے بعد تاکیداً یہ ارشاد فرمایا کہ "وَلَا تَفَرَّقُوا" کہ باہم نااتفاقی نہ کرو قرآن کریم کا یہ حکیمانہ انداز ہے کہ وہ جہاں ایجابی پہلو واضح کرتا ہے وہیں سلبی پہلو سے مخالف چیزوں سے منع فرما دیتا ہے اس جگہ بھی وہی کیا اور تاکیداً ارشاد فرما دیا کہ دیکھو "گروہ گروہ نہ ہو جانا" آج ہم نے اس حکم کی کسی طرح تعمیل کی سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اس نعمت الٰہی کا ذکر جس سے سب بھائی بھائی بن گئے

۱۹۹ ارشاد ہوتا ہے کہ اس نعمت الٰہی کو یاد کرو جس نے تم سب کو بھائی بھائی بنا دیا تھا وہ بھی خاص ایسے وقت میں جب کہ تم ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو چکے تھے اور تمہارے ایک ہونے کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ آتی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے پوری دنیا اور خصوصاً عربوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی خاندانی جنگ و جدال اتنا تھا کہ سینکڑوں سال گزر جاتے تھے جو لڑائی چھڑتی تھی بند ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور پوری کی پوری قوم اس بیماری کا شکار تھی۔ جاہلیت کے زمانہ میں اوس و خزرج کے درمیان بڑی

بڑی لڑائیاں ہو چکی تھیں اور ان دونوں قبیلوں میں بہت ہی سخت عداوت تھی آپس میں برابر جنگ جاری رہتی تھی۔ جب دونوں قبیلے اسلام لائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل ایک ہوگئے سب حسد و بغض جاتا رہا اور آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار اور اللہ تعالیٰ کے دین میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہوگئے۔

اس نعمت الٰہی کی کیا کیا برکتیں لوگوں نے دیکھیں اس کا تذکرہ بہت وسیع ہے جو لوگ آپس میں دشمن تھے وہ کیونکر شیر و شکر ہوگئے اور اسلام کے پھیلانے کا کیا انداز صحابہ نے اختیار کیا یہ داستانیں یاد رکھنے کے قابل ہیں انہیں اوس و خزرج کی داستان کو لے لو تو بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ محمد بن اسحٰق اور دوسرے اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ قبائل اوس و خزرج ایک ماں باپ کی اولاد تھے لیکن ایک مقتول کی وجہ سے دونوں میں دشمنی ہوگئی اور اتنی بڑھی کہ ایک سو بیس برس تک باہم جنگ ہوتی رہی آخر کار اسلام کے ذریعہ اللہ نے ان کی باہمی عداوت کی آگ بجھا دی اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے سب میں اتفاق ہوگیا ان کے اسلام اور باہمی الفت کا آغاز اس طرح ہوا کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں ایک شخص تھا جس کا نام سوید بن صامت تھا اور قوم والے اس کو طاقتور اور نیک ہونے کی وجہ سے "کامل" کہتے تھے۔ سو یہ حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ کو گیا اس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو چکی تھی اور آپ ﷺ کو اسلام کی دعوت دینے کا حکم مل چکا تھا۔ آپ ﷺ نے سوید کی آمد کی خبر سنی تو اس کے پیچھے گئے اور اللہ تعالیٰ کے دین اسلام کی دعوت دی سوید نے کہا شاید تمہارے پاس ویسی ہی کوئی چیز ہے جیسی میرے پاس ہے آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے پاس کیا ہے؟ سوید نے کہا کہ لقمان کا ایک رسالہ یعنی لقمان کا پر حکمت کلام نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے سامنے لاؤ سوید نے پیش کیا یعنی پڑھ کر سنایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اچھا ہے مگر میرے پاس جو چیز ہے وہ اس سے بھی بہت افضل ہے۔ میرے پاس قرآن کریم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نور اور ہدایت بنا کر اتارا ہے پھر آپ ﷺ نے اس کو قرآن کریم سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ سوید نے نفرت نہیں کی اور کہنے لگا یہ اچھی چیز ہے پھر واپس مدینہ چلا گیا اور کچھ ہی مدت کے بعد جنگ بعاث میں قبیلہ خزرج نے اس کو قتل کر دیا اس قوم والوں کا بیان ہے کہ مسلمان ہونے کی حالت میں اس کو قتل کیا گیا۔

اس کے بعد ابو الحیسر انس بنی رافع بنی اشہل کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جس میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھا قریش سے معاہدۂ تعاون کرنے کے لئے آیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ بھی تشریف لے گئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا جس کام کے لئے تم آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز کی تم کو خواہش ہے لوگوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں اللہ نے مجھے اپنے بندوں کے پاس بھیجا ہے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک و سہیم مت بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کتاب بھی نازل فرمائی ہے اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کا تذکرہ کیا اور قرآن کریم

پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو ایک نوجوان لڑکا تھا کہنے لگا قوم والو! جس کام کے لئے تم آئے ہو اللہ کی قسم یہ اس سے بہتر ہے۔ ابوالحسیر نے ایک لپ بھر کر کنکریاں اس کے منہ پر ماریں اور بولا کہ تو اپنی بات رہنے دے۔ ہم دوسری غرض سے آئے ہیں ایاس خاموش ہوگیا اور رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوگئے اور وہ لوگ بھی واپس مدینہ کو لوٹ گئے مدینہ پہنچنے کے بعد اوس و خزرج کے درمیان جنگ ہوئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ایاس کا انتقال ہوگیا پھر جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کا دین ظاہر اور رسول غالب ہو جائے تو ایک حج کے زمانہ میں ہر سال کے معمول کے مطابق رسول اللہ ﷺ انصار مدینہ کی ایک جماعت سے ملے اور عقبہ کے پاس ایک خزرجی گروہ سے ملاقات ہوئی اس گروہ میں چھ اشخاص تھے۔ اسود بن زرارہ۔ عوف بن حارث یعنی عوف بن عفراء۔ نافع بن مالک عجلانی۔ عطیہ بن عامر۔ عقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ ان کو خیر نصیب ہو۔

نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے جواب دیا خزرجی گروہ کے آدمی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم یہودیوں کے دوستوں میں سے ہو انہوں نے کہا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم بیٹھ کر میری بات نہیں سنو گے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں ضرور سنیں گے۔ اس کے بعد سب بیٹھ گئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے دین اسلام کی دعوت دی اور اسلام کے اصول بیان فرمائے نیز قرآن کریم بھی پڑھ کر سنایا اللہ کا احسان یہ ہوا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ ان کے اسلام لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ وہ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ رہتے تھے یہودی اہل کتاب اور ان لوگوں کے مقابلہ میں اہل علم بھی تھے اور یہ لوگ بت پرست اور مشرک تھے۔ یہودیوں سے جب ان کا کچھ جھگڑا' قضیہ' مذہبی بحث و تمحیث میں ہو جاتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے کہ اب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا ہے ہم اس کی اتباع کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تم کو قوم عاد کی طرح قتل کریں گے۔ پس اس گروہ نے جب رسول اللہ ﷺ کا کلام اور اسلام کی دعوت کے اصول سنے تو آپس میں کہنے لگے لوگو! تم جانتے ہو کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کا نام لے کر یہودی تم کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اب یہودی تم سے اس کی مدد حاصل کرنے میں سبقت نہ کرنے پائیں۔

ان سب لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی اور مسلمان ہوگئے اور عرض کی کہ ہم ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جن میں آپس کی جنگ اور دشمنی اتنی ہے کہ اتنی دشمنی شاید کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ اب امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے ذریعہ سے ان میں اتفاق و اتحاد کرا دے۔ عنقریب ہم ان کے پاس جائیں گے اور ان کو اس بات کی دعوت دیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو آپ ﷺ کے معاملہ میں متفق کر دیا تو آپ ﷺ سے بڑھ کر پھر کوئی عزت یافتہ نہ ہو گا اس کے بعد یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اپنے شہر یثرب یعنی مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور مدینہ والوں کو اسلام کی دعوت دی اس طرح سے نبی اعظم

و آخر ﷺ کا ذکر مدینہ طیبہ میں اتنا پھیل گیا کہ انصار کے ہر گھر میں آپ ﷺ ہی کا چرچا ہونے لگا۔

پھر آئندہ سال ایام حج میں بارہ انصار آئے۔ سعد بن زرارہ' عوف بن عفراء' معاذ بن عفراء' رافع بن مالک عجلانی۔ ذکران بن عبدالقیس عبادہ بن صامت۔ زید بن ثعلبہ۔ عباس بن عبادہ۔ عقبہ بن عامر اور عطیہ بن عامر یہ سب لوگ خزرجی تھے اور قبیلہ اوس کے دو شخص بھی تھے ابوالہیثم بن تیہان اور عویمر بن ساعدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ عقبہ اولیٰ میں ان لوگوں کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی اور عورتوں کی بیعت کی شرطوں پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی کہ وہ شرک نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے الخ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم ان شرطوں کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہے اور اگر ان میں کچھ کھوٹ کرو گے تو دنیوی سزا میں گرفتار ہو جاؤ گے تو گناہ کا کفارہ ہو جائے گا لیکن اگر تمہارے جرم پر پردہ پڑا رہا تو تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد رہے گا وہ چاہے گا تو تم کو عذاب دے گا اور چاہے گا تو معاف کر دے گا۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ جنگ پیش آنے سے پہلے کا ہے۔ ان لوگوں کی واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبدمناف کو ان کے ساتھ کر دیا اور حکم دے دیا کہ ان لوگوں کو قرآن کریم پڑھانا اور سکھانا یعنی اسلام کی تعلیم دینا اور احکام اسلام اچھی طرح یاد کرانا مدینہ میں مصعب بن عمیر کا لقب مقری یعنی قرآن کریم پڑھانے والا ہو گیا اور اسعد بن زرارہ کے مکان پر ان کا قیام ہوا۔

کچھ عرصہ کے بعد اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر بنی ظفر کے ایک باغ کو گئے اور اندر جا کر بیٹھ گئے اور وہاں دوسرے مسلمان بھی جمع ہو گئے۔ دوسری طرف سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا یہ دونوں آدمی ہمارے گھر میں آکر "ہمارے کمزور سمجھ" کے آدمیوں کو بہکانا چاہتے ہیں تم جا کر ذرا ان دونوں کو جھڑک کر باہر نکال دو۔ سعد بن زرارہ میرے ماموں کا بیٹا ہے اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں خود ہی یہ کام کر لیتا تمہاری ضرورت بھی نہ ہوتی۔ سعد بن معاذ اور اسید' بنی اشہل کے سردار تھے اور اس وقت تک ابھی مشرک تھے۔ حسب مشورہ اسید اپنا چھوٹا نیزہ لے کر مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد رضی اللہ عنہ کے پاس گیا دونوں باغ کے اندر تشریف فرما تھے۔ اسید کو دیکھ کر اسعد رضی اللہ عنہ نے مصعب رضی اللہ عنہ سے کہا یہ آنے والا اپنی قوم کا سردار ہے اس کو اسلام کی دعوت دو۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اگر یہ بیٹھ جائے گا تو میں اس سے بات کروں گا۔ اسید پہنچ کر دونوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور گالیاں دینے لگا اور کہنے لگا تم ہمارے ہاں کیوں آئے ہو؟ کیا ہمارے "کمزور سمجھ" والوں کو بے وقوف بنا رہے ہو اگر تم کو اپنی جان کی خیر ہے تو یہاں سے ہٹ کر چلے جاؤ۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا آپ بیٹھ کر ہماری بات تو سن لیجئے اگر ہماری بات آپ کو پسند آجائے تو قبول کر لینا ناپسند ہو تو چھوڑ دینا انشاء اللہ آپ کے ناگوار خاطر بات نہیں کی جائے گی۔ اسید نے کہا ہاں! یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی یہ کہہ کر نیزہ زمین میں گاڑ کر دونوں کی طرف رخ کر کے سامنے بیٹھ گیا۔

مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلام کے متعلق اس سے گفتگو کی اور قرآن کریم بھی پڑھ کر سنایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ کا بیان

ہے کہ ابھی وہ کچھ بولا بھی نہ تھا مگر ہم کو اس کے چہرے کی چمک اور بشاشت سے اسلام کے آثار نظر آنے لگے۔ قرآن کریم سننے کے بعد کہنے لگا یہ تو بڑی اچھی اور خوبصورت چیز ہے اچھا بتاؤ کہ اس مذہب میں داخل ہونے کے وقت تم کیا کرتے ہو؟ مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا غسل کر لو کپڑے پاک کر لو پھر شہادت حق دو پھر دو رکعت نماز ادا کرو۔ اسید نے فوراً اٹھ کر اور کسی دوسری جگہ جا کر غسل کیا۔ کپڑے پاک پہنے اور کلمہ شہادت پڑھ کر کھڑا ہوا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر کہنے لگا میرے پیچھے ایک آدمی اور ہے اگر اس نے بھی تمہاری بات مان لی تو اس کی قوم کا کوئی آدمی بھی تامل نہیں کرے گا وہ سعد بن معاذ ہے۔ میں ابھی اس کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں پھر اپنا نیزہ پکڑا اور چل دیا اور اپنی چوپال پر آکر بیٹھ گیا۔ سعد نے پوچھا پیچھے کیا چھوڑ کر آئے ہو اسید رضی اللہ عنہ نے کہا خدا کی قسم میں نے تو ان سے کوئی جرات نہیں پائی میں نے ان کو رد کر دیا تھا انہوں نے کہا جیسا آپ کو پسند ہے ہم ویسا ہی کریں گے لیکن مجھے ایک خبر ملی ہے کہ بنی حارثہ اسعد کو قتل کرنے کے درپے ہیں اور وہ اس طرف بڑھ رہے ہیں چونکہ اسعد تمہارا ماموں کا بیٹا ہے اور اس کو قتل کر کے تم سے عہد شکنی کرنی چاہتے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی سعد غضب ناک ہو گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا نیزہ ہاتھ میں لیا اور بولا خدا کی قسم میرے خیال میں تم نے کچھ کام نہیں کیا۔ باغ میں پہنچ کر جب دیکھا تو مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد رضی اللہ عنہ دونوں کو بالکل مطمئن پایا اور اس سے وہ سمجھ گیا کہ اسید نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں خود پہنچ کر ان کی بات سنوں۔ یہ خیال کر کے وہ ان دونوں کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ان کو گالیاں دینے لگا اور اسعد بن زرارہ سے بولا اگر مجھ سے تیرا رشتہ نہ ہوتا تو پھر میرے متعلق تیری یہ جرات نہ ہوتی تو ہمارے گھر یعنی باغ کے اندر ایسی باتیں لے کر آتا ہے جو ہم کو ناگوار ہیں۔ چونکہ سعد کو دیکھتے ہی اسعد رضی اللہ عنہ نے مصعب رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا تھا کہ یہ آنے والا بھی اپنی قوم کا سردار ہے اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو پھر اس کی قوم میں کوئی بھی تمہاری مخالفت نہیں کرے گا۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا ذرا بیٹھ کر ہماری بات سن لیجئے اگر آپ کو دل پسند اور مرغوب ہو تو مان لیں ورنہ آپ کے ناگوار خاطر کام ہم آپ سے الگ رکھیں گے۔ سعد نے کہا ہاں تیری یہ بات ٹھیک ہے پھر اپنا نیزہ زمین میں گاڑ کر بیٹھ گیا۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلام پیش کیا اور قرآن کریم پڑھ کر سنایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ سعد کے چہرے کی چمک دمک اور بشاشت دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے کہ اسلام اس کو پسند آگیا چنانچہ قرآن کریم سن کر سعد نے کہا جب تم مسلمان ہوتے ہو اور اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غسل کر لو۔ کپڑے پاک پہنو اور پھر کلمہ شہادت ادا کرو اور دو رکعت نماز پڑھو۔

سعد اٹھا جا کر غسل کیا پاک و صاف لباس پہنا شہادت حق ادا کی اور دو رکعت نماز پڑھی اور نیزہ لے کر قصداً اپنی قوم کی چوپال کی طرف گئے اور ساتھ میں اسید بن حضیر بھی تھے۔ قوم والوں نے ان کو آتا دیکھ کر کہا خدا کی قسم اب سعد رضی اللہ عنہ کا وہ چہرہ نہیں جو جاتے وقت تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے قوم سے کہا اے بن عبدالاشہل تم مجھے

اپنے اندر کیسا جانتے ہو قوم والوں نے کہا آپ ہمارے سردار ہیں سب سے زیادہ آپ کی رائے فضیلت رکھتی ہے آپ کا قول و عمل نہایت مبارک ہے سعد نے کہا تو پھر سن لو کہ تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آؤ سعد کے اسی قول کے بعد بنی عبدالاشہل کے احاطہ میں کوئی مرد و عورت بغیر اسلام لائے نہیں رہا تھا۔

اسعد رضی اللہ عنہ اور مصعب رضی اللہ عنہ دونوں لوٹ کر اسعد رضی اللہ عنہ کے گھر آگئے اس لئے کہ مصعب رضی اللہ عنہ ان کے ہاں مقیم رہے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے یہاں تک کہ انصار کے احاطوں میں کوئی احاطہ ایسا نہیں رہا تھا جس میں کچھ مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوں۔ ہاں بنی امیہ بن زید اور حطمہ اور وائل اور واقف کے احاطہ کے لوگ مسلمان نہ ہوئے کیونکہ ابو قیس بن اسلت شاعران میں موجود تھا اور یہ سب خاندان والے اس کی بات سنتے تھے اور اس کا کہا مانتے تھے اس نے سب کو اسلام سے روک دیا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے اور بدر' احد اور خندق کی لڑائیاں بھی گزر گئیں اس کے بعد یہ لوگ ایمان لائے۔

اس کے بعد مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر مکہ کو واپس چلے گئے اس وقت ان کے ساتھ ستر مسلمان انصار اور کچھ لوگ ابھی شرک پر قائم تھے وہ بھی حج کے لئے مکہ کو گئے مکہ پہنچ کر وسط ایام تشریق میں عقبہ ثانیہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان سب کی ملاقات ہونے کا وعدہ ہوا۔ یہی وہ بیعت ہے جو عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ بن مالک کا بیان ہے کہ میں اس موقع پر موجود تھا۔ ہم حج سے فارغ ہوئے اور وعدۂ ملاقات والی رات آئی اور اس وقت ہم اپنے ساتھ والے مشرک لوگوں سے اپنی باتیں ظاہر نہیں کرتے تھے مگر ابوجابر عبداللہ بن عمرو بن حرام کو ہم نے بتا دیا تھا اور اس سے گفتگو کر لی تھی اور کہہ دیا تھا کہ آپ ہمارے سرداروں میں سے ایک ہیں اور ہمارے بزرگ ہیں ہم نہیں چاہتے کہ آپ کل کو آگ کا ایندھن بنیں اس لئے جس حالت میں آپ ہیں اسی حالت میں آپ کو چھوڑ دینا ہم کو پسند نہیں مختصر یہ کہ اس کو ہم نے اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگیا اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ ملاقات کی اس کو اطلاع دے دی اور وہ بھی عقبہ میں ہمارے ساتھ آگیا اور نقیب ہوگیا۔ وعدہ والی رات کا کچھ حصہ ہم نے اپنی فرودگاہوں میں ہی گزارا جب ایک تہائی رات گزر گئی تو ہم چپکے چپکے چھپتے چھپاتے قطاً یعنی چکور کی چال سے نکلے اور عقبہ کے پاس گھاٹی میں پہنچ کر جمع ہوئے اس وقت ہم ستر مرد اور دو عورتیں تھیں ایک بنی نجار کی ام عمارہ نسیبہ بنت کعب اور دوسری بنی سلمہ کی ام منیع اسماء بن عمرو بن عدی۔ گھاٹی کے اندر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لائے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے گروہ خزرج (خزرج کا اطلاق اس جگہ انصار کے پورے گروہ پر ہوتا ہے خواہ ان میں اوس کے لوگ بھی ہوں) تم واقف ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہیں جو لوگ ہماری قوم میں ہمارے خیالات کے ہیں ان سے ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ہے۔ یہ اپنی قوم میں باعزت اور اپنے

شہر میں حفاظت سے ہیں۔ لیکن یہ سب سے کٹ کر تمہارے ساتھ جڑنا چاہتے ہیں اور تم سے کٹنے پر راضی نہیں ہیں۔ پس سوچ لو اگر اس بات کو تم پورا کر سکو جس کے لئے ان کو بلا رہے ہو اور مخالفوں سے ان کی حفاظت کر سکو تو تمہاری ذمہ داری تم پر ہے اور اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب یہ تمہارے پاس پہنچ جائیں گے اور ان کو مدد کی ضرورت ہوگی تو تم ان کو بے مدد' بے سہارا چھوڑ دو گے تو ابھی سے ان کو چھوڑ دو۔ یہ عزت و حفاظت کے ساتھ ہیں۔ کعب کا بیان ہے کہ ہم نے جواب دیا جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ہم نے اچھی طرح سن لیا ہے لیکن اے رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ خود کچھ ارشاد فرمایئے اور اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے ہم سے جو عہد لینا چاہیں لے لیجئے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس پر رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس گویا ہوئے۔ آپ ﷺ نے پہلے قرآن کریم کی تلاوت کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور اسلام کی طرف راغب کیا پھر فرمایا کہ میں تم سے ان شرطوں پر بیعت لیتا ہوں کہ اپنے بیوی بچوں کی جس سے حفاظت کرو گے اس سے میری بھی حفاظت کرو گے یہ سن کر براءؓ بن معرور نے دست مبارک پکڑ لیا اور عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ہم جس چیز سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اس سے آپ ﷺ کی بھی حفاظت کریں گے۔ یارسول اللہ ﷺ ہماری بیعت قبول کیجئے ہم خود بھی جنگ جو ہیں اور دوسروں سے بھی تعاون کا ہمارا معاہدہ ہے جو بزرگوں سے موروثی چلا آتا ہے۔ براءؓ رسول اللہ ﷺ سے بات کر ہی رہے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان بیچ میں بول اٹھے اور کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں سے ہمارے معاہدے ہیں اب ان کو ختم کرنا پڑے گا کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم سب معاہدے ختم کر دیں اور اللہ آپ ﷺ کو غلبہ عنایت فرما دے تو آپ ﷺ ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف آجائیں۔ یہ کلام سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا نہیں تمہارا خون میرا خون ہے۔

تم مجھ سے ہو اور میں تم سے جس سے تم لڑو گے میں بھی لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں بھی صلح کروں گا پھر آپ ﷺ نے فرمایا اپنے لوگوں میں سے بارہ نمائندے چھانٹ کر نکال لو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار ہوں۔ حسب الحکم بارہ نمائندے چھانٹے گئے ۹ خزرج میں سے اور ۳ اوس میں سے۔ عاصم بن عمرو بن قتادہ کا بیان ہے کہ جب بیعت کے لئے لوگ جمع ہوگئے تو عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری نے کہا اے گروہ خزرج! کیا تم جانتے ہو کہ کس شرط پر تم آپ ﷺ کی بیعت کر رہے ہو۔ سن لو ہر گورے اور کالے سے لڑنے کی بیعت کر رہے ہو اگر تمہارا خیال ہو کہ جب تمہارے مالوں پر کوئی مصیبت پڑے گی اور تمہارے سردار مارے جائیں گے تو تم ان کو بے مدد چھوڑ دو گے تو اس وقت ہی بیعت نہ کرو ورنہ اس وقت خدا کی قسم دنیا و آخرت کی رسوائی نصیب ہوگی اور اگر مالوں کی تباہی اور سرداروں کی ہلاکت کے باوجود تم اپنے اس وعدے کو پورا کر سکتے ہو جس پر تم اس شخص کو دعوت دے رہے ہو تو اس کو

لے لو خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔

انصار نے جواب دیا ہم مالوں کی تباہی اور سرداروں کی ہلاکت ہو جانے کے بعد بھی ان کو نہیں چھوڑیں گے اور اس شرط پر ان کو قبول کر رہے ہیں لیکن اے اللہ کے رسول ﷺ اگر ہم نے یہ شرط پوری کر دی تو ہم کو اس کے عوض کیا ملے گا نبی کریم ﷺ نے فرمایا آپ کو جنت ملے گی انصار نے عرض کیا پھر دست مبارک پھیلایئے۔ نبی کریم ﷺ نے ہاتھ پھیلایا تو سب نے بیعت کر لی سب سے پہلے براء بن معرور نے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر یکے بعد دیگرے دوسرے لوگوں نے بیعت کی۔

بیعت ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب تم اپنے اپنے پڑاؤ پر چلے جاؤ۔ عباس بن عبادہ بن نضلہ نے عرض کیا کہ قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ﷺ چاہیں تو ہم کل صبح ہی اہل منیٰ پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑیں فرمایا مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے تم اپنی فرود گاہوں پر چلے جاؤ حسب الحکم ہم سب اپنی اپنی خواب گاہوں کی طرف لوٹ آئے اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو قریش کے بڑے بڑے لوگ ہمارے پڑاؤ پر آئے اور کہنے لگے اے گروہ خزرج! ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تم ہمارے ایک ساتھی کے پاس آئے ہو اس کو ہمارے پاس سے نکال کر لے جانا چاہتے ہو اور ہمارے خلاف جنگ کرنے کے لئے اس سے بیعت کر رہے ہو خدا کی قسم عرب کے کسی قبیلہ سے جنگ چھڑ جانا ہمارے نزدیک اتنی قابل نفرت نہیں جتنی تم سے ہے۔ یہ سن کر ہمارے یعنی خزرج اور اوس کے مشرک کھڑے ہوگئے اور اللہ کی قسمیں کھا کھا کر انہوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہمیں اس کا علم ہے حقیقت میں انہوں نے یہ بالکل سچ کہا تھا اس لئے کہ ان کو اس بیعت کا علم ہی نہ تھا۔ ان کی باتوں کے وقت ہم آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن خاموش تھے اور اس کے بعد سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

قریش میں ایک شخص حارث بن مغیرہ مخزومی نئی جوتیاں پہنے ہوئے تھے میں نے ابو جابر سے ایک بات کہی گویا میں دوسرے قریش کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میں مشرکین انصار کے کلام کی تائید کر رہا ہوں اور بات یہ تھی کہ میں نے اس سے کہا ابوجابر تم ہمارے سرداروں میں سے ہو لیکن اتنی بھی تم میں استطاعت نہیں کہ اس قریشی جو ان کی جوتیوں کی طرح جوتیاں ہی بنوا لو۔ حارث نے یہ بات سنی تو فوراً جوتیاں پاؤں سے نکال کر میری طرف پھینک دیں اور بولا خدا کی قسم اب ان کو تو پہنے گا ابوجابر نے کہا کہ ارے تو نے جوان کو غصہ دلا دیا جوتیاں واپس کر دے میں نے کہا میں تو واپس نہیں کروں گا۔ یہ شگون اچھا ہے اگر فال اچھی ہوئی تو خدا کی قسم میں اس کے کپڑے بھی اتار لوں گا۔ مختصر یہ کہ اس مضبوط معاہدہ کے بعد انصار مدینہ کو لوٹ گئے اور اس طرح مدینہ میں اسلام کا ظہور ہوگیا۔

قریش کو اس کی اطلاع ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کو مزید دکھ دینے لگے آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے کچھ بھائی بنا دیئے ہیں اور امن کی ایک جگہ بھی دے دی تو تم ہجرت کر

مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو[۲۰۰] لیکن اللہ نے تمہیں اس حالت سے نکال لیا اللہ اس طرح اپنی کار فرمائیوں کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم راہ پالو۔ ۱۰۳

کے مدینہ چلے جاؤ اور اپنے انصاری بھائیوں میں مل کر رہو اس حکم پر سب سے پہلے سلمہ بن عبداللہ مخزومی کے بھائی نے مدینہ کی طرف ہجرت کی پھر عامر بن ربیعہ نے پھر عبداللہ بن جحش نے پھر پے در پے جتھے جانے لگے اس طرح اسلام کی وجہ سے اللہ نے مدینہ والے اوس اور خزرج کے قبیلوں کو متفق بنا دیا اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان میں باہم صلح کرا دی۔

اس مختصر تحریر میں عقل والوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں اور ان گنت راہنمایان دین اور سیاست کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے یہ ایک یادگار ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ دین اسلام کو پھیلانے کے لئے صحابہ کرامؓ نے کیا کیا قربانیاں دیں اور اللہ تعالیٰ نے ان مناقشات کو کس طرح ختم کرایا جو مدتوں سے ان کے درمیان چلے آرہے تھے اور جن کی وجہ سے ان کی کتنی نسلیں آپس میں لڑتی چلی آرہی تھیں اور اس طرح شیر و شکر کرنے کے لئے اسلام نے کس طرح راہنمائی کی اور عزت والوں کی عزت کی دین اسلام نے کس طرح حفاظت کر کے ان کی عزت کو بحال رکھا اور کبھی ان کی عزت پر آنچ نہ آنے دی دنیا تو دنیا تھی انہوں نے ان کو آخرت میں بھی عزت والا بنا دیا اور اس صلہ میں انعام یہ پایا کہ ان کو بھی آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور قیامت تک عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ان کے انہی کارہائے نمایاں نے ثابت کر دیا کہ اسلام صلح و آشتی اور پیار و محبت کا داعی ہے اختلاف و افتراق اور گروہ در گروہ تقسیم کرنے کا داعی نہیں۔

گروہ در گروہ تقسیم ہونے کو آگ کے گڑھے پر کھڑے ہونے سے تشبیہ

۲۰۰ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوسرے احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ "تم وہ لوگ ہو کہ گویا ایک آگ سے بھری ہوئی خندق ہے اور تم اس کے کنارے کھڑے ہو لیکن اللہ نے تم کو اس میں گرنے سے بچا لیا۔" اس میں آگ کا گڑھا کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ قوم کا وہ افتراق و انتشار اور لڑائی جھگڑا اور کفر و شرک کے وہ کام جو مدتوں کرتے چلے آرہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرما کر اس میں دھکیلے جانے سے ان کو بچا لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حنین کی فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے مصلحت دین کے تحت رسول اللہ ﷺ نے بعض لوگوں کو زیادہ مال عطا کر دیا تو کسی شخص نے کچھ ایسے ہی ناملائم الفاظ زبان سے نکال دیئے جس پر رسول اللہ ﷺ نے جماعت انصار کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔ آپ ﷺ نے اس میں یہ بھی فرمایا کہ

اے جماعت انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی؟ کیا تم متفرق نہ تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ کیا تم فقیر نہ تھے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری وجہ سے غنی کر دیا۔ ان سب سوالوں کے جواب میں انصار برملا یہ کہنے لگے کہ ہاں! ہم پر اللہ اور اس کے رسول کے اور بھی بہت سے احسان ہیں۔

مسلمانوں کا اسی طرح شیر و شکر ہونا یہودیوں کو ایک آنکھ بھی نہ بھاتا تھا انہوں نے کئی بار اس کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی طرح گروہ بندی اور اختلاف و انتشار کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ وہ موقعہ بموقعہ اوس و خزرج کے لوگوں کو بھڑکانے کے لئے ان کے گزشتہ واقعات ان کے سامنے دہراتے اور ان کو طیش دلاتے کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح بھڑک کر آپس میں پھر لڑ جائیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی وہ اس طرح کی شرارتیں کرتے رہے اور اکا دکا واقعات ایسے ہوئے بھی کہ لوگ آپس میں دوبارہ لڑنے پر اتر آئے۔ روایات میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کا یہ داؤ چل گیا اور ان دونوں قبیلوں میں پرانی آگ بھڑک اٹھی یہاں تک کہ تلواریں کھنچ گئیں ٹھیک دو جماعتیں ہوگئیں اور وہی جاہلیت کی نعرہ بازی شروع ہوگئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ حرہ کے مقام پر پہنچ کر دل کھول کر لڑنے پر آمادہ ہوگئے اور اس پیاسی زمین کو اپنے خون سے ایک بار پھر سیراب کریں گے لیکن نبی کریم ﷺ کو پتہ چل گیا اور آپ ﷺ فوراً موقعہ پر تشریف لائے اور دونوں گروہوں کو ٹھنڈا کیا اور فرمانے لگے کہ تم پھر جاہلیت کے نعرے لگانے لگے ہو۔ میری موجودگی میں ہی تم پھر جہالت کی طرف لوٹ آئے ہو پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم کیا اور دونوں فریق نادم ہوئے اور اپنی دو گھڑی پہلے کی حرکت پر افسوس کرنے لگے اور آپس میں نئے سرے سے معانقے و مصافحے کئے اور بھائیوں کی طرح دوبارہ ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔ سب نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح و صفائی ہوگئی۔

آج بدقسمتی سے مسلمانوں کے سارے گروہ اور سارے مکاتب فکر ان آیات کریمات کو پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کا گریبان چاک کرنے کے لئے ہر وقت تیار نظر آتے ہیں۔ علمائے اسلام کی اکثریت ایسی ہوگئی ہے کہ ان کو ہر وقت متحارب رکھنے کی فکر میں ہیں اور ان کو نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کے گر سکھاتے ہیں کہ کہیں یہ سب لوگ اکٹھے نہ ہو جائیں۔ آپس میں ایک دوسرے کو اس طرح دشمن سمجھتے ہیں کہ یہودی، عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں سے تو مل سکتے ہیں لیکن آپس میں علیک سلیک بھی نہیں کر سکتے۔ ایک مجلس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ رشتے ناطے نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھ سکتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا علاج کیا ہے کیونکہ یہ سب کچھ دین اسلام کے نام پر کرتے جا رہے ہیں۔

پھر تعجب ہے کہ آئے دنوں نئے نئے گڑھے کھودے جا رہے ہیں اور ان میں خوب آگ کے الاؤ روشن

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا

اور ضروری ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو[۲۰۱] وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں[۲۰۲]۔ ۱۰۴

کر کے یہ داعیان اسلام ان گڑھوں کے کنارے اپنے اپنے لوگوں کو اکٹھا کرنے کی فکر میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ دھکم پیل ہو اور جو جس گڑھے میں گر جائے وہی شہید اور وہی دین و دنیا میں کامیاب و کامران ہے۔ ان کو کون بتائے کہ یہ اسلام نہیں بلکہ یہ تو عین کفر ہے۔ آپ نے اسلام کو کفر اور کفر کو اسلام کس طرح بنا دیا؟ اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ کی توفیق دے یا پھر اللہ تعالیٰ ہی کسی جرنیل کو ہمت عطا فرما دے کہ وہ ان سب کو پکڑ پکڑ کر ان ہی کے کھودے ہوئے گڑھوں میں ان کو جلا کر راکھ کر دے۔ تاکہ عوام ان کے دام تزویر سے بچ جائیں۔ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔

آیت زیر نظر کے آخری جملہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ دلیلیں تمہارے لئے اس لئے بیان کی جا رہی ہیں تاکہ تم ہدایت پا جاؤ اور کفر چھوڑ کر ہدایت پر پوری طرح جم جاؤ اور روز بروز تمہاری ہدایت میں اضافہ ہوتا جائے پھر آگے اس کا طریقہ بھی ارشاد فرما دیا۔

اس ہدایت پر قائم رہنے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟

۲۰۱ اس آیت میں اس بات کی پوری پوری وضاحت فرما دی کہ مسلمانوں کو اجتماعی کامیابی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ فرمایا اجتماعی کامیابی کے لئے یہ گر اچھی طرح یاد کر لو کہ تم میں ایک جماعت بطور نظم و ضبط کے بطور گروہ بندی ہر وقت موجود ہونا چاہئے جس کا نام دعوت الی الخیر ہو یعنی تم من حیث القوم تو ایک ہی قوم کے افراد اور ایک دین و ملت سے وابستہ ہو لیکن بلحاظ ذمہ داری ایک جماعت مخصوص ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتی رہے۔ وہ لوگ خود اصلاح نفس کریں اور ایک دوسرے سے شیر و شکر رہیں اور قوم کے دوسرے لوگوں کو اصلاح نفسی اور اصلاح حال کی دعوت دیں اور ان کو اس رسی خداوندی کو مل کر پکڑنے کی ہدایت و تلقین کریں بلکہ ایک حد تک مجبور کریں کہ وہ سب ایک جسم کے مختلف اعضاء کی مانند ہیں۔ دعوت الی الخیر کیا ہے؟ اس سے مراد ہے دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن ویسے بھی خیر کے معنی بھلائی کے ہیں اور

حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن ہی میں ہیں۔ اس لئے اس جگہ یہ ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایک ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونکی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے اور اسی جوش اور تڑپ کو لے کر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور اسلام کا نام دنیا کے دور دراز ملکوں میں روشن کر دیا ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

ہاں! اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہوتی گئی اس لئے کہ وہ اپنے تعیشات میں گرفتار ہوگئے لیکن علماء کا ایک گروہ اللہ کے دین کا کام سرانجام دیتا رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں انحطاط آیا تو علماء کی توجہ بھی زیادہ تر فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی اور بادشاہوں نے بھی کسی حد تک اس میں دلچسپی لی اور یہ ایک شغل بن گیا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے اور انعامات حاصل کرنے کے لئے اس کو باقاعدہ بطور فن سیکھا جانے لگا۔ تاہم بہت سے اللہ کے بندے علماء حق ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کی دعوت میں مصروف رہے۔ بہت سے وہ لوگ ہیں جن کے ناموں پر آج بھی ہزارہا لوگ قربان ہونے کے لئے تیار ہیں اور ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمت گزاری کی وجہ سے تھی اور ہے۔ دراصل وہ ایک قسم کے روحانی بادشاہ تھے اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن کا کام چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور خوب سرانجام دیا وقت گزرتا گیا اور آہستہ آہستہ اس میں بھی انحطاط شروع ہوگیا۔ اور آج یہ کس قدر افسوس ناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیان اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمدنی ہے وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے اور ان کے تعیش کے سامان پیدا کرنے کا ذریعہ نظر آتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ان کو آستانوں کا نام دے کر مخلوق خدا کے لئے سجدہ گاہیں اور مرادیں مانگنے کے مراکز بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور اس طرح کئی طرح کی بدعات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہ ضلالت میں گرا رہی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر اسلامی درس گاہیں ان جگہوں سے الگ کرنا پڑیں۔ چنانچہ کچھ دیر اس طرح وقت چلتا رہا کہ یہ اسلامی درسگاہیں دعوت الی الاسلام کا کام کسی حد تک کرتی رہیں لیکن بدقسمتی سے آج وہ بھی دکانداریاں اور بڑی بڑی رقمیں کمانے کی منڈیاں نظر آتی ہیں اور جو کچھ ان میں ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی، گروہ بندی اور پارٹی بازی پھر ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا اور اس سے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے کی عزت برباد کرنا یہ سب کچھ مع شے زائد دعوت الی الاسلام کے نام سے جاری و ساری ہے اور اس طرح جو چیز اسلامی زندگی کی جان تھی وہی اسلامی زندگی کی موت بن کر رہ گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ

رَاجِعُوْنَ۔

دعوت الی الاسلام دینے والوں کا فرض اولیں کیا ہے؟

۲۰۲ اس زیر نظر آیت کے اندر ہی اس دعوت الی الاسلام دینے والوں کے فرائض منصبی کا بھی اعلان کر دیا گیا فرمایا ان کا فرض منصبی یہ ہوگا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔ معروف وہ کام ہیں جن کو فطرت انسانی پہچانتی ہے یعنی سارے نیک کام اور منکر وہ ہے جس سے فطرت انسانی انکار کرتی ہے یعنی سارے برے کام۔ بدترین حالت کسی قوم کی وہ ہوتی ہے جب وہ اپنے لوگوں کو برا کرتے دیکھیں اور اس سے ان کو نہ روکیں چنانچہ یہودیوں کی بدترین حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے خود قرآن کریم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (المائدہ ۵ : ۷۹) "کہ وہ برائیوں میں پڑ جاتے تو پھر اس سے باز نہیں آتے البتہ یہ بڑی ہی برائی تھی جو وہ کیا کرتے تھے۔"

پھر اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک مسلمان کے فرائض میں سے ہے مگر دعوت الی الاسلام کا کام کرنے والی جماعت کے فرائض میں سے اسے خصوصیت سے داخل فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر افضل الجہاد ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اسلام کا یہ فخر تھا کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے انسان کو بھی نصیحت کر سکتا تھا اور اس کی غلطی پر اسے بے دھڑک آگاہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کامل اور راست باز انسان جب خلافت کے منصب پر آتا ہے تو دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ "اگر میں کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو" حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے بارعب انسان کے سامنے ایک بڑھیا اس طرح کہہ سکتی ہے کہ "اے ابن الخطاب قرآن کریم جو کچھ ہم کو دیتا ہے آپ اس سے منع فرماتے ہیں۔" استفسار ہوتا ہے کہ وہ کیسے؟ بڑھیا کہتی ہے کہ "قرآن کریم عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے کہ "اگر تم نے عورتوں کو حق مہر میں ایک خزانہ بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس مت لو اور آپ کہتے ہیں کہ عورتوں کو بڑے بڑے مہر نہ دو۔" تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے رائے سے رجوع کرتے ہیں لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدی نشین ہے اور اس کا حکم ان کے لئے اللہ کے حکم کے قائم مقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم میں یہ غلطی ہے یا یہ بات تم نے ٹھیک نہیں کہی یہ کام تم نے اچھا نہیں کیا گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اٹھ گئے۔ اس پر آج جتنا رونا رویا جائے اتنا ہی کم ہے۔ لیکن قرآن کریم کی ہدایت آج بھی یہی کہتی ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں یہی لوگ اصل میں کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ

اور دیکھو ان لوگوں کی سی چال نہ چلنا جو الگ الگ ہوگئے[۲۰۳] اور باوجود اس کے کہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں پھر بھی وہ باہم دگر اختلاف میں پڑ گئے۔ یقین

اسلام کے اندر الگ الگ گروہ بندیاں اختیار کرنے کی واضح الفاظ میں ممانعت

۲۰۳ یہود و نصاریٰ کی طرح اصولوں اور بنیادی عقائد میں اختلاف کر کے مختلف گروہ بندیاں اختیار کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت فرما دی۔ یعنی ازراہ نفسانیت و شرارت وحدت دینی کو پارہ پارہ کر کے اپنے اپنے الگ مذہب نہ گھڑو۔ اس لئے کہ تمہارے پاس قطعی دلائل اور آیات محکمات آچکی ہیں اب اختلافات کی کوئی گنجائش حقیقت میں باقی نہیں رہی۔ الفاظ قرآنی خود بخود مفہوم آیت متعین کرنے میں بالکل واضح اور صاف ہیں۔ اس لئے کہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ "دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو کر بٹ گئے اور الگ الگ فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔" مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو جنہوں نے واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے احکام میں پہنچ جانے کے بعد محض اوہام و اہواء کی پیروی کر کے اصول دین میں متفرق ہوگئے اور باہمی جنگ و جدال سے عذاب الٰہی میں مبتلا ہوگئے یہ آیت درحقیقت پہلی آیت کا تتمہ ہے۔ جس آیت میں مرکز وحدت اعتصام بحبل اللہ کی طرف دعوت دی گئی اور اشارۃً بتا دیا کہ اجتماع اور اتحاد تمام امت اور قوم کو ایک شخص واحد میں تبدیل کر دیتا ہے پھر دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اس دعوت و اجتماع کو غذا پہنچائی جاتی ہے اور نشوونما کیا جاتا ہے پھر "لَا تَفَرَّقُوْا" اور آیت "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا" سے اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ تفرق اور اختلاف نے پچھلی قوموں کو تباہ کر دیا ان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے میں یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔

اس آیت میں جس تفرق و اختلاف کی مذمت ہے اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو جس سے "تفریق بین المومنین" ہو جائے۔ چنانچہ آیت میں یہ قید کہ "احکام واضح آنے کے بعد" اس امر پر واضح اور صاف قرینہ ہے کیونکہ اصول دین سب واضح ہوتے ہیں اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے و اجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں اور وہ حدیث صحیح اس کی اجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری و مسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور حکم ٹھیک ہو تو مجتہد کو دو اجر ملتے ہیں اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ اجتہادی اختلاف جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آئمہ اسلام میں ہوا ہے اس کو اس آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں بقول حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ و حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ صحابہؓ کا اختلاف لوگوں کے لئے موجب رحمت و رخصت ہے۔

یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہوگئی کہ جو اجتہادی اختلاف شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے اس میں اپنے لئے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کرلی اگرچہ عنداللہ اس میں سے صواب اور صحیح صرف ایک ہے دوسرا خطا ہے لیکن یہ صواب و خطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد و صواب پر پہنچنے والے عالم کو دوہرا ثواب عطا فرما دے گا اور جس کے اجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے ہاں! اپنے فہم و بصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنہ سمجھے اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صحیح و صواب ہے لیکن احتمال خطا کا بھی ہے اور دوسری جانب خطا ہے مگر احتمال صواب کا بھی ہے اور یہ وہ بات ہے جو تمام آئمہ و فقہا اسلام میں مسلم ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود امر منکر ہے جس سے پرہیز لازم ہے یہ وہ بات ہے جس سے آج کل بہت سے اہل علم بھی غفلت میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرّا اور سبّ و شتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ و جدال اور انتشار و اختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آرہا ہے۔

اجتہادی اختلاف جب کہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو وہ تو ہرگز آیت مذکورہ "وَلَا تَفَرَّقُوْا" سے خلاف اور مذموم نہیں البتہ اس اجتہاد میں اختلاف کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جاتا ہے کہ اس کی بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنا دیا جاتا ہے اور اس پر باہم جنگ و جدل اور سبّ و شتم تک نوبت پہنچا دی جاتی ہے یہ طرز عمل بلاشبہ "وَلَا تَفَرَّقُوْا" کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنت کے بالکل خلاف ہے۔ اسلاف امت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلاف کی بناء پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو۔

مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوتی۔ اس کے بالمقابل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا درست نہیں اس لئے حنفیہ نہیں پڑھتے لیکن پوری امت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا کہ شافعی مسلک والے حنفیوں کو تارک نماز کہتے ہوں کہ تمہاری نمازیں جب ہوتی ہی نہیں تو تم اس لحاظ سے

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ

کر و یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے۔[۲۰۴] ۱۰۵

وہ دن کہ کتنے ہی چہرے اس دن چمک اٹھیں گے اور کتنے ہی چہرے سیاہ پڑ جائیں[۲۰۵]

تارک نماز ہو اور تمہارا وہی حکم ہے جو بالکل نماز ادا نہ کرنے والوں کا ہے یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکرات شرعیہ پر کی جاتی ہے۔

امام ابن عبدالبر اپنی کتاب جامع العلم میں اس معاملہ کے متعلق سنت سلف کے بارے میں یہ بیان دیتے ہیں کہ :عن یحیی بن سعید قال برح اھل الفتوی یفتون فیحل ھذا و یحرم ھذا فلا یری المحرم ان المحل ھلک لتحلیلہ ولا یری المحل ان المحرم حلک لتحریمہ (جامع بیان العلم ص ۸۰)

"یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتویٰ دیتے ہیں ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال قرار دیتا ہے اور دوسرا حرام کہتا ہے مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہوگیا اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک اور گمراہ ہوگیا۔"

گروہ بندی اختیار کرنے والوں کو عذاب عظیم کی اطلاع سنائی جاتی ہے

۲۰۴ اسلامی اصولوں اور بنیادوں میں اختلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "جن لوگوں کے پاس روشن دلیلیں آچکی تھیں پھر بھی وہ باہم دگر اختلاف میں پڑ گئے یقین کرو یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے۔"

غور و فکر کا مقام ہے کہ اس وقت جو اختلاف مختلف مکتبہ ہائے فکر میں پائے جاتے ہیں وہ کس طریقہ کے ہیں فروعی ہیں یا اصولی؟ ان میں نفسانیت اور اہواء کہاں تک ہیں اور کہاں تک نہیں؟ ان اختلافات کا انجام کیا ہے؟ کیا ان اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے گروہ بندیاں تشکیل پا چکی ہیں یا نہیں؟ کیا ہر گروہ دوسرے گروہ کی نظر میں صواب پر ہے یا کفر پر ہے؟ کیا ہر فرقہ والے اپنے فرقہ والوں کو جنتی اور دوسرے فرقہ والوں کو جہنمی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ہم ان سارے سوالوں کا جواب قارئین پر چھوڑتے ہیں جو رائے ان کی وہی ہماری۔ ہاں گروہ بندی کا یہ مرض اتنا مذموم ہے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی مذمت کی گئی ہے لہٰذا چند مقامات ملاحظہ فرمالیں۔

گروہ بندی اختیار کر کے شرک مت کرو

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ

حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (الروم ۳۰ : ۳۱، ۳۲) "اے مومنو! اس کی طرف رجوع رہو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہو جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے پھر ہر فرقہ اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔"

تم سب ایک امت ہو مختلف گروہ بندیاں مت بناؤ

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (الانبیاء ۲۱: ۹۲، ۹۳) سب رسولوں کے ذریعہ جو تعلیم دی تھی وہ یہ تھی کہ "یہ تم سب کی امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تم سب کا پروردگار ہوں۔ پس چاہئے کہ میری بندگی کرو اور الگ الگ گروہوں میں تقسیم مت ہو لیکن لوگوں نے آپس میں اختلاف کر کے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور انجام کار سب کو ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔"

ایک دوسرے سے کٹ کر الگ الگ مت ہو جاؤ

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (المومنون ۲۳ : ۵۲، ۵۳) "اور دیکھو یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں پس انکار و بدعمل کے نتائج سے ڈرو۔ لیکن لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کٹ گئے اور الگ الگ ہوگئے اور اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اب جو جس کے پلے پڑ گیا ہے وہ اسی میں مگن ہے۔"

اختلاف کرنے والوں کو قیامت کے روز معلوم ہوگا کہ انہوں نے کیا کیا؟

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (یونس ۱۰ : ۹۳) "اور ہم نے بنی اسرائیل کو بسنے کا بہت اچھا ٹھکانہ دیا تھا اور پاکیزہ چیزوں سے ان کی روزی کا سامان کر دیا تھا پھر جب کبھی انہوں نے دین حق کے بارے میں اختلاف کیا تو علم کی روشنی ضرور ان پر نمودار ہوگئی لیکن پھر بھی وہ حقیقت پر متفق نہ ہوئے قیامت کے دن تمہارا پروردگار ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔"

علم آنے کے بعد آپس میں اختلاف کرنے والوں کا انجام

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (الجاثیۃ ۴۵ : ۱۶، ۱۷) "اور آپ ﷺ کی امت سے پہلے ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت بخشی تھی اور پاکیزہ رزق عطا کیا تھا اور ان کو تمام عالم پر فضیلت بھی دی تھی اور یہ بھی کہ ہم نے ان کو دین کے نہایت واضح احکام دیئے تھے پھر انہوں نے علم کے آنے کے بعد آپس کی ضد سے اختلاف کیا بے شک آپ کا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن جن امور میں وہ جھگڑتے تھے

فیصلہ کر دے گا۔"

اے پیغمبر اسلام! دین میں تفرقہ ڈالنے والوں سے آپ ﷺ کو کچھ سروکار نہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (الانعام ۶ : ۱۵۹) "اے پیغمبر اسلام! جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ وہ کرتے رہے اس کی حقیقت کیا تھی؟"

مختصر آپ یوں سمجھیں کہ پیروان مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دین میں تفرقہ ڈال کر الگ الگ گروہ بندیاں اور باہم دگر مخالف جتھے بنا لئے نتیجہ یہ نکلا نجات و سعادت کا دارومدار ایمان و عمل پر نہ رہا بلکہ گروہ بندیوں پر آٹھہرا پس فرمایا کہ جن لوگوں کا شیوہ یہ رہا ہے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ وہ نہ تیرے اور نہ تو ان کا۔ ہاں آپ ﷺ ان کی جس بات کی تصدیق کرتے ہیں وہ اصل دین ہے نہ کہ ان کی بنائی ہوئی گروہ بندیاں۔

وہ دن کیسا ہوگا جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ نظر آئیں گے؟

۲۰۵ اس آیت میں دونوں جگہ "وجوہ" کی تنوین ہے اور تنوین مضاف الیہ کے عوض میں بھی آتی ہے اور تنوین تکثیر کے لئے بھی۔ کوئی ایک مراد لی جائے یا دونوں مطلب ہر لحاظ سے واضح اور صاف ہے۔ اگر مضاف الیہ کی تنوین ہو تو ترجمہ ہوگا "نیکو کاروں کے چہرے سفید ہوں گے اور بدکاروں کے چہرے سیاہ ہوں گے" اور اگر تکثیر کے لئے ہو تو ترجمہ ہوگا "اس روز بہت سے چہرے سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ ہوں گے یا کتنے ہی چہرے سفید ہوں گے اور کتنے ہی چہرے سیاہ ہوں گے۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اہل سنت کے چہرے گورے ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے کالے ہوں گے۔ چہروں کا گورے (سفید) یا کالے (سیاہ) ہونے کا مطلب کیا ہے؟ سفیدی اور سیاہی رنگوں میں ہوگی یہ تو عام ہے لیکن عزت و ذلت پر بھی ان الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ عربوں کے محاورہ میں بھی وہ شخص جو کسی عیب سے آلودہ نہ ہو اس کو "ابیض الوجہ" یعنی سفید چہرہ والا کہتے ہیں۔ مفسرین نے مونہوں کی سفیدی کے معنی "خوشی" اور سیاہی سے مراد "غم" لیا ہے اور قرآن کریم نے خود بھی اس محاورہ کو دوسری جگہ خود استعمال کر کے ساری بات کی وضاحت فرما دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ ○ یَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ (النحل ۱۶ : ۵۸، ۵۹) "جب ان لوگوں میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مارے رنج کے اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ غم میں

ڈوب جاتا ہے جس بات کی اس کو خوشخبری دی گئی ہے وہ گویا ایسی برائی کی بات ہوئی کہ. شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔"

یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہو وہ سیاہ رنگ ہی کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو جب بیٹی کی خوشخبری دی گئی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا مطلب یہ ہے کہ وہ خبر سنتے ہی مغموم ہوگیا۔ بلکہ یہ محاورہ اردو میں بھی عام بولا جاتا ہے کہ فلاں نے "منہ کالا کر لیا" یعنی وہ گناہ میں آلودہ ہوگیا۔ پھر فطرۃً بھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا چہرہ چمک دمک اٹھتا ہے اور اگر کوئی چور چوری کرتے پکڑا جائے تو وہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا یعنی مردنی سی چھا گئی ہشاش بشاش دکھائی نہیں دیتا۔

جب کسی پر کوئی الزام لگایا جاتا ہے تو اگر وہ مجرم ہو تو اس کے چہرہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے جرم کیا ہے اور اگر غلط الزام لگایا گیا ہو تو بھی اس کا چہرہ عام طور پر چہرہ شناسوں کو بتا دیتا ہے کہ اصل صورت حال کیا ہے۔ آیت زیر نظر میں ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے خواہ مخواہ اختلاف کر کے لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے کا کام سر انجام دیا ہے یا دے رہے ہیں ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور جن لوگوں نے لوگوں کو اختلاف ختم کر کے ایک جسم و جان ہونے کی دعوت دی اور گروہ بندی سے روکنے کی کوشش کی ان کے چہرے سفید ہوں گے۔ آیئے اب قرآن کریم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ارشاد فرماتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (العبس ۸۰ : ۳۸، ۴۲) "کتنے ہی چہرے اس دن نور ایمان سے منور ہوں گے۔ ہشاش بشاش، خوش و خرم (یہ نیکو کاروں کی جماعت ہوگی) اور کتنے ہی چہرے اس دن غبار آلودہ ہوں گے۔ جن پر سیاہی چھائی ہوگی۔ یہی لوگ کافر و بدکار ہوں گے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (الغاشیة ۸۸ : ۲، ۵)

"کتنے ہی چہرے اس دن اپنی بداعمالیوں کے باعث ذلیل و خوار ہوں گے۔ دنیا میں یہ لوگ بلا ایمان کے محنت کرنے والے تھے لیکن آخرت میں تھکے ہوئے خستہ حال ہوں گے۔ یہ لوگ دھکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ ان کو کھولتے ہوئے چشمہ سے پانی پلایا جائے گا۔" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (الغاشیة ۸۸ : ۸ تا ۱۱)

"کتنے ہی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے نیک اعمال سے وہ خوش ہوں گے۔ یہ عالی شان جنت میں ہوں گے۔ جس میں وہ کوئی فضول بات نہ سنیں گے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (القیمة ۷۵ : ۲۲، ۲۵)

وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ۖ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ

گے۔ سو جن لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے ان سے اس دن کہا جائیگا کہ تم نے ایمان کے بعد پھر انکار حق کی راہ اختیار کرلی تھی تو جیسی کچھ تمہاری منکرانہ چال تھی اب اس کے نتیجہ میں عذاب کا مزہ چکھ لو۔ ۱۰۶

اور جن لوگوں کے چہرے چمک رہے ہوں گے سو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت

"کتنے چہرے اس روز تروتازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کے دیدار میں محو ہوں گے۔ اور کتنے ہی چہروں پر اس دن غم سے اداسی چھائی ہوگی۔ وہ خیال کرتے ہوں گے کہ ان پر ایسی سختی ہوگی جو ان کی کمر توڑ دے گی۔"

ان آیات کے پیش نظر اس بات میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ زیر نظر آیت میں جن چہروں کے گورے ہونے کا ذکر ہے وہ وہی لوگ ہیں جو قوم کے اختلاف و افتراق کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے اور وحدت قوم کا درس دیتے رہے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینے کی تلقین کرتے اور جن چہروں کے سیاہ ہونے کا ذکر ہے وہ وہی لوگ ہیں جو اختلاف ڈال کر گروہ گروہ متفرق ہوئے اور تفریق بین المومنین کے مرتکب ہوئے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا کر اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کرتے رہے۔

جن لوگوں کے چہرے بداعمالیوں کی وجہ سے سیاہ ہوں گے ان کی سزا کا اعلان الٰہی

۱۰۶ آیت کے اس حصہ میں ان لوگوں کی سزاؤں کو بیان کیا جا رہا ہے جن لوگوں نے قوم میں اختلاف ڈال کر اس کو متفرق کر دیا یا ان کے چہرے اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے قیامت کے دن سیاہ پڑ گئے۔ چہروں کا سیاہ ہونا خود ہی کوئی کم سزا نہ تھی ان سے مزید کہا جا رہا ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کے بعد پھر تم نے قطعی دلائل کا انکار کیا اور دین میں تفرقہ کیا اور طرح طرح کے اختلاف کے پیچھے پڑ گئے پس اب اپنے اس کفر کرنے کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ آیت اس امت اور گزشتہ امتوں کے بد عنیتوں کے حق میں نازل ہوئی۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوامامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ خارجی ہیں لیکن حضرت اسماء کی روایت کردہ حدیث بتا رہی ہے کہ اس آیت میں اہل الرائے مراد ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حوض پر دیکھتا رہوں گا کہ کون کون میرے پاس آتا ہے کچھ

وُجُوهُهُمْ ۚ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ
آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا

۲۰۷ کے سائے میں ہوں گے ہمیشہ رحمت الٰہی میں رہنے والے۔ ۱۰۷

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تمام دنیا

لوگ مجھ سے پرے ہی پکڑ لئے جائیں گے یعنی ان کو حوض پر نہیں آنے دیا جائے گا میں کہوں گا اے رب! یہ تو میرے ہیں کیونکہ میری امت کے افراد ہیں جواب دیا جائے گا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کیا؟ خدا کی قسم یہ برابر اپنی ایڑیوں کے بل تمہاری ہدایت سے لوٹتے رہے (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان فتنوں سے پہلے عمل کر لو جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح آئندہ چھا جائیں گے صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر۔ شام کو کافر ہوگا اور صبح کو مومن۔ دین کو دنیا کے حقیر سامان کے عوض بیچ ڈالے گا۔ (رواہ احمد و مسلم والترمذی)

اور علاوہ ازیں بھی اس آیت کے شان نزول میں روایات بیان کی گئی ہیں۔

جن کے چہرے گورے ہوں گے ان کا مختصر حال

۲۰۷ جن لوگوں کے چہرے سفید یعنی گورے ہوں گے نیک اعمال کرنے والے اور لوگوں کے درمیان اختلاف کو مٹانے والے اور مسلمانوں کو اللہ کی رسی کو مضبوط تھامنے کا درس دینے والے "فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ" وہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت یعنی جنت اور لازوال ثواب و اجر میں ہوں گے اس جگہ جنت کی تعبیر لفظ رحمت کے ساتھ کرنے سے اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مومن کی چاہے پوری عمر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف ہوئی ہو مگر جنت میں اس کا داخلہ اللہ کی رحمت اور فضل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راستی اختیار کرو اور درمیانی رفتار سے چلو اور خوش رہو کیونکہ جنت کے اندر کسی کو صرف اس کے اعمال نہیں لے جائیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی؟ فرمایا ہاں مجھ کو بھی اللہ اپنی مغفرت اور رحمت سے مجھ کو ڈھانک لے گا۔ (مسلم و بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں کسی کو صرف اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ دوزخ سے بچائے گا اور نہ مجھے سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے۔

یاد رہے کہ جنت میں مختلف مدارج و مراتب ہیں بلند سے بلند درجات تک پہنچنا بھی جنت ہی میں پہنچنا

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى

پر ظلم کرنے والا ہو جائے۔ ۲۰۸ ۱۰۸

اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لئے ہے اور ساری باتیں بالآخر

ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کے سہارے بلند سے بلند مقامات پر آدمی فائز ہو سکتا ہے۔ یہ الفاظ اس طرح بیان کئے گئے اور دراصل اس سے مراد جنت کے بلند درجات تک پہنچنے سے ہے کہ جنت کے بلند مقامات پر پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل ہی شامل حال ہونا چاہئے ورنہ ان مقامات پر پہنچنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں خواہ وہ کوئی ہو۔ یہ اس لئے بیان کرنا پڑا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اس آیت میں اعمال کو جنت کے داخلہ کا سبب بتایا گیا ہے اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو تو انسان نیک اعمال کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا اپنا نفس بھی نیک کاموں کے راستہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جس کو نیک عمل کی توفیق دی گئی اس نے خیر کثیر حاصل کر لی۔ کیونکہ کسی شخص کا نیک اعمال کرنا بھی اس وقت ممکن ہے جب اللہ کا فضل شامل حال ہو۔

آخر میں فرمایا کہ "هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت یا جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ مستقل جملہ ماقبل کی تاکید بھی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ رحمت یعنی ابتدائی داخلہ مستقل نعمت ہے اور جنت کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کا قیام ایک الگ مستقل نعمت ہے کہ چمڑی بھی اور دو دو بھی ہوں تو پھر کیا ہی بات ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم ہی سے ہو سکتا ہے کسی انسان کے اختیار کی بات نہیں۔

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے وہ کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا

۲۰۸ اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہمیشہ عادلانہ اور حکیمانہ ہی ہوتے ہیں۔ اس نے انسانوں پر حق کھول کھول کر بیان فرما دیا اب جو کچھ کوئی کرے گا اس کا نتیجہ پائے گا یہ اس لئے کہ اسلام کا الٰہ تمام تر رحیم ہے' عادل ہے' شفیق ہے۔ مشرک قوموں کے دیوی دیوتاؤں کی طرح ظالم و خونخوار نہیں ہے۔ قرآن کریم بار بار اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کا اثبات ان صفات ذمیمہ سے ضروری سمجھتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ دوسرے مذاہب میں اللہ تعالیٰ کی صفات قہری بہت ہی زیادہ زور و قوت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ "بالحق" اے بالصدق یعنی بالکل صحیح جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے معاملات میں کبھی ظلم نہیں کرتا کہ نیکی کرنے والوں کا ثواب کم کر دے یا بالکل ثواب نہ دے یا جرم کرنے والوں کی سزا کو جرم کی مقدار سے بڑھا دے ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں معاف کر سکتا ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے اس طرح نیکی کی جزا کئی گنا بڑھا کر عطا فرما دے اور کفر چونکہ

اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ

اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ ۲۰۹ ۱۰۹

تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے ظہور میں آئی ہے۔ ۲۱۰ تم

سب سے بڑا گناہ ہے اس لئے اس کا عذاب بھی سارے گناہوں کے عذاب سے زیادہ اور دائمی ہوگا۔

ہر شے کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے

۲۰۹ آسمان ہو یا زمین کا خلا حتیٰ کہ زمین کے نیچے تحت الثریٰ ان میں جو کچھ ہے سب کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے کہ وہی ان سب چیزوں کا خالق ہے اور ہر چیز اسی کی ملک ہے۔ اور کوئی دیوی دیوتا، نبی، ولی اور پیر فقیر اس کا شریک و سہیم نہیں جس طرح جاہلی قومیں سمجھتی ہیں اور ان سے مرادیں مانگتی ہیں۔ یہ اس لئے ارشاد فرمایا اور قرآن کریم میں اس کی بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے کیونکہ یہی وہ نظریہ ہے جو ہر طرح کے شرک کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے لیکن افسوس کے انسان کو یہی بات سب سے زیادہ بھول جاتی ہے۔ پھر فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سارے کام لوٹائے جائیں گے" یعنی ہر کام کو قبول و مردود بھی وہی کرتا ہے اس لئے وہاں کسی کے واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ وہ علیم کل ہے کسی کے کہنے سے قبول ہونے والے کو مردود یا مردود ہونے والے کے قبول نہیں کرتا۔ ہر ایک فیصلے پر اس کے ہاں اپیل ہو سکتی ہے لیکن اس کے فیصلے پر کہیں اپیل دائر نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اگر وہ کسی کو پکڑ لے تو کوئی اس کو چھڑا نہیں سکتا اور وہ کسی کو چھوڑ دے تو کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا۔

تم صحیح معنوں میں ایمان لانے والے اور اچھے عمل کرنے والے ہو تو تم ہی بہتر امت ہو

۲۱۰ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی امت سے خطاب ہے اور ملت اسلامی ہی مخاطب کی جا رہی ہے کہ "تم تمام امتوں میں سے بہتر امت ہو۔" روایات میں آتا ہے کہ مالک بن الضیف اور وہب بن یہود نے جو یہودی تھے انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ سے کہا کہ ہم تم سے افضل ہیں اور ہمارا مذہب اس دین سے بدرجہا بہتر ہے جس کی دعوت تم ہم کو دیتے ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی "خیر" صفت ہے اور "امت" موصوف۔

"کنتم" ماضی ہے "یعنی تم بہترین امت تھے۔" کیا اب بہترین امت نہیں؟ جواباً عرض کہ "کان" کا استعمال عربی زبان میں کوئی طرح پر ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانہ پر بھی بولا جاتا ہے اور ایک وصف کو لازم و ضروری کرنے کے لئے بھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے بیان میں جہاں اس کا استعمال ہوگا تو ازلیت ہی کے لئے ہوگا۔ جیسے كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ "اللہ ہر چیز کا جاننے

والا تھا" اور اب نہیں ہے کان اللہ غفوراً رحیماً "اللہ غفور و رحیم تھا" اب نہیں۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا تھا۔ ہے اور رہے گا۔ جس کا صاف معنی یہی ہے کہ "اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے" اور یہ لازم ہے کہ جو زمانہ بھی آئے گا اللہ جاننے والا ہی رہے گا۔ کبھی یہ صفت اس سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ اور اسی طرح جب کسی شے کی جنس میں اس کے وصف کے متعلق استعمال کیا جائے جو اس میں موجود ہو تو یہ ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ یہ وصف اس میں لازم ہے جیسے كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۔ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۔ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا اور مطلب یہ ہے کہ "انسان ناشکر گزرا ہے" ۔ "انسان جلد باز ہے"۔ انسان اکثر جھگڑالو ہے۔ اسی طرح اس جگہ بھی حال کے معنی ہیں یعنی "تم بہترین امت ہو" ہاں! یہ بھی احتمال ہے کہ امت اسلامیہ کے خیر الامم ہونے سے مراد یہ ہو کہ تم علم الٰہی میں خیر الامم تھے یا ذکر کرتے وقت گزشتہ اقوام میں تم خیر الامم تھے۔

"اُخْرِجَتْ" خرج کے معنی ہیں اپنی قرارگاہ یا اپنی حالت سے ظاہر ہوگیا یا نکل آیا خواہ اس کی قرار گاہ گھر ہو، شہر ہو، لباس ہو اور خواہ اس کا حال۔ اپنے نفس میں اس کی کوئی حالت ہو یا اسباب خارجی میں (راغب) اخرجت اے اظھرت یعنی ظاہر کئے گئے۔

"للناس" میں لام انتفاع کے لئے ہے یعنی "تمہارا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے۔" اس لئے آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں نیکیاں کرنا نیکیوں کی تعلیم دینا اور نیکیوں پر لوگوں کو لگانا اور قائم رکھنا اور بدیوں سے رکنا اور روکنا ہے۔ اس لئے تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" کو جو کمال نفس کا مرتبہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جو دوسروں کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے پیچھے رکھا ہے۔ کیونکہ اصل غرض اس جگہ یہی ظاہر کرنے کی ہے کہ تمہارا کام دوسروں کی تکمیل ہے اور جملہ "تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" سے ان کے لئے اپنے کمال نفس کا ذکر اس لئے کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کو نہیں کہتے جو خود نہ کرتے ہوں بلکہ وہ دوسروں کی تکمیل چاہتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنے نفس کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے اور یہ بات اپنی جگہ صحیح اور درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ سارے زمانوں سے افضل و اعلیٰ تھا اور پھر جتنا قرب اس زمانہ کو رسول اللہ ﷺ سے رہا اتنا ہی وہ دوسرے زمانہ سے افضل رہا اور یہی بات وصف میں بھی ہے کہ جو شخص اپنے اوصاف کے لحاظ سے اپنے رسول اللہ ﷺ کے قریب رہا اتنا ہی وہ بہتر بھی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد اس طرح ہے کہ "میری امت کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کی معلوم نہیں کہ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا آخری حصہ" اور یہ حدیث ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے ہے لیکن اول تو اس جگہ "کان" کا استعمال اس کے خلاف ہے دوسرے کوئی وجہ اس قید کی نہیں بتائی جا سکتی تیسرے حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ

بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ

نیکی کا حکم دینے والے' برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو[۲۱۱] اور اگر

ساری امت کو ہی "خیر الامم" کہا گیا ہے۔ چنانچہ احمد رحمہ اللہ نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ قال رسول اللّٰہ ﷺ اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء نصرت بالرعب واعطیت مفاتیح الارض وسمیت احمد و جعل التراب لی طھوراً وجعلت امتی خیر الامم (رواہ احمد) "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ میری نصرت رعب سے کی گئی اور مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے۔ میرا نام احمد رکھا گیا۔ میرے لئے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی اور میری امت بہترین امت بنائی گئی۔" اس حدیث کی تشریح اور اس کا مفہوم اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب علم کو اس طرف توجہ دلا دے یہ میری دعا ہے۔

بلاشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اس امت میں سے بھی بہترین گروہ ہے اور اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے کہ فرمایا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ لیکن یہاں ساری امت کی افضلیت کا دوسری امم پر ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب اس امت کا معلم اور مزکی محمد رسول اللہ ﷺ دین کے تمام معلموں اور مزکیوں سے اعظم و افضل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ﷺ کے شاگرد تمام انبیاء کے شاگردوں سے اعظم و افضل نہ ہوں۔ اور آپ ﷺ کی امت تمام امتوں سے اعظم و افضل نہ ہو اور یہ جو کچھ ہے سب آپ ﷺ ہی کے نقش قدم سے ہے۔

مذکورہ فضیلت کس بات اور کس صلہ میں ہے؟

[۲۱۱] فرمایا تمہاری یہ افضلیت اس صلہ میں ہے کہ "تم نیکی کا حکم دینے والے' برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو" مطلب واضح ہے کہ یہ امت دنیا کے تمام لوگوں کی بھلائی کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ بھلائی دنیوی ہو یا اخروی۔ ہر ایک نبی کی امت زیادہ تر اپنی قوم کی بہتری میں ہی کوشاں رہی مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے قومیّت کا نشان مٹا کر ان تمام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے قرار دیا گیا۔ وہ صرف مسلمانوں ہی کا بھلا نہیں چاہتے بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کے لوگوں کا بھلا چاہنے والے ہیں۔ قومی تفرقوں کو اسلام نے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا اور قومی تفرقہ ڈالنے والوں کو امت اسلامیہ سے الگ کر دیا۔ دوسری وجہ ان کی اصلیت کی ان کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونا ہے یعنی بھلائیاں کرنے کے ساتھ ساتھ بھلائیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے خود رکنے والے اور دوسروں کو روکنے والے ہیں۔ اور یہ وہی کام ہے جو انبیاء کرام کرنے کے لئے دنیا میں آتے رہے۔ اب جب نبوت نبی اعظم و آخر ﷺ پر ختم کر دی گئی تو یہ کام

اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ

اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو یہ ان کے لئے بہتری کی بات ہوتی[۲۱۴]۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان رکھنے والے ہیں لیکن بڑی تعداد انہی لوگوں کی ہے جو دائرہ ہدایت سے

آپ ﷺ کی امت کے ذمہ لگا دیا گیا اور اس کی تصدیق نقل سے بھی کرا دی اور عقل سے بھی۔

بلاشبہ یہ کام دوسرے انبیاء کرام کی امتیں بھی کرتی رہی تھیں مگر ان کا کام محدود تھا اور ہر لحاظ سے محدود تھا۔ پھر ان کے اندر وقتاً" فوقتاً" انبیاء کی بعثت بھی ہوتی رہی تھی اب نبوت کے ختم کر دینے کے بعد یہ انبیاء کرام والا کام پہلے سے کہیں زیادہ اور نہایت ہی وسیع پیمانہ پر اس امت کے ذمہ لگا دیا گیا۔ کل دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کرنا اور سب کا یکساں تزکیہ کرنا یہ وہ عظیم الشان کام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کسی نبی کی امت کے ذمہ نہیں لگایا گیا تھا۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں اس وجہ سے افضیلت کو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیا گیا۔ تفصیل کے لئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۱۴۳۔

کیا اس دعویٰ پر کوئی دلیل بھی ہے؟

جب کوئی دعویٰ بغیر دلیل ثابت ہی نہیں ہوتا تو اس دعویٰ پر دلیل کیوں نہیں ہوگی ضرور ہوگی اور ہے۔ پھر اتنی سچی اور اتنی پکی کہ زمین و آسمان سے زیادہ وزنی اور سورج سے بھی زیادہ روشن۔ غور کرو کہ جس ردی حالت میں نبی اعظم و آخر ﷺ نے عربوں کو پایا کیا بلحاظ عقائد اور کیا بلحاظ اعمال اور کیا بلحاظ جہالت۔ ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کی اصلاح کے لئے نہیں دی گئی۔ مگر باوجود ایسی ردی حالت میں پانے کے نبی کریم ﷺ کی قوت قدسی نے ان کو ایمان اور عملی پہلو کے لحاظ سے تعلیم و تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی امت کو اس مقام تک نہیں پہنچایا۔ وہ نہ صرف زہد و عبادت اور تقویٰ و پرہیزگاری میں تمام دنیا کی قوموں سے آگے بڑھ گئے بلکہ ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ہر پہلو میں دنیا کے ہادی و رہبر بن گئے۔ کیا فتوحات ملکی کے لحاظ سے اور کیا سیاست کے لحاظ سے۔ کیا تمدن و معاشرت کے لحاظ سے اور کیا علوم و فنون کے لحاظ سے۔ کیا تہذیب کے لحاظ سے اور کیا آزادی خیال کو قائم کرنے کے لحاظ سے۔ کیا ایجادات کو ایجاد کرنے کے لحاظ سے اور کیا مساوات نسل انسانی کے قائم کرنے کے لحاظ سے۔ پھر سوچ لو کہ اس دعویٰ پر اس سے زیادہ بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

دوسروں کی فکر کا نچوڑ الفاظ کی صورت میں

[۲۱۴] یہ بات جو شروع کی تھی جوں جوں آگے بڑھتی گئی مزید صاف ہوتی گئی۔ اس امت کی نشانی یہ

أَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱۱۰﴾ لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ

یکسر باہر ہو چکے ہیں۔ ۲۱۳ ۱۱۰

وہ مخالفت کر کے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر وہ جو تم کو دلی اذیت ۲۱۴ ہوگی اگر وہ تم

بتائی گئی تھی کہ یہ دوسروں کی فکر رکھنے والی امت ہے اور ان الفاظ نے اس کی مزید تصدیق کر دی فرمایا "اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو یہ ان کے لئے بہتری کی بات ہوتی۔" اہل کتاب کا لفظ ویسے تو بہت وسیع معنی رکھتا ہے مگر اکثر جگہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کو اس سے خطاب کیا ہے بعض جگہ صرف یہودیوں کو اور بعض جگہ صرف عیسائیوں کو بھی اس سے مخاطب کیا ہے۔ مثلاً يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (النساء ۴ : ۱۷۱) اور اس زیر نظر آیت میں صرف یہودی مراد ہیں اور اس طرح کے خطابات اور جگہوں پر بھی ہیں۔ ان یہود کو خاص کر کیوں مخاطب کیا گیا؟ اچھے طبیب و ڈاکٹر کی یہ نشانی ہے کہ اس کے پاس بیک وقت جب بہت سے مریض آجائیں تو سب سے پہلے توجہ اس پر دے گا جو سب سے زیادہ خطرناک حالت میں ہوگا جبکہ اس کے بچنے کی اس کو کچھ بھی امید ہو۔ جب نبی اعظم و آخر ﷺ کی بعثت ہوئی تو ساری قوموں میں سے زیادہ خطرناک امراض میں مبتلاء اہل کتاب میں سے یہودیوں کی جماعت ہی تھی۔ اس لئے آپ ﷺ کو ان کی زیادہ فکر لاحق تھی۔

علاوہ ازیں اب اس سورۃ کے مضامین کو جنگ احد کے واقعات کی طرف لانا ہے اور ان جنگوں میں ہمیشہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو زیادہ خطرہ رہتا تھا کیونکہ ایک بڑی یہودی آبادی مدینہ منورہ میں موجود تھی اس لئے جنگ کی تمہید میں ان کے تعلقات کا ذکر کر دیا ہے کہ کاش! یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں بہت اجر و ثواب ملتا اور وہ امت مسلمہ میں شامل ہو کر ان انعامات کے مستحق قرار پاتے جن کا ذکر اوپر ہوتا چلا آرہا ہے۔

ہاں ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں لیکن زیادہ تعداد شریروں ہی کی ہے

۲۱۳ اور پھر آخری جملہ میں ارشاد فرمایا "ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان رکھنے والے ہیں لیکن بڑی تعداد انہی لوگوں کی ہے جو دائرہ ہدایت سے یکسر باہر ہو چکے ہیں۔" کیوں؟ اس لئے کہ ان کا کام مخالفت برائے مخالفت ہے۔ حق ناحق کی پہچان نہیں۔ کمالات اسلامی میں سے ایک کمال اس کا یہ بھی ہے کہ وہ کسی قوم کو من حیث القوم برا یا اچھا نہیں کہتا بلکہ ہر اچھا کرنے والے کو اچھا اور ہر برا کرنے والے کو برا کہتا ہے خواہ وہ کوئی ہو۔ قوم یہود کی ساری مخالفتوں کے باوجود اگر ان میں اتنی تعداد بھی نیک لوگوں کی ہے جتنا آٹے میں نمک تو وہ ان کی نیکی کا اعتراف کرتا ہے اور یہی اس نے اس جگہ بیان فرمایا کہ ان میں ایمان والے بھی ہیں

اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم ہیں اور حقیقت حال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر یعنی زیادہ تر فاسق یعنی حدود سے تجاوز کرنے والے اور حد عبودیت سے باہر نکل جانے والے ہیں۔

یاد رہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام جو نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ کرام میں سے ایک ہیں اس یہودی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایمان لے آئے تھے اس لئے "مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ" کے الفاظ اس صداقت کا اعلان کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵: ۶۵، ۶۶) "اور اگر اہل کتاب ایمان رکھتے اور پرہیزگار ہوتے تو ہم ضرور ان پر ان کی خطائیں محو کر دیتے اور ضرور انہیں نعمت کی جنتوں میں داخل کر دیتے۔ اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو کچھ ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا اسے سچائی کے ساتھ قائم رکھتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی کہ آسمان ہے اور ان کے قدموں کے نیچے سے بھی کہ زمین ہے انہیں برکت ملتی۔ ان میں سے ایک گروہ ضرور میانہ رو ہے لیکن زیادہ ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں برائی ہی برائی ہے۔"

اور ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (الاعراف ۷: ۹۶) "اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور ان پر کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا پس اس کمائی کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل کی تھی ہم نے انہیں پکڑ لیا اور وہ مبتلائے عذاب ہوگئے۔" جو ان کے اپنے ہی کئے کا نتیجہ تھا۔

ان کی مخالفت سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا' ایک پیش گوئی کا اعلان

۲۱۴ اس آیت کی تین پیش گوئیوں میں سے ایک پیش گوئی ہے جو اس وقت کی گئی جب ابھی یہود پوری طاقت اور قوت کے ساتھ مدینہ منورہ اور مضافات مدینہ میں رہ رہے تھے۔ اس وقت ابھی ان کا مدینہ اور حوالی مدینہ میں بڑا زور اور غلبہ تھا۔ قرآن کریم میں نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اعلان کروا دیا کہ یہود اپنے بڑے بڑے اور مضبوط قلعوں کے باوجود اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمانوں کو ہرگز کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور یہ اعلان گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ جاوید معجزہ ہے جو آج بھی زندہ موجود ہے اور قیامت تک زندہ و تابندہ رہے گا اور اس کو غلط ثابت کرنے والے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے اور اس کی صداقت دنیا دیکھتی آئی ہے اور دیکھتی رہے گی۔

يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

سے لڑیں گے تو انہیں لڑائی میں پیٹھ دکھانی پڑے[۲۱۵] گی وہ کبھی فتح مند نہ ہوں[۲۱۶] گے۔ ۱۱۱

ان لوگوں پر ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے[۲۱۷] گئے یعنی یہود۔ ہاں! یہ کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو۔ اللہ کا غضب ان پر چھا گیا،

ہاں! ان کا معمولی دکھ دینا۔ وہ بھی اس لئے کہ جب مسلمان قوم سونے لگے تو اس کو پھر جگا دیا جائے۔

اذی حیض کے خون کو بھی کہا گیا ہے۔ اس لئے ان دنوں کو جو عورت کے لئے حیض کے دن ہوتے ہیں اذیت کے دن کہا جاتا ہے۔ اس میں معمولی تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ معمولی تکلیف ایک بہت بڑی خوشخبری کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس معمولی تکلیف کے نہ ہونے سے نسوانی زندگی زندگی نہیں بلکہ موت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے اس تکلیف کا ہونا بھی باعث برکت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا ہوتے رہنا ہی بہت بڑے ضرر سے بچاؤ ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی اس طرح بیان ہوا ہے:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (ال عمران ۳: ۱۸۶) "مسلمانو! ایسا تو ضرور ہوتا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں لیکن اگر تم نے صبر کیا یعنی ان مصیبتوں میں ثابت قدم رہے اور تقویٰ کا شیوہ اختیار کیا یعنی احکام حق کی نافرمانی سے بچتے رہے تو بلاشبہ بڑے کاموں کی راہ میں یہ بڑے ہی عزم و ہمت کی بات ہے۔"

عالم دنیا میں اس وقت جو مسلمانوں کو حالات پیش آرہے ہیں ان سے کہیں زیادہ خطرناک حالات سے پہلے گزارے جا چکے ہیں غیر مسلم مل کر جو ریشہ دوانیاں اس وقت کر رہے ہیں اس سے کہیں بہت بڑھ کر وہ پہلے کر چکے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنے مسلمان موجود ہیں اتنے اس سے پہلے کبھی نہیں تھے جو وسائل اور خزائن اس وقت عالم اسلام کے پاس موجود ہیں وہ اس وقت نہیں تھے۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا ایمان و عزم اتنا پختہ تھا کہ وہ قرآن کریم کی آیت پڑھتے تھے تو ان کے دل اتنے مطمئن ہو جاتے تھے اور وہ جس میدان میں اترتے تھے سچے دل اور پوری ایمانی قوت سے اترتے تھے۔ اس وقت بھی اگر قوم مسلم اس عزم و ہمت اور ایمانی قوت سے کام لے اور اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی ان آیات محکمات کو دل و جان سے قبول کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو نیچا نہیں دکھا سکتی اور نصرت

الٰہی آج بھی اس کی اسی طرح مددگار ثابت ہوگی جیسی کہ صدر اول میں مددگار ہوئی تھی۔

آگے چل کر ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (اٰل عمران ۳ : ۱۲۰) "یاد رکھو اگر تم نے صبر کیا یعنی مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کی یعنی احکام الٰہی کی نافرمانی سے پوری طرح بچتے رہے تو ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے گا جیسے کچھ بھی ان کے کرتوت ہیں خدا کی قدرت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔"

یہود کے متعلق دوسری پیش گوئی کا اعلان خداوندی

۲۱۵ آیت زیر نظر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری پیش گوئی مسلمانوں کو یہ سنائی گئی کہ "اگر وہ تم سے لڑیں گے تو انہیں لڑائی میں پیٹھ ہی دکھانا پڑے گی۔" پوری دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ پیش گوئی بھی آج تک بحمد اللہ پوری ہوتی آئی ہے اور رہتی دنیا تک پوری ہوتی رہے گی۔ یہ آیت آج بھی للکار رہی ہے کہ کوئی ایک مثال ایسی بتا دو جہاں یہودیت نے اپنے سارے وسائل کے باوجود اسلام کے مقابلہ میں میدان جنگ میں کامیابی حاصل کی ہو۔ یاد یہ رکھنا ہے کہ اس آیت میں قوم یہود مخاطب ہے نصاریٰ نہیں۔

دوسری بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہود کے بالکل نیست و نابود ہو جانے کی پیش گوئی نہیں بلکہ یہود کے من حیث القوم دنیا میں موجود رہنے کی پیش گوئی ہے اور اعلان یہ کیا گیا ہے کہ یہود اپنی ساری طاقت اور ساری قوت خواہ وہ مالی ہو یا افرادی اسلام کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہاں! مسلمانوں کو ان سے معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فلسطین میں یہود آج سے نہیں بلکہ اسلام کے جنم لینے سے بھی ہزاروں سال پہلے سے آباد چلے آرہے ہیں۔ ان کی پوری تاریخ ان کی بزدلی ان کے جبن پر شہادت دے رہی ہے اور خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں آج بھی وہ مسلمانوں کی گروہ بندیوں اور فرقہ بازیوں کے باوجود مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور رہتی دنیا تک نہیں کر سکیں گے۔ نہ معلوم مسلمان بادشاہوں نے قرآن کریم کو کبھی دیکھا ہی نہیں پڑھا اور سنا ہی نہیں اس قدر وہ پست ہمت ہو چکے ہیں کہ وہ دوسرے غیر مسلموں کے سہارے ڈھونڈ رہے ہیں۔

انہی پیش گوئیوں کی بناء پر یہود آج بھی مسلمانوں سے خائف ہیں اور وہ نصاریٰ کے سہارے اپنے وجود کی بقاء چاہتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہے اور آج سے نہیں بڑی مدت سے جب سے اسلام نے اس سرزمین میں قدم رکھے کہ وہ بغیر کسی سہارے کے زندہ نہیں رہ سکتے یعنی من حیث القوم ان کا وجود کسی سہارے کے بغیر روئے زمین پر باقی نہیں رہ سکتا۔ دنیا گواہ ہے کہ پوری دنیا میں جتنی مال دار دنیوی وسائل رکھنے والی یہ قوم ہے کوئی اور قوم نہیں لیکن اس کے باوجود ان کو محمد رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیاں آج بھی اسی طرح ذلیل و خوار کئے ہوئے ہیں جیسا کہ ان پیش گوئیوں نے خود رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کو ذلیل و

خوار کیا تھا۔ لیکن مسلمان ہیں کہ وہ ان پیش گوئیوں کی روشنیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ نے عالم اسلام کو اکٹھا نہیں ہونے دیا اور ان کا جب تک بس چلے گا وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے لیکن قانون الٰہی اپنی جگہ پر اٹل اور ان مٹ شے ہے وہ کسی قوم کی ریشہ دوانیوں اور گٹھ جوڑ سے کبھی خائف نہیں ہوتا۔ حقیقت تو قادر مطلق ہی جانتا ہے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جو مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے وہ انہوں نے چھوڑ دیا تو اللہ کے پاس ایسی مخلوق کی کمی نہیں وہ جس سے چاہے گا کام لے لے گا لیکن اس کی پیش گوئیاں کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔ دعویٰ کیا ہے؟ کان کھول کر سن لو اور یاد رکھو دعویٰ یہ ہے کہ "اگر یہود تم سے لڑیں گے تو انہیں لڑائی میں پیٹھ دکھانی پڑے گی۔"

اس سلسلہ کی تیسری پیش گوئی جس کا اعلان اس آیت میں موجود ہے

۲۱۶ اس آیت میں جو تین پیش گوئیاں کی گئی ہیں ان میں سے تیسری یہ ہے کہ "وہ کبھی فتح مند نہیں ہوں گے" ظاہر ہے کہ اس فتح مندی سے وہی فتح مندی مراد ہے جو اسلام کے مقابلہ میں جنگ لڑ کر فتح حاصل کی جائے اور یہ آج تک نہیں ہوا اور آئندہ قیامت تک نہیں ہو سکے گا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں نصاریٰ نہیں۔ اس وقت مشرق وسطیٰ کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن اس کے باوجود جب بھی کوئی انسان ذرا گہرائی میں اتر کر تاریخ کا مطالعہ کرے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں زیادہ حصہ خود مسلمانوں کا اپنا ہے۔ مسلمانوں میں وہ دیانت و امانت نہ رہی جو ہونا چاہئے تھی۔ اسلام نے غیروں کی دوستی کے لئے جو کچھ کہا تھا وہ ہم کو یاد نہ رہا۔ اسلام نے جن باتوں سے منع کیا تھا ان سے ہم باز نہ رہے۔ اسلام نے سیاست دان کے لئے جو ہدایت دی تھیں ان کو ہم نے پس پشت ڈال دیا۔ پھر اس علاقے کے اندر جو اتار چڑھاؤ جو دوسروں کے سہارے ہوتا چلا آیا ہے وہ پورے عالم اسلام کے مقابلہ میں اذی تو ہو سکتا ہے لیکن ضرر نہیں۔ ان کو شرارتیں تو کہا جا سکتا ہے لیکن عالم اسلام کے ساتھ جنگ نہیں۔ مسلمانوں کی اپنی غداری تو اس کو کہا جا سکتا ہے لیکن یہود کی فتح مندی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس مضمون پر قرآن کریم کی مزید شہادتیں ایک نظر دیکھ لو اور ان پر اسی طرح ایمان رکھو جس طرح ایک مسلم کو قرآن کریم پر ایمان رکھنے کا حکم ہے اور غیروں پر نظر رکھنے کی بجائے قرآن کریم کی ان ہدایات پر نظر رکھو یقیناً یہی ہم سب کے لئے دین و دنیا میں کامیاب و کامران رہنے کا ایک نہایت پختہ اور نہ ٹوٹنے والا سہارا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الفتح ۴۸: ۲۲، ۲۳) "اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو یہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے۔ پھر وہ نہ کسی کو دوست پاتے اور نہ مددگار۔ اللہ کا یہ دستور پہلے سے چلا آرہا ہے اور آپ اللہ کی سنت میں کبھی فرق یعنی ردوبدل نہ پائیں گے۔

بلاشبہ آیت کا شان نزول صلح حدیبیہ کے متعلق ہے لیکن آیت کا حکم عام ہے کسی خاص واقعہ کی وجہ سے حکم عام کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد اس طرح ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ○ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ○ (الحشر ۵۹: ۱۱، ۱۴)

"تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ یہ کبھی بھی اکٹھے ہو کر کھلے میدان میں تمہارا مقابلہ نہ کریں گے لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت کے بڑے سخت ہیں تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔"

اس مضمون پر غور کرنے والوں کے لئے بہت سی راہنمائیاں ہیں اور تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

یہود مغضوب الٰہی ہو چکے ہیں ان پر ذلت کی مار ہی پڑے گی

۲۱۷ ذلت کیا ہے؟ ذلت محض محکومیت پر بولا جاتا ہے مگر انتہا اس کی یہ ہے کہ ایسی قتل و غارت ان پر واقع ہو کہ کسی حالت میں آرام نہ ملے۔ چونکہ محض محکومیت مسکنت میں بھی شامل ہے اس لئے اس جگہ انتہائی ذلت ہی مراد ہو سکتی ہے۔ خیال رہے کہ دعوت حق کی مخالفت میں سب سے زیادہ حصہ یہودیوں کا ہے۔ کیونکہ ان کا حال یہ ہے کہ اپنی بد عملیوں اور سرکشیوں سے مغضوب الٰہی ہو چکے ہیں اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کر رہے ہوں خواہ وہ فلسطین ہو یا کوئی دوسرا علاقہ۔ جہاں کہیں بھی ان کو پناہ ملی ہے وہ آخر دوسروں کے سہارے ہے اور یہی سب سے بڑی ذلت و نامرادی ہے یعنی یا تو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے یا پھر حکمران قوموں نے محکومیت اور اطاعت کے قول و قرار پر زندگی کی مہلت دے دی ہے۔ چنانچہ پہلی حالت عرب میں تھی اور دوسری روم و ایران میں۔ کہا جا رہا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ تم ان کی مخالفت سے پریشان خاطر ہو وہ وقت دور نہیں جب عرب میں بھی ان کی رہی سہی

وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا

محتاجی اور بدحالی میں گرفتار ہوگئے اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور نبیوں کے ناحق قتل میں بے باک تھے ان کی یہ حالت اس لئے ہوئی کہ وہ نافرمانی اور سرکشی کرنے لگے تھے اور شرارتوں میں حد سے گزر گئے تھے۔ ۲۱۸ ۱۱۲

ہاں! یہ بات نہیں ہے کہ تمام اہل کتاب ایک ہی طرح کے ہوں ان میں ایک

طاقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس جگہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ قرآن کریم محکومی کی حالت کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اس زمانے میں یہودی رومیوں کے ماتحت امن کی زندگی بسر کر رہے تھے اور عرب میں بھی ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں لیکن چونکہ حکومت و فرمانروائی سے محروم ہو چکے تھے اس لئے اس کو ذلت و رسوائی قرار دیا گیا۔ مسلمان اس بات کو یاد رکھتے تو ان کی حالت جو اس وقت دنیا میں ہے یقیناً نہ ہوتی۔

یہود کو دنیا میں زندگی کے دن گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی سہارا پکڑنا ضروری ہوگیا

۲۱۸ جہاں کہیں بھی یہ رہیں گے ان دو صورتوں میں سے ایک ضرور ہوگی یا تو وہ "حَبْلٌ مِّنَ اللّٰهِ" ہوں گے یا "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" رہیں اس کے علاوہ ان کے رہنے کی کوئی تیسری صورت نہیں ہو سکتی۔ حَبْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کیا ہے؟ یعنی قانون الٰہی میں جو ان کو چھوٹ دی جا چکی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر وہ رہیں تو رہ سکتے ہیں اور قانون الٰہی نے مسلمانوں پر یہ بات لازم کر دی ہے کہ جب تم کو حکومت مل جائے اور تمہاری حکومت میں جو کافر لوگ ہوں خواہ وہ اہل کتاب سے ہوں یا مشرکوں سے جو بھی تم سے امن کا طالب ہو اس کو امن دے دو اور اس کو کہو کہ جزیہ دے کر وہ امن و امان کی ضمانت حاصل کر لیں۔ جس کو اسلامی قانون میں ذمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تفصیل قرآن کریم میں بھی موجود ہے اور حدیث رسول اللہ ﷺ میں بھی اور اسلامی قانون میں اس کی پوری پوری وضاحت موجود ہے۔ جس کا مکمل بیان اپنے موقع پر ہوگا۔ اور "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" یہ ہے کہ وہ غیر مسلم حکومتوں سے جو یہود کے علاوہ دوسرے لوگوں کی ہو سکتی ہیں جیسے نصاریٰ کی ان سے کوئی عہد و پیمان کر لیں اور اس طرح وہ اس حکومت کے ماتحت یا اس حکومت کے بل بوتے پر کسی علاقہ میں زندگی بسر کرتے رہیں۔ یہود کی ذلت و مسکنت اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کا ذکر بتفصیل دیکھنا

ہو تو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ سے آیت ۱۲۰ تک کا مطالعہ کریں۔

ہاں! یاد رہے کہ ذلت و مسکنت ان کی دنیوی حالت ہے اور غضب من اللہ ان کی دینی حالت کے متعلق ہے مگر ذلت یعنی قتل و غارت کی حالت سے وہ اس طرح نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذمّی میں آجائیں یعنی حکومت اسلامی کے ماتحت آجائیں یا کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کر کے رہیں۔ اور اسی صورت حال کے تحت وہ آج تک موجود ہیں اور یقیناً اس حالت سے وہ کبھی بھی نہیں نکل سکتے۔ اس وقت جو نصاریٰ نے ان کے وجود کی بقاء کے لئے اہل اسلام سے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے یقیناً وہ دن دور نہیں کہ ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ لوگ یعنی نصاریٰ اور دوسرے غیر اسلامی مذاہب مل کر جو یہود کی سرپرستی کر رہے ہیں وہ اپنے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلانے کے مصداق ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "حَبْلٌ مِّنَ اللّٰہِ" سے ان کی ایسی آبادی مراد ہے جسے خود شریعت الٰہی نے قتل، ہلاکت اور تعزیری و انتقامی کارروائیوں سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ مثلاً ان کے بچے، عورتیں، بوڑھے اور مزاحمت نہ کرنے والے لوگ اور وہ گوشہ نشین زاہد و درویش جو کسی حال میں ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں۔ اور "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" سے مراد ان کی وہ جماعتیں ہیں جو معاہدوں کے ذریعہ امن حاصل کر لیں چونکہ معاہد لوگوں ہی سے ہوں گے خواہ وہ لوگ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اس لئے کہ "حَبْل"، بمعنی عہد و ذمہ ہی ہے خواہ وہ جس سے بھی ہو۔ ان کی اسی حالت کا بیان قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبة ۹: ۲۹)

"اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے ان کی کتاب میں حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ سچے دین ہی پر وہ عمل پیرا ہیں تو مسلمانو! ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ جائے۔"

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ (الحشر ۵۹: ۲، ۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تمہیں

ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کر برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔ اور اگر اللہ نے ان کے حق میں جلا وطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں ان کو عذاب دے ڈالتا اور آخرت میں تو ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔"

یہود کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق کیونکر ہوئے؟ اس کی تفصیل آپ سورہ بقرہ میں پڑھ چکے ہوں گے اگر نہیں تو سورہ بقرہ کی آیات ۶۲ تا ۱۲۶ کا مطالعہ کریں انشاء اللہ بات واضح ہو جائے گی۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا محض ان کی حرکات کی وجہ سے ہوا اور داعی اسلام سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی وہ اس غضب الٰہی کے نیچے دب چکے تھے لیکن آپ ﷺ کی بعثت کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہی پڑی اس لئے کہ وہ اپنی ان حرکات سے باز نہیں آئے بلکہ من حیث القوم ان کی اکثریت جو اس وقت حجاز کے اندر موجود تھی ان شرارتوں میں مزید ترقی کرتی گئی۔ اس لئے حجاز کے اندر بھی ان سے وہی کچھ ہوا جو ایک مدت سے ان کے ساتھ ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس جگہ اگر صرف حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ رسول اللہ ﷺ جو رحمت للعالمین کا لقب پانے والے تھے انہوں نے آخر کار ان کے مختلف قبائل کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے۔

مدینۃ النبی اور اس کے مضافات میں بسنے والے یہود کا تاریخی پس منظر

اس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مدینہ طیبہ اور حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے کیونکہ اس کے بغیر آدمی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں جان سکتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ جان لینا اس لئے ضروری ہے کہ اسلام جو صلح و آشتی کا مذہب ہے کسی پر زیادتی نہیں کرتا اور بظاہر کسی کو اس کے گھر سے نکال باہر کرنا زیادتی معلوم ہوتی ہے اور یہود کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے اور عرب سے باہر کے یہودی مورخین و مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملت سے بچھڑ گئے تھے اور دنیا کے یہودی سرے سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثار قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں ان میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یہود عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار ان زبانی روایات پر ہے

جو اہل عرب میں مشہور تھیں اور ان میں اچھا خاصا حصہ یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخر عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک لشکر یژب کے علاقے سے عمالقہ کو نکالنے کے لئے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمان نبی ﷺ کی تعمیل کی' مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا' اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لئے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعت موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بناء پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً یژب واپس آکر یہیں بس جانا پڑا (کتاب الاغانی ج ۱۹ ص ۹۴) اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ ۱۲ سو برس قبل مسیح یہاں سے آباد ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لئے گھڑا تھا کہ اہل عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی نسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت' خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ قبل مسیح میں ہوئی جبکہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتر بتر کر دیا تھا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آکر وادی القریٰ' تیماء اور یژب میں آباد ہوگئے تھے (فتوح البلدان' البلاذری)۔ لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا اور پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے بالکل نکال باہر کیا' اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے' کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انہوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سود خواری کے ذریعہ سے ان پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ' مقنا' تبوک' تیماء' وادی القریٰ' فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا اور بنی قریظہ' بنی نضیر' بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آکر یژب پر قابض ہوئے۔

یژب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے' کیونکہ وہ کاہنوں (Cohens یا Priests) کے طبقہ میں سے تھے' انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آکر آباد ہوئے اس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین

صدی بعد ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اس سیلاب عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں گزر چکا ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے قوم سباء کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے غسانی شام میں' لخمی حیرہ (عراق) میں' بنی خزاعہ جدہ و مکہ کے درمیان اور اوس و خزرج یثرب میں جا کر آباد ہوئے۔ یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے' اس لئے انہوں نے اول اول اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چاروناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں ان کو قوت لایموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ آخر کار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسانی بھائیوں سے مدد مانگنے کیلئے شام گیا اور وہاں ایک لشکر لا کر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اوس و خزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہوگیا۔ یہودیوں کے دو بڑے قبیلے' بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبور ہوگئے۔ تیسرے قبیلے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے ان بن تھی' اس لئے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا' مگر یہاں رہنے کے لئے اسے قبیلہ خزرج کی پناہ لینی پڑی اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر و بنی قریظہ نے قبیلہ اوس کی پناہ لی تاکہ اطراف یثرب میں امن کے ساتھ رہ سکیں۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے' آغاز ہجرت تک' حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے :

زبان' لباس' تہذیب' تمدن' ہر لحاظ سے انہوں نے پوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا' حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہوگئے تھے۔ ۱۲ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے' ان میں سے بنی زعوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گنے چنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے ان کی زبان اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انہیں ممیز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لئے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے' یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہل عرب کو دین یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہل عرب کو وہ امی (Gentiles)

کہتے تھے' جس کے معنی صرف ان پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان امیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لئے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لئے حلال و طیب ہے۔ سرداران عرب کے ماسواء عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ انہیں دین یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ روایات عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہوگئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اسی لئے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایہ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ' گنڈوں' فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا جس کی وجہ سے عربوں پر ان کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے' اس لئے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر انہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی ان کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ میخانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قینقاع زیادہ تر سنار' لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بنج بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سود خواری کا تھا جس کے جال میں انہوں نے گردوپیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار' جنہیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بھگارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی' ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرح سود پر قرضے دیتے اور پھر سود در سود کا چکر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا' مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

ان کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لیں۔ لیکن دوسری طرف ان کے مفاد ہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انہیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں' کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے' وہ ان بڑی بڑی جائیدادوں اور باغات اور سرسبز زمینوں پر انہیں قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سود خواری سے پیدا کی تھیں۔ مزید برآں اپنی حفاظت کیلئے ان کے ہر قبیلے کو

کسی نہ کسی طاقت ور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے' تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بناء پر بارہا انہیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا' بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلہ کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریق مخالف سے ہوتے تھے۔ یثرب میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اوس کے حلیف تھے اور بنی قینقاع خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بعاث کے مقام پر ہوئی تھی اس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

یہ حالات تھے جب مدینے میں اسلام پہنچا اور بالآخر رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ آپ ﷺ نے اس ریاست کو قائم کرتے ہی جو اولین کام کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی اور دوسرا یہ تھا کہ اس مسلم معاشرے اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ سب متحدہ دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کے چند اہم فقرے یہ ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں کن امور کی پابندی قبول کی تھی۔

یہ کہ یہودی اپنا خرچ اٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ' اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء حملہ آور کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوں گے اور یہ کہ وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کے درمیان نیکی و حق رسانی کا تعلق ہوگا نہ کہ گناہ اور زیادتی کا اور یہ کہ کوئی اپنے حلیف کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا اور یہ کہ مظلوم کی حمایت کی جائے گی اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کے مصارف اٹھائیں گے اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء پر یثرب میں کسی نوعیت کا فتنہ و فساد کرنا حرام ہے اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء کے درمیان اگر کوئی ایسا قضیہ یا اختلاف رونما ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق محمد رسول اللہ ﷺ کریں گے..... اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکاء معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے..... ہر فریق اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔ (ابن ہشام ج ۲)

یہ ایک قطعی اور واضح معاہدہ تھا جس کی شرائط یہودیوں نے خود قبول کی تھیں۔ لیکن بہت جلدی انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش کا اظہار شروع کر دیا اور ان کا عناد روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ اس کے بڑے بڑے وجوہ تین تھے :

ایک یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو محض ایک رئیس قوم دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے ساتھ بس ایک سیاسی

معاہدہ کر کے رہ جائے اور صرف اپنے گروہ کے دنیوی مفاد سے سروکار رکھے۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ تو اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں (جس میں خود ان کے اپنے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل تھا) اور معصیت چھوڑ کر ان کو احکام الٰہی کی اطاعت اختیار کرنے اور ان اخلاقی حدود کی پابندی کرنے کی طرف بلا رہے ہیں جن کی طرف خود ان کے انبیاء بھی دنیا کو بلاتے رہے ہیں۔ یہ چیز ان کو سخت ناگوار تھی۔ ان کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ یہ عالمگیر اصولی تحریک اگر چل پڑی تو اس کا سیلاب ان کی جامد مذہبیت اور ان کی نسلی قومیت کو بہا لے جائے گا۔

دوسرے یہ کہ اوس و خزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ گردوپیش کے عرب قبائل میں سے بھی جو لوگ اسلام کی اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں وہ سب مدینے کی اس اسلامی برادری میں شامل ہو کر ایک ملت بنتے جا رہے ہیں' انہیں یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ صدیوں سے اپنی سلامتی اور اپنے مفادات کی ترقی کیلئے انہوں نے عرب قبیلوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا الو سیدھا کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ اب اس نئے نظام میں نہ چل سکے گی بلکہ اب ان کو عربوں کی ایک متحدہ طاقت سے سابقہ پیش آئے گا جس کے آگے ان کی چالیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

تیسرے یہ کہ معاشرے اور تمدن کی جو اصلاح رسول اللہ ﷺ کر رہے تھے اس میں کاروبار اور لین دین کے تمام ناجائز طریقوں کا سدباب شامل تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سود کو بھی آپ ناپاک اور حرام خوری قرار دے رہے تھے جس سے انہیں خطرہ تھا کہ اگر عرب پر آپ ﷺ کی فرمانروائی قائم ہوگئی تو آپ ﷺ اسے قانوناً ممنوع کر دیں گے۔ اس میں ان کو اپنی موت نظر آتی ہے۔

ان وجوہ سے انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنا لیا۔ آپ کو زک دینے کیلئے کوئی چال' کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تامل نہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک و شبہات اور وسوسے ڈالتے تھے تاکہ وہ اس دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جاتے تھے تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جا سکیں۔ فتنے برپا کرنے کیلئے منافقین سے ساز باز کرتے تھے۔ ہر اس شخص اور گروہ اور قبیلے سے رابطہ پیدا کرتے تھے جو اسلام کا دشمن ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور ان کو آپس میں لڑا دینے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ اوس اور خزرج کے لوگ خاص طور پر ان کے ہدف تھے جن سے ان کے مدتہائے دراز کے تعلقات چلے آرہے تھے۔ جنگ بعاث کے تذکرے چھیڑ چھیڑ کر وہ ان کو پرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اخوت کا وہ رشتہ تار تار ہو جائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا۔ مسلمانوں کو مالی حیثیت سے تنگ کرنے کیلئے بھی وہ ہر قسم کی

دھاندلیاں کرتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا پہلے سے لین دین تھا' ان میں سے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اگر اس سے کچھ لینا ہوتا تو تقاضے کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتے اور اگر اسے کچھ دینا ہوتا تو اس کی رقم مار کھاتے تھے اور اعلانیہ کہتے تھے کہ جب ہم نے تم سے معاملہ کیا تھا اس وقت تمہارا دین کچھ اور تھا' اب چونکہ تم نے اپنا دین بدل دیا ہے' اس لئے ہم پر تمہارا کوئی حق باقی نہیں ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تفسیر طبریٰ' تفسیر نیسابوری' تفسیر طبرسیٰ اور تفسیر روح المعانی میں سورۂ آل عمران' آیت ۷۵ کی تشریح کرتے ہوئے نقل کی گئی ہیں۔

معاہدے کے خلاف یہ کھلی کھلی معاندانہ روش تو جنگ بدر سے پہلے ہی وہ اختیار کر چکے تھے۔ مگر جب بدر میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اٹھے اور ان کے بغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لئے انہوں نے فتح اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینے میں یہ افواہیں اڑانی شروع کر دیں تھیں کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہوگئے اور مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی اور اب ابوجہل کی قیادت میں قریش کا لشکر مدینے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ لیکن جب نتیجہ ان کی امیدوں اور تمناؤں کے خلاف نکلا تو وہ غم اور غصے کے مارے پھٹ پڑے۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چیخ اٹھا کہ "خدا کی قسم اگر محمد ﷺ نے ان اشراف عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لئے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔" پھر وہ مکہ پہنچا اور بدر میں جو سرداران قریش مارے گئے تھے ان کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکہ والوں کو انتقام پر اکسایا۔ پھر مدینہ واپس آکر اس نے اپنے دل کی جلن نکالنے کیلئے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفاء کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہار عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اس کی شرارتوں سے تنگ آکر رسول اللہ ﷺ نے ربیع الاول ۳ھ میں محمد بن مسلمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔ (ابن سعد' ابن ہشام' تاریخ طبریٰ)

یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگ بدر کے بعد کھلم کھلا اپنا معاہدہ توڑ دیا' بنی قینقاع تھا۔ یہ لوگ خود شہر مدینہ کے اندر ایک محلہ میں آباد تھے اور چونکہ یہ سنار' لوہار اور ظروف ساز تھے اس لئے ان کے بازار میں اہل مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردان جنگی ان کے اندر موجود تھے۔ اور ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلہ خزرج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی ان کا پشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والوں مسلمانوں کو ستانا اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ان کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو برسر عام برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہوگیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ ان کے محلہ میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر

کے آپ نے ان کو راہ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ مگر انہوں نے جواب دیا "اے محمد ﷺ! تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے' اس لئے تم نے انہیں مار لیا' ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔" یہ گویا صاف صاف اعلان جنگ تھا۔ آخر کار رسول اللہ ﷺ نے شوال (اور بروایت بعض ذی القعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلّہ کا محاصرہ کر لیا۔ صرف پندرہ روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کے تمام قابل جنگ آدمی باندھ لئے گئے۔ اب عبداللہ بن ابی ان کی حمایت کیلئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپ انہیں معاف کر دیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کی درخواست قبول کر کے یہ فیصلہ فرما دیا کہ بنی قینقاع اپنا سب مال' اسلحہ اور آلات صنعت چھوڑ کر مدینہ سے نکل جائیں۔ (ابن سعد' ابن ہشام' تاریخ طبریٰ)

ان دو سخت اقدامات (یعنی بنی قینقاع کے اخراج اور کعب بن اشرف کے قتل) سے کچھ مدت تک یہودی اتنے خوف زدہ رہے کہ انہیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد شوال ۳ھ میں قریش کے لوگ جنگ بدر کا بدلہ لینے کیلئے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر چڑھ کر آئے اور ان یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کیلئے نکلے ہیں اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں' تو انہوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اس طرح کی کہ مدینہ کی مدافعت میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوئے' حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکہ احد میں مسلمانوں کو نقصان عظیم پہنچا تو ان کی جراتیں اور بڑھ گئیں' یہاں تک کہ بنی نضیر نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کیلئے ایک باقاعدہ سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہو گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بئر معونہ کے سانحہ (صفر ۴) کے بعد عمرو بن امیہ ضمری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غلطی سے بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا جو دراصل ایک معاہد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے مگر عمرو نے ان کو دشمن قبیلہ کے آدمی سمجھ لیا تھا۔ اس غلطی کی وجہ سے ان کا خون بہا مسلمانوں پر واجب آگیا تھا اور چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدے میں بنی نضیر بھی شریک تھے' اس لئے رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ خود ان کی بستی میں تشریف لے گئے تاکہ خون بہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔ وہاں انہوں نے آپ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اس مکان کی چھت پر سے آپ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرا دے گا جس کی دیوار کے سائے میں آپ ﷺ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرتے' اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بروقت خبردار کر دیا اور آپ ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔ حضور ﷺ نے ان کو بلا تاخیر یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آگئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ اس کے بعد

سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ
اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو راہ ہدایت پر قائم ہیں وہ راتوں کو اٹھ کر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور اس کے حضور سر بسجود رہتے ہیں۔ ۲۱۹ ۱۱۳

وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائی سے

اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو جو شخص بھی تمہاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن مار دی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن ابی نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا اور بنی قرینہ اور بنی غطفان بھی تمہاری مدد کو آئیں گے' تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس جھوٹے بھروسے پر انہوں نے حضور ﷺ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے' آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجئے۔ اس پر ربیع الاول ۴ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا' اور صرف چند روز کے محاصرہ کے بعد (جس کی مدت بعض روایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آتی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے کیلئے راضی ہو گئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے لے جائیں گے۔ اس طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرائی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھہر گئے۔ باقی شام اور خیبر کی طرف نکل گئے۔

اہل کتاب یعنی یہود ہی کے اندر اللہ کے نیک بندے بھی تھے جو رحمت الٰہی کے مستحق ٹھہرے

۲۱۹ دین اسلام کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ ہر سچائی کو سچائی تسلیم کرتا ہے اور برملا اور اعلانیہ کرتا ہے دوسرے ادیان کی طرح ضد اور ہٹ دھرمی نام کی کوئی شے اس میں موجود نہیں۔ کاش کہ اس کے ماننے والے بھی آج اس نکتہ کو ذہن نشین رکھتے۔ گروہ یہود کی مختصر تاریخ آپ پڑھ چکے بلاشبہ من حیث القوم ان کی اکثریت شرارتی تھی اس لئے اوپر جو کچھ ذکر ہوا وہ ان کی اکثریت کا ذکر تھا باقی ان میں سے بعض بعض حق شناس اور انصاف دوست بھی تھے اور وہ بالآخر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس لئے قرآن کریم نے بھی ان کی تعریف فرمائی اور ان کے اچھے اعمال و اخلاق کا ذکر واضح الفاظ میں کر دیا۔ اسلام نے صرف ذکر ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ناموں تک کو محفوظ رکھا اور دنیا کو بتا دیا کہ اگر میں بروں کی برائی کو بیان کرتا ہوں تو اس قوم کے نیکوں کی نیکی کو بھی نہیں چھپاتا۔ چنانچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام۔ ثعلبہ رضی اللہ عنہ بن سعید۔ اسید رضی اللہ عنہ بن سعید اور اسد رضی اللہ عنہ بن عبید وغیرہم کے نام آج بھی کتب احادیث اور تفاسیر میں موجود ہیں۔

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٤﴾ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ

روکتے ہیں' بھلائی کے تمام کاموں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نیک کردار ہیں۔[۲۲۰] ۱۱۴

اور یہ لوگ نیک کاموں میں سے جو کچھ کرتے ہیں ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اسکی

قرآن کریم کے اس مقام پر جو ان کی صفات بیان کی گئیں وہ بالکل وہی ہیں جن کو اختیار کر کے انسان اللہ کا ایک نیک اور فرمانبردار بندہ بن سکتا ہے۔ فرمایا "اُمَّةٌ قَائِمَةٌ" "ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو راہ ہدایت پر قائم ہے۔" ان کا یہ پہلا وصف جو قرآن کریم نے بیان کیا ایسا وصف ہے جس نے ان کے ظاہر و باطن دونوں کی پوری پوری وضاحت کر دی کہ وہ ایسے مخلص لوگ ہیں کہ ان کے اخلاص کو شک کی نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ ان کا دوسرا وصف اس طرح بیان کیا کہ "يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ" "وہ راتوں کو اٹھ کر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔" سبحان اللہ! کیا اعجاز قرآنی ہے کہ الفاظ بالکل مختصر اور مضمون اتنا بڑا کہ اس کو کھولنا شروع کر دیا جائے تو وہ کھلتا ہی چلا جائے اور کبھی ختم ہونے میں نہ آئے گویا پورے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اللہ کی آیتوں کی تلاوت جب اور جس وقت بھی کی جائے وہ ایک نہایت ہی اچھا کام ہے لیکن ایسے وقت میں جب لوگ میٹھی نیند میں سوئے ہوئے ہوں کوئی اللہ کا بندہ جاگ کر اور ہر ایک سے الگ تھلگ ہو کر جب ان آیات کی تلاوت کرے گا گویا وہ براہ راست اللہ سے ہم کلام ہو جائے گا اور اس طرح جو مضامین اس کے ذہن میں اتریں گے وہ دن کے شور و غوغا میں کب اتر سکتے ہیں اور کسی چیز کے پڑھنے کا حق کیا ہے؟ یہی کہ وہ دل و دماغ میں اتر جائے تاکہ روح کو اپنی غذا حاصل ہو اور جس طرح جسم غذا کھانے سے تر و تازہ ہوتا ہے اسی طرح روح کو بھی تازگی میسر آئے پھر فرمایا ان پر اللہ کی کتاب کی آیات پڑھنے کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود رہتے ہیں۔" یعنی ان کی فرمانبرداری کا شروع قیام پر ہوتا ہے تو اخیر بارگاہ رب ذوالجلال کی سجدہ ریزی سے ہوتی ہے اور یہ سارے کام وہ تب ہی انجام دے رہے ہیں جب کہ ان کے دل ایمان سے لبریز اور ان کی جانیں مشرف بہ اسلام ہو چکی ہیں۔

ان اہل کتاب کے نیک لوگوں کے مزید اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں

[۲۲۰] اہل کتاب یعنی یہود کی جماعت سے جن لوگوں نے دعوت اسلام قبول کر لی ان کے دوسرے اوصاف سے قرآن کریم کی شہادت اس طرح قائم ہوئی فرمایا "وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں یہ

خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۱۱۵ اِنَّ الَّذِيْنَ

ناقدری کی جائے اور یاد رکھو جو لوگ متقی ہیں اللہ انکے حال سے بے خبر نہیں ہے۔ ۲۲۱ ۱۱۵

بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تو ایسا ہوگا کہ نہ تو مال و دولت کی طاقت

لوگ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے تمام کاموں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نیک کردار ہیں۔" ان کے اوصاف و خصوصیات اس جگہ کسی جامعیت و اعجاز کے ساتھ ارشاد فرما دیئے گئے ہیں۔ اس آیت میں ان کے متعلق پہلی بات یہ بتائی کہ وہ ایمان میں کامل ہوں گے اور جو کچھ بھی خرچ کریں گے مقصد صحیح کے ساتھ اور راہ حق میں کریں گے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ وہ لوگ نہ صرف خود ہی ایجابی و سلبی ہر حیثیت سے اخلاق اور پاکیزہ کرداری کے پتلے ہوں گے بلکہ دوسروں کو بھی اس راہ پر لائیں گے اور لگائیں گے اور نیکیوں کی طرف دلی شوق و رغبت کے ساتھ بڑھیں گے۔ "يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ" کے جملہ نے کیا وضاحت فرما دی؟ کہ وہ وہ لوگ نیکیوں کی طرف بد دلی اور بدشوقی کے ساتھ گویا ہار اور تھک کر نہیں بلکہ بڑے شوق و اشتیاق' چاؤ اور رغبت کے ساتھ لپکتے ہیں اس لئے لازم و ضروری ہے کہ یہ لوگ نیکو کار بھی ہیں اور نیکو کار لوگوں کے ساتھ بھی۔

ان لوگوں نے جو نیک اعمال کئے ہیں ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی

۲۲۱ فرمایا یہ خیال نہ کرو کہ کوئی متقی اللہ تعالیٰ کے علم میں آجانے سے رہ جائے گا یہ ممکن نہیں ہو سکتا پھر یہاں غیر قوموں کے عقائد کی تردید کے لئے اس جملہ کا اضافہ فرما دیا کہ "فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ" یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ جن لوگوں کا ماضی خراب رہ چکا ہے تو اب ان کے نجات و مغفرت کی امید کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اب ان کے ایمان و حسن عمل سے حاصل کیا؟ یہ اس لئے فرما دیا کہ دوسرے مذاہب نے ایسے ہی عقائد گھڑ رکھے تھے اس لئے یہ تنبیہہ ضروری تھی۔ یا کفر بمقابلہ شکر بھی ہو سکتا ہے۔ چونکہ پہلی دو آیات میں کامل صالحین کا نقشہ کھینچا گیا تھا اس لئے اب بتایا جا رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اگر اس کمال کو حاصل نہ بھی کر سکے تو جتنی بھی نیکی کرے گا اس کی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت ہے۔ اس کی ناقدری ہرگز کبھی نہیں کی جائے گی۔ اس مضمون کی مزید تشریح قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (آل عمران ۳ : ۱۹۹) "اور یقیناً اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو

کچھ ان پر نازل ہو چکا ہے سب کے لئے ان کے دل میں یقین ہے۔ نیز ان کے دل اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اللہ کی آیتیں تھوڑے داموں پر فروخت کر ڈالیں۔ تو بلاشبہ ایسے لوگوں کے لئے کوئی کھٹکا نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے پروردگار کے حضور ان کا اجر ہے یقیناً اللہ کا قانون مکافات اعمال کے حساب سے ست رفتار نہیں۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ وَ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ○ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ○ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ○ (القصص ۲۸: ۵۲ تا ۵۵) "جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس قرآن کریم پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہوگئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے تم کو سلام ہے ہم جاہلوں کا سا طریق اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

اہل کتاب ہی کے لوگوں کے متعلق ارشاد الٰہی ہے کہ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ کہ وہ قرآن کریم پر ایمان لاتے ہیں۔ بلاشبہ اس سے یہ تو مراد نہیں کہ تمام اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اس پر ایمان لاتے ہیں بلکہ یہ اشارہ دراصل اس واقعہ کی طرف ہے جو سورہ قصص کے نزول کے زمانہ میں پیش آیا تھا اور اس سے اہل مکہ کو شرم دلانی مقصود ہے کہ تم اپنے گھر آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو جبکہ دور دور کے لوگ اس کی خبر سن کر آرہے ہیں اور اس کی قدر پہچان کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس واقعہ کو بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحٰق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد جب نبی کریم ﷺ کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے غالباً بیس کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیق حال کے لئے مکہ مکرمہ آیا اور نبی کریم ﷺ سے مسجد حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ رہے تھے وہ قریب آکر ان لوگوں کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ وفد کے لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کچھ سوال کئے جن کا آپ ﷺ نے جواب دیا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن کریم کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن کریم کی تلاوت سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انہوں نے اس کے کتاب اللہ ہونے کی تصدیق کی اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستے میں جالیا اور انہیں سخت

ملامت کی کہ تم "بڑے نامراد ہو' تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو۔ مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انہوں نے جواب دیا کہ سلام ہے بھائیو! تم پر! ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔

اس سورہ قصص کی آیت میں اہل کتاب کے ان نیک و برگزیدہ لوگوں کی طرف جو یہ جملہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ "اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ" علمائے اہل اسلام اور مفسرین حضرات کے ہاں یہ بحث موضوع رہ چکا ہے اور اس پر صفحات کے صفحات تحریر کئے گئے ہیں اور بڑے بڑے اہل علم بھی اس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی کہ "مسلم" کی اصطلاح صرف امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص ہے۔ پھر جب یہ آیت سامنے آئی تو وہ خود فرماتے ہیں کہ "میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور میں ششدر رہ گیا اور میں اللہ سے دعائیں کرتا رہا کہ اس کا مفہوم میرے ذہن میں ڈال دے اور شرح صدر عطا فرما" اور پھر اس آیت کی متعدد تعبیریں بھی کیں جن کی تفصیل بہت لمبی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم صرف اس ایک جگہ نہیں بلکہ بیسیوں سے بھی متجاوز مقامات پر اس اصولی حقیقت کو بیان کرتا آیا ہے کہ اصل دین صرف "اسلام" یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کیلئے اس کے سوا کوئی دوسرا دین نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا اور آغاز آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے اور سارے انبیاء کرام خود مسلم تھے اور اپنے پیروؤں کو انہوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے اور ان کے وہ سارے متبعین جنہوں نے نبوت کے ذریعہ سے آئے ہوئے فرمان الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کیا ہر زمانے میں مسلم ہی تھے۔ اس کی تفصیل اس سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ کے تحت گزر چکی ہے جہاں "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" کے الفاظ آئے ہیں وہاں ملاحظہ کریں اور ایک بات یاد رکھیں کہ یہ بات آج کل کی "جماعت المسلمین" میں پائی ہی نہیں جاتی کیونکہ وہ تو کسی دوسرے کو "مسلم" تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ انہوں نے تو اسلام کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا ہے کہ کوئی "مسلم" مسلم ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ کراچی کے ایک مسعود احمد کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے۔

اس آیت کی مزید تفصیل اس کے اپنے مقام یعنی سورہ قصص پر ہوگی۔ انشاء اللہ

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝ (۱۷: ۱۰۷، ۱۰۹)

كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ

انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکے گی' نہ آل و اولاد کی کثرت ہی کچھ کام آئے گی وہ یقیناً دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے۔ ۱۱۶

دنیا کی زندگی میں یہ لوگ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے

"اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہہ دے کہ تم قرآن کریم کو کلام الٰہی مانو یا نہ مانو لیکن جن لوگوں کو پچھلی کتابوں کا علم دیا گیا ہے یعنی اہل کتاب انہیں جب یہ کلام سنایا جاتا ہے تو وہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کے لئے پاکیزگی ہو! بلاشبہ ہمارے پروردگار کا وعدہ اس لئے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔"

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾ (المائدہ ۵ : ۸۳' ۸۴) "اور جب یہ عیسائی وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوش گریہ سے بہنے لگتی ہیں کیونکہ انہوں نے اس کلام کی سچائی پہچان لی ہے وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ خدایا ہم اس کلام پر ایمان لائے پس ہمیں بھی انہیں میں سے لکھ لے جو تیری سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس کلام پر جو سچائی کے ساتھ ہمارے پاس آیا ہے ایمان نہ لائیں اور اللہ سے اس کی توقع رکھیں کہ وہ ہمیں نیک کردار انسانوں کے گروہ میں داخل کر دے؟"

کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کے کام نہ دولت آئے گی اور نہ اولاد

۲۲۲ کفار کون ہیں؟ وہی جنہوں نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی سچائیوں کو جھٹلایا بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس طرح جو روش انہوں نے اختیار کی اسی پر ان کا اختتام ہوگیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ابدی دوزخ کے مستحق ہوگئے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ "خلود نار" کی سزا صرف کافروں کے لئے ہے گنہگار مومنوں کے لئے نہیں فرمایا گیا کہ "نہ تو مال و دولت کی طاقت انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکے گی اور نہ ہی آل و اولاد کی کثرت ہی ان کے کچھ کام آئے گی" یعنی یہ نہیں ہوگا کہ مال کو بطور کفارہ یا توبہ پیش کر کے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہود کے جو غلط سلط عقیدے اس باب میں ہو چکے تھے ان سب کو بند کر دیا اور اس کا

مَا يُنْفِقُونَ فِي هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا

اس ہوا کا چلنا جس کے ساتھ سردی کی لہر شامل ہو پھر فرض کرو ایک گروہ نے اپنے اوپر ہر طرح کی محنت و مشقت برداشت کر کے ایک کھیت تیار کیا ہو لیکن اس سردی کی لہر

تفصیلی تذکرہ تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ آیت ۴۲ سے ۶۲ تک آپ پڑھ چکے ہیں۔ بہت سی قوموں میں یہ عقیدہ آج بھی پایا جاتا ہے کہ اولاد والدین کی بخشش کا باعث ہے چنانچہ ہندوؤں اور جینیوں میں یہ گمراہی خاص طور پر بڑھی ہوئی ہے کہ لڑکا ہی مرے ہوئے باپ کو پانی دے دے کر عذاب سے چھڑا سکتا ہے۔ منوجی کا یہ قول ان کی کتابوں میں اکثر پڑھا اور دیکھا گیا ہے کہ بیٹے کو سنسکرت میں "پتر" کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ باپ کو "پت" یعنی دوزخ سے چھڑا لاتا ہے۔ اور یہ فاتحہ و درود کے نظریے اسی راستہ سے اسلام میں بھی گھس آئے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مال و اولاد مرنے والوں کے کچھ کام آنے والی شے نہیں یہ سب کی سب دنیوی زندگی کی ہو ہوا ہے بس! چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے کہ:

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الممتحنة ۶۰: ۳) "قیامت کے دن نہ تمہارے رشتہ دار ہی تمہارے کچھ کام آئیں گے اور نہ ہی اولاد کچھ کام آئے گی۔" ایک جگہ ارشاد ہوا:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (الشعراء ۲۶: ۸۸) "وہ دن کہ نہ تو مال ان کو فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد۔" ایک جگہ ارشاد ہوا

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (سبا ۳۴: ۳۷) "یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو شخص ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔" یعنی اللہ کے قریب کرنے والی چیز مال اور اولاد نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا کہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے والے اس طرح پکار پکار کر کہیں گے کہ:

مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (الحاقہ ۶۹: ۲۸، ۲۹) کہ افسوس میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا مجھ سے میری حکومت بھی جاتی رہی۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا کہ:

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ

(عبس ۸۰: ۳۳، ۳۶)

پھر جب کان بہرے کر دینے والی، شور بپا کرنے والی آئے گی یعنی قیامت۔ اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا اور اپنی ماں اور باپ سے بھاگے گا اور اپنی بیوی اور بچوں سے بھی گریزاں ہو گا۔" ایک جگہ ارشاد ہوا کہ:

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (اللھب ۱۱۱: ۲) "اس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی۔"

صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾ ۞ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

سے سارا کھیت برباد ہو کر رہ جائے۔ ہاں! یہ جو کچھ انہیں پیش آیا تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا ہو' یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ ۲۲۳ ۱۱۷

اے مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اپنے آدمیوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہم راز اور

دنیوی زندگی کی ہُو ہوا کے لئے خرچ کئے گئے مال کی قرآنی مثال

۲۲۳ پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ان لوگوں کے مال و اولاد جن کے فخر پر وہ تخریب اسلام کے درپے ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے یہاں ان کی ان کوششوں کا انجام ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے اور ان کے مال خرچ کرنے کو مَا يُنْفِقُونَ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا قرار دیا کہ یہ لوگ مال خرچ کرتے بھی ہیں تو دنیا کی زندگی کے لئے کہ اچھی عزت مل جائے اچھا عہدہ حاصل ہو' لوگ خوش ہوں' نام و نمود ہو' ناک رہ جائے اور واہ واہ ہو جائے اس طرح سے خرچ کئے گئے مال کی مثال اس طرح بیان فرمائی کہ گویا ایک کھیتی ہے جس ہریاولی کو سردی کی شدت نے دبالیا یا سخت گرمی نے اس کو جھلس کر رکھ دیا یا تند ہوا نے اس کو اکھاڑ پھینکا جس سے وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئی اور پھر اس تباہی کے بعد ان کے ہاتھ میں سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ نہ آیا اور آخر پر فرمایا کہ ان کی کوششوں کی ناکامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کے طور پر نہیں بلکہ ان کے اعمال کے نتیجہ میں ظاہر ہوئی اس لئے کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کے مرتکب ہوئے۔ کیونکہ بجائے نیکی اور تائید حق کے اپنے اموال کو معصیت اور تخریب حق پر خرچ کیا اس لئے اس اس سزا کے مستحق ٹھہرے اور اپنے ساتھ دوسروں کے لئے بھی وبال جان بن گئے کہ متاثر صرف ان کی ذات ہی نہ ہوئی بلکہ لواحق بھی ہوئے۔

زیر نظر آیت میں لفظ "صر" آیا ہے اور "صر" سخت ٹھنڈی چیز کو بھی کہتے ہیں جس میں پالا۔ برف اور اولے ہوں۔ اور "صر" نہایت سخت لو پر بھی بولا جاتا ہے جس سے نباتات جل بھن کر رہ جاتی ہوں اور اس تند و تیز آندھی پر بھی بولا جاتا ہے جس سے فصلیں تباہ و برباد ہوجاتی ہیں۔ اور اس کے اصل معنی "خوب کس کر باندھنے کے ہیں۔" اور اس سے "اصرار" کا لفظ بنا ہے اور "صرۃ" اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں روپے رکھ کر اوپر سے اس کا منہ کس کر باندھ دیا جاتا ہے۔

اس طرح نام و نمود اور دکھاوے کے لئے خرچ کئے گئے مال و دولت کی مثالیں اور بھی قرآن کریم میں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۠ وَمَا تُخْفِيْ

معتمد بناؤ۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ تمہارے خلاف فتنہ انگیزی میں کمی کرنے والے نہیں۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہی انہیں اچھی لگتی ہے انکی دشمنی تو انکی

بیان کی گئی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (ابراہیم ۱۴: ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تو ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے راکھ کا ڈھیر کہ آندھی کے دن ہوا اس کو لے اڑے جو کچھ انہوں نے اپنے اعمال کے ذریعے کمایا ہے اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ آئے گا۔ یہی گمراہی کی حالت ہے جو بڑی ہی گہری گمراہی ہے۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (النور ۲۴: ۳۹) "جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا بلکہ اس نے وہاں اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔ اور اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہوا کہ:

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ (الانفال ۸: ۳۶) "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ اپنا مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں تو یہ لوگ آئندہ بھی اسی طرح خرچ کریں گے لیکن انجام کار ان کے لئے سراسر پچھتاوا ہوگا اور پھر بالآخر مغلوب کئے جائیں اور یاد رکھو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے۔"

مزید تفصیل کیلئے دیکھئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۲۶۴

مسلمانوں کو ہدایت کہ اپنے لوگوں کے سوا غیروں کو ہم راز مت بناؤ

۲۲۴ "اے مسلمانو! ایسا مت کرو کہ اپنے آدمیوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہم راز اور معتمد

بناؤ" بطانۃ۔ بطن اصل میں پیٹ ہے لیکن ہر چیز میں اس کے ظاہر کے خلاف کو اس کا بطن کہہ دیتے ہیں اور بطور استعارہ بطانۃ کا استعمال اس شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے معاملہ کے باطن یعنی راز پر اطلاع دینے کے لئے خاص کر لیتے ہو۔ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کو رازدار دوست بنانے کی ممانعت کی ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو راز دار اور دوست بنانا اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی چلانا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے بلکہ وہ تو خوش ہیں کہ ان پر کوئی ہلاک کرنے والی مصیبت آئے پھر جب وہ تمہارے رازوں سے واقف ہوں گے تو تم کو معلوم ہی ہے کہ "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" کا محاورہ زبان زد خاص و عام ہے۔

یہ نصیحت جو اس آیت میں مسلمانوں کو کی جا رہی ہے قرآن کریم میں بار بار دہرائی گئی ہے لیکن قوم مسلم پر اس کا کیا اثر ہوا؟ آج عالم اسلام کے جتنے بڑے بڑے لیڈر اور ممالک اسلامی کے سربراہ ہیں انہوں نے اس نصیحت سے کیا فائدہ حاصل کیا؟ وہ کونسی اسلامی حکومت ہے جس کا کوئی راز غیروں سے پوشیدہ ہو؟ وہ کونسی اسلامی حکومت ہے جو اپنا ملکی راز اپنوں تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ بی بی سی اور دوسری عالمی سروسوں کے سامعین پر یہ سب کچھ روشن ہے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں کیا یہ حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے واضح نہیں؟ کیا اس میں کسی مکتب فکر کو کوئی اختلاف ہے؟ ہرگز نہیں پھر ایسا کیوں ہے کہ آج ہمارا سب کچھ غیروں پر روشن ہے؟ ان سوالوں کے جوابات آج ہر ایک عقل و فکر رکھنے والے کو معلوم ہیں۔ اس لئے اس ممانعت کی تاکید کو اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھو باقی تمہاری خوشی چاہو تو عذاب الٰہی کو دعوت دو اور چاہو تو اللہ سے اپنے کئے کی بخشش طلب کرو۔ ارشاد الٰہی دوسری جگہ اس طرح ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (المائدہ ۵ : ۵۱) "مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق و مددگار نہ بناؤ وہ تمہاری مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دیکھو اب تم میں سے جو کوئی انہیں رفیق و مددگار بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے سمجھا جائے گا۔ اللہ اس گروہ پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھولتا جو ظلم کرنے والا گروہ ہو۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا (النساء ۴ : ۱۴۴) "مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو اپنا رفیق و مددگار بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو۔" گویا منافقوں کی چال ہے کہ وہ اپنی قوم کو چھوڑ کر دشمنوں کو اپنا مددگار بناتے ہیں اور قوم کی مصلحتوں پر اپنی منافقانہ غرضوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ (الممتحنۃ ۶۰ : ۱) "اے

صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ۱۱۸

باتوں ہی سے ظاہر ہے لیکن جو کچھ انکے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ۲۲۵
اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہم نے فہم و بصیرت کی نشانیاں تم پر واضح کر دی ہیں۔ ۲۲۶ ۱۱۸

ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کو دوستی اور محبت کا پیغام بھیجتے ہو۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (التوبۃ ۹: ۴۷، ۴۸) "اور اگر یہ تم مسلمانوں میں مل کر میدان جنگ میں نکلتے تو تمہارے اندر کچھ زیادہ نہ کرتے مگر خرابی اور ضرور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑاتے اور تم کو معلوم ہے کہ تم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان کی باتوں پر کان دھرنے والے ہیں اور اللہ ظلم کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا:

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (النساء ۴: ۱۰۲)

"اور یاد رکھو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامان جنگ سے ذرا بھی غفلت کرو تو یک بارگی وہ تم پر ٹوٹ پڑیں۔"

مخالفین کی دشمنی باتوں سے بھی ظاہر ہے اور دلوں کی نہ بجھنے والی آگ سے بھی

۲۲۵ قانون اسلامی کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کو ہرگز نہیں ہے اس لئے کہ اس میں فرد اور ملت دونوں کے ضرر کا اندیشہ ہے اور اس صریح، معقول، مناسب اور نہایت ہی ضروری انتظام کا نام بعض عقل کے دشمنوں نے "تنگ نظری" قرار دیا ہے۔ تعجب ہے کہ امراض وبائی میں پرہیز و احتیاط کا نام تو فخر کے ساتھ "اصول حفظان صحت" رکھا جائے اور جو انتظام کفر و طغیان یعنی دنیا و آخرت دونوں کی بربادی سے بچنے کے لئے کیا جائے اس کا نام "تنگ نظری" پڑ جائے۔ آخر عقل دشمنی کی بھی کوئی حد ہونا چاہئے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں ہی سے واضح ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں کے اندر چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے" گویا ان کے اندر ایک نہ بجھنے والی آگ موجود ہے اور وہ چاہتے ہیں اور ان کی دلی خواہش ہے کہ ہاتھ پڑے تو ان مسلمانوں کو ایک ہی پھونک سے جلا کر راکھ کر دیا جائے۔

آج اگر دنیا کے حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر غیر مسلم قوم کی یہ دلی

خواہش ہے کہ مسلمانوں کا وجود تو کیا نام و نشان بھی باقی نہ رہے لیکن افسوس کہ سارے اسلامی ممالک کا پورا انحصار انہی کی دوستی پر ہے حالانکہ یہ لوگ اگر دو ہتھڑ نہ مار سکیں تو دایاں دکھا کر بائیں سے تابڑ توڑ مارنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ کی فکر ہوتی ہے کہ کہیں مارنے سے اس کو نقصان نہ پہنچے اپنے وجود کی کبھی فکر نہیں ہوئی جس پر یہ برس رہی ہوتی ہیں۔ ہائے افسوس کہ مسلمانوں کو کیا کہا گیا تھا اور وہ کیا کر رہے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ :-

لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا (ال عمران ۳ :- ۱۸۶)

"اہل کتاب اور مشرکین سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننا پڑیں۔" لیکن ابھی ان کے دل کی تمنا پوری نہیں ہوئی۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تمہیں حرف غلط کی طرح مٹا ہی دیا جائے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ :-

یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَکَ (ال عمران ۳ :- ۱۵۴) "اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے۔" پھر زیر نظر آیت کے الفاظ "وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ" ان کی ذہنیت کے ترجمان ہیں کہ "جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہی انہیں اچھی لگتی ہے۔" اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی دی گئی کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلمانوں کا حقیقی دوست اور خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا اگرچہ اس آیت میں اصل اشارہ یہود مدینہ کی جانب ہے۔ یہ لوگ اپنا بغض اسلام مسلمانوں سے چھپا ہی نہیں سکتے اس لئے اکثر بے اختیار ہی ان کی زبانوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں کے اندر جو دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہے اس کا کوئی شعلہ ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔

قرآن کریم اس سے زیادہ وضاحت اور کیا کرے ؟

۲۲۶ "فرمایا ہم نے تو فہم و بصیرت کی نشانیاں تم پر واضح کر دی ہیں" اگر اب بھی تم نہ سمجھو تو تمہاری اپنی مرضی۔ اس ٹکڑے کا مفہوم دو طرح سمجھا جا سکتا ہے ایک یہ کہ ان کافروں کے بغض و عداوت کے آثار و علامات تم پر روشن ہو گئے ہیں جن سے تم فوراً انہیں پہچان سکتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے ان سے ترک موالات کی آیتیں کھول کر بیان کی جا چکی ہیں اور اس بات کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا گیا۔ فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْہِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ نٰدِمِیْنَ (المائدہ ۵ :- ۵۲) "اے پیغمبر اسلام تم دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں نفاق کا روگ ہے وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے الگ رہ کر کسی مصیبت کے پھیر میں نہ آجائیں تو یاد رکھو کہ وہ وقت دور نہیں جب اللہ فتح دے گا یا اس کی طرف سے کوئی بات ظاہر ہو جائے گی اور اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے۔"

هَاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ

تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے تم اللہ کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ہو[۲۲۷] جتنی کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں ان کا احترام کرتے ہو۔ وہ جب کبھی تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان والے ہیں۔ لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوش غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ دانت پیستے ہیں۔ تم کہہ دو اتنا ہی نہیں بلکہ جوش غضب میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالو اور یاد رکھو' اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسانوں کے سینوں میں پوشیدہ[۲۲۸]

تعجب ہے کہ وہ تم سے جتنی دشمنی رکھتے ہیں تم اتنا ہی ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو

۲۲۷ تعجب تو یہ ہے کہ تم تو ان کی قرابت دار، یا دوستی کے پیش نظر ان سے محبت کرتے ہو حالانکہ وہ اختلاف مذہب کی وجہ سے تم سے محبت نہیں کرتے باوجود اس کے کہ تم ہی سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور پوری توراۃ پر بھی تمہارا ہی ایمان ہے اور کافر تمام کتابوں پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی یہود پوری تورات پر ایمان لاتے ہیں اس لئے کہ اگر ان کا ایمان پوری تورات پر ہوتا تو اس میں تو نبی اعظم و آخر ﷺ کے پورے اوصاف بیان کئے گئے ہیں اس لئے ان کو اس پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ اس میں مسلمانوں کو یہ بھی تنبیہہ کر دی کہ جتنے تم لوگ حق پر مضبوط ہو اس سے زیادہ تو وہ لوگ باطل پر سخت ہیں۔

پھر ان کی مزید بری عادت اور چال یہ ہے کہ وہ جب تم سے ملتے ہیں تو بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں حالانکہ وہ یہ بات کہنے میں ذرا بھی سچے نہیں ہیں۔ کوئی اسکیمر جب ایک سکیم بناتا ہے اور وہ سکیم اس کو فیل ہوتی نظر آتی ہے تو اس کے غصے کی عجیب کیفیت ہوتی ہے پھر جب اس کو غصہ نکالنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے آپ ہی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے' دانت پیستا ہے' تیوری چڑھاتا ہے' انگلیاں کاٹتا ہے اور بعض اوقات اپنی بزدلی کی آخری حد تک پہنچ کر اپنی جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكُمْ
سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ

ہے۔ ۱۱۹ اگر تمہارے لئے کوئی بھلائی کی بات ہو جائے تو انہیں برا لگے' برائی ہو جائے تو بڑے ہی خوش ہوں ۲۲۹ لیکن یاد رکھو اگر تم نے صبر کیا اور تقویٰ کی راہ اختیار کی تو ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے گا۔ جیسے کچھ بھی ان کے کرتوت ہیں اللہ کا قانون

جو اپنی جان کا خود دشمن ہے اسے تم کیا کہو گے؟

۲۲۸ غیظ کیا ہے؟ غیظ شدید غضب کو کہتے ہیں اور دراصل یہ وہ حرارت ہے جو انسان قلب کے خون کے جوش میں آنے سے اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ فرمایا ان سے برملا کہو "مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ" کہ تم اپنے غصے ہی میں مرجاؤ اور یہ کہنا تمہارا زبان سے نہیں بلکہ عمل سے ہونا چاہئے۔ ان کو یہ غصہ کیوں آرہا ہے؟ تم مسلمانوں کی کامیابیاں دیکھ کر جو ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور تم پورا زور لگا کر کامیابیوں میں مزید آگے بڑھنے کی عملی کوشش کرو اور تمہاری یہ کوشش بزبان حال یہ پکارے گی کہ "مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ" اب تمہارے لئے چارہ ہی کیا ہے اگر تم ہماری کامیابیوں کی وجہ سے مرتے ہو تو پھر گھل گھل کر مرجاؤ تمہارے اس غصہ کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور اس طرح کا کہا ہوا یقیناً زبان سے کہے ہوئے سے بھی زیادہ وزن رکھتا ہے۔

اس آیت میں اول تو مسلمانوں کو غیروں کے ساتھ اس دلی محبت سے روکا ہے جس سے اپنے رازوں سے دوسروں کو واقفیت ہوتی ہے اور شرارتیوں کو محبت کے رنگ میں شرارتیں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات اس قدر خراب نہ ہوتے تو اسلام بھی اتنی سختی کے ساتھ ممانعت نہ کرتا۔ اس لئے کہ اسلام تو صلح و آشتی کا دین ہے لیکن وہ اس سادگی کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اس صلح کی آڑ میں کوئی نیچے سے جڑیں کاٹتا رہے تاکہ اسلام کا درخت پھلنے پھولنے کی بجائے سوکھ کر رہ جائے۔ نہیں نہیں وہ اس طرح جڑ کاٹنے والوں کی اپنی جڑ کاٹ کر رکھ دینے کی سختی سے ہدایت کرتا ہے۔ جو اسلام میں محض اس لئے داخل ہوئے کہ ان کو اس طرح اسلام کا منہدم کر دینے کا اچھا موقع مل جائے گا وہ ایسے ستونوں کو فوراً گرا دینے کا حکم دیتا ہے اور ان کے سہارے اسلام کی عمارت کھڑی کرنا اسلام نہیں بلکہ کفر قرار دیتا ہے۔

تمہاری خوشی سے وہ ناخوش' تمہاری ناخوشی سے وہ خوش ہوں تو تم کو کیا کرنا چاہئے؟

۲۲۹ منافقوں کی خباثت نفس اور کینہ پروری کا بیان ہے کہ وہ مسلمانوں کی تکلیف سے خوش

شَيْءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾ وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ

قدرت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ ۱۲۰ ۲۳۰

اے پیغمبر اسلام! وہ وقت یاد کرو جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور

ہوتے ہیں اور ان کی خوشی اور خوشحالی سے رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں حسنۃ ہر ایک خوش کرنے والے امر کو کہتے ہیں جس میں رغبت کی جاسکے اور اس سے مراد ہر ایک نعمت بھی ہے جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا حالت میں پہنچے اور اس کی ضد سیۃ ہے۔ اس جگہ حسنۃ سے مسلمانوں کی اندرونی تنظیم یا کافروں پر ان کا غلبہ اور ان کی فتح مراد ہو سکتی ہے اور سیئۃ سے اندرونی بد نظمی یا ہنگامی اور وقتی شکست بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اس طرح کے ارشادات قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئے ہیں مثلاً ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :- وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيْتَنِي كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا

(النساء ۴ :- ۷۲، ۷۳)

اور دیکھو تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ جنگ کا نام سن کر اس کے قدم پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں پھر اگر لڑائی میں تم پر کوئی مصیبت آپڑے تو خوش ہو اور کہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم ہو تو حسد سے جل مرے اور بے اختیار بول اٹھے گویا تم میں اور اس میں محبت کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں کہ اے کاش میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا تاکہ بہت کچھ کامیابی حاصل کر لیتا۔ لَيُبَطِّئَنَّ یبطئی بطؤ سے ہے جس کے معنی ہی چلنے میں قدم جلدی نہ اٹھنا اور پیچھے رہ جانا (راغب) اور اسراع یعنی جلدی چلنے کا نقیض ہے۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ :-

إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ وَيَتَوَلَّوا وَّهُمْ فَرِحُونَ۔

(التوبۃ ۹ :- ۵۰)

"اے پیغمبر اسلام! اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آجائے تو وہ ان منافقوں کو بری لگتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پیش آجائے تو کہنے لگیں گے اس خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنے لئے مصلحت بنی کر لی تھی اور پھر گردن موڑ کر خوشی خوشی چل دیتے ہیں۔"

ان کی مکاری سے آپ ﷺ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا وہ قانون الٰہی کے شکنجے میں ہیں

۲۳۰ اس آیت کا لفظ "تَمْسَسْكُمْ" وہ بھی اپنے اندر بہت پوشیدہ مضمون رکھتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی بھلائی چھو بھی جائے تو ان کو دکھ پہنچتا ہے جس سے ان کی اندرونی کیفیت کی وضاحت ہو جاتی

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۱۲۱

لڑائی کے لئے مسلمانوں کو جابجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۳۱ ۱۲۱

ہے لفظ مس سے اس طرح اشارہ ہے کہ تمہاری ادنیٰ بہتری بھی ان کی رنجیدہ خاطری کا سامان پیدا کر دیتی ہے پھر فرمایا کہ "ان تصبروا" یعنی اگر تم پوری ہمت لگا کر کام کرو گے اور تمہاری اندرونی تنظیم تن من دھن سے اپنے کام میں مصروف رہے گی تو ان کا مکر کبھی کامیاب نہیں ہوگا اور ان کی خفیہ تدبیریں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ تمہارے قدم ڈگمگا نہ گئے تو یقیناً ان کی تدبیریں اور چالیں تمہارا کچھ نقصان نہیں کریں گی۔ یہ لوگ گویا اتنے گئے گزرے ہیں کہ انسانیت نام کی شے ان کے اندر موجود ہی نہیں رہی اس لئے کہ دکھ اور تکلیف تو ایسی چیزیں ہیں کہ جب بھی کبھی کسی شخص کو پہنچ جائے تو فطرت انسانی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ رنجش اور کدورت جو تھوڑی بہت باہم ہو وہ دور ہو کر اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے مگر ان کی عداوت اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں پر مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہ حالت تو ان منافقین کی تھی اور ان کی عداوت کا یہ بیان ہے لیکن آج کل مسلمانوں کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے بلکہ اس سے بھی بدتر جو ان منافقین کی تھی آپ نے ایک سے زیادہ بار یہ بات سنی ہوگی کہ ایک پارٹی کا لیڈر مر گیا اور دوسری پارٹی مٹھائی تقسیم کر رہی ہے اور ان کی خوشی کا یہ عالم ہے کہ بھنگڑے ڈالے جا رہے ہیں اور شہنائیاں بجائی جا رہی ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انسانی قدریں دن بدن مٹتی جا رہی ہیں۔ اے کاش! اے قوم مسلم کبھی تم نے قرآن کو بھی سمجھا ہوتا تو آج تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔

غزوہ احد کا تذکرہ، پس منظر اور تحریک اسلامی پر اس کے اثرات

۲۳۱ اس آیت سے غزوہ احد کا تذکرہ شروع کیا جا رہا ہے۔ غزوہ بدر کے بعد یہ پہلا بڑا معرکہ ہے۔ بدر میں قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کی جو گت بنی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالات پر گوناگوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدم اولین تھا۔ قریش کے بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی میں سد راہ تھا فنا ہوگئے۔ خصوصاً عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی سیاست کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھ دیا تھا لیکن قریش کے اصلی زور قوت کا معیار بہت ماند پڑ گیا تھا۔

مدینہ میں فتح بدر تک عبداللہ بن ابی سلول اعلانیہ کافر تھا لیکن وہ بظاہر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگیا تھا اگرچہ وہ تمام عمر منافق رہا۔ قریش کو پہلے صرف حضرمی کے قتل کا رونا تھا اور اب یعنی بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ

تھا۔ قریش نے ایک سال تک اپنے مقتولین کا بدلہ لینے کے لئے بیسیوں کوششیں کیں لیکن ہر بار ناکام رہے۔ اب انہوں نے مکمل تیاری کر لی اور ایک بہت بڑا لشکر تشکیل دیا اور بہت کچھ سروسامان تیار کیا۔ رسول اللہ ﷺ قبا میں تھے کہ آپ ﷺ کو مکہ سے اپنے آدمیوں کا روانہ کیا ہوا خط ملا۔ جس میں یہ تحریر تھا کہ قریش مکہ کا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے مکہ سے روانہ ہو چکا ہے اس خبر کو آپ ﷺ نے عام پھیلنے نہ دیا اور اپنی تیاری مکمل کرنے کی فکر شروع کر دی۔ جب تک قریش کے اس طرح سے آنے کی خبر عام ہوئی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مسجد نبوی ﷺ میں جمع کیا اور مشورے لئے رائے طلب فرمائی۔ آپ ﷺ نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا کہ شہر کے اندر رہ کر اگر دفاع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ شہر کے اندر رہ کر لڑنے کے تمام فوائد بھی آپ ﷺ نے بیان فرمائے تاہم یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے رائے طلب کی تعجب ہے کہ آپ ﷺ کی اس رائے سے عبداللہ بن ابی بھی متفق ہوگیا۔ تاہم چونکہ اس اجتماع عام میں یہ نوجوان لوگ بھی تھے جو بدر میں شریک معرکہ نہ ہوئے تھے وہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنے جوش اپنے ایمان اور اپنے جذبہ جانثاری کو عملی طور پر پیش کریں اس لئے انہوں نے اصرار کیا کہ باہر کھلے میدان میں جا کر لڑائی کی جائے۔ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد نبی اعظم و آخر ﷺ اپنے گھر تشریف لے گئے اور جب آپ ﷺ دوبارہ مسجد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ لباس جنگ میں ملبوس تھے۔

لوگوں نے جب یہ دیکھا تو نادم ہوئے کہ انہوں نے آپ ﷺ کی رائے سے اپنی رائے پر اصرار کیا اس لئے آپ ﷺ ان کے کہنے پر لباس جنگ پہن کر تشریف لائے اب وہ سب معذرت خواہ تھے اور فرمایا جو آپ ﷺ کی رائے ہے اس پر عمل فرمائیں ہم آپ ﷺ کے ساتھ ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ لباس جنگ پہن لے اور پھر لڑے بغیر اس کو اتار دے۔" اب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو مسجد نبوی ﷺ کے باہر جمع ہونے کا حکم دیا اور ازیں بعد پورے لشکر کو مدینہ کے باہر ایک مقام جو "شوط" کہلاتا تھا اس کو معسکر قرار دیا یہ جگہ شہر سے باہر ایک میل دور بھی نہ تھی اس لئے کہ لڑائی کی روانگی کے لئے لشکر کے کوچ کا آغاز معسکر سے ہی ہونا چاہئے۔

شوط کے معسکر میں مدنی لشکر عصر اور مغرب کے درمیان پہنچا آپ ﷺ نے مغرب کے بعد تک سارے انتظامات مکمل کر لئے۔ دشمن بمشکل دو میل کے فاصلہ پر خیمہ زن تھا اور اس کے افراد اردگرد کے کھیتوں میں اپنے جانور چرا رہے تھے۔ شوط اور مکی لشکر کے درمیان کوئی بھی ایسی جغرافیائی حد حائل نہ تھی جس کی وجہ سے کہا جائے کہ اہل مکہ سے مدنی لشکر کا مدینہ سے خروج پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ اس وجہ سے ضروری تھا کہ رات کے لئے مکی جانب سے لشکر اسلامی کی حفاظت کی جائے آپ ﷺ نے اس کا مکمل انتظام کیا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ ہتھیار باندھ کر تمام رات پہرہ دیتے رہے۔

اور حضرت زبیر بن العوام جو گھوڑ سوار دستے کے کمانڈر تھے انہیں مکی معسکر کی جانب تعین فرمایا کہ مکی

رسالہ کے خلاف پہلی رکاوٹ وہ ثابت ہوں اور گشت کی ذمہ داری محمد بن مسلمہ کو تفویض کی گئی۔

ابھی پورا لشکر شوط ہی میں تھا کہ عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ واپس چلا گیا اس نے بہانہ یہ بنایا کہ چونکہ مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کی تجویز دی تھی اس پر عمل نہیں کیا گیا اور کھلے میدان میں اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ وہ صحیح نہیں سمجھتا اس لئے اپنے آدمیوں کو مروانا مناسب خیال نہیں سمجھتا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا کہ "اللہ اپنے رسول ﷺ کو تمہاری ضرورت سے بے نیاز کر دے گا۔" اب آپ ﷺ کے لشکر کی تعداد سات سو رہ گئی تھی۔ ان میں سے صرف ایک سو زرہ پوش تھے۔ قریش مکہ کے لشکر کی تعداد تین ہزار بتائی جاتی ہے اگرچہ قرائن سے جو اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی قریش کا صرف اپنا لشکر جو مکہ سے نکلا تھا اس کی تعداد دو ہزار نو سو افراد پر مشتمل تھی جس میں سے تین صد سانڈنی سوار اور دو صد گھوڑ سوار بھی تھے اور قریش کے حلیف بھی ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے اس لئے ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لشکر قریش کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی تھیں جو قریش کے نوجوانوں کو بھڑکانے کے لئے لائی گئی تھیں۔ جن میں سے چند کے نام ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ ہند عتبہ کی بیٹی جو ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ تھی۔ ۲۔ ام حکیم جو عکرمہ کی والدہ اور ابوجہل مقتول بدر کی بیوی تھی۔ ۳۔ فاطمہ بنت ولید جو خالد بن ولید جو اس وقت مکی فوج کے سپہ سالار تھے ان کی بہن۔ ۴۔ برزہ مسعود ثقفی جو طائف کا امیر تھا اس کی بیٹی تھی۔ ۵۔ ریطہ عمرو بن عاص کی زوجہ اور ۶۔ حناس جو مصعب بن عمیر کی ماں تھی اور پھر ان کے ساتھ ان کی باندیاں اور خدمت گزار عورتیں بھی تھیں جن کا ذکر تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

عام مورخین و مفسرین کی رائے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز شوط ہی میں ادا کی لیکن کچھ لوگوں کی رائے میں صبح کی نماز سے قبل ہی یہاں سے روانگی ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے کیونکہ صبح کو روشنی ہو جاتی ہے اور تڑکے یہاں سے اٹھنا ان کے نزدیک سپہ سالاری اصولوں کے منافی ہے۔ حالانکہ اسلام میں صبح کی نماز بہت سویرے ادا کرنے کی ہدایات بھی موجود ہیں اور خصوصاً سفر جاری کرنے کے لئے تو نماز بہت جلد ادا کی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہیں سے اٹھ کر لشکر کو ترتیب دینے کا ذکر زیر نظر آیت میں دیا گیا ہے اور یہ صرف ایک جملہ "اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ" کے الفاظ سے سب کچھ قلمبند کر دیا گیا کہ اس رات رسول اللہ ﷺ اپنے اہل یعنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے کئے گئے انتظامات کے مطابق اپنے خیمہ ہی میں چھوڑ کر لشکر کی ترتیب کے لئے باہر نکل کھڑے ہوئے اور یہ بات صحیح احادیث سے واضح ہے کہ اس غزوہ احد میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا شریک تھیں اور یہ بھی کہ اسلامی لشکر کی مددگار عورتوں کی نگہبان بھی تھیں۔ اس میں یہ ہدایت بھی مضمر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے تو اس کی تعمیل میں اہل و عیال کی محبت سنگ راہ نہیں ہونی

إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٢٢﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ

اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں[۲۳۲] حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں تو چاہئے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھیں[۲۳۳]۔ ۱۲۲

اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان جنگ میں تمہیں فتح مند کیا تھا حالانکہ

چاہئے۔ پھر اس کے بعد وہاں سے نکل کر محاذ جنگ تک پہنچنے کے جزئی واقعات کا ذکر نہیں فرمایا اور محاذ جنگ میں پہلے کام کا ذکر کر دیا کہ "تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ" یعنی آپ ﷺ مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات پر جما رہے تھے۔

اس ٹکڑے میں اس وقت کے تمام کئے گئے انتظامات کا ذکر کر دیا کہ جگہ کا تعین، صفوں کی آراستگی، رسد کا انتظام، زخمیوں کی دیکھ بھال، حملے کی صورت میں دفاع اور بہادروں کی جنگ آزمائی کے لئے میدان میں نکلنا۔ اپنے پرچم کی حفاظت۔ بطور کمک پیچھے رکھنے والوں کے لئے ہدایات یعنی یہ سارے کام جو ایک سپہ سالار کے ذمہ ہیں آپ ﷺ نے خود ادا کئے۔ جن میں سے پچاس آدمیوں کو جبل عینین پر تعین کرنا بھی شامل تھا۔ اور "وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" میں اشارہ فرما دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین کے ساتھ جو کچھ پیش آیا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور کوئی شے اس کے علم سے باہر نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کون میدان جنگ تک پہنچے گا اور کون راستہ سے ہٹ کر واپس چلا جائے گا۔ کس کس کے لئے اس میدان میں کام آنا ہے اور کس کس کو غازی بننا ہے اور اس طرح اس جنگ کا انجام بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے حالات سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہے۔

ہاں! تم میں سے دو جماعتوں نے ہمت ہارنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ نے ان کی ہمت بندھا دی

۲۳۲ یہ دو جماعتیں کونسی تھیں جن کے دل ڈھیلے پڑ گئے تھے اور وہ ہمت ہارنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمت بندھا دی۔ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عبداللہ بن ابی جو غزوہ بدر کے بعد ایمان لایا تھا اور غزوہ احد کے وقت اس نے مدینہ کے اندر رہ کر ہی جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے کو خود چھوڑ کر دوسرے نوجوانوں کی رائے کو قبول کر لیا اور یقیناً مشیت ایزدی سے ایسا ہوا

تھا اگر وہ مخلص ہوتا تو وہ بھی نبی کریم ﷺ کی اختیار کردہ راہ کو اختیار کر لیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس مدینہ لوٹ گیا۔ دراصل اس وقت مدینہ سے باہر نکل کر واپس جانے میں اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ باقی لوگ یہ منظر دیکھ کر بددل ہو جائیں۔ یہ گویا اس کی ایسے نازک وقت میں ایک چال تھی۔ اس کے نکلنے کے ساتھ ہی اوس و خزرج کے کچھ لوگوں کے دلوں میں بھی کچھ ایسی باتیں نے جنم لیا لیکن ان کے اظہار کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ اس طرح اس کی یہ چال بھی کامیاب نہ ہو سکی بلکہ وہ بری طرح ناکام ہوگیا۔ اور اس کی منافقت کھل کر سامنے آگئی۔ بس انہی دو جماعتوں کا اس جگہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ "هَمَّتْ" اس دلی ارادہ کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں پیدا ہو اور عملی طور پر اس کا ابھی اظہار نہ ہوا ہو خواہ وہ ارادہ اچھا ہو یا برا۔ فرمایا ان کے دلوں میں یہ پیدا ہوا ہی تھا کہ اللہ نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا اور انہوں نے عملی طور پر ابھی اس کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات بھی اس سے واضح ہوگئی کہ ارادہ پر کوئی مواخذہ نہیں بلکہ مواخذہ عملی اقدام پر ہوتا ہے بلکہ آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق جب کسی شخص نے کسی برے کام کا ارادہ کر لیا ہو اور پھر وہ اپنے ارادہ سے باز آجائے تو اس کو اس بات پر اجر ملتا ہے کہ اس نے اندھا بہرا ہو کر اپنے دل میں پیدا ہونے والے ارادہ کے مطابق عمل نہیں شروع کیا بلکہ اس کو سمجھ سوچ کر ترک کر دیا کہ اس کے مطابق عمل صحیح نہیں۔

اس جگہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ان دونوں گروہوں کا مددگار تھا" اس لئے ان کے دل میں پیدا ہونے والا وہم وہیں روک لیا گیا۔ اور یہ خیال بھی انہیں پیدا ہوا اپنی قلت تعداد، قلت سامان اور مادی کمزوری کی بناء پر نہ کہ ضعف ایمان کی بناء پر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "اَللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" خود ان کے ایمان کامل کی شہادت دے رہا ہے۔ اس لئے گویا ان دونوں قبیلوں کے لئے اگر کچھ عتاب بھی پایا جاتا ہے تاہم یہ بشارت بھی ان ہی کے لئے ہے کہ اللہ ان دونوں جماعتوں کا دوست ہے یا کارساز ہے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کامل ایمان کی ایک نشانی ہے

۲۳۳ "جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں تو چاہئے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھیں" اس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ کثرت تعداد اور کثرت سازو سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں! اپنی مکمل اور ہر لحاظ سے بھرپور تیاری بے شک ضروری ہے اور بقدر استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر ہی رکھنا چاہئے۔ چونکہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ کو کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ اس مادی ضعف کی بناء پر تھا اس لئے ان کے وسوسہ کا علاج توکل ہی سے بتلایا گیا کہ توکل و اعتماد ان وساوس کے لئے نسخہ اکسیر ہے۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ایک ہے۔ محققین نے اس کی حقیت پر بحثیں کی ہیں اس جگہ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ توکل کے معنی یہ نہیں کہ اسباب ظاہری سے بالکل قطع تعلق کر کے اللہ پر اعتماد کیا جائے

وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ

تم دل ہار چکے تھے اور تمہاری کامیابی کے آثار بھی نظر نہیں[۲۳۴] آتے تھے۔ پس اللہ سے ڈرو تاکہ تمہارے اندر اس کی نعمتوں کی قدر پہچاننے کا جوش پیدا ہو جائے[۲۳۵]۔ ۱۲۳

اے پیغمبر اسلام! وہ وقت بھی یاد کرو جب تم ایمان والوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا

بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام اسباب ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور ان سب کو اختیار کرے اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کر دے اور ان ظاہری اسباب پر جو اس نے بڑی محنت اور مشقت سے اکٹھے کئے ہیں کسی طرح کا فخر و ناز نہ کرے۔ شیخی نہ بگھارے اور اپنا مکمل اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھے جس نے ان ظاہری اسباب کو اکٹھا کرنے کی توفیق دی اور ان ظاہری اسباب کو پیدا فرمایا۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے اور اس جہاد میں مسلمانوں کے لشکر کو جنگ کے لئے منظم کرنا۔ رات کے وقت اپنی قیام گاہ کو چھوڑ کر لشکر کی تیاری میں مصروف ہو جانا۔ سپہ سالاروں کے قواعد کے مطابق جگہ کا انتخاب کرنا۔ مختلف لوگوں کے ذمہ ان کی ڈیوٹیوں کا تقسیم کرنا خود اپنی ذات اقدس کا جنگی لباس زرہیں' خود' تلوار' بندوق اور دوسرے اسباب کا اختیار کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود بنفس نفیس جنگ میں شریک ہونا یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ مادی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں ان سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں ہے۔ اس جگہ مومن اور غیر مومن میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ مومن سب سامان اور مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ و توکل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرتا ہے اور غیر مومن کو یہ نظریہ اور عقیدہ نصیب نہیں ہوتا اس کو صرف اپنی مادی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے اور اس فرق کا ظہور ایک سچے مسلم اور ایک پکے دنیا دار کے عمل سے واضح ہو جاتا ہے جو ہمیشہ دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔

ذرا میدان بدر کا نقشہ اپنے ذہن میں لاؤ کہ تمہاری کیا حالت تھی اور اللہ نے کیا کر دکھایا؟

۲۳۴ نبی اعظم و آخر ﷺ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو قریش نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی کو جسے ہجرت رسول ﷺ سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر نبی کریم ﷺ کے مدینہ پہنچ جانے اور اوس و خزرج کی اکثریت کے مسلمان ہونے کی وجہ سے پانی پھر چکا تھا خط لکھا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمہارے مردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیں گے۔ عبداللہ بن ابی اس پر کچھ آمادہ ہوا مگر رسول اللہ ﷺ نے بروقت اس کی شر کی

روک تھام کر لی۔ پھر سعد بن معاذ رئیس مدینہ عمرے کے لئے مکہ گئے وہاں عین زمزم کے دروازے پر ابوجہل نے ان کو روک کر کہا کہ تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دو اور ان کی امداد و اعانت کا دم بھرو اور ہم تمہیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں؟ اگر تم امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا واللہ اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے یعنی مدینہ کی راہ سے تمہاری راہ گزر۔ یہ گویا اہل مکہ کی طرف سے اعلان تھا کہ زیارت بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے اور اسی کا جواب اہل مدینہ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفین اسلام کے لئے پرخطر ہے۔

اور فی الواقع اس وقت مسلمانوں کے پاس اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں تاکہ قریش اور ان کے حلیف قبائل جن کا مفاد اس راستہ سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مزاحمانہ پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خیر اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم و نسق اور اطراف مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ فرمائی وہ اس شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اہم تدبیریں اختیار کیں۔

ایک یہ کہ مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرفداری کے معاہدے کر لیں۔ چنانچہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری پوری کامیابی ہوئی کیونکہ تقریباً سارے قبائل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے ہوگئے۔ دوسری تدبیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لئے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کر دیئے اور بعض دستوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تشریف لے جاتے رہے جن کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں۔

حالات اس طرح چلتے رہے یہاں تک ۲ ہجری کے شعبان میں جو فروری یا مارچ ۶۲۳ء کے برابر ہوگا قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار اشرفی کا مال تھا اور تیس یا چالیس سے زیادہ محافظ تھے شام سے مکہ کی طرف پلٹتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا چونکہ مال زیادہ اور محافظ کم تھے اور سابق حالات کی بناء پر خطرہ قوی تھا کہ کہیں مسلمانوں کا کوئی طاقتور دستہ اس پر چھاپہ نہ مار دے اس لئے سردار قافلہ ابوسفیان نے اس پر خطر علاقہ میں پہنچنے سے پہلے ہی ایک آدمی کو مکہ کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہاں سے مدد لے آئے۔ اس شخص نے مکہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اونٹ کے کان کاٹے، اس کی ناک چیر دی اس کے کجاوے کو الٹ کر رکھ دیا اور اپنی قمیض پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیا اور کہنے لگا کہ قریش والو! اپنے تجارتی قافلہ کی خبر لو تمہارے اموال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آدمی لے کر ان

کے درپے ہوگیا ہے مجھے امید نہیں کہ تم انہیں پا سکو گے دوڑو مدد کے لئے۔ اس پر سارے مکہ میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ تقریباً ایک ہزار جنگی بہادر جن میں سے چھ سو زرہ پوش تھے اور جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا پوری شان و شوکت کے ساتھ لڑنے کے لئے چلے ان کے پیش نظر صرف یہ کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچا لائیں بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں اور مدینہ میں یہ مخالف طاقت جو ابھی نئی نئی مجتمع ہونا شروع ہوئی ہے اس کو پورے زور سے کچل کر رکھ دیں اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آئندہ کے لئے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

اب نبی کریم ﷺ نے جو حالات سے ہر وقت باخبر رہتے تھے محسوس فرمایا کہ فیصلہ کی گھڑی آپہنچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ ایک جسورانہ اقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو تحریک اسلامی ہمیشہ کے لئے بے جان ہو جائے گی بلکہ بعید نہیں کہ اس تحریک کے لئے سر اٹھانے کا پھر کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ اس دارالہجرۃ میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ مہاجرین بے سروسامان' انصار ابھی ناآزمودہ' یہودی قبائل برسر مخالفت۔ خود مدینہ میں منافقین ایک اچھا خاصا طاقت ور عنصر موجود اور گردو پیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً" ان کے ہمدرد بھی ایسے حالات میں اگر قریش مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دبکے بیٹھے رہیں تب بھی مسلمانوں کی ایسی ہوا اکھڑے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لئے ملک بھر میں کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی اور آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مدینہ کے یہودی اور منافقین و مشرکین علی الاعلان سر اٹھائیں گے اور اس دارالہجرۃ میں جینا مشکل کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب و اثر نہ رہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان و مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تامل ہو۔ اس بناء پر نبی رحمت ﷺ نے عزم فرمایا کہ جو طاقت بھی اس وقت میسر ہے اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل بوتا کس میں ہے اور کس میں نہیں۔

اس فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کر کے آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ساری پوزیشن صاف صاف رکھ دی کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب میں قریش کا لشکر چلا آرہا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمہیں مل جائے گا بتاؤ تم کس کے مقابلہ میں چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے لیکن رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر کچھ اور تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اپنا سوال دہرایا اس پر مہاجرین میں سے مقداد بن عمرو نے اٹھ کر کہا "یارسول اللہ ﷺ جدھر آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو حکم دے رہا ہے اس طرف چلئے

ہم آپ ﷺ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم تو یہاں بیٹھیں گے نہیں ہم کہتے ہیں کہ چلئے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا خدا اور ہم آپ ﷺ کے ساتھ ہیں اور اپنی جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔ مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ابھی تک فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی اور ان کے لئے یہ آزمائش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انہوں نے اول روز کیا تھا اسے وہ کہاں تک نباہنے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ نے براہ راست ان کو مخاطب کئے بغیر پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس پر سعد بن معاذ اٹھے اور انہوں نے عرض کیا شاید حضور ﷺ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! انہوں نے کہا "ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ آپ ﷺ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ ﷺ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول ﷺ! جو کچھ آپ ﷺ نے ارادہ فرما لیا ہے اسے کر گزریئے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ﷺ ہم کو لے کہ سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپ ﷺ کے ساتھ کودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ ﷺ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جس کو دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ﷺ ہمیں لے چلیں۔

اب فیصلہ ہو گیا کہ قافلہ کے بجائے لشکر کفار ہی کے مقابلہ پر چلنا چاہئے لیکن یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جو لوگ اس تنگ وقت میں لڑائی کے لئے اٹھے ان کی تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی ۸۶ مہاجر ۶۱ قبیلہ اوس کے اور ۱۷۰ قبیلہ خزرج کے جس میں سے صرف دو تین کے پاس گھوڑے تھے اور باقی آدمیوں کے لئے ۷۰ اونٹوں سے زیادہ نہ تھے جن پر تین تین' چار چار اشخاص باری باری سوار ہوتے تھے۔ سامان جنگ بھی بالکل ناکافی تھا اور صرف ساٹھ آدمیوں کے ساتھ زرہیں تھیں۔ اس لئے چند سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر آدمی جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے دلوں میں سہم رہے تھے اور انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ مصلحت پرست لوگ جو اگرچہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں مال و جان کو زیاں ہو۔ اس مہم کو دیوانگی سے تعبیر کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ دینی جذبے نے ان لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے مگر نبی اور مومنین صادقین یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ وقت جان کی بازی لگانے ہی کا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر وہ نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی جدھر سے قریش کا لشکر آرہا تھا حالانکہ اگر ابتداء میں قافلہ کو لوٹنا مقصود ہوتا تو شمال مغرب کی راہ لی جاتی۔

۱۷/ رمضان کو بدر کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے

لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ ۞ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا

تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار نازل کئے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا؟ ۲۳۶ ۱۲۴

ہاں! بلاشبہ اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو یعنی جذبہ جہاد سے سرشار ہو اور جب

اور نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ تین کافروں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے اور وہ بھی پوری طرح مسلح نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور نہایت خضوع و تضرع کے ساتھ عرض کرنا شروع کی۔ "خدایا یہ ہیں قریش اپنے سامان غرور کے ساتھ آنے والے تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں۔ خداوند! بس اب آجائے تیری وہ مدد جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔"

اس معرکہ کار زار میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرین مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آراء تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آرہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش سے صرف وہی لوگ گزر سکتے تھے جنہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا تھا اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تل گئے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی اور ان لوگوں کی صداقت ایمانی اللہ تعالیٰ کی نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور قریش اپنے سارے غرور اور طاقت کے ساتھ آنے کے باوجود ان بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے اور ان کا سروسامان غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار جو ان کے گل ہائے سرسبد اور اسلام کے مخالف تحریک کے روح رواں تھے اس معرکہ میں ختم ہوگئے اور اس فیصلہ کن فتح نے عرب میں اسلام کو ایک قابل لحاظ طاقت بنا دیا۔ اس زیر نظر آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

تم نہایت کمزور تھے لیکن اللہ نے زور آوروں کے مقابلہ میں تم کو کامیاب کر دیا

۲۳۵ "اَنْتُمْ اَذِلَّة" یعنی تم تعداد کے لحاظ سے اور سروسامان کے لحاظ سے بہت تھوڑے تھے۔ لیکن تمہاری کمزوروں کے باوجود اللہ نے تمہاری مدد فرما دی اور تم کامیاب ہوگئے۔ اور بظاہر تمہاری کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تعداد کے لحاظ سے بھی تم غالب آنے کے قابل نہ تھے۔ کیا ابھی بھی تم کو الٰہی

وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ

ع ۱۳

ایسا ہو کہ دشمن اچانک تم پر چڑھ آئے تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ ۱۲۵ ۲۳۷

اور یاد رکھو یہ بات جو کہی جا رہی ہے تو صرف اس لئے کہ تمہارے لئے فتح و

نصرت کا یقین نہیں آیا۔ پھر فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم شکر کرنے والے بن جاؤ۔ مومن تو پہلے ہی شکر گزار ہوتا ہے پھر اس جگہ اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب بالکل صاف اور واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو کوئی نئی نعمت عطا فرماتا ہے تو گویا نئی شکر گزاری کا موقع بھی عطا کرتا ہے۔ پس شکر گزار بننے میں اس نئی نعمت کی طرف اشارہ ہے جو فتح مندی کی صورت میں نصیب ہوئی تھی۔ فرمایا اگر اب بھی تم تقویٰ اختیار کرو تو پھر تمہیں نصرت الٰہی اپنی مدد میں لے لے گی اور مزید شکر گزاری کا موقع مل جائے گا۔

تمہارے مقابلہ میں کفار تین ہزار ہیں تو تمہاری مدد کے لئے تین ہزار فرشتے نازل ہوں گے

۲۳۶ غزوہ احد میں مسلمانوں کی تعداد جو اس وقت مدینہ طیبہ سے نکلے تھے ایک ہزار تھی لیکن مدینہ طیبہ سے نکلنے کے بعد مقام شوط سے عبداللہ بن ابی منافقین کا سردار اپنے گروہ کے تین صد لوگوں کے ہمراہ الگ ہوگیا اور اس طرح مخلص مومنوں کی تعداد صرف سات سو باقی رہ گئی تھی جن میں سے پچاس آدمی معرکہ احد سے بالکل الگ کرکے جبل عینین پر کفار کے لشکر کی روک کے لئے مستقل مقرر کر دیئے گئے تھے باقی چھ صد پچاس مجاہدین میں سے تقریباً بیس پچیس آدمیوں کو مختلف ڈیوٹیوں پر تعین کیا گیا تھا اور باقی ۶۲۵ مجاہدین میدان کارزار میں جنگ آزما ہوئے تھے جن کو دو صفوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ نبی اعظم و آخر ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے حکم پاکر مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری مدد اللہ تعالیٰ تین ہزار فرشتوں سے فرمائے گا جو ایک طرح سے گویا اللہ تعالیٰ کی مدد کا اعلان تھا۔ اس طرح کی مدد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی بدر کے دن بھی فرمائی تھی جس کا ذکر آگے چل کر سورہ الانفال میں آئے گا۔ چونکہ میدان بدر میں کفار مکہ کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمان ان کے مقابلہ میں صرف تین صد تیرہ (۳۱۳) تھے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کی مدد کی خوشخبری سنائی تھی جیسا کہ ارشاد فرمایا:

اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (الانفال ۸ : ۹) "بلاشبہ میں تمہاری مدد کیلئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔" اور اس معرکہ احد میں مخالفین کی تعداد تین ہزار تھی اس لئے مسلمانوں کے

وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ

نصرت کی خوشخبری ہو[۲۳۶] اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں۔ مدد و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام

حوصلے بڑھانے کے لئے ارشاد الٰہی ہوا کہ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ (ال عمران ۳ : ۱۲۴) "کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے کرے۔"

جب مخالفین کی تعداد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعداد کو بڑھا دیا

۲۳۶ اس آیت میں فرشتوں کی تعداد کو پانچ ہزار کر دیا گیا۔ یہ جنگ احد ہی کا واقعہ ہے یا کسی دوسری جنگ کا۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ دراصل بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور اللہ نے ایک ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی جیسا کہ الانفال میں فرمایا گیا اور پھر احد کے میدان میں کفار کی تعداد تین ہزار تھی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد بھی تین ہزار فرشتوں سے فرما دی۔ اسی طرح جنگ حنین میں کفار مکہ کی تعداد پانچ ہزار تھی اور اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ پہلی دونوں مددیں تو بدر میں تھیں لیکن تیسری پانچ ہزار کی معرکہ احد میں تھی۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ بدر میں تو ایک ہزار فرشتوں نے مدد کی تھی لیکن احد میں پہلے تین ہزار کی مدد تھی اور بعد میں بڑھا کر پانچ ہزار کی مدد کر دی گئی۔ اور دراصل یہ ساری باتیں ہی درست ہیں اس لئے کہ ہر معرکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مومنین کی مدد فرمائی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی نصرت فرماتا ہی رہتا ہے اور پھر آئندہ آنے والی آیت نے خود اس ساری مدد کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

آیت زیر نظر میں ارشاد فرمایا کہ "مِّنْ فَوْرِهِمْ" فور دراصل شدت جوش کا نام ہے اور اس کا استعمال آگ کے متعلق ہوتا ہے جب وہ بھڑک جائے اور ہانڈی کے متعلق ہوتا ہے جب وہ ابلنے لگے۔ اور غصہ کی انتہائی حالت پر اس لفظ کو بولا جاتا ہے۔ اور اس لفظ سے فوراً ہے جو ہماری زبان میں استعمال ہے اور بطور استعارہ "فور" کے معنی فی الحال بھی کئے جاتے ہیں۔

"مُسَوِّمِيْنَ" جس کا اصل "سوم" اس کے معنی ہیں "کسی چیز کی تلاش میں جانا" (راغب) اور لسان العرب میں ہے کہ "سام" چار معنوں میں آتا ہے۔ چرنے کے لئے چھوڑا' طلب کیا' بیچا اور عذاب دیا۔ اس جگہ "مُسَوِّم" میں یہی آخری معنی مراد ہیں یعنی عذاب دینے والے مُسَوِّمِيْنَ تباہی ڈالنے والے یا عذاب دینے والے اور عام معنی "نشان کئے گئے" کئے جاتے ہیں۔

اس طرح تم کو فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں

۲۲۳۸ بدر، احد اور احزاب تینوں جنگوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابلے میں کوئی نسبت نہ رکھتی تھی۔ تینوں جنگوں کی ابتداء کفار کی طرف سے ہوئی جو بدنیتی پر مبنی تھی کیونکہ تینوں ہی جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا۔ تینوں ہی جنگوں میں امداد الٰہی یعنی نزول ملائکہ کی خوشخبری مسلمانوں کو سنائی گئی اور تینوں ہی جنگوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ جنگ احد میں اگرچہ مسلمانوں کو کافی نقصان ہوا لیکن وہ مسلمانوں کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ تھا تاہم انجام کار فتح اسلام ہی کو نصیب ہوئی۔ اور خصوصاً جنگ احزاب جس کا دوسرا نام خندق بھی ہے کے بعد دوبارہ کفار کو مدینہ پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد نبی اعظم و آخر ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور کفار کو اپنے گھر میں بھی مقابلہ کی جرات نہ ہوئی اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو طرح کا وعدہ دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے جیسا کہ سورہ نحل میں فرمایا گیا کہ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ (النحل ۱۶ : ۳۳) "اے پیغمبر اسلام! یہ لوگ جو انتظار کر رہے ہیں تو اس بات کے سوا اور کونسی بات اب باقی رہ گئی ہے کہ فرشتے ان پر اتر آئیں یا تیرے پروردگار کا مقرر حکم ظہور میں آجائے؟ سو اللہ تعالیٰ نے ان تینوں ہی جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی ملائکہ کے ساتھ مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور ان کو ان کے ارادے میں ناکام رکھا اور فتح مکہ میں گویا امر رب ہی آگیا کیونکہ اسلام کی حکومت قائم ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا۔ وہی کفار جو ہزارہا کا لشکر لے کر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جایا کرتے تھے اب ان میں اتنی بھی ہمت نہ رہی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں باہر میدان میں ہی نکل سکیں اور یہ بات واضح ہوگئی کہ امر حق کا مقابلہ کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا۔ پس ملائکہ کے نزول میں گویا دراصل اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا جس کا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور بروقت خوشخبری دے کر مسلمانوں کے دلوں کو بھی مضبوط کر دیا گیا کہ وہ کفار کی اکثریت سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں اللہ اور اس کے فرشتوں کی مدد ان کے ساتھ ہے اور پھر جس کا اللہ مددگار ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

پھر اس زیر نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نزول ملائکہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے صرف تمہارے لئے بشارت ٹھہرایا اور تاکہ تمہارے دل اس خوشخبری کے ساتھ مطمئن ہو جائیں اور بالکل اس طرح سورہ الانفال میں ارشاد فرمایا وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ "اور یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔"

ازیں بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

الْحَكِيمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ

کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۲۶ ۲۳۹

اور یہ اس لئے بھی تاکہ منکرین حق کی طاقت کا ایک حصہ بیکار کر دے یا انہیں

فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (الانفال ۸ : ۱۲) "اے پیغمبر اسلام! وہ وقت یاد کرو جب تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔"

اصولی باتیں جو ہم کو قرآن کریم کے ذریعہ سے معلوم ہیں ان کی بناء پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام تو نہیں لیا گیا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک ٹھیک ان کے مارنے کی جگہ پر بیٹھے اور کاری لگے اور اس کے مقابلہ میں کفار کی طرف سے جو وار اہل اسلام پر ہو وہ فرشتوں کی مدد سے خالی جائے جس سے کفار کی خوب پٹائی ہو اور مسلمانوں کو کوئی گزند نہ آئے۔

مدد و نصرت جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو سب طاقتوروں سے زیادہ طاقتور ہے

۲۳۹ یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے۔ غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آجائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجہ کامیابی کی ضرور ہوتی ہے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت تگنی تھی۔ میدان کا اچھا حصہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ پانی ان کے قبضہ میں تھا۔ ان کی فوج تجربہ کار جنگی جوان تھے اور بالمقابل مسلمانوں میں بچے، بوڑھے شامل تھے۔ ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے۔ میدان کی مشکلات اس پر مترادف تھیں پھر بھی کفار سخت نقصان اٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان احد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے سواروں کی ایک بڑی جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد بن ولید جیسے بہادر بھی ان کے ساتھ ہیں مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں۔ جنگ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی علاوہ ازیں مدینہ کے اندر یہودی دشمن اور منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود تھے مگر وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اس بڑی فوج کو ناکام اور نامراد کر کے واپس پھیرا اور وہ سخت پریشانی کے عالم میں بھاگے یقیناً یہ نزول ملائکہ ہی کا نتیجہ تھا۔

رہی یہ بات کہ جب ملائکہ کا نزول ہوا تھا تو کیا انہوں نے انسانوں کی شکل میں ہو کر جنگ بھی کی؟ جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نازل کیا وہ تو خود ہی بتا دی ہے اور حق بھی یہی ہے کہ ملائکہ کا تعلق

قلوب سے ہوتا ہے۔ پس مومنوں کو اطمینان قلب عطا کرنا اور کفار کے دل میں رعب ڈالنا یہ وہ غرض تھی جس کے لئے ملائکہ کا نزول ہوا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل مدد تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور وہی سب طاقتوروں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جس کام کے لئے اس نے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ سب کے سب گویا اس کے وعدے ہیں اور ان کا پورا ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ وہ سب کام اس طرح طے ہوئے جیسے ان کا ہونا علم الٰہی میں طے پایا تھا۔

اس طرح مدد الٰہی کا ذکر قرآن کریم میں کئی ایک دوسرے مقامات پر بھی کیا گیا ہے جس کی ایک سے زیادہ صورتیں بتائی گئی ہیں جس کو نزول ملائکہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی ہدایات پر بھی محمول کر سکتے ہیں تاہم حقیقت سب جگہ ایک ہی جیسی ہے اگر فرق ہے تو صرف الفاظ کا یا طریق بیان کا جو تفہیم کیلئے ایک لازمی اور لابدی امر ہے تاکہ اچھی طرح ایک بات ذہن نشین ہو جائے۔ اگرچہ ہر جگہ بدر و احد ہی مراد نہیں لیا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال ۸ : ۴۵، ۴۶)

"مسلمانو! جب کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو لڑائی میں ثابت قدم رہو اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور ہوا اکھڑ جائے گی اور جیسی کچھ بھی مصیبتیں پیش آئیں تم صبر کرو۔ اللہ ان کا ساتھی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔"

سورہ الانفال کی ان دو آیات میں پانچ باتیں تلقین کی گئیں اور یقیناً ان پانچوں باتوں میں ایک سے ایک بڑھ کر نصرت الٰہی اور مدد خداوندی پر مبنی ہے۔

۱۔ فرمایا ثابت قدم رہو کیونکہ میدان جنگ کی ساری کامیابی اس کے لئے ہوئی ہے جو آخر تک ثابت قدم رہے۔

۲۔ فرمایا اس نازک حالت میں بھی اللہ کو یاد کرو کیونکہ جسم کا ثبات دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل اس کا مضبوط رہے گا جو اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ فرمایا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور رسول کے بعد اپنے امام و سردار کی کیونکہ بغیر اطاعت یعنی ڈسپلن کے کوئی جماعت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۴۔ باہمی نزاع سے بچو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور بات بگڑ جائے گی۔

۵۔ کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں پوری مردانگی سے جھیلتے رہو بالآخر جیت اس کی ہے جو زیادہ جھیلنے والا

ہوگا۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہوا:

اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا وَلَوْ اَرٰىکَهُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ یُرِیْکُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلًا وَّیُقَلِّلُکُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ (الانفال ۸ : ۴۳، ۴۴) "اے پیغمبر اسلام! یہ وہ دن تھا کہ اللہ نے تجھے خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی اور اگر انہیں بہت کر کے دکھاتا تو مسلمانو! تم ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملہ میں جھگڑنے لگتے۔ اللہ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔ یقین کرو جو کچھ انسان کے سینے میں چھپا ہوتا ہے وہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور پھر دیکھو جب تم دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے اور اللہ نے ایسا کیا تھا کہ دشمن تمہاری نظروں میں تھوڑے دکھائی دیئے اور ان کی نظروں میں تم تھوڑے دکھائی دیئے اور یہ اس لئے کیا تھا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے اور سارے کاموں کا دارومدار اللہ کی ذات پر ہے۔

آیت ۴۳ میں اس خواب کی طرف اشارہ کیا ہے جو جنگ بدر سے پہلے پیغمبر اسلام نے دیکھا تھا اور جس میں دشمن ناکام اور مسلمان فتح مند دکھائی گئے تھے۔ خواب مسلمانوں کے لئے مزید تقویت کا باعث ہوا تھا۔ اور آیت ۴۴ میں دونوں جماعتوں یعنی مدنی جماعت اور مکی جماعت کے آمنے سامنے میدان جنگ میں کھڑے ہونے کی جگہ کا نقشہ بتایا گیا ہے کہ دونوں جماعتوں کے آمنے سامنے کے وقت دونوں ہی ایک دوسرے کو تھوڑا دیکھ رہی تھیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مسلمان تو فی الواقعہ تھوڑے تھے لیکن کفار مکہ کی تعداد ان سے تگنی تھی تاہم مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے جو لوگ تھے وہ تھوڑے ہی نظر آرہے تھے ایسا کیوں ہوا؟ فرمایا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی ہمت بڑھا کر جس فتح کا وعدہ ان کو دیا تھا اس کو پورا کر دکھائے سو وہ پورا ہوگیا۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ (الانفال ۸ : ۴۸) "اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے ان کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما کر کے دکھا دیئے تھے اور کہا تھا آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور کہنے لگا مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے۔" اس سورۃ الانفال کی آیت ۴۸ میں وہ شیطان کون تھا جس نے یہ کام کیا کہ پہلے مکہ والوں کو خوب ابھارا اور جب وہ اسلامی لشکر کے سامنے کھڑے ہوگئے تو خود بھاگ گیا؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ سراقہ بن مالک ابن جعشم تھا جس نے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا تھا لیکن لڑائی شروع ہوتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ مکہ کے لوگ بھی کہتے تھے کہ ہم کو سراقہ نے مروا دیا۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کر دی کہ مخالفین میں پھوٹ پڑ گئی

فَيَنْقَلِبُوا خَآئِبِينَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ

اس درجہ ذلیل و خوار کردے کہ نامراد ہو کر الٹے پاؤں پھر جائیں۔ ۲۴۰ ۱۲۷

اے پیغمبر اسلام! اس معاملہ میں تمہیں کوئی دخل نہیں یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ

اور ان نے کچھ لوگ دل چھوڑ گئے۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○ (التوبۃ ۹: ۲۶) "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور اس طرح ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور یہی جزاء ہے ان لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔" یہ جنگ حنین میں واقع پیش آیا تھا اور تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:

فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ (التوبۃ ۹: ۴۰) "اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ ہی کی بات ہے جس کے لئے بلندی ہے اور اللہ غالب آنے والا حکمت والا ہے۔"

یہ ہجرت کی رات کا واقعہ جب نبی اعظم و آخر ﷺ اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکر الصدیق کو ساتھ لے کر نکلے تھے اور اس خیال سے کہ آپ ﷺ کا تعاقب ضرور کیا جائے گا آپ ﷺ نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر جو شمال کی جانب تھی جنوب کی راہ اختیار کی یہاں تین دن تک آپ ﷺ غار ثور میں چھپے رہے۔ خون کے پیاسے دشمن آپ ﷺ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب وہ اسی غار کے دھانے تک پہنچ گئے اس وقت صدیق اکبر کو سخت خوف ہوا لیکن نبی رحمت ﷺ کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ

جنگ احد کے انجام کا ذکر کہ اس نصرت الٰہی کا نتیجہ کیا رہا؟

۲۴۰ جنگ احد میں نصرت الٰہی کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کردے اور دوسری یہ کہ ان کو بے نیل و مرام واپس کردے۔ یہی وہ جنگ ہے کہ اس میں جنگ نے کئی پہلو بدلے شروع میں مسلمانوں کو فتح ہوتی دکھائی گئی اور مسلمان مال غنیمت کے اکٹھے کرنے میں مصروف ہو چکے تھے کہ کفار نے دوسری طرف سے حملہ کر دیا یہ وہ وقت تھا جب جبل عینین والے مجاہدین کی اکثریت بھی اس مقام کو اس لئے چھوڑ چکی تھی کہ فتح ہوگئی لیکن اس طرف سے مخالفین نے حملہ کر دیا اور

عَلَيْهِمْ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

وہ اپنے قانون کے مطابق چاہے تو ان سے درگزر کرے اور چاہے تو عذاب دے یقیناً وہ ظلم کرنے والے ہیں۔ ۲۴۱ ۱۲۸

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کے لئے ہے وہ اپنے قانون کے مطابق جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے۔ کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ لے؟ اور وہ بخشے

بھگدڑ سا مچ گیا۔ مسلمانوں کا بھی بہت کچھ نقصان ہوا خصوصاً نبی کریم ﷺ کی شہادت کی غلط خبر پھیلا دی گئی جس سے لوگوں کے دل بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ کو بھی سخت زخم آئے لیکن زخمی ہونے کے باوجود آپ ﷺ اپنی سواری کے جانور پر بیٹھ گئے اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جاں نثاروں کو آواز دی دشمنوں کو للکارا اور اس طرح اللہ نے پھر اس ہزیمت سے نکال دکھایا۔ مسلمانوں نے جمع ہو کر دوبارہ حملہ کیا جس کی تاب نہ لا کر کفار دوبارہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اس طرح وقوع میں آئیں کہ ابتدائے جنگ میں مسلمانوں نے کفار کے ایک حصہ کو ہلاک کیا اور بہت سے لوگوں کو زخمی کیا اور پھر جب دوبارہ مسلمان پلٹے تو مشرکین کو پھر ذلیل ہو کر لوٹنا پڑا اور جس غرض کے لئے وہ آئے تھے اسے حاصل کئے بغیر واپس ہوئے اور اس آیت نے یہ بات واضح کر دی کہ جنگ احد میں کفار کو فتح نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے انہیں نامراد قرار دیا۔ کفار کا یہ حملہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ وہ اپنی یہ غرض پوری نہ کر سکے اور یہ ان کے لئے بڑی ذلت تھی خصوصاً ان کی اکثریت جو مسلمانوں سے پانچ گنا زیادہ تھی ان کے کچھ بھی کام نہ آئی۔ بلاشبہ مسلمانوں کو بھی اپنی غلطی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص مدد سے وہ دوبارہ اسی میدان میں سنبھل گئے اور نقصان اٹھانے کے باوجود دشمنوں کو بھگانے میں کامیاب ہوگئے اور مسلمان اس میدان میں پھر جم گئے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اتنے بڑے لشکر کا شکست کھا جانا اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی ایک کھلی دلیل ہے۔ اور یہ سارے واقعات قریش کے لشکر جرار کو ناکام و نامراد ٹھہراتے ہیں۔

آیت "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ" کا شان نزول

۲۴۱ جنگ احد کا انجام بلاشبہ مسلمانوں کے حق میں اچھا رہا تاہم جو تکلیف مسلمانوں کو پہنچی اور خصوصاً نبی کریم ﷺ جس طرح خود اس جنگ میں زخمی ہوئے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح بخاری میں

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "شج النبی" ﷺ یوم احد فقال کیف یفلح قوم شجوا لذ یھم فنزلت لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ۔ یعنی احد کے دن نبی کریم ﷺ کے سر میں زخم آیا تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کس طرح وہ قوم کامیاب ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ "اس معاملہ میں تمہیں کوئی دخل نہیں یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا خاصا نقصان ہوا بہت سے مسلمان مجاہدین شہید بھی ہوئے اور کفار نے ان شہداء احد کی بے حرمتی بھی کی کہ ان کی نعشوں کا مثلہ کیا۔ ان کے کان' ناک' ہونٹ تک کاٹ دیئے گئے اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا گیا جو ہندہ نے اپنے دانتوں سے نوچ کھانے کی کوشش کی اگرچہ وہ نگل نہ سکی۔ یہ سارے کام ایسے تھے جو نہایت حد تک دکھ دہ تھے اس پر ظالموں کی سزا کی خواہش بالکل فطری چیز ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس سزا کی دعا اپنے خالق و مالک حقیقی سے مانگی گئی ان کفار کو جنہوں نے یہ بے حرمتی کی تھی کبھی بھی اس طرح کی کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس لئے کہ اس کے بعد بھی جنگیں لڑی گئیں اور میدان جنگ میں کفار مارے بھی گئے لیکن اس طرح کی کوئی حرکت مسلمانوں کی طرف سے انتقام کے طور پر بھی نہیں کی گئی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو بیئر معونہ کے واقعہ کے متعلق بھی بیان کیا ہے اور وہ واقعہ بھی صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ستر قاریوں کو ایک سردار قوم کی درخواست پر اس کی قوم کی تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا یہ سب حضرات جا رہے تھے اور جب اس کنوئیں کے قریب پہنچے جس کا نام معونہ ہے تو اس قوم کے قبیلوں نے غداری سے ان سب کو قتل کر دیا اور یہ قبائل رعل' زکوان' عصیہ اور بنی لحیان تھے تو نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت ہی دکھ ہوا اور آپ ﷺ نے ایک مہینہ تک نماز صبح کی دوسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھی اور ان لوگوں کے لئے بددعا کی جنہوں نے دھوکہ اور فریب کی حد کر دی اور نبی کریم ﷺ اور اہل اسلام کی اذیت کا باعث ہوئے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ یہ روایت بھی بخاری اور دوسری کتب احادیث میں موجود ہے۔ اور ان سب واقعات میں دراصل کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ جب حکم عام ہے اور جب عالم اسلام پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت ڈال دی جائے یا ایسے تکلیف دہ واقعات رونما ہوں تو یہ دعائے قنوت پڑھی جا سکتی ہے اور یہی کچھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے تو ہر بار کے لئے یہ آیت بھی حکماً موجود ہے کہ اس میں مسلمانوں کے اختیار کا مسئلہ نہیں بلکہ جب کسی کی بدبختی اور روسیاہی کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایسے واقعات پیدا کر دیتا ہے جس سے ایک فریق کو تکلیف پہنچتی ہے تو بہرحال اس کے منہ سے بددعا تو نکلتی ہی ہے اور نکلنی ہی چاہئے اور پھر انجام کار آج بھی کہنا پڑتا ہے کہ ایسے حالات میں انسان کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں کہ ان کو روک تھام سکے یا رونما نہ ہونے دے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے جس کو ٹالا نہیں جا سکتا ہاں! جس نے یہ واردات کی ہے وہ سزا کا مستحق ہے۔

دراصل اس میں سبق یہ دیا گیا ہے کہ جب کسی کو کوئی تکلیف دی جاتی ہے تو اس کے منہ سے مظلوم

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا
اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا

ع ۹ ۱۳۵ ۴

والا اور بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۲۹

اے مسلمانو! سود کی کمائی سے اپنا پیٹ مت بھرو جو دوگنی چوگنی ہو جایا کرتی ہے
اللہ سے ڈرو تاکہ تم اپنے اصلی مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ ۱۳۰

ہونے کے باعث جو کچھ نکلتا ہے وہ غیر اختیاری ہوتا ہے اس لئے نکل جاتا ہے لیکن آپ ﷺ رحمت للعالمین ہیں آپ ﷺ کی اس بددعا کو بھی اس طرح منظور فرمایا گیا ہے کہ وہ تینوں شخص جن پر آپ ﷺ نے بددعا کی بعد میں مسلمان ہوگئے ایسے ہی وہ قبائل بھی مسلمان ہوگئے اس میں ان لوگوں کے لئے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بزرگوں تک کے لئے لعنت بھیجنے کو اپنے مذہب کا ایک حصہ قرار دے بیٹھے ہیں۔ رحمت و مغفرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے

۲۴۲ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کا ایک نتیجہ مقرر کیا ہوا ہے اور کوئی کام ایسا نہیں جو نتیجہ نہ رکھتا ہو۔ گویا یہ قانون الٰہی ہے اس طرح یہ مغفرت بھی اس کے عام قانون رحمت کے مطابق ہوتی ہے انسان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ہوتا وہی ہے جو اس کے قانون میں طے ہے۔ اس لئے انسانوں کو عملاً اور قولاً اچھی بات کی طلب کرتے رہنا چاہئے اور بالکل اسی طرح یہ عذاب بھی اس کے خاص قانون حکمت ہی کے ماتحت ہوگا اس لئے کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے اس کا اصل اور حقیقی مالک صرف اور صرف وہی ہے۔

مسلمانوں کو سود کی کمائی سے باز آنے کا حکم دیا جاتا ہے

۲۴۳ "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" سود در سود کو کہا گیا ہے۔ عربوں میں دستور تھا اور غالباً ایسا ہی دستور تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی ہے اور قرضہ ادا کرنے والا قرضہ ادا نہیں کر سکتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر دوبارہ میعاد مقرر کر لی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنی مجبوری کے باعث ایک بنئے سے سو روپے قرض لئے اور ایک سال کے بعد ایک سو بیس ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ سال گزر گیا لیکن وہ قرض ادا نہ کر سکا تو اب بنئے کی طرف سے ۱۲۰ روپے اصل زر ہوگیا اور سال کے لئے جو رقم طے ہوئی اب وہ ایک صد بیس روپے پر ادا کرنا پڑے گی اس طرح رقم بڑھتے بڑھتے چار چھ سال میں مقروض کو اس قدر دبا کر بیٹھ گئی کہ اس کو زمین، مکان، جانور، غلہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب دینا پڑا اور آہستہ آہستہ وہ ساری چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھا اور آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کئی گنا کر کے سود نہ کھاؤ لیکن تھوڑا تھوڑا کھا لو بلکہ مراد اس سے مذمت یا توبیخ سود ہے کہ تم سود مت کھاؤ۔

انسان جب اصل راہ سے ہٹ جائے تو اس کیلئے ہلاکت و پریشانی اور نقصان ہی نقصان ہوتا جاتا ہے۔ دراصل مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ جنگ احد میں تم نے ایک غلطی کی اور غلطی کا نتیجہ کیا رہا ہے؟ اور کتنی تکلیف اٹھانی پڑی ہے؟ پھر یہ کہ انسان جب ایک قدم غلط اٹھا بیٹھتا ہے تو وہ غلط پر مزید غلط قدم اٹھاتا ہی جاتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ایک غلطی کی اس کا یہ نتیجہ پایا تو اب باز آجاؤں اعتراف کر لوں اور مزید غلط قدم نہ اٹھاؤں۔ لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے' کیوں؟ اس لئے کہ غلطی کا اعتراف اس کو دل پر شاق گزرتا ہے۔

یہاں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ سود اور جنگ عملاً لازم و ملزوم ہیں۔ جس قوم کو یہ بیماری لگ جاتی ہے وہ ہمیشہ جا بجا انسانی خون سے ہاتھ رنگتی رہتی ہے۔ کفار مکہ نے جو جنگیں لڑیں دار صل ان کی بھی اصل وجہ یہی تھی۔ مشرکین نے جو مال اکٹھا کیا وہ سارے کا سارا اسی طرح کا مال تھا کہ وڈیرے قوم کے غریبوں کو سود پر روپیہ دیتے اور ان سے سود کی رقم اکٹھی کر کے اصل زر خود رکھتے تاکہ ان کا کوئی نقصان نہ ہو اور سود کا روپیہ جن سے کماتے انہی لوگوں پر وہ روپیہ خرچ کر کے ان کو آمادہ پیکار کرتے اور اسی طرح قوم کے غریب و نادار لوگ اپنے ہی روپے سے میدان کار زار میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔

آج بھی اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو یہی صورت حال نظر آئے گی ان دنیا کے وڈیروں نے غریب ملکوں کو کیا دیا؟ سود پر قرض دیا اور پھر سود در سود قرض بڑھتا گیا بلکہ ان کی ضرورت کو دیکھ کر مزید ان کو قرض لینے کی راہیں بتائیں کہ اگر تم یہ کرو گے تو تمہیں اتنا قرض مزید مل جائے گا اس طرح غریب ملکوں نے قرض لے لے کر اتنا قرض بڑھا لیا کہ اب اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہی۔ جن ملکوں کے پاس ایسے وسائل تھے کہ ان کو قرض لینے کی ضرورت نہ تھی ان کو ایسی ایسی الجھنوں میں مبتلا کر دیا کہ ان کے ان قدرتی وسائل پر قبضہ کر لیا۔ اب وسائل رکھنے والے برائے نام ان کے مالک ہیں اصل مالک ان کے وہ خود قرار پا گئے۔

جوں جوں آگے بڑھتے گئے حالات بدلتے گئے اور سود کی نئی نئی راہیں کھلتی گئیں۔ ان کے ہاتھ اس سود در سود سے اتنے مضبوط ہوگئے ان غریب ملکوں میں سے جس کو جی چاہا قرض دینا بند کر دیا اور اگر ضرورت پڑی تو پچھلے قرض مانگنے شروع کر دیئے۔ ملک کی پوری پیداوار وہ اٹھا کر لے گئے۔ کسی ملک نے اگر پھر بھی برداشت رکھی تو اس کے خلاف کسی ہمسائے ملک کو اکسا دیا اور شرارت شروع کرا دی حتیٰ کہ وہ پہلا ملک ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

اس طرح کے گٹھ جوڑ اور ان سودی کاروباروں نے سارے اسلامی ممالک کا ستیاناس کر دیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ہمارے ہاں اتنا اسلحہ ہوگیا کہ اب اس کی کوئی کھپت نہ ہوئی تو یہ پڑا پڑا بے کار ہوگا اور ہمیں خسارہ اٹھانا پڑے گا فوراً کسی مسلک سے اسلحہ بیچنے کے لئے اس کو قرض کی پیش کش کر دی اگر ایک ملک متوجہ

النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ

اور اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو منکرین حق کے لئے تیار کی گئی ہے۔[۲۴۴] ۱۳۱

اللہ اور اسکے رسول کی فرمانبرداری کرو تاکہ رحمت الٰہی کے مستحق ہو جاؤ۔[۲۴۵] ۱۳۲

اپنے رب کی بخشائش کی طرف تیز گام ہو جاؤ اور اس جنت کی طرف بھی جس

نہ ہوا تو دوسرے کے ساتھ کانذی معاہدہ کر لیا پھر اس کے ہمسایوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تو ان پر بھی احسان کی ٹانگ رکھ دی۔

اس سودی کاروبار نے ہمارے سارے اسلامی ممالک کو اس مقام پر پہنچا دیا اور اس وقت تقریباً سب دیوالیہ ہیں اور جو اپنے پاؤں پر کھڑے تھے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑا کر اور ان کو اسلحہ دے کر کنگال کر دیا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ ان کے وسائل پر قبضہ کر کے ان کی حفاظت کے ٹھیکہ دار بن گئے۔

اسلام نے جہاں ایک طرف جنگ کو تسلیم کیا ہے خصوصاً ان حالات میں جب ایک قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو تو اسے نہایت ضروری قرار دیا ہے تو دوسری طرف ان موجبات جنگ کو جو بلا ضرورت جنگ جاری رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں دور یا کم کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جب بھی جنگ لڑی ہے دفاعی جنگ لڑی ہے ملک گیری کی ہوس میں ایک جنگ بھی نہیں لڑی گئی اور مخالفین نے جو جنگ بھی لڑی ہے صرف ملک گیری کی ہوس میں لڑی ہے۔ اب مسلمانوں کو مل کر دنیا کے ان وڈیرے مہاجنوں کے خلاف جنگ لڑنے کی ضرورت شدید نظر آرہی ہے اور یہ اس دفاع میں لڑی جانی چاہئے تاکہ ان کے چنگل سے قوم مسلم نجات حاصل کرے اور ان کی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ ان کو بھسم کر کے رکھ دے۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ہر حال میں اس کا علاج یہی ہے اور یہی ہو گا وقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کے لئے کونسا مقرر کیا گیا ہے؟

حرمت سود کا صرف دو موقعوں پر ذکر کیا گیا ہے ایک اس جگہ جہاں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر کیا ہے اور دوسری وہ جگہ جہاں جنگوں کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ سود ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ کے جذبہ سے روکتا ہے اور دوسری طرف جنگ بھڑکانے کے لئے نئے نئے طریقے سجھاتا ہے اور اسلام ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیتا ہے اور اس میں یہ حکمت سکھاتا ہے کہ اس طرح اموال بڑھتے ہیں کم نہیں ہوتے اور قوم میں خوشحالی آتی ہے اور اس کی تنگی دور ہوتی ہے اور سود سے اموال کم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ پوری قوم سے

سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتے ہیں جس سے قومی خوشحالی کو نقصان پہنچتا ہے اور قوم دن بدن بدحالی کی طرف بڑھنے لگتی ہے اور جن ہاتھوں میں دولت سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ اس دولت سے جنگ کے جھونکے تیز کر دیتے ہیں تاکہ ان کے سود پر قرض دینے کی راہیں نکلتی رہیں اور اس طرح پوری قوم کا امن برباد ہو جاتا ہے اور پھر انجام کار وہ وقت آجاتا ہے کہ یہ جنگ بھڑکانے والے خود اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ بانس رہتا ہے نہ بانسری بجتی ہے۔ مزید تفصیل کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ تا ۲۸۱ کا مطالعہ کریں۔

آگ کا عذاب ان ہی کے لئے ہے جو حق کا انکار کرتے ہیں

۲۴۴ بلاشبہ جہنم کی آگ اصولاً ان ہی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو حق سے انکاری ہیں اور اگر تم نے وہ اعمال شروع کر دیئے جو کافروں کے اعمال ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ تم بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ گویا یہ ان لوگوں کے لئے وعید ہوئی جو سود خوری کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں بلکہ اس کے جواز کے فتوے صادر کرتے ہیں جس کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال نہیں سمجھتے وہ گویا عذاب الٰہی کو خود دعوت دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ پر قائم بھی رہے تو دوسری اس کی طرف بڑھتی ہی رہے تو ملاقات یقینی ہے۔ اس طرح گویا اللہ کا عذاب ان کی طرف نہیں بڑھتا بلکہ یہ کم بخت خود عذاب الٰہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور پھر انجام اس کا واضح ہے۔

اطاعت رسول اللہ ﷺ ہی رحمت کا باعث ہے

۲۴۵ اس آیت نے رحمت الٰہی کے حصول کا ذریعہ انسانوں پر واضح کر دیا اور صدر اول کے مسلمانوں کی کامیابیوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ قرآن کریم کی اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات سے جس طرح یہ ثابت ہوگیا کہ رحمت الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری لازمی و ضروری ہے اسی طرح خود نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں جن لوگوں نے آپ ﷺ کی صحیح معنوں میں فرمانبرداری کی ان کو بام عروج پر پہنچا کر دنیا پر یہ بات عملاً ثابت کر دی گئی اور پھر مسلمان کہلانے والوں نے بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو چھوڑ دیا تو اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ ان کو اسی بام عروج سے اٹھا کر قعر مذلت میں گرا دیا اب اگر مسلمان دنیا میں اٹھ سکتے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی سے اٹھ سکتے ہیں۔

فی زمانہ جب مسلمانوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی بجائے "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے علماء اور پیروں اور وڈیروں کے پیچھے لگ گئے اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے جوئے کو گردنوں

عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ

کے پھیلاؤ کا یہ حال ہے کہ تمام آسمان و زمین کی چوڑائی ایک طرف اور اس کا پھیلاؤ ایک طرف جو پرہیزگار انسانوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔[۲۴۶] ۱۳۳

وہ متقی انسان جو ان اوصاف سے متصف ہیں کہ خوشحالی ہو یا تنگ دستی ہر حال

سے مستقل اتار دینا چاہتے ہیں اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو شامل کرنے کو شرک قرار دیتے ہیں۔ شاید انہوں نے اطاعت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کھائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت نہیں سمجھا حالانکہ رسول کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے اور اسی لئے اولو الامر کی اطاعت کا جب حکم دیا تو اس کو مشروط کر دیا کہ ان کی اطاعت اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ان کا حکم اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو اگر خلاف ہوا تو ان کی اطاعت نہیں ہوگی اس کی وضاحت سورہ النساء میں ہوگی۔ انشاء اللہ۔

پھر جب حکم یہ ہوا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور یہ بات ویسے بھی حق ہوئی کہ اگر رسول کی اطاعت نہ کی جائے تو اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں۔ پھر یاد رکھنے کی بات تو یہ تھی کہ قرآن کریم کو اللہ کی کتاب ماننے اور تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ رسول کی بات مانی جائے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اگر رسول کی بات ماننا ضروری نہ ہوا تو قرآن کریم کو اللہ کی کتاب کیسے مان لیا جائے گا۔ ہم تو یقیناً قرآن کریم کو اس لئے اللہ کی کتاب مانتے ہیں کہ اللہ کے رسول محمد ﷺ نے یہ فرمایا۔ اگر رسول کی حیثیت کو ختم کر دیا جائے تو دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی بلکہ پورے دین کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری ہی دین اسلام ہے۔

بھلائیوں کی طرف دوڑو کہ بھلائی ہی جنت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

[۲۴۶] جنت کیا ہے؟ انعام الٰہی۔ ظاہر ہے کہ انعام کسی کام کے صلہ میں ہی دیا جاتا ہے۔ جس کام کے صلہ کا یہ انعام ہے وہ کام کیا ہوگا؟ وہی اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری جس کا پچھلی آیت میں ذکر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "الی الاسلام" اور حضرت عکرمہ نے فرمایا "الی التوبة" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ادائے فرض" اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔ کیونکہ سب کی مراد تو یہی ہے کہ "اعمال صالحہ" جن سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے اور رحمت کے سائے میں پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پھر ان سب کا ماحصل کیا ہوا؟ وہی رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات امور سے پہلے اچھے اعمال کر

يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۴ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا

میں وہ اپنی بساط کے مطابق اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں[۲۴۷]، غصہ میں آکر بے قابو نہیں ہو جاتے، لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں اور اللہ ایسے ہی نیک کرداروں کو دوست رکھتا ہے[۲۴۸]۔ ۱۳۴

نیز وہ لوگ کہ جب ان سے کوئی سخت برائی کی بات ہو جائے یا اپنی جانوں کو کسی

لو۔ وہ سات امور کیا ہیں؟

۱۔ ایسا اخلاص ہے جو ہر چیز کو فراموش کر دینے والا ہے۔ ۲۔ ایسی مالداری جو سرکش بنا دینے والی ہو۔ ۳۔ ایسی بیماری جو نظام صحت کو بگاڑ دینے والی ہو۔ ۴۔ ایسا بڑھاپا جو سب کچھ جاننے کے بعد کچھ نہ جاننے والا کر دے۔ ۵۔ اچانک آجانے والی موت جو چلتے پھرتے انسان کو دبوچ لے۔ ۶۔ قیامت کہ وہ عظیم ترین مصیبت ہے اور نہایت ہی تلخ چیز یا فرمایا کہ دجال ہے جو بدترین انتظار کی چیز ہے۔

"جنت کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے۔" گویا یہ کلام تمثیل ہے حقیقت مراد نہیں۔ چونکہ انسانی ذہن میں زمین و آسمان کی وسعت بہت زیادہ ہے اس لئے جنت کا پھیلاؤ ان کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح دوسری جگہ اس طرح تشبیہ دی کہ "خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" یہ جنت میں گویا رہنے کی تشبیہ ہے جو دوام سکونت پر دال ہے۔ اور یہ بھی عام انسانوں کی نظر میں آسمان و زمین سے زیادہ کسی چیز کی مدت کا بقاء نہیں ہے۔ اسی طرح انسانوں کے خیالات کے مطابق اس جگہ بھی تشبیہ دی گئی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ جنت آسمانوں میں ہے یا زمین میں فرمایا کس زمین و آسمان میں جنت کی سمائی ہو سکتی ہے؟ مطلب یہ کہ اس کا عرض آسمانوں و زمین سے بہت زیادہ ہے اور پھر جو وسعت بھی بیان ہوگی خیالی ہوگی۔ جنت کیوں ہے؟ فرمایا وہ کامل متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے اور کامل متقی وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے وابستگی نہیں رکھتے اور جو کچھ کرتے ہیں اس میں اصل مطلوب ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔ جن متقین کے لئے جنت تیار کی گئی ہے اب ان کی نشاندہی فرمائی جا رہی ہے تاکہ متقی بننے کے لئے انہی نشانات راہ پر چلنا آسان ہو جائے۔

وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے فی سبیل اللہ مال خرچ کرتے ہیں

۲۴۷ ان متقی انسانوں کا پہلا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ وہ جس حال میں بھی ہوں تنگ دست ہوں یا خوشحال وہ اپنی بساط کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں اس خرچ کرنے سے ان کی مراد کسی دوسرے کی خوشنودگی ہرگز نہیں ہوتی بلکہ ان کا اصل مطلوب رضائے الٰہی ہوتا ہے ہاں! رضائے الٰہی کو حاصل کرنے والے سخی لوگ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا کہ "سخی اللہ سے قرب رکھنے والا ہے۔ جنت سے قرب رکھنے والا ہے۔ لوگوں سے قرب رکھنے والا ہے۔ اور دوزخ سے دور رہنے والا ہے اور کنجوس اللہ سے دور رہنے والا۔ لوگوں سے دور رہنے والا اور دوزخ کے قریب رہنے والا ہے اور جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے بہتر ہے۔" اور اس طرح کے اور ارشادات بھی آپ ﷺ کے موجود ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کسی ٹہنی کو پکڑ لے گا وہ ٹہنی اس کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جائے گی اور کنجوسی دوزخ کے درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کوئی ٹہنی پکڑ لے وہ ٹہنی اس کو کھینچ کر دوزخ کی طرف لے جائے گی۔ یہ روایت دار قطنی اور بیہقی میں بیان ہوئی ہے اس کے راوی علی رضی اللہ عنہ و ابن عدی رضی اللہ عنہ اور ابی سعید رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابن عساکر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کی گئی ہے اور الدیلمی مسند الفردوس میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ سے بازی لے گیا۔ ایک شخص نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ کیسے ہوگیا؟ فرمایا ایک آدمی ہو جو بہت ہی بڑا مالدار ہو اور اپنے مال میں سے وہ ایک لاکھ درہم خیرات کر دے اور ایک دوسرا آدمی جس کے پاس صرف دو درہم ہیں اور وہ ان دو درہموں میں سے ایک درہم خیرات کر دے تو اس کا ایک درہم پہلے کے ایک لاکھ سے بہتر ہوگا۔ یہ روایت نسائی اور ابن خزیمہ میں بیان کی گئی ہے۔ (کیونکہ ایک درہم خرچ کرنے والے نے آدھا مال خرچ کر دیا۔)

وہ غصہ میں بے قابو نہیں ہوتے اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں

۲۴۸ ان متقین کی دوسری نشانی آیت زیر نظر میں یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ "وہ سخت غصہ کو پی جانے والے ہیں" کسی مشک کو پانی کے ساتھ بھر کر اس کا منہ بند کر دینا تاکہ اس سے پانی نکلنے نہ پائے۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی راہ میں اتنا تنگ کیا گیا کہ تنگ کرنے والے تنگ کر کے تھک گئے لیکن انہوں نے اپنے سارے غصہ کو اندر ہی اندر بند کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنی اس تنگی کو اس لئے نہیں برداشت کرتے کہ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے بلکہ محض اس لئے برداشتے کرتے ہیں کہ اللہ کی رضا ان کو مطلوب تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سخت غصہ کو روک لیا باوجودیکہ اس کو اس کے بدلہ کی قدرت تھی اللہ تعالیٰ

اس کے دل کو امن و امان سے بھر دے گا۔ یہ حدیث احمد اور عبدالرزاق میں بیان کی گئی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ "جو شخص غصہ کو پی گیا باوجود اس کے اپنا غصہ نکالنے کا اس کو قابو تھا۔ قیامت کے روز ساری مخلوق کے سامنے اللہ تعالیٰ اس کو بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ اس کے عوض جو تیری رضا ہو وہ لے لے۔"

فرمایا اللہ تعالیٰ ایسے ہی محسنین کو پسند کرتا ہے۔ محسنین کون ہیں؟ وہی جو متقین ہیں جن کا ذکر اوپر بیان ہوا۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برائی کرنے والے سے نیکی کرنا احسان ہے اور بھلائی کا بدلہ بھلائی ہے اور اس طرح کی بھلائی گویا تجارت ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کی تشریح پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کا تصور نہ کر سکو تو یہ خیال رکھو کہ وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے۔" اور تنگی اور فراخی میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف لینا ہی نہیں جانتے بلکہ دینا بھی جانتے ہیں گویا ان کے دل دنیوی سروسامان سے وابستہ نہیں ہوتے۔

دیکھو سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام سے کیا سلوک کیا؟ کسی سے یہ واقعہ پوشیدہ ہے؟ لیکن سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس غصہ کو کس طرح پی کر دنیا کو بتا دیا کہ مشیت ایزدی کے مطابق جو شخص جو عمل کرتا ہے اس کا نتیجہ وہ پالیتا ہے بھائیوں نے جب مصر میں یوسف علیہ السلام کو دیکھا اور جب یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ یہ وہی یوسف ہے جس کے متعلق ہم یہ بیان دے چکے ہیں کہ اس کو بھیڑیا کھا گیا تو انہوں نے اپنی خطا کو تسلیم کر لیا جب کہ یوسف علیہ السلام نے ان کو محسوس ہی نہیں کرایا تھا تو یہ احساس فرماتے ہوئے کہ بھائیوں نے اپنی زیادتی کا خود بخود اقرار کر لیا ہے آپؑ نے خود ارشاد فرمایا "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ" آج تم پر کوئی گرفت نہیں' اللہ تم کو معاف فرمائے۔" اور اس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔

پھر یوسف علیہ السلام کے والد بزرگوار سیدنا یعقوب علیہ السلام کو جو دکھ بیٹوں نے پہنچایا جس کے نتیجہ میں مدت تک یعقوب علیہ السلام پریشان حال رہے جب یہ معلوم ہوگیا کہ میرا بیٹا مصر میں بخیریت ہے اور وہ ماشاء اللہ اس وقت مصر کا بادشاہ ہے اور بیٹوں کو یہ نہیں فرمایا کہ تم ایسے ویسے ہو اور کسی غصہ کا اظہار نہیں فرمایا پھر جب بیٹوں نے اپنے جرم کی معافی کا مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں کچھ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا تو یہی کہ "سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ" عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے بخشش طلب کروں گا۔ قرآن کریم کے یہ واقعات تو درس دیتے ہیں کہ معاف کر دینے سے زیادہ کوئی نیکی نہیں ہے۔

پھر قرآن کریم کی صرف ایک آیت کو یاد رکھا جائے تو ساری تشنگی خود بخود ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس

حکیم کل سے زیادہ کون بات کو اچھا سمجھا سکے گا چنانچہ فرمایا کہ:
قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (الجاثیہ ۴۵ : ۱۴) "اے پیغمبر اسلام! ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ تعالیٰ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔" ظاہر ہے کہ اس جگہ "اَيَّامِ اللّٰهِ" سے مراد کسی قوم کے وہ برے دن ہیں جب اللہ کا غضب اس پر ٹوٹ پڑے اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں وہ تباہ کر کے رکھ دی جائے۔ یعنی جن لوگوں کو یہ خیال نہیں ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے ان افعال پر ہماری شامت آئے گی اور اسی غفلت نے ان کو ظلم و ستم پر دلیر کر دیا ہے۔

پھر اس آیت کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں اور آیت کے معنوں میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ اہل ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو یعنی درگزر کرنے والوں کو اپنی طرف سے ان کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہ خدا میں جو اذیتیں انہوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر ان کو عطا فرمائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ تعالیٰ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اسے دے۔

لیکن افسوس کہ بعض لوگوں نے اس آیت کو منسوخ قرار دے کر قرآن کریم کی اس آیت کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ بالکل لغو ہے۔ "درگزر کریں۔ معاف کر دیں یا بخش دیں" کے الفاظ اس معنی میں کبھی نہیں بولے جاتے کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر ہی نہ ہو تو اس سے درگزر کرے' معاف کر دے یا بخش دے۔ آیت میں لفظ "يَغْفِرُوْا" استعمال ہوا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہل ایمان انتقام کی طاقت و قوت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنہیں خدا سے بے خوفی نے اخلاق و آدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اس حکم کا کوئی تعارض ان آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے اور عفو و درگزر کرنے کا حکم ان عام حالات کے لئے ہے جن میں اہل ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انہیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے الجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بیہودگی کا جواب دینے پر نہ اتر آئیں۔ جب تک کہ شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مدافعت کرنا ممکن ہو اس سے پرہیز کیا جائے مگر جہاں بات ان حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چپ سادھ لی

فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا

مصیبت میں ڈال لیں تو فوراً اللہ کی یاد ان میں جاگ اٹھتی ہے وہ اپنے ضمیر کو ملامت کرتے ہوئے اپنے اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں[۲۴۹] اور جو کچھ ہو چکا ہے اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے اور انہیں یقین ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں

جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود نہ انجھیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

افسوس کہ آیت قرآنی سے ہمارے علمائے کرام' ہمارے صوفیاء عظام اور ہمارے سیاست دان حضرات نے کیا سبق سیکھا؟ کیا قرآن کریم کو پیٹھ پیچھے پھینک دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے احکام کی پروا نہ کی جائے؟

اپنی برائی کو خود دیکھ کر اپنی ضمیر کو ملامت کرنے والے لوگ

۲۴۹ "فَاحِشَةً" ایسا فعل یا قول جس کی قباحت بہت بھاری ہو اور ہر کوئی اس کی برائی کو محسوس کرے جیسے زنا یا متعلقات زنا یا اس طرح کی دوسری ناپاکیاں ایسی برائیاں جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑے۔ "ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ" ایسے گناہ جن کا بد اثر اگرچہ دوسروں پر نہ پڑے مگر اپنے آپ کو ان کا نقصان ہو۔ اس آیت سے پہلے جو نشانیاں متقین کی بیان فرمائی تھیں وہ تو نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے متقین کی تھیں۔ ان درجات تک سب لوگوں کا پہنچنا بلاشبہ مشکل تھا اب اس آیت میں بھی متقین ہی کی نشانیاں بتائی گئی ہیں لیکن وہ متقین جو ان پہلے متقین سے کم درجہ کے متقین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے کبھی کوئی ایسی بھاری لغزش بھی ہو جاتی ہے لیکن وہ جلد ہی اپنی کمزوری کو سمجھ جاتے ہیں اور اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنے لگتے ہیں۔ اور جب کبھی اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو استغفار کرنے لگتے ہیں۔ ان سے کوئی برائی کا کام ہو جاتا ہے تو فوراً اس کے بعد نیکی کرنے کی جستجو کرتے ہیں یعنی جب بھی اور جو بھی لغزش ہوگئی تو اس کے بد اثرات سے بچنے کی دعا کرتے ہیں اور آئندہ ایسے گناہ میں پڑنے سے بچنے کی دعا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے قصوروں پر پختہ نہیں ہوتے اور یہ بھی کہ ایک قصور کو بار بار نہیں کرتے۔

گناہ کرنا اور گناہ ہو جانا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پھر جب گناہ ہو جائے تو اس پر ندامت یقیناً انسانوں کے ہاں بھی وہ گناہ کو ہلکا کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تو ایسا انسان مقبولین میں شمار ہوتا ہے۔ گناہ ہو جائے

عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ

جو گناہوں کا بخشنے والا ہو؟ ۱۳۵ ۲۵۰

بلاشبہ یہی لوگ ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کے لئے عفو و بخشش کا اجر

تو اس کا افشاء کرنا اور خود لوگوں کو فخریہ بتانا اس گناہ کو اور زیادہ بڑا اور مضبوط کر دیتا ہے بلکہ اکثر اوقات یہ گناہ کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اس آیت میں ان ہی لوگوں کا ذکر ہے جن سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس پر وہ نادم ہوتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں یعنی اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتے ہیں اور اس گناہ پر پردہ ڈالنے کی اپیل کرتے ہیں اور اپنے قصوروں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور وہ اس بات کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو ہماری غلطیوں اور قصوروں کو معاف کر دے اور جو غلطی ان سے ہو جاتی ہے یا غلطی جس کو وہ کر بیٹھتے ہیں اس پر اصرار نہیں کرتے اور نہ ہی اس غلطی کی عادت کو پختہ کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ○ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (الاعراف ۷ : ۲۰۲) "جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے۔ رہے ان کے بھائی بند تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الاعراف ۷ : ۱۵۳) "اور جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا اور رحمت والا ہے۔"

وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو بخشنے والا ہو

۲۵۰ متقی لوگ وہ ہیں جو یہ بھی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ گناہوں کی معافی دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں خواہ وہ کوئی ہو یعنی وہ کسی نبی' ولی' فرشتہ اور جن کو گناہوں کا بخشنے والا تصور نہیں کرتے۔ اور اس آیت میں خصوصاً رد ہے اس مسیحی عقیدے کا کہ گناہوں کی معافی مسیح علیہ السلام بلکہ اس کے نائبوں کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ آج بھی انجیل میں موجود ہے کہ "جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے میں تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہ ان پر پھونکا اور ان سے کہا کہ روح القدس کو لو' جن کے گناہ تم بخشو' ان کے بخشے گئے اور جن کے گناہ تم قائم رکھو ان کے قائم رکھے گئے۔ (یوحنا ۲۰: ۲۱' ۲۲)

مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا
وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَٰمِلِينَ ﴿١٣٦﴾ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا

ہے اور باغ ہیں' ایسے باغ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے اور دیکھو کتنا ہی اچھا بدلہ ہے جو اچھے کام کرنے والوں کے حصہ میں آئے گا۔ ۱۳۶ ۲۵۱

اور دیکھو تم سے پہلے بھی دنیا میں دستور اور قانون رہ چکے ہیں۔ پس دنیا کی سیر کرو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی بندہ نے گناہ کیا پھر عرض کیا کہ اے میرے رب! مجھ سے ایک گناہ ہوگیا ہے تو اسے معاف فرما دے۔ اللہ کہتا ہے کہ میرے بندہ نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو معاف کرتا ہے اور چاہے تو پکڑ بھی کرتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ معاف کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد اس شخص نے پھر ایک گناہ کیا اور عرض کیا پروردگار مجھ سے ایک اور گناہ ہوگیا تو معاف فرما دے۔ اللہ نے فرمایا میرا بندہ واقف ہے کہ اس کا ایک مالک ہے جو گناہ بخش دیتا ہے اور کبھی چاہے تو گرفت بھی کر لیتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ بخش دیا۔ کچھ وقت کے بعد اس بندہ نے ایک اور گناہ کیا اور پھر عرض کی کہ اے میرے پروردگار مجھ سے ایک گناہ اور ہوگیا تو معاف فرما دے اللہ نے فرمایا میرا بندہ سمجھتا ہے کہ اس کا ایک مالک ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گرفت بھی کر لیتا ہے میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا۔ (رواہ بخاری و مسلم) ایک لحاظ سے یہ فطرت انسانی کا بیان ہے کہ انسان گناہ کرتا ہے پھر نادم ہوتا ہے پھر کرتا ہے پھر نادم ہوتا ہے اور اسی طرح جب تک اس کو ندامت ہوتی رہتی ہے اس کا گناہ معاف کر دیا جاتا ہے اور سب برائیوں سے بڑی برائی اور سارے گناہوں سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انسان سے جب گناہ ہو جائے تو پھر گناہ کرتا ہی جائے لیکن معافی کی طلب اس کے اندر پیدا ہی نہ ہو تو گویا وہ صرف گناہگار ہی نہ ہوا بلکہ دائرہ انسانیت سے بھی خارج ہوگیا اس لئے کہ وہ فطرت انسانی پر قائم نہ رہا۔

جس شخص نے جنت حاصل کر لی گویا وہ صحیح معنوں میں کامیاب ہوگیا

۲۵۱ اس طرح کے وہ سارے متقی لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش حاصل کر لیں گے اور اس انعام خداوندی کو جیت جائیں گے جس کے صلہ میں ان کو جنت الفردوس کا وارث بنا دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ جنت کیا ہے؟ وہ باغات ہیں جن میں ہر طرح کے پھل اور ہر طرح کی آسائیاں وہاں میسر ہوں گی۔ "أُولَٰئِكَ" کا اشارہ صاف انہی لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ غلطیاں' خطائیں اور لغزشیں بھی ان سے صادر ہوتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی تلافی اور

فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا

اور دیکھو کہ جو لوگ احکام حق کو جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا۲۵۲ اور پاداش عمل میں کیسے نتائج پیش آئے؟۲۵۳ ۱۳۷

یہ لوگوں کی فہم و بصیرت کے لئے ایک بیان ہے اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں

تدارک بھی کرتے رہتے ہیں بس انہی کے لئے یہ جنت کی نعمتیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا "دیکھو کتنا ہی اچھا بدلہ ہے جو اچھے کام کرنے والوں کے حصے میں آئے گا۔" "عَامِلِينَ" کے لفظی معنی تو صرف عمل کرنے والے کے ہیں لیکن نظم قرآنی میں اس سے مراد عمل صالح کرنے والے ہی مراد لئے جاتے ہیں۔ اور اچھے اعمال کی وضاحت اوپر آچکی ہے۔

حق جھٹلانے والوں کا انجام نگاہ میں رکھو اور اپنا انجام سمجھ جاؤ

۲۵۲ "سُنَنٌ" سنة کی جمع ہے "سنت" طریقہ کو کہتے ہیں اور عرف اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے دیئے گئے احکام یا کئے گئے کاموں کو کہا جاتا ہے اس جگہ مطلب یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں آئیں اور ان کے انبیاء نے ان کو اللہ کا پیغام پہنچایا لیکن بہت ہی کم تھے جنہوں نے اس پیغام کو قبول کیا اور بہت سے لوگوں نے انکار کر دیا کیا تم کو معلوم نہیں کہ اس کے متعلق انہوں نے کون کون سی راہیں اختیار کی ہیں اور کیا کیا طریقے اختیار کئے اور آخر کار ان کا انجام کیا ہوا؟ یعنی امم سابقہ کی ہلاکت اور استیصال کے طریقے کیا تھے؟

مختصر یہ کہ آیت زیر نظر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کر دیا کہ خبردار ہو جاؤ اگر احد میں تم کو کچھ کوفت پہنچی ہے تو وہ تمہارے اپنے کئے کے نتیجے میں پہنچی ہے اور بجائے اس کے کہ تم اپنے کئے پر پچھتاؤ کہ ہم نے کیا کر دیا اور اس کا افسوس کرو اگر تم نے ہمارے رسول ہی کا انکار کر دیا تو پھر رسول کے انکار کرنے والوں کا انجام بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس سے ایک طرف مسلمانوں کو خبردار کر دیا اور دوسری طرف منافقین کے کان بھی کھول دیئے کہ تم بھی اچھی طرح غور کر لو کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کبھی بھی ناکام نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ کامیاب ہی ہوئے اور ناکامی ہمیشہ مخالفین ہی کے حصے میں آئی۔ اگر تم کو اس بات میں کوئی شک ہے تو پچھلے مخالفین کا انجام دیکھ لو اور زمین میں چل پھر کر اچھی طرح اپنی تسلی کر لو۔ سیدنا نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہو جاؤ اور عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء کرام کی داستانوں سے تم واقف ہو ایک ایک کر کے اچھی طرح دیکھتے جاؤ کہ کون کامیاب ہوا اور کون ناکام؟ پھر اگر کسی معاملہ میں تم کو ابہام ہے تو معلومات حاصل کر لو یقیناً تم کو ہر جگہ یہی بات نظر آئے گی کہ کامیابی رسولؑ کے حصے میں آئی

بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا

ہدایت اور موعظت ہے۔ ۱۳۸

اور یاد رکھو نہ تو ہمت ہارو نہ غمگین ہو تم ہی سب سے سربلند ہو بشرطیکہ تم سچے

اور ناکامی مخالفین کا مقدر بنی اور اب بھی وہی ہوگا جو پہلے ہوتا آیا۔ رہی یہ وقتی صورت حال تو یہ تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ تھی اور تم کو بتا دیا گیا ہے کہ جو بھی غلط عمل کرتا ہے وہ اس کے نتیجہ سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل تم پر کیا اور تمہیں ایک طرح کی ہزیمت دکھانے کے بعد پھر فتح مند کر دیا اور تمہارے مخالفین فتح حاصل کرتے کرتے رہ گئے اور انجام کار بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔

ایک بار پھر سن لو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

۲۵۳ جیسے تم نے اعمال کئے ہیں ویسے ہی نتائج تم نے پالئے اور آئندہ بھی تم کو یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ رسول کے حکم کی نافرمانی اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔ پھر قومی کاموں میں یہ بھی قانون خداوندی ہے کہ کام ایک بگاڑتا ہے اور خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں کے ذمہ قومی کام لگائے جائیں ان کی سوچ اور ان کی فکر بہت بلند ہونی چاہئے اور یہ بھی کہ ان لوگوں کو اپنے ذاتی فوائد قومی فائدوں پر قربان کرنے چاہئیں اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ حقیقت میں قومی کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے جبل عینین پر مقرر کیا تھا اور ان کی کمان عبداللہ بن جبیر کے ہاتھ میں دی تھی ان کو خصوصاً یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ تم دوبارہ حکم ملنے تک یہیں رہو گے اور اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑو گے۔ انہوں نے کیا کیا؟ کہ فتح کی خبر سنتے ہی غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوگئے حالانکہ امیر نے بھی ان کو منع کیا۔ کفار میدان سے بھاگ رہے تھے کہ خالد بن ولید جو اس وقت کفار کے سپہ سالار تھے نے دیکھا کہ پیچھے سے وہ گھاٹی خالی ہے تو اس نے اچانک پلٹ کر اس طرف سے حملہ کر دیا اور جو لوگ ابھی وہاں رہ گئے تھے ان کو قتل کر کے اسلامی لشکر پر پیچھے سے ٹوٹ پڑا جب کہ مسلمانوں کو اس طرف سے حملہ کی کوئی امید نہ تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ طرف بالکل محفوظ تھی۔ اس طرح اس حملہ نے مسلمانوں کے اوسان خطا کر دیئے اور ان گھاٹی پر مقرر کئے گئے لوگوں کی غلط عملی کا خمیازہ جو ان کو بھگتنا پڑا وہ بھگت گئے۔ اور ایک گزر جانے والے واقعہ پر جتنا افسوس کیا جائے وہ دوبارہ واپس نہیں آسکتا۔ آئندہ کے لئے اس سے عبرت حاصل کرتے رہنا چاہئے اور دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنی چاہئے عقلمندی کا یہی تقاضا ہے۔

گزشتہ پر افسوس کرنے کی بجائے آئندہ کے لئے احتیاط ضروری ہے

۲۵۴ مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کی حقیقت کھول کھول کر ہم نے تمہارے سامنے رکھ دی ہے اور

تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ

۲۵۵ مومن ہو۔ ۱۳۹

اگر تم نے اُحد میں زخم کھایا ہے تو دشمنوں کو بھی تو ویسے ہی زخم بدر میں لگ چکے

اس کا بیان تم کو بار بار اس لئے سنایا جا رہا ہے کہ آئندہ ایسی حرکت تم سے سرزد نہ ہو اور اس سے وہی لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو بھلائی کی راہ چلنے کے لئے تیار ہوں اور گزشتہ پر افسوس کرنے کی بجائے آئندہ کے لئے احتیاط کرنی کی تلقین کو قبول کرنے والے ہوں۔ جب بھی کوئی بات کی جاتی ہے تو اس کو سب لوگ سنتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو وہ کام صرف انہی لوگوں کے آتی ہے جو اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور جو سنی اَن سنی کر دیتے ہیں ان کے لئے وہ بات کبھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے جو ہدایات تم کو دی جا رہی ہیں اور آپ سب لوگ ان کو بگوش ہوش سن رہے ہو ان سے نصیحت وہی حاصل کر سکیں گے جو متقین یعنی ان ہدایات کے مطابق عمل کرنے والے ہوں گے۔

مومن کون ہے؟ وہی جو نہ ہمت ہارے اور نہ دل چھوڑے

۲۵۵ "یاد رکھو کہ نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی سربلند ہو اگر تم سچے مومن ہو۔" انسان جو کچھ کھو دے اس پر غمگین ہو کر بیٹھ رہے اور جو کچھ مل جائے اس پر بغلیں بجانا شروع کر دے تو یہ ایک عقل مند اور سمجھ سوچ رکھنے والا آدمی نہیں ہو سکتا۔ غزوہ احد کا واقعہ پیچھے چلتا آرہا ہے اور یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس جہاد میں مسلمانوں کی بعض کوتاہیوں کے سبب ابتدائی فتح کے بعد پھر مسلمانوں کو شکست ہوئی اس کے نتیجہ میں ستر صحابہ کرام شہید ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو بھی زخم آئے مگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنگ کا پانسہ بدل دیا اور مسلمانوں کی شکست کو دوبارہ فتح میں تبدیل کر دیا اور دشمن انجام کار پسپا ہو گئے۔

اس عارضی شکست کے تین اسباب تھے۔ ۱۔ رسول اللہ ﷺ نے جبل عینین پر پچاس تیر اندازوں کو کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا اور ہدایت فرمائی تھی کہ تم لوگ اس جگہ کو نہ چھوڑنا حالات خواہ کچھ ہوں۔ لیکن جب پہلے ہی حملہ میں کفار کا لشکر پسپا ہو گیا اور مسلمان ان کو بھگانے میں کامیاب ہو گئے تو ان پچاس آدمیوں میں اختلاف رائے ہو گیا جس کے نتیجے میں چند صحابہ کے علاوہ باقی سب نے وہ جگہ چھوڑ دی اور غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ کفار کے سپہ سالار نے پیچھے سے حملہ کر کے ان صحابہ کو قتل کیا اور باقی لشکر اسلام پر حملہ کر دیا۔ اس سے حالات ایسے الجھے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور اس بھگدڑ میں رسول اللہ ﷺ بھی زخمی ہو گئے اور مشرکین نے اس موقع سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے آپ ﷺ کے قتل کی خبر مشہور کر دی۔ ۲۔

قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا
بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ

ہیں؟ دراصل یہ اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھراتے رہتے ہیں ۲۵۶ اور علاوہ ازیں یہ اس لئے بھی تھا تاکہ اس بات کی آزمائش ہو جائے کہ کون سچا ایمان رکھنے والا ہے اور اسلئے بھی کہ تم میں سے ایک گروہ کو شاہد حال بنا دے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے

چنانچہ دوسرا سبب یہی خبر ہوگئی۔ یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی اور مسلمانوں کے اوسان بالکل خطا ہوگئے۔ ۳۔ تیسرا سبب جو پہلے دونوں سے بھی بڑا تھا کہ آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں اختلاف پیش آیا۔ بس یہ تین لغزشیں ایسی تھیں جن سے مسلمانوں کو گویا عارضی طور پر شکست ہوئی۔ یہ عارضی شکست اگرچہ بعد میں جلد ہی فتح میں تبدیل ہوگئی تاہم کچھ مسلمان مجاہدین شہید ہوگئے اور بہت سے مجاہدین زخموں سے چور چور ہوگئے اور سب سے بڑھ کر اپنی لغزش کی ان کو بہت ندامت تھی اور اس سارے واقعہ کے جو اثرات مرتب ہونے والے تھے ان کے متعلق گہری سوچ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کا مداوا اس آیت کریمہ سے کر دیا۔ فرمایا کہ تم آئندہ کے لئے کمزوری اور سستی اپنے پاس نہ آنے دو اور گزشتہ پر رنج و ملال نہ کرو اور انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے بشرطیکہ ایمان و ایقان کے رستہ پر مستقیم رہو اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پورا یقین رکھتے ہوئے اطاعت رسول ﷺ اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔

مطلب بالکل صاف ہے کہ گزشتہ باتیں اور لغزشیں جو ہو چکی ہیں اس پر رنج و غم میں اپنا وقت اور توانائی صرف نہ کرو بلکہ مستقبل میں اپنے کام کی درستی کی فکر کرو اور اسے کامیاب بناؤ اور یاد رکھو کہ ایمان و ایقان اور اطاعت رسول ﷺ ہی تمہارے درخشاں مستقبل کا ضامن ہے ان کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے۔

آج جس دکھ میں تم مبتلا ہوئے ہو کل دشمنوں کو بھی تم ایسے ہی دکھ میں مبتلا کر چکے ہو

۲۵۶ اس آیت میں ایک دوسرے انداز میں مسلمانوں کو تسلی کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اٹھانی پڑی تو اس طرح کے حوادث تمہارے فریق مخالف کو بھی پیش آچکے ہیں اگر احد میں تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے ہیں اور بہت سے زخمی بھی تو ایک ہی سال پہلے تم ان کے ستر آدمی جہنم رسید کر چکے ہو اور بہت سے زخم بھی کھا چکے ہیں اور اس لڑائی میں بھی لڑائی شروع ہوتے ہی تمہارے ہاتھوں وہ قتل ہو چکے ہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ ہم ان ایام کو باری باری بدلتے رہتے ہیں جس میں بہت سی

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ

نافرمانی کے نتائج دیکھ لے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۱۴۰ ۲۵۷

اور اس حادثہ میں یہ مصلحت بھی تھی کہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں انہیں

حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اس دنیا کے متعلق قانون الٰہی یہی ہے کہ وہ سختی' نرمی' دکھ' سکھ اور تکلیف و راحت کے دنوں کو لوگوں میں اولتا بدلتا رہتا ہے۔ جس میں لوگوں کے اپنے اعمال کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ اور اعمال میں جس کا بھی عمل قانون الٰہی کے خلاف ہو اس کو ضرور سزا ملتی ہے کیونکہ ہر عمل کے ساتھ اس کا نتیجہ بھی وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کسی باطل قوت کو فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو جماعت حقہ کو اس سے بددل نہیں ہونا چاہئے بلکہ سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔ اور اس سے انجام کار فتح جماعت حقہ ہی کو ہوگی۔

مصیبت کے وقت دوست و دشمن کی پہچان ہو جاتی ہے

۲۵۷ اگر دکھ اور تکالیف نوبت بہ نوبت آتی رہنے والی چیزیں ہیں تو اس کی غرض کیا ہے؟ اور کیوں مسلمانوں کو جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں دکھ اور تکلیفیں پہنچیں؟ پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ مصیبت کا وقت ہی ایک ایسا وقت ہے جب دوست و دشمن کا پتہ چلتا ہے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن؟ مسلمانوں کی اس تکلیف نے بھی جو ان کو میدان احد میں پہنچی دوست و دشمن کو بالکل واضح کر دیا۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کو کیوں تکالیف پہنچیں؟ اس لئے کہ ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اپنی مرضی کرتے رہیں اور صرف ایمان کے دعویٰ پر آزاد ہو جائیں اور کسی بات کے پابند نہ رہیں۔ بلکہ ایمان لانے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ اب ہم آزاد نہیں رہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کرتے پھریں بلکہ ایمان کے دعویٰ نے تو ہم کو پابند کر دیا ہے کہ اب ہماری اپنی کوئی مرضی نہیں رہی بلکہ اب ہماری مرضی وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی جو وہ کہیں گے ہم کریں گے اور جس سے منع کریں گے اس کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔

اس حکم میں غلطی ہوئی اور اس کا خمیازہ اٹھانا پڑا جس سے ہمارا ایمان پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گیا کہ یہ تکلیف محض اس لئے پہنچی کہ ہم نے حکم عدولی کی اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم حکم عدولی نہیں کریں گے اور یہ بھی کہ آج تک مسلم و منافق اکٹھے رہ رہے تھے کسی کو کسی کی کوئی پہچان نہ تھی اللہ تعالیٰ نے جنگ احد میں نکلنے کا حکم دے کر مسلم و منافق دونوں گروہوں کو الگ الگ کر دیا۔ اب مسلمان اچھی طرح جان گئے اور ان کے چہروں سے یہ بات پہچان گئے کہ کون مسلم ہے اور کون منافق ہے؟ پھر یہ بھی کہ اس کی

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ

تمام لغزشوں سے پاک کر دے اور جو منکرین حق ہیں انہیں نیست و نابود کر دے۔ ۱۴۱ ۲۵۸

کیا تم سمجھتے ہو کہ محض دعویٰ ایمان سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تو وہ موقعہ پیش ہی نہیں آیا کہ اللہ تمہیں آزمائش میں ڈال کر نمایاں کر دیتا کہ کون

پہچان میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ہی کرا دی گئی۔ اس طرح جو پکے اور سچے مسلمان میدان جنگ میں اترے ان میں سے وہ لوگ جو جبل عینین پر مقرر کئے گئے تھے ان کے عمل سے یہ بات بھی واضح کرا دی کہ قومی امور میں جب کوئی آدمی غلطی کرتا ہے تو اس کو صرف ایک فرد کی حیثیت سے سزا نہیں دی جاتی بلکہ پوری جماعت کو سزا دی جاتی ہے تاکہ کوئی جماعت جس انسان پر کوئی ذمہ داری ڈالے وہ اس کو قومی ذمہ داری کے لحاظ سے پورا کرے اور پھر جو کچھ کرے وہ قوم کے سامنے اس کا جواب دہ ہو۔ اور ایک دنیا جان لے کہ کس نے غلطی کی ہے اور اس کو اس کی غلطی کی کیا سزا دی گئی اور یہ بھی کہ ہر غلطی زیادتی ہے خواہ وہ اپنی جان کے ساتھ ہو یا پوری قوم کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

جنگ احد کے نتائج نے کھرے اور کھوٹے میں نکھار پیدا کر دیا

۲۵۸ اس آیت میں مزید دو نتائج کی وضاحت فرما دی گئی فرمایا کہ اس سے جو تکلیف پہنچی وہ تو پہنچ ہی گئی لیکن اس واقعہ نے کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر دیا۔ یعنی مومنوں کی تمحیص ہو گئی جو ایمان کے مضبوط تھے ان کا اور جو کمزور تھے ان کا سب کو علم ہو گیا سب کو اپنی اپنی جگہ بھی اور ایک دوسرے کے متعلق بھی اور مخالفین کی بے برکتی اور نقصان بھی واضح ہو گیا۔ پھر یہ بھی کہ جو تکلیف مومن کو پہنچتی ہے وہ اس کے ذنوب و عیوب سے تطہیر کا موجب ہو کر اس کی ترقی کا باعث ہوتی اس طرح تکلیف سے اس کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے اور کافر چونکہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لئے اس کے لئے اس کی تکلیف کا نتیجہ ہمیشہ نقصان اور بے برکتی سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ "گو احد میں قریش فتح مند ہو گئے لیکن یہی عارضی فتح مندی ان کے مستقل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔" اس طرح کہ مصیبت مسلمانوں کے حق میں کیا ہوتی ہے؟ فرمایا اس کا نتیجہ مومنوں کے حق میں یہ نکلتا ہے کہ :

"ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور یہ بھی کہ ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دیتا ہے۔" (النور ۲۴ : ۵۵) اور کفار کے حق میں اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے فرمایا :

"اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ تاکہ حق حق ہو کر رہے اور

الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ
تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ

لوگ راہ حق میں پوری پوری کوشش کرنے والے ہیں اور کتنے ہیں جو مشکلوں اور شدتوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ ۲۵۹ ۱۴۲

اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک موت یعنی جہاد کا سامنا نہیں ہوا تھا تم راہ حق میں مرنے کی آرزوئیں کرتے تھے ۲۶۰ لیکن پھر ایسا ہوا کہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے

باطل باطل ہو کر رہ جائے۔" (الانفال ۸ : ۸)

آزمائش کے وقت ثابت قدم رہنا ہی دعویٰ ایمان کی تصدیق ہے

۲۵۹ کیا تمہارا خیال ہے کہ خالی دعویٰ ایمان کے ساتھ ہی تم جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک تو وہ وقت نہیں آیا کہ تمہاری آزمائش بھی کر لی جاتی یہ پہلا ہی موقع ہے کہ تمہاری ثابت قدمی کا امتحان ہوا ہے۔ جس سے یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ کون لوگ ہیں جو راہ حق میں پوری پوری کوشش کرنے والے ہیں اور اس طرح کی مشکلوں اور شدتوں کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ "وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ" اللہ نے نہیں جانا یعنی اللہ نے ظاہر نہیں کیا۔ علم الٰہی میں کسی چیز کے ہونے کا مطلب اور ہے اور علم الٰہی میں جو کچھ ہے اس کے ظاہر ہونے کا مطلب اور۔ علم الٰہی میں جو کچھ ہونا ہے سب موجود ہے لیکن علم الٰہی میں جو کچھ ہونا ہے اس کا اظہار تو اسی وقت ہی ہوگا جب وہ ہو جائے گا اور اظہار کا مطلب ہے دوسروں کو معلوم کرانا تاکہ سب کے علم میں اصل حقیقت آجائے جو پہلے علم الٰہی میں مستور تھی۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (التوبۃ ۹ : ۱۶) "حالانکہ ابھی تو اللہ نے ظاہر کیا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ تو اس سے باخبر ہے۔" یہ خطاب ہے ان نئے لوگوں سے جو قریب کے زمانہ میں ایمان لائے تھے ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب تک تم اس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت نہ کر دو گے کہ واقعی تم خدا اور اس کے دین کو اپنی جان و مال اور اپنے بھائی بندوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو، تم سچے مومن قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اب تک تو تمہاری ظاہر پوزیشن یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنین صادقین اور سابقین الاولین کی

جانفشانی سے غالب آگیا اور ملک پر چھا گیا اس لئے تم مسلمان ہوگئے۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (العنکبوت ۲۹: ۲، ۳) "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے۔" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو یہ ضرور ظاہر کرنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (العنکبوت ۲۹: ۱۱) "تاکہ ظاہر کر دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور ظاہر کر دے منافقوں کو۔"

"وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ" جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے "اور تاکہ اللہ تم کو ظاہر کر دے۔" یعنی نمایاں کر دے۔ اور عام طور پر جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ "تاکہ اللہ جان لے" ایسا کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو سب کو جانتا ہی ہے اور یہ کہنا کہ پہلے جانتا نہیں تھا اب جان لے کسی حال میں صحیح و درست نہیں۔ لیکن جب تک ایک شخص کے اندر کسی چیز کی صرف صلاحیت اور استعداد ہوتی ہے عملاً اس کا ظہور نہیں ہوتا اس وقت تک ازروئے عدل و انصاف نہ تو وہ کسی جزاء کا مستحق ہو سکتا ہے نہ سزا کا۔ مثلاً ایک آدمی میں امین ہونے کی صلاحیت ہے اور ایک دوسرے آدمی میں خائن ہونے کی صلاحیت موجود ہے ان دونوں پر جب تک آزمائش نہ آئے اور ایک سے امانت داری کا اور دوسرے سے خیانت کا عملاً ظہور نہ ہو جائے یہ بات اللہ تعالیٰ کے انصاف سے بعید ہے کہ وہ محض اپنے علم کی بناء پر ایک کو امانت داری کا انعام دے دے اور دوسرے کو خیانت کی سزا دے ڈالے۔ اس لئے یہ وہ علم سابق جو اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے اچھے اور برے اعمال سے پہلے ان کی صلاحیتوں کے بارے میں اور ان کے آئندہ طرز عمل کے بارے میں حاصل ہے انصاف کی اغراض کے لئے کافی نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انصاف اس علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا کہ فلاں شخص چوری کرے گا یا کرنے والا ہے بلکہ اس علم کے ظاہر کر دینے پر ہوتا ہے کہ اس شخص نے چوری کر ڈالی۔ اس طرح بخششیں اور انعامات بھی اس کے ہاں اس علم کی بناء پر نہیں دیئے جاتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجے کا مومن و مجاہد بن سکتا ہے یا بنے گا بلکہ اس علم کے ظاہر کر دینے پر دیئے جاتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے عمل سے اپنا صادق الایمان ہونا ثابت کر دیا ہے اور اللہ کی راہ میں جان لڑا کر دکھا دی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے ترجمہ "ظاہر کر دے" کیا ہے۔ یا "نمایاں کر دیا" مزید وضاحت اور تسلی کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۴ کو دیکھیں۔

تمناء موت کی دو صورتیں اسلام میں جائز اور درست رکھی گئی ہیں

۲۶۰ موت کی ایک تمنا جو اسلام نے جائز اور درست رکھی ہیں یہ ہے کہ انسان یہ خواہش رکھے کہ

تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ

آگئی یعنی جہاد فرض ہوگیا اور تم کھڑے تک رہے تھے کہ اچانک کیا سے کیا ہوگیا۔ ۱۴۳ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے

مجھے میدان جنگ میں شہادت نصیب ہو۔ اس نظریہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہو اور جہاد کرتے ہوئے شہادت پا جاتے۔ اور دوسرے موت کی تمنا یہ ہے کہ ایک آدمی قرآن و سنت سے اپنے مخالف کو دلائل دے اور اپنا موقف ثابت کر دے لیکن مخالف بضد ہو کر نہ تو اس کے دلائل کو تسلیم کرے اور نہ ہی اس کے دلائل کا شافی جواب دے۔ پھر اس طرح بات ختم ہونے کی طرف نہ آئے تو وہ اپنے مخالف کو دعوت مباہلہ دے دے جس میں اللہ تعالیٰ سے دعا طلب کی جائے کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے اس کو موت دے دے تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں حالانکہ ان میں موت کی تمنا کی گئی اور باقی کسی صورت میں بھی موت کی تمنا جائز نہیں خواہ انسان کسی دکھ اور مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔

یہ لوگ بھی راہ حق میں شہادت پانے کے لئے دعائیں کرتے تھے یہ لوگ کون تھے؟ ایک تو وہ تھے جو بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور بدر کی فتح کو دیکھ کر ان کو خیال آتا تھا کہ اگر ہم بھی شریک جنگ ہوتے تو ان فوائد کثیرہ سے متمتع ہوتے اس لئے وہ اکثر اس کی خواہش کرتے تھے کہ اب اگر جنگ ہوئی تو ہم جہاد کے لئے ضرور نکلیں گے حالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے وہ نوجوان تھے جو مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے پر راضی نہ تھے بلکہ کھلے میدان میں لڑنا چاہتے تھے تاکہ مریں تو شہادت کی موت داد شہادت لیتے ہوئے ورنہ اپنے جوہر دکھائیں گے اور اس کے لئے میدان ہی بہتر مقام ہے۔

یہ دونوں طرح کے مسلمان جنگ احد میں شریک تھے۔ اس لئے ارشاد الٰہی ہوا کہ "جب تک موت یعنی جہاد کا سامنا نہیں ہوا تھا تم راہ حق میں مرنے کی یعنی شہادت پانے کی آرزوئیں کیا کرتے تھے یعنی جہاد میں شریک ہونے کی آرزو رکھتے تھے اور یہ تمنا موت کی ایسی ہے جیسے ایک حدیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللّٰہ ثم احیٰی ثم اقتل ثم احیٰی ثم اقتل "میں اس بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔" اس اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کی آرزو ساری آرزوؤں سے بہتر اور اچھی آرزو ہے۔

پھر جب وہ وقت آگیا کہ جہاد میں نکلنے کا بگل بجنے لگا تو تم میں سے کچھ لوگ ششدر رہ گئے

۲۶۱ پھر ایسا ہوا کہ جب تم نے یعنی تم میں سے بعض نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یعنی جہاد سر پر آگیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ موت دکھائی دینے کی چیز نہیں اور نہ ہی آج تک کسی کو دکھائی دی ہاں!

اسباب موت نظر آنے والی چیز ہیں اور وہ ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ جہاد بھی ایک موت کا سبب بہرحال ہے اس لئے موت کا سبب نظر آنا گویا موت ہی کا نظر آنا ہے اور پھر جب تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ وقت آگیا تو گویا تم دیکھتے ہی رہ گئے مکہ میں جس موت کے تم طلبگار تھے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی اور تم ششدر ہو کر رہ گئے۔ اور اس حالت کو قرآن کریم میں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (النساء ۴: ۷۷)

"اے پیغمبر اسلام! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں حکم دیا گیا کہ جنگ و خونریزی سے ہاتھ روک لو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو پھر جب ایسا ہوا کہ ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو یکایک ایک گروہ انسانوں کے ڈر سے لگا اس طرح ڈرنے جیسے کوئی خدا سے ڈر رہا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ! اب وہ کہتے ہیں کہ خدایا! تو نے ہم پر جنگ کرنا کیوں فرض کر دیا؟ کیوں نہ ہمیں تھوڑے دنوں کی اور مہلت دے دی۔ اے پیغمبر اسلام! تم ان سے کہہ دو کہ تم موت سے بھاگ رہے ہو اور دنیا کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرا تو اس کے لئے تو آخرت ہی کا سرمایہ بہت ہوا وہاں ذرا بھر بھی کسی کی حق تلفی ہونے والی نہیں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ (محمد ۴۷: ۲۰) "اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی جس میں جنگ کرنے کا حکم دیا جائے مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کی فرضیت کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ افسوس ان کے حال پر۔"

محمد ﷺ کیا ہیں؟ اللہ کے ایک رسول ہیں

۲۶۲ جنگ احد میں کسی مخالفت نے یہ بات پکار دی تھی کہ پیغمبر اسلام ﷺ مارے گئے۔ یہ سن کر بہت سے مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ بعض مسلمانوں نے کہا کہ جب پیغمبر ہی نہ رہے تو اب لڑنے سے کیا فائدہ؟ کچھ لوگ جو ایمان کے کمزور تھے یا ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر وہ نبی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ جنگ میں مارے جاتے۔ یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔

"محمد" حمد سے ہے اور یہ سب سے زیادہ مشہور اسم ہمارے نبی کریم ﷺ کا ہے جس کے معنی ہیں "وہ جس کی قابل تعریف خصلتیں بہت ہی بڑھی ہوئی ہیں۔" آپ ﷺ کا نام محمد آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے رکھا تھا۔ اور آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے آپ ﷺ کا نام احمد رکھا۔ اور اس کا عکس بھی بیان کیا

گیا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے یہ دونوں نام ہی اسم ذات تھے محمد بھی اور احمد بھی۔ قرآن کریم میں بھی رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک احمد آیا ہے اور اس طرح محمد بھی۔ احمد بطور پیش گوئی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اور محمد خود اللہ کی طرف سے اور پورا جملہ محمد رسول اللہ بھی آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اَنَا مُحَمَّدٌ وَّاَنَا اَحْمَدُ میں محمد بھی ہوں اور احمد بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم دیکھتے نہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی لعنت و ملامت اور گالی گلوچ کو پھیر دیا ہے وہ ایسے ہیں کہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں محمد ہوں مذمم نہیں۔

اس سے پہلے بھی کفار مکہ نے کئی بار یہ اعتراض کیا کہ یہ کیسا رسول ہے کہ خود بازاروں میں جاتا ہے سودا سلف خریدتا ہے۔ کھاتا ہے پیتا ہے اور اس کے ایسی ہی ساری ضروریات لگی ہیں جیسے ہم دوسرے انسانوں کے ساتھ۔ بھلا کبھی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ: مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ (الاحقاف ۴۶ : ۹) "ان سے کہو میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا۔"

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے' بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' کھاتا پیتا ہے اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اس شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اردلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے اور ہر اس شخص پر عذاب کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں ذرا بھی گستاخی کرتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے اور پھر اسے یونہی مکے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لئے بے سہارا چھوڑ دے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے رسول کے لئے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا ہوا باغ ہی پیدا کر دیتا یہ تو نہ ہوتا کہ اس کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آجائے اور کسی جگہ جانے کے لئے اسے سواری تک میسر نہ آئے۔

مختصر یہ کہ ایسے موقعہ پر بھی لوگوں میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں اور جو جس کے منہ میں آتا وہ کہہ دیتا۔ لیکن اچانک رسول اللہ ﷺ اپنی .لغلہ پر سوار ہو کر کہنے لگے "انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب" میں نبی ہوں جھوٹا نہیں اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں اور یہ ارشاد فرمانے سے آپ ﷺ کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں اللہ کا رسول بحمد اللہ زندہ ہوں مرا نہیں اور میں نے بالکل سچ کہا کہ میدان ہمارے ہاتھ میں رہے گا۔ اور اسلام کو فتح نصیب ہوگی۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا تھا کہ پورے کا پورا سماں ہی بدل گیا۔ مسلمان آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہوگئے اور ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑا مسلمانوں نے پورا زور لگا کر کفار مکہ

اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّنۡقَلِبۡ

پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا جائیں یا ایسا ہو کہ وہ لڑائی میں قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہ حق سے پھر جاؤ گے؟[۲۶۳] اور جو کوئی راہ حق

کو دوبارہ پسپا کر دیا اور دیر تک ان کا پیچھا کرتے گئے۔

رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اس کے لئے ہمیشہ زندہ رہنا نہیں

۲۶۳ محمد رسول اللہ ﷺ کوئی نئے رسول نہیں ہیں۔ وہ ایسے ہی رسول ہیں جیسا کہ اللہ کے دوسرے رسول تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں بھی ایک دن دنیا سے رخصت ہونا ہے جس طرح پچھلے تمام رسول دنیا سے رخصت ہوگئے پھر اگر وہ دنیا سے اٹھا لئے گئے جس طرح دوسرے رسول اٹھا لئے گئے ہیں تو کیا تم حق پرستی کی راہ سے پھر جاؤ گے؟ کیا تمہاری حق پرستی حق کے لئے نہیں ہے؟ بلکہ محض ایک خاص شخصیت کے لئے تھی؟ فرض کرو کہ جنگ احد والی بات صحیح ہوتی تو پھر کیا ان کی موت کے ساتھ تمہاری خدا پرستی پر بھی موت طاری ہو جاتی؟ اگر تم حق کے لئے لڑ رہے تھے تو جس طرح وہ آپ ﷺ کی زندگی میں حق تھا اسی طرح ان کی موت کے بعد بھی حق ہوتا اور ظاہر ہے کہ حق تو ہمیشہ رہے گا۔ نبی یقیناً دنیا سے اٹھا لیا جائے گا لیکن نبوت رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گی۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق تو بنائے کار اصول اور عقائد ہیں نہ کہ شخصیت اور افراد۔ کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔ پس اگر کسی وجہ سے شخصیت ہم میں موجود نہ رہے یا درمیان سے ہٹ جائے تو ہم سچائی کی راہ سے کیوں منہ موڑ لیں یا ادائے فرض میں کیوں کوتاہی کریں؟ سچائی کی وجہ سے شخصیت قبول کی جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شخصیت کی وجہ سے سچائی سچائی ہوگئی ہے۔

کوئی رسول اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا اور نہ ہی یہ لازم ہے کہ کوئی رسول قتل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول قتل ہوتے رہے اور لوگوں نے ان کو قتل کیا۔ اور اس طرح آپ ﷺ سے پہلے جتنے رسول آئے وہ دنیا سے رخصت ہوگئے اور ایک روز آپ ﷺ کو بھی یقیناً اٹھا لیا جائے گا۔ کیا رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ دنیا سے اٹھا لئے جائیں تو تم بھی راہ حق سے پھر جاؤ گے؟ اچھا اگر خدانخواستہ تم حق سے پھر ہی گئے تو اس سے اللہ کا کیا بگڑے گا؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں، جو کچھ بگڑے گا وہ حق سے پھرنے والوں ہی کا بگڑے گا۔ دوسرے جگہ ارشاد ہوا کہ:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ "اے پیغمبر اسلام! بیشک تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لئے نہیں رکھی ہے اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟"

عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

سے الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کیا بگاڑے گا کچھ بھی نہیں! جو لوگ شکر گزار ہیں
۲۶۴
وہ وقت دور نہیں کہ اللہ انہیں ان کا اجر عطا فرمائے گا۔ ۱۴۴

گویا یہ جواب ہے ان ساری دھمکیوں' بددعاؤں' طعن و تشنیع اور قتل کی سازشوں کا جن سے نبی اعظم و آخر ﷺ کی تواضع کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابر قریش تھے جو آئے دن آپ ﷺ کو اس تبلیغ کے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے اور ان میں سے بعض پرجوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپ ﷺ کا کام تمام کر دیں۔ دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کر لیتا تھا آپ ﷺ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اس کی عورتیں آپ ﷺ کو کلپ کلپ کر کوسنے دیتی تھیں اور آپ ﷺ کے لئے بددعائیں مانگا کرتی تھیں اور ان کے مرد آپ ﷺ کو ڈراوے دیتے تھے۔ خصوصاً ہجرت حبشہ کے بعد تو مکے بھر کے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا کیونکہ مشکل ہی سے کوئی گھرانہ بچا رہ گیا ہوگا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی کریم ﷺ کے نام کی دہائیاں دیتے تھے کہ اس شخص نے ہمارے گھر برباد کئے ہیں۔ انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ نبی ﷺ کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم ان کی پروا کئے بغیر بے خوف اپنا کام کئے جاؤ۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ آپ ﷺ کی زندگی ہی میں کر کے دکھا دیا گیا

۲۶۴ اس میں گویا تنبیہہ فرما دی کہ رسول اللہ ﷺ تو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد بھی مسلمانوں کو اس دنیا میں دین پر ثابت قدم رہنا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس عارضی شکست کے وقت نبی اعظم و آخر ﷺ کے زخمی ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز بھی پوشیدہ تھا کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد جو حالات صحابہ کرامؓ پر پیش آسکتے تھے وہ آپ ﷺ کی دنیوی حیات ہی میں ظاہر کر دیئے گئے تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اصلاح خود نبی کریم ﷺ کی زبان اقدس سے ہو جائے اور آئندہ جب یہ واقعہ حقیقت میں پیش آجائے تو یہ فدایان رسول ﷺ از جا رفتہ نہ ہو جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ آپ ﷺ کے اٹھائے جانے کے بعد جب بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس آیت قرآنی کی سند لے کر ان کو سمجھایا اور وہ سب کے سب سنبھل گئے اور اس طرح وہ اپنے آپ پر قابو پا گئے۔ اور اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرما دیا کہ ایسے مشکل اوقات میں عقل و فکر کو ہاتھ سے رخصت نہ ہونے دینے والے لوگ ہی "دراصل شکر گزار ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ اللہ انہیں ان کا اجر عطا فرما دے گا۔"

اس آیت میں پیچھے ارشاد فرمایا ہے کہ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا "اور جو کوئی راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کیا بگاڑے گا۔" جس کا مطلب بھی واضح ہے کہ جو شخص ایک حقیقت کو تسلیم نہ کرے تو اس کے ایسا کرنے سے اللہ کا کیا بگڑے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تو کوئی بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ آج بھی ان الفاظ پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہئے جو نت نئے عقیدے گھڑ کے یا دوسروں کے بنے بنائے عقیدوں پر جم چکے ہیں اور کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں وہ اس طرح کے عقیدے رکھ کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ رہے اور نہ ہی اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کا کچھ بگڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے جو قانون بنا دیا ہے وہ اپنی جگہ پر ان ٹل ہے۔ اس دنیا میں بڑی بڑی شخصیتیں آئیں اور پھر اپنے وقت پر چلی گئیں اللہ تعالیٰ کا نظام باقاعدگی سے چل رہا ہے کسی کے آنے جانے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی ہے۔ فرمایا:

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ○ (النساء ۴ : ۱۳۳) "لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں اس جگہ سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔" ایک جگہ فرمایا:

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ○ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ○ (ابراہیم ۱۴ : ۱۹، ۲۰) "اگر وہ چاہے تو تم سب کو مٹا دے اور ایک نئی پیدائش نمودار کر دے اور ایسا کرنا اس پر کچھ دشوار نہیں۔" اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ایسا کرتا ہی آرہا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ○ (الانعام ۶ : ۱۳۳) "اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد جس گروہ کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے جس طرح ایک دوسرے گروہ کی نسل سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا:

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (التوبہ ۹ : ۳۹)

"اگر تم قدم نہ اٹھاؤ گے تو یاد رکھو وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا اور تم اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے اور اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۡ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (ھود ۱۱ : ۵۷) "پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دی اور میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ

اور یاد رکھو کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی جان مر نہیں سکتی۔ ہر جان کے لئے ایک خاص وقت ٹھہرا دیا گیا ہے[۲۶۵] اور جو شخص دنیا کے فائدے پر نظر رکھتا ہے ہم اسے دنیا میں سے دیں گے اور جو کوئی آخرت کے ثواب پر نظر رکھتا ہے اسے آخرت کا ثواب ملے گا

الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (المائدہ ۵ : ۵۴) "مسلمانو! میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں اللہ دوست رکھتا ہو اور وہ بھی اللہ کو دوست رکھتے ہوں' مومنوں کے لئے نہایت ہی نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جان لڑا دینے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے ہوں گے۔ اور یہ تو اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے اور وہ بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ہر ذی نفس کیلئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے وہ اس میعاد سے پہلے نہیں مر سکتا

۲۶۵ اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ تم کو چاہئے کہ حوادث و مصائب کے وقت ثابت قدم رہو اور یاد رکھو کہ ہر انسان کی موت اللہ تعالیٰ کے نزدیک لکھی ہوئی ہے۔ اس کی تاریخ' دن اور وقت معین ہے نہ اس سے پہلے کسی کو موت آسکتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد وہ زندہ رہ سکتا ہے پھر کسی کی موت سے ایسے سراسیمہ ہو جانے کے کوئی معنی نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاحزاب ۳۳ : ۱۶) "اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لئے کچھ بھی نفع بخش نہ ہو گا کیونکہ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔" مطلب یہ ہے کہ اس فرار سے تمہاری عمر بڑھ نہیں جائے گی اور نہ اس کا نتیجہ کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ قیامت تک تم جیتے رہو گے اور روئے زمین کی دولت پا لو گے۔ بھاگ کر جیو گے بھی تو اتنا ہی جتنا کہ تمہارے جینے کا وقت باقی ہے اور اس دنیا سے تم کو اتنا ہی حصہ ملنا ہے جتنا کہ تمہارے لئے مقدر ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ:

اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء ۴ : ۷۸) "تم کہیں بھی ہو موت تمہارا ٹھکانہ پا کر رہے گی اگر تم اونچے اور مضبوط قلعوں کے اندر چھپے ہو جب بھی اس کی پکڑ سے بچنے والے

مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۱۴۵ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ

ہم شکر گزاروں کو ان کی نیک عملی کا اجر ضرور دیں گے۔ ۱۴۵

اور دیکھو کتنے ہی نبی تھے جن کے ساتھ ہو کر بہت سے رب والے لوگوں نے

نہیں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ:

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ال عمران ۳ : ۱۶۸) "اے پیغمبر اسلام! تم ان سے کہہ دو اچھا اگر تم واقعی اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب موت تمہارے سرہانے آکھڑی ہو تو اسے نکال باہر کرنا۔"

دنیا کے طلب گار کو دنیا اور آخرت کے طلب گار کو دنیا و آخرت مل جائے گی

۲۶۶ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے عمل سے دنیا ہی کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا میں کچھ حصہ دے دیتے ہیں اور جو شخص آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو آخرت کا ثواب بھی یقیناً ملے گا۔ اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دیں گے۔ یہ گویا تنبیہہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا اس لئے کہ جن حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے جبل عینین پر نگراں بنا کر کھڑا کیا تھا وہ ابتدائی فتح کے وقت ہی عام مسلمانوں کو مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول دیکھ کر ان سے بھی اکثر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اب تو فتح ہوگئی اور اس جگہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ رہی پھر ہم بھی مال غنیمت جمع کرنے میں کیوں حصہ نہ لیں؟ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ مال غنیمت جمع کرنے کی فکر میں نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ کام کو چھوڑ بیٹھنے میں ان سے غلطی ہوئی۔ بلاشبہ حقیقت کے اعتبار سے مال غنیمت جمع کرنا بھی بُری دنیا طلبی نہ تھی جو شرعاً مذموم ہے بلکہ غنیمت جمع کر کے محفوظ کرنا اور پھر اس کو اس کے مصرف میں خرچ کرنا بھی جزو جہاد ہے اس لئے عبادت ہے۔ ان صحابہؓ کا اس میں شریک ہونا صرف طمع دنیوی کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ شرعی ضابطہ سے اگر وہ اس مال کو جمع کرنے میں شریک نہ ہوتے جب بھی ان کو مال غنیمت میں سے وہ حصہ ملتا جو ملنا تھا۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حضرات نے طمع دنیا کی خاطر اس مقام کو چھوڑا۔ اس مقام کو چھوڑنا اس لئے خطا تھی کہ ان کو تاکید کی گئی تھی کہ اس مقام کو نہ چھوڑنا لہٰذا دراصل ان کو اس نافرمانی کا گناہ ہوا جو بعد میں معاف بھی کر دیا گیا اور اس سے جو کچھ پہنچنا مقدر تھا وہ بھی پہنچ گیا اور ویسے بھی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بڑوں کی تھوڑی لغزش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے اس لئے ان کے اس معمولی جرم یا خطا کو بڑا سخت جرم قرار دیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے دوسرے بڑے لوگ بھی محتاط رہیں۔ اور یہاں بھی مال غنیمت جمع کرنے میں کچھ نہ کچھ دنیوی منفعت کا تعلق ضرور تھا اور اس تعلق کا طبعی اثر قلوب میں ہونا بھی مستبعد نہ تھا۔ صحابہ کرامؓ کے معیار اخلاق کو بلند سے بلند کرنے کے لئے ان کے

رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٦﴾ وَمَا كَانَ

جنگ[۲۶۷] کی یعنی جہاد کیا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سختیوں کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پیش آئی ہوں بے ہمت ہوگئے ہوں اور نہ ایسا ہوا کہ وہ کمزور پڑ گئے ہوں یا عجز و بے چارگی کا اظہار کریں اور اللہ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو مشکلوں، مصیبتوں میں ثابت قدم رہتے ہیں[۲۶۸]۔ ۱۴۶

اور ان کی زبانوں سے اس کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے

اس عمل کو بھی ارادۂ دنیا سے تعبیر فرمایا گیا کہ طمع دنیا کا ادنیٰ سا غبار بھی ان کے قلوب تک نہ پہنچ سکے۔ اور اس سے قوم کے بڑوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے کہ بڑوں کی معمولی لغزش سے قوم کا کتنا بڑا نقصان ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۲۰۲ کا مطالعہ کریں۔

سابق انبیاء کرام کے ساتھ ہو کر بھی اللہ کی راہ میں لوگوں نے جہاد کیا

۲۶۷ اس سے گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور امت کے دوسرے لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ جہاد صرف تم لوگوں ہی پر فرض نہیں کیا گیا بلکہ پہلی امتوں میں بھی یہ ضروری قرار دیا گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے پہلے انبیائے کرام بھی کفار کے ساتھ جنگ کرتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر بھی اللہ کے بندوں نے جہاد کیا اور وہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہے اس طرح تم کو بھی ثابت قدم رہنا چاہئے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے تو پہلا کام تمہارا یہی ہے کہ ان کی گردنیں مارو (فَضَرْبَ الرِّقَابِ) یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو۔ تب قیدیوں کو مضبوط باندھو اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ احسان کر دیا فدیہ کا معاملہ طے کر لو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے اور یہ تمہارے کرنے کا کام ہے۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا لیکن اللہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے آزمائے۔"

مسلمانوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر محض باطل پرستوں کی سرکوبی کرنی ہوتی تو وہ اس کام کے لئے تمہارا محتاج نہ تھا یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان بھی چشم زدن میں کر سکتا تھا مگر اس کے پیش نظر تو

قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ

گناہ بخش دے ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوگئی ہیں ان سے درگزر فرما، ہمارے قدم راہ حق میں جما دے اور منکرین حق کے گروہ پر ہمیں فتح مند کر دے۔ ۲۶۹ ۱۴۷

تو اللہ نے بھی انہیں دونوں جہانوں میں اجر عطا فرمایا دنیا کا بھی ثواب دیا اور

یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو حق پرست ہوں وہ باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلہ میں مجاہدہ کر لیں تاکہ جس کے اندر جو کچھ اوصاف ہیں وہ اس امتحان سے نکھر کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے کردار کے لحاظ سے جس مقام اور مرتبے کا مستحق ہے وہ اس کو دیا جائے۔ اس لئے یہی پہلے ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی آئندہ بھی ہوگا۔

گزشتہ مجاہدین نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا لیکن عجز و بے چارگی کا اظہار نہ کیا

۲۶۸ گزشتہ انبیاء کرام کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والوں کے مناقب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان میں سے بھی ایسے مجاہدین تھے جنہوں نے جان کی بازی لگائی اور اس طرح ڈٹ کر کفار کا مقابلہ کیا اور وقت آنے پر کبھی سستی نہ دکھائی اور نہ ہی وہ مصائب و شدائد سے گھبرائے۔ دیکھو طالوت بادشاہ کی معیت میں لڑنے والوں کا حال تم پڑھ آئے جو طالوت کے ساتھ میدان جنگ میں اترے تھے انہوں نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ جو طاقت اور قوت اللہ نے ایمان میں رکھی ہے وہ کسی اسلحہ میں بھی نہیں رکھی اور اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانوں کی قربانیاں دیں کہ لوگوں پر واضح کر دیا کہ جب کوئی اللہ کا ہو جائے تو وہ جسم و جان کی پروا نہیں کرتا

ہر کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال وخانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ تو دو جہاں راچہ کند

وہ مجاہدین بھی ایسے تھے کہ جہاد کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے تھے

۲۶۹ اس آیت میں گویا اس طرف اشارہ فرما دیا کہ ان لوگوں کے عمل میں تو کیا لغزش ہوتی زبان تک بھی ان کی کلمات تحمید و تمجید اور اعتراف عجز و قصور کے لئے وقف رہی اور وہ اپنے رب سے اس طرح دعائیں کرتے رہے کہ

اے اللہ! ہمارے پچھلے گناہ معاف فرما دے۔

اے اللہ! اس عمل جہاد میں ہم سے جو کوتاہی ہوگئی ہو اس کو معاف فرما دے۔

ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ۱۴۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا اور اللہ تو انہیں لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں۔ ۱۴۸

اے مسلمانو! اگر تم ان لوگوں کے کہنے میں آگئے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی

اے اللہ! ہمیں ثابت قدمی پر قائم رکھ کہ ہمارے قدموں میں لغزش و لرزش نہ آئے اور
اے اللہ! منکرین حق کے گروہ پر ہمیں فتح مند کر دے۔

اللہ کے نیک بندوں کی ان دعاؤں میں ہمارے لئے کتنے ہی سبق محفوظ کر دیئے گئے اگر ہم یاد کرنے والے ہوں اور اللہ کرے کہ ہم کو یاد رہیں۔

۱۔ یہ کہ حقیقت شناس مومن کا کام یہ ہے کہ وہ کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جدوجہد اللہ کی راہ میں کر رہا ہو اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر مان کرے کیونکہ درحقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی نیک عمل ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فواللہ لو لا اللہ ما اھتدینا۔ ولا تصدقنا ولا صلینا "اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ہمیں نہ سیدھے راستے کی ہدایت ملتی اور نہ ہم سے زکوٰۃ و نماز ادا ہو سکتی۔

۲۔ جو نیک عمل کوئی انسان کرتا ہے وہ کتنا ہی درست کر کے کرے لیکن اس مالک الملک والملکوت کی شان جلالی کے مطابق کر لینا اس کے بس میں نہیں۔ اس کے ادائے حق میں کوتاہی ناگزیر ہے اس لئے اس سے حالت عمل میں بھی استغفار کی ضرورت ہے۔

۳۔ کبھی یہ اطمینان نہیں ہو سکتا کہ جو نیک عمل وہ اس وقت کر رہا ہے آگے بھی اسے اس کی توفیق ہوگی اس لئے موجودہ عمل میں کوتاہی پر ندامت اور آئندہ کے لئے اس پر قائم رہنے کی دعا مومن کا وظیفہ ہونا لازمی ہے۔

۴۔ اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو رنج و غم یا کوئی کسی طرح کی تکلیف یا دشمن کے مقابلہ میں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اکثر اس کے سابقہ گناہوں کا اثر ہوتا ہے جس کا علاج استغفار و توبہ ہی ہو سکتا ہے جیسا کہ مولانا رومی نے کہا ؎

غم چو بینی زود استغفار کن غم بامر خالق آمد کار کن

يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللَّهُ

ہے تو یاد رکھو وہ تمہیں راہ حق سے الٹے پاؤں پھرا دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تباہی و نامرادی میں جا گرو گے۔ ۱۴۹

جن کو دین و دنیا میں کامیاب ہونے کی ضمانت دے دی گئی

۲۷۰ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں یعنی جہاد کرتے ہیں اور دنیا کو دین پر قربان کر دیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کا ثواب بھی دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو ان کو نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے۔ بس ان لوگوں کو زیر نظر آیت میں "محسنین" کہا اور احسان کے معنی حدیث شریف میں آئے ہیں کہ "تعبد اللہ کانک تراہ" کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور جو شخص اپنے فوائد دنیوی اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا ہے یا قربان کر دینے کے لئے تیار ہوتا ہے وہ واقعی احسان کی اس تعریف کے زمرہ میں آتا ہے۔

مسلمانوں کو غیروں کی چالوں میں نہ آنے کی ہدایت الٰہی

۲۷۱ غزوہ احد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کی افواہ گرم ہونے پر منافقین نے جب جنگ کا پانسہ پلٹتے ہوئے دیکھا تو ان کو شرارت کا موقعہ مل گیا۔ مسلمانوں سے کہنے لگے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ ہی نہ رہے تو ہم اپنا دین ہی کیوں نہ اختیار کر لیں جس سے سارے جھگڑے مٹ جائیں۔ اس سے منافقین کی خباثت اور مسلمانوں کا بدخواہ ہونا بالکل واضح ہے اس لئے آیت مذکورہ میں ہدایت دے دی گئی کہ ان دشمنوں کی بات پر کان نہ دھریں اور ان کو اپنے کسی مشورہ میں شریک بھی نہ کریں اور نہ ہی ان کے کسی مشورہ کا اتباع کریں گویا گزشتہ آیت میں اللہ والوں کا اتباع کرنے کی ہدایت تھی اس میں منافقین اور مخالفین اسلام کے مشورہ پر عمل نہ کرنے اور ان سے بچتے رہنے کی ہدایت ہے۔

اطاعت سے اس جگہ یا تو کافروں کے سامنے کمزور ہو کر عاجزی اختیار کر لینا اور ان کی ماتحتی قبول کر لینا ہے جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں فرمایا تھا کہ یاد رکھو نبی کے ساتھی ایسے نہیں ہوتے کہ دشمن کو ذرا غالب دیکھا تو فوراً اس کے آگے جھک گئے اور یہ اس لئے فرمایا کہ وہ منافق جو راستہ سے واپس ہو گئے تھے اب اس مصیبت کو دیکھ کر اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ ابوسفیان مدینہ کا رخ کرے تو فوراً اس کی اطاعت کر لیں اس لئے مومنوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ ان کافروں اور منافقوں کی اطاعت کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ دین اسلام سے تم کو پھیر دیں جیسا کہ سورہ بقرہ میں بیان کر دیا گیا تفصیل کے لئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۲۱۷۔ اور اس سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ ان کی رائے دین کے بارے میں مت قبول کرو اور ان کو

مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ

تمہارا کارساز اور رفیق تو اللہ ہے۔ مدد کرنے والوں میں اس سے بہتر مددگار کون ہو سکتا ہے۔ ۲۷۲ ۱۵۰

وہ وقت دور نہیں کہ ہم منکرین حق کے دلوں میں تمہاری ہیبت بٹھا دیں گے یہ

اپنے خیر خواہ سمجھ کر ان کے پیچھے مت چلو۔ اور فی الحقیقت دونوں معنی درست ہیں۔ اگر مسلمانوں کو کفار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کسی میدان میں جنگ سے نبرد آزما ہو کر غالب بھی آجائیں تو مسلمانوں کو یہ نہیں چاہئے کہ فوراً ہمت ہار کر ان کی اطاعت قبول کرلیں اور اس طرح امور دینی میں بالخصوص اور ویسے بھی ہر حال میں کافروں کے تتبع سے بچنا ہی چاہئے۔

جب تمہارا کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اس سے بہتر کون کارساز ہو سکتا ہے

۲۷۲ صحیح بخاری میں ہے کہ احد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اٹھا چکے اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے گرد ایک مقام پر جمع ہوئے اور اس وقت رسول اللہ ﷺ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ گئے تھے اور اس سے پہلے آپ ﷺ کی وفات کی خبر پھیل چکی تھی تو ابوسفیان ایک گھاٹی پر چڑھا اور آواز دی کہ کیا قوم محمد (رسول اللہ ﷺ) ہیں تو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ جواب مت دو۔ پھر اس نے کہا ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں جب کوئی جواب نہ پایا تو بولا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور بولتے اس پر سیدنا عمر فاروق ضبط نہ کرسکے اور زور سے جواب دیا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لئے زندہ ہیں۔ اس وقت ابوسفیان نے پکارا "اھل ھبل" یعنی ھبل کا نعرہ بلند کیا۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو جواب دو "واللہ اعلیٰ واجل" اللہ ہی سب سے بلند اور زیادہ جلالت والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا "لنا العزی ولا عزی لکم" ہمارے لئے یعنی ہمارا مددگار عزّیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں۔ اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو جواب دو "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ" اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

زیر نظر آیت میں جو الفاظ بیان فرمائے گئے "بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ" بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو توحید الٰہی کے ساتھ کیسی محبت تھی کہ جب اپنی زندگی اور موت کا سوال ہوا تو خاموشی کا حکم دیا لیکن جب غیر اللہ کی بڑائی کی گئی تو اس طرح گویا اس کا حملہ توحید الٰہی پر تھا اس لئے آپ ﷺ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم مسلمانوں کا کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ ہے ہم کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ یہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے لوگوں کی غلطی بھی شامل ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ بالآخر کافر ہی ذلیل ہوں گے۔ بلاشبہ ہمارا نقصان بھی ہوا لیکن اسلام کی یہ خوبی

كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿١٥١﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ

اس لئے ہوگا کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان ہستیوں کو بھی شریک ٹھہرا لیا ہے جن کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی ان لوگوں کا بالآخر ٹھکانہ دوزخ ہے اور جو ظالم ہیں تو ان کا ٹھکانا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے[۲۷۳]۔ ۱۵۱

اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اس

زبان زد ہے کہ "اتنا ہی ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے۔"

گزشت آنچہ گزشت کفار مکہ کے دلوں میں اب بھی تمہارا رعب موجود ہے

۲۷۳ حالات و واقعات سے ظاہر ہے کہ احد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب موجود تھا ان کو صاف معلوم ہوگیا تھا کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) بھی زندہ ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی زندہ ہیں جیسا کہ پیچھے صحیح بخاری شریف کی حدیث سے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان دوبارہ محمد رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہوگئے ہیں تو اس نے اپنی بہتری اس میں خیال کی کہ فوراً مکہ کی راہ لے۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جاتے وقت کفار مکہ کو خود اس پر ندامت ہوئی کہ ہم اس طرح واپس آگئے اور یہ اچھا نہیں ہوا اور بغیر استیصال کے مسلمانوں کو چھوڑ آئے مگر پھر بھی اس رعب کی وجہ سے وہ دوبارہ لوٹ نہ سکے۔ ہاں! نبی کریم ﷺ نے باوجود زخمی ہونے کے ان کا تعاقب کیا اور اگلے روز حمر الاسد تک ان کے پیچھے گئے۔ اس رعب کی وجہ سے ہی یہ ہوا کہ اگلے سال باوجود وعدہ کر جانے کے ابوسفیان مقابلہ کے لئے نہ نکلا۔ اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا تب بھی راتوں رات یہ اتنا بڑا لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی خاص تعداد نہ تھی بھاگ اٹھا اور ایسا گیا کہ پھر کبھی آنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے حملوں کا انقطاع ہوگیا بلکہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے دس ہزار صحابہ کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے اس طرح اس ایک چھوٹی سے جماعت کے سامنے سارے ملک کا عاجز آجانا اسی رعب خداوندی کی وجہ سے تھا۔

احادیث صحیحہ سے یہ بات بھی معلوم ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ نے اپنی جو خصوصیات دوسرے انبیاء

کرام سے بتائی اور بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک رعب کا دیا جانا بھی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک بات یہی ہے کہ نصرت بالرعب مسیرۃ شھر میری امداد ایک مہینہ کی مسافت کے برابر رعب سے کی گئی ہے اور یہ رعب فرضی بات نہ تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے اور اس کی ہزاروں شہادتیں لئے کھڑی ہے کہ دنیا میں جو کامیابی اتنی تھوڑی مدت میں آپ ﷺ نے حاصل کی وہ آپ ﷺ سے پہلے کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی بلکہ آج تک اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اور یہ آپ ﷺ کا رعب ہی تھا کہ عرب کے پورے خاندان' بہادری اور جنگجوئی میں نام پیدا کرنے والے آپ ﷺ کا کچھ نہ بگاڑ سکے بلکہ مکہ میں آپ ﷺ نے تیرہ برس گزارے اور جب تک حکم الٰہی نہیں آیا ہجرت نہیں کی۔ خون کے پیاسے وہیں پھرتے رہے لیکن آپ ﷺ کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ مشورے طے کرنے والے جب آپ ﷺ کے سامنے آئے تو نظروں سے نظریں بھی نہ ملا سکے۔

آپ ﷺ کا یہ رعب پوری دنیا میں اس طرح چھا گیا کہ آپ ﷺ کے بعد مدتوں تک صحابہ' تابعین اور تبع تابعین کے ادوار گزر گئے اور آپ ﷺ کا وہی رعب کام دکھاتا رہا۔ دور نہ جائیں آج بھی اس مادی ترقی کے باوجود مسلمانوں کا رعب اس قدر ہے کہ غیر مسلم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر مسلمان متفق و متحد ہوگئے تو ہمارا جینا محال ہو جائے گا اور اسلام کا یہی رعب ان سب کو متحد کئے ہوئے ہے اور سارے اختلافات کے باوجود وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اکٹھے ہیں اور بات صرف اتنی ہے کہ مسلمان اس حقیقت کو بدقسمتی سے خود بھول چکے ہیں کہ ہم کونسی قوم ہیں اور ہمارا رعب دوسری اقوام کے دلوں میں کتنا ہے اور وہ ہم سے کس قدر خائف ہیں۔

آج مسلمانوں کی اس گئی گزری حالت میں بھی اکثر عیسائی مدبرین کی حالت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح کمزور کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان کی قوت سے خائف ہیں حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی قوت جو کچھ ہے اس سے اتنی بڑی بڑی سلطنتوں کا خائف ہونا جو کروڑوں کی تعداد میں افواج رکھتی ہیں جن کے ایٹمی پروگراموں کے مقابلے میں مسلمان بالکل نہتے ہیں ایک مضحکہ خیز خیال ہے۔ مسلمانوں کی اسلامی زندگی کا جنازہ نکلا کھڑا ہے تاہم عیسائی مشنریوں کو اگر کسی مذہب کا خوف ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ یہ رعب حق ہے اور یہ انشاء اللہ اسی طرح رہے گا اور اللہ کرے کے مسلمان خود ہی اس حکمت الٰہی کو محسوس کر لیں کیونکہ مخبر صادق نبی اعظم و آخر ﷺ کے الفاظ بالکل حق ہیں اس لحاظ سے وہ خدائی وعدہ بھی ہے اور خدائی وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ! پس اس رعب کی وجہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرما دی کہ "مَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ" اس لئے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور یہ آج بھی حقیقت ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی کہ مشرک بزدل اور

کمزور ہوتا ہے کیونکہ جو شخص ادنیٰ سے ادنیٰ طاقت کے سامنے سر جھکانے کو تیار رہے حتیٰ کہ بادو باراں کی اور دوسری ادنیٰ و ساری طاقتیں تو ایک طرف رہیں بے جان چیزوں سے بھی جیسے پتھروں' درختوں' بتوں اور مردہ انسانوں کی پرستش کرتا پھرتا ہے اس لئے کہ وہ ان سب کو خدا سمجھتا ہے اور ان کی عبادت کرتا ہے ان پر قربانیاں پیش کرتا ہے اور ان سے مرادیں مانگتا ہے ان سے دعائیں کرتا ہے اور اس طرح کے افعال سے اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ ہی کی طاقت کو سب طاقتوں سے طاقتور خیال کرتا ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اس ایک ہی سے ڈرتا ہے۔ وہ اپنے اوپر صرف اور صرف اللہ ہی کی طاقت کو خیال کرتا ہے باقی سارے عالم کی طاقتوں کو وہ اپنے قدموں کے نیچے سمجھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی غیر اللہ سے نہیں ڈرتا وہ اتنا قوی القلب ہے کہ ساری دنیا کی مخالفت سے بھی نہیں ڈرتا اور حق پر قائم رہتا ہے۔ اس بات کے پیش نظر اب قرآن کریم کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرو چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ ○ (الانفال: ۸ : ۱۲) "عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں مومنوں کی دہشت ڈال دوں گا۔ سو مسلمانو! ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ۔" یاد رہے کہ ایک افرادی جوڑ ہوتے ہیں اور ایک جماعتی اور اس جگہ دونوں ہی مراد ہیں۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوْقَاتَلَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (الفتح ۴۸ : ۲۲) "اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے پھر وہ نہ کسی کو دوست پاتے اور نہ مددگار۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا: هُوَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ○ (الحشر ۵۹ : ۲) "وہی تو ہے جس نے ان لوگوں کو جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اِن کے گھروں سے پہلی ہی بار جمع کر کے نکال دیا۔ تم کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انہیں بھی غلط فہمی تھی کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ پھر اللہ نے ان کو وہاں سے آلیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ پس اے اہل بصیرت' عبرت حاصل کرو" ایک جگہ ارشاد ہوا الٰہی ہوا:

وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ○ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِیَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ○

اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ

کے حکم سے دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے[۲۷۴] تھے لیکن جب ہم نے تم کو فتح مندی کا جلوہ دکھلایا جو تمہیں اس قدر محبوب ہے تو تم نے کمزوری دکھلائی اور جنگ کے بارے

(الاحزاب ۳۳ : ۲۶، ۲۷) "اور اہل کتاب میں سے جو ان کے پشت پناہ ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔ بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید اور اللہ نے ان کے ذہن اور ان کے گھر اور ان کے مال اور اس زمین کا جس پر تم نے پیر بھی نہ رکھا تھا تم کو مالک بنا دیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" اور اس کے فیصلے ان مٹ ہیں۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (المجادلة ۵۸ : ۲۱) "اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے بے شک اللہ بڑا قوت والا اور غلبہ والا ہے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (المومن ۴۰ : ۵۱) "بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔" یعنی قیامت کے دن جبکہ مومنین رسولوں کی تبلیغ اور کافروں کی تکذیب پر شہادت دیں گے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس ۱۰ : ۱۰۳) پھر جب عذاب کی گھڑی آجاتی ہے تو ہمارا قانون ہے کہ اپنے رسولوں کو اور مومنوں کو اس سے بچا لیتے ہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے اوپر ضروری ٹھہرا لیا ہے کہ مومنوں کو بچا لیا کریں۔

آپ غور کریں گے تو اس سچی بات پر سر دھن کر رہ جائیں گے کہ نزول قرآن کے وقت مسلمانوں کی جو جماعت پیدا ہوگئی تھی اس کے مقابلہ میں مشرکین عرب کا یہی حال تھا کہ وہ تعداد میں بہت اور سروسامان میں طاقت ور تھے مگر ایمان و یقین کی روح سے محروم تھے۔ مسلمان تعداد میں بلاشبہ تھوڑے اور سروسامان سے محروم تھے مگر ایمان و یقین کی روح سے معمور تھے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ سب کو معلوم ہے کہ قلت کی ہیبت سے کثرت کے دل کانپ اٹھے اور مٹھی بھر انسانوں نے عرب کی پوری آبادی کو شکست دے دی۔

وہ واقعہ یاد کرو جب کہ ہم نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا تھا اور تم کفار کو تہ تیغ کر رہے تھے

۲۷۴ وہ وعدہ الٰہی کیا تھا جو پورا ہوا؟ پیچھے آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ وقت یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تین ہزار ملائکہ سے مدد فرمائے گا۔" یہاں

فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ

میں باہم دگر جھگڑنے لگے اور بالاخر اپنے سردار کے حکم سے کہ وہ اللہ کا رسول تھا [۲۷۵]

ارشاد ہوا کہ "اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدہ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اللہ کے حکم سے دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے تھے۔" گویا وہ وعدہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا وہ اللہ نے پورا کر دکھایا۔ وعدہ کیا تھا کہ ملا ئکہ تمہاری نصرت کریں گے اور وعدہ یعنی نزول ملا ئکہ اللہ نے پورا کر دیا۔ کس طرح؟ کہ جب تم نے دشمنوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ گویا ملا ئکہ معاون و مددگار رہے اور کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا لیکن جنگ کرنے والے کافروں کو تہ تیغ تم مسلمان کر رہے تھے۔

یہ بات بالکل حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ اٹھے تاریخی واقعات ہیں جو آج بھی صفحات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہ تیغ کیا کہ ان کا صاحب لوا مارا گیا بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے جھنڈا آیا سب مارے گئے۔ اور اس پر تاریخ شاہد ہے کہ ان میں اسی قدر لوگ زخمی ہوگئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے اور کثرت سے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہی ان کو یہ جرات نہ ہوئی کہ باوجود بعد میں مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے ان کا استحصال کر سکتے یا ان کو قیدی ہی کر لیتے۔ جن لوگوں کی تباہی کے لئے وہ اس قدر سامان کر کے آئے تھے اسی سامان کا اس طرح میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ جانا صاف بتاتا ہے کہ پہلی دفعہ ان میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ ان کا لشکر ہزیمت اٹھا چکا تھا اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔

جنگ احد کی دوسری حالت کا ذکر کہ تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا

۲۷۵ یہ جنگ کی گویا دوسری صورت ہے کہ تم نے کمزوری دکھائی۔ ۲۔ جنگ کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے۔ ۳۔ اپنے سردار یعنی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ قرآن کریم نے ان تین باتوں کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ا "فَشِلْتُمْ" ۲ "تَنَازَعْتُمْ" ۳ "عَصَيْتُمْ" اور یہ تینوں صورتیں ان حضرات کی ہیں جو جبل عینین پر متعین تھے جن کی تعداد پچاس کے قریب تھی جن کے سردار عبداللہ بن جبیر تھے۔ جن کا کام دشمنوں پر تیر پھینکنا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس جگہ ڈیوٹی پر متعین کرتے وقت اس طرح ارشاد فرمایا تھا لا تبرحوا ان رایتمونا ظهر ناعليهم فلا تبرحوا وان رایتموهم ظهروا علينا فلا تعينونا (بخاری) "تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا اگر دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے ہیں۔ تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا اگر تم دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں تو تم ہماری مدد کے لئے نہ آؤ۔" جنگ کے دوران اس حکم کی کیا حیثیت ہے؟ اور یہ حکم کس نوعیت کا ہے؟ اس

مِّنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ

نافرمانی کر بیٹھے۔ تم میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو دنیا کے خواہش مند[۲۷۶] تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کی نظر آخرت[۲۷۷] پر تھی پھر ہم نے تمہارا رخ دشمنوں کی طرف سے پھرا دیا تاکہ

حقیقت کو وہی اچھی طرح سمجھتا ہے جو کبھی فوجوں کی کمان کر چکا ہو۔ گویا یہ اتنا پختہ اور مضبوط حکم تھا کہ جب تک دوبارہ کوئی حکم نہ آتا وہ مرتے یا زندہ رہتے۔ مسلمانوں کا لشکر فتح پاتا یا شکست یہ لوگ اس جگہ کو چھوڑنے کے مجاز نہ تھے۔ لیکن ہوا کیا؟

ہوا یہ کہ بالکل مختصر لڑائی کے بعد جب کفار کے جھنڈا تھامنے والے لوگ یکے بعد دیگرے قتل ہونا شروع ہوگئے تو کفار میدان سے بھاگ نکلے اور مسلمان تلواریں لہراتے اور للکارتے ہوئے ان کے پیچھے لگ گئے۔ کفار نے سارا سامان جہاں تھا وہیں چھوڑا اور اپنے زخمیوں اور مقتولوں کو اٹھا کر بھاگتے بنے اس طرح گویا مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگئی۔ یہ سارا ماجرا ان لوگوں نے جو جبل عینین پر تھے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کو یقین ہوگیا کہ دشمن بھاگ گیا۔ انہوں نے کمزوری یہ دکھائی کہ آرڈر ملنے سے پہلے اپنی جگہ کو چھوڑ کر نیچے اترنے لگے۔ ان کے سردار عبداللہ بن جبیر نے ان کو روکا لیکن ان میں خوشی کی جو لہر دوڑ گئی تھی اس نے ان کو رکنے نہ دیا۔ یہ تنازع اس طرح ہوگیا کہ جبل عینین پر متعین یعنی تیر اندازوں کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان میں سے کچھ کی رائے میں چونکہ فتح ہوگئی اس لئے اب اس جگہ رکنے کا کوئی جواز نہ رہا اور دوسرے گروہ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کا حوالہ دیا لیکن اتفاق رائے نہ ہوا۔ زیادہ لوگ دوسرے مجاہدین سے آکر مل گئے اور تقریباً دس آدمی وہاں رہ گئے۔ مشرکین مکہ کے سپہ سالار خالد بن ولید نے جب یہ دیکھا کہ جبل عینین پر صرف چند آدمی نظر آتے ہیں تو اس نے اپنی فوج کو اس طرف سے ہو کر حملہ کرنے کا اشارہ دے دیا۔ لہٰذا ان لوگوں نے اچانک حملہ کر دیا اور اس وقت جو صحابہ جبل عینین پر رہ گئے تھے ان کو شہید کرتے ہوئے اسلامی لشکر پر پیچھے سے ٹوٹ پڑے اس طرح گویا وہ لوگ جنہوں نے اپنی جگہ چھوڑی تھی نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور ان کی نافرمانی کا اثر سب پر پڑا۔ جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قومی کاموں پر متعین لوگ اگر کسی طرح کی کوئی غلطی کریں تو اس کا وبال پوری قوم پر پڑتا ہے اس لئے اس طرح کی ذمہ دارانہ جگہوں پر جن لوگوں کو متعین کیا جائے ان کو ہر حال میں اپنی ذمہ داری میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ یہاں جو کچھ ہوا وہ غلطی ضرور تھی اگرچہ وہ غلطی بدنیتی پر مبنی نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی۔

کچھ لوگوں کی نظر دنیا کی خواہش پر تھی

۲۷۶ دنیا کی خواہش کیا تھی؟ غنیمت کا مال جمع کرنا دراصل خالصتہً جہاد کا حصہ تھا اور ضروری تھا کہ

عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ

تمہیں آزمائیں۔ بہرحال اللہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور بلاشبہ وہ مومنوں کے لئے
بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے۔[۲۷۸] ۱۵۲
جب ایسا ہوا تھا کہ تم میدان سے بھاگ رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف مڑ

وہ جمع کیا جاتا اور پھر اسلامی اصولوں کے مطابق تقسیم کیا جاتا لیکن یہ کام دین کا اس وقت نہ رہا جب جن کی ذمہ داری یہ نہ تھی انہوں نے بھی کرنا شروع کر دیا۔ گویا انہی تیر اندازوں کے دو گروہوں کا ذکر ان الفاظ میں اس طرح کر دیا کہ "تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے جو دنیا کے خواہش مند تھے" ظاہر ہے اس دنیا کا مال یعنی مال غنیمت اس دنیا ہی کا کہلائے گا خصوصاً جب ان لوگوں نے بھی اس کو جمع کرنا چاہا جن کو جہاد کے اس حصہ پر متعین نہیں کیا گیا تھا اور خصوصاً اس لئے بھی کہ ان چالیس تیر اندازوں نے جو مال غنیمت کے جمع کرنے پر لگ گئے تھے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اگرچہ وہ کسی بدنیتی کی بنیاد پر نہ تھی۔

کچھ لوگوں کی نظر آخرت پر ٹک گئی اور وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے

۲۷۷ یہ ان ہی تیر اندازوں میں سے دس صحابہ کرامؓ تھے جو اپنی جگہ پر قائم رہے اور اپنا فرض ادا کرتے کرتے شہید ہوگئے اور اس طرح وہ اس دنیا سے تو رخصت ہوگئے لیکن وہ ابدی زندگی پا گئے جس کے بعد کبھی موت نہیں آئے گی اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق ہو کر بلا حساب جنت میں داخل ہوگئے۔ اور پہلے ہی بلاشبہ جنت کے مستحق تو ہوئے لیکن ان کو یہ شرمندگی بھی اٹھانا پڑی جس کی معافی کا اعلان الٰہی آگے آرہا ہے۔

انجام کار جن سے غلطی سرزد ہوئی تھی ان کی غلطی کی معافی کا اعلان کر دیا گیا

۲۷۸ یہ غلطی ان سے کیوں سرزد ہوئی؟ فرمایا مشیت ایزدی کے تحت جس کا نقصان اٹھانے کے باجود فائدہ بھی تھا اور وہ فائدہ ہوا فائدہ کیا ہوا؟ فرمایا "لِيَبْتَلِيَكُمْ" تمہاری جانچ کرنے کیلئے تاکہ اہل نفاق سے مومن ممتاز ہو جائیں۔ اس لئے کہ مومن کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے اور منافق گلے شکوے پر اتر آتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے کبھی غلطی نہ کرنے والوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا ہے اور یہ نقصان یقیناً فرمانبرداری کے لئے زیادتی اجر کا باعث ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ "وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ" تم کو معاف کر دیا گیا یعنی غلطی

يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ

کر دیکھتا تک نہ تھا اور اللہ کا رسول تھا کہ پیچھے سے تم کو بلا رہا تھا[۲۷۹] سو جب تمہارا یہ حال ہوا تو اللہ نے بھی تمہیں رنج پر رنج دیا تاکہ اس حادثے سے تم عبرت پکڑو اور آئندہ نہ

تو ایسی خطرناک تھی کہ معمولی حالات میں ایک قوم کے استیصال کے لئے کافی تھی مگر اللہ تعالیٰ چونکہ انسانوں کی نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ جن لوگوں سے یہ غلطی سرزد ہوئی ان کی نیت خراب نہ تھی بلکہ سہواً خطاء ہوئی اس لئے معاف کر دی گئی۔ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے بڑے بھاری گناہوں کو جن کو کبیرہ گناہ کہنا چاہئے انسانوں کی بعض دوسری خوبیوں کی وجہ سے بلا توجہ بھی معاف کر دیتا ہے اور یہ بھی کہ مرنے والوں کی توبہ کا انحصار ان کی نیت پر ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نیتوں سے واقف ہے جب ان کے گناہ سے درگزر فرمایا اور ان کی معافی کا اعلان کر دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی اور یہی بات ان کی معافی کا سبب ہوئی۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (المومن ۴۰ : ۳) کہ وہ یعنی "اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔"

غزوہ احد کا تیسرا مرحلہ جس میں لشکر اسلام کو ہزیمت کا سامنا ہوا۔

۲۷۹ یہ وہ وقت ہے جب خالد بن ولید کی معیت میں لشکر کفار نے جبل عینین پر رہ گئے صحابہ کرام کی چھوٹی سی جماعت کو شہید کرتے ہوئے لشکر اسلام پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں جب مسلمان فتح کے زعم میں ایک طرف سے لشکر کفار کو دبائے چلے جا رہے تھے دوسری طرف سے ان پر اچانک حملہ نے ان کے اوسان خطا کر دیئے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ہوا؟ وہ چھوٹی سی جماعت جس کے ختم ہونے کا امکان بدر کے دن بھی تھا اور جو اللہ کے فضل و کرم اور اپنے استقلال کے نتیجہ میں میدان کار زار سے فتح و کامرانی کے ساتھ لوٹی تھی آج پھر بہت بڑے امتحان سے گزر رہی تھی اور آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لئے شوال ۳ھ کو دوپہر سے غروب آفتاب کے تقریباً پانچ گھنٹے مکہ کے تیرہ سالوں سے بھی زیادہ صبر آزما تھے۔

غزوہ احد کے اس تیسرے دور کا نقشہ کھینچنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس لئے کہ ہزیمت اٹھانے والے لشکر کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے لیکن مشکل اس لئے کہ ایسے نازک وقت میں کسی لشکر کا دوبارہ تیار ہو کر مخالفین کو نئے سرے سے شکست سے دوچار کر دینا کیسے ہوا؟ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب مسلمان دشمن کی زد میں آکر بھاگ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ ان کو اجتماع کے لئے بلا رہے تھے اور باآواز

مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۵۳ ثُمَّ

تو اس چیز کے لئے غم کرو جو ہاتھ سے جاتی رہی ہے نہ اس مصیبت پر غمگین ہو جو سر پر آپڑے اور یاد رکھو جو تم کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۵۳

بلند فرما رہے تھے "اِلَیَّ عِبَادُ اللّٰہِ۔ اِلَیَّ عِبَادُ اللّٰہِ۔ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ" اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ۔ اے اللہ کے بندوں میری طرف آجاؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا اور دشمن کے حملہ کا خطرہ دل میں ہرگز ہرگز نہ لانا نبی کریم ﷺ کی کمال شجاعت کو دکھاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ چھپے نہیں بلکہ مزید ظاہر ہوتے ہیں اور بے خطر اپنے ساتھیوں کو پکارتے ہیں کہ بھاگو نہیں ادھر آؤ۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کی اس آواز ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ ﷺ کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا اور ایک چھوٹی سی جماعت نے آپ ﷺ کے اردگرد ایک حلقہ سا بنا لیا یہ چودہ سر فروش مجاہدین تھے جن کی قیادت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی راہنمائی آپ ﷺ خود فرما رہے تھے اس طرح لشکر اسلام کے سپہ سالار اعظم ﷺ کے ہمرکاب صرف چودہ محافظوں کا دستہ ہے اور آپ ﷺ پر دو سو گھوڑ سواروں کا عقب کی جانب سے حملہ ہوتا ہے۔ یہ گھوڑ سوار چند ہی لمحے قبل تیر اندازوں کی ایک جماعت کو روندتے ہوئے حملہ آور ہوئے ہیں مگر ان چودہ پندرہ پاپیادہ مجاہدوں نے جس پامردی' جس ہمت' جس استقلال اور جس اولوالعزمی سے اس لشکر کے اس حملہ کو روکا اس کی مثال عالمی عسکری تاریخ پیش کرنے سے یقیناً قاصر ہے اور ان کے اس کامیاب دفاع کی تفصیل یا اس ناممکن تصور کارکردگی کا نقشہ کھینچنا اس قلم کے بس کی بات نہیں۔ ان چودہ جلیل القدر اصحاب رسول ﷺ میں وہ کواکب شامل تھے جن کے کارناموں کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

ان میں سرفہرست سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رفیق سفر ہجرت اور یار غار موجود ہیں۔ عام زندگی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بے شک نرم گفتار' نرم رفتار' غریبوں اور یتیموں کے مونس و غمگسار تھے مگر میدان کار زار میں اپنے ہادی و رہبر کے بعد سب سے زیادہ دلیر اور شجاع معروف تھے۔ انہوں نے اس لشکر کفار کے حملہ کو روکنے کے لئے وہ جوہر دکھائے جن کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے اپنے باقی ساتھیوں سے مل کر آپ ﷺ کے گرد ناقابل تسخیر دیوار قائم کرنے میں پورا پورا کردار ادا کیا۔ اس موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان چودہ نامور دلیروں کے حلقہ کو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے گرد قائم رکھنے میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو استعمال کیا اور پورے میدان کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کی آواز پر لبیک کہنے والے اس دستہ میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ' علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ' زبیر بن

عوام رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، مہاجرین میں سے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ، حارث بن اسمہ رضی اللہ عنہ، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور عبید بن حضیر رضی اللہ عنہ انصار میں سے شامل تھے۔ اس طرح جوں جوں لڑائی ہوتی رہی لشکر اسلام کے سپاہی جو بکھر چکے تھے دوبارہ جمع ہونا شروع ہوگئے۔

احد کی ان مشکل گھڑیوں میں ایک مزید مشکل کا اضافہ

۲۸۰ غم بالائے غم یعنی متواتر غم ہی غم۔ فتح کا شکست سے بدل جانے کا غم۔ ساتھیوں کا میدان احد میں شہید ہونے کا غم۔ قدم اکھڑ جانے کا غم۔ مجاہدین کے زخمی ہونے کا غم۔ ایسی مشکل گھڑیوں میں ایک مزید مشکل کا اضافہ اس طرح ہوا کہ عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا اپنے ہی لشکر کو چیرتا پھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور نبی ﷺ کے قریب آگیا اور تلوار کا وار کیا اور آپ ﷺ کے چہرہ اقدس پر تلوار ماری اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ اس طرح آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا۔ یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپ ﷺ کو پھر دائرہ میں لے لیا۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ جھک کر سپر بن گئے اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا۔ ایک ہاتھ کٹ کر گر گیا لیکن دوسرے ہاتھ سے برابر کفار پر تلوار برساتے رہے ایسے نازک موقعہ پر بھی آپ ﷺ کی زبان سے نکلا تو یہی نکلا کہ "رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ" اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کہ وہ جانتے نہیں۔ اس کی تفصیل مسلم شریف غزوہ احد جلد دوم میں ملاحظہ کریں۔

یہی وہ مقام ہے کہ جس وقت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور تیر انداز تھے اور اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے اور کفار کے لشکر پر تیر پھینک رہے تھے کہ ان کا ترکش ٹوٹ گیا تو نبی ﷺ نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا کہ "تم پر میرے ماں باپ قربان تیر مارتے جاؤ۔" بخاری ص ۵۸۰۔

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ اقدس زخمی ہوا لیکن مسلمانوں کو آپ ﷺ کی اس تکلیف کا اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ اپنی ساری مصیبتوں کو بھول گئے۔ گویا "مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہوگئیں" اس طرح ارشاد الٰہی بھی ہوا کہ "تمہیں رنج پر رنج دیا تاکہ اس حادثے سے تم عبرت پکڑو اور آئندہ نہ تو اس چیز کے لئے غم کرو جو ہاتھ سے جاتی رہی ہے اور نہ ہی اس مصیبت پر غمگین ہو جو سر پر آپڑے۔" تاکہ اپنی غفلت کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ چوکس رہنے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی صحیح معنوں میں پیروی کرنے کی ہمت بڑھ جائے اور اس طرح قوم مسلم کو سبق سکھا دیا کہ جب کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کے وجوہ معلوم کئے جائیں اور پہلے سے کہیں زیادہ صبر و استقلال سے کام جاری رکھا جائے نہ کہ ماتم اور مسلسل ماتم پر ماتم شروع کر دیا جائے۔

علم الٰہی میں انسانوں کے سارے کاموں کی حقیقت موجود ہے

۲۸۱ کوئی کس ارادہ سے شریک جنگ ہوتا ہے اور شریک جنگ ہو کر کیا کیا کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے انسانوں کی کوئی حرکت بھی پوشیدہ نہیں۔ جو جس ارادہ سے آیا ہے یقیناً اس کے مطابق اس کو اجر ملے گا اور

اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى

پھر دیکھو ایسا ہوا کہ اللہ نے غم و افسوس کے بعد تم پر بے خوفی کی خود فراموشی طاری کر دی[۲۸۲] یعنی تمہارے دل ایسے مطمئن ہوئے کہ خوف و ہراس کا احساس تک باقی نہ

"الاعمال بالنیات" کی حدیث مشہور اور واضح ہے۔

مختصر یہ کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ احد کے میدان میں جو کچھ پیش آیا اس کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ کا وعدہ نصرت اس موقع پر بھی پورا ہوا تھا اور دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے تھے لیکن جب تمہاری ہی جماعت کے لوگوں نے عین حالت جنگ میں حکم رسول ﷺ کی نافرمانی کی اور ایک گروہ مال غنیمت کی طمع میں مورچہ چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا تو میدان جنگ کی ہوا پلٹ گئی اور فتح ہوتے ہوتے شکست میں بدل گئی پھر تم نے صبر و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ بھی تم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تمہاری شکست کو پھر فتح میں بدل دیا گیا۔ پس یہ جو کچھ ہوا دشمنوں کی طاقت و کثرت سے نہیں ہوا بلکہ تمہاری نافرمانی اور بے ہمتی سے ہوا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم دشمنوں کی طاقت و کثرت سے مرعوب ہو بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اپنے اندر صبر و تقویٰ کی سچی روح پیدا کرو۔ تمہارے اعمال درست ہوں گے تو ان کے نتائج بھی یقیناً درست ہی ہوں گے لیکن اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اس بات کا اچھی طرح خیال رکھو۔

مصیبت کو برداشت کر جانا بھی اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے

۲۸۲ مصیبت ہر حال میں مصیبت ہی ہوتی ہے۔ دعا یہی کرنا چاہئے کہ اللہ کسی کو مصیبت میں مبتلا نہ کرے لیکن مشیت ایزدی سے اگر مصیبت آ ہی جائے تو بجائے جزع فزع کے صبر و ثبات سے کام لینے کی توفیق میسر آ جائے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و انعام ہے۔ میدان احد میں جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مضطرب ہو کر بھاگنے لگی تو نبی اعظم و آخر ﷺ نے پکارنا شروع کیا "الی عباد اللہ" اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔ تم کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ جو لوگ ایمان و اخلاص میں پکے تھے اور محض صورت حال کے فوری اثر نے انہیں گھبرا دیا تھا وہ اپنے رسول ﷺ کی آواز سنتے ہی چونک اٹھے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک ایک مدہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی اور اس مدہوشی میں سارا خوف و ہراس فراموش ہو گیا۔ چنانچہ وہ فوراً پلٹے آسمانی بجلی کی طرح کڑکے اور اس بے خودی کی حالت میں تلوار و تیر کو اس انداز سے چلایا کہ دشمنوں کے اوسان خطا کر دیئے اور ان کو میدان جنگ سے بالآخر بھگا دیا بلکہ حمراء الاسد نامی مقام تک جو مدینہ سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ہے ان کے تعاقب میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ اس طرح جو مصیبت ان کو اس میدان میں پہنچی تھی اس کو برداشت کر کے اطمینان قلب حاصل کر لیا۔

طَآئِفَةٌ مِّنكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ

رہا یہ حالت ایک گروہ کی تھی لیکن تم میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جسے اس وقت بھی

بالکل اس طرح کی صورت میدان بدر میں پیش آئی تھی جس کا ذکر سورہ الانفال میں آئے گا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا کہ :

اِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (الانفال ۸ : ۱۱)

"جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے چھا جانے والی غنودگی تم پر طاری کر دی تھی کہ یہ اس کی طرف سے تمہارے لئے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقعہ دے دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کی ناپاکی دور کردے نیز تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے اور تمہارے قدم جما دے۔"

ان دونوں مواقع پر وجہ ایک ہی تھی کہ جو موقع شدت خوف اور گھبراہٹ کا تھا اس وقت مسلمانوں کے دلوں کو ایسے اطمینان سے بھر دیا کہ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ بدر میں ظاہری حالت کو درست کرنے کیلئے بارش برسا دی گئی اور اس بارش کے تین فائدے ہوئے ایک مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی جبکہ ان کے پاس پانی بالکل موجود ہی نہ تھا اور انہوں نے فوراً حوض بنا کر نشیب میں پانی روک لیا دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصہ پر تھے جو سخت ریتلا علاقہ تھا اور پاؤں ٹکتے نہ تھے اس لئے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہوگئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت بآسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکر کفار نشیب کی جانب تھا اس لئے وہاں اس بارش کی حالت کیچڑ کی سی ہوگئی اور ان کے پاؤں پھسلنے لگے اور یہاں احد کی لڑائی میں اگرچہ مسلمانوں کو اپنے ہی کئے کے نتیجہ میں تکلیف بھی پہنچی تاہم میدان میں نکلنے کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلم اور منافق کا نکھیڑ ہوگیا جو اس سے پہلے اس طرح واضح نہ تھا اور قومی زندگی کے لئے یہ ایک بہت بڑا اور اہم معاملہ تھا بلکہ یہ اسلامی عمارت کی بنیاد تھی۔

اس میں اس جماعت کا ذکر ہے جو میدان احد میں لشکر کفار کے مقابلہ کیلئے نکل کھڑے ہوئے تھے اور ان کو کسی طرح کی لیت و لعل نہ تھی اگرچہ ان ہی میں سے چند لوگوں کی غلطی سے پوری جماعت کو نقصان اٹھانا پڑا لیکن باوجود نقصان اٹھانے کے ان کے دلوں میں کمزوری پیدا نہ ہوئی بلکہ وہ خالص سونے کی طرح "اب کندن" بن گئے۔ ان کو جو غم و افسوس ہوا وہ بالکل وقتی تھا جو اسی میدان میں کافور ہوگیا۔ وہ واپس لوٹے تو ان کے دل ہر طرح سے مطمئن تھے اور خوف و ہراس نام کی کوئی شے اب ان میں موجود نہ تھی۔

بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۚ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ

۲۸۳

اپنی جانوں ہی کی پڑی تھی اور اللہ کی جناب میں عہد جہالت کے سے ظنون و اوہام رکھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ اس کام میں ہماری رائے کا کوئی دخل نہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ ان

بہانے تراشنے والوں کو بھی ایک بہانہ مل گیا

۲۸۳ لیکن ایک دوسری جماعت بھی تھی جو نام کے لحاظ سے تو مسلمان ہی تھی اگرچہ کام کے لحاظ سے وہ کفار سے بھی بدتر تھی۔ یہ جماعت کیا تھی؟ وہی عبداللہ بن ابی کی پارٹی جو میدان جنگ میں آنے کیلئے راضی نہ تھی اور اسی بات کو بہانہ بنا کر وہ واپس مدینہ لوٹ گئی تھی۔ ان لوگوں کو گھر بیٹھے ہی یہ فکر کھائے جا رہی تھی جب انہوں نے یہ سنا کہ لشکر اسلام تتر بتر ہو گیا اور بہت سے لوگ میدان جنگ میں کام آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب مکہ کا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہوگا اور اگر ایسا ہوا تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس لئے کہ یہ لوگ منہ سے تو اسلام کے مدعی تھے۔ اس طرح ان کو اپنی جانوں ہی کی فکر لگی رہی۔ وہ کہتے تھے جو کچھ ہوا اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اگر رسول اللہ ﷺ اللہ کا رسول ہوتا تو ایسی حالت پیش ہی کیوں آتی؟ اور یہ بھی کہتے تھے کہ میدان احد میں جانے والوں نے ہماری بات نہ مانی اس لئے اب چکھ لیں مزہ وہ میدان جنگ میں جانے کا اور یہ کہ اگر ہماری بات مانی ہوتی تو یہ لوگ میدان جنگ میں کیوں مارے جاتے؟ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں وہ بناتے رہے۔ لیکن جب بہت سے خیال ان کے غلط نکلے۔ مکے والے مدینہ پر حملہ کی جرات کیا کرتے وہ تو بمشکل جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے تھے تاہم ایک بات ان کے لئے بہانہ بن گئی کہ "ہماری بات نہ مان کر پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔" اس طرح گویا ایک ہی واقعہ نے دونوں گروہوں کو اپنے اپنے موقف میں پکا کر دیا۔ سچے مسلمانوں کو اسلام کی سچائی پر اور منافقین کو نفاق پر اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ فائدہ میں کون رہا اور نقصان کس کا ہوا؟ دوسری جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا ○ (الفتح ۴۸ : ۱۲) "تم نے یوں سمجھا کہ رسول اللہ اور مومنین اپنے گھروں میں پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت بڑے گمان کئے اور تم سخت بد باطن لوگ ہو۔"

یعنی تم اس بات پر خوش ہو کہ رسول اور اس کا ساتھ دینے والے اہل ایمان جس خطرے کے منہ میں جا رہے تھے اس سے تم نے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ تمہاری نگاہ میں یہ بڑی دانشمندی کا کام ہے اور تمہیں اس بات پر خوش ہوتے بھی شرم نہ آئی کہ رسول اور اہل ایمان ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جس سے وہ بچ کر نہ

الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ

کا کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے سب اختیارات صرف اور صرف اللہ کے ہیں جس بات کو وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے بلکہ دلوں میں چھپائے ہوئے تھے وہ یہ تھی کہ اگر مدینہ میں رہ کر جنگ کی جاتی تو اتنا جانی نقصان نہ ہوتا۔[۲۸۴] اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو اگر

آئیں گے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی تم اس پر مضطرب نہ ہوئے بلکہ اپنی یہ حرکت تمہیں بہت اچھی معلوم ہوئی کہ تم نے اپنے آپ کو رسول کے ساتھ اس خطرے میں نہیں ڈالا۔ تف ہے تم پر کہ تم نے کیا سوچا؟

منافقین کہہ رہے تھے کہ ہمارا کوئی اختیار چلتا ہے؟

[۲۸۴] غزوہ احد میں منافقین نے جس بات کا اظہار کیا تھا وہ تو یہی تھی کہ اتنے بڑے لشکر کے ہاتھ سے کھلے میدان میں مسلمان مارے جائیں گے لیکن ان کے دلوں میں جو کچھ چھپا تھا وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا تھا۔ اب جو واقعات جنگ کی خبر ان کو پہنچی تو وہ اور بھی باتیں بنانے لگے اور اپنے مشوروں کی اہمیت کھل کر بیان کرنے لگے اور اس نازک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگے کہ ہمارا بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہے؟ یعنی اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ تکلیف نہ پہنچتی "مَا قُتِلْنَا هٰهُنَا" تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے۔ یہ فقرہ استعمال کر کے گویا وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ مسلمانوں کا نقصان ان ہی کا نقصان ہے حالانکہ وہ تو اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا یہ کہنا حقیقت کے بالکل خلاف تھا اور منافق ہمیشہ جو کہتا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہی ہوتا ہے اور یہی اس کے نفاق کی علامت ہے۔ ان کی اس بیہودہ گوئی کا جواب یہ دیا گیا کہ جن مسلمانوں نے جاں نثاری کی ہے اور وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ اگر مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو بھی وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے بلکہ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کرتے اور جن کو شہادت پانا تھی وہ یقیناً یہاں بھی شہادت پاتے لیکن اللہ تعالیٰ کو یقیناً یہ منظور تھا کہ دشمنوں کے مقابلہ کیلئے باہر کھلے میدان میں نکل کر جاں نثاری کا سچا نمونہ دکھائیں اور اس طرح کامیابی و کامرانی سے اس دنیا سے رخصت ہوں کہ جاتے ہی اس ابدی زندگی کی کامرانیوں کو حاصل کر لیں اور ان کی شہادت کا خون باقی رہنے والوں کے لئے وہ رنگ لائے کہ ان کی قومی زندگی میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک دے۔

پھر فرمایا کہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو کچھ بعض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا جن

شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ

تم اپنے گھروں کے اندر بیٹھے ہوتے جب بھی ان کے لئے مارا جانا تھا وہ گھر سے ضرور نکلتے اور اپنے مارے جانے کی جگہ پہنچ کر رہتے[۲۸۵]۔ اور اللہ کو منظور تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اس کے لئے تمہیں آزمائش میں ڈالے اور جو کدورتیں

دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا ان کا کھوٹ ظاہر ہوگیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں جو انہی منافقوں کے کہنے سننے سے آگئی تھیں ان کی وہ کمزوریاں دور کر دی گئیں اگر اس طرح حالات کھل کر سامنے نہ آتے تو کھرا اور کھوٹا کس طرح واضح ہوتا۔

موت تو ہر ایک کے لئے لازم و ضروری ہے اگر ان لوگوں کی شہادت تم کو ناگوار گزرتی ہے تو آخر کیوں؟ وہ تو شہادت پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید ہوگئے۔ تم اس طرح کی الٹی ٹیڑھی باتیں کہنے والے تو ہمیشہ زندہ رہو گے؟ آخر کیسے؟ جب کوئی یہاں ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے آیا ہی نہیں اور کسی شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اور کہاں مرے گا؟ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمٰن ۳۱ : ۳۴) کس شخص کو خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی؟ اس طرح کی باتیں بنانے والوں کے متعلق دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ :

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ال عمران ۳ : ۱۶۸) "اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو اچھا اگر تم واقعی اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب موت تمہارے سرہانے آکھڑی ہو تو اسے نکال باہر کرنا اور خود ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ رہنا۔" مزید تفصیل کے لئے دیکھو ۲۶۵ تا ۲۶۶ جلد ہذا۔

جس شخص کو جہاں مرنا ہے وہ دوڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے

۲۸۵ اس کی وضاحت جملہ کے اندر موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام تکوینی تقدیری سے باہر رہنا کسی کے لئے کسی صورت بھی ممکن نہیں کوئی نہ کوئی ظاہری سبب بھی انسان کے مرنے کی جگہ تک اس کے کھینچ کر آنے کا ضرور نکل آتا ہے اور روزمرہ کے حالات اس کی شہادت آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ دعا یہ کرنا چاہئے کہ موت جب بھی ہو اور جہاں بھی ہو بامقصد ہو بے مقصد نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے سے آخر بڑا مقصود اور کیا ہو سکتا ہے؟ مومن اگر کفر کے مقابلہ میں میدان جنگ میں قتل ہو جائے تو اس کی بڑی سے بڑی فتح مندی ہے ایسی فتح مندی جس سے بڑی فتح مندی کی وہ اپنی ذات کے لئے آرزو کر ہی نہیں

مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ

تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی تھیں انہیں پاک و صاف کر دے۔ اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ۲۸۶ ۱۵۴

تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو ان کی لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض

سکتا ۔

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ — درکوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکہ دوکون فتح از عشق است — باآنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

دوسرے اگر لڑیں اور دشمنوں پر غالب نہ آسکیں تو ان کی ہار ہوئی لیکن مومن وہ ہے جو ہار کے معنی سے ناوقف رکھا گیا ہے۔ وہ اگر کسی میدان میں غالب نہ آئے جب بھی جیت اس کی ہے کیونکہ اس کی ہار جیت کا معیار میدان جنگ نہیں ہوتا بلکہ خود اس کی طلب و سعی ہوتی ہے اگر وہ اپنی سعی و طلب میں پورا نکلا تو اس نے میدان مار لیا اگرچہ میدان جنگ میں اس کی لاش ہزاروں لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں وہ کبھی مر نہیں سکتا اس لئے کہ اس کی موت بھی اس کی زندگی ہوتی ہے اگرچہ وہ "وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" کی قید اپنے اندر رکھتی ہے۔ مومن کی منزل مقصود کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ حق کی راہ میں رواں دواں رہے اور کبھی رکے نہیں اس کا ہر قدم جو چلتا رہا فتح مندی ہے اور ہر قدم جو رک گیا وہ نامرادی ۔

رہرواں راخستگی راہ نیست — عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

ایک بار پھر اس جملہ کا ترجمہ پڑھو کہ "اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے جب بھی جن کے لئے مارا جانا تھا وہ گھر سے خود نکلتے اور اپنے مارے جانے کی جگہ پہنچ کر رہتے۔"

آزمائش ہی سے کھرا اور کھوٹا نکھرتا ہے اور قومی زندگی کیلئے نکھار ضروری ہے

۲۸۶ واقعہ احد میں جو لغزشیں اور خطائیں بعض اصحاب کرام سے صادر ہوئیں وہ اپنی ذات میں بڑی شدید اور سخت تھیں جس مورچہ پر پچاس تیر انداز صحابہؓ کو یہ حکم دے کر بٹھایا گیا تھا کہ ہم پر کچھ بھی حال گزرے تم یہاں سے نہ ہٹنا ان کی بڑی تعداد یہاں سے ہٹ گئی اگرچہ یہاں سے ہٹنے کا سبب اجتہادی غلطی سہی کہ اب فتح ہو چکی ہے لہٰذا اس حکم کی تعمیل پوری ہو چکی ہے یہاں سے نیچے آکر سب صحابہؓ سے مل جانا

إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ع ۱۶

کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کرلی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اور اللہ نے ان کی یہ لغزش معاف کردی تھی وہ یقیناً بخش دینے والا بہت ہی بردبار ہے۔ ۱۵۵

اے مسلمانو! دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے

چاہئے مگر درحقیقت بنی اعظم و آخر ﷺ کی واضح ہدایات کے خلاف تھا اس خطا و قصور کے نتیجہ میں میدان جنگ سے بھاگنے کی غلطی سرزد ہوئی اور پھر اس غلطی کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑا تاہم رسول اللہ ﷺ کی اصل حیثیت اور سپہ سالار اعظم کی ہدایت پر قائم رہنے کی اہمیت اس سے واضح ہوگئی۔ شہادت جن کا مقدر تھی ان کو مل گئی اور باقی مجاہدین پر یہ واضح ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور سپہ سالار کے آرڈر کی پابندی کس قدر ضروری ہے؟ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جس پھسلان سے انسان کے قدم پھسلنے کے ساتھ ہی سنبھل جائیں اور پھر وہ ایسی پھسلان کے قریب نہ جائے وہ یقیناً اس کی ترقی کا باعث ہوتی اور اس لحاظ سے یقیناً جنگ احد مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوئی۔ پھر اس سے یہ سبق بھی حاصل ہوا کہ جس لغزش کو انسان لغزش تسلیم کرتے ہوئے ازالہ کی کوشش کرے وہ لغزش لغزش نہیں رہتی بلکہ اس سے کھرا اور کھوٹا نکھر جاتا ہے اور اس طرح زندگی میں وہ نکھار آتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا جو شہادت کا جام نوش نہ کرسکے اور غازی بن کر میدان جنگ سے نکلے اور ان کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا جو شہادت کا جام پی گئے۔ پہلے دوبارہ اس زندگی میں کبھی اس طرح کی لغزش میں مبتلا نہ ہوئے اور دوسرے بامقصد موت پاکر ابدی زندگی حاصل کرگئے اور اس طرح دونوں فریق کامیاب و کامران قرار پائے اس لئے کہ ان دونوں کا دعویٰ ایمان سچا تھا اور منافقین کی جماعت سے پہلے ہی گلو خلاصی ہو چکی تھی۔

جنگ احد کے اس واقعہ میں مسلمانوں کیلئے بے شمار اسباق رکھے گئے ہیں اور سب سے بڑا سبق اس میں یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے جیسے ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچتی ہے یعنی اعمال حسنہ اور سیئہ دونوں میں تجاذب ہے۔ جب انسان کوئی ایک نیک کام کرلیتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کے لئے دوسری نیکیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کے دل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی اس لئے کہا جاتا ہے کہ "نیک کام کی ایک نقد جزاء وہ دوسری نیکی ہے جس کی توفیق اس کو ہو جاتی ہے اور برے عمل کی ایک سزا وہ دوسرا

گناہ ہے جس کے لئے پہلے گناہ نے راستہ ہموار کر دیا ہے۔"

جن لوگوں سے لغزش ہوئی تھی ان کی معافی کا اعلان الٰہی

۲۸۷ "زلة" دراصل بلاقصد و ارادہ پاؤں کے پھسل جانے پر بولا جاتا ہے گویا لفظ کے اندر ہی یہ بات واضح کر دی کہ احد کے روز جو میدان کارزار سے بھاگنے کی صورت پیش آئی تھی تو اس میں ان لوگوں کا مقصد و ارادہ بھاگ نکلنے کا نہ تھا بلکہ کچھ حالات اس طرح کے پیدا ہوگئے تھے کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ منافقین کا گروہ پہلے ہی الگ ہو چکا تھا اس لئے کہ وہ شریک جنگ نہ ہوئے تھے۔ یہ خالص مسلمان تھے تاہم ان سے یہ کمزوری ظاہر ہوگئی اور اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی کہ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر لوٹا اور پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوگیا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں ہوگئی اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ اس لئے وہ اپنی جمعیت قائم نہ رکھ سکے۔ اس حالت میں نبی کریم ﷺ نے آواز دے کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا مگر ایسی حالت میں سارے لشکر کا جمع ہونا محال تھا۔ بعض لوگ لشکر اسلام سے بالکل الگ ہوگئے اور ان کے لئے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہوگیا اگرچہ ان کے دلوں میں کسی قسم کا کوئی روگ نہ تھا اس لئے اس لغزش کا سرزد ہونا شیطان کی طرف منسوب کیا گیا۔ کتنے آدمی بھاگے تھے اور وہ کون کون تھا؟ اس میں لوگوں نے بہت لے دی کی ہے لیکن حقیقت میں اس طرح کی بحث کرنا اور گزشتہ واقعات سے کیڑے نکالنا ایک سچے اور پکے مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا بلکہ ایسی بحثیں وہی اٹھاتے ہیں جن کے اپنے دلوں میں کسی نہ کسی طرح کا کوئی روگ موجود ہوتا ہے اور وہ اسلام سے مخلص نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان سب کی لغزش کو معاف کر دیا اور کسی ایک کو بھی اس میں سے مستثنیٰ نہیں کیا تو ایرے غیرے کو کیا حق ہے کہ وہ اس طرح کی چھان بین شروع کر دے اور اپنے پاس سے ہی جس کو چاہے اس فعل میں ملوث کر دے اور جس کو چاہے بری کر دے۔ ایسے سارے واقعات عبرت حاصل کرنے کیلئے بیان کئے جاتے ہیں۔ ذہنی عیاشی کیلئے نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس لغزش و خطا کے بعد کیا معاملہ کیا؟ اس کی وضاحت خود فرما دی کہ اول ظاہری انعام اونگھ کا بھیج کر ان کی ظاہری تکان، تکلیف اور پریشانی دور فرمائی پھر فرمایا کہ جو مصیبت اور غم مسلمانوں کو اس وقت پہنچا وہ نری سزا و عقوبت نہ تھی بلکہ اس میں کچھ مربیانہ حکمتیں بھی پوشیدہ تھیں اور آخر میں صاف صاف لفظوں میں ان کی اس لغزش کی معافی کا اعلان فرما دیا "تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے اس دن پیٹھ پھیر دی جس دن دو گروہ میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوئے تھے۔ شیطان ہی نے ان کو پھسلانا چاہا جس کا اصلی سبب بعض کا فعل تھا جو انہوں نے کمایا پھر یقیناً اللہ نے ان کو معاف کر دیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کا یا یوں کہو کہ اہل اسلام کا متفقہ مسئلہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

اجمعین اگرچہ معصوم عن الخطا نہیں تھے اس لئے کہ معصوم صرف اور صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہی کی جماعت تھی تاہم جو بھی اور جب بھی ان سے کوئی خطا یا لغزش سرزد ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرمایا اور پھر صرف معاف ہی نہیں فرمایا بلکہ ان کے ساتھ لطف و کرم کا خاص معاملہ فرمایا اور ان سب کو "رضی اللہ عنہم و رضوعنہ" کا مقام عطا فرمایا تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے؟ بلکہ ایسا کام سر انجام دینے والے دراصل شیشہ میں اپنا منہ دیکھتے ہیں اور برے کو ہمیشہ برا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ فراموش کر دیتا ہے کہ یہ چہرہ خود اس کا اپنا ہے۔ اس لئے ایسے ہی کئی بروں کو ان میں سے بُرا چہرہ نظر آرہا ہے۔

عثمان بن مواہب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور اس نے دیکھا ایک جگہ لوگ جمع ہیں اس نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اس کو بتایا گیا کہ یہ قریش ہیں اس نے پھر پوچھا کہ یہ بوڑھا شخص ان میں کون ہے؟ اسے بتایا گیا کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں وہ شخص ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور پھر اس طرح بولا کہ میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے ضرور جواب دینا پھر اس نے سوال کیا کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان احد کے روز بھاگ گئے تھے؟ اس نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ بدر کے دن بھی وہ غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے؟ اور پھر اس نے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ بیعت رضوان میں بھی وہ موجود نہ تھے؟ اس کے جواب میں ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ جنگ احد سے فرار ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا اور پھر یہی زیر نظر آیت تلاوت فرمائی۔ اور بدر سے عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی غیر حاضری کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی بیماری تھی جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ شرکاء بدر کے برابر تم کو اجر و ثواب بھی ملے گا اور حصہ بھی اور تم یہاں مدینہ میں اپنی زوجہ محترمہ کی تیمار داری کیلئے ٹھہر جاؤ۔ رہا بیعت رضوان سے غیر حاضری کا معاملہ تو وہ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ بیعت رضوان کیوں ہوئی؟ اس کا سبب ہی یہ تھا کہ وادی مکہ کے اندر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی معزز شخص ہوتا تو قریش مکہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قریش مکہ کے پاس بھیجتے چونکہ عثمان رضی اللہ عنہ ہی سب سے زیادہ عزت والے تھے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مکہ بھیجا تھا اور ان کے متعلق یہ خبر اڑا دی گئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اس لئے تو بیعت رضوان ہوئی تھی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے پھر اس کو اپنے دوسرے ہاتھ پر خود ہی مارا اور فرمایا یہ عثمان کی بیعت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اے نکتہ چینی کرنے والے ان باتوں کا یہ جواب بھی اپنے ساتھ لے جا۔

(بخاری بحوالہ مظہری)

اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا

اور جن کا شیوہ یہ ہے کہ اگر ان کے بھائی بند سفر میں گئے ہوں یا لڑائی میں مشغول ہوں اور انہیں موت پیش آجائے تو کہنے لگتے ہیں۔ اگر یہ لوگ گھر سے نہ نکلتے اور ہمارے پاس ٹھہرے رہتے تو کاہے کو مرتے یا مارے جاتے[۲۸۸]؟ تاکہ اللہ اس بات کو ان کے دلوں

جس طرح کفر و نفاق برا ہے اس طرح ان کی مصاحبت بھی بری ہے

۲۸۸ یہ محاورہ عام ہے کہ "صحبت صالح ترا صالح کند و صحبت طالع ترا طالع کند" کہ اچھی صحبت کا اثر بھی اچھا ہی ہوتا ہے اور اس طرح بری صحبت کا اثر بھی یقیناً برا ہی ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو کافروں اور منافقوں کی سی باتوں اور ان کی مصاحبت سے بھی روکا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ کفر و نفاق کی صحبت سے تم بھی ان باتوں اور ان افعال کے مرتکب ہو جاؤ گے اور اس طرح کفر و نفاق تم کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ فرمایا کہ یہ کفار و منافقین ایسے لوگ ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں کہ ان کے بھائی بند دوست و احباب تجارت کے لئے یا اپنے اسلامی دشمنوں کے ساتھ جنگ کیلئے نکلتے ہیں اور ان کا وہ وقت متعین آجاتا ہے جس کو انتقال یا موت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ان کو افسوس ہوتا ہے اور وہ اپنے افسوس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ کاش! وہ باہر نہ نکلتے اور ہمارے پاس ہی رہتے تو موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ محض ایک حسرت اور افسوس ان کے دل میں رہ جاتا ہے جس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ ایسا کہنا کہ یوں کرتے تو ایسا ہوتا بالکل بے فائدہ بات ہے رہی موت و حیات سو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ نہ گھر میں بیٹھ رہنے والے ہمیشہ موت سے بچے رہتے ہیں اور نہ ہی باہر نکلنے والے سارے مرجاتے یا مارے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو منع فرمایا کہ تم ایسے نہ ہو جاؤ بلکہ زمین میں تجارت یا طلب معاش کے لئے سفر کرنے یا دشمن کے ساتھ جنگ کے لئے نکلنے میں موت کا خوف کبھی تمہارے لئے روک نہیں ہونا چاہئے یہ کمزور دلوں کی باتیں ہیں جس کام کو کرنا ضروری ہے خواہ صورت حال کیسی ہو اس کو کرنا ہی چاہئے۔ بات بات میں موت سے ڈرنے والے لوگوں کو اپنے اللہ پر بھروسہ نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ اس طرح انسان آہستہ آہستہ نکما ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج یہی حالت کثیر تعداد کی ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بزدلی تو کفار منافقین کی ہے کیونکہ وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے بھائی بندوں میں سے اگر کوئی کسی سفر یا جنگ میں مارا جائے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے پاس ہوتا یا ہمارے مشورے پر عمل کرتا تو یہ افتاد اس کو پیش نہ آتی

قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ

کے لئے داغ حسرت بنا دے۔ یاد رکھو زندگی اور موت کا کھیل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس کی نگاہ سے چھپا نہیں۔[۲۸۹] ۱۵۶

اور یاد رکھو اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہوگئے یا اپنی موت مرگئے تو اللہ کی طرف

اور یہی بات انہوں نے جنگ احد کے مقتولین کے متعلق کہی تھی حالانکہ موت و زندگی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے زندگی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے موت دے دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت جس مقام اور جس شکل میں لکھ رکھی ہے وہ آکے رہے گی اگرچہ وہ اپنے آپ کو آہنی قلعوں میں بند رکھے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اپنے اس وہم کے سبب ہمیشہ ہمیشہ اس خلش اور اس غم میں رہتے ہیں اور جس وقت جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے اور اس کا انجام سوائے بزدلی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

خیال تو یہ چاہئے کہ جو کام کرے وہ صحیح اور درست ہو۔ رضائے الٰہی کے لئے اور رضائے الٰہی کے خلاف نہ ہو اس لئے اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں اور یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ ہمارے ہر عمل کو قدم قدم پر دیکھ رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "اگر تم قتل نہ کئے جاؤ گے مرجاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلوار کی ہزار ضرب بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔"

یاد رہے کہ منافقین کو بعض جگہ "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" میں داخل کیا گیا ہے اور بعض جگہ "اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" میں اور بعض اوقات ایک علیحدہ گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور ظاہری طور پر مسلمانوں کے سے اعمال بھی کرتے رہتے ہیں اور کفار کے ساتھ بھی ان کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے گویا یہ لوگ دوہری پالیسی اختیار کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے سمجھدار لوگ ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان کے متعلق واضح طور پر کہتا ہے کہ یہ لوگ ایمان بھی لاتے ہیں اور کفر بھی کرتے ہیں اس لئے کہ وہ بظاہر ایمان لاتے ہیں اور دل سے کافر کے کافر ہی رہتے ہیں۔ پھر جس طرف ان کو نفع نظر آئے اپنے دل سے اسی کی طرف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو اپنے مطلب سے غرض ہوتی ہے ان کو ایک آنے کا فائدہ ذاتی نظر آئے اگرچہ اس فائدے میں قوم کا سو روپے کا نقصان ہو تو وہ اپنے آنہ کے فائدہ کیلئے قوم کا سو روپے کا نقصان

اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

سے جو رحمت و بخشش تمہارے حصے میں آئے گی یقیناً وہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کی پونجی لوگ جمع کیا کرتے ہیں[۲۹۰]۔ ۱۵۷

برداشت کر سکتے ہیں لیکن اپنا معمولی نقصان بھی برداشت نہیں کرتے۔ وہ مال کو خرچ کرتے ہیں لیکن دکھاوے کے لئے جس میں ان کی واہ واہ ہو اور ان کا کوئی کام بھی رضائے الٰہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اپنی ناک و نمود کے لئے کرتے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آتا کہ نہ ہم رہیں گے اور نہ ہماری ناک۔

رحمت الٰہی اور بخشش خداوندی کے مقابلہ میں جان کیا شے ہے؟ کچھ بھی نہیں

۲۸۹ اہل اسلام کی مزید حوصلہ افزائی کے لئے ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ اگر تم کو اللہ کی راہ میں شہادت حاصل ہوئی یا کسی اور طرح سے موت آگئی تو یہ چیز آخر غم کرنے کی کیا ہے اس لئے کہ اس کے صلہ میں جو مغفرت و رحمت تمہیں حاصل ہوگی وہ ان تمام فانی ذخیروں سے کہیں بہتر ہے جو اس زندگی کے پرستار اپنے لئے جمع کر رہے ہیں۔ خیال رہے کہ اس میں دراصل درس یہ دیا جا رہا ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ انسان کے لئے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے اور یہ یقین رکھے کہ موت اسی وقت آئے گی جب اس کا وقت مقرر آجائے گا اور جب وقت مقرر آجائے گا میں اس زندگی کو کسی صورت بھی نہیں بچا سکتا۔ اور یہ بھی یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ آخر میں ارشاد فرمایا گیا کہ جو مرتا ہے یا قتل ہوتا ہے بہرحال وہ اپنے مالک حقیقی کے پاس ہی پہنچتا ہے تو مومن اللہ کے قرب سے کیوں گھبرائے۔ یہی تو قربانی کی حقیقت اور اس کا اصل مدعا ہے۔ آخر یہ جان کس نے دی؟ اللہ نے، تو اس کی راہ میں دینے سے پھر خوف کیوں؟ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کے درجات بہت بڑے اور بہت بلند ہیں۔ اس لئے کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی رہنے والی چیز ہے جس کو کبھی فنا نہیں اور آخرت اسی کی بہتر ہو سکتی ہے جو اتقاء کو اختیار کرے۔ انسان اور انسان کے پاس جو کچھ ہے سب ختم ہونے والا ہے اور اللہ اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ سب باقی رہنے والا۔ ہزار پاپڑ بیل لینے کے بعد بھی آخر مرنا ہے موت سے آخر کون بچا ہے۔ بقا ہے تو وہ صرف اور صرف اسی ذات کو جس کو اللہ کہا جاتا ہے۔ کیا تم اتنی سی صاف اور آسان بات کو بھی نہیں سمجھ رہے "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ

اور یاد رکھو تم طبعی موت مرو یا مارے جاؤ ہر حال میں ہونا یہی ہے کہ اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے۔ ۱۵۸ ۲۹۱

اے پیغمبر اسلام! یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے اس قدر نرم

طبعی موت مرنا بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرنا ہو سکتا ہے

۲۹۰ اس آیت نمبر ۱۵۶ اور آیت ۱۵۷ کا مضمون ملتا جلتا ہے دونوں آیات میں مُتُّمْ اور قُتِلْتُمْ کے الفاظ بھی موجود ہیں اور دونوں کا مضمون بھی مشترک ہے تاہم ایک باریک فرق نظر آتا ہے اس آیت زیر نظر میں یعنی آیت نمبر ۱۵۶ میں فرمایا کہ اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤں یا طبعی موت مرجاؤ یعنی اس جگہ مر جانے سے مراد بھی اللہ کی راہ میں ہی مرجانا ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہوا انسان قتل بھی ہو سکتا ہے اور طبعی موت بھی مر سکتا ہے۔ بلاشبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میدان کارزار میں بھی قتل ہوئے لیکن کثیر تعداد ان صحابہ کرام کی تھی جو طبعی موت کی صورت میں اس جہان سے رخصت ہوئے لیکن ان سب کا انتقال یقیناً راہ الٰہی ہی میں تھا۔ اگرچہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا ایک عظمت کا مقام ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ منافق اس سے زیادہ تر ڈرتے تھے اور کمزور دل لوگوں کو بھی قتل ہونے ہی سے زیادہ خوف ہوتا ہے اس لئے اس آیت میں قُتِلْتُمْ کے الفاظ پہلے لائے گئے اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے قتل ہو جاؤ یا مرجاؤ تو سب سے زیادہ یہی ہے کہ دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں کمی رہ جائے گی اس لئے کہ تم نے دنیا کے کاموں پر آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے اللہ کی راہ میں کام کرنا پسند کیا اور ظاہر ہے کہ ان اوقات میں تم دنیا کا مال زیادہ جمع نہ کر سکے۔ اور یہ مال و دولت جس کو انسان جمع کرتا رہتا ہے آخرت کے مقابلہ میں کوئی چیز بھی ہے؟ یعنی کچھ بھی نہیں اس سے بہت بڑھ کر تو اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے جس کو اللہ کی راہ میں کام کرنے والا پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "مِمَّا يَجْمَعُوْنَ" کی نسبت کفار کی طرف کی۔ کیونکہ مال و دولت جمع کرنے پر گرا رہنا دنیا پرست لوگوں ہی کا کام ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کیونکہ آخرت پر ان کا ایمان نہیں ہوتا اور اس کے مقابلہ میں اللہ کی راہ میں کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کا آخرت پر پختہ یقین ہو اور وہ دنیاوی مال و دولت پر اخروی فوائد کی فوقیت کو تسلیم کرتا ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک دنیا دار مال و دولت اکٹھا کر کے جتنا خوش ہوتا ہے ایک اللہ کا دوست اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس سے بہت زیادہ خوشی حاصل کرتا ہے۔ ایک کو مال جمع کرنے سے محبت ہے اور دوسرے کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے۔

مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا

مزاج ہو۔ اگر سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے

تم قتل کر دیئے جاؤ یا طبعی موت مرو انجام کار اللہ کے ہاں جمع ہو گے

۲۹۱ طبعی موت مرنے یا اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے سے دنیوی طور پر جو فرق ہے ذرا واضح کرو؟ موت تو بہرحال دونوں کو آگئی اور مرنے والے کو آخر دنیوی لحاظ سے کیا فرق پڑا۔ اس جسد عنصری سے روح کا پرواز کر جانا موت کہلاتا ہے تو نتیجۃً" موت کی صورت تو دونوں طرح واقع ہوگئی ہاں! دینی لحاظ سے یہ فرق ہوا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا بامقصد مرا اور اس طرح کی موت سے اس کو ابدی زندگی نصیب ہوگئی اور وہ بھی ایسی جس میں کسی طرح حزن و ملال نہ رہا۔ اس لئے سچا مومن وہی ہے جو موت سے نہ ڈرے اور کبھی اس ڈر سے راہ حق سے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ وہ فرماتا ہے کہ موت سے تو کسی حال میں بھی مفر نہیں پھر کیوں نہ اس موت کا استقبال کیا جائے جو راہ حق میں پیش آئے اور جس کا نتیجہ اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہو؟

لیکن جن لوگوں کے دل ایمان سے محروم ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ راہ حق میں کچھ لوگوں کو موت پیش آگئی تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے یہ راہ اختیار نہ کی ہوتی تو کیوں اس نتیجے سے دو چار ہوتے؟ گویا موت صرف میدان جنگ ہی میں آسکتی ہے جو آدمی اپنے گھر میں بیٹھا رہے گا وہ تو کبھی مرنے والا نہیں؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں جو پیدا ہوا ہے اس کے لئے مرنا لازم ہے۔ پھر یقیناً موت وہی بہتر ہے جس موت سے آخرت کی کامیابی حاصل ہو جائے۔ اس لئے ایسی موت کو اسلام موت تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی سے تعبیر کرتا ہے لیکن یہ فلسفہ ایک منافق کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کے نرم مزاج ہونے کی قرآنی شہادت

۲۹۲ "لِنْتَ" لین سے ہے اور یہ خشونت کی ضد ہے۔ اس کا استعمال اجسام پر بھی ہوتا ہے اور اخلاق پر بھی۔ قرآن کریم نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ انبیاء کرام کی جماعت میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے اور پھر بعض کسی صفت میں بڑھے ہوئے تھے تو بعض کسی دوسری صفت میں۔ نبی اعظم و آخر ﷺ اپنے فطری خلق عظیم اور نرم مزاجی اور عملی زندگی کے ہر پہلو کے لحاظ سے فضیلت رکھتے تھے اور اس کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دوسرے انبیاء کرام پر فوقیت نہ دیا کرو اور یہ جملہ آپ ﷺ نے اس وقت ہی ارشاد فرمایا جب آپ ﷺ کے روبرو کسی نے آپ ﷺ کی ایسی تعریف کی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نرم مزاج ہونے کی شہادت خود دی ہے اور نرم مزاج ہونے اور نرم

مزاج رہنے کی ہدایت میں جو فرق ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ نرم مزاج سے بیجا سختی ممکن ہی نہیں اور سخت مزاج کو نرم مزاج رہنے کی ہدایت کرنا پڑتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور فرعون کو پیغام نبوت پہنچانے کی ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ تم اپنے بھائی ہارون کو ساتھ لے کر جاؤ جس کو ہم نے تمہارے ساتھ ہی نبوت کے منصب سے نواز دیا ہے اور تمہارا نائب بنا دیا ہے دونوں مل کر فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ نہایت ہی سرکش ہو چکا ہے اور اس طرح ہدایت فرمائی کہ :

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طہ ۲۰ : ۴۴) "اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔"

دیکھو یہاں نرمی کے ساتھ بات کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہاں اس بات کی شہادت دی جا رہی ہے کہ آپ اے پیغمبر ﷺ طبعاً" نرم مزاج ہیں۔ حالانکہ یہاں پیغام نبوت پہنچانے کے لئے بھیجا جا رہا ہے اور وہاں میدان جنگ میں کچھ لوگوں کی کمزوری دکھانے کا ذکر ہے۔ جس جگہ طبعاً" انسان کو دکھ آتا ہے اور وہ کچھ بھی نہ ہو تو طبعی دکھ کی وجہ سے کچھ نہ کچھ سختی کر جاتا ہے ایسے مقام پر بھی نرم مزاج ہی رہنا ان کمالات میں سے ہے جو خصوصاً نبی رحمت ﷺ ہی کا حصہ تھے۔ گویا یہ خصوصیات محمدی ﷺ میں سے ایک خصوصیت ہے۔

گزشتہ رکوع کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا کہ "جو لوگ بھاگ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا" اب نبی رحمت ﷺ کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ عفو و درگزر کرنے والے تھے جو لوگ احد کے میدان سے بھاگ گئے تھے ان کے ساتھ نبی رحمت ﷺ نے کسی طرح کی سختی نہیں کی اور نہ ہی کسی کو درشت الفاظ سے مخاطب فرمایا بلکہ محبت بھرے کلام میں ان سے گفتگو فرمائی اور زبان سے جو ارشاد فرمایا وہ یہ تھا کہ لقد ذھبتم فیھا عریضة کہ تم تو بھاگتے بھاگتے بہت ہی دور نکل گئے تھے مختصر یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی رحمت ﷺ کے خلق عظیم کی اس صفت نرم مزاجی کو بہت پسند کیا ہے اس لئے آپ کی امت کے سامنے اس کا اظہار فرمایا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کی ذات اقدس میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ :

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۶۸ : ۴) "اور یقیناً آپ ﷺ کا خلق عظیم الشان ہے۔"

اس اعلان الٰہی کی ضرورت؟ اس اعلان کی ضرورت یہ تھی کہ انسانیت کو آگاہ کر دیا جائے کہ اگر تم انسان ہو اور انسان ہی بن کر رہنا چاہئے تو ہمارے رسول محمد ﷺ کے اسوہ حسنہ کو کسوٹی بناؤ اور اپنے عقائد' اخلاق اور اعمال کی جانچ کر لو جو جس قدر ان کے قریب ہوگا اس قدر خوش بخت اور خوش نصیب ہوگا اور جو شخص جتنا ان سے دور ہوگا اتنا ہی محروم وہ بد نصیب ہوگا۔ رہبر صادق سرور کائنات ﷺ سراپا رحمت ہیں ان کی محبت' ان کی اتباع تمہاری تقدیر سنوار دے گی اور وہ تم کو اللہ والا بنا دیں گے اگر تم ایسا بننا چاہتے ہو تو اس کے لئے ایک اور صرف ایک ہی راہنما اعظم و آخر ہے۔ ﷺ۔ کاش کہ اس صفت عظیم سے فی زمانا ہمارے

رہنماؤں کا طبقہ بھی کچھ سبق حاصل کرتا۔

آپ ﷺ کے خلق عظیم کے اس پہلو کی مثالیں اتنی ہیں کہ اگر ان کا بیان شروع کر دیا جائے تو ہم اصل مضمون سے دور نکل جائیں گے۔ کفار نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں کبھی جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں، کبھی گلے میں پھندے ڈالے، گھر کے دروازے پر کانٹے بچھائے، کوڑا کرکٹ پھینکا، گالیاں دیں، قتل کے منصوبے بنائے، جسم مقدس کو لہولہان کیا، قید میں رکھا، آپ ﷺ کے صحن اور پکے ہوئے کھانے تک پر غلاظتیں پھینکیں، آپ ﷺ کو پاگل، جادوگر، شاعر اور مذمم کہہ کر مخاطب کیا لیکن رحمت عالم ﷺ، نبی اعظم و آخر ﷺ، طاہر و اطہر ﷺ، ساقی کوثر ﷺ، شافع محشر ﷺ نے کبھی زبان کھولی تو صرف یہ فرمایا کہ اے فرزندان عبد مناف تم حق ہمسائیگی اور حق قرابت داری خوب ادا کرتے ہو۔ اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کے حلم و تحمل، نرمی و خوش خوئی، شفقت و ملاطفت کے واقعات سے احادیث کی کتابیں اور سیرت کی کتابیں تو بھری پڑی ہیں کوئی اگر شمار کرے گا تو کہاں تک؟ اور یہ حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات کیلئے تو کسی سے کبھی بھی انتقام نہ لیا تھا اور اس کا اعتراف صرف اپنوں کو ہی نہیں بلکہ غیروں کے غیروں کو بھی ہے۔ ایک دو مثالیں آپ بھی سن لیں۔ ایک انگریز لین پول لکھتا ہے "ظلم محمد (ﷺ) کی سرشت ہی میں نہ تھا۔" اور پاسورتھ اسمتھ کا بیان ہے کہ "انہوں نے (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ نے) عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا..... کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے اور نہ از خود اس سے الگ ہوتے۔ گفتگو بہت نرم اور شیریں کرتے۔" اور ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں تحریر کرتا ہے کہ "پیغمبر (ﷺ) کا میلان طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا۔" مفصل حوالوں کے لئے جناب عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر ملاحظہ کریں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی سخت مزاج اور ترش رو نہ ہوتے تھے

۲۹۳ "فَظٌّ" فظظ کلام میں خشونت اور سختی کو کہتے ہیں اور "غلیظ القلب" سخت دل اور تند مزاج کو کہتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ "فظ" وہ بدخلق ہے جو دوسروں سے بری طرح پیش آئے اور زبان سے برا بھلا کہے جیسے انسان بعض اوقات غصہ اور مصیبت میں کر جاتا ہے گویا وہ ہر وقت منہ چڑھائے رکھے اور غلیظ القلب وہ سخت دل ہے جس کا دل دوسروں کی مصیبت سے متاثر نہ ہو اور دوسروں کیلئے اس کے دل میں رقت محبت اور ہمدردی پیدا نہ ہو اگرچہ وہ ان کے ساتھ سختی نہ کرے۔

ذرا غور کریں کہ جنگ احد میں کیا کچھ ہوا؟ کیا اس سے زیادہ مشکل وقت بھی انسان کی زندگی میں آسکتا ہے؟ جب ایسے وقت میں بھی آپ ﷺ سے سخت مزاجی اور ترشی روئی کا صدور نہیں ہوا تو باقی زندگی میں آپ ﷺ کے ترش رو ہونے اور سخت مزاجی سے بات کرنے اور زبان سے ایسے الفاظ نکالنے کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ ﷺ کے نرم مزاج اور متین ہونے کا ذکر فرمایا وہاں آپ ﷺ کی سخت مزاجی اور تند گفتاری کی بھی نفی کر دی۔ کیوں؟ اس لئے کہ نرم مزاج سے نرم مزاج اور منکسر المزاج بھی کسی وقت سخت مزاجی اور تند گفتاری سے کام لے جاتا ہے اور قرآن کریم میں اس طرح اللہ تعالیٰ نے گویا یہ اعلان فرما دیا ہے کہ ہمارے رسول محمد ﷺ کسی حال اور کسی مشکل سے مشکل وقت میں بھی سخت مزاج اور تند گفتار نہیں ہوتے تھے۔

ہر ایک خلق کا اظہار کامل اور مکمل اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو۔ سب کو معلوم ہے کہ جنگ کا وقت ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے پھر اس سے بھی بڑھ کر وہ خاص وقت ان احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیئے گئے ہوں فرو گزاشت ہو یا ان احکام کی سرے سے تکمیل ہی نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسے وقت میں کہ آپ ﷺ کی نافرمانی کی گئی ہے یا ہو گئی جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت کا سامنا آپ ﷺ کو اور دوسرے مسلمانوں کو ہوا۔ کتنے شہید ہو گئے اور کتنے زخمی اور نبی رحمت ﷺ کی ذات گرامی کو زخم آئے اور دانت شہید ہوئے اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ ﷺ سے سخت مزاجی کا اظہار نہ ہوا۔ ہاں! ہاں! ان حالات میں بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں آپ ﷺ کے اندر اس خلق لینت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ورنہ آپ ﷺ کی نرم مزاجی کے ہزاروں مواقع تھے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے مفسرین نے "عَبَسَ وَتَوَلّٰی" کا فاعل نبی رحمت ﷺ کو قرار دیا اور یہ لکھا کہ "آپ ﷺ چیں بجبیں ہوئے اور منہ موڑا" حاشا للہ کہ ہمارا رسول ﷺ اس کا فاعل ہو۔ یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور اس قرآنی شہادت کے بھی خلاف ہے۔ یقیناً اس اعمیٰ کو دیکھ کر جس کے ماتھے پر بل آئے اور جس نے منہ موڑا وہ وہی کافر تھا جس سے نبی کریم ﷺ گفتگو فرما رہے تھے۔ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی قرآنی شہادتیں موجود ہیں اور آپ ﷺ کی سخت مزاجی کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبۃ ۹ : ۱۲۸) "لوگو! تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے۔ وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے۔"

اس آیت میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت موجود تھی۔ فرمایا اللہ کا رسول تم میں

آگیا اور اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آنکلا بلکہ سنت الٰہی کے مطابق خود تم ہی میں سے پیدا ہوا اور چونکہ وہ تم ہی میں سے ایک انسان ہے اس لئے اول سے لے کر آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے اللہ کے حکم سے نبوت کا اعلان کیا تو تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گزرنا تھا وہ گزرا اور تم نے مظلومی و بے کسی کے اعلان بھی سن لئے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزمانہ لی ہو۔

پھر آپ ﷺ کے ایک ایسے وصف پر زور دیا جو منصب رسالت ہی کیلئے نہیں بلکہ ہر انسان کیلئے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو سب سے زیادہ ضروری وصف ہے۔ وصف کیا ہے؟ وہ وصف یہ ہے کہ ابنائے جنس کے لئے شفقت و رحمت ہے۔ فرمایا' اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لئے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کیلئے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر تم کو پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت صرف تمہارے ہی لئے نہیں ہے وہ تو تمام مومنوں کے لئے خواہ عرب کے ہوں خواہ عجم کے رؤف و رحیم ہے۔

ایک بار پھر غور کرو کہ "رؤف" رافۃ سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری و مصیبت پر جوش میں آئے پس اس طرح رافۃ رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور "رحمت" عام ہے پھر دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثر کے ساتھ واضح ہو گیا اور دوسرے اوصاف کی طرح یہ دونوں وصف بھی "الرؤف و الرحیم" ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہو جاتے ہیں اور قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔

ہاں! نبی اعظم و آخر ﷺ پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کے متعلق قرآن کریم نے اس طرح اعلان فرمایا کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸ : ۲۹)

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ ﷺ پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں وہ کافروں کے ساتھ مقابلہ میں سخت ہیں لیکن آپس میں نہایت ہی رحمدل ہیں۔" یہ نبی رحمت ﷺ کے ساتھیوں اور سچے دل سے ایمان لانے والوں کے وصف میں ارشاد فرمایا اور کفر کے مقابلہ میں جو "سخت" فرمایا اس کو ذہن نشین کرنا ہے۔

عربی زبان میں کہتے ہیں "فلان شدید علیہ" فلاں شخص اس پر شدید ہے یعنی اس کو رام کرنا اور اپنے

مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ

ہوتے پس ان لوگوں کا قصور معاف کر دو اور اللہ سے بھی ان لوگوں کے لئے بخشش طلب کرو اور اس طرح کے معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔[۲۹۴] پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا تو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً اللہ انہی لوگوں کو دوست

مطلب پر لانا اس کے لئے مشکل ہے۔ کفار پر محمد رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ درشتی اور تند خوئی سے پیش آتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی۔ اصولوں کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلہ میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ چارہ کی طرح نرم نہیں ہیں کہ کافر انہیں آسانی سے چبا جائیں۔ انہیں کسی خوف و ہراس سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انہیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا۔ کافروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ انہیں اس مقصد عظیم سے ہٹا دیں جس کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کے لئے اٹھے ہیں نہ ان کو جھکایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دبایا جا سکتا ہے اور اہل ایمان کے لئے وہ بہت نرم گوشہ رکھتے ہیں ایک دوسرے سے نجی اور قومی معاملات میں تعاون کرتے ہیں۔ ہر ایک مسلم کا دکھ وہ اپنا دکھ سمجھتے ہیں اور ہر ایک مصیبت اپنی مصیبت جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رحیم و شفیق ہیں اس لئے کہ اصول و مقصد کے اتحاد نے ان کے اندر ایک دوسرے کے لئے محبت اور ہم رنگی و سازگاری پیدا کر دی ہے۔ اور ان باتوں کو وہ کبھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے یہی ان کے لئے سچے مومن ہونے کی نشانی ہے۔

قصور واروں کا قصور معاف کرنے اور ان سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت

[۲۹۴] "پس ان لوگوں کا قصور معاف کر دو۔" رسول اللہ ﷺ نے تو پہلے ہی اپنی نرمی طبیعت اور خوش اخلاقی کی بناء پر معاف فرما دیا تھا۔ اس حکم الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ معاندین و مخالفین آپ ﷺ کے اس فعل کو کہیں بزدلی قرار نہ دیں دراصل ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بزدلی نہیں بلکہ شجاعت و بہادری کا نتیجہ ہے جو ہم نے ان کے قلب مطہر میں بھر دی ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے ان سے کسی قسم کا بدلا مواخذہ نہیں فرمایا تو وہ ہمارے حکم سے ہے۔ ہاں! آپ ﷺ کو مخاطب کر کے آپ ﷺ کی امت کو بھی درس دیا جا رہا ہے کہ ایک راہنما کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے بلکہ عفو و درگزر سے کام

لے۔ برا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو اور ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے اس لئے کہ یہ ساری باتیں اولو العزمی کی دلیل ہیں کمزوری کی نہیں۔

پھر ارشاد فرمایا "ان لوگوں کے لئے اللہ سے بخشش طلب کرو۔" جس میں اس بات کا سبق ہے کہ گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس کا ازالہ معافی طلب کر لینا ہی ہے۔ معافی کیا ہے؟ طلب بخشش معافی ہی تو ہے۔ کیونکہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کی رحمت نے ہر ایک چیز کو اپنی وسعت میں گھیر رکھا ہے۔ جب بھی کوئی سچے دل سے معافی طلب کرتا ہے تو یقیناً اس کو معافی ہو جاتی ہے دل میں یہ شک رکھنا بھی گناہ ہے کہ شاید معافی ہوئی ہے یا نہیں۔ پھر اس میں یہ اشارہ بھی مخفی ہے کہ یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں بلکہ دل سے ان کی خیر خواہی مطلق نہ چھوڑیں اور چونکہ سب سے بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی درستگی ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے بخشش طلب کرو کہ وہ آئندہ کبھی ایسے گناہ کا ارتکاب نہ کریں۔ اس لئے کہ یہاں استغفار کے معنی گناہ کی سزا سے حفاظت چاہنا نہیں بلکہ خود گناہ سے حفاظت چاہنا ہے کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ تو خود ان کا گناہ معاف کر چکا ہے کیونکہ آیت ۱۵۴ میں فرما دیا گیا تھا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ۔

کہ اللہ نے ان کا یہ گناہ معاف کر دیا اور گناہ سے معافی کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ گناہ کی سزا سے معافی ہو گئی۔ پس جس کو اللہ معاف فرما چکا اس کے لئے سزا سے بچانے کی دعا کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ یہ اس بات کی قطعی شہادت ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت بھی ہوتی ہے کہ آئندہ کوئی گناہ صادر نہ ہو۔ صرف گناہ صادر ہونے کے بعد ہی استغفار نہیں ہوتی۔ انبیاء کرام اور خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ کے استغفار طلب کرتے رہنے کا یہی مفہوم ہے۔ اگر یہ بات یاد رہی تو انشاء اللہ بہت سے مقامات کی تفسیر سمجھنے میں کام دے گی اور یاد رکھنے کی بات کو یاد رکھنا ہی مفید ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس لئے کہنا پڑی کہ ہمارے قارئین کی اکثر حالت یہی ہے کہ ایک طرف پڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف بھولتے جاتے ہیں اور پھر کیوں نہ ہو جبکہ ہمارے لکھنے والوں کا یہ حال ہے وہ لکھتے جاتے ہیں اور بھولتے جاتے ہیں کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھ رہے ہیں؟ تو آخر قارئین ایسے کیوں نہ ہوں گے؟

اب ارشاد ہوتا ہے کہ "اس طرح کے معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔" غزوہ احد کے معرض وجود میں آنے سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا تھا اور مشورہ سے یہ طے پایا تھا کہ مدینہ میں رہ کر نہیں بلکہ مدینہ سے باہر نکل کر کھلے میدان میں کفار مکہ کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی رائے کے خلاف کثرت رائے پر عمل کیا۔ پھر میدان احد میں تکلیف کی گھڑیاں بھی آئیں۔ منافقین نے پھبتیاں بھی کسیں کہ انہوں نے ہماری رائے نہ مان کر خسارہ پایا۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اب پھر حکم الٰہی ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ نے مشورہ لیا تھا وہ فعل بھی آپ ﷺ کا بالکل صحیح تھا اور آئندہ بھی مشورہ طلب کرتے رہو اور ان منافقین کی باتوں پر کان نہ دھرو جس سے مشورہ کی

اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ مشورہ کرنا کتنا ضروری ہے۔

مشورہ کی اہمیت اسلام میں

مشورہ کے متعلق قرآن کریم نے دو جگہ صریح حکم دیا ہے ایک یہی آیت ہے جس کا یہاں بیان جاری ہے اور دوسرے سورہ شوریٰ کی آیت ۳۸ جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور بعض جگہ ضمنی طور پر مشورہ کی ہدایت فرمائی ہے جیسے رضاعت کے احکام میں ارشاد فرمایا "عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ" یعنی بچے کا دودھ چھڑانا ماں باپ دونوں کی رضامندی اور مشورہ سے ہونا چاہئے مشورہ سے متعلق چند اہم باتیں قابل غور ہیں۔

پہلی بات لفظ امرا اور مشورہ کے معنیٰ' دوسری بات مشورہ کی شرعی حیثیت' تیسری بات رسول کریم ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ' چوتھی بات' حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ' پانچویں بات' مشورہ میں اختلاف رائے ہو تو فیصلہ کی صورت' چھٹی بات ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل۔

پہلی بات = لفظ امر اور شوریٰ کی تحقیق

لفظ "امر" کا اطلاق عربی زبان میں کئی معنی کیلئے ہوتا ہے' ایک عام معنی میں آتا ہے' جو ہر مہتم بالشان قول و فعل کو شامل ہے' دوسرا اطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے' جس پر قرآن کریم میں لفظ اُولِی الْاَمْرِ محمول ہے' تیسرا اطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لئے ہے' جس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔ مثلاً اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ اور محققین کے نزدیک قَالَ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں بھی یہی امر مراد ہے' اب قرآن کے ارشاد وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ میں دونوں معنی کا احتمال ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں اور دوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں' کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات سبھی خاص اہمیت رکھتے ہیں' اس لئے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو' خواہ حکومت سے متعلق ہو خواہ معاملات سے اور لفظ شوریٰ' مشورہ' مشاورت کے معنی ہیں کسی قابل غور معاملہ میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا' اس لئے وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ کے معنی یہ ہوئے کہ:

آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ قابل غور معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں' صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کریں' یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قابل غور معاملہ میں جس میں کوئی اہمیت ہو' خواہ وہ حکم حکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے' ان میں سچے مسلمانوں کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔

دوسری بات = مشورہ کی شرعی حیثیت

اس بارہ میں قرآن کریم کے ارشادات مذکورہ اور احادیث نبویہ ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسے معاملہ میں جس میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں خواہ وہ حکم حکومت سے متعلق ہو یا کسی دوسرے معاملہ سے باہمی مشورہ لینا رسول اللہ کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت اور دنیا و آخرت میں باعث برکات ہے' قرآن و حدیث میں اس کی تائید آئی ہے اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے جیسے معاملات حکومت ان میں مشورہ لینا واجب ہے۔ (ابن کثیر)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں' تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم پر خواہش پرستی غالب آجائے کہ بھلے برے اور نافع و مضر سے قطع نظر کر کے عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دو تو اس وقت کی زندگی سے تمہارے لئے موت بہتر ہے' ورنہ مشورہ میں کسی عورت کی بھی رائے لینا کوئی منع نہیں۔ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے ثابت ہے اور قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کی آیت جو ابھی بیان کی گئی ہے اس میں ارشاد ہے عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ یعنی بچہ کا دودھ چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے' اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے' اس لئے خاص طور سے عورت کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ :

المستشار مؤتمن اذا استشير فليشره بما هو صانع لنفسه

"یعنی جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے اس پر لازم ہے کہ اس معاملہ میں جو کام وہ خود اپنے لئے تجویز کرتا ہے وہی رائے دوسرے کو دے اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔"

یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں بسند حسن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ (مظہری)

البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں مسنون ہے جن کے بارہ میں قرآن و حدیث کا کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو' ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہو اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں بلکہ جائز بھی نہیں' مثلاً کوئی شخص اس میں مشورہ کرے کہ نماز پڑھیں یا نہیں' زکوٰۃ

دے یا نہیں، حج کرے یا نہیں، یہ مشورہ کی چیزیں نہیں، شرعی طور پر فرض قطعی ہیں، البتہ اس میں مشورہ کیا جا سکتا ہے کہ حج کو اس سال جائے یا آئندہ اور پانی کے جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے اور خشکی کے راستہ سے جائے یا دوسرے طریق سے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ مشورہ لیا جا سکتا ہے کہ اس کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کیا جائے، کیونکہ یہ سب امور شرعاً اختیاری ہیں۔

ایک حدیث میں خود اس کی تشریح رسول کریم ﷺ سے منقول ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحتہ" قرآن میں نازل نہیں ہوا اور آپ ﷺ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو، تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کیلئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار سمجھ دار لوگوں کو جمع کرو اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے یہ فیصلہ نہ کرو۔

اس حدیث شریف سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مشورہ صرف دنیوی معاملات میں نہیں بلکہ جن احکام شرعیہ میں قرآن و حدیث کی صریح نصوص نہ ہوں ان احکام میں بھی باہمی مشورہ مسنون ہے اور دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ ایسے لوگوں سے لینا چاہئے جو موجودہ لوگوں میں تفقہ اور عبادت گزاری میں معروف ہوں۔ (اخرجہ الخطب کذا فی الروح)

نیز خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے:

استر شدوا العاقل ولا تعصوہ فتندموا۔

"یعنی عقلمند آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ ندامت اٹھانی ہوگی۔"

ان دونوں احادیث کو ملانے سے معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ کے ارکان میں ۲ دو وصف ضروری ہیں، ایک صاحب عقل و رائے ہونا، دوسرے عبادت گزار ہونا، جس کا حاصل ہے ذی رائے اور متقی ہونا۔

تیسری بات = رسول کریم ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ

آیت میں آنحضرت ﷺ کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام سے مشورہ لیں، اس میں یہ اشکال ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول اور صاحب وحی ہیں، آپ ﷺ کو کسی سے مشورہ کی کیا حاجت ہے، آپ ﷺ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی ہے، اس لئے بعض علماء نے اس حکم مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی، نہ اس مشورہ پر آپ ﷺ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرامؓ کے اعزاز اور دل جوئی کیلئے مشورہ کا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا ہے، لیکن امام ابوبکر جصاص نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا اور نہ مشورہ کا کسی

کام پر کوئی اثر ہے تو پھر اس مشورہ پر کوئی دلجوئی اور اعزاز بھی نہیں رہتا' بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو عام امور میں تو براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے' مگر بمقتضائے حکمت و رحمت بعض امور کو آنحضرت ﷺ کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے' ایسے ہی امور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی قسم کے امور میں مشورہ لینے کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا' رسول اللہ ﷺ کی مجالس مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر کیلئے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ ہمیں دریا میں کود جانے کا حکم دیں تو ہم اس میں کود پڑیں گے اور اگر آپ ﷺ ہمیں برک الغماد جیسے دور دراز مقام کی طرف چلنے کا ارشاد فرمائیں گے تو ہم آپ ﷺ کے ساتھ ہوں گے' ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا رب کفار سے مقابلہ کرے' بلکہ ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ ﷺ تشریف لے چلیں ہم آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ سے آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

اسی طرح غزوۂ احد میں اس بارہ میں مشورہ کیا کہ کیا مدینہ شہر کے اندر رہ کر مدافعت کریں یا شہر سے باہر نکل کر' عام طور سے صحابہ کرامؓ کی رائے باہر نکلنے کی ہوئی' تو آپ ﷺ نے اسی کو قبول فرمایا' غزوۂ خندق میں ایک خاص معاہدہ پر صلح کرنے کا معاملہ درپیش آیا' تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس معاہدہ کو مناسب نہ سمجھ کر اختلاف کیا۔ آپ ﷺ نے انہی دونوں کی رائیں قبول فرمائیں' حدیبیہ کے ایک معاملہ میں مشورہ لیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے پر فیصلہ فرما دیا۔ قصہ افک میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا' یہ سب معاملات وہ تھے جن میں آنحضرت ﷺ کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص جانب متعین نہیں کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت اور صاحب وحی ہونا کچھ مشورہ کے منافی نہیں اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشورہ محض نمائشی دلجوئی کے لئے ہو' اس کا اثر معاملات پر نہ ہو بلکہ بہت مرتبہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو آپ ﷺ نے اپنی رائے کے خلاف بھی قبول فرمالیا' بلکہ بعض امور میں آنحضرت ﷺ کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص صورت متعین نہ فرمانے اور مشورہ لے کر کام کرنے میں حکومت و مصلحت یہ بھی ہے کہ آئندہ امت کیلئے ایک سنت رسول کریم ﷺ کے عمل سے جاری ہو جائے کہ جب آپ ﷺ کو بھی مشورہ سے استغناء نہیں تو پھر ایسا کون ہے جو استغناء کا دعویٰ کر سکے؟ اسی لئے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ میں ایسے مسائل میں مشاورت کا طریق ہمیشہ جاری رہا' جن میں کوئی نص شرعی نہ تھی اور آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہ کرام کا بھی یہی معمول رہا' بلکہ بعد میں تو ایسے احکام شرعیہ کی دریافت کیلئے بھی مشورہ کا معمول رہا' جن میں قرآن و حدیث کا کوئی صریح فیصلہ نہ تھا' کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے یہی طریق کار بتلایا تھا۔

چوتھی بات = حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے؟

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے دو جگہ مشورہ کا صریح حکم دیا ہے' ایک یہی آیت مذکورہ اور دوسرے سورۂ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے' ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ یعنی اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے ان دونوں جگہ پر مشورہ کے ساتھ لفظ امر مذکور ہے اور لفظ امر کی مفصل تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ہر مہتم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے اور حکم اور حکومت کے لئے بھی بولا جاتا ہے' امر کے خواہ معنی اول مراد لیں یا دوسرے معنی' حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا بہرصورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے' حکم یا حکومت مراد لینے کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے اور اگر معنی عام لئے جائیں جب بھی حکم اور حکومت کے معاملات مہتم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابل مشورہ ٹھہریں گے' اس لئے امر اسلام کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت کے اہم معاملات میں اہل حل و عقد سے مشورہ لیا کرے' قرآن کی آیات مذکورہ اور رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کا مسلسل تعامل اس کی روشن سند ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جس طرح معاملات حکومت میں مشورہ کی ضرورت واضح ہوئی اسی طرح ان سے اسلام کے طرز حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اصول بھی سامنے آگئے' کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے' جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے۔ خاندانی وراثت سے نہیں' آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے' شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً و کرہاً اسی طرف آرہی ہیں' لیکن اب سے چودہ سو برس پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے جبکہ پوری دنیا پر آج کے تین بڑوں کی جگہ دو بڑوں کی حکومت تھی' ایک کسریٰ' دوسرا قیصر اور ان دونوں کے آئین حکومت شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں مشترک تھے' جس میں ایک شخص واحد لاکھوں' کروڑوں انسانوں پر اپنی قابلیت' صلاحیت سے نہیں' بلکہ وراثت کے ظالمانہ اصولوں کی بناء پر حکومت کرتا تھا اور انسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی بادشاہی انعام سمجھا جاتا تھا۔ یہی نظریہ حکومت دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلط تھا' صرف یونان میں جمہوریت کے چند دھندلے اور ناتمام نقوش پائے جاتے تھے' لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مدھم تھے کہ ان پر کسی مملکت کی بنیاد رکھنا مشکل تھا' اسی وجہ سے جمہوریت کے ان یونانی اصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہیں بن سکی' بلکہ وہ اصول ارسطو کے فلسفہ کی ایک شاخ بن کر رہ گئے اس کے برخلاف اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کر کے امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں دے دیا' جس کو وہ اپنے نمائندوں اہل حل و عقد کے ذریعہ استعمال کر سکیں' بادشاہ پرستی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ اور فطری نظام سے آشنا ہوئی اور یہی روح ہے اسی طرز حکومت کی' جس کو آج جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم و ستم کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی

اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق العنان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنایا کہ ان کے قلب و دماغ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے اللہ اور اس کی اصلی ما لکیت و حکومت کے تصور سے بھی بیگانہ ہوگئے' اب ان کی جمہوریت اللہ تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے عوامی اختیار پر اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی بار خاطر خلاف انصاف تصور کرنے لگیں۔

اسلامی آئین نے جس طرح خلق خدا کو کسریٰ و قیصر اور دوسری شخصی بادشاہتوں کے جبر و استبداد کے پنجہ سے نجات دلائی' اسی طرح ناخدا آشنا مغربی جمہوریتوں کو بھی خدا شناسی اور خدا پرستی کا راستہ دکھلایا اور بتلایا کہ ملک کے حکام ہوں یا عوام' اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں' ان کے عوام اور عوامی اسمبلی کے اختیارات' قانون سازی' عزل و نصب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں' ان پر لازم ہے کہ امیر کے انتخاب میں اور پھر عہدوں اور منصبوں کی تقسیم میں ایک طرف قابلیت اور صلاحیت کی پوری رعایت کریں تو دوسری طرف ان کی دیانت و امانت کو پرکھیں' اپنا امیر ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم' تقویٰ' دیانت' امانت' صلاحیت اور سیاسی تجربہ میں سب سے بہتر ہو' پھر یہ امیر منتخب بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں' بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے' قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور رسول اکرم ﷺ اور خلفائے الراشدین کا تعامل اس پر شاہد عادل ہیں' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :

لا خلافة الا عن مشورة (کنز العمال بحوالہ ابن ابی شیبہ)

"یعنی شورائیت کے بغیر خلافت نہیں ہے۔"

شورائیت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کیلئے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے' حتیٰ کہ اگر امیر مملکت مشورہ سے آزاد ہو جائے' یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطہ نظر سے مشورہ کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا ضروری ہے۔

ذکر ابن عطیة ان الشوریٰ من قواعد الشریعة والدین فعزله واجب' هذا ما لا خلاف له۔

(البحر المحیط لابی حیان)

"ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے' جو امیر کہ اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے' اس کا عزل کرنا واجب ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔"

مشورہ کے ضروری ہونے سے اسلامی حکومت اور اس کے باشندوں پر جو ثمرات اور برکات حاصل ہوں گے' اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ رسول اکرم ﷺ نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا' ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اس مشورہ کی حاجت نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لئے ایک رحمت

بنایا ہے۔ (بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسول ﷺ کو ہر کام بذریعہ وحی بتلا دیتا' کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا' لیکن امت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپ ﷺ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے' اس لئے بہت سے امور ایسے چھوڑ دیئے جن میں صراحۃً کوئی وحی نازل نہیں ہوئی' ان میں آپ ﷺ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔

پانچویں بات = مشورہ میں اختلاف رائے ہو جائے' تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی؟

مسئلہ میں اگر اختلاف رائے ہو جائے تو کیا آج کل کے پارلیمانی اصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا یا اس کو اختیار ہوگا کہ اکثریت ہو یا اقلیت جس طرف دلائل کی قوت اور مملکت کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے؟ قرآن و حدیث اور رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اکثریت رائے کے فیصلہ کا پابند و مجبور ہے' بلکہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعامل صحابہؓ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے' خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے' البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کیلئے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لئے سبب اطمینان بن سکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں غور فرمایئے' اس میں رسول اکرم ﷺ کو مشورہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ یعنی مشورہ کے بعد آپ ﷺ جب کسی جانب کو طے کر کے عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے' اس میں عَزَمْتَ کے لفظ میں عزم یعنی نفاذ حکم کا پختہ ارادہ صرف آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا۔ عزمتم نہیں فرمایا جس سے عزم و تنفیذ میں صحابہ کی شرکت معلوم ہوتی' اس کے اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد نفاذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے' حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بعض وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے' حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہ موجود ہوتے تھے' جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عمر اور علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے' حضور اکرم ﷺ نے بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے کو جمہور صحابہؓ کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے' حتیٰ کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیت مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ لینے کے لئے نازل ہوئی۔ کلبی کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے :

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال نزلت فی ابی بکر و عمر و کانا جواریتی رسول اللہ ﷺ ووزیریہ وابوی المسلمین (ابن کثیر)

"ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لینے کے بارے میں نازل

ہوئی ہے' یہ دونوں حضرات جناب رسول اکرم ﷺ کے خاص صحابی اور وزیر تھے اور مسلمانوں کے مربی تھے۔"

رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرات شیخینؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا :

لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتکما' (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

"جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا۔"

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں یہ اشکال کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی ہے اور شخصی حکومت کا طرز ہے اور اس سے جمہور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلے کر لی ہے' کیونکہ عوام کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں امیر بنا دیں بلکہ ان پر لازم قرار دیا ہے کہ علم و عمل اور صلاحیت کار اور خدا ترسی اور دیانت کی رو سے جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں صرف اس کو امیر منتخب کریں۔ تو جس شخص کو ان اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ صفات کے تحت منتخب کیا گیا ہو' اس پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو بددیانت اور فساق' فجار پر عائد کی جاتی ہیں' عقل و انصاف کا خون کرنا اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور ملک و ملت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے مرادف ہوگا۔

چھٹی بات = ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا

اس جگہ یہ بات بہت ہی قابل غور ہے کہ نظام حکومت اور دوسرے اہم امور میں تدبیر اور مشورہ کے احکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرو' کیونکہ یہ سب تدبیر مدبر الامور کے قبضہ قدرت میں ہیں' انسان کیا اور اس کی رائے و تدبیر کیا' ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مولانا رومی رحمہ اللہ نے خوب فرمایا ہے ۔

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحان ما مکن اے شاہ بیش

اہمیت مشورہ کا ایک اختصاری خاکہ

مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلقہ اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من

مانی چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندہ کو شریک مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اسی وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کیلئے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے اور نہ وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقل کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کوئی شخص جو اللہ سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جراتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو ان سب کو یا ان کے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے' تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آپڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے' مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی شریک مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ممکن نہ ہو' تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچائیت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کے چلانے کے لئے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب

تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا' نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضا مندی طلب کرے اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے بعد لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے ملوث ہو اور اس خواہش کے ساتھ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو' حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں اعلانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی رغبت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے :

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں' انہیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں' احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے جسے کوئی شخص بھی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضا مندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے' بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کو مشورہ دینے کے لئے بھی وہ لوگ مقرر کئے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیئے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں اور اس طرح کے اظہار رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو' جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بناء پر یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں' وہاں

الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ

۲۹۵

رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ کرنے والے ہیں۔ ۱۵۹

اے مسلمانو! اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے لیکن اگر

درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو کہ مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے' یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کے سننے کے بعد اپنی من مانی کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی' بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔ تاہم امیر کی رائے کو فوقیت حاصل رہے گی اگر وہ اپنی رائے یا اقلیت کی رائے پر عمل کرنے کا حکم دے تو اس کو تسلیم کرنا ہوگا جب کہ اس کا حکم اللہ اور رسول اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔

اسلام کے اصول شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے" اور "تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔" اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس پر عملدرآمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو۔ لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

مشورہ سے طے شدہ بات کے خلاف کرنے کا کسی کو حق نہیں

۲۹۵ "پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا تو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً اللہ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ مشورہ کر کے جب ایک بات پختہ کر لو تو پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو جیسا کہ احد کے موقعہ پر آپ ﷺ نے کیا۔ جب مشورہ کر کے حکم دے دیا پھر بعض لوگوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تو آپ ﷺ نے اس کی پرواہ نہ کی۔ یہ خلاف عزم ہوتا۔ پھر جب

فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ

وہی تمہیں تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے چھوڑ دے تو بتلاؤ کون ہے جو اس کے چھوڑ دینے کے بعد تمہارا مددگار ہو سکتا ہے؟ صرف اللہ ہی کی ذات ہے پس جو مومن ہیں وہ

نقصان پہنچا تب بھی آپ ﷺ نے یہ نہ کہا کہ ہمارے مشورہ میں جو طے ہوا وہ صحیح نہیں تھا۔ ہاں! منافقین نے باتیں بنائیں جن کا یہ جواب دیا گیا کہ مشورہ کرنا ہی ضروری ہے اور اب جو کچھ ہوگا وہ مشورہ ہی سے ہوا کرے گا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا یہی مفہوم ہے کہ طے شدہ بات میں پھر کسی کو ترمیم کا کوئی حق حاصل نہیں۔ آج اگر اسلام کے اس ایک حکم پر ہی سختی سے عمل کیا ہوتا تو مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی جو اس وقت ہے۔ ایسا مشورہ کوئی مشورہ نہیں کہ آؤ سب مل کر مشورہ کریں لیکن ایک بات یاد رکھو اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو ہم ویٹو کر جائیں گے اور تمہارا مشورہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا؟ یہ مشورہ اس لئے کر رہے ہیں کہ تم سب ہماری بات مان جاؤ اگر تم نے ہماری مخالفت کی تو پھر نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا مشورہ کیا اس کو مشورہ کہا جا سکتا ہے؟ یہ مشورہ نہیں بلکہ دھونس ہے لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دھونس کو دھونس کہہ بھی نہیں سکتے بلکہ مشورہ مشورہ کا شور مچانے پر مجبور ہیں۔

اس پوری آیت میں ایک مصلح و مبلغ کے لئے چند صفات کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے ان میں صفت اول یہ ہے کہ وہ سخت کلامی اور کج خلقی سے بچے۔ دوسری یہ کہ ان لوگوں سے جن کی وہ اصلاح چاہتا ہے یا جن کو تبلیغ کر رہا ہے کوئی غلطی سرزد ہو جائے یا ان سے ایذا کی کوئی چیز صادر ہو جائے تو انتقام کے درپے نہ ہو بلکہ عفو و درگزر سے کام لے۔ تیسری یہ کہ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑے بلکہ ان کے لئے دعائے استغفار بھی کرتا رہے کہ وہ آئندہ کبھی ایسی لغزش نہ کر بیٹھیں اور ظاہری حالات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ نہ چھوڑے۔ چوتھی یہ کہ جب مشورہ سے ایک بات طے ہو جائے تو پھر ویٹو نہ کرے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جو طے ہوا ہے اس کے مطابق عمل شروع کر دے اور پھر یہ کہ عمل میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرے۔

توکل کیا ہے؟ اس کی وضاحت قبل ازیں کئی مقامات پر کی گئی ہے تاہم توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس جتنے وسائل ہیں ان سے کام لے اور پوری ہمت لگا کر ایک کام کو سرانجام دے۔ کسی طرح کی کم ہمتی اور بے یقینی کا شکار نہ ہو۔ اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں خرچ کرنے کے بعد اس کام کا نتیجہ اللہ کے سپرد کر دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی بلا

حساب جنت میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ وہ کون ہوں گے؟ فرمایا وہ لوگ وہ ہیں جو داغ نہیں لگواتے، منتر نہیں پڑھتے پڑھاتے، شگون نہیں لیتے اور ہر حال میں اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تم کو اس طرح روزی دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

پہلی حدیث سے اس کی وضاحت ہوگئی کہ ناجائز طریقوں اور ناجائز اشیاء سے علاج نہ کرنا بلکہ جائز طریقے اور جائز اشیاء سے علاج کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھنا توکل ہے۔

ٹونے ٹوٹکے اور دم چھو سے بچتے ہوئے جو طرح طرح کے اوہام کو جنم دیتے ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنا بھی انسان کو کامل اور پختہ ارادہ بناتا ہے۔ وہ شکوک و شبہات اور وہم و گمان کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ یہ ساری باتیں تکمیل انسانیت کے خلاف ہیں۔

اور دوسری حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ پرندوں کے لئے روزی کی جو صورت اللہ نے مقرر کر دی ہے وہ اس میں حتیٰ المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح انسانوں کے لئے اور پھر خصوصاً مسلمانوں کے لئے روزی حاصل کرنے کی جو راہیں متعین کر دی گئی ہیں ان راہوں سے ذرا برابر بھی انحراف نہ کرتے ہوئے وہ پوری پوری سعی و کوشش کریں اور اس طرح سے جو کچھ میسر آئے اس پر قناعت کریں تو گویا انہوں نے توکل کو حاصل کر لیا اور وہ متوکل علی اللہ ہوگئے اور ان راہوں سے ہٹ کر انہوں نے کوئی تدبیر کی تو سمجھ لو کہ وہ غیر متوکل ہوگئے۔

اور پھر اس سے اس کی وضاحت بھی ہوگئی کہ توکل ترک اسباب کا نام نہیں اور نہ ہی ترک تدبیر کا نام ہے بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء کرامؑ اور تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ وہاں اسباب بعید اور دوران کار فکروں میں پڑے رہنا اور کسی رائے پر متفق نہ ہونا یا پھر صرف اسباب اور تدبیر ہی کو موثر سمجھ کر مسبب الاسباب اور مدبر الامور سے غافل ہو جانا بے شک خلاف توکل ہے اور مسلمانوں کو کسی حال میں بھی خلاف توکل نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں اسلام کی اول و آخر یہی نصیحت ہے اور اس مضمون کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ :

i یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تمہارے دل میں نرمی اور مزاج میں سرتاسر شفقت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کے دل تمہاری طرف بے اختیار نہ کھنچتے جس طرح اب کھنچے چلے جا رہے ہیں اور اللہ کا آپ ﷺ پر بہت بڑا فضل ہے۔

ii جنگ احد میں ایک گروہ کی لغزش بڑی ہی سخت لغزش تھی تاہم تمہاری شفقت کا مقتضیٰ یہی ہے

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ

اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۲۹۶ ۱۶۰

اور دیکھو اللہ کا نبی یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی طرح کی خیانت کرے ۲۹۷ کیونکہ نبی

کہ عفو و درگزر سے کام لو۔

iii تمہارا طریق کار یہ ہونا چاہئے کہ صلح و جنگ کا کوئی معاملہ بغیر مشورے کے انجام نہ پائے۔

iv اس بارے میں دستور العمل یہ ہے کہ پہلے جماعت سے مشورہ کرو پھر مشورے کے بعد کوئی ایک بات پکی کر لو۔ جب ایک بات پکی ہو جائے یعنی طے پا جائے تو اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ۔ شوریٰ اپنے محل اور وقت میں ضروری ہے۔ عزم اپنے محل اور وقت میں۔ جب تک مشورہ نہیں کیا ہے فیصلہ و عزم کا سوال نہیں اٹھتا لیکن جب مشورہ کے بعد عزم کر لیا گیا تو وہ عزم ہے اس لئے اب کوئی رائے کوئی نکتہ چینی اور کوئی مخالفت اسے متزلزل نہیں کر سکتی۔

v ایک پیشوا و امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت سے مشورہ کرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب عزم ہو۔

مسلمانوں کو ہدایت کہ اگر تم اللہ کے ہو جاؤ اور اللہ تمہارا ہو جائے' پھر کاہے کا غم

۲۹۶ اب مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم اللہ کے ہوگئے تو اللہ یقیناً تمہاری مدد کرے گا اور اگر وہ تمہارا مددگار ہو تو پھر تم پر کون غلبہ پانے والا ہے؟ یعنی کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پا سکے گا کیونکہ جو مدد الٰہی کو حاصل کر لے وہ کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتا ورنہ اللہ کا عاجز اور کمزور ہونا لازم آئے گا اور یہ قطعاً محال ہے۔ آج فی زمانا مسلمانوں کو اپنا تجزیہ کرنا ضروری اور لازمی ہے کہ وہ دنیا میں کس پہلو پر غالب ہے اور کس پر مغلوب۔ اور مغلوب ہے تو کیسے؟ اور کیوں؟ اور پھر اس سے کیا لازم آتا ہے کیا ہم وہ نہیں رہے جو ہم کو ہونا چاہئے تھا یا اللہ وہ نہیں رہا۔ فیصلہ خود کر لیں۔ لیکن یقیناً فیصلہ آپ کا بھی یہی ہوگا کہ ہم ہی وہ نہیں رہے جو ہم کو ہونا چاہئے تھا ورنہ وعدۂ الٰہی کبھی غلط اور خلاف واقعہ نہیں ہوتا۔

اور پھر فرمایا کہ اگر اللہ ہی تم کو بے مدد چھوڑ دے اور اپنی مدد کو تم سے روک لے تو پھر کون تمہاری مدد کر سکتا ہے یعنی کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا کیونکہ بندوں کے تمام افعال اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اس لئے اگر وہ بے مدد چھوڑ دے تو پھر کسی سے مدد کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی اس کی مدد کے بعد یا یہ مطلب ہے کہ جب تم نے اللہ سے مدد کی طلب چھوڑ دی تو کسی دوسرے سے مدد کا تصور ممکن ہی نہیں گویا اس آیت کریمہ میں توکل کے عقلی وجوب کو دلیل سے ثابت

کیا ہے پھر فرمایا کہ اگر توکل کے معنی سمجھ لیے ہیں تو پھر اہل ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے کیونکہ وہ جانتے ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں۔ کاش کہ آج بھی مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے اور ان کے سارے غموں کا مداوا ہو جائے۔ اس آیت کے مضمون پر محیط قرآن کریم میں بے شمار آیات اور بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ غیر اللہ پر بھروسہ ترک کر کے اللہ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا صرف اور صرف اس کو سمجھو۔ ان راہوں پر چلو جو اس نے تمہارے لئے مقرر کر دی ہیں اور ان راہوں کو بالکل ختم کر دو جن راہوں پر چلنے سے اس نے منع فرمایا ہے اگر تم اللہ کے ہوگئے تو وہ یقیناً تمہارا ہو جائے گا اور جس کا اللہ ہوگیا اس کو کس کا ڈر اور کس کا خوف ہے؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر اختیار کرنے والا دنیا و مافیہا سے نڈر ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○ (الزمر ۳۹ : ۳۸)

"اے پیغمبر اسلام! آپ ان سے پوچھئے کہ بھلا بتاؤ کہ جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے۔ یعنی اپنے قانون مشیت کے مطابق تو کیا وہ اس کی دی ہوئی تکلیف دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر اپنے قانون مشیت کے مطابق مہربانی فرمانا چاہے تو کیا اس کی عنایت کو وہ روک سکتے ہیں۔ پھر ان سے کہہ دیجئے کہ میرے لئے تو بس اللہ کافی ہے اور اس پر بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ مومن متوکل نہ کافروں سے ڈرتے ہیں اور نہ ان کے معبودان باطل سے خواہ وہ کوئی ہوں۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ :

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (فاطر ۳۵ : ۲) "اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لئے کھول دے اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔"

اس کا مقصود کیا ہے؟ یہی کہ مشرکین کی یہ غلطی دور کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دفع کر دیا جائے کہ اللہ کے بندوں میں سے کوئی انہیں روزگار دلانے والا اور کوئی ان کو اولاد دینے والا اور کوئی ان کے بیماروں کو صحت دینے والا ہے۔ شرک کے یہ تمام تصورات بالکل بے بنیاد ہیں اور خالص حقیقت صرف یہ ہے کہ جس قسم کی رحمت بھی بندوں کو پہنچتی ہے محض اللہ عزوجل کے فضل سے ہی پہنچتی ہے کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی طاقت رکھتا ہے اور یہ مضمون قرآن کریم اور احادیث پاک میں بکثرت مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان در در کی بھیک مانگنے اور ہر آستانے پر ہاتھ پھیلانے سے بچے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کے

اختیار میں نہیں ہے اور اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو سب سے زیادہ زبردست' سب پر غالب اور کامل اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتا اور اس کے ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے جو فیصلہ بھی وہ کرتا ہے سراسر حکمت کی بناء پر کرتا ہے کسی کو دیتا ہے تو اس کے لئے قانون مشیت میں کوئی حکمت اس کی مقتضی ہوتی ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو اس لئے نہیں دیتا کہ قانون مشیت میں اسے دینا حکمت کے خلاف ہے۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُکُمْ مِّنَ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَۃً وَلَا یَجِدُوْنَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ○ (الاحزاب ۳۳ : ۱۷) "اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ کون ہے جو تم کو اللہ سے بچا لے اگر وہ تمہیں اپنے قانون کے مطابق نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر اپنے قانون کے مطابق مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلہ میں تو یہ لوگ یقیناً کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا :

قَالَ فَمَنْ یَّمْلِکُ لَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ بِکُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ نَفْعًا بَلْ کَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ○ (الفتح ۴۸ : ۱۱) "اے پیغمبر اسلام! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو تمہارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ بلاشبہ پوری طرح باخبر ہے۔"

مختصر یہ کہ اس آیت ۱۶۰ میں مسلمانوں کی جماعت سے خطاب ہے کہ جب پیغمبر اسلام کا طریق کار یہ ہے کہ ہر معاملے میں تم سے مشورہ کر لیا کریں تو تمہارا فرض یہ ہے کہ ان کے تمام احکام و عزائم کی بے چون و چرا اطاعت کرو۔ وہ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ اپنے رسول کی نصرت اور مدد نہ کرے۔ ہاں میرے قانون مشیت کے مطابق جہاں جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اس کا نتیجہ بھی مرتب ہوتا ہے اور یاد رکھو کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا رسول خلق اللہ کی اطاعت و پیشوائی کے فرائض میں کسی طرح کی کوتاہی برتے یا کسی طرح کی خیانت کا مرتکب ہو۔

نبی اور خیانت' عقل کے ناخن لو تم کون ہو اور کیا کہہ رہے ہو؟

۲۹۷ "غل" یغل کے معنی نقل کئے گئے ہیں اذا خان یعنی غل جس کا مضارع یغل آتا ہے اس کے معنی ہیں خیانت کرنا۔ لفظ "غل" جو قرآن کریم میں متعدد جگہ پر استعمال ہوا ہے وہ خیانت' غشی' عداوت' کینہ' حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ ساری چیزیں ہی نبوت کے منصب کے خلاف ہیں اور ان میں سے ہر ایک نبوت کے منافی ہے اس لئے کسی ایک کا بھی نبی مرتکب نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے اس کو غنیمت کی خیانت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اور قرآن کریم میں بہت سی جگہوں پر استعمال کئے گئے ہیں اور کسی جگہ بھی ان کو غنیمت کے مال کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا بلکہ عام خیانت ہی میں

بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

خائن نہیں ہو سکتا اور جو کوئی خیانت کرتا ہے تو جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے روز نہیں چھپا سکے گا کیونکہ وہ اسکے ساتھ آئے گی پھر ہر جان کو اسکی کمائی کے

استعمال ہوئے ہیں اور اس جگہ بھی یہی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "دیکھو اللہ کا نبی یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی طرح کی خیانت کرے کیونکہ نبی خائن نہیں ہو سکتا" گویا نبوت اور خیانت دونوں اکٹھی ہونے والی باتیں نہیں۔ اس میں خودبخود ہر طرح کی خیانت آگئی کیونکہ خیانت خیانت ہی ہے خواہ مال غنیمت ہو یا کوئی اور مال۔ جس طرح مال میں خیانت ہو سکتی ہے قول میں بھی خیانت ہو سکتی ہے اور عمل میں بھی۔ اور نبوت سے کسی طرح کی خیانت بھی ممکن نہیں نہ مالی' نہ قولی اور نہ عملی۔

اس آیت کے شان نزول میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کہیں بدر میں کسی چادر کے گم ہونے کے متعلق اور کہیں نزول وحی میں خیانت کے متعلق کہیں تقسیم مال میں طاقتوروں کے درمیان مال تقسیم کر دینے کے متعلق اور علاوہ ازیں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے۔ ہاں احد میں کیا کچھ ہوا؟ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر جو کچھ ہوا اس کا تجزیہ کیا جائے تو جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ صرف اور صرف ایک ہے کہ جن تیر اندازوں کو رسول اللہ ﷺ نے جبل عینین پر متعین کیا تھا اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حالات کچھ ہو جائیں تم اس جگہ کو نہ چھوڑنا اور اس طرف سے حملہ نہ ہونے دینا لیکن جب فتح فتح کی آوازیں بلند ہوئیں' مکی لشکر فرار ہوا اور مدنی لشکر نے ان کا تعاقب کیا تو ان تیر اندازوں کی جماعت میں اختلاف رونما ہوگیا اور ان کی کثیر تعداد نے جگہ کو چھوڑ دیا اور مال غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں مکی لشکر کے کمانڈر نے پیچھے ہٹ کر اس طرف مدنی لشکر پر سے حملہ کر دیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ آپ پڑھ چکے انجام کار جانثار صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دوبارہ جمع کر ہو اس زور سے جنگ لڑی کہ مکی لشکر کے چھکے چھڑا دیئے اور ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بلاشبہ رسول اکرم ﷺ جب احد سے واپس مدینہ تشریف لے گئے ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی کہ آخر تم نے یہ حکم عدولی کیوں کی؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے بہت سے تو میدان احد میں شہید ہوگئے تھے باقی لوگوں نے کچھ عذرات پیش کئے لیکن وہ یقیناً بہت کمزور تھے کوئی معقول عذر نہیں تھا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا **بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم**" کیا تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا کہ ہم تم کو باقاعدہ حصہ دار بنائیں گے۔ تمہیں اس بات کا گمان تھا کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے۔ اس آیت کا اشارہ اس طرف ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ کیا تم کو یہ خیال ہے کہ یہ کسی ہماری کوتاہی کا نتیجہ ہے؟ ہم کسی خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں؟ گویا لشکر اسلام کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ آئندہ ایسی

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۱﴾ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ

مطابق پورا پورا بدلہ ملنا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی کی جائے۔ ۲۹۸ ۱۶۱

کیا ایسا آدمی جس نے اللہ کی خوشنودیوں کی راہ اختیار کی ہے اس آدمی کی طرح ہو

کوتاہی نہ ہو اور نبی کریم ﷺ کے متعلق تمہارے خیال میں کبھی یہ بات نہ گزرے کہ نبی ﷺ کی موجودگی میں ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ جو کچھ ہوا وہ تمہاری کوتاہیوں کا نتیجہ ہے اور اس کا صحیح اور واحد حل یہ ہے کہ آئندہ تم ایسی کوتاہی نہ کرو تاکہ ایسے نتیجہ سے تم دوچار نہ ہو۔ نبی ﷺ کے آنے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ تم کو تمہاری کوتاہیوں سے آگاہ کریں اور تمہارا فرض یہ ہے کہ تم ان کوتاہیوں سے باز آؤ۔

خائن اپنی خیانت کو کب تک چھپا سکتا ہے؟

۲۹۸ انبیاء کرام تو معصوم ہوتے ہیں ان سے کسی طرح کی خیانت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں اور نبوت اور خیانت دونوں چیزیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں اس لئے کسی نبی کے متعلق تو ایسا خیال ہی مردود ہے۔ اگر کوئی ایسا خیال رکھے تو یقیناً وہ نبوت کا منکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بھی کسی قسم کی خیانت کا مرتکب ہوا اس کی خیانت آنے والے روز میں ظاہر کر دی جائے گی اور وہ اپنی خیانت کو چاہے کتنا ہی چھپائے نہیں چھپا سکے گا اس لئے کہ میدان حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر دھرا ہوا ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو۔ وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکم الٰہی پہنچا دیا تھا اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک اونٹ والے کے لئے تو آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے جو اوپر آپ نے پڑھ لیا۔ لیکن جن لوگوں کے کندھوں پر پوری پورے بنک، خزانے، سکول، مدارس اور خصوصاً اسلامی درسگاہیں، مسجدیں، خانقائیں اور پورے کے پورے قبرستان رکھے ہوں گے وہ بھی اس حدیث کو اپنی نگاہ میں رکھیں کہ ان کا کیا حشر ہوگا؟ اور کیا گت بنے گی۔ اس لئے کہ ان میں تو پورے ملک کے باشندوں کا حق ہے جو ان میں خیانت کرے اس نے تو سارے مالک کے باشندوں کی خیانت کی۔ چونکہ یہی اموال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی ایک شخص مالک نہیں ہوتا۔ آج کل فی زمانا دنیا میں سب سے زیادہ خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے اور لوگ اس کے انجام بد اور وبال عظیم سے غافل ہیں۔ پھر ان ساری چیزوں کے نگران بھی ملک کے وڈیرے، سیاستدان، علمائے کرام، مفتیان عظام، ناظمین، گدی نشین اور سجادہ نشین ہوتے ہیں ان کو پوچھے تو کون؟ یقیناً یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے

جواب دہ ہیں اور ان کی خیانتیں یقیناً ظاہر ہو کر رہیں گی۔

"غل" کا استعمال قرآن کریم میں چند مقامات پر ملاحظہ فرمائیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (المائدہ ۵ : ۶۴) "یہودیوں نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھ گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہی کے ہاتھ بندھ گئے ہیں اور جو کچھ انہوں نے کہا اس کی وجہ سے ان پر لعنت پڑی ہے۔ اللہ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق خرچ کرتا ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○

(بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۹)

"اور دیکھو نہ تو اپنا ہاتھ اتنا سکیڑ لو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل ہی پھیلا دو۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر طرف سے ملامت پڑے گی اور درماندہ ہو کر رہ جاؤ گے۔"

غور کر لو فرمایا جا رہا ہے کہ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ کسی ایک ہی طرف جھک نہ پڑو مثلاً خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔ دراصل تمام محاسن و فضائل کی بنیادی حقیقت توسط و اعتدال ہے اور جتنی برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں افراط و تفریط سے پیدا ہوتی ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷ : ۱۵۷) "وہ رسول ﷺ ان کو اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہوں گے۔"

یہ پوری آیت نبی اعظم و آخر ﷺ کے مناقب اور آپ ﷺ کے کارہائے نمایاں اور آپ ﷺ کی ذمہ داریوں کے متعلق ہے جن کو آپ ﷺ نے بحکم الٰہی احسن طریق سے انجام دیا اور قوم کو ساری قومی بیماریوں سے نکال کر سیدھی راہ پر گامزن کیا لیکن افسوس کہ آج قوم کی اکثریت انہی بیماریوں میں مبتلا نظر آتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ :

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (الحشر ۵۹ : ۱۰) "وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کیلئے کوئی بغض نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور بہت ہی پیار کرنے والا ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ

سکتا ہے جس نے اللہ کے غضب کو دعوت دی اور اس کا ٹھکانہ جہنم جیسا برا ٹھکانہ ہوا؟ ۲۹۹ ۱۶۲

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے نزدیک لوگوں کے مرتبے ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ ۳۰۰ ۱۶۳

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ○ (الدھر ۷۶ : ۴) "بلاشبہ ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

زیر نظر آیت نمبر ۱۶۱ کے اختتام پر ارشاد فرمایا ہے "پھر ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق پورا پورا بدلہ ملنا ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی کی جائے اس میں بھی اس طرح اشارہ فرما دیا کہ جس قدر کوتاہی کسی نے فرائض و حقوق کی ادائیگی میں کی ہوگی اس قدر اس پر ذمہ داری ہوگی اور کسی پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

اللہ کی رضا کیلئے کام کرنے والے اور اس کے نافرمان ایک جیسے نہیں ہو سکتے

۲۹۹ بھلا جس شخص نے اللہ کی خوشنودی کی اتباع کی ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا مستحق ہوا جبکہ یہ بات طے ہے کہ اللہ کی ناراضگی کے ساتھ لوٹنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

گویا ان سے استفساراً فرمایا جا رہا ہے کہ کیا تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمہارے لئے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر احد میں شریک ہونے والے اور شریک نہ ہونے والے برابر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ہاں یقیناً وہ برابر نہیں۔ شریک ہونے والوں میں کچھ شہادت کا پیالہ پی کر اللہ رب العزت کے باغوں میں سیر کر رہے ہیں اور کچھ غازی بن کر اس راہ پر رواں دواں ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کر دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس راہ کی طرف ان کی راہنمائی کی ہے اور منافقین کا گروہ اگرچہ بظاہر ایمان کا دعویدار ہے لیکن ان کو سوائے قلق اور پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوا اور گیدڑ کی موت مرتے ہی عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بکثرت پائی

جاتی ہیں کافر' منافق' فاسق اور مسلم یکساں نہیں ہو سکتے نہ اس دنیا میں اعمال کے لحاظ سے اور نہ آخرت میں نتائج کے لحاظ سے۔

سچوں کی سچائی ظاہر ہوگی تو جھوٹوں کا جھوٹ بھی کھل جائے گا

۳۰۰ رضائے الٰہی کی اتباع کرنے والا اور اللہ کی ناراضگی لے کر لوٹنے والے مختلف درجات رکھتے ہیں اور ان کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ ثواب و عذاب میں اول و دوم کا بڑا تفاوت ہے گویا اس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ دنیا میں سچے انسان کی زندگی جھوٹے انسان سے اپنی ہر بات میں اس درجہ مختلف ہوتی ہے کہ ممکن ہی نہیں کسی طرح کا دھوکا ہو سکے۔ ایک بدکار آدمی بناوٹ سے اپنے آپ کو کتنا ہی نیک ظاہر کرے لیکن بناوٹ پھر بناوٹ ہے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کر بیٹھے گا کہ اصلیت آشکار ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن کریم نے دونوں کا تقابل بہت سے مقامات پر کر کے حقیقت کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو ان باتوں سے کچھ بھی سروکار نہیں؟ تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہوگئے اور وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔" (الزمر ۳۹ : ۲۲) ایک جگہ ارشاد ہے :

"کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد مچانے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقین کو ہم فاسقوں جیسا کر دیں؟" کیا ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف راستہ پر ہے اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کے برے اعمال اس کی نگاہ میں خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے چل رہا ہے۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ دونوں آدمی برابر ہو جائیں؟ وہ جو یہ بات جان گیا ہے کہ جو بات تجھ پر تیرے پروردگار کی جانب سے اتری ہے حق ہے اور وہ جو اندھا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ سمجھتے بوجھتے ہیں جو دانش مند ہیں (الرعد ۱۳ : ۱۹) "لیکن آج کل دانشمند ان ہی کو سمجھا جاتا ہے جو عقل سے کورے ہیں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتے پڑتے چلتا ہو وہ سیدھی راہ پر ہے یا وہ شخص جو سیدھا ہموار راستہ پر چلا جا رہا ہو۔" (الملک ۶۷ : ۲۲) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ جس

نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ مع اپنے مکین کے آتشیں دوزخ میں جا گری؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں سعادت کی راہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔" (التوبہ ۹ : ۱۰۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"پھر دیکھو جو لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اس کی طرف سے آگیا ہو یعنی قرآن کریم اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی پیشوائی کرتی ہوئی اور سرتاپا رحمت آچکی ہو۔ یہ لوگ اس پر ایمان رکھتے ہوں اور گروہوں میں سے جو کوئی اس کا منکر ہوا تو یقین کرو آگ ہی وہ ٹھکانہ ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔" (ھود ۱۱ : ۱۷) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"کیا جو لوگ برائیاں کر سکتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ ان سب کا مرنا جینا یکساں ہو جائے۔ کیا ہی برا حکم ہے جو وہ لگاتے ہیں۔" (الجاثیہ ۴۵ : ۲۱)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا ہم فرمانبرداروں کو اور نافرمانوں کو برابر کر دیں گے۔ تم کو کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟" (القلم ۶۸ : ۳۵، ۳۶)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"بھلا جو صاحب ایمان ہے تو کیا وہ اس جیسا ہے جو نافرمان ہے؟ نہیں مومن و فاسق برابر نہیں ہو سکتے۔" (السجدہ ۳۲ : ۱۸)

ایک جگہ فرمایا "جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے تو ان کیلئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں یہ مہمانی ان کے نیک اعمال کے بدلہ میں ہوگی اور جو لوگ نافرمان رہے ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔ وہ جب بھی اس میں سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اس میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی آگ کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔" (السجدہ ۳۲ : ۱۹، ۲۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا تم لوگوں نے یہ ٹھہرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے سبیل لگا دینی اور مسجد حرام کو آباد رکھنا اس درجہ کا کام ہے جیسا اس شخص کا کام جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔" (التوبہ ۹ : ۱۹)

مزید تفصیل کیلئے درج ذیل دی گئی سورتوں کی نشان کردہ آیات کا مطالعہ کرو۔

(۴ : ۹۵)، (۵۷ : ۹، ۱۰)، (۴۷ : ۱۵) (۵ : ۱۰۰)، (۴۱ : ۳۴)، (۴۰ : ۵۸)، (۳۹ : ۲۹)، (۳۰ : ۲۸)، (۱۶ : ۷۱)، (۵۹ : ۲۰)، (۳۹ : ۹)، (۶ : ۵۰)، (۱۳ : ۱۶)، ۳ : ۱۱۳)، (۳۵ : ۱۲)، (۳۵ : ۲۱)، (۳۵ : ۲۲، ۲۳)، (۱۰ : ۲۸)

تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۵ ملاحظہ کریں۔

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ

میں بھیج دیا جو انہی میں سے ہے۔ وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے' ہر طرح کی برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ وہ اس سے پہلے کھلی

رسول اللہ ﷺ رحمت عام بھی ہیں اور رحمت خاص بھی

۳۰۱ اس آیت کے پہلے جزء میں ارشاد ہے کہ "اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان ہے کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا۔" اس کے متعلق پہلی بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق نبی اعظم و آخر ﷺ تو رحمت للعالمین ہیں اس لئے پورے عالم کے لئے آپ ﷺ کا وجود نعمت کبریٰ ہے اور احسان عظیم ہے اس جگہ اس کو صرف مومنوں کیلئے احسان فرمانا اپنے اندر کیا حکمت رکھتا ہے؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح قرآن کریم کا سارے عالم کے لئے ہدایت ہونا تسلیم ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تصریح موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس کو "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" بھی فرمایا گیا ہے بالکل اسی طرح رسول اللہ ﷺ بلاشبہ رحمتہ للعالمین ہیں اور آپ ﷺ کا وجود اقدس سارے عالم اور مومن و کافر کیلئے نعمت کبریٰ ہے اور احسان عظیم ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی رسول اللہ ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت یعنی قرآن کریم سے مستفید کون ہوا؟ جس طرح قرآن کریم کی ہدایت سے فائدہ متقین نے حاصل کیا بالکل اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی نعمت عظمیٰ سے فائدہ صرف مومنین نے حاصل کیا اس لئے اس کو اس جگہ اس طرح بیان فرمایا گیا۔ دوسری بات رسول کریم ﷺ کو مومنین کیلئے یا پورے عالم کے لئے نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہونے کی تشریح ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آج کل انسان روحانیت کو بالکل فراموش کر چکا ہے اور مادہ پرستی نے اس کے اوسان بالکل خطا کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا حقیقت کے لحاظ سے بالکل صحیح ہوگا کہ آج کل انسان دنیا کے جانوروں میں سے ہوشیار ترین جانور تو تسلیم کیا جا سکتا ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے یہی وجہ ہوئی کہ آج بدقسمتی سے جن لوگوں نے اس احسان عظیم کو نعمت تسلیم کیا تھا انہوں نے بھی آہستہ آہستہ اس احسان عظیم یعنی قرآن کریم اور محمد رسول اللہ ﷺ کی نعمت عظمیٰ کو پیٹ کا دھندا بنا لیا۔

انسان کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی روح ہے اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر خالی ہوگیا۔ اس لئے اس کی کچھ تشریح کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ ہر اس انسان کو جو اپنے آپ کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتا

النصف

كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ

گمراہی میں مبتلا تھے ﴿۱۶۴﴾

جب اُحد میں تم پر مصیبت پڑی اور یہ مصیبت ایسی تھی کہ اس سے دوگنی مصیبت

ہے اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی حقیقت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں بلکہ حقیقتِ انسان وہ روح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے جب تک یہ روح اس کے بدن میں ہے اس وقت تک انسان کم از کم انسان کہلاتا ہے اس کے حقوق انسانیت قائم ہیں خواہ وہ کتنا ہی کمزور، ضعیف اور جاں بلب کیوں نہ ہو۔ لیکن جوں ہی یہ روح اس کے جسد عنصری سے پرواز کر گئی تو خواہ کتنا ہی قوی اور مضبوط کیوں نہ ہو اس کا کوئی حق خود اپنی جائیداد و اموال میں بھی باقی نہ رہا۔

انبیاء کرام دنیا میں تشریف لاتے رہے اور صرف اس لئے کہ وہ انسانی روح کی صحیح تربیت کر کے انسان کو حقیقی انسان بنائیں تاکہ اس سے جو افعال و اعمال صادر ہوں وہ انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دوسرے انسانوں کو ایذا اور تکلیف دیتا نہ پھرے اور خود اپنے انجام کو اچھی طرح سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے۔ بلاشبہ ہمارے نبی اعظم و آخر ﷺ کو جیسے زمرہ انبیاء میں امامت و سیادت کا منصب حاصل ہے انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے میں بھی آپ ﷺ کی شان تمام انبیاء کرام سے بہت ممتاز ہے آپ ﷺ نے مکی زندگی میں صرف اور صرف یہی کام افراد سازی کا انجام دیا اور مدنی زندگی میں ان ہی انسانوں کا ایک باقاعدہ معاشرہ تشکیل دے کر ان انسانوں کا مقام فرشتوں کی صفوں سے بھی بہت آگے تک لے گئے اور زمین و آسمان نے شاید اس سے پہلے کبھی ایسے انسان نہ دیکھے۔ ان میں ایک ایک ہمارے رسول مکرم ﷺ کا زندہ و جاوید معجزہ نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ مٹی کے ڈھانچے تھے اور روح کے الحاق سے یقیناً چلتے پھرتے بھی تھے لیکن آپ ﷺ نے نفخہ الٰہی ان میں پھونک کر ان کی روحوں کی اصلاح فرما دی اور یہی وہ نفخہ ہے جو پہلے انبیاء کرام میں پیدائش سے بھی پہلے ان میں پھونک دیا جاتا تھا اور اسی وجہ سے ہر نبی کفر کی موت مرے ہوؤں کو ایمانی زندگی اللہ کے حکم سے بخشتے رہے۔

نبی رحمت محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کے دروازہ کو بند کر دیا گیا اور آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات کو ابد الاباد کیلئے محفوظ کر دیا گیا یقیناً اب جو آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق اپنی اصلاح کر لے وہ صحیح معنوں میں انسان اور ایک سچا مسلمان بن جاتا ہے اور آپ ﷺ کی یہ تعلیمات اب بھی سارے عالم کیلئے ہیں اس لئے آپ ﷺ کا وجود پورے عالم کیلئے احسان عظیم ہے گو اس سے نفع وہی اٹھاتا ہے جو نفع اٹھانے کی صحیح سعی و کوشش کرتا ہے اور ان راہوں پر چلتا ہے جن پر چل کر انسان کو صحیح انسان بننے کی آپ ﷺ نے تعلیم دی۔

نبی کریم ﷺ کے رفع کے بعد کامِ نبوت کا جاری رہنا

۳۰۲ آیت کے اس حصہ میں نبی اعظم و آخر ﷺ کے کام کی مزید تشریح فرما دی گئی تاکہ آپ ﷺ کے رفع کے بعد بھی آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کو آسانی حاصل رہے گویا اس جگہ آپ ﷺ کی بعثت کے تین مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا آیات کریمات کی تلاوت دوسرا تزکیہ نفس اور تیسرا کتاب و حکمت کی تعلیم۔

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک چیز اللہ کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے اس طرح نبوت کے سارے کام جن کو معجزات بھی کہا جا سکتا ہے اور پیشین گوئیاں بھی آیات ہیں جو انبیاء کرامؑ سے ظاہر ہوئے یا انبیاء کرام نے ان کو بیان کیا کیونکہ وہ بھی ان کی سچائی کی دلیل تھے۔ قرآن کریم کے الگ الگ جملوں کو بھی آیت کہا جاتا ہے اس لئے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک مستقل دلیل و برہان کی ہے جس سے اللہ کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

یہ واضح ہو چکا کہ رسول اللہ ﷺ ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن کریم سنانے کیلئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سفیر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے اور لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک حقیقی کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتے تھے اس لئے "آیات" کے اس لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ کا دین تحکم اور جبر پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

دوسرا مقصد تزکیہ بتایا ہے اور لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے ایک پاک و صاف کرنے پر دوسرے نشوونما دینے پر اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں جو چیز مخالف و مزاحم زواید و مفاسد سے پاک ہوگی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ نبی کریم ﷺ نے نفوس انسانی کا جو تزکیہ کیا ہے اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک و صاف بھی کرتے اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشوونما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و تحمل کا طالب ہے۔ یہی انسانیت کی آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر انسانیت کی صحیح معنوں میں تکمیل ہو جاتی ہے۔ تزکیہ ہوگا تو کتاب و حکمت کی تعلیم موثر ہوگی اور کتاب و حکمت کی تعلیم ہوگی تو تزکیہ آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کو آگے پیچھے بھی بیان کیا گیا ہے ملاحظہ ہو تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۲۹۔

مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ

تمہارے ہاتھوں بدر میں تمہارے دشمنوں پر پڑ چکی تھی تو تم بول اٹھے کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آپڑی؟ اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو یہ مصیبت خود تمہارے ہی ہاتھوں

تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم تلاوت سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ تلاوت آیات تو یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ اللہ نے مجھ پر یہ وحی نازل کی ہے تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت' محبت اور توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لئے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے۔ اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کئے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیئے جائیں پھر مزید یہ کہ لوگوں کی ذہنی تربیت کیلئے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبیر کی صلاحیت و کتاب الٰہی پر غور و خوض کرنے کی استعداد پوری طرح پیدا ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزاء ہیں اور ہر شخص جس نے نبی ﷺ کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کیلئے تعلیم کتاب کے لئے یہ سارے طریقے اختیار فرمائے پھر اس تعلیم کے ساتھ اس جگہ دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک کتاب کا دوسرا حکمت کا۔ کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہے اور لفظ حکمت کیا ہے؟

سو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی تعریف میں ارشاد ہوا "وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ" یعنی ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلہ معاملات کی صلاحیت یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اس وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت و صلاحیت کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور پھر شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ (مفردات القرآن)

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن کریم ہی سے ماخذ و مستنبط ہو اس لئے حکمت سے مراد حدیث لیا گیا ہے اور

عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَاۤ اَصَابَكُمْ

آئی۔ یاد رکھو اللہ کے اندازہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ ۱۶۵ (۳۰۳)

اور یہ جو دو گروہوں کے مقابلے کے دن تمہیں پیش آیا یعنی میدان احد میں تو اللہ

حدیث نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو کہا جاتا ہے۔

احد کی مصیبت ہم پر کہاں سے پڑی؟ جواب ملتا ہے کہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے

۳۰۳ جماعتی زندگی میں کمزور و قوی دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یقیناً اس وقت بھی تھے۔ جنگ احد میں جب ہوا کا رخ بدلا تو ان کو تعجب ہوا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ نتائج اعمال کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؟ کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آپڑی ہے؟ یہ سراسر تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے سپرد قومی کام ہوتے ہیں اگر وہ کوئی کوتاہی کریں تو خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے بالکل اسی طرح جیسے جسم کے کسی حصہ کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے یا بے چین ہو جاتا ہے کبھی اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تکلیف تو انگلی میں ہے تم بے چین کیوں ہو؟ اس طرح ایک گھر میں سے کسی فرد کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو پورے گھر میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ تکلیف تمہارے ایک فرد کو ہے تم بے چین کیوں ہو؟

آخر جماعت میں سے جب کچھ لوگوں کو ایک جگہ متعین کیا گیا تھا وہ وہاں نہ رہے اور ان کی کوتاہی سے پوری جماعت اس کوتاہی کا شکار کیوں نہ ہوتی؟ پھر یہی نہیں تم اس سے اپنی اس تکلیف کو مداوا کر لو کہ اب جو تم کو تکلیف احد کے میدان میں پہنچی ہے اس سے قبل تمہارے ہاتھوں کفار کے لشکر کو اس سے دوگنی پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے لوگوں سے کچھ ایسی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی جس کا نتیجہ انہوں نے بھگتا اس بار تمہارے آدمیوں سے کوتاہی ہوئی تو آخر تم اس کے نتیجہ سے کیوں دوچار نہ ہوتے؟ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم سے کوتاہی نہ ہونی چاہئے اس لئے کہ تم مسلمان ہو اس کا مطلب تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اگر مسلمان ہو جائیں تو پھر کوتاہیوں پر کوتاہیاں کرتے رہیں لیکن ہماری کوتاہیوں کا نتیجہ ہی بدل دیا جائے۔

اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج قوم مسلم اس غلطی کا شکار ہے کہ اپنی کوتاہیوں سے باز نہیں آتے اور پھر جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن ان کو کون سمجھائے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں جماعتی زندگی میں جماعتی لوگوں سے کوتاہی ہو جائے تو اس کا نتیجہ رسول اللہ ﷺ کو بھی بھگتنا پڑے تو تم اور ہم کون ہیں؟ میدان احد میں آپ ﷺ کا دانت شہید ہوا۔ پیشانی زخمی ہوئی۔ آپ ﷺ کے قتل ہو جانے کی خبریں گرم ہوئیں تو کیا آپ ﷺ کو

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ

ہی کے حکم سے[۳۰۴] پیش آیا یعنی اس کے قانون کے مطابق پیش آیا اور اس لئے پیش آیا تا کہ ظاہر ہو جائے کہ ایمان رکھنے والے کون ہیں۔؟ ۱۶۶

اس کی تکلیف نہ ہوئی؟ آپ ﷺ اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوئے؟ ضرور ہوئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ قوم مسلم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اعمال کے ساتھ ان کا نتیجہ بندھا ہوا ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم عمل صحیح نہ کرو اور صحیح نتیجہ کی امید رکھو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے یہ بالکل نہیں کہا کہ جب تم پر گولیاں برس رہی ہوں تو تم ہاتھ مت چلاؤ بلکہ زبان سے اللہ اللہ کرتے رہو گولی تم پر نہیں آئے گی۔ وہ تو بار بار یہ کہتا ہے کہ اپنی پوری طاقت صرف کرو' کسی طرح کی کوتاہی نہ کرو جو وسائل تمہارے پاس ہیں سارے کے سارے اپنے دفاع میں لگا دو اگر دشمن تمہارے لئے بندوق تیار کر رہا ہے تو تم بم بناؤ وہ بندوق سے گولی چلاتا ہے تو تم اس پر بم پھینکو اور اس کے ساتھ ہی اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ یہ طاقت تم کو اس نے عطا کی ہے جس سے تم نے اپنے دشمن کیلئے بم تیار کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اللہ کی کتاب کا یہ سبق یاد نہ رہا اور پڑھانے والے ہم کو کچھ اور ہی پڑھا رہے ہیں۔

اَنّٰى هٰذَا؟ کہنے والوں کو اللہ کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے؟ سن لو اور اچھی طرح یاد رکھو۔ ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر اسلام! ان کو جواب دو کہ "هُوَ مِنْ اَنْفُسِكُمْ" یہ مصیبت خود تمہارے اپنی ہی ہاتھوں سے آئی ہے۔ لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ کوتاہی تم نے کی اور اب تم ہی یہ پوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟ تم کو یہ سبق کس نے بھلا دیا کہ "اللہ نے ہر ایک چیز کے لئے قانون مقرر کر دیا ہوا ہے اور ایسا بندھن باندھ دیا ہے جو کہیں خطا نہیں کرتا۔ جو ہونا تھا ہو گیا اب اس سے سبق حاصل کرو اور آئندہ ایسی کوتاہی مت کرو۔ گزرے ہوئے وقت پر صرف پچھتاوا کچھ کام نہیں دیتا اس لئے کہ گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آیا۔ وقت جس تیزی سے گزر رہا ہے تم اس سے دو بار تیز ہو جاؤ اور اس کو پکڑ لو اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم اپنی جمعیت اکٹھی کرو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ہمت صرف کر کے وسائل جمع کرو اور پھر اگر میدان کار زار گرم ہو جائے تو اپنے سارے جوہر دکھانے کیلئے پہلے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ میدان میں اترو اور مخالفین کو تہ تیغ کر دو اور تمہارا کمانڈر جس جس ذمہ داری پر تم کو لگاتا ہے پوری دیانت و امانت کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش کرو پھر دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس آزمائش سے سبق حاصل کرو اور زمانہ کو دکھا دو کہ ہم ایک زندہ و جاوید قوم ہیں۔ آج تم پر مذاق کرنے والے یقیناً کل ہی ششدر و حیران رہ جائیں گے اور وہی زبانیں جو آج تمہارا مذاق اڑا رہی ہیں کل تمہاری شجاعت کے گیت گائیں گی اور اس سے تمہارا وہ زخم بھی

یقیناً مندمل ہو جائے گا۔

میدان احد میں جو کچھ تم کو پیش آیا وہ باذن اللہ تھا

۳۰۴ دونوں جماعتوں کی مڈ بھیڑ کے روز جو نقصان تم کو پہنچا کہ تم دشمنوں کے مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تم میں سے کچھ شہید ہوئے اور بعض زخمی ہوئے۔ تم میں سے کچھ کے قدم ایسے اکھڑے کہ وہ دوبارہ اپنے لشکر کے ساتھ مل ہی نہ سکے۔ تم میں سے بعض نے عقیدہ کی کمزوری بھی دکھائی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے تھا۔ اس کی مشیت کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ اس کی حکمت اس کی مقتضی تھی۔ جو کچھ ہوا وہ تمہاری کوتاہی کا نتیجہ تھا تاہم اس سارے نقصان میں تمہارے لئے کچھ فوائد بھی مخفی تھے وہ یہ کہ تم میں ثابت قدم غیر متزلزل ایمان والے صابر بندے بھی تم کو معلوم ہوگئے اور کمزور و ضعیف بھی بالکل واضح ہوگئے۔ اور منافقین کا حال بھی تم پر کھل گیا۔ گویا اس مصیبت کی چھلنی نے چھانٹ چھانٹ کر ہر قسم کو الگ الگ کر دیا۔ تم کو وقت مل گیا کہ کمزور اپنی کمزوری کو دور کر لیں اور منافقین سے تم کبھی دوستی اختیار نہ کرو اس لئے کہ وہ بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں اور اندر سے پکے کافر ہیں۔ ان کی پالیسی ہمیشہ دوہری رہی ہے اور دوہری ہی رہے گی یہ اللہ کے نہیں بلکہ اپنی خواہش کے بندے ہیں۔ پھر ان کی خواہش جس طرف سے بھی پوری ہوتی نظر آئے گی یہ اس طرف ہوں گے۔ یہ ہمیشہ بھاری پلڑے کے ساتھی ہیں۔

نبی اعظم و آخر ﷺ نے منافق کی چار علامتیں اپنی امت کو بتائی ہیں جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں بعض پائی جائیں وہ اس قدر منافق ہوگا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی اس طرح ہے :

اذا اتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر "جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب عہد کرتا ہے تو بے وفائی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے تو ناحق کی طرف جاتا ہے۔"

وہ لوگ جو منہ سے ایک بات کہتے ہیں مگر اس کے مطابق عمل نہیں کرتے ان میں نفاق کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے گویا وہ اس طرح ایک چوتھائی منافق ہو جاتے ہیں اور یہی نفاق بڑھتے بڑھتے ایک روز ان کو پکا منافق بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس عادت سے بچنے کی سختی سے تاکید کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○ (الصف ۶۱ : ۳) "اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔"

بات واضح ہوگئی کہ ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہئے جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے اور جو کرنے کی نیت نہ ہو یا کرنے کی ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں۔ پھر ایسا

لِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ

اور ظاہر ہو جائے کہ منافق کون ہیں؟ ۳۰۵ جب ان سے کہا گیا کہ آؤ یا تو اللہ کی راہ میں

کیوں کہ ایک شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔

ایک بار پھر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "میدان احد میں جو کچھ تم کو پیش آیا تو وہ "باذن اللہ" ہی تھا۔ کیا اللہ ایسا پسند کرتا تھا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اللہ نے ہر عمل کے ساتھ اس کا نتیجہ لگا دیا ہے۔ جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اس کا نتیجہ اور اس کو "اذن اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو قانون بنا دیا ہے وہ کبھی اس کے خلاف نہیں کرتا اس لئے تمہاری عملی کوتاہی کا نتیجہ بھی ظاہر ہونا تھا کیونکہ یہ قانون خداوندی ہے۔ اس سے تم کو یہی سبق حاصل کرنا چاہئے کہ آئندہ پھر کبھی ایسی کوتاہی نہ کرنا۔ یہ بات اس لئے عرض کرنا پڑی کہ اس "باذن اللہ" کا مفہوم ذہن نشین ہو جائے تاکہ دوسری جگہوں پر جب لفظ آئے تو کوئی نئی الجھن پیدا نہ ہو جائے اس کی مزید تفصیل دیکھنا ہو تو اس جلد کا حاشیہ ۱۱۷ ملاحظہ فرمائیں۔

ہر نقصان سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس طرح اس نقصان کا بھی تم کو فائدہ ہوا

۳۰۵ میدان احد میں تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے اور تقریباً اتنے ہی زخمی اور ہزیمت و پریشانی اس پر زائد تھی یہ بہت بڑا نقصان ہے لیکن اس کا ایک فائدہ بھی تم کو ہوا کہ مومن و منافق کی پہچان ہو گئی اور کمزور ایمان والوں کا بھی پتہ چل گیا۔ منافق کیا ہے؟ اس کی پہچان نبی کریم ﷺ کے الفاظ میں پچھلے حاشیہ میں کرا دی گئی ہے اور قرآن کریم کے الفاظ سے اتنا مزید سمجھا جا سکتا ہے کہ :

نَافَقُوْا جس کا اصل ن ف ق ہے اور نفق کے معنی ہیں گزر گیا اور ختم ہوا۔ اس لئے یہی مادہ ن ف ق خرچ کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اسی سے نفق ہے جس کے معنی جاری راستہ یعنی ایسا راستہ جو دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ اس لئے سرنگ کو جو پہاڑ کی ایک طرف سے دوسری طرف نکل جائے یا زمین کے اندر سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل جائے نَفَقًا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے کہ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ (الانعام ۶ : ۳۵) "اگر تم سے ہو سکے تو زمین کے اندر کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو" اس لحاظ سے نفاق کا مطلب یہ ہوا الدخول فی الشرع من باب والخروج عنه من باب (راغب)

یعنی ایک دروازہ سے شریعت میں داخل ہونا اور دوسرے دروازہ سے نکل جانا۔ اب سمجھ میں آگیا کہ منافق کیا ہے؟ یعنی وہ شخص جو بظاہر ایمان لاتا ہے اور لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ کر داخل ہوتا ہے اور پھر عملی نافرمانی کر کے اسلام سے نکل جاتا ہے گویا وہ جس دروازے سے داخل ہوتا ہے اسی دروازہ سے نہیں

بلکہ دوسرے دروازہ سے نکل جاتا ہے اور اندر سے کافر کا کافر ہی رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حالت کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○ (المنافقون ۶۳ : ۱) "اے پیغمبر اسلام! جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں! اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔" کیوں؟ اس لئے کہ جو بات وہ زبان سے کہہ رہے ہیں وہ تو بجائے خود سچی ہے لیکن چونکہ ان کا عمل وہ نہیں ہے جسے وہ زبان سے ظاہر کر رہے ہیں اس لئے وہ اپنے اس قول میں جھوٹے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کے رسول ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ شہادت دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے ایک وہ اصل بات جس کی شہادت دی جائے دوسرے اس بات کے متعلق شہادت دینے والے کا اپنا عمل۔ اب اگر بات بجائے خود بھی سچی ہو اور شہادت دینے والے کا اپنے عمل بھی وہی ہو جس کو وہ زبان سے بیان کر رہا ہے تو ہر لحاظ سے وہ سچا ہوگا اور اگر بات اپنی جگہ جھوٹی ہو لیکن شہادت دینے والا اس کو حق سمجھتا ہو تو ہم ایک لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کیونکہ وہ اس کو حق بیان کرنے میں صادق ہے اور دوسرے لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کیونکہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ بات بجائے خود غلط ہے۔ مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں لیکن ایک آدمی ان کو پانچ کہتا ہے۔ اس سے کوئی پوچھے گا کہ تم نے کہا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں وہ کہے کہ ہاں میں نے کہا ہے تو یہ بات اس نے سچ کہی ہے لیکن چونکہ دو اور دو فی الواقعہ چار ہوتے ہیں اس لئے اس پہلو سے اب بھی اس کی بات جھوٹی ہے۔

اس کے برعکس اگر بات اپنی جگہ سچی ہو لیکن شہادت دینے والے کا اپنے عمل اس کے خلاف ہو تو اس لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کہ وہ صحیح بات کی شہادت دے رہا ہے اور اس لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کہ اس کا اپنا عمل وہ نہیں ہے جس کا وہ زبان سے اقرار کر رہا ہے اور آدھے سچے اور آدھے جھوٹے کو نہ سچا کہیں گے یعنی مومن اور نہ جھوٹا کہیں گے یعنی کافر بلکہ اس کا نام شریعت نے منافق رکھا ہے اور اس کی یہ دوہری پوزیشن اس کے لئے بلحاظ آخرت "نفع مند نہیں ہوگی بلکہ ہر لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

عبداللہ بن ابی سردار المنافقین کا مختصر حال

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کے وقت کے منافقین کے سردار کا مختصر حال بیان کر دیا جائے تاکہ اس کے قول، فعل اور اس کی شخصیت سے واقفیت حاصل ہو جائے اور اس طرح اپنے زمانے کے بڑے بڑے منافقین کو پہچاننے میں آسانی ہو اور اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر ان کی اصلاح کی توفیق حاصل ہو جائے اور اس طرح اپنا تجزیہ کرنے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ دوسروں کے وعظوں اور درسوں

سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

ابن اسحاق نے کہا مجھ سے عاصم بن عمر بن قتادہ نے جس طرح بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے باشندوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول العوفی تھا جو بنی العوف کی شاخ بن الحبلیٰ میں سے تھا۔ (ابن ہشام جلد اول ص ۶۳۲)

جب اسلام کا چرچا مدینے میں پہنچا اور ان دونوں قبیلوں یعنی اوس و خزرج کے با اثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہوگئے اور بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد جب نبی اعظم و آخر ﷺ مدینہ پہنچے تو انصار کے ہر گھر میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن ابی بے بس ہوگیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ان بہت سے حامیوں کے ساتھ جن میں دونوں قبیلوں کے شیوخ اور سردار شامل تھے داخل اسلام ہوگیا۔ حالانکہ دل ان سب کے جل رہے تھے اور خاص طور پر ابن ابی کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعہ کو جب رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرمانے کیلئے بیٹھتے تو عبداللہ بن ابی اٹھ کر کہتا کہ "حضرات یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت و شرف بخشا ہے لہٰذا آپ ان کی تائید کریں۔" (ابن ہشام) دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور محض مسلمانوں پر یہ بات کھلتی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ ﷺ اور گروہ اہل ایمان سے سخت بغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابن ابی نے آپ ﷺ کے ساتھ بدتمیزی کی آپ ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! اس شخص کے ساتھ نرمی برتیئے۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کیلئے تاج شاہی تیار کر رہے تھے۔ اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے (ابن ہشام ج ۲) جنگ بدر کے بعد جب یہود بنی قینقاع کی صریح بد عہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ ﷺ نے ان پر چڑھائی کی تو یہ شخص ان کی حمایت پر اٹھ کھڑا ہوا اور حضور نبی کریم ﷺ کی زرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ "یہ سات سو مردان جنگی جو ہر دشمن کے مقابلہ میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں آج ایک دن میں آپ ﷺ انہیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم میں آپ ﷺ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ ﷺ میرے حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔"

جنگ احد پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدان جنگ سے الٹا واپس آگیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے

مقابلہ میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کیلئے نکلے تھے۔ ان ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور نبی کریم ﷺ کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لئے گئے جو منافقت میں اس کے شریک کار تھے۔ اسی بناء پر جنگ احد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور وہ شخص نبی کریم ﷺ کے خطبہ سے پہلے حسب معمول تقریر کرنے کیلئے اٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔" مدینے میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ علانیہ اس شخص کی تذلیل کی گئی جس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں سے کودتا ہوا مسجد سے باہر نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصار نے اس سے کہا کہ "یہ کیا حرکت کر رہے ہو واپس چلو اور رسول اللہ ﷺ سے استغفار کی درخواست کرو۔" لیکن اس نے بگڑ کر جواب دیا "میں ان سے کوئی استغفار کرانا نہیں چاہتا۔" (ابن ہشام ج۳)

۴ ہجری میں غزوہ بنی النضیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہؓ ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو ہم تمہارے ساتھ ہیں تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود فاش کر دیا جیسا کہ اس کا ذکر سورہ حشر میں کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی اور اس کے ساتھیوں کی اتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود نبی رحمت ﷺ اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے' کیوں؟ اس لئے کہ منافقین کا ایک بڑا جتھا اس کے ساتھ تھا اور اوس و خزرج کے بہت بڑے بڑے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ غزوہ احد میں اس کی ساری اصلیت واضح ہوگئی تھی۔ اس حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے ان دشمنوں سے بھی جنگ مول لی جاتی۔ اس بنا پر اس کی منافقت کا حال جاننے کے باوجود نبی اعظم و آخر ﷺ ایک مدت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے نہ ہمت کہ علانیہ کافر بن کر اہل ایمان سے لڑتے یا کسی کے ساتھ کھلم کھلا مل کر میدان میں نکل آتے اس لئے کہ منافقت صفت لوگوں کے اختیار کا یہ معاملہ ہی نہیں ہوتا جس طرح وہ ان کیلئے مخلص نہیں تھے بالکل اس طرح وہ دوسری طرف کے بھی مخلص نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر آپ غور کریں گے تو ان لوگوں کی کمی ہر زمانہ میں نہیں پائیں گے اگر وہ اس وقت موجود تھے تو آج بھی بکثرت موجود ہیں اور ہر پارٹی اور گروہ میں پائے جاتے ہیں۔

بظاہر وہ ایک جتھا بنائے ہوئے تھے لیکن ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ حشر میں بیان فرما دیا ہے۔ اس لئے وہ مسلمان بنے رہنے میں اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں

آتے نمازیں پڑھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے اور زبان سے وہ لمبے چوڑے دعوے بھی کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو بھی کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کیلئے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہی ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے اور فتنہ پردازی کے ان مواقع سے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے جو اس برادی میں شامل رہ کر انہیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین کو غزوہ بنی المصطلق کی مہم میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے بیک وقت دو ایسے فتنے اٹھائے جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے مگر قرآن کریم کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے اہل ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اس کی بدولت ان دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہوگیا اور یہ منافقین الٹے خود ہی رسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورہ نور میں کیا گیا اور دوسرے فتنے کا ذکر سورہ منافقون میں ہے اس کی کارستانیوں کو سمجھنے کیلئے اس کا مختصر ذکر اس جگہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا تفصیل اپنے موقع پر آئے گی اس واقعہ کو بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ، عبدالرزاق، ابن جریر، طبری اور ابن سعد وغیرہ نے بیان کیا ہے اور ان روایات کا خلاصہ یہ ہے

بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکر اسلام اس بستی میں ٹھہرا ہوا تھا جو "مریسیع" نامی کنوئیں پر آباد تھی کہ یکایک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہوگیا ان میں سے ایک کا نام جہجاہ بن مسعود غفاری تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ملازم تھے اور ان کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے اور دوسرے صاحب سنان بن دبر الجہنی تھے جو قبیلہ خزرج کے ایک قبیلہ کے حلیف تھے۔ زبانی ترش روئی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جہجاہ نے سنان کے ایک لات رسید کر دی جسے اپنی قدیم عینی روایات کی بناء پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے اس پر سنان نے انصار کو مدد کیلئے پکارا اور جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابن ابی نے اس جھگڑے کی خبر سنتے ہی اوس اور خزرج کے لوگوں کو بھڑکایا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ ادھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی اور اس جگہ انصار اور مہاجرین آپس میں لڑ جاتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اسے شکست دے کر ابھی اس کے علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن یہ شور سن کر رسول اللہ نکل آئے اور آپ ﷺ نے فرمایا "یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟ تم لوگ کہاں اور جاہلیت کی پکار کہاں؟ اسے چھوڑ دو یہ بڑی گندی چیز ہے۔ آپ ﷺ کے الفاظ یہ تھے انها منتنة اس پر دونوں طرف کے صالح لوگ اٹھے اور معاملہ کو رفع دفع کرا دیا اور سنان نے جہجاہ جو معاف کر دیا۔

لیکن جن لوگوں کے دلوں میں نفاق تھا وہ عبداللہ بن ابی کے پاس اکٹھے ہوئے اور انہوں نے جمع ہو کر

اس سے کہا کہ "اب تک تو تم سے امیدیں تھیں اور تم بھی مدافعت کر رہے تھے مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلہ میں ان کنگلوں کے مددگار بن گئے ہو۔" ابن ابی پہلے ہی کھول رہا تھا ان باتوں سے اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا کہنے لگا یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی۔ ان پر اپنے مال تقسیم کئے یہاں تک کہ اب وہ پھل پھول کر خود ہمارے حریف بن گئے۔ ہماری اور ان قریش کے کنگلوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اپنے کتے کو کھلا کر موٹا کر تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔" تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں' خدا کی قسم مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔"

اس تھوڑی سی عبارت میں آج اپنے ملک پاکستان کی ساری سیاست کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں انصار' مہاجرین اور ان دونوں فریقوں کے حامی و ناصر اور پھر ان کی نیت ان کا کام ان کی تدبیریں' ان کی تدبیروں کا انجام سب کچھ سمجھا جا سکتا ہے لیکن سمجھانے والا بھی کوئی ہو؟ سمجھنے والے بھی کوئی جذبہ اسلامی رکھتے ہوں؟ وہ اپنی جہالت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار بھی تو ہوں؟ عبداللہ بن ابی کا کردار ادا کرنے والے تو شہ ہی دے سکتے ہیں کیونکہ وہ خود نہ ادھر کے ہیں اور نہ ادھر کے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اے اللہ اس ملک کے باسیوں کو بھی سمجھ کی توفیق عطا فرما۔

اس مجلس میں اتفاق سے حضرت زید بن ارقم بھی موجود تھے جو اس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے انہوں نے یہ باتیں سن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے جا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے جو کچھ سنا تھا من و عن دہرا دیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا شاید تم ابن ابی سے ناراض ہو۔ ممکن ہے تم سے سننے میں غلط ہوئی ہو' ممکن ہے کہ تم کو شبہ ہو گیا ہو کہ ابن ابی یہ کہہ رہا ہے جب کہ اس نے کہا نہ ہو مگر زید نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے یہ باتیں عبداللہ بن ابی کو کرتے سنا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے ابن ابی کو بلا کر پوچھا تو وہ بالکل صاف صاف انکار کر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار نے بھی کہا کہ یارسول اللہ! اس لڑکے کی بات ہے شاید اسے وہم ہو گیا ہو اور اس طرح قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زید کی بھی گوشمالی کی کہ تم نے یہ کیا کیا؟ وہ بچارے سہم کر بیٹھ گئے لیکن نبی کریم ﷺ زید کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن ابی کو بھی۔ ان فقرات میں بھی بڑے اسباق مخفی ہیں' لیکن کن کے لئے جن کو اللہ نے سمجھ دی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو انہوں نے آکر عرض کیا یارسول اللہ! "مجھے اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن اڑا دوں اگر مجھے حکم دینا مناسب نہ ہو تو انصار کے سردار معاذ بن جبل' عبادہ بن بشر' سعد بن معاذ' محمد بن مسلمہ جیسے لوگوں میں سے کسی کو حکم دے دیں کہ وہ اسے قتل کر دیں۔" مگر آپ ﷺ نے فرمایا ایسا کرنا

درست نہیں لوگ کہیں گے کہ محمد نے اپنے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ازیں بعد آپ ﷺ نے فوراً اس جگہ سے کوچ کا حکم دے دیا۔ راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اسید بن حضیر آپ ﷺ سے ملے اور عرض کیا یارسول اللہ! آج آپ ﷺ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لئے موزوں نہ تھا اور آپ ﷺ تو کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ تم نے سنا نہیں کہ تمہارے ان صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟ انہوں نے پوچھا کون صاحب؟ فرمایا عبداللہ بن ابی۔ انہوں نے پوچھا کہ اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔" انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! عزت والے تو آپ ﷺ ہیں اور ذلیل وہ ہے آپ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں۔"

اس طرح چلتے چلتے یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں عبداللہ بن ابی کے خلاف سخت غصہ پھیل گیا۔ لوگوں نے کہا! جا کر رسول اللہ ﷺ سے معافی مانگ لو مگر اس نے ترخ کر جواب دیا کہ "تم نے کہا ان پر ایمان لاؤ' میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمد کو سجدہ کروں؟" ان باتوں سے انصار کی ناراضی اور بڑھ گئی ایک مومن جو سچے دل سے ایمان لایا ہو وہ اپنے رسول کے متعلق ایسی بات سن کر کیسے برداشت کرے گا۔ جب یہ قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن ابی کو اس کے اپنے ہی صاحبزادے نے جن کا نام نامی بھی عبداللہ ہی تھا باپ کے سامنے کھڑے ہو کر روک دیا اور باپ سے کہا "آپ نے کہا تھا کہ مدینہ واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا اب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ ذلیل اور عزت اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنین کیلئے ہے۔ خدا کی قسم آپ مدینے میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ ﷺ آپ کو اجازت نہ دیں۔"

اس پر ابن ابی چیخ اٹھا "خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔ لوگوں نے یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دی اور آپ ﷺ نے فرمایا "عبداللہ سے کہو کہ اپنے باپ کو گھر آنے دے۔" عبداللہ نے کہا "آپ ﷺ کا حکم ہے تو آپ داخل ہو سکتے ہیں۔" اس وقت نبی اعظم و آخر ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "کیوں عمر! اب تمہارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اس کے قتل کرنے کی اجازت دیجئے اس وقت اگر تم نے اسے قتل کر دیا ہوتا تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑکنے لگتیں۔ آج میں اسے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

مختصر یہ کہ عبداللہ بن ابی اپنی طبعی موت مرا۔ کسی نے اس کو قتل نہیں کیا لیکن ساری زندگی وہ اپنے دل ہی دل میں کڑھتا رہا لیکن اس کا داؤ کبھی کامیاب نہ ہوا۔ اس میں ہماری زندگی کے کتنے سبق پوشیدہ ہیں؟ ہر سوچنے والے اور سمجھنے والے کو معلوم ہو سکتے ہیں؟ ہم نے ان اسباق سے کہاں تک فائدہ حاصل کیا ہے اور کہاں کہاں ہمارے قدم ڈگمگائے ہیں کتنی بار ہم سنبھلے ہیں اور کتنی بار ہم ان حالات سے زندگی میں شکست کھا چکے ہیں؟

اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ
لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ
مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ الَّذِيْنَ

جنگ کرو یا شہر میں رہ کر دشمنوں کا حملہ روکو۔ تو کہنے لگے اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑائی ضرور ہوگی تو ہم تمہارا ساتھ دیتے۔[۳۰۶] یقین کرو جس وقت انہوں نے یہ بات کہی تو وہ کفر سے زیادہ نزدیک تھے بمقابلہ ایمان کے۔ یہ لوگ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو فی الحقیقت ان کے دلوں میں نہیں ہے[۳۰۷] اور جو کچھ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں۔[۳۰۸] ۱۶۷

شاطر و چالاک اتنے ہیں کہ سوال سننے سے پہلے جواب تیار رکھتے ہیں

۳۰۶ "جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو" یعنی میدان جنگ کی طرف نکلو اگر جنگ ہوگئی تو جہاد کا ثواب حاصل ہوگا اور اگر دشمن ہماری جمعیت سے مرعوب ہو کر واپس ہوگیا تو دفاع کا مقصد پورا ہو جائے گا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس موقع پر لڑائی ہی نہیں ہوگی اور پھر لڑائی ہو بھی کیسے سکتی ہے ابھی کل میدان بدر میں جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے کیا اتنی جلدی وہ اس کو بھول جائیں گے۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا یہ تو ان کی گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ضرور ہم تمہارے ساتھ جاتے۔ یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب عبداللہ بن ابی بن سلول نے تین سو آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ میدان احد کی طرف چلنے سے انکار کرتے ہوئے واپس مدینہ کو چلنے کا قصد کیا اور انجام کار اپنے ساتھیوں سمیت واپس ہوگیا۔

ان کی زبانوں پر وہ آتا ہے جس سے دل انکار کرتے ہیں

۳۰۷ "یقین کرو جس وقت انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ "اگر ہمیں یقین ہوتا کہ لڑائی ضرور ہوگی تو ہم تمہارا ساتھ دیتے" تو اس وقت وہ کفر سے زیادہ نزدیک تھے بمقابلہ ایمان کے۔ اس لئے کہ انہوں نے زبان سے وہ بات کہی جو ان کے دل میں نہیں تھی اور جو کچھ ان کے دل میں چھپا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب اچھی طرح واقف ہے اس لئے کہ وہ اس ضمیر کو بھی جانتا ہے جس سے انہوں نے جنم لیا اور یہ بھی جانتا

قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو اپنے گھروں میں بیٹھ رہے لیکن اب اپنے بھائیوں کے حق میں کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات پر چلے ہوتے تو کبھی نہ مارے جاتے۔ ۳۰۶

ہے کہ منافقت تو ان کو گھٹی میں پلائی گئی ہے وہ ان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑ سکتی اس لئے کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانا ہی نہیں چاہتے۔

اللہ ہی وہ ذات ہے جو دلوں میں پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے

۳۰۸ "جو کچھ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔" جزاء و سزا کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے بندہ سے نہیں اور یہ جو کچھ پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں وہ بندوں سے پوشیدہ رکھ سکتے ہیں اللہ سے نہیں۔ اگر یہ لوگوں سے وہ بات پوشیدہ رکھنے میں کامیاب بھی ہوگئے تو کیا لوگوں کے ہاتھوں میں جزاء و سزا ہے؟ کہ وہ سزا پانے کی بجائے جزاء حاصل کرلیں گے۔ نہیں بلکہ ان کی یہ چرب زبانی انہی کے حق میں بری ثابت ہوگی کہ ان کو کبھی توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوگی اور جس بات کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے اس کو بھی یقیناً ظاہر کر دیا جائے گا لیکن اس کا جو وقت متعین ہے اس سے پہلے نہیں اس لئے کہ اللہ کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہونا ممکن نہیں۔

اب تم ان سخن سازوں کے دل کا حال سن لو کہ وہ کیا ہے؟

۳۰۹ اللہ تعالیٰ نے اب ان کے دلوں کا حال کھول دیا اور ان کا عمل اس کی تصدیق کرتا ہوا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور بعد میں آنے والوں نے اپنے کانوں سے سن لیا۔ فرمایا کہ یہ خود تو سخن سازی کر کے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن ان کے جو بھائی بند جہاد میں شریک ہو کر شہید ہوگئے ان کی بابت انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ ہوتے۔ مثل ہے کہ "دروغ گورا حافظہ بنا شد" اور اس کو یوں بھی کہتے ہیں کہ "جھوٹ کے پاؤں کہاں" مطلب یہ ہے کہ اصل چیز جو ان کے لئے مانع ہوئی وہ تو ہے "موت کا خوف" لیکن انہوں نے بات یہ بنائی کہ "وہ اس لئے نہیں اٹھ رہے ہیں کہ جنگ ونگ کچھ نہیں ہوگی۔" اسی کو کہتے ہیں کہ "آپ اپنے جال میں صیاد پھنس گیا" دیکھو جس چیز کو وہ اپنے دلوں کے اندر بند کئے ہوئے تھے کس صفائی سے ظاہر ہوگئی۔

فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ ❀ وَلَا

اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو اچھا! اگر تم واقعی سچے ہو تو جب موت تمہارے سرہانے آکھڑی ہو تو اسے نکال باہر کرنا اور بالکل نہ مرنا۔ ۱۶۸

اچھا اگر موت کے ڈر نے تم کو جہاد سے باز رکھا ہے تو اب بالکل نہ مرنا

۳۱۰ زندگی اور موت کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ کون ہے جو اس دنیا میں اپنی مرضی سے آیا اور کون ہے جو یہاں سے اپنی مرضی سے جاتا ہے؟ حقیقت تو یہی ہے کہ نہ کوئی مرضی سے آیا اور نہ ہی مرضی سے جاتا ہے۔ بلکہ وہی ذات "خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" جو لانے والا ہے اپنے قانون کے مطابق لاتا ہے اور اپنے قانون کے مطابق مقررہ وقت پر لے جاتا ہے۔ آنے والے کی خواہش؟ کہ میں کبھی نہ جاؤں۔ کسی کی یہ خواہش پوری بھی ہوئی؟ کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی اس کا امکان ہے۔ جب تک یہ نظام قائم ہے اس طرح چلتا رہے گا۔ کب تک؟ جب تک اس کے چلانے والے نے اس کا چلتا رہنا مقرر کر دیا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ "اے پیغمبر اسلام! تم ان سے کہہ دو کہ اچھا اگر تم موت و زندگی کے مواقع سے ایسے ہی باخبر ہو جیسے تم کہہ رہے ہو کہ "ہماری بات پر چلتے تو کبھی نہ مارے جاتے۔" تو اب تم اپنے آپ کو موت سے بچائے رکھنا اور کبھی نہ مرنا۔ قرآن کریم نے اس طرح چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہر بات کو سمجھانے کی کوشش کی تاکہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آتی جائے لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے ایک عرصہ سے قرآن کریم ہی کے ساتھ مداہنت برت رکھی ہے حالانکہ یہ کافروں' منافقوں اور فاسقوں کا شیوہ تھا سچے مسلمانوں کا نہیں۔ مداہنت کیا ہے؟ جواب قرآن کریم سے سن لو ارشاد فرمایا:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ○ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ○ (الواقعہ ۵۶ : ۸۰ تا ۸۲)

"یہ قرآن رب العلمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ بے اعتنائی برتتے ہو اور اس نعمت میں تم نے اپنے حصہ یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو۔"

مُدْهِنُوْنَ۔ ادھان کے معنی ہیں کسی چیز سے بے اعتنائی برتنا' اس کو کچھ اہمیت نہ دینا' اس کو سنجیدہ توجہ کے قابل ہی نہ سمجھنا۔ مخالفین نے قرآن کریم کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ اور اس نعمت عظمیٰ کو کیوں جھٹلایا؟

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں "رِزْقٌ" معاش کے معنی میں ہے۔ چونکہ کفار قریش جو مخاطبین اول تھے قرآن کریم کی دعوت کو اپنے معاشی مفاد کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ یہ دعوت اگر

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ

اور اے پیغمبر اسلام! جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کی نسبت ایسا خیال نہ کرنا کہ وہ مر گئے، نہیں وہ اللہ کے قانون کے مطابق زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔[۳۱۱] ۱۶۹

اللہ نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ انہیں عطا فرمایا ہے اس سے خوشحال ہیں اور

کامیاب ہوگئی تو ہمارا رزق مارا جائے گا اس لئے اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ تم نے اس قرآن کی تکذیب کو اپنے پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے۔ تمہارے نزدیک حق اور باطل کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل اہمیت تمہاری نگاہ میں روٹی کی ہے اور اس کی خاطر حق کی مخالفت کرنے اور باطل کا سہارا لینے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہے۔ یہ تو کفار قریش کا حال تھا اس لئے کہ وہ قرآن کریم کے معنی بہرحال سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے روٹی کی خاطر قرآن کو نہ مانا اور ہمارے عوام اور ملاؤں کی اکثریت چونکہ قرآن کریم کے معنی نہیں سمجھتی اس لئے انہوں نے روٹی کمانے کی خاطر قرآن کو مانا اور اس کو روٹی کا ایک ذریعہ بنایا۔ اس طرح قرآن کریم اتارنے کے اصل مقصد سے بے اعتنائی برتی گئی اور یہی مداہنت ہے۔

شہید کبھی مرتا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں زندہ ہو جاتا ہے

۳۱۱ یہ گویا منافقین کو تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ سمجھ رہے ہو نہیں۔ نہیں وہ مردہ نہیں بلکہ مردہ تو دراصل تم ہو وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے جوار رحمت میں اس کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ تم اپنی جہالت اور بے بصیرتی سے ترس کھا رہے ہو کہ وہ مار دیئے گئے اور خیال کر رہے ہو بلکہ پکار پکار کر کہہ رہے ہو کہ اگر وہ تمہاری رائے پر چلتے اور تمہاری ہی طرح گھروں میں بیٹھ رہتے تو پھر وہ مارے نہ جاتے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس فضل و نعمت پر فرحاں و شاداں ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نواز رکھا ہے۔ شہداء کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ جواب ملتا ہے "وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" کہ تم ان کی زندگی کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس سے دنیا کی زندگی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ہے آخرت کی کامیاب و کامران زندگی۔ جس کے بعد موت نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آخرت کی کوئی چیز دنیاوی زندگی میں مشاہدہ نہیں کی جا سکتی۔

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک تو زندگی اس دنیا کی زندگی کا نام ہے جو آدمی مرا یا مار دیا گیا بس وہ ختم ہوگیا۔ لیکن ایک مومن اور ایمان بالاخرۃ رکھنے والے کے نزدیک یہ دنیاوی زندگی چند روزہ اور فانی زندگی ہے۔ اصل زندگی کا آغاز جو ابدی زندگی ہے اس کے نزدیک اس وقت سے ہوتا ہے جب یہ زندگی ختم ہوتی ہے۔ یہ زندگی عالم برزخ اور پھر عالم آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ پھر جہاں تک موت کے بعد کی زندگی کا تعلق ہے یہ حاصل تو مومن و کافر سب ہی کو ہوتی ہے لیکن کفار کی زندگی چونکہ کلفت اور عذاب کی ہوتی ہے اس لئے وہ قابل ذکر نہیں لیکن اہل ایمان برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے سرور و شاد کام ہوتے ہیں بالخصوص ان میں سے جو لوگ راہ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی برزخی زندگی کی کامرانیوں کا تو اس ناسوتی زندگی میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہ اپنے مقدس خون شہادت سے اس دنیا کی کشت حق کو جو سیرابی اور زندگی بخشتے ہیں اس کے انعامات ان کو عالم برزخ ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ

"حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہیں۔ عرش کی قندیلیں ان کے لئے ہیں۔ ساری جنت میں جہاں کہیں چاہیں جائیں، کھائیں اور پیئں اور ان قندیلوں میں آرام کریں۔ ان کی طرف ان کے رب نے ایک مرتبہ نظر کی اور دریافت فرمایا کچھ چاہتے ہو؟ کہنے لگے اے رب العزت اور کیا مانگیں ساری جنت میں سے جہاں کہیں چاہیں کھائیں پیئں اختیار ہے پھر کیا طلب کریں؟ اللہ تعالیٰ نے ان سے پھر یہی پوچھا تیسری مرتبہ پھر یہی سوال کیا جب انہوں نے دیکھا کہ بغیر کچھ مانگے چارہ نہیں تو کہنے لگے اے رب! ہم چاہتے ہیں کہ تو ہماری روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے پھر ہم دنیا میں جا کر تیری راہ میں جہاد کریں اور مارے جائیں۔ اب یہ بات واضح ہوگئی کہ انہیں کسی اور چیز کی طلب نہیں جو آخرت کی زندگی سے تعلق رکھتی ہو یعنی اخروی انعامات میں سے جو کچھ چاہتے ہین ان کو ملتا ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ مرجائیں اور اللہ کے ہاں بہتری پائیں وہ ہرگز دنیا میں آنا پسند نہیں کرتے مگر شہید کہ وہ تمنا ہی یہ کرتا ہے کہ دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے اور دوبارہ فی سبیل اللہ شہید ہو۔ کیونکہ شہادت کے درجات کو وہ دیکھ چکا ہوتا ہے۔" (صحیح مسلم، مسند احمد)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے جابر! تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے تمہارے والد کو جب عالم برزخ میں زندہ کیا اور اس سے کہا اے میرے بندے مانگ تو کیا مانگتا ہے؟ تو اس نے کہا اے اللہ! مجھے دنیا میں ایک بار پھر بھیج تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تو میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ کوئی یہاں سے دوبارہ لوٹایا نہیں جائے گا۔" اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ کو نہیں بدلتا اگر اس میں کوئی گنجائش ہوتی تو خود ہی سوال کرکے کہ مانگو جو

کچھ مانگتے ہو پھر جب بندہ مانگے تو اس کو یہ جواب چہ من دارد؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے اس نے جو فیصلے اپنی ذات سے' اپنی قدرت سے پورے علم کے ساتھ کئے ہیں وہ جانتا ہے کہ بندہ کیا طلب کرے گا لیکن پھر پوچھتا ہے کیوں؟ اس لئے تاکہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بدلا نہیں کرتے نہ وہ خود بدلتا ہے نہ ہی وہ کسی کو بدلنے دیتا ہے اور یہی دراصل اس کے قادر مطلق ہونے کی دلیل ہے۔ فیصلوں کو ہمیشہ کمزور بدلتے ہیں یا ان سے بدلوا لئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی کمزوری سے پاک ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ یہ جو داستانیں بنائی گئی ہیں کہ فلاں نے نظر کی تو اس کو زندہ کر دیا فلاں نے بارہ سال کے بعد ڈوبی بیڑی کو تار دیا اور اس کے سواروں کو دوبارہ زندہ کر دیا اور ولی اللہ جب وفات پاتے ہیں تو ان کو کئی کئی جسم عطا کر دیئے جاتے ہیں اور وہ دنیا میں جہاں چاہیں پھرتے رہتے ہیں اور اپنے مریدین کی مرادیں بر لاتے ہیں اور ان کی حاجات کو پورا کرتے رہتے ہیں سب کی سب من گھڑت اور بناوٹی ہیں اور یہ جو کچھ خوابات میں دیکھا جاتا ہے سب خیالی اجسام ہوتے ہیں ان کو حقیقت پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور ترغیب و ترہیب کیلئے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ سب شبہی اور مثالی باتیں ہیں۔ حقیقت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ولی اللہ' شہدا اور صالحین اگر اصل حقیقت میں فی الواقع آسکتے ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ان شہداء سے ایسا کیوں فرماتے۔ غور کرو کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ بڑھ کر بھی کوئی سچا ہو سکتا ہے؟ حاشا للہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسا تصور کرنے والا دائرہ اسلام اور حدود اللہ کو پھلانگ جاتا ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی اکثریت نے دین اسلام کو کیا سمجھا؟ ان دو رکعت کے اماموں اور پیشواؤں نے دین کو کیا بنا دیا؟

قرآن کریم نے بہت سی جگہ خود اس کی نفی فرمائی ہے کہ اس دار فانی سے رخصت ہو جانے والے کتنی اپیلیں بھی کرتے رہیں ان کی ایک نہیں سنی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ کسی کو اس دنیا میں بھیجا جائے گا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّآ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ (المومنون ۲۳ : ۹۹، ۱۰۰)

"جب ان میں سے کسی کے سرہانے موت آکھڑی ہوگی تو اس وقت کہنے لگے گا اے اللہ! مجھے پھر دنیوی زندگی میں لوٹا دے کہ زندگی کے جو مواقع میں نے کھو دیئے ہیں شاید ان میں نیک کام کر لوں۔ ارشاد ہوگا ہرگز نہیں۔ یہ محض ایک کہنے کی بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اب ایسا ہونے والا نہیں ان لوگوں کے مرے پیچھے ایک آڑ ہے جو اس دن تک رہے گی کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

"کاش تم اس وقت کی حالت کو دیکھتے جب یہ آتش دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ یہ اس وقت کہیں گے۔ اے کاش! ایسا ہو کہ ہم پھر دنیا میں ایک بار لوٹا دیئے جائیں اور اپنے پروردگار کی آیتیں نہ جھٹلائیں اور ان میں سے ہو جائیں جو ایمان والے ہیں۔" (الانعام ۶ : ۲۷، ۲۸)

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اس دن ظلم کرنے والے کہیں گے اے پروردگار! تھوڑی سی مدت کیلئے ہمیں مہلت دے دے ہم تیری پکار کا جواب دیں گے اور پیغمبروں کی پیروی کریں گے۔ لیکن ان کو جواب دیا جائے گا کہ کیا تم وہی نہیں ہو کہ اب سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہمیں کسی طرح کا زوال نہ ہوگا؟ تم انہی لوگوں کی بستیوں میں بسے تھے جنہوں نے اپنی جانوں کے ساتھ نا انصافی کی تھی اور تم پر اچھی طرح واضح ہوگیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ نیز تمہیں سمجھانے کیلئے طرح طرح کی مثالیں بھی ہم نے بیان کر دیں پھر تم سرکشی سے باز نہ آئے۔ ان لوگوں نے اپنی ساری تدبیریں کر ڈالی تھیں اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیں مگر اللہ کے پاس ان کی ساری تدبیروں کا جواب تھا۔ پس ایسا خیال مت کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے جو وعدہ کر چکا ہے کبھی اس کے خلاف کرے گا۔ ایسا ہونا ممکن نہیں وہ غالب ہے اور اعمال بد کی سزا دینے والا ہے۔" (الاعراف ۷ : ۵۳) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"وہ کہیں گے اے ہمارے رب! دراصل ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہمارا گروہ گمراہوں کا گروہ تھا۔ اب ہمیں اس حالت سے نکال دے۔ اگر ہم پھر ایسی گمراہی میں پڑیں تو بلاشبہ نافرمان ہوئے۔ اللہ فرمائے گا جہنم میں جاؤ اور زبان مت کھولو۔ ہمارے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا اے اللہ! ہم ایمان لے آئے پس ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تجھ سے بہتر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔ لیکن تم نے انہیں اپنے تمسخر کا مشغلہ بنا لیا تھا یہاں تک کہ اس مشغلہ نے ہماری یاد بھی بھلا دی تھی۔ تم ان لوگوں کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے آج دیکھو ہم نے انہیں ان کے صبر کا بدلہ دے دیا وہی ہیں جو فیروز مند ہوئے۔" (ابراہیم ۱۴ : ۴۴' ۴۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"وہ کہیں گے اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں۔" (الشعراء ۲۶ : ۱۰۰' ۱۰۲)

یہ جو فرمایا کہ وہ کہیں گے "ہمارا کوئی سفارشی نہیں ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں ہم دنیا میں سفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا پار ہے۔ ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کرنے کیلئے زبان کھولنے والا نہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟" (الشوریٰ ۴۲ : ۴۴)

یعنی آج جب پلٹ آنے کا موقع ہے یہ پلٹنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کل جب فیصلہ ہو چکے گا اور سزا کا حکم نافذ ہو جائے گا اس وقت اپنی شامت دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اب انہیں پلٹنے کا موقع ملے۔

فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ
خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے ہیں یعنی دنیا میں' اور ابھی ان سے ملے نہیں ان کے لئے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لئے کسی طرح کا کھٹکا ہوگا نہ کسی طرح کی غم گینی[۳۱۲] ہوگی۔ ۱۷۰

وہ اللہ کی نعمت اور عطیوں سے مسرور ہیں نیز اس بات سے بھی کہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ ایمان والوں کا اجر کبھی اکارت نہیں[۳۱۳] کرتا۔ ۱۷۱

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"وہ عذاب دیکھ کر کہے گا کاش! مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔ اس کو جواب ملے گا ایسا نہیں۔ میری آیات تیرے پاس آچکی تھیں پھر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔" (الزمر ۳۹ : ۹۵)

شہداء کو اللہ تعالیٰ نے جو انعامات دیئے ہیں وہ ان کو حاصل کر کے بہت خوش ہیں

۳۱۲ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تمہارے بھائی اُحد والے اُحد والے روز شہید کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ڈال دیں جو جنتی درختوں کے پھل کھاتی ہیں اور جنتی نہروں سے پانی پیتی ہیں اور عرش کے سائے تلے وہاں لٹکتی ہوئی قندیلوں میں آرام و راحت حاصل کر رہی ہیں۔ جب کھانے پینے' رہنے سہنے کی یہ بہترین نعمتیں انہیں ملیں تو کہنے لگے کہ کاش کہ ہمارے بھائیوں کو جو دنیا میں ہیں ہماری ان نعمتوں کی خبر مل جاتی تاکہ وہ جہاد سے منہ نہ پھیریں اور راہ خدا کی لڑائیوں سے تھک کر نہ بیٹھ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا ہے بے فکر رہو میں یہ خبر ان تک پہنچا دیتا ہوں اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اس آیت میں فرمایا کہ "جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے ہیں یعنی دنیا میں اور ابھی ان سے ملے نہیں ان کے لئے خوش ہو رہے ہیں۔" یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن کریم میں یہ حقیقت مختلف اسلوبوں سے واضح کی گئی

ہے کہ عالی مقام اہل ایمان کے ساتھ جنت میں ان کی ذریت اور ان کے اسلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہو گا اگرچہ یہ لوگ اپنے عمل کے لحاظ سے ان کے درجے کے نہ ہوں گے۔ گویا یہ شہداء اور صدیقین پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہو گا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کیلئے ان کی باایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور ان کو انعامات سے نوازا جائے گا۔ قرآن کریم میں بہت جگہ پر اس کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ ○ وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۹۴، ۹۵) "پس جس کسی نے نیک کام کئے اور وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی کوشش اکارت جانے والی نہیں ہم اس کی نیکیاں لکھ لینے والے ہیں اور دیکھو جس آبادی کے لئے ہم نے ہلاکت ٹھہرا دی تو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کبھی لوٹنے والے ہوں۔"

ایک جگہ ارشاد ہے :

"جس کسی نے اچھا کام کیا خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو یاد رکھو ہم ضرور اسے اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں بھی ضرور اسے اجر دیں گے۔ انہوں نے جیسے جیسے اچھے کام کئے ہیں اس کے مطابق ہمارا اجر بھی ہو گا۔" (النحل ۱۶ : ۹۷)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ہاں! جو کوئی باز آیا' ایمان لایا اور نیک عمل میں لگ گیا تو بلاشبہ ایسے لوگوں کیلئے کوئی کھٹکا نہیں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے حقوق میں ذرا بھی ناانصافی نہ ہو گی۔ ہمیشگی کی جنت' جس کا اپنے بندوں سے خدائے رحمٰن کا وعدہ ہے اور وہ وعدہ ایک غیبی بات کا ہے۔ یقیناً اس کا وعدہ ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آگئی۔ اس زندگی میں کوئی ناشائستہ بات ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔ جو کچھ وہ سنیں گے سلامتی ہی سلامتی کی صدا ہو گی وہاں صبح و شام ان کا رزق ان کیلئے برابر مہیا رہے گا۔ سو دیکھو یہ جنت ہے جس کا ہم اسے وارث کر دیتے ہیں جو ہمارے بندوں میں متقی ہوتا ہے۔" (مریم ۱۹ : ۶۰، ۶۳) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"یہ لوگ ہیں جن کے لئے ہمیشگی کے باغ ہیں اور باغوں کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ سونے کے کنگن پہنے ہوئے سبز ریشم کے باریک اور دبیز کپڑوں میں آراستہ مسندوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے! تو کیا ہی اچھا ان کا ثواب ہوا اور کیا ہی اچھی انہوں نے جگہ پائی۔" (الکھف ۱۸ : ۳۱) مزید تفصیل کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷ ملاحظہ کریں۔

ان کو مشاہدہ ہو چکا ہے کہ اللہ ایمان والوں کا اجر کبھی اکارت نہیں کرتا

۳۱۳ مثل ہے کہ "شنیدہ کے بود دیدہ" کہ سننے والا دیکھنے والے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ شہداء نے ان انعامات کو ملاحظہ کر لیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آخرت میں رکھے ہیں۔ اس لئے اس طرح ارشاد

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۲﴾ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا یعنی جہاد کے لئے تیار ہوگئے باوجودیکہ احد میں زخم کھا چکے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً ان کے لئے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ ۳۱۴ ۱۷۲

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تمہارے ساتھ جنگ

فرمایا کہ "وہ اللہ کی نعمت اور عطیوں سے مسرور ہیں نیز اس بات سے بھی کہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ ایمان والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔" اور اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بہت ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے :

"اور جو لوگ کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے ہوئے ہیں اور نماز میں سرگرم ہیں تو ہم بھی سنوارنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔" (الاعراف ۷ : ۷۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی برائیوں سے بچتا ہے اور مصیبتوں میں ثابت قدم رہتا ہے تو اللہ نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔" (یوسف ۱۲ : ۹۰) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اس لئے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو مصیبت بھی پیش آتی ہے وہ ان کے لئے ایک نیک عمل شمار کی جاتی ہے۔ ہر پیاس جو وہ جھیلتے ہیں۔ ہر محنت جو وہ اٹھاتے ہیں۔ ہر مخمصہ جس میں وہ پڑتے ہیں۔ ہر وہ قدم جو وہاں چلتا ہے۔ جہاں چلنا کافروں کے لئے غیظ و غضب کا باعث ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو وہ دشمنوں سے پاتے ہیں یہ سب کچھ ان کے لئے نیک عمل ثابت کرتا ہے اور اللہ نیک کرداروں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔" (التوبہ ۹ : ۱۱۹)

رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہنے والے ہی متقی ہیں

۳۱۴ پچھلی آیت میں جو اصولی بات بیان فرمائی گئی تھی اس آیت میں اس کا ایک متعین محمل بھی سامنے آگیا یعنی اس اجر عظیم کے مستحق وہ لوگ ٹھہریں گے جن کے عزم و ایمان کا حال یہ ہے کہ احد کی مصیبت کا زخم کھانے کے بعد بھی ان میں کوئی خم نہیں پیدا ہوا بلکہ وہ اس کٹھیالی سے گزر کر کندن بن گئے اس لئے جوں ہی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے ایک تازہ مہم کی منادی ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ احد میں مسلمانوں کو ایک طرح کی آزمائش میں مبتلا کرنے کے بعد قریش

کی فوج پہلے تو واپس چلی گئی لیکن روحاء کے مقام پر پہنچنے کے بعد ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ انہوں نے اس قدر جلد واپس ہونے میں سخت غلطی کی۔ یہ سوچ کہ انہوں نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی اور ادھر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کیلئے منافقین کے ذریعے سے یہ افواہ گرم کر دی کہ قریش نئے سازوسامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے ہی والے ہیں۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کو جب اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے بھی قریش کے دوبارہ تعاقب کیلئے پروانہ جاری فرما دیا۔ مسلمانوں نے بڑے جوش و جذبہ سے اس آواز پر لبیک کہا اور گزشتہ حالات کی ذرا پرواہ نہیں کی۔ اس فوج میں صرف انہی لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو پہلے احد کی جنگ میں شریک ہوئے تھے اس طرح نبی کریم ﷺ ان جاں نثاروں کی اس جماعت کے ساتھ ابوسفیان کے تعاقب کیلئے مدینہ سے نکلے اور حمراء الاسد تک گئے یہ مقام مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ ابھی مسلمانوں کے حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا تو اس نے ارادہ بدل دیا اور مکہ کی طرف اپنے لشکر سمیت بھاگ گیا اور مسلمان کامیاب و بامراد واپس آگئے اور یہ معاملہ ان کے پچھلے زخموں کا کافی حد تک مداوا کر گیا۔

محمد بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب ہفتہ کے دن ۱۵/ تاریخ کو احد سے لوٹے تو دشمن کے لوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا اس لئے خزرج اور اوس کے سرداروں نے مل کر رسول اللہ ﷺ کے دروازہ پر پہرہ دیا جب رات گزر گئی اور اتوار کے دن کی فجر آئی تو بلال رضی اللہ عنہ نے صلوٰۃ الفجر کے لئے اذان پکاری اور نبی کریم ﷺ کا انتظار کرنے لگے۔ آپ ﷺ حجرہ سے تشریف لائے تو ایک مزنی شخص نے اطلاع دی کہ مشرکین جب روحاء پر پہنچے اور وہاں پڑاؤ کیا تو ابوسفیان نے کہا مدینہ کو لوٹ چلو اور روز روز کی یہ خرخش ختم کر کے واپس چلو۔ صفوان بن امیہ نے انکار کر دیا اور کہنے لگا لوگو! ایسا نہ کرو وہ لوگ شکست کھا چکے ہیں اب مجھے اندیشہ ہے کہ خزرج کے جو لوگ رہ گئے تھے وہ تمہارے خلاف جمع ہو جائیں گے اگر لوٹ کر جاؤ گے تو یہ برائے نام فتح بھی شکست میں بدل جائے گی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صفوان سیدھے راستہ پر تو نہیں ہے مگر یہ رائے اس کی بالکل صحیح تھی۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ان لوگوں پر برسنے کے لئے تو پتھر نامزد کر دیئے گئے تھے اگر وہ لوٹ پڑتے تو گزرے ہوئے دن کی طرح گئے گزرے ہو جاتے یعنی ان کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور یہ خبر ان کو بتائی دونوں نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ! دشمنوں کا تعاقب کیجئے اس مشورہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ منادی کر دو کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کا تعاقب کرنے کا تم کو حکم دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ آج وہی لوگ نکلیں جو کل کی لڑائی میں حاضر تھے۔

اسید بن حضیر جن کو احد میں بھی زخم لگے تھے اس ندا کو سن کر بولے بسر و چشم ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر حاضر ہیں۔ خاندان بنی سلمہ کے چالیس زخمی نکل کھڑے ہوئے۔ طفیل بن نعمان رضی اللہ عنہ کے تیرہ

النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ
إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾ ۞ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ

کرنے کے لئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ اکٹھا کر لیا ہے۔ پس چاہئے کہ ان سے ڈرتے رہو یعنی مقابلے کے لئے باہر نہ نکلو لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا وہ بے دھڑک بول اٹھے ہمارے لئے اللہ کا سہارا کافی ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔ ۳۱۶ ۱۷۳

پھر یہ لوگ بے خوف ہو کر نکلے اور اللہ کی نعمت اور فضل سے شاد کام واپس آ گئے

زخم لگے تھے۔ خراش بن صمہ رضی اللہ عنہ کو دس۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو دس سے کچھ زیادہ اور عطیہ بن عامر کو بھی نو زخم لگے ہوئے تھے غرض مسلمانوں نے اپنے زخموں کے علاج کی طرف توجہ ہی نہ کی اور دوڑ کر اسلحہ سنبھال لئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ساتھیوں کے ہمراہ مدینے سے نکل کر حمراء الاسد تک پہنچے تھے لیکن ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر مکہ روانہ ہو گیا تھا۔ اس موقعہ پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے تیس اونٹ سواری کے لئے دیئے تھے اور کچھ جانور ذبح کرنے کے لئے بھی ساتھ رکھے تھے اس جگہ پہنچ کر سوموار کے دن ۱۷ تاریخ کو اور منگل کے روز ۱۸ تاریخ کو اونٹ ذبح کئے گئے اور دو دن یہاں قیام کیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ دن کو لکڑیاں اکٹھی کرو چنانچہ لکڑیاں اکٹھی کی گئیں شام ہوئی تو آگ جلانے کا حکم دیا پھر حسب الحکم ہر شخص نے آگ روشن کی اور کل پانچ سو جگہوں پر روشن کی گئی تاکہ دور سے دیکھ کر کفار کو مسلمانوں کی کثرت معلوم ہو اور یہ بات جنگی تدبیرات سے متعلق ہے۔

منافقین نے شرارتاً مجاہدین کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید رواں دواں ہو گئے

۳۱۵ منافقین نے اس خبر کو خوب گرم کیا اور مسلمانوں سے جو ابھی ابھی احد سے مدینہ پہنچے تھے اور زخموں سے چور تھے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "تمہارے ساتھ جنگ کرنے کیلئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ اکٹھا کر لیا ہے پس چاہئے کہ ان سے ڈرو۔" یہ خبر بجائے اس کے کہ ان کے اندر کسی طرح کا کوئی خوف و ہراس پیدا کرتی ان کی ایمانی قوت نے اس کو دوبالا کر دیا۔ "رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور"

فطرت ہے کہ جس کنوئیں کے سوتے زور دار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اسی طرح آگ اگر قوت کے ساتھ جل رہی ہو تو گیلی لکڑی بھی

اس میں ڈالنے سے اس کو مزید بھڑکانے کا سبب بن جاتی ہے منافقین کے اس جملہ نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا جو بات ان عزم و ایمان کے پہاڑوں کو کمزور کرنے کے لئے کہی گئی تھی اس نے ان کی جولانیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس آزمائش سے ان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا اور یہ امتحان ہی ان کے اچھے رزلٹ کا سبب بن گیا۔ دراصل ایمانی قوت شے ہی ایسی ہے کہ اس کو جتنا دبایا جائے یہ اتنا ہی زیادہ ابھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو اللہ کی راہ میں موت کو دنیاوی زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی ایسے نازک موقعہ پر جب منافقین ان کے حوصلوں کو پست کرنے میں مصروف تھے وہی بات جو انہوں نے ان کے حوصلوں کو پست کرنے کے لئے کہی تھی ان کی ایمانی قوت کو اور بڑھانے کا سبب بن گئی۔

اس کا ایک منظر آپ پیچھے سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ میں پڑھ چکے ہیں جب طالوت کے لشکر کے کمزور دلوں نے کمزوری کا مظاہرہ کیا تھا اور ایمانی طاقت و قوت والے "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ" کہنے والوں کا جواب دے رہے تھے کہ "كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○ اور بالکل یہی صورت بدر کے میدان میں مسلمانوں کو پیش آچکی تھی۔ بلاشبہ اللہ ہی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ڈٹ کر مقابلہ کرنا جانتے ہیں اور وہ میدان جنگ میں مرنا موت نہیں بلکہ زندگی سمجھتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ دارفانی سے دارالبقاء کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور ان کا یہ رفع آسمان صرف ان کے لئے نہیں بلکہ ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی انعامات الٰہی کا مشاہدہ کرنے کا باعث ہوتا ہے اور اس طرح وہ کھجوریں پھینک کر میدان جنگ میں اتر آتے ہیں کہ اب جنت کے انگور کھانے کا وقت ہے دنیا کی کھجوریں کھانے کا نہیں۔

مجاہدین کی صدا کیا ہے؟ "جس کا کارساز اللہ ہو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔"

---

۳۱۶ منافقین کی صدا کیا تھی؟ "کہ تمہارے ساتھ جنگ کرنے کیلئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ اکٹھا کر لیا ہے پس چاہئے کہ ان سے ڈرتے رہو۔" اس "فاخشوهم" کے جملہ نے مجاہدین اسلام کے جسموں میں بجلی کی گویا کرنٹ چھوڑ دی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سچے مسلمان کفار سے ڈریں۔ نہیں نہیں مسلمان تو کہتے ہی اس کو ہیں جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے اس لئے کہ ان کو سبق ہی پڑھایا جاتا ہے کہ "فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ" (المائدہ ۵ : ۴۴) انسانوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔ اس لئے انہوں نے دو ٹوک جواب منافقین کو دیا کہ "ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔"

منافقین نے مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے جو الفاظ بولے تھے مسلمانوں کے حوصلے ان الفاظ سے ایسے بڑھے کہ زبان الٰہی نے اس کی شہادت اس طرح دی "فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا" مسلمانوں کا ایمان ان الفاظ نے بڑھا دیا اور اس طرح جو شوشہ انہوں نے مسلمانوں کو پست کرنے کے لئے چھوڑا تھا وہ مسلمانوں کے لئے شجاعت و

مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ

کوئی گزند انہیں نہ پہنچا۔ وہ اللہ کی خوشنودیوں میں گامزن ہوئے تھے اور اللہ بڑا فضل رکھنے والا ہے۔[۳۱۷] ۱۷۴

یہ ایک مخبر جو تمہیں بہکانا چاہتا تھا یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان[۳۱۸] تھا جو تمہیں

بہادری کا سبب بن گیا اور جب ایمانی قوت بڑھ گئی تو ان کی زبانوں سے جو کچھ نکلا وہ یہ تھا کہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ" انہوں نے کہا "ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔" کیوں؟ اس لئے کہ وہ "نِعْمَ الْوَكِيْلُ" بہت اچھا وکیل ہے۔ وکیل کیا ہے؟ وہی جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے۔ ہمیں اللہ اس لئے کافی ہے کہ ہم نے اپنا سارا معاملہ اس کے سپرد کر دیا ہے۔ یعنی "ہمارا کارساز اللہ ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔" سبحان اللہ۔ یہی وہ جملہ ہے یعنی حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب وہ لوگوں کی بیسیوں میل سے بھی چوڑی سلگائی ہوئی آگ میں ڈالے گئے تھے۔ پھر اللہ نے کیا کیا کہ اس آگ کو آگ نہ رہنے دیا بلکہ ابراہیم علیہ السلام کیلئے اس کو سلامتی ہی سلامتی بنا دیا اور یہ جملہ ان مجاہدین کی زبانوں پر آیا تو اس نے منافقین کی سلگائی ہوئی آگ پر پانی پھیر دیا۔ (بخاری و مسلم عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم پر کوئی بہت بڑا کام آپڑے تو تم "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" پڑھو اور اس کام میں لگ جاؤ۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں کسی طرح فارغ ہو کر آرام رہوں جبکہ صاحب صور نے صور منہ میں لے رکھا ہے اور پیشانی جھکائے حکم الٰہی کا منتظر کھڑا ہے۔ صحابہ کرامؓ یہ سن کر ڈر گئے اور پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ جب وہ وقت آئے کہ صور پھونکا جائے تو ہم کو کیا کرنا چاہئے فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا پڑھو۔ (مسند احمد) ماحصل آپ ﷺ کے کلام کا یہ ہوا کہ موت ہر وقت انسان کا پیچھا کئے ہوئے ہے کب آمنا سامنا ہو جائے کسی کو معلوم نہیں لیکن جب وہ وقت آجائے تو اس وقت زبان سے یہ الفاظ ادا کرو اور بے خطر رفع آسمانی کی اس منزل کو رواں دواں ہو جاؤ اور فکر نہ کرو اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔"

جب کہنا اور کرنا ایک جیسا ہو جائے تو اللہ کا فضل ہو جاتا ہے

۳۱۷ ان مجاہدین اسلام کی زبانوں پر "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" کا ورد تھا اور ہاتھوں میں اسلحہ تھامے میدان جنگ کی طرف رواں دواں تھے وہ سروں پر کفن باندھے بے دھڑک نکلے تھے اس طرح جب ان

کا کہنا اور کرنا ایک ہوگیا تو اللہ نے ان پر بیک وقت تین انعامات عطا فرما دیئے۔ پہلا انعام یہ ہوا کہ کافروں کے قلوب میں ایسا رعب اور اتنی ہیبت ڈال دی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے جس کی وجہ سے اس دفعہ قتل و قتال کی نوبت ہی نہ آئی اور اس انعام کو اللہ تعالیٰ نے خود ایک نعمت فرمایا ہے "پھر یہ لوگ بے خوف ہو کر نکلے اور اللہ کی "نعمت" سے شاد کام واپس آگئے کوئی گزند ان کو نہ پہنچی۔" دوسرا انعام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان مجاہدین نے حمر الاسد کے بازار میں تجارت کا مال خریدا اور اس مال سے اللہ نے ان کو مالا مال ہی کر دیا۔ ان کی اس تجارت سے ان کو اتنا نفع ہوا کہ اس کو خود اللہ تعالیٰ نے "فضل" قرار دیا۔ لیکن اس "فضل" سے مال تجارت کا نفع اس صورت مراد لیا جا سکتا ہے جب اس تیاری سے بدر صغریٰ کی تیاری مراد لی جائے کیونکہ مال تجارت کی خرید و فروخت کا معاملہ بدر صغریٰ میں ہوا تھا۔ اگر حمر الاسود مراد ہے تو پھر اس "فضل" سے مراد یقیناً وہ ثواب ہے جو مجاہدین کو جہاد پر نکلنے کا ہوا اگرچہ جنگ اس موقعہ پر نہیں ہوئی تھی اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا "فضل" ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اور فضل ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اور پھر خصوصاً کوئی دکھ نہیں پہنچا نہ زخمی ہونے کا' نہ قتل ہونے کا اور نہ لوٹے جانے کا۔ اس لئے کہ معرکہ کارزار گرم ہی نہیں ہوا اور وہ بخیر و خوبی دشمنوں پر رعب و دبدبہ ڈال کر واپس آگئے۔ تیسرا انعام جو پہلے دونوں انعامات سے بھی بڑھ کر ہے وہ ہے "وَاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ" یعنی رضائے الٰہی کا حصول جو اس جہاد میں ان غازیوں کو خاص طور پر حاصل ہوا۔

مکی لشکر کی دوبارہ چڑھائی کی خبر دینے والا کون تھا؟ شیطان

۳۱۸ یہ افواہ کس نے پھیلائی کہ ابوسفیان اپنے لشکر کو دوبارہ تیار کر کے مدینہ پر بس ٹوٹ پڑنے والا ہے؟ فرمایا یہ گیدڑ بھبکی شیطان کی تھی اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ شیطان کہیں بھی اپنی اصلی صورت میں سامنے آکر حملہ نہیں کرتا جب وار کرتا ہے کسی نہ کسی انسانی شکل و قالب میں آکر ہی وار کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام اس کا ہے جس کی شکل تو انسانوں جیسی ہوتی ہے لیکن اپنے کاموں کے لحاظ سے وہ شیطان ہوتا ہے گویا "شیاطین الانس" میں سے کسی شیطان کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو "اولیاء الشیطن" کہلاتے ہیں اور ان کا کام ہی خوف و ہراس پھیلانا ہے اور یہ اپنے دوستوں ساتھیوں میں اس طرح بات کا بتنگڑ بناتے ہیں کہ لوگ ششدر و حیران رہ جاتے ہیں یہاں جس شیطان کا ذکر ہو رہا ہے جس نے یہ خبر مدینہ کے منافقین تک پہنچائی تھی اس کا نام نعیم ثقفی لیا گیا ہے۔

قرآن کریم کا یہ عام انداز ہے کہ وہ ایسے مواقع پر کسی کا نام نہیں لیتا تاکہ مفہوم عام رہے اور جب بھی کوئی ایسا کام کرے وہ اس نام سے یاد کیا جائے اور یہی بات اس کے شایان شان بھی ہے کہ حکم عام رہے اور جو بھی ایسی شیطنت کرے اس کو شیطان ہی کے نام سے یاد کیا جائے اور ایسے شیطان خصوصاً ہر قوم کے وڈیرے ہی ہوا کرتے ہیں جن کے پاس دنیوی وسائل ہوتے ہیں اس لئے ان سے متاثر ہو کر بہت سے کمزور لوگ ان

يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧٥﴾

اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو فقط اللہ سے ڈرو۔ ۳۱۹ ۱۷۵

کے گرد اپنی اپنی ضروریات کی خاطر جمع رہتے ہیں اور ان شیاطین کو جب کوئی خبر گرم کرنا ہوتی ہے تو بس یہ اپنے انہی حاشیہ نشینوں میں ایک شوشہ چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح آناً فاناً اس کو پھیلا کر اپنا مطلب حاصل کر لیتے ہیں لیکن جن لوگوں کے سینے قرآن کریم کی روشنی سے منور ہوتے ہیں ان پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن انسان خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ہر وقت ایک جیسی حالت پر نہیں رہ سکتا اس لئے کبھی کبھی اور کہیں کہیں یہ شیطان اپنا ہاتھ دکھا بھی جاتے ہیں۔

مسلمانوں کو ہدایت کہ دیکھو تم شیطان کے ہتھے مت چڑھو

۳۱۹ اب مسلمانوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ یہ شیطان بہت ہی شرارتی ہے یہ دراصل تم کو "اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے مت ڈرو بلکہ فقط اللہ ہی کی ذات سے ڈرو۔" فرماتا ہے کہ وہ غازیان اسلام تو صحیح معنوں میں اللہ کے بندے تھے وہ شیطان کے مکر میں نہ آئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب شیطان نے شیطنت ترک کر دی ہے۔ اس کا جوڑ توڑ تو "اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" جاری رہے گا اس لئے اے مسلمانو! تم بھی اس کے مکر و فریب میں نہ آنا۔ تم کو بار بار یاد دلایا جا رہا ہے اس لئے کہ اس کے داؤ بڑے ہی گہرے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ مضمون بار بار اور کئی طریقوں سے سمجھایا گیا ہے۔ اس جگہ چند ارشادات الٰہی کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ آپ ان ہدایات کی روشنی میں حوالہ دیئے گئے مقامات مطالعہ کرتے رہیں انشاء اللہ یہ مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ خصوصاً تفسیر عروۃ الوثقیٰ میں مقررہ مقامات کا مطالعہ آپ کی انشاء اللہ راہنمائی کرے گا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور اسی کے لئے دین ہے دائمی۔ پھر کیا تم اللہ کے سوا دوسری ہستیوں سے ڈرتے ہو۔" (النحل ۱۶ : ۵۲)

"جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ واحد کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لئے بس اللہ ہی کافی ہے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۳۹)

اس جگہ الفاظ قرآنی ہیں "کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا" جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی اس جگہ درست ہیں ایک یہ کہ "ہر خوف اور خطرے کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔" دوسرے یہ کہ "حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے" اس کے سوا اور کسی کی باز پرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو وہ شخص ہے جو اللہ پر' آخرت کے دن پر ایمان لایا' نماز قائم کی' زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانا۔ جو لوگ ایسے ہیں انہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سیدھی راہ پانے والے ثابت ہوں گے۔" (التوبہ ۹ : ۱۸)

"اور جو اللہ سے ڈرے گا "ومن یتقی اللّٰہ" تو وہ اس کے گناہ اس سے دور کر دے گا اور آخرت میں اس کو بہت بڑا اجر عطا کرے گا۔" (الطلاق ۶۵ : ۵)

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہتا ہے تو اللہ اس کے لئے غم اور مصیبت سے نکلنے کی صورت پیدا کر دیتا ہے اور اس کو روزی عطا کرتا ہے جہاں سے اس کو کبھی خیال بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنا کام پورا کرتا ہے بے شک اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔" (الطلاق ۶۵ : ۳)

"آپ ﷺ تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو آپ ﷺ کے سمجھانے پر چلے اور رحمٰن سے بلا دیکھے ڈرے۔ پس آپ ﷺ اس کو مغفرت اور بڑے اجر یا بڑے درجہ کے ثواب کی بشارت دیجئے جو ہر جگہ اس کے لئے بڑی عزت کا باعث ہوگی۔" (یٰس ۳۶ : ۱۱)

"کیا اللہ اپنے بندہ کو کافی نہیں ہے۔ اور یہ منکر آپ ﷺ کو اس کے سوا اوروں سے ڈراتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جس کو گمراہ کرے یعنی اپنی مشیت کے مطابق اس کو پھر کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔" (الزمر ۳۹ : ۳۶)

یہاں قرآن کریم کے الفاظ ہیں "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" اور اس کے مخاطب اول خود محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس اور یہ ارشاد اس لئے فرمایا کہ کفار مکہ نبی کریم ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے معبودوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو اور ان کے خلاف زبان کھولتے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کیسی زبردست باکرامت ہستیاں ہیں۔ ان کی توہین تو جس نے بھی کی وہ برباد ہوگیا۔ تم بھی اگر اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو یہ تمہارا بھی تختہ الٹ دیں گے۔ اور آج کے مشرکین بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں حالانکہ تختہ الٹ دینا یا تخت بچھا دینا یقیناً ذات الٰہی کے سوا کسی دوسرے کا کام نہیں خواہ وہ کوئی ہو۔

"مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو یعنی اس کی نافرمانی سے بچو تو وہ تمہارے لئے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ایک قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمہاری برائیاں یعنی کمزوریاں دور کر دے گا اور بخش دے گا۔ اللہ تو بہت ہی فضل کرنے والا ہے۔" (الانفال ۸ : ۲۹)

"اے پیغمبر اسلام! اللہ تیرے لئے کفایت کرتا ہے اور ان مومنوں کے لئے بھی جو تیرے پیچھے چلنے والے ہیں۔" (الانفال ۸ : ۶۴)

"اے پیغمبر اسلام! جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے لوگوں پر آشکارا کرو اور مشرکوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ ان

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ

اے پیغمبر اسلام! جو لوگ کفر کی راہ میں دوڑ رہے ہیں ان کی یہ حالت دیکھ کر تم آزردہ خاطر نہ ہو۔ یاد رکھو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ قانون الٰہی چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رہے اور بالآخر ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ۳۲۰ ۱۷۶

جن لوگوں نے ایمان کی پونجی دے کر کفر کا سودا چکایا ہے وہ اللہ کو کچھ نقصان

ہنسی اڑانے والوں کے لئے ہم تمہاری طرف سے بس کرتے ہیں۔" (الحجر ۱۵ : ۹۴، ۹۵)

"اے پیغمبر اسلام! اس گروہ میں سے جس نے زبان سے کہا' ایمان لائے مگر ان کے دل مومن نہیں ہوئے اور اس گروہ میں سے جو یہودی ہے جو لوگ کفر میں تیز گام ہیں تو ان کی حالت تمہیں غمگین نہ کرے۔ یہ لوگ جھوٹ کے لئے کان لگانے والے ہیں اور اس لئے کان لگاتے ہیں کہ ایک دوسرے گروہ کو جو تمہارے پاس نہیں آیا خبریں پہنچائیں۔" (المائدہ ۵ : ۴۱)

مدینہ کے علماء یہود منافقوں کو بھیجتے تھے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی مجلسوں میں بیٹھیں اور انہیں خبریں پہنچائیں اور ان کو یہ بھی کہتے کہ معاملات و قضایا ان کے سامنے پیش کرو اور دیکھو کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ہمارے حق کے مطابق ہو تو مانو نہ ہو تو قبول نہ کرو۔ اور اس طرح کی شرارتیں آج بھی باقاعدہ طور پر مسجدوں اور درسگاہوں میں سکھائی جاتی ہیں اور فی زمانا تو علماء کا شیوہ ہی یہ رہ گیا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جہاں تک بھڑکایا جا سکتا ہے بھڑکائیں اور طلباء یہی کچھ سیکھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے جلسوں میں جا کر خوب بھگدڑ مچایا جاتا ہے۔ یہی دین ہے اور یہی دین کا درد۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

منافقین کی آخرت برباد ہوگی اور وہ عذاب میں پڑے رہیں گے

۳۲۰ فرمایا جا رہا ہے کہ اے پیغمبر اسلام! جو لوگ تیزی سے کفر میں گھس رہے ہیں اور پھر گھستے ہی چلے جا رہے ہیں تم ان کیلئے رنجیدہ خاطر نہ ہو۔ یہ کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی منافق ہیں جن کا سردار

ابن ابی تھا چونکہ یہ لوگ اندر ہی اندر کفار کی مدد کر رہے تھے اور ہر معاملہ میں ان کے معین و مددگار بلکہ قریش مکہ کا ہتھیار تھے اور وہ جب چاہتے تھے ان سے کام لے لیتے تھے اور یہ بھی ان کا کام دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اس لئے ان کو کفر میں تیزی سے بڑھنے والے کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ ان کی حرکتوں سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑ رہا جو کچھ بگڑ رہا ہے وہ ان کا اپنا ہی بگڑ رہا ہے اور "اللہ کا کچھ نہ بگڑنے" کا مطلب بھی خود واضح ہے کہ اللہ والوں یعنی سچے مسلمانوں کا ان کی حرکتوں سے کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ یہ خود اپنی شرارتوں کے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ جو کسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی ایک روز اس میں جا گرتا ہے۔ ہاں! آپ ﷺ کو جو جذبہ رحم رکھنے کی وجہ سے ان کا یہ رویہ غمگین کرتا ہے کہ کاش! یہ لوگ ان حرکتوں سے باز آجائیں اور اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں نہ دیں اور اس طرح یہ دوزخ کا ایندھن نہ بنیں۔ جب وہ خود اپنے لئے غمگین نہیں تو آپ ﷺ ان کیلئے کیوں غمگین ہوں؟ یہ بدبخت مخلوق ہے اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق ان کو آخرت میں حصہ دار نہیں بنائے گا اور اللہ نے ان کی مدد نہیں کی اس لئے کہ قانون خداوندی یہی ہے کہ وہ کبھی ان کی مدد نہیں کرتا جو خود اپنی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود تو کفر کی طرف بڑھ رہے ہوں لیکن اللہ ان کے سامنے اسلام کی راہیں کشادہ کر دے۔ ان آخرت سے محرومین کے لئے تم بھی کڑھنا چھوڑ دو اس لئے کہ یہ اس آگ کا ایندھن ہیں جو اللہ نے دوزخ میں سلگا رکھی ہے۔ ان کے لئے بلاشبہ وہ عذاب عظیم ہے جس کو یہ اپنے ہاتھوں خود تیار کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ ان کا حال اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :

يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (الصف ۶۱ : ۸)

"یہ لوگ اپنے منہ کے پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔"

یہ گویا معجزات محمدی ﷺ میں سے ایک معجزہ ہے۔ یہ کیسے؟ یہ اس طرح کہ یہ آیت یعنی الصف کی آیت ۸ جنگ احد ۳ھ میں نازل ہوئی جبکہ اسلام صرف مدینۃ النبی تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زائد نہ تھی اور سارا عرب اس دین کے مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ احد کے معرکے میں جو مصیبت مسلمانوں کو پہنچی تھی اس کی وجہ سے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی اور گردوپیش کے قبائل ان پر شیر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ اللہ کا یہ نور کسی کے بجھائے بجھ نہ سکے گا بلکہ پوری طرح روشن ہو کر اور دنیا بھر میں پھیل کر رہے گا۔ غور کرو کہ اللہ کے سوا اس وقت اور کون یہ جان سکتا تھا کہ اسلام کا مستقبل کیا ہے؟ انسانی نگاہیں تو اس وقت یہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جسے بجھا دینے کے لئے بڑے زور کی آندھیاں چل رہی ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۷۷ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ

نہیں پہنچا سکتے ان کے لئے ان کے اعمال کے سبب دردناک عذاب تیار ہے۔ ۱۷۷

اور یہ جو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ہم مہلت پر مہلت دیتے جا رہے ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مہلت ان کے حق میں بہتر ہے۔ نہیں! یہ ہمارا قانون ہے یعنی گرفت کا وقت متعین ہے۔ ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ

ایمان کی پونجی دے کر کفر کا سودا چکانے والے خود فیصلہ کر لیتے تو بہتر ہوتا

۳۲۱ جن لوگوں نے ایمان کے عوض کفر کا سودا چکایا ہے حالانکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک رسول کے آنے کے منتظر تھے اور ان کو یقین تھا کہ وہ فاران کی چوٹیوں پر ہی اترنے والا ہے لیکن جب وہ رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوگئے انہوں نے کھلی نشانیاں بھی پیش فرما دیں جن کا وہ کسی طرح رد بھی نہ کر سکے لیکن دنیوی حرص میں آکر محض عناد کی وجہ سے انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اس طرح گویا انہوں نے ایمان دے کر کفر حاصل کر لیا وہ اپنے اس سودے پر خود نظر ثانی کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اچھا! انہوں نے بھی ایسا کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلائی اس سے اللہ یا ایمان والوں کا کچھ نہیں بگڑا جو کچھ بگڑا ان کا اپنا ہی بگڑا۔ دوسرے کفار کی طرح بلاشبہ یہ بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے اور ان کے لئے بہت ہی دکھ دہ عذاب تیار کر دیا گیا ہے اور یہ اس میں اپنے زخموں کو چاٹتے رہیں گے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے ان کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ (النساء ۴ : ۴۴) "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جنہیں کتاب اللہ سے ایک حصہ دیا گیا تھا؟ کس طرح وہ گمراہی خرید رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے بھٹک جاؤ۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (ابراہیم ۱۴ : ۸) "اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر تم اور وہ سب جو زمین میں بستے ہیں کفران نعمت کریں تو اللہ کو اس کی کیا پروا؟ اللہ کی ذات تو بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔" محرومی و ہلاکت ہوگی تو خود تمہارے ہی لئے ہوگی۔

مزید وضاحت کے لئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت (۲ : ۱۶)، (۲ : ۱۰۸)، (۲ : ۱۷۵)

لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٧٨﴾ مَّا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ

گناہوں میں اور زیادہ ہو جائیں اور انجام کار ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ ۳۲۲ ۱۷۸

ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ ایمان والوں کو اس حالت میں چھوڑ رکھے جس حالت میں

کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو جو مہلت دی جا رہی ہے یہ ان کے لئے کبھی مفید نہیں ہوگی

۳۲۲ جنگ احد میں کفار کو جب قرار واقعی سزا نہ ملی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب بس ہم کامیاب ہوگئے فرمایا یہ ایک مہلت ہے اور پھر ساتھ ہی فرما دیا کہ ہاں! یہ مہلت ان کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی کیوں؟ اس لئے کہ اس مہلت سے وہ کوئی فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نظر نہیں آتے مہلت مفید تب ہوتی جب اس کو اپنی بھلائی کے لئے استعمال کرتے اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں رسول اللہ ﷺ جو سراسر رحمت ہی رحمت ہے جو ہماری خیر خواہی چاہتا ہے۔ جس کو کسی قسم کا کوئی لالچ نہیں۔ حکومت وہ نہیں چاہتا۔ مال کا طلبگار وہ نہیں ہے۔ کسی کا وہ ملازم بھی نہیں ہے کہ اس کو تنخواہ مل رہی ہے۔ پھر ہم اس کو خواہ مخواہ کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس نہج پر نہیں سوچا ان کو مہلت ملی ہے تو وہ اس کو شرارتوں اور منصوبہ بندیوں میں صرف کر رہے ہیں اس لئے اس مہلت کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنی شرارتوں میں مزید اضافہ کر کے اپنے نامہ اعمال بھی سیاہ کریں اور دنیا میں بھی ان کا منہ کالا ہو۔ اور اس طرح وہ "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ" کے مصداق ہو جائیں نہ ان کی دنیا رہے اور نہ دین پھر انجام کار ان پر گرفت کا متعین وقت آجائے اور ان کو رسوا کرنے والے عذاب میں پھینک دیا جائے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کی دنیا یوں برباد ہوئی کہ چند سالوں کے بعد ان کو ذلیل و خوار کر کے محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے مغلوب اور مفتوح کی حیثیت میں پیش کیا گیا اور آخر میں بھی بلاشبہ وہ عذاب مہین میں مبتلا ہوں گے۔ اس آیت میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ "یہ جو ہم مہلت پر مہلت دیتے جا رہے ہیں تو وہ نہ سمجھیں کہ یہ مہلت ان کے حق میں بہتر ہے نہیں! یہ ہمارا قانون ہے یعنی گرفت کا ایک وقت مقرر ہے جب تک وہ وقت آنہیں جاتا ہم ان کو ابھی مزید مہلت دیں گے۔ جس کے نتیجہ میں ان کے گناہوں میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ روز بروز اس میعاد کی طرف بڑھ رہے ہیں جو ان کے لئے مقرر کر دی گئی ہے وقت آئے گا تو یہ اچانک اس عذاب میں پھنس کر رہ جائیں گے جس سے پھر نکلنا محال ہے۔ اس مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے :

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (الاعراف ۷ : ۱۸۳، ۱۸۴) "اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں ہم انہیں درجہ بدرجہ آخری نتیجہ تک لے جائیں گے۔ اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی۔ ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں اور ہماری ہماری مخفی تدبیر بڑی ہی

الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ

تم آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو۔ وہ ضرور ایسا کرے گا کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر

مضبوط ہے۔"

اس آیت میں قانون امہال کی طرف اشارہ ہے اور مشرکین مکہ کی نسبت خبر دی ہے کہ جزائے عمل کا قانون ان کی طرف سے غافل نہیں ہے وہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیں گے جو انکار و سرکش کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ چند ہی برسوں کے اندر قریش مکہ کی ساری طاقت نابود ہوگئی۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا :

"جس پر راہ اللہ گم کر دے یعنی اپنے ٹھہرائے ہوئے قانون نتائج کے مطابق تو پھر اس کے لئے کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اللہ کے قانون نے ایک وقت تک انہیں چھوڑ دیا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔"

"ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں یعنی ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق وہ سمجھ سوچ اور بصارت سے کام لینا چھوڑ دیں جس طرح پہلی مرتبہ وہ اس قرآن پر ایمان ہی نہیں لائے تھے تو پھر ہم ان کو ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔" (الانعام ۶ : ۱۱۰)

مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر ابھی وہی ذہنیت کام کئے جا رہی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سن کر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے نقطہ نظر میں ابھی تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے وہی عقل کا پھیر اور دو نظری کا مرض آج بھی ان میں موجود ہے جو انہیں اس وقت صحیح سمجھنے اور صحیح دیکھنے سے روک رہا تھا جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا اور آج بھی ان پر اسی طرح مسلط ہے۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور دیکھو جس طرح انسان فائدے کے لئے جلد باز ہوتا ہے اگر اس طرح اللہ اسے نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا تو اس کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔ پس جو لوگ ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں ان کی سرکشیوں میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔" (یونس ۱۰ : ۱۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد کی فراوانی سے اس لئے ان کی امداد کر رہے ہیں کہ وہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ نہیں حقیقت حال دوسری ہے مگر وہ شعور نہیں رکھتے۔" (المومنون ۲۳ : ۵۵، ۵۶)

مطلب یہ ہے کہ اس دار فانی میں مہلت سب کے لئے ہے اچھوں کے لئے بھی اور بروں کے لئے بھی پس اگر مفسدوں کو دنیوی زندگی کی خوش حالیاں مل رہی ہیں تو یہ اس لئے نہیں ہے کہ ہمارا قانون مجازات معطل ہو گیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ بد عملیوں پر بھی انہیں فوائد سے بہرہ اندوز کریں بلکہ محض اس لئے کہ

الطَّيِّبِ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

۳۲۳ دے یعنی مومن اور منافق کی پوزیشن واضح ہو جائے اور اللہ کا یہ قاعدہ نہیں کہ وہ تمہیں غیب کی خبریں دے دے یعنی بتا دے لیکن ہاں! وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو

مقررہ وقت ابھی آیا نہیں اور یہاں ہر نتیجہ کے لئے اجل مسمی کا قانون کام کر رہا ہے۔

مسلمانوں کی حالت ایسی ہی نہیں رہے گی بلکہ پاک ناپاک سے الگ کر دیا جائے گا

۳۲۳ "یمز" میز کے معنی ہیں ملتی جلتی چیزوں کو الگ الگ کر دینا۔ "اَلْخَبِيْث" وہ چیز جس سے کراہت کی جائے بوجہ اس کے روی ہونے کے خواہ محسوس ہو یا معقول اور اس میں باطل اعتقاد، جھوٹ، باتیں اور برے فعل سب شامل ہو جاتے ہیں "اَلطَّيِّب" طیب وہ ہے جو جہل، فسق اور برے اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم ایمان اور اچھے اعمال کے زیور سے آراستہ ہو۔ (راغب)

اس آیت میں جنگ احد میں جو زخم آئے ان کے فوائد بتائے جا رہے ہیں کیونکہ گزشتہ واقعات سے جو مفید بات ہو اس کو لے کر باقی کو چھوڑ دینا ہی عقلمندی کی دلیل ہے کمزوریوں کو بار بار دہراتے رہنا مزید کمزور کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس جگہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک پاک گروہ کو مصائب کے ہاون میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف منہ کی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کچے پکے اور مومن و منافق یکساں ہو سکتے ہیں اس لئے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کیلئے اور مومنوں کی کمال وفاداری دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق مصائب لاتا ہے اور اس طرح ہر ایک ملے جلے گروہ میں خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیتا ہے۔

ہاں! مومن اور منافق میں امتیاز وحی کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کو عملی طور پر کیا گیا جس میں یقیناً حکمت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کی پوری حکمتیں تو اس کو معلوم ہیں یہاں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں احتیاط کے لئے کوئی ایسی واضح حجت نہیں ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کر لیں وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو ہم تو سچے اور پکے مسلمان ہیں۔ اور اس طرح یہ بحث ختم ہونے ہی میں نہ آتی۔ بخلاف اس پر عملی امتیاز کے جو مصائب کے ابتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق مدینہ سے نکلتے ہی الگ ہو گئے اور اس طرح ان کے بھاگ جانے سے عملی طور پر ان کا نفاق کھل گیا۔ اب ان کا یہ منہ نہ رہا کہ مومن و مخلص ہونے کا دعویٰ کریں اور پھر اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری میل جول بھی قطع ہو گیا ورنہ دل میں اختلاف کے باوجود ظاہری اختلاط رہتا تو وہ بھی یقیناً کفر ہی ہوتا۔ اس مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا: وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (العنکبوت ۲۹ : ۳)

يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ ۞ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

چاہتا ہے اس بات کے لئے چن لیتا ہے۔[۳۲۴] پس چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ اگر اب بھی تم ایمان لے آئے اور برائیوں سے بچے تو یقیناً تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔[۳۲۵] ۱۷۹

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے خاص فضل و کرم سے مال دیا ہے اور وہ اللہ کی راہ میں

"اور اللہ کو تو ضرور یہ ظاہر کر دینا ہے تاکہ سب جان لیں کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ اور ہم ان لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔"

یہ کوئی نیا معاملہ نہیں جو تمہارے ساتھ پیش آیا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے اسے آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا اور جب دوسروں کو امتحان کے بغیر کچھ نہیں دیا گیا تو تمہاری کیا خصوصیت ہے کہ تمہیں صرف زبانی دعوے پر نواز دیا جائے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹ : ۱۱) "اور اللہ کو تو ضرور یہ ظاہر کر دکھانا ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون" اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ "اللہ ایمان والوں کو اس حالت میں نہیں چھوڑ رکھے گا جس حالت میں تم ہو وہ ضرور ایسا کرے گا کہ ناپاک پاک سے الگ کر دے۔" اور اس طرح الگ الگ کرے گا کہ سب کو معلوم ہو جائے گا۔

غیب کی خبریں ہر ایک کو نہیں دی جا سکتیں کیونکہ یہ قانون الٰہی کے خلاف ہے

[۳۲۴] اللہ تعالیٰ کا یہ قانون نہیں ہے کہ وہ ہر ایک کو غیب کی خبریں پہنچائے اور تم کو اس طرح ہر بات سے مطلع کرنا مفید مطلب بھی نہیں کیونکہ اس طرح مزید الجھنیں بڑھیں گی ہاں! اللہ دونوں گروہوں کو عملی طور پر الگ الگ کر کے دکھا دے گا اور یہی اس نے کیا کہ اب دونوں فریق الگ الگ ہو گئے اور یہ بات بھی اب سب پر واضح ہو گئی اور سنت اللہ یہی ہے کہ واقعات کو اس طرح واضح کر دیا جائے کہ کسی کو کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ پھر غیب کی باتوں کے لئے وہ اپنے رسولوں کو چن لیتا ہے اور ان کو امور غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرما دیتا ہے اور یہ کوئی راز نہیں ہے کہ جو بات کسی پر ظاہر کر دی جائے اور بتا دی جائے وہ غیب نہیں ہوتی غیب صرف اسی وقت تک تھی جب تک اس کو اس سے آگاہی نہ تھی۔ آگاہ ہونے کے

بعد وہ غیب کیسے رہا؟ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی غیب کو جانتا ہے تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے ہے جو اس کو نہیں جانتے جو جانتا ہے اس کی نسبت سے وہ غیب نہیں ہوتا۔ آپ ایک چیز جس کو جانتے پہچانتے ہیں اپنی مٹھی میں بند کر کے دوسرے سے کہیں کہ بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ کی مٹھی میں ہے وہ اس کے لئے جس سے تم پوچھ رہے ہو غیب ہے لیکن آپ کے لئے یقیناً وہ غیب نہیں کیونکہ آپ نے دیکھ سمجھ کر اس کو مٹھی میں بند کیا ہے۔ اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز غائب نہیں اور نہ ہی اس سے کوئی چیز پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ جو چیز ہم نہیں جانتے وہ ہمارے لئے غیب ہے لیکن اللہ اس کو جانتا ہے اس لئے ہم کہتے ہیں اللہ ہی غیب کا جاننے والا ہے یعنی جو چیز ہمارے لئے غائب ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ قرآن کریم نے بار بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ انبیاء کرام بھی غیب کو نہیں جانتے تھے مگر ہاں! اللہ جن جن چیزوں کے متعلق چاہتا وہ ان کو بتا دیتا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ (التوبہ ۹ : ۹۴) "جب تم جہاد سے لوٹ کر ان کے پاس جاؤ گے تو وہ آئیں گے اور تمہارے سامنے معذرتیں کریں گے اے پیغمبر اسلام! تمہیں چاہئے کہ ان سے کہہ دو معذرت کی باتیں نہ بناؤ اب ہم تمہارا اعتبار کرنے والے نہیں اللہ نے ہمیں پوری طرح تمہارا حال بتلا دیا ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! یہ غیب کی خبریں ہیں جس کی آپ ﷺ پر وحی کر رہے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہوگئے تھے تو تم اس وقت کچھ ان کے پاس کھڑے نہ تھے۔" کہ سب کچھ دیکھ سن لیا ہو۔ (یوسف ۱۲ : ۱۰۲) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو بتلا رہے ہیں اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں آپ ﷺ جانتے تھے اور نہ آپ ﷺ کی قوم پس صبر کرو کہ انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔" (ھود ۱۱ : ۴۹) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا :

"منافق اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے بارے میں کوئی سورت نازل ہو جائے اور جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ انہیں اعلانیہ جتلا دے آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ تم تمسخر کرتے ہو بلاشبہ اللہ اب وہ بات پوشیدگی سے نکال کر ظاہر کر دینے والا ہے جس کا تمہیں اندیشہ ہے۔" (التوبہ ۹ : ۶۴)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور ان اعرابیوں میں جو تمہارے آس پاس بستے ہیں کچھ منافق ہیں اور خود مدینہ کے باشندوں میں بھی نفاق میں پختہ ہوگئے ہیں اے پیغمبر اسلام! تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر اس عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے جو بہت ہی بڑا عذاب ہے۔" (التوبہ ۹ : ۱۰۱)

اس میں منافقین کے ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اطراف مدینہ میں بدوی قبائل میں بھی تھے اور شہری

يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ

خرچ کرنے میں بخیل ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ایسا کرنا ان کے لئے کوئی بھلائی کی بات ہے۔ نہیں وہ تو ان کے لئے بڑی ہی برائی ہے۔[۳۲۶] قریب ہے کہ قیامت کے دن یہی مال

باشندوں میں بھی فرمایا "مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ" یہ نفاق میں مشاق اور حاذق ہوگئے ہیں یعنی منافقانہ زندگی میں رہتے رہتے اس کی ایسی مشق ہوگئی ہے کہ نو آموزوں کی طرح پکڑے نہیں جا سکتے اور جو پکے اور نو آموز ہیں ان کے لئے مشکل ہے کہ اپنی دلی حالت چھپائے رکھیں وہ تو ان کے چہروں پر ابھر ہی آئی ہے اور باتوں سے ٹپکنے ہی لگتی ہے لیکن یہ لوگ اس بناوٹ کے ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ ممکن ہی نہیں ان کو عام نگاہیں تاڑ سکیں۔

"ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے" یعنی یہ اپنی دوہری استعداد و نفاق کی وجہ سے دہرے عذاب کے مستحق ہوگئے پہلی استعداد یہ کہ منافق ہوئے دوسری یہ کہ اس میں کامل اور مشاق ہوگئے۔

مزید وضاحت کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سے تفسیر سورہ بقرہ کی ان آیات کا مطالعہ کرو (۲ : ۲۳)، (۲ : ۱۷۵)، (۲ : ۲۵۵)، اور جلد دوم سورۂ آل عمران (۳ : ۴۴) اور قرآن کریم کے یہ مقامات بھی دیکھ لو (۷ : ۲۶)، (۵۴ : ۴۵)، (۳۰ : ۱ تا ۴)، (۹ : ۹۴)، (۱۱ : ۱۰۰)، (۱۱ : ۱۲۵)، (۷ : ۱۰۱)، (۲۰ : ۹۹)، (۱۰ : ۳۴)، (۶۶ : ۳)، (۳۳ : ۶۳)، (۲۱ : ۱۰۹، ۱۱۱)، (۷۲ : ۲۵)، (۴۶ : ۹)، (۳۸ : ۶۷ تا ۷۰)

جب تک دارفانی میں ہیں توبہ کا وقت ہے جب دار البقاء کو گئے وقت ختم ہوگیا

۳۲۵ غور کرو کہ مخاطب منافقین ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے دعویدار ہیں لیکن ان کا دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ وہ ایک دروازہ سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل چکے ہیں تاہم ان کا اپنا دعویٰ ایمان ہی کا ہے۔ اس وقت وہ منافقت کس سے کر رہے ہیں رسول اللہ ﷺ سے لیکن جب ان کو سچا ایمان لانے کی تلقین کی جا رہی ہے تو کہا جاتا ہے کہ "فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ" یہ نہیں فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لاؤ بلکہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک رسول کا انکار دراصل سارے رسولوں کا انکار ہے اور ایک رسول سے منافقت گویا سارے رسولوں سے منافقت ہے۔ دراصل یہ اہتمام ہے قرآن کریم کا جو وہ وحدت پیام اور سلسلہ وحی کی اہمیت و عظمت کا رکھتا ہے۔

کوئی کتنا ہی بد عمل کیوں نہ ہو جب تک وہ اٹھا نہیں لیا جائے اس وقت تک اس کے پاس موقع ہے اپنی اصلاح کر لینے کا اور سچے دل سے توبہ کرنے کا اس لئے منافقین کو کہا جا رہا ہے کہ "چاہئے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لے آؤ۔ اگر اب بھی تم ایمان لے آئے اور برائیوں سے بچے تو یقیناً تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔" اور جب اس دار العمل سے نکل کر تم دار البقاء میں پہنچ گئے تو پھر عمل کا دروازہ بند ہوگیا۔[۱۰]

منافق خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخیل بناتے ہیں

۳۲۶ منافقین پر جنہوں نے مصلحت وقت دیکھ کر دعوت اسلام کا ساتھ دیا تھا راہ حق میں مال و دولت کا خرچ کرنا بہت شاق گزرتا تھا۔ وہ خود بھی بخل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے تھے۔ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس جگہ بخل کی مذمت کی گئی ہے اس لئے یہ سمجھنا ہوگا کہ بخل کیا ہے؟ بخل جود کی ضد ہے اور جود یعنی سخاوت سے سب واقف ہیں اور بخل کے معنی ہوئے مال کا وہاں سے روکنا جہاں سے روکنا مناسب نہیں (راغب) اور بخل کے شرعی معنی ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب و ضروری ہو اس کو خرچ نہ کرے۔ اس لئے بخل حرام ہے اور اس پر وعید بھی شدید ہے اور جن مواقع پر مال خرچ کرنا ضروری و لازم نہیں بلکہ جائز ہے وہاں بھی بخل اچھا نہیں تاہم حرام بھی نہیں لیکن عام معنی کے اعتبار سے اس کو بھی بخل کہہ دیتے ہیں اور بخل کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی قرآن و حدیث میں آیا ہے یعنی "شح" اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا ضروری تھا وہ خرچ نہ کرنا اور اس کے ساتھ ہی مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا ہونا۔ اس لحاظ سے یہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے۔ چونکہ "بخل" اور "شح" دونوں ہی انسانیت کے لئے سمّ قاتل ہیں اس لئے ان کا استعمال قرآن کریم میں جہاں بھی ہوا ہے اس پر نظر ڈال لینا مفید ہے۔ بخل کے متعلق ارشادات الٰہی۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ (التوبہ ۹ : ۷۶) "پھر جب ایسا ہوا کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے مال عطا فرمایا تو اس میں بخل کرنے لگے اور اپنے عہد سے پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ نیکی سے ان کے دل ہی پھرے ہوئے ہیں۔"

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○ (النساء ۴ : ۳۷) "جو لوگ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنا سکھاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اسے خرچ کرنے کی جگہ چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو ناشکری کرتے ہیں ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (الحدید ۵۷ : ۲۴)

"جو لوگ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے پر اکساتے ہیں اس طرح اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔"

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ○ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد ۴۷ : ۳۷، ۳۸)

"اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔ دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو

اس پر تم میں کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہے ہیں۔ اللہ تو غنی ہے' تم ہی اس کے محتاج ہو۔"

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○ (الیل ۹۲ : ۸' ۱۰) "اور جس نے بخل کیا اور بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا اس کو ہم سخت راستے کے لئے سہولت دیں گے۔"

"الشُّح" کے متعلق ارشادات الٰہی بھی ملاحظہ کریں :

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ (الاحزاب ۳۳ : ۱۹) "تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں' خطرے کا وقت آجائے تو اس طرح دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو مگر جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لئے تمہارا استقبال کو آجاتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ مال پر گرے پڑے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے اس لئے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے اور ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔"

"وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الحشر ۵۹ : ۹) (۶۴ : ۱۶) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء ۴ : ۱۲۸) "صلح ہر حال بہتر ہے نفس تنگ دلی کی طرف جلد مائل ہو جاتے ہیں۔"

"مَنْ يُّوْقَ" فرمایا یعنی "جو شخص بچا لیا گیا" کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد کے بغیر کوئی شخص خود اپنے زور بازو سے دل کی تونگری نہیں پا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو اللہ ہی کے فضل سے کسی کو نصیب ہوتی ہے "شُحّ" کا لفظ عربی زبان میں کنجوسی اور بخل کے لئے آتا ہے مگر جب اس لفظ کو نفس کی طرف منسوب کر کے "شح نفس" کہا جائے تو یہ تنگ نظری' تنگ دلی' کم حوصلگی' دل کے چھوٹے پن کا ہم معنی ہو جاتا ہے جو بخل سے کہیں وسیع تر چیز ہے بلکہ خود بخل کی بھی اصل جڑ وہی ہے۔ اس صفت کی وجہ سے آدمی دوسرے کا حق ماننا اور ادا کرنا تو درکنار اس کی خوبی کا اعتراف تک کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کا سب کچھ اس کو مل جائے اور کسی کو کچھ نہ ملے۔ دوسروں کو خود دینا تو درکنار کوئی دوسرا بھی اگر کسی کو کچھ دے تو اس کا دل دکھتا ہے۔ اس کی حرص کبھی اپنے حق پر قانع نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے یا کم از کم دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے گردوپیش دنیا میں جو اچھی چیز بھی ہے اسے اپنے لئے سمیٹ لے اور کسی کے لئے کچھ نہ چھوڑے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے اس برائی سے بچ جانے یا بچا لئے جانے کو فلاح کی ضمانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو ان بدترین انسانی اوصاف میں شمار کیا ہے جو

فساد کی جڑ ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتقوا الشح فان الشح اھلک من قبلکم حملھم علی ان سفکوا دماءھم واستحلوا محارمھم (مسلم' بخاری فی الادب' مسند احمد' بیہقی) اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں امرھم بالظلم فظلموا وامرھم بالفجور ففجروا وامرھم بالقطیعۃ فقطعوا (مسند احمد' ابوداؤد' نسائی) "شح" سے بچو کیونکہ "شح" ہی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا اس نے ان کو ایک دوسرے کے خون بہانے اور دوسروں کی حرمتوں کو اپنے لئے حلال کر لینے پر اکسایا۔ ان کو ظلم پر آمادہ کیا اور انہوں نے ظلم کیا۔ اس نے ان کو "فجور" کا حکم دیا اور انہوں نے فجور کیا۔ اس نے ان کو قطع رحمی کیلئے کہا اور انہوں نے قطع رحمی کی۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان اور شح نفس کسی دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔" (بیہقی فی شعب الایمان' نسائی' ابن ابی شیبہ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "دو خصلتیں ہیں جو کسی مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بدخلق۔" یعنی ایمان اور بخل یا ایمان اور بدخلقی۔ دونوں جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ حقیقت میں بخل کرنے والا بدخلق ہوتا ہے اور بدخلق کا بخیل ہونا بعید نہیں۔ (ابوداؤد' ترمذی' بخاری فی الادب)

قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔ جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں اور قرآن کے الفاظ کا گویا یہ اشارہ ہے اس سیرت کی طرف جو خود مسلم معاشرے کے منافقین میں اس وقت بھی سب کو نظر آرہی تھی۔ ظاہری اقرار ایمان کے لحاظ سے ان میں اور مخلص مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اخلاص کے فقدان کی وجہ سے وہ اس تربیت میں شامل نہ ہوتے تھے جو مخلصین و مومنین کو دی جا رہی تھی۔ اس لئے ان کا حال یہ تھا کہ جو ذرا سی خوش حالی اور مشیخت ان کو عرب کے ایک معمولی قصبے میں میسر ہوئی تھی وہی ان کے چھوٹے سے ظرف کو پھیلائے جا رہے تھی اور اس پر ہی وہ پھٹے پڑے تھے اور اس کا پر تو دیکھنا ہو تو اب ان بستیوں کا چکر لگا کر دیکھ لو۔ ان میں دل کی تنگی اس درجہ کی تھی کہ جس اللہ پر ایمان لانے اور جس رسول کو پیرو ہونے اور جس دین کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے اس کے لئے خود ایک پیسہ تو کیا دیتے' دوسرے دینے والوں کو بھی یہ کہہ کہہ کر روکتے تھے کہ کیوں اپنا پیسہ بھاڑ میں جھونک رہے ہو۔

ظاہر بات ہے کہ اگر مصائب کی بھٹی گرم نہ کی جاتی اور احد کی اس بھٹی میں مسلمانوں کو ڈالا نہ جاتا تو اس کھوٹے مال کو جو اللہ کے کسی کام کا نہ تھا زر خالص سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کو الگ کئے بغیر سچ ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخلوط بھیڑ کو دنیا کی امامت کا وہ منصب عظیم نہ سونپا جا سکتا تھا جس کی عظیم الشان

برکات کا مشاہدہ آخر کار دنیا نے آپ ﷺ کے مختصر دور حکومت اور خلافت راشدہ میں کیا۔

قرآنی تعلیمات مسلم معاشرہ کے لوگوں کو تفہیم کراتی ہیں کہ لوگو! یہ مال نہ ہمیشہ سے تمہارے پاس تھا اور نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس رہے گا کل یہ دوسرے لوگوں کے پاس تھا پھر اللہ نے تم کو ان کا جانشین بنا کر اسے تمہارے تصرف میں دے دیا پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ تمہارے پاس نہ رہے گا اور کچھ دوسرے لوگ اس پر تمہارے جانشین بن جائیں گے اور یہ مال ان کے تصرف میں چلا جائے گا۔ اس عارضی جانشینی کی تھوڑی سی مدت میں جبکہ یہ تمہارے قبض و تصرف میں ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو تاکہ آخرت میں اس کا مستقل اور دائمی اجر تمہیں حاصل ہو۔ یہی بات ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کے ہاں ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ آپ ﷺ گھر میں تشریف لائے تو پوچھا اس بکری کا کیا ہوا؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا "ما بقی الا کتفها" ایک شانے کے سوا کچھ نہیں بچا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "بقی کلها غیر کتفها" ایک شانے کے سوا ساری بکری بچ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں صرف ہوا وہی دراصل باقی رہ گیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! ﷺ کس صدقے کا اجر سب سے زیادہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ان تصدق وانت صحیح شحیح تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمهل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا و لفلان کذا وقد کان لفلان "یہ کہ تو صدقہ کرے اس حال میں کو تو صحیح و تندرست ہو مال کی کمی کے باعث اسے بچا کر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو اور اسے کسی کام میں لگا کر زیادہ کما لینے کی امید رکھتا ہو۔ اس وقت کا انتظار نہ کرے کہ جب جان نکلے گی تو تو کہے کہ یہ فلاں کو دیا جائے اور یہ فلاں کو۔ اس وقت تو یہ مال فلاں کا ہو ہی جانا ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یقول ابن آدم مالی مالی، وهل لک من مالک الا ما اکلت فافنیت، اولبست فابلیت، اوتصدقت فامضیت وما سوی ذلک فذاهب و تارک للناس۔ "آدمی کہتا ہے میرا مال، میرا مال۔ حالانکہ تیرے مال میں سے تیرا حصہ اس کے سوا کیا ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا ہے؟ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے اور تو اسے دوسروں کے لئے چھوڑ جانے والا ہے۔" (مسلم شریف)

زیر نظر آیت میں جس کی یہاں تفسیر کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے خاص فضل و کرم سے مال دیا ہے اور وہ اللہ ہی کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں یعنی وہ بخیل ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ایسا کرنا ان کیلئے کوئی بھلائی کی بات ہے نہیں وہ تو ان کے لئے بڑی ہی برائی ہے۔" بخل کی مذمت اور صدقہ کے فوائد سمجھ میں آگئے۔ جو عمل کرے گا فائدہ اس کا ہوگا خواہ میں ہوں یا آپ۔

شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ

و متاع جس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے وہ بخل کر رہے ہیں ان کے گلوں میں طوق بنا کر پہنا دیا جائے گا۔[۳۲۷] اور یاد رکھو جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کی میراث

اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کا مال ان کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا

۳۲۷ "یُطَوَّقُوْنَ" طوق وہ چیز ہے جو گلے میں ڈالی جائے خواہ پیدائشی لحاظ سے ہو جیسے کبوتر کا طوق یا خود ڈالا جائے جیسے مالا یا ہار بخل کی سزا دنیوی زندگی میں جو ملتی ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کہ نہ اچھا کھائیں گے اور نہ پہنیں گے اور نہ ہی اچھا پہنیں گے۔ شوم، کنجوسی اور بخیل کی مثالیں بھی زبان زد خاص و عام ہیں اور مال کے حریص لوگوں کو مال جس جس طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن قیامت کے روز ان بخیلوں کو منافقوں، کافروں اور زیاں کاروں کی صفوں میں کھڑا ہونا ہوگا۔ زیاں کار وہی ہوں گے جن کے نیک اعمال بھی وہاں ضائع ہو چکے ہوں گے۔ علاوہ ازیں بخیلوں کے گلے میں ان کے بخل کا ہار بھی ہوگا جو ان کی اس پہچان کو واضح کر دے گا کہ یہ لوگ بخیل تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بنا کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا سرمایہ ہوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الخ۔

مسلمانو! بخل نہ کرو۔ اللہ نے جو کچھ رزق و دولت عطا فرمائی ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ سے کبھی نہیں رک سکتا۔ ہاں! جو کچھ خرچ کرو اللہ کی رضا کیلئے اور اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو۔ نام و نمود کیلئے مت خرچ کرو۔ جو شخص نام و نمود کیلئے خرچ کرتا ہے وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اپنا تجزیہ خود کرتے رہو کہ کیا اللہ کی رضا میں خرچ کیا ہے اور کیا ناک و نمود کے لئے؟ وہ کیا ہے جو خرچ کرنا چاہئے تھا لیکن خرچ نہیں کیا؟ یہ بھی کہ جو خرچ کیا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے یا غیر اللہ کی راہ میں؟

اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کے لئے وعید الٰہی قرآن کریم میں۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○ (التوبہ ۹ : ۳۴، ۳۵) "اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ

ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس کے علم سے مخفی نہیں۔ ۱۸۰

بلاشبہ اللہ نے ان لوگوں کا کہنا سن لیا ہے جنہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ محتاج ہے

خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو عذاب دردناک کی اطلاع دے دو۔ عذاب دردناک کا وہ دن جبکہ سونے چاندی کا ڈھیر دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کے ماتھے' ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا یہ ہے جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ کیا تھا۔ سو جو کچھ ذخیرہ کر کے جمع کرتے رہے اس کا مزہ آج چکھ لو۔"

اسلام نے مال کھانے اور خرچ کرنے کے اصولی ضابطے قائم کر دیئے ہوئے ہیں ان ضابطوں کے خلاف کمایا ہوا مال اور جتنا خرچ کرنا لازم و ضروری ہے اتنا بھی اس میں سے خرچ نہ کیا گیا تو مال "خزانہ" یا "ذخیرہ" کہلاتا ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو سونے اور چاندی کے ذخائر کی بات ہے گندم یا دوسرے غلہ جات چینی یا دوسری خوردنی اشیاء کے ذخائر سے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوٹھیاں' زمینیں اور باغات اگر جمع کر لی جائیں تو پھر تو ایسا نہیں ہوگا اور یہ بھی کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ اگر ان سب کو دوزخ کی آگ میں ڈال ہی دیا جائے گا تو یہ سب مل کر راکھ ہو جائیں گے پھر کاویہ کیونکر ہوگا۔ کوئی بڑا ہی بدبخت ہوگا جو ایسی بات کرے گا کیونکہ مراد اس جگہ "کاویہ" کرنے سے عذاب میں مبتلا کرنا ہے اور "کاویہ" کرنے کے عذاب سے انسان واقف ہے کہ وہ کتنا تکلف دہ ہوتا ہے اور اس کی اصلی نوعیت کیا ہے؟ علم الٰہی میں موجود ہے۔ انسانوں کو سمجھانے کے لئے ان ہی کی زبان استعمال کی جا سکتی تھی اور وہی کی گئی ہے۔

چنانچہ فرمایا کہ "قریب ہے کہ قیامت کے دن یہی مال و متاع جس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے وہ بخل کرتے تھے ان کے گلوں میں طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔"

وارث حقیقی ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے انسان کی ملکیت عارضی اور مستعار ہے

۳۲۸ "مِیْرَاث" ورث سے ہے وراثت اور ارث کے معنی ہیں ایک شخص کی طرف کسی دوسرے سے مال کا منتقل ہونا بغیر کسی معاہدہ یا اس امر کے جو قائم مقام معاہدہ ہو۔ (راغب) اس لئے جو مال میت کی طرف سے منتقل ہوتا ہے اس کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام "الوارث" بھی ہے اس لئے کہ سب کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے والی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ

اور ہم دولت مند[۳۲۹] ہیں۔ عنقریب جو بات انہوں نے کہی ہے ہم ان ہی کے لئے لکھ دیں[۳۳۰] گے اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی لکھا جا چکا ہے وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم کہیں

ہے وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (الحجر ۱۵ : ۲۳) "اور یہ ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور موت طاری کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبضہ میں سب کی کمائی آتی ہے۔"

یعنی اللہ ہی کی ذات ہے جو زندہ کرتا اور موت طاری کرتا ہے اور اس کا علم رکھتا ہے کون پہلے آئے گا اور کون بعد؟ جس طرح اللہ نے تمام چیزوں کی تقدیر کر دی ہے۔ مقررہ اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔ اسی طرح موت و حیات کا بھی ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا ہے اور قوموں کے تقدم و تاخر کے لئے بھی مقررہ اندازہ ہے ہر ہستی جو پیدا ہوتی ہے اور ہر ہستی جو مرتی ہے اپنے مقررہ اندازہ کے مطابق پیدا ہوتی ہے اور مقررہ اندازہ کے مطابق مرتی ہے تقدیر اشیاء اور اجسام کا قانون عالمگیر قانون ہے۔ ہستی کا کوئی گوشہ نہیں جو اس سے باہر ہو سوائے اس کی اپنی ذات کے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔

آسمان و زمین کی وراثت اللہ ہی کو حاصل ہے کیونکہ مخلوق کو فنا ہے اور اللہ باقی رہنے والا ہے سب مر جائیں گے اور مال چھوڑ جائیں گے۔ اللہ کی طرف ہر چیز لوٹا دی جائے گی۔ مرنے والوں کی گردن پر اس کا عذاب رہ جائے گا اور مرتے وقت مال چھوڑنے کی حسرت ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ وہ بخل کرتے ہیں اور راہ خدا میں مال خرچ نہیں کرتے؟ فرمایا "جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اللہ کی میراث ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس کے علم سے مخفی و پوشیدہ نہیں۔"

یہودیت اور منافقت کا جوڑ

آیت ۱۱۶ تک اہل کتاب کا حال چلا آرہا تھا خصوصاً یہود کا پھر آیت ۱۱۷ سے منافقین کا بیان شروع ہو گیا جو آیت ۱۸۰ تک چلتا رہا اور اب آیت ۱۸۱ سے پھر موضوع اہل کتاب کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور خصوصاً یہود کی طرف گویا یہودیت نے منافقت کو گھیرے میں لے رکھا ہے یا منافقت یہودیت کی لپیٹ میں ہے۔ اور اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہودیت اور منافقت کا مزاج ملتا جلتا ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کے فقیر ہونے کی پھبتی کسی ہے ان کی بات اللہ نے سن لی ہے

۳۲۹ منافقین کے جس گروہ کا ذکر پیچھے ہو رہا تھا بڑے حامی اور جنگ احد کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن جو بالکل منافقوں کی طرح اندرونی دشمن ہی تھے کیونکہ بظاہر مسلمانوں سے معاہدہ بھی کر رکھا تھا' یہودی تھے۔ یہاں ان ہی کا ذکر شروع ہو رہا ہے جیسا کہ قتل انبیاء کے جملہ نے صاف وضاحت کر دی

ہے۔ نظام اسلام میں زکوٰۃ کا قائم کرنا' صدقات کی ترغیب دینا اور خصوصاً جنگوں کے لئے مالی قربانیوں پر زور دینا معاشرہ اسلامی کا ایک اہم جز تھا اور ہے باوجود اس کے کہ مسلمان اس وقت ابھی حالت غربت میں تھے اور مال کی فراوانی نہیں تھی۔ ادھر یہود ہمیشہ سے بوجہ اپنی سود خواری اور بخل کے ایک مال دار قوم تھی۔ اس لئے یہ لوگ اسلام کی ان باتوں پر استہزاء کرتے رہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیبات پر انہوں نے یہ پھبتی کسی کہ اب اللہ فقیر ہوگیا ہے اور ہم غنی ہیں اس لئے اللہ کی غربت کو دور کرنے کے لئے اب مسلمان چندہ کی اپیلیں کر رہے ہیں فرمایا "بلاشبہ اللہ نے ان لوگوں کا کہنا سن لیا ہے جنہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ محتاج ہے اور ہم دولت مند ہیں۔" انہوں نے اس طرح کا استہزاء کیوں کیا اور کیسے کیا؟ بعض لوگوں اور قوموں کی خصوصیت ہے کہ وہ لفظوں کے پھیر میں الجھے رہتے ہیں اور حقیقت' لب لباب اور راز کی طرف نہیں آتے ایسا پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے یہودیوں کی یہ قومی خصوصیت ہے اور انہوں نے اسی طرح کی بیسیوں باتیں بنائی ہیں جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے جیسے "رَاعِنَا" کے لفظ کو زبان کے پیچ کے ساتھ پڑھنا جس سے اس کا اصلی مفہوم بدل جائے یعنی "رَاعِنَا" کو رَاعِیْنَا کہنا کہ "اے ہمارا چرواہے"۔ السلام علیکم کو سام علیکم کہنا کہ "تم پر موت آئے" محمد ﷺ کو مزمم کہنا کہ "مزمت کیا گیا۔"

اس جگہ ان کو یہ استہزاء اس لئے سوجھا کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کو "اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا" یعنی اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دو سے بیان کیا گیا ہے اور یہ الفاظ اپنے اندر کیا پوشیدہ راز رکھتے ہیں؟ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہوں نے "اَللّٰہُ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ" کے الفاظ کہہ کر گویا اللہ اور اس کے رسول پر پھبتی کسی۔ "قَرْضًا حَسَنًا" اصطلاح قرآنی میں کیوں لایا گیا؟ اس کی تفصیل کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول بقرہ ۲ : ۲۴۵' حاشیہ ۴۱۱ ص ۸۳۱ ملاحظہ کریں۔ اس جگہ ان آیات کی فہرست ملاحظہ کریں جہاں یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔

ارشادات الٰہی متعلق "قَرْضًا حَسَنًا" اصطلاح قرآنی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرہ ۲ : ۲۴۵) "کون ہے جو اللہ کو خوش دلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تاکہ اللہ اس کا دیا ہوا دوگنا' سہ گنا کر کے ادا کرے؟ اور تنگی اور کشائش کا رشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے حضور تم سب کو لوٹنا ہے۔"

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ (التغابن ۶۴ : ۱۷) "اگر تم اللہ کو اچھی طرح سے قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا اور تمہاری کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا اور اللہ بڑا قدر دان' بڑا تحمل والا ہے۔"

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ○ (الحدید ۵۷ : ۱۱) "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تو اللہ اس کو اس کا دوگنا دے اور اس کے لئے بڑا ہی عزت والا صلہ ہے" جو دوگنے' چوگنے سے بھی زیادہ ہے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ○ (الحدید ۵۷ : ۱۸) "بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور وہ جو اللہ کو نیک نیتی سے قرض دیتے ہیں ان کو دوگنا دیا جائے گا اور ان کے لئے بڑا ہی باعزت اجر ہے۔"

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (المزمل ۷۳ : ۲۰) "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو اخلاص کے ساتھ قرض دیا کرو اور تم جو بھی نیک عمل اپنے لئے پہلے بھیجو گے اسے تم اللہ کے ہاں بہتر اور اجر کے اعتبار سے بڑھا ہوا پاؤ گے۔"

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ (المائدہ ۵ : ۱۲) "اور میرے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی مدد کی اور اللہ کو قرض نیک دیتے رہے تو میں ضرور تم پر سے تمہاری برائیاں محو کر دوں گا۔"

اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کے لئے دوسرے الفاظ میں بھی ترغیب دی گئی تاکہ لوگ خوشدلی اور اپنی مرضی اور جذبہ اسلامی کے ساتھ خرچ کرتے رہیں کیونکہ قانون کے ڈنڈے سے لیا ہوا دینے والے کے لئے اس اجر کا باعث نہیں ہو سکتا جس اجر کا باعث اپنی مرضی اور خوشی سے دیا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ : وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ (البقرہ ۲ : ۲۷۲) "جو کچھ بھی تم خیرات کرو گے تو اس کا بدلہ پوری طرح تم کو مل جائے گا۔"

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (البقرہ ۲ : ۲۷۲) "جو کچھ بھی تم خیرات کرو گے تو خود اپنے ہی فائدہ کے لئے کرو گے۔"

فرمایا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عبادت ہے اور عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ہوتا ہے اس میں تمہاری زندگی کو عبادت بنانے کی تعلیم اس لئے ہے کہ تم اللہ کے ہاں سے روزی اور اس کی عنایات کے مستحق بنو۔ اللہ اس تمہارے دیئے کو خود نہیں کھاتا اور نہ ہی وہ کھانے کا محتاج ہے یہ جو کچھ ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَمَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ○ (الذاریات ۹۱ : ۵۷) "میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں پلائیں۔" ایک جگہ فرمایا :

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا یَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (محمد ۴۷ : ۳۶)

"اور اگر تم ایمان لاؤ اور برائیوں سے بچتے رہو تو وہ تم کو تمہارے اجر دے گا اور تم سے تمہارے مال

طلب نہیں کرے گا۔"

یعنی وہ غنی ہے اسے اپنی ذات کے لئے تم سے لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے اگر وہ اپنی راہ میں تم سے کچھ خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے تو وہ اپنے لئے نہیں بلکہ تمہاری ہی بھلائی کے لئے کہتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ○ (فاطر ۳۵ : ۱۵) "اے لوگو! اللہ تمہارے مال کا محتاج نہیں بلکہ تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی یعنی بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔"

یہود کی یہ بات کہ اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں لکھ لی گئی ہے' یہ خود اس کا جواب ہوں گے

۳۳۰ جس وقت ان لوگوں نے نبی اعظم و آخر ﷺ کے اس پیغام کو استہزاء کا نشانہ بنایا تھا اس وقت یہ مذاق اڑانے والے اپنے قلعوں میں رہتے اور اپنے باغوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے اور مہاجن بن کر مسلمانوں اور دوسرے غریب طبقوں کا خون چوس رہے تھے۔ ان کا اصل کاروبار سود اور سود در سود کا تھا۔ لیکن ان کے اس طرح کے مذاق کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔ تاکہ وقت آنے پر یہ خود اس کا جواب ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی یہ ہوا کہ "عنقریب جو بات انہوں نے کہی ہے ہم ان ہی کے لئے لکھ دیں گے۔" انہوں نے کیا کہا تھا "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں" ارشاد ہوا کہ یہ بات ہم ان کے لئے لکھ دیں گے۔ کیا؟ ان کو جلدی معلوم ہو جائے گا کہ اللہ غنی ہے اور وہ خود فقیر ہیں۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دنیا نے دیکھ لیا اور وہ خود بھی سمجھ گئے کہ جو بات اللہ نے کہی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہوگئی۔

"نَحْنُ أَغْنِيَاءُ" کہنے والوں کو اس دنیا ہی میں عذاب الحریق کا ایک جھونکا پہنچا دیا اور ان کا غنا حالت فقر میں تبدیل ہوگیا اور ان کو اپنے املاک وغیرہ چھوڑ کر ملک بدر ہونا پڑا اور جن کو وہ فقیر کہتے تھے اللہ نے ان کو اپنے فضل سے مالا مال کر دیا اور بے حساب رزق دے دیا جہاں سے ان کو اتنا رزق ملنے کی کبھی توقع نہ تھی۔

نبی اعظم و آخر ﷺ تو رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ ﷺ نے بنی نضیر کے اخراج کا حکم کیوں دیا؟ اس جگہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے تاکہ اس معاملہ میں ذہن صاف ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ سے بنی نضیر کا باقاعدہ تحریری معاہدہ تھا اور اس معاہدے کو انہوں نے رد نہیں کیا تھا کہ معاہدہ ختم ہو جاتا لیکن جس وجہ سے ان پر چڑھائی کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے بہت سی چھوٹی بڑی خلاف ورزیاں کرنے کے بعد آخر کار ایک صریح فعل ایسا کیا تھا جو نقض عہد کا ہم معنی تھا۔ وہ یہ کہ انہوں نے دوسرے فریق معاہدہ یعنی مدینہ کی اسلامی ریاست کے صدر کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور وہ کچھ اس طرح کھل گئی تھی کہ جب ان کو نقض معاہدہ کا الزام دیا گیا تو وہ اس کا انکار نہ کر سکے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو دس دن کا نوٹس دے دیا کہ اس مدت میں مدینہ چھوڑ کر نکل جاؤ ورنہ تمہارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ نوٹس قرآن کریم کے اس حکم کے ٹھیک مطابق تھا کہ "اگر تم کو کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدہ کو اعلانیہ اس کے

آگے پھینک دو۔" (الانفال ۸ : ۵۸) اس لئے ان کے اخراج کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا جیسا کہ سورہ الحشر کی آیت ۲ سے واضح ہے کیونکہ یہ ٹھیک قانون الٰہی کے مطابق تھا گویا ان کو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ نے نکالا۔

خیال رہے کہ بنو نضیر صدیوں سے یہاں جمے ہوئے تھے مدینہ کے باہر ان کی پوری آبادی یکجا تھی جس میں ان کے اپنے قبیلے کے سوا کوئی دوسرا عنصر موجود نہ تھا۔ انہوں نے پوری بستی کو قلعہ بند کر رکھا تھا اور ان کے مکانات گڑھیوں کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ جس طرح عموماً قبائلی علاقوں میں جہاں ہر طرح بد امنی پھیلی ہوئی ہو بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی اس وقت کے مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھی اور خود مدینے کے بہت سے منافقین ان کی پشت پر تھے۔ اس لئے مسلمانوں کر ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ لوگ لڑے بغیر صرف محاصرے ہی سے بدحواس ہو کر یوں اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ اس طرح خود بنی نضیر کے بھی وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ کوئی طاقت ان سے چھ دن کے اندر یہ جگہ چھڑا لے گی۔ اگرچہ بنی قینقاع ان سے پہلے نکالے جا چکے تھے اور اپنی شجاعت پر ان کا سارا زعم دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ لیکن وہ مدینہ کے ایک محلہ میں آباد تھے اور ان کی اپنی کوئی قلعہ بند بستی نہ تھی۔ اس لئے بنو نضیر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بخلاف اس کے وہ اپنی محفوظ بستی اور اپنی مضبوط گڑھیوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی انہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔ اس لئے جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جانے کا نوٹس دیا تو انہوں نے بڑے دھڑلے کے ساتھ کہہ دیا کہ ہم نہیں نکلیں گے آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجئے۔

بنی نضیر بظاہر اپنے قلعوں کا استحکام دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حملے سے بچ جائیں گے مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کا مقابلہ اللہ سے تھا اور اس سے ان کے قلعے نہ بچ سکتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہودی اس دنیا میں ایک ایسی عجیب قوم ہے جو جانتے بوجھتے اللہ کا مقابلہ کرتی رہی ہے۔ اللہ کے رسولوں کو جانتے ہوئے اس نے قتل کیا۔ اس قوم کی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت یعقوب سے اللہ تعالیٰ کی رات بھر کشتی ہوتی رہی اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ پچھاڑ سکا پھر جب صبح ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا اب مجھے جانے دے تو انہوں نے کہا کہ میں تجھے نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا یعقوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔" (ملاحظہ ہو یہودیوں کی جدید ترجمہ کتب مقدسہ (The Holly Scriptures) شائع کردہ جیوش پبلی کیشن سوسائٹی آف امریکہ ۱۹۵۴ء کتاب پیدائش باب ۳۲ آیات ۲۵، ۲۹)

پھر بائبل کی کتاب "ہوسیع" میں حضرت یعقوب کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ اپنی توانائی کے ایام

نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ

گے کہ اب پاداش عمل میں عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔[۳۳۱] ۱۸۱

تم جو کچھ اپنے ہاتھوں اپنے لیے مہیا کر چکے ہو یہ اسی کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ کے

میں خدا سے کشتی لڑا۔ وہ فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب آیا۔" (باب ۱۲ آیت ۴) اب ظاہر ہے کہ یہ بنی اسرائیل جو مدینہ کے قریب بستے تھے وہ ان ہی کے صاحبزادے ہی تھے جنہوں نے اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے زور آزمائی کی تھی اور اس سے کشتی لڑ کر خدا کو پچھاڑ دیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے اعتراف کے مطابق خدا کے نبیوں کو قتل کیا اور اس بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زعم کے مطابق صلیب پر چڑھایا اور خم ٹھونک کر کہا "کہ ہم نے مسیح بن مریم رسول اللہ کو قتل کیا۔" لہٰذا یہ بات ان کی روایات کے خلاف نہ تھی کہ انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول جانتے ہوئے ان کے خلاف جنگ کی لیکن اس کا نتیجہ کیا رہا کہ جب ان کی بستی کا محاصرہ کیا گیا اور بستی کے اطراف میں کھجوروں کے باغ تھے وہ کاٹ دیئے گئے انہوں نے خوب شور مچایا اور ظلم ظلم کے نعرے بلند کئے اور اپنے کئے ہوئے مظام کو چھپانے کے لئے ہر طرح کا شور و غوغا کیا لیکن انجام کار ان کو اپنی بستی خالی کر کے اس جگہ سے نکل جانا پڑا اور اس میں انہوں نے عافیت سمجھی اور اپنے ظلم کا بدلہ دنیا ہی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جس نبی اعظم و آخر ﷺ کو قتل کرنے کی انہوں نے سازش کی تھی اس کا خمیازہ بھگت کر یہاں سے نکل گئے اور اس طرح انہوں نے اپنے فقیر ہونے کو مانا یا نہیں؟ اس واقعہ کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورہ الحشر ہی میں آئے گی۔ کیونکہ وہی مقام اس کی تفصیل کا ہے۔

جو لوگ انبیاء کرام کے قتل سے باز نہ رہے ان کو نبی سے استہزاء میں کیسے شرم آتی

۳۳۱ یہ مثل مشہور عام ہے کہ جو ماں کا نہیں وہ خالہ کا کیسے ہوگا؟ جن لوگوں نے انبیاء کرامؑ کو قتل کرنے میں جھجک محسوس نہ کی ان کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ استہزاء و مذاق سے کون باز رکھ سکتا تھا؟ ہاں ایک مثل یہ بھی ہے کہ "سو سنار کی اور ایک لوہار کی" اور یہ بھی ہے کہ "سو دن چور کا اور ایک شاہ کا" بلاشبہ انہوں نے انبیاء کرام کو قتل کیا اور دکھ دیئے اور ایذا پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس وقت وہ اس نبی ﷺ کے ساتھ مذاق کے مرتکب ہوئے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کا دروازہ بند کر دیا تھا لہٰذا اس مذاق و استہزاء کی سزا بھی لازم تھی جو دی گئی اور ایسی دی گئی کہ وہ رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے کہ وہ کس کی درگاہ سے راندے گئے ہیں۔ ہاں! یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کے مخاطب تو یہود مدینہ ہیں اور قتل انبیاء کے مرتکب صدیوں پہلے گزر چکے تھے کیونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تو کوئی نبی آیا ہی نہ تھا۔ بلاشبہ سیدنا زکریاؑ اور سیدنا یحییٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے قتل کیا تھا لیکن وہ قاتل اب تک

کہاں موجود تھے؟ پھر ان مخاطبین کی طرف قتل انبیاء کا جرم کیسے منسوب کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود مدینہ اپنے سابق یہودیوں کے اس فعل پر راضی تھے اور خوش تھے کہ ان کے بڑوں نے یہ کارہائے نمایاں انجام دیئے اس لئے یہ بھی اس حکم میں شمار کئے گئے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر اور معصیت میں داخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب زمین پر کوئی گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص وہاں موجود ہو مگر اس گناہ کی مخالفت کرے اور اس کو برا سمجھے تو وہ ایسا ہے گویا یہاں موجود نہیں یعنی وہ اس کا شریک نہیں اور جو شخص اگرچہ اس مجلس میں موجود نہیں مگر ان کے اس فعل سے راضی ہے وہ باوجود غائب ہونے کے ان کا شریک گناہ سمجھا جائے گا۔ پھر قرآن کریم میں جگہ جگہ ان کے بزرگوں کی بد اعتدالیوں کا ذکر موجود ہے کبھی کسی یہودی نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا آپ ﷺ کے وقت میں یہ سوال نہ اٹھایا کہ یہ کام ہمارے آباء و اجداد یا ہمارے فکر کے لوگوں نے کئے تھے ہم تو ان کے مرتکب نہیں ہوئے یا ہم ان کاموں کو اچھا نہیں سمجھتے جو انہوں نے کئے تھے۔ جب کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی تو یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کے کاموں کو برا خیال نہیں کرتے تھے پھر وہ خود وہی کام کرتے تھے جو ان کے وڈیرے کرتے رہے۔ وہ جس جرم میں مدینہ سے نکالے گئے تھے وہ بھی تو یہی تھا کہ انہوں نے نبی اعظم و آخر ﷺ کے قتل کر دینے کی سازش کی جو موقع پر پکڑی گئی اور اسی جرم کی پاداش میں ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا چنانچہ اس جگہ ارشاد فرمایا کہ "اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی لکھا جا چکا ہے اور وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم کہیں گے اب پاداش عمل میں عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔" اور قرآن کریم میں جگہ جگہ ان کی اس دیدہ دلیری کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (النساء ۴ : ۱۵۵) "پس ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتیں جھٹلانے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ خدا کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے نیز اس شقاوت کی وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ (ال عمران ۳ : ۲۱) "جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور اس کے نبیوں کے ناحق قتل میں چھوٹ ہیں نیز ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو حق و عدالت کا حکم دینے والے ہیں۔"

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ (ال عمران ۳ : ۱۱۲) "وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور نبیوں کے ناحق قتل میں بے باک تھے۔"

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (البقرہ ۲ : ۶۱) "وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور انبیاء کے ناحق قتل میں بے باک و چھوٹ تھے۔"

أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿١٨٢﴾ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ

لئے تو یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی کہ اپنے بندوں کے لئے ظلم کرنے والا ہو۔ ۳۳۲ ۱۸۲

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے عہد لے چکا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ

یاد رہے کہ سب قوموں میں جو قومی بیماریاں ہوتی ہیں ان میں ہر دور کے لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ ان بیماریوں کو بیماریاں نہیں بلکہ قومی فخر اور قومی امتیازات مانتے ہیں اگر یہ بیماریاں ان سے دور کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ممنون نہیں ہوتے بلکہ درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ ہاں دور بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ بیماریاں خود بخود بدلتی رہیں یہ دوسری بات ہے لیکن ایسی قومی بیماریاں جب بدلتی ہیں تو اپنی جگہ پہلے سے بھی بری بیماری چھوڑ جاتی ہیں بالکل ختم نہیں ہوتیں۔ آج قوم مسلم خود اپنا تجزیہ کر کے دیکھے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ صدر اول کے بعد جب ہم کسی بیماری میں مبتلا ہوئے تو وہ بیماریاں ہم میں بڑھتی چلی گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بیماریوں نے ہم کو مختلف مذہبی گروہوں اور سیاسی پارٹیوں میں تقسیم کر دیا اور جس کو جو بیماری لگی وہ روز بروز پختہ ہوتی گئی اگر کوئی بیماری گئی تو نئی اس سے بھی بدتر آئی جس کے نتیجہ میں اختلاف' افتراق مزید بڑھتا گیا اور جو حال ہمارا ہے وہ سب پر روشن ہے۔

ان کو اپنے کئے کی اور تم کو اپنے کئے کی سزا بھگتنا ہوگی' اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا

۳۳۲ قرآن کریم کے الفاظ بالکل صاف صاف بتا رہے ہیں کہ یہود کو جس سزا دیئے جانے کا ذکر ہے وہ ان کے اپنے کئے کے نتیجہ میں ہے نہ کہ ان کے پہلوں کے کئے ہوئے گناہوں کی پاداش میں اور اس میں ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ کے الفاظ اس بات کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تم جو کچھ اپنے ہاتھوں اپنے لئے مہیا کر چکے ہو یہ اس کا نتیجہ ہے پھر جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کی پوری تفصیل تفسیر' سیرۃ' تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں موجود ہے اور پیچھے تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدے کر کے ان معاہدوں کا کیا حشر کیا اور ایک بدعہدی نہیں کی بلکہ بار بار بدعہدیاں کیں عہد کرنا اور اس سے پھرنا ان کا معمول زندگی تھا اور پھر ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جو رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازش انہوں نے کی تھی کیا یہ سب کچھ انہوں نے خود نہیں کیا تھا؟ ہاں یہ سب کچھ انہوں نے اپنے ہاتھوں سر انجام دیا اور بڑی ترکیب اور ترتیب سے سر انجام دیا لیکن افسوس کہ ہمارے مفسرین نے "أَيْدِيكُمْ" سے مراد وہ اشخاص اور نفوس لئے جو قتل انبیاء کے مرتکب ہوئے تھے اور یہ لکھا کہ "ید" کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اکثر حسی افعال ہاتھوں ہی سے ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلے انسانوں کو جنہوں نے صحیح معنوں میں انبیاء کرام کو قتل کیا تھا ان یہود کے ہاتھ قرار دیا گیا اور کون پوچھے کہ آخر اس طرح کی توجیہات اور دور از کار بحثوں کی ضرورت؟ پھر یہ کہ پیچھے آنے

اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ

لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو۔[۳۴۳] تو تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے اللہ کے کتنے ہی رسول سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ

والے پہلوں کے ہاتھ قرار دیئے جا سکتے ہیں پہلے ہونے والے پچھلوں کے ہاتھ کس طرح ہوگئے؟ تعجب ہے کہ کچھ لوگوں نے کیا کیا مغز ماریاں کیں اور کیوں کیں؟ اس سے رسول اللہ ﷺ کی امت کو کیا فائدہ ہوا؟

ارشاد الٰہی ہے کہ "اللہ کیلئے تو یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی کہ اپنے بندوں کے لئے ظلم کرنے والا ہو۔" اللہ ظالم نہیں اور نفی ظلم کے لئے عدل لازم ہے اور عدل کا تقاضا ہے کہ نیک کو ثواب اور بد کو عذاب دیا جائے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ظالم نہ ہونے کا تقاضا ہے کہ کافروں کو عذاب دیا جائے۔ پھر اس پر بحث چھیڑ دی کہ یہ مفہوم مسلک اشاعرہ کے خلاف ہے کیونکہ یہ معتزلہ کا مسلک ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ظلم کی نفی اللہ کی ذات کے لئے لازم ہے کیونکہ ظلم قبیح ازالہ ہے اور تمام بری باتوں سے اللہ کا پاک ہونا ضروری ہے اور نفی ظلم عدل کو مستلزم ہے اور عدل کے لئے لازم ہے کہ نیک کو ثواب اور گنہگار کو عذاب دیا جائے۔ پس فرمانبردار کو ثابت اور نافرمان کو عذاب دینا اللہ پر لازم قرار پایا اور یہ اشاعرہ کے مسلک کے خلاف ہے کیونکہ وہ اللہ پر کسی چیز کو لازم قرار نہیں دیتے اور اس طرح بیان کرنے سے ظلم نہ کرنا لازم آتا ہے۔

پھر اس بحث کو اتنا طول دیا کہ صفحات کے صفحات تحریر کئے گئے اور انجام کار یہ ثابت کیا کہ "اس جگہ لفظ ظلم حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ نفی ظلم سے مراد یہ ہے کہ جو فعل بندوں کے باہمی معاملات میں ظلم کہلاتا ہے اگرچہ اللہ سے اس کا صدور ظلم نہیں۔" اور دوسرا مطلب اس کا بیان کیا گیا ہے کہ "آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافر عذاب کے اتنے مستحق ہیں کہ اگر اللہ ان کو عذاب نہ دے تو ان پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہوگی پس گویا اس طرز کلام سے کافروں پر عذاب ہونے کو مؤکد طور پر ظاہر کر دیا۔"

اس طرح کی سر دردیاں پڑھ کر فی الواقع درد سر شروع ہو جاتا ہے اور پھر بھی جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو دوست کہتے ہیں کہ ہاں! حقیقت تسلیم کر لو کہ سمجھ کر پڑھنا گناہ عظیم ہے اور جو سمجھ میں نہیں آتا اس پر اجر عظیم ہے۔

زیر نظر آیت میں ارشاد الٰہی ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝" اور ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت ظلم کرنے والا۔ یعنی "اللہ بہت ظلم کرنے والا نہیں" اور تھوڑا سا ظلم.....؟ جواب

غور سے سن لو کہ قرآن کریم نے کئی دفعہ یہ جملہ بیان کیا ہے کہ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا (النساء ۴ : ۵۰) "ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔" پھر اس طرح بھی ارشاد فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء ۴ : ۴۰) "اللہ ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔" اس لئے مجھے کہہ لینے دو کہ "اللہ اپنے بندوں کے لئے مطلق ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" ہاں! لوگ جو کچھ کرتے ہیں خود اپنے ہاتھوں کرتے ہیں اور اللہ نے اپنے قانون کے مطابق عمل کے ساتھ نتیجہ لازم کر دیا ہے جو کبھی خطا نہیں کرتا۔

بے دلیل باتیں بنانے والوں کے جو منہ میں آئے وہ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں

۳۳۳ مدینے کے علمائے یہود جب دعوت اسلام کے خلاف تمام دلیلوں میں ہار چکے تو آخر ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ بات نکالی کہ ہمیں تورات میں سوختنی قربانی کا حکم دیا گیا ہے اس لئے ہم اس نبی کو سچا مانیں گے جو سوختنی قربانی کے عمل کے ساتھ آیا ہو اور یہ بات بالکل ان کی بناوٹی تھی تورات میں بلاشبہ سوختنی قربانی کا ذکر ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح ان لوگوں نے بیان کیا ہے تورات آج بھی موجود ہے اور اس میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں۔ توراۃ میں جو کچھ ہے اس میں سوختنی قربانی سے مقصود یہ ہے کہ یہودی جانوروں کی قربانی کر کے ان کے کچھ حصے آگ میں جلایا کرتے تھے اور یہ ان کے کاہنوں کے ذمہ تھا کہ وہ جو کچھ جلانے کے قابل ہے جلا دیں اور باقی اپنے گھر لے جائیں۔ اور یہ ان کے پیٹ کے دھندا تھا جو انہوں نے کتاب اللہ میں داخل کر دیا۔ اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں جو انہوں نے نبی کریم سے بیان کی۔

کتاب سلاطین۔ ا میں جس قربانی سوختنی کا ذکر ہے اس میں یہ بات مطلق نہیں ہے کہ اللہ نے کہیں کسی نبی کی نبوت کے لئے یا ہر آنے والے نبی کی نبوت کے لئے یہ معیار مقرر کیا ہے۔ حاشا للہ کہ یہ بات کہیں موجود ہو۔ احبار میں جو بیان ہے وہ اتنا لمبا ہے کہ احبار باب اول سے شروع ہو کر ۱۳' ۱۴ باب تک چلا گیا ہے لیکن جو بات اوپر مذکور ہوئی وہ کہیں دستیاب نہیں۔ احبار میں جو کچھ ہے وہ اس طرح سے ہے۔

"اگر اس کا چڑھاوا گائے بیل کی سوختنی قربانی ہو تو وہ بے عیب نر کو لا کر اسے خیمہ اجتماع کے دروازہ پر چڑھائے تاکہ وہ خود خداوند کے حضور مقبول ٹھہرے اور وہ سوختنی قربانی کے جانور کے سر پر اپنے ہاتھ رکھے تب وہ اس کی طرف سے مقبول ہوگا تاکہ اس کے لئے کفارہ ہو اور وہ اس بچھڑے کو خداوند کے حضور ذبح کرے اور ہارون کے بیٹے جو کاہن ہیں خون کو لا کر اس مذبح پر گرداگرد چھڑکیں جو خیمہ اجتماع کے دروازہ پر ہے تب وہ اس سوختنی قربانی کے جانور کی کھال کھینچے اور اس کے عضو عضو کو کاٹ کر جدا جدا کرے۔ پھر ہارون کاہن کے بیٹے مذبح پر آگ رکھیں اور آگ پر لکڑیاں ترتیب سے چن دیں اور ہارون کے بیٹے جو کاہن ہیں اس کے اعضا کو اور سر اور چربی کو ان کی لکڑیوں پر جو مذبح کی آگ پر ہوں گی ترتیب سے رکھ دیں لیکن وہ اس کی انتڑیوں اور پایوں کو پانی سے دھو لے تب کاہن سب کو مذبح پر جلائے گا وہ سوختنی قربانی یعنی خداوند کے لئے راحت انگیز خوشبو کی آتشیں قربانی ہو۔" (احبار باب اول : ۳ تا ۹)

بیل کے بعد بھیڑ بکری کی سوختنی قربانی کا ذکر ہے۔ پھر پرندوں کی سوختنی قربانی کا ذکر ہے پھر باقی چیزوں کی سوختنی قربانی کا ذکر ہے پھر نذر کی قربانی کا ذکر ہے اور اس میں اتنا مزید ہے کہ :

"اور کاہن اس نذر کی قربانی میں سے اس کی یادگاری کا حصہ اٹھا کر مذبح پر جلائے یہ خداوند کے لئے راحت انگیز خوشبو کی آتشیں قربانی ہوگی اور جو کچھ اس نذر کی قربانی سے بچ رہے وہ ہارون اور اس کے بیٹوں کا ہوگا۔ یہ خداوند کی آتشیں قربانی میں پاک ترین چیز ہے۔"

اس کی نقالی میں آج بھی قوم مسلم کے افراد جو کچھ مردوں کو ثواب پہنچانے کی خاطر دینا چاہتے ہوں ملاؤں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ کچھ قدر گھٹیا قسم کا ان لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جو مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور کام کی چیزیں جو ستھری اور دیرپا ہوتی ہیں از قسم کپڑے' غلہ' نقدی اور پھل وہ اپنے گھر بھجوا دیتے ہیں گویا یہ ہارون کی اولاد میں سے کاہن ہیں جن کا کام مردوں کو ثواب پہنچا کر چیزیں اڑا لے جانے کا حکم خداوندی ہے جو ان کی لال کتاب میں درج ہے۔ نذر کی قربانی کے بعد پھر دوسری قربانیوں کا لامتناہی ذکر چھڑ جاتا ہے جو دور تک کتاب احبار میں چلا گیا ہے۔ جس کو شوق ہو وہاں سے دیکھ لے۔ اس بیان کا مقصود یہ ہے کہ یہ بے لگام اور چھوٹ یہودیوں کے منہ کی بات تھی کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو۔"

تورات میں جہاں کہیں بھی سوختنی قربانی کا ذکر ہے جیسے تواریخ و سلاطین وغیرہ میں تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ نہیں ہے اس لئے ہم یہ علمائے یہود کی بڑ یا بھبک ہی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے مفسرین اور علماء کی اکثریت نے یہودیوں کی اس بڑ کو حقیقت تسلیم کر لیا اور اس کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ علمائے یہود سے بھی بہت آگے نکل گئے اور یہاں تک لکھ دیا کہ "قربانیاں اور مال غنیمت بنی اسرائیل کے لئے خود کام میں لانے کا حکم نہیں تھا اس لئے جب کوئی قربانی کرتے یا مال غنیمت پاتے تھے تو اللہ کے لئے پیش کرتے تھے اور قبول یا عدم قبول کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ آسمان سے ایک آگ سفید بے دود یعنی بغیر دھوئیں کے آتی تھی جس کے آنے سے ایک گونج اور گڑگڑاہٹ کی آواز آتی تھی اور وہ آگ آکر اس قربانی کو کھا جاتی تھی اور یہ اس قربانی کے قبول ہونے کی علامت تھی اور اگر آگ نہ آتی اور وہ قربانی اصلی حالت پر رہ جاتی تو نامقبول سمجھی جاتی۔

سعدی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ "اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شخص اللہ کی طرف سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے تو تم اس کی تصدیق نہ کرنا تاوقتیکہ وہ ایسی قربانی نہ پیش کرے جس کو آگ کھا جاوے۔ ہاں! مسیحؑ اور محمد ﷺ اگر آئیں تو تم ان پر ایمان ضرور لانا وہ قربانی پیش نہیں کریں گے۔" گویا یہ علمائے یہود کے نہلہ پر علمائے اسلام کا دہلہ ہے جس کی کوئی اصل موجود نہیں۔

قرآن کریم جو اللہ تعالیٰ کے آخری رسول محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب اقدس پر اتارا گیا اس میں اس

وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ

تمہارے پاس آئے اور بقول تمہارے اس بات کے ساتھ آئے جس کے لئے تم کہہ رہے ہو پھر اگر اپنے قول میں سچے ہو تو کیوں تم انہیں قتل کرتے رہے؟ ۳۳۴ ۱۸۳

طرح کی کوئی بات نہیں ہے الا یہ کہ یہود کی اس گھڑی ہوئی شرارت کا ذکر کر دیا ہے اور ان کو اس طریقہ سے جواب دیا ہے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھنے کے نہیں رہے اور ایسے دبے کہ انہوں نے پھر کبھی ایسی لچر اور لغو بات کا ذکر تک نہ کیا۔

یہود کے منہ جو کچھ آیا انہوں نے کہہ دیا تھا لیکن تعجب تو یہ ہے کہ علمائے اسلام اور مفسرین حضرات نے یہ بھی نہ سوچا کہ آگ کسی چیز کو ہڑپ کر جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی صورت ہے نہ کہ قبولیت کی اور قرآن کریم میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ (البقرہ ۲ : ۲۶۶)

"کیا تم میں سے کوئی شخص بھی یہ بات پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں کے درخت اور انگوروں کی بیلوں کا ایک باغ ہو۔ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں نیز اس میں اور بھی ہر طرح کے پھل پھول پیدا ہوتے ہوں کہ جب اس صاحب باغ کو بڑھاپا آجائے اور ناتوان اولاد اس شخص کے چاروں طرف جمع ہو تو اچانک ایک جھلستی ہوئی آندھی چلے اور آن کی آن میں باغ جل کر ویران ہو جائے؟"

تفصیل کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۶ کی تفسیر دیکھیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○ (اٰل عمران ۳ : ۱۱۷) "دنیا کی اس زندگی میں ہم لوگ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس ہوا کا چلنا جس کے ساتھ پالا ہو فرض کرو ایک گروہ نے اپنے اوپر ہر طرح کی محنت و مشقت برداشت کر کے ایک کھیت تیار کیا ہو لیکن پالا پڑے اور پورا کھیت برباد ہو کر رہ جائے اور یاد رکھو یہ جو کچھ ان کو پیش آیا تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا ہو یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

تفصیل کے لئے جلد ہذا سورہ اٰل عمران کی آیت ۱۱۷ کا مطالعہ کفایت کرے گا۔

یہود کو رو در رو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اس کا جواب دلوا دیا

۳۳۴ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام سے فرمایا کہ "تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے اللہ کے

كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا

اے پیغمبر اسلام! یہ لوگ آج تمہیں جھٹلا رہے ہیں تو تم سے پہلے کتنے رسول ہیں جو جھٹلائے گئے باوجود اس کے کہ سچائی کی روشن دلیلیں، صحیفے اور روشن کتاب ان کے ساتھ تھی۔ ۳۳۵ ۱۸۴

یاد رکھو! ہر جان کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے اور جو کچھ تمہارے اعمال

کتنے ہی رسول سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور بقول تمہارے اس بات کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو "(بِالَّذِیْ قُلْتُمْ)" پھر اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو کیوں تم انہیں قتل کرتے رہے؟"

سبحان اللہ! جو بات علمائے یہود نے کہی تھی اگرچہ اس کا بھی کوئی سر پیر نہیں تھا اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ لاؤ دکھاؤ تورات میں کہاں یہ لکھا ہوا ہے تو اس طرح سے ایک نئی بحث چھڑ جاتی اور اصل موضوع سے دور ہٹ جاتے۔ پھر وہی ہوتا جو آج تک ہوتا آیا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائی شروع ہو جاتی اور زبانوں کا بھیڑ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ لیکن مقابلہ میں محمد رسول اللہ ﷺ جیسے رحمت للعالمین تھے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے ان کی اس لغو بات کا جواب ایسے ستھرے، صاف شفاف اور حکمت بھرے الفاظ سے دلوایا کہ وہ دم بخود ہوگئے جس کا نہ ان کے پاس کوئی جواب تھا اور نہ وہ دے سکتے تھے کیونکہ یہود نے زکریا علیہ السلام اور زکریا کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام دونوں کو نبی تسلیم کیا اور دونوں نبی جو باپ بیٹا بھی تھے یہود کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے جس سے انکار کی ان کے پاس کوئی گنجائش نہ تھی۔

سوختنی قربانی کا ذکر آپ اوپر پڑھ چکے۔ ایک چیز خود اپنے ہاتھوں جلائی جائے پھر اس کے متعلق اتنا بڑا جھوٹ گھڑ کر بیان کیا جائے جو علمائے یہود نے گھڑا تھا تو ان کے جواب کے کئی طریقے اختیار کئے جا سکتے تھے لیکن جو طریقہ بھی اختیار کیا جاتا اس پر مزید سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو سکتا تھا اور پھر یہ مذہبی وکیل جس طرح بات سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن بانئ اسلام نبی اعظم و آخر ﷺ نے کسی سوال کو نہیں چھیڑا جس سے بحث آگے بڑھ سکے اور اللہ نے ایسی بات آپ ﷺ سے کہلوا دی جس کا جواب دنیا کے کسی یہودی کے پاس نہ تھا اور نہ ہی کبھی ہونے کا امکان ہے۔ لیکن آپ نے غور کیا کہ جو جواب ان کو دیا گیا وہ خالصتاً عقلی ہے لیکن علمائے یہود کو یہ بات بھی نہ سوجھی کہ وہ اس کو یہ کہہ کر ٹال جاتے کہ آپ ﷺ کا یہ جواب تو سراسر عقلی ہے اور دین میں تو عقل کو دخل نہیں ہے۔ آج کے علماء ہوتے تو ان کو یہ کہتے

تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ

کا بدلہ ملنا ہے وہ قیامت کے دن پورا پورا[۳۳۶] ملے گا اس دن جو شخص آتش دوزخ سے ہٹا لیا گیا اور جنت میں داخل کر لیا گیا تو وہ کامیاب ہوگیا سو اصل کامیابی[۳۳۷] اسکی کامیابی ہوگی

شاید دیر نہ لگتی کیونکہ اکثر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ جب کسی عالم کہلانے والے کو جواب نہیں آتا تو یہ جواب فٹ کر دیتا ہے کہ یہ بات تو عقلی ہے اور دین میں عقل کو دخل نہیں ہے اور اس کو اتنی بار دہرایا جاتا ہے کہ عوام بیچارے دب کر رہ جاتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے خطاب کہ یہود نے آپ ﷺ کو جھٹلا کر کوئی نیا کام نہیں کیا

۳۳۵ اس آیت میں نبی اعظم و آخر ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اگر یہ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ نہ یہ بات تمہاری کسی کوتاہی کے سبب ہے اور نہ اس وجہ سے کہ تم کو ان کے حسب منشاء معجزہ نہیں دیا جا رہا کیونکہ آپ ﷺ نے ان کے سامنے کوئی ایسا دعویٰ پیش نہیں کیا بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لانا ہی نہیں چاہتے اور جب کوئی ایک بات پہلے ہی ٹھان لے کہ مجھے یہ نہیں کرنا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں پھر یہ معاملہ خاص تمہیں کو پیش نہیں آیا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے حالانکہ وہ روشن دلائل' صحیفے اور اللہ کی طرف سے کتاب بھی لے کر آئے تھے۔ اس آیت میں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں بینات' زبر' کتاب منیر۔

بینات کے معنی واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنوں میں استعمال ہوا ہے ایک واضح اور مسکت دلائل کے معنی میں دوسرا حسی معجزات کے معنی میں اور معجزہ کی تعریف اصول تفسیر میں بیان کر دی گئی ہے وہاں سے ملاحظہ کر لیں۔

زبر۔ زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنی ٹکڑے' قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لئے اس کا استعمال معروف ہے اور اس جگہ بھی اس سے مراد انبیاء کرام کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

کتاب منیر سے مراد تورات ہے۔ قرآن کریم سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جس پر لفظ کا استعمال ہو سکتا ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اگرچہ دوسری قوموں کے دعویٰ بھی آسمانی کتب کے موجود ہیں۔

دنیوی زندگی کا حجاب اٹھے گا تو اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا

۳۳۶ گزشتہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو انبیاء علیہ السلام کی معاندانہ مخالفت کرتے رہے۔ اس

جگہ وضاحت فرما دی کہ ہر مخالفت کا فوراً بدلا دیا جائے یہ تو قانون الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ یہ دارالعمل ہے اور ہر مخالفت کا اگر اسی وقت بدلا مل جائے تو پھر دنیا کاہے کو رہی اور آخرت ہے تو وہ اس لئے ہے کہ اس میں اعمال کی جزاء دی جائے۔ پھر آخر ان کی مخالفت سے ہمارا کیا بگڑ رہا ہے جو کچھ بگڑ رہا ہے وہ ان کا اپنا ہی تو ہے اور یہ جو انبیاء کرام اور نیک لوگوں کی مخالفت سے ان کو دکھ پہنچ رہا اس کے بدلہ کے لئے بھی دارالجزاء ہی ہے اس لئے فرمایا کہ ہر عمل کا کھلا کھلا بدلہ تو اس زندگی میں نہیں ملتا اس کے لئے ہر شخص پر موت آنے والی ہے اور کھلے کھلے اور کامل اجر کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت یعنی قیامت کا دن مقرر کیا ہوا ہے اس لئے قانون الٰہی میں جو کچھ یہاں ملنا ان کا مقدر ہے وہ بھی ملتا ہے اور ملتا رہے گا لیکن اعمال کی پوری پوری جزاء و سزا تو تم قیامت کے دن ہی پاؤ گے۔ اس طرح آیت زیر نظر میں تہدید اور تسکین دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ منافقین و معاندین کیلئے یہ تہدید ہے اور اہل ایمان کے لئے پیغام تسکین' مطلب صاف ہے کہ تم کو اور تمہارے مخالفوں کو سب کو موت کی منزل سے گزرنا ہے اور بالآخر اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے اور پوری پوری جزاء و سزاء کیلئے قیامت کا دن مقرر ہے ہاں! یاد رہے کہ جو شخص اٹھا لیا گیا گویا اس کی قیامت آگئی۔ اس لئے کہ اس کو دوبارہ دارالعمل میں نہیں آنا ہے۔ اس لئے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کب قیامت آئے گی اور کب جزاء و سزاء ملے گی؟ تمہاری قیامت بس آئی کہ آئی۔

جو آتش دوزخ سے ہٹا لیا گیا گویا کامیابی اس کا مقدر ہوگئی

۳۳۷ وہاں بازی کون جیتا اور کون ہارا۔ فرمایا بس جو بازی جیت گیا وہ صحیح معنوں میں کامیاب ہوگیا اور اس کی کامیابی کا نشان؟ جنت میں داخلہ اور وہاں وہ کچھ ملے گا **ما لا عین رات ولا اذن سمعت ولا حطر علیٰ قلب بشر**۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کی اصل حقیقت آسکتی ہے کیونکہ وہ تصور میں سمانے والی چیز نہیں ہے۔ صحیح بخاری' مسلم' ترمذی' مسند احمد میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے اور قرآن کریم میں اللہ کا فرمان جس کی یہ تفسیر ہے وہ اس طرح ہے :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (السجدہ ۳۲ : ۱۷) "پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے۔"

اور یہ کامیابی جن کے حصے میں آئے گی ان کا ذکر اس طرح فرمایا :

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (التوبہ ۹ : ۲۰) "اللہ کے ہاں تو انہیں لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں۔" اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (الزمر ۳۹ : ۶۱) "جن

الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۱۸۵ لَتُبْلَوُنَّ

اور دنیا کی زندگی تو اسکے سوا کچھ نہیں کہ خواہشوں اور ولولوں کا کارخانہ فریب ہے۔ ۱۸۵ ۳۳۸

لوگوں نے یہاں تقویٰ اختیار کیا ہے ان کے اسباب کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گی اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المومن ۴۰ : ۹) "اے اللہ! جس کو تو نے قیامت کی برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔"

روز قیامت کی برائیوں سے مراد میدان حشر کا ہول' سائے اور ہر قسم کی آسائشوں سے محرومی' محاسبے کی سختی' تمام مخلوق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی اور دوسری وہ تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پڑنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ان سارے مواقع کی سختیوں سے بچا لیا گیا کامیابی اس کا مقدر بن گئی اور اس سے بڑھ کر کون خوش قسمت ہوگا اور ایسا رزلٹ جس کے حصے میں آئے گا یقیناً وہ پکار پکار کر کہے گا کہ آؤ میری سند کامیابی کو پڑھ کر دیکھو هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ۔

دنیا کیا ہے؟ خواہشوں اور ولولوں کا کارخانہ فریب ہے' اس کے سوا کچھ نہیں

۳۳۸ "اور دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ خواہشوں اور ولولوں کا کارخانہ فریب ہے" غرور غار کی جمع ہے جس کے معنی ہیں دھوکہ دینے والے۔ یعنی اس کے سارے عارضی فائدے دھوکہ ہی دھوکہ ہیں جن کی حقیقت پانی کے حباب کی طرح کچھ بھی نہیں کہ دکھائی بہت کچھ دیتا ہے لیکن حقیقت اس کی ایک آہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ دنیا ایک ایسا سامان ہے جو دوسروں کو چھوڑا ہوا ہے اور پھر چھوٹ جانے والا ہے۔ عنقریب دنیا اور دنیادار سب مٹ جائیں گے لہٰذا اس سامان میں سے تم اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ حسب توفیق لے لو لیکن اس پر انحصار کر کے بیٹھ مت رہو۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (الحدید ۵۷ : ۲۰) "خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی اور انجام کار وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے اور اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے۔" ایک جگہ فرمایا :

فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

خوب یاد رکھو کہ ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ

یہ بھی ضروری ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ (ھود ۱۱ : ۱۵) "جو لوگ اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔" ایک جگہ ارشاد ہوا :

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ○ (الرعد ۱۳ : ۲۶) "یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں۔ حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (العنکبوت ۲۹ : ۶۴) "اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔"

مختصر یہ کہ اس دنیائے دوں کی حقیقت بس اتنی ہے جیسے بچے تھوڑی دیر کے لئے کھیل کود لیں اور پھر اپنے اپنے گھر کو سدھاریں یہاں جو بادشاہ بن گیا ہے وہ حقیقت میں بادشاہ نہیں بن گیا ہے بلکہ صرف بادشاہی کا ڈرامہ کر رہا ہے۔ ایک وقت جب اس کا یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور اس بے سروسامانی کے ساتھ وہ تخت شاہی سے رخصت ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ اس طرح زندگی کی کوئی مشکل بھی یہاں مستقل اور پائیدار نہیں ہے جو جس حال میں بھی ہے عارضی طور پر ایک محدود ملت کے لئے ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی کامرانیوں پر جو لوگ مرمٹتے ہیں اور انہی کے لئے ضمیر و ایمان کی بازی لگا کر کچھ عیش و عشرت کا سامان اور کچھ شوکت و حشمت کے ٹھاٹھ فراہم کر لیتے ہیں ان کی یہ ساری حرکتیں دل کے بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کھلونوں سے اگر وہ دس بیس یا ساٹھ ستر سال دل بہلا لیں اور پھر موت کے دروازے کے خالی ہاتھ گزر کر اس عالم میں پہنچیں گے جہاں کوئی دائمی زندگی میں ان کا یہی کھیل بلائے بے درماں ثابت۔ ہو تو آخر اس طفل تسلی کا فائدہ کیا؟ ہاں اگر یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے کہ دنیا کی موجودہ زندگی صرف ایک مہلت امتحان ہے اور انسان کے لئے اصل زندگی جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے تو وہ اس جگہ امتحان کی مدت کو اس لہو و لعب میں ضائع نہ کرتے اور اس کے بجائے اس کا ایک ایک لمحہ ان کاموں میں استعمال کرتے جو اس ابدی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ جس کی سمجھ میں یہ بات آجائے اس کا اپنا فائدہ ہے اور گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ مزید تفصیل کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت

مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا
وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾ ۞ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ

سننی پڑیں ۳۳۹ لیکن اگر تم نے صبر کیا اور پرہیزگاری اختیار کی تو بلاشبہ اسلام کی راہ میں یہ
بڑے ہی عزم و ہمت کی بات ہے ۳۴۰۔ ۱۸۶

اور وہ وقت یاد کرو جب ایسا ہوا تھا کہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان سے اللہ

---

۱۵۵ کی تفسیر کو دیکھیں۔

جان و مال کی آزمائش میں تم بھی مبتلا ہوگے اور اہل باطل کی تلخ کلامی بھی سننا ہوگی

۳۳۹ کسی یہودی کی اس دریدہ دہنی پر کہ "اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ" اچھا! بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور یہ بات بولنے والے کو طمانچہ رسید کر دیا کہ کیسی بکواس کر رہے ہو؟ یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ دین کے لئے جان و مال کی قربانیوں سے اور کفار و مشرکین اور اہل کتاب کی بدزبانی کی ایذاؤں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ یہ سب ان کی آزمائش ہے اور اس میں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر سے اور برداشت سے کام لیں اور اپنے اصل مقصد کی تکمیل میں مصروف رہیں۔

اگر تم نے قیام حق کی خدمت عظیم اپنے سر لی ہے تو ضروری ہے کہ اس راہ کی تمام آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑے۔ اہل کتاب اور مشرکین عرب دونوں تمہاری مخالفت میں کمربستہ ہوگئے ہیں وہ طرح طرح کی اذیتیں تمہیں پہنچائیں گے اور تمہیں برداشت کرنا پڑیں گی تمہاری کامیابی کے لئے اصل چیز صبر اور تقویٰ ہے۔ اگر تم نے صبر کیا تو تمہارا اجر محفوظ رہے گا اور بلاشبہ تم خود کامیابی سے ہم کنار ہوگے۔ قرآن کریم نے ان کی اس طرح کی ایذا رسانیوں کا ذکر دوسرے مقامات کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ (النساء ۴ : ۴۶) "اے پیغمبر اسلام! ان یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" اور "اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" اور "رَاعِنَا" اسی طرح وہ دین حق کے خلاف نیش زنی کرتے ہیں اور زبانوں کو توڑ موڑ کر مطلب کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔"

یعنی جب ان کو اللہ کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں کہ سَمِعْنَا ہم نے سن لیا اور آہستہ دل میں کہتے ہیں عَصَيْنَا کہ ہم نے قبول نہیں کیا یا اَطَعْنَا ہم نے قبول کیا کا تلفظ اس انداز سے زبان

کو پیچ دے کر کہتے ہیں کہ وہ عَصَیْنَا بن جاتا ہے۔ اس طرح دوران گفتگو جب وہ کوئی رسول اللہ ﷺ سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں اِسْمَعْ یعنی ہماری بات سنئے اور پھر اس کے ساتھ "غَیْرَ مُسْمَعٍ" بھی بڑھا دیتے ہیں جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ خدا تمہیں بری بات نہ سنوائے اور دوسرے یہ بھی کہ "بہرہ ہو جاؤ" اسی طرح "رَاعِیْنَا" بولتے جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہماری طرف التفات کیجئے اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ اے ہمارا چرواہے اس طرح وہ زبانوں کو پیچ دے دے کو وہ بات کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں اور پھر جب مجلس سے اٹھتے ہیں اور کہیں دوسری جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر ان حرکات پر پھبتیاں کستے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں سے دلی دکھ پہنچنا فطری امر ہے لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ اس کو برداشت کرو کہ عنقریب نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ○ (النساء ۴ : ۵۱) "اور وہ کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

علمائے یہود کی ہٹ دھرمی اور ضد و عناد یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ جو لوگ نبی اعظم و آخر ﷺ پر ایمان لائے تھے ان کو وہ مشرکین عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین زیادہ راہ راست پر ہیں حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شریک کا شائبہ تک نہیں اور دوسری طرف صریح بت پرستی ہے جس کی مذمت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔ لیکن ستیاناس اس مخالفت کا یہ کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی اور اپنے مخالف کی اچھی سے اچھی بات سے بھی کیڑے نکالنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور دوسروں کی بھلی بات بھی بری لگتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ :

وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِهِ اللّٰهُ وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (المجادلۃ ۵۸ : ۸) "اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقہ سے سلام کرتے ہیں جس طریقہ سے اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا اور پھر اپنے دلوں میں یا اپنی مجلسوں میں اپنے لوگوں سے کہتے ہیں ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔" مزید تفصیل کے لئے دیکھو آل عمران کی آیت ۱۱۱ اور ۱۱۸ کی تفسیر زیر نظر جلد میں۔

مشرکین اور یہود کی ایذا رسانیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھو

۳۴۰ آیت کے آخر میں فرمایا کہ "اگر تم نے صبر کیا اور پرہیزگاری اختیار کی تو بلاشبہ اسلام کی راہ میں یہ بڑے ہی عزم و ہمت کی بات ہے۔" کیوں نہ ہو جتنا کام مشکل ہوگا اتنا ہی عزم و ارادہ پختہ کرنا ہوگا۔ مخالفین کی ایذا رسانیوں کو برداشت کرنا اور صبر و استقلال سے اپنا کام جاری رکھنا بلاشبہ بہت بڑی ہمت اور دل گردہ کی بات ہے خصوصاً جب اللہ نے طاقت بھی دی ہو تو مصلحتاً طاقت کا استعمال نہ کرنا اور بھی مشکل امر ہے صبر کیا ہے؟ آزمائشوں کے وقت بے قرار نہ ہونا اور فرمانبردار رہتے ہوئے مصائب پر کسی طرح کا دھیان دیئے

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا

نے اس بات کا عہد لیا تھا کہ اسے لوگوں پر واضح کرتے رہنا اور ایسا نہ کرنا کہ اسے چھپانے لگو لیکن انہوں نے کتاب اللہ کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا[۳۴۱] اور اسے تھوڑے داموں فروخت کر ڈالا پس کیا ہی برے وہ دام ہیں جو حق فروشی کے بدلے حاصل کئے

بغیر اپنا کام جاری رکھنا اور تقویٰ کا بھی تقاضا کچھ اس طرح کا ہے کہ کانٹوں سے بچ بچا کر صحیح سالم منزل مقصود تک پہنچ جانا اور صبر اور تقویٰ دونوں کا امتزاج ایک راہ رو سے جو تقاضا کرتا ہے اس کا انجام بلاشبہ عزم و ہمت کی بات ہے اور پھر جس چیز کو خود اللہ تعالیٰ عزم الامور فرما رہا ہے جس کو یہ میسر آجائے اس کی کیا ہی شان ہوگی؟ قرآن کریم میں ایک جگہ لقمان علیہ السلام کی نصیحت جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی اس کا بیان اس طرح کیا ہے :

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (لقمان ۳۱ : ۱۷) "بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جو بڑی عزم و ہمت کی ہیں اور ان کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔"

بیٹے کو بات سمجھا دی کہ جو شخص بھی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام کرے گا اس پر مصائب کا نزول ناگزیر ہے۔ دنیا لازماً ایسے شخص کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے۔ فرمایا کہ بیٹے! یہ بڑے حوصلے کا کام ہے اصلاح خلق کے لئے اٹھنا اور اس کی مشکلات کو انگیز کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کام لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ ہاں! ہاں! یہ کام لوہے کے چنے چبانا ہی ہے۔

یہود کو کتاب اللہ دی گئی تھی لیکن انہوں نے اس کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا

۳۴۱ زیر نظر آیت میں علماء یہود کے اس جرم کا بیان ہو رہا ہے کہ ان کو کتاب دی گئی تھی کہ اس میں جو احکام ہیں بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دو اور اس میں سے کچھ مت چھپاؤ لیکن انہوں نے اپنی دنیوی اغراض کے لئے اور طمع نفسانی کی خاطر اس عہد کی پرواہ نہ کی اور بہت سے احکام کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا اگر وہ اس جرم کے مرتکب نہ ہوتے اور لوگوں تک صحیح صحیح حق پہنچاتے تو پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی آپ ﷺ کو تسلیم کر لیتے اور آج اس مخالفت اور سب و شتم سے جو وہ کام لے رہے ہیں اس کی بجائے وہ پیغمبر

اعظم و آخر ﷺ کے معین و مددگار ہوتے کیونکہ اللہ کی کتاب تورات میں تو پیش گوئیاں کھلے اور واضح الفاظ میں موجود ہیں جو نبی اعظم و آخر ﷺ کی بعثت کے متعلق ہیں۔ پھر اس مخالفت سے انہوں نے دراصل اپنی کتاب جس کو وہ خود بھی کتاب اللہ مانتے ہیں پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے اور ان کی پرواہ نہیں کی پھر ان پیشین گوئیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اور بھی بہت سے احکام کو جو تورات میں بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں چھپایا اور بہت کچھ اپنے پاس سے اور اپنے رسم و رواج سے اٹھا کر اللہ کے احکام میں رکھ دیا ہے اور یہ انہیں پر زور دیتے ہیں اور ان کو ثابت کرنے کی دن رات کوشش کرتے رہتے ہیں۔

یہود کی اس گمراہی کا ذکر کر کے ایک طرف یہود کو ان کے اس جرم سے آگاہ کیا ہے اور دوسری طرف اہل اسلام کو یہ سمجھایا ہے کہ دیکھو اہل کتاب ایسے جرائم کے مرتکب ہو چکے ہیں تم کو بھی اللہ کا آخری پیغام پہنچایا جا رہا ہے تم چوکنے رہنا اور ایسے جرائم کا مرتکب نہ ہونا بلکہ پیشین گوئی کے طور پر یہ فرما دیا کہ تم پر بھی وہ وقت آئے گا کہ تمہارے علماء بھی اللہ کی کتاب قرآن کریم کو کھول کر لوگوں کے لئے بیان نہیں کریں گے بلکہ اس کے احکام کے چھپانے کے مرتکب ہوں گے اور اس کے عوض دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے حاصل کریں گے اور اس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے کہ قرآن کریم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور دنیا داری کو حاصل کرنے کی دوڑ لگائی جا رہی ہے۔

اس جگہ اس جرم کے دو پہلو بیان کئے گئے ہیں ایک کتاب کو کھول کر بیان نہ کرنا اور دوسرا اس کو چھپانا۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا کیا ہے؟ کھول کر بیان کرنا یہ ہے کہ جو احکام اس میں عمل کے لئے ہیں ان کو کھول کر عمل کے لئے پیش کیا جائے اور لوگوں کو ان اعمال کی طرف دعوت دی جائے بلکہ ان کو ان اعمال پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ وہ اس کو کتاب اللہ مان چکے ہیں اور خود اعمال کر کے ان لوگوں کو متاثر کیا جائے جو ابھی ایمان ہی نہیں لائے اور اس طرح لوگوں کو ان اعمال کی طرف دعوت دی جائے لیکن افسوس کہ آج ہم ان قصوں میں پڑ گئے ہیں جن کا نام و نشان بھی قرآن کریم میں نہیں ہے اور شنیدہ قصوں کو قرآن کریم کی تفسیر قرار دے دیا ہے اور اس طرح قرآن کریم کے ان سادہ اور واضح اور روشن احکام کو اپنی دماغی عیاشی سے عجیب سے عجیب تر بنا دیا ہے اور پھر جب اس پر ایک مدت گزر گئی اور اس طرح کی یہ ساری باتیں یہود کی پیروی میں کتاب اللہ میں بطور تفسیر بھر دی گئیں تو آج وہ ہمارے لئے حجت اور دلیل بن گئیں کہ دیکھو فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ تم اللہ کی کتاب کو بیان کر رہے ہو تو وہ اللہ کے فضل سے تمہارے پاس من و عن موجود ہے اور اللہ نے اس کے محفوظ رکھنے کی جو ذمہ داری لی تھی وہ اس طرح پوری کی ہے کہ اس میں ایک حرف بھی اوپر نیچے نہیں ہونے دیا تم اس کو بیان کرو ان قصوں کو کیوں بیان کرتے ہو جو اس کے اندر لا کر باہر سے رکھ دیئے گئے۔ تمہارا کام تو یہ چاہئے تھا کہ تم ان کو اٹھا کر قرآن کریم کی اصلی حقیقت لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن تم نے کیا کیا؟ وہی جو اہل کتاب اور خصوصاً یہود تم سے

پہلے کر چکے۔ پھر اگر انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ ظلم کیا تھا تو وہ اس کی پاداش میں ذلیل و خوار ہوئے اور تم جب اس جرم کے مرتکب ہو چکے تو تم کو اس کے نتیجہ سے دوچار نہیں ہونا تھا؟ کیا اللہ ظالم ہے؟ ایک گروہ کو تو ایک جرم کی سزا دے اور دوسرے کو اس جیسے جرم پر انعام و اکرام دے۔ عقل کے ناخن لو اور حق کو لوگوں کے بنائے ہوئے قصے کہانیوں میں مت چھپاؤ۔

تعجب ہے کہ آج ہم نے لوگوں کو صرف یہ بتایا کہ اہل کتاب نے کتاب اللہ کی طرف پیٹھ کر دی تھی تم اس کی طرف پیٹھ نہ کرنا بلکہ اس کو آنکھوں اور ماتھے پر رکھنا۔ اور پھر لوگوں کے سامنے قرآن کریم کو کھول کر اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر منہ پر مارے اور چوم کر ماتھے سے لگایا' اس لئے لوگوں نے آج یہی سمجھ لیا کہ جس شخص نے قرآن کریم کو کھول کر اس سے یہ کام کر لیا کہ ہاتھ پھیر کر منہ پر مل لئے اور الٹی سیدھی چار آیتیں بغیر سمجھے پڑھ لیں پھر اس کو چوم کر ماتھے پر بھی لگا لیا اور اس طرح کے سارے کام کے بعد اس کو غلاف میں بند کر کے اوپر کہیں طاق پر ٹکا دیا تو گویا وہ اس حکم سے بری الذمہ ہو گیا اور اب وہ دنیا کے کاموں میں مصروف ہو کر کم تولے۔ کم ماپے۔ جھوٹ بولے۔ فریب و مکاریاں کرے۔ لوگوں کی چیزوں میں ملاوٹ کرے۔ ملک کی ساری پیداوار کو خرید کو سٹوروں میں بند کر دے اور اس طرح مصنوعی قلت پیدا کر کے دگنے تگنے دام کمائے۔ لوگوں کی مشکلات میں چاہے جتنا اضافہ کرے آخر وہ ماشاء اللہ پکا مومن اور متقی ہے۔ اب اس کو کون کہہ سکتا ہے کہ تو نے قرآن کریم کی طرف پیٹھ کر دی ہے۔ اس طرح جو بھی کہے گا وہ جھوٹا ہو گا کہ اس نے جھوٹ بولا کیونکہ اس اللہ کے بندے نے تو قرآن کریم کو اتنا اوپر لے جا کر رکھا ہے کہ کوئی مائی کا لال اس کی طرف پیٹھ کر ہی نہیں سکتا۔

اس پر طرہ یہ کہ یہ اللہ کا بندہ اتنا نیک اور اتنا مخیر ہے کہ ہر ماہ دو ماہ کے بعد کوٹھی میں قرآن ختم کراتا ہے اور ہر جمعرات کو دیگ پکا کر تقسیم کرتا ہے۔ کتنی مسجدوں میں چندہ دیتا ہے اور علمائے کرام کی خدمت اس سارے کام سے سوا ہے۔ حج بھی کیا ہے اور ہر مہینے اس کی منتھلی بھی درس گاہ میں باقاعدہ پہنچ جاتی ہے یہ صدقہ جاریہ کے اتنے کام اس نے سنبھال رکھے ہیں۔ آخر وہ دنیا میں اس طرح کے کام نہیں کرے گا تو یہ سارے نیک کام کون سرانجام دے گا اور ان مساجد کا کیا بنے گا جن میں وہ چندہ دیتا ہے اور ان علماء کرام کا کیا ہو گا جن کی خدمت وہ کر رہا ہے اور وہ درسگاہیں کیسے قائم رہیں گی جہاں اس کی منتھلی پہنچتی ہے۔ کوئی اندھا ہی ہو گا جو یہ سارے کام دیکھنے کے بعد بھی کہے گا کہ اس نے قرآن کریم کی طرف پیٹھ کر دی ہے۔

اس کو کون سمجھائے کہ قرآن کریم کے احکامات پر عمل نہ کرنے سے قرآن کی طرف پیٹھ ہو جاتی ہے اور قرآن کو پیٹھ پیچھے پھینکنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی من مانی کی جائے جیسے چاہے کمائے اور جیسے چاہے خرچ کرے۔ قرآن کریم کی طرف پیٹھ نہ کرنے اور اس کے پیٹھ پیچھے نہ پھینکنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ تاجر ہے تو تجارت ان احکامات کے مطابق کرے جو احکام قرآن نے تجارت

يَشْتَرُونَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ

گئے۔ ۳۴۲ ۱۸۷

اے پیغمبر اسلام! جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان

کرنے کے دیئے ہیں اور ان اشیاء کی تجارت کرے جن اشیاء کی تجارت کرنے کا حکم دیا ہے اور تجارت کے ان کاموں سے رک جائے جن سے قرآن کریم نے روکا ہے اور ان اشیاء کی تجارت سے بھی پیچھے ہٹ جائے جن کی تجارت سے منع کیا ہے۔ ان طریقوں کے مطابق عمل کرنے کے بعد اس کو جو نفع حاصل ہو اس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے مطابق خرچ کرے تاکہ وہ دین و دنیا میں سرفراز ہو۔

حق فروشی کے دام جہنم ہی میں پہنچائیں گے کیونکہ یہ راستہ جہنم ہی کو جاتا ہے

۳۴۲ حق حق ہے اور باطل باطل۔ یہ دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے اس لئے کہ جو حق ہے وہ باطل نہیں تب ہی وہ حق ہے اور جو باطل ہے وہ حق نہیں تب ہی وہ باطل ہے۔ مذہبی علماء کا کام تو یہ ہے کہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر کے لوگوں تک پہنچائیں لیکن انہوں نے کیا کیا؟ کہ حق اور باطل کو ملا کر رکھ دیا کبھی باطل کو حق کے نیچے چھپایا اور کبھی دونوں کو ملا جلا کر ایک کرنے کی کوشش کی۔ فرمایا یہ سارا کچھ کیوں کیا؟ اس لئے کہ اس سے ان کو خوب دام ملتے ہیں اور آخر وہ کون ہے جس کو دام نہیں چاہئیں؟ غور کرو۔ فکر کرو کہ جب بھی کسی مذہبی راہنما نے دام کمائے تو اس طرح کمائے اور جس نے ایسا نہیں کیا اس کو دھکے ملے۔ گالیاں ملیں۔ استہزاء کا نشانہ بنا۔ کفر کے فتوے لگے اس کے سوا اس کو کیا ملا؟

فرمایا بالکل صحیح ہے کہ دام اس کو ملے جس نے حق و باطل ملایا یا باطل کو حق کے نیچے چھپایا۔ لیکن یہ دام اس کو کہاں لے گئے؟ ارشاد ہوا کہ یہ دام برے تھے اور بری چیز کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (التوبہ ۹ : ۳۴) "مسلمانو! یاد رکھو کہ علماء و مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق، ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں۔"

یعنی یہ ظالم اتنے دلیر ہیں کہ لوگوں کا مال بھی کھاتے ہیں اور ان کو سیدھی راہ سے بھی روکتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ ستم یہ لوگ اس طرح ڈھاتے ہیں کہ فتوے بیچتے ہیں۔ رشوتیں کھاتے ہیں۔ نذرانے لوٹتے ہیں۔ ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدتے ہیں اور ان کا مرنا جینا اور شادی و غم کچھ بھی ان کو کھلائے بغیر نہ ہو سکے اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکہ دار ان

کو سمجھ لیں بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلق خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوت حق اصلاح کے لئے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ (الاعراف ۷ : ۱۶۹) "پھر ان لوگوں کے بعد ناخلفوں نے ان کی جگہ پائی اور کتاب اللہ کے وارث ہوئے۔ وہ دین فروشی کر کے اس دنیائے حقیر کی متاع بے تامل لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی تو ہمیں معافی مل ہی جائے گی اور اگر انہیں کوئی متاع اس طرح فریق ثانی سے ہاتھ آجائے تو اسے بھی بے تامل لے لیں کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہیں مگر وہی جو سچ ہو اور کیا جو کچھ کتاب میں حکم دیا گیا ہے وہ پڑھ نہیں چکے ہیں؟"

یعنی ان کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ یہ لوگ گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر اس بھروسے پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور خواہ ہم کچھ ہی کریں بہرحال ہماری مغفرت ہونا ضروری ہے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد نہ وہ شرمندہ ہوتے نہ توبہ کرتے ہیں۔ بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدنصیب لوگ! اس کتاب کے وارث ہوئے جو ان کو دنیا کا امام بنانے والی تھی مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخہ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاع حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے علمبردار اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے محض دنیا کے کتے بن کر رہ گئے۔

کیا دینی مصلحت کے لئے حکم الٰہی چھپایا جا سکتا ہے اور دبایا بھی؟

ہاں! چلتے چلتے ایک بات مزید سن لیں کہ ہمارے علماء نے اس آیت کے تحت یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "یہود نامسعود اپنی دنیوی اغراض و مقاصد کے تحت حق کو چھپاتے تھے اور لوگوں سے مال بھی وصول کرتے تھے اور اگر کسی دینی اور شرعی مصلحت سے کوئی حکم عوام پر ظاہر نہ کیا جائے تو وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ تعلیمات اسلامی سے یہ بات روشن ہے کہ بعض اوقات کسی حکم کے اظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس خطرہ کی بناء پر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔" پھر اس خطرہ کے تحت ان کو جتنے احکام حق و باطل کے نیچے کسی نہ کسی زمانے میں دبائے گئے نظر آتے ہیں تو وہ ان کا نام "لینا گناہ عظیم" جانتے ہیں کہ اس سے فتنہ کھڑا ہوگا لہٰذا حق کو اس طرح چھپا رہنے دینا دینی مصلحت ہے اور پھر جب بھی کوئی ایسے حق کو ان باطل کے تہہ در تہہ پردوں کے نیچے سے اٹھا باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ

اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ

کاموں کے لئے سراہے جائیں جو انہوں نے کبھی نہیں[۳۴۳] کئے تو تم ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ وہ

کلہاڑیاں' لاٹھیاں' ڈنڈے اور رسیاں لے کر اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور شور کرتے ہیں کہ مارو مارو اس کم بخت نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کا یہ شور سن کر عوام اٹھتے ہیں اور جنت حاصل کرنے کے نشہ میں وہ ان ہی کی کلہاڑیوں' ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے اس بچارے کو قتل کر کے انہی کی رسیوں سے باندھ کر جب تک کسی اندھے کنوئیں میں نہیں ڈال دیتے یہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ اس طرح کے دینی مسئلے انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں گھوٹ گھوٹ کر پئے تھے۔ کیونکہ بہت سی دینی درسگاہوں میں صرف یہی کام ہوتا ہے اور اس طرح یہ گھوٹ گھوٹ کر پینے والے اب گرینڈ کر کر کے آگے آنے والوں کو پلاتے ہیں اور اگر کسی قسمت کے مارے نے یہ رگڑا نہ لگایا ہو تو ان کا تکیہ کلام ہی یہ ہوتا ہے کہ "اجی یہ تو کہیں پڑھا نہیں نہ اس کے پاس کوئی سند ہے۔" یہ کیا جانے کہ دو اور دو پانچ کیسے ہوتے ہیں؟

اپنے قریب کے زمانہ کے ان پڑھوں کی فہرست کے چند نام بھی سن لیں تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو جائے۔

شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ' الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ' ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ' عنایت اللہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ' ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ' عبدالماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ' عبدالحئی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ' محمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ' ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ' امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ' حافظ عنایت اللہ اثری رحمۃ اللہ علیہ' ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور سرسید مرحوم و مغفور کو سارے ان پڑھوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس اوپر کے ان پڑھوں کا یا تو ان کو علم نہیں یا جان بوجھ کر کسی دینی مصلحت کے لئے چھپائے ہوئے ہیں۔

مزید تفصیل کے لئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت (البقرہ ۲ : ۱۰۱)' (۲ : ۱۰۲)' (۲ : ۱۵۹) اور (۲ : ۱۷۴) کا مطالعہ کریں۔

کچھ لوگ اپنے اس کرتوت پر خوش ہیں کہ کام لوگ کریں اور مدح سرائی ان کی ہو

۳۴۳ اس سے مراد یہود بھی ہو سکتے ہیں اور منافق بھی کیونکہ یہ بات ان دونوں گروہوں کی صفات سے ملتی جلتی ہے اور تفہیم یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص نیک عمل کرنے کے بعد اس پر مدح و ثناء کا انتظار و اہتمام کرے تو نیک عمل کرنے کے باوجود بھی قواعد شرعیہ کی رو سے یہ مذموم ہے اور نہ کرنے کی صورت میں تو اور بھی زیادہ مذموم ہے اور یہ ان لوگوں کی صفت ہے جو بیٹھا بیٹھا ہپ ہپ کرنے کے عادی ہوتے ہیں خواہ

وہ کسی قوم سے ہوں۔ جب بھی کہیں کوئی تعریف کی بات ہو خواہ وہ کیسی ہو اس لئے کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو شرعاً اچھی نہیں لیکن لوگ ان کو اچھا سمجھتے ہیں اور ایسی بھی ہیں کہ وہ شرعاً بہت اچھی ہوتی ہیں لیکن لوگ ان کو اچھا نہیں سمجھتے۔ لیکن ان لوگوں کا وصف یہ ہے کہ وہ بات جو لوگ اچھی سمجھتے ہیں فی نفسہٖ وہ اچھی ہو یا بری بہرحال وہ اس میں اپنا نام رکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور وہ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہر وہ بات جس کی لوگ تعریف کریں اس میں ہمارا نام پہلے ہونا چاہئے۔ حاصل کلام یہ کہ یہ لوگوں کے منہ سے اپنی تعریف ہی سننے کی خواہش رکھتے ہیں اور جب بھی کوئی کلام کرتے ہیں تو اس میں یہ پہلو ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے برے کو بھی اچھا کر کے بیان کریں اور دوسروں کے اچھے کا بھی ان کے سامنے ذکر نہ ہو اگر ہو تو کسی برائی کے رنگ ہی میں ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اس کا واقع اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو طلب فرمایا اور ان سے کوئی بات پوچھی۔ یہودیوں نے اصل بات چھپالی اور کوئی دوسری بات بتائی اور رسول اللہ ﷺ پر ظاہر یہ کیا کہ آپ ﷺ نے جو کچھ دریافت کیا تھا ہم نے وہی بتایا اور اس فعل پر انہوں نے مستحق تعریف بھی بننا چاہا لیکن اپنی جگہ پر وہ اندر ہی اندر خوش تھے کہ ہم نے وہ بات چھپالی جو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمائی پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو تلاوت کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غلط بیانی کر کے اس پر اپنی تعریف رسول اللہ ﷺ سے سننا چاہتے تھے اگرچہ ان کو یہ بات نصیب نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے اور اس طرح اس واقعہ کو بیان کر کے رسول اللہ ﷺ کی امت کو یہ درس دے دیا گیا کہ وہ بھی اچھے اور برے، کھوٹے اور کھرے، صحیح اور غلط میں امتیاز پیدا کریں اس لئے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

اس لئے کہ وہ خود بھی ایسی بیماری میں مبتلا نہ ہوں اور دوسروں کی تعریفوں سے بھی خوشامد کے طور پر ان کی تعریفوں کے پل نہ باندھیں بلکہ ہر حال میں حقیقت کا دامن تھامیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ کتب احادیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ "کچھ منافق ایسے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جہاد پر جاتے تھے تو وہ پیچھے رہ جاتے تھے اور جہاد میں شامل نہیں ہوتے تھے اور اس طرح اپنے بیٹھ رہنے سے خوش ہوتے تھے لیکن جب نبی اعظم و آخر ﷺ بخیریت واپس تشریف لاتے تو یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر معذرت پیش کرتے تھے اور ناکردہ نیکی پر آپ ﷺ کے منہ سے تعریف کے خواستگار ہوتے تھے اور اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ بہرحال آیت کا نزول کچھ بھی ہو۔ آیت کا حکم عام ہے اس صفت کے لوگ اس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ بلکہ کثرت سے ہیں اور کسی شہر، قصبہ یا دِہ میں جتنے وڈیرے اور کھاتے پیتے لوگ ہیں ان میں تو اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے اور پھر علماء کے طبقہ میں تو یہ بات دن رات دیکھنے میں آتی ہی رہتی ہے کہ وہ اپنے علم کی ڈینگیں مارتے ہیں اور ہم چوں ما دیگرے سے نیت کی نعرہ بازی ان کی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے۔ ان کی اس فرحت کا ذکر قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آیا ہے۔

اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (۱۱ : ۱۰) لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ (۲۸ : ۷۶) وَابْتَغِ فِيْمَا اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۷۷) حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ (۱۰ : ۲۲) فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳ : ۲۶) بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ○ (۲۷ : ۳۶) لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۵۷ : ۲۳) وَاِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا (۴۲ : ۴۸) فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ (۴۰ : ۸۳) كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (۲۳ : ۵۳) وَفَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰ : ۳۲) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْٓا (۶ : ۴۴) فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ (۹ : ۸۱) اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَهُمْ فَرِحُوْنَ ○ (۹ : ۵۰)

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اللہ سے بے نیاز اور آخرت سے بے فکر ہو کر صرف دنیا کے لئے کیا۔ دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھ لیا۔ لوگوں کو راہ بتاتے رہے لیکن اپنی راہ گم ہونے کا انہوں نے کبھی نہ سوچا۔ دنیا کی کامیابیوں اور خوشحالیوں ہی کو اپنا مقصد بنایا۔ خدا کی ہستی کے اگر قائل ہوئے بھی تو اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ اس کی رضا کیا ہے اور ہمیں کبھی اس کے حضور جا کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ اپنے آپ کو محض ایک خودمختار و غیر ذمہ دار حیوان عاقل و عالم سمجھتے رہے جس کے لئے دنیا کی اس چراگاہ سے تمتع کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کو خود ہی اچھا سمجھتے ہیں فی نفسہ و کتنا برا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ○ (الکھف ۱۸ : ۱۰۴)

"یہی لوگ ہیں جن کے سارے کام اکارت گئے اور وہ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں۔"

ان کے سارے غلط صحیح کام ان کی نظر میں کیسے اچھے ہوگئے قرآن کریم کہتا ہے کہ "اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ" شیطان نے ان کے لئے اس روش کو سہل بنا دیا ہے اور پھر شیطان کی اس روش کا ذکر قرآن کریم میں جگہ جگہ کیا گیا۔ آپ کے مطالعہ کے لئے ایک فہرست پیش خدمت ہے قرآن کریم کے ان مقامات کا مطالعہ انشاء اللہ تمہاری آنکھیں کھول دے گا۔

وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۵۸ : ۱۸) زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ (۲۷ : ۴) وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۲۹ : ۳۸) وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶ : ۴۳) اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (۳۵ :

الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

عذاب سے بچے رہیں گے۔ نہیں! ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ ۱۸۸ ۳۴۴

اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے اندازہ

۸) إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (۲۷ : ۴) زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ (۱۳ : ۳۳) وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ (۴۰ : ۳۷) كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶ : ۱۲۲) وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ (۷ : ۲۰۲) قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ يَقُولُ أَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ (۳۷ : ۵۲) تَاللّٰهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلٰى أُمَمٍ مِنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۶ : ۶۳) وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا (۴ : ۳۸) قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلٰكِنْ كَانَ فِي ضَلٰلٍ بَعِيدٍ (۵۰ : ۲۷) وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۴۱ : ۲۵) وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خٰسِرِينَ (۴۱ : ۲۵) إِنَّ الشَّيٰطِينَ لَيُوحُونَ إِلٰى أَوْلِيَآئِهِمْ (الانعام ۶ : ۱۲۱) يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (۶ : ۱۱۲) إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِينَ أَوْلِيَآءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (۷ : ۲۷) إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ (۷ : ۳۰) وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ (۴۳ : ۳۶) وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ (۴۳ : ۳۷) حَتّٰى إِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَّلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ○ (۴۳ : ۳۹) وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُفْرَطُونَ ○ (۱۶ : ۶۲) يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ (۹ : ۶۲) يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ (۹ : ۹۶) يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا (۴ : ۶۲) وَلَيَحْلِفَنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ (۹ : ۱۰۷) إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَآءَهُمْ ضَآلِّينَ فَهُمْ عَلٰى آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ (۳۷ : ۶۹ : ۷۰)

دنیا ہی کے ہو کر رہ جانے والے رسوا کن عذاب میں پھنس کر رہ جائیں گے

۳۴۴ ذرا غور کرو کہ کتنی ہی زندگیاں ہیں جن کا ہر لمحہ طرح طرح کی کوششوں میں بسر ہوتا ہے لیکن ان کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوتی اور جب پردہ غفلت ہٹتا ہے تو صاف دیکھ لیتے ہیں کہ جدوجہد کی ساری زندگی رائیگاں گئی! وہ ہمیشہ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات بنائی اور فلاں فلاں کام میں

الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی

قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ ۱۸۹ ۳۴۵

بلاشبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن ایک کے بعد ایک آتے

کامیابی حاصل کر لی اور فلاں کارخانہ لگا لیا حالانکہ بنتا وتنا کچھ بھی نہیں بلکہ سر تا سر بگڑتا ہی جاتا ہے دنیا کی چند روزہ زندگی بلحاظ دنیا اچھی بھی گزر گئی اور آخرت میں ناکامی کا سامنا گزرے دنوں پر پانی پھیر دے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ تم کو معلوم ہے کہ تم نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ جو چیز حق نہ تھی اس کی تم نے پیروی کی بلکہ تم اس غیر حق پر ایسے مگن رہے کہ جب حق تمہارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے اس کی طرف التفات نہ کیا اور الٹے اپنی باطل پرستی پر اتراتے رہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ○ (المؤمن ۴۰ : ۷۵) "ان سے کہا جائے گا کہ تمہارا یہ انجام اس لئے ہوا کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے اور پھر اس پر اتراتے تھے۔"

آسمانوں اور زمین کی اصل بادشاہی تو اللہ ہی کی ہے باقی سب بکھیڑے ہیں

۳۴۵ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے یعنی اللہ کے زیر فرمان ہے۔ پس اگر وہ تمہیں کامیابی و کامرانی اور سربلندی عطا فرمانا چاہے تو تمہاری راہ کو کون روک سکتا ہے؟ لیکن ہاں! شرط کامیابی یہ ہے کہ تم راہ حق پر استوار رہو۔ لیکن کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے کسی کے ماننے نہ ماننے سے حقیقت کبھی بدل نہیں جاتی زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں' جباروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی ہے نہ کسی نبی یا ولی یا دیوی اور دیوتا کا اس میں کوئی حصہ ہے بلکہ اس کا مالک اکیلا اللہ ہی ہے اس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بل بوتے پر جیت سکتا ہے نہ ان ہستیوں میں سے کوئی آکر اسے بچا سکتی ہے جنہیں لوگوں نے اپنی حماقت و بے وقوفی سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا :

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ○ (لقمٰن ۳۱ : ۲۶) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز ہے اور آپ سے آپ محمود ہے۔"

وہ آپ سے آپ محمود ہے کا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں اور نہ کسی کے کفر سے اس کا کوئی نقصان ہے۔ جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر اس کے اپنے لئے نقصان

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى

رہنے میں اربابِ عقل و دانش کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ ۳۴۶ ۱۹۰

اربابِ عقل و دانش وہ لوگ ہیں جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں

وہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ تو آپ سے آپ محمود ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے کمال و جمال اور اس کی خلاقی و رزاقی پر شہادت دے رہا ہے اور ہر مخلوق زبان حال سے اس کی حمد بجا لا رہی ہے ایک انسان ہی ایسا ناکارہ ہے جو اس سے سر پھیر جائے تو پھیر جائے لیکن اس سے سر پھیر کر وہ کس کا نقصان کرے گا؟ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ○ (الشوریٰ ۴۲ : ۴۹، ۵۰) "اللہ ہی زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے' جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز کا اندازہ مقرر کرنے والا ہے۔"

گویا اللہ تعالیٰ کے مطلق العنان ہونے کا ایک کھلا ہوا ثبوت۔ ہاں۔ کوئی انسان خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار خواہ اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے اللہ نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا۔ جسے اللہ نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا اور جسے اللہ نے لڑکے ہی لڑکے دیئے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اس معاملہ میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے بلکہ بچے کی پیدائش سے پہلے کوئی یہ حتمی بات معلوم نہ کر سکا کہ رحم مادر میں لڑکا پرورش پا رہا ہے یا لڑکی اور اس مشینی دور میں کسی آلہ کے ذریعہ معلوم ہو بھی جائے تو کیا وہ لڑکے کو لڑکی یا لڑکی کو لڑکا بنا دے گا تو پھر ایسا علم مفید کیا رہا؟ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختار کل ہونے کا زعم کرے یا کسی دوسری ہستی کو اس کے اختیارات میں دخیل سمجھے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے جس کا خمیازہ وہ بھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ بھر بھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

کائنات کے ذرہ ذرہ میں توحید الٰہی کے نشانات موجود ہیں

۳۴۶ ذوق نے کیا ہی عجیب کہا کہ ۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

چنانچہ اسی زیر نظر آیت میں قرآن کریم رات اور دن کے اختلاف کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر غور کرو تو اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمدورفت کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے زندگی کے لئے بڑی ہی تسکین و دلبستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ اگر قطبین کے اطراف میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف اپنی نمود نہیں رکھتا تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ اختلاف گزران حیات کے لئے کیسی عظیم الشان نعمت ہے اس لئے اشارہ فرمایا "آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب عقل و دانش کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔"

رات اور دن کے اختلاف نے معیشت کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کی روشنی' جدوجہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی اور یہی وہ رحمت الٰہی ہے جس کا خود قرآن کریم نے بھی ذکر فرمایا ہے :

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (القصص ۲۸ : ۷۳) "اور دیکھو یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن الگ الگ ٹھہرا دیئے گئے تاکہ رات کے وقت راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو۔" یعنی کاروبار معیشت میں سرگرم رہو۔

پھر رات اور دن کا اختلاف صرف رات اور دن ہی کا اختلاف نہیں بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گزرتا ہے اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے اور ہر منزل کے لئے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے اور اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ دن ڈھلتا ہے تو اس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدل و تجدد کی لذت و سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہی بات قرآن کریم کی اس آیت میں اس طرح بیان کی گئی ہے :

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (الروم ۳۰ : ۱۸) "پس پاکیزگی ہے اللہ کے لئے اور آسمان و زمین میں اس کے لئے ستائش ہے یعنی ہر قسم کی اچھی تعریف جبکہ تم پر شام آتی ہے' جب تم پر صبح ہوتی ہے' جب دن کا آخر وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دوپہر آتی ہے۔"

اسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے اور تمام حیوانات کو دیکھے کہ فطرت نے کس طرح طرح کے

جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا

ہوتے' کھڑے ہوں' بیٹھے ہوں' لیٹے ہوں' جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں[۳۴۷] پھر پکار اٹھتے ہیں اے اللہ! یہ سب کچھ تو نے پیدا کیا ہے سو

اختلافات سے اس میں تنوع اور دل پذیری پیدا کر دی ہے؟ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ (فاطر ۳۵ : ۲۸) "اور انسان' جانور' چارپائے طرح طرح کی رنگتوں کے۔" پھر عالم نباتات میں دیکھو۔ درختوں کے مختلف ڈیل و ڈول ہیں' مختلف رنگتیں ہیں' مختلف خوشبوئیں ہیں' مختلف خواص ہیں اور پھر دانہ اور پھل کھاؤ تو مختلف قسم کے ذائقے ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی اس طرح ہوا "کیا ان لوگوں نے کبھی زمین پر نظر نہیں ڈالی اور غور نہیں کیا کہ ہم نے نباتات کی ہر دو دو بہتر قسموں میں سے کتنے بے شمار درخت پیدا کر دیئے ہیں۔" (۲۶ : ۷) اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور دیکھو اللہ نے جو پیداوار مختلف رنگتوں کی تمہارے لئے زمین میں پھیلا دی ہے سو اس میں بھی عبرت پذیر طبیعتوں کے لئے حکمت الٰہی کی بڑی ہی نشانی ہے۔" (۱۶ : ۱۳) "اور وہ حکیم و قدیر جس نے طرح طرح کے باغ پیدا کر دیئے۔ ٹہنیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور طرح طرح کی کھیتیاں جن کے دانے اور پھل کھانے میں مختلف ذائقے رکھتے ہیں۔" (۶ : ۱۴۱)

پھر حیوانات اور نباتات ہی پر موقوف نہیں جمادات میں بھی یہی قانون فطرت کام کر رہا ہے جس طرح ارشاد خداوندی ہے کہ "پہاڑوں کو دیکھو' گوناگوں رنگتوں کے ہیں کچھ سفید کچھ سرخ کچھ کالے کلوٹے۔" اس طرح ہر ایک چیز کے متعلق غور کرتے جاؤ تو یقیناً تم کو ایک ایک ذرہ میں اللہ کی توحید و وحدانیت کے دلائل نظر آتے جائیں گے لیکن آخر عقل و فکر سے کام لینا تو تمہارا ہی کام ہے اگر تم اس پر تالا لگا دو گے تو پھر غور و فکر کس طرح کرو گے؟ جو لوگ عقل و فکر پر تالا لگانے کا حکم صادر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ دین عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا ان سے پوچھ کر بتا دو؟ لیکن اس کا جواب دے گا کون اور کیسے؟ کیونکہ جواب بھی تو عقل کا تقاضا کرتا ہے اور اس پر ہے "تالا" ہاں! جب ضرورت ہوئی تو تالا کھول لیا اور جب چاہا تالا بند کر دیا۔ اگر بات اس طرح ہے تو یہی ہٹ دھرمی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

ہر حال میں اللہ کی یاد رکھنے والے ہی صاحب عقل و دانش ہیں

۳۴۷ پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ کی توحید و وحدانیت کے نشانات ان ہی لوگوں کو نظر آتے ہیں جو صاحب عقل و فکر ہیں اور اس آیت میں اس بات کی وضاحت فرما دی کہ صاحب عقل و دانش کون لوگ ہیں؟ کیونکہ ساری دنیا عقل مند ہونے کی مدعی ہے کوئی بے وقوف بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم نہیں

کرتا اور اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ دین عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اگر یہ مان لیا جاتا کہ دین عقل سے سمجھا جاتا ہے تو پھر عقل مند لوگوں اور بے وقوفوں کی پہچان ہو جاتی اور اس طرح نہ معلوم کس کس کا نقصان ہوتا اس لئے یہاں لا کر رسی کاٹ دی گئی اور دین کو ایک جھمیلا بنا کر رکھ دیا گیا۔ بہرحال قرآن کریم نے عقل والوں کی چند علامات بتلائی ہیں جو درحقیقت عقل کا صحیح معیار ہیں۔ ان علامات میں سے پہلی علامت اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ غور کیجئے کہ محسوسات کا علم کان' آنکھ ناک اور زبان وغیرہ جو بے عقل جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے اور عقل کا کام یہ ہے کہ وہ علامات و قرائن اور دلائل کے ذریعہ کسی ایسے نتیجہ تک پہنچ جائے جو محسوس نہیں ہے اور جس کے ذریعہ سلسلہ اسباب کی اس آخری کڑی کو تلاش کیا جا سکے اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کائنات عالم پر غور کیجئے آسمان اور زمین اور ان میں سمائی ہوئی تمام مخلوقات اور ان کی چھوٹی بڑی چیزوں کا مستحکم اور حیرت انگیز نظام عقل کو کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتا ہے جو علم و حکمت اور قوت و قدرت کے اعتبار سے سب سے بالاتر ہے اور جس نے ان تمام چیزوں کو خاص حکمت سے بنایا ہے اور جس کے ارادہ اور مشیت سے یہ سارا نظام چل رہا ہے اور وہ ہستی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے۔ کسی نے کیا عجب کہا ہے ؎

ہر گیاہے کہ زمیں روید وحدہ لا شریک گوید

انسان ارادوں اور تدبیروں کے فیل ہونے کا ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس کو اس نظام کا چلانے والا نہیں کہا جا سکتا اس لئے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات کی پیدائش میں غور و فکر کرنے کا نتیجہ عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت و ذکر ہے جو اس سے غافل ہے وہ عقل مند کہلانے کا مستحق نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو دوسرے حیوانوں سے جن کے پاس ظاہری لحاظ سے کان' ناک' آنکھ اور زبان سب کچھ ہے لیکن غور و فکر نہیں جس کو حقیقت میں عقل کہا جاتا ہے اس لئے اس جگہ عقل والوں کی یہ علامت بتائی گئی اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ "یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو کسی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کھڑے ہوں' بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوں جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان و زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں۔ ذکر کیا ہے؟ یہی ہے کہ اللہ کی یاد سے دل کبھی خالی نہ ہو۔ اللہ کی یاد سے دل کب خالی ہو جاتا ہے؟ جب غور و فکر اور تدبر کرنا وہ چھوڑ دے۔ غور و فکر کیا ہے؟ یہ کہ آسمان و زمین کی خلقت اور کائنات فطرت کے حوادث و مظاہر پر نظر کر کے یہ معلوم کرنا کہ ان کا بنانے والا کون ہے؟ اور ان میں یہ خاصیتیں کس نے بھر دی ہیں؟ اس طرح سے وہ آخری سبب یا علت العلل تک پہنچ گیا تو گویا اس کو مقصود حاصل ہو گیا کیونکہ آخری سبب اور آخری علامت اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ پر اس طرح سے ایمان لانے والے کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ ہر اس شے سے مضبوط ہو گا جس کو اللہ نے تخلیق کیا۔ اور اس ایمان والا جو کام کرے گا وہ صحیح کرے گا غلط کے قریب بھی نہیں جائے گا اور جو کچھ کرے گا بے خوف و خطر کرے گا۔

اس لئے کہ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی شے اس سے زندگی نہیں لے سکتی جب تک اس کو اللہ نہ لینا چاہے اور جب اللہ ہی لینا چاہے تو آخر وہ اس کو رکھے گا کیوں؟ اس لئے کہ وہ جان گیا ہے کہ اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو سارے سببوں کا آخری سبب ہے۔

اسی بات کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ مثال یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا یعنی جنگلی آدمی جو کچھ بھی لکھا پڑھا نہیں کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتا ہے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے اس بات کو وہ مشاہدہ کرتا ہے ایک بار چاہے دس بار تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ سرخ جھنڈی اور سبز جھنڈی بڑی پاور رکھتی ہے کہ اتنے طاقت والے انجن کو روک دیتی ہے اور چلا دیتی ہے تو ایک علم و عقل والا ہے جو اس کو کہتا ہے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں بلکہ اس گارڈ کے پاس ہے جس کے ہاتھ میں وہ جھنڈیاں ہیں اس کی یہ بات سن کر ایک اور علم و عقل والا اٹھتا ہے وہ اس کو کہتا ہے کہ نہیں طاقت اس کے پاس نہیں ہے جس کے ہاتھ میں جھنڈیاں ہیں بلکہ طاقتور تو وہ ہے جو انجن میں بیٹھا انجن چلا رہا ہے کیونکہ اگر وہ گاڑی چلانا چھوڑ دے گا تو گاڑی کی جھنڈی کیا کرے گی یہ بات سن کر ایک اور علم و عقل والا بولتا ہے کہ انجن ڈرائیور کو بھی پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا جہالت ہے کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو انجن میں کوئی دخل نہیں بلکہ طاقت تو ساری انجن کے اپنے کل پرزوں میں ہے اور ان کا اس طرح جوڑ جوڑ دینے میں اور وہ بہت خوش ہے کہ میں بڑا عقلمند ہوں کہ میں نے پہلوں کی غلطی ثابت کر دی ہے لیکن یہ بات سن کر ایک عقل و علم والا اور اٹھتا ہے وہ کہتا ہے کہ نہیں تیری بات صحیح نہیں ہے بلکہ ان بے حس کل پرزوں میں تو کچھ بھی نہیں بلکہ اصل طاقت تو اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے اور یہ اپنے اس بیان کی وجہ سے حکیم اور فلاسفر کہلاتا ہے اور ایک زبان میں سائنس دان لیکن حکمت و فلسفہ اس جگہ پہنچ کر تھک جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں تفکر و تدبر کرنے والے یعنی انبیائے کرام فرماتے ہیں کہ اے ظالم اس طرح بھاپ اور سٹیم کو طاقت کا مالک سمجھنا بھی تیری غلطی ہے اپنے اس فلسفہ سے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر دیکھ کہ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا تیرے ہاتھ آجائے اور سلسلہ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہو جائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں و پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے اور ان کا جوڑ جوڑنے والے کو عقل دی جس سے اس نے اس جوڑ کو جوڑا اور یہ اسٹیم تیار ہوئی۔

اس تفصیل سے آپ نے یقیناً معلوم کر لیا ہوگا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو صحیح معنوں میں پہچانیں اور ہر وقت اور ہر حالت میں اس کو یاد کر لیں اس لئے اولی الباب کی صفت قرآن کریم نے یہ بتائی کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ "جو لوگ کھڑے بیٹھے اور لیٹے کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور جن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ آسمان و زمین کی خلقت

مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۱۹۱

بلاشبہ بیکار و عبث نہیں پیدا کیا[۳۴۸] یقیناً تیری ذات اس سے منزہ ہے کہ ایک بیکار کام اس سے صادر ہو۔ اے ہمارے اللہ! ہمیں عذاب آتش سے بچا لے[۳۴۹]۔ ۱۹۱

میں غور کرتے ہیں" وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔
غور و فکر کرنے والے وہی ہیں جو اللہ کی کسی پیدائش کو عبث و بے کار نہیں سمجھتے

۳۴۸ ان صاحب عقل لوگوں کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ آسمان و زمین کی تخلیق و پیدائش میں اور جو کچھ آسمان و زمین میں پیدا ہوا ہے اس کے ایک ایک ذرہ کے متعلق تفکر و تدبر کرتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے یہ سب کچھ جو پیدا کیا ہے تو بے کار و عبث نہیں پیدا کیا۔" اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ذکر سے فکر کا مقام بڑا ہے اس لئے یہ سمجھنا بھی لازم ہے کہ فکر کیا ہے؟ فکر اور تفکر کے لفظی معنی غور کرنے اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے اسی طرح فکر بھی ایک عبادت ہے ہاں! اس میں فرق یہ ہے کہ ذکر تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا مطلوب ہے اور فکر و تفکر اس کی مخلوقات میں مقصود ہے کیونکہ ذات و صفات الہیہ کی حقیقت کا ادراک انسان کی عقل سے باہر ہے کیونکہ وہ ان دیکھی ذات کا مشاہدہ اس دنیا میں ناممکن ہی نہیں بلکہ ممتنع ہے اس لئے اس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر بجز برائی کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا عارف رومی کہتے ہیں ؎

دور بینان بارگاہ است غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں زیادہ غور و فکر انسان کی ناقص عقل کے لئے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے اہل معرفت کا یہ مقولہ زبان زد عام ہے کہ "تفکروا فی آیت اللہ ولا تفکروا فی اللہ" یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور و فکر کرو مگر خود اللہ کی ذات و صفات میں غور و فکر نہ کرو' کیوں؟ اس لئے کہ وہ تمہاری عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ آفتاب کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھا جا سکتا ہے مگر خود آفتاب کو کوئی دیکھنا چاہے تو آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور پھر کچھ بھی دکھائی نہ دے گا۔ البتہ غور و فکر اور عقل کی دوڑ دھوپ کا میدان معلومات الٰہیہ ہیں جن میں صحیح اور کامل غور و فکر کا لازمی نتیجہ ان کے خالق جل شانہ کی معرفت ہے۔ اتنا عظیم الشان اور وسیع و عریض آسمان اور اس میں آفتاب و مہتاب اور پھر دوسرے ستارے جن میں کچھ ثوابت ہیں جو دیکھنے والوں کو اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کوئی بہت آہستہ حرکت ہو تو اس کا علم پیدا کرنے والے ہی کو ہے اور انہی ستاروں میں کچھ سیارات ہیں جن کے دوسرے نظام شمسی و قمری وغیرہ کے انداز میں نہایت محکم و مضبوط قانون کے تحت مقرر اور متعین ہیں نہ ایک سیکنڈ ادھر ہوتے ہیں نہ

ادھر۔ نہ ان کی مشینری کا کوئی پرزہ گھستا ہے' نہ ٹوٹتا ہے نہ کبھی ان کو کسی ورکشاپ میں بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی مشینری کبھی رنگ و روغن چاہتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں سال سے ان کے مسلسل اس نظام محکم اور معین اوقات کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اس طرح زمین کا پورا کرہ اس کے دریا اور پہاڑ اور پھر دونوں میں طرح طرح کی مخلوقات درخت اور جانور اور زمین کی تہہ میں چھپی ہوئی معدنیات اور زمین و آسمان کے درمیان چلنے والی ہوا اور اس میں پیدا ہونے اور برسنے والی برق و باراں اور اس کے مخصوص نظام یہ سب کے سب سوچنے سمجھنے والے کے لئے کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتے ہیں جو علم و حکمت اور قوت و قدرت میں سب سے بالاتر ہے اور اس کا نام معرفت ہے تو یہ غور و فکر معرفت الٰہیہ کا سبب ہونے کی وجہ سے بہت بڑی عبادت ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ تفکر ساعة خير من قيام ليلة (ابن کثیر) یعنی ایک گھڑی آیات قدرت میں غور کرنا پوری رات کی عبادت سے بہتر اور انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے۔" اور اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس غور و فکر کو افضل عبادت فرمایا ہے۔ (ابن کثیر)

حسن بن عامر نے فرمایا کہ میں نے بہتر ۷۲ صحابہ کرامؓ سے سنا ہے وہ سب یہ فرماتے تھے کہ "ایمان کا نور اور روشنی تفکر ہے۔" اور حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "میں گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نگاہ پڑتی ہے کھلی آنکھوں دیکھتا ہوں کہ اس میں میرے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس کے وجود میں میرے لئے عبرت حاصل کرنے کا سامان موجود ہے۔" (ابن کثیر) حضرت سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے کہ "غور و فکر ایک نور ہے جو تیرے دل میں داخل ہو رہا ہے۔" حضرت وہیب بن منبہ نے فرمایا کہ "جب کوئی شخص کثرت سے غور و فکر کرے گا تو حقیقت سمجھ لے گا اور جو سمجھ لے گا اس کو علم صحیح حاصل ہو جائے گا اور جس کو علم صحیح حاصل ہو گیا وہ ضرور عمل بھی کرے گا۔" (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ایک بزرگ کا گزر ایک عابد زاہد کے پاس ہوا جو ایسی جگہ بیٹھے ہوتے تھے کہ ان کی ایک طرف قبرستان تھا اور دوسری طرف گھروں کا کوڑا کباڑ پڑا تھا۔ گزرنے والے بزرگ نے کہا کہ دنیا کے دو خزانے تمہارے سامنے ہیں ایک انسانوں کا خزانہ جس کو قبرستان کہتے ہیں دوسرا مال و دولت کا خزانہ جو فضلات اور گندگی کی صورت میں ہے اور یہ دونوں خزانے عبرت کے لئے کافی ہیں۔ (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے قلب کی اصلاح و نگرانی کے لئے شہر سے باہر کسی ویرانہ کی طرف نکل جاتے تھے اور وہاں پر پہنچ کر فرماتے تھے "این اهلک" تیرے بسنے والے کہاں گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے (ابن کثیر) اور اس طرح کے تفکر کے ذریعہ آخرت کی یاد اپنے قلب میں مستحضر کرتے تھے اور حضرت بشر حافی رحمہ اللہ نے فرمایا "اگر لوگ

اللہ تعالیٰ کی عظمت میں تفکر کرتے تو اس کی معصیت و نافرمانی نہ کر سکتے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اے ضعیف الخلقت آدمی! تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈر اور دنیا میں ایک مہمان کی طرح بسر کر اور مساجد کو اپنا گھر بنا لے اور اپنی آنکھوں کو خوف خدا سے رونے کا اور جسم کو صبر کا اور قلب کو تفکر کا عادی بنا دے اور کل کے رزق کی فکر نہ کر۔"

آیت مذکورہ میں اس فکر و تفکر کو عقل مند انسان کا اعلیٰ وصف کر کے بیان فرمایا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کر کے حق سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت اور دنیا کی ناپائیداری کا علم حضوری حاصل کر لینا افضل عبادت اور نور ایمان ہے اس طرح آیات الٰہیہ کو دیکھنے اور برتنے کے باوجود خود ان مخلوقات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں الجھ کر رہ جانا اور ان کے ذریعہ مالک حقیقی کی معرفت حاصل نہ کرنا سخت نادانی اور ناسمجھ بچوں کی سی حرکت ہے اور اس بے بصیرتی کی طرف حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

کچھ بھی مجنوں جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے　　تو نے لیلیٰ جسے سمجھا ہے وہ محمل ہو جائے

بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائنات عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے آج کی سائنٹفک (Scientfic) اور حیرت انگیز ایجادات اور ان میں الجھ کر رہ کر موجدین اور استعمال کرنے والے بہت سے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اپنے انجام کار سے غفلت میں ہونے کی وجہ سے حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہیں کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں اتنا ہی وہ خدا شناس اور حقیقت آگاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں اور اس کو اکبر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

بھول کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو　　بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

قرآن کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف ۱۲ : ۱۰۵) "آسمان و زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں اور ان کی حقیقت و صنعت اور ان کے صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے۔"

مطلب کتنا واضح اور صاف ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز بجائے خود محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے جو اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ انسان کا سا دیکھنا نہیں بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا چاہتے ہیں۔ درخت کو درخت اور پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان چیزوں کا مصرف بھی جانتا ہے مگر جس مقصد کے لئے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے وہ صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مصرف اور استعمال معلوم کرے بلکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ آدمی حقیقت کی

جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعے سے اس کا سراغ لگائے۔ اسی معاملہ میں اکثر انسان غفلت برت رہے ہیں اور پھر وہ اپنے آپ کو معمولی انسانی بھی نہیں سمجھتے بلکہ قوم کا لیڈر۔ حکمران اور علماء و مذہبی راہنما سمجھتے ہیں اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر دلوں پر یہ قفل نہ چڑھا لیا گیا ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی بات سمجھنا اور ان کی راہنمائی سے فائدہ اٹھانا لوگوں کے لئے اس قدر مشکل نہ ہو جاتا۔

اہل منطق اور فکر؟ اہل منطق کے نزدیک فکر کا معنی ہے نا معلوم چیز کو جاننے کے لئے معلوم چیزوں کو دماغ کے اندر مناسب ترتیب دینا۔ قاموس میں ہے کہ کسی چیز کو جاننے کے لئے غور سے کام لینا فکر ہے اور جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ "فکرۃ" وہ قوت جو نامعلوم تک پہنچنے کے لئے علم کا راستہ بتاتی ہے اور تفکر کا معنی ہے قوت فکر کی حرکت جو عقلی نظر کے موافق ہو اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے دوسرے حیوان تفکر سے محروم ہیں کیونکہ حیوان کو قوت عقلیہ نہیں ملی حیوان کے پاس صرف "حس" ہے تفکر کا تعلق صرف انہی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی صورت دماغ میں آنا ممکن ہو اس لئے روایت میں آیا ہے کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو لیکن اللہ کی ذات میں غور نہ کرو کیونکہ اللہ کی ذات ہر صورت سے پاک ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ لفظ فکر لفظ "فوک" کا مقلوب ہے اور "فوک" کے معنی ہیں تراشنا' چھیلنا' رگڑنا مگر فکر کا استعمال معانی میں ہوتا ہے یعنی معانی کو چھیلنا' تراشنا' کھودنا' کریدنا اور رگڑنا تاکہ ان کی حقیقت تک رسائی ہو جائے تفکر ہے۔

غور و فکر کا آخر میں نتیجہ عذاب دوزخ سے پناہ طلب کرنا ہے

۳۴۹ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ صحیح معنوں میں غور و فکر کرنے والا پہلے تو یہ پکار اٹھتا ہے کہ اے میرے رب! تو نے کوئی چیز بے کار اور بے حقیقت محض کھیل کے لئے نہیں بنائی۔ اور چونکہ یہ تمام کارخانہ ہستی اور اس کا عجیب و غریب نظام بغیر کسی اعلیٰ مقصد اور نتیجہ کے نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی کے بعد بھی کوئی دوسری زندگی ہو اور پھر جو کچھ اس زندگی میں کیا جاتا ہے اس کے نتائج اس زندگی میں پیش آئیں۔ جب یہ حقیقت اس پر کھلتی ہے تو اس کی روح گویا خدا پرستی کے جوش سے معمور ہو جاتی ہے اور وہ اپنے رب حقیقی کے سامنے بندگی و نیاز کا سر جھکا دیتا ہے اور اس سے بخشش و رحمت کا طلب گار ہوتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ "سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" اے ہمارے رب! تو پاک ہے ہمیں عذاب سے بچا لے۔ اس آیت کے مضمون کو تصریف آیات کے ذریعہ سے بار بار قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے ایک جگہ ارشاد ہے کہ :

"وہی ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن اور پھر چاند کی منزلوں کا اندازہ ٹھہرا دیا تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ نہیں بنایا ہے مگر حکمت اور مصلحت کے ساتھ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں اور وہ اپنی قدرت و حکمت کی دلیلیں کھول کر بیان کر دیتا ہے۔" (یونس ۱۰ : ۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۱۹۲ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ

اے ہمارے رب! جس کے لئے ایسا ہو کہ تو اسے دوزخ میں ڈالے تو بلاشبہ تو نے اسے بڑی ہی رسوائی میں ڈالا اور یہ اس دن ہوگا جس دن ظلم کرنے والوں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۱۹۲

اے ہمارے رب! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی جو ایمان کی

"ہم نے زمین و آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے۔" (الاحقاف ۴۶ : ۳) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔"

ایک جگہ ارشاد ہے : (الانبیاء ۲۱ : ۱۶)

"اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔" (الانبیاء ۲۱ : ۲۲، ۲۳)

"بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے؟" مطلب یہ ہے کہ ہمیں کھیلنا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اس صورت میں یہ ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شعور، ذمہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا اس کے درمیان حق و باطل کی یہ کشمکش اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں اور محض اپنے لطف و تفریح کے لئے ہم دوسروں کو بلاوجہ تکلیفوں میں ڈالتے۔ تمہارے اللہ نے یہ دنیا کچھ ردی اکھاڑے (Colosseum) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو درندوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں نچوڑ کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ○ (ص ۳۸ : ۲۷) "ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے اور ایسے کافروں کے لئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔" اور یہی مضمون سورہ المؤمنون ۲۳ : ۱۱۵ اور سورہ الدخان کی آیات ۳۸ تا ۴۰ میں بیان کیا گیا

ہے۔

اے ہمارے رب دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا جو دوزخ میں گیا وہ رسوا ہو گیا

۳۵۰ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو آگ سے بچنے کی دعا سکھائی کیونکہ آگ ہی قیامت کا بدترین عذاب ہے جس سے زیادہ بڑا اور زیادہ برا اور کوئی عذاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر غور کیا جائے تو آگ ہی اس دنیا میں انسان کے سارے امن اور اطمینان کو برباد کر دیتی ہے۔ آخرت کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے اور دنیا کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے۔ وہ کتنے ہیں جو اس دنیا کی آگ میں جل رہے ہیں اور پھر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کتنے ہیں جو آخرت میں جلنے کے لئے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسوائی سے بچائے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی لیکن منکرین کے لئے عذاب ہی عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے وہاں کوئی ان کا مدد کرنے والا نہ ہوگا۔" (فصلت ۴۱ : ۱۶)

یہ ذلت و رسوائی کا عذاب ان کے اس کبر اور غرور کا جواب تھا جس کی بنا پر وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور خم ٹھونک ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے؟ اللہ نے ان کو اس طرح ذلیل کیا کہ ان کی آبادی کے بڑے حلقے کو ہلاک کر دیا اور ان کے قرن کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا اور ان کا قلیل حصہ جو باقی رہ گیا وہ دنیا کی انہی قوموں کے آگے ذلیل و خوار ہوا جن پر کبھی یہ لوگ اپنا زور جتاتے تھے اور پھر یہ تو دنیا کی رسوائی تھی لیکن آخرت کی رسوائی وہ اس سے بہت بڑی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

"اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف لے جانے کے لئے گھیر لئے جائیں گے اور ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا۔ پھر جب وہ سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔" (فصلت ۴۱ : ۲۰) اس لئے ایک سچے مسلمان کو اللہ سے یہ دعا مانگتے رہنا چاہئے کہ "اے ہمارے رب! جس کے لئے ایسا ہو کہ تو اسے دوزخ میں ڈالے تو بلاشبہ تو نے اسے بڑی ہی رسوائی میں ڈالا اور یہ اس دن ہوگا جس روز ظلم کرنے والوں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔" اس طرح گویا پہلی درخواست جہنم کے عذاب سے بچنے کے لئے ہے جو اس سے پہلی آیت میں کی گئی اور اس آیت میں یہ دوسری درخواست ہے کہ ہمیں آخرت کی رسوائی سے بچائیے کیونکہ جن کو تو نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو سارے جہان کے سامنے رسوا کر دیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دعا میدان حشر کے عذاب سے بچنے کے لئے تعلیم کی گئی ہو کیونکہ حشر کے اندر رسوائی ایک ایسا عذاب ہوگا کہ آدمی خواہش کرے گا کہ کاش! اسے جہنم میں ڈال دیا جائے اور اس کی

اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا

طرف بلا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ لوگو! اپنے رب پر ایمان لاؤ' تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے[۳۵۲]۔ پس اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے' ہماری برائیاں مٹا

بدکاریوں کا چرچا اہل محشر کے سامنے نہ ہو۔ اللہ کی پناہ۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کی دعوت سن لینے کی شہادت

۳۵۱ منادی ندا سے ہے اور نِدَاءٌ آواز کے بلند کرنے کو کہتے ہیں اور بعض اوقات مجرد صوت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی و مفہوم ہو یا نہ ہو جیسے "اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً" (البقرہ ۲ : ۱۷۱) اور بعض اوقات مرکب پر جس سے کچھ معنی و مفہوم ہوں جیسے وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى (الشعراء ۲۶ : ۱۰) وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ ۵ : ۵۸)

زیر نظر آیت میں یہ "منادی" کرنے والے کون ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حقیقی تو نبی اعظم و آخر ﷺ ہی ہیں اگرچہ آپ ﷺ کے بعد ہر دعوت اسلام دینے والے شخص پر یہ لفظ بولا جا سکتا ہے تاہم اس جگہ سب سے اول منادی کرنے والے خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اگرچہ بعض نے اس سے مراد قرآن کریم بھی لیا ہے اور امام راغب کہتے ہیں منادی میں اشارہ ہے عقل کی طرف جو انسان کو دی گئی ہے' کتاب کی طرف جو اتاری گئی اور رسول کی طرف جو بھیجا گیا اور ان تمام نشانات کی طرف جو اللہ پر ایمان لانے کی طرف دلالت کرنے والے ہیں کیونکہ ان کا ظہور بھی ندا ہی کی طرح ہے۔ تاہم اس جگہ منادی کرنے والے خود رسول اللہ ﷺ ہی کو بیان کرنا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ آپ ﷺ ہی کو "شاہد" "مبشر" "نذیر" "دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ" اور "سِرَاجًا مُّنِيْرًا" جیسے ناموں سے نوازا ہے اور یہاں بھی سب لوگوں کی گواہی اور شہادت ہو گئی کہ ہاں تیرے منادی کرنے والے کی منادی سن لی۔"

منادی کرنے والا کیا منادی کرتا ہے یہ فرمایا گیا کہ وہ ایمان کی دعوت دیتا ہے

۳۵۲ اس منادی کرنے والے نے کس چیز کی منادی کی؟ فرمایا یہ ایمان کی طرف دعوت دے رہا تھا کہ "لوگو! اپنے رب پر ایمان لاؤ۔" بس ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس پر ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کا اقرار کر لیا تو اب سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کیا ہے؟

"ایمان" کے معنی ہیں یقین کرنا' تصدیق کرنا' مان لینا اور اصطلاح شریعت میں "ایمان" کا مطلب ہے اس حقیقت کو تسلیم کرنا اور ماننا کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معبود و الٰہ نہیں وہی پروردگار حقیقی ہے اور اس کے تمام ذاتی و صفاتی کمالات برحق ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں یعنی آپ

ﷺ پر رسالت و نبوت بند کر دی گئی ہے آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں آئے گا اور جو بھی دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا۔

آپ ﷺ کی ذات صادق و مصدوق ہے اور یہ کہ آپ ﷺ کتاب و سنت کی صورت میں اللہ کا جو آخری پیغام اس دنیا میں لائے ہیں اس کی حقانیت و صداقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

ایمان کی یہ تشریح خود رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جب پوچھنے والے جبرئیل علیہ السلام تھے انہوں نے پوچھا تھا کہ "فاخبرنی عن الایمان" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان تؤمن باللہ وملائکۃ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر و تؤمن بالقدر خیرہ و شرہ "آپ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ کو اس کے فرشتوں کو اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن کو' دل کے یقین سے مان لے اور اس بات پر بھی یقین رکھ کہ برا بھلا جو کچھ پیش آتا ہے وہ سب قانون قدرت کے مطابق ہے۔" ہاں اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ایمان سے پہلے اسلام ضروری ہے کیونکہ جبریل علیہ السلام نے بھی ایمان سے پہلے اسلام ہی کی متعلق سوال کیا تھا اس لئے یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے پوچھا تھا "اخبرنی عن الاسلام" کہ مجھے اسلام کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا الاسلام ان تشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ وتقیم الصلوٰۃ و تؤتی الزکوٰۃ وتصرم رمضان و تحج البیت ان استطعت الیہ سبیلاً "اسلام یہ ہے کہ تم اس حقیقت کا اعتراف کرو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور پھر تم پابندی سے نماز پڑھو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو اور زاد راہ میسر آئے تو بیت اللہ کا حج کرو۔"

اس حدیث میں سب سے پہلے اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی بیان ہوئی ہے جس سے اسلام اور ایمان کے درمیان جو فرق ہے وہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا تعلق ظاہر یعنی اعمال اور جسمانی اطاعت و فرمانبرداری سے ہے اور ایمان کا تعلق باطن یعنی قلبی تصدیق اور اعتقاد سے ہے۔ "اللہ کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ اس کی ذات اور صفات برحق ہیں اور عبادت کی سزاوار صرف اور صرف اس کی ذات ہے اس کے سوا کسی کی بھی ذات عبادت کی سزاوار نہیں اور کوئی اس کا ہمسر و شریک نہیں۔

"فرشتوں کے ماننے" کا مطلب اس بات پر یقین کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی گئی طاقتیں ہیں جو نیکی کی مدد و معاون ہیں برائی کی نہیں۔ وہ لطیف و نورانی ہیں اور ان میں توالد و تناسل نہیں۔

اسلام کی بنیادی چیزیں پانچ ہیں جو اس حدیث میں بھی بیان کی گئی ہیں اور دوسری احادیث میں بھی جگہ جگہ یہ بیان کی گئی ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وایتاء

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ

دے اور ایسا کر کہ ہمارا انجام نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔ ۳۵۳

اے ہمارے رب! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی

الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان (بخاری و مسلم) "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اول اس بات کا دل سے اقرار کرنا اور گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ دوم پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ سوم باقاعدہ زکوٰۃ دینا۔ چہارم حج کرنا اور پنجم رمضان کے روزے رکھنا۔

اور ایمان کی تشریح بھی کتب احادیث میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث اس طرح بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا الایمان بضع و سبعون شعبة فافضلها قول لا الٰه الا الله وادنا اماطة الاذی من الطریق والحیاء شعبة من الایمان (بخاری و مسلم) "ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ اوپر ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ کی شاخ زبان و دل سے اس بات کا اقرار و اعتراف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے کم درجہ کی شاخ کسی تکلیف دینے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور شرم و حیاء بھی ایمان ہی کی ایک شاخ کا نام ہے۔" اس طرح اسلام و ایمان آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور اس سارے مرکب کو کبھی اسلام کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی ایمان کا یعنی ان سارے اجزاء کے کل کو اسلام کہیں یا ایمان ایک ہی بات ہے۔ آیت کے اس جملہ میں اس بات کی تصدیق ہے کہ اے اللہ! وہ منادی کرنے والا ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ ہم نے اس کی پکار سن لی کہ "ایمان لے آؤ" چنانچہ ہم ایمان لے آئے۔"

ہمارے رب! ہمارے گناہ معاف فرما کہ ہمیں نیک کرداروں کے ساتھ ملا دے

---

۳۵۳ پکارنے والے کی پکار سن لی پھر سن ہی نہیں لی بلکہ دل و جان سے اس کو قبول بھی کر لیا اور اس پر پورے عزم و جزم کے ساتھ عمل بھی کر رہے ہیں اور جب تک زندگی رہی عمل کرتے رہیں گے لیکن چونکہ ہم انسان ہیں پھر انسان اور خطا۔ انسان اور بھول چوک تو لازم و ملزوم ہیں۔ ہم بھول بھی گئے اور ہم سے خطائیں بھی سرزد ہوئیں۔ اے ہمارے رب! ہم چھوٹے ہیں تو بڑا۔ ہم گناہ گار ہیں اور تو غفور و رحیم ہے ہمارے چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف فرما دے اے اللہ ہم کو سچی توبہ کی توفیق عطا فرما۔ اے عفو و کرم کرنے والے! ہم نے بہت گناہ کئے ہیں گناہ گار ہیں قصور وار ہیں لیکن پھر بھی آپ کی معافی کے طلبگار ہیں اے اللہ! درگزر فرما دیجئے۔ اے ہمارے مالک! ہماری ان ٹوٹی پھوٹی عبادتوں کو اپنے فضل خاص سے قبول فرما لے۔

اے ہمارے پروردگار اس شیطان و نفس نے ہم کو بہت بہکایا اس کے فریب سے ہم کو بچا لے۔ اے

وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ

وعدہ فرمایا ہے[۳۵۵] اور اپنے کرم خاص سے ایسا کر کہ قیامت کے دن ہمیں ذلت و خواری نصیب نہ ہو[۳۵۶]۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ ۱۹۴

پس ایسی دعائیں کرنے والوں کی دعائیں انکے رب نے قبول کرلیں بلاشبہ میں کبھی کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا مرد ہو خواہ عورت تم سب ایک دوسرے

رب العالمین! رزق حلال عطا فرما اور حرام کھانے اور کمانے سے ہم کو بچالے۔ اے ہمارے نگہبان! ہماری جان و مال اور عزت و آبرو اور دنیوی مصائب سے ہم سب کو بچالے۔ اے ہادیٔ برحق! ہم سب کو ہماری اولادوں کو اور متقین کو نیک بنا دیجئے۔ دین پر چلنے کی توفیق دیجئے اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہماری نیک نامی اور آخرت کی کامیابی کا باعث بنا دے۔ اے احکم الحاکمین! ہم کو ظالموں کے ظلم سے بچائیے اور ہم مظلوموں کی مدد فرما دیجئے۔ اے قادر و قدیر رب! حاسدوں کے حسد سے اور دشمنوں کی شرارت سے ہم کو بچا اور ہماری برائی چاہنے والوں کو بھی ہدایت عطا فرما اور غیب سے ہماری نصرت کا سامان کر دے۔ اے غفور رحیم! ہم کو ہر قسم کی بلاؤں' ناگہانی آفتوں سے بچالے' مہلک بیماریوں سے جنات و شیاطین کی شرارتوں سے محفوظ فرما۔ اے ہمارے آقا و مولیٰ! تو ہمیں آزمائش میں مت ڈال ہم بہت کمزور ہیں ہم پر رحم فرما ہمارے والدین' ہماری اولاد اور عزیز و اقارب کو ہر طرح کی مصیبتوں سے بچاتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے سے محبت و پیار کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے گھروں کو خیر و برکت سے بھر دے ہمارے روحانی و جسمانی بیماروں کو شفا عنایت فرما۔ اے مالک و مہربان! ہمارے مرحومین کی مغفرت فرما اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرما۔ اے قدرت والے! ہماری ساری پریشانیاں دور فرما دے اور عبادات میں ہمارا دل لگا دے کہ سچے دل سے تیری عبادت کریں۔ اے حالات کے بدلنے والے! ہمارے حالات کو بھی نیکی' بھلائی اور اچھائی کی طرف بدل دے۔ اے ہمارے رب! امن و امان' چین و سکون اور اطمینان قلب عطا فرما دے۔ اے رب کریم! ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما اور بری موت سے بچا' اچانک موت سے محفوظ فرما۔ اے ہمارے مالک! ہم کو میدان حشر کی رسوائی سے بچا دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اے ہمارے رب! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دے جس کا تو نے وعدہ فرمایا ہے

۳۵۴ اپنے رب سے مانگنے میں کسی بندے کو نہ شرم آنی چاہئے نہ جھجک کیونکہ ہم سب مانگت

ہیں اور وہی ہم سب کا داتا ہے۔ انبیاء کرامؑ جو دوسرے سارے انسانوں سے افضل و اعلیٰ تھے وہ بھی اللہ سے مانگتے رہے قرآن کریم نے تقریباً ہر نبی کی پکار کا ذکر کیا ہے آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اعظم و آخر ﷺ تک سارے انبیائے کرام کو اللہ نے خود دعائیں سکھائیں اور خود ہی ان کو قبول فرما کر ساری امتوں کو یہ سبق دیا کہ جو کچھ مانگنا ہے صرف مجھ ہی سے مانگو اور یہی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو دی۔ چنانچہ فرمایا :

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ○ (البقرہ ۲ : ۱۸۶) "اے پیغمبر اسلام! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں یہ بات تم انہیں سنا دو شاید کہ راہ راست پالیں۔"

اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ ہی اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے ہو لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دور ہوں نہیں' میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے میں اسے بھی سن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے اللہ اور رب قرار دے رکھا ہے ان کے پاس تو تمہیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمہاری شنوائی کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں مگر میں کائنات بے پایاں کا فرماں روائے مطلق تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے اور وسیلے اور سفارش کے براہ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار' بناوٹی خدا کے در پر مارے مارے پھرتے ہو جو دعوت تمہیں دے رہا ہوں اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو۔ میری طرف رجوع کرو' مجھ پر بھروسہ کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آجاؤ۔

شکر گزاروں کو مزید ملتا ہے اور کفران نعمت کرنے والوں کیلئے عذاب الٰہی تیار ہے

۳۵۵ "اور اپنے کرم خاص سے ایسا کر کہ قیامت کے دن ہمیں ذلت و خواری نصیب نہ ہو۔" قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کی وضاحت خود فرما دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اس سلسلہ میں یہ ہے کہ شکر گزاروں کو زیادہ ملتا ہے اور کفران نعمت کرنے والوں کیلئے عذاب الٰہی تیار کھڑا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم ۱۴ : ۷) "اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کیا ہے کہ اگر تم شکر گزار ہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔"

اس آیت میں اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی وفات سے چند روز پہلے

أُنْثَىٰ ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا
مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ

کی جنس ہو لہٰذا نتائج عمل کا قانون سب کیلئے ایک جیسا ہی ہے[۳۵۷]۔ پس جن لوگوں نے راہ حق میں ہجرت کی' اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ میری راہ میں ستائے گئے اور پھر راہ حق میں جہاد کیا اور قتل ہوئے تو یقیناً ایسا ہوگا کہ میں ان کی خطائیں محو کردوں اور

بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں اور پھر تورات کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے پھر ایک طویل وعظ فرماتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کتنی سخت سزا دی جائے گی۔

اس جگہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذلت و خواری سے بچنے کی جو دعائیں کر رہے ہو ان کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ اگر تم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی نعمت کا شکر ادا کیا کہ ان کی سچے دل سے فرمانبرداری کی تو یقیناً تمہاری دنیا بھی سنورے گی اور آخرت بھی بہتر ہوگی لیکن اگر تم نے ناشکری کی یعنی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی اور مزید یہ کہ تم عذاب الٰہی کے مستحق قرار دیئے جاؤ گے اس لئے کہ یہی کچھ موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ساتھ ہوا تھا۔

اے اللہ! تیری ہی وہ ذات ہے کہ جس کا کیا ہوا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا

۳۵۶ "اے اللہ! تو ہی ہے کہ تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔" اس طرح یہ ان اللہ کے بندوں کی اپنے رب کریم کی بارگاہ میں چوتھی درخواست ہے جو دنیا و آخرت کے فوائد حاصل کرنے کے متعلق ہے کہ انبیاء کرام کے ذریعہ جو وعدہ آپ نے جنت اور جنت کی نعمتوں کا فرمایا وہ ہمیں اس طرح عطا فرمائے کہ قیامت کے روز رسوائی بھی نہ ہو یعنی اول مواخذہ اور بدنامی بعد میں معافی کی بجائے اول ہی سے معافی فرما دیجئے آپ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے اور اس طرح عرض و معروض کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ ہمیں اس قابل بنا دیجئے کہ ہم یہ وعدہ حاصل کرنے کے مستحق ہو جائیں اور پھر اس پر قائم بھی رہیں پہلوں کی طرح وعدہ کر کے خلاف نہ کریں یعنی ہمارا خاتمہ ایمان اور عمل صالح پر ہو۔

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ جب ایک امر کا وعدہ ہو تو پھر اس کے لئے دعا کی کیا حاجت رہ گئی اور وعدہ بھی جب کہ اللہ کی طرف سے ہو کیونکہ اللہ سے تو خلاف وعدہ محال ہے؟ سن لینا چاہئے

کہ وعدہ عمل کے ساتھ وابستہ ہے جب عمل ہوگا یقیناً ویسا ہی اس کے ساتھ اس کا نتیجہ قانون الٰہی میں طے ہے اور اسی نتیجہ کا نام وعدہ ہے۔ جب عمل اچھا ہے تو یقیناً اس کا وعدہ الٰہی یعنی نتیجہ عمل بھی اچھا ہی ہوگا اور برائی یا خطا ہو جانے کے بعد اس کا اعتراف اور معافی کی طلب جو بذاتہ ایک عمل ہے اور پھر ایسا عمل ہے جو پہلے عمل کے نتیجہ کو مٹا کر نیا نتیجہ پیدا کر دیتا ہے جو اس معافی طلب کرنے کے عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔

اللہ کے ہاں ہر عمل کرنے والے کے عمل کا اجر محفوظ ہے وہ مرد ہو یا عورت

۳۵۷ سبحان اللہ! دعا کی قبولیت کا اظہار ہے لیکن کتنے پیارے انداز میں۔ کیا ہیں وہ جو اس طرح دعا کرتے ہیں اور کیا ہی ان کا عمل ہے اور کیا ہی اس کا نتیجہ؟ ادھر ان کی زبان سے دعا کے الفاظ نکلے ادھر اس بذات الصدور ذات سے قبولیت کی سند مل گئی۔ جو دعائیں صحیح عمل و جذبے کے ساتھ صحیح محل اور ٹھیک وقت پر نکلتی ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ گزشتہ دعاؤں کے مضمون پر ایک بار نظر کرو اور ان کو دعا کے طور پر پڑھو اور ان دعا مانگنے والوں کو دیکھو انہوں نے کس طرح اللہ کا ذکر بلند کیا اور آسمان و زمین کی پیدائش پر فکر کرنے کا کون سا انداز اختیار کیا اور پھر اپنے رب کو پکارتے ہوئے "رَبَّنَا" کے الفاظ انہوں نے دل کی گہرائی سے نکالے اور پھر پکار اٹھے کہ اللہ! تو نے ان کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا اور اس طرح انہوں نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو رب کے آگے ڈال دیا اور کہنے لگے جس طرح تو نے ہم کو "اٰمَنَّا" کہنے کی توفیق دی اس طرح ہماری تمام کوتاہیوں سے درگزر فرما اور اس راہ کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے اور انجام کار ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اس طرح جب انہوں نے اچھے اعمال کرنے کے باوجود ان پر ناز نہ کیا بلکہ اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھتے ہوئے دعا مانگی تو رحمت الٰہی نے بھی ان کی کس طرح حوصلہ افزائی فرمائی کہ "اس طرح دعائیں کرنے والوں کی دعاؤں کو ان کے رب نے قبول کر لیا اور فرمایا کہ "بلاشبہ میں کبھی بھی کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو اور نتائج عمل کا قانون سب کے لئے ایک جیسا ہی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی فرما دی جو اس دعوت کو قبول کرنے والے تھے جس دعوت کو پیش کرنے کے لئے نبی اعظم و آخر ﷺ مبعوث ہوئے۔ جو اس نازک مرحلے میں اس کی تائید و تصدیق کے لئے سارے خطرات سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پھر اس مرحلے کا ذکر بھی خود ہی فرما دیا کہ یہ وہی مرحلہ ہے جس میں لوگوں نے راہ حق میں ہجرت کی۔ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے "اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ" انجام کار راہ حق میں جہاد کیا اور مرنے مارنے پر تیار ہوگئے۔

اس مشکل وقت میں جو لوگ اس میدان میں سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترتے تھے ان میں آزاد بھی تھے اور غلام بھی مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور سب کے سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کر

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝۱۹۵ لَا يَغُرَّنَّكَ

انہیں ابدی باغوں میں پہنچا دوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ یہ اللہ کی طرف سے انکے نیک اعمال کا ثواب ہوگا اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہتر ثواب ہے۔ ۳۵۸ ۱۹۵

اے پیغمبر اسلام! جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان کا عیش و آرام کے ساتھ

رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندین اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں اور غلاموں پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے ان کو سن کر تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کا یہ بہت بڑا معجزہ ہے کہ کفار کی یہ تمام ستم ظریفیاں کسی ایک شخص کو بھی اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا جو شخص جتنا ہی کمزور تھا اس نے اس قدر زیادہ استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا۔ پھر ان کی دعاؤں کی قبولیت کیوں نہ ہوئی؟ وہ وقت تو بہت مشکل وقت تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت باراں تو آج بھی اس طرح برسنے کے لئے تیار ہے کوئی دل سے "آہ" نکال کر تو دیکھے کوئی مانگنے والا بھی تو ہو؟

جن لوگوں کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور ان کے اجر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے

۳۵۸ ثَابَ يَثُوْبُ ثَوْبًا کے اصل معنی رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور اسی سے ثواب ہے جس کے معنی اس ثمر سے کے ہیں کسی عمل کرنے والے کے عمل کے نتیجہ میں اس کو دیا جاتا ہے گویا وہ اس کو عمل کرنے کے رد عمل کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ لفظ میں گنجائش ہر عمل کے نتیجہ کی ہے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط یعنی خیر و شر دونوں کی لیکن ثواب کا لفظ نیک عمل ہی کے نتیجہ کے لئے استعمال سمجھا گیا ہے ہاں! اس جگہ بندوں کے حقیر اعمال پر جو اللہ تعالیٰ ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا اس کو ثواب کے لفظ سے ادا کیا گیا گویا اس طرح اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کے اعمال صالحہ کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔ "مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس انعام و اکرام کو جو بندوں کو دیا جائے گا "وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ" اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہتر ثواب ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا : (۱۳۴)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ (النساء ۴ : ۱۳۴)

"جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی اور سننے والا دیکھنے والا ہے۔" مطلب بالکل واضح ہو گیا کہ اللہ کے پاس دنیا کے فائدے بھی

ہیں اور آخرت کے فائدے بھی۔ عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمہارے اپنے ظرف، حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چند روزہ فائدوں پر ہی ریجھتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہو تو خدا یہی کچھ تمہیں ابھی اس دنیا میں دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصے میں آئیں۔ ہم نے اس ثواب کا جو حشر کیا ہے اس کا ذکر کسی دوسرے مقام پر ہوگا۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (التحریم ۶۶ : ۸) "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کے حضور ایسی خالص توبہ کرو کہ دوبارہ اس کے ارتکاب کا خیال تک بھی نہ آئے بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہارے گناہ اور قصور معاف فرما کر ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ یہ ایسا دن ہوگا جس میں اللہ عزوجل اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں کو رسوا اور ذلیل نہیں کرے گا اور یہی وہ وقت ہے کہ اہل ایمان کا ایمان ان کے لئے روشنی کا کام دے گا جو ان کے دائیں بائیں دوڑ رہا ہوگا اور وہ اس میں چل کر جنت میں داخل ہوں گے اور نہایت خوشی سے بارگاہ ایزدی میں عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لئے مکمل فرما دے اور ہمارے گناہ معاف فرما دے تو بلاشبہ ہر چیز پر قادر ہے۔" توبہ نصوح کیا ہے؟

اس کی تشریح ہمیں اس حدیث میں ملتی ہے جو ابن ابی حاتم نے زر بن حبیش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب سے توبہ نصوح کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سوال کیا تھا آپ ﷺ نے فرمایا "اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔" یہی مطلب حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے اور ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تَوْبَةً نَّصُوحًا کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار اس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔ (ابن جریر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک بدو کو جلدی جلدی توبہ و استغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا یہ "توبة الکذابین" ہے۔ اس نے پوچھا پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا اس کے ساتھ چھ چیزوں کا ہونا ضروری

ہے اور وہ یہ ہیں کہ

۱۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔

۲۔ اپنے جن فرائض سے کوتاہی برتی ہے ان کو ادا کرے۔

۳۔ جس کا حق مارا ہے اس کو واپس کرے۔

۴۔ جس کو تکلیف پہنچائی ہے اس سے معافی طلب کرے۔

۵۔ آئندہ کیلئے کبھی اس گناہ کا اعادہ نہ کرے۔

۶۔ اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں لگا دے جس طرح اب تک اسے معصیت کا خوگر بنایا ہے اب اس کو اطاعت الٰہی کا تلخ مزہ چکھائے جس طرح اب تک تو اسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا۔ (کشاف)

توبہ کے متعلق چند امور اور بھی قابل لحاظ ہیں ان کو بھی اچھی طرح یاد رکھ لینا چاہئے تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

اول یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لئے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے ورنہ کسی گناہ سے اس لئے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لئے نقصان دہ ہے یا کسی بدنامی یا مالی نقصان کا موجب ہے توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔

دوم یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے اس وقت اسے توبہ کرنی چاہئے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو بلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہئے اسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔

سوم یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور اس طرح زبان سے توبہ توبہ کرنا اور اس حرکت سے باز نہ آنا گویا توبہ کو کھیل بنا لینا توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اس طرح اس کو کھیل نہ بنایا جاتا یہ توبہ نہیں ہے۔

چہارم یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا اگر بشری کمزوری پر اس گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہوگا البتہ اسے اس بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہئے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہئے کہ آئندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہو۔

پنجم یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے لیکن اگر اس کا نفس اپنے سابق گناہ گارانہ زندگی کی یاد سے لطف اندوز ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہئے۔ یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لئے لذت کی بجائے شرمساری سے گردن جھکا دے اس لئے کہ جس شخص نے فی الواقع اللہ کے خوف کی بنا پر توبہ کی ہو وہ اس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خوف الٰہی نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی یا یہ کہ اس نے گناہ نہیں چھوڑا بلکہ گناہ اس کو

تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ

ملکوں میں سیر و گردش کرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ ۳۵۹ ۱۹۶

یہ جو کچھ ہے محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے بالآخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ذرا

چھوڑ گیا ہے۔

کفر کی راہ چلنے والے آپ کے لئے دھوکا کا باعث نہ ہوں

۳۵۹ یہ بات نبی اعظم و آخر ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی گئی۔ یہ وقت وہ تھا کہ نبی رحمت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی سب کے سب دنیوی زندگی کے اعتبار سے مالی کمزوریوں میں مبتلا تھے۔ مکی زندگی میں کار نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کی وجہ سے تجارت تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور رہی سہی کسر ہجرت سے نکل گئی جو کچھ کسی کے پاس تھا وہ مکہ میں رہ گیا مدینہ پہنچنے کے بعد مہاجرین کے پاس تو پہلے ہی کچھ نہ تھا اب انصار کی باری آئی وہ اپنی طرف سے سب کچھ پیش کر رہے تھے لیکن مہاجرین میں سے قوت لایموت اگر کسی نے کچھ لیا بھی تو اس کو واپسی کی فکر دامن گیر تھی۔ اس کے برعکس مدینہ اور مضافات مدینہ میں یہود کے سرداروں کے پاس بہت مال تھا اور دنیا کی ہر طرح کی آسائشوں اور آسانیوں سے زندگی بسر کر رہے تھے ایسی حالت میں اگرچہ صحابہ بالکل مطمئن اور پوری محنت و مشقت کی زندگی گزار رہے تھے تاہم ان کی دلجوئی فرمائی جا رہی ہے کہ تم شکستہ خاطر نہ ہونا تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں اور رشک کے لائق تمہاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے نہ کہ ان لوگوں کی مالی دولت جو طرح طرح کے حرام طریقوں سے انہوں نے کمائی ہے اور کما رہے ہیں اور پھر اگر وہ اس حرام کمائی کو طرح طرح کے راستوں میں اڑا رہے ہیں تو آخر کار بالکل مفلس و قلاش ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔ اور یہی بات آپ ﷺ کو مکی زندگی میں بھی ارشاد فرمائی گئی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ اللہ تو اپنے قانون کے مطابق یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکار حق کی حالت میں دیں۔" (التوبہ ۹ : ۵۵)

یعنی اس مال و دولت اور اہل و اولاد کے سبب اور اس دنیا کی ہو ہوا کی وجہ سے انہیں مرتے دم تک صدق ایمان کی توفیق نصیب نہ ہوگی اور اپنی دنیا خراب کر لینے کے بعد یہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوں گے کہ ان کی آخرت بھی خراب ہو چکی ہوگی کیونکہ وہاں جو کچھ ان کے حصے میں آئے گا وہ اس کا نتیجہ ہوگا جو

جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ

خیال کرو کہ جہنم کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۱۹۷
لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرے یعنی پرہیزگاری کی راہ اختیار کی تو ان کے لئے

وہ دنیا میں کرتے رہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (الحجر ۱۵ : ۸۸) "تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان والوں کی طرف جھک جاؤ۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۰، ۱۳۱) "اور یہ جو مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی آرائشیں دے رکھی ہیں اور ان سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں تو تیری نگاہیں اس پر نہ جمیں یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا ہے اور جو کچھ تیرے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی ہے وہی تیرے لئے بہتر ہے اور باقی رہنے والی۔" ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (الشوریٰ ۴۲ : ۳۶) "جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

اس دنیا کا مال و متاع کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے ایک تھوڑی سی مدت ہی کے لئے ملی ہے چند سال وہ اس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دولت چاہے بہی کھاتوں میں کتنی بڑی دولت کیوں نہ ہو عملاً اس کا قلیل حصہ ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اس مال پر اترانا کسی ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنے اور اس مال و دولت کی اور خود اس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ۚ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (القصص ۲۸ : ۶۰) "تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟"

مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۲

دنیا کا فائدہ ایک قلیل مدت کیلئے اور جہنم کا عذاب ابد الاباد ہے

۳۶۰ دنیا کی زندگی جو انسان کو ملی ہے وہ کتنی ہے؟ فرض کر لیجئے کہ ایک سو سال پندرہ بیس سال تک انسان شعور کو پہنچتا ہے اور پچھتر اسی سال سے قبل ہی جوانی اور شعور جاتا رہتا ہے الا ماشاء اللہ اور درمیان کے پچاس ساٹھ سال ہیں کہ اگر اس کو ڈھیروں دولت مل گئی یا اس نے حاصل کر لی اور پھر جبھی آنکھیں بند ہوئیں وہ سارے خزانے گویا راکھ ہوگئے اور اب جو زندگی ملی وہ ایسی ہے جس کا کوئی آخر نہیں کیونکہ وہ خود ہی آخر ہے اور اس دنیا کو چھوڑنے والا کہاں گیا؟ فرمایا یہ دنیا میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے والا جو مال و دولت کے ان خزانوں پر ایسا مفتوں ہو چکا تھا کہ وہ عطا کرنے والے کو بالکل بھول ہی گیا تھا اس سانس کے منقطع ہوتے ہی جہنم رسید ہوگیا۔ اس لئے کہ عالم برزخ میں اس کو جو مقام نصیب ہوا وہ دوزخیوں کی جیل ہے لہٰذا اب اس کو اس جیل خانہ میں قید کر دیا گیا اور اب اسے کوئی مائی کا لال رہائی نہیں دلا سکے گا اور یہ سارے ثواب کے ٹھیکے دار کتنی ہی فیسیں اس کے پچھلوں سے وصول کر لیں لیکن اس کی وکالت نہیں کر سکیں گے اور اس کو مسلسل جیل خانہ میں رکھ کر عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور حشر کا دن آنے تک اس قید میں سڑتا رہے گا اور پھر حشر ہوگا اور اس کو ابدی دوزخ کی سزا سنا دی جائے گی۔ اتنے بڑے عرصے کے عذاب کو اس چند روزہ زندگی کے ساتھ آخر کیا نسبت رہی؟ اور آخر اس نے کتنا فائدہ اٹھا لیا؟ قرآن کریم میں یہ مضمون اس تعداد میں بیان کیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ اس سے خالی ملے۔ تاہم دو' تین مقامات کو دیکھ لینا اس جگہ بھی مفید ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

"جو لوگ بدبخت و محروم ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے ان کے لئے وہاں چیخنا چلانا ہوگا۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں مگر ہاں! اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے اور اس کے قانون میں ان کا وہاں رہنا ہمیشہ ہمیشہ نہ ہو بلاشبہ تیرا پروردگار اپنے کاموں میں مختار ہے وہ جس طرح چاہتا ہے بالکل اسی طرح کرتا ہے۔" (ہود ۱۱ : ۱۰۶' ۱۰۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا تو ان کے لئے سرتاسر خوبی ہے لیکن جنہوں نے قبول نہیں کیا ان کے تمام اعمال رائیگاں جائیں گے اور اگر ان کے اختیار میں کرۂ ارض کی ساری دولت بھی آجائے اور پھر اسے دوگنا کر دیا جائے تو یہ لوگ اپنے بدلہ میں ضرور اپنے فدیہ میں دے دیں کہ کسی طرح عذاب نامرادی سے بچاؤ مل جائے مگر انہیں ملنے والا نہیں یہی لوگ ہیں جن کے لئے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہوگیا اس کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہوا۔" (الرعد ۱۳ : ۱۸) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اصل یہ ہے کہ ان منکروں کی نگاہوں میں ان کی مکاریاں خوشنما بن گئیں اور وہ راہ حق میں قدم اٹھانے سے رک گئے اور جس پر اللہ کامیابی کی راہ بند کر دے تو کون ہے جو اسے راہ دکھانے والا ہو سکتا ہے؟ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت میں بھی اور آخرت کا عذاب یقیناً بہت ہی زیادہ سخت

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ ❁ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک کرداروں کے لئے ہے جو اچھائی اور خوبی کے سوا کچھ نہیں۔ ۳۶۱ ۱۹۸

اور یقیناً اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر سچے دل سے ایمان رکھتے

ہوگا اور کوئی نہیں جو انہیں اللہ کے قوانین کی اس پکڑ سے بچا سکے۔" (الرعد ۱۳ : ۳۳، ۳۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی مگر انہوں نے کفران نعمت سے اسے بدل ڈالا اور اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارا؟ یعنی دوزخ میں جا اتارا جس میں وہ داخل ہوں گے پھر جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو کیا ہی برا اس کا ٹھکانہ ہے۔" (ابراہیم ۱۴ : ۲۹)

اور یہی مضمون اس جگہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ "یہ جو کچھ ہے محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور ذرا خیال کرو کہ جہنم کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔"

جو لوگ نیک کردار ہوئے وہ ابدی باغات اور ان کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

۳۶۱ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون سعادت و شقاوت کے مطابق جس کسی کو راہ کامیابی ملنے والی ہے اس کا دل اسلام کے لئے کھل جاتا ہے اور نیک کردار ہو جاتا ہے اور برائی سے دور بھاگتا ہے اور اس کا دل نیکی پر جم جاتا ہے۔ اب جو بات بھی اس کو اچھی معلوم ہوگی وہ اس کی طرف لپک جائے گا اور جو راہ برائی کی ہوئی اس کے قریب بھی نہیں جائے گا۔ ہاں! اگر ایسا ہوگیا اور اللہ نے اس کو برائیوں سے بچا لیا تو وہ یقیناً کامیاب و کامران ہوگیا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اللہ کی سیدھی راہ پر قدم اٹھایا ان کے پروردگار کے حضور سلامتی و عافیت کا گھر ہے اور جو کچھ ان کے نیک عمل رہے ہیں ان کی وجہ سے وہ ان کا رفیق و مددگار ہے۔" (الانعام ۶ : ۱۲۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ہمیشگی کی جنت جس کا اپنے بندوں سے خدائے رحمٰن نے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ وعدہ ایک غیبی بات کا ہے جسے وہ اس زندگی میں محسوس نہیں کر سکتے مگر یقیناً اس کا وعدہ ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آگئی ہو۔

لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ

ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہو چکا ہے سب کے لئے ان کے دل میں یقین ہے[۳۶۲] نیز ان کے دل اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے کہ

پھر اس زندگی میں کوئی ناشائستہ بات ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی جو کچھ سنیں گے وہ سلامتی کی صدا ہوگی۔ وہاں صبح و شام ان کا رزق ان کے لئے برابر مہیا ہوگا۔ سو دیکھو یہ جنت ہے جس کا ہم اسے وارث کر دیتے ہیں جو ہمارے بندوں میں متقی ہوتا ہے۔" (مریم ۱۹ : ۶۱، ۶۳)

یہی بات اس جگہ ارشاد فرمائی جا رہی ہے کہ "جو لوگ اپنے رب سے ڈرے اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کی تو ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک کرداروں کے لئے ہے جو اچھائی اور خوبی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔"

اہل کتاب میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو کتاب الٰہی کو مانتے ہیں وہ تورات ہو یا قرآن کریم

۳۶۲ اسلام کے ابتدائی عہد ہی میں جب کہ ابھی دعوت حق کی غربت و بے چارگی کا زمانہ تھا نجاشی یعنی "نیگوشی" حبش کا مسیحی فرمانبردار بغیر دیکھے ایمان لے آیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ مسلمانوں کی جو جماعت ہجرت کر کے مکہ سے حبش چلی گئی تھی نجاشی نے ان سے خواہش کی کہ اپنے پیغمبر کا کلام سناؤ۔ انہوں نے سورہ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی۔ ان آیات کی تلاوت کرنے والے جعفر بن ابی طالب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے نجاشی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور وہ بول اٹھا "اس کلام میں وہی روح بول رہی ہے جو مسیح میں گویا ہوئی تھی۔" (صحیح بخاری و مسلم) نجاشی کے علاوہ عرب میں بھی اگرچہ ہجرت کے بعد ہی عیسائیوں کی بڑی تعداد ایمان لے آئی لیکن یہود کے جمود میں جنبش نہ ہوئی وہ برابر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں خیبر سے بھی جلا وطن کر دیئے گئے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوا۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (المائدہ ۵ : ۸۳، ۸۵)

اور جب یہ لوگ یعنی عیسائیوں میں سے کچھ وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوش گریہ سے بہنے لگتی ہیں کیونکہ انہوں نے اس کلام کی سچائی پہچان لی ہے اور وہ

بے اختیار بول اٹھتے ہیں "اے ہمارے رب! ہم اس کلام پر ایمان لائے' پس ہمیں بھی انہی میں لکھ لے جو تیری سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔" اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس کلام پر جو سچائی کے ساتھ ہمارے پاس آیا ہے ایمان نہ لائیں اور اللہ سے اس کی توقع نہ رکھیں کہ وہ ہمیں نیک کردار انسانوں کے گروہ میں داخل کر دے؟" تو دیکھو اللہ نے ان کے اس طرح کہنے کے صلے میں جو انہوں نے بالکل سچی بات کہی تھی جنتیں عطا فرمائیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ ان جنتوں میں رہیں گے۔ ایسا ہی بدلہ ہے جو نیک کرداروں کے لئے ٹھہرا دیا گیا ہے۔"

سورہ الاعراف کی آیت ۱۵۹ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو حق کو حق کہتے تھے یعنی یہود میں سے بھی کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے اگرچہ ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی چنانچہ مفسرین نے ان کی گنتی کو دس سے آگے یقیناً نہیں بڑھایا اور ان میں سے سر فہرست حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کے چند ایک دوسرے ساتھی بھی تھے جو سچے دل سے ایمان لائے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نجاشی کے انتقال کی خبر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو دی اور فرمایا کہ تمہارا بھائی حبش میں انتقال کر گیا ہے اس کے جنازے کی نماز ادا کرو اور کھلے میدان میں جا کر صحابہؓ کی صفیں مرتب کر کے آپ ﷺ نے ان کے جنازے کی نماز ادا کی۔ (بخاری و مسلم)

ابن مردویہ میں ہے کہ جب نجاشی فوت ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو یعنی نماز جنازہ ادا کرو تو بعض لوگوں نے کہا دیکھئے نبی کریم ﷺ نے ایک نصرانی کے لئے استغفار کرنے کا حکم دیا ہے جو حبشہ میں مرا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر میں ہے کہ ان کی موت کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی کہ تمہارا بھائی اصحمہ انتقال کر گیا ہے۔ پھر آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور جس طرح جنازے کی نماز پڑھاتے تھے اسی طرح چار تکبیروں سے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس پر منافقوں نے اعتراض کیا تھا اور یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی۔

ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نجاشی کے انتقال کے بعد ہم یہی سنتے رہے کہ ان کی قبر منور ہوگئی یعنی اللہ نے اس کو بخش دیا۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملتا ہے جن میں سے ایک اہل کتاب کا وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور مجھ پر ایمان لایا پھر باقی دو کا بھی ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو کسی قیمت پر بھی نہیں بیچتے اور نہ ہی اپنی کتاب کی علمی باتوں کو چھپاتے ہیں۔ ہاں ان میں سے یہ کام ایک رذیل جماعت کا ہے۔ بلکہ یہ اللہ کے نیک بندے تو ایسے ہیں کہ ان باتوں کو خوب کھول کر بیان کرتے اور لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور ان کا بدلہ ان کے

خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ

اللہ کی آیتیں دنیا کے مال حقیر کے بدلے فروخت کر ڈالیں تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے[۳۶۳]۔ یقیناً اللہ کا قانون مکافات

رب کے ہاں محفوظ ہے جو کبھی ضائع ہونے والا نہیں۔

ایسے اہل کتاب کا اجر بھی یقیناً اپنے رب کے ہاں محفوظ ہے

۳۶۳ "نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال" کا محاورہ زبان زد خاص و عام ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ نیکی اگر نیکی ہے تو اس کو کوئی خطرہ نہیں نہ وہ گلے گی نہ سڑے گی بلکہ ہر حال میں محفوظ رہے گی جب تک کہ نیکی کرنے والا خود اس پر کیڑ نہ پھیر دے۔ نیکی کے لئے صرف ایمان شرط ہے گروہ بندی نہیں۔ اس لئے نیکی کا تعلق گروہ بندیوں سے نہیں ایمان باللہ سے ہے۔ اسلام اس بات کا داعی ہے اور اس نے شروع سے لے کر آخر تک کبھی بھی ان گروہ بندیوں کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے نیک عمل کو اس لئے ٹھکرا دیا ہے کہ وہ گروہ فلاں گروہ بندی سے ہے اس لئے اس کے نیک عمل کا کوئی نتیجہ نہیں وہ بار بار یہ کہتا ہے کہ جو بھی نیک عمل کرے گا اور اس کا عمل رضا الٰہی کے لئے ہوگا وہ اپنا اجر یقیناً اللہ کے ہاں محفوظ پائے گا اور اس کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کرے بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا ہو گیا کیونکہ جونہی تم اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹو گے تمہارے سامنے وہی حقیقت آموجود ہوگی جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں بلکہ وہی قدیم اور عالمگیر پیام ہے جو تمام انبیاء کرام میرے سے پہلے دے چکے۔ اس طرح اس نے جب کہا یہی کہا کہ تم اپنی آسمانی کتاب کا سبق بھول چکے ہو اس کو یاد کرو۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :-

"اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی اور ان تمام صحائف کی جو تم پر نازل ہوئے اس حقیقت قائم نہ کرو اسی وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور اے پیغمبر اسلام! تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا تو جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کر لی ہے تم ان کی حالت پر بے کار غم مت کھاؤ۔ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں' جو یہودی ہیں' صابی ہیں' جو نصاریٰ ہیں جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے' نہ کسی طرح کی غمگینی۔" (المائدہ ۵

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ

اعمال کے حساب میں ست رفتار نہیں۔ ۳۶۴ ۱۹۹

اے مسلمانو! ان ساری باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ صبر کرو۔ ایک دوسرے کو صبر کی

(۶۸، ۶۹ :-

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قران کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے اپنے مذہب کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔ ہاں! وہ کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور غالب تعداد انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے دین الٰہی کی اعتقادی اور عملی حقیقت کو یک قلم ضائع کر دیا ہے۔ اس جگہ بھی وہ یہی کہہ رہا ہے کہ "جن لوگوں کے دل اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے کہ اللہ کی آیتیں دنیا کے مال حقیر کے بدلے فروخت کر ڈالیں تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔"

یہ بات یاد رکھو کہ اللہ کا قانون مکافات سست رفتار نہیں ہے

۳۶۴ اب فرمایا کہ عمل کا تعلق نیت کے ساتھ ہے ایک آدمی نے نیک عمل کیا اور اس کی نیت میں یہ بات موجود ہے کہ اس کا بدلہ اس کو روز جزاء میں ملے گا اس لئے اس نے جو کیا وہ اللہ کی رضا کے لئے۔ مثلاً ایک آدمی نے پانی کا نل لگوا دیا اس کی نیت یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کا فائدہ ہو اور میرا اجر اللہ کے ہاں محفوظ رہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ہے جس نے اسی طرح پانی کا نل لگوایا لیکن اس کی نیت میں یہ بات ہے کہ لوگوں میں چرچا ہو اور اس طرح میرا نام پکارا جائے اور مدت تک لوگ یاد رکھیں کہ فلاں نے یہ کام کیا تھا۔ اب عمل دونوں کا ایک جیسا ہے لیکن ایک نے ایمان باللہ کے ساتھ یہ عمل کیا ہے اور دوسرے نے لوگوں سے داد تحسین حاصل کرنے کیلئے۔ داد تحسین یقیناً دونوں کو ملے گی لیکن پہلے کا اجر عنداللہ محفوظ ہے اور دوسرے کا اجر بڑی تیزی کے ساتھ اللہ نے لوگوں سے داد تحسین دلوا کر چکا دیا یہ اس لئے کہ اس کی خواہش ہی یہی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ کافروں کے اچھے اعمال کو ریت سے تشبیہ دی گئی اور مثال دے کر سمجھایا کہ جس وقت دنیا میں انہوں نے یہ اعمال کئے تھے اس وقت ان کی نیت لوگوں سے داد تحسین حاصل کرنا تھا چنانچہ وہ ان کو ملتی رہی اور اتنی ملی کہ وہ پھولے نہ سمائے لیکن موت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ دنیا تو صرف دارالعمل تھا دارالجزاء تو یہ ہے اور اس وقت ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اب وہی کئے گئے اعمال ہم کو کچھ فائدہ دیں کیونکہ یہاں تو کوئی عمل کیا نہیں جا سکتا اور نہ ہی کسی دوسرے عمل کا کیا ہوا اب ہمارے کام آسکتا ہے۔ اس

اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۲۰۰

تلقین کرو یعنی ترغیب دو' ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ۔ یعنی سب مل کر ایک ہو جاؤ اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب و کامران ہو اور یاد رکھو کہ آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔[۳۶۵] ۲۰۰

حالت کو قرآن کریم نے پیاس اور طلب سے تشبیہ دی ہے اور اب جب ان کو پیاس لگے گی تو وہ دوڑیں گے اور دیکھیں گے کہ گویا وہاں پانی موجود ہے یعنی ان کے وہ عمل جو انہوں نے دنیا میں کئے تھے وہ یاد آئیں گے تو اب ان کی خواہش ہوگی کہ کچھ ہمارے کام آئیں لیکن وہ بھاگ کر وہاں پہنچیں گے تو وہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں پائیں گے یعنی ان کے وہ کئے ہوئے اعمال ریت کی طرح بے جان اور مردہ ہو چکے ہوں گے اس وقت ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا حساب تو کب کا بیباک ہو چکا ہے کیونکہ اللہ نے تو ان کا بدلا ساتھ ہی ساتھ چکا دیا تھا۔ اس مثال کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا :-

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (النور ۲۴ :- ۳۹) "جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا ہاں! اللہ کو اس نے وہاں موجود پایا میں نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔" پھر اس مضمون کو دوسری مثال سے بھی سمجھایا گیا ہے اور اس جگہ بھی آیت کے آخر میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ کفار کے اعمال کا پورا پورا حساب چکانے والا ہے تو وہ اپنے نیک لوگوں کے اعمال کو یعنی ان کے اجر کو آخر کیوں ضائع کرے گا؟ کیونکہ ان کا مطلوب تو اللہ کی رضا تھی؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء ۴ :- ۱۲۲) "اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے تو ہم انہیں باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ سچا ہی ہوتا ہے اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں سچا اور کون ہو سکتا ہے؟"

خلاصہ کلام سن لو اور ہدایات پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ دین و دنیا کی بھلائی اسی میں ہے

[۳۶۵] یہ سورہ آل عمران کی آخری آیت ہے جس میں خاتمہ کلام کے طور پر تمام بنیادی ہدایات جمع کر دی گئی ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے اور اس راستہ میں پیش آنے والی ساری مشکلات سے عہدہ برا ہونے کیلئے ضروری ہیں اور ان ہدایات کا ماحصل چار چیزیں ہیں ان کو اختیار کر کے مضبوطی کے ساتھ

جمے رہنے میں دین و دنیا کی ساری کامیابیاں ہیں۔

ان چار چیزوں میں پہلے صبر ہے' دوسری مصابرت' تیسری مرابطہ اور چوتھی تقویٰ۔ سورہ فاتحہ میں صبر اور تقویٰ دونوں کی تفصیل آچکی ہے تاہم ان چاروں کا مختصر ذکر یہاں بھی علی الترتیب کر دیا جاتا ہے۔

صبر کیا ہے؟ صبر کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس طرح ہے کہ "الصبر ردائی" صبر میرا لباس یعنی اوڑھنا ہے۔ گویا صبر اسلام کا دیا ہوا لباس ہے جس نے پہن لیا اس نے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا اور جس نے اتار دیا وہ ننگا ہوگیا۔ صبر انسان اور خصوصاً مسلمان کی پوری زندگی پر محیط ہے اسی طرح صبر یہ ہے کہ آدمی نیکی پر قادر ہو جائے اور معصیت سے رک جائے یا جو مصائب و مشکلات قضا و قدر سے یا اسلام کے دشمنوں کی طرف سے پیش آئیں ان کو برداشت کرتے ہوئے اسلام پر کاربند رہے اور ان مصائب و مشکلات کے سامنے ہمت نہ ہارے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرتا رہے اور دیکھتا رہے کہ آپ ﷺ نے اس لباس کو ہر حال میں پہنے رکھا اور اپنے صحابہ کو بھی اس کے اوڑھنے کی نصیحت کی اور انہوں نے بھی اس نصیحت کے قبول کرنے میں دیر نہ لگائی اور پوری زندگی اسی کو اوڑھے ہی رہے۔ پھر اس بیان کو چند سطروں میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے؟ اس لئے اس جگہ قرآن کریم کی ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہم کو بھی یہ لباس پہننے کی توفیق عطا فرمائے جو پوری زندگی نہ اتر سکے۔ قرآن کریم کی آیت میں فرمایا :

وَلَا يَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (فصلت ۴۱ : ۳۴' ۳۵) "اور اے پیغمبر اسلام! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کا دفاع اس نیکی سے کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔"

یہ تو اس آیت کے معنی ہیں لیکن اس ارشاد کو پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے کیلئے وہ حالات بھی نگاہ میں رہنے چاہئیں جن میں نبی اعظم و آخر ﷺ اور آپ ﷺ کے واسطے سے آپ ﷺ کے پیروؤں کو یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ دعوت حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا جس میں اخلاق' انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ دی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ ﷺ کو بدنام کرنے اور آپ ﷺ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کیلئے استعمال کئے جا رہے تھے طرح طرح کے الزامات آپ ﷺ پر لگائے جا رہے تھے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپ ﷺ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو پہنچائی جا رہی تھیں جن سے تنگ آکر

مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپ ﷺ کی تبلیغ کو روک دینے کیلئے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہلڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ ﷺ کی تاک میں لگا رہے اور جب آپ ﷺ دعوت حق کیلئے زبان کھولیں تو اتنا شور بپا کر دیا جائے کہ کوئی آپ ﷺ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے اس وقت مخالفتوں کو توڑنے کا یہ نسخہ آپ ﷺ کو بتایا گیا۔

اس میں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اٹھا لائے ہوں جن کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اس کی فطرت بدی سے نفرت کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھ ہی نہیں خود اس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں' ظالم ہیں اور اپنی اغراض کیلئے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں ان کا وقار پیدا کرنا تو درکنار انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور ان کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے مسلسل کام کرتی چلی جائے تو آخر کار وہ غالب آکر رہتی ہے کیونکہ اول تو نیکی بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروف پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

زیر نظر آیت میں دوسری یہ بات فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجہ کی ہو یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو یہ محض نیکی ہے اعلیٰ درجے کی نیکی نہیں۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے برا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔ اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا۔ اس لئے کہ یہی انسانی فطرت ہے گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ نیکی ہوگی مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کیلئے کھلے گی۔ ایک شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر مزید دلیر ہو جائے لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آرہے گا کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے

میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدہ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر شخص جگری دوست ہی بن جائے گا دنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی برائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں ان کے نیش عقرب کا زہریلا پن ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شر مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیر مجسم انسان کم یاب ہیں۔

ہاں! یہ نسخہ تو بڑا ہی کارگر ہے مگر اس کا استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس کیلئے بڑا دل گردہ چاہئے۔ اس کیلئے یہ بڑا عزم' بڑا حوصلہ' بڑی قوت برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک ان باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کرتے ہوں اور پھر طاقت اور اقتدارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کیلئے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہے۔ جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو اور جس کے اندر نیکی اور راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہوں کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقام بلند سے نیچے اتروانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

یہ تو اس وقت کے حالات کی ایک جھلک تھی جب نبی اعظم و آخر ﷺ مبعوث ہو کر دعوت دے رہے تھے اب اس آیت کی مختصر ہدایات پر نظر کرو کہ :

۱۔ اس آیت میں ایک اصول بتایا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔ اس آیت میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرز عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳۔ اس آیت میں دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا ہے اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاق محمدی ﷺ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ اس آیت میں دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو صحابہ میں سب سے بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر علم اور عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑا دے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔" (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۱۲)

ہاں! عملی مثالیں دیکھنا چاہتے ہو تو اسلام کے اس داعی اعظم و آخر ﷺ میں ان مثالوں کی کوئی کمی نہیں پاؤ گے بلکہ اس سے بڑھ کر دنیا کے کسی انسان میں نہیں ملے سکیں گی جس نے فاتح بن کر مفتوح ہو کر نہیں۔ حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں بیک وقت مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسہ رہ چکا تھا۔ (صحیح بخاری باب فتح مکہ)

جس نے اس کو معاف کیا جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کیلئے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الہجرۃ)

جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کر دیا تھا۔ (صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر اخلاق النبی)

جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا (صحیح بخاری فتح مکہ) یہ وہی قاتل تھا جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کیا اور اس کے جگر کو چبانے والی کو معاف کر دیا۔ (صحیح بخاری باب فتح مکہ)

جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا۔ (جامع ترمذی التفسیر سورہ الفتح)

جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا اپنے اوپر ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کر دیا۔ (صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۲۰۸)

جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی جنہوں نے اس پر پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے۔

جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۶ باب احد)

جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کیلئے نہیں بلکہ رحمت کیلئے آیا ہوں۔ (صحیح بخاری، مشکوۃ، اخلاق النبیؐ بحوالہ مسلم)

یہ تھا وہ صبر جس کی ہدایت لے کر نبی اعظم و آخر ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور اس کو پوری زندگی اپنا لباس بنا کر دنیا کو دکھا دیا کہ داعی اسلام کا کہنا اور کرنا ایک ہے اس میں کوئی تضاد تم نہیں پاؤ گے۔

مصابرت کیا ہے؟ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا یا اپنوں، قریبیوں اور ہمسایوں سے جو دکھ پیش آئیں ان کو برداشت کرنا یا مصائب اور تکالیف کی برداشت میں اپنے دشمن سے

فوقیت لے جانا۔ گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر مصائب کو برداشت کرنا اور اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لینا پھر یہ ساری باتیں ہی آپ ﷺ میں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں جو محتاج بیان نہیں۔

رَابِطُوْا کیا ہے؟ رَابِطُوْا ربط سے ہے اور "ربط الفرس" کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کیلئے مکان پر باندھنا اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو جیسے چھاؤنیاں اور فوجی چوکیاں۔ مفردات میں ہے کہ مرابطہ جس سے رَابِطُوْا ہے کے دو معنی ہیں ایک۔ مراد گھوڑوں کا باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کیلئے ہر وقت تیار رہنا اور دوسرے معنی انسان کے نفس کے متعلق ہیں گویا نفس کو خود پر کھڑا رکھنا تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے اور کوئی بری یا فضول حرکت اس کو نہ کرنے دے۔

پہلے معنوں کی تائید قرآن کریم سے ہوتی ہے اور دوسری معنوں کی حدیث شریف سے اور دونوں معنی اپنے اپنے مقام پر صحیح اور درست ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ :

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۸ : ۶۰)

"اور جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کیلئے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ رکھ سکو۔"

مطلب واضح ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج "Standing Army" ہر وقت تیار رہنی چاہئے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار، اسلحہ اور سامان رسد جمع کرنا شروع کرو اور اس اثناء میں کہ تمہاری تیاری مکمل ہو دشمن اپنا کام کر جائے۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سامان جنگ جو زمانہ کے حالات کے مطابق نئی نئی صورت بدلتا جائے مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا ہر وقت تیار رکھنا نہایت ضروری ہے اور قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق اس کے بیان کی یہی غرض ہے۔ اس طرف سے تساہل برت کر مسلمانوں نے ناقابل تلافی نقصان اٹھایا ہے اور ابھی تک اس نقصان کو پورا کرنے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی اور اس کوتاہی کا جو نتیجہ ہے وہ عالم اسلام کے سارے مذہبی اور سیاسی لیڈروں پر واضح ہے۔ یہ کوتاہی کیوں ہوئی؟ اس کا علاج کیوں نہ کیا گیا؟ اور آج بھی اس پر توجہ کیوں نہیں دی جا رہی؟ اس کے اسباب و وجوہ پر انشاء اللہ کسی دوسرے مقام پر روشنی ڈالی جائے گی۔

دوسرے معنی قیام صلوٰۃ کے کئے گئے ہیں اور فرمایا گیا ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا بلکہ اس کیلئے تیار رہنا مرابطہ کہلاتا ہے اور نماز بذاتہ جنگی تیاری کی ایک نہایت عمدہ مشق ہے جو ڈسپلن، وقت کی پابندی، نظم و ضبط، حرکات و سکنات کی باقاعدگی اور خصوصاً آرڈر کی پابندی اور جنگی مشقوں کا بہترین نمونہ ہے اور خصوصاً اللہ رب العزۃ کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے نئے سرے سے وعدوں کا میثاق

ہے۔ لیکن ہم نے اس کو جو کچھ بنا دیا ہے وہ کسی پر بھی پوشیدہ نہیں۔

تقویٰ کیا ہے؟ ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کیلئے خلش ہو۔ بس اس کا نام تقویٰ ہے۔ اگر رسول مکرم نبی اعظم و آخر ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو "تقویٰ" سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اس تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ اس طرح ہم اسلام کے کسی کام کسی عمل کا نام تقویٰ سے لے سکتے ہیں کیونکہ اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اس تقویٰ کا حصول ہے۔

ہدایت کن لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے؟ متقین کو۔ (البقرہ ۲ : ۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔ (البقرہ ۲ : ۲۲)

تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح پہلوں پر فرض کیا گیا تھا' روزہ اس لئے ہے کہ تم متقی ہو جاؤ۔ (البقرہ ۲ : ۱۸۳)

جو شخص حج کے ارکان و مقامات کی عزت کرتا ہے اس کا منشاء بھی دل کا تقویٰ ہے۔ (الحج ۳۲ : ۲۳)

اللہ کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت و خون نہیں پہنچتا لیکن جو پہنچتا ہے وہ تقویٰ ہے۔ (الحج ۳۲ : ۳۷)

مسجدیں بنانے اور نمازیں ادا کرنے کا اصل مقصد تقویٰ ہی ہے۔ (توبۃ ۹ : ۱۰۸)

حج و جہاد کے سفر میں جو زاد راہ لے کر چلنے کی ہدایت ہے وہ بھی تقویٰ ہی ہے۔ (البقرہ ۲ : ۱۹۷)

معاف کر دینا کیا ہے؟ فرمایا وہ تقویٰ ہے۔ (البقرہ ۲ : ۲۲۷)

انصاف کرنا کیا ہے؟ فرمایا وہ بھی تقویٰ ہے۔ (المائدہ ۵ : ۸)

سارے کاموں میں سے عزم و ہمت کا کام کیا ہے؟ فرمایا وہ بھی تقویٰ ہی ہے۔ (الانعام ۶ : ۱۸۶)

نیکی کیا ہے؟ وہی جو تمہارے اعمال میں سے ایک بہترین عمل ہے جو حقیقت میں تقویٰ ہے۔ (النساء ۴ : ۱۲۸)

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے۔ عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے' پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے موقع پر ہے۔

"اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔" (الحج)

گویا تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کی بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا کرتا ہے اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

"بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے۔ ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ ہے۔" غور کرو کہ "اِمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى" کے الفاظ ثابت کر رہے ہیں کہ تقویٰ کا تعلق دل ہی سے ہے اور اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ :

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا" کہ "نفس یعنی جان میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا"

جس طرح فجور گناہ گاری اور نافرمانی کی جڑ ہے ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃ ودیعت ہیں۔ اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے مگر ہر حال میں یہ دونوں الہام فطری ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ الہام فطری کا مرکز بھی دل ہے اس لئے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔ یہ اختیار اللہ کی طرف سے انسان کو دیا گیا ہے کہ وہ چاہے نیکی اختیار کر لے اور چاہے برائی اگرچہ نیکی اللہ کو پسند ہے اور برائی ناپسند ہے۔

جس طرح انسان کا فجور بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے۔ اس کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :

"جو لوگ راہ پر آئے اللہ نے ان کی سوجھ بوجھ اور بڑھا دی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کر دیا۔" (محمد)

اس سے ظاہر ہو گیا کہ تقویٰ ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر مزید دولت تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے مجمع میں ارشاد فرمایا :

التقوی ھھنا "تقویٰ یہاں ہے" اور یہ فرماتے ہوئے دل کی طرف اشارہ کیا جس سے بلاشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے۔ جو تمام نیکیوں کی محرک ہے۔ وہی دراصل مذہب کی جان ہے اور دینداری کی روح ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ قرآن کریم کی راہنمائی کی غایت ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب و نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی

معیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بہ آواز بلند یہ اعلان فرمایا :

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات) "ہم نے تم کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے یہ صرف اس لئے ہے کہ باہم شناخت ہو سکے تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔"

اس اعلان کو نبی اعظم و آخر ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا "الکرم التقویٰ" یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اس کیلئے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ عرب کو عجم پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری نہیں برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔ الحمد اللہ کہ آپ کے اس اعلان پر ہم آل عمران کے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ ہاں! اس فضیلت کا ذکر بھی سن لیجئے کہ آپ ﷺ نے اس میں کیا ارشاد فرمایا۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بقرہ اور آل عمران کو بغور پڑھا کرو کیونکہ قیامت کے روز یہ دونوں پڑھنے والے کیلئے لئے ایسی ہوں گی جیسے دو بدلیاں یا دو سائبان یا چھپائے ہوئے پرندوں کے دو جھنڈ اور اپنے پڑھنے والے کی یہ دونوں سورتیں حمایت کریں گی۔ رواہ مسلم۔

حضرت نواس بن سمعان کی روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ "قیامت کے دن قرآن اور قرآن والوں کو پیش کیا جائے گا جو قرآن کریم پر عمل کرتے تھے سب سے آگے سورہ بقرہ اور آل عمران ہونگی۔" کیونکہ دوسری سورتوں کے نسبت احکام ان ہی دونوں سورتوں میں زیادہ دیئے گئے ہیں اور آل عمران میں خصوصاً ان لوگوں کا عقلی طور پر رد کیا گیا ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا۔ اللہ یا اللہ کا تیسرا حصہ مان لیا۔

اور خصوصاً سورہ بقرہ کا آخری رکوع اور آل عمران کی آخری آیات کی تلاوت کرنے کی بہت فضیلت احادیث میں آئی ہیں۔ ثم الحمد للہ کہ رمضان المبارک کی اکیسویں اور فروری ۱۹۹۵ء کی بائیسویں شب کو یہ مضمون ختم ہوا۔



تفسیر عُروۃ الوُثقیٰ

النسآء

۴

النساء

نام سورۃ اس سورہ مبارکہ کا نام "النساء" ہے جو اس سورہ کی آیت ۳ میں آیا ہے۔ یہ سورت بھی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کا نزول نمبر ۹۲ ہے اور ترتیب میں اس کا چوتھا نمبر ہے۔ زمانہ نزول ۴ ہجری سے ۶ ہجری کا درمیان ہے۔ یہ سورت ۲۴ رکوع اور ۱۷۶ آیات پر مشتمل ہے اس سورت میں ۳۷۲۰ کلمات اور ۱۶۶۶۷ حروف بتائے گئے ہیں۔

موضوع سورت مدنی زندگی میں مسلمانوں کے ابتدائی معاشرتی احکام' خاندانی اور عائلی قوانین کے ساتھ ساتھ بعض فرسودہ خیالات کی اصلاح کی ضرورت تھی اس لئے اس سورت میں یہی اصلاحی احکام بیان ہوئے ہیں۔

چنانچہ ۱ سے ۱۰ تک کے مضمون میں تمام انسانوں کو اللہ سے ڈرتے ہوئے عورتوں اور یتیموں کے حقوق کا خیال رکھنے اور خصوصاً یتیموں کے مال سے بچتے رہنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ پھر آیت ۱۱ سے ۱۴ تک میراث کا بیان ہے اور آیت ۱۵ سے ۲۲ تک حد زنا کے حکم کے نازل ہونے سے پہلے ابتدا فحاشی کا ارتکاب کرنے والے مرد اور عورت کی سزا اور توبہ کی قبولیت کی شرائط کے ساتھ ساتھ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور باپ کی منکوحہ کے ساتھ نکاح سے بچنے کے احکامات بیان کئے گئے ہیں۔

آیت ۲۳ سے ۲۸ تک کی چھ آیات میں بارہ محرمات جن سے نکاح حرام ہے اور ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنے کی حرمت اور نکاح کی بنیادی شرائط بیان کی گئی ہیں پھر آیت ۲۹ سے ۴۳ میں گناہوں سے بچتے رہنے کی تلقین' عورتوں اور مردوں کے درجات' پڑوسیوں' رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی تلقین ہے اور اسی طرح نشہ کی حالت اور ناپاکی کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے کا حکم بیان کیا گیا ہے اور پھر آیت ۴۴ سے ۵۹ یہود نامسعود کی خرابیاں اور نیک لوگوں کیلئے جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کر کے امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔

آیت ۶۰ سے ۷۰ کی درمیانی آیات میں اس منافق کا قصہ ہے جسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا تھا اور بعد ازیں ۷۱ سے ۸۴ تک جہاد کا حکم اور اس کی تاکید کا بیان ہے۔ پھر آیت ۸۵ تا ۸۷ نیک سفارشی کی فضیلت اور سلام کے جواب کا ذکر اور توحید باری تعالیٰ کا بیان ہے۔ آیت ۸۸ سے ۹۱ تک کی آیات میں منافقوں کا بیان ہے اور ان کی نشاندہی کی گئی ہے پھر ۹۲ سے ۹۳ کی آیات میں قتل کے جرم میں قصاص و دیت کے احکام بیان ہوئے ہیں اور آیت ۹۳ سے ۹۶ کی آیات میں جہاد کے احکام کا بیان ہے اور آیت ۹۷ سے ۱۰۰ تک ہجرت نہ کرنے کی وعید بیان کی گئی ہے۔

پھر آیت ۱۰۱ سے ۱۰۴ تک قصر نماز کا حکم ہے۔ سفر کی حالت میں یا حالت جنگ میں اور آیت ۱۰۵ سے ۱۱۵ تک ایک منافق کا واقعہ ہے جس نے چوری کر لی تھی اور ایک دوسرے پر الزام دیا تھا جو مسلمان نہیں تھا۔ آیت ۱۱۶ سے ۱۲۶ تک شرک کی مذمت اور نیک اعمال کی فضیلت کا بیان ہے پھر آیت ۱۲۷ سے ۱۳۴ تک عورتوں کے حقوق اور ان کے درمیان انصاف کے طریقے ذکر کئے گئے ہیں۔ آیت ۱۳۵ سے ۱۴۷ میں ہر حالت میں انصاف کا حکم اور منافقوں کی مذمت کا مسلسل بیان ہے اور آیت ۱۴۸ سے ۱۷۵ یہودیوں اور عیسائیوں کی خرابیوں کا بیان اور یہودیوں کے ان خیالات کی تردید کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے اور عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا شریک ماننے کی مذمت کی گئی ہے اور آیت ۱۷۶ میں کلالہ یعنی بے اولاد کی میراث کا دوبارہ بیان ہے جس کی خاصی وضاحت کر دی گئی ہے اور اس مضمون پر سورت کو ختم کر دیا گیا ہے۔

اٰیاتہا ۱۷۶ (۴) سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ (۹۲) رکوعاتہا ۲۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ

اے افراد نسل انسانی! اپنے پروردگار سے ڈرو وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی[1] جان سے

سلسلہ حسب و نسب باپ سے ہے ماں سے نہیں لیکن کنیت ماں سے بھی ہو سکتی ہے

[1] انسان اول کی پیدائش کا ذکر قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر کیا گیا ہے لیکن کسی جگہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان اول فی نفسہ صرف ایک اور وہ بھی مرد ہی ہے اور پھر اس مرد یعنی انسان اول کی بائیں پسلی نکال کر یا وہاں سے ایک گوشت کا ٹکڑا نکال کر یا پسلی کے درمیان سے حوا کو پیدا کر کے اس کی بیوی بنا دیا۔ اس طرح کے سارے تخیلات دراصل ہندو لٹریچر سے لئے گئے اور ان کو الفاظ کا لبادہ پہنا کر قرآن کریم کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر ان کو چڑھا دیا گیا اور اس طرح آہستہ آہستہ نظریات پیدا ہوتے رہے اور انہی نظریات کے نیچے حقیقت کو ایسا چھپا دیا گیا کہ وہاں تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا اور پھر اگر کسی نے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی تو اس کو فتووں کی ایسی مار پڑی کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ دنیا میں پیدا کیا سب جوڑا جوڑا ہی پیدا کیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (الذاریات ۵۱: ۴۹) "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔"

اور اس سے بھی واضح تر حکم یہ ہے جو دوسری جگہ اس طرح فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِہِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (یٰس ۳۶: ۳۶) "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے۔ خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہو یا خود ان کی اپنی جنس سے یعنی نوع انسانی سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّہَا وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ (الزخرف ۴۳: ۱۲) "وہی ذات ہے جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کئے اور جس نے تمہارے لئے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان پر سوار ہو۔"

اگر ایمان کا کوئی ذرہ بھی تم میں موجود ہے تو تم خود ہی بتاؤ قرآن کریم کیا کہتا ہے اور تم کیا سمجھ بیٹھے ہو۔ کیا ان آیات کریمات کو بغیر سوچے سمجھے پڑھ کر آگے نکل جاتے ہو؟ دیکھو میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہاری انگلی ان آیات پر رکھ رہا ہوں اب تو ان کو غور سے پڑھو۔ تم تو ایک انسان کے جوڑے پر بحث کرتے ہو اور اس کوشش میں ہو کہ اس ایک کو پیدا کر کے اس سے ہی اس کا جوڑا بنالیکن قرآن کیا کہتا ہے؟

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔" خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا "اس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے۔" کیا ہر چیز اور جملہ اقسام میں انسان تو داخل نہیں؟ اگر ہے تو پھر تم ہی مان لو کہ ہاں اللہ نے اس کو بھی جوڑا ہی بنایا تھا۔ پھر اس نے تم کو مخاطب کر کے یہ جو فرمایا کہ "وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ" یعنی ہم نے نوع انسانی کو بھی جوڑا بنایا۔ تم تو مسلمان ہو قرآن کریم کو اللہ کی کتاب اور آخری وحی تسلیم کرتے ہو لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ میں آخر کیوں نہیں آتی؟

غور کرو کہ ان جوڑوں سے مراد صرف نوع انسانی کے زن و مرد اور حیوانات و نباتات کے نر و مادہ نہیں ہیں بلکہ دوسری ساری چیزوں میں بھی خالق کائنات نے ایک دوسرے کا جوڑا بنایا ہے۔ جن کے اختلاط یا امتزاج سے دنیا میں نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں جن کے متعلق خود قرآن کریم ناطق ہے کہ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ "جن کو یہ ابھی جانتے تک نہیں۔" مثلاً عناصر میں بعض کا بعض سے جوڑ لگتا ہے اور بعض کا بعض سے نہیں لگتا۔ جن کا جوڑ ایک دوسرے سے لگتا ہے انہی کے جوڑ لگنے سے طرح طرح کی ترکیبیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ یہ منفی اور مثبت کیا ہے؟ ان کی باہمی کشش نے دنیا میں عجیب و غریب کرشموں کو عام کر دیا ہے اور کرتی ہی جا رہی ہے اور دوسرے ان گنت جوڑے ہر قسم قسم کی مخلوقات کے اندر اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں ان کی ساخت اور ان کی باہمی مناسبتوں اور ان کے تعامل کی گوناگوں شکلوں اور ان کے ملنے سے پیدا ہونے والے نتائج پر اگر انسان غور کرے تو اس کا دل یہ گواہی دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سارے کارخانہ عالم میں ہر چیز کے جوڑے ہی جوڑے نظر آرہے ہیں ایک زبردست صانع حکیم کا بنایا ہوا ہے اور اس کی تدبیر اور اس کے بنائے ہوئے اسی اصول پر چل رہا ہے۔ پھر ایک وہ ہیں جو اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے فائدہ حاصل کر کے نئی نئی اجناس نئی نئی نباتات نئے نئے پھول اور طرح طرح کی ایجادات در ایجادات کرتے چلے جا رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ تمہیں فتووں سے ہی فرصت نہیں۔ خدا کیلئے اس قوم مسلم پر رحم کرو۔ خود بھی اللہ کی آیات پر غور کرو اور دوسروں کو بھی ان پر غور کرنے کی دعوت دو۔ ان اپنے ہی گھڑے ہوئے اصولوں کو اللہ کے ذمے نہ لگاؤ۔ کل اس ذات الٰہ کو کیا جواب دو گے؟ کیا مرنے کا یقین نہیں یا دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان نہیں؟

ساری کائنات کا تزوج کے اصول پر بنایا جانا اور دنیا کی تمام اشیاء کا زوج زوج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے اگر تم غور کرتے تو اس سے بھی تمہاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی تھی کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے اور کوئی چیز اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی تو

دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جوڑ ہو سکتی ہے؟ اور اس کا جوڑا لازماً آخرت ہے اور آخرت بھی تم کو یہی درس دے رہی ہے کہ دنیا میں ہر چیز اللہ نے جوڑا جوڑا بنائی ہے۔ اس کا تفصیلی بیان ہم نے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۳۷ کے بعد "قصہ آدم" کے عنوان کی شق ۵ ص ۲۰۶ پر کر دیا ہے وہاں ملاحظہ کر لیں۔

قرآن کریم کی اس آیت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ فقط یہ ہے کہ حکمت الٰہی کی یہ بڑی ہی کارفرمائی ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش اور معیشت کا نظام کچھ اس طرح کا بنادیا ہے کہ پہلے ایک فرد واحد سے وہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کی نسل سے بے شمار افراد پیدا ہوتے ہیں پھر ہر فرد کی نسل سے الگ الگ سلسلے قائم ہو جاتے ہیں پھر یہ سلسلے پھیلتے ہیں اور رفتہ رفتہ خاندانوں، قبیلوں، گروہوں اور بستیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت حال نے افراد کے باہمی اجتماع و اتحاد کیلئے صلہ رحمی یعنی نسلی قرابت کا رشتہ پیدا کر دیا ہے اور پوری سوسائٹی کا نظام اس پر قائم ہے۔ اگر اس طرح رشتے کے موثرات نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت پیدا نہ ہوتی۔ اس لئے اس جگہ ارشاد الٰہی ہوا کہ "اے افراد نسل انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا یعنی باپ سے اور اس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کر دیا۔ یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اسی طرح لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح سے ان کے آپس میں جوڑے بنتے آئے ہیں بن رہے ہیں اور تا نظام دنیا اسی طرح بنتے رہیں گے۔ مختصر یہ کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جنس کی دو الگ الگ اصناف ہیں من حیث الجنس ایک ہیں اور من حیث الصنف دو ہیں۔ ہاں! دونوں میں مرد اصل ہے کیونکہ نسل اس سے ہے عورت سے نہیں۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اس بات کی تشریح کہ مذکر و مونث میں اصل مذکر ہے خود نبی اعظم و آخر ﷺ کی زبان اقدس سے بھی بہت سے طریقوں سے کر دی گئی اور قرآن کریم میں بھی اس پر بیسیوں مثالیں بیان کی گئی ہیں اور یہی اصول ہر مذکر و مونث میں پایا جاتا ہے جس میں انسان بھی شامل ہے۔ اگرچہ مخاطب جب کیا جائے گا تو انسان ہی کو کیا جائے گا کیونکہ وہی قابل خطاب ہے۔

قرآن کریم میں یہ امر واضح ہے کہ ذریت کا تعلق باپ سے ہوتا ہے ماں سے نہیں۔ اور ذریت کیا ہے؟ وہی نسل ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔ دودھ ماں سے ہوتا ہے اور وہیں سے بچہ دودھ حاصل کرتا ہے جو بچہ کیلئے ساری غذاؤں سے بہتر غذا ہے اور اس دودھ کی نسبت بھی رسول اللہ ﷺ نے باپ سے دی ہے ماں سے نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد واضح ہے کہ "لبن الفحل" یعنی دودھ نر سے ہے۔ مطلب صاف ہے کہ جب تک مادہ سے نر ملاپ نہیں کرے گا دودھ پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی زبان میں علاتی بہن بھائی ان ہی بہن بھائیوں کو کہا جاتا ہے جو باپ کی طرف سے بہن بھائی ہوں خواہ ان کی مائیں الگ الگ ہی ہوں اور ان کے سارے احکام بھی حقیقی بہن بھائیوں کی طرح ہوں گے جو

ایک ماں باپ سے ہوتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ اصل علت باپ ہے۔ سیدنا اسماعیل اور سیدنا اسحٰق دونوں نبی ہوئے اس لئے کہ دونوں ہی ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں داخل ہیں اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ دونوں کی مائیں الگ الگ ہیں۔ اگر ذریت ماں کی طرف سے ہوتی تو یہ دونوں نبی نہ ہو سکتے اس لئے کہ نبوت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ابراہیم علیہ السلام کی ذریت سے مخصوص تھی کوئی دوسری ذریت سے تعلق رکھنے والا نبی نہیں بن سکتا تھا۔ (العنکبوت ۲۹: ۲۷)

اس طرح سلسلہ نسب باپ کی طرف سے چلتا ہے ماں کی طرف سے نہیں۔ ایک عورت مختلف اوقات میں دو تین آدمیوں کی بیوی رہ سکتی ہے اور پھر ان سب سے اس کی اولاد بھی ممکن ہے تاہم یہ اولاد بھائی کہلانے کے باوجود ایک سلسلہ نسب سے متعلق نہیں ہوں گے وہ اپنے باپ کے سلسلہ نسب سے ہی متعلق ہوں گے اگرچہ ان سب کی ماں ایک ہے۔ اسی طرح مرد ایک ہی وقت میں یا مختلف اوقات میں دو تین عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اور ساری عورتوں سے اولاد بھی ممکن ہے اور پھر اس ساری اولاد کا سلسلہ نسب ایک ہی شمار ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اصل علت یعنی باپ ان سب کا ایک ہے۔

بلاشبہ اس جگہ اکثر مفسرین نے سیدنا آدمؑ مراد لئے ہیں جو انسان اول تھے۔ ہاں! آدم علیہ السلام انسان اول ضرور تھے۔ لیکن اس جگہ اس آیت کو ان سے مخصوص کرنا ضروری نہیں اگرچہ ان کو مراد بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ حوا علیہ السلام بھی ان کی جنس ہی سے تھیں غیر جنس سے نہیں۔ ہاں! ان سے یعنی آدم علیہ السلام سے حوا کا پیدا ہونا اس آیت سے یا کسی دوسری آیت سے ثابت نہیں ہوتا اور اس کی تفصیل ہم قبل ازیں کر چکے ہیں جیسا کہ ابھی اوپر مذکور ہوا۔ اس کے لئے سورہ بقرہ ہی کی طرف مراجعت کریں انشاء اللہ تفہیم ہو جائے گی۔ اس جگہ ہر خاندان کا مورث اعلیٰ مراد لیا جا سکتا ہے اور زمانہ کے ساتھ ساتھ نئے نئے مورث بنتے رہتے ہیں اور وہ سب اس آیت سے مراد لئے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا کہ ان سب کو مراد لیا جا سکے تاکہ انسانوں کو جو سمجھانا مقصود ہے وہ اچھی طرح ان کی سمجھ میں آجائے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں کہ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً اور یہی تنکیر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ یہاں مورث اعلیٰ مراد لیا جائے۔ مثلاً زید کی ہندہ سے شادی ہو جائے اور ان کے چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں اور ان چھ بیٹوں کی شادیاں ہوگئیں ان کے ہاں چھ چھ آٹھ آٹھ بچے بچیاں پیدا ہوئے پھر ان بچوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اس طرح یقیناً زید ان سب کا مورث اعلیٰ ہوا اور اس طرح زید کی اولاد اور اولاد در اولاد میں سینکڑوں مرد اور عورتیں بن گئیں جن پر رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً کے الفاظ صادق آگئے۔

پھر اس کی مزید تشریح قرآن کریم نے خود ہی دوسرے مقامات پر کر دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات ۴۹: ۱۳)

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کر دیا۔[۲] پھر دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ پس دیکھو اللہ سے ڈرو جس کے نام پر باہم دگر سوال

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک جنس کی دو اصناف یعنی مرد و عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اور اللہ کے نزدیک تم سب میں عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الروم ۳۰: ۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

جوڑا اپنی جنس ہی سے ہو سکتا ہے غیر جنس سے نہیں

۲ انسان کا جوڑا وہی کہلائے گا جو اس کی جنس سے ہو۔ پھر جنس سے مذکر و مونث ہی کو جوڑا قرار دیا جائے گا۔ دو مذکر یا دو مونث کا جوڑا نہیں کہلا سکتا بلکہ دو مرد یا دو عورتیں ہی کہا جا سکتا ہے۔ گویا ہر میاں بیوی کا تعلق ایک جنس سے ہوگا تو وہ میاں بیوی ہو سکتے ہیں کسی دوسری جنس سے ممکن نہیں۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت اس لئے کر دی کہ سارے انسان ایک جنس کہلاتے ہیں یہ خاندان اور قبیلوں کی تقسیم محض پہچان کے طور پر رکھی گئی اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک خاندان کسی دوسرے خاندان سے شادی بیاہ کو حرام قرار دے لے جیسا کہ آج کل ہم نے کر ہی لیا ہے جیسے سید اور غیر سید یا جاٹ اور غیر جاٹ کی تقسیم یہ رسم و رواج ہندوؤں سے آیا ہے اسلام کا بنایا ہوا نہیں۔

دوسری بات یہ واضح ہوگئی کہ جس طرح پڑھی لکھی بے وقوف قومیں قوانین بنا رہی ہیں کہ مرد مرد سے اور عورت عورت سے شادی رچا سکتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انسان چونکہ ایک حیوان ہی ہے اس لئے اس کو ہر حیوان سے شادی رچانے کا حق حاصل ہونا چاہئے اس طرح کی ساری قباحتوں کا حل قرآن کریم نے صرف دو لفظوں میں پیش کر دیا۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے یہ انسان کا اپنا کام ہے۔ بہرحال اس طرح کے نظریات نے پہلے ہم صنفی کا مرض پیدا کیا اور کتنی قومیں اس میں غرق ہوئیں اور اب انسانوں نے حیوانی مطابقت سے مزید آگے بڑھنے کی سعی شروع کی ہے اور شاید آہستہ آہستہ ننگے دھڑنگے رہنے اور کچا گوشت کھانے اور غاروں کے اندر رہنے والے زمانے کی طرف مراجعت چاہتا ہے حالانکہ خود اس کو دور جاہلیت سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝

کرتے ہو۔ نیز قرابت داری کے معاملہ میں بے پروا نہ ہو جاؤ۔ یقین رکھو کہ اللہ تم پر نگران حال ہے۔ ۱

ابھی اس انسان کو کیا کیا سوجھے گا؟ اللہ جانے۔ اچھا فرمایا جتنا بھی تو اے انسان پیچھے ہٹتا چلا جائے ہٹ لے لیکن ایک بات اچھی طرح یاد رکھ کہ تیری نسل اس وقت آگے بڑھے گی جب فطرت انسانی کے مطابق تیرا عقد ہوگا اور تیری خواہشات کا ازالہ ایک جنس کی دونوں الگ الگ اصناف سے ہوگا۔ علاوہ ازیں تیری نسل آگے نہیں بڑھے گی اور نہ ہی تو اولاد جیسی چیز کسی اور طریقہ سے حاصل کر سکے گا۔ اس لئے حقیقت کو بھولنا تیرا کمال نہیں بلکہ تیرے زوال کی نشانی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ "دونوں کی نسل سے یعنی میاں بیوی سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد کو دنیا میں پھیلا دیا۔" اس مقصد کیلئے جو الفاظ ارشاد فرمائے ان کو ایک بار پھر نظر میں لاؤ کہ فرمایا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً اگر اس جگہ آدم علیہ السلام اور حوا ہی مراد ہوتے تو پھر عبارت اس طرح ہوتی کہ وبث منهما جميع الرجال والنساء یعنی تنکیر کی بجائے معرفہ بنایا جاتا کیونکہ آدم و حوا معروف نام ہی ہیں نکرہ نہیں۔ اور ان الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نسل کیلئے ایک ہی جنس کی دونوں اصناف ضروری ہیں جب تک دونوں اصناف کا ملاپ نہیں ہوگا نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ خوب سمجھ لو کہ نسل کی ایک طرف نسبت دینے سے دوسری طرف معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ لازم ہو جاتی ہے اور جو چیزیں لازم و ملزوم ہوں ان میں سے ایک کا ذکر کرنا دوسرے کے ذکر کا اثبات ہوتا ہے۔

اللہ کے نام سے سوال کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس جگہ اس کی ضرورت کیوں؟

۱ اس بیان سے دو چیزوں کی وضاحت ہوگئی ایک یہ کہ اللہ کا تصور فطرت انسانی میں داخل ہے۔ دوسری یہ کہ اس فطری تصور کا غیر فطری استعمال ہی انسان کو مشرک بنا دیتا ہے۔ انسان شرک کا مرتکب بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ کا تصور اس کے دل و دماغ میں موجود ہوتا ہے اور پھر جب وہ اپنے فطری تصور کو کسی شکل و صورت کے مجسمہ میں دیکھنا چاہتا ہے تو شرک کا مرتکب ہو جاتا ہے گویا شرک اس فطری تصور کے غلط استعمال کا دوسرا نام ہے۔ نہ کہ اللہ کے عدم تصور کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مشرک انسان فی نفسہ اللہ کا اقراری ہوتا ہے انکاری نہیں اور یہ بھی کہ اللہ کا منکر فطرت انسانی سے انکاری ہے اس لئے وہ منکر یا کافر ہے۔

مطلب واضح ہوگیا کہ اللہ کے نام سے طلب کرنا یعنی ایک دوسرے سے سوال کرنا فطرت انسانی ہے اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام کا واسطہ دے کر مانگنا شرک بھی ہے اور فطرت انسانی کے خلاف یعنی غیر فطری بھی۔ اس طرح غیر اللہ کے نام کی دوہائی، غیر اللہ کے نام کی پکار، جب کہ وہ موجود نہیں غیر اللہ کے نام کی نذر و

نیاز، غیر اللہ کے نام کی منت و چڑھاوا، غیر اللہ کے نام کی قسم، غیر اللہ کے نام کا واسطہ و وسیلہ سب حرام اور شرک ہیں اور غیر فطری چیزیں ہیں اور غیر فطری افعال کا مرتکب کیا ہوتا ہے؟ سب پر واضح ہے۔

اس جگہ اس کے بیان کی ضرورت اس طرح ہوئی کہ جس ایک ہی جنس کی دو اصناف کا یہاں ذکر شروع کیا گیا ہے ان کو بتانا مقصود ہے کہ تم دونوں اصناف ایک دوسرے کی محتاج ہو اور یہ احتیاج تمہاری فطری ہے۔ محتاج کون ہے؟ وہی جو کمزور ہو اور ہر کمزور کو اپنی کمزوری کا ازالہ بھی فطری ہے لہٰذا تم دونوں اصناف کو اپنی کمزوری کے ازالہ کیلئے ایک دوسرے کی طلب ہوگی لہٰذا اپنی اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کیلئے وہی راستہ اختیار کرنا جو اللہ نے فطرت انسانی میں رکھا ہے اگر اس راستے سے بھٹک گئے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو ایک اللہ کا تصور رکھنے والے کے بھٹکنے کا ہوا۔ وہ اس طرح بھٹکا تو مشرک ہوگیا اور اس طرح بھٹکے گا تو اس کا نام زانی ہوگا اور زانی اور مشرک دونوں کی ایک مثال ہے۔ جب تصور کے لحاظ سے ایک جگہ تصور کو قائم نہ رکھ سکا بلکہ در در کی ٹھوکریں کھا کر مشرک کہلایا اور بالکل اسی طرح اس فطری خواہش کے ازالہ کیلئے جو جگہ متعین تھی اور جو طریقہ مقرر کیا گیا تھا اس کو چھوڑ کر دوسری طرف نگاہ اٹھائی تو زانی ہوگیا۔

ازالہ دونوں نے فطری چیز کا کیا لیکن اس فطری ازالہ کیلئے دونوں نے غیر فطری راستہ اختیار کیا۔ پھر اس غیر فطری راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ایک مشرک کہلایا اور دوسرا زانی۔ اب آپ کا سوال یہ ہوگا کہ یہ جو کچھ میں نے کہا وہ میرے سے پہلے کسی دوسرے نے بھی کہا؟ اگر نہیں تو آخر مجھے کیا حق ہے کہ میں ایسی بات کہوں جو میرے پہلے کسی نے نہ کہی ہو۔ سو گزارش ہے کہ اس جگہ اس آیت کی تفسیر میں خواہ کسی نے نہ کہا ہو لیکن فی نفسہ جو میں نے کہا ہے وہ میں نے نہیں کہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے اس لئے مجھے کہنے کی جرات ہوئی ورنہ میں کون ہوں کہ ایسی بات کہوں؟ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (النور ۲۴ : ۳) "کوئی زانی مرد ہی کسی زانیہ یا مشرکہ عورت کو پسند کر سکتا ہے تاکہ اس سے نکاح کرے اور اس طرح کوئی زانیہ عورت ہی پسند کرے گی کہ وہ کسی زانی مرد یا مشرک مرد سے نکاح کرلے۔ اہل ایمان کیلئے تو یہ بات حرام ہے۔"

رہی یہ بات کہ میں نے یہ کیسے کہہ دیا کہ مشرک اللہ کے تصور سے خالی نہیں ہوتا؟ اللہ کا تصور بھی رکھے اور پھر مشرک بھی ہو؟ ہاں! بالکل صحیح ہے کہ مشرک کبھی بھی اللہ کے تصور فطری سے خالی نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا تصور یقیناً اس میں موجود ہوتا ہے بالکل اسی طرح کوئی زانی بھی عنین نہیں ہوتا بلکہ ہر زانی اپنے اندر وہ فطری قوت رکھتا ہے تب ہی وہ زنا کرتا ہے اور جس میں وہ فطری قوت موجود ہی نہ ہو وہی عنین ہوتا ہے۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ ایک غلام پر حد جاری کرنے کیلئے طلب کیا گیا کہ اس کے خلاف شہادت تھی کہ وہ زنا کا مرتکب ہوا۔ اس کو حاضر کرنے کیلئے آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو پیش کریں۔ جب

آپ اس کو بلانے کیلئے گئے تو وہ غسل کر رہا تھا آپ کی اتفاقی نظر جو پڑی تو اس عنین پایا اور اس عنانت کی وجہ سے اس سے حد ساقط کر دی گئی اور شہادت دینے والوں پر حد جاری کی گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس میں وہ چیز موجود ہی نہ تھی جس سے انسان زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس زنا سے حد جاری ہوتی ہے۔ رہی مشرک کی یہ بات کہ وہ کبھی اللہ کا تصور سے خالی نہیں ہوتا اور یہ بھی میں نے نہیں کہا بلکہ خود اللہ کریم کا ارشاد قرآن کریم میں ہے :

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (المومنون ۲۳ : ۸۴) "اے پیغمبر اسلام! ان مشرکوں سے کہہ دے۔ اچھا اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ کہ زمین اور وہ تمام مخلوق جو اس میں ہے کس کیلئے ہے؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کیلئے۔ تو کہہ پھر کیا ہے تم کو تم غور کیوں نہیں کرتے؟ تو ان سے پوچھ وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار ہے؟ اور جہاں داری کے عرش عظیم کا مالک ہے؟ وہ فوراً کہیں گے یہ سب کچھ اللہ ہی کیلئے ہے تو کہو پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ شرک و انکار کے نتیجہ سے تم ڈرتے نہیں ہو؟" اس سے آگے بھی بیان جاری ہے۔

مطلب اس جگہ یہ ہے کہ کیا یہ مشرک اللہ کے تصور سے خالی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ مشرک کیوں ہیں اس لئے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کو بھی ان صفات میں شریک جانتے ہیں جن سے صرف اللہ ہی کی ذات متصف ہے۔ وہ اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی دوسروں کو بھی اپنا حاجت روا اور مشکل کشا قرار دیتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ جب وہ حقیقی مشکل کشا ان کو نظر نہیں آتا تو وہ اپنے تصور کو جو فطری طور پر ان میں موجود ہے ان شخصیتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں جن کو وہ اللہ کا مقرب جانتے ہیں اور اس طرح گویا فطری تصور کو غیر فطری طریقہ کی طرف پھیر دیتے ہیں اور ان صفات میں اللہ کا شریک قرار دے لیتے ہیں اس لئے وہ مشرک کہلاتے ہیں۔

رشتہ داریوں اور قرابت داریوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ

۴ فرمایا دیکھو جب ہی تم نے اس دنیا میں قدم رکھا تو لازم ہوگیا کہ کوئی تمہارا باپ ہے اور کوئی ماں۔ اس طرح دادا' دادی اور نانا' نانی۔ پھر کوئی تمہارا ماموں ہوگا تو کوئی چچا اس طرح کوئی تمہاری خالہ ہوگی تو کوئی پھوپھی۔ پھر تمہارے کتنے بھائی ہوں گے اور کتنی بہنیں اور اس طرح تم قدم رکھتے ہی کئی ایک رشتہ داریوں اور قرابت داریوں میں گھر جاؤ گے۔ یہ سارے لوگ تمہارے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں اور تم ان سے۔ اس لئے یاد رکھو کہ ان تعلقات کی وجہ سے تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق و فرائض لازم آتے ہیں اور ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے مطابق ادا کرنا تم پر لازم و ضروری ہے اگر تم نے اس میں کوتاہی کی تو تم سے باز پرس ہوگی۔ گویا تمہاری پیدائش نے بہت سے لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی یعنی نسلی قرابت کا

رشتہ پیدا کر دیا ہے اور سوسائٹی کا نظام اس پر قائم ہے۔ اگر اس رشتے کے موثرات نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت پیدا نہ ہوتی۔ یہ رشتہ ہی ہے جو باہمی الفت و مساعدت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور ایک فرد کو دوسرے فرد کے ساتھ ملائے رکھتا ہے۔ پس نظام معاشرت کی درستگی کیلئے ضروری ہے کہ صلہ رحمی کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا گیا :

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الانفال ۸ : ۷۵) "اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔" یہ ارشاد اس لئے فرمایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد جو مواخات کرائی تھی اس سے مسلمانوں میں ایک ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا کہ خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ رشتہ حق کے ان عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے اور ایک دوسرے کے وارث ہونے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنے سارے پچھلے رشتے بھلا دیئے تھے اور ان کے دل میں صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی یعنی سب اللہ کے رسول ﷺ کے شیدائی اور سب اس کے حسن جہاں آراء پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والے ہو گئے ۔

تو نخل خوش ثمر کیستی؟ کہ باغ و چمن ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح اعلان کرنا پڑا کہ جو قرابت دار ہیں وہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قرابت دار ہیں اور اس صلہ رحمی کا رشتہ کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اور ایک جگہ قریبی رشتہ داروں کی رشتہ داری کا خیال نہ رکھنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا :

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (الرعد ۱۳ : ۲۵)

"اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد بپا کرتے ہیں۔"

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (محمد ۴۷ : ۲۲) "کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم لوگ حاکم بن گئے تو زمین میں پھر فساد کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔"

فرمایا جا رہا ہے کہ جب تمہاری سیرت و کردار کا حال یہ ہے کہ جس دین پر ایمان لانے کا تم نے اقرار کیا تھا اس کیلئے تمہارے اندر کوئی اخلاص اور کوئی وفاداری نہیں ہے اور اس کی خاطر کوئی قربانی دینے کیلئے تم تیار نہیں ہو تو اس اخلاقی حالت کے ساتھ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ اقتدار عطا کر دے اور دنیا کے معاملات کی باگیں تمہارے ہاتھ میں آجائیں تو تم سے ظلم و فساد اور برادر کشی کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ اسلام میں قطع رحمی حرام ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار خواہ وہ دور

کے ہوں یا قریب کے اس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو اس کا حق آدمی پر اتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطع رحمی کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلہ رحمی کیا ہے؟ کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اس سے دریغ نہ کرے اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ برا سلوک کرے یا جو بھلائی کرنا اس کیلئے ممکن ہو اس سے قصداً پہلو تہی کرے۔

پھر یہ صلہ رحمی کے حقوق کس نے ٹھہرائے؟ اس ذات نے جو تمہارا خالق ہے اور تم سے پہلوں سب کا بھی۔ یہ سب اس کے ٹھہرائے ہوئے حقوق ہیں جو شخص ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے وہ احکام الٰہی سے سرتابی کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ ظلم و معصیت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ان حقوق کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے انہی حقوق میں انسان نے جنم لیا اور انہی میں اس کی موت ہوئی۔ دیکھو والدین کے حقوق' اولاد کے حقوق' تعلیم و تربیت کے حقوق' رضاعت و حضانت کے حقوق' زوجین کے حقوق' اہل قرابت کے حقوق' ہمسایہ کے حقوق' یتیموں کے حقوق' بیواؤں کے حقوق' حاجت مندوں کے حقوق' بیماروں کے حقوق' غلاموں کے حقوق' مہمانوں کے حقوق' مسلمانوں کے باہمی حقوق' انسانی برادری کے حقوق اور جانوروں کے حقوق۔ فرمایا ان حقوق کی ادائیگی میں بے پروا نہ ہو جاؤ۔

مکلفین کی ہر حرکت سے اللہ بذاتہ واقف ہے اور ایک سلسلہ نگرانی کا اس نے قائم کر دیا ہے

۵ مکلفین کی ہر حرکت سے اللہ واقف ہے۔ اس لئے کہ مکلفین ہی وہ جنس عظیم ہے جو اپنی ہر حرکت کا جواب دہ ہے۔ باقی مخلوق کی حرکات و سکنات سے بھی اللہ خوب واقف ہے لیکن مکلفین کے علاوہ دوسری کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اپنے اعمال کی جواب دہ ہو۔ ایسا کیوں؟ اس لئے کہ جو عقل و فکر اور سمجھ و سوچ اور تدبر اس کو دیا گیا ہے وہ کسی دوسری مخلوق کو نہیں اور یہ بھی کہ اس کائنات ارض میں جو کچھ ہے وہ صرف اور صرف اس کے استفادہ کیلئے ہے اور آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ بھی صرف اسی کی خاطر۔ گویا پوری کائنات میں مقصود حقیقی اور اشرف المخلوقات صرف یہی ہے اور اسی اصول کے مطابق جتنا کوئی زیادہ اشرف ہوگا اتنا ہی زیادہ جواب دہ۔

کاش کہ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو شرک کی ساری جڑیں کٹ جائیں۔ انبیائے کرام کی زندگیوں پر غور کرو باوجود اس کے کہ ہر رسول معصوم تھا اور کوئی نبی و رسول کسی صغیرہ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوا۔ نسیان و بھول جو انسانیت کا خاصہ ہے وہ جس کو لاحق ہوا فوراً اللہ سے معافی طلب کی اور سارے انبیاء کرام کے سردار رسول مکرم و نبی اعظم و آخر ﷺ کا درجہ و مقام سارے انبیاء سے بڑھ کر ہے پھر بھی آپ ﷺ کی عبادات' آپ ﷺ کی خشیت الٰہی' آپ ﷺ کی توبہ و استغفار کا کوئی مقابلہ؟ ساری ساری رات کا قیام' پے درپے روزے' پیغام نبوت کی مسلسل گردش یہ سارا کچھ کیوں؟ یہ محض اس لئے کہ آپ ﷺ پوری کائنات کے انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور بلند مقام رکھتے تھے اور آپ ﷺ پر یقیناً ذمہ داری اللہ نے رکھی تھی

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا

اور دیکھو بے باپ[۶] بچوں کا مال ان کے حوالے کر دو ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی چیز کو اپنی

جس کے پورے کرنے میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھے؟ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو جو امہات المومنین ہیں مخاطب کر کے اللہ نے فرمایا "اے پیغمبر اسلام کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا' اللہ کیلئے یہ بہت آسان کام ہے اور تم میں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کمائے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۲۹' ۳۰)

بلاشبہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے کسی فحش حرکت کرنے کا اندیشہ تھا بلکہ اس سے مقصود آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اس کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں۔ اس لئے ان کا اخلاقی رویہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہئے اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے خود نبی اعظم و آخر ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ "اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا" (الزمر ۳۹ : ۶۵) اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا۔ ہرگز ہرگز نہیں بلکہ اس سے مقصود نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت احتراز لازم ہے۔

پھر غور کرو کہ گناہ پر دوہرے عذاب اور نیکی پر دوہرے اجر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں کسی بلند مرتبے پر سرفراز فرماتا ہے وہ بالعموم لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں اور بندگان خدا کی بڑی تعداد بھلائی اور برائی میں انہی کی پیروی کرتی ہے۔ ان کی برائیاں تنہا انہی کی برائیاں نہیں ہوتیں بلکہ ایک پوری قوم کے بگاڑ کا موجب ہوتی ہیں اور اس طرح ان کی بھلائیاں بھی تنہا انہی کی بھلائیاں نہیں ہوتیں بلکہ بہت سے انسانوں کی فلاح کا سبب بنتی ہیں اس لئے جب وہ برے کام کرتے ہیں تو اپنے بگاڑ کے ساتھ دوسروں کے بگاڑ کی سزا پاتے ہیں اور جب وہ نیک کام کرتے ہیں تو انہیں اپنی نیکی کے ساتھ اس بات کی جزا بھی ملتی ہے کہ انہوں نے دوسروں کو بھلائی کی راہ دکھائی۔ اس لئے فرمایا کہ "خوب اچھی طرح جان لو کہ اللہ تم پر نگران حال ہے۔" اس لئے تمہیں جو احکام دیئے جا رہے ہیں ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اللہ کے قانون مکافات سے بے پروا نہ ہونا یقیناً اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے۔

معاشرہ اسلامی کے حقوق میں سے بے باپ بچوں کے حقوق کا تذکرہ کیا جا رہا ہے

[۶] اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستحق بے باپ بچے تھے لہٰذا ان کا ذکر سب سے پہلے کر دیا۔ یہ بے

باپ بچے کون ہیں؟ وہی جو یتیم ہیں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ ان یتیموں کے نگران و محافظ ہوں ان کو چاہئے کہ ان کا مال الگ رکھیں اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کے مالوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ بے باپ بچہ جو باپ کے سایہ محبت و عاطفت سے محروم ہے جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو محبتِ آغوش میں لے' اس کو پیار کرے' اس کی ہر طرح خدمت کرے۔ اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس کر دے اور اس کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے۔ گویا یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا ایک بے باپ بچہ جو علم الٰہی میں اس کا رسول تھا اور وقت آنے پر رسول بنا کر مبعوث کیا گیا وہ اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے باعث یتیموں کی کثرت رہتی تھی مگر جیسا کہ چاہئے ان کی غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ اپنے باپ کی وراثت سے وہ محروم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے (تفسیر ابن جریر طبری ج ۴ ص ۱۷۰) اور اس وقت کے سنگدل عربوں میں عام طور پر ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ بھی مطلق نہ تھا۔ قرآن کریم میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (الماعون ۱۰۷ : ۱' ۲) "کیا آپ نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے۔ وہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔" ایک جگہ ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہونے کے ڈر سے ان کے آباؤ اجداد کی متروکہ وراثت کو جلد جلد ہڑپ کر جانا چاہتے تھے اس لئے وہ ایسی برائی کے مرتکب ہونے میں ذرا جھجک محسوس نہ کرتے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر ۸۹ : ۱۸' ۲۰)

"نہیں' ہرگز نہیں! بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھلانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورے کا پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال پر جی بھر کر ریجھتے ہو اور جمع کرنے میں حلال و حرام میں بھی تمیز نہیں کرتے ہو۔"

اسلام سے پہلے کسی مذہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس مظلوم فرقہ کی اصل داد رسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم ہونے والا دین کامل کی شریعت لے کر آیا اور وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اس کو خطاب کر کے یاد دلایا کہ :

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (الضحیٰ ۹۳ : ۶) "کیا تجھ کو اللہ نے بے ماں باپ نہیں پایا پھر اس نے تجھ کو پناہ دی۔" اب تو بھی ایسا ہی کر کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحیٰ) "پس یتیم کو مت ڈانٹ ڈپٹ۔" (۹۳ : ۹)

رسول مکرم و نبی معظم ﷺ مکہ مکرمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے۔ یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایات

تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۲

ناکارہ چیز سے بدل ڈالو اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا جلا کر خورد برد کر دو۔ یقیناً ایسا کرنا بڑی ہی گناہ کی بات ہے۔ ۲

فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بیکس اور بے سہارا گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے اور مسلسل مکی زندگی میں آپ ﷺ کو یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں۔ دولت مندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصل کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیوں کر پاس کر سکتے ہو؟ فرمایا ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر بھوکوں کو کھانا کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (بلد ۹۰ : ۱۴، ۱۵) "یا بھول والے دنوں میں کسی رشتہ اور یتیم کو کھانا کھلانا۔" اسی طرح نیکو کار لوگوں اور بخشندوں کی تعریف میں ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ (الدھر ۷۶ : ۸) "اس کی محبت کی خاطر کسی غریب و یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔" اب ہجرت کر کے آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لاتے ہیں اور باقاعدہ اسلامی معاشرہ کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ پہلے تو ہدایات دی گئی تھیں اور اب اس بیکس گروہ کے متعلق تم کو احکام دیئے جا رہے ہیں کہ ان کی وراثت ادا کرو اور متولی جو آج تک طرح طرح کی بددیانتیاں کرتے تھے وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو "کہ دیکھو بے باپ بچوں کا مال ان کے حوالے کر دو ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی چیز کو اپنی ناکارہ چیز سے بدل ڈالو اور ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا جلا کر خورد برد کر لو۔"

یتیموں کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانا معمولی قسم کی برائی نہیں بلکہ جرم عظیم ہے

۲ پھر ظاہر ہے کہ جتنا بڑا ظلم ہوگا اتنی بڑی اس کو سزا ہوگی۔ اس لئے فرمایا کہ "یتیموں کا مال ناجائز طریقوں سے کھانا بڑی ہی گناہ کی بات ہے۔" وہ بڑی ہی گناہ کی بات کیا ہے؟ فرمایا کان کھول کر سن لو اور اچھی طرح یاد رکھو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ○ (النساء ۴ : ۱۰) "جو لوگ یتیموں کا مال نا انصافی سے خورد برد کر لیتے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے بھر رہے ہیں اور عنقریب یہ لوگ دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے۔"

"يَاْكُلُوْنَ" کے معنی خوردبرد کیوں؟ اس لئے کہ "يَاْكُلُوْنَ" سے مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

اور دیکھو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان سے نکاح نہ کرو) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں نکاح کر لو یعنی دوسری عورتوں سے۔ دو۔ تین۔

ناجائز مصرف ہے اور ناجائز مصرف کو خورد برد کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ایسے مال کو کھانا تو پیٹ میں آگ بھرنے کے مرادف ہے لیکن باقی مصرف میں لے آنے میں تو کوئی قباحت نہیں اور ویسے بھی زمین کھا جانا' مکان کھا جانا' کوٹھی اور کار کھا جانا' سونا اور چاندی کھا جانا اور اسی طرح مال و مویشی کھا جانا کے مطلب کو ساری دنیا سمجھتی ہے اور قرآن کریم بھی انسانوں ہی کی زبان میں نازل کیا گیا ہے اس لئے ان ساری باتوں سے جو کچھ لوگ سمجھتے ہیں وہی قرآن کریم کی بھی مراد ہے۔ سیدھا سادا اور صاف مطلب چھوڑ کر لفظی معنوں میں الجھاؤ وہی پیدا کرتے ہیں جن کی اپنی نیت میں فتور ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے شب معراج میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ اونٹ کے لبوں کی طرح تھے کہ بالائی لب سکڑا ہوا دونوں نتھنوں پر تھا اور نچلا ہونٹ سینہ پر لٹکا ہوا۔ جہنم کے کارندے ان کے منہ میں دوزخ کے انگارے اور پتھر بھر رہے تھے۔ میں نے پوچھا جبرئیلؑ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال بے جا طور پر کھاتے تھے۔" (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم من حدیث ابن سعید الخدری رضی اللہ عنہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ قبروں سے کچھ لوگوں کو ایسی حالت میں اٹھائے گا کہ ان کے منہ سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہوں گے فرمایا کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے انگارے بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ یہی وہی لوگ ہیں۔" (ابن ابی شیبہ نے مسند میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو بیان کیا۔)

اس پوری آیت کا ماحصل یہ ہوا کہ جب تک وہ بچے ہیں ان کا مال انہیں پر صرف کرو اگر تم اپنے پاس سے مال خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے یا صرف کرنا نہیں چاہتے اور جب وہ بڑے ہو جائیں تو جو ان کا اصل مال ہے وہ ان کو واپس کر دو۔ ایسا نہ کرو کہ ٹوٹل پورا کرنے کیلئے ان کی اچھی اشیاء کو اپنی نکمی اشیاء سے بدل کر ٹوٹل پورا کر دو۔ ایسا کرنا بڑی ہی گناہ کی بات ہے۔

یتیم لڑکیوں کا مخصوص حکم کہ ان کے معاملہ میں بھی انصاف سے کام لو

۸ مال کھانے کے معاملہ میں یتیم لڑکے ہوں یا لڑکیاں' دونوں ہی کیلئے ایک جیسا حکم ہے اور کوئی فرق نہیں لیکن یتیم لڑکیوں کیلئے تم کو ایک مخصوص حکم بھی دیا جاتا ہے تاکہ اس کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ وہ حکم یہ ہے کہ ان یتیم لڑکیوں کو جو تمہاری کفالت میں آجائیں اس لئے اپنے گھروں میں مت ڈال لیا کرو کہ ان کا مال اس طریقہ سے تم کو حاصل ہو جائے گا یا ان کی ماؤں کے ساتھ اس غرض سے نکاح کرو کہ ان کے ساتھ نکاح کرنے سے وہ مال بھی اور یتیم بچے بھی تمہاری ملک میں آجائیں گے اور تم اپنی من مانی کر سکو گے۔

اگر اس بات کا ذرا بھی خیال ہو کہ اس طرح نکاح کر لینے سے ان یتیم بچیوں کے معاملہ میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو ان کو چھوڑ کر باقی عورتوں سے نکاح کرو ان کے ساتھ ہرگز نکاح نہ کرو اس لئے کہ اس طرح سے جائیداد کا لالچ تمہاری آخرت برباد کر دے گا اور دنیا کا مال حاصل کرنے کیلئے اگر آخرت برباد ہو گئی تو یہ سودا نہایت خسارے کا ہوا۔

سورہ الانعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن روحانی اور اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ "وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (الانعام ۶ : ۱۵۲) "اور بہتری کے سوا مال یتیم کے پاس ہرگز نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچ جائے۔"

سورہ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت کے اور اصلاح کے صاحب جائیداد یتیموں کی جائیداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ بھٹکنا چاہئے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنے دامن بچائے رکھنا چاہئے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم لڑکیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا تو ہے نہیں۔ جس طرح ہم چاہیں گے ان کو دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے اس پر ارشاد الٰہی ہوا کہ تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں موجود ہیں ان میں سے جو تمہیں پسند آئیں یعنی تم شادی کرنی چاہو تو کر لو اور ان یتیم بچیوں کو اپنے گھروں میں مت ڈالو۔

خود شادی کرنے کا مطلب بھی واضح ہے کہ صرف یہی نہیں کہ کفیل اپنے ساتھ ہی شادی کرے تو اس کی ممانعت ہے نہیں بلکہ عام زبان اور رواج کے مطابق اگر کوئی اپنے بیٹے' بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار سے شادی کرے اور نیت میں یہی ہو تو بھی اس کے ضمن میں وہ آئے گا۔ اس طرح یہ بھی نہیں کہ ضرور ان یتیم

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ

چار تک[۹] (سے نکاح) کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر چاہئے کہ

بچیوں ہی کا معاملہ ہے نہیں اگر ان کی ماؤں کے ساتھ اگر وہ ہیں اس غرض سے شادی ہوگی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم کتنا صاف اور واضح ہے لیکن ہمارے ہاں کا جو رواج ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے لوگ اپنی بھاوجوں کو اپنے نکاح میں اور اپنی بھتیجیوں' بھانجیوں کو اپنے بچوں کے ساتھ محض اس لئے نکاح میں دیتے ہیں تاکہ ان کی جائیداد کہیں دوسری جگہ منتقل نہ ہو۔ گویا وہ ان کی وراثت کو اپنی جائیداد اور اپنا حصہ سمجھتے ہیں اور ہر ممکن ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان کی پتی میں کوئی دوسرا شریک کیوں ہو؟ اور ہمارے معاشرے میں اس فعل کو آج کوئی بھی بری نگاہ سے دیکھنے والا نہیں بلکہ ہر ایک اس کو پسند کرتا ہے کہ بہت اچھا عمل اس نے کیا ہے اپنے باپ دادا کی جائیداد کو سنبھال لیا ہے اور باہر نہیں جانے دیا۔ گویا یتیم بچے اور ان کی مائیں ان کی جائیداد ہیں وہ انسان نہیں۔

ضرورت ہو تو تم مرد ایک سے زیادہ چار کی حد تک عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو

[۹] یہ ایک مستقل حکم ہے جو اس ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر مرد کو ضرورت ہو اور وہ اس بات کا متحمل ہو تو ایک سے زیادہ بیویاں وہ بیک وقت رکھ سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی غرض و غایت کیلئے ان یتیم بچیوں یا ان کی ماؤں کو محض اس لئے اپنے گھر میں ڈال لے کہ اس جائیداد کو سمیٹنے کا اس کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں۔ فرمایا کہ اگر تم حاجت مند بھی ہو تو بھی اپنی حاجت کو جائز طریقہ سے پورا کرو ناجائز طریقہ سے نہیں اور مال کا لالچ تم کو راہ راست سے نہ ہٹا دے۔

مرد اور عورت کو دوش بدوش چلتا دیکھنے والے اس حکم کو نہایت بری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو طعن و تشنیع کرتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ آخر یہ حکم الٰہی ہے کسی دنیوی مقننہ کا نہیں اور ہم اپنی زبان کو بے لگام کرنے کی بجائے اس حکم پر غور کریں کہ ہمیں کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں ازروئے عقل و کوئی قباحت نہیں بلکہ عقل اور فطرت کے مطابق یہ بات ہے۔ ان کو کیوں بُری لگی ہے اس لئے کہ دراصل وہ حکم الٰہی کو سمجھنے سے عاری ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی عقل و فکر کا ماتم کریں وہ اسلام پر لب کشائی کرتے ہیں تاکہ کوئی تاویل اس کی کی جا سکے کیوں؟ اس لئے کہ ان کی میم صاحبہ اس حکم کو سن کر سیخ پا ہو رہی ہیں اور ان کی خوشنودی ان کے ایمان کا جز ہی نہیں بلکہ اصل ایمان ہے۔

کوئی پوچھے کہ صاحب تمہاری صاحبہ اگر وہ صحت مند ہیں تو ہر ماہ میں سات آٹھ روز کیلئے اذیت میں ہیں کیا تم ان کی اس اذیت میں ان کا ہاتھ بٹا سکے ہو۔ پھر ہر سال ہر دوسرے سال تو تمہاری صاحبہ پانچ چھ ماہ

مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝ وَآتُوا النِّسَاءَ

ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو یا پھر جو عورتیں تمہارے ہاتھ آگئی ہیں[۱۱] (انہیں بیوی بنالو) بے انصافی سے بچنے کیلئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب[۱۲] ہے۔ ۳

کیلئے سیل بند ہیں تم کیا کرتے ہو؟ ذرا اپنے اندر جھانک کر تو دیکھو۔ پھر اگر تمہاری صاحبہ اپنے دل میں کوئی مامتا کا پیار بھی رکھتی ہیں انہوں نے اگر اس پیار کا گلا نہیں گھونٹ دیا تو وہ مزید دو سال کیلئے تمہاری نسل کو چھاتی سے لگائے ہوئے ہیں اور تم کس حال میں ہو؟

ان ساری حرام کاریوں اور مکاریوں سے بچانے کیلئے جو تم اپنے ہی گھر میں یا کسی دوسرے کے گھر میں کر رہے ہو ان سے بچانے کیلئے اللہ نے اپنی آخری کتاب ہدایت میں تمہاری رعایت رکھتے ہوئے ایک حکم دیا ہے تم چاہو اس رعایت سے فائدہ اٹھاؤ چاہو بالکل نہ اٹھاؤ۔ بلاشبہ اگر تمہارے پاس کوئی اس کا جائز حل ہے تو وہ استعمال کرو۔ تم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی گئی دو تین یا چار شادیاں کرو لیکن یہ رعایت ہر حال میں تمہارے حق میں بھی مفید ہے اور تمہارے زندگی کے ساتھی کیلئے بھی اس پر جرح و قدح مت کرو بلکہ اپنی اصلاح کرو اور جن جن افعال کے تم مرتکب ہوتے ہو ان پر نگاہ رکھو اللہ کے دین کو مذاق کا نشانہ نہ بناؤ۔

یاد رکھو کہ اذیت کے دنوں میں تم پابند ہو۔ دوران حمل خصوصاً جب بچہ میں حرکت آچکی ہو تم پابند ہو اور دودھ پلانے کی مدت میں اگر تم بیوی سے دودھ پلوا رہے ہو تم پابند ہو۔ ان پابندیوں کیلئے تمہیں رعایت دی گئی ہے۔ تم ان پابندیوں کو پورا کرو اور رعایت سے مطلق فائدہ حاصل نہ کرو تم پر کوئی گناہ نہیں بلکہ تم تعریف کے قابل ہو لیکن یاد رکھو کہ یہ جھوٹ موٹ کی تعریف دنیا والوں سے تو تم کرا سکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ تو تمہارے سارے رازوں سے واقف اور تمہاری ساری حرکتوں سے آگاہ اور تمہاری ساری بد اعتدالیوں کو دیکھ رہا ہے اگر اس کی نگاہ میں تم سرخرو ہو تو واقعی شاباش کے لائق ہو تاہم تمہاری یہ خواہش کیوں ہو کہ جب تم کو ایک رعایت کی ضرورت نہیں تو آخر کوئی دوسرا اس رعایت سے فائدہ کیوں اٹھائے؟ ہاں! اگر تمہاری فکر میں ایسی بات ہے تو یہ بھی کوئی قابل تعریف نہیں بلکہ باعث مذمت ہے کہ تم دوسروں کے حق پر جو ان کو اس رعایت کا حاصل ہے خواہ مخواہ جز بز ہو۔

ایک سے زیادہ بیویوں کی جو اجازت تم کو دی گئی ہے وہ پابندیوں کے ساتھ ہے

[۱۰] ایک مرد کیلئے متعدد بیویاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا۔ عرب، ہندوستان، ایران، مصر اور بابل وغیرہ تمام ممالک کی ہر قوم میں کثرت ازواج کی رسم جاری تھی اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آج کل یورپ میں جو مہم چلی ہے بلکہ ایک عرصہ

سے چل رہی ہے اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ قلم میں ہمت نہیں کہ بیان کئے جا سکیں۔ مختصر یہ کہ ان کوششوں کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا اور یہی کچھ احتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے اور اس کے ردعمل میں بھی اب آوازیں اٹھ رہی ہیں اس لئے کہ فطری چیزوں سے انکار ہمیشہ ذلت کا باعث ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ ہاں! اچھی فصل میں ناکارہ پودے بھی ہوتے ہیں یہ ایک دوسری بات ہے۔ یہ مسٹر دیوں پورٹ ہیں جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہیں اور تعدد ازواج کی حمایت میں اس طرح رقمطراز ہیں اناجیل سے وہ کچھ عبارات اس حق میں نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔"

پادری نکسن اور جان ملتنی اور ایزک ٹیلہ نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے کہ تعدد ازواج بعض اوقات ضروریات انسانی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام سے پہلے یہ رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی۔ ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی یہود و نصاریٰ نے' نہ ہندوؤں نے' نہ آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہ رسم جوں کی توں قائم رہی لیکن اس غیر محدود کثرت ازواج کا نتیجہ بھی نہایت ہی برا تھا کیوں؟ اس لئے کہ لوگ رسماً" نکاح تو کر لیتے لیکن بعد میں عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہ ہوتیں اور پھر عدل و انصاف کا کہیں کبھی تذکرہ ہی موجود نہ تھا۔

اسلام نے عدل و انصاف بین النساء پر بہت زور دیا لیکن علماء نے تفہیم صحیح نہ کرائی

اس آیت میں دو الفاظ پر زیادہ غور و فکر کرنا ضروری ہے ایک لفظ "اِنۡ خِفۡتُمۡ" اور دوسرا "عدل" اور پورا جملہ اس طرح ہے کہ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً "یعنی اگر تم کو ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح پر اکتفا کرو۔" قرآن کریم نے اس بات پر سارا زور لگا دیا کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا معمولی ثانیہ بھی ہو تو دوسرا نکاح مت کرو لیکن علمائے اسلام نے عدل کو صرف رہنے سہنے' نان و نفقہ دینے اور باری باندھنے کے ساتھ خاص کر دیا اور میل قلبی یعنی محبت و موانست اور اس امر میں جو وظیفہ زوجیت سے متعلق ہے اس عدل سے مستثنیٰ کر دیا اور پھر انہوں نے اس کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے باندھ دیا کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں ہم نہیں کہتے بلکہ اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔ اس طرح اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری تاکید جو قرآن و سنت سے اس کے متعلق بیان ہوئی تھی وہ کلیتہ ختم ہو کر رہ گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس سے جو نکاح کا مقصد ہے وہ بالکل باطل ہو گیا اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے ذمہ وہ بات لگا دی جو آپ نے قطعاً نہیں فرمائی تھی اور یہ اس سے بہت بڑا گناہ ہے جو اس سادگی میں قبول کر لیا گیا۔ علمائے اسلام کی اکثریت نے یہ مطلب جس حدیث سے استنباط کیا وہ حدیث اس طرح ہے کہ :

ان النبی ﷺ کان یقسم بین نسائہ فیعدل ویقول اللھم ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما

تملک ولا املک "یعنی رسول اللہ ﷺ باری باندھتے تھے اور اپنی بیویوں میں عدل کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے جس حد تک میں مالک ہوں پھر تو مجھ کو مت ملامت کر اس میں جس میں تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا کہ بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ ان اخیر لفظوں سے محبت و مودت مراد ہے اور لمعات میں اس امر کو بھی اس میں خاص کر دیا ہے جو زوجیت سے متعلق ہے۔

مگر ہم کو اس میں کلام ہے۔ کس میں؟ جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کا مطلب بیان فرمایا۔ امام کا مقام؟ ہاں! امام کا مقام بلاشبہ بہت بلند ہے تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ حق ہے کہ امام نہ معصوم عن الخطا ہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ کی تائید ہوتی ہے۔

اول تو اس حدیث کی صحت قابل بحث ہے اس حدیث کے دو سلسلے ہیں ایک حماد بن سلمہ رحمہ اللہ سے اور ایک حماد بن زید سے اور دوسرے لوگوں سے۔ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ نے اپنے سلسلہ کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر ملا دیا ہے اور حماد بن زید اور دوسرے لوگوں نے صرف ابی قلابہ پر چھوڑ دیا ہے یعنی ان کی حدیث مرسل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے پہلے سلسلے کو کافی اعتبار کے لائق نہیں سمجھا اور کہا کہ دوسرا سلسلہ حماد بن زید کا زیادہ صحیح ہے لیکن جب کہ وہ خود مرسل ہے تو کافی اعتبار کے لائق نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ الفاظ "فلا تلمنی فیما تملک ولا املک" کس امر کی طرف کنایہ ہے کیونکہ اس کو میل قلبی یعنی محبت و موانست پر مخصوص و متعین کر لینے اور بالتخصیص اس امر سے بھی متعلق کر دینے کی جو خاص زوجیت سے متعلق ہے کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ انبیائے کرام کی عظمت و شان اور ان کی پاک طینت اور پاکیزگی طبیعت کے بالکل برخلاف ہے۔ پھر نبی اعظم و آخر ﷺ کی شان تو سارے انبیاء کرام سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے کیا وہ کہیں گے کہ "اے اللہ! جس پر میرا دل آجائے تو اس میں تو مجھ کو معاف فرما جس کے ساتھ میں وہ امر نہ کروں جو خاص زوجیت سے متعلق ہو تو تو مجھ کو ملامت مت فرما۔"

افسوس ہے کہ بعض اوقات اکابر بھی قدر و منزلت نفوس قدسیہ انبیاء کو شاید بھول جاتے ہیں اور اپنے نفوس پر قیاس کر کے وہی خفیف و گھٹیا اور نازیبا باتیں جو خود ان کے نفوس میں ہیں نفوس قدسیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ وشان انبیاء اعلیٰ واجل وارفع مما یظنون۔

اگر اس حدیث کو بالکل صحیح تسلیم کر لیا جائے اور یہ الفاظ جو قابل بحث ہیں وہ بھی خود نبی کریم ﷺ کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے مان لئے جائیں جس کا ماننا بلاشبہ مشکل ہے تو بھی ان الفاظ کا یہ مفہوم جو بیان کیا گیا ہے تسلیم کرنا بغیر دلیل کے ہے۔ کیونکہ الفاظ میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جو مجبور کرے کہ ان الفاظ کا یہی مطلب ہے کیونکہ ان کا اشارہ ان امور کی طرف بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے جو قضا و قدر الٰہی سے واقع ہوتے ہیں جن میں انسان کا کچھ اختیار نہیں مثلاً امراض میں سے کسی مرض کا لاحق ہو جانا یا ایک کا ذی ولد اور دوسری کا

لاولد ہونا وغیر ذلک۔ نہ ان امور کی طرف جو خواہش نفسانی سے علاقہ رکھتے ہیں کیونکہ انبیاء کرام کی قدر و منزلت کا ادنیٰ درجہ ان کی خواہش نفسانی کے مطیع نہ ہونے کا یقین کرنا ہے اور یہ مسلمان کے ایمان کا جزو ہے کہ کوئی نبی بھی نفسانی خواہش کے تابع نہیں تھا بلکہ نفسانی خواہشیں ان کے تابع فرمان ہوتی تھیں اور پھر محمد رسول اللہ ﷺ کی شان رسالت تو دوسرے رسولوں کے مقابلہ میں بھی ارفع و اعلیٰ ہے لہٰذا اس بات کو کیسے مان لیا جائے؟ فَافْهَمْ فَتَدَبَّرْ۔

تیسرے یہ کہ باری کی اور نان و نفقہ کی تقسیم میں مساوات جس کو ایک حریص علی الازواج کر سکتا ہے کوئی ایسا مشکل امر اور مہتم بالشان نہ تھا جس کی نسبت "وَاِنْ خِفْتُمْ" کا قرآنی لفظ استعمال ہوتا۔ ہر لفظ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا امر عظیم الشان مراد ہے جس کی بجا آوری بجز ان نفوس قدسیہ کے جو فی الحقیقت نفسانی خواہشوں کے مطیع نہیں تھے باقی لوگوں سے بمقتضائے فطرت انسانی کی خواہش ان پر غالب آہی جاتی ہے نہایت مشکل ہے۔ اس لئے فرما جا رہا ہے کہ اس معاملہ میں ڈرتے رہو۔

چوتھے یہ کہ "عدل" کے لفظ میں میل قلبی کو داخل نہ سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہے اتنی بڑی کہ اس سے حکم الٰہی کا ایک مذاق ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ نکاح کے مفہوم میں جو تعلقات کہ باہم زن و شوہر کے ہیں ان میں میل قلبی سب سے مقدم ہے۔ جس نکاح میں میل قلبی نہیں وہ نکاح ہی کیوں ہے؟ وہ تو سراسر ازالہ خواہش نفسانی ہے۔ اگرچہ وہ بھی وقتی میل قلبی کے علاوہ ممکن نہیں۔ اس لئے ایسا تصور کرنا کہ عدل میں میلان قلبی داخل نہیں لفظ عقد یا نکاح کے سرپانی ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس لئے لفظ "عدل" بدرجہ اتم اس امر مقدم یعنی میل قلبی ہی کے متعلق ہے کیونکہ زن و شوہر کے تعلقات حقیقی میں اس کو اولیت حاصل ہے۔ جس طرح آنکھ کے لئے دیکھنا ضروری ہے بالکل اسی طرح نکاح کیلئے میل قلبی ضروری ہے۔ اس لئے یہ "عدل" سے باہر نہیں رہ سکتا بلکہ اس کیلئے عدل کی قید الٰہی ہے۔ لہٰذا حدیث مذکورہ بالا کے الفاظ "لا تلمنی فیما تملک ولا املک" سے میل قلبی کی طرف اشارہ سمجھنا سراسر غلطی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موانست و محبت کو تعلقات زن و شوہر میں امر مقدم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الروم ۳۰ : ۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم کو قلبی سکون حاصل ہو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

اس نظام کو بنانے والا کون ہے؟ وہی اللہ جس نے کائنات کا سارا کارخانہ بنا کر چلایا ہوا ہے اور جس کا وہ خود ہی نگران ہے۔ پھر بنانے والے نے بالارادہ اس غرض کیلئے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ہی

سکون و اطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف نسل انسانی کے برقرار رہنے کا اور دوسری طرف انسانی تہذیب و تمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جس کو میلان قلبی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو ان کے باہمی اتصال و وابستگی کے بغیر مبدل سکون نہیں ہو سکتا تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح نسل انسانی کا سلسلہ تو چل جاتا لیکن کسی تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام نوع حیوانی کے برعکس نوع انسانی میں تہذیب و تمدن کے رونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کیلئے وہ مانگ' وہ پیاس' وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سکون میسر نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جڑ کر نہ رہیں۔ یہی سکون کی طلب ہے جس نے انہیں مل کر گھر بنانے پر مجبور کیا۔ اس کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدن کا نشوونما ہوا۔ اس نشوونما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوتی ہیں مگر وہ اس کی اصل محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک وہی اضطراب ہے یعنی میلان قلبی جسے مرد و عورت کے وجود میں ودیعت کر کے انہیں "گھر" کی تاسیس پر مجبور کر دیا گیا۔ کون صاحب عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہوگیا ہے؟ اور کون یہ کہتا ہے کہ اس میں عدل کی ضرورت نہیں ہے یا اس میں عدل ممکن نہیں۔

یاد رہے کہ اگر کہیں یہ میلان قلبی پیدا نہ ہو سکے اور انسان انسانیت سے پیچھے ہٹ کر حیوانیت میں داخل ہو جائے تو اس وقت شریعت اسلامی کا مسئلہ یہی ہے کہ ان دونوں کے جوڑ کو یک قلم توڑ دیا جائے۔ اگر مرد کی طرف سے کوئی ایسی صورت واقع ہو جائے تو طلاق ہے اور عورت کی طرف سے پہل ہو تو خلع۔

اس حدیث کو پیش نظر رکھو جس میں نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک عورت نے شکایت پیش کی تھی کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے خاوند کے متعلق کوئی شکایت نہیں رکھتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا دل اس کو نہیں چاہتا۔ آپ ﷺ نے اس سے بار بار یہ سوال فرمایا کہ کوئی وجہ بتاؤ لیکن وہ ہر بار یہی کہتی رہی۔ کتنی سچی تھی وہ اللہ کی نیک بندی کہ میلان قلبی نہ ہونے کے باوجود کوئی حرف شکایت لب پر نہ لائیں اور ہر بار یہی جواب بے دھڑک سنایا کہ میں اس کے دین و اخلاق میں کوئی نقص نہیں دیکھتی لیکن میرا دل اس کو نہیں چاہتا۔ پھر آپ ﷺ نے کیا کیا؟ اس کے خاوند کو طلب کیا اس سے حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش فرمائی۔ اللہ کا بندہ بھی بار بار یہی کہتا رہا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں تو اس کو دل سے چاہتا ہوں اگر میری کوئی شکایت ہے تو مجھ سے کہی جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ رسول اللہ ﷺ نے کیا نکالا؟ عورت سے پوچھا کہ جو باغ تجھ کو حق مہر میں دیا گیا تھا کیا تو اس کو واپس کرتی ہے؟ اس نے ہاں میں جواب دیا اور پھر آپ ﷺ نے اس کے خاوند سے فرمایا کہ اپنا باغ واپس لے لے اور نکاح تمہارا فسخ ہو چکا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نکاح کا مقصد یہاں حاصل نہیں ہوا اور انسانوں

کے فیصلہ پر فیصلہ الٰہی غالب آگیا۔ بالکل اسی طرح کا ایک نکاح خود رسول اللہ ﷺ نے بحکم الٰہی کرا دیا لیکن اس کا نتیجہ بھی طلاق کی صورت میں منصہ شہود میں آیا جس کے متعلق اعلان الٰہی آج بھی قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ نکاح ہم نے خود کرایا تھا اور ہم نے خود اس کو توڑ دیا ہے تاکہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح جس مقصد کیلئے ہوتا ہے اگر کہیں وہ مقصد پورا ہوتا نظر نہ آئے تو بے جھجک اس کو ختم کرا دو تاکہ انسان کی انسانیت بحال رہے۔

ہاں! اس جگہ کوئی سر پھرا یہ کہہ سکتا ہے کہ دیکھو نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام دونوں اللہ کے نبی تھے اور دونوں ہی کو سکون قلبی یا میلان قلبی میسر نہ آیا اور دونوں کی بیویاں جہنم واصل ہوگئیں۔ بات بالکل غلط ہے کس نے کہا کہ دونوں کو میلان قلبی میسر نہ آیا۔ ہرگز نہیں بلکہ دونوں انبیاء علیہما السلام کو اپنی ازواج سے سکون قلبی یا میلان قلبی حاصل تھا اور طرفین میں تھا یعنی جس طرح دونوں نبیوں کو سکون قلبی حاصل تھا اسی طرح ان کی بیویوں کو بھی میلان قلبی اپنے خاوندوں سے حاصل تھا اور دونوں صحیح معنوں میں شریک زندگی تھیں۔ طرفین میں میلان قلبی موجود تھا جس کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ طرفین کو اس سلسلہ میں کبھی ایک دوسرے سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں! ان دونوں انبیاء کرام کی بیویوں نے اپنے خاوندوں کو خاوند تو تسلیم کیا تھا لیکن ان کی نبوت کو انہوں نے تسلیم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں وہ جہنم واصل کر دی گئیں اور دونوں انبیاء کرام اپنے میلان قلبی کے باوجود ان کو دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے۔

یعنی ان کو بحیثیت میاں بیوی ایک دوسرے پر کوئی اعتراض نہ تھا اور طرفین میں وہ میلان قلبی بدرجہ اتم موجود تھا لیکن ان دونوں عورتوں کو اپنے خاوندوں کی نبوت پر یقین نہ تھا جس میں ہماری زندگی کے بے شمار سبق موجود ہیں لیکن ہم کوئی سبق سیکھنا ہی نہ چاہیں تو اس کا حل کیا؟

پھر غور کرو کہ اس حدیث سے جو مراد لی گئی ہے اس کی کوئی گنجائش وہاں موجود ہے ہرگز نہیں۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ سے ہمیں دلی محبت ہے ان کی دینی خدمت کے بھی معترف ہیں ہم ان کا احترام کرتے ہیں اور کریں گے لیکن ان کی بات کو رسول اللہ ﷺ کی بات نہیں کہہ سکتے۔ اس جرم میں ہمیں جو سزا دی جائے قبول ہے۔

مختصر یہ کہ جو امر کہ تعلقات زن و شو سے مخصوص ہے وہ کیونکہ لفظ "عدل" سے جو ایسے موقع پر بولا گیا ہے خارج رہ سکتا ہے۔ میلان قلبی یا سکون قلبی ہی وہ شے ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کا زوج بنائے ہوئے ہے اس لئے اس کو عدل سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسا کہنا پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق وہ بات لگانا ہے جو آپ ﷺ نے یقیناً ارشاد نہیں فرمائی اور پھر جس سلسلہ میں عدل ممکن نہیں اس کی خود قرآن کریم نے دوسری جگہ وضاحت فرما دی ہے اس لئے کہ ان معاملات میں عدل کا لفظ صادق ہی نہیں آتا اس کو عدل کہا ہی نہیں جاتا۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس یہ حکم آنے سے پہلے متعدد بیویاں تھیں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم بیان کرتے ہوئے خود ارشاد فرمایا ہے کہ :

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ○ (النساء ۴ : ۱۲۹) اور دیکھو اس بات کے تم کتنے ہی خواہش مند کیوں نہ ہو لیکن تم عورتوں کے درمیان بعض باتوں میں عدل کر ہی نہ سکو گے تاہم یاد رکھو کہ قلبی میلان کو ایک طرف مت کر دو کہ ایک تو تمہاری بیوی معلوم ہو لیکن دوسری درمیان میں اٹک کر رہ جائے اور یاد رکھو کہ اگر تم راہ راست پر رہو اور بے انصافی سے بچتے رہو تو اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔" یعنی جن باتوں میں انصاف ضروری ہے عدل ضروری نہیں ان میں اگر تم انصاف پر قائم رہے اور عدل نہ کر سکے تو تم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

اس آیت نے اس بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ میلان قلبی میں تو عدل ضروری ہے کیونکہ ایک طرف میلان قلبی رکھنے سے روکا گیا اور فرمایا کہ جن باتوں میں عدل ممکن ہی نہیں ان میں عدل نہیں ہوگا تو بات قابل گرفت نہ ہوگی بلکہ قابل گرفت بات وہی ہے جس میں عدل ممکن ہے پھر جس میں عدل ممکن ہے اس میں عدل لازم و ضروری ہے ہاں! میلان قلبی میں چونکہ عدل ضروری ہے اس لئے فرمایا کہ یہ ایسی بات نہیں کہ اس کو عدل نہ ہو سکنے کا بہانہ بناؤ یہ معاملہ ایسا نہیں کہ جس میں عدل ممکن نہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ باتیں یا چیزیں کیا ہیں جن میں عدل ممکن نہیں تو اس کی تشریح اور عدل و انصاف کا فرق انشاء اللہ اس سورہ مبارکہ کی زیر نظر آیت کے اپنے مقام پر ہوگا وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کریم نے عام معاشرہ کے اس ظلم عظیم کو روکا' تعداد ازواج پر پابندی لگائی اور چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر ہیں ان میں مساوات حقوق کا نہایت موکد حکم اور اس کے خلاف پر وعید شدید سنائی۔ سب سے پہلے "ماطاب" کے الفاظ سے یہ بیان کیا کہ جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں ان سے تم نکاح کر سکتے ہو اور پھر اسی آیت میں چار کی پابندی لگائی گئی کہ اس سے اوپر ایک وقت میں حرام ہیں۔ پر ان میں عدل و انصاف کو لازمی اور ضروری قرار دیا گیا اور سب کے بان و نفقہ اور رہائش و مکان کے مسئلہ کو الگ الگ رکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ آپ نے خود عملاً یہ سارا کام کر کے دکھا دیا کہ عدل بین الازواج اس طرح ہوتا ہے اور ان ساری باتوں کو اس کثرت سے بیان کیا گیا کہ کسی کو اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہا اور پھر ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان پابندیوں کو پورا نہ کر سکے وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے بلکہ ایک وقت میں ایک ہی پر کفایت کرے اس کے تمام حقوق کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی طرح کی زیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ "ماطاب لکم" سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ شادی سے پہلے فریقین ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور علاوہ ازیں بھی مطالب پھوٹتے ہیں لیکن تفصیل کسی دوسرے مقام پر انشاء اللہ۔

رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات ایک وقت میں چار سے زیادہ تھیں آخر کیوں؟ اس لئے کہ ہر نبی کی کچھ خصوصیات ایسی تسلیم ہیں جو اس کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ اس طرح یہ بھی رسول کے منصب کے لئے مخصوص بات تھی جو بغیر وجہ نہیں تھی۔ اور پھر یہ بھی کہ یہ حکم آنے سے پہلے ہی ان سے اکثر نکاح ہو چکے تھے نبی کی بیوی ام المومنین ہے جس سے دوسرے لوگوں کا نکاح حرام ہے اگر ان کو اس بندھن سے آزاد کیا جاتا تو ان کا سہارا کون ہوتا؟ اور پھر جس طرح ہر خصوصیت کیلئے کوئی ضروری بات ہے جس کی وجہ سے وہ خصوصیت رکھی گئی بعینہ اس کی بھی خاص ضرورت تھی اس لئے اس کو آپ کی خصوصیت قرار دیا گیا۔

برابری کی ہمت نہ ہو اور ضرورت کا احساس بھی ہو تو دوسری جگہ ملک یمین سے نکاح کر لو

۱۱ عورت اور مرد ایک ہی جنس کی دو اصناف ہیں اور جنس کا جنس کی طرف میلان فطری امر ہے جس سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی ضرورت پیش آجانا یہ بھی ایک فطری بات ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ دین اسلام کی طرف سے عدل و انصاف اور خصوصاً برابری تقسیم اوقات بھی لازمی اور ضروری چیز قرار دی گئی گویا کسی وقت ضرورت اور برابری کے درمیان بھی تقابل ممکن ہے کہ ایک طرف ضرورت کی شدت ہو اور دوسری طرف برابری کے حکم کا ڈنڈا۔ تو ڈنڈے کا ڈر بھی ایک فطری چیز ہے اور دو فطری چیزوں کے تقابل میں ایک کو قبول اور دوسری کو رد کرنا لازم و ضروری ہے۔ تو اس میں انسان کیلئے آسانی اس طرح پیدا کی گئی کہ ایک آزاد عورت سے شادی کر لی پھر دوسری شادی کی ضرورت کا احساس ہے اور عدل و برابری نہ کر سکنے کا خوف و ڈر تو ایسی صورت میں اگر ملک یمین عورت میسر آئے تو اس سے شادی کر سکتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو دو آزاد عورتوں کی برابری کے حقوق ہیں ان کے مقابلہ میں ایک آزاد اور دوسری ملک یمین کے حقوق برابر نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ جس طرح دو آزاد عورتوں کا عدل و انصاف اور برابری میں حق ہے اسی طرح دو ملک یمین کے عدل و انصاف اور برابری میں حق تو تسلیم ہے لیکن ایک آزاد اور دوسری ملک یمین میں ہر لحاظ سے برابری اور عدل و انصاف تو ویسے ہی عدل و انصاف کے خلاف ہے کیونکہ دونوں کے حقوق الگ الگ ہیں ایک جیسے نہیں۔

بالکل اس طرح جس طرح ایک بیٹا اور دوسرا غلام ہو تو دونوں کے حقوق برابر نہیں۔ ہاں! جس طرح دو بیٹوں کے درمیان عدل و انصاف ضروری ہے بالکل اسی طرح دو غلاموں میں بھی لیکن یہ کوئی عقلمند تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہر معاملہ میں بیٹے اور غلام کے درمیان عدل و انصاف اور برابری کے حقوق ہیں اور حقوق دونوں کے الگ الگ ہیں۔ جب تک حقوق ایک جیسے نہ ہوں تو عدل و انصاف یہی ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے حق کے مطابق حق دیا جائے نہ کہ دونوں کو ایک جیسا کیونکہ یہ عدل و انصاف نہیں بلکہ ظلم عظیم ہے۔

اسے ایک اور مثال سے سمجھ لو یہ بات معلوم ہے کہ شریعت نے وراثت میں لڑکے کو دو لڑکیوں کے

برابر حق دیا ہے یا لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ میں آدھا حصہ دیا ہے۔ اب کسی کے ایک لڑکی اور ایک ہی لڑکا ہے تو عدل و انصاف کیا ہوا؟ یہی کہ لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کو دوگنا ملے اور اگر اس طرح کیا جائے کہ لڑکے اور لڑکی میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو یہ عدل و انصاف نہیں بلکہ عدل و انصاف کے خلاف ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ دونوں کا حق یا حصہ برابر برابر نہیں۔ اس کے باوجود دونوں کو برابر برابر دیا جائے گا تو ایک کی حق تلفی ہوگی جو عدل نہیں بلکہ ظلم ہے۔ اب زیر نظر آیت کا ترجمہ پڑھو ارشاد ہو رہا ہے کہ "جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو ایک وقت میں دو' تین یا چار تک کر سکتے ہو بشرطیکہ ان میں انصاف کر سکو یعنی سب کے حقوق ادا کر سکو اور سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا سلوک کر سکو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر چاہئے کہ ایک سے زیادہ سے نکاح نہ کرو یا پھر جو عورتیں لڑائی کی قید میں سے تمہارے ہاتھ آگئی ہیں ان میں سے کسی کو بیوی بنا لو یعنی نکاح کر لو۔" اس لئے کہ آزاد عورتوں کے اور لڑائی میں قید ہو کر آنے والی عورتوں کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ ہاں! ان کے ملک یمین رکھتے ہوئے جب تم ان سے نکاح کر لو گے تو زنا شوئی کا ایک مزید تعلق تمہارا ان سے قائم ہو جائے گا۔ اس طرح اب وہ تمہاری خادمہ بھی ہیں اور بیوی بھی اس لئے اس سے خادمہ کا سا سلوک بھی کر سکو گے اور بیوی کا سا سلوک بھی اس طرح اس کے خادمہ ہونے کے حقوق بھی ادا کرنے ہوں گے اور بیوی ہونے کے حقوق بھی۔ اس لئے ان دونوں حقوق کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہوگی ایک بیوی ہے اور دوسری بیوی بھی اور خادمہ یعنی نوکرانی بھی۔

لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے ملک یمین کو ایسی ستم ظریفی کا نشانہ بنایا کہ نام لیتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے کہ اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ لڑائی میں قبضہ میں آجانے والی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ بغیر نکاح کے ہی استعمال کی جا سکتی ہیں؟ گویا یہ انسان اب انسان ہی نہیں رہی کہ اس کی مرضی اور خواہش کا بھی کوئی احترام ہو اور اس طرح مکافات عمل کا احساس بھی نہ پیدا ہوا کہ اگر کفار کی عورتیں ہمارے قبضہ میں آسکتی ہیں تو ہماری بھی ان کے قبضہ میں جا سکتی ہیں؟ اس طرح ملک یمین میں جس طرح عورت آسکتی ہے بالکل اسی طرح مرد بھی پھر جس طرح ایک عورت کسی مرد کے حصے میں آسکتی ہے اسی طرح کوئی مرد بھی کسی عورت کے حصہ میں جا سکتا ہے۔ پھر ان کی خرید و فروخت کے وقت جس طرح ایک آزاد مرد قید میں آئی ہوئی عورت کو خرید سکتا ہے اسی طرح ایک آزاد عورت ایک قید میں آئے ہوئے مرد کو بھی خرید سکتی ہے۔ سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کہو جو کچھ کہتے ہو اور خصوصاً قرآن کریم کے الفاظ پر غور کرو اور اس ترتیب کو دیکھو جس ترتیب کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا ہے۔ صرف اتنی بات کہ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا بلکہ اس کو اس طرح سمجھا گیا ہے اور یہ نئی صورت کہاں سے نکالی گئی ہے؟ مطلق نہیں کوئی نئی صورت نہیں نکالی گئی بلکہ وہی کچھ کہا ہے جو قرآن کریم کے الفاظ کا تقاضا ہے اور جو بات سنت سے واضح ہوتی ہے۔ ہاں! اس معاملہ میں کوئی صریح ثبوت موجود ہے جو صحیح بھی ہو اور اس کا یہی مطلب بیان کیا جا سکے کہ

ملک یمین سے نکاح کی ضرورت نہیں بلکہ اُس کا ملک یمین ہونا ہی نکاح ہے تو اس کی دلیل میں وہ حدیث پیش کرنا چاہئے حالانکہ یہ ممکن نہیں تو ہَا تُوا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

ہاں! اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ایک آزاد عورت بھی میسر نہ آئے تو کسی ملک یمین ہی سے نکاح کر سکتے ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔

ملک یمین کے ساتھ نکاح کرنے سے تم اس گناہ سے بچ سکتے ہو جس کا اس جگہ احتمال ہے

۱۲ دو عورتوں کے درمیان برابری اور انصاف نہ کر سکنے کی زد سے بچنے کیلئے ایک طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اس ملک یمین کی خواہشات کا احترام بھی بحال ہو سکتا ہے کیونکہ کسی کے لونڈی غلام ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اب انسانی خواہشات سے مستثنیٰ ہو گئے ہیں نہیں بلکہ وہ انسان ہی ہیں اور ان میں بھی وہ ساری خواہشات موجود ہیں جو تم میں ہیں۔ یہ حالات کا تقاضا ہے جنہوں نے ان لوگوں کو تمہارے زیردست کر دیا ہے۔

فرمایا ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا "بے انصافی سے بچنے کیلئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے۔" ذلک کا اشارہ کس طرف ہے؟ فواحدۃ کی طرف ہے یعنی ایک بی بی سے ہی ایک مرد کا نکاح ہونا زیادہ مناسب ہے تاکہ انسان نا انصافی سے بچا رہے۔ اس طرح گویا پھر دوسری بار "فَوَاحِدَۃً" کے اصول پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ عام لوگوں کیلئے جو اعلیٰ درجہ کا ضبط اور انصاف نہیں رکھتے یا ان کو انصاف قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہے تو وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کریں اور یہ بھی کہ اس طرح وہ کثرت عیالداری کی مصیبت کے نیچے دب جانے سے بھی بچیں گے کہ ایک ہی بی بی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک سے زیادہ اور چار کی حد تک جو تم کو اجازت دی گئی ہے کہ تم نکاح کر سکتے ہو تو بعض ناگزیر حالات کے تحت ہے اگر تم برداشت کرتے ہوئے ایک ہی بیوی پر صبر کرو اور اس کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے کیلئے تیار رہو تو یہ اس لئے بھی بہتر ہے کہ تم اس زد ہی میں نہ آؤ جہاں دو متقابل چیزوں میں عدل و انصاف اور برابری کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ملک یمین کیا ہے؟ ملک یمین اسلام کی لائی ہوئی چیز ہے یا پہلے موجود تھی؟ اسلام نے اس کے متعلق کیا کیا احکام دیئے؟ اور ان کا نتیجہ کیا رہا؟ ان کا جواب ابھی باقی ہے۔

ملک یمین کے موضوع پر ایک مختصر مگر جامع نوٹ

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عربوں میں کئی طرح کے نکاح موجود تھے یعنی ان کے رواج میں آچکے تھے اور رواج پا جانے والی بات اس وقت بھی اور آج بھی کسی قوم کو بری محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے کرنے والے بہت سے لوگ ہوتے ہیں لہٰذا کون کس کو کہے گا کہ یہ صحیح نہیں جب کہ باپ دادا سے من حیث القوم سب ہی لوگ کرتے چلے جا رہے ہوں۔ رواج کا خلاف اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ رواج کے مطابق آسان ہے۔

صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، مستخرج ابو نعیم، اسماعیل جوزی اور دار قطنی میں ان نکاحوں کی تفصیل موجود ہے جن کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ عقدۃ النکاح، حلالۃ النکاح۔ متعۃ النکاح۔ بدل ازواج۔ استبضاع جس کو ہندی میں نیوگ کا نام دیا گیا ہے اور ملک یمین۔

ملک یمین کیا ہے؟ کیا یہ اسلام کی لائی ہوئی چیز ہے؟

اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ملک یمین کیا ہے؟ ملک یمین کفر و اسلام کی باقاعدہ جنگ ہونے کے بعد جو مرد یا عورتیں کفار کی طرف سے قید ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں وہ سب ملک یمین ہیں اور پھر ان کو بعض اوقات لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ اس کو اپنے ساتھ شریک کار کر لیں اور ان کے مکمل کفیل و ذمہ دار ہوں۔ اس طرح جو جس کی ملکیت میں دے دیا جاتا وہ اس کا "ملک یمین" ہوتا۔

اسلام سے پہلے عربوں میں اس کا رواج موجود تھا اسلام نے اس کی اصلاح کی لیکن تدریجاً" اور سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ ہر پکڑ لیا گیا انسان غلام یا کنیز نہیں بلکہ اس کیلئے باقاعدہ جنگ شرط ہے۔ پھر اس طرح جنگ میں پکڑے گئے لوگوں کیلئے ان کی آزادی کو زیادہ اہمت دی خواہ وہ کسی صورت میں ہو جس کی تفصیل مضمون میں مل جائے گی۔

اسلام نے اس رسم کو مٹانے کیلئے بہت بڑا کام کیا اور کئی طریقے اس کیلئے بنائے گئے اور انجام کار اس کو پوری دنیا سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسلام آیا تو اس نے پہلے نکاح یعنی عقدۃ النکاح کو جائز اور باقی سب کو تدریجاً" مکروہ سمجھتے ہوئے آہستہ آہستہ حرام قرار دے دیا اور اب سوائے ایک کے یعنی اس پہلی صورت کے باقی سب حرام ہیں اگرچہ تفہیم نہ ہونے کی وجہ سے یا ضد و عناد کی بناء پر باقی صورتیں بھی کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہیں ان میں سے متعۃ النکاح اور ملک یمین اور کسی حد تک حلالہ پر تو آج تک عملدر آمد ہوتا آیا ہے۔ متعۃ النکاح شیعہ دوستوں نے اور ملک یمین کو باقی اہل سنہ نے کھلا کھلا جائز قرار دیا اور اس طرح کوئی شیعہ ہو کر "متعۃ النکاح" سے اور اہل سنہ ہو کر "ملک یمین" کے استعمال سے روک نہیں سکتا بلکہ بعض صورتوں میں شیعوں کے ہاں تو "متعۃ النکاح" ضرویات دین میں داخل ہے۔

ہاں! ملک یمین کا معاملہ اللہ نے اپنے قانون کے مطابق اور اسلام کی مساعی جمیلہ کے تحت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی خصوصاً اسوۂ حسنہ کی مثالوں کے پیش نظر بالکل ختم کر کے رکھ دیا اور آج سے نہیں بلکہ ایک مدت سے سوائے ایک دو موقع کے جو درمیان میں معرض وجود میں آگئے بیخ بن سے اکھاڑ کر رکھ دیا۔ اس لئے اس کی زیادہ تشریح کی ضرورت نہ تھی تاہم نظریاتی طور پر جب ایک نظریہ موجود ہو اور پھر اس کو اسلام کا نظریہ بھی سمجھا جائے تو زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی طریقہ سے اس کے ساتھ سابقہ پڑ ہی سکتا ہے۔ اس لئے اتنا کہنا اب بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ بتا دیا جائے کہ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا بلکہ حرام ٹھہرایا اور جس چیز کی

اجازت دی وہ صرف اور صرف نکاح کی تھی۔ اور بدستور اب بھی ہے جب بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور علاوہ نکاح کے کنیزوں سے نکاح کا کام لینا بہرحال حرام ہے۔ لیکن چونکہ بدقسمتی سے من حیث القوم اکثریت نے بغیر نکاح استعمال بطور بیوی جائز سمجھا ہے اس لئے اب گویا یہ قومی نظریہ کے طور پر مانا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہی سوائے رواج کے اس کی کوئی سند قرآن و سنت سے واضح طور پر ملتی ہے اور جس بنیاد پر ایسا سمجھا گیا ہے وہ بنیاد بہرحال درست نہیں اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔ ہاں! پہلے ان سارے طریقوں کا مختصر تعارف کرا دینا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

۱۔ **عقدۃ النکاح** جو اسلام نے جائز رکھا اس کی صورت تو عام ہے کہ اگر کسی کنواری عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کے ولی کی اجازت ضروری ہے۔ دو گواہوں کا ہونا بھی شرائط نکاح میں سے ہے جو عادل اور نیک ہوں اور مسلمان بھی ہوں اور حق مہر بھی لازم ہے وہ معجل ہو یا موجل لیکن اس کا مقرر کر لینا زیادہ صحیح ہے اور ادائیگی ہر حال میں لازم ہے۔ اِلّا یہ کہ عورت مہر کا کوئی حصہ یا پورا مہر خاوند کو وصول کرنے کے بعد واپس کر دے یا معاف کر دے اور آخر میں ایجاب و قبول بھی شرائط نکاح سے ایک شرط ہے خواہ وہ زبان سے ہو اور خواہ اشارہ سے اگر کوئی شخص بول نہ سکتا ہو۔

۲۔ **حلالۃ النکاح** وہی ہے جس کو آج بھی "حلالہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی شکل یہ تھی کہ جب کسی مرد نے تین طلاقیں دے دیں اور اب اس کو رجوع کا حق نہ رہا تو وہ اپنی بیوی کسی دوسرے کو اس شرط پر دے دے کہ آج نکاح کر کے اس کے ساتھ عمل زوجیت کرے اور ازیں بعد وہ طلاق دے دے تاکہ اس کا پہلا خاوند اس سے نکاح کر سکے جس کو اسلام نے کھلے الفاظ میں حرام کر دیا لیکن اس کے باوجود بعض مکاتب فکر اس سے فائدہ اٹھا کر عورت کو پہلے خاوند کی ملکیت میں دینے کیلئے بطور حیلہ کرتے ہیں اس طرح اس حرام چیز کو حلال کی صورت میں تبدیل کر کے پیسے کمانے کا کاروبار کرتے ہیں اور اس کا رواج آج بھی دور جاہلیت کی طرح کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔

۳۔ **بدل ازواج** وہ نکاح ہے کہ دو مرد شادی شدہ اپنی بیویوں کو ایک وقت کیلئے ایک دوسرے سے بدل لیں کہ آج کیلئے ایسا طے ہے چنانچہ اس طرح کر لینے سے ایک دوسرے کی بیوی کو اپنی زوجیت میں رکھ کر اس سے اپنی خواہش نفسانی پوری کر سکنے کی اجازت کا نام ہے۔ جس کی برائی محتاج بیان نہیں تاہم یہ صورت عربوں میں اس وقت موجود تھی لیکن اسلام نے اس کو حرام قرار دیا۔ ہاں! یہ کہ ایک مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت سے نکال دے یعنی طلاق دے دے تو وہ عدت گزرنے کے بعد دوسرے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے لیکن اس کو اس صورت سے کوئی تعلق نہیں جو استبدال زوج میں بیان کی گئی ہے۔

۴۔ **استبضاع** جس کو ہندوؤں کے ہاں نیوگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ بھی تقریباً ازواج کے بدلنے ہی کی ایک صورت ہے تاہم اس کی تعریف جو ہندوؤں کے ہاں ہے وہی عربوں کے ہاں اُس وقت تھی اور وہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ "جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تب وہ اپنی عورت کو اجازت دے دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی عورت تو مجھ سے علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر کیونکہ اب مجھ سے تو اولاد نہیں ہو سکے گی۔ تب عورت دوسرے کے ساتھ تعلق قائم کر کے اولاد پیدا کرے لیکن اس طرح جو اولاد ہوگی وہ اس خاوند کی ہوگی جس کی وہ مستقل بیوی ہے اور جس نے اس کو نیوگ کی اجازت دی ہے اور جس طرح اعلانیہ بیاہ ہے اسی طرح اعلانیہ نیوگ ہے۔ ہاں! نیوگ کرنے والی عورت مستقل اپنے پہلے خاوند کے گھر رہے گی دوسرے مرد سے صرف نیوگ کرے گی تاآنکہ اولاد ہو جائے جو اس نیوگ کرنے والے مرد کی نہیں بلکہ اس خاوند کی قرار پائے گی جس کی یہ منکوحہ بیوی ہے۔

۵۔ **ملک یمین** کے متعلق یہ ہے کہ جب کوئی کنیز کسی کی طے پاگئی تو اب گویا وہ اس کی ملکیت پا جانے کے ساتھ حلال ہوگئی۔ ہاں! کنیز کسی دوسرے کی ہوگی تو پھر نکاح کرنا ضروری ہے اس کے متعلق اکثریت مسلمانوں کی اسی طرح جانتی ہے اور سمجھتی ہے۔ چنانچہ تحریر ہے کہ

(۱) "نکاح اپنی کنیز سے نہیں ہوتا وہ بغیر نکاح ہی مولیٰ کیلئے حلال ہے۔"

(مولوی نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ احمد رضا خاں سورہ النساء)

"مملوکات ملک یمین خواہ خریدے سے ملک یمین میں آئی ہوں یا ہبہ سے یا وراثت سے یا وصیت سے وہ سب حلال ہیں۔" (مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ)

(۲) "اور ان میں سے جو عورتیں ہوں ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل ہے۔ اس کا قیدی ہو کر آنا یہ خود اعلان نکاح کے قائم مقام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب و قبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں۔"

(مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ)

(۳) "مملوکہ سے نکاح نہیں ہو سکتا وہ بدوں نکاح روا ہے۔" (مولانا سید امیر علی صاحب مواہب الرحمٰن)

(۴) کافروں کی ملک سے جو دارالحرب ہو عورتیں قید ہو کر آویں وہ لونڈیاں ہو جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کی ملک تو ان سے مالک کو صحبت کرنا درست ہے اگرچہ ان کے خاوند دارالحرب میں زندہ اور سلامت ہوں۔ دوسرے یہ کہ لونڈی بیچی جائے تو جس نے خریدا وہ اس سے صحبت کر سکتا ہے اگرچہ اس کا خاوند موجود ہو کیونکہ بیچنے سے وہ نکاح فسخ ہوگیا جو اس کے اگلے مالک نے کسی سے کرایا تھا۔" (مولانا وحید الزمان صاحب ترجمۃ القرآن)

(۵) "جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کیلئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جائیں۔"

(سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ تفہیم القرآن حصہ دوم ص ۳۲۳)

"شرمگاہ کی حفاظت کے حکم سے دو قسم کی عورتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ایک ازواج دوسری ملکت ایمانہم۔ ازواج کا اطلاق عربی زبان کے معروف استعمال کی رو سے بھی اور خود قرآن کی تصریحات کے مطابق بھی صرف ان عورتوں پر ہوتا ہے جن سے باقاعدہ نکاح کیا گیا ہو اور یہی اس کے ہم معنی اردو لفظ بیوی کا مفہوم ہے۔ رہا لفظ ما ملکت ایمانہم تو عربی زبان کے محاورہ اور قرآن کے استعارات دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اس کا اطلاق لونڈی پر ہوتا ہے یعنی وہ عورت جو آدمی کی ملک میں ہو۔ اس طرح یہ آیت صاف تصریح کر دیتی ہے کہ منکوحہ بیوی کی طرح مملوکہ لونڈی سے بھی صنفی تعلق جائز ہے اور اس کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ ملک ہے اگر اس سے بھی نکاح شرط ہوتا تو اسے ازواج سے الگ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی کیونکہ منکوحہ ہونے کی صورت میں وہ ازواج میں داخل ہوتی۔"

"ملک یمین" کا چونکہ اس جگہ بیان کرنا مقصود ہے اس لئے اس کا تعارف ذرا مفصل طور پر آپ کو کرا دیا گیا تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکے کہ ہمارے علمائے کرام نے اس کے متعلق جو بیان کیا ہے اس کے متعلق کوئی بات مبہم نہ رہ جائے۔ اس سے پہلے کہ ہم "ملک یمین" کے متعلق اظہار خیال کریں اور جو کچھ قرآن و سنت سے سمجھا ہے اس کو پیش کریں پہلے اتنی بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ تاریخ اور احادیث میں اس طرح کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ

۱۔ ایک کنیز ایک آدمی کی ملکیت میں تھی پھر وہ اس کے بیٹے کی ملکیت میں آگئی اور پھر وہ اس کے پوتے کی ملکیت میں چلی گئی اور اس طرح اس سے جو کچھ ثابت ہوا وہ کیا ہے ذرا غور فرمالیں۔

۲۔ اس کی مثالیں بھی تاریخ اور احادیث دونوں میں موجود ہیں اور ایک دو نہیں زیادہ ہیں کہ ایک ہی مرد کی ملک میں دو بہنیں اکٹھی یا دو ماں بیٹی اکٹھی اور پھوپھی بھتیجی اکٹھی آئیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرما کر دیں۔ اس طرح ملک یمین سے جب نکاح نہیں ہے تو ان سب کو ایک کی ملک میں دینے سے جو کچھ لازم آتا ہے اس پر بھی غور فرمالیں۔

۳۔ ایک عورت کسی ایک مرد کی ملکیت میں آگئی اور اس نے اپنے بیٹے یا بھائی سے اس کا نکاح کر دیا کیونکہ وہ ابھی اس کے بیٹے کی ملکیت میں نہ ہے لہٰذا باپ ملک ہونے کے ناطے اور بیٹا منکوحہ ہونے کے ناطے اس سے ازدواجی تعلق قائم کر سکیں گے لہٰذا اس پر بھی فکر کرنا ہوگا۔

۴۔ ایک عورت کسی ایک مرد کی ملکیت میں آگئی اور اس نے کسی دوسرے غیر رشتہ دار کو نکاح کر دی اب پہلا مرد جس کی وہ ملکیت ہے وہ بدستور مالک ہے لیکن دوسرے کی زوجیت میں ہے اس طرح دونوں اس سے تعلق خاص پیدا کرنے کے حق دار ٹھہریں گے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیسے؟ اگر ٹھہریں گے تو ایک ہی وقت میں ایک عورت کو دو مردوں سے حق زوجیت مل گیا پھر کیا خیال ہے؟ اگر اس کے ہاں اولاد ہوگی تو وہ کس کی

قرار پائے گی؟

۵ ۔ مولاناؤں نے بیان فرمایا کہ "مملوکہ سے نکاح نہیں ہو سکتا۔" نکاح اپنی کنیز سے نہیں ہوتا۔" (قرآن کریم کہتا ہے کہ "تم میں جو کوئی اس کا مقدر نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان بیبیوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں اور مومن ہیں۔" (النساء ۴ : ۲۵) بات کس کی مانیں؟ اللہ کی یا مولاناؤں کی؟

۶ ۔ ملک یمین مرد بھی ہوتا ہے اور عورت بھی۔ یہ کہنا کہ صرف عورت ہی ملک یمین ہوتی ہے بالکل صحیح نہیں۔ اس کا اطلاق عورت پر بھی ہوتا ہے اور مرد پر بھی اور عورت اور مرد دونوں کو ملا کر بھی۔ چنانچہ خود مولانا مودودی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "جمہور مفسرین و فقہاء کے نزدیک اس سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔" (سورہ النور)

۷ ۔ پھر جس طرح عورت کسی مرد کے ملک یمین میں آسکتی ہے کسی عورت کو ملک یمین مرد بھی حصے میں آسکتا۔ ہبہ کر کے دیا جا سکتا۔ وصیت سے دیا جا سکتا اور کوئی آزاد عورت اس کو خرید بھی سکتی ہے پھر ان صورتوں میں وہ اس عورت کا ملک یمین ہوگیا تو آخر وہ آزاد عورت جس نے غلام خرید لیا یا اس کو ہبہ میں دے دیا گیا ہے یا وصیۃ" مل گیا تو پھر کیا ہوگا؟

۸ ۔ "حسن" نے اپنی باندی کو اجازت دی کہ وہ جس سے چاہے نکاح کر لے اس نے مالک کی اجازت سے "حسین" کے ساتھ نکاح کر لیا اور اس سے نکاح کے بعد "حسن" نے اس باندی کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اب "حسین" کے نکاح کا کیا ہوا؟ نکاح باقی رہا یا اس کا بکنا ہی طلاق ہوگیا؟ نکاح باقی رکھنے میں کتنے مفاسد ہوئے معلوم ہیں؟ اور نکاح باقی نہ رکھنے میں کیا ہوا؟ ذرا غور کرو!

چنانچہ اس کی مثالیں بھی کثرت سے احادیث و تاریخ میں موجود ہیں کہ عورتوں نے غلام خریدے اور ان سے کام کاج بھی لیا اور پھر کچھ دیر کے بعد ان کو آزاد بھی کر دیا کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ان عورتوں کو خریدتے ہی ان غلاموں سے ازدواجی تعلقات کی اجازت تھی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس کیلئے کوئی ممانعت کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور وہ اس حکم سے پہلے بیان ہوئی یا بعد۔

علاوہ ازیں بھی اس کے متعلق بہت کچھ بیان کیا جا سکتا ہے لیکن تفہیم کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے۔ ہم قارئین سے امید رکھتے ہیں کہ وہ قلت و کثرت کی پٹی اتار کر براہ راست قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر غور کریں گے کیونکہ یہ ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ کلام اللہ اور کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انحصار کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بزرگان دین کے اقوال سے استفادہ کرے نہ کہ لکیر کا فقیر ہو کیونکہ استفادہ کرنا اندھی تقلید کا نام نہیں۔

قرآن کریم میں اس ملک یمین کا ذکر تقریباً پندرہ مقامات میں کیا گیا ہے جن میں سے بعض جگہ اس سے

مراد صرف عورتیں ہیں جو کہ کسی لڑائی میں تقسیم ہو کر دی گئی ہوں' کسی جگہ اس طرح کے مرد اور عورتیں دونوں مراد ہیں اور کسی جگہ صرف مرد مراد ہیں جو اس طریقہ سے حاصل ہوئے ہوں۔ چنانچہ سورہ النساء کی آیت ۳۶ میں جو لفظ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے اس کا ترجمہ سارے مترجمین نے لونڈی غلام دونوں سے کیا ہے جیسے کہ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے بھی دونوں ہی کو مراد لیا ہے فرماتے ہیں "اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔"

اور اس سورۃ کی آیت ۲۵ میں جو لفظ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے اس سے مراد سب نے باندیاں ہی مراد لی ہیں جیسا کہ مولانا مودودی صاحب رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ "تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔"

سورہ النور آیت ۳۱ اور سورہ الاحزاب کی آیت ۵۵ میں یہ لفظ اس طرح آیا ہے کہ ما ملكت ايمانهن "جن کے مالک ہوتے ہیں داہنے ہاتھ ان کے "یعنی مسلمان عورتوں کے۔ مولانا مودودی صاحب رحمہ اللہ کے علاوہ سب کا نقطہ نظر تقریباً یہی ہے لیکن مولانا نے اس جگہ ترجمہ کیا ہے "اپنے مملوک"۔

سورہ النور میں عام مسلمان عورتوں کو جو پردے کا حکم دیا گیا ہے اس میں ان مردوں کی فہرست دی گئی ہے جن کے سامنے زیب و زینت کرنے کی اجازت ہے اور اس میں وہ غلام بھی داخل ہیں جو ان آزاد مسلمان عورتوں کی ملکیت میں ہیں۔ اس لئے عام مفسرین نے اس جگہ لونڈی غلام مراد لے کر یہ لکھا ہے کہ مومن عورتیں جن کی ملکیت میں لونڈی غلام ہیں ان سے زیب و زینت کا پردہ نہیں ہے لیکن مولانا مودودی رحمہ اللہ کو مملوک ترجمہ اس لئے کرنا پڑا کہ وہ اس طرح ان "مملوک" سے صرف لونڈیاں مراد لینا چاہتے ہیں غلام نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کی فیاضی خاص مردوں کے ساتھ ہے کہ اگر کسی آزاد مرد کے ملک میں کوئی باندی آجائے تو اس کو حق ہے کہ وہ بغیر نکاح اس سے ازدواجی تعلق بھی قائم کرے کیونکہ وہ اس کی ملکیت ہے اور "حکومت کی طرف سے حقوق ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتع میں کراہت محسوس کرے۔"

لیکن اس کے برعکس یہی حقوق حکومت کی طرف سے کسی عورت کو مل جائیں اور وہ کسی غلام کی مالک بن جائے تو وہ اپنے غلام کے سامنے زیب و زینت نہیں کر سکتی وہ اس کیلئے ایسا ہے جیسا کہ "آزاد اجنبی مرد" کیوں؟ اس لئے کہ "غلام کیلئے اس کی مالک محرم نہیں ہے اگر وہ آزاد ہو جائے تو اپنی سابقہ مالکہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا محض غلامی اس امر کا سبب نہیں ہو سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہ آزادی برتے جس کی اجازت محرم مردوں کے سامنے برتنے کیلئے دی گئی ہے۔"

گویا کوئی باندی جب کسی مرد کی ملکیت میں آجائے تو "حقوق ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک

قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا وہ خواہ مخواہ لونڈی سے ازدواجی تعلق میں کراہت محسوس کرے۔" لیکن یہی حقوق ملکیت عورت کو مل جائیں اور وہ کسی غلام کی مالک بن جائے تو وہ اپنے غلام کے سامنے جس کی وہ مالکہ ہے زیب و زینت بھی نہ کرے اس لئے کہ وہ اس کیلئے ایسا ہی ہے جیسا کہ "آزاد اجنبی مرد" کہ "غلام کیلئے اس کی مالکہ محرم نہیں ہے۔" اس کو کہتے ہیں کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔"

"حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم جو پہلے عیسائی تھے جب نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انہوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک یہ سوال بھی کیا تھا کہ "انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔" اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟ جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے اور جو کچھ یہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بس یہی ان کو خدا بنا لینا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کیلئے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انہیں خدا بناتے ہیں۔" (تفہیم القرآن جلد دوم سورہ التوبہ ص ۱۹۰ ۳۱)

مولانا کا روحانی حلقہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہے اس لئے ہم امید رکھتے ہیں کہ مولانا کی اس حلت و حرمت اور جائز و ناجائز کو قرآن کریم کی کس آیت سے ثابت کریں گے کیونکہ ہمیں تو بہرحال یہ تقسیم کسی آیت یا حدیث سے معلوم نہیں ہوئی اور اس طرح جو مولانا "حلال قرار دیتے ہیں وہ حلال" نہیں مان سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر ایسا مان لیا تو گویا ہم نے مولانا مودودی صاحب رحمہ اللہ کو خدا مان لیا۔ ہم پورے وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ نہ مولانا کا یہ دعویٰ تھا اور نہ ہی ہم کو یہ منظور ہے اگر ان کا دعویٰ ثابت بھی ہو جائے تو ہم بہرحال اس سے انکاری ہیں۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں فرماتے ہیں :

"جنگ میں پکڑی گئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔ بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں گی وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔" (تفہیم القرآن جلد اول ص ۳۴۰ حاشیہ ۴۳ کی شق نمبر ۳)

اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء ۴ : ۲۵) "جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے

جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔" (تفہیم القرآن جلد اول ص ۳۴۱)

مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ کا نوٹ جو اوپر ذکر ہوا کہ جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں کوئی شرط نہیں کہ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو اور قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ جو مولانا مرحوم نے کیا کہ "ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔" کوئی فرق تو نظر نہیں آیا؟ اگر آیا ہے تو وہ کیا؟ "ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔" اور "وہ مومنہ ہوں" ایک ہی بات ہے؟

"مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ" قرآن کریم کا فرمان ہے اور "ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔" یہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔ اگر ان دونوں جملوں کا ایک ہی مطلب ہے تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ اگر دونوں جملوں میں تضاد ہے تو پھر کس کو مان لیا جائے اور کس کو چھوڑ دیا جائے؟ اس کا جواب اپنے ضمیر سے طلب کریں انشاء اللہ دو ٹوک ملے گا۔

اب مولانا ہی کے ترجمہ کو جو انہوں نے سورہ النساء کی آیت ۲۵ مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ تک کیا ہے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ایک بار پھر پڑھ لیں۔ "اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اسے چاہئے کہ اپنی ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو اس کے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔"

قرآن کریم کی سورہ النساء سے آیت ۲۵ کو نکال لیں اور کم از کم تین بار پڑھیں اور پھر اس ترجمہ پر غور کریں کہ اس میں کوئی نقص یا کمی و بیشی تو نہیں ہوئی اگر ہوئی ہے تو کیا؟ کیا آیت کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے؟

سورہ النساء کی اس آیت یعنی آیت ۲۵ کا مکمل ترجمہ و مفہوم ملاحظہ فرمائیں۔

"اور تم میں جو کوئی اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان بیبیوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو لڑائی کے قیدیوں میں سے تمہارے قبضے میں آئی ہیں اور مومنہ ہیں اور اس بات میں کوئی ذلت اور عیب نہ سمجھو کہ تم نے ایک ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو لڑائی میں قید ہو کر آئی تھی اور لونڈی بنا لی گئی تھی۔ اصل چیز ایمان ہے اور اللہ تمہارے ایمانوں کا حال بہتر جاننے والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مومن لونڈی ایمان کے لحاظ سے بہتر درجہ رکھتی ہو اور ایک شریف زادی ایمانی خصائل سے محروم ہو اور تم سب ایک دوسرے کی ہم جنس ہو یعنی انسان ہونے کے لحاظ سے سب ایک ہی طرح کے انسان ہیں۔ پس ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے بلا تامل اپنے نکاح میں لاؤ اور دستور کے مطابق ان کا مہر ان کے حوالے کر دو البتہ یاد رہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی قید و بند میں رہنے والی ہوں۔ بدکار عورتیں نہ ہوں اور نہ ایسی ہوں کہ چوری چھپے بدچلنی کرتی رہتی ہوں۔"

آیت کے اس حصہ سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسیران جنگ میں سے جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آجائیں انہیں اس لئے حقیر و ذلیل نہ سمجھو کہ

وہ دوسری قوم کی عورتیں ہیں یا یہ کہ وہ لڑائی میں قید ہو کر آئی ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اس لئے ان میں سے جو عورتیں مسلمان ہو جائیں اور اسلام بھی اپنی مرضی سے قبول کریں تم ان سے بلاتامل نکاح کر سکتے ہو خصوصاً جب اپنے خاندان کی آزاد عورتیں میسر نہ آئیں تو آخر وہ بھی عورتیں ہی ہیں اگر ان کی رضا بھی ہو تو تم کو ان سے نکاح کر لینے میں کوئی چیز مانع نہ ہونی چاہئے۔

پ ۔ نکاح کیلئے ایمان شرط ہے اور یہ بھی کہ ان کی اپنی رضا بھی ہو کیونکہ بزور ایسی حرکت انسانیت کے خلاف ہے اور اسلام کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو انسانیت کیلئے ننگ و عار ہو۔ خاندانی نہیں تو انسانی رشتہ تو تمہارا ان سے موجود ہے۔ ہاں! ان کا حق مہر بھی ادا کرنا ضروری ہے جس طرح خاندانی عورتوں کا حق مہر لازم ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ ان کی ملکیت حاصل ہونے کی وجہ سے اب تم ان کے حق مہر ہی کو خورد برد کر دو یہ گویا ایک ازدواجی حق ہے جو مرد پر لازم کر دیا گیا ہے کہ شریک زندگی کو شریک مال بھی ایک حد تک کر دیا جائے۔

ج ۔ اس طرح وہ تمہاری بیوی بھی ہوگی اور ملک یمین بھی جس سے تم کو یہ سہولت بھی حاصل ہوگی کہ اس تعلق کی بناء پر تم اس سے گھر کے کام کاج میں زیادہ مدد لے سکو گے اور وہ بھی اس طرح تمہاری ممنون احسان ہو کر زیادہ خدمت دینے کو تیار ہوں گی کہ اب تم ان کے دوہرے مالک اور دوہرے حقوق کے ادا کرنے والے ہو اور اس طرح ان کے اتنے مطالبات بھی نہیں ہوں گے جتنے کہ خاندان کی عورتیں کر سکتی ہیں۔

د ۔ تمہاری ملکیت میں جو کنیز دی گئی ہے اگر تم خود اس سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے یا تم کو حاجت نہیں ہے اور اس طرح تمہارے کسی دوسرے مسلمان بھائی کو ضرورت ہے اور وہ چاہتا ہے تو اپنی کنیز سے پوچھ لو اگر وہ بھی پسند کرے تو اس کو نکاح کی اجازت دے دو کیونکہ انسانیت کے تقاضے سارے انسانوں کے ساتھ ایک ہی جیسے ہیں اگر ان کو حالات نے کنیز و غلام بنا دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ انسان نہیں رہے۔ اس طرح جب تم کسی دوسرے کو نکاح کر لینے کی اجازت دے دو گے اور اپنی کنیز کو نکاح سے منع نہیں کرو گے تو اس سے دو انسانوں کی ضرورت بھی پوری ہوگی اور تمہارا بوجھ بھی ہلکا ہوگا جو اس کنیز کا تم پر پڑ چکا تھا کیونکہ اب وہ جس کی زوجیت میں ہے اس کی ضروریات کا وہ کفیل ہو جائے گا۔

ہ ۔ اس کے باوجود کہ اس کا نکاح تم نے کسی دوسرے آدمی کو کر دیا اپنے گھر کے کام کاج میں اس سے مدد لے سکو گے کیونکہ وہ تمہاری ملک یمین ہے اور یہ بات اس کے ہونے والے خاوند کو بھی معلوم ہے۔

و ۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ جب تم دوسرے کے نکاح میں دو گے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ چونکہ وہ تمہاری ملک یمین ہے اس لئے جو اس کا حق مہر ہوگا اس کے تم مالک ہو جاؤ گے ہرگز نہیں وہ حق زوجیت ہونے کے لحاظ سے اس کا اپنا ذاتی حق ہے اس کا مہر کھانے کی تم کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ز۔ اس میں تم سب کے لئے خوبی اور بھلائی ہے کہ ایسی عورتوں سے خصوصاً جب کہ وہ جوان اور خوبرو بھی ہوں یا خود نکاح کرو یا کسی ضرورت مند سے نکاح کر دو کہ اس طرح دونوں طرف سے ایک مشکل امر کا خوف جاتا رہے گا یعنی کسی برائی کے مرتکب ہونے کا خطرہ مٹ جائے گا لیکن اگر کنیز نکاح کیلئے تیار نہ ہو یا تم کسی مصلحت کے پیش نظر نکاح نہ کر سکو اور نہ ہی کسی دوسری جگہ نکاح کرو تو بھی اس میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو کچھ کیا جائے انسانیت کے حقوق کے اندر رہ کر کیا جائے اس سے تجاوز نہ ہو۔ کیونکہ اس کا حقیقی فیصلہ وہی ہوگا جو فریقین کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

ح ۔ جو کچھ تمہیں کرنا چاہئے وہ پاکدامنی اور پاکیزگی حاصل کرنے کیلئے کرنا چاہئے اس کا نتیجہ بے حیائی اور بری بات یعنی نفس پرستی نہ ہو اور ہر عمل کا انحصار نیت پر ہے یہ اصول تم کو بھول نہ جانا چاہئے اور فضیلت کا معیار ایمان و عمل ہے نہ کہ حسب و نسب۔

ط ۔ احکام معاشرت میں سختیاں اور جکڑ بندیاں نہ ہوں کیونکہ یہ انسانیت کے خلاف ہیں اور انسانیت کا احترام ہر فرد و بشر پر لازم و ضروری ہے اور معاشرت کا تقاضا سہولتیں اور آسانیاں ہیں۔ سختیاں اور جکڑ بندیاں نہیں۔

س ۔ جن معاشرتی برائیوں میں تم اسلام سے قبل مبتلا تھے اسلام ان سب کو ختم کرنے کیلئے آیا ہے ان کی حفاظت کے لئے نہیں آیا اور نہ ہی ان برائیوں کو پروان چڑھتے اسلام برداشت کر سکتا ہے چہ جائیکہ وہ خود انہی برائیوں میں مبتلا ہو جائے۔

ک ۔ نکاح کرنے سے پہلے ان حرام رشتوں پر نظر رکھنا ضروری ہے جو اسلام نے حرام قرار دیئے ہیں یعنی دو کنیزیں ایسی جمع نہ کریں جو ازروئے اسلام جمع نہ ہو سکتی ہوں کیونکہ وہ اصولی باتیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں ان کا خلاف کسی حال میں قبول نہیں ہوگا کہ اسلام اپنے اندر پختہ اصول رکھتا ہے وہ موم کی ناک نہیں ہے۔

یاد رہے کہ جنگی قیدیوں کے متعلق جو حکم عام دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یا ان پر احسان کرو اور یا فدیہ کا معاملہ کر لو۔ احسان اس میں کیا ہے؟ یہی کہ قید کی حالت میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ یہ کہ قتل یا دائمی قید کی بجائے ان کو غلام و باندی بنا کر افراد مسلمین کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہ کہ جزیہ لگا کر ان کو ذمی بنا لیا جائے اور یہ بھی کہ ان کو بلامعاوضہ رہا کر دیا جائے۔ اس طرح گویا یہ ان پر احسان ہوا جو انسانیت کے حقوق میں سے ایک اہم حق ہے۔

اور اس طرح فدیہ کا معاملہ بھی تین طریقوں سے کیا جا سکتا ہے ایک یہ کہ مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے دوسرے یہ کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت ان سے لی جائے جو دائرہ انسانیت اور اسلام کے اندر رہ کر لی جائے اور ان کو اس طرح خدمت لے لینے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اپنے ان آدمیوں سے جو دشمن کے قبضے میں ہوں ان کا تبادلہ کر لیا جائے اور اس طرح گویا اس کو اولیت حاصل ہونا

چاہیے۔

اسلام کے مختلف ادوار میں ان پر عمل ہوتا رہا اور خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ان کی اس طرح حفاظت کی گئی جس طرح کوئی شخص اپنے مہمانوں کی خدمت کرتا ہے۔ اگر ان سے کوئی کام لیا گیا تو وہ بھی انہی اصولوں کے مطابق جو اصول اسلام نے انسانیت کو پروان چڑھانے کیلئے قائم کئے تھے۔ آپ کی ہدایت کہ "استوصوا بالاساری خیرا" کہ ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کے اصول کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے یہ بات مسلمانوں کو سکھائی کہ ملک یمین مرد ہو یا عورت سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کو ملکیت میں آتے ہی آزاد کر دو اور پھر آزاد ہونے کے بعد وہ چاہیں اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں واپس چلے جائیں اگر وہ یہاں ہی رہائش پذید ہونا پسند کریں تو ان عورتوں سے جن کو تم نے آزاد کیا ہے خود نکاح میں لے آؤ ورنہ ان کو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں نکاح کرنے دو۔ آپ ﷺ نے خود ایک یا دو کنیزوں کو آزاد کیا اور ان کو امہات المومنین میں داخل ہونے کا شرف نصیب ہوا اور کچھ نے دوسری جگہ بھی نکاح کئے جیسے ام ایمن وغیرہ۔

ہمیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی یہ بات کہی گئی کہ آپ ﷺ نے کئی ایک کنیزیں بے نکاح رکھی تھیں اور ان سے تعلق خاص بھی قائم کیا تھا لیکن اس طرح کی ساری باتوں کو "خرافات" کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم ان کو عمداً بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان کو ترک کرتے ہیں اور پورا زور دے کر کہتے ہیں کہ ایسی ساری روایتوں کا نہ سر ہے نہ پیر صرف دور ازکار قصے اور کہانیاں ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ ہاں! آپ ﷺ نے ایک یا دو کنیزوں سے نکاح کیا ان کا ولیمہ کیا اور حق مہر ادا کیا اور پردہ کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ اس میں زیادہ ہی کوئی گہرائی میں اتر کر دیکھے گا اور ان روایات کا تجزیہ کر کے کوئی بات پیش کرے گا تو صرف یہ کہ کسی کو نکاح میں رکھا ہو اور آزاد نہ کیا ہو جب کہ اس کی اجازت موجود تھی حالانکہ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔

قرآن کریم کی وہ دو آیات جن سے یہ سمجھ لیا گیا ہے جن کا ذکر بھی ہم اوپر کر آئے ہیں وہ یہ ہیں وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ (المومنون ۲۳ : ۵، ۶) "جو لوگ اپنے ستر کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ ہاں! اپنی بیبیوں سے زنا شوئی کے علاقہ رکھتے ہیں یا ان سے جو ان کی ملکیت میں آگئیں یعنی غلامی میں پڑی ہوئی عورتیں جو ان کے نکاح میں آگئیں تو ان سے علاقہ رکھنے پر ان کیلئے کوئی ملامت نہیں۔" اور دوسری جگہ آیات سورہ المعارج کی ۳۰/۳۱ ہیں جو بالکل لفظ بلفظ ایک ہی جیسی ہیں ان میں ایک حرف یا زبر و زیر کا فرق بھی نہیں گویا وہی مضمون المعارج میں بھی بیان ہوا ہے اور یہ دونوں سورتیں مکی ہیں اور ان کا زمانہ نزول بھی بالکل قریب قریب ہے اگرچہ المومنون المعارج سے پہلے کی نازل شدہ ہے۔ گویا المومنون ہی کا مضمون المعارج میں دہرایا گیا ہے اور ابھی تک اسلامی

جنگوں اور ان کے امیروں کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔

عربوں میں ملک یمین کی جتنی صورتیں اس وقت رائج تھیں اور عربوں کی ازدواجی زندگی کا جو حال تھا اس کی طرف ہم نے شروع ہی سے اشارت دے دیئے ہیں اور اسلام نے جو ان کی اصلاح کی اور جس طریقہ سے کی وہ قابل داد اور تحسین و شاباش کے لائق ہے۔ پھر اسلامی ترقی کا زمانہ آیا تو اس میں دفاعی جنگیں بھی لڑی گئیں اور ان کے اندر جو قیدی آئے ان کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی گئی اور احسان و سلوک کے تحت، جنگی قیدیوں کے تبادلہ اور مفتوح قوموں کی عورتوں کے مسلمان ہونے کے بعد ان سے نکاح ان کے خاندانوں کے سربراہوں کی بیٹیوں کے خود رسول اللہ ﷺ سے نکاح ہونے سے ان کے قیدیوں کی رہائی جیسے کام عمل میں لائے گئے اور آہستہ آہستہ اس رسم کو نیست و نابود کر دیا گیا۔

تاہم جب تک اس کے اثرات باقی رہے ان میں اصلاح کی مسلسل کوششیں اختیار کی گئیں جن میں ایک کوشش ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد نکاح کرنا بھی تھا۔ اس لئے کہ نکاح کے بعد اس عورت کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ جب اس کے ہاں اولاد ہو جاتی تو فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے خاوند کی اگر وفات ہو جاتی تو خود بخود آزاد ہو جاتی تھی۔ نکاح کی صورت میں اس کو حق مہر وصول ہوتا تھا جس سے اس کی انسانیت کو ایک سہارا مزید مل جاتا تھا۔ مالک کا کسی دوسری جگہ ان کا نکاح کر دینے میں بھی انہی عورتوں کا فائدہ ہوتا تھا جس سے اس کی انسانیت کو ایک سہارا مزید مل جاتا تھا۔ مالک کا کسی دوسری جگہ ان کا نکاح کر دینے میں بھی انہی عورتوں کا فائدہ ملحوظ خاطر رکھا گیا اور ملک یمین کو آزاد عورتوں سے الگ اس لئے رکھا گیا کہ ملک یمین سے نکاح کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس عیب کو مٹانے کیلئے جب تک ان کا نام ملک یمین ہی سے نہ لیا جاتا کوئی صورت اور اس کے عیب کو مٹانے کی نہ تھی اور یہ بھی کہ جب کسی طرح سے قومی تقسیم تشکیل پا جاتی ہے تو اس کو جب تک اس قوم کی طرف منسوب نہ کیا جائے اس وقت تک وضاحت ممکن نہیں ہوتی۔ یہود و نصاریٰ کے وہ لوگ جو ایمان لا چکے تھے ایمان لاچکنے کے باوجود ان کو اہل کتاب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مہاجرین و انصار دونوں ایک ہی وطن کے باشندے تھے صرف فرق یہ تھا کہ ایک شہر سے وہ دوسرے شہر ہجرت کر آئے تھے دونوں کے اسلام لانے اور اسلام کی خدمت کرنے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں ہے تاہم وہ مہاجر و انصار کہلاتے رہے۔ اوس و خزرج دو قبیلوں کے لوگ جب مسلمان ہوئے تو اسلام لانے کے باوجود ان کو خزرجی اور اوسی ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور یہ ساری تقسیمات مع شے زائد آج بھی موجود ہیں اس لئے کہ ایک دفعہ تقسیم ہونے کے بعد یا اس کا کوئی نام رکھا جانے کے بعد اس کا بدلنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔

اسی بنیاد کے پیش نظر اہل کتاب سے نکاح جائز اور اہل کتاب کا کھانا حلال رکھا گیا لیکن مسلمانوں نے ان القابات سے جو جو ٹھوکریں کھائیں ان کا بیان بہت لمبا ہے اور ایک بار جب کوئی غلطی رواج پا جاتی ہے اس کی

صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا

اور دیکھو عورتوں کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کر دیا کرو[۱۳] ہاں! اگر ایسا ہو کہ وہ اپنی خوش دلی

اصلاح نہایت ہی مشکل ہوتی ہے تعجب ہے کہ مشرکوں کے ساتھ مناکحت کو اسلام نے واضح الفاظ میں منع فرمایا اور پھر اس سے بھی واضح الفاظ اہل کتاب کے دونوں گروہوں سے شرک کا رد کیا یہ شرک کا رد کیا تھا؟ اس سے کیا بات ثابت ہوتی تھی؟ یہی کہ اہل کتاب سارے کے سارے نہیں تو کم از کم ان کی کثیر تعداد کھلے شرک کی مرتکب ہو چکی ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ہٹ دھرمی سے ہر طرح کے اہل کتاب سے مناکحت اور ہر قسم کے اہل کتاب کے کھانے حلال و طیب سمجھے گئے یہاں تک کہ وہ چیزیں جو ان کیلئے قطعی حرام تھیں جب انہوں نے اپنی قومی غلطی کی بناء پر ان کو حلال بنا لیا تو اہل اسلام نے اگرچہ اختلافی صورت ہی میں سہی ان کو کھا لینے کا فتویٰ دیا اس لئے کہ وہ اہل کتاب کا کھانا تھا۔

ایک بات ہو تو اس کی تفہیم پر وقت لگایا جائے جب آوے کا آوا ہی خراب ہو جائے تو اصلاح کی کوئی صورت ہے؟ اس لئے اس جگہ یا خاموشی اختیار کر لینا یا مار کھاتے رہنا دونوں میں سے ایک کا انتخاب لازم ہے اور پھر خود انسان یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ مار کھاتے کھاتے مر جانے سے یا مارا جانے سے بہتر خاموشی ہے اس لئے وہ اکثر خاموش ہو کر دم بخود رہتا ہے۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ جب کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور کتنا ہی ذمہ دار کیوں نہ ہو انبیاء کرام کے علاوہ جب بھی کوئی بھول چوک سے کچھ کہہ بیٹھتا ہے تو اس کا اعتراف اس کے لئے اپنی موت سے بھی دشوار نظر آتا ہے اس لئے وہ اپنے کئے ہوئے پر دلائل مہیا کرتا رہتا ہے اور ان طفل تسلیوں کیلئے اس کے پاس سہارا بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ پہلے بھی لوگ اس طرح کہتے آئے ہیں۔ کیا وہ سارے غلط تھے؟ کیا ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکتی تھی؟ یہی کچھ یہاں ہوا۔ ملک یمین اگر عورت ہو تو پھر اس کے انگ انگ اور جوڑ جوڑ میں وہ کچھ جائز رکھا گیا جس کا ذکر کرنا نہ کرنے سے سو بار برا ہے اس لئے اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

جب اسلام نے "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" کے بالکل مختصر ان الفاظ سے عربوں کی ان ساری کارستانیوں پر پانی پھیر دیا تو اہل اسلام کے علماء کے لغو خیالات کی تردید بھی یقیناً انہی الفاظ سے ہو گئی۔ اس جگہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ میرے جیسے ان پڑھوں اور ناخواندہ لوگوں کیلئے ہے علماء کو سمجھانے والے ہم کون ہیں؟ اس کے متعلق مزید تفصیل درکار ہو تو رسالہ "حق الیقین" ملاحظہ فرمالیں وہ "مکتبہ الاثریہ" سے مل جائے گا۔ یہ رسالہ استاذی حافظ عنایت اللہ اثری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔

عورتوں کا حق مہر ادا کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ نکاح کی شرائط میں سے یہ ایک شرط ہے

[۱۳] صدق یا صداق وہ ضروری چیز ہے جو خاوند کی طرف سے بوقت نکاح عورت کو پیش کی جاتی ہے

فَكُلُوهُ هَنِيٓـًٔا مَّرِيٓـًٔا ۞ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ

سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بے کھٹکے اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ ۴

اور دیکھو مال و متاع کو اللہ نے تمہارے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ پس ایسا نہ کرو کہ کم عقل آدمیوں کے حوالے کر دو۔ ایسا کرنا چاہئے کہ ان کے مال سے ان کے کھانے اور کپڑے کا

اور یہ شرائط نکاح میں سے ایک شرط ہے۔ اسلام جو دراصل صحیح اور سچے اصولوں کا مذہب ہے اس میں ہر چیز کو کسی نہ کسی حکمت کے تحت رکھا گیا ہے۔ وہ کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو بہرحال حکمت اس میں پنہاں ضرور ہوگی۔ کہاں کا لڑکا اور کہاں کی لڑکی؟ لیکن اب ان دونوں کو ایک جسم و جان کی طرح ہو جانے کا حکم ہے اور اس جوڑ کے جڑتے ہی دونوں فریق پر حقوق لازم ہو جاتے ہیں اور فریقین کیلئے ان حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ہاں! یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ حقوق حقوق کا بدل نہیں ہوتے کہ ایک حق ادا کرے گا تو دوسرا بھی کرے گا اور اگر ایک کوتاہی کرے گا تو دوسرا بھی کوتاہی کرے گا۔ یہ بات مطلق درست نہیں ہے بلکہ درست یہ ہے کہ جو حق ادا کرتا ہے وہ صحیح کرتا ہے اور جو کوتاہی کرتا ہے وہ غلط کرتا ہے اور صحیح کرنا اور غلط کرنا دونوں عمل ہیں صحیح کا نتیجہ یقیناً صحیح اور غلط کا نتیجہ یقیناً غلط ہوتا ہے اور حق ادا کرنے والا عنداللہ بھی ماجور ہے اور کوتاہی کرنے والا بھی مستحق عذاب ہے۔ یہ بات اس لئے کہنا پڑی کہ عوام تو عوام علماء بھی اس مہر کو کسی چیز کا بدل مانتے ہیں جو کسی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ بلکہ اسلام نے اس میں یہ حکمت رکھی ہے کہ ایک فریق کو جب گھر لایا جا رہا ہے تو اس گھر میں اس کا حق ملکیت بھی ہونا ضروریات میں سے ہے تاکہ شریک زندگی شریک ملکیت بھی ہو جائے اور جو چیز پہلے ایک کی تھی اب دو کی تصور ہو اگر برابر نہیں تو بھی کسی حصہ میں شریک متصور تو ہو۔ اس لئے اس کی مقدار متعین نہیں کی گئی بلکہ نکاح کرنے والے کی حیثیت پر اس کو چھوڑ دیا گیا اور اخلاقاً اس سے کہا گیا ہے کہ وہ بخوشی جتنے حصہ میں شریک کرنا چاہتا ہے اس کا اعلان کر دے۔ وہ آدھے میں شریک کرے خواہ چوتھائی میں اور خواہ اس سے بھی کم۔

ہاں! ضروری یہ ہے کہ جو کچھ حصہ اس کو دیا گیا ہے اس کا اسے مالک سمجھے یہ نہیں کہ صرف نام کی ملکیت اور نام کی ادائیگی اس لئے کہ عورت کو اس میں پورا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں عورت کو اس مال میں شریک کرنا ہے جو مرد کے پاس ہے اس لئے اس پر یہ لازم قرار دے دیا کہ وہ اپنے مال میں سے ایک متعین حصہ اس کو ہبہ کرے۔ نحلۃ وہ عطیہ جو تبرع

کے طور پر ہو یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو اور یہ بھی کہ وہ اس کو بطیب خاطر دے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ نحلة سے مراد ہے ھبة اور اس لئے بھی کہ نحل یعنی شہد کی مکھی جس چیز پر بیٹھتی ہے تو اس کا نقصان کئے بغیر ایک طریقہ سے اپنا حصہ اٹھا لیتی ہے اور اس کا فائدہ بھی اس میں آگیا کہ یہ چیز دونوں میاں بیوی کو شیر و شکر کر دینے کیلئے ہے نہ کہ ناراضگی کا باعث بنانے کیلئے جیسا کہ ہمارے معاشرے میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس معاملہ کی لے دے میں" جوتیوں دال بٹنا" شروع ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو چیز شیر و شکر کرنے کیلئے ضروری قرار دی گئی تھی وہ طعن و تشنیع کا باعث بن کر رہ جاتی ہے۔ فریقین کو اس معاملہ میں ہوش و گوش سے کام لینا چاہئے۔

عورت اگر خوش دلی سے کچھ چھوڑ دے تو اس کو اختیار ہے اس کے لینے میں کوئی گناہ نہیں

۱۴ فرمایا مرد نے جو کچھ عورت کو مہر کے طور پر دیا جب وہ اس کی مالک قرار پا گئی تو اب اس کی مرضی ہے کہ وہ چاہے سارا خاوند کو دے دے چاہے اس میں کوئی حصہ۔ ہاں اس سلسلہ میں جو کچھ وہ کرے بطیب خاطر کرے کسی دباؤ کے تحت دینا دینا نہیں ہوتا بلکہ مجبوری ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اس مجبوری کو مجبوری کہا بھی نہ جا سکتا ہو کیونکہ بعض لوگوں کے نزدیک حرف شکایت زبان پر لانا بھی جرم قرار پاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم مار دیں تو کوئی "سی بھی" نہ کرے اور اگر کوئی کرے تو وہ مجرم قرار پائے اس لئے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ "اگر ایسا ہو کہ وہ اپنی خوش دلی سے کچھ چھوڑ دے تو تم اس کو بے کھٹکے اپنے استعمال میں لا سکتے ہو۔"

گویا اس آیت میں جو قید لگائی ہے کہ وہ طیب نفس سے اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دے دیں یا تم سے وصول ہی نہ کریں تو تم اس کو کھا سکتے ہو اس میں ایک بہت بڑا راز ہے اور وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں یہ بات واضح ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کیلئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طیب نفس سے اجازت نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرء الا بطیب نفس منه (مشکوۃ ۲۵۵) "خبردار ظلم نہ کرو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال دوسرے شخص کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔"

پھر اس آیت میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ صدقات کا استعمال ہوا ہے اس لئے مہر کو صداق یا صدقه کہا جاتا ہے اور یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ "صدق" کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس مناسبت سے مہر کو صداق کہا جائے گا۔ "ھنیا مرئیا" اس چیز پر بولتے ہیں جو کسی مشقت و تکلیف کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اس لئے جب یہ طعام کی صفت کے طور پر واقع ہو تو اس کے معنی خوشگوار طعام کے ہوتے ہیں یعنی ایسا طعام جو کسی مشقت کے بغیر حلق سے اتر جائے اور

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ

انتظام کردیا جائے اور نیکی اور بھلائی کی بات انہیں سمجھا دی جائے۔[۱۵] ۵

اور یتیموں کی حالت پر نظر رکھ کر انہیں آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ

آسانی سے ہضم ہو کر جزو بدن بنے اور ایسے کھانے کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ اس کو بے کھٹکے کھاؤ اور اس میں کسی طرح کی مضرت نہیں ہے۔

یتامیٰ جب تک مال سنبھالنے کے قابل نہ ہوں ان کے مال واپس نہ کرو

[۱۵] انہی یتامیٰ کے باعث نکاح کی طرف مضمون منتقل ہوا تھا اور پھر واپس اپنے مقام پر لایا گیا ہے فرمایا وہ یتامیٰ جن کے تم کفیل بنے تھے یا بنائے گئے تھے ان کی کفالت کو راستے ہی میں مت چھوڑو بلکہ ان کو سن رشد تک پہنچ لینے دو تب ان کے مال ان کی طرف لوٹاؤ۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مال جو قیام زندگی کا ذریعہ ہے اگر یہ مال ان بچوں کو دے دیا گیا جو ابھی خرچ کرنے اور مال پر عمل کرنے کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اگر ان کو مال دیا گیا تو وہ بہت جلد اس کو ضائع کر دیں گے اور پھر زندگی کے بحال رکھنے کا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے جب تک یہ یتیم بچے عاقل بالغ نہ ہو جائیں اور اپنے مفاد کی خود حفاظت نہ کر سکیں ان کا مال بھی ان کے قبضہ میں نہ دو۔

اس میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو نا سمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے۔ وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف ہے کہ "تم اپنا مال ان کو نہ دو" اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کا مال واپس کر دینے کا حکم ہے وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ "تم ان کا مال ان کو واپس کر دو" جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس ہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک گن کر واپس کر دیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔

صاحب جائیداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو ان کیلئے ان یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا ہے اور تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی اور فرمایا گیا کہ "ایسا کرنا چاہئے کہ ان کے مال سے ان کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کر دیا جائے اور نیکی اور بھلائی کی بات ان کو سمجھا دی جائے۔"

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ" اور مت دو کم عقلوں کو۔ یہ کم عقل کون ہیں؟ وہی جو ابھی اپنے مال پر کسی

فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۚ

جائیں۔[۱۶] پھر اگر ان میں صلاحیت پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔[۱۷] اور اس خیال سے کہ

طرح کا عمل نہیں کر سکتے صرف خرچ ہی خرچ کر سکتے ہیں! ان کو مال کمانے کی سمجھ نہیں ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یتیموں کے مال پر متولیوں کو عمل کرنے کا حق ہے تاکہ مال آہستہ آہستہ ختم نہ ہو جائے بلکہ جو خرچ ہو اس میں کچھ اضافہ بھی ہو اور اضافہ کیلئے ضروری ہے کہ مال کو کسی کام پر لگایا جائے۔ گویا متولی حضرات اپنا مال سمجھ کر اس کی حفاظت کریں اور اس کو بڑھانے کی فکر بھی کریں جس طرح انسان اپنے مال کو بذریعہ عمل بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ان کے یتیم کا زمانہ باسانی گزر جائے اور مال کی حفاظت بھی ہوتی رہے اور اس طرح جو کچھ کیا جائے وہ پوری دیانت داری اور حساب کتاب کے ساتھ کیا جائے۔ علی الحساب اندھا کھاتہ نہ رکھا جائے۔ گویا اس آیت کے مطابق سفہاء وہی ہیں جو مال پر عمل کرنے کی سمجھ نہ رکھتے ہوں۔ رہی یہ بات کہ یہ مال پر عمل کیا چیز ہے؟ تو یہ کسی سے بھی مخفی نہیں مال کو تجارت کے ذرائع میں سے کسی ذریعہ پر لگانا جو ذریعہ شرعاً جائز اور درست ہو۔ مطلب واضح ہے کہ جو لوگ شغل معاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنے راس المال کو تباہ کرتے چلے جاتے ہیں وہ سب کم عقلوں میں داخل ہیں۔ مال ان کے سپرد کرنے کی بجائے یہ حکم دیا ہے کہ ان اموال پر تم ہی کسی تجارت وغیرہ میں لگا کر اس سے ان کی پرورش کا بندوبست بھی کرو اور مال کو سنبھالنے کی فکر بھی

پھر ان کے کھانے اور پہننے کے بندوبست کے علاوہ ایک مزید ارشاد بھی فرمایا کہ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا "نیکی اور بھلائی کی بات انہیں سمجھاؤ۔" اس سے ہمارے مفسرین نے نصیحت کے چند فقرے ہی مراد لئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے ان کی صحیح تربیت کرنا مراد ہے۔" یعنی ان کی تربیت پر روپیہ خرچ کرو اور مال کو تجارت پر لگا کر اس کی حفاظت اور اس کے بڑھانے کے طریقے ان کو سمجھاؤ تاآنکہ ان کو یہ عقل و شعور آجائے کہ مال کو اسراف کے طور پر خرچ کرنے کی بجائے سنبھال کر خرچ کرنے کی اہلیت بھی ان میں پیدا ہو جائے یہ بھی "قولًا معروفًا" میں داخل ہے۔ چنانچہ آنے والی آیت میں قرآن کریم نے اس بات کو وضاحت کے ساتھ خود بیان کر دیا ہے۔

ان بے باپ یا بن ماں باپ بچوں کو آزماتے رہنے کا حکم تاکہ ان کو تجربہ بھی حاصل ہو

[۱۶] جب ایسے بچوں کے تم نگران بن گئے جن کے آباؤ و اجداد یا بعض اوقات ماں باپ دونوں ہی رخصت ہوگئے تو ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کا امتحان بھی لیتے رہو کہ وہ اس جائیداد کو سنبھالنے کے اہل ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ تعلیم کے ساتھ تجربہ بھی ضروریات میں سے ہے یعنی وہی بات کہ قول معروف صرف زبانی کلام بات ہی نہیں بلکہ عملی آزمائش بھی ہے اس لئے کہ اس یتیم کو ماشاء اللہ جوان ہو کر اسلامی

سوسائٹی کا ایک فرد بننا ہے اس کے کندھوں پر وہ سارے بوجھ پڑنے ہیں جو اس دنیا میں آنے والوں کے کندھوں پر پڑتے آرہے ہیں۔ اس کے والدین اگر دار فانی سے رخصت ہوگئے تو جو ترکہ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ صحیح معنوں میں ان کے کام تب ہی آسکتا ہے جب ان میں اس کو سنبھالنے کی اہلیت پیدا ہوگی۔

ویسے بھی غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ پیغام حیات ہے جس میں انسان کی ہر طرح کی تربیت کے احکام موجود ہیں۔ مالی' اخلاقی اور بدنی ساری حفاظتوں کا ذکر اور اس کے اصولوں کی طرف رہنمائی پائی جاتی ہے۔ اس میں اموال کا حکم بھی بار بار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق قوانین بھی بتائے گئے ہیں۔ تجارتی خطوط کا ذکر بھی ہے اور لین دین کے اصول بھی۔ رہن کا بیان بھی ہے اور وصیتوں کی ضرورت بھی۔ مال متروکہ حصص کی تفصیل بھی بتائی گئی ہے تو عورتوں کو حق مہر میں سونے چاندی کے ڈھیر دینے کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ اموال کی حفاظت اور مالی تنازعات سے بچنے کیلئے تحریر اور گواہی کی ضرورت بھی واضح کر دی ہے۔ اموال کی ٹھیک طریقہ سے حفاظت نہ کرنے والوں کیلئے ان کے متولی بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سارے کاموں کو صرف دنیا کے کام ہی نہیں رہنے دیا بلکہ دین کے ساتھ ان کو وابستہ کیا ہے۔ مال و دولت کو غلط طریقوں سے جمع کرنے والوں کو آخرت کی وعیدیں بھی سنائی ہیں تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ مال کا کمانا صرف دنیا ہی سے متعلق نہیں بلکہ آخرت میں کام آنے والی بات بھی ہے۔

نکاح کی عمر کیا ہے؟ وہی جب انسان بالغ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ بلوغ تک ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھنا چاہئے۔ جب بالغ ہو جائیں تو اس وقت اگر یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر اب اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو۔ گویا اس طرح اشارہ فرما دیا کہ ہر فرد کیلئے ضروری نہیں کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچتے ہی اس صلاحیت کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ نہیں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی بہت سی صلاحیتوں کے مالک ہو جاتے ہیں اور زیادہ تعداد ان ہی لوگوں کی ہے جو بلوغت کو پہنچنے کے باوجود دوسری صلاحیتوں میں کورے ہوتے ہیں اس لئے صرف نکاح کی عمر پر اکتفا نہ کیا بلکہ ساتھ ہی ارشاد فرما دیا کہ خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ بالغ ہونے کو تو ہو جائے لیکن ناک لگی ہی رہ گئی ہو۔ ایسے الھڑ اور بالغ نادانوں کے متعلق جلدی سے کام نہ لو بلکہ شعور آلینے دو۔

صرف بلوغت شرط نہیں بلکہ صلاحیت کار بھی ضروری ہے تاکہ مال کی واپسی ان کیلئے مفید ہو

۱۷ ہاں! بلوغت کے ساتھ رشد بھی ہو تو بیشک ان کا مال واپس کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ بلوغت کے ساتھ رشد و ہدایت بھی ضروری ہے اور اس رشد و ہدایت سے مراد مالی حفاظت اور نگرانی ہے کہ وہ اب اس قابل ہیں کہ اپنے مال کی خود حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کو کسی نگران کی ضرورت نہیں رہی۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ اس کو آڑ بنا کر ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کا مالک ہے۔ نیت صحیح اور درست

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا

بڑے ہو کر مطالبہ کریں گے فضول خرچی کر کے جلد جلد ان کا مال کھا پی نہ جاؤ۔ ان کے سرپرستوں میں سے جو مقدور والا ہو اسے چاہئے کہ پرہیز کرے، جو حاجت مند ہو اس میں سے

ہے تو بحمد اللہ جو فیصلہ ہوگا اس میں برکت اور خیر ہی ہوگی۔ اس سلسلہ میں جتنی ہدایات دی گئی ہیں سب کا ماحصل یہ ہے کہ جو کچھ کیا جائے وہ یتیموں کی بھلائی اور فائدہ کیلئے کیا جائے ان کے ساتھ اپنی کسی طرح کی کوئی غرض سوائے ان کی بھلائی کے نہ ہو۔ ان کے مال کی نگرانی اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی ہے تو ان کی بھلائی کیلئے اور اب مال ان کو واپس کرنا ہے اور اس ساری ذمہ داری اور نگرانی سے سبکدوش ہونا ہے تو ان کی بھلائی کیلئے۔

نگرانوں کیلئے مزید یہ ہدایت کہ جب تم نگران بن گئے ہو تو بندر بانٹ سے کام نہ لینا

۱۸ جن یتیموں کی ذمہ داری تم نے قبول کی ہے اور ان کے مال کے تم نگران بنائے گئے ہو اس ذمہ داری اور نگرانی کے کام کو اس خیال کے ساتھ پورا کرو کہ اگر یہ بچے یتیم ہو چکے ہیں تو کل میرے بچے بھی یتیم ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال میں رکھو کہ اگر تمہارے بچے یتیم ہو جائیں تو تمہاری خواہش کیا ہے کہ ان کے ساتھ ان کا نگران کیا سلوک کرے؟ بس یہی سلوک تم ان یتیم ہونے والوں کے ساتھ کرو اور دور نہ جاؤ اپنے دل سے پوچھتے رہو۔ ہاں! ہاں! دل کو ٹٹول کر دیکھو اور اس سلسلہ میں جو ہدایت فرمائی گئی وہ اس طرح ہے کہ "اور اس خیال سے کہ بڑے ہو کر وہ مطالبہ کریں گے فضول خرچی کر کے جلد جلد ان کا مال کھا پی نہ جاؤ۔"

نبی رحمت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت درست کر کے رکھ دی اور ان کی بری عادات کو خواب بنا دیا۔ وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کیلئے لطف و شفقت کے کئی کئی ہاتھ اس کے ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش و کفالت کیلئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا۔ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول سیدہ فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہیں کہ اس یتیم کی پرورش میرا فرض ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنا معمول زندگی یہ بناتے ہیں کہ جب تک کوئی یتیم آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھائے آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے۔ (آداب المفرد بخاری)

نگران اگر صاحب استطاعت ہیں تو بقدر طاقت ان بے باپوں پر صرف کریں

۱۹ صاحب جائیداد بے باپوں کے متولی و نگران اگر خود ہی کھاتے پیتے ہوں تو ان کیلئے ان کی جائیداد

فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ

لے سکتا ہے مگر ٹھیک طریقہ پر یعنی بقدر اس کی ضرورت[۲۰] کے۔ پھر جب ایسا ہو کہ ان کا مال ان

کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ بھی قبول نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ بات بھی خلاف اخلاق ہے اور خلاف اخلاق بات کبھی پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ بلند اخلاق اور کردار اس چیز کا نام ہے کہ اگر وہ طاقت رکھتے ہوں ان کو بھی اپنے مال میں کھلائیں پلائیں اور اس طرح خرچ کیا ہوا مال ان کا یقیناً محفوظ ہے اور محفوظ بھی اس بنک میں ہے جس کے منافع کی کوئی حد نہیں؟ اس لئے کہ وہ کسی انسان کا بنک نہیں بلکہ رب العالمین کا بنک ہے جو کبھی بھی بیٹھ نہیں سکتا اور یہ وہ قرض ہے جو قیامت تک بڑھتا ہی رہے گا۔

اس طرح ہدایات جو یتامی کیلئے قرآن کریم نے دی ہیں یہ ایک لحاظ سے عام طور پر تربیت اطفال بھی ہے اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ان یتامی کے ساتھ جو سلوک کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ فی الحقیقت وہی لوگ ہیں جو یتیم ہو چکے ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا سکھایا ہے جو انسان اپنے بچوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ اور اس طرح یہ بات سمجھا دی ہے کہ ایک ولی کا یتیم کے ساتھ جو فرض ہے وہ باپ کا اپنے بیٹے کے ساتھ بطریق اولیٰ فرض ہے۔ اس طرح ہر والد کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی تربیت قول معروف کے ساتھ کرے یعنی اس کو نیکی کی راہیں بھی بتائے اور اس کو معاش پیدا کرنے کے قابل بھی بنائے اور دیکھتا رہے کہ کس قدر ترقی وہ کر رہے ہیں جس طرح ہر انسان اپنے بچوں کے متعلق دیکھتا ہے اور ان کی ترقی اور فلاح و بہبود سے خوش ہوتا ہے۔

اس استطاعت کیلئے جو الفاظ بیان کئے گئے ہیں یعنی "فلیستعفف" وہ بھی قابل غور ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی ہیں کہ بچتا رہے اور اپنے آپ کو روک لے۔ یعنی ان بے ماں باپ بچوں کے حال سے جو کچھ ان کی اپنی تربیت کیلئے خرچ کرتا ہے اس خرچ کا لینا اگرچہ درست اور جائز ہے لیکن اس کے باوجود اس کے لینے سے بچتا رہے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر روک لے اور ان پر خرچ کیا ہوا بھی ان کے مال سے لینے سے درگزر کرے اور یہ سمجھے کہ یہ میرے ہی بچے ہیں اس لئے میں ان پر خرچ کر رہا ہوں اور اپنا خرچ کیا ہوا مال جب اپنے بچوں سے واپس لینے کی خواہش نہیں رکھتا تو ان پر خرچ کیا ہوا مال ان سے واپس کیوں لوں؟ پھر اس قربانی کے جو نتائج نکلیں گے وہ دنیا کی ہر چیز سے یقیناً بہتر نکلیں گے اس کو کہتے ہیں کہ نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال یعنی اس نیکی کا صلہ جس کے ساتھ وہ نیکی کی ہے اس سے طلب نہ کرے۔

نگران اگر محتاج ہے تو بقدر اس کی حاجت کے لے سکتا ہے

[۲۰] فرمایا کہ نگران اگر خود بھی محتاج ہے اور اس کے پاس اتنا مال نہیں کہ اس یتیم کی پرورش کر سکے

إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝٦

کے حوالے کرو تو چاہئے کہ اس پر لوگوں کو گواہ کر لو۔ یاد رکھو محاسبہ کرنے کیلئے اللہ کا محاسبہ بس کرتا ہے۔[۲۱] ۶

تو اس کے مال سے اس قدر لے جو اس پر خرچ کرنے کی غرض سے ہو۔ اس لئے کہ اس کی ایک سے زیادہ صورتیں ہو سکتی ہیں کہ وہ اس کے مال میں سے لینے کے لئے مجبور ہو۔ ظاہر ہے کہ بسبب اپنی محتاجی کے اپنا مال تو اس پر خرچ نہیں کر سکے گا کیونکہ مال اس کے پاس ہے نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یتیم صاحب مال ہونے کی وجہ سے زیادہ خرچ کرنے کا متحمل ہے لیکن کفیل کے پاس کچھ بھی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بھی وہ یتیم ہی کے مال سے اس پر خرچ کرے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفیل اتنا محتاج ہو کہ اس یتیم کی نگرانی اور دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت اس یتیم کے مال سے بھی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اس کو اس کام کا کچھ معاوضہ نہ ملے تو ایسی صورت میں وہ بقدر حق اس مال میں سے لے سکتا ہے لیکن باقاعدہ حساب کتاب کے ساتھ کہ اتنا مال اس کی خوراک، لباس اور دوسری ضروریات زندگی اور تعلیم و تربیت پر خرچ کیا گیا اور اتنی رقم یا فلاں چیز ان سارے کاموں کے سرانجام دینے پر صرف ہوا کیونکہ صرف کرنے والا یعنی نگران خود محتاج ہے اور وہ بلامعاوضہ وقت صرف نہیں کر سکتا تھا اندریں مجبوری یہ رقم اس کے انتظام کرنے کے عوض نگران نے وصول کی کیونکہ یہ بھی حقیقت میں اس یتیم ہی کی ضرورت تھی۔

بلوغت اور رشد آنے کے بعد جب مال کو لوٹانا ہو تو اس پر گواہ مقرر کرنا بھی ضروری ہے

[۲۱] اس حکم سے یہ بات خود بخود نکل آتی ہے کہ کوئی شخص جب کسی یتیم کے مال کا نگران مقرر ہو تو اس وقت جب اس نے نگرانی قبول کی اس یتیم کے سارے مال کا باقاعدہ اندراج کر کے ساری چیزوں کو تحریر کر لینا چاہئے اور پھر جب وہ یتیم اپنی بلوغت اور رشد کو پہنچ جائے اور نگران اس کے مال کو اس کے ہاتھ یعنی قبضہ میں دینے لگے تو باقاعدہ حساب کر کے واپس کرے اور پورے وضاحت کے ساتھ اس کے مال میں جو کچھ ہوا یا اس کے مال کی تجارت کرنے سے جو وصول ہوا اور جتنا اضافہ یا بچت ہوئی باقاعدہ تحریر کر کے اس پر گواہ بھی بنائے اور ان گواہوں کی موجودگی میں اس بالغ ہونے والے اور سن شعور کو پہنچنے والے کو رقم یا جو بھی مال ہے اس کے قبضہ میں دے اور گواہوں سے اس تحریر پر دستخط لے لے اور اس طرح سے بھی اس کی تحویل سے فارغ ہوا۔ تاکہ بات صاف ہو جائے اس طرح وہ دنیا والوں کے روبرو بھی سرخرو ہو اور آخرت میں بھی یہ بات اس کے کام آئے۔ اس بات کو سورہ الانعام میں بھی اس طرح بیان فرمایا کہ :

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الانعام ۶ : ۱۵۲) "اور دیکھو یتیموں کے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ

ماں' باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا زیادہ' لڑکوں کا حصّہ ہے۔ ماں' باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصہ مقرر کیا گیا حصّہ ہے[۲۲]۔ ۷

اور یاد رکھو جب ایسا ہو کہ ترکہ تقسیم کرنے کے وقت رشتے دار' بے باپ اور مساکین

مال کی طرف نہ بڑھو الا یہ کہ اچھے طریقے پر ہو یعنی ان کے فائدہ اور نگہداشت کے لئے اور یہ بھی اس وقت تک کہ یتیم اپنی عمر کو پہنچ جائیں۔" یعنی اس عمر کو کہ وہ اپنے مال کو خود سنبھال کر خرچ کر سکیں اور اس مال پر عمل بھی کر سکیں تاکہ سارا مال ہی ضائع نہ ہو جائے۔

ان بے سہاروں کا سہارا بننے والوں کیلئے نبی اعظم و آخر ﷺ نے کیا فرمایا اس کے متعلق بھی کچھ سن لیں۔ فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۔" پھر دونوں انگلیوں کو کھڑا کر کے سامعین کو دکھایا (ترغیب و ترہیب ج ۲ ص ۱۳۲) آپ ﷺ نے فرمایا "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو اس کی بخشش کے منافی ہو۔" یعنی شرک (ترمذی شریف)

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا "مسلمانوں کا سب سے زیادہ اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور سب سے بدتر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔" (ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۳' ابن ماجہ و آداب المفرد) ان یتیموں اور بے سہارا بچوں کی نسبت سے پورے عالم اسلام کی خیر ہی فرما دی اور وراثت کے متعلق عام اعلان فرما دیا گیا۔

بات یتیموں اور بے سہارا بچوں کی ہو رہی تھی کہ وراثت کی تقسیم کا حکم عام آگیا

۲۲ عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس بات میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف ان مردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والوں کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور ان سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور

فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ دیانتداری اور ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اس لئے اس آیت کے شان نزول یعنی نازل ہونے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری صحابی کا انتقال ہوا اور اس نے پسماندگان میں ایک بیوی اور تین لڑکیاں چھوڑیں۔ کچھ جو میت کے چچا کے بیٹے تھے وہ اٹھے اور اپنے چچا زاد بھائی کے سارے ترکہ پر قبضہ کر لیا متوفی کی بیوی اور اس کی تینوں بچیوں کو کچھ بھی نہ دیا۔ ایسا کیوں کیا؟ اس وجہ سے کہ عربوں کے ہاں اس کا رواج ہی نہ تھا بلکہ وہ کیا کرتے تھے کہ مال صرف اس کو مل سکتا ہے جو دشمنوں سے لڑے اور یہ تینوں تو ویسے ہی بچیاں تھیں اور ان کی والدہ بھی آخر ایک عورت تھی اس لئے ان سب کی پروا نہ کی گئی۔ متوفی کی بیوی جو محروم کر دی گئی تھی آپ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میرے خاوند کا انتقال ہو گیا اس نے تین بیٹیاں چھوڑیں اور میرے پاس اتنا بھی مال نہیں کہ میں ان کو کھانا ہی کھلا سکوں اس لئے کہ میرے پاس بھی اس کے چچا زاد بھائیوں نے کچھ نہیں چھوڑا بلکہ سارا ہی وہ لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے متوفی کے بھائیوں کو طلب کیا جو حقیقی بھائی نہیں تھے بلکہ چچا زاد تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے یہ بات پوچھی جو اس عورت نے عرض کی تھی تو انہوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ اس عورت کی اولاد اس قابل نہیں کہ گھوڑے پر سوار ہو سکے اور نہ ہی وہ کسی طرح کا کوئی بار اٹھا سکتی ہے نہ دشمن سے لڑ سکتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ اس میں اس بات کی پوری وضاحت کر دی گئی اور حکم ہوا "ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکہ میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ لڑکوں کا حصہ ہے اور بالکل اس طرح ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں لڑکیوں کا حصہ بھی ہے اور یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو مقرر فرما کا اعلان کر دیا ہے۔ اب رشتہ داروں کے حقوق مورث کے ورثہ میں مقرر ہو چکے ہیں جن کی وضاحت آگے آرہی ہے۔ ان حصص میں نہ کمی بیشی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی کو بالکل محروم کیا جا سکتا ہے الا یہ کہ قانون خود کسی کو محروم کر دے۔

زیر نظر آیت میں واضح طور پر پانچ احکام بیان کر دیئے گئے

ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ ہاں! ان کے حصص کی صورت کیا ہوگی اس کا حکم آگے آرہا ہے کہ اگرچہ مرد اور عورت برابر ہونے کے حصہ دار نہیں تاہم شریک میراث ضرور ہیں۔

دوم یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہوگی خواہ کتنی ہی کم اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور باقاعدہ حساب کتاب سے ہوگی ایسا نہیں کہ جو جس کے پاس ہے وہ اس کو سنبھال رکھے۔ ہاں! حساب کتاب ہو جانے کے بعد اگر کوئی وارث اپنا حصہ کسی ایک وارث کو دے یا سب کو اپنے حصہ میں شریک کر دے وہ دوسری بات ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وارث دوسرے وارث کا حصہ خرید لے۔

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۞

افراد بھی حاضر ہو جائیں تو چاہئے کہ میت کے مال سے انہیں بھی تھوڑا بہت دے[۲۳] دو اور انہیں اچھے طریقے پر بات کہہ کر سمجھا[۲۴] دو۔ ۸

سوم یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ وراثت کا حکم ہر ایک قسم کے مال پر ہے خواہ وہ نقد ہو سونا چاندی ہو یا املاک ہوں خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ۔ زرعی ہوں یا صنعتی مختصر یہ کہ وہ کسی صنف مال میں شمار ہوں وہ سب قابل تقسیم ہیں۔

چہارم یہ کہ میراث کا حق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ کر انتقال کر جائے۔ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنی زندگی میں جو کچھ وہ دے گا وہ میراث نہیں کہلائے گا۔ عطیہ' ہبہ یا چاہو جو بھی اس کا نام رکھو۔

پنجم یہ کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تو رشتہ دار میراث نہیں پائے گا۔

متوفی کا ترکہ تقسیم ہونے لگے تو ورثا کو کیا کرنا چاہئے؟

۲۳ قانون میں جب حصے مقرر ہوگئے تو اب متوفی کے ورثا وہی قرار پائیں گے جو قرآن کریم نے بیان کر دیئے اور وہی حصہ ان کو ملے گا جو قرآن کریم نے ان کیلئے مقرر کیا بلاشبہ اب قانونی حق دار تو وہی ہوں گے جو ازروئے قرآن کریم وارث قرار پاتے ہیں لیکن متولی کے ذوی الارحام اور خاندانی و انسانی ہمدردی کے عام حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ اس لئے متوفی تو دار فانی سے رخصت ہوگیا اب اس کے صحیح وارثوں کو خطاب کر کے ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر وراثت تقسیم کرتے وقت قرابت مند یتیم اور مسکین یعنی فقیر قسم کے لوگ آموجود ہوں تو ہرچند وراثت میں ان کا کوئی شرعی حق نہ ہے تاہم وہ ڈانٹے ڈپٹے نہ جائیں بلکہ ان کو بھی اس میں کچھ تھوڑا بہت دے دیا جائے تو یہ بھلائی کی بات ہے اور بھلائی ہر حال میں بھلائی ہے۔ آج جس کے ترکہ پر تم بیٹھ گئے ہو کہ اس کو تقسیم کر لیا جائے۔ کل تمہارے ترکہ پر کوئی بیٹھ سکتا ہے۔ دنیا کا نظام اس طرح چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا جب کہ اللہ نے اس کو باقی رکھنا ٹھہرایا ہے۔ اس ترکہ کے جب تم وارث نہیں قرار پائے تھے تمہارا وقت ہی اس وقت بھی گزرتا تھا اور اب اس ترکہ سے حصہ پانے کے بعد بھی وقت ہی پاس ہوگا۔ اس لئے یہ خیر کا کام ہے اس میں دل کھول کر حصہ لو اور اتفاق رائے سے کچھ اشیاء یا کچھ رقم اور سامان جو مناسب خیال کرو پہلے ان خاندان کے غرباء میں تقسیم کر دو تاکہ یہ بھی تم کو اور مرنے والے کو نیک دعا دے کر رخصت ہوں۔ یہ تو وہ مال ہے جس کے تم مالک نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے مطابق تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اہل قرابت سے تو ویسے بھی کچھ دیتے رہنے کا حکم تم کو دیا گیا ہے اگر مالی کشائش اللہ نے تم کو دی

ہے تو اہل قرابت کا خیال خصوصاً جو ان میں سے کمزور ہیں بہت ضروری ہے چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا :

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (البقرہ ۲ :) "اور مال اللہ کی محبت کیلئے قرابت داروں کو دیا کرو۔" یعنی مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اور صرف اللہ کی رضاجوئی کیلئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد کرو اس لئے کہ ان سے تعاون اور پھر وہ بھی خالص اللہ کی رضا کیلئے ایک بہت بڑی نیکی ہے اور پھر جتنی نیکی بڑی ہوگی اتنا ہی اس کا اجر بھی بڑا ہوگا۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ماں باپ سے بھی نیک سلوک کرو اور ان کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ اور یاد رکھو کہ یہ ان عہد و پیمان میں سے ایک ہے جو انسان سے اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر لئے ہوئے ہے جن کو دنیا کے لوگ اور آج خصوصاً مسلمان بھول ہی چکے ہیں۔ فرمایا وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی اور ماں باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنے کا تم سے عہد لیا گیا ہے۔ پھر سورہ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل و احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل ۱۶ :) "بلاشبہ اللہ تم کو انصاف کرنے اور حسن سلوک سے پیش آنے اور قرابت داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے۔" اس طرح اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِیْنَ (النور ۲۴ : ۲۲) "اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔"

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام ﷺ اپنی ان تمام محنتوں' زحمتوں' تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت' تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا۔ معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب کرتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ۔ یہ تو ایک دوسرے انسان پر فطری حق ہے خواہ کوئی کسی دین و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ آخر میرا بھی یہ فطری حق تو تم پر موجود ہے تم اس کو بھی آخر کیوں بھول گئے ہو۔ فرمایا اور وہ بھی اللہ کے حکم سے اپنی طرف سے نہیں۔ ارشاد ہوا۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (الشوریٰ ۴۲ :) "اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو کہ میں تم سے اس پر کچھ مزدوری طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میری قرابت کا حق تو ادا کرو۔" جو گویا فطری حق ہے۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو "وصل رحم" کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں اس لفظ کی دوسری معروف شکل صلہ رحم یعنی رحم ملانا ہے۔ اور قرابت کے حقوق کو ادا نہ کرنے کو قطع رحم سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ رحم مادری ہی دراصل تعلقات قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصل گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہم سائیگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی اور کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کیلئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے اور اس کا توڑنا انسانی قوت سے باہر ہے اس لئے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ایک حدیث میں نبی رحمت ﷺ نے انسانوں کے اس فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ رحم یعنی جو شکم مادر کے اندر ایک عضو ہے رحمٰن اللہ تعالیٰ کے نام سے مشتق ہے۔ اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا۔ جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔" اس مضمون کو ایک اور استعارہ کے مزید گہرے رنگ میں نبی کریم ﷺ نے اس طرح ادا فرمایا "کہ رحم مادر انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے۔"

ایک اور موقع پر نبی اعظم و آخر ﷺ نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (حدیث کا اصل لفظ حقوہ ہے) کو تھام لیا۔ اللہ نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔ کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے ساتھ ملاؤں جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹ دوں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) گویا رحم مادر اور اس رحمٰن کے رحم و کرم کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔ رحم اور رحمٰن کے اس جوڑ کی طرف ہی اس سورہ النساء کی پہلی آیت میں اشارہ کیا ہے جو پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ ایک شخص نے نبی رحمت ﷺ سے آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا اللہ کی بندگی کرو۔ کسی کو اس کا ساتھی نہ بناؤ۔ نماز مکمل طور پر ادا کرو۔ زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم)

جبیر بن مطعم صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی نہیں کرے گا اللہ اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف

نہ ہو جائے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو لے گا۔ (صحیح بخاری کتاب الاداب)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ صلہ رحمی کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی ہے اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کیلئے اضمحلال' تکدر اور قلبی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ' صلہ رحمی اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں خاندانی مسرت' انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث اس طرح کہ "صلہ رحم سے قرابت والوں میں محبت' مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔" (ترمذی)

حدیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے بلکہ صلہ رحم یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلہ رحم کیا جائے۔ یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔ (بخاری کتاب الاداب من بسط لہ فی الرزق)

وہ قرابت دار جو متوفی کے مال میں وارث نہیں ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ

۲۴ وہ قرابتدار جو مال کی تقسیم کے وقت جو کسی متوفی کے ترکہ کا مال ہو موقع پر پہنچ جائیں اور وہ مستحق بھی ہوں تو ان سے جو سلوک کرو خوش دلی اور پیار و محبت کے ساتھ کرو ایسا نہ کرو کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ دیں وہ تمہاری زبانیں ضائع کر دیں۔ اس دینے سے نہ دینا بہتر ہے۔ مثل ہے کہ تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ آیت کے اس حصہ میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ دیکھو انہیں اچھے طریقے سے بات سمجھا دو اور اپنا مدعا اس طریقہ سے بیان کرو کہ ان کا دل بھی نہ دکھے اور تم بھی جو بات ان تک پہنچانا چاہتے ہو پہنچا لو۔

آپ کی قوت قدسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کے بگڑے ہوئے انسان پلک جھپکنے میں کچھ سے کچھ ہوگئے۔ اللہ جانے کب سے یہ رواج جاری تھا کہ وہ ورثہ صرف ان لوگوں کو ملے جو ملک یا قوم کی حفاظت کر سکتے ہوں اور جو اس قابل نہ ہوں ان کا ورثہ میں کوئی حق ہی تسلیم نہ ہو۔ عورتوں اور بچوں کی حمایت میں کب کسی نے آواز اٹھائی تھی اور ایسی جرات کر بھی کون سکتا تھا؟ لیکن یتیم اور عاجز عورتیں کیا اپنے ہی حامیوں اور اپنے ہی محافظوں کے خلاف آواز اٹھا سکتی تھی؟ مگر آسمان سے ایک آواز آئی اور اس کے سامنے تمام گردنیں

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۹

اور لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائیں تو انہیں ان کی طرف سے کیا کچھ اندیشہ ہو؟ پس چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور ایسی بات کہیں جو درست اور مضبوط

۲۵ ہو۔ ۹

جھک جاتی ہیں۔ ایک بادشاہ جس کی زندگی کا انحصار اس کے سپاہیوں کی بہادری پر۔ ان کے تلوار چلانے پر ہو کیا وہ ان ہی سپاہیوں کے حقوق جو انہوں نے خود ہی تجویز کئے ہوں دوسروں کو دینے کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے؟ لیکن یہ کمال ہے اس نبی اعظم و آخر ﷺ کا کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعلان فرما دیا کہ یہ ان سپاہیوں کا حق نہیں بلکہ ان یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے جو متوفی چھوڑ کر گیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ اعلان کرنا تھا کہ آپ ﷺ کے جاں نثاروں نے اس کو قبول کرتے ہوئے عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ فرمانبرداری اس چیز کا نام ہے۔ یہ نبی اعظم و آخر ﷺ کی قوت قدسی تھی جس نے دنیا میں ایسا انقلاب پیدا کر کے دکھا دیا جس کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا انسان نہیں دکھا سکا۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کے دل پر نازل ہونے والا یہ پیغام آج بھی اسی طرح زندہ و تابندہ ہے اور قابل عمل ہے جیسا کہ نزول کے وقت تھا منسوخ نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے کہہ دیا ہے اور یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں سے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو قابل عمل نہ ہو بلکہ ایسا کہنا ہی قرآن کریم اور قرآن کریم کے نازل کرنے والے رب کریم پر بہتان عظیم ہے۔

متوفی کے ورثاء کیلئے ایک مزید تنبیہ کہ جو آج بیجو گے کل وہی کاٹو گے

۲۵ فرمایا کسی حق دار کے حق میں ناانصافی کرنے والے لوگوں کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس طرح ہم ہی میں سے ایک آدمی کے ترکہ کا معاملہ درپیش ہے اس طرح کل ہمارا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس قانون کے تحت بھی کبھی انہوں نے سوچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ یہ بات ذہن نشین رکھیں تو کبھی کسی کے حق میں زیادتی کا سوچ بھی نہ سکیں۔ ہاں! ہاں! لوگوں کو اس بات سے ڈرنا ہی چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائے تو انہیں ان کی طرف سے کیا کچھ اندیشہ لاحق ہوتا؟ ایسا ہی دوسروں کیلئے بھی سمجھیں اور چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور ایسی بات کہیں جو صاف اور سیدھی ہو۔ اصل میں یہاں الفاظ ہیں "قولًا سدیدًا"۔ سدید سد سے ہے جس کے معنی ہیں کسی اختلال کو بند کر دینا یا روک دینا۔ قول سدید اس بات کو کہتے ہیں جو صحیح موقعہ پر پہنچنے والی ہو وہ ایک طرف اختلال کو روکتی ہے اور دوسری طرف قصد کو حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ
فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي ع ۱۰ ۱۲

جو لوگ یتیموں کا مال نا انصافی سے خوردبرد کر لیتے ہیں تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے بھر رہے ہیں اور قریب ہے کہ دوزخ میں جھونکے جائیں۔ ۱۰ ۲۶

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کیلئے دو لڑکیوں کے برابر

ایسی بات کرو جس کو کہی جا رہی ہے وہ محسوس بھی نہ کرے اور جو تمہارا مقصد ہے اس بات کو کہنے کا وہ بھی پورا ہو جائے۔ اس کو کہتے ہیں کہ "سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی بچے۔"

اس لئے یہاں ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائیں تو انہیں ان کی طرف سے کیسا کچھ اندیشہ ہو؟ پس چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور ایسی بات کہیں جو درست ہونے کے ساتھ مضبوط بھی ہو۔" دین اسلام کی یہ وہ ہدایات ہیں جن کے مطابق زندگی گزار کر انسان صحیح معنوں میں دنیا ہی میں جنت کا پرتو حاصل کر سکتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں میں ایسے اصول بتا دیئے ہیں کہ ان کے مطابق عمل کرنے سے انسان صحیح انسان کہلا سکتا ہے لیکن افسوس کہ آج ہم نے ان باتوں کو بالکل بھلا دیا ہے۔ (تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ ۲ : ۲۶۶)

بے سہاروں اور بے باپوں کا مال کھانے والے اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں

۲۶ محتاج محتاج ہی ہے خواہ کوئی ہو۔ لیکن جن کا دنیا میں کوئی سہارا ہی نہ ہو جیسے بچے کیلئے والدین قانون فطرت میں ایک بہت بڑا سہارا ہیں اور جو بے باپ ہوں آخر ان کا سہارا کون ہوگا؟ اور ایسے بے سہاروں کا مال کھا جانے والے انسانوں کی فہرست میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟ انسان کے تو معنی ہی انس و محبت ہیں پھر جس میں انس و محبت نہ رہا وہ انسان کاہے کا ہوا؟ ہاں! ایسے بھی بہت ہیں جن کے ڈھانچے تو انسانوں کے سے ہیں لیکن انسانیت نام کی شے فی الواقع ان میں نہیں ہے اور وہ وہی ہیں جو مال جمع کرنے کی ہوس میں نہ محتاج دیکھتے ہیں نہ مسکین کی پروا کرتے ہیں اور نہ یتیم اور بے سہاروں کا کوئی درد ان کے سینے میں ہے۔ ان کا کام کھانا ہے اور حلال و حرام کی تمیز ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ صرف ایک ہی کام کیلئے دنیا میں آئے ہیں کہ مال جمع کریں اور پھر اس کو بار بار گنتے رہیں چنانچہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (الھمزہ ۱۰۴ : ۲) "وہ وہی ہے جس نے مال جمع کیا اور پھر اس کو گن گن کر رکھا۔" کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ مرنے پر اس کو یقین ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں شاید یہی ہے کہ وہ خود اور اس کا یہ

مال کبھی ختم نہیں ہوں گے یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (الھمزۃ ۱۰۴ : ۳) "وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔"

گویا مال نے اس کو ایسا اکھڑ بنا دیا ہے کہ اس کا کام لوگوں کی تحقیر و تذلیل اور غرباء و مساکین کے ساتھ زیادتی ہے اور مال کو گن گن کر رکھنے سے اس کی ہوس مزید بڑھتی ہی چلی جاتی ہے حتی کہ وہ کسی ضابطہ حیات کا پابند نہیں رہنا چاہتا وہ اپنی خواہش کا بندہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو حیات جاوداں بخش دے گا اور دولت کے نشہ میں وہ اس قدر چور ہو چکا ہے کہ اس کو اپنی موت تک یاد نہیں رہی اس کے خیال میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ ایک وقت ایسا بھی آنا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔

ایسا مادہ پرستانہ نظریہ حیات جو نزول قرآن کے وقت تھا اب بھی ہے۔ اب بھی ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو اس دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز ملے تو وہ پھول جاتے ہیں اور ڈینگیں مارتے ہیں کہ اس مال و دولت اور اقتدار نے ہمیں عزت دار بنا دیا اور اگر یہ سب کچھ نہ ملے تو اس وقت کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں ذلیل کر دیا۔ اس عزت و ذلت کا معیار ان کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا ملنا یہ نہ ملنا ہے پھر اس پر طرہ یہ کہ ان اقتدار و عزت مل جائے تو یہ ان کا کمال ہے اور اگر کہیں شکست کھا جائیں تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عزت و مال اور اقتدار آئے تو اس کو اللہ کی طرف نسبت کرنی چاہئے تھی اور اگر کوئی کمزوری ہو تو اس کو اپنی طرف نسبت کرنا چاہئے تھا۔ پھر یہ بھی کہ دنیا میں جو کچھ بھی ملتا ہے وہ ایک طرح کی آزمائش ہوتی ہے کیونکہ اللہ نے اگر دولت اور طاقت دی ہے تو وہ امتحان کیلئے دی کہ وہ اسے حاصل کر کے شکر گزار بنتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔ اگر مفلس یا تنگ حال بنایا ہے تو بھی دراصل امتحان ہی ہے کہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی بہ رضا رہتے ہیں اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں یا اخلاق و دیانت کی حدود کو پھاندے جاتے ہیں اور اپنے مالک حقیقی کو کوسنے دینے لگتے ہیں۔

فرمایا کہ مال نے ان کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ وہ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کو کھلانے کی بجائے ان کا مال بھی ہڑپ کر جانے کیلئے ہر وقت بے تاب رہتے ہیں اور ان کا ہاتھ جب پڑ جاتا ہے وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو نگلنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ مال ہے جس کا نتیجہ دوزخ کے دھکتے انگارے ہیں۔ اس طرح وہ جو کچھ بھی اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اپنے مصرف میں لا رہے ہیں اور اپنی تجوریوں میں جمع کر رہے ہیں دراصل وہ دوزخ کی آگ ہے اور وہ وقت عن قریب آنے والا ہے کہ یہی آگ ان کو اور ان کے سارے مال کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے گی۔ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی لیکن پھر کھلی کی کھلی ہی رہ جائیں گی اس لئے کہ اب ان کے اس زیاں کا کوئی مداوا ان سے نہیں ہو سکے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا ان کے اس نقصان کو پورا کرنے والا ہو گا۔

اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً

۴۷ حصہ ہو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ترکے میں ان کا حصہ دو تہائی ہے اور

وراثت کے مال کی تقسیم میں پہلا اصول یہ ہے کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا

۴۷ تقسیم میراث کے معاملہ میں پہلا حکم یا اصول یہ ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے۔ یعنی لڑکی سے لڑکے کا حصہ دوگنا ہوگا۔ گویا یہ ایک کلیہ ارشاد فرما دیا گیا جس نے لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو میراث کا مستحق بنا دیا اور پھر ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا اور یہ اصول بھی معلوم ہو گیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصہ میں جو مال آئے گا اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا مل جائے گا یعنی اگر کسی مورث نے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں چھوڑیں تو مال کے چار حصے کر کے ۲/۴ لڑکے کو اور ۱/۴ ہر لڑکی کو دے دیا جائے گا لیکن اگر یک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوں تو پھر؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کل مال کے پانچ حصے ہوں گے جن میں سے ۲/۵ لڑکے کو اور ۱/۵ ہر لڑکی کو مل جائے گا۔ وقس علی ہذا۔

اندازہ کیجئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا کس قدر انتظام کیا اور کتنا پیارا انداز اختیار فرمایا کہ حکم دیا تو اس حکم کے اندر یہ احتیاط رکھ دی کہ اگر لڑکیوں کو حصہ نہ دیا تو گویا ترکہ تقسیم ہی نہ کیا۔ کیونکہ تقسیم میں لڑکیوں کے حصہ کو اصل و بنیاد ٹھہرایا گیا۔ جیسے اکائی ایک بنیادی چیز ہے اگر اکائی نہ رہے تو حساب چل ہی نہیں سکتا۔ یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ "دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے برابر" بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ "لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دو" جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے یا دیتے ہیں تو جھوٹ موٹ کا۔ وہ کیسے؟ کہ ہم نے تو دیا تھا لیکن انہوں نے معاف کر دیا۔ معاف کیسے کر دیا؟ بادل نخواستہ کہ ملنے کا تو ہے نہیں پھر کیوں بھائیوں سے نہیں بلکہ پورے معاشرے سے برائی مول لیں اور لوگ کہیں گے؟ ایسے ہی شرما شرمی عدالت میں بیان ہو گئے اور قانون کا پیٹ بھر دیا گیا ہاں! اس لئے کہ قانون نافذ کرنے والوں کے پیٹ جو بھر دیئے گئے وزیر مال سے لے کر پٹواری سب نے اپنا اپنا حصہ وصول کر لیا۔ اس طرح وراثت کی تقسیم عنداللہ کوئی تقسیم نہیں اور یہ ظلم عظیم ایسا ظلم ہے کہ اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں بڑے بڑے پڑھے لکھے حاجی، نمازی، اللہ والے، دیندار نہیں بلکہ دین کے ٹھیکہ دار سب اس معاملہ میں برابر چلے جا رہے ہیں اس لئے کوئی شخص کسی کو کچھ کہہ نہیں سکتا اس لئے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے خود سوچیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

اس آیت سے علم فرائض کی ابتداء ہو رہی ہے اس لئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ علم فرائض کیا ہے؟ علم فرائض ان احکام شرعیہ کا نام ہے جن کا تعلق میت کے چھوڑے ہوئے مال سے ہے اور میت کے چھوڑے ہوئے مال پر دوسرے لوگوں کا استحقاق اور ملک ثابت ہو جانے کا نام میراث ہے اور موجودہ رشتہ

داروں کے جو حقوق اور حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں یہی فرائض ہیں۔ علم فرائض نہایت شریف اور قابل قدر علم ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے حاصل کرنے اور تعلیم کرنے کی نہایت تاکید اور اس پر ترغیب بھی فرمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک نہایت فصیح و بلیغ پردرد و رقت آمیز موثر وعظ میں فرمایا کہ اے لوگو! میں تم میں ہمیشہ نہیں ہوں گا۔ فرائض کو سیکھ لو اور یکے بعد دیگرے لوگوں کو سکھاؤ پھر فرمایا کہ یاد رکھو وہ وقت قریب ہے کہ وحی کا دروازہ بند ہو جائے گا اور علم کے معدوم ہونے کا وہ زمانہ آئے گا کہ دو آدمی ایک ضروری مسئلہ میں جھگڑتے ہوں گے اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہ ملے گا اور ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! فرائض کو سیکھو اس لئے کہ وہ نصف علم ہے اور سب سے پہلے جو علم میری امت سے اٹھایا جائے گا وہ علم فرائض ہے۔

غور کیجئے کہ اس "اٹھائے جانے" کے دو ہی مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس علم کا جاننے والا اور پوری سمجھ رکھنے والا کوئی نہ رہے اور دوسرا یہ کہ لوگ اس کے مطابق ورثہ تقسیم کرنا عملاً چھوڑ دیں اور آج یہ دونوں باتیں ہی مسلمانوں میں موجود ہیں۔

ایک بار پھر سوچ لیجئے کہ آج کتنے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ حضرت العلام' علامہ صاحب' مولانا صاحب اور پروفیسر و پرنسپل کے سابقے اور ایم۔ اے اسلامیات۔ ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی کے لاحقے لگتے ہیں لیکن علم سے ایسے کورے ہوتے ہیں جیسے تازہ بھٹی سے نکلا ہوا برتن۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وان مثل العالم الذی لا یعلم الفرائض کمثل البرنس لا راس لہ (جمع الفوائد) "اور وہ عالم جو فرائض نہ جانتا ہو ایسا ہے جیسے بے سر کے ٹوپی" یہ تو بے سر کے ٹوپی کا حال ہے اور جو سر ہی بغیر ٹوپی ہو اس کیلئے کوئی کیا کہے گا؟ اس لئے تو آج علمائے کرام نے ماشاء اللہ سر سے ٹوپی اتار ہی دی ہے کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

فی زمانا مسلمانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دنیائے فانی کی محبت میں پھنس کر تقسیم وراثت کے شرعی اصولوں پر عمل کرنے سے کلی طور پر گریز کرتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی مجبوری لاحق نہ ہو پھر اگر اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے ہوئے انحراف و گریز کیا تو یہ فسق اور گناہ عظیم کیا لیکن اگر خدانخواستہ قرآنی قانون سے انکار کیا یا اس سے نفرت اور اس کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے یہ نوبت آئی تو یہ صریح کفر ہوا۔ دنیا کے چند روزہ عیش و عشرت کی خاطر آخرت کی دائمی نعمت سے محروم ہو جانا اور عذاب دوزخ کو اختیار کرنا دنیا کے اس حال کے پیش نظر مستقبل کو برباد کر لینا کتنی بڑی حماقت' کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی ہے کسی نے کیا خوب کہا ؎

ارے یہ کیا ظلم کر رہا ہے کہ مرنے والوں پہ مر رہا ہے
جو دم حسینوں کا بھر رہا ہے بلند ذوق نظر نہیں ہے

فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً
فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ

اکیلی ہو تو اس کو آدھا[۲۸] ملے گا اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ میت کے اولاد[۲۹] ہو۔ اگر اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہی

میت کے جب کوئی لڑکا نہ ہو اور لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں یا صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حکم

۲۸ پھر اگر ایسا ہو کہ مرنے والے کے ہاں کوئی لڑکا موجود ہی نہ ہو اور لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان سب لڑکیوں کو ۲/۳ حصہ ملے گا اور باقی ۱/۳ دوسرے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اگر لڑکی صرف ایک ہے اور کوئی اولاد نہیں ہے تو اس لڑکی کو ۱/۲ مل جائے گا اور ۱/۲ دوسرے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اس بات پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ اگر لڑکا ایک ہوا تو وہ پوری جائیداد کا وارث ہو جائے گا بشرطیکہ کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو اگر دوسرے وارث بھی ہوں گے تو ان کا حصہ ادا کر کے باقی سارا مال لڑکا لے جائے گا۔ بلاشبہ قرآن کریم میں "فوق اثنتین" کے الفاظ آئے ہیں کہ اگر لڑکیاں دو سے زائد ہوں تو ان کیلئے ۲/۳ ہو گا لیکن دو کا حکم تو اس سے واضح نہیں ہوتا؟ احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ دو کا حکم بھی دو سے زائد کے اندر موجود ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اس طرح فیصلہ فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ

"جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ باہر نکلے کہ ہمارا گزر سواف میں ایک جگہ سے ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک انصاری عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر سامنے آئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! ﷺ یہ دونوں لڑکیاں میرے شوہر کی ہیں جو آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے اور اس میدان میں شہید ہو گئے تھے۔ ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال پر قابض ہو گیا ہے اور ان کیلئے کچھ باقی نہیں رکھا۔ اس معاملہ میں آپ ﷺ کا کیا حکم ہے؟ اللہ کی قسم اگر ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو گا تو کل کوئی ان کو نکاح میں بھی لینے کیلئے تیار نہیں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ بات سنی اور صرف اتنا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کوئی فیصلہ فرما دے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر جب سورہ النساء کی یہ آیت نازل ہوئی "يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ" الخ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور یعنی لڑکیوں کے اس چچا کو جس نے پوری جائیداد پر قبضہ کر رکھا ہے بلاؤ۔ وہ حاضر ہو گئے تو آپ ﷺ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا ۲/۳ حصہ دو اور ان کی والدہ کو آٹھواں حصہ اور اس کے بعد جو بچے وہ تم خود رکھ لو۔"

چنانچہ اس حدیث کی روشنی میں بے جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو حکم دو سے اوپر کی لڑکیوں کا ہے وہی حکم دو کا ہے کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے دو لڑکیوں کو ۲/۳ دلوا دیا اس طرح دو کا بھی وہی حکم ہوا جو دو سے

اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ

ہوں تو ماں کیلئے تہائی ہے۔ اگر میت کے ایک یا زیادہ بھائی بہنیں بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصّہ

زائد کا ہے ہاں! دو سے زائد خواہ وہ کتنی ہوں گی ان میں یہی حصہ برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔

میت کے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی ہوں تو اس کا حکم

۲۹ اگر مرنے والے کی اولاد یا اولاد در اولاد موجود ہو اور اس کے ساتھ مرنے والے کے ماں باپ یا ماں باپ کے ماں باپ موجود ہوں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکہ کا ۱/۲ حصہ ملے گا اور باقی ۲/۳ دوسرے ورثا میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ذوی الفروض یعنی وہ وارث جن کے حصے قرآن کریم اور احادیث میں مقرر کر دیئے گئے ہیں وہ کل تیرہ اشخاص ہیں (۱) باپ (۲) دادا (۳) اخیافی بھائی یعنی وہ بھائی جو صرف ماں کی طرف سے بھائی ہو یا ہوں (۴) اخیافی بہن یعنی وہ بہن جو صرف ماں کی طرف سے ہو یا ہوں (۵) خاوند (۶) بیوی (۷) بیٹی ہو یا ہوں (۸) پوتی ہو یا ہوں (۹) حقیقی بہن یعنی ماں باپ کی طرف سے جو بہن ہو یا ہوں (۱۰) علاتی بہن یعنی صرف باپ کی طرف سے جو بہن ہو یا ہوں (۱۱) والدہ (۱۲) دادی (۱۳) نانی۔ ان سب کیلئے شریعت میں مقرر و معین کردہ حصے ہیں اور وہ حصے جو قرآن کریم اور احادیث میں معین و مقرر ہیں وہ اس طرح ہیں ۱/۲، ۱/۴، ۱/۸ اور ۲/۳، ۱/۳ اور ۱/۶۔

شش بود فرض مقدر در کتاب عزیز نصف وربع و ثمن باللہ ثلث و ثلثان سدس نیز

شاید آپ کو خیال ہوگا کہ یہ تیرہ اشخاص جن کا اوپر ذکر کیا گیا ان میں بیٹے کا تو کوئی ذکر ہی نہیں وہ کہاں چلا گیا؟ حالانکہ وہ تو سارے رشتوں سے زیادہ قریب اور سارے ورثاء سے زیادہ اہم وارث ہے؟ بالکل وہ سارے وارثوں سے زیادہ اہم وارث ہے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ان سارے ورثاء میں سے جن کا ذکر کیا گیا ہے ان کے حصص مقرر ہیں اور بیٹے کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے۔ اس لئے یہاں ان ہی ورثا کا ذکر ہے جن کے حصص مقرر ہیں اگرچہ وہ حصص کم و بیش ہوتے رہیں۔ ان ورثا میں سے کوئی وارث ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ اکیلا ہو تو مرنے والے کی ساری میراث کا وارث ہو جائے لیکن بیٹا ایک ایسا وارث ہے کہ اگر وہ صرف اکیلا ہو اور دوسرا کوئی وارث بھی موجود نہ ہو تو ساری میراث کا حق دار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کا حصہ مقرر نہیں۔ لیکن اس کے برعکس لڑکی کا حصہ مقرر ہے جو کم و بیش تو ہو سکتا ہے لیکن لڑکی اکیلی بھی ساری میراث کی وارث نہیں ہو سکتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کا حصہ مقرر ہے۔ اب سمجھ میں آگیا کہ ان وارثوں میں لڑکے کا کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟ پھر ان سب حصوں کی مختلف حالتیں ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔

میت کے کوئی اولاد نہ ہو لیکن اس کے ماں باپ موجود ہوں تو ان کا حکم

۳۰ ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث موجود نہ ہو تو ماں کو ۱/۳ ملے گا اور باقی ۲/۳ باپ کو ملے گا

الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ

ہوگا۔ ہاں! یاد رہے کہ میت نے جو کچھ وصیت کر دی ہو یا جو کچھ اس پر قرض رہ گیا ہو اس کی

بشرطیکہ مرنے والے کا کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو۔ لیکن اگر مرنے والے کے بھائی ہوں یا ہو یا بہنیں ہوں یا ہو یا بہنیں اور بھائی ہوں کو ہر حال میں ماں کو ۱/۶ ہی ملے گا اور باقی ماں کے حصہ میں سے جو ۱/۶ واپس لیا گیا وہ بھی مرنے والے کے باپ ہی کے حصہ میں چلا جائے گا اور بہن بھائی ایک ہیں یا زیادہ سب محروم ہوں گے ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ والدین کی موجودگی میں بہن بھائی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس طرح والدین کی گویا تین حالتیں ذکر کر دی گئیں۔ اول یہ کہ ماں اور باپ دونوں زندہ ہوں اور مرنے والے کی اولاد بھی ہو ایک یا ایک سے زیادہ خواہ کتنی اس حالت میں ماں اور باپ دونوں کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی حصہ دوسرے ورثا میں تقسیم ہو جائے گا یعنی اولاد اور بیوی یا شوہر لے لیں گے اور بعض حالتوں میں اگر پھر بھی کچھ بچ گیا تو وہ پھر والد کو مل جائے گا جو اس کے مقررہ چھٹے حصے سے زائد ہوگا علم فرائض کی اصطلاح میں اس طرح کے حق کو حق تعصیب کہتے ہیں۔

والدین کی دوسری حالت یہ بتاتی ہے کہ مرنے والے کے اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں لیکن ماں باپ موجود ہوں تو اس صورت میں مال موروث کا ۱/۳ ماں کو اور باقی دو تہائی ۲/۳ والد کو مل جائے گا اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ مرنے والے کے ورثہ میں اس کا شوہر یا اس کی بیوی بھی موجود نہ ہو اگر شوہر یا بیوی موجود ہے تو سب سے پہلے ان کا حصہ الگ کیا جائے گا اور باقی ۱/۳ والدہ کو اور ۲/۳ والد کو ملے گا۔

والدین کی تیسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہو لیکن بھائی بہن ہوں جن کی تعداد ایک، دو یا دو سے زیادہ خواہ کتنی ہو صرف بھائی ہوں یا بھائی بہنیں ہوں یا فقط بہنیں ہوں۔ ہر حال میں ماں کو ۱/۶ ملے گا ۱/۳ نہیں ملے گا اور اگر کوئی دوسرا وارث نہیں تو باقی ۵/۶ حصہ باپ کو مل جائے گا۔ اس طرح گویا بھائیوں بہنوں کی موجودگی میں ماں کا حصہ تو کم ہوگیا لیکن بھائی بہن کو کچھ نہیں ملے گا کیونکہ باپ بہ نسبت بھائی بہن کے قریب ہے اس سے جو بچے گا وہ باپ کو مل جائے گا۔ "فرائض" کی اصطلاح میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں اور یہ بہن بھائی جن کی وجہ سے والدہ کا حصہ کم ہو گیا ہے خواہ مرنے والے کے حقیقی ہوں۔ خواہ باپ شریک ہوں خواہ ماں شریک ہوں ہر صورت میں ان کی موجودگی میں ماں کا حصہ کم ہو جائے گا یعنی ۱/۶ ہو جائے گا۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ماں باپ کا حصہ کسی صورت بھی ۱/۶ سے کم نہیں ہو سکتا اور ماں باپ کسی صورت میں محروم بھی نہیں ہو سکتے ہاں ماں باپ کا حصہ ۱/۶ سے بڑھ سکتا ہے اور بڑھنے کی صورت میں ماں کو ۱/۳ مل سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں اور باپ بعض اوقات سارا بھی لے سکتا ہے اور بعض اوقات ۱/۶ سے زیادہ بھی لیکن اس زیادتی کی کوئی حد مقرر نہیں حتیٰ کہ وہ سب بھی لے جا سکتا ہے۔ اس طرح گویا والدین کے حصہ کی حالتیں مختلف

وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ

تعمیل اور ادائیگی کے بعد یہ حصے تقسیم ہوں گے[۳۱]۔ دیکھو تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری

صورتوں میں بدلتی رہتی ہیں۔

میراث کے تقسیم کرنے سے پہلے مرنے والے کی وصیت اور قرض ادا کرنا ضروری ہے

۳۱ فرمایا کہ مرنے والے کی میراث تقسیم کرنے سے پہلے شریعت اسلامی کا اصول یہ ہے کہ میت کے مال سے شریعت کے مطابق اس کے کفن و دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں جن میں نہ فضول خرچی ہو اور نہ کنجوسی۔ اس کے بعد اس کے قرض ادا کئے جائیں اگر کوئی ہوں۔ لیکن اگر قرض اتنے ہوں کہ اس کا سارا مال ان میں لگ جائے تو لگ جائے یا اس سے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی اور نہ کوئی وصیت پوری کی جائے گی اور تصور یہ ہوگا کہ مرنے والے نے کوئی مال نہیں چھوڑا اس لئے کہ وہ سب کا سب اس کے قرضوں میں چلا گیا۔ ہاں! اگر قرض کی ادائیگی کے بعد مال بچ رہے یا کوئی قرض موجود ہی نہ ہو تو جو اس نے وصیت کی ہے بشرطیکہ وہ وصیت کسی طرح کی معصیت میں نہ ہو تو جو مال موجود ہے اس کے تیسرے حصے پر اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر جائے تو بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہوگی۔ تہائی مال سے زیادہ میں وصیت کرنا درست ہی نہیں اور اگر کوئی کر دے تو اس کو پورا بھی نہیں کیا جا سکتا اور وارثوں کو محروم کرنے کیلئے پورے مال کی وصیت کر جانا گناہ بھی ہے۔ گویا قرض ادا کرنے کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے باقی شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ تفصیلات اس کی فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں۔

اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کفن وہ ہے جو میت کو شریعت کے مطابق نہلا دھلا کر پہنایا جاتا ہے اور اس کفن سے زیادہ لینا کسی صورت بھی جائز نہیں ہے جیسے کفن کے ساتھ جائے نماز وغیرہ بنانے کا رواج ہے اور اس طرح قبر کے اندر مزید اشیاء کا استعمال خواہ وہ جائے نماز ہو یا صف یا روئی یا کوئی اور چیز۔ یہ سب بدعت ہونے کے علاوہ اس لئے بھی ناجائز ہیں کہ یہ مال شرعی تجہیز و تکفین سے زائد ہونے کی وجہ سے ترکہ میں داخل ہیں جس کے احکام نہایت سخت اور اس میں احتیاط کی نہایت تاکید کی گئی ہے اور اس کی اہمیت اوپر ذکر کر دی گئی ہے۔ اس طرح میت کو ایصال ثواب کیلئے یہ ترکہ میں سے جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں بھی بہت بڑی قباحتیں ہیں کیونکہ مرنے والے کا مال دراصل اس کے مرنے کے ساتھ ہی لاک ہو جاتا ہے وہ کم ہو یا زیادہ۔ پھر اس میں پوری احتیاط کے ساتھ صرف بقدر شرعی تجہیز و تکفین ہی لیا جا سکتا ہے باقی پھر لاک جب تک سارے ورثاء میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم نہ ہو جائے اس کا معمولی حصہ بھی استعمال نہیں ہو سکتا مثلاً اگر یہ لاکھوں اور کروڑوں روپے ہوں تو ان میں سے ایک پیسہ بھی نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ پھر مرنے والے کے ورثاء میں یتیم،

أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن

اولاد بھی ہے۔ تم نہیں جانتے نفع رسانی کے لحاظ سے کونسا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک ہے۔ اللہ نے حصے ٹھہرا دیئے ہیں اور وہ جاننے والا' حکمت رکھنے والا ہے۔[۳۲] ۱۱

تمہاری بیویاں جو کچھ ترکے میں چھوڑ جائیں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ان سے اولاد نہ ہو

مسکین بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے مال میں سے ایک پیسہ بھی ادھر ادھر کرنا حرام بلکہ دوزخ کی آگ کے انگاروں سے کم نہیں ہے اور یہ مال جو مرنے والا چھوڑ گیا ہے کسی حال میں بھی اس کا نہیں بلکہ اس کے ورثاء کا ہے اور ورثاء میں سے کوئی بھی اس کو استعمال نہیں کر سکتا جب تک لاک نہ کھلے اور لاک تب ہی کھلے گا جب اس کی تقسیم ہوگی کیونکہ اسی غرض سے وہ لاک ہوا ہے ورنہ بظاہر اس پر کوئی تالا نہیں پڑ گیا۔ یہ شریعت اسلامی کا تالا ہے اور شریعت ہی کی چابی سے کھل سکتا ہے اگر اس کے بغیر کوئی بھی اس کو کھولے گا تو وہ شرعی مجرم قرار پائے گا ایسے مجرموں کی سزا قرآن کریم نے واضح کر دی ہے۔

وصیت کے متعلق تفصیلی بحث عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۸۰ کے تحت حاشیہ ۳۰۹ میں گزر چکی ہے وہاں سے ملاحظہ فرمالیں۔

دنیا کے سارے نادان دانشمندوں کے سوال کا الٰہی جواب

۳۲ نادان دانشمند کون ہے؟ وہی جو اپنی نادانی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور یہ کوشش صرف اس لئے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دانشمند سمجھتا ہے اور قانون خداوندی کے سامنے جو اپنے آپ کو دانشمند سمجھ کر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ نادان نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر قانون کی خلاف ورزی کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ قانون کو قانون سمجھتے ہوئے اس کے خلاف کرنا اور دوسری یہ کہ کسی قانون کو قانون ہی نہ سمجھنا۔ اس طرح پہلا قانونی چور ہے اور دوسرا قانونی ڈاکو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ چور سے ڈاکو ایسا ہی ہے جیسے بد سے بد تر پھر بد سے بد تر جتنا زیادہ برا ہوتا ہے اتنی ہی اس کی سزا بھی سخت ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ "دیکھو تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی۔ تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کونسا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک تر ہے؟" مطلب واضح ہے کہ اللہ نے جو حصے مقرر کئے ہیں ان میں بڑی حکمتیں ہیں اگر تمہاری رائے پر تقسیم میراث کا قصہ رکھا جاتا تو تقسیم تم لوگ نفع رساں ہونے کو بناتے لیکن نفع رساں کون ہوگا؟ اور پھر سب سے زیادہ نفع کس سے پہنچ سکتا ہے؟ اس کا یقینی علم حاصل کرنا

تمہارے بس کا روگ نہیں ہے؟ اس لئے علم الٰہی میں بجائے نفع و ضرر کے اقربیت کو مدار حکم بنایا ہے۔

لیکن ان نادان دانشمندوں کی اتنی قسمیں ہیں کہ ان کو گنا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ خواہش کے بندے ہیں اور خواہشیں اتنی ہیں کہ ان کا احصا ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ ہر آن بدلتی رہتی ہیں اور جتنی پوری ہوتی ہیں ان سے کئی گنا نئی پیدا ہو جاتی ہیں۔ تاہم ان میں کچھ ایسے ہیں کہ ان کو ان کی نادانی جس کو وہ دانش سمجھتے ہیں مجبور کرتی ہے کہ یہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا حصہ کیوں؟ یہ تو بیگانہ مال ہوتی ہیں پھر ان کو جہیز جو دے دیا جاتا ہے وہ ان کا حصہ ہی ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس طرح یہ اپنی نادانی کے باعث لڑکوں کو اور لڑکیوں کو بیگانہ اور پھر اس نادانی کو دانش سمجھ کر سینکڑوں پاپڑ بیلتے ہیں کہ یہ جائیداد کسی نہ کسی طرح لڑکوں کے نام ہو جائے۔ گویا اللہ نے یہ فیصلہ فرما کر کوئی نہایت ہی نادانی کا حکم دے دیا ہے اور ان دانشمندوں کی دانش اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ غور کرو کہ یہ نادان ہیں یا دانش مند؟ ہیں تو نادان لیکن نادانی کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے میں ان کو نادان دانشمند کہتا ہوں۔ اگر آپ ان کو شمار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ اس ملک میں جتنے چھوٹے بڑے زمیندار ہیں سب اس دانش کے مارے ہوئے ہیں۔ پھر ان میں مذہبی راہنما یعنی زمرۂ علما کے لوگ بھی ہیں پیرو پیشوا بھی ہیں۔ قاضی اور مفتی بھی ہیں۔ گدی نشین اور سجادہ نشین بھی ہیں اور سیاسی لیڈر و راہنما بھی۔

ان نادان دانشمندوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ بیٹا اور پوتا دونوں ایک ہی اصل اور نسب سے ہیں۔ زندگی اور موت اللہ کے قبضے میں ہے۔ جب اس نے یہ اصول نہیں بنایا کہ ہر باپ پہلے مرے اور بیٹا بعد تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ ایک باپ کی موجودگی میں اگر اس کا بیٹا مر گیا تو اس متوفی بیٹے کی اولاد اپنے چچوں اور پھوپھیوں کے ساتھ اپنے دادا کی میراث میں کیوں شریک نہ ہو؟ اس لئے اس قریب کی وجہ سے بعید پر ظلم ہو گیا لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ قریب بعید کو محروم کرتا ہے گویا اللہ نے یہ نادانی کا حکم دیا ہے اور ان دانش مندوں کو دانش اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں لہٰذا قانون میں ترمیم کرو اور پوتے کو بیٹے کا قائم مقام بنا کر جائیداد میں شریک ٹھہراؤ کہ یہی بات دانشمندی کی ہے۔

ان کو کون سمجھائے کہ اے نادان دانشمندو! تمہیں تو صرف ایک پوتے کا غم کھائے جاتا ہے حالانکہ اللہ اور اس کے رسول نے صرف ایک پوتے ہی کا نہیں بلکہ دوسرے کمزور اعزہ و اقرباء کا بندوست پہلے فرما دیا ہے اور جائیداد کو ہاتھ بعد میں لگانے دیا ہے ذرا آنکھیں کھولو اور اللہ کے حکم کو اپنی نادانی کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ یہ ۱/۳ حصہ کی حد تک جو تم کو وصیت کا حکم دیا ہے یہ کیوں دیا ہے؟ یہ وصیت کا قاعدہ اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ قانون وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے نہیں پہنچتا ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہے اس کے یہ اپنے اختیار تمیزی سے حصہ مقرر کر دے مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے یا کسی بیٹے کی بیوی مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے یا کوئی بھائی، بہن، بھاوج، بھتیجا، بھتیجی، بھانجا، بھانجی اور کوئی عزیز ایسا ہے

جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے تو اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے اللہ کے حکم پر حرف گیری کرنے کی بجائے آخر تم انسانیت سیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تم تو مسلمان ہو اور مسلمان تب ہی مسلمان ہوتا ہے جب وہ پہلے انسانیت کو سمجھے اور انسانیت کے دائرہ کے اندر داخل ہو۔ تم عجیب انسان ہو کہ قانون کے ڈنڈے سے بھی گریزاں ہو اور اختیار استعمال کرنے سے بھی الرجک ہو۔ تم صرف ایک پوتے پوتے کا شور مچاتے ہو اور اللہ نے تم کو ایسے سارے غموں کا علاج مرحمت فرمایا ہے اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے تاکہ تمہارے سارے غموں کا مداوا ہو جائے۔ اگر تمہارے اعزہ و اقرباء میں کوئی مستحق نہیں ہے کوئی یتیم پوتا پڑپوتا، دوہتی دوہتا بھی نہیں ہے بھائی اور بہن بھی نہیں ہے تو مستحقین کیلئے کسی راہ عامہ کے کام میں صرف کرنے کیلئے وصیت کی جا سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ آدمی کی کل ملکیت میں سے ۲/۳ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ مقرر فرما دیا جس میں سے شریعت کے نامزد کردہ وارثوں کو مقرر حصہ ملے گا اور ۱/۳ یا اس سے کچھ کم خود اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے حالات کے مطابق مختلف ہوں گے جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے یا بالفاظ دیگر اپنے اختیار تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں تو اس کیلئے یہ چارہ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضامندی سے اس کی اصلاح کر لیں یا شرعی عدالت سے مداخلت کی درخواست کی جائے تاکہ وہ اس وصیت کو درست کر دے۔ اللہ نے کتنی وسعت رکھی تھی لیکن تم نے اس ساری وسعت کو اپنی نادانی کی وجہ سے اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی نہ تعلیم دی تاکہ معاشرہ اسلامی کی تعمیر و ترقی ہو ان کا اللہ کے حکم کو تنقید کا نشانہ بنا کر اللہ کو نادان اور اپنے آپ کو دانش مند ثابت کرنے کی نارواکوشش میں مصروف ہوگئے اور یاد رکھو کہ اس طرح تم کبھی دانشمند نہیں ہو سکتے۔ انسان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا نادان ہوتا ہے اور پھر جو اللہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے وہ دانشمند کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں! اس کیلئے کوئی رعایت ہو سکتی ہے تو صرف اور صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو نادان دانشمند کہہ دیا جائے۔ کیونکہ حقیقت میں وہ نادان ہے اور اپنی نادانی کو تسلیم بھی نہیں کرتا تو یہ جھگڑا ختم کرنے کیلئے ہی اس کو نادان دانشمند ہی کہہ سکتا ہوں۔ فرمایا کہ "اللہ نے حصے ٹھہرا دیئے ہیں اور وہ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔" قرآن کریم کے اس حکم نے بتا دیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے اس میں کسی کو رائے زنی یا کمی بیشی کا حق نہیں اور تمہیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے۔ تمہارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے وہ کس حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس نے جو تقسیم میراث کا حکم دیا ہے وہ بھی ان ٹل اور ان مٹ ہے اور جو وصیت کا حکم فرمایا ہے وہ بھی اس کا

لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ

۳۳ تو تمہارا حصہ آدھا ہے اگر اولاد ہو تو چوتھائی۔ مگر یہ تقسیم اس کے بعد ہوگی کہ جو کچھ وہ وصیت کر گئی ہوں اس کی تعمیل ہو جائے اور جو کچھ ان پر قرض ہو ادا کر دیا ۳۴ جائے اور جو کچھ ترکہ تم چھوڑ جاؤ' تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تم سے اولاد نہ ہو تو بیویوں کا حصہ چوتھائی ہوگا اور اگر اولاد

فیصلہ شدہ ہے۔ یاد رکھو کہ تمہیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہو سکتی اگر تقسیم میراث کا مسئلہ صرف تم ہی پر چھوڑ دیا جاتا تو ضرور تم اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کر پاتے اور میراث کی تقسیم میں ہمیشہ بے اعتدالی رہتی۔ اس نے جتنا حصہ تمہاری صوابدید پر چھوڑا ہے اس کا صحیح استعمال کرو اور جو حصہ خود حکماً طے کر دیا ہے اس کو اس حال پر رکھو اور اپنی نادان دانشمندی کا پیوند اس میں مت لگاؤ۔ اصلاح حال کے سارے پہلوؤں سے باخبر رہو کسی ایک معاملہ میں ہٹ دھرمی سے کام مت لو۔

مرنے والی اگر بیوی ہو تو اس کے ترکہ میں میاں کا حصہ مقرر ہے

۳۳ اس حکم میں شوہر یعنی خاوند کی دو حالتوں کا بیان ہے۔ پہلی حالت یہ ہے کہ اگر زوجہ کا انتقال ہوا اور اس نے کوئی بیٹا' بیٹی' پوتا' پوتی' پڑپوتا' پڑپوتی نیچے تک نہیں چھوڑا خواہ اس خاوند سے جس کے نکاح میں اس نے وفات پائی اور خواہ دوسرے خاوند سے جو موجودہ خاوند سے پہلے اگر ہو پھر اس کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد دوسری جگہ اس نے نکاح کیا ہو اور اس پہلے خاوند سے بھی اس کی اولاد نہ ہو تو اس کے اس موجودہ خاوند کو اس کے ترکہ میں سے ۱/۲ حصہ ملے گا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ زوجہ کا انتقال ہو اور اس نے کوئی بیٹا' پوتا' پوتی' پڑپوتا' پڑپوتی نیچے تک میں کوئی ایک یا زیادہ چھوڑے ہیں خواہ وہ اس خاوند سے ہوں جس کے نکاح میں اس نے وفات پائی یا اس سے قبل دوسرے خاوند سے جو موجودہ خاوند سے پہلے اگر کوئی رہ چکا ہو پھر اس کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد دوسری جگہ اس نے نکاح کیا ہو اور اس پہلے خاوند سے اس کی کوئی اولاد موجود ہو تو اس کے اس موجودہ خاوند کو اس کے ترکہ میں سے ۱/۴ یعنی چوتھائی حصہ ملے گا۔

پہلی صورت میں باقی ۱/۲ اور دوسری صورت باقی ۳/۴ عورت کے دوسرے ورثاء مثلاً مرحومہ کی اولاد' والدین' بھائی' بہن میں حسب قاعدہ جو پہلے ذکر ہوا ہے مال تقسیم ہو جائے گا۔

إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ

ہو تو آٹھواں۔ جو کچھ تم وصیت کر جاؤ اس کی تعمیل اور جو کچھ تم پر قرض رہ گیا ہو اس کی

عورت کا ترکہ بھی اس کے قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد تقسیم ہوگا

۳۴ لیکن اس جگہ بھی میت کے ذمہ کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی کے بعد اور اگر کوئی وصیت ہو تو اس کے ۱/۳ مال کی حد تک اس کو پورا کرنے کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا یعنی خاوند کا مقررہ حصہ بھی اور دوسرے ورثا کے مقرر حصص بھی بعد میں تقسیم ہوں گے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ عورت بھی صاحب مال صاحب جائیداد اور صاحب آمدنی ہوتی ہے جس کا ہمارے معاشرہ میں کوئی تصور ہی نہیں۔ عورت اگر کوئی کمائی کرتی ہے تو وہ سب سے پہلے ان کے گھر والوں کے ہاں! اگر وہ شادی شدہ ہے تو پھر خاوند کے گھر والوں کی ہے اور اگر ایسا نہیں ہو سکا تو پھر خاوند کی۔ ماشاء اللہ۔ کیسا ظلم ہے اور کیا اندھیر کھاتہ ہے؟ عورت کو پہلے تو ورثہ ملتا ہی نہیں اور اگر کہیں کسی کو کچھ مل گیا تو وہ خودبخود ہی اس کے سسرال کا ہوگیا۔ یہ سب صورتیں ایسی ہیں جیسے عورت گویا کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی جانور ہے۔

جس طرح عورت مرد کے مال کی امین و محافظ ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح مرد بھی عورت کے مال کا امین و نگران ہو سکتا ہے۔ مرد پر عورت کے جائز مصارف لازم و ضروری ہیں اور مرد کو ضرورت ہو تو وہ عورت سے لینے کا شرعی مجاز نہیں ہاں! وہ اپنی مرضی سے خاوند کو کچھ دے دے اور وہ لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ عورت مرد سے زیادہ مال دار ہو سکتی ہے۔ عورت اپنے مال میں جائز تصرف کر سکتی ہے۔ عورت اگر صاحب مال ہو تو اس پر اس طرح زکوٰۃ فرض ہے جس طرح مرد پر ہے عورت اپنے مال میں سے اپنی مرضی کے مطابق صدقہ و خیرات کر سکتی ہے۔ جن باتوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عورت کی آزادی دی ہے ہم اس کو ہر ممکن سلب کرنے کی کوشش میں ہیں اور جن باتوں میں اللہ اور اس کے رسول نے عورت کو پابند کیا ہے ان میں ہم عورت کو آزاد رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن معاشرے کی جکڑ بندیاں اتنی سخت ہیں ان سے نکلنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ کیا ہیں ہم؟ اور کیا ہے ہمارا اسلام؟

میاں کے ترکہ سے بیوی کا شرعی حصہ بھی کتاب اللہ میں مقرر کر دیا گیا ہے

۳۵ اس حکم میں بیوی یعنی زوجہ کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے کہ اگر خاوند کا انتقال ہو اور اس کی کوئی اولاد یعنی بیٹا' بیٹی' پوتا' پوتی نیچے تک نہیں ہے اس کی بیوی ایک ہے یا ایک سے زائد لیکن اولاد کسی سے بھی موجود نہیں تو عورت کو وہ ایک ہے یا ایک سے زائد ہر حال میں اس کے ترکہ کا ۱/۴ اس

کو ملے گا یا ان میں برابر تقسیم ہوگا اگر وہ ایک سے زائد ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خاوند کا انتقال ہوا اور اس کے اولاد بھی موجود ہے یعنی بیٹا' بیٹی' پوتا' پوتی نیچے تک برابر برابر حدیں موجود ہیں تو اس کے ترکہ میں سے ۱/۸ عورت یعنی بیوی کو ملے گا اور بیویاں ایک سے زائد ہیں تو بھی ۱/۸ حصہ ہی ان میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ اولاد خواہ ایک بیوی سے ہو یا ایک سے زائد بیویوں سے۔ بیوی کے حصہ مقرر ہیں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔

ہاں! اس جگہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ بیوی ایک ہے یا زائد ان کا حق مہر ادا ہوا ہے یا نہیں۔ اگر ادا نہیں ہوا ایک کا یا سب کا تو وہ بھی پہلے ادا کرنا ہوگا اگر وہ مقرر ہے اور اگر کسی کا ادا ہوا ہے اور کسی کا نہیں تو بھی جس کا ادا نہیں ہوا اس کا ادا کرنا ہوگا اور اس طرح یہ بھی گویا قرض میں داخل۔ پھر قرض کی ادائیگی اور وصیت کے پورا کرنے کے بعد بشرطیکہ وہ وصیت ۱/۳ سے زیادہ کی نہ ہو باقی مال میت کے دوسرے ورثا میں تقسیم ہو جائے گا۔ ان حصص کے مطابق جو مقرر کئے گئے ہیں۔

بیوی کو اگر طلاق دے دی لیکن ابھی عدت پوری نہ ہوئی تھی کہ خاوند وفات پا گیا تو میراث کا حکم؟

جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں وہ خاوند کی میراث سے اپنا حصہ پائے گی۔ اسی طرح اگر خاوند نے مرض الموت میں طلاق دی تو بھی عورت میراث میں سے حصہ لے گی۔ اس میں سب کو اتفاق ہے اختلاف ہے تو وہ اس میں ہے کہ اگر طلاق بائن کی عدت ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ یا اختلاف اس میں ہے کہ اگر عدت پوری ہو جائے لیکن عورت نے نکاح ثانی نہ کیا ہو تو کیا وہ اپنے پہلے خاوند کی وفات کے بعد جس نے طلاق دی تھی اس کی میراث کی وارث ہوگی یا نہیں؟ پھر ان مسائل کی بحث بہت طویل پکڑ گئی جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مطلقہ اگر ابھی عورت طلاق کے اندر ہو کہ خاوند وفات پا جائے تو ایسی مطلقہ خاوند کی جائیداد سے اپنا مقررہ حصہ وصول کرے گی۔ اگر عدت گزر چکی اور رجوع نہیں کیا گیا تو ایسے خاوند کے مرجانے سے وہ خاوند کی میراث سے حصہ نہیں پائے گی اس لئے کہ اب وہ اس کا خاوند نہیں تھا۔

رہا مرض الموت میں طلاق کا مسئلہ تو اس کی تفصیل احادیث کے اس واقعہ سے مل جاتی ہے کہ احمد نے معمر کی روایت سے لکھا ہے کہ غیلان بن سلمہ جب مسلمان ہوئے اس وقت ان کے پاس دس بیویاں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو اور باقی چھ کو طلاق دے دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اب ان کے پاس چار بیویاں تھیں لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو غیلان نے چاروں بیویوں کو طلاق دے دی اور اپنا مال اپنے لڑکوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی تو انہوں نے غیلان کو طلب کیا یا غیلان کے پاس خود گئے اور اس سے فرمایا کہ شاید شیطان نے تجھے کوئی بات بڑھا دی یعنی اس نے تیرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اب تو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا۔ خدا کی قسم! یا تو تو اپنی عورتوں سے مراجعت کر لے اور لڑکوں سے مال واپس لے لے ورنہ ان عورتوں کو میں تیرا وارث بنا دوں گا اور حکم دوں گا جس طرح ابورغال کی قبر پر

مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ

ادائیگی کے بعد[۳۶] اور اگر ایسا ہو کہ کوئی مرد یا عورت ترکہ چھوڑ جائے اور وہ کلالہ[۳۷] ہو اور اس کے بھائی یا بہن ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ بھائی بہن میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہوگا اور اگر ایک

سنگ باری کی گئی اس طرح تیری قبر پر بھی سنگ باری کی جائے گی۔ ابورغال نے دور جاہلیت میں ایک قومی غداری کی تھی اور قوم کو معلوم ہوا تھا کہ اس نے قومی غداری کی اور قوم نے اس کی سزا یہ تجویز کی تھی اور اس سے مطلب اس کی تذلیل تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مطلب تھا کہ تیری یہ حرکت ابورغال کی طرح غداری کی ایک حرکت ہے۔

اور اس حدیث سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلاق رجعی کے بعد مرنے والے خاوند کی میراث سے حصہ اس عورت کو ملے گا اور اس نیت سے طلاق دینا کہ اس طرح عورت اس کی جائیداد میں شریک نہ ہو جائے حرام فعل ہے اس لئے ایسے مرنے والے کی بیوی کو اس کی میراث سے حصہ دیا جائے گا۔

اس طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنی بیوی کو جس کا نام تماظر بنت ابن بن زیاد تھا اور یہ خاندان کلب سے تھی طلاق دے دی اور عدت پوری ہونے نہ پائی تھی کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی مطلقہ بیوی کو حضرت عبدالرحمٰن کا وارث قرار دیا اور یہ فیصلہ کثیر صحابہؓ کی موجودگی میں ہوا اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں عبدالرحمٰن بن عوف پر بدگمانی نہیں کرتا میرا مقصد صرف سنت پر عمل کرنا ہے۔

اس مسئلہ کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ارشادات بھی اس کے موافق بیان کئے ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ خلع کرنے والی عورت کے لئے خاوند کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں اگرچہ وہ خلع کی عدت میں ہو اور خاوند کی وفات ہو جائے۔ کیونکہ اس میں مرد کو رجوع کرنے کا حق نہیں رہا اور رجوع کرنے کا مجاز نہیں۔

ترکہ جس کا بھی تقسیم ہوگا اس کی وصیت اور اس کے قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگا

۳۶ قرآن کریم ایک حکم میراث کے متعلق دیتا ہے اور ساتھ ہی تاکیدی حکم یہ بیان کر دیتا ہے کہ

اس حکم پر عمل درآمد سے پہلے وصیت اور قرض کی ادائیگی لازم ہے۔ احادیث بار بار وصیت کی تاکید کرتی ہیں اور وصیت تیار نہ رکھنے والوں کو سخت وعید بھی سنائی جاتی ہے۔ لیکن علماء کا ایک طبقہ ایسا ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود وصیت کو بیخ دین سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے یعنی آیت تو قرآن کریم میں موجود ہے لیکن اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو پانچ آیتیں منسوخ بتائی ہیں ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جب ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے گئے تو اس لئے اب وصیت کے حکم کو منسوخ ہی سمجھنا ہوگا اور تیسری دلیل ان کی یہ ہے کہ حدیث میں واضح الفاظ موجود ہیں کہ "لا وصیۃ لوارث" یعنی وارث کیلئے وصیت نہیں ہے۔ حالانکہ لا وصیۃ لوارث کے الفاظ سے جن پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے مطلق وصیت کی نفی کیسے نکل آتی جب کے الفاظ یہ بیان کرتے ہیں کہ "وارث کیلئے وصیت نہیں" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب ایک مال میں سے خاص مقرر حصہ ورثاء کے درمیان تقسیم ہونے والا ہے تو پھر وارث کیلئے وصیت کیوں؟ یعنی وصیت تو ان اقرباء و اعزاء کیلئے مناسب ہے جو وراثت میں شریک نہ ہوں یا وراثت سے محروم ہو رہے ہوں حالانکہ مرنے والے کے ساتھ ان کا گہرا رشتہ موجود ہے اور پھر وہ مستحق بھی ہیں کہ ان کو کچھ ملنا چاہئے جیسے اولاد کی موجودگی میں بھائی یا بہن اور بیٹوں بیٹیوں کی موجودگی میں پوتا یا دوہتا علی ہذا القیاس۔

حدیث کے متعلق ایک بہت بڑی غلطی کا ازالہ جو اچھی طرح سمجھنے کی چیز ہے

قرآن کریم کی آیت ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○ (البقرہ ۲ : ۱۸۰)

"مسلمانو! یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہو تو چاہئے کہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے اچھی وصیت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں ان کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔" اس آیت میں قرآن کریم نے والدین اور قریبوں کیلئے وصیت کا حکم دیا اور اس حکم کو لا وصیت لوارث کے الفاظ نے روک دیا تو اس طرح ایک حکم خود اسلام نے دیا اور خود ہی اس سے روک دیا یعنی اس کو منسوخ کر دیا اور پھر دعویٰ یہ کہ اسلام میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے؟

میں تو اکثر یہ کہتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کیلئے عقل کی ضرورت ہے اگر عقل سے کام نہ لیا جائے تو ایسے شبہات ضرور پیدا ہوتے ہیں لیکن عقل سے کام لیا جائے تو سوال کے اندر ہی اس شبہ کا جواب موجود ہوتا ہے۔ اصل اس کی یہ ہے کہ عربوں میں رواج تھا کہ وہ مرتے وقت اپنے عزیز و اقرباء کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں یعنی دوست و احباب کے نام وصیت کر جاتے اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے مرنے کے بعد ان کا مال تقسیم ہو جاتا جس سے بعض اوقات والدین اور قریبی بالکل محروم رہ جاتے یہ گویا ان کا ایک رواج تھا اور اسلام نے ان

کے ہاں جتنے بھی اس طرح کے رواجات موجود تھے ان کو یک دم ختم کرنے کی بجائے بتدریج ختم کیا تاکہ کوئی کام حکمت سے خالی نہ ہو جس کا بعض اوقات فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو جاتا ہے۔ انہی رواجات میں ایک یہ رواج بھی تھا۔ سورہ بقرہ میں اس رواج کو ختم کرنے کا پہلا مرحلہ یہ قائم کیا کہ ان کو ہدایت دی کہ مرتے وقت اپنے والدین اور قریبوں کو "کچھ نہ کچھ" ضرور دو اب وصیت کیا ہوئی؟ یہی کہ ان کو "کچھ نہ کچھ" ضرور دو پھر اس زیر نظر آیت کے تحت جو سورہ نساء میں "کچھ نہ کچھ" ضرور دو کو حکماً نافذ کر دیا کہ ان کو "اتنا اتنا حصہ" مزید دو یعنی "کچھ نہ کچھ" دینے کو ایک متعین مقدار کے ساتھ دینا لازم کر دیا اس طرح گویا وصیت کو ایک طرح کا پکا کر دیا۔ پہلی وصیت یہ تھی کہ ان کو "کچھ نہ کچھ ضرور دو۔" بعد میں یہ وصیت ہوتی کہ ان کو "کچھ نہ دو" تو یہ یقیناً پہلے حکم کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ پہلا حکم عام تھا اور دوسرا حکم عام کی بجائے خاص کر دیا گیا جس سے پہلے حکم کی مزید توضیح ہوئی نہ کہ تنسیخ۔ پہلا حکم ایک طرح کا مبہم تھا اور دوسرا بین اور اس طرح گویا وصیت کا حکم عام بھی قائم رہا اور کچھ لوگوں کیلئے مخصوص بھی ہوگیا کہ یہ اب دینے والے کی مرضی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کو پابند کر دیا گیا کہ اب تیرے پورے مال پر تیرا اختیار نہیں چلے گا اور تیرے سارے رشتہ دار حتیٰ کہ ماں باپ بھی تیری وصیت کے محتاج نہیں ہاں! زیادہ سے زیادہ تیرے حصہ میں تجھے اختیار اب بھی باقی ہے اور ان ورثاء کے علاوہ باقی رشتہ داروں اور عام لوگوں میں وصیت کا حق بھی تیرا محفوظ ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود جانب داری سے کام لینا اب بھی تیرے لئے مفید نہیں ہوگا۔

ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ قرآن کریم نے ایک عام حکم کو خاص ضرور بنایا ہے اور یہ منسوخ نہیں کہلاتا بلکہ وضاحت کہلاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پیغامبر کی ایک حیثیت بھی متعین کر دیتا ہے کہ پیغمبر کوئی باجا نہیں ہے کہ جو آواز اس میں بھر دی گئی اس کے سوا اس سے کچھ نہیں نکلتا بلکہ اس کے اندر جو بات وحی کی گئی اس وحی کی تشریح کا ملکہ بھی اس کے اندر بدرجہ اتم رکھ دیا گیا تاکہ جن کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا گیا وہ اس کی حیثیت کو بھی سمجھیں کہ وہ مختار کل بھی نہیں اور بالکل بے اختیار بھی نہیں اور جو اختیار اس کو دیا گیا ہے وہ اس کے بے جا استعمال بھی نہیں کرتا کہ اس کے اختیار پر کوئی اعتراض کرنا شروع کر دے۔

ناسخ منسوخ کے متعلق تفصیلی بحث عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۰۶ حاشیہ ۲۰۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو میت کے مال میں سے متعین حصہ ملے گا تو پھر دوسرے رشتوں کا حق مار کر ہی ان کو دیا جائے گا۔ جب قانون الٰہی میں ان کا حصہ موجود ہے تو پھر ان پر ہاتھ رکھنا چہ معنی دارد؟ ان لوگوں کی بجائے ان کو کچھ نہ کچھ دے جانا جو عصبات میں شامل ہیں لیکن ذوی الفروض کی وجہ سے وہ محروم ہو رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان سارے رشتہ داروں کا لحاظ فرماتے ہوئے مرنے والے کو ۱/۳ حصہ کی وصیت کا حق عطا فرما دیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس حق کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ رشتہ داروں اور دوسرے مستحقین کا بھی خیال کرو جس مال کو تم چھوڑنے والے ہو اس کی فکر بھی دل میں رکھو یہ مال ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس

وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ

سے زیادہ ہوں تو پھر ایک تہائی میں سب برابر کے شریک ہوں[۳۸] گے لیکن اس وصیت کی تعمیل

کی اشد ضرورت ہے تاکہ تم کو بھی اس کا اجر و ثواب ملتا رہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اجر و ثواب کے ٹھیکہ دار الگ مقرر کر کے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے حق کو غضب کر لیا اور اس طرح قرآن کریم کے احکام کو منسوخ کرنے والوں نے اپنی مہر اس پر ثبت کر کے اپنا حصہ ان سے وصول کر لیا۔

کلالہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس طرح ہے

۳۷ کلالہ کیا ہے؟ کلالہ کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں مشہور تفسیر یہ ہے کہ جس مرنے والے کے اصول اور فروع نہ رہے ہوں وہ کلالہ ہے یعنی وہ بے باپ بھی ہو اور بے ولد بھی بلکہ یہ کہ اوپر تک اس کا کوئی باپ نہ ہو اور نیچے تک اس کی کوئی اولاد بھی نہ ہو وہ کلالہ ہے۔ کلالہ اصل میں مصدر ہے جو کلال کے معنی میں ہے اور کلال کے معنی ہیں تھک جانا جو ضعف و کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے باپ بیٹے والی قرابت کے سوا دوسری قرابت کو کلالہ کہا گیا اس لئے کہ ایسی قرابت باپ بیٹے کی قرابت کی نسبت کمزور ہوتی ہے۔

پھر کلالہ کا اطلاق ہر اس مرنے والے پر کیا گیا جس کی اولاد بھی نہ ہو اور باپ بھی نہ ہو اور اس وارث پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا جس مرنے والے کا ولد اور والد نہ ہو۔ اس طرح اس جگہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ "ذو" مقدر مانا جائے اور کلالہ بمعنی "ذو کلالہ" مانا جائے یعنی ضعیف و کمزور رشتہ والا۔ پھر یہ کہ وہ رشتہ اگرچہ حسب و نسب کے لحاظ سے کمزور نہ ہو لیکن ورثہ پانے کے لحاظ سے کمزور ہو۔ پھر اس مال موروث پر بھی یہ بولا جائے گا جو ایسی میت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی والد اور ولد نہ ہو۔

کلالہ کی میراث تقسیم کرنے کی تفصیل اس طرح ہے

۳۸ ماحصل اس کلام کا یہ ہوا کہ کوئی ایسا شخص وہ مرد ہو یا عورت وفات پا جائے اور اس کے نہ باپ ہو اوپر تک اور نہ اولاد ہو نیچے تک اور اس نے ایک بھائی یا بہن ماں شریک چھوڑے ہوں تو ان میں سے اگر بھائی ہے تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی نہیں بلکہ صرف بہن ہے تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں یعنی دو بھائی یا دو بہنیں یا بھائی بھی اور بہنیں بھی تو یہ سب مل کر مرنے والے کے مال میں ۲/۳ حصے کے مالک ٹھہریں گے اور اس طرح مرنے والے کے مال کا ۲/۳ حصہ ان میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا یعنی مرد اور عورت کا لحاظ رکھ کر تقسیم نہیں ہوگی بلکہ سب برابر کے شریک ہوں گے اور مذکر کو مونث سے دوہرا نہیں ملے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان سب کا تعلق ماں کی وجہ سے ہے باپ کی نسبت سے نہیں اور صحابہ کرام رضوان

فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ

کے بعد جو میت نے کر دی ہو نیز اس قرض کی ادائیگی کے بعد جو میت کے ذمہ رہ گیا ہو۔ بشرطیکہ ' مقصود' نقصان پہنچانا نہ ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ' جاننے والا اور بہت بردبار ہے۔ ۱۲ ۵۳۹

یاد رکھو یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں پس جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے

اللہ علیہم اجمعین سے اس آیت کی تفسیر میں وله اخ او اخت من امه یعنی ایسے مرنے والے کیلئے بھائی یا بہن ہو اس کی ماں کی نسبت سے۔ پھر اس بیان کو اس سے مزید تقویت مل جاتی ہے کہ سورہ النساء کے آخر میں دوبارہ کلالہ کا مسئلہ بیان ہوا ہے جس میں یہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ایسے مرنے والے کی اگر ایک بہن ہو تو اس کو آدھا ملے گا اور اگر دو بہنیں ہوں تو وہ ۲/۳ پائیں گی اور اگر متعدد بہن بھائی ہوں تو مذکر کو مونث سے دوہرا دیا جائے گا وہاں عینی اور علاتی بہن بھائی تسلیم کئے گئے ہیں یعنی جو ماں باپ دونوں سے ہوں یا صرف باپ سے اس لئے اس جگہ اخیافی بہن بھائی تسلیم ہوں گے ورنہ دونوں آیات میں تعارض ہوگا اور تعارض کلام الٰہی میں محال ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس جگہ اخیافی بہن بھائی تسلیم کئے جائیں اور وہی مانے گئے ہیں۔ ہاں! اس کا کوئی مزید حل نکل آئے تو بھی ممکن ہے۔

وصیت کی تاکید پر مزید تاکید تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے

۳۹ زیر نظر آیت میں تین مرتبہ میراث کے حصے بیان کر کے ہر حصے کے بیان کے بعد فرمایا گیا کہ یہ تقسیم وصیت اور دین کے بعد ہوگی پہلے نہیں۔ جس سے ایک تو وصیت کرنے کا تاکیدی حکم نکل آیا اور دوسری یہ بات معلوم ہوگئی کہ وصیت اور دین میراث تقسیم کرنے سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ پھر وصیت کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے خود یہ ارشاد فرما دیا کہ وصیت ۱/۳ حصہ سے زیادہ مال میں نہیں کی جا سکتی اور چوتھی بات حدیث سے یہ واضح ہوگئی کہ وصیت ورثاء کیلئے جو اس وقت مورث کی وراثت میں شریک ہوں ان کو مزید وصیت سے کچھ نہیں دلایا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسی وصیت ہوئی تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔ قرآن کریم میں وصیت کا ذکر پہلے ہے اور قرض کا بعد میں لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی کہ قرض پہلے ادا ہوگا اور وصیت بقیہ مال میں نافذ ہوگی اور وصیت کے بعد جو بچے گا وہ ورثا میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی تشریح اس طرح بیان کی گئی۔ چنانچہ مشکوۃ شریف میں ہے کہ :

انکم تقرءون هذه الاية من بعد وصية توصون بها او دين و ان رسول الله ﷺ قضى بالدين قبل الوصية (مشکوۃ المصابیح بحوالہ ترمذی ۲۶۴) "یعنی آپ لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہیں۔" من بعد وصية توصون بها او دين" اس میں اگرچہ لفظ وصیت مقدم ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کو عمل میں قرض کے بعد رکھا ہے۔" مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو ترتیب بیان ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس ترتیب کے ساتھ اس پر عمل ہوگا بلکہ عمل میں اس ترکیب کا عکس ہے کیونکہ ورثہ کے تقسیم کا پہلے ذکر ہے اس کے بعد وصیت کا اور اس کے بعد قرض کا اور عمل میں سب سے مقدم قرض ہے بعد میں وصیت اور اس کے بعد تقسیم میراث۔ رہی یہ بات کہ ترتیب میں ایسا کیوں کیا گیا تو اس کے بہت سے جواب دیئے جا سکتے ہیں تاہم مختصر یہ ہے کہ دین یعنی قرض ہر میت کیلئے ضروری نہیں کہ اس نے قرض ادا کرنا ہی ہوگا اور اس کے بعد وصیت ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مرنے والے کی نظر میں کوئی ایسا مستحق نہ ہو کہ وہ اس کیلئے وصیت کرے رہی میراث تو وہ ہر حال میں تقسیم ہوگی خواہ کم ہو یا زیادہ اس لئے اس ترتیب کے ساتھ اس کو بیان کرنا ضروری سمجھا گیا کہ اگر دین اور وصیت نہ ہو تو تجہیز و تکفین کے بعد بچا ہوا کل مال وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

ہاں! وارث کے حق میں وصیت کرنا اسلام کی نظر میں باطل ہے اگر کسی نے لڑکے' لڑکی' شوہر یا بیوی کیلئے یا دوسرے کسی ایسے شخص کیلئے وصیت کی جس کو میراث میں مقررہ حصہ ملے گا تو اس وصیت کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا۔ وارثوں کا صرف میراث کا حصہ ملے گا اس سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں۔ اس کے متعلق نبی اعظم و آخر ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا تھا۔

ان الله قد اعطى كل ذى حق حقه فلا وصية لوارث "اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے اس لئے کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت معتبر نہیں ہے۔" (مشکوۃ المصابیح بحوالہ ابوداؤد ص ۲۶۵)

لیکن اگر کسی نے ایسی کوئی وصیت کر دی اپنی لاعلمی کی وجہ سے' کسی وارث کو اتنا مستحق سمجھتے ہوئے کہ وہ اتنا کمزور ہے کہ میری میراث جو حصہ اس کو ملنے والا ہے اس سے اس کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا تو اس کا حکم یہ ہے کہ مرنے والے کے بعد اس کے جتنے وارث ہیں ان کے سامنے وہ بات رکھ دی جائے اور پھر وہ اتفاق رائے سے اس کو منظور کر لیں تو اس کو وصیت کے مطابق دیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس کیلئے خود رسول اللہ ﷺ نے امت کے نام پیغام یہ دیا ہے کہ الا ان يشاء الورثة "مگر ہاں اگر سارے وارث ایسا چاہیں۔" کہ یہ وصیت پوری ہو۔ تفصیل اس کی کتب فقہ اسلامی میں ملے گی۔ مثلاً ہدایہ وغیرہ میں۔

کلالہ کی میراث کا ذکر فرماتے ہوئے جو وصیت اور قرض کی ادائیگی کا ذکر فرمایا گیا اس پر مزید ان الفاظ کا اضافہ ارشاد فرمایا کہ غير مضار یعنی مرنے والے کیلئے وصیت یا دین کے ذریعے وارثوں کو نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی قرض کا فرضی اقرار کر لینا یا اس مقصد کے پیش نظر وصیت کرنا کہ ورثاء کو نقصان پہنچنے کے ارادہ سے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی نے کسی ایسے قرض کی نشاندہی کی ہے تو وہ قرض لے کر کہیں

خرچ کرنے کے متعلق بھی اس نے کہا ہوگا یا اس بات کی شہادت موجود ہوگی کہ مرنے والے نے یہ قرض لے کر کس جگہ خرچ کیا ہے یا کیوں قرض لیا ہے۔ اس کی تفصیل بہت لمبی ہے اور حالات و وقت ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ تحریر میں صرف نشاندہی کی جا سکتی تھی لہٰذا وہ کر دی گئی ہے اور اس میں گویا ہر مرنے والے کیلئے یہ ہدایت ہے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کوئی عمل ایسا مت کرو کہ جس مال و دولت اور جائیداد کو تم چھوڑے جا رہے ہو وہ تمہاری آخرت کی بربادی کا باعث ہو جائے۔

میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ "یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔" یعنی جو کچھ حصے مقرر کئے گئے ہیں اور دین اور وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی ہے کہ اس کو ضرور ادا کر دو جو غلط وصیت سے روکا گیا ہے ان ساری باتوں پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے اور خوب جان لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ایک عظیم وصیت مہتم بالشان کا حکم دیا جا رہا ہے اس کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی نہ کرنا اور اس تنبیہہ پر مزید تنبیہہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ "اللہ جاننے والا اور بہت بردبار ہے۔" اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے ہوئے حصے مقرر فرمائے ہیں۔ جو احکام مذکورہ پر عمل کرے گا اس کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہیں ہوگی اور جو خلاف ورزی کرے گا اس کی یہ خلاف ورزی بھی علم الٰہی میں موجود ہے اس لئے اس کی پاداش میں اس سے مواخذہ کیا جائے گا اور پس ماندگان تمہیں مواخذہ سے بچا نہیں سکیں گے اور یہ کہ پس ماندگان بھی اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرنے والے کو کوئی ایسی ترغیب نہ دیں جس سے اس کے اصل وارثوں کا نقصان ہوتا ہے اس لئے کہ آج وہ مرنے والا ہے اور مر رہا ہے مر جائے گا تو کل تم پر بھی یہ وقت یقیناً آنے والا ہے اللہ حلیم و بردبار ہے اس وقت ایسا کرنے والوں کو سزا نہیں سنا دیتا اور اس طرح کی ڈھیل سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ شاید اس کی کوئی سزا ہی نہیں ہے۔ سزا یقیناً ہے لیکن اس تاخیر کا راز تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ تم میں جس کو مرنا کہتے ہو وہ تمہاری دوسری دنیا کا جینا ہے اور تم جس طرح مرنے پر مجبور ہو بالکل اسی طرح جینے پر بھی مجبور ہو۔ سمجھ لو تو تمہارا اپنا فائدہ ہے اور نہ سمجھو گے تو تمہارا اپنا نقصان۔ اس مسئلہ کی وضاحت احادیث کی روشنی میں بھی اس طرح کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بعض مرد اور عورتیں ساٹھ برس اللہ کی طاعت کا کام کرتے ہیں پھر موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں وارثوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اور اس وجہ سے دوزخ ان کیلئے واجب ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ والی آیت تلاوت کی۔" (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں پانچویں حصہ کی وصیت کروں تو چوتھائی مال کی وصیت کرنے سے زیادہ بہتر ہے اور اگر میں چوتھائی مال کی وصیت کروں تو تہائی مال کی وصیت سے زیادہ بہتر ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح ورثا حقیقی کا کم از کم نقصان ہوگا اور مستحق کو بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ تہائی مال کی

وصیت سے زیادہ تو وصیت کی بھی گئی تو نافذ ہی نہ ہوگی لیکن تہائی مال سے کم وصیت کرنا ہی وصیت کرنے والے کے حق میں مفید ہو سکتا ہے۔

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قانون وراثت کے متعلق ایک خاکہ مرتب کر دیا جائے تاکہ اس پر نظر کرنے سے ایک تو وارثوں کے متعلق کچھ چیزیں ذہن نشین ہو جائیں دوسرے ان کی حالت بلحاظ حصص جو بدلتی ہے اس کی کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ آجائے تیسرے اس باب میں مختلف فیہ مسائل کے متعلق حقیقت آشکار ہو اور چوتھے جلدی میں کئے گئے فیصلوں کا نقصان ذہن نشین ہو اس لئے فیصلے کرتے وقت عقل و فکر سے کام لینے پر زیادہ زور دیا جا سکے اور یہ بات واضح ہو جائے کہ جس طرح جذبات میں کئے گئے قومی فیصلے قوموں کے حق میں نقصان دہ ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جذبات میں کئے گئے انفرادی فیصلے افراد کیلئے بھی مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

مقالہ برائے وراثت

علم فرائض کی فضیلت

علم فرائض نہایت شریف اور قابل قدر علم ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے حاصل کرنے اور تعلیم کرنے کی نہایت تاکید اور اس پر ترغیب فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک فصیح و بلیغ پر درد و رقت آمیز موثر وعظ میں فرمایا کہ اے لوگو! میں تم میں ہمیشہ نہیں رہوں گا۔ فرائض کو سیکھ لو اور (یکے بعد دیگرے) لوگوں کو سکھاؤ۔ وہ وقت قریب ہے کہ وحی کا دروازہ بند ہو جائے گا اور علم کے معدوم ہونے کا وہ زمانہ آئے گا کہ دو آدمی ایک ضروری مسئلہ میں جھگڑتے ہوں گے اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہ ملے گا۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ اے لوگو! فرائض کو سیکھو اس لئے کہ وہ نصف علم ہے اور سب سے پہلے جو علم میری امت سے اٹھا لیا جائے گا وہ علم فرائض ہے۔

علم فرائض کی حقیقت

علم فرائض ان احکام شرعیہ کا نام ہے جن کا تعلق میت کے چھوڑے ہوئے مال سے ہے۔

میت کے چھوڑے ہوئے مال پر دوسرے لوگوں کا استحقاق اور ملک ثابت ہو جانے کا نام میراث ہے اور موجودہ رشتہ داروں کے جو حقوق اور حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں یہی فرائض ہیں۔

جو چیزیں میراث پر مقدم ہیں ان کا بیان

تین چیزیں ایسی ہیں جن کا خرچ تقسیم ترکہ سے مقدم ہے۔ ان پر مال صرف کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اس میں میراث جاری رہے گی اور وارثوں کا حق ہوگا اور اگر میت کا ترکہ انہیں چیزوں کے خرچ میں ختم ہو جائے تو وارثوں کو کچھ نہ ملے گا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں :

(۱) میت کے ترکہ میں سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ لیا جائے مگر یہ کام نہایت سیدھے سادے

شرعی طریقے سے سنت کے مطابق اور میت کی حیثیت کے موافق کیا جائے۔

(۲) جب تجہیز و تکفین کے خرچ سے کچھ مال باقی رہے تو قرض ادا کیا جائے۔ کیونکہ جیسے زندگی میں بدن کا لباس قرض سے مقدم ہے اور قرض خواہ اس کو نہیں لے سکتا اسی طرح بقدر کفن دفن حق میت ہے قرض خواہ کی رعایت سے وہ حق ضائع نہ ہوگا۔

(۳) ادائے قرض کے بعد جو کچھ مال باقی رہے تو اس کے تیسرے حصہ سے اس کی وصیتیں پوری کی جائیں گی اور دو حصوں میں وارثوں کا پورا استحقاق ہے۔

وارثوں کی اقسام

وارثوں کی ترتیب وار آٹھ اقسام ہیں۔

(۱) پہلے ذوی الفروض ہیں۔ یعنی وہ وارث جن کے حصے اور میراث کی مقدار شریعت نے مقرر کر دی ہے۔

(۲) عصبات نسبی (یعنی میت سے نسبی علاقہ رکھنے والے)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے رشتہ میں عورت کا واسطہ اور ذریعہ نہ ہو اور شریعت میں ان کا کچھ حصہ بھی مقرر نہ ہو بلکہ ذوی الفروض کے پورے حصے نکال لینے کے بعد جو کچھ ترکہ باقی رہے ان کو مل جائے اور باقی نہ رہے تو محروم رہ جائیں۔ اگر ذوی الفروض میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو ان کو تمام ترکہ اور کل مال مل جائے گا۔

(فائدہ) عصبات نسبی وہ مرد ہیں جو نسب میں میت کے شریک ہوں (یعنی وہ عورتیں نہ ہوں) اور نسب کا اعتبار شریعت اسلامی میں مرد کی طرف سے ہے۔ لہٰذا عصبات نسبی وہی لوگ ہوں گے کہ ان میں اور میت میں بلاواسطہ عورت علاقہ موجود ہو اور خود بھی مرد ہوں۔ پس چچا اور چچا کا بیٹا عصبہ ہوں گے اور پھوپھی اور چچا کی بیٹی عصبہ نہ ہوں گی اور بھتیجا عصبہ ہوگا اور بھانجا اور نواسہ عصبہ نہ ہوں گے۔

(۳) ذوی الارحام یہ وہ وارث ہیں جن کا حصہ بھی شریعت میں مقرر نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہوں بلکہ میت میں اور ان میں عورت کے علاقہ اور وسیلہ سے رشتہ اور قرابت ہو یا خود عورت ہوں جیسے خالہ، پھوپھی اور بھتیجی۔

(۴) مقرلہٗ بالنسب علی الغیر یعنی وہ آدمی جس کی نسبت میت نے اپنے وارثوں میں داخل ہونے اور اپنے نسب میں شریک ہونے کا اس طرح اقرار کیا ہو کہ اس آدمی کا علاقہ نسب کسی دوسرے شخص سے لگ جائے لیکن اصل نسب والے نے اس کا اقرار نہ کیا ہو اور نہ گواہ ہوں۔ البتہ میت اس کو اپنے وارثوں میں اور نسب میں آخری دم تک داخل جانتا رہا ہو۔ جو شخص اس قسم کے اقرار سے وارثوں میں داخل ہوا ہے اس کو اقرار کرنے والے میت کی میراث مل جائے گی۔ بشرطیکہ مذکورہ بالا چھ اقسام کے وارثوں میں سے کوئی بھی موجود

نہ ہو۔ البتہ اگر میت نے صرف زوجہ یا صرف شوہر چھوڑا ہو اور کوئی وارث کسی قسم کا بالکل نہ ہو تو شوہر یا زوجہ کا حصہ دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ اس مقرلہٗ کو دیا جائے گا۔

مثال مقرلہٗ کی۔ زید ایک مجہول النسب شخص کی نسبت کہتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس شخص کی عمر اس قابل ہے کہ اس کا بھائی ہو سکے یعنی زید کے باپ سے پندرہ بیس برس چھوٹا ہے۔ اب زید کے اس کو بھائی جاننے اور اپنے وارثوں میں داخل کرنے سے یہ لازم آیا کہ یہ شخص اس کے باپ کا بیٹا ہے۔ لیکن زید کے باپ نے اس کی نسبت کبھی اقرار نہیں کیا اور نہ گواہ ہیں کہ یہ شخص زید کے باپ کا بیٹا ہے۔ ایسی صورت میں زید کا اقرار اپنے حق میں صحیح ہوگا اور یہ شخص مقرلہ کہلائے گا اور زید کے وارثوں میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن ذوی الفروض یا عصبہ نہ بن جائے گا بلکہ مقرلہ ہی رہے گا اور اگر کوئی وارث کسی قسم کا موجود نہ ہو تو اس کو میراث پہنچے گی جیسا ابھی ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ مقرلہ زید کے باپ کا بیٹا نہیں بن جائے گا اور زید کے باپ سے اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا کیونکہ زید کو یہ اختیار نہیں کہ باپ وغیرہ کسی دوسرے شخص کے نسب میں کسی کو داخل کرے۔

تنبیہہ اگر کوئی میت کسی شخص کی نسبت یہ اقرار کرے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا میری بیٹی ہے اور اس مذکور کا کوئی نسب مشہور بھی نہیں بلکہ مجہول الشخصیت ہے اور عمر بھی اتنی زیادہ نہیں کہ اقرار کرنے والا اس کا باپ نہ ہو سکے تو یہ نسب ثابت ہو جائے گا اور یہ بیٹا بیٹی حقیقی اولاد کے مانند عصبہ اور ذوی الفروض میں داخل ہو جائیں گے اور پوری طرح بلا تکلف میراث پائیں گے۔

(۵) مولی العتاقہ اور (۶) مولی الموالات ان دونوں کا بیان کتب میراث میں ملے گا۔

(۷) مذکورہ بالا اقسام کے وارث اگر موجود نہ ہوں تو تمام مال اس کو دیا جائے گا جس کیلئے میت نے اپنے تمام مال کی وصیت کی تھی۔

(۸) اگر کسی میت کے فی الحقیقت کوئی وارث اقسام مذکورہ میں سے موجود ہی نہ ہو یا کوئی ہو مگر کسی کو بھی معلوم نہ ہو تو اس کے پس ماندہ اسباب کے تمام مسلمان مستحق ہوں گے جو میت سے اسلامی تعلق رکھنے والے ہیں۔ لیکن اگر تقسیم کیا جائے تو ایک ذرہ بھی کسی کے حصہ میں نہ آئے تو شرعی حکم یہ مقرر ہوا کہ وہ مال بادشاہ اسلام کے خزانہ میں داخل کیا جائے جس کو بیت المال کہتے ہیں۔ وہاں سے وہ ایسے مفید خلائق اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ ہوگا جس سے بلا خصوصیت عام مسلمانوں کو نفع پہنچے۔ مثلاً جہاد کیلئے فوج و لشکر تیار کرنا۔ سرحدوں پر حفاظت کیلئے چھاؤنیاں اور چوکیاں قائم کرنا اور دریاؤں کے پل اور سڑکیں بنانا۔ مدارس و مہمان سرائے پر خرچ کرنا۔

جو چیزیں میراث پانے سے محروم کر دیتی ہیں

میت کا مال بوجہ ایک علاقہ اور تعلق اور رشتہ داری کے خدا تعالیٰ نے اس کو بعد موجودہ وارثوں کو عطا

فرمایا ہے۔ پس اگر کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے تعلق نہ رہے اور ایک قسم کی جدائی اور علیحدگی اور نفرت ثابت ہو جائے تو اس وارث کو میراث نہ ملے گی۔ وہ چار امور ہیں۔

(۱) قتل مورث = اگر بالغ وارث نے اپنے مورث کو ظلماً مار ڈالا تو یہ وارث میراث سے بالکل محروم رہے گا خواہ یہ قتل عمداً واقع ہو (یعنی قتل کرنے کے قصد ہی سے مارا ہو) یا خطاً ایسا ہوگیا (یعنی غلطی سے مارا گیا۔) مثلاً ہرن کو گولی یا تیر مارنا تھا نشانہ خطا کر گیا اور مورث پر جا لگا۔

اگر نابالغ یا مجنوں نے اپنے مورث کو قتل کر دیا تو میراث سے محروم نہ ہوگا کیونکہ نابالغ اور مجنوں کے اکثر افعال شرعاً مستوجب سزا و جزا نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر ظلماً نہیں مارا بلکہ مورث ناحق اس پر حملہ کرتا تھا اس نے اپنے بچاؤ کیلئے اس پر وار کیا اور وہ مورث مرگیا تو یہ وارث میراث سے محروم نہ ہوگا یا مورث پر سزا میں کسی وجہ سے شرعاً قتل واجب ہوا اور بادشاہ یا قاضی کے حکم سے وارث نے قتل کر دیا تو بھی میراث سے محروم نہ ہوگا۔ کیونکہ ان سب صورتوں میں قتل ظلماً نہیں ہے۔

(۲) اختلاف دین = اگر ایک مسلمان ہو اور دوسرا کافر تو یہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکیں گے۔

(۳) غلامی (۴) اختلاف وطن

ذوی الفروض کا بیان

ذوی الفروض (یعنی وہ وارث جن کا حصہ شریعت نے مقرر و معین فرما دیا ہے) تیرہ شخص ہیں (۱) باپ (۲) دادا (۳) اخیافی بھائی (یعنی ماں کی طرف سے جو بھائی ہیں) (۴) اخیافی بہن (یعنی ماں کی طرف سے جو بہنیں ہیں) (۵) شوہر (۶) زوجہ (۷) بیٹی (۸) پوتی (۹) حقیقی بہن (۱۰) علاتی بہن (یعنی باپ کی طرف سے جو بہنیں ہیں) (۱۱) والدہ (۱۲) دادی (۱۳) نانی اور ان کیلئے شریعت میں مقرر و معین کردہ حصے یہ ہیں۔

۱/۲، ۱/۴، ۱/۸ اور ۲/۳، ۱/۳، ۱/۶۔

ذوی الفروض کی مختلف حالتوں کا بیان

باپ کی تین حالتیں ہیں (۱) صرف چھٹا ۱/۶ حصہ ملتا ہے جب کہ میت نے کوئی بیٹا یا بیٹے کی مذکر اولاد یا پوتے کی مذکر اولاد چھوڑی ہو۔

(۲) اگر مرنے والے کے کوئی مذکر (یعنی نرینہ) اولاد کسی درجہ میں بھی نہ ہو بلکہ بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی موجود ہو تو مرنے والے کے باپ کو چھٹا ۱/۶ حصہ بھی ملتا ہے اور تمام ذوی الفروض موجودہ کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہ جائے وہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں باپ ذوی الفروض بھی ہے اور عصبہ بھی ہے۔

(۳) اگر میت کے نہ بیٹی ہے نہ بیٹا نہ بیٹے کی اولاد ہے نہ پوتے کی نہ پڑپوتے کی تو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے وہ سب باپ کو مل جائے گا۔ اس صورت میں باپ کا کوئی حصہ مقرر نہیں۔

دادا کی چار حالتیں ہیں پہلی تین حالتوں میں باپ اور دادے کا حصہ بالکل یکساں ہے۔

(۴) چوتھا حال یہ ہے کہ اگر باپ زندہ ہو تو دادے کو کچھ نہیں ملتا وہ بالکل محروم رہتا ہے۔ کیونکہ باپ کا درجہ قریب ہے اس کی موجودگی میں دادا مستحق نہیں ہو سکتا۔

واضح ہو کہ پڑدادا اور سکڑ دادا کے بھی یہی حصے ہیں اور یہی حال ہے جو دادا میں مذکور ہوا لیکن دادا کے سامنے پڑدادا محروم ہوتا ہے اور پڑدادا کے سامنے سکڑ دادا۔

فائدہ شریعت اور لغت عربی میں دادی کے باپ کو اور دادی کی ماں کے باپ اور دادا کو بھی جد یعنی دادا کہتے ہیں لیکن یہ لوگ ذوی الفروض میں داخل نہیں۔ ذوی الفروض وہی دادے ہیں جن کے رشتہ میں عورت کا واسطہ اثر نہ کرے۔ جیسے باپ کا باپ، دادا کا باپ، پڑدادا کا باپ انہیں لوگوں کو جد صحیح کہتے ہیں اور انہیں کی میراث اور حصہ کا حال اس جگہ بیان ہوا ہے جن دادوں کے رشتہ میں عورت کا واسطہ آئے یا ہے وہ ذوی الارحام میں داخل ہیں اور ان کو جد فاسد کہتے ہیں جیسے باپ کی ماں کا باپ یا دادا کی ماں کا باپ۔

اخیافی بھائیوں اور بہنوں کی تین حالتیں ہیں

(۱) اگر ان میں سے صرف ایک بھائی یا بہن ہو تو میت کے ترکہ کا چھٹا ۱/۶ حصہ پائے گا۔

(۲) اگر دو یا دو سے زائد ہوں خواہ صرف بھائی ہوں یا صرف بہنیں ہوں یا بھائی اور بہنیں دونوں ہوں تو سب کو ایک ثلث ۱/۳ (یعنی میت کے کل ترکہ کا ایک تہائی حصہ) پہنچے گا۔ اسی کو باہم برابر تقسیم کر لیں نہ تعداد کے کمی زیادتی کا فرق ہے نہ عورت مرد کا تفاوت بلکہ ہمیشہ برابر تقسیم ہوگا۔

یہ خصوصیت صرف اخیافی بھائی بہنوں کی ہے کہ مرد و عورت کو برابر حصہ ملتا ہے (یعنی ایک مرد کو دو عورتوں کا حصہ ملتا ہے۔)

(۳) اگر میت کا بیٹا بیٹی یا پوتی یا پڑپوتہ پڑپوتی موجود ہوں تو اس قسم کے بھائی بہن بالکل محروم رہتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اگر میت کا باپ دادا پڑدادا زندہ ہو تب بھی اخیافی بہن بھائی میراث کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

شوہر کی دو حالتیں ہیں (۱) اگر زوجہ کا انتقال ہوا اور اس نے کوئی بیٹا بیٹی پوتا پوتی پڑپوتہ پڑپوتی نہیں چھوڑا تو شوہر کو زوجہ کے ترکہ کا نصف ۱/۲ حصہ ملتا ہے۔

(۲) اگر زوجہ کے کوئی بیٹا بیٹی یا پوتہ پوتی یا پڑپوتہ پڑپوتی موجود ہو تو شوہر کو کل مال میں سے ربع ۱/۴ (یعنی چوتھائی) حصہ پہنچے گا۔

زوجہ کی بھی دو حالتیں ہیں (۱) اگر شوہر کا انتقال ہوا اور اس کے کوئی بیٹا بیٹی پوتہ پوتی، پڑپوتہ پڑپوتی سکڑ پوتہ سکڑ پوتی موجود نہ ہو تو کل ترکہ میں سے زوجہ کو ربع ۱/۴ (یعنی چوتھائی حصہ) دیا جاتا ہے۔

(۲) اگر شوہر کا بیٹا بیٹی یا پوتہ پوتی یا پڑپوتہ پڑپوتی موجود ہو تو زوجہ کو صرف آٹھواں ۱/۸ حصہ ترکہ میں

سے ملتا ہے۔

بیٹی کی تین حالتیں ہیں (۱) اگر صرف ایک بیٹی ہو اور کوئی بیٹا نہ ہو تو میت کے ترکہ میں سے اس کو نصف ۱/۲ حصہ ملتا ہے۔

(۲) اگر دو بیٹیاں ہوں یا دو سے زیادہ ہوں اور کوئی بیٹا نہ ہو تو ان بیٹیوں کو ترکہ میں سے دو ثلث ۲/۳ پہنچے گا۔ اس دو ثلث کو باہم تقسیم کرلیں خواہ کتنی ہی بیٹیاں ہوں دو ثلث میں شریک رہیں گی اور برابر تقسیم کرلیں گی۔

(۳) اگر بیٹیوں کے ساتھ میت کا بیٹا بھی موجود ہو تو اس صورت میں بیٹی کا کوئی حصہ مقرر نہیں۔ بلکہ جس قدر بیٹے کو ملے گا اس سے نصف ہر ایک بیٹی کو ملے گا۔ خواہ ایک بیٹی ہو یا دو چار ہوں۔ اس حالت میں بیٹیاں ذوی الفروض نہیں رہتیں بلکہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بالغیر ہوگئیں۔

پوتی کے حصوں کا بیان عرف میں بیٹے کی دختر کو پوتی کہتے ہیں لیکن یہاں خاص وہی مراد نہیں بلکہ پوتے اور پڑپوتے کی بیٹی کو بھی پوتی کہتے ہیں اور اگر بیٹے کی بیٹی موجود نہ ہو تو پوتے کی بیٹی کو حصے ملتے ہیں اور اگر پوتے کی بیٹی بھی نہ ہو تو پڑپوتے کی بیٹی انہی حصوں کی مستحق ہوگی۔ پوتی کی میراث کی چھ صورتیں ہیں۔

(۱) اگر میت کے بیٹا بیٹی موجود نہ ہو صرف ایک پوتی ہو تو اس کو ترکہ میں سے ۱/۲ نصف ملے گا۔

(۲) اگر میت کے بیٹا بیٹی موجود نہ ہوں صرف دو پوتیاں یا دو سے زیادہ موجود ہوں تو ان کو کل مال میں سے دو تہائی ۲/۳ دیا جائے گا۔

(۳) اگر میت کے بیٹا پوتا پڑپوتہ سکڑپوتہ موجود نہ ہو صرف ایک بیٹی موجود ہو تو پوتیوں کو صرف چھٹا ۱/۶ حصہ ملے گا خواہ ایک پوتی ہو یا زائد۔

(۴) اگر میت کے بیٹا پوتہ پڑپوتہ سکڑپوتہ موجود نہ ہو۔ دو بیٹیاں یا دو سے زیادہ موجود ہوں تو پوتیاں ذوی الفروض سے نہیں بنیں گی۔ (یعنی ان کیلئے کوئی مقرر حصہ نہیں ہے۔)

(۵) اگر میت کے بیٹا بیٹی نہ ہو ایک پوتی یا کئی پوتیاں ہوں اور ان کے ساتھ ایک پوتہ ہو یا پوتی پوتیوں سے نیچے درجہ میں کوئی مرد پڑپوتہ یا سکڑپوتہ موجود ہو تو جو کچھ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد باقی رہے اس کو یہ باہم تقسیم کرلیں۔ مرد کو دہرا اور عورت کا اکہرا دیں۔

فائدہ۔ ان پانچوں صورتوں میں اگر پوتی اور پوتیاں نہ ہوں تو پڑپوتی اور پڑپوتیوں کو یہ حصے ملیں گے اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو سکڑپوتی اور سکڑپوتیاں ان کی جگہ لیں گی اور اسی طرح نیچے چلتے جائیں۔

(۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ اگر میت کے بیٹا موجود ہے تو پوتیاں، پڑپوتیاں، سکڑپوتیاں اور ان سے بھی نیچے کے درجے کی لڑکیاں سب محروم رہیں گی۔

حقیقی ہمشیرہ (یعنی سگی بہن) کی پانچ حالتیں ہیں (۱) اگر میت کے کوئی بیٹی، پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی نہ ہو

اور ایک ہمشیرہ ہو تو اس کو میت کے کل ترکہ میں سے نصف ۱/۲ مال ملے گا۔

(۲) اگر میت کے کوئی بیٹی' پوتی' پڑپوتی' سکڑپوتی نہ ہو اور دو ہمشیرہ ہوں یا زیادہ ہوں تو ان سب کو ترکہ میں سے دو تہائی پہنچے گا اس کو باہم تقسیم کرلیں۔

(۳) اگر میت کے حقیقی بھائی (ایک یا زیادہ ہوں) تو بہن ان کے ساتھ مل کر عصبہ ہو جائے گی اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے اس کو یہ بھائی بہن باہم تقسیم کرلیں۔ ہر ایک بھائی کو دوہرا اور بہن کو اکہرا ملے گا۔

(۴) اگر میت کے بیٹی' پوتی یا پڑپوتی یا سکڑپوتی موجود ہو (خواہ ایک ہو یا زیادہ) تو اس صورت میں ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے وہ میت کی ہمشیرہ کو مل جائے گا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بناؤ۔

(۵) اگر میت کے بیٹا' پوتہ' پڑپوتہ' سکڑپوتہ موجود ہو یا میت کا باپ موجود ہو تو بالاتفاق ہمشیراؤں کو کچھ حصہ نہ ملے گا بالکل محروم رہیں گی۔ اسی طرح اگر میت کے دادا' پڑدادا وغیرہ موجود ہو تو بھی ہمشیراؤں کو کچھ نہ ملے گا۔

علاتی بہن کی آٹھ حالتیں ہیں (یعنی باپ کی طرف سے جو بہنیں ہیں)

(۱) اگر میت کے کوئی بیٹی' پوتی' پڑپوتی' سکڑپوتی اور حقیقی ہمشیرہ نہ ہو اور علاتی بہن صرف ایک ہو تو اس کو میت کے ترکہ میں سے نصف ۱/۲ ملے گا۔

(۲) اگر میت کی کوئی بیٹی' پوتی' پڑپوتی' سکڑپوتی اور حقیقی ہمشیرہ نہ ہو اور علاتی بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کو کل ترکہ میں سے دو تہائی ۲/۳ ملے گا اس کو باہم تقسیم کرلیں۔

(۳) اگر میت کی بیٹی' پوتی' پڑپوتی' سکڑپوتی کوئی موجود نہیں لیکن ایک ہمشیرہ حقیقی موجود ہے تو علاتی بہن کو صرف چھٹا ۱/۶ حصہ ملتا ہے اگر ایک ہوگی تو تنہا چھٹے حصے کی مالک ہو جائے گی اور دو چار علاتی بہنیں ہوں تو اس چھٹے حصے کو باہم برابر تقسیم کرلیں۔

(۴) اگر ہمشیرہ حقیقی دو یا دو سے زیادہ موجود ہوں اور کوئی علاتی بھائی بھی نہیں ہے تو علاتی بہنیں بالکل محروم رہیں گی۔

(۵) اگر میت کی جس طرح علاتی بہنیں موجود ہیں ایسے ہی کوئی علاتی بھائی بھی موجود ہو (خواہ ایک ہو یا چند) تو یہ اپنے علاتی بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ ہو جائیں گی۔ جو کچھ ذوی الفروض سے باقی رہے اس کو یہ بھائی بہن تقسیم کرلیں مردوں کو دہرا عورتوں کو اکہرا۔

(۶) اگر میت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی یا سکڑپوتی موجود ہے (خواہ ایک ہو یا زیادہ) مگر حقیقی بھائی اور حقیقی ہمشیرہ کوئی نہیں تو ذوی الفروض کے پورے حصے دینے کے بعد جو کچھ باقی رہ جائے وہ علاتی بہن کو مل

جائے گا۔

(۷) اگر میت کے بیٹا' پوتہ' پڑپوتہ' سکڑپوتہ موجود ہو یا میت کا باپ موجود ہو تو بالاتفاق بھائیوں اور ہمشیروں کو کچھ حصہ نہیں ملے گا بلکہ محروم رہیں گے۔ اسی طرح اگر میت کے دادا' پڑدادا وغیرہ موجود ہوں تو ان کو کچھ نہ ملے گا۔

(۸) اگر میت کا حقیقی بھائی موجود ہے تو علاتی بہن (بلکہ علاتی بھائی بھی) میراث سے محروم رہیں گے اور ان کو کچھ حق نہ پہنچے گا اور اسی طرح اگر حقیقی بہن عصبہ ہوگئی ہے تو علاتی بہنوں اور بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

ماں کی چار حالتیں ہیں (۱) میت کی ماں کو کل ترکہ کا چھٹا ۱/۶ حصہ ملے گا۔ اگر میت کو بیٹا' بیٹی' پوتہ' پوتی' پڑپوتہ' پڑپوتی' سکڑپوتی موجود ہو یا میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن موجود ہوں۔ بھائی بہن خواہ کسی قسم کے ہوں حقیقی یا علاتی یا اخیافی۔ خواہ صرف بھائی ہوں یا صرف بہنیں یا بھائی بہنیں دونوں ملے ہوئے ہوں۔ خواہ بھائی بہنوں کو میراث سے کچھ ملے یا نہ ملے۔

(۲) اگر مذکورہ بالا وارثوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو میت کی والدہ کو کل مال میں سے تہائی ۱/۳ ملے گا۔

(۳) اگر میت کا انتقال ہوا ہے اور اس کی زوجہ اور باپ دونوں موجود ہیں یا عورت کا انتقال ہوا ہے اور اس کے شوہر اور باپ دونوں موجود ہیں تو شوہر یا زوجہ کا حصہ شرعی مقرر شدہ نکال لینے کے بعد جو مال باقی رہے اس میں سے ایک تہائی والدہ کا حصہ ہے۔

جدہ یعنی دادی اور نانی کی میراث کا حال فائدہ نمبر۱ : عربی میں دادی اور نانی دونوں کو جدہ کہتے ہیں اس لئے شریعت میں ان دونوں کی میراث کا حال بالکل یکساں اور دونوں کا ایک ہی حصہ ہے۔

فائدہ نمبر۲ : دادی سے صرف باپ کی ماں مراد نہیں۔ بلکہ دادا کی ماں اور دادی کی ماں (یعنی باپ کی نانی) اور پڑدادا کی ماں اور پڑدادی کی ماں وغیرہ کو بھی شرعاً دادی اور جدہ کہتے ہیں اور یہ سب ذوی الفروض میں داخل ہیں۔ اس وجہ سے ایک شخص کے کئی کئی دادیاں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے دادا کی ماں (یعنی پڑدادی) بھی موجود ہو اور دادی کی ماں بھی اور دادی کی نانی بھی زندہ ہو۔ اسی طرح کئی پشت تک سلسلہ چل سکتا ہے۔ اگر ہم چار پشت تک شمار کرنے لگیں تو ہر ایک شخص کی پندرہ دادیاں نکل سکتی ہیں اور اگر اس سے زیادہ اوپر تک پشتوں میں شمار کریں تو تعداد بہت بڑھ جائے۔

جس طرح دادی سے صرف باپ کی ماں مراد نہ تھی' نانی سے بھی صرف ماں کی ماں مراد نہیں بلکہ ماں کی نانی اور نانی کی نانی بھی عربی میں جدہ کہلاتی ہے اور ذوی الفروض وارثوں میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ایک شخص کی چند نانیاں ہو سکتی ہیں مثلاً میت کی ماں کی ماں بھی موجود ہو اور ماں کی نانی بھی۔ اس طرح اگر چار

پشت تک شمار کریں تو ہر شخص کی پندرہ نانیاں ہو سکتی ہیں اور اگر اوپر تک زیادہ پشتوں کی نانیوں کا حساب لگائیں تو بڑھتی چلی جائیں گی۔

لیکن ان سب دادیوں اور نانیوں کی میراث پانے اور حصہ کی مستحق ہونے میں دو قاعدوں کا لحاظ ضروری ہے۔

قاعدہ نمبر ۱ : دادیاں اور نانیاں دو قسم کی ہیں صحیحہ اور فاسدہ۔ فاسدہ دادیاں اور فاسدہ نانیاں ذوی الفروض میں داخل نہیں بلکہ ذوی الارحام میں داخل ہیں۔

صحیح دادی وہ ہے جس کی میت کے ساتھ قرابت فاسد دادے کے واسطے سے نہ ہو جیسے باپ کی ماں' دادے کی ماں' پڑدادے کی ماں وغیرہ۔

صحیح نانیاں وہ ہیں جن کے رشتہ میں مرد کا علاقہ درمیان میں نہ ہو مثلاً ماں کی ماں' نانی کی ماں' پڑنانی کی ماں وغیرہ۔

پس فاسد دادیاں وہ ہیں جن کی میت کے ساتھ قرابت فاسد دادے کے واسطے سے ہو جیسے باپ کی ماں کے باپ کی ماں اور دادی کی ماں کے باپ کی ماں اور پڑدادا کی ماں کے باپ کی ماں وغیرہ۔

فاسدہ نانیاں وہ ہیں جن کے رشتہ میں مرد کا علاقہ درمیان میں ہو جیسے ماں کے باپ کی ماں یا ماں کے دادا کی ماں وغیرہ۔

قاعدہ نمبر ۲ : اگر قریب درجہ کی دادی اور نانی موجود ہو تو بعید درجہ کی دادی اور نانی کو بالکل حصہ نہیں ملتا۔ مثلاً باپ کی ماں زندہ ہو تو دادا کی ماں کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر باپ کی ماں مرگئی ہو تو دادا کی ماں کو ملے گا اور پڑدادا کی ماں کو کچھ نہیں ملے گا۔

اسی طرح اول پشت کی نانی موجود ہے تو دوسری اور تیسری اور چوتھی پشت کی نانیاں بالکل محروم رہیں گی اور اگر پہلی پشت کی نانی مرگئی ہو تو دوسری پشت کی نانی جو زندہ ہے وہ حصہ پائے گی۔ لیکن تیسرے اور چوتھے درجہ والی نانیاں اگر زندہ ہوں گی تو محروم رہیں گی کیونکہ ان سے قریب والی زندہ اور موجود ہے۔

دادی اور نانی کی چھ حالتیں ہیں

(۱) میت کے ترکہ کا صرف چھٹا ۱/۶ حصہ ملتا ہے خواہ ایک دادی ہو یا ایک نانی ہو یا دو تین دادیاں یا نانیاں ہوں یا کچھ دادیاں اور کچھ نانیاں ہوں بشرطیکہ سب ایک ہی درجہ (ایک ہی پشت) کی ہوں۔ ورنہ قریب کے سامنے بعید کو کچھ نہیں ملتا۔ مثلاً دادی دوسری پشت کی ہے اور نانی تیسری اور چوتھی پشت کی ہے تو یہ دادی کے ساتھ شریک نہ ہوں گی اور اسی طرح نانی دوسری پشت کی ہے اور دادی تیسری یا چوتھی پشت کی تو دادی محروم رہے گی۔ کیونکہ دادیوں اور نانیوں میں جو قریب ہوتی ہے وہ حصہ پاتی ہے اور جو بعید ہوتی ہے وہ محروم رہتی ہے۔

(۲) اگر میت کی ماں موجود ہو تو تمام دادیاں اور نانیاں بالکل محروم رہتی ہیں۔

(۳) اگر میت کا باپ موجود ہو تو تمام دادیاں بالکل محروم رہتی ہیں (نہ نانیاں)۔

(۴) اگر میت کے دادا موجود ہو تو بھی صرف دادیاں محروم رہتی ہیں لیکن باپ کی ماں اور باپ کی نانی اور باپ کی ماں کی نانی اور باپ کی نانی کی نانی وغیرہ دادا کے سامنے محروم نہیں رہتیں کیونکہ میت کے ساتھ ان کی قرابت دادا کے واسطے سے نہیں ہے۔

(۵) قریب درجہ کی دادیاں اور نانیاں بعید درجہ کی دادیوں اور نانیوں کو محروم کر دیتی ہیں خواہ قریب درجہ کی نانیاں اور دادیاں وارث ہوں یا محروم ہوں۔

(۶) اگر کوئی دادی یا نانی ایسی ہو کہ وہ میت سے دوہرا رشتہ اور قرابت رکھتی ہو اور اسی درجہ اور اسی پشت کی کوئی دادی یا نانی صرف اکہرا رشتہ رکھتی ہو تو اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

عصبات کا بیان

عصبات نسبیہ کی تین قسمیں ہیں

(۱) = عصبہ بنفسہ (۲) = عصبہ بغیرہ (۳) = عصبہ مع غیرہ

عصبہ بنفسہ وہ ہے جو مرد ہو اور اس کی میت کے ساتھ قرابت کسی عورت کے واسطے سے نہ ہو اور ان کے چار درجے ہیں۔

(۱) میت کا جزء (یعنی اس کی نسل) جیسے بیٹا' پوتہ' پڑپوتہ' سکڑپوتہ اسی طرح نیچے تک سلسلہ چل سکتا ہے۔

(۲) میت کے اصل جیسے باپ' دادا' پردادا' سکڑدادا اسی طرح اوپر تک سلسلہ چل سکتا ہے۔

(۳) باپ کا جزء (یعنی باپ کی نسل) بھائی' بھتیجہ' بھتیجے کا بیٹا (یعنی بھائی کا پوتہ) بھتیجے کا پوتہ۔ اسی طرح باپ کی نسل میں سلسلہ نیچے چلا جائے۔

(۴) دادا کے جزء (دادا کی نسل) اور پھر ان کی اولاد در اولاد جیسے چچا' چچا کا بیٹا' چچا کا پوتہ' چچا کا پڑپوتہ۔

پھر عصبات بنفسہ کے ان چار درجوں میں تین امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) عصبہ بنفسہ کے ان چار درجوں میں سے جب اول درجہ کے عصبات موجود ہوتے ہیں تو دوم' سوم اور چہارم درجہ کے عصبوں کو کچھ نہیں ملتا اور درجہ دوم کی موجودگی میں درجہ سوم اور چہارم محروم رہیں گے اور درجہ سوم کے سامنے درجہ چہارم محروم ہو جائیں گے جیسے درجہ اول کے عصبات میں سے اگر کوئی ذرا سا بچہ بھی موجود ہو تو دادا عصبہ نہ رہے گا اور دادا کی موجودگی میں بھتیجے کو کچھ نہیں ملے گا اور بھتیجے کی موجودگی میں دادا کی اولاد محروم رہے گی اور جب پہلے تین درجوں میں سے کوئی نہ ہوگا تب جا کر دادا کی اولاد وارث بنے گی۔

(۲) اوپر کی طرح ہر ایک درجہ کے وارثوں میں بھی باہم فرق ہے جو ان میں سے زیادہ قریب ہوگا وہی حقدار ہوگا۔ جو لوگ بنسبت اس کے بعید ہوں گے وہ محروم رہ جائیں گے۔ مثلاً ایک شخص کے بیٹا بھی موجود ہے پوتہ بھی تو بیٹا چونکہ سب سے قریب ہے سب مال وہی لے گا۔ پوتہ پڑپوتے محروم رہ جائیں گے۔

(۳) ہر ایک درجہ کے وارثوں میں میت کے برابر قریب ہونے کے باوجود قوت قرابت سے ترجیح دی جائے گی (یعنی دو قرابت والا ایک قرابت والے سے مقدم ہے خواہ مرد ہو یا عورت) جیسے جب حقیقی بھائی موجود ہو تو علاتی بھائی اور علاتی بہنیں محروم رہیں گے۔ اور جب حقیقی بہن میت کی بیٹی کے ساتھ عصبہ ہو علاتی بھائی سے اولیٰ ہے اور حقیقی بھائی کا بیٹا علاتی بھائی کے بیٹے سے اولیٰ ہے اور اسی طرح میت کے چچوں پھر میت کے باپ کے چچوں پھر میت کے دادا کے چچوں میں حکم کیا جائے گا۔

عصبہ بغیرہ چار عورتیں ہیں جو ذوی الفروض میں سے ہیں اور ان کو ۱/۲ اور ۲/۳ مال ملتا ہے لیکن اپنے بھائیوں کے ساتھ آنے کی وجہ سے عصبہ بن جاتی ہیں۔ ان کا بیان ذوی الفروض میں گزر چکا ہے وہ چار عورتیں یہ ہیں (۱) ایک بیٹی یا ایک سے زیادہ (۲) ایک پوتی یا ایک سے زیادہ (۳) حقیقی بہن (۴) علاتی بہن۔

فائدہ : یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ عورتوں میں سے جو ذوی الفرائض سے نہیں ہے اور اس کا بھائی عصبہ ہے وہ عورت اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ نہیں بنتی جیسے چچا اور پھوپھی۔ کل مال چچا کیلئے ہے نہ پھوپھی کیلئے۔

عصبہ مع غیرہ وہ عورت ہے جو دوسری عورت کے ساتھ مل کر عصبہ بن جائے۔ جیسے بہن بیٹی کے ساتھ عصبہ ہوتی ہے۔ اس کا بیان بھی ذوی الفروض میں گزر چکا ہے۔

باب الحجب (گزشتہ اسباق کا اعادہ)

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس میں تھوڑا فکر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بعض وارث ایسے ہیں جن کو ہر حالت میں کچھ نہ کچھ میراث سے حصہ ملتا ہے۔ ایسے وارث چھ ہیں۔ (۱) بیٹا (۲) باپ (۳) شوہر (۴) بیوی (۵) بیٹی (۶) ماں۔

اور بعض وارث ایسے ہیں جن کو دوسرے وارث کی وجہ سے کم حصہ ملتا ہے اگر وہ وارث نہ ہوتا تو ان کو زیادہ ملتا۔ ایسے وارث پانچ ہیں (۱) شوہر (۲) بیوی (۳) ماں (۴) پوتی (۵) علاتی بہن۔

اور بعض وارث ایسے ہیں جو ایک حال میں وارث ہوتے ہیں اور دوسرے حال میں ان کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ان کا ایک حال میں وارث ہونا اور دوسرے حال میں محروم ہونا دو قاعدوں پر مبنی ہے۔

پہلا قاعدہ : یہ ہے کہ ہر وہ شخص کہ جس کا نسب میت کی طرف کسی شخص کے واسطے پہنچتا ہے تو وہ آدمی اس شخص کے موجود ہوتے ہوئے وارث نہ ہوگا بجز اخیافی بھائی بہنوں کے۔ وہ ماں کے موجود ہوتے ہوئے بھی میت کے وارث بنتے ہیں۔ کیونکہ ماں کسی بھی حالت میں میت کے پورے مال کی حقدار نہیں بن

سکتی۔

دوسرا قاعدہ : یہ ہے کہ جب تک اوپر کے درجہ والے موجود ہوں گے نیچے درجہ والے محروم رہیں گے (یعنی) قریب تر وارث بعید تر وارث کو میراث سے روک دیتا ہے۔

اب یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ وہ وارث جو دوسرے وارث کی موجودگی کی وجہ سے میراث سے محروم ہو جاتا ہے کیا وہ دوسرے وارث کو کچھ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جیسے ایک شخص فوت ہوگیا اور اس نے اپنا باپ اور ماں اور دو بھائی چھوڑے تو دونوں بھائیوں کو باپ کی وجہ سے کچھ بھی نہیں ملے گا لیکن وہ ماں کا حصہ تہائی حصہ ۱/۳ سے کم کر کے چھٹا حصہ ۱/۶ کر دیں گے۔

اور یہ بات بھی خیال میں رکھنی چاہئے کہ جو لوگ دوسرے وارث کی موجودگی کی وجہ سے میراث سے محروم نہیں ہیں بلکہ اپنے کردار کی وجہ سے میراث سے محروم ہیں جیسے کافر یا غلام بیٹا باپ کا وارث نہیں بن سکتا اور جس نے اپنے مورث کو قتل کیا وہ بھی اس کا وارث نہیں بن سکتا۔ ابھی یہ اشخاص ہمارے نزدیک دوسرے وارثوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے نہ دوسرے کو میراث سے بالکل محروم کر سکتے ہیں اور نہ اس کا کچھ حصہ گھٹا سکتے ہیں۔ گویا کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوئے یا پہلے ہی مر چکے ہیں۔ لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک دوسرے وارث کا حصہ گھٹا سکتے ہیں۔ بالکل محروم نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک مسلمان عورت فوت ہوگئی اور اس نے مسلمان شوہر اور دو مسلمان اخیافی بھائی (یعنی ماں کی جانب سے بھائی) اور ایک کافر بیٹا اور ایک چچا زاد بھائی چھوڑا تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحاب میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کی مثالیں کتاب میراث میں ملیں گی۔

پوتے کی میراث کا مسئلہ جو خواہ مخواہ ایک اختلافی مسئلہ بنا لیا گیا

ملک عزیز میں ایک خاص طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو بظاہر پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ احادیث سے یا تو کلی طور پر بیزار ہو چکا ہے یا جزوی طور پر حالانکہ احادیث سے بیزاری درحقیقت رسالت اور خصوصاً محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے بیزاری کے مترادف ہے جو ایک مسلمان کے شایان شان نہیں بلکہ دین اسلام سے انحراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ بظاہر صورت اس کی یہی ہے لیکن چونکہ ان کی اکثریت ناواقفی اور عدم علم کی وجہ سے اس کی شکار ہے جس کا اصل سبب کتب احادیث کے تراجم ہیں جو بدقسمتی کی بناء پر ہمارے ہاں رواج پا چکے ہیں۔ اکثر و بیشتر تراجم بالکل غلط ہیں اور بعض جگہوں پر صحیح تفہیم کے محتاج ہیں۔ حقیقت میں یہی صورت قرآن کریم کے تراجم کے ساتھ بھی ہوئی اگرچہ وہ احادیث کی نسبت کم تھی اور یہ بھی کہ ذخیرہ احادیث قرآن کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع تھا اور قرآن کریم کی طرح حتمی اور وحی جلی بھی نہیں تھا۔ اس طبقہ کے لوگ چونکہ زیادہ تر انگریزی خواں، اردو ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور عربی اور خصوصاً عربی محاورات، ضرب الامثال،

استعارات اور تمثیلات سے کلی طور پر ناواقف تھے اس لئے ان کا اس غلطی کا شکار ہونا ممکن تھا۔ پھر جب ایک بار کسی چیز کی اہمیت دل سے اٹھ جاتی ہے تو اٹھتی ہی چلی جاتی ہے اور جب زبان بھی اس کے خلاف استعمال ہونا شروع ہو جائے گی اس میں درستی اور صحت کے امکانات مزید کم سے کم تر ہو جاتے ہیں اور یقیناً یہاں بھی یہ سب کچھ ہوا۔

جن مسائل میں اس غلطی کی بناء پر شدت سے اختلاف ہوا ان ہی میں سے ایک مسئلہ پوتے کی میراث کا بھی ہے۔ جن خطوط پر اس کا تجزیہ کرنا چاہئے تھا ان خطوط پر نہیں کیا گیا اور پھر جب ایک بار ریل پٹڑی سے اتر جائے تو جو نتیجہ اس کا ہوتا ہے وہی کچھ یہاں بھی ہوا لیکن چونکہ ریل کا پٹڑی سے اتر جانا ایک مشاہدہ کی بات ہے اور یہ نظریات کا مسئلہ ہے اس لئے اس تباہی کو سمجھنا بہت حد تک مشکل امر ہے۔ یہاں فن میراث سے متعلق نظام اسلامی کے چند اجمالی اصول ذکر کئے جاتے ہیں اور خصوصاً وہی اصول جن کا مسئلہ زیر بحث کے ساتھ ایک گہرا تعلق واسطہ ہے۔ آخر میں اس غلطی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے ایسا ہوا اور اس کا اسلامی حل بھی جو ہم سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک قانون بن جانے کے بعد اس کی اصلاح کی توقع کم ہی ہوتی ہے اور بے سوچے سمجھے جذبات میں کئے گئے فیصلے ہمیشہ غلط ہی ہوتے ہیں اور اس ملک عزیز میں آج تک جو کچھ ہوا وہ جذبات ہی کی رو میں ہوا جس میں سوچ سمجھ کا عنصر بہت کم تھا۔ پھر تعجب تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہاں بھی ہوا جہاں عقل، عقل اور پھر عقل کی گردان جاری تھی۔ اس لئے عقل بھی اس بے عقلی کی بھینٹ چڑھ گئی جس کی اکثریت پہلے ہی شکار تھی۔

اصل اول : اسلام بلکہ ہر مذہب و ملت میں میراث کی تقسیم کا معیار ضرورت و حاجت یا لیاقت یا قائم مقامی یا یتیم اور قابل رحم ہونے پر نہیں بلکہ یہ حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ قرابت ہے ورنہ اگر ضرورت و حاجت پر مدار ہوتا تو ہر شخص کے مرنے کے بعد اس کے مالدار بیٹے، پوتے، باپ، دادا، بیوی، بھائی و بہن وغیرہ سب محروم رہتے اور بستی کے فقراء و مساکین اور یتیم وارث بنتے، نیز وصی بھی قائم مقام ہونے کی وجہ سے وارث ہوتا، یہ اصل مسلمات عقلیہ اور اجماعی و جملہ مذاہب میں متفق علیہ ہونے کے ساتھ قرآن مجید کی نصوص صریحہ سے بھی ثابت ہے۔ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ اور دوسری تمام متعلقہ آیات میں اس کی تصریح ہے۔

اصل دوم : جب وراثت کا مدار رشتہ و قرابت پر ہے تو ساری دنیا اولاد آدم ہونے کی وجہ سے آپس میں رشتہ و قرابت کا تعلق رکھتی ہے حالانکہ ساری دنیا کو حق وراثت کا دلانا نہ ہی عقلاً ممکن ہے اور نہ کسی مذہب میں اسے قابل عمل سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا "الاقرب فالا قرب" کا قانون سامنے آتا ہے۔ یعنی درجہ قرابت میں جو لوگ مقدم ہیں وہ موخرین کو کلیتہ" یا جزءً محروم کر دیں گے۔ جو لوگ اصولاً وارث ہوتے ہیں ان میں درجہ قرابت کے تفاوت کی وجہ سے سہام متفاوت ہوں گے استحقاق ارث میں قرب و بعد کا تفاوت مندرجہ ذیل دلائل

سے ثابت ہے۔

(۱) یہ تفاوت مسلمات جملہ مذاہب میں سے ہے۔ عقلی طریق سے اس کا واجب العمل ہونا اوپر بیان ہو چکا ہے۔

(۲) مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ میں "اَقْرَبُوْنَ" کا لفظ

(۳) علاقہ بنوت میں زیادہ قرب ہونے کی وجہ سے والدین کو خاص طور پر اقربون سے جدا ذکر کرنا۔

(۴) وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ

(۵) اجماع امت پھر قرب و بعد کے لحاظ کی دو صورتیں ہیں۔

(الف) حجب نقصان یعنی قریب کو زیادہ اور بعید کو کم حصہ ملے۔

(ب) حجب حرمان یعنی قریب کی موجودگی میں بعید بالکل محروم رہ جائے۔

ذی الفروض میں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں' احکم الحاکمین نے ذو الفروض کے سہام معین کرتے وقت اپنی حکمت سے قریب کی موجودگی میں بعید کو کلاً یا جزءً محروم کر دیا ہے چنانچہ قرب و بعد کے لحاظ سے وارثوں کو تین مراتب پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(۱) ذوی الفروض (۲) عصبات (۳) ذوی الارحام

اور پھر ہر مرتبہ میں قرب و بعد کے لحاظ سے تین درجات ہیں۔

(۱) جزء میت (۲) اصل میت (۳) جزء اصل میت

عصبات و ذوی الارحام کے متعلق یہ تقسیم مشہور اور کتب متداولہ میں مذکور ہے لہٰذا ہم یہاں صرف ذوی الفروض کو تین درجات پر تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا درجہ (جزء میت) اس میں بیٹی اور پوتی اور خاوند و بیوی ہیں کیونکہ زوجین میں ولد کی وجہ سے علاقہ جزئیت پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا درجہ (اصل میت) ماں' باپ' دادا' دادی اور نانی پر شامل ہے۔

تیسرا درجہ (جزء اصل میت) بہن و بھائی خیفی' بہن عینی اور علّاتی پر حاوی ہے دوسرے درجہ میں سے ماں کا حصہ ۱/۲ پہلے درجہ میں سے بیوی کا حصہ ۱/۴ سے زائد رکھنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بیوی میں علاقہ جزئیت من کل الوجوہ نہیں ہے' نیز ماں کا حق پرورش ملحوظ ہے اور درجہ سوم میں سے اگرچہ بہن عینی وعلّاتی کا حصہ ۱/۲ درجہ دوم میں سے ماں کے حصہ ۱/۳ اور اور جدہ کے حصہ ۱/۶ سے زیادہ ہے مگر یہاں ماں اور دادی و نانی کے قرب کا اس طرح لحاظ رکھا گیا ہے کہ بہت سے وارث بہنوں کو بالکل محروم کر دیتے ہیں۔ ماں اور جدہ کو محروم نہیں کرتے۔ ماں کسی حالت میں بھی محروم نہیں اور نانی صرف ماں کی موجودگی میں اور دادی ماں یا باپ کی موجودگی میں محروم ہوتی ہے۔ اس صورت کے علاوہ دوسری کسی حالت میں بھی جدہ محروم نہیں۔ علاوہ ازیں

ماں کا حصہ ۱/۶ سے کبھی بھی کم نہیں ہوتا اور اخوات جب زیادہ ہوں تو ہر ایک کا حصہ ۱/۶ سے کم بھی ہو سکتا ہے۔ نیز ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کسی خاص جزئی میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے قانون کو چھوڑ دینا نادانی ہے۔ غرضیکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان تینوں درجات میں اور اسی طرح ہر ایک درجہ کے وارثوں میں قدرت نے قرب و بعد کا لحاظ رکھا ہے۔ ممکن تھا کہ انسان کی نظر قاصر کسی خاص صورت کو اس کے خلاف سمجھنے لگے۔ لہٰذا ارشاد ہوا "اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا" حاصل یہ کہ ذوی الفروض میں سے قریب بعید کو کلاً" یا جزءً محروم کر دیتا ہے۔ اول کو حجب حرمان اور دوم کو حجب نقصان کہا جاتا ہے' عصبات میں صرف حجب حرمان ہوتا ہے۔ حجب نقصان ممکن نہیں کیونکہ عصبات کا کوئی حصہ معین نہیں کہ قریب کی وجہ سے بعید کا حصہ ناقص ہو جائے۔ عصبات کا حصہ معین نہ ہونے پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

(۱) قرآن یا حدیث میں عصبات کا کوئی حصہ معینہ مذکور نہیں۔ حالانکہ قرآن میں ذوی الفروض کے حصص نہایت وضاحت اور بسط کے ساتھ مفصل بیان کئے گئے ہیں۔

(۲) يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔

(۳) فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ میں باپ کا حصہ معین نہ کرنا۔

(۴) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ' مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہاں موالی سے عصبات مراد ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۲۳)

(۵) حدیث من مات و ترک ما لا فماله للموالی لعصبة (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۲۴)

(۶) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الحقوا الفرائض باهلها فما بقی فهولا ولی رجل ذکر (بخاری کتاب الفرائض)

(۷) ما احرز الوالد والولد فهو لعصبته من کان۔

(۸) فایما مومن ترک مالا فلیرثه عصبته من کانوا (بخاری کتاب التفسیر)

(۹) واجعلوا الاخوات مع البنات عصبة (بخاری)

(۱۰) اجماع امت غرضیکہ عصبات میں قرب و بعد کا لحاظ اس طرح ہو سکتا ہے کہ قریب کی موجودگی میں بعید بالکل محروم ہے۔ بخاری کی روایت مذکورہ "الحقوا الفرائض باهلها فما بقی فهولا ولی رجل ذکر بھی صراحتہ" اس کی مثبت ہے حقیقی عصبہ صرف مرد ہی ہیں بہن اپنے بھائی کے ساتھ ضمناً" عصبہ بن جاتی ہے۔

لقوله تعالیٰ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ اور بیٹی کے ساتھ بہن کا عصبہ ہونا صرف حدیث پر مبنی ہے۔

عصبات کی طرح ذوی الارحام کا بھی کوئی حصہ معین نہیں۔ بلکہ ذیل کے دلائل سے بلحاظ قرب و بعد

مطلقاً استحقاق ثابت ہے۔

(۱) وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ

(۲) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ لفظ اَقْرَبُوْنَ میں قرابت کا ہر درجہ داخل ہے خصوصاً لفظ "لِلنِّسَآءِ" سے ذوی الارحام کے استحقاق کی زیادہ وضاحت ہو گئی۔

(۳) الخال وارث من لا وارث له (بخاری)

(۴) التمسوا له وارثا او ذا رحم (ابوداؤد)

اصل سوم کوئی شخص کسی شخص کی زندگی میں اس کا وارث نہیں ہو سکتا بلکہ مرنے کے بعد استحقاق وراثت ہوتا ہے۔ یہ اصل مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت ہے۔

(۱) عقل سلیم چنانچہ جملہ ادیان کا اس اصل پر اتفاق ہے۔

(۲) قانون وراثت سے متعلق نصوص قرآنیہ میں مما ترک، مما ترکن، مما ترکتم کے الفاظ بار بار وارد ہیں یعنی قانون وراثت کی بحث کا موضوع ہی تقسیم ترکہ ہے نہ کوئی مال کسی کی زندگی میں ترکہ ہو سکتا ہے اور نہ اس مال میں بحیثیت وارث کسی کا حق پیدا ہو سکتا ہے۔

(۳) اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ اُخْتٌ (سورہ نساء)

اس میں پوری وضاحت ہے کہ قرباء کے استحقاق وراثت کا سوال مورث کے مرنے پر ہی پیدا ہوتا ہے زندگی میں نہیں غرضیکہ یہ اصل بھی قطعی ہے کہ کسی کی زندگی میں کوئی دوسرا اس کا وارث قرار نہیں پا سکتا بلکہ اس کے مرنے کے بعد وراثت کا حق پیدا ہوتا ہے برطانوی قانون وراثت میں بھی یہ اصول اس طرح زیر عمل ہے۔

اصل چہارم ترکہ میں حق وراثت صرف زندہ وارثوں کا ہوتا ہے۔ مورث سے پہلے مرجانے والے ورثاء کو سرے سے محسوب ہی نہیں کیا جاتا۔ غور کیجئے کہ قانون میراث سے متعلق آیات میں یہ الفاظ ہیں لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ اُخْتٌ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً کیا یہ الفاظ مردہ اور زندہ سب لوگوں کو شامل ہیں؟ کیا یہ بات صرف زندہ وارثوں کی ہے یا کہ مردوں کی بھی؟ مذکورہ آیات کے ٹکڑوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ "اگر فلاں رشتہ دار ہو" سے یہ مدعا نکالا جا سکتا ہے کہ کبھی پہلے موجود رہا ہو یا "فلاں رشتہ دار نہ ہو" سے یہ مفہوم بھی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا رشتہ دار سرے سے پیدا ہی نہ ہوا ہو؟ اگر کوئی اس کا مدعی ہو تو ہم اسے عربی زبان

و ادب سیکھنے پر توجہ دلائیں گے۔ آج تک کوئی ایک فرد بھی دور نبوی ﷺ سے لے کر ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اس انوکھے اجتہادی مفہوم کی گنجائش کہیں ڈھونڈ نکالی ہو۔ اگر اس پر بھی نشہ اجتہاد نہ اترے تو ہم ذیل کی نصوص سامنے رکھ کر پوچھیں گے کہ ان پر آپ کا مفہوم کس طرح منطبق ہو سکے گا۔

(۱) وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ کلالہ اسے کہتے ہیں جس کا نہ باپ زندہ ہو نہ بیٹا۔ تو کیا یہاں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص بے باپ کے پیدا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ باپ تھا اور مر گیا لہٰذا اس کے وارث ہونے کا سوال خارج از بحث ہے۔

(۲) وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ "کیا والدین مردہ ہونے کی صورت میں بھی وارث ہوں گے اور مردہ ماں بھی ۳/۱ حصہ حاصل کرے گی؟

(۳) حدیث "الخال وارث من لا وارث له" (ابوداؤد) کیا "من لا وارث له" سے یہ مراد ہے کہ سرے سے اس کا کوئی وارث پیدا ہی نہ ہوا ہو یا یہ مطلب ہے کہ ماموں کے سوا کوئی دوسرا وارث زندہ نہ ہو؟ نیز کیا خال سے مراد ایسا خال بھی لیا جا سکتا ہے جو مورث سے پہلے فوت ہو گیا ہو۔

(۴) عن بریدہ رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ جعل للجدة السدس اذا لم تكن دونها ام (ابوداؤد) کیا "اذ الم تكن دونها ام" سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ سرے سے ماں ہی نہیں؟ یا کہ صاف صاف یہ مطلب ہو گا کہ ماں تو تھی لیکن مورث سے پہلے مر گئی۔

(۵) اگر قریبی رشتہ دار کو مرنے کے بعد بھی مستحق وراثت سمجھا جائے تو چاہئے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی کسی کا وارث نہ ہو۔ کیونکہ مرنے کے بعد مورث کا نفس اس کی طرف سے سب سے زیادہ اقرب ہے لہٰذا مورث خود اپنے مال کا مستحق ہو گا۔

پس اس معاملہ میں پوری امت متفق ہے کہ وارثت کے حق کی بحث کا تعلق صرف ان ورثاء سے ہے جو مورث کی موت کے وقت زندہ ہوں۔ مورث سے پہلے مرنے والوں کا کسی قسم کا استحقاق شریعت اسلامی کے نظام قانون میں نہیں پایا جاتا۔ اس طرح کے غیر عقلی استحقاق کی مثال صرف ہندوانہ رواجی قانون میں ہے۔ اب اگر کسی کو یہ ہندوانہ قانون پسند ہو تو سرے سے شریعت کو چھوڑ کر اسے اختیار کر سکتا ہے لیکن اس ہندوانہ رواجی قانون کے اجزاء کو لا کر شریعت کے قانون میں پیوند نہیں دے سکتا۔

مندرجہ بالا اصول دلائل عقلیہ اور نصوص قرآنیہ و احادیث صریحہ اور اجماع امت سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی ٹھوس و اٹل ہیں کہ ان میں ذرہ برابر بھی اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ہر ایسا اجتہاد جو مذکورہ اصول میں سے کسی اصل سے ٹکراتا ہو باطل اور ناجائز ہے۔ پس اب ہم ان صورتوں کا تجزیہ کرتے ہیں جو یتیم پوتے کو حصہ دلوانے کیلئے پیش کی جاتی ہیں۔

صورت اول پوتا زیادہ صاحب ضرورت اور حاجت مند و قابل رحم ہے اور بعض دفعہ چچا کی بہ نسبت زیادہ

خدمت گزار یا لائق ہوتا ہے۔ یہ صورت اصل اول سے ٹکراتی ہے۔ یعنی وراثت کا استحقاق ضرورت' حاجت اور قابل رحم ہونے یا خدمت و لیاقت پر مبنی نہیں بلکہ اس کا معیار قرابت و رشتہ داری پر ہے۔ پوتے کی میراث کے قائل شاذ و نادر کسی خاص صورت میں جذبہ رحم کی وجہ سے قرآن کے قطعی اصل کو ٹھکرا دینا چاہتے ہیں۔ تفصیلی جزئیات میں بہت سے مواقع رحم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً زوجہ مفقود عدۃ ممتدۃ الطہر' منکوحہ صغیر' مطلقہ ثلث وغیرہ صورتوں میں بعض دفعہ عورت غریب و مسکین ہوتی ہے اور اس کا کوئی حصہ دار یا کفیل بھی موجود نہیں ہوتا۔ خود میراث میں بھی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں جن کی وجہ سے اگر معاذ اللہ حدیث اور اجماع کا انکار بھی کر دیا جائے تو قرآنی قانون میں بھی ایسی صورتوں سے نجات نہیں۔ مثلاً اولاد نرینہ (خواہ پڑپوتا ہی ہو) کی وجہ سے بہن عینیہ محروم ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ بہن بیوہ ہو۔ عیال رکھتی ہو۔ اس کے خاوند نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا ہو۔ ایسے ہی وہ نواسی جس کی والدہ اپنے والد کی زندگی میں فوت ہوگئی ہو۔ ایسی صورتوں میں بھی آپ کا جذبہ رحم ابھر آئے گا اور آپ کہیں گے کہ خدا کا قانون ایسا بے مہر نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم ﷺ بیواؤں اور رانڈوں کے ملجا و ماویٰ تھے غرضیکہ نہ صرف میراث میں بلکہ نکاح' طلاق' رضاعت' کفالت وغیرہ میں بھی آپ کو کئی جزئیات مواقع رحم نظر آئیں گی۔ پس اگر آپ کے جذبہ رحم کو کھلی اجازت دے دی جائے تو یہ جذبہ قطعی اصول کو توڑ پھوڑ کر سارے نظام اسلامی کو درہم برہم اور قانون کے ڈھانچہ کو پاش پاش کر دے گا۔ منکرین حدیث یہ نہیں سوچتے کہ اولاً یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ فیصدی کتنی صورتوں میں پیش آتا ہے اور پھر کتنی صورتوں میں پوتا خود بالغ اور کاروبار میں مستقل آمدنی کا مالک ہوتا ہے یا اپنے والد سے ملا ہوا کافی ترکہ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں دادا اپنی زندگی میں جس قدر چاہے یتیم پوتے کو دے سکتا ہے بلکہ قرآن و حدیث نے جا بجا اس کی ترغیب دی ہے اور ساتھ ہی خاندانی قرابت کے جذبات بھی اس کے موید ہوتے ہیں۔ اگر زندگی میں نہ دے سکا تو ثلث مال تک وصیت کر سکتا ہے۔ پھر تعجب اس پر ہے کہ ان لوگوں کی نظر رحم صرف یتیم پوتے پر ہی مرکوز ہے۔ اس طرف قطعاً توجہ نہیں جاتی کہ انتقال اراضی کے وقت بھائی اپنی بہنوں سے اور بیٹے اپنی والدہ تک سے دستبرداری کے بیان دلا دیتے ہیں اور رشوت خور افسر موقع غنیمت سمجھ کر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ اگر آپ میں ایسا ہی جذبہ رحم موجزن ہے تو ایسی بیچاری ماؤں اور بہنوں کے متعلق کیوں قانون پاس نہیں کرواتے؟ حالانکہ مستورات کے حقوق کی حفاظت کے متعلق ارشاد ہے لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ قرآن کریم میں ہر جگہ مردوں کے احکام میں ہی ضمناً عورتوں کو بھی داخل کر دیا گیا ہے مگر یہاں اہتمام کیلئے عورتوں کا حکم مستقل بیان فرمایا اور پھر مزید تاکید کیلئے نَصِيْبٌ مِّنْهُ کی بجائے نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ کو مکرر لایا گیا پھر نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا سے واضح کر دیا کہ مستحق کو اس کا حصہ معینہ بکمالہا دینا فرض ہے۔ نیز اس میں اس پر بھی دلیل ہے کہ وارث اگر اپنا حصہ نہ لے یا بری کر دے تب بھی اس کا حق ساقط نہیں ہوتا مذکورہ آیت کی علی الاعلان خلاف ورزی کی جاتی ہے مگر اس کے متعلق

جناب کی رگ حمیت نہیں پھڑکتی حالانکہ ان کی گودوں میں بسا اوقات یتیم ہوتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا خود یتیم پوتے کی بھی ہمدردی یہ ہے کہ قرآن کے ٹھوس اور اٹل قانون کو ٹھکرانے کی بجائے مستورات کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ یتیم پوتے کی والدہ کو جب کئی طرف سے حصہ ملے گا تو وہ خوش حال ہوگا اور کسی کا دست نگر نہ رہے گا۔ علاوہ ازیں اگر یتیم پوتا محتاج ہو تو جب تک وہ نابالغ ہے یا اپاہج ہو تو اس کے مصارف شرعاً اس کے چچا پر واجب ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی صورت بھی نہ ہو سکے تو بیت المال جملہ مساکین اور محتاجون کے مصارف کا کفیل ہوگا۔ اسلامی قانون کو مکمل طور پر جاری نہ کرنے کی وجہ سے اگر ملک کے یتیم بچے آفت میں مبتلا ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری قانون اسلامی کی بجائے اس قانون ساز مجلس پر ہے جس کے ہاتھ میں اس کا نفاذ ہے پس آپ کو اگر واقعی یتیم پوتے پر شفقت ہے تو اسلامی قانون پاس کروائیے۔

مندرجہ بالا صورتوں سے معلوم ہوگیا کہ منکرین حدیث کا یہ سوال کہ یتیم پوتے کے معاش کی کیا صورت ہوگی؟ بالکل باطل ہے۔ قانون وراثت یا وصیت تمام انسانوں کے گزارہ کا ذمہ دار نہ عقلاً ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔ اگر لوگوں کے معاش کا مدار وراثت ہی پر رکھا جائے تو کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کے مورث کچھ بھی ترکہ نہیں چھوڑتے۔ سو جو انتظام ان کے معاش کا ہوگا وہی یتیم پوتوں کے معاش کا بھی ہو جائے گا۔

صورت دوم شریعت کے قانون میراث میں تقدم و تاخر کا پورا سسٹم ہی ختم کر دیا جائے تو یتیم پوتا بیٹوں کے ساتھ شامل ہو کر میراث پالے گا۔ یہ صورت اصل دوم یعنی "الا قرب فالا قرب" کے قانون سے ٹکراتی ہے۔ ہمارے اس اجتہادی اقدام کا اثر سارے ہی نظام قانون کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ یعنی اب ایک میت کے ترکے سے اس کے تمام زندہ رشتہ دار بیک دم وارث ہوں گے۔ خواہ درجہ قرابت میں کتنا ہی تفاوت ہو اس صورت کے اختیار کرنے میں اجماع تو کیا خود نصوص پر پانی پھر جائے گا۔

صورت سوم "یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ" لفظ اولاد کے تحت بیٹوں' پوتوں' پڑپوتوں سب کو جمع کر دیا جائے اور سب کو ایک ہی درجہ میں لا کر ان پر علی السویہ تقسیم کی جائے۔ یہ اجتہادی تجویز بھی اصل دوم یعنی "الا قرب فالا قرب" کے قاعدہ کلیہ پر ہاتھ صاف کر دیتی ہے۔ لفظ اولاد عربی لغت و محاورہ میں حقیقتہً" بلاواسطہ اولاد کیلئے بولا جاتا ہے اگر کبھی توسعاً" اولاد کی اولاد پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے جیسا کہ "اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ" میں لفظ ولد عام ہے (روح المعانی) یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ میں لفظ اولاد کو عام لینا نہ اصولی طور پر معقول ہے کہ قریب و بعید کو یکساں حصہ ملے اور نہ ہی عہد رسالت اور خلفائے راشدین و مابعد میں کہیں ایسا عمل ہوا اور نہ پوری امت محمدیہ میں کوئی اس کا قائل ہے۔ آپ جب یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ والدہ کی موجودگی میں پوتا اپنے دادا کا وارث نہیں ہے۔ کیونکہ اقرب الی المیت اس پوتے کا والد ہے لہٰذا وہی اصلی وارث ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ پوتے کو ولد کے وسیع مفہوم میں داخل کرنا مجاز ہے اور حقیقت کی موجودگی میں مجاز کی طرف

رجوع نہیں کیا جاتا۔ اگر ولد کے مفہوم میں پوتا حقیقتہ" داخل ہے تو باپ کی موجودگی میں بھی پوتے کو ضرور حصہ ملنا چاہئے۔

صورت چہارم ذوی الفروض کی طرح بیٹے اور پوتے میں بھی قرب و بعد کا لحاظ رکھتے ہوئے بیٹے کو زیادہ حصہ دیا جائے اور پوتے کو کم۔ یہ صورت بھی اصل دوم سے ٹکراتی ہے اصل دوم میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ عصبات میں حجب نقصان ممکن نہیں بلکہ ان کا حصہ معین نہ ہونے کی وجہ سے ان میں "**الا قرب فالا قرب**" کا قانون جاری کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ قریب کی موجودگی میں بعید بالکل محروم رہے۔ اگر آپ بلحاظ قرب و بعد کے بیٹے اور پوتے کو کم و بیش حصہ دینا چاہتے ہیں تو اس کی بیشی کا معیار کیا ہوگا اگر اپنی طرف سے کوئی معیار مقرر کر لیا جائے مثلاً بیٹے کو ۲/۳ اور پوتے کو ۱/۳ دیا جائے تو کیا۔ قرآن پر زیادتی نہ ہوگی؟ کیا نشہ اجتہاد میں عصبات کے متعلق لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ میں بیان کردہ غیر معین حصص کو معین کرنے اور قرآن کے اٹل قانون کے مخالفت کرنے کی گنجائش ہے؟ پھر ہم یتیم پوتے کو ظلم سے بچانے کے مدعیوں سے پوچھتے ہیں کہ بعید کو اگر قریب کے حصہ میں شریک کر دیا جائے تو کیا اس میں قریب پر ظلم نہیں کہ یتیم پوتے کو تو حصہ دیا گیا۔ مگر زندہ بیٹے کی اولاد کو محروم کر دیا گیا جو درجہ میں یتیم پوتے کے مساوی ہے اور ان کے باپ کو جو کچھ ملا ہے وہ حقیقت میں ان کو نہیں ملا اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ آئندہ بھی وہ ان کو نہ ملے اور ملا بھی تو اپنے والد کے ترکہ کی حیثیت سے ملے گا جس سے یتیم پوتا بھی محروم نہیں۔ الغرض یتیم پوتے پر رحم کھا کر قانون شرعی میں ترمیم کرنا بہت سے لوگوں پر بے رحمی کا سبب بنے گا اور سب سے بڑا ظلم اپنے نفس پر ہوگا کہ احکم الحاکمین اور اس کے رسول امین ﷺ کے اٹل قانون میں دست اندازی کرتے ہیں۔

صورت پنجم نظریہ قائم مقامی یعنی جو تعلق بالواسطہ ہونے کی وجہ سے مرتبہ ثانی پر ہوتا ہے وہ واسطہ کے بیچ میں سے ہٹ جانے پر مرتبہ اول پر آجاتا ہے کہا جاتا ہے کہ متقدمین نے خود قائم مقامی کا نظریہ اختیار کیا ہے جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ و ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول "الجراب" کے تحت باپ کا حصہ دادا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جب باپ کی خالی جگہ کو دادا پر کر سکتا ہے تو بیٹے کی خالی جگہ کو پوتا کیوں پر نہیں کر سکتا۔ یہ صورت بھی اصل دوم سے ٹکراتی ہے اور پوتے کو دادے پر قیاس کرنا باطل ہے۔ چچا کی موجودگی میں پوتے کو بیٹے کے قائم مقام کر کے چچا کے برابر کر دینے سے "**الا قرب فالا قرب**" کا قانون ٹوٹ جاتا ہے اور دادے کو باپ کے قائم مقام کرنا اس قانون کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کے بیٹے متعدد ہو سکتے ہیں مگر باپ متعدد نہیں ہو سکتے تاکہ یہ سوال پیدا ہوتا کہ متعدد باپوں میں سے ایک باپ کے مرنے پر اس کا باپ اس کا قائم مقام ہو کر دوسرے باپوں کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے یا نہیں؟ "**الا قرب فالا قرب**" کے قانون کا حاصل یہ ہے کہ درجہ اول میں سے جب تک کوئی فرد بھی موجود ہو درجہ دوم کا کوئی شخص بھی وارث نہ ہوگا۔ درجہ اول میں سے اگر کوئی موجود نہیں تو درجہ دوم کے افراد درجہ اول کے قائم مقام ہوں گے یہی قانون اصول اور فروع میں دونوں

طرف جاری ہوتا ہے لہٰذا جب تک کوئی بیٹا موجود ہوگا پوتا وارث نہ ہو سکے گا چنانچہ اصول میں بھی جب دادی فوت ہوگئی ہو اور اس کی ماں زندہ ہو اور نانی بھی موجود ہو تو دادی کی ماں کے قائم مقام کر کے نانی کے ساتھ سدس میں شریک نہیں کیا جاتا اور باپ چونکہ ایک ہی ہو سکتا ہے اس لئے اس کی عدم موجودگی میں درجہ اول خالی ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں سے دادا کو اس کا قائم مقام کر کے میراث دلائی جاتی ہے غرضیکہ باپ کے مرنے پر دادا جو اس کا قائم مقام اس لئے کیا جاتا ہے کہ درجہ اول خالی ہے اور چچا کی موجودگی میں پوتے کو بیٹے کا قائم مقام اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ درجہ اول خالی نہیں بلکہ اس میں چچا (میت کا بیٹا) موجود ہے اگر چچا نہ ہو تو پوتا بھی بیٹے کا قائم مقام ہوگا۔ قائلین نے یہ عجیب ضابطہ ایجاد کیا ہے کہ وہ ابعد وارث جو میت کی طرف بالواسطہ منسوب ہو واسطہ کے فوت ہو جانے پر اصل واسطہ کے قائم مقام ہو کر میت کا اقرب بن جاتا ہے۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست!

تمام اہل عقل کے نزدیک جس رشتہ دار کی قرابت میت سے بلاواسطہ ہو وہ اقرب کہلاتا ہے اور جس کا تعلق کسی واسطہ سے ہو وہ ابعد۔ خواہ یہ واسطہ زندہ ہو یا مردہ۔ کیونکہ واسطہ کی زندگی اور موت کا رشتہ کی نوعیت اور اس کے قرب و بعد سے کوئی تعلق نہیں۔ جو شخص میت سے قرابت بالواسطہ رکھنے کی وجہ سے ابعد ہے وہ جس طرح واسطہ کی زندگی میں ابعد ہے اسی طرح واسطہ کے مرجانے کے بعد بھی ابعد ہی رہتا ہے۔ اس کے رشتہ و قرابت کی نوعیت نہیں بدل جاتی وہ اب بھی ابعد ہی ہے۔ ہاں اقرب کے موجود نہ ہونے پر ابعد ہونے کے باوجود اس کو وارث تسلیم کیا جاتا ہے اور پھر تعجب ہے کہ یہ لوگ چچا کی موجودگی میں پوتے کو یتیم ہونے کے باعث میراث دلاتے ہیں۔ پس جب پوتے کو یتیم کہا جاتا ہے تو یہ دعویٰ باطل ہوگیا کہ بیٹے کے مرنے پر وہ یتیم بیٹے کے قائم مقام ہوگیا اور اسے ابن ہونے کا درجہ مل گیا جب پوتے کو بیٹا سمجھا جاتا ہے تو اسے یتیم کیوں کہتے ہیں؟ غرضیکہ اہل عقل کا اجماع ہے کہ واسطہ مرجانے سے ابعد اقرب نہیں ہو جاتا۔

حضور کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیٹی کو نصف، پوتی کو سدس اور باقی ہمشیرہ کو دیا جائے (بخاری ص ۹۹۸) اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی اور پوتی برابر نہیں اس حدیث سے پوتے کی وراثت پر اس طرح استدلال کیا جاتا کہ جب بیٹی کی موجودگی میں پوتی وارث ہے تو بیٹے کی موجودگی میں پوتا کیوں نہ وارث ہوگا؟ یہ قیاس چند وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کو ۱/۲ اور پوتی کو ۱/۶ حصہ دلایا اور آپ بیٹے و پوتے کو برابر رکھتے ہیں۔

(۲) اگر بیٹے کو بیٹی پر قیاس کیا جائے تو جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کی موجودگی میں بہن کو بھی وارث بنایا اسی طرح آپ کو چاہئے کہ بیٹے کی موجودگی میں بہن کو محروم نہ کریں۔

(۳) مونث اولاد کا حصہ ۲/۳ ہے۔ ایک بیٹی چونکہ ۱/۲ کی مستحق ہے لہٰذا باقی ۱/۶ پوتی کو مل جاتا ہے تاکہ ۲/۳ حصہ پورا ہو جائے۔ جب زیادہ بیٹیاں ہوں تو چونکہ کل ۲/۳ ان میں تقسیم ہو جاتا ہے اس لئے پوتی

محروم رہ جاتی ہے۔ بیٹا چونکہ کل مال کا مستحق ہے اس لئے اس سے کچھ بچتا ہی نہیں تاکہ باقی پوتے کو دیا جائے۔

(۴) ایک بیٹا دو بیٹیوں کی بجائے ہے۔ پس جب دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتی وارث نہیں ہوتی حالانکہ بیٹیاں کل مال کی مستحق نہیں تو بیٹا جو کل مال کا مستحق ہے بطریق اولیٰ پوتے کو محروم کر دے گا۔

(۵) بیٹی اور پوتی ذوی الفروض میں سے ہیں اس لئے ان میں حجب نقصان جاری ہو سکتا ہے بیٹا اور پوتا عصبات میں سے ہیں ان میں "الاقرب فالاقرب" کا قانون صرف حجب حرمان کی صورت میں ہی جاری ہوتا ہے۔ حجب نقصان ممکن نہیں۔

صورت ششم قائلین کے نظریہ قائم مقامی کا وہ دوسرا تصور اختیار کیا جائے جو ہندو رواجی قانون سے ماخوذ ہے اور جو اخباری بحثوں میں زیادہ تر پیش کیا جاتا ہے نیز اس پر محمد اقبال چیمہ کا ترمیمی مسودہ قانون مبنی ہے جو انہوں نے پنجاب اسمبلی میں پیش کیا ہے۔ یعنی یہ تصور کہ یتیم پوتا اگرچہ بذات خود وارث نہیں ہے لیکن وہ اپنے باپ کا حصہ دادا سے لینے کا حق دار ہے۔ یہ صورت اصل سوم اور اصل چہارم سے ٹکراتی ہے یعنی اس تصور کو قبول کرنے کیلئے ہمیں شریعت کا یہ بنیادی اصول ختم کرنا پڑے گا کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کے مال پر کسی کا حق میراث نہیں لگ سکتا اور یہ اصول بھی ختم کرنا ہوگا کہ تقسیم ترکہ کے وقت زندہ وارثوں کے ساتھ کسی مردہ وارث کو مستحق نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر ان دو اصولوں سے آزاد رہ کر قانون سازی کی جائے تو صرف پوتے کے لئے ہی اس کے مردہ باپ کو زندہ نہ رکھنا ہوگا بلکہ ہر ترکہ کے تقسیم کرتے وقت جملہ ممکن وارثوں کو زندہ فرض کرنا پڑے گا اور اس طریق سے جو رشتہ دار بھی فوت ہوگیا ہو ہر ایک کو حصہ دینا ہوگا قرآن اور حدیث و اجماع اور عقل سلیم کے خلاف اگر اس اجتہاد کو زیر عمل لایا جائے تو تقسیم ترکہ ممکن ہی نہیں۔ جملہ وارثوں پر تقسیم کرنا تو درکنار صرف دو رشتہ داروں کا مال آپس میں قیامت تک تقسیم نہ ہو سکے گا۔ فرض کیجئے کہ زید کا بیٹا بکر جو صاحب اولاد ہے زید سے پہلے فوت ہوگیا۔ اس لئے بکر کے مال سے ۱/۶ زید کو دیا گیا۔ پھر زید فوت ہوا تو یہی مال اس کے مردہ بیٹے بکر کو ملے گا۔ پھر بکر کا ترکہ تقسیم کرتے وقت اس سے ۱/۶ بکر کے مردہ باپ زید کو دیا جائے گا اور زید سے پھر مردہ بیٹے بکر کو اس طرح اوپر سے نیچے کو اور نیچے سے اوپر کو یہ تسلسل ختم ہی نہ ہوگا اور مال تقسیم ہوتے ہوتے اجزائے لا تجزی اور ایٹموں تک پہنچ جائے گا۔ آخر یہ دور ایٹم کے کرشموں کا دور ہے پھر تو تمام دنیا میں اس اجتہاد کے ڈنکے بج جائیں گے اسلامی قانون کی بڑی قدر و قیمت ہوگی اور ملاؤں کی حماقتوں کی اصلاح کرنے والے مسٹروں کو دماغوں کو سونے میں تولا جائے گا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق جو بھی صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں سب کی سب نظام اسلامی کے کلیات کے خلاف ہیں اور قرآن، حدیث، اجماع اور عقل سے ثابت شدہ قطعی اصول کے ڈھانچہ کو پاش پاش کر دیتی ہیں لہٰذا ان صورتوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرنا نظام اسلامی

کو یکسر ٹھکرا دینا ہے۔

اسی طرح ایک مرنے والے کو جو اس کی وراثت میں تیسرے حصہ تک وصیت کا اختیار دیا گیا تھا اس کا وہ صحیح استعمال کر کے وارثوں سے باہر جو اس کے قریبی تھے ان میں تقسیم کر سکتا تھا مثلاً اس کے پوتا' پوتی' دوہتا' دوہتی' بھائی' بھانجا' بھتیجا وغیرہ اس طرح وہ خلا پورا ہو سکتا تھا جو اس کی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔ ہاں! اگر اس نے اس خلا کو پر نہیں کیا تو حکومت وقت کو حق حاصل تھا کہ وہ ان کے حصص تقسیم کرتے وقت اس خلا کو پر کر دیتی۔ اس طرح حکومت کو خاص قانون نافذ کرنے کا حق تھا وہ محفوظ ہوتا اور حکومت کی اس مداخلت کی وجہ سے عوام خودبخود اپنے گھریلو مسائل کو گھر کی حد تک ختم کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح معاشرہ اسلامی میں امن' صلح اور آشتی کا دور دورہ ہوتا لوگ باوقار زندگی بسر کرتے اور اس گھریلو فیصلہ سے میری مراد یہ ہے کہ بعض اوقات تیرے حصے کی وصیت سے کم میں اگر معاملہ طے پا جاتا تو وہ اصلاح کی ایک ایسی صورت تھی جس پر وہ بہت جلد متفق ہو سکتے کیونکہ وہ اتفاق رائے سے نہ پہنچ پاتے تو تیسرے حصے تک حکومت اس کو وصیت کی شرعی اجازت کے اندر رہتے ہوئے مداخلت کر سکتی تھی۔

جس چیز کو معاشرتی ناانصافی قرار دیا گیا ہے سوائے اس کے کہ لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر قانون الٰہی میں بے جا مداخلت کی گئی یہی وجہ ہے کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوا اور جذبات کے تحت اس طرح کے فیصلے ہمیشہ غلط ہی ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی دور رس نہیں ہوتے لیکن بدقسمتی سے آج تک اس ملک میں اسلام کے نام پر جتنے فیصلے کئے گئے سب اس قسم کے ہیں جن سے لوگ مزید اسلام سے دور ہو گئے ہیں اور طرح طرح کی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور آئندہ ہوتی رہیں گی اور حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ فیصلے اس طرح کے ہوں اور چند پیٹ کے پجاریوں کو ساتھ ملا کر ایسے فیصلے طے کرا لئے جائیں جس سے مزید پیچیدگیاں بڑھیں اور بے چینی پیدا ہو تاکہ کاروبار حکومت چلتا رہے۔ اس طرح کے آج تک جو فیصلے قرار پائے ان میں چند ایک سرفہرست ہیں اور اگر صرف انہی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً عائلی قوانین کا فیصلہ۔ عشر و زکوٰۃ کے نفاذ کا فیصلہ۔ جمعہ کی چھٹی کا فیصلہ۔ ایک نوے سال پرانے جھگڑے کا فیصلہ جس کو احمدیوں کا فیصلہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسلامی حد و تعزیرات کے نفاذ کا فیصلہ۔ مسئلہ میراث کا فیصلہ بنک کاری کا فیصلہ۔ قتل کی دیت کا فیصلہ۔ اسلامی اوقاف کا فیصلہ۔ ان میں سے ہر ایک فیصلہ سے اسلامی روح خارج کر کے غیر اسلامی روح داخل کر دی گئی۔ نام وہی استعمال کئے گئے اور کام کو مزید الجھا دیا گیا اور اس طرح دوسری قوموں کے سامنے اسلام کو اسلام نہیں بلکہ موم کی ناک بنا کر رکھ دیا گیا اور مسلمان عوام کو جو اسلام سے ایک طرح کی محبت رکھتے تھے خواہ وہ نام تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی بڑی ترتیب اور نہایت ہی آہستگی کے ساتھ نامحسوس طریقے سے ختم کرنے کی سازش کی گئی جو اب تک جاری ہے۔ اس جگہ مسئلہ میراث کی بات ہو رہی تھی اس میں جو ترمیم کی گئی اس میں سرے فہرست پوتے کی میراث ہے جس کو انصاف کا تقاضا کہہ کر' نا

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

گا تو اللہ اسے ایسے باغوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ' اس

انصافی کی انتہاء کر دی گئی۔

ان انصاف پسندوں کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں جو فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے اور بالکل اس زمانہ سے اس کا تعلق ہے جس کے افراد ابھی زندہ حیات موجود ہیں جو وفات شدہ ہیں ان کو زمانہ جانتا ہے اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کے نام اب بھی موجود ہیں اور یہ واقعہ بالکل میرے قریب ہے پھر اس طرح کے سینکڑوں واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں یہ کوئی شاذ مثال بھی نہیں۔

ایک دریافت طلب مسئلہ جو فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے

اس میں بتایا گیا ہے کہ "ع" ستر سال کی عمر میں وفات پا گیا جو ۳۲ بیگھہ زمین اور ایک مکان تقریباً ایک لاکھ مالیتی چھوڑ کر مرا اس کی بیوی اور ماں باپ موجود نہیں تھے اور اس کی دس اولادوں میں سے آٹھ زندہ تھیں اور دو وفات پا چکی تھیں۔

وفات پانے والوں میں اس کا ایک لڑکا "ظ" اور ایک لڑکی "ر" وفات پا چکے تھے۔

اس کے لڑکے "ظ" کی جب وفات ہوئی تو اس وقت وہ باپ سے الگ ہو کر ۴۰ بیگھہ زمین اور تین کوٹھیوں کا مالک تھا جب کہ اس "ظ" کا بڑا لڑکا "ک" بھی وفات پا گیا تھا اور اس "ک" نے باپ سے الگ ہو کر ۵۰ بیگھہ زمین اور ایک رہائشی کوٹھی الگ اپنے نام سے بنا لی تھی اس میں اس کے والد نے اس کی کتنی مدد کی تھی اس کا صحیح علم موجود نہیں۔ اس "ک" کے دو بچے اور بیوہ موجود ہیں۔

"ع" کی لڑکی "ر" بھی وفات پا چکی تھی جو چار بچیوں کی ماں بن چکی تھی اور تقریباً دو سال سے بیوہ تھی اس کا خاوند ایک سول کمپنی میں ملازم تھا جو نہ کسی زمین کا مالک تھا اور نہ ہی ذاتی مکان رکھتا تھا تاہم ملازمت اچھی تھی اور زندگی کے دن آسانی سے گزار رہا تھا کہ اچانک وفات پا گیا۔

"ع" کی اپنی اولاد میں بھی ابھی تین بچے نابالغ تھے جن میں سے ایک ۱۵ سال کا اور ایک لڑکی ۹ سال کی اور ایک لڑکا ۵ سال کا تھا اس کی جائیداد کو اب تقسیم ہونا ہے "ع" نے کوئی وصیت نہیں کی اور کوئی قرض نہیں چھوڑا۔ اس کے ۵ بچے ہیں جن میں سے ۳ لڑکیاں ہیں اور ۲ بچے ابھی غیر شادی شدہ ہیں اس کی میراث کو ذرا انصاف کے ساتھ تقسیم کر کے دکھائیں تاکہ تمہارے انصاف کی وضاحت ہو جائے۔ الٰہی قانون میں جو انصاف کیا گیا ہے جب کہ اسلامی حکومت کو اس کے وصیت نہ کرنے کی صورت میں حق تھا کہ اس سقم کو پورا کرنے کی ایک حد تک کوشش کرتی پھر ان دونوں تقسیموں کو ملا کر دیکھیں تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی تم نے اللہ کے قانون میں ناجائز مداخلت کر کے انصاف کے نام سے کتنا ظلم کیا ہے۔

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳ وَمَنْ يَّعْصِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠
وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۴ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ

ع ۲ ۴ ۱۳

حالت میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے جو انہیں حاصل[۴۰] ہوگی۔ ۱۳

لیکن جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں سے باہر نکل گیا تو وہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور اس کے لئے رسوا کرنے والا عذاب[۴۱] ہوگا۔ ۱۴

اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں تو چاہئے کہ اپنے آدمیوں

میراث کے متعلق جو احکام تم کو دیئے گئے ہیں ان کی پابندی دینی اور دنیاوی زندگی کیلئے مفید ہے

۴۰ جو احکام میراث کے متعلق تم کو دیئے گئے ہیں ان کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ دنیا کا معاملہ ہے ان کی پرواہ نہ کر کے خود اپنے آپ کو خدائی عدالت میں مجرم نہ بناؤ۔ "تلک" کے لفظ سے ان تمام احکام کی طرف اشارہ کر دیا جو یتیموں کے متعلق تقسیم ترکہ کے متعلق، وصیتوں کے متعلق اور ادائیگی کے متعلق بیان فرمائے۔ اس طرح ان کی اہمیت کو واضح کر دیا کہ یاد رکھو یہ حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق العباد بھی۔ اس لئے ان کی پابندی دوسرے سارے احکام سے بڑھ کر ہے جو صرف حقوق اللہ میں آتے ہیں یا صرف حقوق العباد میں۔ اس لئے فرمایا ان کی اطاعت کامل پر بہت بڑی کامیابی تم کو حاصل ہوگی جو دین و دنیا دونوں میں تم کو سرخرو کر دے گی یعنی قانون میراث کی پابندی کو معمولی بات نہ سمجھو بلکہ اس پر تمہاری دنیاوی اور دینی دونوں کامیابیوں کا انحصار ہے۔

قانون میراث کی پابندی نہ کرنا دین و دنیا دونوں کا خسارہ ہے

۴۱ یہ احکام جو تم کو دیئے گئے ہیں یہ گویا اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدود ہیں اور حدود اللہ کی پرواہ نہ کرنے والا یقیناً اپنی دنیا کو برباد کرتا ہے اور آخرت کو اور پھر آخرت کا خسارہ تو ایسا ہے جو کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اس طرح یہ عذاب دائمی بھی ہوگا جو ان کو دیا جائے گا اور معذب کے حق میں ذلت آخریں بھی اور یہ عذاب دو چار روز کی بات بھی نہیں بلکہ دائمی عذاب کی خبر تم کو پہنچائی جا رہی ہے لیکن جس چیز کا بدلہ یا نتیجہ

نِسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝١٥ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ

میں سے چار آدمیوں کی اس پر گواہی لو۔ اگر چار گواہ گواہی دے دیں تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کیلئے کوئی دوسری راہ پیدا کر دے۔ ۱۵

اور جو دو شخص تم میں سے بدچلنی کے مرتکب ہوں تو چاہئے کہ ان دونوں کو اذیت

ہے چند روز کی چاندنی اور پھر اندھیری رات کے مترادف ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کریم کی یہ وعید کتنی سخت ترین وعید ہے لیکن آج مسلم معاشرہ میں اس کا کوئی اثر۔ ملکی قانون میں جو لولہا لنگڑا قانون نافذ ہے اس کی کوئی پابندی؟ نہیں بلکہ وہ تو نافذ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ عدلیہ کا کام چلتا رہے اور لوگ مصروف کار رہیں ان کو ہوس جائیداد سے ساری زندگی فرصت ہی نہ ملے اور ان کی نسبی جائیداد کے یہ وارث جو محکمہ مال کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں سارا مال انہی کے اردگرد چکر لگاتا رہے اور یہ بندر بانٹ کیلئے ہمہ وقت تیار رہیں۔ جس کی اکائی کا نام پٹواری اور مجموعہ کا نام وزیر مال ہے۔

مختصر یہ کہ وہ قانون نافذ کرانے کے متمنی عوام ہوں یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد سب اچھی طرح کان کھول کر سن لیں کہ "جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی اور اس کی مقرر کردہ حد بندیوں سے باہر نکل گیا تو یاد رہے کہ وہ جنت کی ابدی راحتوں کی جگہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا اور ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور اس کیلئے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔"

ذرا غور کیجئے کہ ضمنی عدالتوں کا فیصلہ ہو تو جس شخص کا اس فیصلہ پر دل تسلی نہ پائے وہ اوپر کی عدالتوں کو رجوع کرتا ہے بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر سپریم کورٹ سے فیصلہ صادر ہو جائے پھر؟ تختہ دار پر لٹکنے کے سوا کوئی چارہ ہاں! رحم کی اپیل؟ لیکن اگر وہ بھی خارج ہو جائے۔ یہ تو ان مصنوعی عدالتوں کے فیصلوں کی صورت ہے جن میں ایک طرح کے نہیں بیسیوں طرح کے فریب اور مکاریوں سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن عدالت الٰہی کے فیصلہ پر کوئی اپیل کی جگہ؟ نظر ثانی کی کوئی صورت؟ پھر خود ہی سوچ لو کہ ان مذہبی وکیلوں کی موہوم ثواب پہنچانے کی تدبیریں فیصلہ الٰہی کے اور سزا یافتوں کے کام کس طرح آئیں گی؟

جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں ان کی سزا کا حکم اور بدچلنی سے مراد کیا ہے؟

۴۲ مفسرین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ان آیات میں جس برائی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود زنا ہے اور جس سزا کا حکم دیا گیا ہے وہ اوائل اسلام میں دی جاتی تھی بعد میں جب سورہ نور نازل ہوئی تو زنا کی حد مقرر ہوگئی اور یہ سزا باقی نہ رہی۔ لیکن دوسری جماعت اس طرف گئی ہے کہ ان آیات میں اور سورہ نور کی آیات میں ایک طرح کے جرم کی سزائیں نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ دو مختلف قسم کے جرائم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جگہ بدچلنی کا ذکر ہے اس سے مقصود وہ بدچلنی ہے جو دو عورتیں آپس میں اور دو مرد آپس میں کریں اور سورہ نور میں زنا کا ذکر ہے پس دونوں کے احکام اپنی اپنی جگہ باقی اور قائم ہیں اور علاوہ ازیں بھی ان آیات کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

جیسا کہ پیچھے آپ پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ پہلے دو رکوعوں میں عورتوں کے حقوق کا بیان ہے اور اس رکوع میں کچھ ان کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے جس طرح اسلام نے سارے مذاہب سے بڑھ کر عورت کو اس کا مقام دلوایا ہے اور عورتوں کے ساتھ حقوق معاشرت کو تعلیم الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے اس طرح ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی بتائی ہیں اور اس طرح ان کو یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح وہ حقوق کو حاصل کرنے میں تمام دنیا کی عورتوں سے فائق ہیں اسی طرح اپنے چال چلن میں اعلیٰ درجہ کی پاکبازی اور راستبازی اختیار کرنے میں فوقیت لے جائیں۔ چونکہ اسلام کی اصل غرض یہ ہے کہ عورت کی ذلت کے جس قدر اسباب ہیں ان سب کا قلع قمع ہو جائے اس لئے جس طرح اس کے حقوق کو ایک طرف محفوظ کیا تاکہ اس کی عزت اور مرتبہ معاشرہ میں بڑھ جائے تو دوسری طرف اس کی عصمت کو محفوظ کرنے کے سارے طریقوں کو بھی ساتھ ذکر کر دیا تاکہ عصمت کی ذلت و رسوائی سے بھی اس کو بالکل محفوظ کر دیا جائے جو ساری ذلتوں اور رسوائیوں سے بڑھ کر ہے۔

پھر مفسرین نے جو اس کی مختلف طریقوں سے تفسیر کی ہے تو اس کا بھی صحیح جواب یہی ہے کہ وہ اس لئے کہ ان کو جو جو راستہ ان کی رسوائی کا نظر آیا اس کو انہوں نے ذکر کر دیا جس کی نظر میں جو راستہ زیادہ ذلت و رسوائی کا تھا اس نے اس کو ترجیح دے دی اور اس طرح ان مختلف تفاسیر ہونے کی وجہ سے ان سارے راستوں کو بند کرنے کی صورتیں سامنے آگئیں بلکہ ان کے ہر جز پر بحث کر کے ان کے کانوں تک پہنچا دیا کہ دیکھو جس طرح اسلام نے تمہیں عزت کا مقام دیا ہے تم خود بھی اس کی اسی طرح ہر برے طریقے سے بچ کر دنیا والوں پر ثابت کر دو کہ جو عزت کا مقام اسلام نے ہم کو دلایا ہے اس کو ہر لحاظ سے محفوظ رکھ کر ہم ذلت کا کوئی مقام اختیار نہیں کریں گی تاکہ ہماری عزت و احترام معاشرہ میں مزید بڑھ جائے۔ اس طرح جن لوگوں نے جو تفسیریں اختیار کی ہیں ہم ان سب کی ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ہم کو ہر راہ کی نشاندہی کر دی جس جس راستے سے ہو کر شیطان ہم کو بہکا سکتا تھا۔ اس لئے اگر ابو مسلم اصفہانی نے پہلی آیت سے دو عورتیں مراد لی ہیں جو آپس میں بدکاری کی مرتکب ہوں تو ہم ان کی ممنون ہیں کہ انہوں نے ہم کو اس کمزور راستے کی بھی

نشاندہی کر دی جو ایک گھٹیا سے گھٹیا ذہن کر سکتا ہے۔ ہم ان کی ممنون ہیں جنہوں نے اس سے مراد مبادی زنا لئے ہیں اس لئے کہ ہماری نظر میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر بھی پڑتی ہے کہ زنا کی ایک قسم ہی نہیں بلکہ زنا کی بہت سی قسمیں ہیں جیسے انسان کی آنکھ بھی زنا کرتی ہے اور کان بھی اس برے فعل کا مرتکب ہوتا ہے اور ہاتھ اور پاؤں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے پھر ایک صورت وہ بھی ہے جس کے واقعہ ہونے سے زنا کی وہ سزا دے دی جاتی ہے جو مشہور و معروف ہے یعنی گن گن کر سو درے لگانا اور پھر ان میں سے ہر ایک راستہ ذلت و رسوائی کا راستہ ہے اس لئے ہم اسلام کی بیٹیاں کسی ایک پگڈنڈی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی جس کا دوسرا سرا برائی کے ساتھ جڑا ہوا ہوگا۔

فرمایا کہ اس طرح کی اگر کسی سے کوئی بھول چوک ہو بھی گئی جس کا صدور انسان سے ناممکن الوقوع نہیں ہو سکتا تو مردوں کو بھی عقل کے ناخن لے کر بات کرنا ہوگی کیونکہ کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ ایسے ہی زبان کھول دے اور جس پر چاہے الزام رکھ دے کہ فلاں ایسی ہے اور فلاں ویسی ہے۔ بلکہ اس طرف نظر کرنے کیلئے اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ جب تک چار گواہ یہ بات آنکھوں سے دیکھ کر نہ کہیں گے ہم ان کو سزا دلوائیں گے کہ انہوں نے ایسی نازک بات پر زبان کیوں کھولی جس کے کھولنے کی اجازت ان کو نہ تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ برائی بلاشبہ برائی ہے لیکن برائی کی تشہیر اس برائی سے بھی بڑھ کر برائی ہے اب انہوں نے کیا دیکھا؟ عورت عورت کو برائی میں دیکھا۔ مبادی زنا دیکھا یا زنا کی مرتکب پایا پھر تفصیل اس کی سورہ نور میں آئے گی۔

ہاں! اگر گواہی مکمل ہو جائے یعنی چار گواہ ان کی بدکاری کی گواہی دے دیں تو "پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کیلئے کوئی دوسرا راستہ پیدا کر دے۔" اگر معاملہ عورت عورت کا ہے تو زنا کی حد تو جاری نہیں ہوگی لیکن اس بدکاری کیلئے ان کو آئندہ آزاد بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ سب سے پہلے ان کو قید میں ڈال دو یعنی پابند کر دو۔ اگر معاملہ حکومت کی سطح پر ہے تو قید خانہ میں اور اگر گھریلو صورت کوئی ایسی واقع ہوئی ہے تو گھر میں پابند کر دو اور دیکھو کہ ایسی صورت کیوں واقع ہوئی اگر یہ ناکتخدا ہیں تو اللہ اس کی سبیل پیدا کر دے گا کہ ان کا نکاح ہو جائے گا جس سے ان کی خواہش اور ہوس کا ازالہ ہو جائے گا اور پھر پابندی کے ناطے ان کی اصلاح ممکن ہو جائے گی۔ اگر بات کتخدا کے درمیان ہے تو پابندی سے معاملہ درست ہو جائے گا اور متاہل زندگی کی پابندیاں ان کو خود بخود درست کر دیں گی اور اللہ ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے گا۔ اگر وہ بات ہے جس کو زنا سے موسوم کیا جاتا ہے تو اس کا حکم سزا تم پر واضح کر دیا جائے گا چنانچہ وہ بھی بعد ازیں واضح فرما دیا گیا کہ ان کو سو درے لگاؤ اور ایک سال قید میں بھی ان کو رکھو۔

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿١٦﴾ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ

پہنچاؤ' پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی حالت سنوار لیں تو انہیں چھوڑ دو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۶ ۵۴۳

یاد رکھو کہ اللہ کے حضور توبہ کی قبولیت انہیں لوگوں کیلئے ہے جو برائی کی کوئی بات نادانی

دو شخص بے حیائی اور بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا کیا ہے؟

۵۴۳ جس طرح قبل ازیں آیت کے تین مطالب بیان کئے گئے تھے بالکل اسی طرح یہاں بھی تین ہی مطالب بیان ہوئے ہیں۔ "دو شخصوں" سے کیا مراد ہے؟ دو مرد یا مرد اور عورت پھر اگر مرد اور عورت مراد ہیں تو ارتکاب فعل دبر میں ہوا ہے یا قبل میں۔ اگر مراد مرد اور عورت ہیں اور مقام فعل بھی قبل ہی ہے تو پھر آیت کا مطلب کیا ہوگا؟ کیونکہ اس فعل کی سزا تو پہلے ہی سنائی جا چکی اور پھر اس آیت میں پہلی سزا کو بھی ڈھیلا کر دیا گیا۔ کیوں؟ دو شخصوں سے مراد دو مرد بھی کی گئی ہے۔ اس طرح سے یہ ایک دوسرا حکم ہے جس کا پہلے حکم سے کوئی تعلق نہیں پھر ظاہر ہے کہ جب حکم الگ ہے تو اس کی سزا بھی الگ ہی ہونا چاہئے تھی۔ اس لئے سزا بھی الگ ہی بیان کر دی۔ ان ساری باتوں میں سے صحیح کون سی بات ہے۔

جن لوگوں نے پچھلا حکم دو عورتوں کے درمیان سحاقت مراد لیا ہے انہوں نے "وَاللَّذَانِ" سے مراد سدومیت لیا ہے یعنی مرد مرد سے بے حیائی کا مرتکب ہو اور بعض نے کہا کہ چونکہ یہ ابتدای حکم ہے جب کہ ابھی زنا کی سزا کا اعلان الٰہی نہیں ہوا تھا اس لئے جیسا کہ اور بہت سے احکام تدریجاً" نازل ہوئے یہ حکم بھی تدریجاً" نازل ہوا اور اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ اگر مرد اور عورت کے درمیان کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ان دونوں کو طعن لعن کرو اور مناسب سزا بھی دو تا آنکہ ان کیلئے کوئی واضح حکم نازل ہو جائے۔ پھر یہ بھی بیان کیا گیا کہ بعض اوقات حالات اس طرح بھی ہوتے ہیں کہ انسان انسانیت ہی سے گری ہوئی حرکت جب کرنے پر اترتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے اس لئے اگر کسی نے غیر فطری راستہ عورت کا استعمال کر لیا تو چنانچہ کچھ لوگ اس طرف بھی نکل گئے بہرحال اس سے اس طرح کی ساری صورتیں ہی مراد لی جا سکتی ہیں اس لئے کسی ایک کو قبول کر کے باقی کا رد ایک مزید گھٹیا بات ہے جس چیز سے برائی کا ہر ممکن راستہ بند ہوتا ہو اس سے کوئی ایک راستہ بند کر کے باقی راستوں کو کھول دینا بھی کوئی کمال کی بات نہیں بلکہ ہم کو ان سب مفسرین کا ممنون احسان ہونا چاہئے جنہوں نے ہر راستہ کی نشاندہی کر دی اور اس طرح اس راستہ کو بند کر دینا آسان ہوگیا۔ قرآن کریم کی یہ آیت بھی برائی کے راستہ کو بند کرنے کیلئے بیان کی جا سکتی ہے اگر یہ ابتدائی حکم ہے تو پھر ہم

کو اس کی ضرورت ہے کہ جہاں ذرا کمزوری دیکھی ان کی گوشمالی کی جا سکے فرمایا اگر کوئی ایسی بات ہے تو ان کو اذیت دو' دکھ پہنچاؤ تاکہ ان کو انرجی کے ضائع ہونے اور غیر فطری راستہ کے استعمال کی فطری سزا جو نتیجہ کے طور پر لازم ہو جاتی ہے اس سے ان کو آگاہی حاصل ہو اور پھر آئندہ ایسی حرکت کرنے سے باز آنے کی ذمہ داری وہ قبول کر لیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کی سزا اہل حل و عقد پر چھوڑ دو تاکہ وقت' حالات اور اتفاق و عادت ساری باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ خود اس کا فیصلہ کر لیں گے تو زیادہ بہتر نتیجہ برآمد ہوگا کیونکہ اتفاق بھی ممکن ہے اور عادت کا پختہ ہو جانا بھی اور ان ساری باتوں کی وضاحت بھی اس وقت ممکن ہے جب ایک چیز مشاہدہ میں آئے گی اور چونکہ یہ عمل برا ہے لیکن ایسا نہیں جس میں نسل کے خراب ہونے کا امکان ہو اگر یہ واقعہ دو مردوں کے درمیان ہے تو اس طرح نسل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ "اَلَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا" کا مصداق وہ لوگ ہیں جو غیر فطری طریقہ پر قضاء شہوت کرتے ہیں یعنی دو مرد استلذاذ بالمثل کے مرتکب ہوتے ہیں اور الفاظ قرآن کریم میں چونکہ لفظ اَلَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا موصول اور صلہ دونوں مذکر کے الفاظ ہیں اس لئے ان حضرات کا یہ قول بعید نہیں ہے گو جن حضرات نے زانی اور زانیہ مراد لیا ہے انہوں نے بطور تغلیب مذکر کا یہ صیغہ زانیہ کیلئے بھی شامل رکھا ہے تاہم موقع کی مناسبت سے استلذاذ بالمثل کی حرمت و شدت اور اس کی جزاء و تعزیر کا ذکر اس جگہ بے جا نہ ہوگا۔ احادیث و آثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے اور ان سات میں سے ایک پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے اور باقی پر ایک دفعہ فرمایا ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہ کے غضب میں ہوتے ہیں اور شام کو بھی اللہ جل شانہ ان سے ناراض ہوتے ہیں میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مرد جو عورتوں کی طرح بنتے ہیں اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے اور وہ مرد جو مرد سے قضا شہوت کرتا ہے۔ (الترغیب والترہیب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو تم قوم لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھ لو تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔ (الترغب والترہیب)

حافظ زکی الدین نے ترغب و ترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضرت علی رضی اللہ عنہ'

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ہشام بن عبدالملک رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے محمد بن المنکدر کی روایت سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں عرب کے ایک علاقہ میں ایک مرد ہے جس کے ساتھ عورت والا کام کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ارتکاب سوائے ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا اور ۔۔ جل شانہ نے اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے میری رائے ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے۔ دوسرے صحابہ کرام نے بھی اس پر اتفاق کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے آگ میں جلا دینے کا حکم دے دیا۔

مندرجہ بالا روایات استلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں۔ روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال لا ینظر اللہ عزوجل الی رجل اتی رجلا او امرءۃ فی دبرھا (الترغیب والترہیب)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے۔" (الترغیب والترہیب)

"حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے پھر فرمایا عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو۔" (الترغیب وترہیب)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ تعلق خاص قائم کرتا ہے۔" (الترغیب والترہیب)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مرد اذیت کے دنوں میں بیوی کے ساتھ تعلق خاص پیدا کرتا ہے یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب سے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے تو ایسے لوگ اس دین کے منکر ہوگئے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔"

اس فعل قبیح میں خواہ مرد کے ساتھ مرد یا عورت کے ساتھ عورت یا مرد عورت سے غیر فطری طریقہ سے فعل اختیار کرے تو اس کی تقریباً ایک جیسی سزا سنائی گئی ہے کبھی آگ میں جلایا جانا' دیوار گرا کر کچل دینا اور اونچی جگہ سے پھینک دینا اور تلوار سے قتل کر دینا اور اس طرح بالکل جان سے مار دینے کے علاوہ بھی

سزائیں سنائی گئیں تو نوعیت فعل، یا بار بار ایسی حرکت کی سزا اور اتفاقی امر کی کچھ ہلکی سزائیں دے کر حالات و وقت پر چھوڑ دیا گیا تاکہ وقت کے ساتھ اسلامی حکومت اس کی سزا میں کمی بیشی کرنے کی مجاز رہے۔

یعنی پہلے زنا جیسی بلا سے بچانے کیلئے راستہ کی رکاوٹیں تجویز کیں کہ سب سے پہلے مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول اور عورتوں کو غیر محرم لوگوں سے خلوت اختیار کرنے سے روکا۔ پھر عورتوں کو اس بات سے روکا کہ وہ بن سنور کر اور سنگھار کر کے باہر نہ نکلیں بلکہ پردہ میں رہ کر باہر جائیں ان کی چال ڈھال پر پابندی لگائی کہ وہ زینت کو ظاہر کرنے کیلئے زمین پر پاؤں زور سے نہ ماریں تاکہ چھن چھن کی آواز دوسروں کو راغب کرے لباس کی ہیئت پر پابندی لگائی اور سب سے بڑھ کر مردوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ جب راستہ پر چلو تو اپنی اپنی نظروں کو نیچا رکھو اور فضول تاک جھانک سے کام مت لو۔ پھر اتفاقی نظر کو معاف کرتے ہوئے دوبارہ خوب کو خوب تر دیکھنے سے منع فرمایا اور پھر اگر کوئی اتنا ہی آگے بڑھ گیا کہ ان ساری پابندیوں کی پروا کئے بغیر بے حیائی کے فعل کا کھلے بندوں مرتکب ہوگیا کہ چار لوگوں نے ان کو مصروف کار دیکھ لیا تو ایسے بے حیاؤں کیلئے سخت سزا سنا دی۔ ایسے اس جگہ غیر فطری فعل کے مرتکبین کو بھی علی الترتیب مار پیٹ تک لے آیا اور اس قدر سزا دلوا دی کہ وہ توبہ پر مجبور ہو جائیں اور آئندہ ایسی حرکت سے کلی طور پر باز آجائیں۔ فرمایا اگر وہ باز آجائیں اور اصلاح کرلیں تو اب تم بھی ان کو بار بار بے حیائی کا طعنہ مت دو کہ اس سے وہ حیا اتار پھینکنے پر مجبور ہی نہ ہو جائیں۔ "بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔" توبہ کے متعلق دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو، تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو تو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔" (الانعام ۶ : ۵۴)

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کیلئے صحیح طریق کار کیا ہے۔" فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُونَ (الاعراف ۷ : ۲۰۱)

"ہاں! جن لوگوں نے جہالت کی بناء پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کرلی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کیلئے غفور و رحیم ہے۔" (النحل ۱۶ : ۱۱۹)

مذکورہ روایات میں قوم لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم کفر و شرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی اور جب

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ

و بے خبری میں کر بیٹھتے ہیں اور پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں[۴۴] تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ اللہ بھی

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا جس کا ذکر سورہ اعراف میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

توبہ کا جو گر اس "جگت گرو" نے سکھایا وہ کوئی اور نہ سکھا سکا۔ ﷺ

۴۴ توبہ کیا ہے؟ کفارہ ہے انسان کے اس برے عمل کا جس کی برائی اس نے محسوس کر لی اور جو کام اس سے سرزد ہوا تھا اس سے اس نے رجوع کر لیا اور نادم ہوا کہ میرے اللہ! مجھ سے گناہ ہو گیا۔ میں اپنے گناہ کا تیری ذات کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے آئندہ ایسی حرکت سے باز آنے کا اقرار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اس سے وہ پاک ہوتا ہے اور اس سے ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل خلوص کے ساتھ کسی وقت اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کیلئے نیکوکاری کا اللہ سے مستحکم وعدہ کر لے تو اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی اللہ کی آغوش محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصہ اس کی ایک مثالی صورت کیلئے بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح ایک نادم ہونے والے انسان کو واپس لینے کیلئے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمت الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے حاشا للہ اس سے دنیا کا ہر مت اور دھرم قطعاً محروم ہے۔ جوگر اس "جگت گرو" ﷺ نے بتائے اور سمجھائے ان سے تورات خاموش ہے۔ زبور کی سریلی آواز مدھم ہے اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے۔ لیکن نبی اعظم و آخر ﷺ نے اپنے پیغام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا :

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا (مریم ۱۹ : ۶۰) "ہاں! جو کوئی باز آگیا' ایمان لایا اور نیک عمل میں لگ گیا تو بلاشبہ ایسے لوگوں کیلئے کوئی کھٹکا نہیں۔ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کے حقوق میں ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔" اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا :

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ○ (الفرقان ۲۵ : ۷۰) "ہاں! جو شخص ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ

ان پر لوٹ آتا ہے اور وہ یقیناً سب کچھ جانے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔[۴۵] ۱۷

لیکن ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو' برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب تو میں توبہ کرتا ہوں۔ اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔[۴۶] ۱۸

مسلمانو! تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں کہ عورتوں کو' میراث سمجھ کر ان پر زبردستی قبضہ

اللہ جانتا ہے کہ تائب کون ہوا اور دفع الوقتی کون کر رہا ہے

۴۵ بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے اور کرتا ہی جاتا ہے اس لئے کہ اس پر فوراً گرفت نہیں ہوئی اور وہ پکڑا نہیں گیا لیکن اگر کوئی معمولی کوفت پہنچی تو توبہ توبہ کرنے لگا۔ نمازیں پڑھے گا' وظیفے پوچھے گا' ہر وقت ورد میں رہے گا اور نفل پر نفل پڑھے گا۔ لیکن نظام الٰہی بھی عجیب واقعہ ہوا ہے کہ پھر اس کے دن بدل گئے گویا وہ ایک طرح سے جس پکڑ میں مبتلا تھا اس سے چھوٹ گیا اس طرح دفع الوقتی گویا ہوگئی۔ بس اس سے چھوٹنا تھا کہ وہ پہلے والی سرگرمی دوبارہ آگئی اور بے لگاہ ہوا تو ایسا کہ اب اس کو کوئی لگام دینے والا شاید نہ رہا معلوم ہوا کہ دراصل وہ اس کی توبہ توبہ نہ تھی بلکہ دفع الوقتی تھی وقت ٹل گیا اور پھر جو کچھ کرتا ہے وہ صرف عادۃً کر رہا ہے اس کی حالت اس طرح ہے کہ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔

بول اس کے بڑے میٹھے۔ شکل اس کی بہت خوبصورت گویا انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔ ظاہر داری اتنی خوب صورت کہ دیکھنے والا دیکھتے ہی مفتون ہو جائے لیکن حقیقت میں وہ بگلا بھگت ہے۔ ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ صحیح معنوں میں توبہ کس نے کی اور دفع الوقتی سے کون کام

لے رہا ہے۔ "وہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔" کہ دفع الوقتی کرنے والوں کو فوراً نہیں پکڑتا بلکہ ایک وقت تک موخر کر دیتا ہے۔

موت کو سامنے کھڑا دیکھ کر توبہ توبہ کرنے والوں کی کوئی توبہ نہیں ہے

۴۶ یہ مضمون قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ مجرمین موت کی سرحد میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر آخرت میں واصل جہنم ہونے تک بلکہ اس کے بعد بھی بار بار یہی درخواستیں کرتے رہیں گے کہ ہمیں بس ایک دفعہ دنیا میں اور بھیج دیا جائے۔ اب ہماری توبہ ہے۔ اب ہم کبھی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اب ہم سیدھی راہ چلیں گے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ :

"کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس لئے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہوگی۔ ورنہ ان کو سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا بھی جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہی منع کیا گیا ہے وہ تو ہیں ہی جھوٹے اس لئے اپنی اس خواہش کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لے رہے ہیں۔" (الانعام ۶ : ۲۷، ۲۸)

ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

"جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ اس کو جواب دیا گیا کہ اب تو ایمان لاتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد بپا کرنے والوں میں سے تھا۔" (یونس ۱۰ : ۹۰، ۹۱)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے رضائے الٰہی کے لئے بھی خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اس وقت وہ کہے گا کہ اے میرے رب! کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ اس کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔" (المنٰفقون ۶۳ : ۱۱)

پھر ارشاد الٰہی ہوا کہ "اس طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں، ان تمام لوگوں کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔" آیت کے اس حصہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ توبہ اور ایمان اس وقت تک نافع اور فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں جب تک آدمی اللہ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آجائے۔ عذاب الٰہی کی پکڑ شروع ہو جائے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا

یا توبہ کرنا اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان لانا ان کیلئے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہی اللہ کا مقرر کردہ ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔" (المومن ۴۰ : ۸۵) ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

"کاش تم انہیں اس وقت دیکھو جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑ لئے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آسکتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔" (سبا ۳۴ : ۵۳)

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز ہر مجرم اس طرح پکڑا جائے گا کہ گویا پکڑنے والا قریب ہی کہیں چھپا کھڑا تھا' ذرا اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو بس فوراً ہی دھر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوگا؟

فرمایا' اس لئے کہ ایمان لانے کی جگہ تو دنیا تھی اور وہاں سے اب یہ بہت دور نکل آئے ہیں۔ عالم آخرت میں پہنچ جانے کے بعد اب توبہ کا یا ایمان لانے کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جو رسول اور تعلیمات رسول ﷺ کی طرف بلائے جاتے تھے تو ان کے چہرے بل کھا جاتے تھے اور اللہ اور اس کے رسول اور قرآن کریم کی تعلیمات پر طرح طرح کے الزامات لگاتے تھے' آوازے کستے تھے اور فقرے چست کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ شخص ساحر ہے' کبھی کہتے مجنون ہے' کبھی توحید کا مذاق اڑاتے اور کبھی آخرت کے تخیل پر باتیں چھانٹتے۔ کبھی یہ افسانہ تراشتے کہ رسول کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور کبھی ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے کہ یہ محض اپنی نادانی کی وجہ سے رسول کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

"جس روز تمہارے رب کی بعض نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو کہ اچھا تم انتظار کرو' ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔" (الانعام ۶ : ۱۵۸)

یعنی آثار قیامت صغریٰ جس کو موت کہتے ہیں یا عذاب کی کوئی اور ایسی نشانی جو حقیقت کی بالکل پردہ کشائی کر دینے والی ہو اور جس کے ظاہر ہو جانے کے بعد امتحان اور آزمائش کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اس وقت اگر کوئی کافر اپنے کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اس کا ایمان لانا بے معنی ہے اور اگر کوئی نافرمان مومن اپنی نافرمانی کی روش چھوڑ کر اطاعت کیش بن جائے تو اس کی اطاعت بھی ویسے ہی بے معنی ہے اس لئے کہ ایمان اور اطاعت کی قدر تو اس وقت تک ہے جب تک حقیقت پردے میں ہے مہلت کی رسی دراز نظر آرہی ہے اور دنیا اپنی ساری متاع غرور کے ساتھ یہ دھوکا دینے کیلئے موجود ہے کہ کیسا خدا اور کہاں کی آخرت'

كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ

کر لو اور ایسا نہ کرنا چاہئے کہ جو کچھ' انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ لے نکلنے کیلئے ان پر سختی کرو اور انہیں روک رکھو اِلّا یہ کہ وہ علانیہ بدچلنی کی مرتکب ہوئی ہوں[۴۷] اور دیکھو عورتوں کے ساتھ معاشرت کرنے میں نیکی اور انصاف ملحوظ رکھو پھر اگر ایسا ہو کہ تمہیں وہ ناپسند ہوں'

بس کھاؤ پیو اور مزے لوٹو۔

مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۱۶۲' ۲۱۷۔

جلد دوم تفسیر سورہ آل عمران آیت ۱۹۱۔

عورتوں کو جو کچھ تم نے دیا ہے ان سے بزور لینے کی کوشش نہ کرو اور اپنا مقام مت بھول جاؤ

۴۷ اوپر چونکہ وراثت کی تقسیم کا مسئلہ بیان کیا گیا تھا اور مرنے والے کے ترکہ میں جن جن لوگوں کا حصہ بنتا تھا اس کی وضاحت کی تھی اب عربوں کی اس بری رسم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ان میں اس وقت موجود تھی جب قرآن کریم اتر رہا تھا اور اس کے کچھ نہ کچھ اثرات آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں گویا قرآن کریم پڑھنے والوں میں وہ جراثیم موجود ہیں جو اس وقت جاہل اور اکھڑ عربوں میں پائے جاتے تھے۔ رسم یہ تھی کہ جب کوئی آدمی مرجاتا تو اس کا بڑا لڑکا اگر ہوتا تو یا مرنے والے کا کوئی عزیز آکر اپنا کپڑا اس عورت پر یا اس کے خیمہ پر ڈال دیتا تھا اور بس کپڑا ڈالنے کے ساتھ گویا وہ اس کا وارث قرار پا جاتا۔ اس عورت کو اپنی ذات پر اب کوئی حق باقی نہ رہتا وہ عورت گویا اپنے خاوند کے بڑے بیٹے کی جس کو اس نے جنم نہیں دیا تھا بلکہ اس کے خاوند کا وہ بیٹا تھا اس کی میراث بن گئی اور اس کے رحم و کرم پر جو چاہے کرے نکاح کرے تو کر سکتا تھا لیکن بغیر مہر کے کیونکہ مہر اس کے باپ نے ادا کر دیا تھا اور چاہے تو اپنی میراث بنا کر چھوڑ دے اور سارے کام اس سے لے چاہے تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دے اور اس طرح اس کا حق مہر اس سے لے کر خود کھا جائے کیونکہ یہ حق مہر کا بدل ہے جو اس کے باپ نے ادا کیا تھا۔

قرآن کریم نے اس بری رسم کی تردید کی اور فرمایا کہ دیکھو تم اس طرح ان عورتوں کے وارث نہیں قرار پاتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر عورت مرجاتی تھی تو جس نے اس پر اپنا کپڑا ڈالا ہوتا تھا وہی اس کا وارث ہوتا تھا۔ ہاں! اگر کوئی عورت خاوند کی وفات کے بعد فوراً میکے چلی جاتی اور اس پر کوئی کپڑا نہ ڈال سکتا تھا پھر اس کو اختیار ہوتا جہاں چاہے نکاح کرے کیونکہ اس طرح وہ اپنے خاوند کے گھر سے نکل جاتی

كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا
كَثِيرًا ۱۹ ❀ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ

عجیب نہیں کہ ایک بات تم ناپسند کرتے ہو اور اس میں اللہ نے تمہارے لئے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو۔ ۱۹ (۴۸)

اور اگر تم ارادہ کر لو کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری کرو گے اور پہلی بیوی کو

تھی اور وہاں کی چیز کی وہ مالک نہ قرار پاتی۔ اسلام آیا تو اس وقت ابھی اس طرح کی رسومات جاری تھیں اس لئے ایک واقعہ اس طرح کا رونما ہوا جو مسلمان ہونے والوں میں تھا کہ ابو قیس بن اسلت انصاری کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوہ کبیشہ بنت معن انصاری رہ گئی ابو قیس کے بیٹے نے جس کا نام حصن تھا اپنا کپڑا کبیشہ پر ڈال دیا اور اس طرح گویا وہ اس کے نکاح کا وارث ہو گیا۔ لیکن اس کو اس طرح چھوڑے رکھا نہ خرچ دیا اور نہ ازدواجی زندگی بحال کی مقصد یہ تھا کہ اس طرح یہ تنگ ہو کر اس سے گلو خلاصی کی کوئی صورت اختیار کرے گی تو اس سے مال وصول ہو گا۔ کبیشہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ابو قیس مر گیا اور اس کا بیٹا میرے نکاح کا وارث ہو گیا۔ اب نہ وہ مجھے خرچ دیتا ہے نہ میرے ساتھ رہتا ہے اور نہ ہی میرا راستہ چھوڑتا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرا کوئی فیصلہ فرما دے گا اور جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو تو اس گھر میں بیٹھی رہ۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔" (ابن جریر اور ابن ابی حاتم)

حکم یہ آیا کہ "اے مسلمانو! تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں کہ تم عورتوں کو میراث سمجھ کر ان پر زبردستی قبضہ کر لو اور نہ ایسا کرنا چاہئے کہ جو کچھ انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ لے نکلنے کیلئے ان پر سختی کرو اور انہیں روک رکھو الّا یہ کہ وہ اعلانیہ بدچلنی کی مرتکب ہوں۔" اس طرح اس رسم بد کا قلع قمع ہو گیا اور ساتھ یہ بات بھی واضح فرما دی کہ ہاں! اگر کوئی عورت خاوند کی نافرمانی کرے اور بد خلقی سے پیش آئے اس کا حق ادا نہ کرے تو ایسے حالات میں مردوں کو اتنی اجازت دے دی کہ وہ جو کچھ انہوں نے حق مہر میں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس مانگ سکتے ہیں کہ وہ مال جو ہم نے تم کو دیا ہے وہ واپس کر دو اور تم اپنی راہ اختیار کرو یعنی طلاق کی اگر وجہ کوئی ایسی برائی ہو جس کی عورت مرتکب بھی ہو اور پھر اس سے باز بھی نہ آئے تو ایسی عورت سے مہر کا کچھ حصہ واپس لیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی مشروط طور پر کہ وہ طلاق حاصل کر لے اور اس کا مہر سارا یا کچھ حصہ واپس کر دے۔

مردوں کو مزید ہدایت کہ عورتوں سے حسن سلوک کرو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو

۴۸۔ ماں' باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں زن و شوہر کا رشتہ ہے اور اس بات کو اگر اس طرح کہہ دیا جائے کہ تعلقات کی فہرست میں پہلا درجہ زن و شوہر کا ہے اور دوسرا ماں باپ کا اور تیسرا درجہ اولاد کا تو بھی جائز و درست ہے کیونکہ زن و شوہری کا وہ رشتہ ہے جو بدل کر ماں باپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر اس جوڑ کے بعد ماں باپ کا روپ دھارنے کے نتیجہ میں اللہ نے اولاد جیسی عزیز ترین متاع دنیا کو رکھا ہے اور پھر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا اس طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب موجود تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلقات کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کیلئے رکاوٹ اور مانع بیان کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بودھ' جین' ویدانت' جوگ اور سادھوین کے سارے پیرو اس نظریہ کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا۔ (انجیل قری نتون باب ۷ : ۸) اسلام ہی وہ دین ہے جس نے آکر اس نظریہ کو باطل قرار دیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازواج میں ممکن ہے۔ کیونکہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے جو کسی کا شوہر نہ ہو' جو کسی کی بیوی نہ ہو' جو کسی کا باپ نہ ہو' جو کسی کی ماں نہ ہو' جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو' نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کیلئے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے' اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری پوری شہادت ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے بعثت سے لے کر اس دنیا سے رخصت ہونے تک عورت سے حسن معاشرت کا درس دیا اور قوم کے مردوں کو باور کرایا کہ تم میں بہتر انسان وہی ہو سکتا ہے جو اپنے اہل کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ خواہ ازدواجی زندگی اختیار کر کے امت کیلئے عملی سبق کے نمونہ قائم کر دے کہ حسن معاشرت اس چیز کا نام ہے۔

"عشر" کے ایک معنی مخالطت کے بھی ہیں یعنی مل جل کر رہنا اس سے معاشرہ کے معنی گھل مل کر رہنا کے ہوئے اور عشیر کے معنی قریبی اور دوست کے۔ اس طرح یہ لفظ بول کر زمانہ کو بتا دیا کہ عورت کا عشیر اس کا خاوند ہے اس لئے کہ وہ مرد اپنی عورت سے اور عورت اپنے مرد سے دوست کی طرح میل جول رکھتے ہیں۔ اس طرح اسلام نے پہلے دو حکم دے کر جن کا اوپر ذکر ہوا ایک بد رسم کو دور کیا اور اس حکم سے عورت کو جو

اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا

تم نے ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو بھی نہیں چاہئے کہ' اس میں سے کچھ واپس[۴۹] لے لو۔ کیا تم

صرف خواہشات کا ازالہ سمجھا جاتا تھا اس کی طرف توجہ دلائی کہ عورت صرف نفسانی خواہش کے ازالہ ہی کیلئے نہیں پیدا کی گئی بلکہ یہ خواہشات تو دونوں طرف برابر برابر رکھی گئی ہیں عورت اور مرد کا ایک خاص تعلق ہے اور پھر ایک لفظ "عَاشِرُوْهُنَّ" میں مرد اور عورت کے سارے تعلق کو بند کر کے رکھ دیا یعنی میاں بیوی کا تعلق ایک دوسرے سے صدیق اور سچے دوست کا تعلق ہے جو ایک دوسرے کے اپنی جان سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوتے ہیں اور پھر صرف لفظ معاشرت پر ہی انحصار نہیں رکھا جو بجائے خود سچے تعلقات کا مقتضی ہے بلکہ اس کے ساتھ تاکید کے طور پر لفظ بالمعروف بھی بڑھا دیا ہے یعنی ایسی معاشرت جو پہچانی گئی اور پسند کی گئی۔ پھر اس پر تاکید اور بڑھا دی کہ یہ دو طبائع کا ملنا ہے ممکن ہے کہ آپ کی طبع کے خلاف بھی کوئی چیز موجود ہو کیونکہ وہ بھی کوئی بے جان چیز نہیں جس طرح تمہاری طبع ہے اللہ نے اس کو بھی ایک طبع دی ہے اگر کہیں طبائع کا فرق نکل آئے جس کا امکان بہرحال موجود ہے تو ناپسندیدگی کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ تم ان سے اچھا میل جول نہ رکھو بلکہ ایسی صورت میں اپنی طبیعت پر کنٹرول کر کے ان سے حسن اخلاق سے پیش آؤ اور اس کنٹرول کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ جس چیز کو تم پسند نہیں کرتے آہستہ آہستہ وہی تمہارے لئے مرغوب ثابت ہونے لگے گی۔ اس درخت کی آبیاری کرو اور اس طرح اس پر پھل آنے دو پھر دیکھو یہ کتنا میٹھا ہے۔ اگر آتے ہی طبیعت کا جوڑ جڑ گیا تو پھر تمہارا کمال کیا ہوا کمال تو یہی کمال ہے کہ طبع کے فرق کے باوجود گھل مل جاؤ اور محبت کے اثر سے وہ چیز پیدا کر کے دکھاؤ جس کی کمی تم کو محسوس ہو رہی تھی پھر زندگی کا مطالعہ کرو کہ کتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے طبیعت میل نہیں کھاتی لیکن اس کے باوجود انسان ان کے کرنے پر مجبور ہے اور وہ کتنی ہی چیزیں ہیں جو دل کو لبھاتی ہیں لیکن انسان کو وہ چھوڑنا پڑتی ہیں اور جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو طبیعت خود بخود اعتراف کرنا شروع کر دیتی ہے کہ اس کرنے نے کتنا فائدہ دیا جو باوں نخواستہ کیا جاتا تھا اور اس طرح اس نہ کرنے سے کتنا فائدہ ہوا جس کے کرنے کو طبیعت پسند کرتی تھی۔

اپنا بچپن یاد کرو اور اس طرح ایک ایک چیز کا تجزیہ کرتے جاؤ تم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی اور نہ ہر میٹھا گھونٹ زندگی کیلئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک کڑوا گھونٹ زندگی کی ساری رعنائیوں کا سبب بن گیا۔ اس لئے برداشت سے کام لینا سیکھو کچھ دیر صبر کرو ایک دو گھونٹ گلے سے اترنے دو ممکن ہے اس سے طلب بڑھ جائے اور ناگواری آہستہ آہستہ گوارا ہونا شروع ہو جائے پھر یہی تعلق بہت سی بھلائیوں کا موجب بن جائے۔

اگر ازدواجی زندگی کی بحالی کی کوئی صورت نہیں رہی تو نقصان کو بخوشی قبول کر لو۔

۴۹ اوپر کی آیت میں بتایا تھا کہ ناپسندیدگی کے باوجود اعلیٰ طریقہ یہی ہے کہ آدمی بیوی کے ساتھ شائستہ طریقہ پر نباہنے کی کوشش کرے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اگر اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ اس تعلق کو استوار نہیں رکھا جا سکتا اور اس طرح کوئی نیا جوڑ بند لگانا چاہتا ہے تو یہ تو بہرحال نہ کرے کہ جو کچھ پہلی بیوی کو لکھ دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں مال بھی اس نے دیا ہے جب بھی اس کیلئے جائز نہیں کہ وہ اس کے واپس لینے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دے۔ استبدال کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عورت کو اول بدل کرنے میں کوئی برائی نہیں کیونکہ قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے کہ جب چاہو اور جو چاہو یہ بگڑے ہوئے ذہنوں کی تفہیم ہو سکتی ہے ایک صالح انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے تو فطرت انسانی کا تقاضا ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تم نے نکاح کیا تھا کیوں؟ اس لئے کہ فطرت انسان کا تقاضا تھا اور اس طرح طلاق دے دینے سے فطری تقاضا تو ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ وہ تو بدستور قائم ہے لہٰذا جو چیز برداشت نہیں ہو سکی اگر اس کو چھوڑنا چاہتے ہو تو اس کی جگہ کوئی دوسری لانا بھی تو اتنا ہی ضروری ہے اس لئے جو پہلے تم نے کیا تھا اس پر تم نے جو کچھ خرچ کیا اب اس کو بھول جاؤ اور اگر ابھی اس حق کا ادا کرنا تمہارے ذمہ واجب ہے تو فوراً ادا کر دو اور دل کی صفائی کے ساتھ اس نقصان کو بخوشی قبول کرو اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ اس نقصان کو نقصان ہی نہ سمجھو اور یہ کڑوا بول زبان تک بھی نہ لاؤ احسن طریقہ سے فارغ کر کے جو صورت تم کو پسند ہے وہ اختیار کرلو۔

پھر اس آیت کے آخری الفاظ میں مزید وضاحت فرما دی کہ کیا تم اپنا دیا ہوا مال لینے کی خاطر عورت پر کوئی بہتان لگاؤ گے یا کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب کرو گے یعنی جاہلیت کی طرح عورت کو دکھ دینا شروع کر دو گے تاکہ وہ مال کا کچھ حصہ یا سارا واپس کر کے خلع کر لے۔ مطلب بالکل واضح کر کے رکھ دیا کہ حالات ایسے پیدا کر دینا کہ طلاق دینے کا ارادہ ہونے کے باوجود اظہار نہ کرنا اور اوپر اوپر سے صلح اختیار کرنے کا اظہار کرنا اور اندر سے عورت کا حلقہ اس قدر تنگ کر دینا کہ وہ بیچاری بولنے پر مجبور ہو جائے اور اس طرح خلع کا بہانہ بنا کر اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے لینا دوہرا ظلم ہے جس کی سزا یقیناً مل کر رہے گی اس لئے کہ اس طرح انسانوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں سے واقف ہے اور وہ تمہاری ساری اسکیموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ آیت اس پر بھی صریح دلیل ہے کہ صداق یعنی حق مہر پر ایسی کوئی پابندی نہیں کہ اتنا ہونا چاہئے کیونکہ مہر کا تعلق خاوند کی حالت پر ہے اگر وہ آسودہ حال ہے تو اس حالت کے پیش نظر مقرر کرنا چاہے اور اگر وہ تنگدست ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق ہی کام کرے۔ لیکن ضروری بات تو یہ ہے کہ جو کچھ اس نے مقرر کیا ہے وہ خلوص نیت پر مبنی ہو بہتر ہے کہ بغیر مطالبہ اس کو ادا کر دے ورنہ مطالبہ پر تو بہرحال دل کی خوشی کے ساتھ ادا کرنا نہایت ضروری ہے ایسا نہ کرے کہ مجلس میں واہ واہ حاصل کرنے کیلئے

وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ

چاہتے ہو کہ انہیں دیا ہوا مال بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لے لو؟ ۲۰

اور پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اسے واپس لو جبکہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ

ہزاروں کا نام لے اور زیور کے ایک ڈھیر کو مہر سے منسوب کر دے لیکن جب ادائیگی کا وقت آئے تو بہانے تراشنے لگے یہ تعلیمات اسلامی کے سراسر منافی ہے اور نہایت ہی گناہ کی بات ہے۔

بلاشبہ اس جگہ "قِنْطَارًا" کا لفظ آیا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے لیکن اس پر "اٰتَيْتُمْ" کا لفظ بڑھا کر صاف بتا دیا ہے کہ مہر ادا کرنے کی چیز ہے صرف اعلان کر دینے یا تحریر کر دینے کی نہیں اور جس کو ادا کرنا ہے ظاہر ہے کہ اس کی مقدار مقرر ہونا لازمی اور ضروری چیز ہے اگر وہ ایک ڈھیر بھی ہو تو ڈھیر کا وزن اور حساب رکھنا ضروری ہے اور جس چیز کو عام زبان میں ڈھیر ساری چیز کا لفظ بولتے ہیں یقیناً اس کا وزن بھی ہوتا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی وزن ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مرد نے جو زیور بنوایا وہ اپنی حیثیت کے مطابق بنوایا وہ کتنا وزن یا کتنی مالیت رکھتا ہے سب کو معلوم ہے اور اگر معلوم نہیں تو بہرحال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس ڈھیر کی گنتی' وزن یا مالیت کا حساب لگانا ضروری ہے۔ پھر جہاں اس میں یہ وسعت موجود ہے کہ اس کو محدود نہیں کیا اس کے ساتھ یہ درس بھی دیا ہے جو احادیث میں موجود ہے کہ اعظم النساء برکۃ ایسرھن صداقا یعنی "سب سے بڑھ کر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔" جو آسانی کے ساتھ ادا کیا جا سکے۔ فرمایا من خیر النساء ایسرھن صداقا یعنی بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مہر باندھتے وقت عورت یا عورت کے وکیل مہر زیادہ باندھنے پر زور نہ دیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کی مقدار بالکل نہ ٹھہرائیں بلکہ لڑکے پر یا اس کے وکیل پر بات چھوڑ دیں اس میں بڑی برکت ہوگی اس لئے لڑکے والوں کیلئے یہ تاکید کافی ہے کہ لڑکا جو بخوشی ادا کر سکتا ہے اپنی حیثیت کے مطابق وہ بیان کر دے۔ ہاں! یہ خیال رکھنا چاہئے کہ شریعت اسلامی نے جب اس کی مقدار مقرر ہی نہیں فرمائی تو پھر شریعت کے ذمہ یہ لگانا کہ حق مہر بتیس روپے ۶ آنے یا اس طرح کا کوئی اور نام رکھنا اور اس کو شرعی حق مہر کے نام سے یاد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہو سکتا۔

مردوں کیلئے تاکیدی حکم کہ اس طرح دیا ہوا مال واپس لینا صریح ظلم ہے

۵۰ مردوں کا حق مہر دیا ہوا مال یا بیوی کو کوئی تحفہ و تحائف میں دی گئی کسی چیز کی واپسی خواہ چیز کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اس کو گناہ ظاہر اور ظلم عظیم سے تعبیر فرما کر اس کی برائی کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا اور قرآن کریم میں جہاں بھی ازدواجی زندگی کا ذکر کیا وہاں اس بات کی طرف ضرور توجہ دلائی اور ہر بار ایک نئے

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ

شوہر اور بیوی کا ملنا مل چکے ہو اور تمہاری بیویاں تم سے نکاح کے وقت پکا قول و قرار کرا چکی ہوں؟ ۲۱

اور دیکھو ان عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ لاؤ جنہیں تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہوں،

پیرائے سے بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کا دیا ہوا مال واپس مانگنا یا اس کے واپس لینے کی اسکیم بنانا کہ عورت خود بخود مجبور ہو کر واپس دینے پر راضی ہو جائے کو نہایت بری اور ذلیل حرکت قرار دیا۔ اس جگہ بھی دوبارہ تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ بیوی پر زنا وغیرہ کے بہتان لگانے کا کھلا گناہ کر کے اپنے مال واپس لینے کا راستہ نکالو۔ یعنی جب یہ معلوم ہوگیا کہ دیا ہوا مال واپس لینا صرف اس وقت جائز ہے جب بیوی کسی ناجائز حرکت کی مرتکب ہو اور انسان ظاہر ہے کہ اس کو برداشت نہیں کر سکے گا تو اب تم جو صورت بھی مال کو واپس لینے کی اختیار کرو گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ گویا اس نے کوئی ناجائز حرکت کی ہے جس کی وجہ سے تم طلاق دینا چاہتے ہو کیونکہ تم نے حق مہر اس سے طلب کر لیا ہے یا اس کی ادائیگی پر راضی نہیں ہو۔ اپنی زبان سے تم اس پر تہمت لگاؤ یا نہ لگاؤ بزبان عمل تم نے یہ ثابت کر دیا کیوں؟ اس لئے کہ تم نے دیا ہوا مال واپس لینے کی لاحاصل کوشش کی جس کا تم کو حق نہیں تھا۔

حق مہر کی واپسی کی صرف ایک صورت جائز ہے جس کو خلع کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس میں یہ شرط ہے کہ طلاق حاصل کرنے کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو اور خاوند کسی صورت بھی طلاق دینا نہ چاہتا ہو اور وہ اس میں بالکل سچا اور حق بجانب ہو۔ اگر کوئی صورت ایسی واقعہ ہو جائے تو وہ صرف اس قدر جو اس نے حق مہر میں دیا ہے واپس لینے کا مجاز ہے لیکن اس میں بھی اگر وہ اس اجازت سے استفادہ حاصل نہ کرے اور مہر واپس نہ لے تو زیادہ بہتر سمجھا گیا ہے اور یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے کہ وہ کسی ناگواری کے باعث اس حق کو استعمال کر سکتا ہے اسی طرح عورت کو یہ شرعی حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی ناگواری کا شکار ہو جائے تو اس حق کو استعمال کر لے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں یہ اجازت بھی دے دی گئی کہ چونکہ ابتداء عورت کی طرف سے ہوئی ہے اس لئے وہ حق مہر کی رقم یا جو چیز بھی اس نے لی تھی واپس کر دے پھر اس کو مرد کے مطالبہ پر چھوڑ دیا کہ وہ چاہے جو دیا ہے سب واپس لے لے یا اس کا کوئی مخصوص حصہ یا کوئی چیز جو اس نے ادا کی تھی اور اگر ابھی کچھ ادا نہیں کیا تھا تو ایسی صورت میں وہ پابند نہ رہا کہ ادا کرے۔ اور اس کا نام خلع رکھا۔

تفصیل کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ کی آیت ۲۲۹ حاشیہ ۳۹۰ ملاحظہ کریں۔

مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ

اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا' یہ بڑی ہی بے حیائی کی بات تھی' مکروہ و مردود شیوہ تھا اور

حق مہر کی واپسی کے ظلم و گناہ ہونے کے مزید دو مراحل کی طرف اشارہ

۵۱ حق مہر کی واپسی کے ایک مرحلہ کا ذکر اوپر کی آیت کے آخری حصہ میں کر دیا تھا اور باقی دو مرحلوں کا ذکر اس آیت میں کر دیا گیا ہے۔ فرمایا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اسے واپس لو جب کہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شوہر و بیوی کا ملنا مل چکے ہو۔" وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ۔

"افضیٰ"۔ فضا فراح مکان کو کہتے ہیں اور مفردات میں ہے کہ عورت کی طرف افضیٰ کنایہ میں زیادہ بلیغ اور تصریح میں زیادہ قریب ہے" خلا بها" سے یعنی اس سے خلوت کی اور مراد اس سے عورت سے خلوت کرنا ہی ہے۔ گویا اس طرح اس آیت میں اس حق مہر کی واپسی کی ممانعت کی وجہ بھی ذکر کر دی کہ جب تم دونوں کا صرف عقد ہی نہیں بلکہ خلوت صحیحہ بھی میسر آگئی اور ایک دوسرے سے بے حجابانہ ملنا بھی ہو چکا ہے کیونکہ اس صورت میں دیا ہوا مال اگر مہر کا ہے تو عورت اس کی پوری مستحق اور مالک ہو چکی ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کر دیا ہے اس لئے اب اس کی واپسی کے کوئی معنی نہیں اور اگر یہ دیا ہوا مال ہدیہ یا تحفہ ہے تو بھی اس کی واپسی کے لحاظ سے درست نہیں کیونکہ ہدیہ یا تحفہ دیا ہوا واپس مانگنے کا کوئی جواز شرعی اور قانونی نہیں ہے بلکہ وہ کتے کی قے کے مترادف ہے جو انسانیت کے اصول ہی کے منافی ہے۔

پھر اس مضمون کا تیسرا مرحلہ جو اس آیت میں دوسرے نمبر پر ہے یہ بیان فرمایا کہ "تمہاری بیویاں تم سے نکاح کے وقت پکا قول و قرار کرا چکی ہیں؟" اور تم نے یہ قول و قرار قبول کیا ہے اس سے مراد بھی وہی عقد نکاح کا عہد ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام پر خطبہ کے ساتھ مجمع کے سامنے کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس ازدواجی عہد و میثاق اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کیلئے عورت کو مجبور کرنا کھلا ہوا ظلم اور جور ہے جس سے مسلمانوں کو بڑی وعیدیں سنا سنا کر روکا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس آیت کو بھی بعض مفسرین نے منسوخ بتایا ہے اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۹ کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے جس میں خلع کی صورت میں عورت سے مہر جزوی طور پر یا کلی طور پر وصول کر لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ حالانکہ اس حکم کے منسوخ ہونے کا کوئی جواز یہاں نہیں بلکہ وہاں بھی اور یہاں بھی دونوں جگہ اہمیت اس کو دی گئی ہے کہ خلع ہونے کی صورت میں بھی مہر واپس نہ لیا جائے لیکن دونوں ہی جگہ اس کی ترغیب مراد ہے اگر مرد چاہے تو اس کو واپس لینے کی شرعی اجازت بقرہ میں بھی تسلیم کی گئی ہے اور یہاں بھی تسلیم کی گئی ہے۔ ہاں طلاق کی صورت میں اس کے جواز کی کوئی وجہ نہیں اس کی سختی سے ممانعت وہاں بھی موجود ہے اور یہاں بھی۔ اس طرح دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ اس سے نظم قرآنی کا کمال معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح حصے حصے کر کے

سَبِيلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ
وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيٓ
أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ
الّٰتِي فِي حُجُورِكُمْ مِّن نِّسَآئِكُمُ الّٰتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ ۖ فَإِن

۵۲

برادستور۔ ۲۲

دیکھو تم پر حرام ٹھہرا دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں، تمہاری دودھ پلانے والی مائیں، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، تمہاری بیویوں کی اولاد جو تمہاری گودیوں میں

مضمون کو مکمل اور مدلل کرتا ہے تاکہ کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔
باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے اس لئے کہ وہ ماں کے حکم میں داخل ہے

۵۲ جاہلیت کے دور میں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی جیسا کہ اوپر آیت ۱۹ میں مذکور ہوا بلکہ ان کے ہاں عام رواج تھا کہ جب کسی کا باپ وفات پا جائے تو اس کا بڑا لڑکا یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اٹھتا اور اس کی بیوی پر جو کپڑا ڈالنے والے کی حقیقی والدہ نہ ہوتی کپڑا ڈالنے سے اس کی ملکیت تصور ہوتی اب وہ چاہے اس کو زوجہ بنا کر ازدواجی تعلقات پیدا کرے اور چاہے کسی دوسرے کو نکاح میں دے کر اس کا حق مہر خود وصول کر لے اور چاہے کپڑا ڈال کر بس چھوڑ دے تاکہ وہ اس طرح کسی دوسری جگہ جا کر نکاح نہ کر سکے۔ اس رسم بد کو قرآن کریم نے بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منسوب کیا اور منع فرمایا کہ مسلمانوں تم اس حرام فعل کے کبھی مرتکب نہ ہونا۔

اس آیت سے مزید یہ بھی معلوم ہو گیا کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے خواہ اس سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس تحقیق کی ضرورت نہیں۔ صرف نکاح کا ثبوت کافی ہے اور بالکل اسی طرح بیٹے کی منکوحہ سے اس کے باپ کا نکاح حرام قطعی ہے خواہ اس کے بیٹے کے ساتھ اس کی منکوحہ کی خلوت صحیح میسر آئی ہو یا نہ آئی ہو اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں صرف نکاح کی شہادت موجود ہونا کافی ہے۔ باوجود اس کے کہ عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنے باپوں کی بیویوں سے نکاح کر لیتے تھے تاہم اس رسم کو وہ بھی اچھا نہ

لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ
الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ
سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۲۳﴾

ہے' البتہ یہ ضروری ہے کہ زنا شوئی کا تعلق بھی ہو گیا ہو اگر ایسا نہ ہوا ہو تو پھر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں کوئی پکڑ نہیں۔ تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں[۲] نیز یہ بات بھی حرام کر دی گئی ہے کہ دو بہنوں کو جمع کرو' پہلے جو کچھ ہو چکا اللہ بخش دینے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔[۵۳] ۲۳

سمجھتے تھے اس لئے اس نکاح کو نکاح مقت کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اسلام نے اس کو جڑ سے کاٹ دیا۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کے لفظی معنی تو یہی ہیں کہ جو پہلے گزر چکا سو گزر چکا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو نکاح اس طرح سے ہو چکے سو ہو چکے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو اب تک ہوا سو ہوا اور اب اس طرح کے جتنے نکاح ہیں وہ سب خود بخود ہی اس حکم سے فسخ ہو گئے اس لئے اب کوئی جواز نہیں ہے کہ ایسے نکاح اپنی اسی حالت میں قائم رہیں۔

غور کریں کہ حرمت سود کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال ہوئے ہیں چنانچہ ارشاد ہوا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ (البقرہ ۲ : ۲۷۵) اور "فَلَهُ مَا سَلَفَ" کے معنی بتائے گئے کہ جو گناہ اس سے ہوا ہو چکا اس سے درگزر کی جائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے سودی معاملہ کیا ہوا ہے وہ سود لیتا رہے بلکہ وہاں صاف صاف یہ ہدایت موجود ہے کہ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا (البقرہ ۲ : ۲۷۸) جو سود اس وقت تک لینا باقی ہے وہ بھی ترک کرنا پڑے گا۔ اس طرح اس جگہ بھی "اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" کے معنی ہیں کہ تمہارا فعل ہو چکا اس کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح پہلے ہو چکا وہ اب بھی باقی رہ سکتا ہے چونکہ اس آیت کے نزول کے بعد ایسا نکاح ناجائز ہو گیا اس لئے وہ تو فوراً منسوخ ہو جائے گا البتہ اس کے کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں یعنی "اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" میں استثناء گناہ سے ہے جواز فعل سے نہیں۔ اس کلمہ کو بیان کرتے وقت سارے الفاظ ایسے استعمال کئے گئے جو اس فعل کی نفرت پر بذاتہ دلالت کرتے چلے جاتے ہیں چنانچہ فرمایا "یہ بڑی ہی بے حیائی کی بات تھی" اِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً "مکروہ و مردود شیوہ تھا" مَقْتًا "اور نہایت ہی برا دستور" وَسَاءَ سَبِيلًا اس ایک ہی فعل کیلئے تینوں جملے استعمال کئے گئے اور تینوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر سخت ہیں جس سے اس فعل قبیح اور رسم شنیع پر دلالت کر رہے ہیں۔

حرام رشتوں کی پوری وضاحت فرمادی تاکہ کوئی بات مبہم نہ رہ جائے

۵۳ امہات ام کی جمع ہے اور اس میں قریب ترین وہ والدہ ماجدہ ہے جس کے بطن سے انسان پیدا ہوتا ہے یعنی جس بطن سے میں پیدا ہوا وہ میری ماں اور جس بطن سے آپ پیدا ہوئے وہ آپ کی ماں۔ یہ حقیقی ماں کہلاتی ہے۔ لیکن جس نے کسی جننے والوں کو جنا ہو وہ بھی ماں ہی کے حکم میں داخل ہے۔ جیسے والد کی ماں دادی اور والدہ کی ماں نانی۔ اسی طرح جب اوپر کو چلے جائیں تو ساری ماں ہی کے حکم میں داخل ہیں اور ان سب سے نکاح حرام ہے۔ پھر ان حرام رشتوں کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ جن میں سے بعض محرمات تو وہ ہیں جو کسی حال میں بھی حلال نہیں ہوتیں جنہیں محرمات ابدیہ کہا جاتا ہے اور بعض وہ ہیں جن کے ساتھ ایک وقت تک نکاح درست نہیں لیکن پھر ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ ان سے نکاح جائز ہو جاتا ہے ان آیات میں جو رشتے حرام قرار دیئے گئے ان میں سے شروع کی تین اقسام محرمات سببیہ' محرمات رضاعیہ اور محرمات بالمصاہرت تو محرمات ابدیہ میں داخل ہیں اور آخری ایک قسم منکوحہ عورتوں کی ہے وہ اس وقت تک تو حرام ہیں جب تک وہ کسی دوسرے کے نکاح میں ہیں لیکن جب دوسرے کے نکاح میں نہ رہیں تو ان سے نکاح کی ممانعت بھی اٹھ گئی۔ اب ان کی تفصیل الگ الگ کر کے بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :

"تم پر حرام ٹھہرا دی گئی ہیں تمہاری مائیں۔" یعنی اپنی والدہ سے نکاح حرام ہے اور لفظ "اُمَّهٰتُكُمْ" کے عموم میں دادیاں اور نانیاں سب داخل ہیں۔ یعنی جنہوں نے ان کے جننے والوں کو جنا ہے وہ سب اوپر تک حرام کر دی گئی ہیں۔

"تمہاری بیٹیاں" یعنی اپنی صلبی بیٹی سے نکاح کرنا حرام ہے اور لفظ "وَبَنٰتُكُمْ" کے عموم میں بیٹی کی بیٹی نیچے تک اور بیٹے کی بیٹی نیچے تک داخل ہوگئیں گویا لڑکی اور لڑکی کی لڑکی اور اس طرح بیٹے کی لڑکی اور بیٹے کی لڑکی کی لڑکی سے بھی۔ وقس علی ہذا۔

"تمہاری بہنیں" یعنی اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے اور لفظ "اَخَوٰتُكُمْ" کے عموم میں باپ شریک بہنیں اور ماں شریک بہنیں سب داخل ہوگئیں یعنی علاتی اور اخیافی بہنیں سب حرام ہیں۔

"تمہاری پھوپھیاں" یعنی حقیقی باپ کی حقیقی بہن سے نکاح حرام ہے اور اسی طرح علاتی پھوپھی اور اخیافی پھوپھی بھی اس حکم میں داخل ہے اس لئے ان سے بھی نکاح حرام ہے۔

"تمہاری خالائیں" یعنی حقیقی والدہ کی بہن سے نکاح حرام ہے خواہ والدہ کی حقیقی بہن ہو یا علاتی بہن ہو یا اخیافی بہن ہو سب اس حکم میں داخل ہیں اور سب سے نکاح حرام ہے۔

"تمہاری بھتیجیاں" یعنی حقیقی بھائی کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے اور اس طرح علاتی بھائی کی بیٹی ہو یا اخیافی بھائی کی بیٹی ہو ان سے نکاح حرام ہے۔

"تمہاری بھانجیاں" یعنی تمہاری حقیقی بہن کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے اور اس طرح علاتی بہن کی بیٹی سے بھی اور اخیافی بہن کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے۔

"تمہاری دودھ پلانے والی مائیں" جن عورتوں کا دودھ پیا ہے اگرچہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حکم نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں اور ان سے بھی نکاح حرام ہے۔ دودھ خواہ تھوڑا پیا ہو یا زیادہ۔ ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدد بار پیا ہو ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس حرمت کو اصطلاح میں حرمت رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہاں! حرمت رضاعت اس عمر اور اس زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے اس لئے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کا ارشاد ہے کہ انما الرضاعة من المجاعة یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی وہ اس زمانہ میں دودھ پینے سے ہوگی جس زمانہ میں دودھ پینے سے ہی سے بچے کا نشوونما ہوتا ہے (بخاری و مسلم) اور یہ مدت بعض کے نزدیک دو سال اور بعض کے نزدیک اڑھائی سال ہے۔ لیکن دو سال والی بات زیادہ صحیح ہے۔

"تمہاری رضاعی بہنیں" یعنی رضاعت کے رشتہ سے جو بہنیں ہوں ان سے بھی نکاح حرام ہے پھر تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایام رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پی لیا تو وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی اور اس عورت کا شوہر ان کا رضاعی باپ بن گیا۔ پھر اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے اور اس رضاعی باپ کی ساری اولاد خواہ اس بیوی سے ہو جس کا انہوں نے دودھ پیا یا کسی دوسری بیوی سے ہو وہ رضاعی بہن بھائی ہوگئے اور اس طرح اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں اور رضاعی باپ کی بہنیں پھوپھیاں ہوگئیں اور اس رضاعی باپ کے بھائی چچا بن گئے اور ان سب میں باہم حرمت رضاعت ثابت ہوگئی۔ مختصر یہ کہ نسب کے لحاظ سے جن رشتوں کے ساتھ نکاح حرام تھا وہ سارے رشتے رضاعت کی وجہ سے اس طرح کے سارے رضاعی رشتے بھی حرام ٹھہر گئے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة (بخاری) اور اس طرح مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ ان اللہ حرم من الرضاعة ما حرم من النسب (بحوالہ مشکوۃ المصابیح ص ۲۷۳)

دودھ عورت نے پلایا جس سے رضاعت قائم ہوگئی لیکن اس کے خاوند سے کیا تعلق ہوا؟

اس طرح رضاعت کا معاملہ بہت لمبا اور دور تک پھیلا ہوا ہے اس لئے یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ رضاعت ثابت کرنے کیلئے دو دیندار مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے صرف کسی عورت کے کہہ دینے سے کہ میں نے فلاں کو دودھ پلایا ہے۔ کافی نہیں۔ احتیاط کا معاملہ دوسری چیز ہے۔ دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ کسی عورت کا دودھ پینے سے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اس عورت کا دودھ پیا ہے اس لئے اس عورت کے رشتوں سے رضاعت ثابت ہوگئی لیکن اس عورت کے خاوند سے اس کا کیا تعلق ہوا کہ اس کی طرف سے بھی جتنے رشتے تھے وہ حرام قرار پا گئے؟ بات فی الواقع سمجھنے کی ہے اور اگر

اس کی سمجھ میں آجائے تو بہت سے الجھے ہوئے مسائل خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اس بات کی اصل یہ ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لبن الفحل" کہ دودھ مذکر کی طرف سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک مذکر و مونث کا ملاپ نہیں ہوتا بچہ ممکن نہیں اور بچہ کی افزائش کیلئے دودھ کی غذا لازم تھی اس لئے قدرت نے مذکر کے ملاپ سے دونوں چیزوں کا بندوبست کر دیا بچہ کا بھی اور بچہ کی غذا کا بھی اب اس غذا کو کوئی استعمال کرے یا نہ کرے بہرحال اتنی بات تو معلوم ہوگئی کہ دودھ کا تعلق بھی صرف مادہ سے نہیں بلکہ نر و مادہ دونوں سے ہے۔ اس لئے اگر مرد کے ہاں کسی طریقہ سے دودھ پیدا ہو جائے تو نر و مادہ کا الحاق اس میں بھی لازم و ضروری قرار پائے گا۔ دوسری بات یہ کہ یہ دودھ غذائیت کا کام نہیں دے گا اور نہ اس سے رضاعت ثابت ہوگی۔

"تمہاری بیویوں کی مائیں" بھی شوہر پر حرام ہیں یعنی جن کو خوش دامن یا ساس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ بھی ابدی طور پر حرام ہو جاتی ہیں خواہ ان کی بیٹیاں زندہ ہوں یا وفات پا گئی ہوں یا ان کو طلاق دے دی گئی ہو ہر حال میں بیوی کی ماں ابدی طور پر حرام ہوگئی اور یہی بات رضاعت میں بھی ہے یعنی رضاعی ماں کی ماں ہو یا رضاعی ماں کی نانی یا دادی سب کا ایک ہی حکم ہے۔ پھر یہ بھی کہ نفس نکاح ہی سے بیوی کی ماں حرام ہو جاتی ہے اس سے خلوت صحیح ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اس جگہ اس تفصیل کی ضرورت نہیں بلکہ ماں کا رشتہ ہی اتنا نازک ہے کہ اس کا ذکر ہی حرمت کیلئے کافی ہے۔

"تمہاری بیویوں کی اولاد جو تمہاری گودیوں میں ہوں" یعنی جس عورت کے ساتھ نکاح کیا اور نکاح کے بعد خلوت صحیحہ بھی میسر ہوگئی یعنی ازدواجی جوڑ بھی جڑ گیا تو اس عورت کی لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہے۔ اس طرح اس کی پوتی اور نواسی بھی حرام ہوگئیں ان سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ لیکن اگر نکاح ہوا لیکن ازدواجی جوڑ نہیں جوڑا گیا تو وہ لڑکیاں جو اس کی دوسرے خاوند سے ہوں وہ حرام نہ ہوں گی۔ منکوحہ کی وہ لڑکی یا لڑکا جو دوسرے خاوند سے ہو وہ ربیبہ یا ربیب کہلاتا ہے۔ وہ گود میں بیٹھنے کے قابل ہو یا نہ ہو۔ پرورش اس کی اس نے کی ہو یا کسی دوسرے نے بیوی کی اولاد ہر حال میں حرام ہے۔

"تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں" یعنی حقیقی بیٹے کی بیوی حرام ہے اور بیٹے کے عموم میں پوتا اور نواسا بھی داخل ہیں لہٰذا ان کی بیویوں سے بھی نکاح جائز نہیں ہے اور اس طرح "مِنْ اَصْلَابِكُمْ" کی قید نے متبنیٰ بیٹوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا یعنی ایسے بیٹے جو کسی لحاظ سے بیٹے تو نہیں تھے لیکن صرف ان کو بیٹا بنا لیا گیا۔ اولاد نہ ہونے کی غرض سے یا پیار و محبت یا اس طرح کی کسی وجہ سے اس کو بیٹا بنا لیا حالانکہ اس کا حقیقی باپ کوئی دوسرا ہے خواہ وہ معلوم ہے یا معلوم نہیں ہے۔ اس لئے کہ متبنیٰ بیٹے کے حکم میں نہیں ہے جیسے خود رسول اللہ ﷺ نے زید کو بیٹا بنا لیا لیکن نبوت کے بعد جب یہ حکم نازل ہوگیا تو آپ ﷺ نے زید کو زید بن الحارثہ کے نام سے بلانا شروع کر دیا اور قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ تمہارے مردوں میں

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور دیکھو وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔ ہاں! جو عورتیں

سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔

"دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔" گویا یہ حرمت وقتی ہے کہ جب تک ایک بہن نکاح میں ہے اس وقت تک اس کی دوسری بہن سے نکاح حرام ہے لیکن اس کی وفات کے بعد یا اس کو طلاق دے دینے کے بعد یہ حرمت ساقط ہو جائے گی اور اب بیوی کی بہن سے شادی کرنا جائز و درست ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح دونوں بہنیں بیک وقت ایک آدمی کے نکاح میں نہیں ہوں گے بلکہ یکے بعد دیگرے ہوں گی تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔ دو بہنیں بیک وقت نکاح میں اکٹھی نہیں ہو سکتیں یہ دونوں بہنیں حقیقی ہوں یا علاتی ہوں یا اخیافی ہوں نیز جو یکے بعد دیگرے کی قید لگائی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی عدت گزارنے کے بعد دوسری سے نکاح ہو سکتا ہے عدت کے اندر نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عدت طلاق ہی کی ہو سکتی ہے موت کی نہیں کیونکہ موت کے بعد کوئی دوسرا نکاح اس دنیا میں نہیں کر سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عدت عورت کیلئے ہوتی ہے مرد کیلئے نہیں۔ لہٰذا ایک بہن کی وفات ہو جائے جو کسی مرد کے نکاح میں تھی تو اس کی وفات کے بعد وہ اپنی بیوی کی دوسری بہن سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی نے ایک عورت کو طلاق دی ہو تو جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

اس طرح پھوپھی، بھتیجی، خالہ، بھانجی کو بھی ایک وقت میں نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا اور اس کا اصول اس طرح سمجھ میں آنا آسان ہے کہ دو ایسی عورتیں جن میں سے اگر ایک مرد ہوتا تو ان کا آپس میں نکاح حرام تھا وہ دونوں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں اکٹھی نہیں رہ سکتیں یعنی ایک وقت میں ایسی دو عورتوں سے نکاح حرام ہے اور یہ ایسا پکا اور پختہ اصول ہے کہ کسی سے مسئلہ پوچھنے کی ضرورت و حاجت باقی نہیں رہتی۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ فرمایا ہاں! جو گزر گیا سو گزر گیا یعنی یہ حکم نازل ہونے سے پہلے اپنے علاقائی رواج کی وجہ سے جو کچھ کوئی کر بیٹھا وہ معاف ہے۔ ہاں! اس کے بعد اگر کسی کے ہاں دو بہنیں اکٹھی ہوں تو ایک کو رکھنا اور دوسری کو چھوڑ دینا ہے اس طرح اگر دو ایسی عورتیں بیک وقت کسی کے نکاح میں ہوں جن میں سے کسی ایک کو اگر مرد تصور کریں تو دونوں کا نکاح جائز نہ ہوگا ان میں سے ایک کو رکھ کر دوسری کو فارغ کرنا لازم ہوگیا۔ چنانچہ اس حکم کے نزول کے بعد جہاں جہاں اس طرح کی غلطی موجود تھی وہ درست کر دی گئی اور اس کی مثالیں احادیث و تاریخ میں عام ملتی ہیں۔

"پہلے جو کچھ ہو چکا اللہ بخش دینے والا، رحمت رکھنے والا ہے۔" یہ حکم نازل ہونے سے قبل جو کچھ ہوگیا وہ ناسمجھی اور رواج کی غلطی کی وجہ سے تھا اب زیادہ اس کا افسوس نہ کرو اللہ بخش دینے والا اور معاف کر

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

تمہارے قبضے میں آگئی ہوں یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ٹھہرا دیا گیا ہے۔[۵۴] ان عورتوں کے علاوہ، تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، بشرطیکہ قید و بند میں رہنے کیلئے۔ نہ کہ نفس پرستی

دینے والا ہے۔ جہالت کی وجہ سے جو ہوا اس پر گرفت نہیں ہوگی۔

وہ عورتیں جو دوسروں کے نکاح میں موجود ہیں تمہارے نکاح میں نہیں آسکتیں

۵۴ جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو دوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد شوہر والی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح گویا یہ رد ہے ان لوگوں کا جو یہ کہتے ہیں کہ ملک یمین سے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بغیر نکاح ہی اس کو بیوی بنایا جا سکتا ہے۔ ایک شخص نے جب اپنی ملک یمین کو کسی دوسرے کے نکاح میں دے دیا تو اس طرح جس کے نکاح میں وہ دی وہ اس کا نکاح کی وجہ سے شوہر ہوگیا اور ظاہر ہے کہ وہ اس سے زنا شوئی کا تعلق قائم کرے گا اور دوسرا جس کی وہ ملک یمین ہے اگر وہ بھی ملک یمین ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ وہی تعلق قائم کرے گا تو گویا عملاً اس عورت کے دو شوہر ہو گئے ایک نکاح کی وجہ سے اور دوسرا ملک یمین ہونے کے سبب سے اور یہ بات حرام ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ان لوگوں کا رد بھی آگیا جو اپنے الحاد کی وجہ سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ مردوں کو جب ایک سے زائد بیویوں کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ایک سے زائد شوہروں کی ضرورت ہو سکتی ہے لہٰذا ان کو بھی متمتع ہونے کی اجازت ہونی چاہئے۔ اس آیت نے حکماً ان کا بھی رد کر دیا کہ ایسا ممکن نہیں ہو سکتا اور یہ بات عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ اس طرح بات آگے بڑھے گی اور مردوں کو حمل کی باری مقرر کرنا پڑے گی۔ اذیت کے دنوں کو اپنے سر لینا پڑے گا اور وضع و رضع جیسی مصیبتوں سے گزرنا پڑے گا کہ یہ سارے کام باری باری انصاف کے ساتھ چلتے رہیں ایسا کیوں ہو کہ ہر بار عورت ہی حمل کی مصیبت برداشت کرے اور ہر ماہ عورت ہی اذیت کے دنوں کیلئے مجبور ہو۔ اس طرح یہ دین کا مذاق اڑانے والے خود مذاق بن کر رہ جائیں گے اور جو باتیں اللہ نے ان کے ذمہ نہیں ڈالیں ان کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے سر نہ لیں۔ بلکہ جو کام اللہ نے عورتوں کیلئے مخصوص کر دیئے ہیں وہ انہی کے ذمہ رہنے دیں اور جو کام مردوں کے ذمہ مخصوص کئے ہیں وہ ان ہی کو نباہتے رہیں تو خیر اس میں ہے ورنہ نماز معاف کراتے کراتے روزوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔

یورپ کی عینک اتار کر دیکھیں تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مرد کیلئے کثرت ازدواج ایک نعمت ہے جسے ہر مذہب و ملت میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ جس پر انسان کی تاریخ شاہد ہے لیکن عورت کیلئے ایک وقت میں ایک

سے زائد شوہر ہونا اس عورت کیلئے ایک بہت بڑا عذاب ہے اور جو دو مرد ایک عورت کے شوہر بن جائیں ان کیلئے بھی باعث ننگ و عار ہے اور سراسر بے شرمی و بے حیائی کی بات ہے۔ پھر اس میں کسی بچہ کے ثابت النسب ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ جب ایک عورت سے کئی مرد استمتاع کریں گے تو پیدا ہونے والی اولاد کو ان میں سے کسی ایک کا بیٹا قرار دینے کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہے گا اور حسب و نسب باقی نہ رہے گا اور پھر جب حسب و نسب باقی نہ رہا تو حلال و حرام کی تمیز نہیں رہے گی اور یہ وہ صورت ہوگی کہ انسان انسان نہیں بلکہ ایک حیوان رہ جائے گا اور بلے کتے اور ایسے انسانوں میں سوائے نطق کے کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا اس طرح کا بدترین مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو انسانیت کو ضائع کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے انسان بھی انسان نہ رہیں اور جن کی غیرت و حیاء کا اس طرح جنازہ نکل چکا ہے ایسے لوگ اولاد اور والدین کے حقوق کی لائن سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے خود محروم ہو چکے ہیں اور پوری انسانیت کو ان سے محروم کرنے کی فکر میں ہیں۔ جب نسب ہی ثابت نہ رہا تو باہمی حقوق و فرائض کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ اس لئے خالص طبعی اور عقلی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو ایک عورت کیلئے متعدد شوہر ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

ا۔ ازدواجی زندگی کا بنیادی مقصد تناسل ہے اس اعتبار سے متعدد عورتیں تو ایک مرد سے حاملہ ہو سکتی ہیں اس لئے وہ ایک مرد سے رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک عورت متعدد مردوں سے حاملہ نہیں ہو سکتی بلکہ وہ ایک ہی مرد سے حاملہ ہوگی اور اس طرح جب وہ ایک مرد سے حاملہ ہو چکی تو اس طرح دوسرے مردوں کی قوت ضائع ہوگئی اور شہوت رانی کے سوا ان کو کیا حاصل ہوا۔

ب۔ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں صنف نازک ہے وہ سال کے اکثر حصہ میں استمتاع کے قابل ہی نہیں رہتی۔ بعض حالات میں اس کیلئے ایک ہی شوہر کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس طرح کئی طرح کی بداعتدالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا فریقین حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں اس لئے عورت کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک سے زائد شوہروں کے بندھن میں وہ بندھ سکے۔ ہاں! ایسی عورت کو انسانیت کے سارے اصول توڑ کر حیوانی زندگی ہی پر گزر بسر کرنا پڑے گا اور آج یورپ میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

ج۔ چونکہ مرد جسمانی قوت کے لحاظ سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ طاقت و قوت رکھتا ہے کیونکہ وہ سخت جان ہے اور اس قوت عمل کیلئے اس کو زیادہ مواقع فراہم ہیں کہ جن دنوں میں عورت حمل میں ہے۔ رضاعت کی منازل طے کر رہی ہے اور اس طرح کبھی وہ اذیت ماہانہ کے دنوں میں مصروف ہے۔ ان سارے کاموں پر اس کی قوت صرف ہو رہی ہے اس لئے اگر کسی مرد میں اتنے لمبے وقت کیلئے انتظار مشکل ہے تو اس کا عقلی طور پر بھی حق ہے کہ اس قوت کے جائز اور صحیح مصرف کیلئے اس کو دوسری بیوی کی اجازت ہو۔ ورنہ

وہ دوسرے ناجائز طریقے استعمال کر کے پورے معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنے گا۔ اس لئے عقل بھی اس بات سے انکار کرتی ہے جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔

دین اسلام میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ کسی مرد کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت سے دوسرا نکاح حرام قرار دیا بلکہ کسی عورت کو جب اس کا شوہر طلاق دے دے یا شوہر وفات پا جائے تو بھی عورت کے ساتھ عدت کے دنوں میں نکاح حرام کر دیا تاکہ حسب و نسب محفوظ رہے اور اس میں گڑبڑ نہ ہو۔

"المحصنت" اور "المحصنین" کے الفاظ شادی شدہ عورتوں اور مردوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں

قرآن کریم کی اس آیت میں جو لفظ استعمال کیا گیا وہ "اَلْمُحْصَنٰتُ" ہے جو "محصنة" کی جمع ہے اور وہ "حصن" سے ہے اور "حصن" کے معنی قلعہ کے ہیں۔ جس کی جمع "حصون" آتی ہے اور اسی سے "تحصن" ہے جس کے معنی ہیں کہ قلعہ کو اپنا مسکن بنایا اور اس سے یہ لفظ ہر طرح کی حفاظت پر استعمال ہونے لگا جیسے "فرس حصان" وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچا لیتا ہے۔ درع حصینة وہ زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ اس سے احصان ہے جس کے معنی "نکاح کرنا" کے ہیں جیسے قرآن کریم میں فَاِذَآ اُحْصِنَّ ای زوجن۔ وَاَحْصَنَهٗ ای زوجه۔ تَحَصُّنًا ای تزوجا و زنا و معنا۔ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ای زوجت۔ اَلْمُحْصَنَاتُ ای المتزوجات اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے الفاظ قرآن کریم میں سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کیلئے اور حدیث شریف میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کیلئے استعمال ہوئے ہیں اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج (مشکوۃ المصابیح بحوالہ بخاری و مسلم۔ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) "اے نوجوانو! تم میں جو بھی استطاعت رکھے شادی کرے کہ اس سے نظر اور شرم گاہ کی حفاظت ہو جاتی ہے۔"

المحصنة وجمعها محصنت هی الحرة او العفیفة او المتزوجة آزاد، پاکباز اور شادی شدہ عورت کو محصنہ کہتے ہیں۔ اس طرح محصن آزاد، پاکباز اور شادی شدہ مرد کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسے اس آیت زیر نظر میں "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ" محصنین ای متزوجین استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کی تفسیر چار طریقوں سے کی گئی ہے اور چاروں ہی طریقوں سے صحیح اور درست ہے۔

اول "مُحْصَنٰتٌ" سے شادی شدہ عورتیں مراد لی گئی ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس طرح اس کی دو صورتیں ہیں پہلی یہ کہ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد وہ عورتیں لی جائیں جو جنگ میں قید ہو کر ملک یمین ہو جاتی ہیں اور اس طرح معنی آیت کے اس طرح ہوں گے "خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آجائیں۔" اور دوسری صورت یہ ہے کہ ملک یمین سے مراد ملک نکاح لی جائے تو اس طرح آیت کے معنی یہ ہوں گے "خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک نکاح میں آجائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہو جائے۔"

يَأْمُوَالِكُمْ مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ

کیلئے اپنا مال خرچ کر کے ان سے نکاح کرو۔ پھر جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا ہے تو چاہئے

کیونکہ جب تک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہو جائے ایسی عورت ملک نکاح میں نہیں آسکتی۔

دوم "مُحْصَنٰتٌ" سے مراد آزاد عورتیں لی جائیں تو اس طرح بھی دو ہی صورتیں ہوں گی پہلی یہ کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد وہ عدد لیا جائے جو اللہ نے بیک وقت نکاح میں لانے کی حد مقرر کر دی ہے یعنی چار اور دسری یہ کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں جائز طور پر آچکی ہیں یعنی دل کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی میں اور دوسری ساری شرائط کے ساتھ تو اس طرح دونوں صورتوں میں معنی یہ ہوں گے "آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زیادہ تمہارے لئے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لئے حرام ہیں سوائے اس کے کہ جائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں آئیں۔"

اس طرح پہلے پیرا کی دو صورتوں میں سے دوسری صورت اور دوسرے پیرے کی دونوں صورتوں کو ملا کر تینوں صورتوں میں جو معنی کئے گئے ہیں ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا اور پہلی صورت پر ذرا غور کرنا اور ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے اور اس طرح بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح تمام منکوحہ عورتوں سے نکاح حرام قرار پاتا ہے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہوں اور اس طرح گویا دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا گیا اور حکم دیا کہ "کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا ناجائز ہے۔ سوائے اسی منکوحہ عورت کے جو ملک یمین ہو جائے۔" یعنی شادی شدہ عورت جب کسی کی ملک یمین ہو جائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ اس میں سمجھایا جا رہا ہے کہ نکاح کے بغیر کسی قسم کا تعلق مرد و عورت کا ہونا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ ہاں! اس آیت میں ملک یمین یعنی باندی سے نکاح کر لینے کی اجازت کا حکم دیا جا رہا ہے اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہے جن میں سے بعض شرائط کا ذکر آگے والی آیت میں دیا جا رہا ہے اور عام شرائط قرآن کریم کی دوسری آیات میں موجود ہیں مثلاً یہ کہ مشرکہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہے اور یہ بات جو لوگوں میں معروف ہے اور علماء و مفسرین کی خاصی تعداد اس طرف چلی گئی ہے کہ "ملک یمین" کے ساتھ نکاح کی ضرورت نہیں بالکل لغو ہے اور اس کی پوری وضاحت ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

مذکورہ عورتوں کے سوا باقی عورتوں سے تم نکاح کر سکتے ہو

۵۵ ان عورتوں کے ماسوا عورتوں سے یعنی جن کا ذکر "لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ" سے شروع ہو کر "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" تک ہو چکا ہے تمہارا نکاح جائز و درست ہے لیکن اس کے ساتھ دو شرطیں مزید ہیں اور وہ دونوں شرطیں بیک وقت مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح مہر کے ساتھ ہو اور دوسری شرط یہ کہ اس

مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

کہ جو مہران کا مقرر ہوا تھا وہ ان کے حوالے کر دو۔[۵۶] اور مہر مقرر کرنے کے بعد اگر آپس کی رضا

نکاح سے مقصود عورت کو اپنی حمایت و حفاظت میں لینا ہو یعنی مستقل زوجہ بنانا مطلوب ہو نہ کہ وقتی طور پر شہوت رانی کر کے آگ پر پانی ڈالنا کہ چار آنہ دیئے' اپنی ہوس کی آگ بجھائی اور چلتے بنے۔

مہر کی شرط لگانے کا اصل مقصد عورتوں کے معاملے میں اکراہ یا توارث کے ان امکانات کا بالکل خاتمہ کرنا ہے جن کی طرف اوپر اشارات دیئے گئے ہیں اور جو دور جاہلیت کے رواج میں پایا جاتا تھا۔ اس کا بہت حد تک تدارک تو رحمی رشتوں کو حرام قرار دینے سے ہوگیا جن کو لوگوں نے اپنے اپنے رواج کی وجہ سے بھلا دیا ہوا تھا اور رہی سہی کسر اس شرط نے پوری کر دی اور اس طرح جاہلیت کی رسم دفن کرنے کیلئے مہر کا حق لازم کر دیا گیا۔ دوسرا مقصد اس کا یعنی مہر کا یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدہ کی حیثیت حاصل ہو جائے اس کو بچوں کا کھیل نہ سمجھا جائے کہ یہ گیند بلا یا "اٹی ٹلا" نہیں بلکہ زندگی کی قید و بند کا معاملہ ہے اور اس معاہدہ سے حقوق و فرائض لازم آتے ہیں جن کو پورا کرنا ہر حال میں ضروری ہو جاتا ہے مہر کیا ہے؟ ایک شریک زندگی کو شریک مال و متاع کر دینا کہ اس سارے گھر کا مالک فرد واحد مرد ہی نہیں بلکہ شریک حیات بھی ایک حد تک اس میں حصہ دار ہے۔ اس کی حیثیت کسی کرایہ دار کی نہیں بلکہ مستقل ملکیت کی ہے۔ اس گرہ نکاح کا مطلب یا مقصد خواہش نفس کا ازالہ نہیں بلکہ زندگی کی ساری رعنائیوں میں شرکت کامل ہے۔

"احصان" کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ نکاح کو سفاح سے بالکل الگ کر دیا جائے۔ سفاح کیا ہے؟ خون یا پانی بہانے کو سفاح کہا جاتا ہے اور اس جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی مرد اور عورت کا صرف ازالہ خواہش کیلئے مل جانا شہوت رانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی آگ پر پانی ڈالنا ہے۔ احصان پاکبازی ہے اور سفاح بدکاری۔

احصان یہ ہے کہ ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کے سنجوگ اور شریک حیات کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت کے قلعہ میں داخل کرے اور اس شعور و ارادہ کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا ہی نہیں ہو سکتا جو قدرت الٰہی نے اس سے پورا کرنا چاہا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقت اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو وہ اس کتے سے بھی بدتر ہے جو ایک خاص وقت کی شناخت رکھتا ہے۔

مہر کی ادائیگی کی تاکید کہ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا

[۵۶] قرآن کریم میں جہاں بھی ازدواجی زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا تو اس شرط کو ساتھ رکھا کوئی ایک جگہ بھی قرآن کریم میں ایسی نہیں ہے کہ نکاح کا ذکر کیا ہو اور مہر کی ادائیگی کا نام نہ لیا ہو کیوں؟ اس لئے

کہ مال ہی وہ چیز ہے جس سے ہر انسان ہر حال میں محبت رکھتا ہے اور پھر جتنا مل جائے کبھی اس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ دیتے وقت کم سے کم دے اور لیتے وقت زیادہ سے زیادہ حاصل کرے۔ اس لئے اس جگہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ "جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا ہے تو چاہئے کہ جو مہران کا مقرر کیا ہے وہ ان کے حوالے کر دو۔" آیت کے حصہ سے لوگوں نے متعہ کا جواز نکال لیا اور پھر برملا کہنا شروع کر دیا کہ دیکھو قرآن کریم میں متعہ کا ذکر کر کے متعہ کرنا ضروری ٹھہرایا ہے جو ہر حال میں غلط ہے۔

سورہ النساء کی اس آیت نمبر ۲۴ کے اس حصہ سے کچھ لوگوں نے متعہ کا جواز نکال کر اس پر ایک مستقل بے حیائی اور بے غیرتی کی بنیاد رکھ لی اور پھر اس پر اتنے دلائل جمع کر دیئے کہ اس کو نعوذ باللہ "حج اکبر" بنا کر رکھ دیا۔

متعہ کیا ہے؟ وہ ایک نکاح کا طریقہ ہے جو عربوں کے ہاں اسلام سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس کی تعریف آج تک یہ معروف چلی آتی ہے کہ "ایک مرد ایک عورت سے میعاد معین کے لئے مثلاً ایک شب کیلئے بعوض مال معین کے مثلاً دس روپے کی اجرت ٹھہرا لے اور اس عورت سے اس میعاد تک تعلق خاص قائم کرے۔" جیسا کہ اس زمانہ میں بھی بے حیا عورتوں اور بے حیا مردوں کا عام دستور ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے کہ :

وھی اے المتعة عبارة عن ان یستاجر الرجل المراءة بمال معلوم الی اجل معین فیجا معھا

(تفسیر کبیر امام رازی آیت زیر نظر)

سورہ النساء کی زیر نظر آیت میں لفظ آیا ہے کہ "اِسْتَمْتَعْتُمْ" یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے تم نے تعلق زنا شو قائم کر لیا ان کو ان کے پورے حق مہر ادا کرو۔ اس لئے کہ جو نکاح کا مقصد تھا وہ یہی تھا کہ تمہاری ازدواجی زندگی بحال ہو جائے اور جس طرح تم ایک دوسرے سے جسمانی نفع حاصل کر رہے ہو اور دونوں مل کر گویا ایک ہو چکے ہو تم میں مال اشتراک بھی ضروری ہے تاکہ یہ گھر دونوں کا گھر اور ہر مال دونوں کا مال ہو جائے اور ظاہر ہے کہ اس طرح وہ حق قائم ہو جاتا ہے جس کو اسلام نے ضروری قرار دیا ہے۔

اور مراد اس سے یہ تھی کہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ نکاح کے بعد اگر تعلق خاص پیدا نہ ہو جس کو شریعت کی زبان میں "خلوت صحیحہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس طرح مینہ برستے ہی اولے شروع ہو جائیں اور نوبت طلاق تک پہنچ جائے جس کا بعض اوقات امکان ہوتا ہے تو مہر پورا واجب نہیں ہوتا بلکہ آدھا واجب ہوتا ہے کیونکہ فریقین کی شرکت ثابت نہیں ہوئی بلکہ اس عیب کا گویا ازالہ ہے جو ایک حد تک لگ چکا ہے۔

متعہ کو جائز قرار دینے والوں نے اس میں مدت معین کا اضافہ کر کے اس سے وہ فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا جس کو متعہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پھر جیسے مثل مشہور ہے کہ "ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے" انہوں نے جہاں قرآن و سنت میں کوئی ایسا لفظ دیکھا جس کے مادہ میں م ۔ ت اور ع ہوں اس سے

متعہ کا جواز ثابت کر دکھایا اور پھر اس کے فوائد عقلی اور نقلی بیان کرنے شروع کر دیئے اور شریعت کی نظر میں اس فعل کو نہایت ہی بابرکت ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کی اور آہستہ آہستہ ایک مکتبہ فکر نے اس کو "عقدۃ النکاح" سے ہر لحاظ میں افضل کہنا شروع کر دیا۔

ہمارے علماء و مفسرین کی اکثریت کا یہ اتفاق ہے کہ ابتدائے اسلام میں متعہ جائز تھا اور پھر اس باب میں کہ وہ بدستور جائز ہے یا ممنوع یا منسوخ ہوگیا ہے اختلاف ہے۔ پھر ان میں سے گروہ کثیر کا یہ قول ہے کہ اس آیت سے تو بلاشبہ جواز متعہ کا حکم ہے یعنی "اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ" لیکن یہ حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ پھر اس پر استدلال شروع ہو جاتا ہے جو دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔

اور گروہ قلیل کا یہ قول ہے کہ حکم جواز متعہ بدستور بحال ہے اور وہ غیر منسوخ ہے پھر دونوں طرف سے دلائل شروع ہوگئے ہیں قائلین متعہ اپنے موقف پر قائم ہیں اور حکم کے منسوخ کہنے والوں کے پاس اپنے دلائل ہیں اور پھر دونوں طرف طعن و تشنیع اس کے علاوہ ہے۔

ہمارے نزدیک علماء و مفسرین کا اس آیت سے حکم جواز متعہ پر استدلال کرنا محض غلط ہے بلکہ ایک طرح کی سینہ زوری ہے ہاں! اس میں اعلانیہ متعہ کے امتناع کا حکم پایا جاتا ہے جو اسلام سے پہلے عربوں میں رواجاً پایا جاتا تھا۔ جب نبی اعظم و آخر ﷺ مبعوث ہوئے تو اس طرح کے بیسیوں کام عربوں میں موجود تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائی اور کوئی ایک کام بھی آپ ﷺ سے ایسا سرزد نہ ہونے دیا جس کو بعد میں چل کر ناجائز و حرام قرار دینا علم الٰہی میں موجود تھا اور یہی وہ کمال ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو دنیا کے تمام انسانوں سے الگ کر دکھاتا ہے کہ باوجود ایک انسان و بشر ہونے کے کوئی کمزوری آپ ﷺ سے سرزد نہ ہوئی بلکہ ہر ایسی کمزوری سے اس طرح پاک رہے جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہونے والا حسب و نسب کا وجیہ اور پسندیدہ بچہ۔

تمام تاریخوں اور کتابوں میں پایا جاتا ہے کہ ہر ایک قوم میں قدیم زمانہ میں اس قسم کی عورتیں تھیں جو یہی پیشہ کرتی تھیں جیسے کہ اس زمانہ میں بھی ایسی عورتیں پائی جاتی تھیں جن کو بلحاظ ان کے حالات کے خانگیاں اور کسبیاں کہتے تھے۔ یہودیوں میں' فارسیوں میں بلکہ تمام قوموں میں اس قسم کی عورتیں تھیں۔ عرب میں قبل از اسلام اور ابتدائے اسلام میں اور جب تک امتناع متعہ کا حکم نہیں آیا ایسی عورتوں کا وجود تھا۔ یہ طریقہ اور یہ فعل صرف اس وجہ سے نکلا تھا کہ مردوں کو اپنی خر مستی دور کرنے کا موقع ملے۔ تزوج میں اور اس طرح پر متعہ یعنی اجرت سے کام چلانے میں فی نفسہ کوئی فرق نہ تھا اس لئے کہ مہر اور اجرت کو ایک ہی شے سمجھا جاتا تھا اور رضاء و معاہدہ بھی دونوں حالتوں میں ایک ہی حقیقت رکھتا تھا۔ متعہ میں میعاد کا معین ہو جانا اور تزوج میں تعین میعاد کا اختیار زوج کے ہاتھ میں رہتا یا میعاد کا معلوم ہونا لیکن اس تعداد کا نامعلوم ہونا کہ کب موت آئے گی حقیقت میں معاہدہ میں کوئی معتدبہ تبدل نہیں کرتا پس ان دونوں میں جو حقیقتہ" فرق تھا

وہ یہی تھا کہ تزوج سے مقصود دراصل احصان یعنی پاکدامنی اور نیکی تھی اور متعہ سے صرف خرمستی کو مٹانا کیونکہ اس کے مرتکب کو بجز سفح یعنی منی گرانے کے اور کوئی مقصود نہیں ہوتا پس اس کو اس احکم الحاکمین نے منع فرمایا۔

اور حکم دیا کہ اِنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (یعنی تم اپنے مال سے آزاد عورتوں کو نکاح کرنے کیلئے تلاش کرو اور ان سے نکاح کرنا پاکدامنی رکھنے کیلئے ہو وقتی خرمستی کرنے کیلئے نہیں اس طرح آیت کا مطلب محصنین کے لفظ پر گویا ختم ہوگیا غیر مسافحین کا لفظ صرف اسی طریقہ متعہ کے منع کرنے کو کہا گیا ہے جو نہایت بے حیائی اور بد اخلاقی سے رائج تھا اس طرح اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا میں یہ فعل بھی داخل ہے۔

پس اس طرح اس آیت کے لفظ "غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ" سے متعہ کا امتناع پایا جاتا ہے نہ کہ اس کا جواز جیسا کہ غلطی سے سمجھ لیا گیا۔ اس استمتاع سے مراد بلاشبہ ہم بستر ہونا ہے لیکن اپنی منکوحہ بیوی سے بغرض حصول اولاد اور پاکدامنی کے نہ کہ خرمستی کیلئے جس کا مقصود صرف اور صرف منی گرانا ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ رہی طلاق تو وہ ایک شرعی ضرورت ہے اور اس کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی عورت سے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ رقم وصول کر لو اس مرد سے نکاح کر لو لیکن ٹھیک تین دن کے بعد اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو یقیناً کوئی عورت بھی ایسے مرد سے شادی رچانے کو تیار نہیں ہوگی لیکن یہ بات عین ممکن ہے کہ جس کا آج نکاح ہوا ہو اور تین روز بعد اس کے خاوند کی کسی حادثہ میں دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں اور اس طرح اس کو بطور مثال پیش کیا جائے کہ آج سے چار روز پہلے فلاں کی شادی ہوئی اور تیسرے ہی روز اس کے خاوند کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں تو آخر اس میں حرج کیا ہے یا گناہ کیا ہے کہ تم اس مرد سے آج نکاح کر لو کیونکہ اس کی ٹانگیں تو تین روز کے بعد توڑی جانے والی ہیں کیا یہ مثال صحیح ہے؟ کیا اس طرح کوئی نیک کردار اور نیک سیرت عورت تیار ہوگی؟ یقیناً نہیں حادثہ اور بات ہے اس لئے کہ وہ اختیاری نہیں بلکہ اتفاقی ہے اور متعہ جس بلا کا نام ہے اتفاقی نہیں بلکہ اختیاری چیز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اتفاق اور اختیار کے فرق کو نہ سمجھتا ہو تو یہ دوسری بات ہے کیونکہ اندھے کو راستہ دکھایا نہیں جا سکتا اور اگر وہ دیکھ کر چلنے کی ضد کرے تو اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔

کسی صحابی کا یہ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی ہم متعہ کرتے رہے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ آپ ﷺ نے متعہ کا حکم دیا ہے یا کم از کم اجازت دی ہے۔ حاشا کلا ہرگز نہیں۔ ہاں! اس رواج کے منع فرمانے سے پہلے مسلمانوں سے بھی رواجاً کسی بات کا ہونا اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ آپ ﷺ نے اس کا حکم یا آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بھی متعہ کر لیا کرتے تھے جب تک کہ اس کو منع نہیں کیا گیا تھا اور سورہ نساء کی اس آیت نے عربوں کے اس رواج کو سختی سے

فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

مندی سے کوئی بات ٹھہر جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے اس میں تم پر کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اللہ جاننے

روک دیا کہ آئندہ خرمستی لگانے کیلئے اور صرف منی گرانے کیلئے استمتاع حرام ہے۔

ان احادیث سے متعہ کا جواز نکالنا سراسر زیادتی اور سینہ زوری ہے اور اس طرح یہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کا نہیں بلکہ عربوں کے رواج کو مٹانے کا ہے کسی قوم میں کسی رواج کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کا حکم ان کے مذہب نے دیا ہے۔ آج بھی مسلمانوں میں بیسیوں ایسی رسمیں موجود ہیں جن سے اسلام نے سختی سے منع فرمایا ہے تاہم مسلمان کرتے ہیں اور ان کی ادائیگی قرآن و سنت کے احکام کے مقابلہ میں بھی بہت سخت سمجھی جاتی ہے لیکن اس طرح سمجھ لینے سے وہ رسم اسلام کی نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ مسلمان ایسا کرتے ہیں اس لئے یہ اسلام کے حکم ہیں۔ اگرچہ ان رسومات کے ادا کرنے والے اس کے جواز میں سو دلیلیں گھڑ لیں جیسے متعہ کے جواز کیلئے لوگوں نے بیسیوں دلیلیں گھڑ لی ہیں اور پھر من حیث القوم جو برائیاں قوم میں موجود ہیں ان کے پیش نظر ایک دوسرے پر الزام ہی سے جواز گھڑ لیا گیا ہے کہ دیکھو کچھ لوگ حلالہ نکالتے ہیں اور پھر حلالہ اور متعہ کا موازنہ کر کے دکھایا جائے کہ متعہ حلالہ سے کئی درجہ بہتر ہے پھر حلالہ کی برائی کی دلیلیں پیش کر کے ان ہی دلیلوں کو متعہ کا جواز سمجھ لینا کوئی دیانت و امانت کا مسئلہ نہیں ہے۔

ہم روایتی بحث میں اس لئے الجھنا نہیں چاہتے کہ بدقسمتی سے دونوں فریق اس معاملہ میں حدود سے تجاوز کرتے نظر آتے ہیں اور دونوں اطراف سے اپنے بزرگوں کو اس طرح جواز اور عدم جواز کیلئے کھڑا کیا ہے کہ ان کی عصمتوں کو بھی محفوظ نہیں رہنے دیا گیا۔ شعیوں نے رسول اللہ ﷺ سے شروع کر کے بڑے بڑے صحابہ کرام اور آئمہ کرام کو متعہ کرتے دکھایا ہے اور اس جواز میں وہ کچھ پیش کیا ہے جس کا دہرانا نقل کفر کفر نباشد کے محاورہ کے باوجود ایک صالح طبیعت اس سے انکار کرتی ہے کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے اور مانعین جواز کی طرف سے بھی کچھ اس طرح کے تسامح ضرور ہوئے ہیں۔ ہاں اس جگہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ جس طرح "متعہ" حرام ہے بالکل اسی طرح "حلالہ" بھی حرام ہے اور ہر قسم کا موقت نکاح بھی باطل و حرام ہے اور دونوں کی حرمت اسلام میں طے شدہ امر ہے اور اس طرح شغار بھی ممنوع اور مکروہ فعل ہے اور اس کیلئے جواز پیش کرنا کسی حال میں بھی جائز و درست نہیں اس کے حسن سے قبائح ہر حال زیادہ ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس بری رسم کا دفن کر دینا بھی ضروری ہے نیز یہ بھی کہ اپنے بیٹوں کے نکاح کیلئے صرف ظاہری مال و دولت ہی کو سب کچھ سمجھ لینا بھی ایک قبیح فعل ہے اس لئے حسن اخلاق، نیک کردار اور صالح انسان کا انتخاب دین اسلام کی ہدایت اور ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھنا بے وقوفی کی دلیل ہے۔

عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ

۵۶

والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۲۴

اور تم میں کوئی اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان بیبیوں سے نکاح کرے تو ان

زوجین اپنی رضامندی سے حق مہر زیادہ یا کم کر سکتے ہیں

۵۷ مہر شرعاً فرض اور ضروری ہے کوئی بھی اسے ساقط نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے اس شرط کے ساتھ نکاح کر لیا ہو کہ وہ کوئی مہر نہ دے گا اور مہر کے بغیر ہی نکاح کر رہا ہے اور عورت نے بھی اس شرط کو منظور کر لیا ہو تب بھی اس کی ادائیگی اپنی جگہ بدستور واجب اور ضروری ہی رہے گی اور مرد کی یہ شرط یکسر لغو اور غیر موثر قرار پائے گی کیونکہ یہ مہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔ اس کا واجب اور ضروری ہونا کسی اور کی مرضی پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک مہر صرف واجب ہی نہیں بلکہ عقد نکاح کے ارکان میں شامل ہے یعنی نکاح کا نکاح ہونا جہاں کچھ اور باتوں پر موقوف ہے وہیں مہر پر بھی موقوف ہے اگر کسی نے مہر نہ دینے کی شرط کے ساتھ نکاح کر لیا تو یہ نکاح سرے سے جائز ہی نہ قرار پائے گا۔ بلاشبہ قرآن کریم نے مہر کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں ان کے الفاظ اور انداز بیان سے یہی بات وزنی معلوم ہوتی ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ شارح بخاری نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ مہر کے بغیر کسی عورت سے جنسی تعلق کا قائم کرنا جائز نہیں۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۶۷)

اس مسئلے میں خود عورت کی رضامندی اور منظوری بھی کوئی فرق پیدا نہ کر سکے گی کیونکہ عورت کا مہر حق ضروری ہے مگر اس سے پہلے وہ خود شریعت کا حق ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے حق کو تو ساقط کر سکتا ہے مگر شریعت کے حق کو ساقط نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس بات پر سب مسلمانوں کا ہر لحاظ سے اتفاق ہے کہ مہر کو ساقط ٹھہرا لینے پر متعلقہ افراد شوہر و بیوی یا اس کے ولی کا متفق ہونا اور رضامند ہونا جائز نہیں ہے۔

ہاں! یہ بات جان لینی چاہئے کہ مہر کے واجب ہونے یا صحت نکاح کی شرط ہونے کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ نکاح کے وقت ہی اسے ادا کر دیا جائے اگرچہ وقت پر ادا کرنا زیادہ مناسب ہے یا کم از کم یہ کہ اس کی تعیین اور ادائیگی بعد میں بھی کر دی جا سکتی ہے اور یہ گنجائش یا اجازت قرآن کریم کے بعض ارشادات سے بالکل واضح طور پر نکلتی ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ اور جہاں تک ہمارا علم ہے علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر کا تذکرہ نہ آنے یا اس کی تعیین نہ ہونے سے اس کی ضرورت اور اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ وہ بجائے خود ایک لازمی اور قطعی فریضہ ہے اس لئے نکاح کے موقع پر لفظوں میں اس کا تذکرہ اور تعین نہ ہونے کے باوجود اصلاً اور معنی وہ مذکور اور متعین ہی ہوتا ہے=

الْمُحْصَنٰتُ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ

عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہارے قبضے میں آئی ہوں اور وہ مومن ہوں اور اللہ تمہارے

ہاں! وقت پر اس کا تعین کرنا زیادہ بہتر اور صحیح ہے۔

مہر کی مقدار کم سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی اور اعتدال ہر حال میں بہتر ہوتا ہے لیکن اس کی ایک حد مقرر کر دینا مناسب ہے اس لئے کہ شرعاً اس کی حد کا مقرر کرنا فریقین پر رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود کہ مجلس میں ایک اعلان ہو جائے کہ اس نکاح کا اتنا مہر مقرر ہے پھر بھی میاں بیوی کو یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ وہ اس میں چاہیں تو رضامندی سے کمی بیشی کر لیں اور اسی طرح مرد کو بڑھانے کا حق ہوگا اور عورت کو کم کرنے کا۔ مرد اپنی طرف سے کم نہیں کر سکتا اور عورت اپنی طرف سے زیادہ نہیں کر سکتی اور رضامندی سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔

شریعت کی نگاہ میں بہتر یہ ہے کہ مہر اتنا ہی مقرر کیا جائے جو وقت کے معروف اور زوجین کے سماجی مرتبے اور معاشی حالات کے مطابق ہو جیسا کہ لفظ "بِالْمَعْرُوْفِ" سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اپنے زمانہ میں بعض لوگوں نے "معروف" کی سطح سے اونچے مہر مقرر کئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکماً منع نہیں فرمایا لیکن ناپسندیدگی کا اظہار ضرور فرمایا۔ (مسلم کتاب النکاح ج اول ص ۴۷۵)

مہر پر لفظ "اُجُوْر" کا استعمال بھی قرآن کریم کی اس آیت میں ہوا ہے فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ "ان کے حق مہر ادا کر دو" تو اس "اجر" کے لفظ سے بھی بعض لوگوں کو غلطی لگی ہے اور اس غلطی کا نتیجہ بھی بہت بھیانک سامنے آیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اجر کیا ہے؟ الثواب علی العمل کسی عمل کا نتیجہ۔ مزدوری نہیں؟ اس لئے کہ نتیجہ وہ شے ہے جو عمل کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور مزدوری وہ چیز ہے جو معاوضہ کے طور پر طے کی جاتی ہے۔ ہاں یہ دوسری چیز ہے کہ عربی زبان میں مزدوری کو بھی اجرت کہا جاتا ہے لیکن یہ معنوں کی وسعت کی وجہ سے ہے۔ ہاں! اس کو لفظ ہدیہ یا تحفہ سے ادا کیا جا سکتا ہے جو ایک طرف سے ہوتا ہے اور انہی ہدایا اور تحائف ہی کو اجر یا اجور کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ دیا گیا ہے یہ صرف اور صرف ایک طرف سے یعنی مرد کی طرف سے دیا گیا ہے دونوں طرف سے کچھ نہیں لیا دیا گیا۔ اس لئے اس کو مزدوری یا اجرت جو ہماری زبان میں بولے جانے والے الفاظ ہیں وہ اس جگہ مراد نہیں اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ حسن عمل کے نتیجہ کو قرآن کریم نے "اجر" کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔ یہ فقیر کو کپڑا، روٹی اور نقد جو کچھ آپ نے دیا اس کا جو نتیجہ آپ کو ملے گا اس پر لفظ "اجر" کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اس کو مزدوری کون کہے گا؟ اس خراب راستے کو جو آپ نے درست کیا۔ اس اندھے کو اس کے مقام تک پہنچا دیا۔ بھولے ہوئے مسافر کو سیدھے راہ کی نشاندہی کر دی اس کا اجر آپ کو ضرور ملے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ
فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

ایمانوں کا حال بہتر جاننے والا ہے اور تم سب ایک دوسرے کی ہم جنس ہو۔[۵۸] پس ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے' اپنے نکاح میں لاؤ اور دستور کے مطابق ان کا مہر ان کے

لیکن اس کو مزدوری کیسے کہا جا سکتا ہے؟ کسی دوست' عزیز' رشتہ دار یا نیک و بد بزرگ کو جو آپ نے ہدیتہ" و تحفتہ" کوئی چیز پیش کی اس کو آخر مزدوری کیوں کر کہیں گے؟

آزاد مومن عورت نہ مل سکتی ہو تو باندی مومنہ سے نکاح کر لو کہ وہ بھی تمہاری جنس ہی ہیں

۵۸ مطلب یہ ہے کہ آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی طاقت و وسعتِ مال نہ ہو کہ ان کے نان و نفقہ اور مہر وغیرہ کو تم آسانی سے نہ ادا کر سکتے ہو کیونکہ معاشرہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں کمزور بھی اور طاقتور بھی اور ظاہر ہے ایک کمزور اور مزدور قسم کا آدمی وسعت مال نہیں رکھتا اگر وہ کسی عورت سے نکاح رچالے جس کے ایک دن کے اخراجات اس کی ایک ماہ کی مزدوری بھی پورے نہ کر سکتی ہو تو وہ ایسی بیوی سے سکون و محبت اور شفقت و رافت کی امید کیونکر کر سکتا ہے تو پھر پہلے ہی وہ قدم سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ ایک غریب آدمی اگر کسی متمول عورت سے نکاح کرے گا در آنحالیکہ وہ یہ بات نہ جانتی ہو کہ میرے ہونے والے شوہر کی کیا حالت ہے اور یہ سبز باغ دکھا کر اس کو یا اس کے گھر والوں کو آمادہ کر بھی لے گا اور طرح نکاح قرار پا جائے گا تو اس کا نبھانا اتنا آسان نہیں ہوگا اس لئے ایک تو نکاح سے پہلے فریقین کو اچھی طرح اس حالت پر غور و فکر کر لینا چاہئے اور دوسری یہ بات ہے کہ زندگی کے ایسے معاملات میں پردہ و اخفاء سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ اس سے بہتر ہے کہ آدمی جوڑ ہی ایسی جگہ جوڑے جس میں اس طرح کی خلل اندازی کا خطرہ نہ ہو۔

اس لئے چونکہ نکاح کے مسائل جاری تھے ان میں اس طرح ہدایت فرما دی گئی کہ ایک آدمی اگر صاحب وسعت نہیں ہے کہ آیک آزاد عورت کی ذمہ داریاں باحسن و خوبی ادا کر سکے تو چاہئے کہ ان باندیوں میں سے جو اس کی اپنی ملکیت میں آچکی ہوں یا کسی دوسرے کی باندی سے اس کی اجازت کے ساتھ نکاح کر لے۔ ایسا کرے گا تو اس میں ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں بھلائیوں کی امید کی جا سکتی ہے اگر وہ باندی اپنی ہے تو بہتر ہے کہ آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے آئے وہ اس کی شکر گزار رہے گی اور خدمت گزار بھی اور اگر کسی دوسرے کی باندی ہے تو اس کی اجازت سے جب وہ نکاح کرے گا اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے گا تو عین ممکن ہے کہ اس طرح مل بیٹھنے سے اس مملوکہ کے آزاد ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے

ممکن ہے کہ نکاح میں دینے والا مزید احساس کرتے ہوئے اس کو آزاد کر دے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مکاتب کر دے اور اس طرح اس کی مکاتبت کو ادا کر کے وہ آزاد ہو جائے یہ بھی ممکن ہے کہ اس جوڑ سے وہ دونوں مل کر مزدوری کر لیں اور اس مزدوروی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے حالات میں آسانی پیدا فرما دے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر آزاد عورت میسر نہ آئے تو یہ کنیز و مملوکہ بھی تو آخر انسان ہے اور اس میں وہ ساری خواہشیں موجود ہیں جو ایک آزاد عورت میں ہیں پھر ایک پنتھ دو کاج والی بات سے کیوں گریز کیا جائے بلکہ اس کو ایک نیک کام سمجھتے ہوئے سرانجام دے اور نیت میں یہ بات رکھے کہ میں نے اس سے نیکیاں کمانی ہیں۔ یقیناً اس کو اس میں سے سب کچھ میسر آجائے گا۔ یہ مشورہ گویا اس لئے دیا گیا کہ ایک کنیز کا مہر اور نان و نفقہ اتنا بڑا نہیں ہوگا جتنا کہ ایک آزاد عورت کا اور پھر یہ بھی کہ ان کے مالک ان کو غریب شوہروں کے نکاح میں دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے "فَتَيٰتِكُمُ" سے اس جگہ مراد نوجوان ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی کنیزیں مراد ہیں خواہ وہ جوان ہوں یا سن رسیدہ ہوں۔ ہاں! شرط یہ ہے کہ کنیز مملوکہ مومنہ ہو اس لئے کہ اگر وہ غیر مومنہ ہوئی تو اولاد کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہر حال میں رہے گا۔

اسی طرح یہ بات بھی مسلمانوں کو سمجھا دی کہ اسیران جنگ میں سے جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آجائیں انہیں اس لئے حقیر و ذلیل نہ سمجھو کہ وہ دوسری قوم کی عورتیں ہیں یا لڑائی میں قید ہو کر آئی ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ قابل لحاظ ہے ان میں سے جو عورتیں مسلمان ہوگئی ہوں تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ اس سے جو مسائل ہمارے علماء مفسرین نے اخذ کئے ہیں وہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتے کہ کوئی اور چارہ کار نہ ہونے کی صورت میں یہ حکم ہے ورنہ حتیٰ للامکان مملوکہ سے نکاح کرنا اچھا نہیں اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہ باندیوں کی اولاد غلام ہی ہوتی ہے اس لئے یہ بھی اچھا نہیں ہے۔ یہ سب رسم و رواج کی باتیں ہیں اسلام ان ساری چیزوں سے بری الذمہ ہے بلکہ اسلام نے اس باندی و غلام والی رسم کو آہستہ آہستہ نیست و نابود کر دیا ہے اور آج اس طرح کی باتیں کرنا ویسے بھی زیب نہیں دیتا۔

نزول قرآن کریم سے پہلے غلامی کی رسم پوری دنیا میں موجود تھی۔ ہر طاقتور قوم کمزور قوم کے افراد کو غلام بنا لیتی اور ان کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کرتی۔ قرآن کریم نے اس بارے میں اصلاحات کیں انہیں دو قسموں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اولاً یہ کہ غلامی صرف اسیران جنگ میں محدود کر دی وہ بھی اس طرح کہ کم سے کم اس کا امکان باقی رہ گیا۔ سورہ محمد کی آیت نمبر ۴ کے ذریعہ اعلان کر دیا کہ اگر مصالحہ جنگ کے خلاف نہ ہو تو چاہئے کہ اسیران جنگ کو فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا جائے۔ ثانیاً غلاموں کے حقوق کی رعایت پر اس قدر زور دیا اور ان کیلئے ایسے احکام و قوانین نافذ کئے کہ غلامی غلامی نہیں رہی بلکہ سوسائٹی کا ایک مساویانہ عنصر بن گیا اور جو

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ

حوالے کر دو۔ البتہ یاد رہے کہ وہ' قید و بند میں رہنے والی ہوں۔ بدکار عورتیں نہ ہوں اور نہ ایسی ہوں کہ چوری چھپے بدچلنی کرتی رہتی ہوں۔[۵۹] پھر اگر ایسا ہو کہ قید نکاح میں آنے کے بعد'

کمزور پہلو تھا وہ بھی معمولی کمزور رہ گیا جو آہستہ آہستہ طاقتور ہوگیا۔ چنانچہ اس جگہ بھی گویا یہ ترغیب دی گئی ہے کہ کنیزوں اور باندیوں سے نکاح کرنے میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں اور فضیلت کا معیار ایمان و عمل صالح ہے بلکہ یہ عورتیں دنیا کے تھپڑ کھانے کے بعد کافی حد تک سلجھ چکی ہوں گی اگر ان کو سہارا دو گے تو وہ تمہارے سہارے کی ممنون احسان بھی ہوں گی اور بیوی کے کام بھی باحسن خوبی انجام دیں گی۔

کنیزوں سے شادی کی جو اجازت دی جا رہی ہے اس میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے

۵۹ فرمایا تم کو باندیوں سے نکاح کی جو اجازت دی جا رہی ہے وہ معاشرہ کو سنوارنے کیلئے دی گئی ہے بگاڑنے کیلئے نہیں اس لئے یہ بات یاد رکھو کہ سب سے پہلے تو کسی باندی سے نکاح کرنا چاہو تو اس صورت میں کہ جب وہ تمہاری اپنی مملوکہ نہیں ہے تو جس کی وہ کنیزو مملوکہ ہے اس سے رابطہ قائم کرو اور اس کی اجازت کے بعد نکاح کرو ان کی اجازت کے بغیر نکاح نکاح نہیں ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ باندی و کنیز سمجھ کر اس کو مہر سے محروم نہیں رکھ سکتے۔ اگر وہ بغیر مہر نکاح کرنے پر راضی بھی ہو جائے تو بغیر مہر نکاح منعقد نہیں ہوگا بلکہ مہر لازماً ادا کرنا پڑے گا ہاں اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا رہی تاکہ تم اپنی وسعت کے مطابق ادا کر سکو اور جو کچھ دو اللہ کا حکم اور دل کی رضامندی سے ادا کرو۔ ہوس نفس کی خاطر نہیں۔

تیسری بات یہ یاد رکھو کہ وہ قید و بند میں رہنے کیلئے تیار ہوں یعنی ان کی عادات و اطوار سے ان کے اخلاق کردار سے کوئی ایسی جھلک ظاہر نہ ہوتی ہو کہ وہ ہر مقام پر آنکھ لڑانے والی ہوں اور اخلاق و کردار کی گھٹیا نہ ہوں کہ معاشرے کو سنوارنے کی بجائے اس کے بگاڑ کا سبب بن جائیں۔ وہ پاکدامن ہوں' گندی اور ناپاک عادات کی مالک نہ ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بغایا بھی نہ ہوں کہ ٹیکسی کی طرح چلنا ان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ان میں دیکھو تو بالکل قریب نہ جاؤ اس لئے کہ برا ہم نشین برا ہی رہتا ہے۔ ہاں' طبعاً" نیک ہوں اور عادتاً درست ہوں تو صرف باندی اور کنیز ہونا کوئی عیب کی بات نہیں اس لئے کہ یہ کسی عادت یا طبعی کمزوری کا نام نہیں بلکہ حالات زمانہ اور قومی کمزوری کی نشانی ہے جو ہر انسان کی انفرادی حالت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اجتماعی کمزوری کا نتیجہ ہے اور یہ ہر انسان کی اختیاری بات نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ بدچلن عورت کو نکاح کیلئے کبھی بھی پسند نہ کرو اور اس طرح بدچلن مرد کو بھی وہ آزاد ہو یا غلام و

أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى
الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ
وَأَنْ تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ ۲۵ يُرِيدُ

بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان کیلئے اس سزا سے آدھی سزا ہوگی جو کہ آزاد بیبیوں کیلئے ہے۔[۶۰] یہ حکم ان لوگوں کیلئے ہے جنہیں اندیشہ ہو کہ نقصان اور برائی میں پڑ جائیں گے اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے کہیں بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔[۶۱] ۲۵

باندی۔ کیونکہ یہ حالت کفر سے بھی بدتر ہے۔ اس کی اگر کوئی رگ ملتی ہے تو مشرک سے ملتی ہے کیونکہ مشرک ایک اللہ کا ہو کر نہیں رہ سکتا اور زانی ایک ہی نکاح پر انحصار و اکتفا نہیں کر سکتا وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ اس لئے مشرکہ اور زانیہ عورت کے قریب ہی نہ جاؤ جب تک کہ وہ اس سے تائب نہ ہو جائیں۔

کنیز اگر برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کیلئے آزاد عورت کے مقابلہ میں آدھی سزا دی جائے گی

۶۰ تم نے نکاح کر لیا اپنی طرف سے ہر طرح کی دیکھ بھال کی۔ پوری تسلی کرنے کے بعد نکاح کیا لیکن اس وقت حالات واضح نہ ہو سکے نکاح تم نے کر لیا کنیز ساری احتیاطوں کے باوجود پھر بھی بداخلاق نکلی یا تم نے شادی تو نہیں کی کسی عام کنیز کو برائی میں مبتلا پایا اور اسلامی نظر کے مطابق اس کو برائی میں کوئی شک و شک کی بات نہ رہی تو اب کیا کیا جائے گا؟ فرمایا ایسی صورت میں اس باندی و کنیز کیلئے آزاد و محصنہ کے مقابلہ میں آدھا عذاب دیا جائے گا۔ یعنی اس کو پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔ اس آیت سے رجم کو اسلامی سزا نہ ماننے والوں نے استدلال کیا ہے کہ الفاظ واضح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کنیز و باندی جس سے برائی کی صدور ہوا وہ شادی شدہ ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں اور اگر آزاد کی سزا رجم ہوتی تو اس کے لئے کسی دوسری سزا کا حکم نافذ ہوتا اس لئے کہ رجم میں آدھا رجم کرنا تو کسی حال میں بھی ممکن نہیں اور قرآن کریم کے الفاظ واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ ان پر آدھا عذاب ہے اور یہ آدھا عذاب غیر شادی شدہ آزاد کے مقابلہ میں تو آدھا ہو کر پچاس کوڑے ہوگئے لیکن شادی شدہ ہونے کی صورت میں اگر آزاد کیلئے رجم ہوتا تو اس کنیز کیلئے کوئی دوسری سزا تجویز کی جاتی جب ایسا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ شادی شدہ آزاد کیلئے بھی ایک سو درے ہی تسلیم کرنا ہوں گے تاکہ اس کی آدھی سزا پچاس کوڑے قرار پا سکے۔

کنیز سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے ضروری نہیں ٹھہرایا گیا

۶۱ کسی کام کی اجازت ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کو کرنا لازم و ضروری ہے۔ یہ اجازت جو

دی گئی ہے یہ محض تمہاری کمزوری کی بناء پر ہے کہ جب ایک آزاد عورت سے نکاح ممکن نہیں ہو رہا اور نفسانی کمزوری میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے تو اس خطرہ کا ازالہ بہرحال نکاح ہی ہے اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آزاد عورت نہیں تو کنیز سے نکاح کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بھی آخر انسان ہے اور تمہاری جنس سے ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ یہ باندی و غلام کی رسم قبل اسلام موجود تھی اسلام نے اس کو آہستہ آہستہ کئی ایک طریقوں سے ختم ضرور کیا ہے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور بیک وقت اس کو ختم کرنے کا اعلان جو نہیں کیا تو یہ مصلحت سے خالی نہ تھا بلکہ ایک دفعہ ان کی آزادی کا اعلان کر دیا جاتا تو اس سے کئی طرح کی نئی خرابیاں جنم لیتیں اور جب ایک برائی کو ختم کرنے سے کئی برائیاں مزید پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو اس برائی کو اس طرح ختم کرنا دانشمندی کی بات ہے کہ اس سے مزید برائیاں جنم نہ لیں۔ پاکستانیوں کی طرح اندھا دھند قانون بنا کر نافذ کر دینے کے بعد جو نتائج نکلتے ہیں ان سے آج کچھ بھی عقل و فکر رکھنے والا انسان ناواقف نہیں ہے۔

نبی اعظم و آخر ﷺ نے کسی ایسے حکم کے نفاذ کی فوراً اور اچانک کوشش ہی نہیں فرمائی جس سے مزید برائیوں کے پیدا ہونے کا خطرہ موجود تھا۔ ایسے احکام کا نزول بھی تدریجاً ہوتا رہا۔ انہی مسائل و احکام میں رسم ملک یمین بھی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ رسم غیر اسلامی ہے اور اس کا قلع و قمع ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے نبوت ملنے سے بھی بہت پہلے زید کو آزاد کیا جو سیدہ خدیجہ کبریٰ ام المومنین کی طرف سے آپ ﷺ کو ہبہ کئے گئے تھے۔ آزاد کرنے کے بعد اس سے وہ محبت اور پیار کیا کہ ایک وقت آیا کہ جب اس کے والدین کو اطلاع ملی تو وہ زید کو حاصل کرنے کیلئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ثبوت فراہم کر دیا کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو زید کو ویسے ہی آزاد کر دیا ہوا ہے اور اب میری طرف سے اجازت ہے کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے۔ والدین نے زید کو لے جانے کی سعی و کوشش کی زید کو بہت سمجھایا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت کو والدین کے مقابلہ میں ترجیح دی اور والدین کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی پرورش کرنے والی آپ ﷺ کے خاندان کی طرف سے بطور ورثہ میں ملی ہوئی کنیز تھی۔ آپ ﷺ نے اس کو آزاد کر کے اس کو وہ احترام دیا جیسے ایک بیٹا اپنی والدہ کو احترام دیتا ہے اور یہ دونوں واقعات تو نبوت سے پہلے آپ ﷺ نے سرانجام دیئے تھے نبوت عطا ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو ایک باندی فتح خیبر کے موقع پر پیش کی گئی آپ ﷺ نے اسے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی آزاد کر دیا اور پھر صرف آزاد ہی نہیں کیا بلکہ اپنے حرم میں بھی داخل کر لیا اور اس طرح ان کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ یہی وہ ام المومنین ہیں جن کا اسم گرامی صفیہؓ تھا۔ احادیث و تاریخ کی روایات گواہ ہیں کہ ام المومنین سیدہ صفیہ کو وہی مقام حاصل تھا جو قریشی بیبیوں کو حاصل تھا۔ اور بالکل یہی صورت ماریہ قبطیہ کی بھی تھی جس کو شاہ مصر نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ماریہ کے یہاں پہنچتے ہی اس کو

اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ
يَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ
عَلَيْكُمْ ۖ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان لوگوں کی راہ کھول دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور انہیں کے طریقہ پر تمہیں بھی چلائے نیز تم پر لوٹ آئے اور اللہ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۲۶ ۶۲

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر لوٹ آئے' لیکن جو لوگ' نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے

آزاد کر دیا اور پھر نکاح کر کے حرم میں داخل کر کے ام المومنین کے خطاب عظیم سے نواز اور یہی رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی وہ دیر تک زندہ رہیں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی وفات تک ان کو دوسری ام المومنین کے ساتھ اور ان کے برابر نفقہ دیتے رہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس کنیز ہو پھر وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے اور پھر اسے آزاد کر کے نکاح کر لے تو اس کیلئے دو چند اجر و ثواب ہے۔ پس باندی کے ساتھ نکاح کی صرف اجازت کا مطلب یہ ہے کہ باندی کو باندی ہی رکھ کر نکاح کرنے کی بجائے کوئی ایسی صورت اختیار کرنا کہ باندی باندی نہ رہے بلکہ آزاد ہو جائے اور پھر آزاد کرا کر اس سے نکاح کرنا کمالات انسانی اور آداب اسلامی میں داخل ہے۔

جن رشتوں سے نکاح حرام ہے یہ پچھلی امتوں میں بھی حرام تھے بداعتدالی رسم و رواج نے پیدا کی

۶۲ پچھلے رکوع میں جن قریب کے رشتوں میں نکاح کی حرمت کا اعلان فرمایا گیا یہ حرمت کوئی ایسی حرمت نہیں جس کو کبھی اللہ نے اس سے پہلے حلال بھی بتایا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام جو تدریجاً" نازل ہوتے رہے ہیں اس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی چیز کے حلال ہونے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو اور پھر زمانہ یا مدت گزرنے کے بعد اس حکم کو حرام کر دیا ہو۔ حاشا کلّا کہ کبھی ایسا ہوا ہو۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ ہاں! ایک کام ہوتا رہا اور اللہ جانتا تھا کہ ایسا ہو رہا ہے لیکن اس کی ممانعت نہیں فرمائی تو اس میں یہ حکمت پنہاں تھی کہ اس وقت کے حالات میں اس حکم کا آنا مناسب نہیں تھا اور یہ علم الٰہی میں موجود تھا۔ لہٰذا اس کے حلال ہونے یا حرام

ہونے کا حکم نافذ نہیں فرمایا اور پھر جب مناسب جانا اس کی حلت و حرمت کا حکم نازل فرما دیا۔ کتب سابقہ میں اگر کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہے تو وہ ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی ان انبیاء کرام کے بعد جب وہ دنیا سے رخصت ہوگئے تو پچھلے لوگوں نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے بطور تفسیر ان کتابوں میں ایسے احکام داخل کر دیئے اور مرور زمانہ سے جب ان کتابوں کی اصل زبان بھی عنقا ہوگئی تو مترجمین نے ترجمہ کرتے وقت ان تفسیری بیان کا بھی ساتھ ترجمہ کر دیا اور پھر کسی کو یہ بات معلوم ہی نہ رہی کہ اصل کتاب کا حکم کونسا ہے اور بعد میں لوگوں نے تفسیر کرتے وقت ان میں کیا داخل کیا تھا۔

ایک مثال بھی اس طرح کی بیان نہیں کی جا سکتی کہ ایک چیز کو اللہ نے خود ہی حلال ٹھہرایا ہو اور پھر کسی زمانہ میں حرام کر دیا ہو۔ ہاں یہود و نصاریٰ نے اپنی طرف سے حلت و حرمت میں بہت دخل اندازی کی اور بہت سی چیزوں کا حلال و حرام ٹھہراتے رہے اور اس طرح گویا ان کو ان کے اپنے ہی کئے کی سزا ملتی رہی کہ ایک چیز حلال تھی لیکن انہوں نے حرام کر کے اس سے فائدہ حاصل کرنا ترک کر دیا اور ایسی چیزیں بھی ہیں کہ وہ ابدی طور پر حرام تھیں لیکن انہوں نے ان کو قومی طور پر حلال تصور کر کے ان سے فائدہ پانا شروع کر دیا اور اس کی مثالیں کثرت سے قرآن کریم اور دوسری کتب احادیث میں مل جاتی ہیں۔

زیر نظر آیت میں اس بات کو بیان فرمایا جا رہا ہے کہ یہ رشتے جو تم پر حرام ٹھہرائے گئے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ "اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان لوگوں کی راہ کھول دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور انہیں کے طریقہ پر تم کو بھی چلائے اور تم پر لوٹ آئے اور اللہ جاننے والا' حکمت رکھنے والا ہے۔"

اس آیت نے کیا سبق دیا؟ سبق یہ دیا کہ اگر تم سنو کہ کسی زمانہ میں اللہ نے بہن بھائی کی شادیاں رچانے کا حکم دیا تھا جیسے آدم علیہ السلام کے بیٹوں اور بیٹیوں کے بارے میں مشہور ہے تو سمجھ لو کہ یہ بالکل جھوٹ ہے اللہ نے ایسا حکم کبھی نہیں دیا۔ اگر تم کو یہ سنایا جائے کہ دیکھو یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں دو سگی ہمشیرہ تھیں پھر حوالے بھی نکال کر دکھائے جائیں تو تم یاد رکھو کہ یہ بات بالکل غلط ہے اللہ نے کبھی ایسا حکم نہیں دیا اور نہ ہی یعقوب علیہ السلام کے گھر میں دو حقیقی بہنیں کبھی بیک وقت نکاح میں رہی ہیں۔ اگر تم یہ سنو کہ لوط علیہ السلام نے خود اپنی لڑکیوں سے نکاح کا فعل کیا یا یہ کہ کفار اور مشرکین کو آپ نے اپنی حقیقی بیٹیاں پیش کی تھیں تو صاف صاف انکار کر دو یہ باتیں بالکل غلط ہیں اور لوط علیہ السلام کے ذمہ افتراء کھلا افترا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی دو متضاد حکم نازل نہیں فرمائے۔ اور کبھی کوئی ایسا حکم نازل نہیں فرمایا کہ کسی زمانہ میں اللہ نے خود ہی اس کو حرام ٹھہرایا ہو اور پھر خود ہی اس کو کسی دوسرے زمانہ میں حلال ٹھہرایا ہے تو بے دھڑک کہہ دو کہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا اندھیر کھاتہ مطلق نہیں۔ ہاں! ایک چیز کے متعلق حکم نازل ہی نہ فرمایا ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ اگر تم نے یہ اصول یاد رکھا تو تمہاری بہت سی الجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں گی اور تم سمجھ جاؤ گے کہ وہ کیا کیا جھوٹ ہیں جو آج تک تم سنتے آئے اور وہ اللہ

مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ
الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ اعتدال سے ہٹ کر بہت دور جا پڑو۔ ۲۷ ۶۳

اللہ چاہتا ہے تمہارے لئے نرمی اور آسانی ہو اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ ۲۸ ۶۴
مسلمانو! ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق و ناروا نہ کھاؤ ہاں! اس صورت میں کھا سکتے

کے ذمہ لگا لگا کر بیان کئے گئے کہ پہلے اللہ نے حکم اس طرح دیا تھا لیکن بعد میں اس کو ایسا کر دیا۔ کیوں؟ اللہ کو پہلے علم نہیں تھا اور بعد میں علم آیا ہے۔ فوراً کہیں گے نہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے جو چاہے کرتا ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے لیکن وہ بِذَاتِ الصُّدُوْر بھی ہے اور عَلَّامُ الْغُيُوْب بھی۔ اس نے خود ہی یہ اعلان بھی فرمایا کہ وہ "لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَاد" بھی ہے کہ جو وعدہ وہ کر لے اس کا خلاف نہیں کرتا اور نہ ہی ہونے دیتا ہے۔ اس لئے آپ ہرگز ایک بھی ایسا حکم نہیں دکھا سکتے کہ پہلے اللہ نے فرمایا ہو کہ "ایسا کرو" اور پھر کبھی کہہ دیا ہو کہ "ایسا مت کرو" کیوں؟ اس لئے کہ میں فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہوں تم کون ہوتے ہو مجھے پوچھنے والے۔ ایسی بات کوئی ملاں جی اور مولانا صاحب اور علامہ صاحب تو فرما سکتے ہیں کوئی سیاسی لیڈر کوئی حکمران یا کوئی مذہبی راہنما کہلانے والا تو کہہ سکتا ہے لیکن اللہ وحدہ لا شریک لہٗ کی ذات ایسی بات کبھی نہیں فرماتا۔ اس لئے کہ اس کے کلام میں مطلق تضاد نہیں ہے۔

جس چیز کو اس نے پہلے روز سے حرام کہا اس چیز کو اس نے وحی کے آخری روز بھی حرام ہی کہا اور جس چیز کو اس نے پہلے روز سے حلال ٹھہرایا وہ وحی کے آخری روز تک حلال ہی ٹھہری اور رہتی دنیا تک وہ حلال ہی ٹھہرے گی۔ اللہ کا حکم اور اللہ کا قانون موم کی ناک نہیں کہ جدھر چاہا موڑ لیا۔ وہ حاشا اللہ کہ کبھی ایسا کمزور ہو جیسا لوگوں نے اس کو سمجھ لیا۔ واللہ ثم تاللہ، کہ اللہ سے کوئی زور آور ہو، وہ تو خود سارے زور آوروں سے زیادہ زور آور ہے اور اس طرح قانون کو ہمیشہ وہی بدلتا ہے اور وہی ترمیم کرتا ہے جو کمزور ہو اور ذرا حالات بگڑتے دیکھے تو وہ قانون میں ترمیم کر دے۔

اللہ کا چاہنا وہی ہے جو اس نے قانون بنا کر اس کا اعلان کر دیا ہے

---

۶۳ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور اپنی پوری مخلوق سے ان کو اشرف و اعلیٰ بنایا۔ چونکہ تخلیق انسانی میں شر اور خیر دونوں چیزوں کو اکٹھا کر دیا اور اس شاہکار کا یہی کمال ہے کہ یہ مجموعہ اضداد ہے اور اس وجہ سے یہ مکلف بھی ہے کہ جب متضاد قوتوں کا مجموعہ ہے تو ان قوتوں پر اس نے اس کو اختیار بھی مرحمت

فرمایا ہے اس اختیار کی وجہ سے وہ ثواب و عذاب کا مستحق ہے۔ پھر اللہ نے اس کو دونوں طاقتوں اور قوتوں سے کام لینے کی سمجھ بھی عطا فرمائی۔ اس کی راہنمائی کیلئے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا فرمایا یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ اللہ کا ارادہ یہ ہوا کہ انسان راہ راست پر چل کر دین و دنیا میں کامیابی حاصل کرے اور انہی کامیابیوں کی وجہ سے اس کو نیابت الٰہی نصیب ہو۔ لیکن قانون الٰہی یہ ہے کہ جو شخص جیسا عمل کرے ویسے ہی اس کا نتیجہ بھی اس کو ملے۔ اللہ کا ارادہ تو یہی ہے کہ انسان سیدھی راہ اختیار کرے اور اس نے سیدھی راہ چلنے والوں کیلئے اپنا قانون بھی نافذ کر رکھا ہے لیکن اگر انسان اپنے اس ارادہ سے جو اللہ نے اس کو اختیار کی صورت میں دے دیا ہے اللہ کے ارادہ یعنی چاہت کے خلاف چل نکلے تو پھر وہ اس کے قانون کی مخالفت کے باعث اس نتیجہ سے یقیناً دوچار ہوگا۔ گویا اس طرح اللہ کے چاہنے کے خلاف جو اس نے کیا تو اس لئے نہیں کہ وہ اس کے قانون کی گرفت سے بچ گیا ہرگز نہیں بلکہ اس طرح وہ اس کے قانون کی گرفت میں آگیا کہ اس نے رضائے الٰہی کے خلاف عمل کیا اور رضائے الٰہی کے خلاف عمل کرنے والوں کیلئے جو قانون الٰہی میں سزا ہے وہ اس کا مستحق قرار پایا اور اس طرح وہ اس شکنجے میں خود پھنس گیا اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ رضائے الٰہی کے خلاف کر کے میں نے نقصان کس کا کیا؟

فرمایا حقیقت حال اس طرح ہے کہ کچھ لوگ نرے اپنی خواہشات کے بندے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں؟ وہی اتنے جھوٹے کہ ہر بداعتدالی کی راہ کے متلاشی ہیں اور حدود اللہ کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اللہ سے زیادہ زور آور ہوگئے ہیں بلکہ اس لئے کہ اللہ نے ان کو اختیار دیا ہے اور وہ اپنے وعدے کا اتنا پکا ہے کہ جو اس نے اختیار دیا ہے وہ ان سے چھیننا نہیں چاہتا کیونکہ ان کو یہ اختیار دے کر اس کے استعمال کرنے کا ایک وقت بھی متعین فرما دیا ہے لہٰذا اس وقت معین تک ان کا پہنچنا قانون الٰہی میں طے ہے اور جب وہ وقت آجائے گا اس سے آگے وہ ایک پل بھی نکل نہیں سکیں گے اور اس طرح وہ اپنے کئے کی جوابدہی کیلئے حاضر کر لئے جائیں گے۔ اس طرح تم کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ راہ اعتدال سے ہٹ جانا مفید مقصد ہے یا راہ اعتدال پر قائم رہنا۔

ہاں! یہ بات مزید سمجھ لینی چاہئے کہ "ارادہ" کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک قطعی فیصلہ کے معنی میں اور ایک "چاہنے" کے معنی میں۔ اللہ تعالیٰ کے جو قطعی فیصلے ہیں ان پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور مجرد چاہنے کے معنوں پر اس کا اطلاق موجود ہے۔ قطعی فیصلے تو ان ٹل اور ان مٹ ہوتے ہیں جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں پتھر پر لکیر اور مجرد چاہنے کی تشریح میں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے علم و حکمت سے تمہیں اس مقصد کیلئے منتخب کیا ہے کہ تمہارے لئے اپنی آیتیں اور اپنے احکام و ہدایات واضح فرمائے اور انبیاء و صلحا امت کے ذریعے سے ایمان و عمل صالح کی جو راہیں دنیا کیلئے کھولی گئی تھیں اور جو اب گم کر دی گئی ہیں ان کی تمہیں از سر نو ہدایت بخشے تاکہ اللہ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تم پر رحمت کی نظر فرمائے۔ اس بات کو بھی ایک

فیصلہ الٰہی کی حیثیت سے ظاہر فرمایا۔ اس طرح اس کو بیان کرنے کا مقصد ایک تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے اور دوسرے اسلام کے معاندین و مخالفین کی ہمت شکنی جو ان معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے جو اس سورہ مبارکہ میں مذکورہ ہوئی ہیں جھاڑ کے کانٹوں کی طرح مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے تھے اور ان معاشرتی اصلاحات کو عام طور پر مفاد پرست طبقہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے سارے یہود و عیسائی اور مشرکین سب مل کر ان اصلاحات سے آگ بگولا ہوگئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس طرح ان کی زد ان کی بے لگام آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس ارادے کے ساتھ کھڑے ہوئے کہ ان تمام اصلاحات کو ناکام کر کے خلق خدا کو پھر اس تاریکی کے گڑھے میں دھکیل دیں جس سے نجات دینے کیلئے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔ اس طرح جن لوگوں نے اپنے اوپر اپنی خود ساختہ شریعتوں اور خانہ ساز رسموں اور رواجوں کے بوجھ لاد رکھے تھے انہوں نے جب دیکھا کہ یہ بوجھ لوگوں کے سر سے اتر رہا ہے اور اصرار و اغلال کی غیر فطری بیڑیاں کٹ رہی ہیں تو چیخنے لگے کہ دیکھو اسلاف کا سارا سرمایہ معرض خطر میں ہے اور چاروں طرف سے مارو مارو کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوگئیں اور قرآن کریم نے ان سب کا جواب دو ٹوک الفاظ میں دے دیا اور مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کی کمزوری کیا ہے؟ یہی کہ وہ مجموعہ اضداد ہے

۶۴ انسان چونکہ کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کمزوری کے باعث وہ اس گورکھ دھندہ میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ میں بڑا طاقتور ہوں کہ میں نے یہ کیا اور میں نے وہ کیا اور اس یہ وہ میں ان مخفی راہوں کو وہ تلاش نہیں کر پاتا جو اس کی اصل کامیابی کی راہیں ہیں اس لئے اس بتانے اور سمجھانے کیلئے سلسلہ ہدایت قائم کیا گیا اور ان تین آیتوں میں دراصل وہ سلسلہ ہدایت ہی اس کو سمجھایا گیا ہے اور اس طرح اس کو تین باتیں تفہیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے اول یہ کہ نزول شریعت کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگوں پر بھی شرائع نازل ہوتی رہیں اور وہ سب ایک ہی تھیں وہ کبھی مختلف نہ ہوئیں کہ ان کے اصول ایک ہی منبع سے نکلے تھے اور اس طرح ایک سچے کا حال مختلف نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہدایت و شریعت نہ ہوگی تو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کریں گے اور اس طرح اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔ تیسری یہ کہ نزول شریعت اس لئے ضروری تھا کہ انسان ہدایت کی راہوں کو صرف اپنی کوشش سے حاصل کرنے سے عاجز ہے جتنی دیر میں اس کو ایک غلط راہ چلنے کا تجربہ ہوگا اتنی دیر میں خود بوجہ اپنی غلطی کے غلط راہ پر چل کر ہلاک ہو چکا ہوگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود شرائع نازل کر کے انسان کے اس بوجھ کو کافی حد تک ہلکا کر دیا ہے۔ اے کاش کہ انسان بھی اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قانون الٰہی ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کر کے اس کے ذمہ کچھ ذمہ داریاں ڈال دی ہیں اور جب تک وہ ان اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا اس وقت تک قانون الٰہی حرکت میں نہیں آتا۔

بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۲۹ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ

ہو کہ آپس کی رضامندی سے ملا جلا کاروبار ہو اور دیکھو اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے لئے رحمت رکھنے والا ہے۔ ۲۹

اور یاد رکھو کہ جو کوئی ظلم اور شرارت سے ایسا کرے گا تو قریب ہے کہ ہم اسے آتش

دیکھو انسان کو پیدا کیا اور اس کی نسل کو آگے بڑھانے کیلئے ایک قانون بنا دیا اور یہ قانون اس نے صرف اور صرف اپنی مرضی و اختیار سے بنایا کسی کے دباؤ میں آکر نہیں اور پھر اس قانون کا اعلان بھی خود ہی فرما دیا۔ وہ قانون کیا ہے؟ فرمایا افرایتم ما تمنون تم نے دیکھا کہ امنا تمہارے ذمہ ہے لیکن تخلیق تمہارے ذمہ کی بات نہیں وہ ہمارے یعنی اللہ کے ذمہ ہے۔ فرمایا جب تک تم اپنے ذمہ کی بات پوری نہیں کرو گے ہمارا قانون اپنی ذمہ داری کیلئے کبھی کھڑا نہیں ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم قانون کے خلاف نہیں کرتے۔

سورہ الواقعہ میں اس طرح کی چند چیزیں اللہ نے اور بھی سمجھائی ہیں اور مطلب سب کا ایک ہی ہے کہ قانون الٰہی یہ ہے کہ تم اپنے ذمہ کا کام کرو اور یہی شریعت کا وہ بوجھ ہے جو انسان پر رکھا گیا ہے اور اس پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اس کو برداشت کرتے ہوئے اپنی منزل پر رواں دواں رہے گا تو تیرے لئے کامیابی کی راہیں کھلتی جائیں گی جو تیری دنیا کو بھی سنواریں گی اور تیری آخرت کو بھی بنائیں گی۔ لیکن بدقسمتی سے اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا اور ان کو پورا کرنے میں ہمیشہ کوتاہی کرتا ہے اور موہوم طریقہ سے اللہ کی ذمہ داریاں پوری ہونے کی امید پر طرح طرح کے عقائد گھڑتا اور پھر ان پر سختی سے کاربند ہو جاتا ہے اس طرح گویا وہ خود ہی اپنا خدا گھڑتا ہے اور خود ہی اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے اور پھر اس ادھیڑبن کا نام اس نے مذہب رکھ دیا ہے اور جتنا اس پر پختہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ اصل راہ سے دور ہٹتا جاتا ہے۔ یہود کی تاریخ تمہارے سامنے ہے، عیسائیوں کی تاریخ تمہارے پاس موجود اور آج عالم اسلام کے مسلمانوں کے عقائد و نظریات جو ان کے ہاں رواج پا گئے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں ایک ایک پر غور کرتے جاؤ بات تم پر روشن ہوتی جائے گی۔ پچھلی امتوں نے ہدایت الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی ہی تخلیق کردہ باتوں کو مذہب کے نام سے پیش کیا اور وہی کچھ آج کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آج جتنی مذہبی جماعتیں ہم میں موجود ہیں ان میں کون ہے جو اسلام کا نام نہیں لیتا؟ لیکن وہ اسلام تو ایک عرصہ سے دفتین میں بند ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے سینہ اقدس میں نازل ہوا تھا۔ اے اللہ!

اے ہمارے رب! ہم سب مسلمانوں کو دین اسلام کی سمجھ کی توفیق عطا فرما اور دین اسلام کے احکام پر مضبوطی سے چلنے اور قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔

مسلمانوں کو ہدایت کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ

۶۵ گزشتہ آیات میں ہدایات دی تھیں کہ یہ احکام جو تم کو دیئے گئے ہیں ان کا اصل مقصود یہ چار چیزیں تھیں۔

۱۔ اول یہ کہ فلاح و سعادت کی جس راہ پر تم سے پہلے نیک انسان چل چکے ہیں وہ تم پر بھی کھل جائے۔

۲۔ دوم یہ کہ احکام معاشرت میں سختیاں اور جکڑ بندیاں نہ ہوں بلکہ سہولتیں اور آسانیاں ہوں۔

۳۔ سوم یہ کہ جن معاشرتی برائیوں میں تم مبتلا تھے ان سے آئندہ تائب ہو جاؤ اور جان لو کہ جس اندھے کنوئیں میں پہلے گرے ہم اس سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

۴۔ چہارم یہ کہ افراط و تفریط سے بچو اور نفس پرستی میں بے لگام نہ ہو جاؤ ورنہ وہی کچھ ہو گا جو پہلوں کے ساتھ ہو چکا۔

ان باتوں کے سمجھانے کے بعد اب زیر نظر آیت میں یہ حکم سنایا جا رہا ہے کہ معاشرتی زندگی کی سعادت حاصل نہیں ہو سکتی اگر خاندان کے تمام افراد دیانت دار اور راست باز نہ ہوں بلکہ سہولتیں اور آسانیاں ہوں۔ سب مسلمان تو ایک ہی خاندان کے افراد ہیں حالانکہ حق تو یہ ہے کہ سارے انسان ہی مل کر ایک خانوادہ ہیں۔ فرمایا اچھا! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔ ہاں! اگر معاملہ تجارت کا ہو تو باہمی رضامندی سے ہر آدمی اپنا اپنا حصہ لے سکتا ہے۔

اس طرح اس آیت میں باطل طریقوں سے ایک دوسرے کا مال کھانے اور قتل نفس کو حرام ٹھہرایا ہے اور ان دونوں حرمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے کیوں؟ اس لئے کہ دراصل یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ مال کی حرص اس کے جائز و ناجائز طریقوں کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ اس کیلئے قتل و خون تک نوبت آجاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خون ریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے۔

باطل طریقہ سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملت کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی نہ پائی جاتی ہو بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہو، دوسرے کے مفاد کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ دوسرے کا مفاد نہ ہونے کے باوجود اس کو نظر آئے کہ اس میں میرا مفاد موجود ہے۔ تجارت کے رنگ میں جو دراصل تجارت بھی نہیں ہے کتنے طریقے ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں رواج پا گئے ہیں جن طریقوں سے دن رات ایک دوسرے کا مال ہڑپ کیا جا رہا ہے۔ قومی اسمبلی سے لے کر یونین کونسلوں تک جو جو

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ

دوزخ میں ڈال دیں اور اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ ۶۶ ۳۰

دیکھو جن بڑی بڑی برائیوں سے تمہیں روک دیا گیا ہے اگر تم ان سے بچتے رہو گے تو

صورتیں مال کھانے کی نکالی گئی ہیں کیا یہ تجارت ہے؟ آئے دن مال بٹورنے کے جو نئے نئے طریقے نکالے گئے ہیں کیا یہ تجارت ہے؟ تعلیمی اداروں سے لے کر مذہبی مدارس تک جو جو طریقے مال کھانے کے اختیار کئے جا رہے ہیں کیا یہ تجارت ہے؟ عذاب آخرت سے بچانے اور ثواب دلوانے کے مذہبی ٹھیکیدار جن جن طریقوں سے مال کھانے میں مصروف ہیں کیا یہ تجارت ہے؟ فرض عبادات کی ادائیگی کیلئے جو تنخواہیں' ہدیئے' تحفے اور فیسیں وصول کی جاتی ہیں کیا یہ تجارت ہے؟ دم' درود' گٹ' تعویذ' جھاڑ پھونک' جنات اور سائے وغیرہ کے مصنوعی طریقوں سے جو مال بٹورا جا رہا ہے کیا تجارت ہے؟ فیصلہ خود فرمالیں۔ لیکن ان ساری چیزوں کا جواز ہم نے قرآن و سنت کی روشنی میں بنا کر تیار رکھا ہوا ہے جو آئے ملاحظہ فرما سکتا ہے اور پھر آخر جو کچھ ہوتا ہے فریقین کی رضامندی ہی سے تو ہوتا ہے جو جواز کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ ساری فریب کاریاں اور مکاریاں آپس میں ایک دوسرے پر تو چل سکتی ہیں اور چل رہی ہیں لیکن کیا اللہ کے سامنے بھی چل جائیں گی؟

"قتل نفس" سے ایک مراد تو اس طرح ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا کہ مال کے حصول میں اکثر نوبت یہاں تک پہنچ ہی جاتی ہے کہ قتل جیسے نہایت ہی برے فعل سے بھی بعض اوقات دریغ نہیں کیا جاتا لیکن ایک معنی اس کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لینے کے بھی ہیں کہ ان طریقوں کو اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو اور اس طرح "نفس" سے مراد اپنی ذات بھی ہو سکتی ہے اور اس وجہ سے بعض مفسرین نے اس سے مراد خودکشی بھی لی ہے کہ مالی پریشانیوں اور ناجائز طریقوں سے مال اکٹھے کرنے کے نتائج میں بعض اوقات خودکشی کی صورت بھی لوگ اختیار کر جاتے ہیں۔

شریعت کے احکام میں سب سے زیادہ وقعت اسی بات کو دی گئی ہے کہ ایک دوسرے کا مال باطل طور پر نہ کھاؤ اس لئے کہ دنیا میں جتنی بدکاریاں موجود ہیں سب کی اصل جڑ یہی ہے۔ مال کی محبت اور حرص ہی انسان سے اور قوموں سے اکثر ظلم کراتی ہے۔ آج کسی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ قومی زندگی میں یہ سب سے زیادہ ظلم کس قوم نے مچا رکھا ہے اور کون ہے جو کسی ظالم کو ظالم کہنے کی ہی جرات رکھتا ہے؟ اپنے آپ کو مظلوم کہنے والوں کی زبانوں پر بھی تالے پڑ گئے کہ وہ اپنے آپ کو مظلوم کہتے ہیں لیکن ظالموں کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے کہ انہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اکثر و بیشتر مظلوم اپنے اوپر خود ہی ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ پھر سوچ لو کہ کیوں؟ اس لئے کہ جب فاعل اور مفعول دونوں مل جائیں تو دراصل وہ دونوں ہی ظالم ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ایک ظالم نظر آتا ہے اور دوسرا مظلوم۔

نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا

ہم تمہاری لغزشوں اور غلطیوں کے اثرات تم سے محو کر دیں گے اور تمہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے جو عزت اور خوبی کا مقام ہو گا۔ ۳۱

ایسے پاپیوں کیلئے اللہ کی آگ تیار ہے جو چور بھی ہیں اور چتر بھی

۶۶ اس آیت میں ان موہوم خواہشیں رکھنے والوں کے کان کھول دیئے گئے ہیں جو دن رات ظلم کر کر نہیں تھکتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ غفور و رحیم ہے اگر ہم ظلم ہی نہ کریں تو وہ آخر کس کو معاف کرے گا اور کیا معاف کرے گا؟ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے ہیں اور پھر کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کی ٹینکیاں جب بھرنے کو آتی ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی ٹوٹی کھول دیتے ہیں اور اس فیاضی سے وہ سخی کہلاتے ہیں حاجی جی کا خطاب حاصل کرتے ہیں اور اس طرح پچھلے مظالم معاف کرا کر نئے سرے سے پوری آب و تاب کے ساتھ ظلم ڈھانا شروع کر دیتے ہیں پھر ان کی کھلی ٹوٹی سے جو لوٹا بھر رہا ہے جو دو گھونٹ پی رہا ہے کیا وہ ان کو ظالم کہے گا؟ کبھی نہیں۔ اچھا تو اس طرح یہ ظالم ظالم نہیں رہیں گے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر وہ پہلے اکہرے ظالم تھے تو اب وہ دوہرے ظالم ہیں اس لئے کہ وہ اس طرح عدوان کے بھی مرتکب ہوئے ہیں اور ظلم کے بھی۔

عدوان کیا ہے؟ زور و زبردستی سے دوسرے کے مال و جان پر دست درازی کرنے والا کیا کرتا ہے؟ عدوان کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کو ہماری زبان میں دھونس کہتے ہیں اور ہر دھونس کرنے والا دھاندلی بھی ضرور کرتا ہے۔ بس یہ دھونس عدوان ہے اور دھاندلی ظلم۔ فرمایا جب یہ دھاندلی مچانے والا دھونس پر اتر آیا ہے کہ اب اس کی دھاندلی کا کوئی نام بھی نہیں لے سکتا گویا اتنی ترقی کر گیا ہے تو آؤ اس کا نام ہم رکھ دیتے ہیں کہ وہ عادو ہو کر ظلم کی حدود سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ فرمایا اچھا! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم اس کو آتش دوزخ میں ڈال دیں گے اور ہمارے لئے ایسا کرنا کوئی مشکل امر نہیں کیونکہ ہم کچھ کر ہی نہیں رہے ہم نے تو صرف اس کے اپنے کئے ہوئے کاموں کے نتائج اس کے سامنے رکھے ہیں اور ان نتائج میں ہم نے کوئی ذرہ برابر بھی زبردستی نہیں کی پھر کیا اس کے اعمال اس کے سامنے پیش کرنا ہمارے لئے کوئی مشکل بات ہے؟

کبائر سے بچنے والوں کے صغائر کی معافی کا اعلان عام

۶۷ کبائر کبیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بڑا۔ اس جگہ کبائر سے مراد وہ گناہ ہیں جن کی عقوبت بڑی ہو۔ جس طرح نیکیاں بڑی اور چھوٹی ہوتی ہیں بالکل اسی طرح برائیاں بھی چھوٹی اور بڑی ہوتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کی بڑائی اور چھٹائی کے ناپنے کیلئے کوئی پیمانہ ہے تو وہ صرف اور صرف

ان کے نتائج و اثرات ہیں اس لئے ان کے سمجھنے کیلئے عقل کی راہنمائی کافی ہے۔ وہ خود فیصلہ کرتی جاتی ہے کہ یہ گناہ کتنا بڑا گناہ اور یہ نیکی کتنی بڑی نیکی ہے۔ پھر حالات اور واقعات کے مطابق نیکی اور برائی کا معیار کم اور زیادہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی ذرا سی نیکی بھی بہت بڑی لگتی ہے اور دوسرے کی بڑی نیکی بھی معمولی نظر آتی ہے اور اس طرح اپنی بڑی سے بڑی برائی کو بھی ہلکا سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کی معمولی برائی کو بھی بڑا خیال کیا جاتا ہے کبھی خواہشات کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ پربت رائی بن جاتا ہے اور رائی پربت ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اس التباس سے بچنے کیلئے حلال و حرام کو واضح کر دیا ہے لیکن ان کے درمیان کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق التباس پیش آسکتا ہے۔ ایسی چیزوں کے متعلق تقویٰ کی راہ تو یہی ہے کہ آدمی احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے تاہم بشری کمزوری سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو دل کی ملامت یقیناً اس کو صاف کر دیتی ہے۔

تاہم احادیث میں کبائر کی نشاندہی بھی فرمائی گئی ہے تاکہ عام لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے مثلاً صحیح بخاری اور مسلم میں حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سات ہلاک کرنے والی باتوں سے بچو اور پھر ان کی تفصیل بھی آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی اور ان کے اس طرح نام لئے کہ فرمایا شرک ہے' سحر ہے' قتل ناحق ہے' یتیم کا مال کھانا ہے۔ سود کھانا ہے۔ جنگ کے دن پیٹھ دے کر بھاگنا ہے اور پاکدامن مومنہ عورتوں پر الزام لگانا ہے اور ایک حدیث میں ہجرت کے بعد یہ بادیہ نشینی کی طرف لوٹ جانا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح کسی جگہ والدین کی نافرمانی کو شمار کیا ہے اور کبھی ان کی ترتیب کو کسی طرح بیان کیا ہے کہیں کسی طرح اور اس طرح ان کی اہمیت کے پیش نظر کسی جگہ کسی بات کو اولیت دی گئی ہے اور کسی جگہ کسی بات کو۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے شراب کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اکبر الکبائر ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی کبائر میں سے ہے کہ کوئی انسان اپنی ماں کو گالی دے اور پھر اس کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی کہ کسی کی ماں کو گالی دے اور وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا تو اس طرح گویا جس نے پہلے گالی دی اس نے اپنی ہی ماں کو گالی دی (صحیح بخاری) ایک حدیث میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور قتل کرنا کفر ہے اور یہ بھی کبائر میں داخل ہیں۔ (صحیح بخاری)

ترک صلوٰۃ کو بھی کفر فرمایا گیا جو کبائر میں داخل ہے اور ایک حدیث میں رحمت سے مایوس ہونے کو اکبر الکبائر میں بیان فرمایا گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ میں کوئی اصولی فرق ظاہر کیا جائے کہ وہ کیا ہے؟ قرآن و سنت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین چیزیں ہیں جو کسی گناہ کو بھی بڑا گناہ بنا دیتی ہیں اگرچہ عام دیکھنے میں وہ بڑا گناہ نظر نہ آتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سے بے خوفی اور اس کے مقابلہ میں استکبار جس کی بناء پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پرواہ نہ

کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور جان بوجھ کر ان کاموں کو نہ کرے جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیت اپنے اندر لئے ہوئے ہوگی اس قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اس معنی کے لحاظ سے گناہ کے لئے "فسق" اور "معصیت" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

۲۔ کسی کی حق تلفی' خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہو کہ اس کا حق تلف کیا جائے یا والدین ہوں یا دوسرے انسان حتیٰ کہ اپنا نفس بھی۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اس قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہوگا۔ اس بناء پر گناہ کو "ظلم" بھی کہا جاتا ہے اور اس بناء پر شرک کو قرآن کریم نے ظلم عظیم قرار دیا ہے۔

۳۔ ان روابط کا توڑنا اور ان تعلقات کو بگاڑنا جن کے ملانے کا اور جن کی درستی و استحکام کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے خواہ وہ روابط بندے اور اللہ کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملہ میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے اس قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجئے یہ فعل فی نفسہٖ نظام تمدن کو خراب کرنے والا ہے اس لئے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے لیکن اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ کا زنا بن بیاہے کی نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر میں اس فعل کا ارتکاب غیر ہمسایہ سے زیادہ برا ہے۔ محرمات میں اس کا صدور غیر محرمات سے بہت ہی زیادہ قبیح و شنیع ہے۔ کسی پاکیزہ جگہ میں ایسا فعل ناپاک جگہ کی نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ گویا ایک ہی گناہ اپنی نوعیت کی وجہ سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ہر قسم کے رذائل اپنی نوعیت کے اعتبار سے کبائر میں داخل ہو جاتے ہیں اور اگر ان کا شمار کیا جائے تو بہت ہی زیادہ ہیں شاید ان کا شمار کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے تاہم ان میں سے بعض کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

جھوٹ' جھوٹی قسمیں کھانا' غیر اللہ کی قسمیں کھانا' وعدہ خلافی کرنا' فطری وعدوں کا خیال نہ رکھنا' خیانت اور بددیانتی' غداری اور دغا بازی' بہتان' چغل خوری' غیبت اور بدگوئی' دورخا پن' بدگمانی' مداحی اور خوشامد' بخل' حرص و طمع' بے ایمانی' چوری' ڈاکہ زنی' ناپ تول میں کمی بیشی یعنی دیتے وقت کم دینا اور لیتے وقت زیادہ لینا۔ رشوت' سود خوری' شراب خوری' جوا بازی' اغلام بازی' ناحق غیظ و غضب' بغض و کینہ اور ہر طرح کا ظلم' فخر و غرور اور تکبر' ریا' خود بینی اور خود نمائی۔ بعض حالات میں فضول خرچی اور فحش گوئی۔ یہ سب گناہ ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور بعض شرائط کے تحت یہ سارے ہی کبائر کی فہرست میں داخل ہیں۔

قرآن کریم میں بہت سی چیزوں کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے اور پھر ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور ان

تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ

اور دیکھو اللہ نے تم میں سے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے مقابلہ میں جو کچھ دے رکھا ہے اس کی تمنّا نہ کرو۔[۵۶۸] مردوں نے اپنے عمل میں سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے

کے قائل کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

"اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے' جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں۔ الا یہ کہ کوئی قصور ان سے سرزد ہو جائے۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔" (النجم ۵۳ : ۳۲) اور ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

"جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں' جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں' ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔" (الشوریٰ ۴۲ : ۳۸)

اللہ تعالیٰ نے تم کو جو فضیلت ایک دوسرے پر دی ہے اس کا خیال رکھو اور تجاوز نہ کرو

۵۶۸ قرآن کریم کے نزول سے پہلے دنیا کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ وجود انسانی کا کامل ظہور صرف مردوں ہی کی جنس میں ہوا ہے۔ عورتوں کی ہستی کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتی بلکہ مردوں کا ایک کھلونا ہے۔ وہ صرف اس لئے بنائی گئی ہیں کہ مردوں کی خرمستیوں کا ازالہ کریں اور ان کی کام جوئیوں کا ذریعہ ہوں بلکہ ان کی چاکری اور پرستاری میں فنا ہو جائیں۔

قرآن کریم تاریخ عالم کی سب سے پرانی آواز ہے جو اس اعتقاد کے خلاف بلند ہوئی۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے نوع انسانی کو مرد اور عورت کی ایک جنس کو دو صنفوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ان دونوں صنفوں کا مل کر ایک جنس ہو جانا شیر و شکر کی طرح اپنے اندر ایک تکمیل حیات رکھتا ہے۔ تاہم دونوں صنفیں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں۔ کارخانہ معیشت کیلئے جس طرح ایک صنف کی ضرورت تھی ٹھیک اسی طرح دوسری صنف کی بھی ضرورت تھی۔ انسان کی معاشرتی زندگی کیلئے یہ دو مساوی عنصر ہیں جو اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کر دیں۔

دیکھو تم دونوں صنفیں ذرا غور کرو کہ تم دونوں مل کر ایک جنس ہو اس لئے جنس کے لحاظ سے تم کو

ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ ہاں! اصناف کے لحاظ سے تم دو اصناف میں منقسم ہو۔ ایک مرد ہے تو دوسری عورت تمہاری ڈیل ڈول اور جسمانی ساخت اور اعضاء و بند میں ایک خاص طرح کا فرق رکھ دیا گیا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تمہارے بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ کسی فضیلت میں مرد زیادہ ہے اور کسی میں عورت زیادہ ہے۔ کوئی کمی مرد کے اندر ہے اور اس طرح کوئی کمی عورت کے اندر۔ لہٰذا تم فریقین کو یہ احتیاط لازم ہے کہ جو فضیلت عورت میں ہے اس کو حاصل کرنے کی مرد کوشش نہ کرے اور اس طرح جو فضیلت مرد میں ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش عورت نہ کرے بالکل اسی طرح جو کمزوری مرد میں ہے اس کمزوری کو مرد تسلیم کرے اور جو کمزوری عورت میں ہے اس کو عورت تسلیم کرے یہی راہ اعتدال کی راہ ہے اور پھر تم دونوں مل کر ایک ہو جاؤ اور اس طرح ایک ہو کہ مرد کی کمزوری کا ازالہ عورت کرے اور عورت کی کمزوری کا ازالہ مرد کرے۔ مرد کی فضیلت کو عورت تسلیم کرے اور عورت کی فضیلت کو مرد تسلیم کرے اور اس طرح تم دونوں مثلثیں منطبق ہو جاؤ کہ تمہارا ہر زاویہ ایک دوسرے کے برابر ہو اور کوئی دیکھ نہ سکے کہ تم دو ہو اس طرح تم دونوں ایک ہو جاؤ۔ اجسام دونوں کے دو ہوں لیکن انطباق دونوں کا ایک اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد مرد رہے گا اور عورت عورت۔ پھر مرد کبھی عورت ہونے کی خواہش نہ کرے گا اور عورت کبھی مرد ہونے کی خواہش نہ کرے گی۔ مرد جتنی ترقی کرے گا صرف مرد ہونے ہی میں کرے گا عورت جس بلندی پر بھی پہنچے گی عورت رہتے ہوئے پہنچے گی۔ اس طرح ترقی میں کوئی چیز مانع نہ ہوگی بلکہ فریقین آزادی کے ساتھ ترقی کر سکیں گے لیکن اپنے اپنے دائرہ فطری میں رہتے ہوئے۔

آج فی زمانا جس ترقی کو لوگ ترقی کے نام سے پکارتے ہیں حاشا اللہ وہ ترقی نہیں بلکہ فطرت سے انکار ہے اور پھر چونکہ فطرت سے انکار ممکن نہیں اس لئے اس بات سے انکار کرنا جس سے انکار کرنے کی کوئی صورت بھی موجود نہ ہو ایک طرح کی ضد ہے عناد ہے اور پھر ضد و عناد کا جو نتیجہ نکلنا لازمی و ضروری ہے آج ہم اس سے دوچار ہیں اور صرف آزادی آزادی کے بل بوتے جئے جا رہے ہیں اور اس آزادی کا جتنا شور کرتے ہیں اتنے ہی غلامی میں پھنستے جا رہے ہیں۔ عورت کیا ہے؟ مزروعہ زمین۔ اس کا کام کیا ہے؟ بیج اگانا۔ مرد کیا ہے؟ ایک دہقان۔ اس کا کام کیا ہے؟ ہل چلانا اور بیج ڈالنا۔ واہ رے عورت! اور واہ رے مرد! تم دونوں تو نئی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے تھے۔ تم نے تو کہا تھا کہ یہ ملا دقیانوسی پرانے خیالات کے ہیں جو مرد و عورت کو مساوی مساوی چلنے سے روکتے ہیں۔ یہ عورتوں کے حقوق نہیں دیتے۔ تم نے تو بڑے الزام لگائے تھے لیکن نتیجہ کیا رہا کہ تم نے سفر بھی بہت کیا؟ جوں چلنے لگے بس چلتے ہی گئے تم دونوں نے ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھا' بانہوں میں بانہیں ڈالیں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دھکے کھائے' ملازمتیں کیں۔ اب ہی سوچ لو کہ تم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ آج تک تم دونوں نے ایک دوسرے کا کیا ہاتھ بٹایا کہ مرد کا کام چار گنا بڑھا تو عورت کا دس گناہ بڑھ گیا اور دونوں اصناف کو اپنے اپنے فطری کام بھی ویسے ہی کرنے پڑے۔ کتنی خواری ہوئی اور کتنا

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝۳۲

اور اللہ سے اس کی بخشش کے طلبگار رہو یقیناً وہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ ۳۲ ۶۹

بوجھ بڑھا؟ اللہ کا ارشاد ایک بار پھر نظروں میں رکھو فرمایا "اور دیکھو اللہ نے تم میں سے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے مقابلہ میں جو کچھ دے رکھا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔" اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کرو' خیر اس میں ہے۔ "مینڈکی کو کھربال لگوانے کا کچھ فائدہ نہ ہوا"

مردوں کی کمائی مردوں کیلئے اور عورتوں کی عورتوں کیلئے یہ ایک اصولی بات ہے

۶۹ مردوں کی کمائی کا ایک دائرہ کار ہے اور اس طرح عورتوں کی کمائی کا بھی ایک دائرہ کار ہے۔ اپنے اپنے دائرہ فطری کے اندر رہ کر کسب عمل نہ برا ہے اور نہ ہی اس کی ممانعت ہے۔ ممانعت جو ہے وہ صرف اس کی ہے کہ عورتیں مردوں کے دائرہ کار میں رہ کر عمل کرنا چاہیں اور مرد عورتوں کے دائرہ کار کے اندر دخل اندازی سے باز نہ آئیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح حدود سے تجاوز ہوگا اور حدود سے جب بھی تجاوز ہوگا سرکشی و طغیانی آئے گی جس کے نتائج بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں اور پھر اس طرح کا جب سیلاب آتا ہے تو اس میں سب کے سب برابر کے شریک سمجھے جاتے ہیں کیونکہ سیلاب کے سامنے جو بھی آیا وہ تباہ و برباد ہوا۔ اگر جان بچ بھی گئی تو نقصان کی کوئی کمی نہ رہی۔

عورتیں اس خیال سے دل گیر نہ ہوں کہ وہ مرد کیوں نہ ہوئیں؟ اور مردوں کے کام ان کے حصے میں کیوں نہ آئے؟ اور مرد بھی یہ خیال نہ کریں وہ مرد ہو کر عورتوں کے مالک ہوگئے اور عورتوں کو ان کی ملکیت سے اب کون نکال سکتا ہے۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے بالکل دونوں فریقین کیلئے اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے دائرہ فطری میں رہتے ہوئے عمل و فضیلت کی ساری راہیں کھلی ہیں۔ کسب و کمائی کا اطلاق دینا کے دھندوں پر بھی ہوتا ہے اور اخروی بھلائیوں اور نیکیوں پر بھی اور اس جگہ دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ جس طرح مردوں کو کمانے کا حق ہے عورتوں کو بھی ہے خواہ وہ کمائی دنیوی ہو یا اخروی لیکن دونوں کے دائرے اور حدود الگ الگ ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ کچھ عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مرد تو ہم پر بہت سبق لے گئے کہ ان کو جہاد کا موقعہ ہے اور وہ بہت ثواب حاصل کر سکتے ہیں اور راہ الٰہی میں بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتے ہیں تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر حاملہ عورت کو اتنا اجر ملتا ہے جتنا اس شخص کا اجر ہے جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو ذکر الٰہی میں کھڑا رہتا ہے۔ پھر جب وہ بچہ جنتی ہے یعنی حمل وضع کرتی ہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کیلئے کس قدر اجر و ثواب ہے۔ پھر اگر وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو ہر ایک مرتبہ جو بچہ اس کا دودھ چوستا ہے اس کو ایک نفس کے احیاء کا اجر ملتا ہے۔

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

ع ۵ ۸ ۲

اور دیکھو جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کیلئے ہم نے حق دار ٹھہرا دیئے ہیں نیز جن سے تمہارا عہد و پیمان بندھ چکا ہے پس چاہئے کہ جو کچھ جس کا حصہ ہو وہ اس کے حوالے کر دو اللہ حاضر و ناظر ہے' اس سے کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔ ۳۳

مرد عورتوں کی معاشی زندگی کا بندوبست کرنے والے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ان میں

مرد و عورت کی جو تقسیم فطری ہے اس سے فریقین کو تجاوز نہ کرنا چاہئے۔ مرد الگ حالات میں رکھا گیا ہے اور عورت الگ حالات میں رکھی گئی ہے۔ مردوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کمالات کو حاصل کریں اور عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کمالات کو حاصل کریں۔ اس بات کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ○ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ○ (اللیل ۹۲ : ۳' ۴)

"وہ ذات جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا' درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔"

غور کرو اور سوچ سمجھ کر جواب دو کہ کیا رات اور دن ایک جیسے ہیں؟ رات چھپا لینے والی ہے اور دن سب کچھ روشن کر دینے والا۔ پھر کیا رات بغیر دن کے کوئی شے ہے؟ کیا دن کی حقیقت بغیر رات کے کچھ رہ جاتی ہے؟ حاشا للہ! رات دن کے بغیر عذاب الٰہی ہے اور اسی طرح دن رات کے بغیر عذاب الٰہی ہے۔ لیکن دونوں کے جوڑ نے کیا سہانا نظام قائم کر دیا ہے۔ پھر اس طرح رات کے آثار و نتائج اپنے ہیں اور دن کے آثار و نتائج اپنے۔ کیا دونوں نے کبھی کوشش کی ایک دوسرے کے آثار و نتائج کو حاصل کر لیں۔ پھر یہ فطری تقسیم نر و مادہ میں بھی قائم ہے اور انہی نر و مادہ میں سے ایک جنس انسان بھی ہے اور پھر انسان کا نر و مادہ یہ کوشش کیوں کرے کہ وہ ایک دوسرے کے دائرہ کار میں داخل ہو؟ بس یہی وہ تجاوز ہے جس سے روکا گیا ہے۔ باقی معاملات میں اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر ترقی سے جو روکتا ہے وہ خود انسانیت سے عاری اور پرلے درجے کا جاہل ہے۔ ہاں! یاد رکھو کہ تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہو وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور نتائج کے لحاظ سے اپنی اپنی حدود کے اندر ہیں اور ان کو انہی حدود کے اندر رہنا چاہئے باقی سب خیر ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ

سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے[۷۱]۔ نیز اس لئے کہ مرد اپنا مال' خرچ کرتے ہیں[۷۲]۔ پس جو

میراث میں بھی ایک خاص طریقہ ہے اس کا لحاظ رکھو اور عہد و پیمان کو پورا کرو

۷۰ عربوں میں عام رواج تھا کہ ایک دوسرے سے انفرادی قومی عہد و پیمان باندھتے رہتے تھے۔ جن کے فوائد سے بھی کلی طور پر انکار نہیں کیا جاتا بلکہ اسلام نے ان میں سے بہت سے عہد و پیمان جاری رکھے ہیں اور ان کی حفاظت کا بھی حکم دیا ہے ہاں! جو غلط قسم کے رواج تھے ان کی بیخ کنی کر دی گئی ہے اور آئندہ ان سے روک دیا گیا ہے۔ ان ہی عہد و پیمان میں ایک یہ بھی تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے کہہ دیتا کہ میرے مرنے کے بعد میری میراث کا تو وارث ہے خواہ کسی خاص حصہ میں یا ساری میراث کا اور یہ بھی کہ تیرا خون میرا خون ہے اور تیرا عہد میرا عہد ہے۔ تیری جنگ میری جنگ ہے۔ اس کو وہ ایک دوسرے کا حلیف کہتے تھے۔ ان میں بہت سے رواج غلط بھی تھے کہ مثلاً یہ کہہ دینا کہ میرے بعد تم میری بیوی کے وارث ہو اور وہ میرے بعد گویا تمہاری بیوی ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے بہت سے غلط رواجات کو مٹایا لیکن جو ان میں ایسے تھے کہ ان میں کوئی قباحت نہ تھی بلکہ کچھ اچھائی اور بھلائی ہی کے آثار پائے جاتے تھے ان کو نہیں چھیڑا اور اگر کہیں چھیڑا ہے تو صرف اصلاحی رنگ میں اس کی اصلاح فرمائی ہے۔

زیر نظر آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ دیکھو "جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کیلئے ہم نے حق دار ٹھہرا دیئے ہیں۔ اور پھر ان حصہ داروں کی پوری تفصیل بھی پیچھے قانون میراث میں سمجھا دی گئی ہے۔ چنانچہ اس جگہ اس بات کی کچھ مزید وضاحت فرما دی کہ "جن لوگوں سے تمہارا عہد و پیمان بندھ چکا ہے۔ پس چاہئے کہ اس کو بھی اس کے حصہ کے مطابق پورا کرو اور اس کے حوالے کر دو۔" یعنی زندگی ہی میں اس کو ادا کر دو وہ اس طرح کہ دیکھو تم کو زیادہ سے زیادہ تیسرے حصہ میں وصیت کا حق ہے اور پھر تم اس حق کے اندر رہتے ہوئے چاہو تو وصیت کر سکتے ہو اور اس طرح جس عزیز و اقارب کی مدد کرنا چاہتے ہو کو لو چاہو اپنے ہاتھوں دے جاؤ چاہو اس کی وصیت کر دو ہاں! اپنے حصہ سے تجاوز نہ کرو کہ اس طرح ورثاء کا نقصان ہوگا اور وہ بھی کسی مال میں جائز نہیں اور آخر میں فرمایا کہ "اللہ حاضر و ناظر ہے اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔" یعنی جو کچھ تم کر رہے ہو اس حقیقت حال سے بھی اللہ واقف ہے اور جانتا ہے کہ تم کس کس کی مدد کر رہے ہو یا ورثاء کا نقصان چاہتے ہو۔

جس معاملہ میں مردوں کو مزیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا

۷۱ اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے اور اسی طرح

کی کچھ مزیت مردوں کو بھی عورتوں پر حاصل ہے۔ عورت صنف نازک ہونے کی وجہ سے حمل' وضع اور رضع پر فطری طور پر پابند ہے اور یہ فوقیت فطری طور پر اس کو مرد پر حاصل ہے اس طرح مردوں پر عورتوں کی ضروریات معیشت کی ذمہ داریاں رکھ دی گئی ہیں ان میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے جس کے نتیجہ میں فطری طور پر سربراہی و کارفرمائی کا مقام مردوں کو حاصل ہے کیونکہ وہ عورتوں کے مقابلہ میں فطری طور پر سخت جان ہیں۔ اس لئے سربراہی اور کار فرمائی کا عہدہ ان کی اس فطری حالت ہی کے مطابق دیا گیا ہے کیونکہ کنٹرول بہرحال سختی چاہتا ہے اور عورت فطری طور پر اس کی متحمل نہیں۔ اگر اس کے ہاتھ میں یہ نظام دیا جاتا تو یقیناً وہ نظام معطل ہو کر رہ جاتا کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر کیونکہ فطرت بدل نہیں سکتی۔

چنانچہ سورہ بقرہ میں ہم اس کی تفصیل بیان کر چکے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اور اس مضمون کو اس جگہ ان الفاظ میں ادا فرمایا گیا کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ جو بات وہاں ارشاد فرمائی وہی اس جگہ بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم و واجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں۔ تاہم ایک معاملہ میں مردوں کو عورتوں پر امتیاز حاصل ہے وہ بھی فطری چیز ہے کسبی نہیں وہ سخت جان ہونا ہے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مرد زیادہ سخت جان اور اپنی ڈیل ڈول میں اور قویٰ کی بناوٹ میں عورتوں کے لحاظ سے سخت ہیں۔ اس لئے سختی برداشت کرنا بھی ان ہی کا حق ہے۔

قرآن کریم نے اس مزیت کو بیان کرتے وقت جو الفاظ بیان فرمائے وہ بھی بہت ہی قابل غور ہیں۔ الفاظ کیا استعمال کئے گئے؟ فرمایا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اور یہ نہیں فرمایا کہ فضلهم عليهن کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی۔ اس طرح جو الفاظ بیان کئے گئے ان کے اندر ایک خاص حکمت رکھ دی کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزء قرار دے کر اسی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر ایک چیز میں مردوں کی فوقیت اور فضیلت ثابت بھی ہوتی ہے تو یہ آپس کے بعض کو بعض پر ہے کیونکہ اس طرح کی فضیلت کوئی ایسی چیز نہیں جس سے مرد کوئی اعلیٰ چیز ہوگیا اور عورت ردی کا مال۔ نہیں بلکہ یہ فضیلت ایسی ہے جو پھر گھوم پھر کر عورت ہی کی طرف منتقل ہوتی ہے کیونکہ عورت اور مرد ایک جنس کی دو اصناف ہیں اس لئے ان دونوں کا ایک ہی خمیر ہے۔ اس کی مثال اس طرح آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ جیسے انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل ہے یا انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے یا اعضائے رئیسہ دوسرے اعضاء کے مقابلہ میں افضل ہیں۔ تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا یا دل کا معدہ سے افضل ہونا یا اعضائے رئیسہ کا دوسرے اعضاء کے مقابلہ میں افضل ہونا ہاتھ' معدہ اور دوسرے اعضاء کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا اس طرح مرد کا افضل ہونا عورت کے درجہ یا مقام کو کچھ کم نہیں کر دیتا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے مثل اجزاء اعضاء ہی کے ہیں۔ پھر مرد کو سر کہہ دینے اور عورت کو بدن کہہ دینے سے قیامت کیا بپا ہوگئی؟ مرد کس بات پر پھولے نہیں

سماتے؟ اور عورت اپنے مقام سے کیسے گرا دی گئی؟

لیکن افسوس کہ یہ فضیلتیں مسلمانوں کے پیچھے ایسی پڑیں کہ انہوں نے کچھ اسلام کا چھوڑا نہ مسلمانوں کا۔ حسین رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا علی رضی اللہ عنہ ؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا علی رضی اللہ عنہ ؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا عائشہ رضی اللہ عنہا ؟ حسن رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حسین رضی اللہ عنہ ؟ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ افضل ہیں یا مہدی رحمۃ اللہ علیہ ؟ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ افضل ہیں یا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ؟ اس طرح کی فضیلتوں نے اسلام کو ایک میدان جنگ بنا دیا کتنے مرے اور کتنے مر رہے ہیں کوئی پوچھے کہ سب جن کا ذکر کیا گیا ہے یہ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ نہیں؟ یہ سب بنی نوع انسان نہیں؟ یہ سارے کے سارے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ کوئی کسی معاملہ میں افضل ہے اور کوئی کسی صفت اور کام میں افضل تاہم یہ سب کے سب ایک جسم کے اعضاء ہیں۔ کوئی اسلام کا ہاتھ ہے تو کوئی سر کوئی اسلام کی پشت ہے تو کوئی پیٹ۔ کوئی اسلام کا دل تو کوئی دماغ۔ آپ آخر لڑتے کس بات پر ہیں؟ تاریخ میں ہے کہ امام محمد بن الحنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ تم سے بڑے ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس معرکہ کیلئے کیوں انتخاب کیا ہے اور ان میں سے کسی کو کیوں روانہ نہیں کیا؟ کہنے والے نے جس مقصد کیلئے بھی کہا اس سے کوئی بحث نہیں کی اور نہ الجھاؤ پیدا کیا فرمایا تو صرف یہ کہ بھائی بات دراصل یہ ہے کہ میں علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ہوں اور حسین رضی اللہ عنہ آنکھیں اس لئے جو کام ہاتھوں کے کرنے کا ہے اس کیلئے مجھے ہی انتخاب کرنا چاہئے تھا۔ حسنین رضی اللہ عنہما کو نہیں یہ تو اس گھر کی بات ہے جس گھر کی فضیلت ثابت کرنے کیلئے تم ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہو اور تمہیں ذرا شرم نہیں آتی کہ کل اللہ کے سامنے جواب کیا دو گے؟

مردوں کو جو مزیت حاصل ہے وہ کس درجہ میں ہے ؟

۷۲ قرآن کریم کہتا ہے کہ عورتیں چونکہ صنف نازک ہیں اور ان کے سارے فطری کاموں اور ذمہ داریوں کا تعلق چار دیواری کے اندر سے ہے اور ان کے مقابلہ میں مرد سخت جان اور ایک کرخت صنف ہے اس لئے ان کے فطری کاموں اور ذمہ داریوں کو تعلق بھی زیادہ تر چار دیواری سے باہر کے کاموں سے ہے۔ جو محنت و مزدوری مرد کر سکتے ہیں عورت کیلئے ممکن ہی نہیں۔ مرد صبح سے شام تک ٹوکری سر پر رکھے تیسری منزل پر اینٹ گارا پہنچانے کیلئے سو سو بار چڑھ اتر سکتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں عورت جو حاملہ بھی ہے ایک بار بھی اتنا بوجھ اٹھا کر تیسری منزل تک پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ مرد سارا دن ہل چلا کر بیلوں کیلئے چارہ کاٹتا اور کھیت کو پانی دیتا ہے لیکن عورت اذیت کے دنوں کی تکلیف میں مبتلا گھر میں بیٹھ کر اپنی کمر میں کمربند باندھے پڑی ہے۔ وہ خاوند کو کھانا پکا کر دینے سے بھی بیزار ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ مرد مرد ہے اور عورت عورت ہے۔ پھر مرد نے اتنی محنت کر کے جو کمایا ہے وہ کدھر گیا؟ اس اپنی چہیتی بیوی کے ہاتھ میں دے کر خالی ہاتھ بیٹھ گیا۔ پھر فضیلت کس کو ہوئی؟ مرد کہتا ہے کہ عورت کو کیوں؟ اس لئے کہ میں نے اتنی محنت کر کے جو کچھ کمایا ہے وہ اپنی جان پر بھی خرچ نہیں کیا وہ سارے کا سارا بیگم صاحبہ کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیا

اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ

عورتیں نیک ہیں ان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور اللہ کی حفاظت سے جو انہیں حاصل ہے وہ پوشیدگی اور غیبت میں بھی اس کی حفاظت کرتی ہیں ۷۳ اور جن بیویوں سے

اس لئے میرے خیال میں تو فضیلت عورت ہی کی ہوئی۔ اسلام کہتا ہے کہ شاباش تم نے بہت اچھا کام کیا اور آئندہ بھی ایسا ہی کرتا رہ کہ خوب محنت و مزدوری کر کے جو کچھ حاصل ہو اسی طرح لا کر بیگم کے ہاتھ میں دے اور اس محنت و مزدوری کرنے کے باعث فضیلت تیری ہی بڑی ہے اور اس فضیلت کو بحال رکھنے کیلئے تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے پوری ہمت سے کرتا رہ کیونکہ تجھ پر بہت بار ہے اور ابھی مزید بار بڑھنے والا ہے۔ پھر جوں جوں تیری ذمہ داریاں بڑھیں گی تجھے محنت زیادہ کرنا ہوگی اور اس میں تیری فضیلت ہے گویا کام کرنے والے کو جو شاباش دی گئی ہے اس پر آپ جز بز ہیں کہ یہ شاباش اس کو کیوں دی گئی؟ اسلام کہتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اس لئے کہ محنت کرنے والے کی حوصلہ افزائی ضروری و لازمی تھی تاکہ وہ بھی دل ہار کر بیٹھ نہ رہے۔

عورت اگر نیک شعار ہوگی تو وہ اطاعت گزار بھی ہوگی اور خاوند کا شکریہ بھی ادا کرے گی

۷۳ فرمایا نیک عورتیں وہ ہیں جو اطاعت شعار ہوتی ہیں اور جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہوتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے اپنے شوہروں کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں اور ان کی ہمت افزائی کے لئے ان کا دل بڑھاتی رہتی ہیں۔ ان کے کاموں میں ان کی مدد و معاون ہوتی ہیں اور ان کی کمائی کو انہی کی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ خاوند جب تھک ہار کر گھر پہنچتے ہیں تو ایک نظر شفقت سے ان کا سارا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے اور ان کی تھکاوٹ کی فکر ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان کی خوراک کا ایسا بندوبست کریں کہ صبح تک وہ پھر چاک و چوبند ہوں۔ اس طرح مرد ہی کی آمدنی مرد کے سامنے پیش کر کے داد تحسین حاصل کرتی ہیں اور مردوں کی پیٹھ پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اور کبھی بھی وہ بندر بانٹ سے کام نہیں لیتیں۔ اس طرح وہ اپنی عصمت اور گھر کی حفاظت جو امور خانہ داری میں سب سے اہم ہیں ان کے بجا لانے میں ان کیلئے مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہوتے ہیں ایسا نہیں کہ ان کے سامنے تو اہتمام کریں اور ان کی نظروں سے غائب ہوں تو اس میں لاپروائی برتیں۔ چنانچہ نبی اعظم و آخر ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ :

"بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اس کو دیکھو تو خوش ہو اور جب اس کو کوئی حکم دو تو وہ اطاعت کرے اور جب تم غائب ہو تو اپنے نفس اور مال کی حفاظت کرے۔" چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت دونوں آسان کام نہیں کیونکہ مال کمانے سے بھی خرچ کرنا زیادہ مشکل ہے اگر اس

اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ

تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو چاہئے انہیں سمجھاؤ پھر خواب گاہ میں ان سے الگ رہنے لگو اور انہیں مار بھی سکتے ہو ۷۴ پھر اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ایسا نہ کرو کہ الزام دینے کیلئے راہیں ڈھونڈنے

کو طریقہ سے خرچ کیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ یعنی اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ بھی اس عورت کی مدد فرماتا ہے اور پھر اس کی مدد و توفیق سے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں۔ اطاعت شعار اور تابعدار عورتوں کی فضیلت اس آیت میں بھی بیان فرمائی گئی اور بہت سے مقامات پر قرآن کریم نے ان کا اس طرح تذکرہ کیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی اچھائی کا ذکر فرمایا۔

عورت اگر سرکش ہو جائے تو اس کا علاج اس کی تفہیم اور نظر خاص سے پرہیز ہے

۷۴ فرمایا اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ کوئی عورت شوہر کے حقوق کی رعایت نہ کرے اور اطاعت شعاری کے دائرہ سے باہر ہو جائے تو شوہر کو چاہئے کہ اسے سمجھائے اور اس حرکت کے عواقب اس کے سامنے بیان کرے اور اس سلسلہ میں نرمی و گرمی سے اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔

"جن عورتوں سے یعنی بیویوں سے وہ تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو۔" اس کیلئے قرآن کریم میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ اور نشوز۔ نشز سے ہے جس کے معنی ہیں اٹھنا جیسا کسی کے مقابلہ میں کھڑے ہو جانا۔ "نشوز بین الزوجین" یہ ہے کہ ہر ایک اپنے رفیق سے کراہت کرے۔ "لیکن جب تم یہ جان لو کہ عورت تم سے نفرت کرتی ہے۔" چونکہ ایسی صورت دونوں طرف سے واقع ہو سکتی ہے اگر مرد عورت سے نفرت کرے تو اس کیلئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور اگر عورت مرد سے نفرت کرے تو اس پر بھی یہی لفظ استعمال ہوتا۔ اس جگہ چونکہ نُشُوْزَهُنَّ ہے اس لئے مطلب یہی ہے کہ جو عورتیں اپنے مردوں سے نفرت کرنے لگیں اور چونکہ پیچھے عورتوں کی اطاعت شعاری کا ذکر ہو چکا ہے یعنی اچھی عورتیں وہ ہیں جو خاوندوں کی اطاعت شعار ہوں اس جگہ اس بات کا ذکر فرمایا کہ جو عورتیں خاوندوں کی اطاعت شعاری سے نکل جائیں گویا وہ اچھی عورتیں نہ ہوئیں۔

فرمایا اگر خدا نہ کرے کوئی ایسی صورت واقع ہو جائے تو خاوند کیا کریں؟ ارشاد الٰہی ہے کہ پہلا درجہ ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ "نرمی سے ان کو سمجھاؤ۔" اللہ تعالیٰ نے ایسی بات فرما دی کہ جس سے نفرت کا سارا راز کھل گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر نفرت دونوں طرف سے ہے تو مرد یہ کام کرے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو نفرت کو مزید بڑھائے گا۔ بات بات پر ٹوکے گا۔ ڈانٹے ڈپٹے گا اور ہر لحاظ سے دبانے کی کوشش کرے گا اور اگر مرد کی

طرف سے کوئی ایسی صورت واقع ہوگی تو بات واضح ہو جائے گی کہ عورت کیا نفرت کرتی ہے کہ مرد خود ہی اس کا اہل نہیں کہ اس سے محبت کی جائے اور اگر مرد کو کوئی نفرت نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس الٰہی ہدایت پر عمل کرے گا اور نرمی سے اس کو سمجھائے گا اسے پیار کی نگاہ سے دیکھے گا اور حسن سلوک سے پیش آئے گا اور اس طرح انشاء اللہ حالات درست ہو جائیں گے لیکن مرد اگر صرف "خرمستی" کر سکتا ہے اس کے سوا اس کو کچھ کرنا ہی نہیں آتا تو حالات کے درست ہونے کی کوئی صورت مشکل ہی سے ہوگی۔

ہاں! خاوند نے نرمی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی اور اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو روٹھے کو ماننا ہی ہوتا ہے اگر وہ نہ مانے تو؟ فرمایا مردوں کو چاہئے کہ "وہ خواب گاہوں میں ایسی عورتوں کے قریب نہ ہوں۔" وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ خواب گاہوں میں تم مرد ایسی عورتوں کے قریب نہ جاؤ۔ یعنی باقی سارے فرائض ادا کرو۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرو اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ صرف خواب گاہ میں الگ رہو اور یہ جدائی بستر کی حد تک ہو کمرے کی حد تک نہ ہو۔ کیونکہ لفظ "مضاجع" کا یہی تقاضا ہے۔ یعنی روٹھ جانے والی بیوی جس کو تم نے حسن سلوک اور پیار و محبت سے منانے کی کوشش کی اگر وہ نہیں مانی تو اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم بھی اس سے ایک حد تک روٹھ جاؤ' لیکن تمہارا یہ روٹھنا اس حد تک محدود رہے اس سے آگے تجاوز نہ کرے۔ پھر سمجھ لو کہ روٹھنے کی حد کیا ہے؟ صرف اور صرف یہ کہ ایک جگہ ایک کمرہ تنہائی میں رہتے ہوئے بیوی کے بستر سے الگ رہو اور علاوہ ازیں سارے معاملات میں اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ یہ گویا ایک ایسا راز ہے جو میاں بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا اور کسی کو جاننا بھی نہیں چاہئے۔ یہ دوسری پابندی بھی مرد پر عائد کی گئی اور حسن و خوبی سے کی گئی کہ اگر کوئی مرد فی الواقع مرد ہے تو بیوی اس سے روٹھ ہی نہیں سکتی اور اگر روٹھ گئی ہے تو یقیناً مان جائے گی بلکہ ایسی رام ہوگی کہ وہ مرد کے پاؤں تلے آنکھیں بچھائے گی شرط صرف یہ ہے کہ مرد مرد ہو یعنی مردانگی دکھائے۔ آخر کب تک یہ روٹھنا ہوگا؟

ان دونوں سزاؤں کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی کہ ایک گھنٹہ تو پیار سے سمجھاؤ اور پھر دس منٹ کیلئے بستر چھوڑ دو۔ اور مزید دس منٹ کے بعد ڈنڈے برسانا شروع کر دو اور ایک رات میں بھانڈا پھوڑ دو۔ غور کرو کہ حکیم کل نے کس حکمت سے کام لیا ہے۔ ان کاموں کیلئے وقت درکار ہے۔ اس انتظار میں تمہیں مہینوں لگیں یا سال بہرحال خاموشی کے ساتھ اصلاح کرتے رہو اور انشاء اللہ یقیناً اصلاح ہوگی۔ یہ نسخہ اس حکیم کل کا ہے استعمال کر کے تو دیکھو۔ لیکن جن عورتوں کو اس سے بھی فائدہ نہ ہو ممکن ہے کہ ان کی فطرت ہی کچھ ایسی سخت ہو کہ سختی و گرمی کے سوا اس کی اصلاح نہ ہو سکتی ہو کیونکہ یہ مثل بھی مشہور ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اچھا تو اس کیلئے یہ تیسرا نسخہ بھی آزما کر دیکھ لو کہ اگر کر سکتے ہو تو ایک دو تھپڑ لگا کر دیکھ لو یہ تیسری سزا بہت پابندیوں کے ساتھ دینے کی اجازت دی گئی اور نبی اعظم و آخر ﷺ نے اس پر اتنی پابندیاں

لگائیں کہ اس مارنے کو سوائے اس کے کہ مارنے کے لفظ کا اس پر اطلاق کیا ہے کوئی مارنا مارنا نہیں بلکہ صرف ایک تادیبی کارروائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

فرمایا کہ اگر اس کی نوبت آہی جائے اور تم ایسا اقدام کر بھی سکتے ہو تو ہاتھ چلاتے وقت اس بات کا خیال رکھو کہ کس پر ہاتھ چلا رہے ہو۔ غصہ میں آکر آپے سے باہر نہ ہو جاؤ۔ اپنا کنٹرول درست کرو۔ تادیبی طور پر مجبوری لاحق ہو تو اس کے منہ پر مت مارو۔ ایسا مت مارو کہ اس کے جسم کے کسی حصہ کا کوئی نقصان ہو۔ دشمن کا سا مارنا مت مارو بلکہ عقل و فکر اور پیار و محبت کا مارنا مارو اور پھر اجازت الٰہی کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو ولن یضرب خیارکم یعنی اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے۔ کیونکہ کسی چیز کی اجازت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کرنا لازم و ضروری یا فرائض میں داخل ہو جاتا ہے بلکہ اگر کہیں ایسی صورت واقعہ ہو جائے تو اس کو یہ کہہ کر برداشت کر لیا جاتا ہے کہ خیر ہے اتنی اجازت بہرحال موجود ہے۔

اس آخری بات کا کچھ لوگوں نے ایسا بتنگڑ بنایا کہ انہوں نے اسلامی قانون کو نہایت سفاکی کا قانون قرار دیا اور مسلمانوں کو ایسے ایسے کوسنے دیئے کہ مسلمان خود بھی یہ بات سمجھنے لگے کہ شاید یہ قانون کوئی ایسا ہی وحشیانہ ہے لہٰذا انہوں نے اس کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں اور پھر ضرب یضرب کی گردان سے ایسے ایسے مفہوم نکالنے شروع کر دیئے جن کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور اس طرح کے دور از کار قصے بیان کر کے انہوں نے ثابت کرنا شروع کر دیا کہ عورت بس صرف مرد کے کھیلنے کا کھلونا ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ بے جان نہیں بلکہ جاندار ہے لہٰذا اس کو بالارادہ کھیلنا ہے چاہے وہ اپنے مرد سے کھیلے یا دوسرے سے اور مرد کا کام یہ ہے کہ اس کو کھیلتا دیکھ کر خوش ہو۔

اس طرح انہوں نے اپنی ضمیر کا جنازہ تو نکال ہی دیا تھا وہ چاہتے ہیں کہ پورے اسلام کا جنازہ اٹھ جائے اور وہ ان ساری پابندیوں سے آزاد ہو جائیں جو اسلام معاشرے کے بگاڑ پر لگاتا ہے اور ہر وہ بات اور ہر وہ کام جس سے بگاڑ پیدا ہو اس کو وہ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ بلکہ اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے ایسے نامردوں پر کہ دراصل وہ خود مرد نہیں رہے بلکہ پوری طرح نامرد ہو چکے ہیں لیکن اپنی نامردی کا علاج بھی نہیں چاہتے بلکہ ان کے خیال میں صرف عورت کے آنچل میں چھپ جانے کا نام مرد ہے اور عورت کے آنچل اتار کر پھینک دینے کا نام عورت۔ پھر اس کا نام انہوں نے نئی تہذیب اور نئی روشنی رکھا ہے۔ کس طرح؟ ان کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ اس اندھیرے کا نام روشنی رکھنے والے ہم مسلمان ہیں اس لئے یہ روشنی اسلام کی روشنی ہے کہ ہم مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں یا ہم نے اس کو متبنیٰ بنا لیا ہے۔

سن لو اور یاد رکھو کہ اسلامی نکاح پیشاب خانے کے سودے کا نام نہیں بلکہ چند ایک شرائط اور پابندیوں کے اندر رہ کر انسانیت کے شرف کی حفاظت کا نام ہے۔ اسلامی نکاح کسی چوسے کے چوس لینے کا نام نہیں بلکہ

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا ﴿٣٤﴾ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا

لگو یاد رکھو کہ اللہ سب کے اوپر اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا موجود ہے۔ ۳۴

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا تو چاہئے کہ ایک پنچ شوہر کے

ایک مقدس فریضے کا نام ہے۔ اسلامی نکاح ایک عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بازاروں اور گلیوں میں کھلے بندوں پھرنے کا نام نہیں بلکہ لباس میں ملبوس ہو کر ایک اور صرف ایک خاص راہ چلنے کا نام ہے۔ اسلامی نکاح صرف نفسانی خواہشات کے ازالہ کا نام نہیں بلکہ انسان کے حسب و نسب کی حفاظت کا نام ہے۔

تادیبی کارروائی سے اگر وہ سنبھل جائیں تو اب تم الزام تراشی نہ شروع کر دو

۷۵ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر انسانی کمزوریوں سے کون زیادہ واقف ہو سکتا ہے؟ یہ انسانی کمزوری ہے کہ جب کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ منوا لیتا ہے تو اس کے مان جانے کے بعد اس کو الزام دینے لگتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں لگائی بجھائی کر جاتا ہے اور ایسے ایسے بول بول دیتا ہے جو دوسرے انسان کو زخمی کرتے رہتے ہیں اور پھر یہ زخم بھی ایسے جو کسی کو دکھائے نہیں جا سکتے پھر ان زخموں پر نمک چھڑکنے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس طرح حالات پہلے سے بھی ابتر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مثل مشہور ہے کہ تلوار کے زخم مٹ جاتے ہیں یا بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی بھرنے میں نہیں آتے۔ یہ زخم زخم ہی نہیں رہتے بلکہ ناسور بن جاتے ہیں۔ پھر ایسی حالت میاں بیوی میں جن کو ہر حال میں ایک جگہ رہنا ہے اور ایک ساتھ رہنا ہے۔

فرمایا دیکھو اگر اس سہ تدبیری کورس سے کسی تدبیر کے صلہ میں بھی وہ تمہاری بات ماننے لگی ہیں تو اب تم بھی زیادہ بال کی کھال نہ اتارو اور اس کمزور پہلو کی طرف دوبارہ مت آؤ اور کوئی ایسی بات مت کرو جس سے بجھی ہوئی آگ دوبارہ دھکنا شروع ہو جائے۔ کسی طرح کی الزام تراشی میں مت لگو بلکہ چشم پوشی سے کام لو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر اللہ نے عورتوں پر تم کو ایک درجہ دیا ہے تو اس سے تمہیں نرم ہونا چاہئے نہ کہ سخت کیونکہ درجات کی بلندی نرمی میں پوشیدہ کر دی گئی ہے اور خادم القوم مخدومھم کے جملہ سے سبق سیکھو کہ مخدوم کہلانے کا حق دار وہی ہے جو خود خادم ہے۔ پھر غور کرو کہ ایسا کیوں ہے کہ پھل دار ٹہنی جھک کر رہتی ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بھرا ہوا برتن کم بجتا ہے؟

دیکھو! عند الضرورت تادیبی کارروائی کا تم کو حق تھا۔ اپنا حق تم نے عند الضرورت استعمال کیا۔ اللہ نے فضل کیا کہ ضرورت پوری ہو گئی تو اب تم حق سے تجاوز کیوں کرو؟ بلکہ اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تم کو وہ حق دیا تھا جس سے تم بے آباد ہوتے ہوتے آباد ہونے لگے۔ دیکھو اپنے ہاتھوں اپنا سکون برباد مت کرو۔ یاد رکھو کہ نیکی کے بدلے نیکی کوئی کمال نہیں بلکہ برائی کے بدلے نیکی نیکی ہے۔ تمہارا درجہ بڑا ہے تمہاری برداشت بھی

فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ﴿٣٥﴾ وَاعْبُدُوا اللَّهَ

کنبے میں سے مقرر کرو ایک بیوی کے کنبے میں سے اگر دونوں پنچ چاہیں گے کہ صلح و صفائی کروا دیں تو اللہ ضرور فریقین میں باہم موافقت پیدا کر دے گا بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے۔[۷۶] ۳۵

اور دیکھو اللہ کی[۷۷] بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور چاہئے کہ ماں

بڑی ہونا ضروری ہے۔ سمجھ لو! تم کتنے بڑے ہو؟ ایک درجہ۔ لیکن اللہ تو سب بڑوں کا بڑا ہے اسی طرح تمہارا بھی بڑا ہے۔ تم کتنی غلطیاں کرتے ہو۔ لیکن اس بڑے کی برداشت تو دیکھو۔ اگر وہ تم کو پکڑنا چاہے کوئی صورت ہے تمہارے بچنے کی؟ پھر غور کرو کہ بڑا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ برداشت چھوٹی ہو بلکہ بڑا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ برداشت بھی بڑی ہو۔ اللہ کرے کہ تم اپنے درجہ کہ حفاظت بھی کر سکو۔ اللہ تم کو توفیق دے۔

اگر پہلی تینوں تدبیریں ناکام ہو چکی ہوں تو یہ ایک چوتھی تدبیر بھی آزما دیکھو

۷۶ جس مسئلہ میں گفتگو ہو رہی ہے اس کا ایک حل تو وہ ہے کہ اگر مرد کی طرف سے پہل ہو تو اس کو "طلاق" کہتے ہیں اور اگر عورت کی طرف سے پہل ہو جائے تو اس کو "خلع" کا نام دیا گیا ہے اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ میاں بیوی میں جدائی ہو گئی۔ وہ بندھن جو باندھا گیا تھا کاٹ دیا گیا۔ وہ عہد و پیمان جو میاں بیوی میں قائم ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ فریقین پر جو پابندی لگائی گئی تھی وہ اٹھا دی گئی۔ جو شہد کا پیالہ لبوں تک پہنچایا گیا تھا اس میں کسی سبب سے زہر مل گئی تو وہ فوراً ہٹا دیا گیا۔ "جان بچی لاکھوں پائے۔"

لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہے کہ جو جوڑ لگایا تھا اس میں کچھ خامی رہ گئی۔ خامی کہاں ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب اس جوڑ کو توڑے کون؟ فریقین کو حق تھا کہ وہ متفق ہوتے یا اس جوڑ کو توڑ دیتے لیکن نہ اتفاق ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اس جوڑ کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ الٰہی قانون جس کے مطابق یہ جوڑ لگایا گیا تھا وہ خود حرکت میں آتا ہے اور مرد کو اس جوڑ کے جوڑے رکھنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ترکیب بھی بتاتا ہے۔ یہ ترکیب مرد کو کیوں بتائی گئی؟ اس لئے کہ اس پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن قانون اس کو یہ نہیں کہتا کہ اس کو چھوڑ دے بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس کو صحیح طریقہ سے اڑا اور ڈور کو تھام کر رکھ۔ اس کی حفاظت کی ترکیبیں بھی بتاتا ہے۔ اس طرح ایک ترکیب فیل ہوئی تو دوسری بتا دی پھر وہ فیل

ہوئی تو تیسری بتا دی اور جب وہ فیل ہوگئی تو اب چوتھی بتائی جا رہی ہے۔ ترکیبیں ناکام کیوں ہوئیں یہ تو اللہ کی بتائی ہوئی تھیں؟ بلاشبہ ترکیبیں اللہ ہی کی بتائی ہوئی تھیں لیکن ترکیب بگاڑنے والا تو اللہ نہیں تھا؟ ترکیب لگانے والا ناسمجھ نکلا یا پتنگ کہیں ایسا پھنس گیا کہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے اور اس کو تقدیر یا مقدر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں حقیقت میں انسان بے بس ہو جاتا ہے۔

یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جاتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا ہے۔ وجہ اس کی کوئی ہو عورت کی طبیعت میں تردد و سرکشی ہو یا مرد کا کوئی قصور اور بے جا تشدد ہو بہرحال اس صورت میں گھر کی بات کو باہر نکلنا تو لازمی امر ہے۔ لیکن عام عادت کے مطابق تو ایسا ہوتا ہے کہ طرفین خود اور طرفین کے حامی ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں جس کا نتیجہ جانبین سے اشتعال اور پھر دو شخصوں کی لڑائی کا نتیجہ دو خاندانوں کی بربادی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کیلئے فریقین کے اولیاء' حامیوں کو' مسلمانوں کی عام جماعت کو اور حکام وقت کو مخاطب کر کے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلا دیا ہے جس سے فریقین کا اشتعال بھی ختم ہو جائے اور الزام تراشی کے سارے راستے بھی بند ہو جائیں اور ان کی آپس میں مصالحت کی راہ نکل آئے خواہ وہ جوڑ جوڑے رہنے کی صورت میں ہو یا جوڑ توڑ دینے کی صورت میں۔ اس طرح اگر گھر کا جھگڑا گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں۔ مسلمانوں کی ایک جماعت ہی میں یا کمرہ عدالت ہی میں ختم ہو جائے تاکہ یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے دو خاندانوں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ لیکن ہماری جہالت اور قرآنی تعلیمات سے دوری کے باعث ہوتا اکثر یہی ہے جس سے قرآن کریم نے ہر حال میں منع فرمایا ہے۔ افسوس کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بھی جب عمل کا وقت آتا ہے تو ان پڑھ اور جاہل ہی ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے حالات و واقعات سے اپنی امان میں رکھے۔

اسلام کی دی ہوئی تراکیبوں میں یہ چوتھی اور آخری ترکیب ہے کہ فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی ایک جماعت یا ارباب حکومت یہ کام کریں کہ فریقین کی آپس میں مصالحت کرانے کیلئے دو حکم مقرر کریں ایک مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے۔ ان دونوں مقرر ہونے والے شخصوں کو قرآن کریم نے حکم کے لفظ سے تعبیر کر کے ان کے اوصاف کو بھی واضح کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت اس شخص میں ہو سکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور صحیح معنوں میں دیانتدار بھی۔

یہ حکم کیا کریں گے؟ یہ دونوں فریقین یعنی میاں بیوی کو الگ الگ یا آمنے سامنے سمجھائیں گے۔ ان کی اصلاح کی ہر کوشش جو ان کے اختیار میں ہوگی وہ بروئے کار لائیں گے۔ دھونس دھاندلی سے نہیں بلکہ تفہیم کرانے سے۔ اس جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ "اگر دونوں پنچ چاہیں گے کہ صلح صفائی کرا دیں تو اللہ تعالیٰ

ضرور فریقین میں باہم موافقت پیدا کر دے گا۔"

اس جگہ "فریقین" کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے اس سے مراد میاں بیوی بھی ہو سکتے ہیں اور میاں بیوی کے خاندان بھی۔ مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی میں موافقت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک ساتھ شیر و شکر ہو جانے پر رضامند ہو جائیں تو الحمد للہ۔ پنچ حضرات کا یہی مقصود حقیقی تھا۔ اگر کسی وجہ سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تو کم از کم یہ تو ضرور ہی ہو گا کہ اب دونوں خاندان اتفاق رائے سے اس تعلق کے توڑنے پر راضی ہو جائیں گے اور فریقین کے درمیان جو کچھ لین دین ہے اس کا تصفیہ ہو کر عمل درآمد ہو جائے گا اس طرح سے بھی وہ خطرہ ٹل جائے گا جس کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اب دونوں طریق اس کڑوے گھونٹ کو گلے سے اتارنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کیلئے نئی راہیں پیدا کر دے گا۔ "بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے۔"

ممکن ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے کچھ لوگوں پر وہ شاق گزرے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ کسی نے پہلے نہیں بیان کیا۔ خصوصاً "یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا" میں میاں بیوی سے ہٹ کر دونوں خاندانوں کو مراد لینا یا اس کا ترجمہ "فریقین" کے الفاظ سے ادا کرنا ساری باتیں ہی نئی ہیں۔ یہ نئی اور پرانی کی بحث چھوڑ دیں اور صرف یہ بتائیں کہ کیا الفاظ قرآنی اس کے متحمل نہیں؟ میں زیادہ لمبی بحث نہیں کرتا کہ مجھے عادت نہیں اور چاہتا بھی نہیں۔ صرف یہ بتائیں کہ زید رضی اللہ عنہ و زینبؓ کو اس بندھن میں باندھ دیا گیا تھا؟ یہ بندھن باندھنے والا کون تھا؟ کیا نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا پنچ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میاں بیوی کے درمیان موافقت کی کوشش نہیں کی تھی؟ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ کے الفاظ نہیں فرمائے تھے؟ کیا میاں بیوی میں صلح ہو گئی تھی؟ کیا نتیجہ طلاق نہیں نکلا تھا؟ کیا دونوں خاندانوں میں کوئی اینٹ روڑا چلا تھا حالانکہ ایسا ہونے کے امکانات موجود تھے۔ کیا ان دونوں خاندانوں میں موافقت پیدا نہیں ہوئی تھی؟ اب بھی اگر کوئی یہ کہے اس سے خاندان مراد نہیں لئے جا سکتے تو اس کی اپنی مرضی ہے اس کو کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہی ہے کہ اس سے مراد دونوں خاندان لئے جا سکتے ہیں اور لئے گئے ہیں۔ مزید تفصیل کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۲۲۹، ۲۳۰ کا مطالعہ کریں۔

اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ

۷۷ قرآن کریم میں جگہ جگہ یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور بندگی کرو تو صرف اس کی بندگی کرو اور اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ بلکہ یہ کہ غیر اللہ کی بندگی سے انکار کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کا اقرار کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ کی بندگی بھی کرتے رہو اور غیر اللہ کی بھی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ کی بندگی کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو بلکہ یہ بھی ہے کہ بندگی اور غلامی اور بے چون و چرا اطاعت بھی

صرف اس کی کرو اور اس کے حکم کو حکم اور اس کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ اور صرف انفرادی طرز عمل کیلئے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اس پورے نظام اخلاق اور تمدن و سیاست کا سنگ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیبہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے عملاً قائم کیا۔ اس کی عمارت اس نظریئے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ جل شانہ ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور اس کی شریعت ملک کا قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر عہدہ نبوت کے ختم کرنے تک ہر ایک نبی کی دعوت کا پہلا سبق یہی تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی اس طرح ہے :

"کسی انسان کو یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب' حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ وہ لوگوں سے کہے اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ؟ بلکہ چاہئے کہ ربانی انسان بنو۔ اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے بھی کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔ ایک ربانی انسان کبھی تمہیں اس بات کا حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں یا نبیوں کو اپنا پروردگار بنالو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کفر کرنے کا حکم دے حالانکہ تم مسلم ہو چکے ہو؟" (ال عمران ۳ : ۷۹' ۸۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا

"ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو پروردگار بنا لیا اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی۔ حالانکہ انہیں جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک اللہ کی بندگی کرو۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی' وہ پاک ہے اس شرکت سے جو یہ اس کی ذات میں ٹھہرا رہے ہیں۔" (التوبہ ۹ : ۳۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا

"اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا جو کہتا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو' اور سرکش قوتوں سے بچو' پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر اللہ نے کامیابی کی راہ کھول دی اور بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو جو قومیں سچائی کی باتوں کو جھٹلانے والی تھیں انہیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا؟" (النحل ۱۶ : ۳۶) ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

"اور پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا اس نے کہا تھا "بھائیو! اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں؟" (المومنون ۲۳ : ۲۳)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا اس نے کہا' لوگو! میں تم کو واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔" (ہود ۱۱ : ۲۵' ۲۶) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا' ہودؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' یقین کرو' تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ افتراء پردازیاں کر رہے ہو۔" (ہود ۱۱ : ۵۰) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ کو بھیجا' اس نے کہا کہ اے میری

وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي

باپ کے ساتھ[۷۸]، قرابت داروں کے ساتھ[۷۹]، یتیموں[۸۰] اور مسکینوں کے ساتھ، پڑوسیوں[۸۱] کے ساتھ،

قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور پھر اس میں تمہیں بسا دیا۔ پھر چاہئے کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو کر رہو، یقین کرو میرا پروردگار ہر ایک کے پاس ہے اور ہر ایک کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔" (ہود ۱۱ : ۶۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور ہم نے قبیلہ مدین کی طرف اس کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کوئی کمی نہ کیا کرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو، میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا۔" (ھود ۱۱ : ۸۴)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے اور تمہارے پروردگار نے یہ بات ٹھہرا دی کہ اس کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۳، ۲۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے موسیٰ! میں نے تجھے چن لیا ہے، پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن، میں ہی اللہ ہوں اور میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کر، اور میری یاد کیلئے نماز قائم کر۔" (طہ ۲۰ : ۱۳، ۱۴)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو رکوع میں جھکو، سجدے میں گرو، اپنے پروردگار کی بندگی کرو، جو کچھ کرو نیکی کی بات کرو، عجب نہیں کہ اس طرح بامراد ہو۔" (الحج ۲۲ : ۷۷)

مزید تفصیل کیلئے نیچے اشارات دیئے جا رہے ہیں قرآن کریم کے ان مقامات کا مطالعہ کریں۔

(البقرہ ۲ : ۲۱)، (البقرہ ۲ : ۱۲۳)، (الاعراف ۷ : ۷۳)، (مریم ۱۹ : ۴۴)، (الزمر ۳۹ : ۱۷)، (الاعراف ۷ : ۸۵)، (الانبیاء ۲۱ : ۹۲)، (الزمر ۳۹ : ۲)، (الزمر ۳۹ : ۱۱)، (الزمر ۳۹ : ۶۴)، (یونس ۱۰ : ۲)، (الزمر ۳۹ : ۱۴، ۱۵)، (الحجر ۱۵ : ۹۹)، (الکفرون ۱۰۹ : ۱، ۶)، (لقمٰن ۳۱ : ۱۴، ۱۵)

والدین کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ اگر وہ مسلمان نہیں ہیں تو بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

۷۸ والدین کی عزت و احترام، خدمت اور مصاحبت موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور نبی اعظم و آخر ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہیں۔ بلکہ ان تینوں مذاہب میں ان کا درجہ اللہ تعالیٰ کی ذات رسول اللہ ﷺ کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بنایا گیا ہے اور اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ ان کی فرمانبرداری کی تاکید بھی کی گئی ہے چنانچہ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے' تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو۔" (خروج ۲۰ : ۲۱) پھر ایک اور حکم دیا۔

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا ہے۔" (احبار ۱۹ : ۳) پھر انتہا یہ ہے کہ تورات میں قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ :

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے' مار ڈالا جائے گا' اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔" (احبار ۲۰ : ۹)

"اور وہ جو اپنی ماں پر لعنت کرے' مار ڈالا جائے۔" (خروج ۲۱ : ۱۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کی روح و معانی کا خیال کیا جائے' فرمایا

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کرو اور جو ماں باپ پر لعنت کرے' جان سے مارا جائے' یہ تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں' پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔" (متی ۱۵ : ۴)

علاوہ ازیں انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً (متی ۱۹ : ۱۹)' (مرقس ۷ : ۱۹)' (لوقا ۱۸ : ۲۰)

نبوت محمدی ﷺ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کیلئے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی پوری تفصیل بیان کر دی اور ہر ممکن سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔

اس نے سب سے پہلے ماں باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے۔ عورت کی فطری کمزوری' بیچارگی اور حمل' وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا' ماں کی بڑائی' اس کی سب سے پہلے دلدہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

"اور ہم نے انسان کو' اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی' دیکھو اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور پھر دو برس تک دودھ پلایا۔" (لقمن ۳۱ : ۱۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے' اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا' پیٹ میں رکھنے اور دودھ کے پلانے کی مدت تیس مہینے ٹھہرائی گئی۔" (الاحقاف ۴۶ : ۱۵)

نبی اعظم و آخر ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی۔ ایک شخص نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا' تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا اور چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا' تیرا باپ۔ (صحیح بخاری ج ۲ کتاب الاداب)

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو رکھا اور فرمایا "کہ تمہارے اللہ نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔" (صحیح بخاری ج ۲ کتاب الاداب)

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے؟ کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں' دریافت کیا خالہ ہے؟ گزارش کی! ہے۔ فرمایا تو اس کے ساتھ نیکی کر۔" یہی اس کی توبہ ہے۔ (جامع ترمذی کتاب البر و صلۃ)

ایک صحابیؓ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب دیا کہ ہاں! ہے۔ فرمایا تو اس کی خدمت کرو کہ جنت اس کے پاس ہے۔" (ترغیب و ترہیب منذری ج ۲ ص ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ' نسائی و حاکم)

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں اس صنف نازک ہی کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں لیکن باپ کی مادی علت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون جلا جلا کر بڑھایا ہے اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا ہے پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا ہے' پھر اس نو پیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان' اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوق میں سے کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لئے شریعت اسلامیہ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کے سزاوار ہے۔

ماں کے بعد جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے۔ وہ باپ ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی اور مالی کوشش شامل ہیں اس لئے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ اسلام نے یہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی عزت کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی خدمت' ان کی اطاعت' ان کی

امداد' ان کی دلدہی فرض قرار دے دی اور یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو' ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو' ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو۔ انہی کی خدمت سب سے بڑا جہاد ہے۔ یہاں تک کہ انہی کی خوشنودی میں خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی اور خدمت کی تاکید آئی اور یہ ۱۲ مقامات ہیں جن میں اکثر مقامات پر یہ تعلیم' توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آتی ہے کیونکہ پہلی تخلیق انسان کی علت فاعلی ہے اور دوسری علت مادی اس لئے اس کو عبادت الٰہی کے ساتھ ہی بیان کیا گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں دو مقامات پر اس سے پہلے ذکر کر آیا۔ اس جگہ صرف اشارہ بھی دیا جا سکتا تھا لیکن ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ والدین کا ذکر بار بار اور پھر ہر بار مختلف طریقے سے کیا جانا چاہئے کہ آج بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ میں والدین کو عام انسانوں کے برابر بھی درجہ نہیں دیا جا رہا ہے اولاد بیزار ہے تو ماں باپ سے۔ حالانکہ جو آج اولاد ہیں کل وہ بھی ماں باپ ہوں گے تو ان کا حال اس سے بھی بدتر ہوگا۔ اپنی جانوں پر رحم کرو جو بیج رہے ہو کل ضرور کاٹو گے۔

قریبی رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو کہ ان کے متعلق سوال کئے جاؤ گے

۷۹ ماں' باپ' اولاد اور زن و شو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلہ رحم" ہے۔ نبی اعظم و آخر ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ ﷺ نے اس کی طرف بار بار توجہ دلائی اور قرآن کریم میں بھی کم از کم ۱۲ آیتوں میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم ۳۰ : ۳۸) "تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر دے۔" اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۶) "اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر" ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت داروں کی امداد اور ان کے ساتھ تعاون اصل نیکی ہے۔ فرمایا

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى (البقرہ ۲ : ۱۷۷) "اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے اپنا مال اس کی محبت پر قرابت داروں کو دیا۔"

فرمایا والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں ارشاد ہوا "فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں' باپ اور رشتہ داروں کیلئے کرو۔" (البقرہ) ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام میں سے ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا ہے چنانچہ سورہ نمل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا گیا "بلاشبہ اللہ انصاف' حسن سلوک اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔" (النحل) مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہی ہیں فرمایا "اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ'

قرابتداروں، یتیموں اور غریبوں کیلئے خرچ کرو۔" (البقرہ) اگر کسی قرابت دار سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل ثروت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں چنانچہ فرمایا "اور جو لوگ تم میں سے مالی برتری رکھتے ہیں وہ محتاجوں اور قرابت داروں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں۔" (النور)

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کو بھی ادا کرو کہ تمہارے مال میں وہ حصہ دار ہیں

۸۰ یتیم کون ہیں؟ وہی بے باپ بچے جو اس سہارا سے محروم ہو چکے ہیں۔ مسکین کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی آمدنی اتنی کم ہے کہ وہ اس آمدنی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے۔ یتیم اس وقت یتیم ہے جب تک وہ کھانے اور خرچ کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اکثر یہ حد بلوغت پر ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض اوقات جسمانی بلوغت تو ہو جاتی ہے اور ذہنی و دماغی بلوغت نہیں ہوتی ایسے حالات میں اسلام نے دوسری حالت کو ترجیح دی ہے اور مسکین اس وقت تک مسکین ہے جب تک اس کے حالات معاش درست نہ ہو جائیں اور کم از کم اس کی آمدنی اس کے اخراجات کے برابر ہو جائے تاکہ آسانی سے گزر بسر کر سکے۔ اس لئے ان لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کے جائز حقوق کی ذمہ داری معاشرے کے ان افراد پر عائد ہوتی ہے جو صاحب جائیداد ہیں اور سب سے زیادہ اسلامی حکومت کو حق ہے کہ ان سارے لوگوں کا بندوبست خود کرے۔ عوام حکومت سے تعاون کریں یا حکومت عوام سے ان سارے لوگوں کا حق وصول کر کے ان کی باقاعدہ حساب کتاب کے ساتھ کفالت اپنے ذمہ لے لے۔ اموال سرکاری خزانہ میں جمع ہوں اور وہاں سے ایسے سارے لوگوں میں ایک قاعدہ و قانون کے مطابق تقسیم ہوں۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم گروہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے لیکن نبی اعظم و آخر ﷺ کے سینہ اقدس پر نازل ہونے والے قانون میں ان کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور نہایت حد تک تاکید فرمائی گئی ہے اور خصوصاً یتیموں کی طرف توجہ نہ دینے والوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں سورہ الفجر میں ارشاد فرمایا گیا کہ "تم وہ لوگ ہو کہ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو رغبت ہی نہیں دلاتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔" (الفجر ۸۹ : ۱۷ تا ۲۰)

مطلب یہ کہ تم عجیب انسان ہو کہ جب تک بچوں کا باپ زندہ رہتا ہے ان کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ ہوتا ہے اور جب ان ہی بچوں کا باپ وفات پا جاتا ہے تو ہمسائے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار چچا، ماموں اور بڑے بھائی تک ان سے آنکھیں پھیر جاتے ہو۔

تم اپنے محلے، شہر اور ملک کے بڑے لوگ ہو لیکن تمہاری مجلسوں میں غریبوں کا کبھی چرچا نہیں ہوا نہ تم خود بھوکوں کو کھلانے پر آمادہ ہوتے ہو اور نہ ہی لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کے لئے تیار ہو۔ ہاں! غریبوں میں تقسیم کرنے کا مال تم کو مل جائے تو تم اس کو ہڑپ کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہو اور اس کیلئے طرح طرح کے

حیلے بہانے تراش سکتے ہو۔ قانون کا پیٹ بھرنے کیلئے کچھ دیتے ہو تو وہ بھی ان لوگوں کو جو تمہارے کام آسکیں اور تمہارے نام کے گیت گائیں۔ تمہاری پارٹی میں داخل ہوں وقت آئے تو تم کو ووٹ دیں۔ بتاؤ تو سہی کہ آخر تم کس ناطے سے انسان ہو؟ کیا انسانوں کے یہی اوصاف ہوتے ہیں جو تمہارے ہیں۔ ہاں! تم درندہ نہیں تو درندہ صفت ضرور ہو۔ یاد رکھو درندہ ہزار بار اچھا ایسے درندہ صفت انسانوں سے کیوں؟ اس لئے کہ درندہ کو دیکھ کر اور کچھ نہیں تو بھاگ کر ہی جان بچائی جا سکتی ہے لیکن تم نوچ نوچ کر کھاتے ہو اور پھر "سی" بھی نہیں کرنے دیتے۔

پڑوسیوں کا خیال رکھو وہ تمہارے دکھ سکھ میں آسانی سے شریک ہو سکتے ہیں

۸۱ ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک جگہ رہتے اور بستے ہیں۔ انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل' تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کے تعاون کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہے اس کی تیمارداری کرے۔ ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا ہو اور ایک دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔ اس لئے ہر مذہب نے ان دو انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہ وقت پر دوسروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ بھی اس میں مضمر ہے کہ انسان کو اس سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے باہمی تعلقات خوش گوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوسی دوزخ کی بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور دوسرے کی محبت اور تعاون پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

زیر نظر آیت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں "خواہ قرابت والے پڑوسی ہوں' خواہ اجنبی ہوں" اس کے پیش نظر ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت نسبی یا مذہبی حاصل ہو یا اس طرح کا کوئی دوسرا تعلق ہو اور اجنبی وہ ہوگا جس سے صرف ہمسائیگی کا تعلق ہوگا دوسرے تعلقوں میں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ہم کسی اختلاف میں پڑے بغیر الفاظ کی روانی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کے پڑوسیوں سے تعلق درست ہونے چاہئیں۔ وہ قریبی ہوں یا نہ ہوں۔ ہم مذہب ہوں یا نہ ہوں۔ بلکہ ان پڑوسیوں سے جو غیر مذہب و ملت کے ہوں زیادہ دلچسپی لینی چاہئے اور ان کے کام آنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہئے۔ ان سے تعاون

الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ

خواہ قرابت والے پڑوسی ہوں خواہ اجنبی ہوں نیز پاس کے بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ[۸۲] اور ان

نہ لیا جائے یا کم لیا جائے لیکن خود ان کے ساتھ زیادہ تعاون کیا جائے تاکہ وہ اسلام کی شیرینی سے متاثر ہوں اور غیر مسلم ہونے کے باوجود اسلام سے نفرت نہ کریں۔

شریعت کی پابندیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمسایوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونا۔ ضرورت کے وقت ان کے کام آنا۔ غریب ہوں تو ان کی مدد کرنا۔ ہدیہ و تحفہ وقتاً" فوقتاً" پیش کرتے رہنا۔ روز مرہ اشیا کا تبادلہ کرنا۔ وہ کوئی چیز پیش کریں اگر شریعت مانع نہ ہو تو اس کو قبول کرنا۔ اپنے ہاں سے کچھ نہ کچھ ان کو بھجواتے رہنا۔ ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھنا۔ کسی نے کوئی زیادتی کی ہو تو برداشت کرنا اور اس سے انتقام لینے کی کوشش نہ کرنا۔ ان کی برائی کے نتیجہ میں ہو سکے تو نیکی کرنا ورنہ برائی کا جواب برائی سے ہرگز نہ دینا۔ یہ ساری باتیں رسول اللہ ﷺ نے امت کو سمجھا دی ہیں اور مسلمان ہونے کے باعث ان کی پابندی نہایت ضروری ہے۔

اٹھنے بیٹھنے والوں سے بھی تعلق پیدا ہو جاتا ہے اس کی پاسداری بھی ضروری ہے

۸۲ انسان کی زندگی میں کتنے مراحل آتے ہیں جو آپس میں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کسی وقت وہ سفر میں ہوتا ہے کبھی حضر میں۔ کبھی درسگاہ میں ہوتا ہے کبھی ملازمت کے دفتر میں۔ یہ مختلف سورتیں تقریباً ہر انسان کو پیش آتی ہیں۔ پھر وہ جہاں جاتا ہے اس کو دوسرے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے سفر کے ساتھیوں کے اپنے حقوق ہیں ایک درس گاہ کے طالب علموں کے اپنے حقوق ہیں۔ ایک کارخانہ کے ملازمین کے اپنے حقوق ہیں۔ ایک استاد کے شاگردوں کے اپنے حقوق ہیں اور ان سب حقوق کی ادائیگی بھی ضروری ہے اور ہر جگہ پر اپنی اپنی نوعیت کی رفاقت اور محبت ہے اور ان سب قسموں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر قسم کے حقوق کو پورا کرنا لازم و ضروری ہے۔

انسانیت کا تقاضا ہے کہ انسان جہاں بھی جائے اچھی یاد چھوڑ کر آئے کہ یاد کرنے والے اس کو نیکی سے یاد کریں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ) "لوگوں سے اچھی بات کہو" اس طرح لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں۔ دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ ۵ : ۸) "اور یاد رکھو کہ ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کیلئے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو' ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔"

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے یہ آیت انسان کے اس مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے اور مسلمانوں کو باور کراتی ہے کہ یہ بودار مادہ ایک سچے مسلمان میں بالکل نہیں ہونا چاہئے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانًا (بخاری ج ۲) "آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو' ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔"

اسلام نے ہم کو کیا درس دیا تھا اور ہم نے کیا یاد کیا؟ آخر یہ مارو' مارو کس اسلام کا سبق ہے؟ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے؟ آج ہم میں کس کو کس سے بغض نہیں؟ کس کو کس سے حسد نہیں؟ آج ہم میں سے کس کا کس سے منہ پھرا ہوا ہے؟ کیا آج ہم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی ہیں؟

اس وقت ہمارے چاروں طرف ایک شور بپا ہے اور مارو مارو کی صدائیں بلند ہیں۔ کیوں مارو؟ اگر جنت چاہتے ہو تو مارو! کس کس کو مارو؟ صدا بلند ہوتی ہے وہابیوں کو مارو' دیوبندیوں کو مارو' بریلویوں کو مارو' شیعوں کو مارو' مرزائیوں کو مارو' مودودیوں کو مارو' تبلیغیوں کو مارو' اسماعیلیوں کو مارو' سندھیوں کو مارو' پنجابیوں کو مارو' ہندوؤں کو مارو۔ اسلام کہتا ہے کہ تم سارے انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا ہے اور تم سب میں انسانیت کا ایک اصولی رشتہ قائم ہے اس کا پاس کرو اور یاد رکھو کہ کسی کو بھی نہ مارو جب تک میدان کارزار گرم نہ ہو جائے اور کفر و اسلام کی جنگ کا اعلان نہ ہو جائے۔ تم نظریاتی طور پر اگر دو ہو بھی تو صرف اور صرف کفر و اسلام کی تقسیم سے اور یہ کفر اور اسلام کی تقسیم پر بھی مرنا اور مارنا اس صورت میں ہے جب کفر و اسلام کی جنگ ہو یا کفر اسلام پر چڑھائی کر دے اور پھر یہ جتنے گروہ تم نے گنائے ہیں ان میں سے ایک دو کو چھوڑ کر باقی تم سب تو ایک دین و ملت کے ساتھ وابستہ ہو تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ تم کیوں کہتے ہو کہ مارو مارو؟ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ مت مارو' مت مارو؟ اس لئے کہ ان سب کی "مت" ماری گئی ہے اس لئے باقی مارو' مارو ہی رہ گیا ہے۔ ورنہ اس طرح مرنے اور مارنے کا کوئی جواز اسلام میں نہیں ہے۔

دیکھو! بخاری شریف کی ایک حدیث کا چھوٹا سا ٹکڑا سن لو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا ہے جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتہ" جنت کا ایک حصہ بن جائے چلو آسمانی جنت نہ سہی دنیوی جنت سہی۔ فرمایا گیا من لا یرحم لا یرحم "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔" جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ رحم نہیں کرتا۔ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کرتے۔ آپ جو ترجمہ چاہیں کریں بات اسی طرح رہے گی جس طرح حقیقت

الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ

لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں یا تمہارے قبضے میں ہوں[۸۳] احسان اور سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔

حال ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" (مستدرک حاکم کتاب البروالصلۃ ج ۴ ص ۱۵۹)

اٹھو۔ ان مارو مارو کی صدائیں بلند کرنے والوں کو کہہ دو کہ خدارا "تم بھی اس دنیا میں رہنے والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان والا بھی تم پر رحم کرے۔" تم سب ایک دوسرے کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہو اس لئے "پاس کے بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ احسان اور سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔"

مسافروں اور قبضے میں آنے والوں کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو

۸۳ ہر انسان خواہ وہ کس قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسرے سے تعاون حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اسلامی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت سے مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سفر ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان کو سابقہ پڑ سکتا ہے بلکہ پڑتا ہے۔ پھر سفر دور دراز کا بھی ہو سکتا ہے اور اپنے وطن سے باہر کا بھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ حالت سفر میں ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ ایک لاکھوں اور کروڑوں پتی آدمی بے بس اور مجبور ہو جائے۔ اس لئے اس وقت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کیا جانا چاہئے کہ ایسے وقت کسی سے مدد حاصل کرنا کوئی جرم ہے یا مدد کرانا کوئی برائی ہے نہیں بلکہ یہ بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کا تم پر حق ہے اور ایسے وقت تم کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج) "ان کے مالوں میں مانگنے والوں کا بھی حق ہے اور محروم لوگوں کا بھی۔" یاد رہے کہ ہر سائل سے مراد بھیک مانگنے والا ہی نہیں ہوتا اگرچہ اس کو بھی سائل ہی کہتے ہیں۔ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہے جو کسی وجہ سے بھی مالی تعاون کا خواستگار ہو۔ ایسے حالات میں زکوٰۃ سے بھی ان کی مدد کی جا سکتی ہے اور عام صدقہ و خیرات سے بھی۔ وقت و حالات کے مطابق عمل کرنا جائز و درست ہے۔ ہاں! خیال رہے کہ ایسے پیشہ ور جو مانگنا ایک پیشہ بنا لیتے ہیں اگر ان کے پیشہ کا یقین ہو تو چاہو مدد نہ کرو لیکن لعن طعن درست نہیں کیونکہ وہ عنداللہ مجرم ہیں اور یقیناً اپنے جرم کی سزا پائیں گے اور یقین جانئے کہ مانگنا ایک بذاتہٖ مانگنے والے کیلئے سزا ہے۔

زیر نظر آیت میں مسافروں کے ساتھ ان حاجت مندوں کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے جن ناتواں طبقہ کو "غلام"

اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۳۶
الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ

اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترانے والے اور ڈینگیں مارنے والے ہیں۔ ۸۴ ۳۶

جو خود بھی بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنا سکھاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے

کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود ہے قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج تھوڑی سی حالت پہلے سے مختلف ضرور ہو چکی ہے تاہم دنیا کی ترقی یافتہ قومیں آج بھی غیر ترقی یافتہ قوموں کو غلام ہی بنائے ہوئے ہیں۔ بہرحال ایسے لوگ بھی مستحق اعانت ہیں تاکہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ اسلام زیردستوں کی مدد کرنے اور کمزوروں کی حمایت کے لئے اٹھا تھا لیکن افسوس کہ آج اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے مسلمان خود زیردست اور کمزور ہو کر رہ گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے نبوت سے پہلے ہی ایک معاہدہ میں شرکت فرمائی تھی جو تاریخ میں آج بھی "حلف الفضول" کے نام سے موسوم ہے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اس لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا چنانچہ زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ، خباب رضی اللہ عنہ بن ارت، بلال رضی اللہ عنہ بن رباح، یاسر رضی اللہ عنہ یمنی، عمار رضی اللہ عنہ، صہیب رضی اللہ عنہ رومی، ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ، عامر رضی اللہ عنہ بن فہیرہ اور سالم رضی اللہ عنہ غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبسؓ اور سمیہؓ کنیزوں میں سب سے پہلے اسلام کی آغوش میں آئیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزء بنا لیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا۔ سورہ طہ میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے ان میں ایک "فَكُّ رَقَبَةٍ" "گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا" بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پر خطر زندگی میں بھی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل ثروت صحابہ نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید کر آزاد کیا تھا اور مدینہ آکر اس تحریک نے اور بھی فروغ پایا اور انجام کار اس غلامی کی جڑیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کاٹ دیں۔ اللہ مسلمان حکمرانوں کو مل بیٹھنے کی توفیق دے اور سب مل کر اس نئی غلامی کی جڑیں بھی کاٹ دکھائیں۔ اے اللہ! مسلمانوں کو صحیح سمت سوچنے کی توفیق عطا فرما۔

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ڈینگیں مارنے والوں کو دوست نہیں رکھتا

۸۴ یہ ڈینگیں مارنا کیا ہے؟ تکبر و غرور کرنا ہے اور اس کا شمار رذائل میں ہے بلکہ یہ سارے

رذائل کا سردار ہے۔ انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا۔ اس نے آدمؑ کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکار کر کہنے لگا انا خیر منه (الاعراف) "میں اس سے بہتر ہوں۔" کیوں؟ کہنے لگا کہ "وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں۔" اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا "یہاں سے نکل جا! اس جگہ تجھے غرور کرنا زیبا نہیں تھا۔ دفعہ ہو جا تجھے اس بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی مار پڑے گی۔" (الاعراف) اس طرح انسان کو سمجھا دیا کہ دیکھو تیرے جسم میں بھی ایک عنصر ایسا ہے اس لئے چوکنا رہنا کہ ہمارے ہاں ڈینگیں مارنے اور شیخی بگھارنے والوں کے ساتھ یہی کچھ کیا جاتا ہے جو اس ملعون سے کیا گیا ہے اور یہی بات زیر نظر آیت میں ارشاد فرمائی کہ "اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترانے والے اور ڈینگیں مارنے والے ہیں۔" "مختال" خیال سے ہے جس میں یہ رمز سمجھا دی کہ انسان اپنے خیال ہی خیال سے اس ذلیل حرکت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہیں باہر سے کوئی آکر اس کو اس پر آمادہ نہیں کرتا۔

تکبر و غرور ایک اضافی چیز ہے جس کیلئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے اس لئے یہ خیال ہی خیال سے پیدا ہونے والی چیز جب دوسروں کے مقابلہ میں "ہم چوما دیگرے نیست" کے مقام پر پہنچ جائے سمجھ لو کہ اب کام خراب ہے۔ اس میں مبتلا کوئی ہو میں ہوں یا آپ۔

تکبر کی اس اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی' اخلاقی' معاشرتی بد اخلاقیوں کو سرچشمہ بنا دیا۔ آپ ذرا غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء کرام کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے رہے جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے تھے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو انبیاء کرام کی کوئی بھی مخالفت نہ کرتا۔ اب بھی چونکہ ہر بستی' قصبہ اور شہر میں یہ لوگ موجود ہیں اس لئے دین کی مخالفت جاری ہے اور رسم و رواج کی اہمیت قائم ہے کیونکہ ساری رسومات ایسے ہی لوگوں کی تشکیل دادہ ہیں اور ان کا ٹوٹنا ان کی موت ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اس بات کو بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود کرنا وہی چاہتے ہیں جو ان کے باپ دادا کرتے آئے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ فطری تقاضا ہے کہ جو شخص کوئی پودہ لگاتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے۔ چونکہ یہ پودا انہی کا لگایا ہوا ہے لہٰذا وہ اس کو پانی دیں گے اور اس کو اکھاڑ پھینکنے والوں کو دشمن سمجھیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی وضاحت جگہ جگہ کی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور دیکھو قیامت کے روز سب لوگ اللہ کے روبرو ہوں گے' اس وقت یہ ناتواں اور کمزور لوگ تکبر کرنے والے اور بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمہارے پیچھے چلنے والے تھے' پھر کیا آج تم ایسا کر

مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ۳۷

اپنے فضل سے دے رکھا ہے اسے چھپا کر رکھتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو ناشکری کرتے ہیں ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۷ ۸۵

سکتے ہو اللہ کے عذاب سے کچھ ہمارا بچاؤ کرا دو وہ کہیں گے کہ اللہ ہم پر بچاؤ کی کوئی راہ کھولتا تو ہم بھی تمہیں کوئی راہ دکھاتے' اب تو ہم خود بھی عذاب میں مبتلا ہیں۔ اب اس کو جھیل لیں یا روئیں پیٹیں ہمارے لئے دونوں حالتیں برابر ہیں اس لئے کہ ہمارے لئے آج کسی طرح چھٹکارا نہیں۔" (ابراہیم ۱۴ : ۲۱)

یہی وہ تکبر ہے جس کی بناء پر انبیاء کرام کے زمانہ کے لوگ اپنے ہی جیسے آدمی کو جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں سودا سلف خریدنے کے لئے چلتا پھرتا تھا اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہوگئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔ آخر کیوں؟ ان کا طبقہ اونچا ہے اس لئے وہ نیچے طبقہ کے لوگوں میں نہیں بیٹھ سکتے۔

اس جگہ لفظ "مُخْتَالٌ" استعمال ہوا ہے اور قرآن کریم میں یہ لفظ دو مقامات پر آیا ہے ایک اس جگہ اور ایک سورہ بنی اسرائیل میں۔ یہ لفظ اس شخص پر بولا جاتا ہے جو مغرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ فخر اور غرور اس میں گویا کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہو یہی وجہ ہے کہ اس کو تکبر کی آخری کڑی بتایا گیا ہے یعنی "بہت ہی تکبر کرنے والا۔" اور اس جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ "اللہ ان کو دوست نہیں رکھتا جو بہت ہی تکبر کرنے والے اور اترانے والے ہوں۔"

اس تکبر کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بڑے بڑے آداب و القاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کیا جائے۔ پھر اگر وہ خلاف واقعہ ہوں گے تو جھوٹ ہوں گے اور اگر واقعہ کے مطابق ہیں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے اسلام کی نظر میں یہ سب پسندیدہ نہیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے سوانح کو دیکھو ان کے تذکار پڑھو آپ کسی کے نام کے آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھیں گے بلکہ بعض اوقات نام کی جگہ ان کی کنیت یا لقب ہی مشہور و معروف ہوگا اور نام کا کسی کو پتہ ہی نہیں ہوگا کہ اصل نام ان کا کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا پر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا ہے۔ اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں ایک مومن و پرہیزگار اور دوسرا بدبخت و بدکار۔ دیکھو! تم لوگ آدم زادے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا اللہ کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا پھرتا ہے۔ (ابوداؤد کتاب الاداب' باب فی التفاخر بالاحساب)

بخل سے کام لینے والے عذاب الٰہی کے مستحق ہیں اس لئے بخل کرنا ترک کر دو

۸۵ تکبر کی وہ حالت جس کو پچھلی آیت میں "مُخْتَالٌ" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی ایک پہچان بخل بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ باتیں تو کریں گے بہت اور لوگوں کو مشورے دے دے کر اور سکیمیں بنا بنا کر دکھائیں گے۔ لیکن جب پیسہ خرچ کرنے کا وقت آئے گا تو پھر یہ نظر ہی نہیں آئیں گے کہ کہاں چلے گئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ پیسہ ان کی جان ہے اگر وہ خرچ ہو گیا تو گویا وہ مر گئے اور پھر کون ہے جو موت کیلئے تیار رہے؟ یہ وہی ہیں کہ کچھ آتا دیکھیں گے تو گویا جان ان میں پڑ گئی اور جاتا دیکھیں گے تو پھر وہی حالت۔ ذرا خوشحالی اور مشیخت یا کوئی عہدہ اگرچہ وہ صلوٰۃ کمیٹی ہی کا کیوں نہ ہو ان کو مل گیا تو اس پر پھولے نہیں سمائیں گے کہ کوئی پوچھنے والا تو ہوا لیکن اگر نماز پڑھنی پڑ گئی تو گویا پھر موت میں مبتلا ہو گئے۔ ایمان کا دعویٰ باتوں میں کرتے رہیں گے لیکن کچھ خرچ کرنا پڑ گیا تو پھر موت۔ خود تو دیں گے نہیں لیکن دوسرے دینے والے بھی ان کی نظروں میں نہیں جچیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح ان کا نام نہ دینے والوں میں شامل ہو جائے گا اور یہ ان کو پسند نہیں۔ لہٰذا نہ کوئی دے اور نہ ان کو دینا پڑے۔ اس لئے بخل کو اساسی بد اخلاقیوں میں شمار کیا گیا ہے بلکہ یہ ایسی بداخلاقی ہے جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت' بددیانتی' بے مروتی' بے رحمی و بدسلوکی' حرص' طمع' لالچ' تنگ نظری' کم ہمتی اور پست طبعی سب اس بخل کی شاخیں ہیں۔

اسلام آیا تو اس نے جھوٹ کے بعد اس پر سب سے پہلے کلہاڑا چلایا اور اس کی جڑیں پہلے ہی وار میں کاٹ کر رکھ دیں۔ کیسے؟ اس طرح کہ اس نے بھوکوں کو کھلانا' ننگوں کو پہنانا' محتاجوں کو دینا' یتیموں کی خبر گیری کرنا' مقروضوں کے قرض اتارنا فرض قرار دیا اور انہی فرائض کے مجموعہ کا نام اس نے زکوٰۃ رکھا اور یہ نظام ان کو ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتے تھے مرتے کرتے تھے اس لئے کہ لینے سے تو وہ واقف تھے لیکن دینے سے انجان اور نظام زکوٰۃ میں دینا پڑتا تھا اس لئے وہ جز بز کیوں نہ ہوتے؟ وہ کام تو وہ کر سکتے تھے جس میں کچھ دینا نہ پڑے لیکن جس میں دینا پڑے وہی تو ان کیلئے موت تھا۔

ہاں! بخیل خرچ کرتا ہے تو صرف اس وقت جب اس کو اس کا معاوضہ اس دنیا میں ملنے کی توقع ہو اور پھر معاوضہ بھی اتنا کہ اگر اس نے روپیہ خرچ کیا ہے تو دو تو اس کو ملیں۔ اس کو اس ملنے کی خوشخبری سنائی گئی لیکن اس پر اس کا دل کب جمتا کہ وہ اس دنیا کا معاملہ تھا اور وہ چیز جس کو جزا کہتے ہیں اس پر اس کا ایمان نہ تھا۔ وہ ثواب کمانے کی فکر کریں گے بھی تو صرف انہی کاموں میں جن پر پیسہ خرچ نہ ہو۔ ان کو کچھ ملنے کی توقع ہو تو اس مقام پر سب سے آگے آگے نظر آئیں گے لیکن اگر کچھ دینا پڑ جائے تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے بے ضرورت قرض لے لیں گے کیوں؟ اس لئے کہ کچھ لے ہی رہے ہیں اور اس میں ان کا اپنا حق ہے کہ یہ بے سود ہے؟ اور کچھ نہیں تو اس بے سود قرض سے سود ہی کما لیں گے اور پھر یہ حرص بھی ساتھ رہے گی کہ شاید یہ قرض معاف ہی ہو جائے۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا

اور جو محض لوگوں کے دکھانے کو مال خرچ کرتے ہیں وہ فی الحقیقت اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور دیکھو جس کا ساتھی شیطان ہو کیا ہی برا یہ ساتھی ہے۔ ۳۸

ان لوگوں کا کیا بگڑتا تھا اگر یہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے اور جو کچھ انہیں اللہ نے

قرآن کریم میں بخیل کی سب سے بڑی مثال قارون بتایا گیا ہے جس کا بیان سورہ قصص میں ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اور انہی کی قوم کا ایک آدمی تھا۔ اتنا مالدار تھا کہ تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک کنجی بنتی تھی۔ خزانے تو الگ رہے ان خزانوں کی کنجیاں بھی کئی آدمی مل کر مشکل سے اٹھا سکتے تھے تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل خاص سے اس کو اتنا مال دار بنا دیا۔ وہ کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے۔ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزر چکے ہیں جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے۔ چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا انجام بھی یہ ہوا کہ وہ سب اس دنیا میں دھنس کر رہ گئی اور آج بھی بخیلوں کی دولت یقیناً ان کو عذاب الٰہی سے نجات نہ دلا سکے گی۔ اس لئے فرمایا کہ "جو خود بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنا سکھاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دے رکھا ہے اس کو چھپا کر رکھتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ناشکری کرتے ہیں ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

دکھاوے کیلئے مال خرچ کرنا مال کو ضائع کرنے کے برابر ہے

۸۶ یہ ریا سے مال خرچ کرنے والے وہی لوگ ہیں جن کو مختال و فخور کہا گیا اور جن کی ایک صفت بخیل بھی بیان ہو چکی۔ فرمایا اگر یہ مال خرچ کرتے بھی ہیں تو دکھاوے کیلئے۔ اس طرح بھی ان کی اور اصل ایک غرض پوری ہوتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا نام روشن ہوگا اور اس طرح اس رسم کے ادا کرنے سے برادری میں ایک مقام حاصل ہوگا اور لوگ عش عش کر اٹھیں گے پھر ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کا چرچا ہوگا۔ اس طرح گویا ناک رکھنے کیلئے زمینیں اور جائیدادیں بھی فروخت کر لیں گے مگر اللہ کی راہ میں دینے کا نام آئے تو چند پیسے خرچ کرنے بھی ان کو دشوار ہوں گے اور زیر نظر آیت میں مزید اشارہ اس طرح

مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۳۹ ۞ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ

دے رکھا ہے اسے خرچ کرتے؟ اور اللہ تو ان کی حالت کی پوری خبر رکھتا ہے۔ ۸۶ ۳۹

یاد رکھو اللہ ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا اگر ذرہ برابر بھی کسی نے نیکی کی ہے تو وہ

فرمایا کہ اس طرح یہ لوگ شیطان کی راہ میں مال خرچ کرتے وقت تو بخیل نہیں ہوتے لیکن یہ شیطان کی راہ میں مال خرچ کرنا ان کے بخل سے ایک درجہ بڑھ کر برائی ہے اس لئے اگر وہ ایک برائی سے نکلے بھی ہیں تو اس سے بڑی برائی میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ فرمایا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ وہ کر سکتا ہے اس کا صلہ نقد حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ وہ پیسے کی صورت میں ملے یا نام و نمود کی صورت میں کیونکہ اس کی انا کی تسکین کیلئے سامان ضروری ہے اور وہ دونوں طریقوں سے اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ فرمایا غور کرو کہ جس کا ساتھی شیطان ہو جائے کیا اس سے زیادہ برا ساتھی بھی کسی کو مل سکتا ہے؟ کیا جس کا ساتھی برا ہوگا وہ خود بھی اچھا ہو سکتا ہے؟

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ رکھنے کا نقصان کیا ہوا؟ کاش یہ بات وہ سمجھ جائے

۸۷ رضائے الٰہی میں خرچ کرنے والا بھی خرچ کرتا ہے اور نام و نمود حاصل کرنے والا بھی۔ خرچ تو دونوں نے کیا لیکن فائدہ میں کون رہا؟ وہی جس کی واہ واہ ہوئی کہ سودا نقد بہ نقد ہو گیا۔ ہاتھ سے مال دیا اور کان نے واہ واہ سن لی اور وہ سرد ھن کر رہ گیا۔ رضائے الٰہی میں خرچ کرنے والا ایک روز مر گیا اور نام و نمود کیلئے خرچ کرنے والا بھی۔ کئے گئے اعمال سامنے لائے گئے۔ ایک کی اجرت محفوظ تھی کیونکہ اس نے اس کو اس وقت کیلئے محفوظ رکھا تھا اور دوسرے کا حساب بے باک تھا اس لئے اس کو سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب بتاؤ کہ فائدہ میں کون رہا؟ وہی جس نے رضائے الٰہی کے لئے خرچ کیا تھا۔ اجر دونوں کو ملا یا نہیں؟ دونوں کو ملا لیکن ایک کو دنیا میں ہی مل گیا اور دوسرے کو آخرت میں۔ دنیا کا اجر دنیا ہی میں ختم ہو کر رہ گیا اور آخرت میں وصول ہونے والا آخرت میں اس کے کام آگیا۔ فرمایا! "ان کا کیا بگڑتا تھا کہ یہ بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے اور جو کچھ ان کو اللہ نے دیا تھا اس کی رضا کیلئے خرچ کرتے؟" اس طرح آج ان کا دیا ہوا بھی محفوظ ہوتا۔

اس طرح اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرنے والوں کی آج بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ کاش کہ یہ لوگ سمجھ جائیں اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی نہ ماریں۔ "اللہ ان کے مال سے پوری طرح باخبر ہے اس لئے ان کو مطلع کر رہا ہے کہ اپنے برتن کے ان سوراخوں کو بند کر دو ورنہ یہ خالی کے خالی ہی رہیں گے۔"

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ
أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا
بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اسے دوگنا کر دے گا اور پھر اپنے پاس سے ایسا بدلہ بھی عطا فرمائے گا جو بہت بڑا بدلہ ہوگا۔ ۴۰

اور پھر اے پیغمبر اسلام! کیا حال ہوگا اس دن، جب ہم پر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تجھے بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کیلئے طلب کریں گے! ۴۱

سو اس دن ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اور رسول کے حکموں

اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے

۸۸ یہ آیت ایک طرح پچھلی آیات کا تکملہ ہے کیونکہ گزشتہ آیات کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔ پچھلی آیات میں حقوق العباد اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر تھا اور اس میں یہ بتایا گیا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے اور اللہ اس کا اجر ضرور دے گا۔ اگر اجر نہ دے تو گویا اس نے ظلم کیا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تو ایک ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ کیا ہوا؟ کہ یہ خرچ کرنے والے کا برتن بھی خالی نکلا اور اللہ بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا یہ بات کیا ہوگئی، اجر کدھر گیا؟ فرمایا ان کو تو بتایا گیا کہ تم نے تو خود ہی اپنے برتن میں سوراخ بنا رکھے ہیں اس میں جو تم ڈالتے ہو وہ وہیں رہ جاتا ہے جہاں ڈالا گیا۔ لیکن ان لوگوں نے اس وقت پروانہ کی اور سنی ان سنی کر دی اور اب شور بپا کرتے ہیں کہ برتن خالی نکلا تو اس میں قصور وار کون ہوا؟ لیکن اس طرح اپنے ہاتھوں اپنی ذات پر ظلم کرنے والے ظلم سے خود باز نہ آئیں تو یہ ان کی مرضی "اللہ تو ایک ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کے پاس ایک ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اجر ضرور ملے گا اور پھر اتنا ہی نہیں ملے گا جتنا اس نے کیا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ ملے گا۔ کیونکہ وہ اپنے پاس سے ایسا بدلہ بھی عطا فرمائے گا جو ایک بہت ہی بڑا بدلہ ہوگا۔" ذرہ کیا ہے؟ کہا گیا ہے کہ کسی بند مکان میں سوراخ ہو اور اس سوراخ سے اندر دھوپ داخل ہو رہی ہو تو اس دھوپ میں کچھ آٹم نظر آئیں گے جو باہر کھلی فضا میں نظر نہیں آتے بس یہ آٹم جو نظر آ رہے ہیں یہی وہ ذرات ہیں جن میں کا ایک ذرہ اس جگہ بیان ہوا اور اس کو ہماری زبان میں اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ "ہوا بھر" یعنی ان پر ہوا بھر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ اس چیز کو قرآن کریم میں کس جگہ "گٹھلی کے تاگہ" سے تشبیہ دی ہے اور کسی جگہ ذرہ سے اور کسی جگہ نہ نظر آنے

والے پردہ سے اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے۔

ہر امت سے گواہ طلب کرنے کے بعد ان گواہوں پر نبی اعظم و آخر ﷺ کی گواہی کا مطلب

۸۹ اعمال کے بدلہ سے آخرت کی طرف مضمون کو منتقل کیا تھا لیکن یہ اس طرف گویا ایک طرح کا اشارہ تھا۔ اب آخرت کی طرف مستقل طور پر مضمون کو لایا جا رہا ہے۔ زیر نظر آیت میں جو مضمون بیان کیا گیا اس کو تین طرح بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ قیامت کے روز تمام انبیاء کرام کو ان کی اپنی اپنی امتوں پر شہادت کیلئے بلایا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کو دوسرے تمام انبیاء کرام کی شہادت کے درست ہونے کی گواہی کیلئے تشریف لانا ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ گواہی قرآن کریم کی شہادت کی بناء پر ہوگی جو کلام الٰہی کی وجہ سے حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی گواہی ہوگی۔

دوسرے یہ کہ "هٰٓؤُلَآءِ" کا مشار الیہ امت احمدیہ ﷺ ہوئی کہ احمد مجتبیٰ ﷺ اپنی امت کے احوال و اعمال پر گواہی دیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ اس پہچان کی بناء پر ہوگی جس کا ذکر خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں اپنی امت کی پہچان کے متعلق پہلے ہی بیان فرما دیئے ہوئے ہیں اور انہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اپنی امت پر گواہی دیں گے۔

تیسرے یہ کہ سارے انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں پر گواہی دیں گے اور احمد رسول اللہ ﷺ کی امت اجابت کو بھی بطور گواہ ان امتوں پر حاضر کیا جائے گا کیونکہ ان ساری امتوں کے احوال قرآن کریم میں بیان فرما دیئے گئے ہیں اور ان سارے گواہوں کے بعد آخری گواہ خود احمد مجتبیٰ ﷺ ہوں گے۔

بخاری شریف میں یہ روایت ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ نے عبداللہ بن مسعود سے فرمایا کہ مجھے قرآن کریم سناؤ۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ مجھ سے قرآن سننا چاہتے ہیں حالانکہ قرآن کریم تو آپ ﷺ کے سینہ اقدس پر نازل ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! پڑھو! حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سورہ النساء کی تلاوت شروع کی اور جب فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ پر پہنچا تو آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ بس کرو اور جب میں نے آپ ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مختصر یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ امتوں کے انبیاء کرام اپنی اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہوں گے اور آپ ﷺ بھی اپنی امت پر یا ساری امتوں پر یا ساری امتوں کی انبیاء پر گواہی دیں گے اور قرآن کریم کے اس اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی امت کے متعلق گواہی دے ورنہ قرآن کریم میں اس کا اور اس کی شہادت کا بھی یقیناً ذکر ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کے مضمون کی ایک دلیل ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کے بعد ہر شخص جو نبوت کا دعویٰ کرے وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کو قرآن کریم میں "شاہداً" بھی کہا گیا ہے اور "شہیداً" بھی "شاھداً" کا لفظ آپ ﷺ کیلئے سورہ الاحزاب آیت ۴۵' سورہ الفتح آیت ۸ اور سورہ المزمل آیت ۱۵ میں بیان ہوا اور "شھیداً" کا لفظ آپ ﷺ کیلئے سورہ بقرہ آیت ۱۴۳' سورہ النساء آیت ۴۱' سورہ النحل آیت ۸۹' سورہ الحج آیت ۷۸ اور سورہ الاحزاب آیت ۵۵ میں بیان ہوا۔

شہادت کیا ہے؟ شہادت امر واقع کو بیان کرنا اور دوسرے شخص کو اپنے بیان کے ذریعے سے اس امر کا باور کرانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شہادت جسے آپ ﷺ نے ادا کیا اور جسے ادا فرما کر لوگوں کو یقین کے درجہ تک پہنچایا عموماً امور ذیل کے متعلق تھی۔

ذات باری جل مجدہ' تقدیس ذات و تنزیہہ صفات' سلسلہ وحی الٰہی' وجود نبوت' عالم ارواح' علوم مابعد الطبیعہ اور ان سارے امور کو جس وضاحت اور کمال علم اور روشن دلائل اور براہین قاطعہ سے نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا اور پھر اپنے گفتار و کردار سے اس صداقت کے یقین کو ملحدوں اور منکروں کے قلوب میں مستحکم فرمایا یہ آپ ﷺ ہی کا حصہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت الٰہیہ اور حکمت ربانیہ نے نبی کریم ﷺ کو دنیا کے سامنے بطور اپنی گواہی کے پیش کیا ہے اور یہ ایک قانونی حقیقت ہے کہ گواہوں کی قلت یا کثرت کسی معاملہ کے ثبوت و نفی پر ذرا موثر نہیں اور جہاں تعداد گواہ متعین کی ہے وہاں دراصل اس کی گہرائی میں کوئی خاص ضرورت مخفی ضرور ہے۔ بلکہ شہادت کو قوت دینے اور صداقت کے روح تک پہنچانے والی جو شے ہے وہ شاہد کی ثقاہت اعتبار اور راست بازی ہے اور نبی کریم ﷺ کی راست بازی اور اعتبار کی یہ حد تھی کہ جب کفار نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تم نے کیونکر محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا سچا رسول تسلیم کر لیا تو انہوں نے جواب دیا کہ لوگو! یہ ہونٹ کبھی جھوٹ بولنے والے کے نہیں۔ ہرقل نے ابوسفیان کے جواب میں کہا تھا کہ جس شخص نے کبھی کسی مخلوق پر جھوٹ نہیں بولا ناممکن ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگے۔ ابوجہل جیسے جھگڑالو شخص نے کہا تھا کہ محمد (ﷺ) میں تجھے جوٹا نہیں سمجھتا مگر تیری تعلیم پر میرا دل ہی نہیں جمتا۔

صداقت اور اعتبار ہو تو ایسا ہو کہ خواہ کوئی شہادت کو قبول کرتا ہے یا نہیں لیکن شہادت دہندہ کی ثقاہت کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالتا۔ یا بقول ابوسفیان نہیں نکال سکتا۔ بلکہ ہر شخص دل میں سمجھ گیا ہے کہ اس کے خلاف لب کشائی کرنا اپنی ہنسی کرانا اور خود کو ذلیل کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شہادت کو دشت و جبل میں آشکارا کیا۔ بیابان اور شہروں کے سمع و قلب تک اس کو پہنچایا اور اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے نعرہ سے فضائے ارض و سماء کو بھر دیا اور سننے والوں کے دل و دماغ کو شک انکار اور تذبذب و گمان کی ہوائے فاسد سے خالی کر دیا۔ سبحان اللہ! یہ شاہد کی زبردست شہادت سے اٹھا ہے جس کے منہ سے نکلتے ہی وہی کلمہ شہادت ہر ایک زبان پر رواں ہے۔ کیا عجمی' کیا عربی' کیا شرقی' کیا غربی ہر ایک اس شہادت کا کلمہ خوان ہے۔ یہ شاہد کیسا ہے؟ خاموش نہیں ہو جاتا جب تک ہزاروں اور لاکھوں بندوں کو "وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

النَّاسِ" کے فرض پر آمادہ نہیں کر لیتا اور اسود و احمر اور عبید و ملوک کر "كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" کے وجوب امری کا پابند نہیں ٹھہرا دیتا۔ یہ کیسا شاہد ہے؟ جس کی صداقت پر لاکھوں شاہد عینی موجود ہیں۔ ملکوں' قوموں' جزیروں اور وادیوں نے اس کی شہادت سے ایقان حاصل کر لیا ہے تب شاہد اس وادی گاہ سے عزم رحلت فرماتا ہے اور چلتے وقت بھی ان سب کو یہ سنا دیتا ہے کہ :

انتم تسءلون عنی فما انتم قائلون قالوا بلغت واد یت و نصحت فقال باصبعه یرفعها الی السمآء و ینکتها الی الناس اللهم اشهد۔ اللهم اشهد۔ اللهم اشهد۔ "وہ پوچھتا ہے کہ لوگو! وہ قاضی جہاں۔ رب زمین و زمان جب دریافت فرمائے گا کہ میں نے اپنی شہادت کو کیونکہ ادا کیا' تو آپ کیا بتائیں گے؟ سب کے سب متفق آواز بول اٹھتے ہیں' اجی آپ ﷺ نے تو جتنا کچھ فرمانا تھا خوب ہی فرمایا۔ آپ ﷺ نے تبلیغ و تفہیم کا حق ادا کر دیا۔ حضور ﷺ نے تو اپنی شہادت سے معاملہ کا کھوٹا کھرا الگ الگ کر کے دکھا دیا۔ شاہد ﷺ آسمان کی جانب انگشت شہادت اٹھاتا ہے' پھر لوگوں کی طرف جھکاتا ہے اور اپنے بھیجنے والے سے مخاطب ہو کر عرض کرتا ہے۔ الٰہی میری شہادت کی شہادت کو سن لے میری گواہی کا تو خود گواہ رہنا اور ان لوگوں کے بیان کو محفوظ فرما لینا۔

ایسے شاہد پر دل و جان خود بخود قربان ہوتے ہیں جو داوی گاہ عالم میں شہادت کیلئے اکیلا آیا اور لاکھوں لوگوں کو گواہ بنا گیا۔ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ نے نبی اعظم و آخر ﷺ کو "شاہد" اور "شہید" فرما کر آپ ﷺ کی بہترین خوبی سے دنیا کو آگاہ فرما دیا۔ لوگوں نے اس شہادت کو کیا سمجھا کہ ایک اکھاڑا بنا کر رکھ دیا۔ اس کو بنیاد بنا کر اپنے شرک کی عمارت تعمیر کرنا شروع کر دی اور وہی چیز جس کو مٹانے کیلئے شاہد آیا تھا اس کے وجود پر اپنی سحر کاری سے کھڑی کر دی۔ اللہ ایسے شاطروں سے بچائے اور حق کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جی چاہتا ہے کہ اس شاہد کی بتائی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں کچھ مزید عرض کر دیا جائے تاکہ ایک ہی مقام پر اس کی پوری حیثیت واضح ہو جائے۔ کان لگا کر سنو اور آنکھوں سے پڑھ کر دیکھو اور سمجھنے کی توفیق اس احکم الحاکمین سے طلب کرو جس نے ایسا کمال اور ایسا بے مثال شاہد تم کو عطا کیا۔ اللهم صلی علی محمد و علیٰ ال محمد۔

بلاشبہ نبی کو "گواہ" بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں۔

ایک قولی شہادت یعنی کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اصولوں پر مبنی ہے' نبی ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی اصول حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔ اللہ کی ہستی اور اس کی توحید' ملائکہ کا وجود' وحی کا نزول' حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظہور خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے دیوانہ کہے' مگر نبی کسی کی پروا کئے بغیر اٹھے اور ہانک پکار کر کہہ دے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ جو اسے

نہیں مانتے۔ اسی طرح اخلاق اور تہذیب اور تمدن کے جو تصورات' اقدار' اصول اور ضابطے خدا نے اس پر منکشف کئے ہیں' انہیں اگر ساری دنیا غلط کہتی ہو اور ان کے خلاف چل رہی ہو تب بھی اس نبی کا کام یہ ہے کہ انہی کو علی الاعلان پیش کرے اور ان تمام خیالات اور طریقوں کو غلط قرار دے جو ان کے خلاف دنیا میں رائج ہوں۔ اسی طرح جو کچھ خدا کی شریعت میں حلال ہے نبی اس کو حلال ہی کہے خواہ وہ ساری دنیا اسے حرام سمجھتی ہو اور جو کچھ خدا کی شریعت میں حرام ہے نبی اس کو حرام ہی کہے خواہ ساری دنیا اسے حلال و طیب قرار دے رہی ہو۔

دوسرے عملی شہادت' یعنی یہ کہ نبی اپنی پوری زندگی میں اس مسلک کا عملاً مظاہرہ کرے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے وہ اٹھا ہے جس چیز کو وہ برائی کہتا ہے اس کے ہر شائبے سے اس کی زندگی پاک ہو۔ جس چیز کو وہ بھلائی کہتا ہے اس کی اپنی سیرت میں وہ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ جس چیز کو وہ فرض کہتا ہے اسے ادا کرنے میں وہ سب سے بڑھ کر ہو۔ جس چیز کو وہ گناہ کہتا ہے اس سے بچنے میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکے۔ جس قانون حیات کو وہ خدا کا قانون کہتا ہے اسے نافذ کرنے میں وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اس کا اپنا اخلاق و کردار اس بات پر گواہ ہو کہ وہ اپنی دعوت میں کس قدر سچا اور کتنا مخلص ہے اور اس کی ذات اس کی تعلیم کا ایسا مجسم نمونہ ہو جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ جس دین کی طرف وہ دنیا کو بلا رہا ہے وہ کس معیار کا انسان بنانا چاہتا ہے' کیا کردار اس میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور کیا نظام زندگی اس سے برپا کرانا چاہتا ہے۔

تیسرے اخروی شہادت یعنی آخرت میں جب اللہ کی عدالت قائم ہو اس وقت نبی اس امر کی شہادت دے کہ جو پیغام اس کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے اپنے قول و عمل سے حق واضح کر دینے میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسی شہادت پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ماننے والے کس جزا کے اور نہ ماننے والے کس سزا کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ کو شہادت کے مقام پر کھڑا کر کے اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی اور وہ کیسی عظیم شخصیت ہونی چاہئے جو اس مقام بلند پر کھڑی ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ سے دین حق کو قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے' تبھی تو آخرت میں آپ ﷺ یہ شہادت دے سکیں گے کہ میں نے لوگوں پر حق پوری طرح واضح کر دیا تھا اور تبھی اللہ کی حجت لوگوں پر قائم ہوگی۔ ورنہ اگر معاذ اللہ آپ ہی سے یہاں شہادت ادا کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو نہ آپ ﷺ آخرت میں ان پر گواہ ہو سکتے ہیں اور نہ منکرین حق کے خلاف مقدمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس شہادت کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ نبی ﷺ آخرت میں لوگوں کے اعمال پر شہادت دیں گے اور اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ حضور تمام لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں' ورنہ بے دیکھے شہادت کیسے دے سکیں گے لیکن قرآن مجید کی رو سے یہ تاویل قطعاً غلط ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے

کہ لوگوں کے اعمال پر شہادت قائم کرنے کیلئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا ہی انتظام فرمایا ہے۔ اس غرض کیلئے اس کے فرشتے ہر شخص کا نامہ اعمال تیار کر رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ق' آیات ۱۷۔ ۱۸ اور ا لکہف۔ آیت ۴۹) اور اس کیلئے وہ لوگوں کے اپنے اعضاء سے بھی گواہی لے گا۔ (یاسین ۶۵' حم السجدہ ۲۰۔ ۲۱) رہے انبیاء علیہم السلام' تو ان کا کام بندوں کے اعمال پر گواہی دینا نہیں بلکہ اس بات پر گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ قرآن صاف فرماتا ہے :

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (المائدہ ۵ : ۱۰۹) "جس روز اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا' پھر پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا' تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں' تمام غیب کی باتوں کو جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔"

اور اسی سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب ان سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال ہوگا تو وہ عرض کریں گے :

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدہ ۵: ۱۱۷)

"میں جب تک ان کے درمیان تھا اسی وقت تک ان پر گواہ تھا۔ جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو آپ ہی ان پر نگراں تھے۔"

یہ آیات اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اعمال خلق کے گواہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہ گواہ کس چیز کے ہوں گے؟ اس کا جواب قرآن اتنی ہی صراحت کے ساتھ یہ دیتا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۲: ۱۴۳) "اور اے مسلمانو! اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔"

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النحل ۱۶ : ۸۹)

"اور جس روز ہم ہر امت میں انہی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو ان پر گواہی دے گا اور (اے محمد ﷺ) تمہیں ان لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز نبی ﷺ کی شہادت اپنی نوعیت میں اس شہادت سے مختلف نہ ہوگی جسے ادا کرنے کیلئے حضور ﷺ کی امت کو اور ہر امت پر گواہی دینے والے شہداء کو بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو ان سب کا بھی حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے اور اگر یہ گواہ صرف اس امر کی شہادت دینے کیلئے بلائے جائیں گے کہ خلق تک اس کے خالق کا پیغام پہنچ گیا تھا تو لامحالہ حضور ﷺ بھی اسی غرض کیلئے پیش ہوں گے۔

اسی مضمون کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن کو بخاری' مسلم' ترمذی' ابن ماجہ اور امام احمد وغیرہم

وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ
حَدِيْثًا ۴۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى

سے نافرمان ہوگئے ہیں وہ تمنا کریں گے کاش! زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن وہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکیں گے۔[۹۰] ۴۲

مسلمانو! ایسا کبھی نہ کرو کہ تم نشہ میں ہو اور نماز کا ارادہ کرو۔[۹۱] نماز کیلئے ضروری ہے کہ تم

نے عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عباس' ابو الدرداء' انس بن مالک اور بہت سے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے' جن کا مشترک مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ قیامت کے روز اپنے بعض اصحاب کو دیکھیں گے کہ وہ لائے جا رہے ہیں' مگر وہ آپ ﷺ کی طرف آنے کے بجائے دوسرے رخ پر جا رہے ہوں گے یا دھکیلے جا رہے ہوں گے۔ حضور ﷺ ان کو دیکھ کر عرض کریں گے کہ خدایا' یہ تو میرے امتی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کرتوت کئے ہیں۔ یہ مضمون اتنے صحابہ سے اتنی کثیر سندوں کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ اس کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور اس سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے امت کے ایک ایک شخص اور اس کی ایک ایک حرکت کے شاہد قطعاً نہیں رہیں ہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کی امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں تو وہ کسی طرح بھی اس مضمون سے متعارض نہیں ہے اس لئے کہ اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو امت کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر شخص کے اعمال نامہ کا عینی مشاہدہ فرما رہے ہیں؟ اور کسی کو کسی بات سے باخبر رکھنا اور کسی انسان کا کسی چیز کو مشاہدہ کرنے میں جو فرق ہے وہ محتاج نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ "ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں کا انجام

۹۰ یہ غلطی بھی مدت سے قوموں کو لگتی آئی ہے کہ ہم بد اعتدالیاں کرتے ہیں اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی ہر لحاظ سے ہم نے مخالفت کی لیکن ہمیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ فوراً کسی کو کبھی نہیں پکڑتا بلکہ وہ ایسے نافرمانوں کو جو رسول کی نافرمانی کرتے ہیں ایک وقت تک مہلت دیتا رہتا ہے۔ پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب و استہزاء کی جو روش انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اس پر چونکہ ابھی تک انہیں سزا نہیں دی گئی اس لئے یہ نبی سرے سے

نبی ہی نہیں۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کیلئے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے سمجھنے اور سنبھلنے کیلئے اتنی مہلت دی جائے گی اور اسی حد تک اس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے اور ہماری مقرر کی ہوئی حد جس وقت تک آ نہیں جاتی ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں رسول کی مخالفت کرنے والوں کا حال دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ :

"ہر ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کہ کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکانے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی اور شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا۔" (الفرقان ۲۵ : ۲۷، ۲۹) بلکہ شیطان تو عین وقت پر انسان کو دھوکا دے جانے والا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"جس روز ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی اور کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ہمارے ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔" (الاحزاب ۳۳ : ۶۷، ۶۸) چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ :

"اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا اور ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔" (عبس ۸۰ : ۳۴، ۳۷)

ان عزیزوں سے بھاگنے کا مطلب کیا؟ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی عزیزوں کو جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ پیارے تھے مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کی مدد کو دوڑے الٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کیلئے نہ پکار اٹھیں اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے اس کے برے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گنہگاریوں کی ذمہ داری اس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے۔ اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔"

اور یہی مضمون اس جگہ اس طرح ارشاد فرمایا کہ "سو اس دن ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اور رسول کے حکموں سے نافرمان ہوگئے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش! زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن وہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکیں گے۔"

حالت سکر میں نماز ادا کرنے کی ممانعت

۹۱ گزشتہ آیات کریمات میں معاشرتی زندگی کے جو حقوق و فرائض بیان کئے گئے ہیں اگر تم چاہتے

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو اسے ۹۲ سمجھو اور جس کسی کو نہانے کی حاجت ہو تو وہ بھی جب تک نہا نہ لے نماز کا قصد نہ کرے ہاں! راہ چلتا مسافر ہو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم

ہو کہ ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو تو چاہئے کہ خدا کے شکر و عبادت سے اپنی ایمانی قوت مضبوط کرتے رہو مطلب واضح ہے کہ جو جماعت نماز کی حقیقت سے محروم ہوگی یعنی عبادت کے خشوع و خضوع کا اس میں ذوق نہ ہوگا وہ کبھی عملی زندگی کی اخلاقی مشکلوں پر قابو نہیں پا سکتی۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب کے باشندے صدیوں سے شراب نوشی کے عادی چلے آرہے تھے۔ اس لئے ان کا ایک دفعہ باز آجانا نہایت مشکل تھا اس لئے بتدریج ممانعت کے احکام نازل ہوتے رہے اور بالآخر قطعی طور پر اس کا استعمال حرام کر دیا گیا۔ اس جگہ نماز کے وقت شراب نوشی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ابتدائی دور کا ہے ابھی تک شراب کی حرمت کا آخری اعلان نہیں ہوا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اوقات نماز میں تو شراب پینے سے باز رہو یہ مطلب نہیں کہ شراب تو اس طرح پیتے چلے جاؤ اور نشہ کی حالت میں نماز کو چھوڑے رہو۔

نمازی جو کچھ زبان سے کہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے کیا کہا؟

۹۲ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ "جو کچھ زبان سے کہو اسے سمجھو" اس حکم کا تقاضا تو یہی ہے کہ نماز کے جو الفاظ منہ سے نکالے جائیں آدمی ان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ان اذکار اور درود، وظیفہ اور دعاؤں کا ترجمہ آتا ہو اور یہ بات معلوم ہو کہ جو کچھ میں زبان سے ادا کر رہا ہوں وہ اصل میں کیا ہے؟ جب یہ بات نہ امام صاحب کو معلوم ہو اور نہ دوسرے نمازیوں کو تو وہ نماز کیا نماز ہوئی اور قرآن کریم کا یہ حکم اس پر کس طرح وارد ہوا۔ افسوس کہ ہمارے نمازیوں کا نہ تلفظ صحیح ہے نہ ترجمہ آتا ہے کہ کم از کم وہ دعائیں جو زبان سے ادا کی جا رہی ہیں ان کے متعلق اتنی سمجھ تو ہو کہ میں کیا مانگ رہا ہوں تاکہ اپنی حاجت اور ضرورت کی طلب تو پوری ہو سکے۔ پھر اس افسوس پر مزید افسوس یہ کہ علماء طبقہ اپنے نمازیوں کی توجہ بھی اس طرف مبذول نہیں کراتا بلکہ صرف اور صرف نیت کیلئے ایک مجموعہ الفاظ یاد کرایا جاتا ہے جو ہر نمازی کھڑے ہوتے وقت ان الفاظ کو زبان سے اپنی بولی میں ادا کر لیتا ہے اور یہی نماز ہے۔ اس طرح نماز کیا ہے؟ صرف چند حرکات و سکنات کا ایک مجموعہ کھڑے ہونا، جھکنا اور سجدے میں گرنا اور ایک طریقہ سے بیٹھ کر دائیں بائیں منہ پھرنا فقط والسلام۔

مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ

میں سے کوئی آدمی جائے ضرور سے فارغ ہو کر آئے یا ایسا ہو کہ تم نے عورت کو چھوا ہو اور پانی نہ ملے تو اس صورت میں چاہئے کہ پاک زمین سے کام لو' چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ بلاشبہ اللہ درگزر کرنے والا اور بخش دینے والا ہے ۴۳

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جنہیں کتاب اللہ سے کچھ حصہ دیا گیا تھا؟ کس

غسل فرض ہو تو غسل کر کے مسجد میں آنا چاہئے ہاں عند الضرورت مسجد سے گزرا جاسکتا ہے

۹۳ شراب اور جنب دراصل دونوں ہی لذت نفسانی کے حصول کا ذریعہ ہیں اس لئے لذت ذکر الٰہی سے روک دیا گیا کہ لذت نفسانی کے حصول سے الگ ہونے کیلئے غسل ضروری ہے اس لئے نماز ادا کرنے سے پہلے جو درحقیقت تزکیہ نفس کا ایک بہترین ذریعہ ہے جبکہ اس کے متعلق سمجھ بھی ہو کہ وہ چیز کیا ہے؟ اس لئے حالت سکر میں اور حالت جنب میں نماز سے الگ رکھا گیا اور پھر تدریجاً" حالت سکر کو بالکل اٹھا دیا گیا کہ وہ عقل کو خراب کرنے والی ہے اور حالت جنب سے طہارت لازمی قرار دی گئی کہ نہا دھو کو غسل کر کے ہر طرح کی ناپاکی سے جسم کو پاک کر لو پھر نماز ادا کرنا۔ اس لئے کہ نماز روحانی سرور کا ذریعہ ہے جس کو جسمانی سرور سے ہر حال میں الگ رہنا چاہئے تاکہ اس سے روحانی غذا حاصل ہو سکے جو روح کی تقویت کا باعث ہو۔ "عَابِرِیْ سَبِیْلٍ" عَبُوْرًا" سے ہے یعنی مسجد سے گزر کر ہی پانی تک پہنچا جا سکتا ہو تو یہ دوسری بات جس کی اس حد تک اجازت ہے کہ جنبی آدمی عند الضرورت مسجد میں داخل ہو سکتا ہے لیکن بیٹھ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس کو مستثنیٰ قرار دے کر ایک طرح کی سہولت پیدا کر دی گئی اور واضح کر دیا گیا کہ مجبوری کے احکام عام حالت سے الگ ہیں۔

دوسرا حکم اس میں یہ دیا گیا ہے کہ کوئی حالتِ جنب میں ہو یا قضائے حاجت سے فارغ ہوا ہو یا صرف وضو کی حاجت ہو لیکن پانی میسر نہ آئے تو کیا کرے؟ فرمایا ایسی حالت میں پانی کا بدل مٹی ہے اور پھر مٹی کو بھی ملنا مراد نہیں بلکہ صرف پاک مٹی سے تیمم لازم آتا ہے گویا آدمی بول و براز سے فارغ ہو جو انسانی ضروریات میں داخل ہے تو پانی نہ ملنے کی صورت میں صرف پاک مٹی سے مسح کافی ہے۔ اور پھر مسح کا طریقہ بھی ساتھ

الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا

طرح وہ گمراہی خرید رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے بہک جاؤ؟ ۴۴ ۹۵

ہی بتا دیا گیا کہ مسح کیا ہے؟ مسح یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو پاک مٹی، دیوار یا زمین پر لگا کر دونوں ہاتھوں کے گھٹنے تک مس کرتے ہوئے منہ پر پھیر لیا اور پھر اس طرح دوسری دفعہ زمین کو مس کر کے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں تک پھیر لینے سے مسح ادا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی بار زمین سے ہاتھ مس کرنے سے بھی مسح ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سریہ میں تھے کہ مجھ پر غسل فرض ہو گیا اور پانی موجود نہیں تھا تو میں مٹی کے اندر لوٹ گیا تاکہ سارا جسم مٹی سے اٹ جائے۔ بعد میں میں نے یہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے یعنی مسکرانے لگے اور فرمایا کہ تجھے صرف اتنا کافی تھا وضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ الارض ثم نفخ فیھا و مسح بھا وجھہ و کفیہ یعنی نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر دونوں ہاتھ مارے پھر ان پر پھونک ماری تاکہ زائد مٹی اڑ جائے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ اور کفوں پر مسح کیا۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں جنبی کی حالتیں اور "لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" کی مختلف تعبیریں پھر مسجد میں داخلہ اور اسی طرح وضو اور مسح کا طریقہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اختلافات کا ذکر بھی کیا ہے جو اس سلسلہ میں امت کے درمیان پائے جاتے ہیں اور عجیب عجیب بحثیں بیان کی ہیں مثلاً اگر جنبی صرف وضو کر لے اور غسل کرنا واجب ہو تو صرف وضو کرنے سے مسجد میں داخل ہو سکتا ہے، بیٹھ سکتا ہے، وعظ و درس بیان کر سکتا ہے حتیٰ کہ جمعہ کا خطبہ بھی دے سکتا ہے۔ البتہ نماز نہیں پڑھ سکتا ہم ان ساری بحثوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

بال کی کھال اتارنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے

۹۴ مجبوری کے تحت دیئے گئے احکام مجبوری کا وقت ٹل جانے سے خود بخود زائل ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ اصل احکام نافذ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً غسل فرض تھا لیکن کسی مجبوری کے تحت غسل نہیں کر سکا خواہ وہ مرض کی وجہ سے تھا یا پانی نہ ملنے کی صورت سے اس لئے جب مجبوری نہ رہی بیمار صحت مند ہو گیا تو اب احکام غسل واجب ہو گئے اس طرح اگر مسح کیا تھا لیکن پانی دستیاب ہو گیا تو مسح باقی نہ رہا۔ یہ جو رعایت دی گئی تھی یہ محض اس لئے تھی کہ اللہ کسی انسان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا کہ وہ درگزر کرنے والا اور بخش دینے والا ہے۔

اہل کتاب خصوصاً یہود کی طرح نیکی سے محبت کرنے کی بجائے اس سے عداوت نہ بنا لو

۹۵ نماز کے ذکر کے بعد سلسلہ بیان اہل کتاب کی طرف منتقل کیا جاتا ہے اور پیروان دعوت حق پر یہ حقیقت واضح کی جاتی ہے کہ جس طرح اللہ نے تمہاری فلاح و سعادت کیلئے احکام شریعت نازل کئے ہیں اسی

بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ
هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا
وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ
طَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ

اور اللہ تمہارے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہے اللہ کی دوستی اور اس کی مددگاری کافی ہے۔ ۹۶ ۴۵

اے پیغمبر اسلام! یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ لفظوں کو ان کی اصلی جگہ سے پھیر دیا کرتے ہیں اور اس خیال سے کہ دین حق کے خلاف طعن و تشنیع کریں زبان مروڑ مروڑ کر لفظوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں "سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" اور "اَسْمِعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" اور "راعنا" اگر یہ لوگ "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" اور "اسمع" اور "اُنْظُرْنَا" کہتے تو یہ ان کے حق

طرح تم سے پہلے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے لئے بھی نازل کئے تھے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ وہ راہ ہدایت سے منحرف ہوگئے۔ پس چاہئے کہ ان کی حالت سے عبرت پکڑو اور اخلاص و صداقت کے ساتھ احکام الٰہی پر کاربند ہو اور ساتھ ہی یاد دہانی بھی کرا دی کہ جب انسان نیکی اور پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی حالت کہاں تک پہنچتی ہے۔ پھر ان کی حالت کا انجام بتایا ہے کہ وہ نیکی کی راہوں کو چھوڑ کر نیکی سے محبت کرنے کی بجائے نیکی سے اس قدر عداوت اور بدی سے اس قدر محبت کرنے لگے کہ اب ان کو برائی کیلئے مال خرچ کرنا بھی ذرا محسوس تک نہیں ہوتا اس طرح مسلمانوں کو گویا یہ بتا دیا کہ کل تمہاری بھی یہی پوزیشن نہ ہو جائے کہ تم بھی اہل کتاب کی طرح پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر برائی کی راہوں کو شروع کر دو۔ ہوا کیا؟ جس سے منع کیا گیا تھا۔

اللہ تمہارے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہے لیکن تم نہیں جانتے

۹۶ اللہ کی دوستی کیا ہے؟ مخالفین کی ریشہ دوانیوں کا اثر زائل کرتے رہنا ہی اللہ تعالیٰ کی دوستی اور اس کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے کہ وہ مومن بندوں کی مصلحتوں کی رعایت کرتا رہتا ہے اور اس کا مددگار ہونا یہ ہے کہ وہ انہیں دشمنوں کی چالوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں سے بے

وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ ۙ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾ ۞ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا

میں بہتر ہوتا اور درستگی کی بات ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑ چکی ہے۔ پس ایک چھوٹے گروہ کے سوا اور سب ایمان سے محروم ہیں۔[۹۷] ۴۶

اے وہ لوگو کہ تمہیں کتاب دی گئی تھی! جو کتاب ہم نے نازل کی ہے اور جو اس کی

خبر نہیں ہے ان سے اور ان کی چالوں اور شرارتوں سے خوب واقف ہے وہ ان کی ہر شرارت کو ناکام بنا دے گا جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اس کیلئے اس کی حمایت و نصرت کافی ہے۔ تم اپنی راہ پر آگے بڑھے چلو اور اللہ کی کارسازی اور مدد پر پورا پورا بھروسہ رکھو وہ تم کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔

یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر جو وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے

[۹۷] یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر سورہ بقرہ اور آل عمران میں بڑی تفصیل سے گزر چکا ہے اور اس آیت میں بھی ان کی انہی شرارتوں کا ذکر ہے۔ کبھی وہ کوئی شرارت کرتے کبھی کوئی متعدد روایات میں بھی یہ بات آئی ہے کہ کچھ یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آتے تو السلام علیکم کی بجائے سام علیکم کہتے یعنی السلام علیکم کا تلفظ اس طرح کرتے کہ سننے والا سمجھے کہ سلام کہا ہے مگر دراصل وہ سام کہتے ہیں جس کے معنی موت کے ہیں۔ نبی اعظم و آخر ﷺ ان کو جواب دیتے تو صرف اتنا ارشاد فرماتے کہ "وعلیکم" یعنی انہوں نے کہا تمہیں موت آئے اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑے نبی کریم ﷺ نے جواباً صرف یہ ارشاد فرمایا کہ "تم پر ہی"۔ پھر جب اس سے زیادہ ان کو کچھ نہ کہا جاتا تو وہ اپنے دل میں یہ خیال کرتے کہ اگر یہ رسول ہوتا تو جس وقت ہم انہیں اس طرح سے سلام کرتے ہیں اس وقت ہم پر عذاب آجاتا۔ اب چونکہ عذاب نہیں آیا اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ وہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔" (المجادلہ ۵۸ : ۸) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"مسلمانو! پیغمبر اسلام کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو ان منکرین حق کی طرح یہ نہ کہو کہ "رَاعِنَا" بلکہ "اُنْظُرْنَا" کہو کہ ہماری طرف التفات کیجئے اور پھر وہ کچھ بھی کہیں اسے جی لگا کر سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ باقی رہے یہ منکرین حق تو یاد رکھو کہ انہیں ان کے اعمال کی پاداش میں دردناک عذاب ملنے والا ہے۔" (البقرہ ۲

: ۱۰۳) اور اس جگہ ان کی اس حرکت کا ذکر فرمایا کہ جب پیغمبر اسلام اور دوسرے مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ذو معنی اور مشتبہ الفاظ کہہ کر دل کا بخار نکالتے ہیں اور پھر ان کے اس بخار نکالنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ لفظوں کو ان کی اصلی جگہ سے پھیر دیا کرتے ہیں اور پھر جب تم سے ملتے ہیں تو اس خیال سے کہ دین حق کے خلاف طعن و تشنیع کریں زبان مروڑ مروڑ کر لفظوں کو بگاڑ دیتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں "سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" اور "اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" اور "رَاعِنَا" اگر یہ لوگ راست بازی سے محروم نہ ہوتے اور ان شرارت آمیز لفظوں کی جگہ "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" اور "اسمع" اور "اُنْظُرْنَا" کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور ان کیلئے یہ درستگی کی بات تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑ چکی پس ایک چھوٹے گروہ کے سوا باقی سب کے سب ایمان سے محروم ہیں۔

"اسمع غَيْرَ مُسْمَعٍ" کے لفظی معنی ہیں سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی اور اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سنئے۔ یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے' اس سے پہلے کبھی یہ بات ہم نے نہیں سنی' ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدر دانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدر دانی کیلئے ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (Hooting) کے انداز میں باندازِ تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا اس کی ان ہونی بات بھی سنو یہ کیسی بے پر کی اڑاتا ہے۔ ایسی بات کاہے کو کبھی کسی نے سنی ہوگی۔ اس طرح محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت عالی شان فقرے کو نہ صرف بے شان بنا دیا بلکہ اس میں تحقیر بھی داخل کر دی اور اس طرح اس کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی گرفت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ گرفت ہو تو کہنے والا اپنی صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو "غَيْرَ مُسْمَعٍ" کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لئے قرآن کریم نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف "اسمع" کہا جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

اسی طرح "رَاعِنَا" کے لفظی معنی ہیں کہ ذرا ہماری رعایت فرمایئے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کیلئے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "مکرر" یعنی ایک بار پھر ارشاد ہو' پھر فرما دیجئے اس طرح عربی زبان میں "رَاعِنَا" کہتے ہیں یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے لیکن یہودی اشرار "لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ" یعنی زبان کے توڑ موڑ کے ذریعہ سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے اس کی شکل یہ ہوتی کہ "رَاعِنَا" کے کسرہ کو ذرا دبا دیتے تو یہ لفظ "رَاعِيْنَا"

بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا

تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے اس پر ایمان لاؤ۔ [۹۸] اس وقت سے

ہو جاتا اور اس طرح اس کے معنی ہوں گے "اے ہمارے چرواہے" قرآن کریم نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کی مجلسوں کی زینت بننے سے روک دیا اور اس کی جگہ "اُنْظُرْنَا" کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں کہ ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو۔ ذرا پھر توجہ فرمایئے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک لفظ "رَاعِنَا" کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجہ کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کئے جانے کا کوئی امکان بھی باقی نہیں رہتا اس لئے کہ یہ لفظ ذو معنی نہیں ہے۔ اس طرح گویا مجلسی آداب کی طرف سے بھی اسلام نے توجہ دلا دی کہ وہ کتنے ضروری ہیں اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا جو ذو معنی ہوں اور خصوصاً جب ایک معنی جتنے اچھے ہوں دوسرے معنی اتنے ہی برے اور یہ بھی بتا دیا کہ الفاظ کے ادا کرنے اور لب و لہجہ کے بدل کر لفظوں کو ادا کرنے کا مطلب کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس طرح کے الفاظ ذو معنی ہوتے ہیں کہ "ہمارے ہاں آؤ گے تو تمہاری وہ خاطر و مدارات کریں گے کہ تم یاد رکھو گے۔" آجاؤ تمہارے کھانے کا انتظام ہم نے کر دیا ہے۔" "آؤ گے تو یاد رکھو گے کہ کس نے بلایا تھا۔" "اچھا تم بھی کیا یاد کرو گے۔" وغیرہ وغیرہ پھر آیت کے آخر میں بتا دیا کہ تم بھی عجیب انسان ہو کہ حامل کتاب گروہ ہو کر یہ جسارت اور بدتمیزی جو آخری پیغمبر اسلام کے ساتھ تم لوگ کر رہے ہو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی نتیجہ ہی برآمد نہ ہو یاد رکھو کہ اس استہزاء و مذاق کا مزہ تم کو چکھنا ہوگا اور یہ کہہ کر گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیا۔

اس آیت میں ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہود کی یہ تمام شرارتیں تھیں تو نبی اعظم و آخر ﷺ پر طنز کی نوعیت کی لیکن قرآن کریم نے ان کو "طَعْنًا فِی الدِّیْنِ" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ نبی کیا ہے؟ درحقیقت مجسمہ دین ہے اور مظہر شریعت ہے اس وجہ سے اس پر طعن کرنا خود دین پر طعن کرنا ہے اگر یہ نکتہ یاد رہے تو بہت سے لوگوں کی دریدہ دہنیوں کا جواب خودبخود اس میں آجاتا ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو احادیث پر اعتراض و طنز اور استہزاء و مذاق کرتے ہیں ان کا جواب ہے کہ وہ رسول پر نہیں دراصل وہ اسلام کے بخیہ کو ادھیڑنا چاہتے ہیں۔

اپنی بنائی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی طرف آؤ

[۹۸] "کتاب اللہ" سے مراد اس جگہ "قرآن کریم" بھی ہو سکتا ہے اور "توراۃ" بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کو دی گئی کتاب اللہ یعنی قرآن کریم کی طرف آؤ اس لئے کہ اب یہ

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝۴۷ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ

پہلے ایمان لے آؤ جب ایسا ہو کہ ہم لوگوں کے چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں۔ یا ایسا ہو کہ جس طرح سبت والوں پر ہماری پھٹکار پڑی تھی اسی طرح ان پر بھی پھٹکار پڑے اور اللہ نے جو کچھ فیصلہ کر دیا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ ۴۷

اللہ یہ بات کبھی بخشنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک ٹھہرایا

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری ہدایت ہے جس کے بعد کوئی اور ہدایت اللہ کی طرف سے نہیں آئے گی اور اگر اس سے "توراۃ" مراد ہے تو بھی بات وہی ہے کہ اگر تم توراۃ کے احکام کو مان لو تو قرآن کریم کی تعلیمات سے انکار کر ہی نہیں سکتے اس لئے کہ قرآن کریم میں وہی بیان ہے جو توراۃ میں تھا کوئی نئی تعلیم نہیں ہے ہاں! وہ چیزیں اور باتیں جو تم نے توراۃ میں داخل کر لی ہیں حالانکہ ان کا تعلق توراۃ سے نہیں ہے قرآن کریم ان کی نشاندہی کرتا ہے اور پھر وہ صرف تمہاری ہی اس طرح کی بد اعتدالیوں کا ذکر نہیں کرتا وہ ہر ایک کی بداعتدالیوں کو درست کرنے کیلئے آیا ہے۔ اگر تم اپنی اپنی کتابوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں ان کی تعلیمات کو صحیح صحیح مان لو تو قرآن کریم سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ تمہاری کتابوں میں نبی اعظم و آخر ﷺ کی آمد کی خبر محفوظ ہے اور تمہارا اپنی اپنی کتابوں کو مان لینا محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول مان لینا لازم قرار پا جاتا ہے اور اس طرح تم نے گویا محمد رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے اپنے انبیاء کرام اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات سے بھی انحراف کیا ہے۔

دعوت پیش کرنے کے بعد منکرین دعوت کو ساتھ ہی سزا بھی سنائی جا رہی ہے

۹۹ "اس وقت سے پہلے ایمان لے آؤ جب ایسا ہو کہ ہم لوگوں کے چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں۔" اس طرح چہروں کے مٹا دینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آنکھ' کان' ناک اور منہ کے نشانات ہیں یہ سب مٹا کر برابر کر دیئے جائیں پھر غور کرو کہ وہ شکل کیا شکل ہوگی؟ نہایت ہی بری اور بھونڈی ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا یہ قوتیں جو تم کو ان اعضاء کی صورت میں دی گئی تھیں ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا تم نے اس مقصد کو پورا کیا؟ نہیں تو پھر جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کام کیلئے ان کو بنایا گیا تھا بلکہ ان کو تم نے ٹھوکر کے گڑھے بنا دیا تو اب ضروری ہے کہ ان کی اصل صورتوں کو بھی اس کے مطابق کر دیا جائے اور اس طرح کے یہ گڑھے آخر کیوں رکھے جائیں؟ اور یہ بھر کیوں نہ دیئے جائیں؟ ان کا جواب سورہ البقرہ میں "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کے الفاظ

میں دیا جا چکا ہے اور وہاں ان کی تشریح بھی کر دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ رکھتے ہوئے جب بہرے، گونگے اور اندھے ہو کر رہ گئے ہیں تو پھر یہ اس کے سزاوار ہیں کہ ان کے ظاہری نشانات بھی مٹا دیئے جائیں اور جس طرح انہوں نے انسانیت کے اصل کو ضائع کیا ہے ان کی شکل و صورت کو ضائع کر دیا جائے۔

"فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا" کے الفاظ سے گزشتہ الفاظ کی مزید تشریح فرما دی کہ جب ان کے چہرے اور گدی میں کوئی فرق ہی نہیں اور ان کا پچھلا اور اگلا حصہ دونوں ایک ہی طرح کے ہو کر رہ گئے ہیں تو پھر یہ بہتر ہے کہ ان کو ایک ہی جیسا کر دیا جائے اور ان کے چہرے چہرے نہ رہیں بلکہ گدی ہی بنا دیئے جائیں اور یہ عبارت ہے اس بات سے کہ جب چہرہ چہرہ ہی نہ رہا تو اب اس کی چہرے جیسی حفاظت کیوں ہوگی؟ گویا یہ مضمون ان کی اس شقاوت پر دال ہے کہ ان کے منہ سے نکلنے والی بات اور پاخانہ کی جگہ سے سرنے والی ہوا ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں کہ جو منہ میں آیا بک دیا گویا ان کے منہ اور پیٹھ میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ یہ ان کی اس تغیر حالت کیلئے الفاظ بولے گئے ہیں۔ یہ تغیر کیا ہے کہ جس نے ان کو صحیح معنوں میں ذلیل و رسوا کر دیا ہے؟ ان کی وجاہت اور اقبال جب سلب ہوگیا تو ان کی ایسی ہی حالت ہوگئی یعنی یہ محاورہ ہے ان کی اس حالت کا جب وہ اوصاف انسانی سے عاری ہوگئے اور اس طرح کے محاورات قرآن کریم میں عام و تام بیان ہوئے ہیں۔

"أَصْحَابَ السَّبْتِ" وہی ہیں جن کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۶۵ میں گزر چکا اور ہم نے اس کی تفصیل بھی اس جگہ بیان کر دی ہے۔ ان سارے الفاظ اور اس مضمون میں یہود کو بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اس طرح عداوت اور قساوت قلبی پر اڑے رہے تو ان کا انجام نہایت ہی برا ہوگا اور پھر برے انجام کیلئے دو سزائیں بیان کی گئی ہیں پہلی یہ کہ وہ ذلیل و خوار کر دیئے جائیں گے جیسے بندر اور سور ذلیل و خوار ہیں اور دوسری سزا یہ ہے کہ وہ اللہ کی لعنت کے مستحق قرار پائیں گے اور یہ اس وقت ہی ہوتا ہے جب کوئی قوم یا کوئی شخص اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جائے اور رحمت الٰہی سے دوری وہ عذاب ہے جس سے بڑا کوئی عذاب دنیا و آخرت میں نہیں ہوگا اور یہی کچھ یہود کے ساتھ ہوا۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ وہی یہود جو پوری دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ جن کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا کی گئی تھی ان کا ایک حصہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے مستحق لعنت قرار پاگیا اور باقی ماندہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ذلیل و خوار کر دیا گیا اور ان پر وہ وقت آیا کہ ساری دولت کے باوجود وہ دربدر دھکے کھاتے پھرے اور ان کے رہنے کی کوئی جگہ ان کو میسر نہ آسکی اور بدقسمتی ہے آج وہی صورت حال خود مسلمانوں کی ہوتی چلی جا رہی ہے کیوں؟ اس لئے کہ آج وہ بھی انہی حرکات کے مرتکب ہوئے جن کے یہود مرتکب ہو چکے تھے اس لئے یقیناً وہ بھی اس سزا کے مستحق تھے جو یہود کو دی جا چکی تھی اور یہی وہ سزا ہے جو اصحاب سبت کو سنائی گئی تھی کہ وہ اوصاف انسانی سے عاری ہوگئے تو ان کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ان حیوانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کو بندر اور سور کہتے ہیں۔ اسی طرح ان

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۞ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ

جائے۔ ہاں! اس کے سوا جتنے گناہ ہیں وہ چاہے تو بخش دے اور دیکھو جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے تو یقیناً وہ بڑا گناہ کرتا ہے' افتراء پردازی کرتا ہے۔ ۴۸

اے پیغمبر اسلام! تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جو اپنی پاکیزگی کا بڑا گھمنڈ

پر بھی وہی پھٹکار پڑی جو ان کے آباو اجداد پر پڑ چکی تھی اور ان پر اللہ کا ویسا ہی عذاب نازل ہوا جیسا کہ ان کے آباؤ و اجداد پر نازل ہو چکا تھا لیکن ان کے ساتھ ہوا جو ہوا اور آج ہم نے ان کے اس عذاب سے کیا سبق حاصل کیا کہ خود اس عذاب میں پھنس کر رہ گئے کیا آج ہماری حرکات وہی ہیں جو انسانوں کی ہیں؟ یا ہم خود حیوانوں سے بھی بہت آگے نکل چکے ہیں۔

شرک سے بڑا کوئی گناہ اور مشرک سے بڑا کوئی گنہگار نہیں ہوتا

۱۰۰ یہود و نصاریٰ بلاشبہ اہل کتاب ہیں اور اس رشتہ کی بناء پر اسلام نے ان کا اتنا احترام کیا کہ ان کے ساتھ کھانا پینا اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز قرار دیا گیا لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ وہ مشرک نہ ہوں۔ جب وہ مشرک ہوئے یا جو جو ان میں شرک کا مرتکب ہوا وہ اس بنیادی قاعدہ سے بھی خود بخود نکلتا چلا گیا زیر نظر آیت اس بات پر مکمل اور واضح دلیل ہے کہ اہل کتاب کا بہت گروہ بڑا مشرک ہو گیا تھا اور اس لحاظ سے وہ عرفاً اہل کتاب نہیں رہے تھے بلکہ مشرک ہو کر اہل کتاب سے خود بخود خارج ہو گئے تھے رہی یہ بات کہ یہود کا شرک کیا تھا؟ ان کے اس شرک کی نشاندہی آنے والی آیات میں کرا دی گئی ہے اس زیر نظر آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھ لو کہ شرک ساری برائیوں کی گویا جڑ ہے اور ساری برائیاں اس سے معرض وجود میں آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے گویا یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ شرک کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا جبکہ وہ اس شرک کی حالت میں مر گئے اور توبہ ان کو نصیب نہ ہوئی۔ ہاں! کوئی شخص گناہوں میں کتنا ہی لت پت کیوں نہ ہو جب اس نے شرک سے توبہ کر لی یا شرک کا مرتکب نہ ہوا تو اس کی نجات یقینی ہے چاہے سزا پانے کے بعد یا سزا بھی اس کی معاف کر دی جائے ہر حال میں وہ اس سزا میں نہیں آتا جس کی عدم معافی کا اعلان کر دیا گیا ہے اور وہ شرک ہی ہے۔ شرک پر کوئی مرنے والا ہو یعنی وہ یہودی ہو عیسائی ہو یا کوئی مسلمان کہلانے والا ہو اگر اس پر شرک کی سزا لازم ہو گئی تو سمجھ لو کہ وہ ابدی دوزخ کے عذاب میں مبتلا کر دیا گیا جس سے خلاصی و نجات کی اب کوئی سبیل باقی نہ رہی۔

افسوس کہ آج مسلمانوں کو اس آیت کا حکم بہت کم ہی یاد رہا اور وہ اہل کتاب کو اہل کتاب ہی سمجھتے

ہیں جبکہ وہ کھلے شرک کے مرتکب ہونے لگے اور یہ کہا گیا کہ کیا اللہ میاں اتنی بات بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ اہل کتاب اہل کتاب نہیں رہے بلکہ مشرک ہوگئے اور اس شرک کے سبب ان کے ساتھ کھانا پینا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ رہا۔ ہاں! یہ بات اب بھی اپنی جگہ قائم اور اس کا حکم باقی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اہل کتاب اہل کتاب رہیں مشرک نہ ہو جائیں کیونکہ شرک سے بڑا نہ کوئی اور ظلم ہے اور نہ اس سے بڑا کوئی گناہ ہے۔

اس آیت نے مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ وہ اچھی طرح یہ اصول یاد کر لیں کہ شرک سب برائیوں کی جڑ ہے اور توحید سب نیکیوں کی جڑ ہے لہٰذا شرک سے پرہیز کریں۔ شرک کیا ہے؟ یاد رہے کہ صرف بتوں' چاند' سورج' ستاروں اور ہواؤں وغیرہ کو پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ یہ شرک کی وہ موٹی قسم ہے جس میں بت پرست اور عناصر پرست قومیں گرفتار ہیں اور نہ صرف یہی شرک ہے کہ انسان کو فی الواقع خدا سمجھا جائے جیسے ہندو' کرشن یا رام چندر کو سمجھتے ہیں یا عیسائی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بلکہ ان سارے شرکوں سے بڑا وہ شرک ہے جو احبار و راہبان پرستی سکھاتا ہے اور آج کی زبان میں پیر پرستی اور علماء پرستی سے اس کو موسوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ جس کو حلال کہہ دیتے ہیں لوگ اس کو حلال اور جس کو وہ حرام کہہ دیتے ہیں لوگ اس کو حرام کہتے ہیں اور ان کا اس طرح کہنا ان کی خواہشات اہوا کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی دلیل کی بناء پر۔ کیونکہ دلیل تو کتاب و سنت ہے لوگوں کے قصے کہانیوں کا نام دلیل نہیں رکھا جا سکتا اور اس وقت سارے شرکوں سے بڑا شرک جو دنیا میں اور خصوصاً خود مسلمان کہلانے والوں میں پایا جاتا ہے وہ وہ ہے جس کو قرآن کریم کی زبان میں اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

"کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے ہیں۔" (الفرقان ۲۵ : ۴۳' ۴۴)

خواہش نفس کو خدا بنا لینے سے مراد اس کی بندگی کرنا ہے اور یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی شرک ہے جیسا بت کو پوجنا یا کسی مخلوق کو معبود بنانا۔ حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ نے فرمایا ما تحت ظل السماء من اله يعبد من دون الله تعالىٰ اعظم عند الله عزوجل من هوى يتبع "اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے معبود بھی پوجے جا رہے ہیں ان میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ خواہش نفس ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔"

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہے اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہے کہ اس کیلئے صحیح راہ کونسی ہے اور غلط کونسی وہ اگر کسی قسم کے شرک یا کفر میں مبتلا ہو تو اس کو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے اور یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ راہ راست اختیار

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ

رکھتے ہیں' حالانکہ یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ جسے چاہے' پاک و صاف کر دے اور رائی برابر بھی کسی پر ظلم نہیں[۱۰۱] ہوگا۔ ۴۹ دیکھو! یہ لوگ اللہ پر کس طرح صریح بہتان باندھ رہے ہیں؟

کرنے کا فیصلہ کر لے گا تو اس پر ثابت قدم رہے گا لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شتر بے مہار ہے اسے تو اس کی خواہشات جدھر لے جائیں گی وہ ان کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرے گا اس کو سرے سے یہ فکر ہی نہیں ہے کہ صحیح اور غلط اور حق و باطل میں تمیز کرے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرے اور ایسا مشرک قبر پرست اور پیر پرست یا بت پرست نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی سمجھ میں یہ بات بھی مشکل ہی سے آتی ہے کہ وہ بھی مشرک ہے وہ شرک کے خلاف وعظ کرے گا اور مشرک کو برا جانے گا اور شرک کی ساری اقسام سے بچے گا الا یہ کہ اس کی خواہش کی بات ہوگی تو پھر اس کی ساری مت ماری جائے گی اور وہ کچھ سمجھنے والا نہیں ہوگا اور بالفرض اگر وہ بات مان بھی جائے تو اسے کسی ضابطہ اخلاق کا پابند بنا دینا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ یہ شرک ایک طرح کے خاص مشرکین کا شرک تھا لیکن عوام کا شرک بھی بڑا عجیب شرک ہے۔

قرآن کریم نے ان کی مثال اس طرح بیان کی ہے کہ جس طرح بھیڑ بکریوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ ہانکنے والا انہیں چراگاہ کی طرف لے جا رہا ہے یا کمیلہ کی طرف بس وہ آنکھیں بند کر کے ہانکنے والے کے اشارے پر چلتی رہتی ہیں اس طرح یہ عوام الناس بھی اپنے مذہبی بے راہ رووں اور اپنے گمراہ کن لیڈروں کے اشاروں پر آنکھیں بند کئے ہوئے چلے جا رہے ہیں کچھ نہیں جانتے کہ وہ انہیں فلاح کی طرف ہانک رہے ہیں یا تباہی و بربادی کی طرف۔ اس حد تک تو ان کی حالت بھیڑ بکریوں کے مشابہ ہے لیکن بھیڑ بکریوں کو اللہ نے عقل و شعور سے نہیں نوازا ہے وہ اگر چرواہا اور قصائی میں امتیاز نہیں کرتیں تو کچھ عیب نہیں البتہ حیف ہے ان انسانوں پر جو اللہ سے عقل و شعور کی نعمتیں پا کر بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں کی سی غفلت اور بے شعوری میں مبتلا کر لیں۔

شرک کی ایک اور راہ کہ "ہم چوما دیگرے نیست" جس میں یہود و نصاریٰ بھی مبتلا تھے

[۱۰۱] اقسام شرک میں سے ایک قسم شرک کی یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ یا انسان سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بات واضح ہو گئی ہے یا راسخ کر دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد ہیں اس لئے وہ بھی اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ ان کیلئے اللہ کے ہاں کوئی باز پرس یا سزا نہیں ہے۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اگر ڈالے بھی گئے تو محض تھوڑی مدت کیلئے۔ اس گھمنڈ نے ان کو عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے زمرے میں داخل کر لیا ہے حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو

يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى

ان کی آشکارا گناہ گاری کیلئے یہی ایک بات بس کرتی ہے۔ ۵۰

برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں فرمائی ہے جس کو بزرگی عطا ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ نے اس چیز کو ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ نسل و نسب سے۔ ہر شخص جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اللہ ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ اپنی برتری کا یہ عقیدہ جو انہوں نے گھڑا ہے یہ ان کا اپنا طبع زاد ہے اس کو اللہ سے جو وہ منسوب کرتے ہیں تو یہ اللہ پر بالکل ایک جھوٹا افتراء ہے ان کے مجرم ہونے کیلئے دوسرے جرائم سے قطع نظر یہی جرم کافی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس جرم میں بھی صرف یہود و نصاریٰ ہی مبتلا نہ تھے بلکہ آج مسلمان کہلانے والوں میں بھی ایک خاص طبقہ اس شرک میں مبتلا ہے اور اس طرح یہ سارے پیرزادے، صاحبزادے اور سجادہ نشین اور گدی نشین اس شرک میں مبتلا ہیں اور جو شخص بھی "ہم چوما دیگرے نیست" کی ڈینگیں مارے گا وہ اس شرک میں مبتلا پایا جائے گا، تب ہی اس کے نظریہ میں بات آئے گی اور اسلام کی نظر میں اس کی حیثیت ایک ڈنگر ڈھور سے زیادہ نہیں ہے خواہ وہ کوئی ہے اور لوگ اس کو کچھ سمجھیں۔

اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارنے والے اس طرح اللہ پر گویا بہتان باندھ رہے ہیں

۱۰۲ اپنی پاکیزگی اور بڑائی کی بات دوسروں سے سن کر آدمی اس گناہ میں مبتلا ہو سکتا ہے جس کا ایک سرا شرک کے اندر پھنسا ہوتا ہے اور جو شخص اس حد سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو پاک اور برگزیدہ کہنا شروع کر دے اس کے مرض میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ اللہ پر کس طرح صریح بہتان باندھ رہے ہیں اسلام نے ایک دوسرے کی تعریف اس کے منہ پر کرنے کو اس لئے منع فرمایا تھا کہ اس کے غلط نتائج برآمد ہونے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مقداد بن الاسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ "ہم مدح کرنے والے کے منہ میں مٹی پھینکیں" اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا ویحک قطعت عنق صاحبک "تجھ پر افسوس ہے تو نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔" پھر فرمایا اگر اپنے دوست کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میں اسے ایسا سمجھتا ہوں۔

کسی شخص کے گناہگار ہونے کیلئے یہ بات ہی کافی ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاک اور برگزیدہ سمجھے کیونکہ یہ بات بذاتہ اپنے اندر تکبر و غرور کے انبار رکھتی ہے اور اگر کوئی فی الواقعہ نیک یا برگزیدہ انسان ہے تو آخر وہ ایسا دعویٰ کیوں کرے گا جو خلاف تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ كَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا یہ اس بات کیلئے کافی ہے کہ وہ گناہ گار ہے جو اپنی پاکیزگی کا خود ہی اعلان کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝

اے پیغمبر اسلام! کیا تم ان لوگوں کا حال نہیں دیکھتے جنہیں کتاب اللہ سے ایک حصہ دیا گیا تھا؟ وہ بتوں کے اور شریر قوتوں کے معتقد ہوگئے اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ یہی لوگ سیدھے راستے[۱۰۳] پر ہیں۔ ۵۱

وہ جن کو کتاب اللہ دی گئی لیکن اس کے باوجود وہ شرک کے مرتکب ہوئے

۱۰۳ اس آیت میں ایک دوسرے گروہ کے شرک کا بیان ہے جو کتاب اللہ کے حامل ہونے کے باوجود جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اعمال سفلیہ کے عامل بھی ہیں اور ان پر عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔ اعمال سفلیہ کیا ہیں؟ وہی دھوکا اور فریب کاریاں جو پچھلے لوگ کرتے آئے ہیں وہ یہ بھی کرتے ہیں کیونکہ ان کا اصل تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواح خبیثہ سے ہوتا ہے اور انہی کو اس جگہ طاغوت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان اعمال کے درپے ہیں اول تو وہ ارواح خبیثہ کو بالذات موثر مانتے ہیں پھر ان سے تعلق پیدا کرنے اور ان کو اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کیلئے ان کو نہ صرف خلاف شرع بلکہ صریح مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جس سے عقیدہ اور عمل دونوں یک قلم تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ان سے طاغوت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کھان ینزل علیھم الشیطان (بخاری) یہ کاہن ہیں جن پر شیطان اترتے ہیں اور اس میں یہ بھی ہے کہ ہر ایک قبیلہ میں ایک کاہن تھا جس سے وہ فیصلہ کراتے تھے۔

یہود کے متعلق مزید وضاحت کہ کس طرح حق سے انحراف کرتے کرتے ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ صریح کفر پر مائل ہوگئے چنانچہ اس آیت میں يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت تک عربوں میں رہ کر عربوں کی بت پرستی اور کہانت پر یہودیوں کا بھی اعتقاد ہوگیا تھا اور یہی حال ہر قوم کا ہوتا ہے جو حق کے پھیلانے پر زور نہیں لگاتی کہ آہستہ آہستہ دوسروں کے اثر کے نیچے آنا شروع ہو جاتی ہے اور یہودی جو عرب میں توحید کا پیغام لے کر آئے تھے بجائے اس کے کہ بت پرستوں کو توحید کی طرف لاتے خود بت پرستی اور کہانت پر لگ گئے۔ آج اس کی مثال مسلمانوں میں بھی اکثر و بیشتر ملتی ہے۔ جب تک وہ دوسروں کو توحید سکھانے پر زور لگاتے تھے ان کے خیالات ہندوؤں میں اثر کرتے چلے گئے مگر جب انہوں نے اس کو ترک کر دیا تو ہندوؤں کے بہت سے خیالات ان میں

رواج پا گئے حتیٰ کہ بعض صوفیوں کے گروہ ایسے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی دعاؤں اور وظیفوں کو لے لیا ہے اور ہندوؤں کے رسم و رواج اکثر مسلمانوں میں آگئے۔ یہ پیر پرستی اور قبر پرستی جو مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے وہ بھی دراصل بت پرستی کا ہی ایک رنگ ہے۔

پھر اس بیماری کا ذکر فرمایا کہ لوگ اکثر اوقات جس طرف کو بھاری دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ہو کر ان کو دبانے لگتے ہیں جو کمزور ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ کمزور ان کے خیال میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور بھاری بھرکم لوگوں کے ہاں میں ہاں نہ ملانے سے اکثر نقصان ہوتا ہے اور یہ لوگ اس نقصان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک سچ وہی ہے جو بڑے لوگوں کی زبان سے نکلے اور سچ وہی ہے جو بڑے لوگوں کے عمل میں آئے۔ قرآن کریم کہتا ہے دیکھو یہ اہل کتاب ہیں جو نبیوں کی تصدیق کرتے ہیں اور اللہ کی کتابوں کو اللہ ہی کی کتاب تسلیم کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کے متعلق کہتے ہیں کہ ان مسلمانوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت پر ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ مکہ میں اکثریت ان کی ہے اور پھر یہ لوگ اکثریت میں بھی ہیں اور دنیا والوں کی نگاہوں میں مال دار اور عزت والے بھی۔ بس ان کو یہ بات کہنے میں ان کی یہ ظاہری حالت آڑے آگئی اس لئے وہ ان وڈیروں اور مال دار لوگوں کو جو دنیا میں بھی بڑی عزت و تکریم کے مالک ہیں مسلمانوں سے بہتر جانتے ہیں اور پھر وہ بھی دین کے معاملہ میں حالانکہ کفار مکہ وہ لوگ ہیں جو نہ انبیاء کرام کو مانتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا روز قیامت پر ان کا ایمان ہے۔

حدیث میں ہے کہ مدینہ کے رؤسا حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف مکہ میں اہل مکہ کے پاس آئے تو مکہ والوں نے ان سے کہا کہ تم بتاؤ اس لئے کہ تم اہل کتاب بھی ہو اور اہل علم بھی کہ ہمارا دین اچھا ہے یا محمد (ﷺ) کا انہوں نے سوال کیا کہ تم کیا ہو اور محمد کیا ہیں؟ قریش مکہ نے جواب دیا کہ ہم وہ ہیں جو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ حاجیوں کو دودھ اور پانی ملا کر پیش کرتے ہیں اور ان کو ستو گھول کر پلاتے ہیں اور قیدیوں کو بھی چھوڑاتے ہیں۔ محمد ﷺ وہ ہیں کہ ان کی کوئی اولاد نہیں انہوں نے ہمارے ارحام کو قطع کیا ہے اور حاجیوں میں جو چور اچکے ہیں وہ ان کے تابع ہوگئے ہیں اب تم فیصلہ کرو کہ ہم دونوں فریقوں میں بہتر کون ہے؟ سرداران مدینہ یعنی حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف نے کہا کہ "تم ہی ان کی نسبت زیادہ ہدایت پر ہو۔" چنانچہ یہی مضمون زیادہ تفصیل کے ساتھ سورہ المائدہ میں بیان ہوا جہاں فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو اہل ایمان کے مقابلہ میں کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے۔ اللہ ان پر غضب ناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر ﷺ اور اس چیز کو ماننے والے ہوتے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی تھی تو کبھی اہل ایمان کے مقابلہ میں کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں تو بیشتر لوگ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری سے نکل چکے ہیں۔" (المائدہ ۵ : ۸۰، ۸۱)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ
نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ
نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن

یقین کرو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی مار پڑی اور جس کسی پر اللہ کی مار پڑ گئی تو ممکن نہیں کہ تم کسی کو اس کا مددگار پاؤ۔ ۵۲

تو پھر کیا یہ بات ہے کہ ان کے قبضے میں بادشاہت کا کوئی حصہ آگیا ہے اور اس لئے نہیں چاہتے کہ لوگوں کو رائی برابر بھی کچھ مل جائے؟ ۵۳

یا پھر اللہ نے اپنے فضل سے لوگوں کو جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کا انہیں حسد ہے؟ اگر

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کو ماننے والے ہیں انہیں فطرتاً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں ان سے خواہ اختلاف ہی رکھتے ہو مگر بہرحال ان کی طرح اللہ اور اس کے رسول اور سلسلہ وحی کو مانتے ہیں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہل کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اقرار نبوت اور انکار نبوت کی لڑائی میں اعلانیہ ان کی ہمدردیاں منکرین نبوت کے ساتھ ہیں اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیاء کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم اللہ اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔"

یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی مار کے مستحق ٹھہرے اب ان کا مددگار کون ہو سکتا ہے؟

۵۲ اس طرح وہ اللہ کی لعنت کے مستحق ٹھہرے اور جس پر اللہ کی لعنت کی پھٹکار پڑے پھر وہ کون ہے جو اس کی پھٹکار سے اس کو بچا لے۔ یعنی مشرک قوموں اور قبیلوں نے اللہ کے ساتھ ساتھ جو اپنے حمایتی اور بھی بنا رکھے ہیں وہ بھی ان کو اللہ کی اس لعنت سے بچا نہیں سکیں گے۔ اس بات کی تشریح پیچھے بہت سے مقامات پر گزر چکی ہے کہ اللہ کی لعنت کیا ہے؟ یہی کہ وہ رحمت الٰہی سے دور کر دیئے گئے اور اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے جانے والوں کیلئے کوئی بھی حمایتی اور مددگار نہیں ہوگا۔ یہی بات اس جگہ زیر نظر آیت میں بیان کی گئی کہ فرمایا "یقین کرو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی مار پڑی اور جس کسی پر اللہ کی مار پڑی تو ممکن نہیں کہ تم کسی کو اس کا مددگار پاؤ۔"

فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا

یہی بات ہے تو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی تھی اور ساتھ ہی بڑی بھاری

یہود کو اگر دنیا کی سیادت مل جاتی تو اس میں وہ کسی کو شریک نہ کرتے

۱۰۵ نَقِيْرًا۔ ن ق ر سے ہے جس کے اصل معنی کریدنے کے ہیں اور اس سے منقار ہے اور منقار جانور کی چونچ کو کہتے ہیں جس سے وہ زمین وغیرہ کو کریدتا ہے اور اس آلہ کو بھی جس سے چکی وغیرہ راہی جاتی ہے اور اس جگہ نقیر سے مراد وہ کریدی ہوئی جگہ ہے جو کھجور کی گٹھلی میں ایک چھوٹی سی لکیر کی مانند گہرائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی طرف نسبت دے کر کہیں فتیل اور کہیں نقیر کا لفظ استعمال کیا ہے مراد اس سے حقیر سے حقیر اور تھوڑی سے بھی تھوڑی چیز ہے جیسے ہماری زبان اردو میں ایک رائی برابر یا رتی بھر کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں اس وجہ سے شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں "تل بھر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی یہود کی اپنی حالت یہ ہے کہ روحانی عظمت تو الگ رہی اگر ان کو دنیوی امارت و سیادت نصیب ہوتی تو یہ اتنے بخیل اور تنگ دل لوگ ہیں کہ اس میں بھی کسی کو شریک نہ ہونے دیتے بلکہ لوگوں کے حقوق تک ادا نہ کرتے اور اسی تنگ دلی اور بخیلی کے باعث وہ دنیا کے اقتدار سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں اور محروم ہی رہیں گے اور کہیں کچھ ٹھکانا پائیں گے بھی تو وہ دوسروں کے سہارے اور دوسروں کے سہارے زندہ رہنے والے درحقیقت مردہ ہی ہوتے ہیں اور قوموں کی زندگی اور موت کا مطلب یہی ہے کہ جو قوم برسر اقتدار ہے اور ان کا اقتدار دوسروں کے سہارے نہیں بلکہ اپنی قومی طاقت کے بل بوتے پر ہے وہ قوم زندہ ہے اور جو دوسروں کے سہارے برسر اقتدار ہے وہ اسلام کی زبان میں مردہ ہے۔ آج قوم مسلم کو بھی اپنا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ کیا آج وہ زندہ قوم ہیں یا یہود کی طرح وہ بھی قومی حیات کو ضائع کر بیٹھے ہیں؟

اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہود کو یہ حسد کھا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ بنی اسماعیل سے کیوں؟ وہ بنی اسرائیل سے کیوں نہیں؟ اور یہ لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ نبوت من اللہ چیز ہے جس کا تعلق کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نبوت عطا کرنے والا ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی نبوت و رسالت کا منصب کس کو عطا کرے اور پھر جس کو وہ عطا کر دیتا ہے اس کی عطا کو کوئی روک نہیں سکتا اور یہ بھی کہ بنی اسماعیل بھی ذریت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں کہیں باہر سے تو نہیں آئے۔ پھر اس آیت نے یہ سبق و درس بھی دیا کہ جس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت و اقتدار عطا فرما دے اس کو بہت وسیع النظر اور عریض القلب ہونا چاہئے اگر وہ ایسا ہوگا تو اس کی بادشاہت اور اقتدار دیرپا ہوگا۔ دیکھو دنیا کے انسانوں میں سے جو وسعت قلب اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیا وہ کسی دوسرے انسان کے حصے میں نہ آیا اس لئے آپ ﷺ کا اقتدار نبوت ابد الاباد رہے گا جب تک نظام دنیا قائم ہے وہ بھی قائم رہے گا بلکہ ہر وہ شخص جو اس اقتدار نبوت میں قدم رکھے گا تباہ و برباد کر دیا

عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ

سلطنت بھی عطا فرمائی تھی۔[۱۰۶] ۵۴

پھر ان میں سے کوئی تو ایسا ہوا جس نے اس پر یقین کیا۔ کوئی ایسا ہوا جس نے روگردانی

جائے گا۔

الٰہی فیصلے ایسے فیصلے نہیں ہیں جن کو دنیا کے حاسد روک لیں

[۱۰۶] حسد کرنے والوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ حاسد ہمیشہ اپنا نقصان کرتا ہے جس پر حسد کیا جاتا ہے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا اور یہ اتنا بڑا پکا اصول ہے کہ تم ایک ایک حاسد کا تجزیہ کر دیکھو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ نقصان میں ہمیشہ وہی رہے جنہوں نے حسد کیا۔ ہاں! اگر حسد دونوں طرف سے شروع ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے اس لئے جس کا حسد کیا جائے اس کو یہ یقین کرنا چاہئے کہ حاسدین کا اپنا نقصان ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں مشرکین مکہ کی ہلاکت کا باعث بھی ان کا حسد ہی تھا اور یہود و نصاریٰ کی ہلاکت کا باعث بھی وہی۔ کیونکہ مشرکین مکہ جن نفسیاتی وجوہ سے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے ان میں بھی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس طرح انہیں آپ کا فضل و شرف ماننا پڑتا تھا اور اپنے کسی معاصر اور ہم چشم کا فضل ماننے کیلئے انسان مشکل ہی سے آمادہ ہوا کرتا ہے۔ اس پر پیچھے فرمایا گیا کہ جن لوگوں کی بخیلی کا یہ حال ہے کہ کسی کے واقعی مرتبے کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کا دل دکھتا ہے انہیں اگر کہیں اللہ نے اپنے خزانہائے رحمت کی کنجیاں حوالے کر دی ہوتیں تو وہ کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے۔ اس مضمون کو سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو کہ اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔"

(بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۰۰)

نبی اعظم و آخر ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کا خطاب عطا فرمایا کیوں؟ اس لئے کہ آپ ﷺ فی الواقع تمام جہانوں کیلئے رحمت تھے کہ آپ ﷺ میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو سابقین انبیائے کرام میں سے کسی میں کوئی اور کسی میں کوئی تھی کوئی نبی کسی فضیلت میں زیادہ تھا اور کوئی کسی میں لیکن رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی وہ ذات تھی جس میں ہر طرح کی خوبیاں بیک وقت موجود تھیں۔ اس کو کسی نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آل ابراہیم میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں لیکن اس جگہ آل ابراہیم سے مراد صرف مسلمان ہی لئے جا سکتے ہیں اس لئے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل سے خاص کر لیا ہے ان کا سارا فخر بنی

بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ط

کی اور اس کو دھکتی ہوئی دوزخ کی آگ بس کرتی ہے۔ ۵۵

یاد رکھو جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا' تو قریب ہے کہ ہم انہیں آتش

اسرائیل ہی کے ناطے سے تھا اگر وہ آل ابراہیم کا نام لیتے تو اس طرح بنی اسماعیل بھی اس میں شمار ہو جاتے کیونکہ وہ بھی آل ابراہیم ہی ہیں اور مسلمان باوجود اس کے کہ بنی اسرائیل بھی آل ابراہیم میں اپنا امتیازی نشان آل ابراہیم کی وجہ سے رکھتے ہیں گویا اس طرح یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں مسلمان ایک وسیع الظرف قوم تھے لیکن افسوس کہ آج ان لوگوں نے اپنا یہ قومی امتیاز بھی ختم کر دیا اور وسیع الظرف ہونے کی بجائے تنگ ظرف ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ گروہ بندی اور خصوصاً مذہبی گروہ بندی اس تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ کوئی قوم جتنے گروہوں میں تقسیم ہوتی جائے گی اتنی ہی وہ تنگ نظر ہوگی اور گروہی تقسیم سے جتنا کوئی قوم دور رہے گی اتنی ہی وسیع الظرف کہلائے گی۔

بہرحال اس جگہ اللہ کا فضل جس چیز کو قرار دیا گیا وہ کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام کے لوگوں کو کتاب و حکمت کا عطا کرنا اور ساتھ ایک ملک عظیم کی پیش گوئی بھی کی جو گویا کتاب و حکمت ہی کا ثمرہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ درخت جتنا اچھا اور اس کی نگرانی و حفاظت جتنی بہتر ہوگی اتنا ہی اس کا پھل بہتر ہوگا۔ اس طرح جتنی کتاب و حکمت کی حفاظت ہوگی اتنا ہی اس کا ثمرہ بھی بڑا ہوگا۔ جب کتاب و حکمت کا ثمرہ "ملک عظیم" ہے تو اس ملک عظیم کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل کر دینا کتاب و حکمت سے دوری ہی کا دوسرا نام ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو "ملک عظیم" عطا فرمایا تھا آج اس کو بیسیوں حصوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا گیا اور پھر ان ہی کا ہر ایک حصہ دوسرے حصہ سے جس طرح پیکار جنگ ہے آج کسی سے پوشیدہ نہیں اور پھر اس کا جو نتیجہ ہے وہ بھی سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ کاش کہ آج بھی مسلمان مسلمان ہو جائیں؟ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کی سوچ ایک ہوگی۔ ان کا دفاع ایک ہوگا۔ ان میں سے کسی ایک کا دشمن سب کا دشمن ہوگا۔ ان میں سے کسی ایک کا دوست سب کا دوست ہوگا۔ وہ سب ایک جسم کے مختلف اعضاء ہونے کے باوجود ایک جسم و جان ہوں گے۔ ان کی آنکھیں آنکھوں کا کام کریں گی اور ان کا دماغ اپنا کام سنبھال لے گا اور ان کے ہاتھ وہی کام کریں گے جو ہاتھوں کے کرنے کا ہے اور یہی فطرۃ اللہ ہے جس کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی اس فطرۃ کو تبدیل نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اے اللہ! مسلمانوں کے برسراقتدار لوگوں کو اپنے اس قانون کے مطابق سوچنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ہماری اس دعا کو قبول فرما۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا
الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ

دوزخ میں جھونک دیں جب کبھی ایسا ہو گا کہ ان کی کھال' پک جائے گی تو ہم پچھلی کھال کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب کا مزہ چکھ لیں بلاشبہ اللہ سب پر غالب ہے اور جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔[۱۰۸] ۵۶

اور جو لوگ' ایمان لائے اور ان کے کام بھی اچھے ہوئے تو ہم انہیں ایسے باغوں میں

آل ابراہیم میں سے کچھ لوگوں نے مان لیا اور کچھ نے انکار کیا

[۱۰۷] "پھر ان میں سے کوئی تو ایسا تھا جس نے اس پر یقین کیا۔" اس جگہ کس کو مان لینا مراد ہے؟ یعنی "اٰمَنَ بِهٖ میں" ہ "کی ضمیر کس کی طرف اشارہ کر رہی ہے ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ اس سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کا تعلق اور آپ ﷺ کی نسبت بھی آل ابراہیم سے ایسی ہی ہے جیسے دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کی ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کو تسلیم کیا اور کچھ آپ ﷺ کے منکر تھے اور پھر جو منکر تھے وہ صرف یہی نہیں کہ منکر تھے بلکہ دوسروں کو روکنے کا سبب بھی تھے اور برملا کہتے تھے کہ ہمارے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل سے کیوں نہیں؟ حالانکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کا تعلق ابراہیم علیہ السلام سے بالکل ایک طرح کا تھا جن کی نسل سے نبوت خاص کر دی گئی تھی۔ اب فرمایا کہ مان لینے والوں کا اپنا فائدہ ہے بشرطیکہ وہ اس کی تعلیمات سے استفادہ کریں اور روکنے والوں کا اپنا نقصان ہے جب وہ اس کی لائی ہوئی ہدایت سے استفادہ نہیں کرتے۔ پھر اس پر ایمان نہ لانے والوں کو انجام کار اللہ کی سلگائی ہوئی ابدی آگ میں داخل کر دیا جائے گا اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی لیکن "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

منکرین کے عذاب کی کیفیت کا ایک منظر

[۱۰۸] عذاب الٰہی کی مختلف کیفیتیں قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں اور ہر ایک کیفیت اپنے اندر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس جگہ جس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جب دوزخ میں ڈالا جائے گا تو ان کی جلدیں یعنی کھالیں جھلس جائیں گی اور پھر ان کو بدل دیا جائے گا اور اس طرح وہ پھر جھلس

جائیں گی اور عذاب کی یہ کیفیت ہمیشہ اس طرح قائم رہے گی تاکہ ان کا عذاب تازہ ہوتا رہے اور وہ برابر اس تکلیف میں مبتلا رہیں کیونکہ وہ دنیوی زندگی میں جو مخالفت کرتے تھے تو مسلسل کئے ہی جاتے تھے گویا مخالفت کی انہوں نے قسم کھائی تھی کہ کوئی وجہ بظاہر اگرچہ مخالفت کی نہ تھی لیکن ان کا کام صرف مخالفت تھا اور یہ وہی صورت ہے کہ کسی کام کی کوئی وجہ و علت ہو یا نہ ہو جس کو مخالفت کرنا ہے وہ وجہ خود پیدا کر لیتا ہے اور اس حالت کو ہمارے ہاں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "آٹا گوندھتی ہلتی کیوں ہے؟"

جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ جیسے رسول کی رسالت کا انکار کیا آخر ان کی رسالت کے انکار کا کوئی باعث بھی تھا؟ ہرگز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ کچھ بیان بھی نہ کر سکے اور جو بیان کیا وہ صرف یہ تھا کہ "وہ بنی اسرائیل سے کیوں نہیں؟" اور کچھ لوگوں کو اعتراض یہ تھا کہ "اگر نبوت کو آنا ہی تھا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی سردار کے پاس آتی" تاکہ لوگ آسانی سے اس کو مان لیتے یا اگر کوئی نہ مانتا تو اس سے منوا لیا جاتا کیونکہ قوم کے وڈیروں کی بات کو مان لینا نہ ماننے سے زیادہ آسان ہے اور قوم کے کسی غریب کی بات کو مان لینا اس کے انکار کر دینے سے زیادہ مشکل ہے اور ہر انسان آسانی کا طالب ہے "لوہے کے چنے چبانا کون پسند کرتا ہے؟" اس لئے تو یہ کہا جاتا ہے کہ "چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو۔"

اللہ تعالیٰ کی اس آگ کا بیان جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مختلف کیفیتوں سے کیا گیا ہے ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے: "کہ یہ لوگ تو چکنا چور کر دینے والی جگہ پھینک دیئے جائیں گے اور تم کیا جانو کہ وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ کیا ہے؟ وہ تو اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جائے گی اور وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی۔" (الھمزہ ۱۰۴ : ۴ تا ۸)

یعنی ہیں تو وہ بڑے بڑے لوگ جو دنیا میں بڑے بڑے بنے بیٹھے تھے اور ان کی یہی بڑائی ان کو حقیقت مان لینے میں آڑے آئی۔ لیکن قیامت کے روز ان کو ایک بے وقعت اور حقیر سمجھتے ہوئے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ فرمایا ایسا کیوں ہوگا؟ اس لئے کہ ان کی نخوت و تکبر نے ان کی نگاہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو حقیر اور بے وقعت چیز جانا جس کے نتیجہ میں آج وہ بے وقعت اور حقیر بنا کر رکھ دیئے گئے جس طرح نخوت و تکبر کا اصل مرکز دل ہے اس لئے لازم تھا کہ آگ بھی ان کے دل ہی پر اپنا اثر دکھاتی۔ دل کا لفظ عربی زبان میں اس مقام کیلئے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور و ادراک اور جذبات و خواہشات اور عقائد و افکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا مطلب اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"ان کیلئے جہنم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا یہ ہے وہ جزاء جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔" (الاعراف ۷ : ۴۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"ان پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی بچھونے آگ ہی کے ہوں گے۔"

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى

داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی رفاقت کیلئے نیک و پارسا بیویاں ہوں گی۔ نیز ہم انہیں بڑے اچھے سائے میں جگہ دیں گے۔[۱۰۹] ۵۷

مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالے کر دیا کرو اور

(الزمر ۳۹ : ۲۱) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"آگ ان کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے بالکل باہر نکل آئیں گے۔" (المومنون ۲۳ : ۱۰۴) جیسے بکرے کی بھنی ہوئی سری۔ عبداللہ بن مسعود سے پوچھا گیا کہ کالح کیا ہے؟ جواب دیا کہ الم تر الی الراسی المشیط؟ کیا تم نے کبھی بھنی ہوئی سری نہیں دیکھی؟

ایمان لانے والوں کے انعام الٰہی پانے کا منظر

[۱۰۹] دوسرا گروہ وہ تھا جو ایمان لایا ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو ہم جنت میں داخل کریں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کیلئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ پھل کھائیں گے اور سایوں میں آرام کریں گے اور پھر اس کی کیفیات بھی مختلف انداز سے بیان کی گئیں ہیں اور ہر ایک کیفیت اپنے اندر ایک مقام رکھتی ہے جو ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ :

"پرہیزگاروں کیلئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا۔ نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کیلئے نہایت لذیر ہوگی۔ نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی' اس میں ان کیلئے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے خاص بخشش ہوگی۔" (محمد ۴۷ : ۱۵) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا کہ :

"بلاشبہ متقی انسان اس دن باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ انہیں کہا جائے گا سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔ ان کے دلوں میں باہمی جو کچھ رنجشیں تھیں سب ہم نے نکال دیں وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ وہاں کسی طرح کا صدمہ ان کو چھو بھی نہیں سکے گا۔ نہ وہاں سے کسی کو نکالا جائے گا۔" (الحجر ۱۵ : ۴۵' ۴۸)

مذہبی مکاتب فکر کی لڑائی لڑنے والوں کیلئے درس عبرت ہے کہ رنجشیں اور کدورتیں جو ایک دوسرے

أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾ يَا أَيُّهَا

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہئے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔ کیا ہی اچھی بات ہے جس کی اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔[110] ۵۸

کے ساتھ بنا رکھی ہیں ان کا فائدہ؟ یہ بدمزگیاں اور آپس کی غلط فہمیاں بالآخر دور کر دی جائیں گی اور دل ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے اس لئے بہتر ہے کہ آج ہی ان کو دور کر دو اور وسیع النظری سے اور وسعت قلب سے کام لو اس لئے کہ یہ ساری چیزیں آخرت میں کام آنے والی نہیں بلکہ انجام کار ان کا دور ہونا لازمی و ضروری ہے۔ اپنی اس دنیوی زندگی کو بھی جنتی زندگی کے مماثل کرنے کی کوشش کرو اس میں تمہارا اپنا بھی فائدہ ہے اور ان لوگوں کا بھی فائدہ ہے جن کو ایک دوسرے سے تم نے بیزار کر دیا ہے۔ یاد رکھو کہ ہم سب کو ایک ضیافت میں ماشاء اللہ شریک ہونا ہے اور ایک ہی کی مہمانی کو قبول کرنا ہے اس لئے ان آیات کو تلاوت کرتے وقت صرف تلاوت کر کے آگے مت بڑھ جاؤ بلکہ ذرا رک جاؤ اور ایک بار اپنے اندر جھانک کر دیکھ لو کہ تم ماشاء اللہ زمرہ علماء میں داخل ہو جو لوگوں کی راہنمائی کیلئے مختص کر لئے گئے ہو۔ اللہ مثبت سوچ کی توفیق عطا فرمادے۔

جنتیوں کو جنت میں کیا کچھ ملے گا؟ اس کا بیان بڑا وسیع ہے اور جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب کا سب بطور تفہیم ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کو جو وہاں نیک لوگوں کو ملیں گے اپنے الفاظ میں سمجھ لیا جائے حالانکہ ان کی حقیقت ان چیزوں سے جو دنیا کے اندر موجود ہیں کسی لحاظ سے بھی ملتی نہیں ہو گی اگر کوئی مشابہت ہوگی بھی تو وہ شکل و صورت میں ہو سکتی ہے علاوہ ازیں کوئی مشابہت اِن چیزوں کی اُن چیزوں سے نہیں ہوگی اور یہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے جہاں ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کان نے اس کو سنا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا کسی انسان کے دل میں تصور پیدا کرنا بھی مشکل ہے نہیں کیا جا سکتا" حالانکہ ان ساری چیزوں کا تصور انسان کے دل میں موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک چیز کو اکثر انسان جانتا ہے جن کا نام لے کر انعامات جنت کا ذکر کیا گیا ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کسی ان دیکھی ان سمجھی بات بیان کرنے کیلئے وہی الفاظ بیان کئے جا سکتے ہیں جو معلوم چیزوں کیلئے استعمال ہوئے ہیں اور یہ گویا انسان کی مجبوری ہے کہ بات اس کی زبان میں ہوگی تو اس کو کچھ معلوم ہوگا ورنہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا اور قرآن کریم جو اللہ کی کتاب ہے وہ عین اس زبان کے مطابق ہے جو انسان کے ہاں بولی جاتی ہے تاکہ ان کی تفہیم ہو سکے۔

مسلمانوں کیلئے ہدایت کہ جس کی امانت ہو اس کو واپس لوٹا دو

۱۱۰ اوپر کی آیات میں یہودیوں کی بداعتدالیوں کا ذکر تھا۔ یہودیوں کی بد اعتدالیاں کیا تھیں اور کس بات کا نتیجہ تھیں؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے مرتکب تھے۔ اس کی عبادت سے منحرف ہو چکے تھے اس کی عطا کردہ قوتوں کو غیر محل پر استعمال کرتے تھے اور یہ درحقیقت امانت میں خیانت تھی کیونکہ امانت میں یہ ساری باتیں آجاتی ہیں۔ امانت کا لفظ یہاں اپنے محدود مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جس طرح اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "ہم نے امانت کو زمین' آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا۔" والی آیت میں آیا ہے اس طرح اس جگہ بھی نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق و فرائض خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد' انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے قریبوں کے متعلق ہوں یا عام انسانوں کے متعلق۔ مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے صلح دامن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔ غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بناتے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور ان میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ لا ایمان لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له "جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔" (بیہقی فی شعب الایمان)

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتلاتے ہوئے ایک علامت یہ بتائی کہ جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔

امانت کو اس جگہ "امانات" کے لفظ سے بیان فرما کر اس بات کا اشارہ دے دیا کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عرف عام میں امانت ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے صرف یہی امانت نہیں بلکہ اس کی بہت سی قسمیں ہیں جس میں قومی امانتوں سے لے کر عام معمولی چیز کی امانت تک سب شامل ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے عہدے اور مناصب بھی سب امانتیں ہیں جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ سیاہی و سفیدی کے اختیارات ہیں۔ ان کیلئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کیلئے اپنے دائرہ حکومت میں اس کے مستحقین کو تلاش کریں۔ اگر پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی شخص نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی ذمہ داری سپرد

کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی بنا میں بغیر اہلیت معلوم کئے دے دیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض قبول ہے نہ نفل یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔

(جمع الفوائد ص ۳۲۵)

ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کیلئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول اللہ ﷺ کی اور سب مسلمانوں کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی ہے جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو اب قیامت کا انتظار کرو۔" (صحیح بخاری کتاب العلم)

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ المجالس بالامانة یعنی مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہونی چاہئیں مطلب یہ ہے کہ مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اہل مجلس کے درمیان امانت ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر اس کو دوسروں تک پہنچانا اور پھیلانا جائز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا المستشار مؤتمن "جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔" اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو اگر جانتے ہوئے خلاف مشورہ دے دیا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہو گیا۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "امانت کو ادا کرو اس کی طرف جس نے تم کو امانت دی اور خیانت نہ کرو اس کی بھی جس نے تمہاری خیانت کی۔" اس روایت کو حضرت سمرہ نے بیان کیا اور یہ روایت احمد اور سنن میں موجود ہے۔ اس جگہ جس امانت کا ذکر ہے وہ کوئی مخصوص امانت ہے اس کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ بیان کیا ہے اور یہ تک کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کی چابی عثمان بن طلحہ کو بلا کر اس سے حاصل کی تھی اور پھر رسول اللہ ﷺ نے چابی اس کو واپس کر دی اس جگہ اس امانت کا ذکر ہے۔ حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ اس کو کسی خاص واقعہ کے ساتھ وابستہ کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کا مفہوم عام ہے اور اس کے مفہوم میں "امانت خلافت" مراد ہو سکتی ہے جو قرآن کریم کے بیان کے مطابق انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو استعمال کرنے کیلئے اسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کئے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرز عمل پر اجر کا غلط طرز عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کئے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیئے ہیں اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے اس لئے اس کو قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر "خلافت" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کچھ مقامات پر اس کو "امانت" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ بات ایک ہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اے ایمان والو! جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو' اپنی امانتوں میں غداری

کے مرتکب نہ بنو۔" (الانفال ۸ : ۲۷) اس جگہ بھی "اپنی امانتوں" سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار کر کے اس کے سپرد کی جائیں خواہ وہ عہد وفا کی ذمہ داریاں ہوں یا اجتماعی معاہدات کی یا جماعت کے رازوں کی یا شخصی و جماعتی اموال کی یا کسی ایسے عہدہ و منصب کی جو کسی شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کرے۔ اس کی مزید وضاحت کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ ص۵۰۳ ملاحظہ کریں۔

دوسرا حکم اس آیت میں یہ دیا گیا کہ "جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہئے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔" ظاہر ہے کہ اس کا خطاب حکام و امراء کو ہے جو خصومات و مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس قرینہ سے مفسرین نے پہلے جملہ کا مخاطب بھی حکام و امراء ہی کو دیا ہے اگرچہ پہلے جملہ کی طرح اس جملہ میں بھی گنجائش اس کی موجود ہے کہ حکام و عوام دونوں اس میں شامل ہیں کیونکہ عوام میں سے بھی اکثر فریقین کسی کو ثالث بنا کر فیصلہ کر لیا کرتے ہیں اور اس طرح جھگڑوں کا فیصلہ کرنا گویا عوام میں بھی پایا جاتا ہے تاہم ان دونوں حکموں کے مخاطب اول حکام قرار دیئے جا سکتے ہیں اور ثانیاً یہ خطاب ہر اس شخص کیلئے ہے جس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں اور جس کو کسی مقدمہ کا ثالث بنا دیا جائے۔

غور کرو گے تو اس آیت میں مزید بہت کچھ ملے گا دیکھو اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "بَيْنَ النَّاسِ" یہ نہیں فرمایا کہ "بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ" اور اس طرح اس حکم میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں مسلم ہوں یا غیر مسلم' دوست ہوں یا دشمن' اپنے ہوں یا پرائے' ہم وطن ہوں یا غیر وطن سے تعلق رکھنے والے' ہم رنگ و ہم زبان ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے بے نیاز ہو کر جو بھی حق و انصاف کا تقاضا ہو اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

مختصر یہ کہ آیت کے پہلے حصہ میں ادائے امانات کا ذکر ہے اور دوسرے میں عدل و انصاف کا۔ اس میں ادائے امانات کو مقدم کیا گیا شاید اس لئے کہ پورے ملک میں عدل و انصاف کا قیام اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ جن کے ہاتھ میں ملک کی زمام حکومت ہے وہ پہلے ادائے امانات کا فریضہ صحیح طور پر ادا کریں یعنی حکومت کے عہدوں پر صرف انہی لوگوں کو مقرر کریں جو صلاحیت کار اور امانت و دیانت کی رو سے اس عہدہ کیلئے سب سے زیادہ بہتر نظر آئیں۔ دوستی اور تعلقات یا محض سفارش یا رشوت کو اس میں راہ نہ دیں ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ نااہل' ناقابل یا خائن اور ظالم لوگ عہدوں پر قابض ہو کر عدل و انصاف سے کبھی کام نہیں لیں گے۔ اس طرح ارباب اقتدار اگر دل سے چاہیں گے کہ ملک میں عدل و انصاف قائم ہو تو یقیناً ایسا ہوگا کیونکہ یہ لوگ ہی حکومت کے ہاتھ اور پیر ہیں۔ جب یہ خائن اور ناقابل ہوئے تو عدل و انصاف قائم ہونے کی اور کوئی راہ نہیں ہوگی۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ "کیا ہی اچھی باتیں ہیں جن کی تمہیں اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے بلاشبہ وہ سب

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں حکم اور اختیار رکھتے ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو تو چاہئے کہ

کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔" جو کچھ تم کرتے ہو اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ امانت کس کو ادا کرنی چاہئے اور تم کس کو ادا کر رہے ہو امانت تو صرف اس کو واپس کی جا سکتی ہے جو اس کا مالک ہے کسی مسکین فقیر پر رحم کھا کر کسی کی امانت ان کو نہیں دی جا سکتی اور اگر کوئی اس طرح ادا کر دے تو اس طرح گویا امانت کی ادائیگی نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی ایک طرح کا ظلم ہی ہوگا اس لئے کہ امانت اس کے اہل کو ادا نہیں کی گئی۔ بالکل اس طرح حکومت کے عہدوں کا بھی حال ہے کہ وہ رحم کھا کر بھی ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں دیئے جا سکتے جو ان عہدوں کے اہل نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو وہ بھی ظلم ہوگا اور اس ظلم کے مرتکب جس طرح اس ملک میں لوگ ہو رہے ہیں وہ سب پر روشن ہے کہ حکومت کے عہدوں کی تقسیم کس طرح پر ہے اور امانتوں کی ادائیگی کی کیا صورت ہے؟ اور ان ساری بد اعتدالیوں کا نتیجہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

قرآن کریم نے یہ حکم بار بار تصریف آیات کے ذریعہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ "اور جب کبھی کوئی بات کرو یا کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ معاملہ اپنے قرابتدار ہی کا کیوں نہ ہو اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اس کو بھی پورا کرو۔" (الانعام ۶ : ۱۵۲) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کیلئے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو ہر حال میں انصاف کرو یہی بات تقویٰ سے میل کھاتی ہے۔ (المائدہ ۵ : ۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا "اے پیغمبر اسلام! یہ لوگ جھوٹ کیلئے کان لگانے والے اور برے طریقوں سے مال کھانے میں بے باک ہیں پس اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ اگر تم کنارہ کش ہو گئے تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے لیکن اگر فیصلہ کرو تو چاہئے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف سے فیصلہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (المائدہ ۵ : ۴۲)

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکماء اسلام کی بھی

اس چھوٹے سے جملے میں اسلام کی ساری تعلیم بند کر دی گئی اور کوئی پہلو اس کا ایسا نہ رہ گیا جو تشنہ ہو۔ اس میں اللہ کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا اور اللہ کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کا اور ان حکماء وقت کی فرمانبرداری کا جو برسر اقتدار ہوں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف کوئی حکم نہ دیں۔ اللہ کی

فرمانبرداری کیسے؟ فرمایا رسول کی فرمانبرداری دراصل اللہ کی فرمانبرداری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری ممکن ہی نہیں جب تک کہ رسول کی فرمانبرداری نہ کی جائے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست حکم نہیں دیتا بلکہ جو حکم اس نے انسان کی فطرت میں رکھ دیئے ہیں ان کی تشریح کیلئے بھی وہ رسول کو منتخب کرتا ہے کہ وہ انسانوں کو باور کرائے ان فطرت میں رکھی گئی باتوں کی خلاف ورزی نہ کرو اور پھر صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی تعلیم دے دے نہیں بلکہ پریکٹیکل لوگوں کو کر کے دکھائے گا اس لئے کہ وہ بھی انسانوں ہی میں سے منتخب کیا ہوا ایک انسان ہے جو حوائج ضروریات دوسرے انسانوں میں رکھی گئی ہیں وہ ساری کی ساری اس کے اندر بھی موجود ہیں اور جو عقل و فکر اس کو دی گئی ہے وہ دوسرے انسانوں کو بھی فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ اس کی انسانیت کی تکمیل براہ راست اللہ نے کر دی ہے اس کا انحصار دوسرے انسانوں پر نہیں رکھا پھر جب اس کی تکمیل ہوگئی تو پھر دوسرے انسانوں کی انسانیت کو بحال کرنے کیلئے اس کو منتخب کر لیا گیا اور اس کے ذمہ وہ کام لگائے گئے ایک اس انسانیت کے سنوارنے کی تعلیم اور دوسرے اس کے مطابق خود عمل کر کے لوگوں کو دکھانا کہ اس فعل کو اس طرح کرنے سے اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور کوئی عمل بغیر نتیجہ اور کوئی نتیجہ بغیر عمل ممکن نہیں۔ پھر یہ بھی کہ جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ عمل و فعل جس پر محمد رسول اللہ ﷺ کی مہر ہوگی وہ قابل قبول اور جو آپ ﷺ کی مہر سے خالی ہوگا وہ مردود ہوگا۔ مہر کی پہچان؟ قرآن کریم کو ہم نے جب ہی قرآن مانا جب آپ ﷺ نے اس کے قرآن ہونے کا اعلان کیا اب قرآن کریم کے اعلان کے خلاف آپ ﷺ کا کوئی عمل ممکن نہیں ازیں بعد آپ ﷺ کی سنت کو محفوظ کر لیا گیا اور اس کی حفاظت کی گواہی قرآن کریم میں قائم کر دی گئی اس طرح قرآن و سنت کے پیوند کو اتنا مضبوط کر دیا گیا جیسے پیٹ کو پشت سے اور پشت کو پیٹ سے مضبوط کر دیا گیا پیٹ بغیر پشت کے یا پشت بغیر پیٹ کے کوئی پوزیشن نہیں رکھتے یہ دونوں ایک دوسرے کے محافظ و نگہبان ہیں ایک کا انکار دوسرے کا انکار ہے لیکن ایک کا اقرار دوسرے کا اقرار نہیں ہاں! ایک کا اقرار تب ہی اقرار ہوگا جب دوسرے کا بھی اقرار ہو۔ جس طرح ایک نوشتہ بہرحال نوشتہ ہے اس کے نوشتہ سے انکار نہیں لیکن جب تک اس پر مہر سرکار نہ ہوگی اس نوشتہ کی کوئی حقیقت نہیں لیکن مہر ثبت ہونے کے بعد نوشتہ وہی ہے اس میں کچھ ردوبدل بھی نہیں ہوا لیکن اس پر جس مہر کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھی جب اس پر وہ مہر ثبت ہوگئی تو اب اس نوشتہ کی ایک حیثیت قائم ہوگئی۔

اطاعت رسول کے بعد تیسرا نمبر حکام وقت کی اطاعت و فرمانبرداری کا ہے۔ پہلی دونوں فرمانبرداریاں لازم و ملزوم ہیں کہ ان میں سے کسی ایک فرمانبرداری سے سر پھیرا جائے تو اطاعت متصور ہی نہیں ہوگی لیکن تیسری اطاعت مشروط ہے کہ حکام وقت کی اطاعت اس وقت لازم ہے جب ان کا کوئی حکم پہلی قسم کی اطاعت یا دوسری قسم کی اطاعت کے خلاف نہ ہو اگر ان کا کوئی حکم پہلی اطاعت یا دوسری کے خلاف ہوا تو اس میں ان کی

اطاعت و فرمانبرداری نہیں ہوگی۔ فرمایا اگر صورت حال ایسی ہو تو ظاہر ہے کہ جھگڑا پیدا ہوگا کس کے درمیان؟ حکام وقت اور ان کی اطاعت نہ کرنے والوں کے درمیان فرمایا اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو چونکہ حکام کی اطاعت مطلق اطاعت نہیں بلکہ مشروط ہے اور مشروط کس سے ہے کہ ان کا حکم اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ جب خلاف ہوگیا تو بظاہر جھگڑا ہوگیا پھر اس جھگڑے کا حل بھی یہی ہے کہ دونوں فریق مل کر اس جھگڑے کو دوبارہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش کریں یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول پر منطبق کر کے دیکھیں اگر خلاف نکلے تو ہر حال میں مردود ہوا موافق نکلے تو اطاعت و فرمانبرداری لازم ہوگئی اور اس جھگڑے کو اللہ اور اس کے رسول یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر پیش کرنے سے پہلے فریقین کو اس بات کا پابند کرنا ہوگا کہ معاملہ جس کے حق میں ہوگا دوسرے کو اسے تسلیم کرنا ہوگا ورنہ اسے سزا کیلئے تیار رہنا ہوگا۔ اس بات کو خود رسول اللہ ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ **افضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر**۔

یہی وہ اصول تھا کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے اپنی اطاعت کو اس بات سے مشروط کر دیا اور فرمایا کہ **اطيعوني ما اطعت الله ورسوله فان زغت فقوموني** "جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کروں تو تم میری اطاعت کرو اور اگر میں ان کی اطاعت سے انحراف کروں تو تمہارا فرض ہے کہ تم مجھے سیدھا کرو۔" چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان گویا اس آیت کی تفسیر ہے اور اس سے یہ بات روز روشن کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ خلیفہ یا بادشاہ وقت کی اطاعت مشروط ہے لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مشروط نہیں۔ بلاشبہ یہ آیت دستور مملکت اسلامی کی اصل و اساس ہے لیکن اسلام کے مختلف گروہوں نے جو اس کی تشریح کی ہے اس نے اس کو بہت کچھ نقصان پہنچایا ہے۔

اطاعت و فرمانبرداری کی تین عملی صورتیں ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے

ایک صورت یہ ہے کہ جس چیز کا حکم صراحتہ" اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل فرما دیا ہے اور اس میں کسی تفصیل و تشریح کی مزید ضرورت نہیں جیسے کفر و شرک کا انتہائی جرم ہونا۔ اللہ وحدہٗ کی عبادت کرنا' آخرت اور قیامت پر یقین رکھنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری رسول ماننا۔ نماز قائم کرنا۔ روزہ' حج اور زکوٰۃ کو فرض سمجھنا اور ان ارکان اسلام کو بجا لانا یہ سب کام وہ ہیں جو براہ راست احکام ربانی ہیں اور ان کی تعمیل بلاشبہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے لیکن یہ ساری چیزیں رسالت کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں اس لئے قرآن کریم نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ رسول کی اطاعت ہی اصل میں اللہ کی اطاعت ہے۔

دوسرا حصہ ان احکام کا ہے جن میں تفصیل و تشریح کی ضرورت تھی اور اس میں وہ سارے احکام آجاتے ہیں جن کا قرآن کریم مجمل حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل نبی و رسول کے حوالے سے کی جاتی ہے پھر وہ تفصیل و تشریح جو رسول اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ فرماتا ہے وہ بھی دین اسلام میں ثانوی حیثیت

رکھتی ہے کیونکہ وہ عام لوگوں کے اجتہاد کی طرح نہیں ہوتی بلکہ وہ ملکہ نبوت کے تحت ہوتی ہے اور ملکہ نبوت نبوت سے خاص ہے جو عام لوگوں میں جو نبی نہیں وہ ملکہ نہیں ہوتا اس لئے عام لوگوں کے اجتہاد کی حیثیت سے اس کا مقام بہت بلند ہے بلکہ وہ دین کی اصل و اساس میں شامل ہے اور اس کو اسلام کی زبان میں سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی دوسرے انسان کو حق نہیں کہ کسی طرح کی ترمیم یا کمی بیشی کرے۔ پھر اس کے باوجود اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو وہ مستوجب سزا ہوگا اور پروگرام نبوت سے انکاری سمجھا جائے گا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص رسالت کو تسلیم نہیں کرتا اگرچہ بظاہر وہ اقرار بھی کرتا ہے کیونکہ زبان سے اقرار کرنا اور عمل سے انکار کرنا منافقت ہے اور منافق کبھی مسلمان نہیں ہوتا اگرچہ اس کو کافر بھی نہ کہا جا سکتا ہو یا نہ کہنا چاہئے کیونکہ ایسی حالت ہر انسان پر واضح نہیں ہوتی۔

تیسرے درجہ کے احکام وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحتہ" مذکور نہیں اور نہ ہی احادیث میں پوری طرح واضح ہیں کیوں؟ اس لئے کہ جدید حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور پھر ان حالات کے پیش نظر استنباط قرآن و سنت سے لازم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں علمائے اسلام اور حکمائے اسلام کا ملا جلا کام ہے کہ وہ ضرورت وقت کے مطابق اس میں نرمی و سختی کرنے کے مجاز ہیں اور یہی وہ کام ہیں جو فروعات کہلاتے ہیں جو اصولوں کے تابع ہوتے ہیں تاہم ان میں اگر اختلاف ہوگا تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوگا بلکہ ان کی برکات سے لوگ مستفید ہوں گے اور حالات کے پیش نظر ان میں لچک بھی ڈالی جا سکے گی۔ ان احکام میں بہت زیادہ وسعت رکھی گئی اور اس وسعت سے فائدہ حاصل کرنے میں کسی گروہ کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کو مطعون کرے بلکہ ہر انسان کو حق ہے کہ ان میں کلام کر سکے اور اپنے نظریات کو کھل کر بیان کرے۔ ہاں! ان فروعات کو اصول بنانا اور اصولوں کو فروعات کے درجہ سے بھی گرا دینا بہت بڑا ظلم ہے بلکہ یہ ایک قسم کا حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے یا اسلام کی عطا کردہ وسعت سے غلط فائدہ حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اس لئے حکومت اسلامی کو اجازت ہے کہ ان میں زمانہ کے حالات کے مطابق ترمیم یا نرمی سختی کرے اور باقاعدہ قانون کا درجہ دے کر کسی کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دے۔ اس لئے ہر زمانہ میں ایک مشاورتی کونسل ہونا اصول اسلامی میں داخل ہے اور اس میں بہت بڑی وسعت موجود ہے لیکن اس میں جتنی وسعت تھی آج ہم نے اس کو اتنا ہی تنگ کر کے رکھ دیا اور اس پر اسلام کی بنیاد کھڑی کر دی ذرا کسی کو اپنے نظریات کے خلاف پایا تو کفر کا فتویٰ صادر کر دیا اور اس سلسلہ میں حکومت اسلامی نے اپنی ذمہ داری پوری نہ کی جس وجہ سے نئی نئی فرقہ بندیاں پیدا ہوگئیں اور اس وقت حالت اتنی ناگفتہ بہ ہوگئی کہ جس کے سدھرنے کی کوئی شکل بظاہر نظر ہی نہیں آتی کیوں؟ اس لئے کہ جن لوگوں کا یہ کام تھا انہوں نے اس سے کلی طور پر منہ پھیر لیا بلکہ اس کو اپنی ذمہ داری ہی تصور نہ کیا اور لوگوں کو لڑنے مرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

اوپر کے پہلے دو قسم کے احکام جن کے نفاذ کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر لازم و ضروری تھی حکومت

إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ ع ۸ ۵
تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ

اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو' اس میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔ ۵۹

اے پیغمبر اسلام کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ

نے اسلامی حکومت کہلانے کے باوجود ان کے نفاذ سے انکار کر دیا اور صاف صاف یہ کہہ دیا کہ یہ کسی اسلامی حکومت کا کام ہی نہیں' کیوں؟ اس لئے کہ ان کی فرضیت ظاہر ہے اس لئے براہ راست مسلم کا اپنا فرض ہے کہ وہ اس کو جس طرح چاہے پورا کرے یہی وہ سب سے بڑا ظلم ہے جو حکومت نے اسلامی حکومت کہلانے کے باوجود آج تک روا رکھا ہے اور اسلام کے اندر کی گروہ بندی نے اپنا اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے دوسرے لفظوں میں مسلمان کہلانے کے باوجود کفر پر قائم رہنے کیلئے آج تک کسی حکومت کو یہ ذمہ داری قبول کرنے کیلئے نہیں کہا وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر حکومت نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تو ہماری سیادت و قیادت کی وہ عمارت یک قلم ڈھیر ہو کر رہ جائے گی۔

اور حکومتی ارکان نے یہ سمجھا کہ ان لوگوں کو اس طرح لڑنے دو تاکہ حکومت کی باگ ڈور گنے چنے آدمیوں کے ہاتھوں میں رہ سکے اگر اس کام کو ہاتھ لگایا تو حکومت ہی کب ہماری حکومت رہے گی وہ تو فطرۃ ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے گی جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں گے اس لئے نجات اس میں ہے کہ دین اسلام باقاعدہ "اودھوں کا ڈھیر رہے" اور یہ لوگ لڑتے جھگڑتے رہیں اور ہم ان سب کے فیصلے مٹانے کیلئے حکومت کی کرسیوں پر براجمان رہ سکیں۔

اس سوچی سمجھی سکیم کے تحت حکومت کے ارکان اور طبقہ علماء کے گرد گھنٹال سب اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے خوب زور زور سے نعرہ بازی کر رہے ہیں کہ اسلام زندہ باد۔ ہم آئیں گے تو اسلام لائیں گے۔ ہم رہیں گے تو اسلام رہے گا۔ اس طرح اسلام اسلام کے اس شور نے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آنے دیا کہ اسلام کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟

اگر کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حل کیا ہے؟

۱۱۱ اس تیسری قسم کی اطاعت میں جس کو "اُولُو الْاَمْرِ" کی اطاعت کہا گیا ہے چونکہ اختلاف کا احتمال تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی ارشاد فرما دیا کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے تو "چاہئے کہ اللہ اور اس کے

رسول کی طرف رجوع کرو۔" اس طرح تمہارا اندر کا اختلاف ختم کرنے کیلئے تمہیں پھر اس اطاعت کی طرف آنا ہوگا جو اطاعت مشروط نہیں بلکہ اصل و اساس ہے اور اس میں حکومت اور عوام دونوں اس کے پابند ہیں' کیوں؟ اس لئے کہ جس طرح عوام نے اسلام قبول کیا ہے ارکان حکومت نے بھی اسے قبول کیا ہے اس میں عوام اور ارکان حکومت میں کوئی فرق نہیں کہ سب امت مسلمہ میں داخل ہیں۔ ان کیلئے رسول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے بلکہ رسول ان سب کا معلم و مربی ہے اور اسلامی زندگی کا ایک نمونہ ہے اور وہ ایک ایسا امیر ہے جس کی اطاعت ہر زمانہ میں بے چون و چرا کی جانی چاہئے اور اس کی ہدایت خود قرآن کریم نے دی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳ : ۲۱) "تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں اسوہ حسنہ ہے۔" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳: ۳' ۴) "رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ وہ وہی کچھ حکم دیتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔" گویا رسول کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی ہے وہ مسلمان عوام ہوں یا امراء و حکماء یعنی وہ سارے امیروں کا بھی امیر ہے اور وہ ایسا امیر بھی نہیں جس سے نزاع کی جائے بلکہ وہ ایسا امیر ہے جس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا اللہ کی ذات کو اور قرآن کریم کے اللہ کا کلام ہونے کو۔ وہ ایسا امیر ہے جو قیامت تک کیلئے پوری امت مسلمہ کا امیر ہے۔ وہ ایسا امیر ہے جس کی امارت اس وقت تک قائم ہے جب تک یہ نظام عالم قائم ہے۔

پہلی دونوں قسم کی طاعتوں میں کوئی سوال جھگڑنے کا نہیں اور تیسری طاعت میں احتمال موجود ہے پھر اگر ایسا احتمال پیدا ہو جائے تو اس کا حل واضح کر دیا اس بات کو ایک مثال سے سمجھ لینا مفید ہوگا تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ بخاری اور دوسری کتب حدیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر کو روانہ کیا جس کا امیر ایک انصاری کو مقرر فرمایا۔ راستہ میں امیر کو اپنے ساتھیوں پر کسی معاملہ میں غصہ آگیا۔ اس نے ساتھیوں سے کہا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو حکم نہیں دیا کہ تم میری اطاعت کرو۔ سب نے کہا کہ بیشک حکم دیا ہے پھر اس نے آگ جلوائی اور ان ساتھیوں سے کہا کہ میں حکم دیتا ہوں کہ اس کے اندر کود جاؤ۔ ایک نوجوان نے کہا کہ ہم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے ہیں پس جلدی مت کرو یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے مل لیں اس طرح اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی اور لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب واپس آئے تو یہ واقعہ بھی آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا آپ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی نہ نکل پاتے یاد رکھو کہ "اطاعت صرف معروف باتوں میں ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان پر واجب ہے کہ وہ قبول کرلے اور فرمانبرداری کرے خواہ ایک بات کو پسند کرے یا اسے ناپسند کرے جب تک کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا لیکن اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر

إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ

جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے وہ اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اپنے جھگڑے قضیئے ایک سرکش اور شریر کے آگے لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ سیدھی

قبول کرنا نہیں ہے اور نہ اس کی اطاعت ہے۔" ہاں! اس میں یہ احتمال ہے کہ جس کو حکم دیا گیا وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ حکم اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف ہے اور اس نے اس پر عمل کر دیا تو ظاہر ہے کہ ایسے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے مستوجب سزا نہیں ہوگا بلکہ اصل مستوجب سزا تو حکم دینے والا ہے اس پر عمل کرنے والا نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اولو الامر کی اطاعت اصل میں اتحاد جماعت کا نام ہے جب تک سب اپنے آپ کو ایک حکم کے تابع نہیں کریں گے اس وقت تک اتحاد قائم نہیں ہو سکتا اس لئے اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جس کو وہ پسند نہ کرے جس کو حکم دیا گیا تو پھر بھی اس کو بجالانا ضروری ہے کیونکہ اس میں معیار پسند یا ناپسند نہیں بلکہ اطاعت رسول کے خلاف ہونا ہے جب تک ایسی بات نہ ہو تو کسی شخص کے پسند نہ پسند سے کچھ اثر نہیں ہوگا اور اگر وہ فعل صرف عمل کرنے والے کی پسند کے خلاف ہو اس لئے وہ اس پر عمل نہ کرے تو وہ مستوجب سزا ہوگا کیونکہ اس نے جماعت کے پورے نظم کو توڑنے کی کوشش کی جس کا اس کو حق نہیں تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور امراء اسلام کی اطاعت میں جو بنیادی فرق ہے اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر ایک امیر کو اس کی امارت سے جبکہ وہ امارت کا غلط استعمال شروع کر دے الگ کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی رسول نہ تو اپنی رسالت سے تجاوز کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کو رسالت کے منصب سے کوئی الگ کر سکتا تھا اور امراء کی حقیقت یہ ہے کہ ہر امیر کا انتخاب انسان خود کرتے ہیں لیکن کسی رسول کی رسالت میں کسی انسان کا کوئی مشورہ یا اشارہ تک نہیں پایا جاتا تھا اور امارت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا جب کہ سلسلہ رسالت و نبوت کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم کر دیا گیا۔

دعوائے اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ قبول نہ کرنے والوں کا فیصلہ

۱۱۲ھ روایات میں اس طرح کے بہت سے فیصلوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ کو چھوڑ کر سرداران یہود کے پاس اپنے مقدمہ کو لے جانے کی کوشش کی ان میں سے ایک کا ذکر اس جگہ کر دینا مناسب خیال کیا جاتا ہے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکے۔ ابو صالح نے ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی سے ایک نام کے مسلمان کا جھگڑا ہوگیا۔ یہودی نے اپنا فیصلہ کرانے کیلئے اس نام کے مسلمان سے رسول اللہ ﷺ کے پاس مقدمہ لے جانے میں پہل کی اور کہا کہ چلو رسول اللہ ﷺ سے اپنے اس قضیہ کا فیصلہ کرالیں لیکن مسلمان مصر تھا کہ فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی بجائے کعب بن اشرف ایک یہودی سردار سے کرایا جائے۔ لیکن یہودی نے اپنے سردار کعب بن اشرف کے پاس جانے سے صاف صاف انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرانے پر اصرار کیا۔ مجبوراً منافق کو بھی نبی اعظم و آخر ﷺ کی طرف آنا پڑا۔ مختصر یہ کہ اس طرح وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے دونوں کی بات سنی اور اس یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ جب دونوں آپ ﷺ کی خدمت سے الگ ہوئے تو منافق یہودی کو چمٹ گیا اور اس کو مجبور کیا کہ فیصلہ کیلئے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلئے اس طرح دونوں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو یہودی نے عرض کیا کہ ہم دونوں مل کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مقدمہ لے کر گئے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے خلاف فیصلہ دے دیا تب یہ آپؐ کے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور مجھے آپ کے پاس لے کر آیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منافق سے فرمایا کیا ایسا ہی ہے؟ منافق نے اقرار کر لیا کہ جی ہاں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا ٹھہرو میں ابھی فیصلہ کر دیتا ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ اٹھ کر گھر میں داخل ہوئے اپنی تلوار اٹھائی اور باہر آکر اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا فیصلہ میں اس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ روایت ثعلبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور ابن ابی حاتم نے ابوالاسود سے بھی نقل کی ہے اور اس نام کے مسلمان اور عمل کے منافق کا نام بھی "بشر" لیا گیا ہے۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حق کو باطل سے الگ الگ کر دیا ہے اس لئے آپ کا لقب "فاروق" سے معروف ہوگیا۔

آیت کے الفاظ نے اس نام کے مسلم اور عمل کے منافق کے متعلق یہ اشارہ بھی کر دیا کہ اس کا تعلق اہل کتاب سے تھا اور یہ بات بھی ان الفاظ ہی سے نکلتی ہے کہ اس طرح کے بہت سے لوگ اس وقت موجود تھے جو منہ سے اسلام کا اظہار کرتے تھے لیکن وہ مصلحت وقت کے تحت مسلمان ہوئے تھے ان کے دل اسلام کی تعلیمات پر جمتے نہیں تھے۔ وہ دعویٰ توبہ کرتے تھے کہ وہ قرآن کریم پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم سے پہلے کی نازل شدہ کتابوں کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اپنے معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کی بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف جانے کے شوقین تھے حالانکہ جس اللہ اور اس کے رسول پر وہ ایمان کے مدعی تھے ان کی طرف سے یہ واضح ہدایت آچکی تھی کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کیلئے لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے بغیر اس انکار کے ایمان معتبر نہیں ہے لیکن یہ دونوں کو جمع کرنا چاہتے تھے اور اس طرح شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان کو بھٹکا کر صراط مستقیم سے اتنی دور کر دے کہ پھر ان کے لئے اس کو پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے تو یہ ان منافقین کی بات تھی لیکن آج اہل اسلام کی حالت کیا ہے؟ وہ کتنے جھگڑے ہیں جو ہم نے اپنے رسول اللہ ﷺ سے دور کرا لئے ہیں؟ اور آپ

يُضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۞ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۞ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ

راہ سے بہت دور جا پڑیں۔

اے پیغمبر اسلام! جب ان لوگوں کو اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے نازل کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے روگردانی کرتے ہیں اور ان کے قدم ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔[۱۱۳] ۶۱

پھر اگر ایسا ہو کہ ان کے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آپڑے تو اس

ﷺ کے فیصلے کو مان لیا ہے؟ اس وقت ایمان کا دعویٰ رکھنے والے دعویٰ کے بعد جب دوسرے لوگوں سے فیصلہ کرانے کیلئے گئے تو ان جانے والوں کو منافق کہا گیا اور فیصلہ صادر کرنے والوں کو طاغوت اور اس وقت ہم کیا ہیں؟ اور ہمارے فیصلے کرنے والے کیا؟

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کرنے والے منافق ہیں

[۱۱۳] منافق کون ہیں؟ وہی جو زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا عمل ان کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتا۔ طاغوت کون ہیں؟ وہ لوگ مراد ہیں جو حاکم ہیں لیکن قانون خداوندی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ ہی کتاب اللہ کو آخری سند مانتا ہو خواہ اعتقاداً ایسا ہو یا عملاً۔ ہاں! اگر اعتقاداً ایسا ہوگا تو وہ طاغوت کافر ہوں گے اور اگر صرف عملاً ایسا ہوگا تو وہ منافق ہوں گے۔

اس جگہ منافقین سے مراد تو وہی لوگ ہیں جو اسلام کو اقراراً تسلیم کر چکے لیکن عملاً اس کا خلاف کرتے تھے اور وہ اہل کتاب سے اسلام کی طرف آئے تھے اور طاغوت سے سرداران یہود مراد ہیں جو لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے اور لوگ بھی ان کو اپنا سردار مانتے اور تسلیم کرتے تھے۔

چونکہ ان لوگوں نے مصلحتاً اسلام قبول کیا تھا اسلئے بانی اسلام ﷺ کو بحیثیت رسول انہوں نے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ تھے جن کو اسلام کی زبان میں منافق کہا گیا اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں بلکہ اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے عملاً منکر ہیں اور آپؐ کے فیصلوں پر ان کا دل نہیں جمتا۔

ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲

وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت یہ تمہارے پاس آکر اللہ کے نام کی قسمیں کھائیں گے اور کہیں گے، ہم نے جو کچھ کیا تھا اس سے مقصد صرف بھلائی تھی اور یہ کہ میل ملاپ رہے۔[۱۱۴] ۶۲

اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے آئی ہوئی مصیبت کا کوئی حل؟

[۱۱۴] جوں جوں اسلام طاقت پکڑتا گیا اور یہود کی سیادت ختم ہوتی گئی تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض سے کام نہ لیا جائے بلکہ اب وہ بھی اپنی روش بدلیں اس حکم سے مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور اس طرح اب منافقین کا احتساب شروع ہوگیا۔ منافقین اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے نہ یہود میں اتنا زور باقی رہا کہ وہ ان کو پہلے کی طرح سہارا دے سکیں اور نہ ہی مسلمان اب ان پر اعتماد کرنے کیلئے تیار تھے اس وقت ان کا حال کیا تھا؟ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" نتیجہ یہ ہوا کہ اب منافقین بھاگ بھاگ کر نبی اعظم و آخر ﷺ ہی کے پاس جاتے اور قسمیں کھا کھا کر آپ ﷺ کو یقین دلاتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط آج تک رکھے تھے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں ان کے فیصلے تسلیم کرتے تھے اس میں ہماری نیت کا کوئی فساد نہیں تھا بلکہ ہماری خواہش تو صرف اور صرف یہ تھی کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی تھی وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے اس طرح اب وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس طرح منہ بسور بسور کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی عرضیاں گزارتے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ جب ہم ایک جھوٹ بول کر اس مصیبت میں مبتلا ہیں تو اس طرح جتنے جھوٹ بڑھتے جائیں گے ہماری مصیبت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور پھر یہی کچھ ہوا۔ کیا اس طرح وہ رواداری کا اظہار کر کے بری الذمہ ہوگئے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس نے یہ بات واضح کر دی کہ حریف طاقتوں کے ساتھ اختلاف یا رواداری کی پالیسی بنانا حکومت وقت اور ارباب حل و عقد اور سرداران ملت کا کام ہے نہ کہ عوام کی انفرادی صورت کا یا گروہی سیاست کا۔ ہاں! ضرورت پیش آئے تو عوام بجائے خود یا اپنے نمائندوں کے ذریعہ سے حکومت وقت کی توجہ مبذول کرا سکتے ہیں اور حکومت کو افرادی اور مادی قوت دے سکتے ہیں لیکن جو ان کے کرنے کا کام نہیں وہ خود نہیں کر سکتے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے اور ہر جماعت اور ہر پارٹی اپنے اپنے خیال کے مطابق مصروف جہاد ہے اس طرح کا کوئی شرعی جواز موجود نہیں بلکہ یہ صرف اور صرف پیٹ کا دھندا ہے اور اس کا نیا روپ ہونے کی وجہ سے ابھی قبول عام ہے اور پیٹ کے باقی دھندوں سے مجموعی طور پر بڑا بھی ہے۔

آیت کے ترجمہ میں ارشاد فرمایا کہ یہ قسمیں کھا کھا کر باور کرانے والے عادی مجرم ہیں اس لئے ان کے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا

اے پیغمبر اسلام! یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ہی جانتا ہے ان کے دلوں میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے؟ پس چاہئے کہ ان کے پیچھے نہ پڑو اور انہیں پند و نصیحت کرتے رہو۔ تم انہیں ایسی باتیں کہو کہ ان کے دلوں میں اتر جائیں۔ ۶۳

اور اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو ہم نے جس کسی

اس طرز عمل کو اچھی طرح نگاہ میں رکھو اور ان کے اس طرز عمل کی تین و جھیں ہو سکتی ہیں ان میں سے تجزیہ کر کے دیکھ لو ان کو کیا بات لاحق ہے۔ ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طرز طریقہ پر محض دھوکہ دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کیلئے مسلمان ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اسے اس امر میں شک ہو کہ کیا رسول اللہ اللہ کا رسول ہے یا نہیں؟ قرآن اللہ کی کتاب ہے یا نہیں؟ آخرت واقعی ہی آنے والی ہے یا نہیں؟ ہاں! اس طرح یہ کہ کیا اللہ بھی کوئی حقیقت میں ہے یا نہیں؟ کیا اللہ کا تصور تصوراتی ہی تو نہیں ہے؟ تیسرے یہ کہ وہ اللہ کو اللہ مان کر اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اللہ کی کتاب نے فلاں حکم دے کر ہمیں تو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کا فلاں طریقہ تو ہمارے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو ایسے لوگوں کے ظالم و منافق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں آتا ہے' ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے۔ وہ بہت بڑا دغا باز' خائن اور جعل ساز ہے۔ اس طرح وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے ذلیل ترین خصائل کا پیکر بناتا چلا جاتا ہے اور مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اس کے ظاہر کلمہ شہادت پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت کا ایک جز مان لیتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی' تمدنی' سیاسی اور اخلاقی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم دوسری جگہ ان کی اس طرح نشاندہی کرتا ہے۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ اطاعت سے منہ موڑ لیتا ہے' ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک

فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کے موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں کیا ان کے دلوں کو منافقت کا روگ لگا ہوا ہے یا شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔" (النور ۲۴ : ۴۸' ۵۰)

اللہ ان کے دلوں سے خوب واقف ہے آپ ایسی بات کریں کہ ان کے دلوں میں اتر جائے

۱۱۵ اس میں شک نہیں کہ منافقین ایک الگ گروہ ہے جو اہل ایمان کی امت سے بالکل الگ تھلگ ہے اگرچہ اسلام کا ظاہری اقرار اور اسلام کی پیروی کا خارجی اظہار دونوں گروہوں میں مشترک ہے لیکن دونوں کے مزاج' اخلاق' اطوار' عادات اور طرز فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں زبان پر ایمان کا دعویٰ ہے مگر دل سچے ایمان سے خالی ہیں وہاں زندگی کا سارا رنگ ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے دعوئے ایمان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اوپر کے لیبل پر لکھا ہے کہ یہ کستوری ہے مگر لیبل کے نیچے کل ہی پیدا ہونے والے بچے کے پیٹ کا ایک سڑا ہوا گند ہے جو اپنے پورے وجود سے ثابت کر رہا ہے کہ کہ ایک پلید و ناپاک شے کے سوا کچھ بھی نہیں بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے وہاں کستوری اپنی صورت سے' اپنی خوشبو سے' اپنی خاصیتوں سے ہر آزمائش اور ہر معاملہ میں اپنا مشک ہونا کھولے دے رہی ہے۔ اسلام و ایمان کے عرفی نام نے بظاہر دونوں گروہوں کو ایک امت بنا رکھا ہے مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاقی مزاج اور رنگ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اس وجہ سے منافقانہ خصائل رکھنے والے مرد و زن ایک الگ گروہ بن گئے ہیں جن کو اللہ سے غفلت' برائی سے دلچسپی' نیکی سے بعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہل ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے اور دوسری جانب سچے مومن مرد و زن ایک دوسرا گروہ بن گئے ہیں جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں' بدی سے نفرت کرتے ہیں۔ اللہ کی یاد ان کیلئے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کیلئے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور اللہ اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا وتیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرز زندگی نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین کے گروہ سے مکمل طور پر توڑ دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اب تم ہی بتاؤ کہ کستوری وہ کام کیسے کرے گی جو بچے کے پیٹ کی گندگی کر رہی ہے اس لئے تم اپنی کستوری کی مشک و خوشبو کو اتنا عام کر دو کہ ان کو اپنا گند خود بخود معلوم ہونے لگے۔ تم کسی بحث میں الجھے بغیر وہی کام کرو جو خوشبو کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "جادو وہ جو سر چڑھ بولے" تمہارے بول اتنے میٹھے ہوں کہ ان کو اپنی کڑواہٹ خود محسوس ہونے لگے دیکھو نیکی کے عوض میں نیکی کوئی نیکی نہیں ہاں! برائی کے عوض نیکی نیکی ہے۔ فرمایا تمہارے برتن میں رکھا کیا ہے؟ کستوری' پھر کستوری کا کام؟ خوشبو دینا' بس خوشبو کو چھوڑو اور اتنا چھوڑو کہ ان کو اپنی بدبو خود معلوم ہونے لگے۔ بات کرو اتنی میٹھی اور اتنی اچھی' اتنی ستھری کہ ان کے دلوں کے اندر

لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ

کو بھی منصب رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا اس لئے کیا کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی
۱۱۶
جائے اور جب ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیا تھا تو اگر اس وقت تمہارے پاس

اتر جائے۔ آپ کا کام منانا نہیں بلکہ صرف پہنچانا ہے بس تم اپنا کام کرو اور ایسے انداز سے کرو جو انداز تم کو اسلام نے سکھایا ہے۔

فرمایا "اے پیغمبر اسلام! یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ پس چاہئے کہ ان کے پیچھے نہ پڑو اور انہیں پند و نصیحت کرتے رہو' تم انہیں ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔" وہ اثر پذیر ہو یا نہ ہو اس کی ذمہ داری آپ ﷺ پر نہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ :

"یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی' حالانکہ انہوں نے یقیناً وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے۔ یہ ان کا سارا غصہ اس بات پر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انہی کیلئے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو یقیناً بہت دردناک سزا دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔" (التوبہ ۹ : ۷۴' ۷۶)

اطاعت کا جو حکم ان کو دیا گیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی ہر ایک فرستادہ کی اطاعت لازم تھی

۱۱۶ منصب رسالت کیوں تھا؟ فرمایا رسول صرف مان لینے کیلئے نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر رسول اس لئے آیا تھا کہ اس کی اطاعت کی جائے وہ صرف عقیدت کا مرکز ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اطاعت کا مرکز بھی تھا۔ اس کی حیثیت ایک واعظ و ناصح ہی کی نہ تھی بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی و راہنما کی بھی تھی اس کو اس لئے مبعوث کیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے لوگ اس کی جملہ معاملات میں اطاعت و فرمانبرداری کریں کیونکہ اس کی اطاعت ہی بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ جو لوگ رسول کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے یا اس سے اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ ایمان بالکل جھوٹا ہے۔

چونکہ اصل مضمون اس رکوع میں یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور پھر اطاعت نہ کرنے والوں کو ہی جب وہ منہ سے اطاعت کرنے کا اقرار بھی کریں منافق کہا گیا ہے اس لئے اب بات واضح ہوگئی تو قرآن کریم نے مزید بات کو واضح کر دیا اور فرمایا کہ رسول تو بھیجا ہی اس غرض کیلئے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے لیکن چونکہ اصل حق اطاعت کا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اس لئے ساتھ ہی "بِاِذْنِ اللّٰهِ"

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ

حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے پھر اللہ کا رسول بھی ان کیلئے بخشش طلب کرتا تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔ ۶۴

پس دیکھو تمہارا پروردگار اس بات پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں اور پھر ان کے دلوں کی

فرما دیا یعنی اس کی اطاعت و فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم و ضروری ہے پھر اس کی اطاعت کا جوا اتار کر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلا سکتا خواہ وہ کوئی ہو اس طرح یہ آیت رسولوں کے ایک امتیازی نشان پر فیصلہ کن ہے۔ امام رازی رقم طراز ہیں کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ کوئی رسول نہیں ہو سکتا مگر ضروری ہے کہ اس کے پاس پیغام رسالت ہو اور وہ اس پیغام میں مطاع ہو اور اس کے متعلق اس کی پیروی کی جائے اور یہ لازم ہے کہ ہر رسول نبی ہو مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اس لئے جب منصب نبوت ختم کر دیا گیا تو اب منصب رسالت پر تو کوئی فائز ہو نہیں سکتا کیونکہ رسالت کیلئے نبوت شرط ہے اور جب نبی ہی نہ ہو سکتا ہو تو کوئی رسول کیونکر ہو گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہر ایک رسول کیلئے لازمی تھا کہ وہ مطاع بھی ہو اور اب قیامت تک کیلئے مطاع صرف اور صرف ایک ہی رہیں گے یعنی خود محمد رسول اللہ ﷺ۔ اب جو کوئی ہو گا وہ اس کی اطاعت کرے گا۔

قرآن کریم کا یہ حکم اسلامی آئین کی اصل الاصول ہے اور اس کا اطلاق نظام زندگی پر ہوتا ہے۔ اس کی رو سے کسی مسلمان فرد، قوم، عدالت یا پارلیمنٹ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ خود اپنی آزادئی رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی اللہ اور اس کے رسول کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا مسلمان بھی ہونا اور اپنے لئے اس اختیار کا محفوظ بھی رکھنا دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رویوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کے آگے جھک جانا ہو گا اور جسے نہ جھکنا ہو اسے سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے یا مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے اور اللہ اور اللہ کی مخلوق دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرنے والوں کا اصل حق اور اس نقصان کا ازالہ کیا تھا؟

۱۱۷ غلطی کوئی بھی اور کسی قسم کی بھی ہو اس کا ازالہ کیا ہے؟ توبہ و استغفار ہے۔ غلطی سے رجوع کرنا توبہ ہے اور جو کچھ ہو اس پر پچھتاوے اور معافی طلب کرنے کا نام استغفار ہے۔ غلطی کو مان لینا اور پھر غلطی پر غلطی کرتے جانا اس طرح منہ سے توبہ توبہ اور استغفر اللہ کا ورد جاری رکھنا اور کام اس طریقہ کے مطابق کرتے جانا توبہ نہیں کہلاتا اور نہ ہی اس استغفار کا کوئی فائدہ ہے یہ دھوکا ہے' فریب ہے' مکاری ہے' عیاری ہے' اور سب سے بڑھ کر دغا بازی ہے۔

مدعی ایمان دو ہی طرح کے ہو سکتے ہیں یا وہ سچے ہوں گے یا جھوٹے۔ ان کی پہچان کیا ہوگی؟ جھوٹے مدعی ایمان اور گنہگار مومن کا فرق صاف صاف لفظوں میں تم کو بتا دیا جاتا ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر فی الواقع اللہ اور اس کے دین اور جماعت المسلمین کے ساتھ کوئی خلوص نہیں رکھتا اس کے عدم اخلاص کا ثبوت اس کے طرز عمل سے مل جائے گا۔ اگر فی الواقع وہ مومن ہے اور اس سے کوئی غیر مخلصانہ حرکت ہوگئی اور وہ اپنے قصور کا اعتراف کرلے تو یقیناً اس کو معاف کیا جائے گا اور اس بات کا معلوم کرنا بھی کوئی مشکل نہیں ہے اس کے لئے صرف ان معیاروں سے پرکھ ہو جائے گی اور "دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

۱۔ وہ اپنے قصور کیلئے عذرات لنگ اور تاویلات و توجیہات پیش نہیں کرے گا بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے سیدھی طرح صاف صاف مان لے گا اور کسی قسم کی لیت و لعل نہیں کرے گا۔

۲۔ اس کے سابق طرز عمل پر نگاہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ یہ عدم اخلاص کا عادی مجرم تو نہیں ہے۔ اگر پہلے وہ جماعت کا ایک صالح فرد رہا ہے اور اس کے کارنامہ زندگی میں مخلصانہ خدمات ایثار و قربانی اور سبقت الی الخیرات کا ریکارڈ موجود ہے تو باور کرلیا جائے گا کہ اس وقت جو قصور اس سے سرزد ہوا ہے وہ ایمان و اخلاص کے عدم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک کمزوری ہے جو وقتی طور پر رونما ہوگئی ہے۔

۳۔ اس کے آئندہ طرز عمل پر نگاہ رکھی جائے گی کہ آیا اس کا اعتراف قصور محض زبانی ہے یا فی الواقع اس کے اندر کوئی گہرا احساس ندامت موجود ہے۔ اگر وہ اپنے قصور کی تلافی کیلئے بے تاب نظر آئے اور اس کی بات سے ظاہر ہو کہ جس نقص ایمانی کا نقش اس کی زندگانی میں ابھر آیا تھا اسے مٹانے اور اس کا تدارک کرنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں نادم ہے اور یہ ندامت ہی اس کے ایمان و اخلاص کی دلیل ہوگی۔

زیر نظر آیت میں اس بات کا ذکر کیا گیا فرمایا "اور جب ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرلیا تھا تو اس وقت اگر وہ تمہارے پاس حاضر ہوتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور اللہ کا رسول بھی ان کیلئے بخشش طلب کرتا تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔" اس سے یہ بات بھی

بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا

بھی حالت ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف اپنے اندر کسی طرح کی کھٹک محسوس نہ کریں اور وہ جو کسی بات کو پوری پوری طرح مان لینا ہوتا ہے وہ ٹھیک اسی طرح مان لیں۔[۱۱۸] ۶۵

اور دیکھو اگر ہم انہیں حکم دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا حکم دیتے کہ اپنے گھروں سے

واضح ہوگئی کہ زندگی میں اگر کچھ اوپر نیچے سہواً و خطاءً اور عمداً جو کچھ غلط کام ہو جائیں خود بھی ان سے توبہ کرنا شرمندہ ہونا اور اللہ سے معافی طلب کرنا اور اللہ کے بندوں سے بھی اللہ سے معافی طلب کرنے کیلئے سفارش کرنا جائز و درست ہے اور اس طرح اگر کسی کے ذہن میں کوئی بیماری تھی تو اس کی معافی کی امید کی جا سکتی ہے لیکن یہ مرنے کے بعد ہی خصوصاً مرنے والوں کیلئے ان کے گناہوں کی بخشش طلب کرنا اور دوسروں سے بھی اپیل پر اپیل کرنا اور ان کو پڑھ کر بخشنا ان کے نام پر فاتحہ و درود کرنا اور یہی سمجھنا کہ اس طرح مغفرت طلب کرنا ہی مردوں کا زندوں پر حق ہے تو یہ بات کہاں سے نکال لی گئی ہمارا رواج تو یہ ہے کہ اگر کوئی مر بھی گیا اور معلوم بھی ہوگیا سب اکٹھے بھی ہوگئے لیکن مغفرت کی دعاء' توبہ توبہ' ابھی نہیں' کیوں؟ اس لئے کہ ابھی میت دفن نہیں ہوئی۔ گویا اس کے لئے مغفرت کی دعا روک دی گئی کہ جب تک وہ قبر میں داخل نہ کر دیا جائے اس کیلئے مغفرت طلب ہی نہیں کی جا سکتی۔ مغفرت طلب کرنے کا وقت کیا تھا اور ہمارے رواج نے اس کو کیا بنا دیا؟ نماز جنازہ ایک نظام اسلامی کا مسئلہ ہے رواج کا نہیں اور اس میں اکرام مسلم ہے کہ کھڑے ہو کر باقاعدہ' باوضو اور سمت قبلہ اختیار کر کے الوادعی تحفہ ہے جس میں اپنے لئے اور مرنے والوں کے الوداع کہنے کے اجر کو حاصل کرنے کیلئے اور پس ماندگان کیلئے صبر و تحمل کی تلقین کیلئے اور سارے مسلمانوں کو اس وقت کی یاد تازہ کرانے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اس کا ایک خاص طریقہ مقرر فرما دیا کہ شریعت کی تشریح اور شرعی حیثیت متعین کرنا رسول کے منصب کا ایک حصہ تھا پھر جو اختیار رسول کو دیا گیا تھا اس نے اس اختیار کے مطابق اس کا استعمال فرما کر ایک طریقہ مقرر فرما دیا کیا اس میں یہ خامی باقی رہ گئی تھی جس کو پورا کیا گیا؟ اللہ کی پناہ ایسے خیال سے جو من الشیطان ہے۔

جھگڑوں کے فیصلوں کی عدالت اور عدلیہ کا سب سے بڑا جج ایک ہی ہے

[۱۱۸] آیت زیر نظر نے سارے شکوک و شبہات کو یک قلم ختم کر دیا اور نبی اعظم و آخر ﷺ کی

حیثیت صاف صاف لفظوں میں بیان کر دی اور کوئی گنجائش کسی صاحب ایمان کیلئے باقی نہ رہی فرمایا "دیکھو تمہارا پروردگار اس بات پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں۔" ایک ایک لفظ پر غور کرتے جاؤ اور اس عبارت کو جو تمہاری اپنی زبان میں تحریر کی گئی ہے بار بار پڑھو حقیقت تم پر خود بخود واضح ہوتی جائے گی کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کی حیثیت مسلمان معاشرے میں کیا ہے؟ ایمان کی بنیادی شرط رسول اللہ ﷺ کی ظاہراً و باطناً" اطاعت ہے۔ اس کا پتہ کیسے چلے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے تمام نزاعات میں تمہیں حاکم نہ مانیں۔ ایک بات میں کہوں' کوئی مولانا یا علامہ صاحب کہیں' کوئی پیر و امام کہے درجات میں کمی بیشی کے اعتبار سے بات کی اصلیت کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ان میں سے کسی کو غلطی لگی ہو کیونکہ غلطی کا احتمال ہے لیکن جو بات اللہ تعالیٰ ارشاد فرما دے اس میں بھی کوئی شک باقی رہا؟ ہاں! تو کسی طرح کا شک و شبہ کرنے والا؟ یہ کہ وہ مسلمان نہ رہا۔ بس اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ "تیرے رب کی قسم وہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے" "حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ "جب تک اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں آپ ﷺ کو حاکم نہ بنائیں۔"

اس جگہ اس قسم کا موقع و محل بھی ملحوظ رہے اس سے صرف رسول کی ظاہری و باطنی اطاعت کی تاکید ہی مقصود نہیں بلکہ یہ منافقین کی جھوٹی قسم جس کا ذکر آیت ۶۲ میں کیا گیا جہاں ارشاد ہوا کہ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ "پھر وہ تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں۔" سچی قسم کے ساتھ تردید کرنا بھی مقصود ہے پھر "وَرَبِّكَ" کے خطاب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کیلئے التفات خاص کی جو دل نوازی ہے اس کی بلاغتوں کا اندازہ تو صرف اہل ذوق ہی کر سکتے ہیں میرے جیسے عقل کے پھسڈی نہیں کر سکتے اور قلم بھی ان کی تعبیر سے قاصر ہے۔

آگے چلنے سے پہلے ایک بار پھر غور کر لو' کیا آج ہم مسلمانوں میں کوئی جھگڑا قضیہ نہیں رہا ہم اپنے فیصلے کس سے کراتے ہیں؟ ہمارے مذہبی مشاجرات کا حل کہاں ہے؟ ہمارے مختلف مکاتب ہائے فکر میں کوئی جھگڑا نہیں؟ ہمارے سیاسی مناقشات کا حل؟ کیا ہم سب مسلمان ہیں؟ قرآن کریم کیا کہتا ہے؟ "تیرے رب کی قسم وہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں آپ ﷺ کو حکم نہ مان لیں۔" کیا قرآن کریم صرف پڑھنے کیلئے ہے؟ اظہار عقیدہ کیلئے ہے؟ پھر سوچ لو کہ منافقت کیا ہے؟ کیا اسلام تقریروں سے آئے گا۔ اسلام اسلام کے شور سے' نعرے بازی اور ہلڑ بازی سے؟ ہاں! جو رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ نہ کرائے وہ کون؟

یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے فرمایا ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ "ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کرو اس کے خلاف اپنے اندر کسی طرح کی کھٹک محسوس نہ کریں۔"

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کا احترام ایسا ہے کہ اس کو صرف ظاہری طور پر مان لینے سے بھی ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ فیصلہ تہ دل سے تسلیم نہ کرلیں۔ جس چیز کو دل یقین کر لے اس میں کوئی شک کی گنجائش؟ یہ فقرہ بار بار دہرائیں کہ "ہمارے دلوں میں یقین آجائے۔" سو بار کہیں ہزار بار کہیں اور پھر دیکھیں ہمارے دلوں میں کیا یقین آگیا ہے؟ یقین آنے کا مطلب کیا؟ کہ فیصلہ رسول ﷺ سے کرائیں اور کسی دوسرے سے ہرگز نہ کرائیں۔ کبھی اس طرف دھیان بھی دیا؟ واللہ! پھر سوچ لو اور سوچ کر جواب دو؟ کبھی دل میں خیال پیدا بھی ہوا کہ فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے کرائیں۔

کیسے کرائیں رسول تو موجود نہیں؟ رسول موجود نہیں۔ اس تمہاری عدالت میں جس نے قانون بنایا تھا وہ موجود ہے؟ سول میں؟ انتظامیہ میں؟ ہائی کورٹ میں؟ سپریم کورٹ میں؟ غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟ رسول موجود نہیں' کیا رسالت بھی موجود نہیں؟ قانون لانے والا موجود نہیں' کیا قانون بھی موجود نہیں؟ سوچ کر جواب دو کہ قرآن کیا ہے؟ فرمان رسول کیا ہے؟ کیا قرآن بھی موجود نہیں؟ پھر رسول کا فرمان بھی موجود نہیں؟ ان حجتوں سے جان نہیں چھوٹے گی۔ ان بہانوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

نبی اعظم و آخر ﷺ بحیثیت رسول خود امت کے حاکم اور ہر پیش آنے والے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ آپ ﷺ کی حکومت اور آپ ﷺ کا فیصلہ کسی کے حکم بنانے پر موقوف نہیں پھر مسلمانوں کو اس آیت میں حکم بنانے کی تلقین؟ اس لئے فرمائی گئی کہ حکومت کے مقرر کردہ حاکم اور اس کے فیصلہ پر تو بہت سے لوگوں کو اطمینان نہیں ہوا کرتا جیسا کہ اپنے مقرر کردہ ثالث یا حاکم پر ہوتا ہے مگر رسول مکرم صرف حاکم نہیں ایک معصوم شخصیت بھی ہیں' رحمتہ للعلمین بھی ہیں' امت کے شفیق و مہربان باپ بھی ہیں اس لئے تعلیم یہ دی گئی کہ جب بھی کسی معاملہ میں یا کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو فریقین کا فرض ہے کہ رسول کریم ﷺ کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ کرائیں اور پھر آپ ﷺ کے فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کر کے عمل کریں۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کی مزید وضاحت خود فرما دی۔ فرمایا

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۵۹ : ۷) "جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے رک جاؤ۔" کیا اس کا مطلب یہ نہیں؟" کہ تمام معاملات میں مسلمان رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں جو وہ دے لے لیں اور جس سے وہ روکیں رک جائیں۔" کیا شرک اور کفر کی کوئی تشریح رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمائی؟ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کے متعلق کچھ نہیں فرمایا؟ والدین' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' فقیروں اور مسافروں کے متعلق کچھ نہیں فرمایا؟ وراثت کی تقسیم۔ لین دین کے اصول' قرض و ادھار کے متعلق کوئی راہنمائی نہیں چھوڑی؟ مذہبی' سیاسی اور اخلاقی معاملات کی وضاحت نہیں فرمائی؟ آخر زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس کو آپ ﷺ نے تشنہ چھوڑ دیا؟

اچھا' حکومتی فیصلوں کی ذمہ داری تو حکومت پر ہے وہی اس کی جواب دہ ہوگی۔ آپ کے انفرادی فیصلے'

مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا

نکل کھڑے ہو تو چند آدمیوں کے سوا کوئی بھی اس کی تعمیل[۱۱۹] نہ کرتا۔ حالانکہ اگر یہ اس پر عمل

گھریلو مناقشات' مذہبی اختلافات' بھائیوں بھائیوں میں شکر رنجیاں؟ مالی معاملات؟ تقسیم وراثت کے مسائل؟ ہر وہ معاملہ جو حکومت ہی کی ذمہ داری کا نہیں اس کا کیا حال ہے؟ کیا اس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کچھ نہیں دیا؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ان معاملات میں سے کسی بات سے منع نہیں فرمایا؟

آپ کے اس ملک پاکستان میں کتنے فیصلے خالصتہ" مذہب کے نام پر کئے گئے۔ ایک ایک فیصلہ کو باری باری قرآن و سنت کی سان پر چڑھاؤ۔ کیا جو کچھ مذہب کے نام پر ہوا پھر اس کے نفاذ میں جو کچھ کیا گیا وہ رسول اللہ ﷺ کی رضامندی کے مطابق ہے؟ اللہ کی حاکمیت؟ قرآن و سنت کے خلاف کسی قانون کی نفی؟ عائلی قوانین؟ تعزیرات سرقہ و زنی؟ قانون وراثت؟ عشر و زکوٰۃ؟ خمر و شراب کی حرمت؟ جمعہ کی تعطیل؟ جیز کی پابندی؟ شاتم رسول کی سزا' احمدی غیر مسلم یا کافر' ناموس صحابہ؟ شرعی عدالتوں کا قیام وغیرہ وغیرہ۔ اس آیت کے آخر میں جو الفاظ ہیں وہ بھی اچھی طور غور کے لائق ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا کہ "اور وہ جو کسی بات کو پوری پوری طرح مان لینا ہوتا ہے تو ٹھیک اسی طرح مان لیں۔"

ان لوگوں کو اپنے آپ کو قتل کرنے' گھروں سے نکلنے کا حکم دیا جاتا تو کیا یہ بجالاتے؟

[۱۱۹] اطاعت و فرمانبرداری کا ان کو حکم دیا گیا تھا اس پر انہوں نے جیسا کیسا عمل کیا وہ سب پر عیاں ہے کہ ان میں سے کتنے تھے جو منہ سے اقرار کرنے کے باوجود عملی کوتاہی کے مرتکب ہوئے۔ کونسا وہ داؤ ہے جو انہوں نے نہیں لگایا؟ کونسا وہ حکم ہے جس کو انہوں نے بلا چون و چرا مان لیا؟ کونسا وہ وقت ہے کہ وہ چیں بجبیں نہیں ہوئے؟ یہ کن لوگوں کا بیان ہے انہی منافقین کا جو نام کے مسلم اور کام و عمل کے کافر تھے۔ اب ان کی حالت کو مزید ظاہر کرنے کیلئے تاکہ ان کا نفاق کھل کر سامنے آجائے اور اس طرح گویا" جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا دیا جائے" کا اصول بتایا گیا کہ کہنے کو تو وہ اسلام کے مدعی بنے بیٹھے ہیں لیکن ابھی تک وہ جاہلیت کے مطابق روابط و تعلقات اور رسم و رواج کے پھندوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تک خاندان' برادری' قبیلہ اور قوم کی زنجیریں اور بیڑیاں بھی ان کے پاؤں میں ہیں اور وطن و سرزمین کی وابستگیاں بھی دامن گیر ہیں اس وجہ سے یہ آگے بڑھنے کی بجائے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں حالانکہ اسلام کا اول مطالبہ یہی ہے کہ آدمی ہر زنجیر کو توڑ کر صرف اللہ کیلئے اٹھ کھڑا ہو جس طرح مہاجرین اولین اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

یاد رہے کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود اور اطراف مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اسلام کے اظہار پر تو مجبور ہوگئے تھے لیکن یہ اپنے روابط سرداران یہود اور اپنے قبائلی سرداروں کے ساتھ بھی مسلسل رکھنا چاہتے تھے اور اس غرض کیلئے اپنے اکثر معاملات و مقدمات میں

يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ﴿٦٦﴾ وَإِذًا

کرتے اور پوری طرح جمے بھی رہتے تو ان کے حق میں اچھا ہوتا۔ ۶۶ ۱۲۰

بھی ان سے رجوع کرتے تھے اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ دونوں طرف روابط رکھ کر دنیوی فوائد حاصل کرتے رہیں۔ قرآن کریم نے ان کی اس کمزوری سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھانا شروع کیا اور ان کو صاف ننگا کر دکھایا۔ اس جگہ ارشاد فرمایا کہ ان کو اپنوں سے لڑنے اور اپنے گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آملنے کا حکم دیا جائے تو اس جہاد و ہجرت کیلئے یہ لوگ کبھی آمادہ نہ ہوں گے یا بہت ہی تھوڑے ہوں گے جو اس امتحان سے پاس مارکس حاصل کر سکیں۔

"اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" کا حکم قرآن کریم نے بار بار ارشاد فرمایا ہے اور ہمارے مفسرین نے اس سے مراد اپنے آپ کو قتل کر دینے ہی سے زیادہ تر لی ہے جو کسی صورت بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ خودکشی ہے جس کی کبھی بھی اجازت نہیں دی گئی اور حکم و اجازت میں جو فرق ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ ہاں! خودکشی کی سزا اسلام میں بڑی سخت ہے۔ یہ ایک طرح کا محاورہ ہے جو اپنے اندر بہت سا مضمون پوشیدہ رکھتا ہے۔ ہاں! بلاشبہ میدان جنگ میں مسلمانوں نے اپنے خویش و اقارب پر تلوار چلائی ہے اگر اس سے یہی حکم مراد لیا جائے تو بھی اس کی گنجائش موجود ہے لیکن وہ بات جو مفسرین نے لکھی ہے اس کی تو کوئی بھی اصل اسلام میں موجود نہیں کہ ایک طرح کا توبہ کا طریقہ تھا کہ جب انہوں نے اپنے آپ کو قتل کر دیا تو اللہ نے ان کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس طرح ان کی توبہ قبول ہوگئی ساری بے پر کی اڑائی گئی ہیں۔

جہاد جو اپنی فطرت ہی سے ایک آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان لوگوں کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون کے رشتے موجود ہوں اور جن کی حمیت و حمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہو جن کا اٹھانا بٹھانا اور پرورش کرنا ابھی تک یاد ہو' جن کے پیار و محبت کی داستانیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہوں تو یہ آزمائش اور بھی سخت تر ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس صورت میں تلوار گویا اپنی ہی جانوں پر چلانا پڑتی ہے لیکن اسلام کے حق کے مقابلہ میں خون اور نسب کا کوئی رشتہ بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا اس لئے رب کریم کی وفاداری کا امتحان پاس کرنے کیلئے اہل ایمان کو اس مرحلہ سے بھی گزرنا پڑتا ہے چنانچہ تاریخ اسلام شاہد کہ میدان بدر میں ماموں کی تلوار بھانجے' بھتیجے کی تلوار چچا اور بیٹے کی تلوار نے باپ کو میدان جنگ میں ڈھیر کر دیا اور اس طرح عصبیت' جاہلیت کے تمام روابط دین الٰہی کے آگے بالکل بے حقیقت اور ہیچ ہو کر رہ گئے۔

جو چیز مشکل سے حاصل کی جائے اس کی قدر و منزلت دل میں بڑھ جاتی ہے

۱۲۰ اسلام کی اس حقیقت کی طرف یہاں ان منافقین کی بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر یہ بھی

لَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ

تو اس وقت ضروری تھا کہ ہم اپنی جانب سے انہیں ایسا اجر عطا فرماتے جو بڑا اجر ہوتا ۶۷ (۱۲۱)

اور ایسی راہ لگا دیتے جو سیدھی راہ ہوتی۔ ۶۸ (۱۲۲)

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا

اپنے خاندان و قبیلہ اور گھر در کی وابستگیوں سے آزاد اور یکسو ہو کر کلیتہ" مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح ہی اسلام کی قدر و قیمت کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جو چیز جتنی مشکل سے حاصل ہوئی ہے اتنی ہی اس کی قدر و قیمت انسان کے دل میں زیادہ ہوتی ہے اور جتنی ہی کوئی چیز آسانی اور آرام سے حاصل ہو جائے اس کی قیمت اتنی ہی انسان کے دل میں بہت کم ہوتی ہے۔ ایک چیز اپنی کمائی سے اور پھر کمائی بھی بڑی محنت کی ہو تو اس کو عوض دے کر خریدی گئی چیز کے ساتھ جو محبت و انس ہوگی وہ اس سے سوگنا قیمتی چیز جو مفت میں حاصل ہوگئی ہو اس سے نہیں ہوتی۔ یہی حال اسلام کا ہے اس کیلئے قربانیاں دی گئی ہوں تو جو اس وقت اس کی قدر و قیمت دل میں ہوگی اس کو اس کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے جو نسلا" بعد نسلٍ مسلمان ہوتا آیا ہے فرمایا اس طرح جب یہ لوگ قربانیاں دے کر اسلام میں داخل ہوں گے اور فاسد ماحول سے نکل کر جب یہ پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں گے تو اس وقت ان کی کمزوریاں دور ہوں گی اور پھر یہ بھی اسلام کے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر اللہ کے وفادار اور حق کے خدمت گزار ہو جائیں گے۔

فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ اطاعت رسول پورے طور پر کریں تو یہ ان کی دونوں طرح پر بھلائی کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی ان کی بہتری کا موجب ہوگا اور ایمان میں بھی وہ مضبوط ہوں گے اور ثابت قدمی میں بھی ترقی کریں گے۔ یا آخرت میں یہ ان کی بھلائی کا موجب اور دنیا میں ان کی ثابت قدمی کا موجب ہوگا۔ اس سے یہ منشاء نہیں کہ حفاظت دین کیلئے اپنے آپ کو قتل تک کیلئے پیش کرنا یا اپنے گھر کو چھوڑ دینا کسی حال میں جائز نہیں، کیوں نہیں بلکہ یہ بعض اوقات فرض عین ہے کیونکہ دین کے مقابلہ میں جان عزیز ہونا اسلام کا حکم نہیں بلکہ دین کی خاطر جان کی قربانی دینا اسلام کا ایک اہم ترین حکم ہے۔ ہاں! اپنی جان کو خود قتل کر دینا اور پھر یہ کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ایک بالکل طفلانہ بات ہے جو نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے اور اس طرح کے قتل کو قربانی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ" کنوئیں میں گرے کو خصی کر لینے کے مرادف ہے" یا اس کو" لہو لگا کر

أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝٦٩ ذٰلِكَ الْفَضْلُ

جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور وہ نبی ہیں' صدیق ہیں' شہید ہیں اور نیک اور راست باز انسان ہیں اور ایسے ساتھی کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔ ۱۲۳ ۶۹

شہیدوں میں داخل ہونے" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اسلام ایک عقل و فکر کا مذہب ہے "سکھ شاہی" کا نام نہیں۔

بعض چیزوں کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ خرچ کرنے ہی سے بڑھتی ہیں

۱۲۱ اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ احکام پر عمل کرنے سے خود قوت ایمانی ضعیف سے قوی اور قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد یقین کی باطنی کیفیت کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ بشرطیکہ وہ تجارت نہ ہو کیونکہ تجارت کے اصول دین کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔

اِذاً یعنی اس وقت جب انہوں نے احکام خداوندی سرانجام دیئے ہوتے اور رسول اللہ ﷺ کا اتباع کیا ہوتا اور نتیجۃً" انہیں خیر و صلاح بھی حاصل ہو چکتی اور دین میں ثبات و استقامت بھی نصیب ہو چکتی اس لئے کہ یہ ایک اصولی بات ہے کہ کاشتا وہی ہے جو بیجتا ہے جو بیجے گا نہیں آخر کاٹے گا کیا؟

اس طرح دین کی شاہراہ پر وہ بھی گامزن ہو جاتے

۱۲۲ "اور ہم ان کو ایسی راہ پر لگا دیتے جو سیدھی راہ ہوتی۔" اور اس طرح وہ بے دھڑک سیدھے رضائے الٰہی کے مقام جنت میں داخل ہو جاتے اور عجب نہیں کہ اس کی برکت سے دنیا میں بھی سعی و عمل کی راہ مستقیم ان پر خوب روشن ہو جاتی۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اصل ثمرہ

۱۲۳ جو لوگ سب سے کٹ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کو اللہ کے انعام یافتہ بندوں انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین کی معیت و رفاقت حاصل ہوتی ہے اور کیا ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اس پاک گروہ کی معیت و رفاقت حاصل ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس فضل خاص کے مستحق بندوں سے بے خبر نہیں ہے جو لوگ اس فضل کے حاصل کرنے کیلئے ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیلیں گے وہ مطمئن رہیں کہ اللہ ان کی جاں بازیوں سے اچھی طرح باخبر ہے اور ان کیلئے خاص انعامات رکھے گئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان تمام چیزوں پر عمل کریں جن کے کرنے کا حکم اللہ نے اور اس کے رسول

ﷺ نے دیا ہے اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے تو عمل کے اعتبار سے ان کے مختلف درجات ہوں گے اول درجہ کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت کے مقامات عالیہ میں جگہ عطا فرمائیں گے اور دوسرے درجہ کے لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ جگہ عطا فرمائیں گے جو انبیاء کرام کے بعد ہیں جن کو صدیقین کہا جاتا ہے یعنی وہ اجلہ صحابہ کرام جنہوں نے بغیر کسی جھجھک اور مخالفت کے اول ہی روز کو ایمان کی دعوت سنی تو اس کو قبول کر لیا جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر تیسرے درجہ کے حضرات شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ شہداء وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان اور مال قربان کر دیا پھر چوتھے درجہ کے حضرات صلحاء کے ساتھ ہوں گے اور صلحاء وہ لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں اعمال صالحہ کے پابند ہیں اور اس کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

انبیاء کرام سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سچائی کے وہ تمام پیغامبر ہیں جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں پیدا ہوتے رہے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت سے حکم الٰہی کے مطابق نوع انسانی کو خدا پرستی اور نیک عملی کی دعوت دی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے نبی اعظم و آخر ﷺ کو مبعوث فرما کر نبوت کا دروازہ بند کر دیا اور اب تاقیامت آپ ﷺ ہی کی دعوت جاری و ساری رہے گی۔

صدیق اسے کہتے ہیں جس میں سچائی کی روح غالب ہو یعنی ایسا انسان جو سچائی سے فطری مناسبت رکھتا ہو اور اسے دیکھتے ہی پہچان لیتا اور قبول کر لیتا ہو۔ شہید کے معنی ہیں گواہی دینے والا یعنی ایسا انسان جو اپنے قول و عمل سے سچائی کا اعلان کرنے والا ہو اور دنیا میں اس کیلئے شہادت و حجت قائم کر دے۔ صالحین سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو اپنے اعتقاد و عمل میں نیک اور راست باز ہوں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کرنے والے ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور مقبول ہیں جن کے چار درجے بتلائے گئے ہیں۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اس آیت کریمہ کو کچھ لوگوں نے نبوت کے جاری ہونے کیلئے دلیل بنایا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح آج بھی ایک انسان نیک اعمال کر کے صالحین میں شمار ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو کر شہداء میں اور ہر معاملہ میں سچ بول کر سچائی کو مان کر اور سچائی کا ساتھ دے کر صالحین میں شمار ہو سکتا ہے اسی طرح ترقی کرتے کرتے وہ نبی بن کر انبیاء میں بھی داخل ہو سکتا ہے حالانکہ یہ لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نبوت و رسالت کسبی چیز نہیں کہ ایک انسان محنت کر کے اس عہدہ کو حاصل کر لے بلکہ یہ خالصتہً وہبی یا عطائی چیز تھی جس کے قیامت تک ختم کر دینے کا اعلان الٰہی موجود ہے پھر اللہ تعالیٰ کے بند کئے ہوئے دروازہ کو کھول سکے ایسی بات وہ شخص تو نہیں کہہ سکتا جس کے دل میں ایمان نام کی کوئی شے موجود ہو اور جس کے دل میں ایمان ہی نہ ہو اس کی زبان کچھ کہے اس کا اعتبار کیا؟

وقد اخطا من استدل بهذه الایه علی بقاء النبوة مطلقة کانت او مقیدة لان الله قد سد بها بها وخوختها وختمها قولًا منه وفعلا الی یوم القیامة (آیات للسائلین ص ۲۲۷ الحافظ عنایت اللہ الاثری رحمہ اللہ)

پھر قرآن کریم میں اس آیت کے اندر یہ بات بیان فرما دی گئی اور اس کی ترتیب اس طرح رکھی کہ اس بات کا کسی کو شبہ ہی پیدا نہ ہو سکے کیونکہ عطائی اور وہبی چیز کو سب سے پہلے فرمایا تاکہ حاصل کرنے اور کمانے کا مفہوم اس سے پیدا ہی نہ ہو سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی نبوت' کتاب اور حکمت کا ذکر فرمایا وہاں "اٰتَیْنَا" "اٰتَیْنٰهُمْ" "اٰتَانِیْ" "یُؤْتِیْهِ" "جَعَلْنَا" "جَعَلْنٰهُمْ" "جَعَلَنِیْ" "اَرْسَلْنَا" "اَرْسَلَنِیْ" "اَرْسَلْنٰهُمْ" اور "اَنْزَلْنَا" وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے۔ کیا حاصل کرنے اور عطا کئے جانے یا دیئے جانے میں کوئی فرق نہیں؟ کیوں نہیں اس فرق کو تو بچے بھی جانتے ہیں لیکن جس کو غرض نے اندھا کر دیا ہو' وہ کیا سمجھے؟ ڈوبنے والا ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ شاید کوئی تنکا ہی سہارا بن جائے؟ لیکن کبھی کوئی تنکے کے سہارے بچ بھی نکلا؟ پھر جس کو اللہ غرق کرنا چاہے اسے کون بچا سکتا ہے۔ یہ اللہ کا غرق کرنا کیا ہے؟ اس کے قانون کا مطالعہ کرو بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

اس طرح "ہونے" اور "ساتھ ہونے" میں بھی بہت بڑا فرق ہے اور ہر آدمی اس کو سمجھتا ہے جس کو اللہ نے عقل و فکر دی ہے وہ ان باتوں میں غور کرتا ہے۔ قرآن کریم نے "مَعَ الَّذِیْنَ" "ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے" کے الفاظ نے اس بحث کو بالکل بند کر دیا ہے جو خواہ مخواہ چھیڑ دی گئی اور یہ بات بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ چھیڑ چھاڑ کرنے والے شرارتی ذہن کے لوگ کبھی شرارت سے باز نہیں آتے۔ باب نبوت کے بند ہونے کے بعد اس کو کھٹکھٹانے والے شرارتی نہیں تو اور کیا ہیں؟

زیر نظر آیت ایک خاص واقعہ کی بناء پر نازل ہوئی جس کو امام تفسیر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے متعدد اسانید سے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابی رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے دل میں آپ ﷺ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے' اپنی بیوی سے بھی' اپنی اولاد سے بھی' بعض اوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی زیارت کر لوں تب سکون ہوتا ہے' اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دنیا سے آپ ﷺ کی وفات ہو جائے اور مجھے بھی موت آجائے گی تو میں جانتا ہوں کہ آپ ﷺ جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ درجات عالیہ میں ہوں گے اور مجھے اول تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں؟ اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ ﷺ سے بہت نیچے ہوگا' میں وہاں آپ ﷺ کی زیارت نہ کر سکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

آنحضرت ﷺ نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا' یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوگئی وَمَنْ یُّطِعِ

اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ○ اس وقت آنحضرت ﷺ نے ان کو بشارت سنا دی کہ اطاعت گزاروں کو جنت میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہدا اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا' یعنی درجات جنت میں تفاضل اور اعلیٰ ادنیٰ..... ہونے کے باوجود ملاقات و مجالست کے مواقع ملیں گے۔

جنت میں ملاقات کی چند صورتیں

جس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے جیسا کہ موطاء امام مالک رحمہ اللہ میں بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت اپنی کھڑکیوں میں اپنے سے اوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں گے جیسے دنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو۔

اور یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کیلئے آیا کریں گے' جیسا کہ ابن جریر نے بروایت ربیع نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اونچے درجات والے نیچے درجات کی طرف اتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور مجالست ہوا کرے گی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کیلئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اجازت ہو' اس آیت کی بناء پر رسول کریم ﷺ نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن اسلمی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ رات گزارتے تھے' ایک رات تہجد کے وقت کعب اسلمی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کیلئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لا کر رکھیں تو آپ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا : مانگو کیا مانگتے ہو؟ کعب اسلمی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا' میں جنت میں آپ ﷺ کی صحبت چاہتا ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا اور کچھ؟ تو انہوں نے عرض کیا اور کچھ نہیں؟ اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو "اعنی علیٰ نفسک بکثرۃ السجود" یعنی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا لیکن اس میں تم بھی میری مدد اس طرح کرو کہ کثرت سے سجدے کیا کرو' یعنی نوافل کی کثرت کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں پانچ وقت کی نماز کا بھی پابند ہوں اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہوں اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرجائے وہ انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا' بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء

"یعنی وہ بیوپاری جو سچا اور امانت دار ہو' انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"

قرب کی شرط محبت ہے

رسول کریم ﷺ کی صحبت اور رفاقت آپ ﷺ کے ساتھ محبت کرنے سے حاصل ہوگی' چنانچہ صحیح بخاری میں طرق متواترہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں پہنچا' آپ ﷺ نے فرمایا المرأ مع من احب "یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو دنیا میں کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس حدیث سے' کیونکہ اس حدیث نے ان کو یہ بشارت دے دی کہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ محبت کرنے والے محشر اور جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ ہوں گے۔

صدیقین کی تعریف قرآن کریم میں

یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"جو لوگ روز جزاء کو برحق مانتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔" (المعارج ۷۰ : ۲۶' ۲۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انہوں نے اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں کی یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۲۳' ۲۴)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی وہ سچے لوگ ہیں۔" (الحجرات ۴۹ : ۱۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

"یہ مال ان غریب مہاجرین کیلئے ہے جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ ہیں' یہی راست باز لوگ ہیں۔" (الحشر ۵۹ : ۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا

"اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے انسانوں کو ان کی سچائی کام آئے گی ان کیلئے جنتیں ہیں جن کے

تلے نہریں بہہ رہی ہیں۔" (المائدہ ۵ : ۱۱۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ پر' آخرت کے دن پر' فرشتوں پر' آسمانی کتابوں پر اور اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اللہ کی محبت کی راہ میں اپنا مال' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں اور سائلوں کو دیتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرانے کیلئے خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں' جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اسے پورا کر کے رہتے ہیں' تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر کرنے والے ہوتے ہیں بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہوئے اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔" (البقرہ ۲ : ۱۷۷)

شاہدین کی تعریف قرآن کریم میں

فرمایا جو لوگ اللہ کی طرف سے دلیل و حجت پر ہیں اور انہوں نے راہ حقیقت پا لی ہے اور ان کے پاس اس بات کی دلیل و گواہی بھی موجود ہے جس کو وہ ایمان و ایقان سے مان چکے ہیں وہ ان مغرورین دنیا کی طرح نہیں ہو سکتے۔ ان کی راہ ہدایت الٰہی کی راہ ہے اور ہدایت الٰہی کی کامیابی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"پھر دیکھو جو لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتے ہیں یعنی وجدان و عقل کا فیصلہ اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اللہ کی طرف سے آگیا ہو یعنی اللہ کی وحی اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی پیشوائی کرتی ہوئی اور سرتاپا رحمت آچکی ہو اور اس کی تصدیق کر رہی ہو تو کیا ایسے لوگ انکار کر سکتے ہیں؟" (ھود ۱۱ : ۱۷) ایک جگہ فرمایا

"مسلمانو! ہم نے تمہیں نیک ترین امت ہونے کا درجہ عطا فرمایا تاکہ تمام انسانوں کیلئے سچائی کی گواہی دینے والے ہو اور تمہارے لئے اللہ کا رسول گواہی دینے والا ہو۔" (البقرہ ۲ : ۱۴۳) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں' ان کیلئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔" (الحدید ۵۷ : ۱۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن کریم میں بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔" (الحج ۲۲ : ۷۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔"

(الاحزاب ۳۳ : ۴۵)

نبی کو گواہ بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں۔ ایک قومی شہادت دوسرے عملی شہادت اور تیسرے اخروی شہادت۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور جس روز ہم ہر امت میں انہی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کر کھڑا کریں گے جو ان کے اوپر گواہی

دے گا اور اے پیغمبر اسلام تمہیں ان لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔" (النحل ۱۶ : ۸۹)

صالحین کی تعریف قرآن کریم میں

فرمایا جو لوگ ایمان و عمل کی سچائی رکھتے ہیں ضروری ہے کہ وہ اپنی نیک عملی کا نیک اجر پائیں۔ رب کریم کا قانون مکافات کسی خاص گروہ اور نسل ہی کیلئے نہیں ہے بلکہ تمام نوع انسانی کیلئے ہے جو انسان بھی راست باز اور نیک کردار ہوگا اللہ کے ہاں اجر محفوظ پائے گا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائی سے روکتے ہیں' بھلائی کے تمام کاموں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نیک کردار ہیں۔" (ال عمران ۳ : ۱۱۴)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔" (العنکبوت ۲۹ : ۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور زبور میں ہم تذکیر و نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔" (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۵) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس کلام پر جو سچائی کے ساتھ ہمارے پاس آیا ہے ایمان نہ لائیں اور اللہ سے اس کی توقع نہ رکھیں کہ وہ ہمیں نیک کردار انسانوں کے گروہ میں داخل کر دے؟" (المائدہ ۵ : ۸۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"میرا کارساز تو بس اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی اور وہی ہے جو نیک انسانوں کی کارسازی کرتا ہے۔" (الاعراف ۷ : ۱۹۶) ایک جگہ ارشاد فرمایا

"اے پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا' اے آسمان و زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو اپنے فضل و کرم سے ایسا کیجئو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔ (یوسف ۱۲ : ۱۰۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور مجھ کو صالحون کے ساتھ ملا دے۔" (الشعراء ۲۶ : ۸۳)

یہی دعا ہر ایک مسلم انسان کی ہونا چاہئے کہ اے اللہ! دنیا میں مجھے صالح سوسائٹی دے اور آخرت میں میرا حشر نیک لوگوں کے ساتھ کر دے۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے صالح لوگوں کے ساتھ کسی کا حشر ہونا اور اس کا نجات پانا گویا ہم معنی ہیں اس لئے یہ تو ہر انسان کی دعا ہونی چاہئے جو حیات بعد الموت اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہے لیکن دنیا میں بھی ایک پاکیزہ روح کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بداخلاق' فاسق و فاجر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی مصیبت سے نجات دے اور اس کو نیک لوگوں کے ساتھ ملائے۔

معاشرے کا بگاڑ تو جہاں چاروں طرف محیط ہو وہاں ایک آدمی کیلئے صرف یہی چیز ہمہ وقت اذیت کا موجب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گردوپیش گندگی ہی گندگی پھیلی ہوئی دیکھتا ہے بلکہ اس کیلئے خود پاکیزہ رہنا اور اپنے آپ کو گندگی کے چھینٹوں سے بچا کر رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے ایک صالح آدمی اس وقت تک بے چین ہی رہتا ہے جب تک یا تو اس کا اپنا معاشرہ پاکیزہ ہو جائے یا پھر وہ اس سے نکل کر کوئی دوسری سوسائٹی نہ پالے جو حق و صداقت کے اصولوں پر چلنے والی ہو۔

اوپر سورہ الانبیاء کی آیت ۱۰۵ کا ترجمہ درج کیا گیا ہے خیال پڑتا ہے کہ شاید یہ کسی دوست و عزیز کے دل میں کھٹ کھٹ پیدا کر دے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ آیت قرآن کریم میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۵)

"دیکھو ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کی وراثت انہی بندوں کے حصے میں آئے گی جو نیک ہوں گے۔"

ایک غلطی کا ازالہ

اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کریم کی تردید اور پورے نظام دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قائدہ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثت زمین ہے' جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر ان قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وارث زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر' مشرک' دہریئے' فاسق' فاجر' سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف صاف الفاظ میں کفر' فسق' فجور' معصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئی اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرمانرواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر' مخالف' بلکہ مد مقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارث زمین ہوئے ہیں اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کلیہ تو غلط نہیں ہو سکتا' اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ "صالح" کے اس مفہوم میں ہے جو اب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں "صالح" قرار پا سکیں' قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ

ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء ان کی راہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصور "صلاح" کو ڈارونی تصور "صلاحیت" (Fitness) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رو سے آیت زیر بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی ممالک کو فتح کرنے اور ان پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی "خدا کا صالح بندہ" ہے اور اس کا یہ فعل تمام "عابد" انسانوں کیلئے ایک پیغام ہے کہ "عبادت" اس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے' اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں وراثت زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ تمہارا شمار صالحین میں ہو سکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر "صلاح" اور "عبادت" کا تصور یہ ہے تو پھر ایمان (ایمان باللہ' ایمان بالیوم الاخر' ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب) کیا ہے جس کے بغیر خود اسی قرآن کی رو سے' خدا کے ہاں کوئی عمل صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی ہیں کہ اس نظام اخلاق اور قانون زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر' فاسق' عذاب کا مستحق اور مغضوب بارگاہ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمانداری کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان' اسلام' توحید' آخرت' رسالت' ہر چیز کے معنی بدل ڈالے تاکہ وہ سب ان کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں اور اس ایک چیز کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انہوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرمت دین سے اختلاف کرتے ہیں ان کو یہ الٹا الزام دیتے ہیں کہ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں" یہ دراصل مادی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے' حالانکہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے' اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے وہ "مادی ترقی اور حکمرانی کی صلاحیت" کی ہم معنی نہیں ہے' اور "صالح" کو اگر "صاحب صلاحیت" کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں' حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آرہا ہے وہ عالم آخرت میں مومنین' صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضموں میں یکایک اس مضمون کو بیان کرنے کا آخر کونسا موقع تھا کہ دنیا میں وراثت زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے؟

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا یہ مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں' جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے' زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اس ابدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظام زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون آیات ۱۰۔ ۱۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخ صورِ اول و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرمایا ہے' پھر کفر کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتایا ہے کہ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ○ "اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کیلئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو' تم بہت اچھے رہے' آؤ اب اس میں ہمیشہ رہنے کیلئے داخل ہو جاؤ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا' اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کیلئے۔" دیکھئے یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں اور دونوں جگہ وراثت زمین کا تعلق عالم آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے۔

اب زبور کو لیجئے جس کا حوالہ آیت زیر بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت پائی جاتی ہے یہ اپنی اصلی غیر محرف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزامیر داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خلط ملط ہو گئے ہیں اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زبور اس وقت موجود ہے اس میں بھی نیکی اور راستبازی اور توکل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

"کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔

مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۞ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا
حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۞ وَاِنَّ مِنْكُمْ
لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ

یہ بخشش و کرم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے۔[۱۲۴] ۷۰

مسلمانو! اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو پھر مقابلے میں نکلو الگ الگ گروہوں میں ہو کر یا اکٹھے ہو کر۔[۱۲۵] ۷۱

اور دیکھو! تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ وہ ضرور قدم پیچھے ہٹائے' اگر تم پر کوئی

کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا' تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے..... ان کی میراث ہمیشہ کیلئے ہوگی..... صادقین زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔" (۳۷ داؤد کا مزامیر۔ آیات ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۹۔ ۲۹۔)

دیکھئے' یہاں راست باز لوگوں کیلئے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں کی رو سے خلود اور ابدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا کی زندگی سے۔

دنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے اسے سورۂ اعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (آیت ۱۲۸) "زمین اللہ کی ہے' اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔" مشیت الٰہی کے تحت یہ وراثت مومن اور کافر' صالح اور فاسق' فرماں بردار اور نافرمان سب کو ملتی ہے مگر جزائے عمل کے طور پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر' جیسا کہ اسی آیت کے بعد دوسری آیت میں فرمایا وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ

نیک لوگوں کی رفاقت کا میسر آنا اللہ کا فضل و کرم ہے

۱۲۴ ان لوگوں کی رفاقت کا میسر آنا اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم کافی و وافی ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر حاوی و محیط ہے لوگوں کی نیتوں کو بھی لوگوں کے عمل کو بھی اور ان کے مقتضائے عمل کو بھی۔ مطلب بالکل واضح ہے کہ عام مومنین کو جو ان کاملین کی معیت و رفاقت نصیب ہوگی یہ محض فضل الٰہی کا ظہور ہوگا ان کے اعمال کا ثمرہ نہیں۔

مسلمانوں کو نور بصیرت سے کام لینے کی ایک خاص ہدایت

۱۲۵ نور بصیرت کیا ہے؟ مسلمان قوم کو من حیث القوم دوسری قوموں سے ہر وقت چوکنا رہنا' کسی کو دھوکا نہ دینا اور کسی سے دھوکا نہ کھانا' حالات جیسے بھی پیش آئیں ان کیلئے ہر وقت تیار رہنا۔ دشمنوں کے ساتھ دشمنی ہونے کے باوجود اصولوں کی پابندی کرنا اور کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ کل اگر دشمنی دوستی میں بدل جائے تو خفت محسوس ہو اور دوستوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے باوجود اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی وقت یہ دوستی دشمنی میں بھی بدل سکتی ہے اس لئے ان کو اپنے خاص رازوں سے واقف نہ کرنا کہ حالات بدلیں تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کا محاورہ ہم پر صادق آجائے۔ ہر معاملہ میں رواداری اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ دوستی اور دشمنی کے جو اصول اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا۔ کوئی جنگ کیلئے آمادہ ہو تو اس کو سوچ سمجھ لینے کی تلقین کرنا اور اپنی تیاری مکمل رکھنا۔ اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنا۔ کسی دوسری حکومت سے ایسا معاہدہ نہ کرنا جس پر کل پچھتاوا ہو۔ گیدڑ بھبکیوں کی پروا نہ کرنا اور ان سے نہ گھبرانا۔ سنار کی سو چوٹ پر لوہار کی ایک ہی چوٹ لگا دینا۔ پھر اس پر خوش نہ ہونا بلکہ اس کی سو چوٹ پر اس کو آگاہ کرنا۔ اپنے گھر کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا بلکہ خود اس کی حفاظت کرنا۔ اپنی نظر اپنے کام پر رکھنا۔ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا۔ قومی غلطیوں کی تشہیر نہ کرنا۔ دوسروں کی اطلاعات پر بے سوچے سمجھے عمل نہ کرنا۔ قدم اٹھانے سے پہلے پوری احتیاط کرنا لیکن جب قدم اٹھ جائے تو پھر کبھی پچھتاوا نہ کرنا بلکہ ہر حال میں ثابت قدم رہنا۔ اپنی ساری تیاروں اور ساری تدبیروں کو امانت و دیانت سے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ انحصار اللہ پر رکھنا۔ اپنوں کی غلطی کو برداشت کرنا۔ ہو چکنے والے واقعات پر افسوس نہ کرنا بلکہ معرض وجود میں آنے والے حالات میں احتیاط کرنا۔ ہر ایک کام اگر قبل از وقت نہ ہو تو وقت پر اس کو کر دکھانا۔ اسلحہ کی قوت کے ساتھ ساتھ اسلحہ کے استعمال کی قوت کو نگاہ میں رکھنا۔ اس طرح کی ساری باتوں اور چیزوں کا تعلق نور بصیرت سے ہے اور اس نور بصیرت کو بروقت استعمال کرنا اور اس قوت سے پورا پورا کام لینا۔

میدان کار زار کی طرف نکلنا اور اس تیاری کے ساتھ نکلنا کہ گروہ در گروہ نکلنا مفید ہے یا یکبارگی نکلنا مفید ہے جس میں فائدہ نظر آئے حالات جیسے پیش آئیں اس کے مطابق عمل کرنا۔ زیر نظر آیت میں تھوڑے الفاظ میں زیادہ مضمون کو بند کر دیا گیا ہے۔ پچھلے حالات کو نگاہ میں رکھو کہ احد میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ اس پر بحث نہ کرو بلکہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جو ہوا سو ہوا لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا اس کو یاد رکھو کہ احد کے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اور فطرتاً جو ہونے چاہئے تھے ان پر نظر رکھو مشرکین کی ہمتیں بہت بڑھ چکی تھیں ان کے حریف قبیلے ان کی قوت کو آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ تمہاری مصیبت سے بچہ بچہ واقف ہے' تمہاری کمزوریاں مخالفین کی نگاہ میں ہیں بس اس حکم کو اپنی لوح دل پر نقش کر لو کہ خُذُوْا

عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ
مِّنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى

مصیبت آپڑے تو کہے اللہ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا۔ ۱۲۶ ۷۲

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم ہو تو بے اختیار بول اٹھے گویا تم میں اور اس میں کوئی محبت کا

حِذْرَكُمْ اور اس طرح دشمن کے مقابلہ میں ہر طرح کیل کانٹے سے درست اور آمادہ رہو اور قرآن کریم کی اس ہدایت پر عمل پیرا رہو کہ

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے اور تمہارے اختیار میں ہو زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کیلئے مہیا رکھو تاکہ ان کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدائے اسلام کو خوف زدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔" (الانفال ۸ : ۶۰)

حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ ان تبدیلیوں کو مت بھولو جو ہر زمانہ کے ساتھ لازماً ہوتی رہتی ہیں خیال رکھو کہ دشمن ٹینک' جنگی جہاز' ایٹم بم اور میزائل تیار کریں تو تم گھوڑے ہی پالتے رہو نہیں ایسا نہیں بلکہ زمانہ کی ترقیوں کا ساتھ دو' جدید آلات تیار کرو جو اس وقت کے گھوڑوں ہی کے حکم میں ہیں۔ لفظوں کی بحث میں مت الجھو۔ دشمنوں کو حیران کر دو کہ وہ اپنے ہی گھروں میں مبہوت ہو کر رہ جائیں۔ انگشت بدندان تم کیوں ہو؟ تم تو مسلمان ہو ان کو انگشت بدندان کرو۔ ساریۃ الی الجبل کی آواز پیدا کرو۔ لوگ بحث کرتے رہیں کہ یہ کیا ہے؟ تم کام کرو۔ نور بصیرت تمہارے پاس ہے یہ وہ ایٹم ہے جس کو اللہ نے خود مخلوق کیا ہے۔ حاشا للہ ہر ایٹم بم سے اس میں طاقت زیادہ ہے بس اس کو استعمال کرنا سیکھ لو یہ کیسے؟ غور کرو کہ ایٹم بم کیا ہے؟ اس نور بصیرت کی کرشمہ سازیوں میں سے ایک کرشمہ ہے۔ "الحاقہ" تمہارے پاس ہے "الراجفہ" تمہارے پاس ہے "القارعۃ" تمہارے پاس ہے "الرادفہ" تمہارے پاس ہے۔ "الحطمہ" تمہارے پاس ہے۔ کیا اللہ تمہارا نہیں؟ کیا تم کو اس نے ان ساری چیزوں کی اطلاع نہیں دی؟ پھر اس سے پوچھتے کیوں نہیں کہ یہ کیا ہے؟ یہ کائنات کس کی ہے؟ اس کے اندر جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ ان ساری چیزوں کا اصل موجد کون ہے؟ قرآن اللہ کا کلام ہے تو کائنات اللہ کا فعل نہیں؟ عقل کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ وہی جس نے قرآن جیسا کلام دیا۔ وہی جس نے اس ساری کائنات کا ایک نظام ترتیب دیا۔ وہی جو اس نظام کا چلانے والا ہے۔ وہی جس نے یہ قانون ترتیب دیا۔ وہی جس نے اس کے اندر پختگی ودیعت کر دی۔ وہی جس نے تم کو عقل دی اور پھر اس عقل کے اندر ان ساری چیزوں کو حاصل کر لینے کی طاقت رکھی۔ تم نے کیا کیا؟ عقل سے کام لینا حرام کر لیا۔ نتیجہ کیا رہا؟ کہ جو چیز عقل سے سمجھنے کی تھی وہ تم پر حرام کر دی گئی۔ قصور وار کون ٹھہرا؟

كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

رشتہ تھا ہی نہیں کہ اے کاش! میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا کہ بہت کچھ کامیابی حاصل کر لیتا۔ ۷۳ سو دیکھو! جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی فروخت کر چکے ہیں انہیں چاہئے اللہ

ہاں! ہاں! اٹھو' تم فتویٰ لگاؤ کہ یہ قرآن کریم کی تفسیر ہے یا بکواس بازی۔ یہ قرآن کریم کی تفسیر ہے یا کسی پاگل کی زیاں کاری۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا کسی غیر مسلم کی غداری۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا کسی مداری کی پٹاری۔ کیوں؟ یہ آج تک کسی نے نہیں لکھا' کسی نے نہیں بتایا' کسی نے نہیں سمجھایا۔

فائدے کے ساجھی نقصان کا نام سنتے ہی دم بخود ہو جائیں گے کہ ہم ساتھ نہیں تھے

۱۲۶ چھلنی اور چھاج کیوں؟ کہ صاف اور ستھرا غلہ الگ ہو جائے۔ میدان جنگ کی مصیبت کیا ہے؟ چھاج بھی اور چھلنی بھی۔ بلاشبہ میدان احد میں تم پر مصیبت آئی لیکن وہ تمہارے اپنے ہی عمل کا نتیجہ تھی اور پھر بھی وہ تمہارے لئے مفید رہی کہ اس نے کھرا اور کھوٹا' اچھا اور خراب' گندا اور ستھرا الگ الگ کر دیا۔ کھرے' اچھے اور ستھرے کو کھوٹا' خراب اور گندا صاف صاف نظر آنے لگا۔ مسلمان اور منافق کی پہچان ہو گئی۔ جو تم نے کھویا وہ کھویا نہیں گیا وہ کام آگیا۔ جانے والے جنت اور باغوں کی نعمتوں میں خوش اور خرماں ہیں۔ تمہارے زخم بھی مندمل ہو چکے۔ اب تم صاف ستھرے اور کھرے باقی ہو اٹھو اور اپنا مقصد زندگی حاصل کرو۔

ہاں! کوئی کوئی دانہ ابھی تمہارے اندر موجود ہے۔ اس کی پہچان کیا ہے؟ وہی کہ وہ فائدے کے ساجھی ہیں اور نقصان کے شریک نہیں۔ جس طرح احد میں تم کو نقصان پہنچا تو وہ بغلیں بجاتے تھے اور ان کی کثیر تعداد پہلے ہی روز تم سے الگ ہو گئی تھی یہی عمل ان کا ہو گا۔ اگر کچھ دینا پڑے گا تو ان کے ہاتھ رک جائیں گے۔ میدان جنگ کو جانا پڑے گا تو ان کے قدم چلنے سے ڈھیلے پڑیں گے اور ان کی ہمت جواب دے جائے گی۔ اگر لینے کا وقت آیا تو یہ سب سے آگے ہوں گے۔ گھر بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں چاہو جتنی کروا لو۔ بس ان کا خیال رکھو اور اپنے کام سے غرض رکھو کیونکہ تم غازی ہو اور زندہ قومیں اپنے دفاع سے کبھی نہیں گھبراتیں اس لئے تم بھی قومی زندگی کا ثبوت دو۔

ہر جماعت میں کچھ لوگ ایمان و یقین سے محروم اور عزم و ہمت سے تہی دست ہوتے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ عزم و ہمت کا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے تو اپنی کمزوری سے خود بھی باز رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی باز رکھیں۔ پھر جب جماعت قدم اٹھا دیتی ہے تو وہ الگ تھلگ رہ کر غیروں کی طرح تماشا دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں اچھا ہوا کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہوئے اگر کامیابی ہوتی ہے تو حسد سے جل مرتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ کاش ہم نے بھی ساتھ دیا ہوتا گویا ان کی شخصیت جماعت کی ہستی سے بالکل الگ تھلگ ہے نہ تو اس کا نقصان ان کا نقصان ہے نہ اس کی کامیابی

ان کی کامیابی۔

اللہ کا فضل تمہارے شامل حال ہوگا تو وہ بھی محبت کا رشتہ تم سے جوڑیں گے

۱۲۷ کچھ باتیں زبان زد عام و خاص ہوتی ہیں اور ان کا انحصار زبان کے استعمال پر ہے۔ اس لئے صرف زبان سے کسی بات کے نکل جانے کا کچھ اعتبار نہیں کیا گیا جب تک کہ عمل اس کا ساتھ نہ دے۔ اسلام میں یہ اصول اتنا واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے انہوں نے جب تمہاری کامیابی کی خبر سنی تو ان کی زبان پر یہ جملہ وارد ہوگیا "کہ اے کاش' میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا" اور ان کے اس ایک جملے نے ان کی ساری حقیقت واضح کر دی کیونکہ اس سے یہ بات خود بخود کھل کر سامنے آگئی کہ "اس میں اور تم میں کوئی خاص تعلق محبت نہ تھا" بلکہ اس کو اپنا وقتی فائدہ یاد آگیا کہ وہ کس طرح اس سے محروم ہوگیا "اگر وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بہت کامیابی حاصل کر لیتا۔" آخر یہ کہہ کر اس نے کامیابی کس کو قرار دیا؟ دنیا کے مال کو حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کے مال کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ کامیابی کوئی اتنی بڑی کامیابی نہیں اصل کامیابی تو جہاد میں شریک ہو کر جنگ کرنا تھی۔ کیونکہ ایک سچا مسلمان میدان جنگ میں شریک ہو کر کبھی ناکام نہیں ہوتا وہ تو ہر حال میں کامیاب ہی رہتا ہے اگر شہید ہوگیا تو اس نے دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی حاصل کر لی اور اگر غازی بن کر میدان جنگ سے واپس لوٹا تو دنیا کا مال بھی حاصل ہوا اور آخرت کا ثواب لازوال بھی۔ اس طرح دونوں حالتوں میں اس کو ایک سے ایک بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ ان لوگوں کے اس تاسف اور افسوس کا ذکر قرآن کریم نے بار بار کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح نصیب ہوتی ہے تو اپنے کو تمہارا ساتھی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہم بھی تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر فتح مندی منکرین حق کے حصے میں آجائے تو ان کی طرف دوڑے جاتے ہیں اور اپنا احسان جتانے کیلئے کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کیا کہ جنگ میں بالکل غالب آگئے تھے پھر تمہیں مسلمانوں سے بچا لیا۔" (النساء ۴ : ۱۴۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور اعرابیوں ہی میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ راہ حق میں خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر جرمانہ سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے تو الٹ پڑیں حقیقت یہ ہے کہ گردش کے دن خود انہی پر آنے والے ہیں۔" (التوبہ ۹ : ۹۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

اور دیکھو کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کی بندگی تو کرتے ہیں مگر دل کے جماؤ سے نہیں اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہوگئے اگر کوئی آزمائش آگئی تو الٹے پاؤں اپنی کفر کی حالت پر لوٹ پڑے وہ دنیا میں بھی نامراد ہوئے اور آخرت میں بھی۔" (الحج ۲۲ : ۱۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آجائے تو وہ انہیں بری لگے اور اگر کوئی مصیبت پیش آجائے تو کہنے لگیں اس خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنے لئے مصلحت بنی کر لی تھی اور پھر گردن موڑ کر خوش

الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ

کی راہ میں جنگ کریں اور جو کوئی اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے تو خواہ قتل ہو جائے' خواہ غالب آئے' ہم اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔ ۱۲۸ ۷۴

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں' کتنی ہی عورتیں ہیں' کتنے ہی بچے ہیں جو فریاد کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں بستی سے

خوش چل دیں۔" (التوبہ ۹ : ۵۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! تم دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں نفاق ہے وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے کسی مصیبت کے پھیر میں نہ آجائیں۔ تو یقین کرو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تمہیں فتح دے گا یا اس کی طرف سے کامیابی کی کوئی اور بات ظاہر ہو جائے گی اور اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے۔" (المائدہ ۵ : ۵۳)

دنیوی زندگی کے بدلے آخرت کی زندگی کو پسند کرنے والے جہاد فی سبیل اللہ سے نہیں گھبراتے

۱۲۸ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی بیچنے والے کا سواد کبھی خسارے کا سودا نہیں ہو سکتا یہ تو اتنا نفع ہے جس کا شمار ممکن ہی نہیں۔ گزشتہ دونوں آیتوں میں کم ہمتوں اور دودلے لوگوں کا بیان تھا اور اب ان لوگوں کا تذکرہ شروع ہوا جو اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں بیچ چکے اور اپنا کچھ بھی باقی نہ رکھا اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی دنیوی غرض کوئی بھی ان کے عمل جہاد سے وابستہ نہ تھی یعنی یہ شریک جہاد ہوتے ہیں تو خالصتہ" رضائے الٰہی کیلئے۔ نہ وہ اپنی فتح کی شہرت چاہتے ہیں اور نہ ہی مال غنیمت کے طالب ہیں اس لئے تو وہ سب سے پہلے دنیا کے سارے ساز و سامان کو دے چکے ہیں۔ جانوں کے سوا ان کے پاس تھا ہی کیا؟ وہی جانیں لے کر وہ شریک جہاد ہو گئے اور اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے لڑے ان کی پاکیزہ نگاہ میں اللہ کے دین کا غلبہ تھا وہ ان کو جان دے کر حاصل ہو جائے یا زخم کھا کر۔ اس بات کو سورہ بقرہ میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا تفصیل

اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ

جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا دوست بنا دے اور کسی کو ہماری مددگاری کیلئے کھڑا کر دے۔[۱۲۹] ۷۵

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں تو ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کی راہ

کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ البقرہ ۲ : ۲۰۷، ۲۶۵۔

جو لوگ دین کیلئے ستائے جا رہے ہوں ان کی آزادی کیلئے جہاد فی سبیل اللہ فرض اول ہے

۱۲۹ نبی اعظم و آخر ﷺ کی ہجرت کے بعد مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی ضعف اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکتے تھے اور یہ بھی کہ روسائے مکہ ان کو ہجرت کرنے سے باز رکھے ہوئے تھے اور طرح طرح کی اذیتیں ان کو دیتے تھے۔ آپ ﷺ کی موجودگی میں ان کیلئے مکہ والوں کے مظالم برداشت کرنا آسان تھا کیوں؟ اس لئے کہ اپنی تکلیف کے بعد جب ان کی آنکھیں اپنے محبوب کو دیکھ لیتی تھیں تو ان کے سارے غم اور دکھ دور ہو جاتے تھے لیکن آپ ﷺ کی ہجرت کے بعد ان بیچاروں پر دوسرا عذاب شروع ہو گیا کفار کی مار اور دل آزاری اور اپنے پیارے رسول ﷺ کو آنکھوں سے نہ دیکھنے کا قلق اور ان کیلئے یہ دوسرا عذاب پہلے سے بھی سوا تھا۔ محبوب پر نگاہ ڈالنے کی لذت کیا ہے؟ وہی سمجھ سکتے ہیں جن کے دل میں محبت کا کوئی پہلو موجود ہے۔ اس کو کہتے ہیں کہ "ہے ظالم تو نے پی ہی نہیں؟" حاشا اللہ جس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ ایک جان کیا ہزار جانیں ہوں تو اس پر ایک ایک کر کے قربان کرنے کیلئے انسان تیار ہو جاتا ہے۔

کہیں کا نہ چھوڑا ہوئی جب سے الفت — تمہاری ہماری، ہماری تمہاری
محبت یہ کیا ہے، بڑھی آہ و زاری — بڑی بے قراری، بڑی بے قراری
دل و چشم دونوں میں طوفان بپا ہے — ادھر شعلہ باری، ادھر لالہ زاری
نہ جانے کیا کر دیا تو نے جاناں؟ — ترے ہی کرم پر ہے اب جاں ہماری
لگا تیر دل میں ہوئے نیم بسمل — زہے دل سپاری زہے جاں نثاری
تری زلف پیچاں میں ہوں یوں پریشاں — ابھی خندہ زن ہوں، ابھی گریہ طاری
تصور میں تیرے میں سب کھو چکا ہوں — یونہی دن بھی گزرا، یونہی شب گزاری

تری یاد نے مجھ کو ایسا ستایا
اس میں تڑپتے کٹی عمر ساری

جن لوگوں کے دلوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت کے دریا موجزن تھے وہ چاہتے تھے کہ سب کچھ قربان کر کے اس بستی سے نکل جائیں اور ان راہوں پر جانیں دیں جن راہوں سے گزرتا ہوا ہمارا محبوب مدینہ پہنچ گیا لیکن ان کے پاؤں کی زنجیروں نے ان کو جکڑ رکھا تھا اس حالت زار کے پیش نظر جہاد فرض ہو چکا تھا قرآن کریم کے اس حکم نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ تم ان مردوں' عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کیلئے کیوں نہیں اٹھتے جو مکہ اور اس کے اردگرد کی بستیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کفار کی قید سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں؟ جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بے قراری سے یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر دے اس طرح اس آیت نے کتنی ہی باتوں کو ظاہر کر دیا۔ مثلاً

۱۔ یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے اگر وہ ان کی مدد کیلئے نہ اٹھیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے بلکہ منافقت کی زد میں آئیں گے۔

۲۔ یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہ دے رہی تھی' سارا بھروسہ بس اللہ ہی کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کیلئے کوئی راہ کھولے تو کھولے لیکن اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ کیا شان تھی ان کی استقامت کی! سچ ہے کہ پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں اور اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لئے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

۴۔ یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہل ایمان کیلئے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین و ایمان کیلئے امن ہو اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ' سانپوں' اژدہوں کا مسکن اور شیطان کا مرکز ہے۔

۵۔ یہ کہ حالات کتنے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوں مسلمانوں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہئے اور جب تک جسم میں جان ہے مایوس ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہئے حالات کے مطابق اپنی حالت کو بدلتے نہیں رہنا چاہئے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا
ع ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳ ۱۰۴ ۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ ۱۰۸ ۱۰۹ ۱۱۰ ۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱۱۹ ۱۲۰ ۱۲۱ ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵ ۱۲۶ ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۳۰ ۱۳۱ ۱۳۲ ۱۳۳ ۱۳۴ ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹ ۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۸ ۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۷ ۱۵۸ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۶ ۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰ ۱۰۰۱ ۱۰۰۲ ۱۰۰۳ ۱۰۰۴ ۱۰۰۵ ۱۰۰۶ ۱۰۰۷ ۱۰۰۸ ۱۰۰۹ ۱۰۱۰ ۱۰۱۱ ۱۰۱۲ ۱۰۱۳ ۱۰۱۴ ۱۰۱۵ ۱۰۱۶ ۱۰۱۷ ۱۰۱۸ ۱۰۱۹ ۱۰۲۰ ۱۰۲۱ ۱۰۲۲ ۱۰۲۳ ۱۰۲۴ ۱۰۲۵ ۱۰۲۶ ۱۰۲۷ ۱۰۲۸ ۱۰۲۹ ۱۰۳۰ ۱۰۳۱ ۱۰۳۲ ۱۰۳۳ ۱۰۳۴ ۱۰۳۵ ۱۰۳۶ ۱۰۳۷ ۱۰۳۸ ۱۰۳۹ ۱۰۴۰ ۱۰۴۱ ۱۰۴۲ ۱۰۴۳ ۱۰۴۴ ۱۰۴۵ ۱۰۴۶ ۱۰۴۷ ۱۰۴۸ ۱۰۴۹ ۱۰۵۰ ۱۰۵۱ ۱۰۵۲ ۱۰۵۳ ۱۰۵۴ ۱۰۵۵ ۱۰۵۶ ۱۰۵۷ ۱۰۵۸ ۱۰۵۹ ۱۰۶۰ ۱۰۶۱ ۱۰۶۲ ۱۰۶۳ ۱۰۶۴ ۱۰۶۵ ۱۰۶۶ ۱۰۶۷ ۱۰۶۸ ۱۰۶۹ ۱۰۷۰ ۱۰۷۱ ۱۰۷۲ ۱۰۷۳ ۱۰۷۴ ۱۰۷۵ ۱۰۷۶ ۱۰۷۷ ۱۰۷۸ ۱۰۷۹ ۱۰۸۰ ۱۰۸۱ ۱۰۸۲ ۱۰۸۳ ۱۰۸۴ ۱۰۸۵ ۱۰۸۶ ۱۰۸۷ ۱۰۸۸ ۱۰۸۹ ۱۰۹۰ ۱۰۹۱ ۱۰۹۲ ۱۰۹۳ ۱۰۹۴ ۱۰۹۵ ۱۰۹۶ ۱۰۹۷ ۱۰۹۸ ۱۰۹۹ ۱۱۰۰ ۱۱۰۱ ۱۱۰۲ ۱۱۰۳ ۱۱۰۴ ۱۱۰۵ ۱۱۰۶ ۱۱۰۷ ۱۱۰۸ ۱۱۰۹ ۱۱۱۰ ۱۱۱۱ ۱۱۱۲ ۱۱۱۳ ۱۱۱۴ ۱۱۱۵ ۱۱۱۶ ۱۱۱۷ ۱۱۱۸ ۱۱۱۹ ۱۱۲۰ ۱۱۲۱ ۱۱۲۲ ۱۱۲۳ ۱۱۲۴ ۱۱۲۵ ۱۱۲۶ ۱۱۲۷ ۱۱۲۸ ۱۱۲۹ ۱۱۳۰ ۱۱۳۱ ۱۱۳۲ ۱۱۳۳ ۱۱۳۴ ۱۱۳۵ ۱۱۳۶ ۱۱۳۷ ۱۱۳۸ ۱۱۳۹ ۱۱۴۰ ۱۱۴۱ ۱۱۴۲ ۱۱۴۳ ۱۱۴۴ ۱۱۴۵ ۱۱۴۶ ۱۱۴۷ ۱۱۴۸ ۱۱۴۹ ۱۱۵۰ ۱۱۵۱ ۱۱۵۲ ۱۱۵۳ ۱۱۵۴ ۱۱۵۵ ۱۱۵۶ ۱۱۵۷ ۱۱۵۸ ۱۱۵۹ ۱۱۶۰ ۱۱۶۱ ۱۱۶۲ ۱۱۶۳ ۱۱۶۴ ۱۱۶۵ ۱۱۶۶ ۱۱۶۷ ۱۱۶۸ ۱۱۶۹ ۱۱۷۰ ۱۱۷۱ ۱۱۷۲ ۱۱۷۳ ۱۱۷۴ ۱۱۷۵ ۱۱۷۶ ۱۱۷۷ ۱۱۷۸ ۱۱۷۹ ۱۱۸۰ ۱۱۸۱ ۱۱۸۲ ۱۱۸۳ ۱۱۸۴ ۱۱۸۵ ۱۱۸۶ ۱۱۸۷ ۱۱۸۸ ۱۱۸۹ ۱۱۹۰ ۱۱۹۱ ۱۱۹۲ ۱۱۹۳ ۱۱۹۴ ۱۱۹۵ ۱۱۹۶ ۱۱۹۷ ۱۱۹۸ ۱۱۹۹ ۱۲۰۰ ۱۲۰۱ ۱۲۰۲ ۱۲۰۳ ۱۲۰۴ ۱۲۰۵ ۱۲۰۶ ۱۲۰۷ ۱۲۰۸ ۱۲۰۹ ۱۲۱۰ ۱۲۱۱ ۱۲۱۲ ۱۲۱۳ ۱۲۱۴ ۱۲۱۵ ۱۲۱۶ ۱۲۱۷ ۱۲۱۸ ۱۲۱۹ ۱۲۲۰ ۱۲۲۱ ۱۲۲۲ ۱۲۲۳ ۱۲۲۴ ۱۲۲۵ ۱۲۲۶ ۱۲۲۷ ۱۲۲۸ ۱۲۲۹ ۱۲۳۰ ۱۲۳۱ ۱۲۳۲ ۱۲۳۳ ۱۲۳۴ ۱۲۳۵ ۱۲۳۶ ۱۲۳۷ ۱۲۳۸ ۱۲۳۹ ۱۲۴۰ ۱۲۴۱ ۱۲۴۲ ۱۲۴۳ ۱۲۴۴ ۱۲۴۵ ۱۲۴۶ ۱۲۴۷ ۱۲۴۸ ۱۲۴۹ ۱۲۵۰ ۱۲۵۱ ۱۲۵۲ ۱۲۵۳ ۱۲۵۴ ۱۲۵۵ ۱۲۵۶ ۱۲۵۷ ۱۲۵۸ ۱۲۵۹ ۱۲۶۰ ۱۲۶۱ ۱۲۶۲ ۱۲۶۳ ۱۲۶۴ ۱۲۶۵ ۱۲۶۶ ۱۲۶۷ ۱۲۶۸ ۱۲۶۹ ۱۲۷۰ ۱۲۷۱ ۱۲۷۲ ۱۲۷۳ ۱۲۷۴ ۱۲۷۵ ۱۲۷۶ ۱۲۷۷ ۱۲۷۸ ۱۲۷۹ ۱۲۸۰ ۱۲۸۱ ۱۲۸۲ ۱۲۸۳ ۱۲۸۴ ۱۲۸۵ ۱۲۸۶ ۱۲۸۷ ۱۲۸۸ ۱۲۸۹ ۱۲۹۰ ۱۲۹۱ ۱۲۹۲ ۱۲۹۳ ۱۲۹۴ ۱۲۹۵ ۱۲۹۶ ۱۲۹۷ ۱۲۹۸ ۱۲۹۹ ۱۳۰۰ ۱۳۰۱ ۱۳۰۲ ۱۳۰۳ ۱۳۰۴ ۱۳۰۵ ۱۳۰۶ ۱۳۰۷ ۱۳۰۸ ۱۳۰۹ ۱۳۱۰ ۱۳۱۱ ۱۳۱۲ ۱۳۱۳ ۱۳۱۴ ۱۳۱۵ ۱۳۱۶ ۱۳۱۷ ۱۳۱۸ ۱۳۱۹ ۱۳۲۰ ۱۳۲۱ ۱۳۲۲ ۱۳۲۳ ۱۳۲۴ ۱۳۲۵ ۱۳۲۶ ۱۳۲۷ ۱۳۲۸ ۱۳۲۹ ۱۳۳۰ ۱۳۳۱ ۱۳۳۲ ۱۳۳۳ ۱۳۳۴ ۱۳۳۵ ۱۳۳۶ ۱۳۳۷ ۱۳۳۸ ۱۳۳۹ ۱۳۴۰ ۱۳۴۱ ۱۳۴۲ ۱۳۴۳ ۱۳۴۴ ۱۳۴۵ ۱۳۴۶ ۱۳۴۷ ۱۳۴۸ ۱۳۴۹ ۱۳۵۰ ۱۳۵۱ ۱۳۵۲ ۱۳۵۳ ۱۳۵۴ ۱۳۵۵ ۱۳۵۶ ۱۳۵۷ ۱۳۵۸ ۱۳۵۹ ۱۳۶۰ ۱۳۶۱ ۱۳۶۲ ۱۳۶۳ ۱۳۶۴ ۱۳۶۵ ۱۳۶۶ ۱۳۶۷ ۱۳۶۸ ۱۳۶۹ ۱۳۷۰ ۱۳۷۱ ۱۳۷۲ ۱۳۷۳ ۱۳۷۴ ۱۳۷۵ ۱۳۷۶ ۱۳۷۷ ۱۳۷۸ ۱۳۷۹ ۱۳۸۰ ۱۳۸۱ ۱۳۸۲ ۱۳۸۳ ۱۳۸۴ ۱۳۸۵ ۱۳۸۶ ۱۳۸۷ ۱۳۸۸ ۱۳۸۹ ۱۳۹۰ ۱۳۹۱ ۱۳۹۲ ۱۳۹۳ ۱۳۹۴ ۱۳۹۵ ۱۳۹۶ ۱۳۹۷ ۱۳۹۸ ۱۳۹۹ ۱۴۰۰ ۱۴۰۱ ۱۴۰۲ ۱۴۰۳ ۱۴۰۴ ۱۴۰۵ ۱۴۰۶ ۱۴۰۷ ۱۴۰۸ ۱۴۰۹ ۱۴۱۰ ۱۴۱۱ ۱۴۱۲ ۱۴۱۳ ۱۴۱۴ ۱۴۱۵ ۱۴۱۶ ۱۴۱۷ ۱۴۱۸ ۱۴۱۹ ۱۴۲۰ ۱۴۲۱ ۱۴۲۲ ۱۴۲۳ ۱۴۲۴ ۱۴۲۵ ۱۴۲۶ ۱۴۲۷ ۱۴۲۸ ۱۴۲۹ ۱۴۳۰ ۱۴۳۱ ۱۴۳۲ ۱۴۳۳ ۱۴۳۴ ۱۴۳۵ ۱۴۳۶ ۱۴۳۷ ۱۴۳۸ ۱۴۳۹ ۱۴۴۰ ۱۴۴۱ ۱۴۴۲ ۱۴۴۳ ۱۴۴۴ ۱۴۴۵ ۱۴۴۶ ۱۴۴۷ ۱۴۴۸ ۱۴۴۹ ۱۴۵۰ ۱۴۵۱ ۱۴۵۲ ۱۴۵۳ ۱۴۵۴ ۱۴۵۵ ۱۴۵۶ ۱۴۵۷ ۱۴۵۸ ۱۴۵۹ ۱۴۶۰ ۱۴۶۱ ۱۴۶۲ ۱۴۶۳ ۱۴۶۴ ۱۴۶۵ ۱۴۶۶ ۱۴۶۷ ۱۴۶۸ ۱۴۶۹ ۱۴۷۰ ۱۴۷۱ ۱۴۷۲ ۱۴۷۳ ۱۴۷۴ ۱۴۷۵ ۱۴۷۶ ۱۴۷۷ ۱۴۷۸ ۱۴۷۹ ۱۴۸۰ ۱۴۸۱ ۱۴۸۲ ۱۴۸۳ ۱۴۸۴ ۱۴۸۵ ۱۴۸۶ ۱۴۸۷ ۱۴۸۸ ۱۴۸۹ ۱۴۹۰ ۱۴۹۱ ۱۴۹۲ ۱۴۹۳ ۱۴۹۴ ۱۴۹۵ ۱۴۹۶ ۱۴۹۷ ۱۴۹۸ ۱۴۹۹ ۱۵۰۰ ۱۵۰۱ ۱۵۰۲ ۱۵۰۳ ۱۵۰۴ ۱۵۰۵ ۱۵۰۶ ۱۵۰۷ ۱۵۰۸ ۱۵۰۹ ۱۵۱۰ ۱۵۱۱ ۱۵۱۲ ۱۵۱۳ ۱۵۱۴ ۱۵۱۵ ۱۵۱۶ ۱۵۱۷ ۱۵۱۸ ۱۵۱۹ ۱۵۲۰ ۱۵۲۱ ۱۵۲۲ ۱۵۲۳ ۱۵۲۴ ۱۵۲۵ ۱۵۲۶ ۱۵۲۷ ۱۵۲۸ ۱۵۲۹ ۱۵۳۰ ۱۵۳۱ ۱۵۳۲ ۱۵۳۳ ۱۵۳۴ ۱۵۳۵ ۱۵۳۶ ۱۵۳۷ ۱۵۳۸ ۱۵۳۹ ۱۵۴۰ ۱۵۴۱ ۱۵۴۲ ۱۵۴۳ ۱۵۴۴ ۱۵۴۵ ۱۵۴۶ ۱۵۴۷ ۱۵۴۸ ۱۵۴۹ ۱۵۵۰ ۱۵۵۱ ۱۵۵۲ ۱۵۵۳ ۱۵۵۴ ۱۵۵۵ ۱۵۵۶ ۱۵۵۷ ۱۵۵۸ ۱۵۵۹ ۱۵۶۰ ۱۵۶۱ ۱۵۶۲ ۱۵۶۳ ۱۵۶۴ ۱۵۶۵ ۱۵۶۶ ۱۵۶۷ ۱۵۶۸ ۱۵۶۹ ۱۵۷۰ ۱۵۷۱ ۱۵۷۲ ۱۵۷۳ ۱۵۷۴ ۱۵۷۵ ۱۵۷۶ ۱۵۷۷ ۱۵۷۸ ۱۵۷۹ ۱۵۸۰ ۱۵۸۱ ۱۵۸۲ ۱۵۸۳ ۱۵۸۴ ۱۵۸۵ ۱۵۸۶ ۱۵۸۷ ۱۵۸۸ ۱۵۸۹ ۱۵۹۰ ۱۵۹۱ ۱۵۹۲ ۱۵۹۳ ۱۵۹۴ ۱۵۹۵ ۱۵۹۶ ۱۵۹۷ ۱۵۹۸ ۱۵۹۹ ۱۶۰۰ ۱۶۰۱ ۱۶۰۲ ۱۶۰۳ ۱۶۰۴ ۱۶۰۵ ۱۶۰۶ ۱۶۰۷ ۱۶۰۸ ۱۶۰۹ ۱۶۱۰ ۱۶۱۱ ۱۶۱۲ ۱۶۱۳ ۱۶۱۴ ۱۶۱۵ ۱۶۱۶ ۱۶۱۷ ۱۶۱۸ ۱۶۱۹ ۱۶۲۰ ۱۶۲۱ ۱۶۲۲ ۱۶۲۳ ۱۶۲۴ ۱۶۲۵ ۱۶۲۶ ۱۶۲۷ ۱۶۲۸ ۱۶۲۹ ۱۶۳۰ ۱۶۳۱ ۱۶۳۲ ۱۶۳۳ ۱۶۳۴ ۱۶۳۵ ۱۶۳۶ ۱۶۳۷ ۱۶۳۸ ۱۶۳۹ ۱۶۴۰ ۱۶۴۱ ۱۶۴۲ ۱۶۴۳ ۱۶۴۴ ۱۶۴۵ ۱۶۴۶ ۱۶۴۷ ۱۶۴۸ ۱۶۴۹ ۱۶۵۰ ۱۶۵۱ ۱۶۵۲ ۱۶۵۳ ۱۶۵۴ ۱۶۵۵ ۱۶۵۶ ۱۶۵۷ ۱۶۵۸ ۱۶۵۹ ۱۶۶۰ ۱۶۶۱ ۱۶۶۲ ۱۶۶۳ ۱۶۶۴ ۱۶۶۵ ۱۶۶۶ ۱۶۶۷ ۱۶۶۸ ۱۶۶۹ ۱۶۷۰ ۱۶۷۱ ۱۶۷۲ ۱۶۷۳ ۱۶۷۴ ۱۶۷۵ ۱۶۷۶ ۱۶۷۷ ۱۶۷۸ ۱۶۷۹ ۱۶۸۰ ۱۶۸۱ ۱۶۸۲ ۱۶۸۳ ۱۶۸۴ ۱۶۸۵ ۱۶۸۶ ۱۶۸۷ ۱۶۸۸ ۱۶۸۹ ۱۶۹۰ ۱۶۹۱ ۱۶۹۲ ۱۶۹۳ ۱۶۹۴ ۱۶۹۵ ۱۶۹۶ ۱۶۹۷ ۱۶۹۸ ۱۶۹۹ ۱۷۰۰ ۱۷۰۱ ۱۷۰۲ ۱۷۰۳ ۱۷۰۴ ۱۷۰۵ ۱۷۰۶ ۱۷۰۷ ۱۷۰۸ ۱۷۰۹ ۱۷۱۰ ۱۷۱۱ ۱۷۱۲ ۱۷۱۳ ۱۷۱۴ ۱۷۱۵ ۱۷۱۶ ۱۷۱۷ ۱۷۱۸ ۱۷۱۹ ۱۷۲۰ ۱۷۲۱ ۱۷۲۲ ۱۷۲۳ ۱۷۲۴ ۱۷۲۵ ۱۷۲۶ ۱۷۲۷ ۱۷۲۸ ۱۷۲۹ ۱۷۳۰ ۱۷۳۱ ۱۷۳۲ ۱۷۳۳ ۱۷۳۴ ۱۷۳۵ ۱۷۳۶ ۱۷۳۷ ۱۷۳۸ ۱۷۳۹ ۱۷۴۰ ۱۷۴۱ ۱۷۴۲ ۱۷۴۳ ۱۷۴۴ ۱۷۴۵ ۱۷۴۶ ۱۷۴۷ ۱۷۴۸ ۱۷۴۹ ۱۷۵۰ ۱۷۵۱ ۱۷۵۲ ۱۷۵۳ ۱۷۵۴ ۱۷۵۵ ۱۷۵۶ ۱۷۵۷ ۱۷۵۸ ۱۷۵۹ ۱۷۶۰ ۱۷۶۱ ۱۷۶۲ ۱۷۶۳ ۱۷۶۴ ۱۷۶۵ ۱۷۶۶ ۱۷۶۷ ۱۷۶۸ ۱۷۶۹ ۱۷۷۰ ۱۷۷۱ ۱۷۷۲ ۱۷۷۳ ۱۷۷۴ ۱۷۷۵ ۱۷۷۶ ۱۷۷۷ ۱۷۷۸ ۱۷۷۹ ۱۷۸۰ ۱۷۸۱ ۱۷۸۲ ۱۷۸۳ ۱۷۸۴ ۱۷۸۵ ۱۷۸۶ ۱۷۸۷ ۱۷۸۸ ۱۷۸۹ ۱۷۹۰ ۱۷۹۱ ۱۷۹۲ ۱۷۹۳ ۱۷۹۴ ۱۷۹۵ ۱۷۹۶ ۱۷۹۷ ۱۷۹۸ ۱۷۹۹ ۱۸۰۰ ۱۸۰۱ ۱۸۰۲ ۱۸۰۳ ۱۸۰۴ ۱۸۰۵ ۱۸۰۶ ۱۸۰۷ ۱۸۰۸ ۱۸۰۹

تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ

اے پیغمبر اسلام! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں حکم دیا گیا تھا کہ ہاتھ روک لو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو[۱۳۱] پھر جب ایسا ہوا کہ ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اور جہاں بھی نقصان اٹھایا تو اپنے ہاتھوں ہی اٹھایا اور کسی اپنی ہی کمزوری سے اٹھایا اس آیت میں "طاغوت" کا لفظ بھی آیا ہے اور "شیطان" کا لفظ بھی دو بار استعمال ہوا ہے اور اس طرح "کید" اور "ضعیف" کا لفظ بھی۔ ان سب کا مفہوم آپ کو پیچھے سمجھا دیا گیا ہے اس لئے ان الفاظ پر خوب غور کرو اور ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر بھی نظر رکھو کہ "ایمان والو! اللہ کی راہ میں لڑو۔" پھر اپنے معاشرے کے ایک فقرہ پر بھی نظر کرو جو ہر کس و ناکس کی زبان پر جاری ہے کہ "خدا واسطے لڑائی کون لڑے؟" "اللہ واسطے کا بیر کون کرے؟"

تم حافظے کے کتنے کمزور ہو کہ ابھی تم کیا کہہ رہے تھے اور اب کیا؟

۱۳۱ باتونی لوگ کبھی بات کے پکے نہیں ہوتے کیوں؟ اس لئے کہ ان کے منہ میں جو آتا ہے کہتے جاتے ہیں فرمایا ابھی تم اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کیلئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جہاد جہاد کے نعرے لگا رہے تھے۔ تمہارا مطالبہ ہی یہ تھا کہ ان ساری بیماریوں کا حل جہاد ہے۔ ہم تو کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمہارا ایک ایک شخص جہاد کے عشق سے سرشار ہے لیکن نبی اعظم و آخر ﷺ کی طرف سے صبر و تحمل اور انتظار کی ہدایت کی جاتی تھی اور تم کو کہا جاتا تھا کہ نماز، نماز اور بس نماز اگر مزید کچھ کر سکتے ہو تو زکوٰۃ۔ یعنی یہ کہ صبر و استقلال سے کام لو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرو۔ اس لئے کہ ہمیں جو پروگرام دیا گیا ہے اس میں سرفہرست امن قائم کرنا ہے۔ چنانچہ تم کو کہا جاتا رہا کہ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ (البقرہ ۲ : ۱۰۹) "عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے۔" أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (البقرہ ۲ : ۱۲۰) "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔" لیکن تمہاری صدائے بازگشت تھی تو یہی کہ لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ "ہم پر کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی جس میں جنگ کا حکم دیا جائے۔" (محمد ۴۷ : ۲۰) لیکن جب جہاد فرض ہو گیا تو تم نے کیا کہا۔ کیا تمہارا حافظہ اتنا کمزور ہے کہ کل کی بات آج ہی بھول گئے؟

فَإِذَا هُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ

یکایک ایک گروہ انسانوں کے ڈر سے لگا اس طرح ڈرنے جیسے کوئی اللہ سے ڈر رہا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ[۱۳۲]۔ وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے ہم پر جنگ کرنا کیوں فرض کر دیا؟ کیوں نہ ہمیں

جب جہاد فرض ہوا تو تم نے پادنا شروع کر دیا اور تمہارے پیٹ میں بل پڑنے لگے

۱۳۲ لیکن اب جب کہ جہاد کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہو اور ایسا لگتا ہے کہ گویا خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہو اور اب تم کو شکایت ہے تو یہ کہ اتنا جلدی جہاد کا حکم کیوں دے دیا گیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل جو کچھ تم کہہ رہے تھے تو وہ تم نہیں تھے۔ صورت حال جو کچھ بھی ہے اب یہ یاد رکھو کہ فرائض سے فرار موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ موت اپنے وقت پر ہی آئے گی اور جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ہر اس شخص کو ڈھونڈ نکالے گی جس کیلئے وہ مقدر کر دی گئی اور مضبوط سے مضبوط قلعے بھی اس کو موت سے بچا نہیں سکیں گے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لئے کچھ بھی نفع بخش نہیں ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۱۶، ۱۷)

اچھی طرح سوچ لو کہ اس فرار سے کچھ تمہاری عمر بڑھ نہیں جائے گی اس کا نتیجہ بہرحال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور روئے زمین کی دولت پا لو۔ یاد رکھو کہ تم اتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اٹھا سکو گے جتنا تمہارے لئے مفید ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے مسلمان ہی اس کمزوری کا شکار ہو چکے تھے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس سے مراد وہ دودلے لوگ ہیں جو شور و غوغا تو کر سکتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو پھر نظر ہی نہیں آتے۔ اسلام کی زبان میں یہ منافق کہلاتے ہیں یہ اس وقت بھی کچھ نہ کچھ ضرور موجود تھے اور ہر زمانے میں رہے ہیں اور آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں۔ بلاشبہ جہاد فرض ہونے کا مطالبہ پکے مسلمانوں کا بھی تھا لیکن ان پکے مسلمانوں کو خوش کرنے کیلئے کچھ ایسے مشورے دینے والے بھی موجود تھے جو اس مطالبے میں پیش پیش تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مطالبہ پورا ہونے کا وقت آیا تو پکے مسلمان جہاد میں شریک ہوئے اور دل کھول کر لڑے ان کے اس جہاد کی داستانیں آج تک مخالفین کے کانوں میں گونج رہی ہیں تاہم ان ہی لوگوں میں کچھ تھوڑ

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ ۖ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ

تھوڑے دنوں کی اور مہلت دے دی؟[۱۳۳] اے پیغمبر اسلام! تم ان لوگوں سے کہہ دو دنیا کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرا تو اس کیلئے آخرت ہی کا سرمایہ بہت ہوا۔ وہاں رائی برابر بھی کسی کی حق تلفی ہونے والی نہیں۔[۱۳۴] ۷۷

تم کہیں بھی ہو موت تمہارا ٹھکانا پا کر رہے گی۔ اگر تم اونچے اور مضبوط قلعوں کے اندر

دلے بھی موجود تھے اس لئے ان کو مخاطب کر کے بات کی جا رہی ہے کہ کل تو تم جہاد جہاد کر رہے تھے اور آج جہاد کا حکم آگیا تو تم نے پادنا شروع کر دیا اور تمہارے پیٹ میں بل پڑنے لگے اور ہنسی ہنسی ہی میں تمہارا کام تمام ہوگیا۔

کیا یہ آواز تمہاری ہی ہے کہ اے اللہ! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی؟

۱۳۳ جب تک جہاد کا مطالبہ تھا اس وقت تک مسلمانوں اور منافقوں میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نماز وہ بھی پڑھتے تھے اور یہ بھی۔ روزے وہ بھی رکھتے تھے اور یہ بھی' زکوٰۃ وہ بھی ادا کرتے تھے اور انہیں بھی تامل نہیں تھا اس لئے کہ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام ان کو قبول تھا۔ جہاد کا مطالبہ وہ بھی کرتے تھے اور شور و غوغا ان کا بھی یہی تھا لیکن جب جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو یہ ٹھنڈے پڑ گئے' ان کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور اس طرح ان کے نفاق کا حال کھل گیا اور نمائشی اسلام کا وہ لبادہ اتر گیا جو انہوں نے اوپر سے اوڑھ رکھا تھا اور اب وہ کہنے لگے "اے اللہ! تو نے ہم پر جنگ کرنا کیوں فرض کر دیا؟ کیوں نہ ہمیں تھوڑے دنوں کی اور مہلت دی۔" اس طرح کل تک وہ اپنی جس حالت کو چھپائے ہوئے تھے اور لہو لگا کر شہیدوں میں داخل تھے آج ان کی حالت کھل کر سامنے آگئی اور سب کو معلوم ہوگیا کہ یہ مومن نہیں بلکہ منافق تھے۔ بھیڑیا شیر کی کھال پہن کر آخر کب تک شیر رہ سکتا ہے؟ کیونکہ شیر شیر ہے اور بھیڑیا بھیڑیا۔ ان لوگوں کی اس حالت کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا۔

"جو لوگ ایمان لائے وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی جس میں جنگ کا حکم دیا جائے مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو' افسوس ان کے حال پر کہ ان کی زبان پر تو اطاعت کا اقرار تھا لیکن دلوں میں کیا چھپا تھا؟" (محمد ۴۷ : ۲۰)

كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ

چھپے ہو جب بھی اس کی پکڑ سے بچنے والے نہیں[۳۵] اور اے پیغمبر اسلام! جب ان کو کوئی بھلائی کی بات پیش آتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے لیکن جب کبھی کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے

ان کو سمجھاؤ کہ دنیا کیا ہے؟ "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔"

۱۳۴ حق کی حمایت اور حفاظت کیلئے لڑتے ہوئے مرجانا اس ذلیل زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں صرف یہی پیش نظر ہو کہ دنیا کا کچھ مال اکٹھا کر لیا جائے۔ حفاظت حقوق کے سامنے مال دنیا کوئی چیز نہیں اور دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں افضل و بہتر ہیں اور گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بھی بہتر ہے۔ دنیا کی زندگی بامقصد ہونی چاہئے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ آخرت کا حصول۔ کہ دنیا نہ ہوتی تو آخرت کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا یاد صرف یہ رکھنا ہے کہ دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔ دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہیں اور آخرت کی نعمتیں غیر فانی ہیں۔ دنیا کی نعمتوں کے ساتھ طرح طرح کی پریشانیاں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں ان پریشانیوں سے پاک ہیں۔ دنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں اور آخرت کی نعمتیں متقین کی میراث قرار پا چکی ہیں۔ کسی نے کیا عجیب کہا ہے ؎

ولا خير فى الدنيا لمن لم يكن له ؛ من الله فى دار المقام نصيب
فان تعجب الدنيا رجالًا فانها ؛ متاع قليل والزوال قريب

"اس ناپائیدار دنیا میں ایسے انسان کیلئے کچھ بھلائی نہیں ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائیدار گھر یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ ہو۔ پھر اگر دنیا کچھ لوگوں کو فریفتہ کرے تو وہ خبردار رہیں کہ یہ دنیا تو متاع قلیل ہے اور اس کا زوال بہت قریب ہے۔" ادھر آنکھ بند ہوئی اور ادھر آخرت سامنے آئی۔ اس لئے حباب آب پر انحصار آخر کب تک؟

موت سے فرار؟ سوچ لو! اس کی کوئی صورت ممکن بھی ہے

۱۳۵ انسان پیدا ہوا ہے؟ کیوں؟ مرنے کیلئے اور آج تک تو یہی ہوتا آیا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے وہ یقیناً مرا۔ قتال فرض کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی زندگی کے قیام کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔ پس جب سوائے اس کے چارہ نہیں تو خواہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جائے وہ کام کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اصول زندگی نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں جس کی ضرورت انسانی زندگی کے بقا کیلئے ہے موت کا خطرہ ہو تو انسان وہ کام نہ کرے اس طرح پر موت سے بچنا گویا انسانی زندگی کی اصل غرض ہوگئی حالانکہ یہ بات بذاتہ بالکل غلط ہے

مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ

تو کہتے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے' تم کہہ دو جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے پھر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ کوئی بھی بات ہو سمجھ بوجھ کے قریب نہیں پھٹکتے۔[۱۳۶] ۷۸

حقیقت میں جو کچھ بھلائی تمہیں پیش آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو کچھ

تاہم اگر تم موت سے بچنے ہی کو انسان کی زندگی کی اصلی غرض قرار دیتے ہو تو ضرور اس کے حصول کا سامان بھی تمہارے پاس ہوگا۔ پس اپنی جانوں سے موت کو دور رکھ کر بتاؤ کہ تم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ انسانی زندگی کے مقصد کو یوں کھویا اور شرف انسانیت کو بٹا لگایا اور موت تو پھر بھی آخر کار آکر ہی رہی اس کے بچاؤ کا کوئی نسخہ نہ پہلوں کے پاس تھا اور نہ تمہارے پاس ہے۔

کتنے تھے جو موت سے ڈر کر جہاد میں شریک نہ ہوئے لیکن پھر بھی مرگئے اور کتنے تھے جو ہر جنگ میں شریک ہوئے بلکہ پیش پیش رہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں مارے جانے کی ان کی خواہش بھی تھی لیکن وہ ہر میدان سے بخیریت لوٹے۔ موت سے زیادہ ڈرنے والا منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی ہی تھا کیا وہ موت سے بچ گیا؟ کیا جو احد میں شریک ہوئے وہ سارے مرگئے۔ ان میں تو وہ بھی تھے جو نبی اعظم و آخر ﷺ کی وفات کے بعد بھی ساٹھ سال تک زندہ رہے۔

خالد بن ولید جو اسلام کے سپاہی اور مشہور و معروف جرنیل تھے اور سیف اللہ ان کا لقب تھا اسلام کی پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے اور ہزاروں کافروں کو تہ تیغ کیا۔ ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا اور ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ میری موت چارپائی پر نہ ہو بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدان جہاد میں کام آؤں لیکن موت کا پروانہ آیا تو بستر پر ہی آیا۔ یہ بات معلوم ہوگئی کہ زندگی اور موت کا نظام قادر مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر موت دے دے اور چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بھی بچا لے فرمایا موت سے بچنا تو ممکن نہیں چاہے وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ "اگرچہ تم اونچے اور مضبوط قلعوں کے اندر چھپے ہو۔" کیونکہ موت کسی انسان کی طرف سے نہیں آتی بلکہ اس قادر مطلق کی طرف سے آتی ہے جس نے ہر انسان کی موت کا وقت متعین کر دیا ہے۔

بھلائی کی نسبت تو یہ لوگ اللہ کی طرف کرتے ہیں لیکن مصیبت کی نسبت تیری طرف' کیوں؟

---

[۱۳۶] منافقین میں سے کسی ایک کی زندگی کو پڑھنے کیلئے منتخب کر لو اور پھر اس کی زندگی کا ایک ایک

واقعہ پڑھتے جاؤ تم کو معلوم ہو گا کہ منافق کا کوئی کام اور منافق کی کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جس میں اس نے اپنے نکلنے کیلئے کوئی نہ کوئی رخنہ نہ رکھا ہو۔ یعنی وہ بیک وقت چالاک' مکار اور عیار بھی ہوتا ہے اور عقل مند' سمجھدار اور فرمانبردار بھی۔ آپ پیچھے پڑھتے آرہے ہیں تو آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ ہم نے ان کو "دوہری پوزیشن کے لوگوں" کے نام سے اکثر یاد کیا ہے۔ ان کی دوہری پوزیشن یہی ہے کہ بیک وقت سب کچھ ہیں زیر نظر آیت میں ایک جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے "جب ان کو کوئی بھلائی کی بات پیش آئی؟ تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔" یہ بالکل وہی بات ہے جس کو ان کے دل تسلیم نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر محتاط ہیں کہ بھلائی کی نسبت وہ اللہ کی طرف کر رہے ہیں۔ معلوم ہے کہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ برائی کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا چاہتے ہیں اور اپنا راز بھی چھپانا چاہتے ہیں اور وہ اس طرح چھپایا جا سکتا ہے۔ ان کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ وہ مسلمان نہ ہونے کے باوجود اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں ہماری یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہو اس لئے وہ بولیں گے تو بڑی احتیاط سے کام کریں گے تو بڑی احتیاط سے اور یہی ہاتھ انہوں نے اس جگہ دکھایا ہے۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول دونوں کی مخالفت کرتے تو آخر ان کو مسلمان کون سمجھتا؟ انہوں نے بڑی چالاکی سے اللہ تعالیٰ کی طرف بھلائی کی نسبت دے کر اپنی فرمانبرداری اور اسلام دوستی کا اظہار کیا اور جب وقت آیا تو اللہ کے رسول ﷺ پر سارا کیچڑ پھینک دیا اور پھر مسلمان کے مسلمان بھی رہے۔ اس طرح گویا انہوں نے بزعم خویش سانپ بھی مارا اور لاٹھی بھی بچالی کہ کافر کے کافر بھی رہے اور اسلام کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے ان کی اس "دوہری پوزیشن" کو اس طرح بیان فرمایا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔" ہاں! اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔" (المنافقون ۶۳ : ۱)

ان کو کہا جا رہا ہے کہ اسلام اس چیز کا نام نہیں کہ "آدھا تیتر آدھا بٹیر" ماننا ہے تو سارا مانو اور انکار کرنا ہے تو سارے کا انکار کرو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔" جتنا چاہا مان لیا اور جس سے چاہا انکار کر دیا۔" اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔" کیونکہ اس نے ہر چیز اور ہر عمل کے نتائج مقرر کر دیئے ہیں جیسا عمل ہو گا ویسا ہی اس کا نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔ یہ فلسفہ تم نے کہاں سے نکالا کہ بھلائی کی نسبت اللہ کی طرف تاکہ تم مسلمان سمجھے جاؤ اور جب کوئی مصیبت آجائے جو حقیقت میں تو ہو تمہارے عمل کا نتیجہ' لیکن تم اس کو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ڈال دو تاکہ اس کفر کی حمایت تم کو حاصل ہو جائے اور پھر تمہارا یہ کفر اسلام کے اندر چھپ بھی جائے۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کا جملہ بول کر اللہ نے ان کے سارے راز کو فاش کر دیا کہ نہ وہ اس کو مانیں گے اور نہ سچے مسلمان کہلائیں گے اور اس طرح اپنی "دوہری پوزیشن" کے ساتھ اپنے رب کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے اس

حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ

نقصان اٹھاتے ہو وہ خود تمہاری طرف سے ہوتا ہے اور اے پیغمبر اسلام! تمہیں لوگوں کے پاس

وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اس "دوہری پوزیشن" سے نقصان کس کا ہوا؟ لیکن "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" فرمایا "ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ کوئی بات ہو سمجھ سوچ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔" یہی ہیں جو "چلتی کا نام گاڑی رکھیں اور بنے دودھ کو کھویا۔"

اصلاح کا پہلو اس میں تھا کہ بھلائی کی نسبت اللہ کی طرف اور برائی کی نسبت اپنی طرف کرتے

۱۳۷ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک اللہ کی رضا ہے اور ایک اللہ کی قضا و قدر کے فیصلے۔ جو شخص ان دونوں میں فرق کرنا نہیں جانتا وہ ہمیشہ ٹھوکر کھا جاتا ہے "مِنَ اللّٰهِ" وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عین رضا کے مطابق ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ "مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" ہے۔ ادب و احترام کی سیدھی اور صاف راہ یہ ہے کہ انسان کو جب بھی کوئی بھلائی اور اچھائی نصیب ہو یا بھلائی اور اچھائی کا نتیجہ اس کے سامنے آئے تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کرے کہ وہ خیر کل ہے لیکن جب کوئی معاملہ اس کے برعکس ہو جائے تو اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتے ہوئے اس کی اصلاح کرے۔ کوئی نقصان ہوا یا کوئی مصیبت آئی تو سمجھے کہ یہ میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس اصول کے اندر بڑے راز مضمر ہیں اس لئے جس انسان کو اس کی سمجھ آجائے اور اس کے مطابق وہ عمل کرنا شروع کر دے سمجھو کہ اس پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہوگیا۔

زیر نظر آیت میں اس بات کا درس ہے فرمایا جو کچھ برائی پیش آتی ہے وہ خود تمہاری ہی بد عملی کا نتیجہ ہے اس کا الزام کسی دوسرے کے سر نہ ڈالو۔ پیغمبر اسلام تو اللہ کے رسول ہیں اور رسول کا کام یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے پیغام پہنچا دے۔ ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے اگر تم ان کے احکام کی اطاعت نہ کرو اور اس کا برا نتیجہ پیش آئے تو اس کی ذمہ داری تم پر ہے نہ کہ پیغمبر اسلام پر۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی جماعت یا کسی ریاست کی پیشوائی کا منصب رکھتا ہے اسے کیسی کیسی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے؟ وہ جب عزم و عمل کی دعوت لوگوں کو دیتا ہے تو ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی پیدا ہو جاتا ہے جو یقین کا کچا اور ہمت کا کمزور ہوتا ہے وہ اطاعت کی جگہ مخالفت کی روش اختیار کر لیتا ہے۔ پھر جب اس صورت حال کی وجہ سے کوئی ناکامی پیش آجاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ لوگ اپنی بد عملیوں پر نادم ہوں۔ سارا الزام رئیس جماعت کے سر ڈال دیتے ہیں اور اس طرح مخالفت کا ایک نیا بہانہ ان کے ہاتھ آجاتا ہے اور یہ وقت رئیس جماعت کیلئے بھی بہت سخت ہوتا ہے پھر رسالت کا منصب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے اس کی ذمہ داری بھی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پھر رسول ہی وہ انسان ہے کہ ایسے نازک وقت میں بھی کوئی بات منہ سے ایسی نہیں نکالتا جو کسی برے سے برے انسان کیلئے بھی باعث تکلیف ہو۔

وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ
يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ

اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔[۱۳۸] ۷۹

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس کسی نے روگردانی کی تو اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے۔[۱۳۹] ۸۰

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک خاص دائرہ کے اندر آزادی بخشی ہے۔ یہ آزادی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس پر انسان کے سارے شرف کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ سے انسان آخرت میں جزاء و سزاء کا مستحق ٹھہرے گا۔ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو ایک گھوڑے اور انسان کے درمیان سوائے شکل و صورت کے کوئی فرق نہ ہوتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نیک ارادے بھی اللہ کی توفیق سے پورے ہوتے ہیں اور برے ارادے بھی اس کے مہلت دینے سے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے برے ارادے کو بروئے کار آنے دیتا ہے تو اس پہلو سے وہ اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ اس کا بروئے کار آنا اللہ ہی کے قانون مشیت سے ہوا لیکن دوسرے پہلو سے وہ انسان کا فعل ہے کیونکہ اس کا ارادہ انسان نے خود کیا۔ لیکن اگر اس ارادے کی آزادی انسان سے واپس لے لی جائے تو وہ مکلف کیوں کر ہوا؟

رسول کی رسالت کے مان لینے سے رسول کا فائدہ؟ اور نہ ماننے سے اس کا کوئی نقصان؟

۱۳۸ فرمایا اے پیغمبر اسلام! ﷺ اگر یہ منافقین تمہاری رسالت کے باب میں متردد ہیں اور تمہارے ہر قول و فعل کو اللہ کی طرف سے نہیں سمجھتے تو اس بات کی پروانہ کرو کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح کا اقدام کر کے یہ آپ ﷺ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے جو نقصان ہوگا وہ سراسر ان کا اپنا ہوگا اور جو شخص اپنا نقصان خود کرنے پر تل جائے اس کو روکنے کا کوئی فائدہ؟ ہاں! اس طرح وہ روکنے والے کو مطعون کرے گا اس لئے اس کو اپنے کئے کا مزہ چکھ لینے دو اور تمہاری رسالت ان کی گواہی کی محتاج نہیں ہے اس لئے کہ اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ پھر ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی حوصلہ افزائی بھی فرما دی۔

صاحب عزم کو چاہئے کہ وہ ان باتوں سے دل گرفتہ نہ ہو' اللہ پر بھروسہ رکھے اور اپنے کام میں سرگرم رہے۔ اس کا عزم و ثبات بالآخر تمام دشواریوں پر غالب آجائے گا۔

اللہ کی اطاعت کا دعویدار رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کر کے خود اپنے دعویٰ کی تردید کرتا ہے

۱۳۹ جن لوگوں نے بھلائی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی تھی اس نسبت سے انہوں نے اللہ کی اطاعت کا دعویٰ کیا لیکن وقت آنے پر برائی کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کر کے گویا انہوں نے اپنے دعویٰ کی خود تردید کر دی۔ اس لئے کہ رسول جب اللہ ہی کا رسول ہے اور اس کی اطاعت ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اس لئے وہ اس سے انکاری ہیں۔ حالانکہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت سے سر پھیرا اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے ایسا دعویٰ جس کی تردید دعویٰ کرنے والا خود ہی کر دے اس پر کسی خارجی شہادت کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی وہ خود بخود خارج ہو جاتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا دعویدار توہین عدالت کا مرتکب ٹھہرتا ہے جس کی سزا بذاتہ بڑی سخت ہے اور وہ دھوکہ دہی کا مجرم بھی ٹھہرتا ہے اس لئے اس کی "دوہری پوزیشن" کے پیش نظر اس پر دوہری سزا لازم آتی ہے۔

اس لئے فرمایا کہ اے پیغمبر اسلام! ہم نے آپ ﷺ کو داروغہ یا پاسبان بنا کر نہیں مبعوث کیا بلکہ پیغام بر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کا کام پیغام پہنچانا تھا وہ آپ ﷺ نے پہنچا دیا اب اگر کوئی بدبخت آپ ﷺ کا انکار کرتا ہے تو اس نے آپ ﷺ کا انکار ہی نہیں کیا بلکہ اس نے بھیجنے والے یعنی اللہ کا انکار کیا پھر جب اس نے اللہ کا انکار کر دیا تو وہ اس کی سزا سے بچ کر کہاں جائے گا؟ اور کیسے جائے گا؟ آپ ﷺ فکر نہ کریں بلکہ سمجھیں کہ "بس وہ دھر لیا گیا۔"

اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کا رسول اس لئے آتا ہے کہ پیغام برحق پہنچا دے اس لئے نہیں کہ لوگوں کے اعمال کا پاسبان ہو اور انہیں جبراً اپنے طریقے پر چلائے۔

اسلامی نظام میں اصل مطاع بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہے لیکن یہ تصور کس نے دیا؟ رسول نے۔ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ رسول کی اطاعت مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعت الٰہی کی واحد عملی صورت ہے۔ اس بات کو آپ اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت اللہ کی ہے لیکن عمل و طریقہ رسول کا۔ اس لئے وہی اطاعت "اللہ کی اطاعت" کہلائے گی جو اللہ کے رسول ﷺ کے "عمل و طریقہ" کے مطابق ہوگی۔ وہ شخص جو اللہ کی اطاعت کا دعویدار ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت یعنی عمل و طریقہ سے سر پھیرتا ہے وہ ہرگز ہرگز اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کی جا سکتی ہے کہ رسول کی اطاعت کی جائے اس لئے رسول کی پیروی سے منہ موڑنا اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد بھی اسی طرح ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور یہی بات قرآن کریم کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے جس کی یہاں تفسیر بیان کی جا رہی ہے۔

اس اطاعت کو دو حصوں میں کیوں بیان کیا گیا؟ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابد الاباد زندہ نہیں رہنا تھا بلکہ آپ ﷺ کا اٹھا لیا جانا بھی لازم و ضروری تھا اس لئے الٰہی پیغام یعنی کلام اللہ اور "عمل و طریقہ" رسول دونوں میں خط امتیاز بھی ضروری تھا اور یہ اس صورت ممکن تھا کہ ان دونوں کی حیثیت الگ الگ قائم کی جاتی اور یہی کچھ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کلام اللہ یعنی قرآن کریم کو باقاعدہ تحریر کروا کر اول تا آخر مکمل کروا دیا جو اطیعوا اللہ کا مرکز قرار پایا اور رسول اللہ ﷺ کی تشریحات و تفسیر کو آپ ﷺ کا "عمل و طریقہ" مشاہدہ کرنے والوں نے منضبط کرا دیا جو اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور دونوں کے امتزاج کا نام اسلام ہے۔

اس جگہ ایک شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ کچھ لوگوں کی طرف سے یہ شبہ پیدا کیا گیا ہے کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ممکن ہی نہیں' کیوں؟ اس لئے کہ جو چیزیں بعد میں پیدا ہوئیں اور اس وقت ان کا وجود ہی نہیں تھا جیسے میونسپل کمیٹیاں' ڈاک خانہ' ریلوے' پی ڈبلیو ڈی' ٹیلیفون' تار برقی' بجلی' وائرلیس' ریڈیو' ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ اور ان کے قواعد و ضوابط اور اس طرح ان گنت معاملات کے احکام سرے سے جب وہاں موجود ہی نہیں تھے اس کے ازالہ کیلئے سب سے پہلے یہ یاد رکھنا ہے کہ یہ شبہ اصول دین کو نہ سمجھنے کی بناء پر پیدا ہوا۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس دائرہ کی آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند نہیں سمجھتا اس کے برعکس مسلمان ہر معاملہ میں سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہے پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے اور وہ چیزیں جو نئی نئی ایجاد ہوتی ہیں ان کے متعلق کتاب و سنت سے استنباط کر کے جائز و ناجائز کی تمیز کرتا ہے اور اس کی یہ آزادی اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع نے جو احکام دیئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ پھر جو لائحہ عمل تیار کرتا ہے اس پر مزید تجربہ کرتا رہتا ہے اگر اس کے نقصانات زیادہ اور نفع کم ہو تو ترک کر دیتا ہے اور نفع زیادہ اور نقصانات کم ہوں تو ان کو کرتا رہتا ہے اور اس میں اگر وہ نور بصیرت سے کام لے تو انشاء اللہ کم ہی خطا ہوتی ہے اور اگر کہیں غلطی ہو بھی جائے تو معلوم ہونے پر اس سے تائب ہو کر اپنے مالک حقیقی سے معافی طلب کرتا ہے اور اسلام کا رب اس کے سارے اعمال سے چونکہ خبردار ہوتا ہے اور اس طرح وہ اس کی نیت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اگر اس کی نیت میں کوئی فتور نہ ہو تو وہ معاف کر دیتا ہے۔

اس طرح کی جتنی ایجادات ہوئی ہیں اور جو جو ابھی مزید ہوں گے ان سے جائز فائدہ وہ اپنا حق سمجھتا ہے کیونکہ وہ اس کے رب ہی کے پیدا کئے گئے عناصر سے ترتیب پائی ہیں اور ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی وہ کبھی کوشش ہی نہیں کرتا اور وہ جانتا ہے کوئی ایجاد بذاتہ خود غلط نہیں غلط ہمیشہ اس کا استعمال ہوتا ہے اس لئے وہ

حَفِيظًا ﴿٨١﴾ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ ۖ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۚ

اور دیکھو یہ کہتے ہیں کہ آپ کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر! لیکن جب تمہارے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو راتوں کو اپنی مجلسیں جماتے اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کے خلاف مشورے کرتے ہیں[۱۴۰] اور راتوں کی ان مجلسوں میں وہ جو کچھ کرتے ہیں

ہر ایجاد سے جائز فائدہ حاصل کرتا ہے بلکہ نئی نئی ایجادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اسی طرح اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا فعل ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام اور اللہ کا فعل ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہو سکتے بلکہ وہ دونوں ایک ہیں اس لئے وہ سائنس سے کبھی دور نہیں بھاگتا بلکہ قرآن کریم کے مطابق اس کو ترتیب دینے کی سعی کرتا ہے جس میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ کامیاب ہی ہوتا ہے اس طرح نئے نئے اسلحے تیار کرتا اور ان کے استعمال کا علم حاصل کرتا ہے لیکن ان کے استعمال میں وہ قرآن کریم کی راہنمائی کے مطابق پوری احتیاط برتتا ہے تاکہ چھری اس چیز کو کاٹے جس کے کاٹنے کا اس کو حق ہے اور اس سے تجاوز بھی نہیں کرتا تاکہ اس سے مواخذہ نہ ہو۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اب اس شبہہ کا ازالہ ہوگیا ہوگا اور مزید کوئی شبہ پیدا بھی نہیں ہوگا۔

اسلام اس کو جھوٹا کہتا ہے جو جھوٹا ہو اور پھر اس کو اس کے گھر تک پہنچا دیتا ہے

۱۴۰ انہی دوہری پوزیشن کے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ جب تمہاری نافرمانیوں کا یہ حال ہے کہ منہ سے تو اطاعت کا اقرار کر لیتے ہو لیکن راتوں کو مجلس جما کر مخالفانہ مشورے کرتے ہو تو پھر تمہیں کیا حق ہے کہ نتائج کیلئے اللہ کے رسول ﷺ کو ذمہ دار ٹھہراؤ؟

بَيَّتَ کے متعلق یاد ہے کہ ہر وہ فعل جس کے متعلق رات کو تدبر کیا جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ رات کو سارے ہم خیال اپنے اپنے دھندوں سے فارغ ہو کر ایک جگہ جمع ہوتے اور سب مل کر ایک دوسرے سے مشورہ کر کے ایک پروگرام مرتب کرتے ہیں تاکہ مخالف کو زک پہنچا سکیں اور یہی کچھ یہ لوگ نبی اعظم و آخر ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر اپنے سرغنوں کی مجالس میں شریک ہو کر آنے والے روز کا پروگرام حاصل کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "اے پیغمبر ﷺ یہ لوگ اپنی زبانوں سے کیا کہتے ہیں آپ ﷺ کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر" لیکن جب تمہارے پاس اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو راتوں کو اپنی مجلسیں جماتے ہیں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ گویا بڑے ڈھیٹ اور بے حیاء

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا

اللہ' لکھ رہا ہے۔[۱۴۱] پس چاہئے کہ ان کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ کارسازی کیلئے اللہ کی کارسازی بس کرتی ہے۔[۱۴۲] ۸۱

لوگ ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اللہ اور اس کے رسول کو وہ دھوکا دے لیں گے؟ جو شخص ایسا سوچ سکتا ہے ایک تو اس کا اسلام ظاہر ہوگیا کہ وہ کتنا متقی ہے؟ اور دوسرا اس کے فریب کا وبال بھی یقیناً اس پر پڑے گا کیونکہ اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کس مجلس سے اٹھ کر آیا ہے اور اس مجلس میں کوئی ایسا پروگرام مرتب نہیں ہوتا جس میں کسی کو دھوکہ و فریب میں مبتلا کرنے کا کوئی پروگرام ہو اس طرح قانون الٰہی یہ ہے کہ جو فریق دھوکہ دینے کی سوچتا ہے دراصل وہ خود فریب خوردہ ہوتا ہے وہ پانی پر لاٹھی مارتا ہے اس کی چھینٹیں خود اس پر پڑتی ہیں اور پانی کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

یہ بھول نہ جائیں ہم ان کے کئے ہوئے مشورہ کو لکھ رہے ہیں

۱۴۱ یہ فریب خوردہ لوگ جو کچھ اپنے مشوروں میں طے کرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ان کی یاد دہانی کیلئے محفوظ بھی کر رہے ہیں کہ تحریر شدہ چیز محفوظ ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ یہ بھول جائیں لیکن ہم ان کو اس مجلس کی پوری جھلکی دکھائیں گے جس میں ان کے سرغنے اور یہ سارے شامل ہوں گے اور جو کچھ انہوں نے طے کیا ہے اس کی تحریر بھی ان کے سامنے پیش کر دیں گے اور ان کو بولتا بھی دکھا دیں گے۔ ہاں! آج ہی یہ لوگ اس نقشہ کو اپنے ذہن میں رکھ لیں تو شاید ان کو اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہو اور یہ اس جرم سے باز آجائیں جو ان کے اپنے لئے ہی مفید ہو۔ پھر آپ ﷺ بھی زیادہ فکر نہ کریں آپ ﷺ کو تو ان کے کرتوتوں سے ہم بتا ہی رہے ہیں اس لئے ان کا کوئی راز بھی آپ ﷺ سے پوشیدہ نہیں رہا اس لئے انہیں جو کچھ کل کرنا ہے ہم آج ہی تم کو بتا دیتے ہیں۔ اگر کسی بات کی اطلاع قبل از وقت نہیں دیتے تو اس میں بھی یقیناً آپ ﷺ کا یا آپ ﷺ کے ساتھیوں کا امتحان مطلوب ہوتا ہے اور امتحان کیلئے ضروری ہے کہ پرچہ آؤٹ نہ ہو اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ امتحان کیوں لیا جاتا ہے؟

ان کی اَن ہونیوں کو آپ ﷺ اپنے دل میں جگہ نہ دیں کہ نیش زن کا کام نیش مارنا ہے

۱۴۲ اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ خود اور آپ ﷺ کے ساتھی ان عقرب صفت لوگوں کے متعلق زیادہ خیال ہی نہ کریں اس لئے کہ یہ اپنی عادت سے باز آنے والے نہیں اور یہ لباس انہوں نے اتارنے کیلئے نہیں پہنا بلکہ اس کے اندر کچھ چھپانے کیلئے پہنا ہے۔ آپ ﷺ اپنے اللہ پر بھروسہ کریں اور ان کو نیش مارنے

يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ

پھر کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی باتوں میں اختلاف پاتے[۱۴۳]۔ ۸۲

اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے تو یہ اسے لوگوں

کا موقعہ ہی فراہم نہ کریں بلکہ ان کو دور سے آتا دیکھ کر ان کے چہروں سے ان کے اندر کی حالت دیکھ لیں اس طرح سب کچھ آپ ﷺ پر روشن ہو جائے گا اور یہی سبق اپنے ساتھیوں کو بھی یاد کرائیں۔ یاد رکھو کہ جو "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔" وہ عقل مند نہیں ہوتا۔ عقل و فکر اس چیز کا نام ہے کہ دودھ اور چھاچھ کو دیکھتے ہی پہچان جائے کہ یہ دودھ ہے اور یہ چھاچھ۔ ہاں! پکڑتے ہی منہ نہ لگا لو' توقف کرو تمہیں ہاتھ ہی بتا دے گا کہ پینے کے قابل ہے یا ابھی نہیں۔ فرمایا جس کا اللہ کارساز ہو اس کو کسی دوسرے کی کارسازی کی آخر ضرورت ہی کیوں؟

اللہ کی باتوں میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

[۱۴۳] "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ؟" پھر کیا یہ لوگ قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے؟ معلوم ہے کہ "دبر" کسے کہتے ہیں؟ پیٹھ کو۔ پیٹھ کہاں ہوتی ہے؟ پیچھے۔ اف توبہ قرآن اور پیچھے۔ ہاں ہاں! قرآن اور پیچھے۔ تم نے کبھی یہ فقرہ نہیں سنا؟ "کہ یار تم تو اس بات کے پیچھے ہی لگ گئے ہو۔" اب غور کرو کہ پیچھے کا کیا مطلب ہے؟ بس اس "دبر" سے "تدبر" ہے اور اسی سے تدبیر اور "تدبر" کے معنی ہیں "التفکیر فی دبر الامور" (راغب) یعنی امور کے نتائج میں غور و فکر کرنا۔ قرآن کریم کی آیت کے اس حصہ کا مطلب کیا ہوا؟ کہ قرآن کے پیچھے لگ جاؤ اس طرح کہ اس میں غور و فکر کرتے ہی رہو۔ بس غور و فکر کرتے ہی رہو اور پھر غور و فکر کرتے ہی رہو۔ ہاں! یاد رکھو کہ پیچھے لگ جاؤ نہ یہ کہ اس کو پیچھے لگا لو۔ سمجھ لو کہ پیچھے لگ جانے اور پیچھے لگا لینے میں بڑا فرق ہے۔

اگر قرآن کریم کے پیچھے لگ جاؤ گے یعنی اس میں غور و فکر کرو گے؟ یہ تمہارا وعدہ ہے تو پھر یاد رکھو کہ قرآن کریم میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا اور یہی اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کی دلیل ہے۔ اگر غور و فکر کرنے سے کہیں اختلاف نظر آیا تو سمجھ جاؤ کہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآن میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ پھر غور و فکر کرو۔ بس اس طریقہ سے قرآن کریم کے پیچھے لگے رہو۔ یقیناً اختلاف

ختم ہو جائے گا یا تم پر روشن ہو جائے گا کہ یہ اختلاف کسی دوسرے نے ڈالا تھا۔ جان بوجھ کر یا غلطی سے بس تم اس کے پیچھے مت پڑو کہ اختلاف کس نے ڈالا اور کیوں ڈالا۔ غلطی سے یا جان بوجھ کر۔ یہ زائد چیز ہے اگر تم اس کے پیچھے پڑ گئے تو بہت دور نکل جاؤ گے اور اس طرح تم پر شیطان کا داؤ لگ جائے گا۔ اس کے پیچھے بالکل نہ پڑو بلکہ قرآن کریم کے پیچھے لگ جاؤ ہاں! آگے پڑھو اور اس طرح اپنے اختلافات کا حل ڈھونڈتے رہو۔ یہی قرآن کریم میں تدبر ہے اور اس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ اگر تم نے اس طرح قرآن کریم پر غور کیا تو انشاء اللہ نہ مذہبی "بلڈ پریشر" ہو گا اور نہ "ذیابیطس" نہ "ہارٹ اٹیک" ہو گا اور نہ "خفقان قلب" حاشا للہ نہ مذہبی "ہیضہ" ہو گا اور نہ "قبض"۔ کیا تم کو آرام و سکون مطلوب نہیں ہے؟ کیا تم ان بیماریوں سے نجات نہیں چاہتے؟ اگر آرام و سکون مطلوب ہے اور ان بیماریوں سے بھی نجات چاہتے ہو تو قرآن کریم کا مطالعہ کرو اور نہایت غور و فکر کے ساتھ کرو۔ خاموشی کے ساتھ کرو اور الگ تھلگ ہو کر کرو۔ ایک آیت پڑھو اور اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو پھر الفاظ کو جملوں میں استعمال کر کے غور کرو۔ پھر پوری آیت پر غور کرو اور اس کے بعد ایک آیت کو دوسرے کے ساتھ ملا کر غور کرو۔ حاشاء للہ تم کو اس سے جسمانی غذا بھی ملے گی اور روحانی غذا بھی۔

آج جس قدر پوری قوم میں مذہبی افراتفری ہے یا سیاسی کشمکش ہے شاید آج سے پہلے کبھی نہیں ہوئی ہو گی اس کا اصل سبب قرآن کریم سے دوری ہے۔ ہمارے مذہبی راہنما بھی اتنے ہی قرآن کریم سے دور ہیں جتنے سیاسی لیڈر بلکہ ان سے بھی زیادہ دور۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ کو اور مجھے حکم ملا کہ "لاہور آؤ تاریخ اور وقت بھی بتایا ہے اور آنے کا مقصد بھی۔ آپ نے میرے ساتھ کان لگایا لیکن میں جانے کیلئے تیار نہ ہوا۔ آپ نے ماشاء اللہ ٹکٹ خرید لی اور ایئر کنڈیشن میں سیٹ بھی ریزرو کرا لی اور میرے پاس تشریف لے آئے اور مصروف کار ہو گئے کہ تاریخ آئی' وہ وقت بھی نکل گیا اور وقت پر گاڑی بھی چھوٹ گئی لیکن تم میرے ساتھ ہی رہے۔ نتیجہ کیا نکلا؟

اپنی مجلس میں آپ مجھے برا بھلا کہتے ہیں کہ میں نے ٹکٹ نہیں خریدی۔ میں آپ کو برا بھلا کہتا کہ وہ شامل نہیں ہوئے۔ دلائل آپ کے پاس بھی موجود ہیں بکنگ سیٹ بھی ہے اور ٹکٹ اور دلائل میرے پاس بھی موجود ہیں۔ آپ اپنا زور لگاتے رہیں میں اپنی طاقت صرف کرتا رہوں گا اور آپ کی میری لڑائی کا کوئی فائدہ؟ قوم کے راہنما ہیں "میں" بھی اور "آپ بھی"۔ ایک ہم میں سے مذہبی راہنما ہے اور دوسرا سیاسی فیصلہ خود فرما لیں کہ مذہبی راہنما دین سے زیادہ دور ہے یا سیاسی لیڈر؟ دونوں کی دوری میں کوئی شک نہیں یہ "زیادہ" اور "کم" پر لڑائی ہے جتنی دیر چاہتے ہو لڑتے رہو۔

قرآن کریم کی اس آیت پر ایک بار پھر غور کر لو "پھر کیا یہ لوگ قرآن کریم میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی

أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي
الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

میں پھیلانے لگتے ہیں۔ اگر یہ اسے اللہ کے رسول کے سامنے اور ان لوگوں کے سامنے جو ان میں حکم و اختیار والے ہیں پیش کرتے تو جو بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے[۱۴۴] اور دیکھو اگر اللہ کا تم پر فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ لئے ہوتے[۱۴۵]۔ ۸۳

باتوں میں اختلاف پاتے۔" قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں' اختلاف جتنے ہیں وہ سب لوگوں کے ڈالے ہوئے ہیں۔ بس ان کو مٹا دو ورنہ خود مٹ جاؤ گے۔ ماحصل اس آیت کا کیا ہوا؟

ا۔ قرآن کریم کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے' پس یہ سمجھنا کہ وہ صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے سمجھنے کی چیز ہے صحیح نہیں' ہاں! جو سمجھ میں نہ آئے کسی سمجھے ہوئے سے سمجھ لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

ب۔ غور و فکر وہی کر سکتا ہے جو مطالب سمجھنے کی دلچسپی رکھتا ہو۔

ج۔ جو اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیتا ہو اور دلائل و وجوہ سے نتائج نکال سکے۔ پس مقلد اعمیٰ یعنی اندھی تقلید کرنے والا قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

د۔ جو شخص قرآن کریم میں تدبر کرتا ہے اس پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور جس پر یہ حقیقت کھل جائے وہ قرآن کریم کے سوا زندہ نہیں رہ سکتا۔

رسالت کا درجہ تو بہت بڑا ہے لیکن بات کی تہ تک پہنچ جانے والے لوگ بھی یقیناً ہوتے ہیں

۱۴۴ يَسْتَنْبِطُونَهُ "جو لوگ اس بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں" اِسْتَنْبَاط ن ب ط سے ہے اور "نبط البئر" کے معنی ہیں کنوئیں کو کھودا یہاں تک کہ پانی آگیا اور کنواں کھودنے کا یہی مقصود تھا۔ اس طرح استنباط کرنے والے وہ لوگ ہوئے جو اپنے فہم و فراست سے بات کی تہ تک پہنچ جانے والے ہیں وہی استنباط کرنے والے کہلاتے ہیں یعنی بات کی گہرائی میں پہنچ کر اس کے اصل مطلب کو حاصل کر لینے والے اور یہی وہ لوگ ہیں جو "اولو الامر" بننے یا بنا دیئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ کسی ایرے غیر کو "اولو الامر" بنا دینے کے

جو نقصانات ہوتے ہیں ان کے نتائج بھی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت تیار ہوتے ہیں کہ کوئی بات سنی تو اس وقت آگے سنانے کی کوشش کرتے اور پھر آگے سناتے وقت کچھ چاشنی اپنے پاس سے بھی ساتھ ملا دیتے ہیں اور ہوتے ہوتے وہ بات کا ایک بتنگڑ بن جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پر سے کوا اور کوے سے ڈار۔ ایسے لوگوں کو رب کی مار۔ کبھی کبھی ان ہی باتوں کے نتائج اتنے زبردست ہوتے ہیں کہ وہ لاعلاج ہو کر رہ جاتے ہیں اور پوری قوم کی قوم نگل جاتے ہیں گویا وہ ایک آگ ہوتی ہے جو ہر چیز کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔

تقریباً یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کی حالت نفاق کے قریب ہوتی ہے یا وہ صحیح معنوں میں منافق ہوتے ہیں اور اس جگہ ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ جاری ہے۔ منافقین چونکہ ملت کے خیر خواہ نہیں ہوتے اس وجہ سے افواہیں پھیلانے کے معاملے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ بات کو ایسا رنگ چڑھاتے ہیں کہ وہ دور ہی سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ امن یا خطرے کی جو بات بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ وہ آن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح ان کے ذریعے سے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں خصوصاً ایسی افوائیں بڑے خطرناک نتائج پیدا کر دیتی ہیں اور پھر جب حالات جنگ ہوں جیسے کہ اس وقت تھے اس وقت تو ان کی خطرناکی مزید دَہ چند ہو جاتی ہے۔ منافقین ان افواہوں سے مختلف قسم کے فوائد حاصل کرتے رہتے تھے لیکن خاص طور پر کمزور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کیلئے یہ ان کا ایک خاص ہتھیار تھا۔ بعض اوقات وہ اس طرح کی افواہوں سے مسلمانوں کے اندر غلط قسم کا اطمینان بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ظاہر ہے کہ بے جا تشویش کی طرح غلط اطمینان بھی ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ ویسے اُس وقت کا نام لینا ذرا آسان ہے ورنہ ایسے لوگوں کی کمی ہمارے زمانے میں بھی نہیں بلکہ یہ جماعت ترقی پذیر ہے۔ ہاں! اب تو ان کے باقاعدہ طور پر محکمے بن چکے ہیں اور ہر جماعت میں ایک پروپیگنڈا سیکرٹری کی سیٹ مختص ہے۔ اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی اس کے انحصار پر زندہ و تابندہ ہیں اور دنیا میں بڑی بڑی حکومتوں کا یہی سب سے بڑا ہتھیار ہے اور امریکہ سردار کی اسی پر سرداری قائم ہے۔ لیکن چونکہ ان ساری چیزوں میں ماشاء اللہ ہم خود بھی بقدر ہمت شریک ہیں اس لئے ذرا ان کا نام لیتے جھجک محسوس ہوتی ہے اور وہ جو چودہ سو سال پہلے کے مر چکے ہیں ان کا نام لینا آسان ہے اور یہ بھی کہ ان کا نام تو لیا جاتا رہا ہے اور جو کام پہلے ہوتا چلا آیا ہے اس کے کہنے کی ہمارے پاس دلیل موجود ہے کہ ہم کسی تفسیر کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں زمانہ کے حالات پر کوئی شہادت موجود نہیں اور اس طرح اب جو کوئی بیان کرے گا اس کو کافر بننے کیلئے یہ فتویٰ کافی ہے کہ تفسیر بالرائے ہے۔ کیوں اس لئے یہ پہلے کسی نے نہیں کی۔ جانے ان کی بلا کہ تفسیر بالرائے کیا ہوتی ہے؟ بس مُہرِ کفران کے پاس ہے اور لگا جانا وہ جانتے ہیں۔

اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا تو شیطان تو اپنی شہد بھری انگلی لگا ہی گیا تھا

۱۴۵ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ اور ملت اسلامیہ کے خیر خواہ ہوتے تو ان

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ
الْمُؤْمِنِينَ ۚ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ
وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً

پس تم اللہ کی راہ میں جنگ کرو کہ تم پر تمہاری ذات کے سوا اور کسی کی ذمہ داری نہیں اور مومنوں کو بھی جنگ کی ترغیب دو عجب نہیں کہ بہت جلد اللہ منکرین حق کا زور اور تشدد روک دے اور اللہ کا زور سب سے زیادہ قوی اور سزا دینے میں وہ سب سے زیادہ سخت ہے ۸۴ جو انسان دوسرے انسان کے ساتھ نیکی کے کام میں ملتا اور مددگار ہوتا ہے تو اسے اس کام

کیلئے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ اس طرح کی باتیں ان کے علم میں جو آئی تھیں تو وہ عوام میں سنسنی پیدا کرنے کی بجائے رسول اللہ ﷺ اور امت کے دوسرے حل و عقد اور ارباب علم و دانش کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ لوگ جو معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں ان کے موقع و محل کا تعین کرتے اور اس باب میں وہ صحیح پالیسی اختیار کرتے۔ فرمایا یہ تو اللہ کا خاص فضل و کرم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس نے ان کی بہت سی باتوں اور بہت سی اسکیموں کی اطلاع تم کو دے دی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیثیت رسالت کے تحت مسلمانوں کو سنبھالا دے لیا اور کمزوری کی ڈھارس کا وہ سبب بن گیا اور اس طرح شیطان کی چال میں وہ آتے آتے بچ گئے اور آنے والوں کے لئے اس میں راہنمائی رکھ دی گئی تاکہ وہ بھی ایسے حالات کا مقابلہ کر سکیں اور یہ بات بھی سمجھ جائیں کہ حکومت کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں مفید اور کن ہاتھوں میں مضر ثابت ہوگی پھر آنے والوں نے اس سے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے؟ یہ بات کسی سے مخفی نہیں۔

فرمایا دیکھو "اگر اللہ کا خاص فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نے تم کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیا ہوتا تو چند معدودے آدمیوں کے سوا تم سارے کے سارے شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔" اللہ کا خاص فضل و رحمت کیا ہے؟ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہے جو بنفس نفیس اس وقت موجود تھے اور آج بھی آپ ﷺ کی سنت کی راہنمائی ہم میں موجود ہے۔

تم جہاد کیلئے ہر وقت تیار رہو اور اللہ کے زور کو اپنی کمزوری کا سہارا بنالو

۱۴۶ کمزور اس وقت کیوں کمزور ہوگا جب وہ اپنے اللہ کو زور آور تسلیم کرتا ہو اور یہ بھی یقین جان لے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے؟ فرمایا اے پیغمبر (ﷺ) آپ ﷺ پر ذمہ داری صرف اپنے نفس کی ہے۔ بس

حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا

میں حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی میں دوسرے کے ساتھ ملتا اور مددگار ہوتا ہے تو اس کیلئے اس برائی میں حصہ ہوگا اور اللہ ہر چیز کا محافظ اور نگران ہے۔ ۸۵ ۱۴۷

آپ ﷺ خود جنگ کیلئے اٹھ کھڑے ہو جایئے اور مسلمانوں کو ترغیب دیجئے اور اس بات سے بے نیاز ہو جایئے کہ کون اٹھتا ہے اور کون نہیں؟ اس لئے کہ یہ ذمہ داری ہم نے آپ ﷺ پر ڈالی ہے اور آپ ﷺ اپنی ہی ذمہ داری کے جواب دہ ہیں دوسروں کی ذمہ داری کے نہیں۔ اس کے کام دوسروں پر منحصر نہیں ہوتے۔ وہ خود بڑی قوت رکھنے والا ہے اور اس کی قوت کی مظہر دنیا کی ہر شے ہے اور جس سے وہ جو کام لینا چاہے گا لے لے گا۔ وہ ایک شپرہ سے نمرود جیسے رب کہلوانے والے کو مروا سکتا ہے تو یہ آپ ﷺ کے مخالف آخر شے ہی کیا ہیں؟ وہ چاہے گا تو آپ کے مخلص ساتھیوں کے اندر اتنی قوت پیدا کر دے گا کہ وہ دیکھنے کے انسان قوت کے پہاڑ بن جائیں گے۔

غور کرو کہ ابابیل اور ہاتھی کا کوئی جوڑ بھی ہے پھر وہ وہی ہے جس نے ابابیلوں سے ہاتھیوں کو مروا دیا۔ آپ ﷺ فکر نہ کریں یہ چڑیاں ان بازوں کو ماریں گی اور یہ نہتے ان دہشتوں کو تہہ تیغ کریں گے۔ یہ زمانہ دیکھے گا کہ اللہ کے زور کے سامنے یہ سارے زور آور کمزور ہو جائیں گے اور ان کو بھاگ کر چھپنے کی جگہ بھی نصیب نہیں ہوگی۔

نیکی میں تعاون نیکی ہے اور برائی میں تعاون برائی، ہر تعاون کرنے والا خوب سمجھ لے

۱۴۷ آیت زیر نظر میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے اور یہ بھی بتلا دیا ہے کہ نہ ہر سفارش بری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی اور یہ بھی بتا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا اور بری سفارش کرنے والے کو عذاب کا۔ اس آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ "نَصِيْبٌ" کا لفظ آیا ہے اور بری سفارش کے ساتھ "كِفْلٌ" کا اور لغت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کسی چیز کا ایک حصہ لیکن عرف عام میں لفظ "نَصِيْبٌ" اچھے حصے کیلئے بولا جاتا ہے اور لفظ "كِفْلٌ" برے حصہ کیلئے استعمال کرتے ہیں اگرچہ کہیں اچھے حصے کیلئے بھی لفظ "كِفْلٌ" استعمال ہوتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ جب ایک دوسرے کے مقابلہ میں دونوں لفظ آئیں تو "نَصِيْبٌ" اچھے حصہ کو کہتے ہیں اور "كِفْلٌ" برے حصہ کو اور جب ایک ہی لفظ کا استعمال ہو تو جس چیز کا ذکر ہو رہا ہے اس میں حصہ مراد ہوگا لفظ خواہ "نَصِيْبٌ" ہو یا "كِفْلٌ"۔ شفاعت کے لفظی معنے ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ شفعہ عربی

زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنے طاق استعمال کیا جاتا ہے' اس لئے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے' یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے یعنی طاقتور کر دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت و سفارش کیلئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو' دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا' آپ پہنچا دیں' اس سے معلوم ہوا کہ خلاف حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعت سیئہ یعنی بری سفارش ہے' اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں' اسی لئے وہ بھی شفاعت سیئہ میں داخل ہے۔

اب خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہوگیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کیلئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا اور اسی طرح جو کسی ناجائز کام کیلئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا محروم کا کام کر دے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا اسی طرح سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گنہگار ہوگا اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش موثر اور کامیاب بھی ہو بلکہ اس کو بہرحال اپنا حصہ ملے گا۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے الدال علی الخیر کفا علہ (رواہ البزار عن ابن مسعود والطبرانی عنہ و عن سہل بن سعد' بحوالہ مظہری) "یعنی جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کر دے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو۔"

اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من اعان علی قتل مؤمن بشطر کلمۃ لقی اللہ مکتوب بین عینیہ انس من رحمۃ اللہ (مظہری)

"یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا لفظ "مُقِيْت" کے معنی لغت کے اعتبار سے

قادر و مقتدر کے بھی ہیں اور حاضر و نگراں کے بھی اور روزی تقسیم کرنے والے کے بھی اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں پہلے معنی کے اعتبار سے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے' عمل کرنے والے اور سفارش کرنے والے کی جزاء یا سزاء اس کیلئے دشوار نہیں۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں و حاضر ہے اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کر رہا ہے' محض لوجہ اللہ کسی بھلائی کی امداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رشوت کے اس سے حاصل کرتا ہے۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے' جتنا کسی کیلئے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا' کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا' بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا' البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جائے گا کہ وہ ایک کمزور کی اعانت کر رہا ہے۔ حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے :

کان اللّٰہ فی عون عبدہ ما دام فی عون اخیہ۔

"یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنی کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے۔" اسی بناء پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے :

اشفعوا فلتوجروا و یقضی اللّٰہ علی لسان نبیہ ما شاء

"یعنی تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب ملے گا' پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔"

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجب ثواب ہونا بیان فرمایا ہے وہیں یہ بھی بتلایا کہ سفارش کی حد یہی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک پہنچانے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو' آگے وہ سفارش مانی جائے یا نہ مانی جائے اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہئے۔ حدیث کے آخری جملہ میں ویقضی اللّٰہ علی لسان نبیہ ما شاء کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کامیاب ہو بلکہ اس ثواب و عذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے' آپ نے شفاعت حسنہ کر دی تو ثواب کے مستحق ہو گئے اور شفاعت سیئہ کر دی تو عذاب کے مستوجب بن گئے' خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر بحر محیط اور بیان القرآن وغیرہ میں مَنْ یَّشْفَعْ میں لفظ مِنْهَا کو سببیہ قرار دے کر اس کی طرف اشارہ بتلایا ہے اور تفسیر مظہری میں امام تفسیر مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب

ملے گا اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو اور یہ بات صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں' کسی دوسرے انسان کے پاس جو سفارش کی جائے اس کا بھی یہی اصول ہونا چاہئے کہ سفارش کر کے آدمی فارغ ہو جائے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے' جیسا کہ خود رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ طلاق تو نے اپنے شوہر مغیث سے حاصل کر لی ہے اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کر لے۔

بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اگر یہ آپ ﷺ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا جانتی تھیں کہ رسالت مآب ﷺ کو خلاف اصول کوئی ناگواری نہ ہوگی' اس لئے صاف عرض کر دیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی' آپ ﷺ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعث اجر و ثواب تھی' آج کل لوگوں نے جو اس کا حلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی' بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو ناراض ہوتے ہیں بلکہ دشمنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہو جائے' اکراہ و اجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کسی کے حق پر زبردستی قبضہ کر لے' وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد و خودمختار تھا' آپ نے اس کو مجبور کر کے اس کی آزادی سلب کر لی اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کیلئے کسی دوسرے کے مال چرا کر اس کو دے دیا جائے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہی ہے جو حرام ہے

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے' حدیث میں اس کو سُحت و حرام فرمایا ہے' اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے' خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشاء کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو یا اس کو کوئی جائز نفع پہنچانا یا مضرت اور نقصان سے بچانا ہو اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کیلئے نہ ہو بلکہ محض اللہ کیلئے کمزور کی رعایت مقصود ہو اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو' نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کیلئے نہ ہو جس کی سزا قرآن میں معین و مقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے اور دعاء کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے۔

حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ

اور مسلمانو! جب کبھی تمہیں دعا دے کر سلام کیا جائے تو چاہیئے کہ جو کچھ سلام و دعا میں کہا گیا ہے اس سے زیادہ اچھی بات جواب میں کہو یا جو کچھ کہا گیا ہے اس کو لوٹا دو۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔[۱۴۸] ۸۶

یاد رکھو اللہ ہی کی ایک ذات ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف وہی۔ وہ ضرور تمہیں

السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ویسا ہی جواب ہے جیسا کہ اس نے دیا

۱۴۸ اس آیت میں سلام و دعا کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ اسلام سے قبل عربوں میں ملاقات کے وقت "حَيَّاكَ اللّٰه" کہنے کا رواج تھا جس کے معنی ہیں کہ "اللہ تم کو زندہ رکھے" اس طرح "اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا" یا "اَنْعَمَ صَبَاحًا" کے الفاظ سے بھی ایک دوسرے سے سلام و دعا کرتے تھے اسلام نے اس طرز تحیہ کی بجائے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہنے کا طریقہ جاری کیا اور اس کے جواب میں "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ" کہنا شروع کیا یعنی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو "السلام علیکم" کہے اور دوسرا پہلے کو "وعلیکم السلام" سے جواب دے اور اگر وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ کہہ دے تو گویا اس نے پہلے کو اچھا جواب دیا۔ زیر نظر آیت میں اس بات کا حکم ہے اور اسلام علیکم کے معنی "اَللّٰهُ رَقِيبٌ عَلَيْكُمْ" کے ہیں یعنی "اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ و نگہبان ہو۔"

دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کیلئے کہیں۔ لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھے پھر دعا بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں بلکہ حیات طیبہ کی دعا ہے، تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہنچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور اپنے بھائی مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرما دے تو اس کے ضمن میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور

زبان سے مامون ہو' تمہاری جان' مال' آبرو کا میں محافظ ہوں۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے :

اتدری ما السلام؟ یقول انت آمن منی۔

"یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے : (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہار تعلق و محبت بھی (۴) اس کیلئے بہترین دعا بھی (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی' جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد وارد ہے :

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ (الحدیث)

"یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں' کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔"

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کرے' بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کرے' تو شاید پوری قوم کی اصلاح کیلئے یہی کافی ہو جائے' یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ :

"تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو' میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہاری آپس میں محبت قائم ہو جائے گی' وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو' یعنی ہر مسلمان کیلئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔ (صحیحین)

مسند احمد' ترمذی' ابوداؤد نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتداء کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے' جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے' اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو' کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ

تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے' کیونکہ اس نے سب کو سلام' یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی' اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے۔ (طبرانی' معجم کبیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

رسول کریم ﷺ کے ان ارشادات کا صحابہ کرام پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں' کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا' یہ روایت موطاء امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو' یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو اس کی تشریح رسول کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السلام علیک یا رسول اللہ" آپ ﷺ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کا فرمایا : "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" پھر ایک صاحب آئے اور انہوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے : "السلام علیک یارسول اللہ ورحمتہ اللہ" آپ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" پھر ایک صاحب آئے انہوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک یارسول اللہ ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" پھر ایک صاحب آئے انہوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک رسول اللہ ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" آپ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد فرمایا' ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان' پہلے جو حضرات آئے آپ ﷺ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ ﷺ نے "وعلیک" پر اکتفا فرمایا۔ فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے' تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے' اس لئے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفاء کر لیا۔ اس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے' مثلاً اس نے کہا : "السلام علیکم" تو آپ جواب دیں "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" اور اس نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" تو آپ جواب میں کہیں "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ"

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے' اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے اس لئے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ ﷺ نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا' اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ : ان السلام قد انتهى الى البركة (مظہری عن البغوی)

یعنی سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے' اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے۔ (او مثلہ عن ابن کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی اداء بالمثل کے حکم میں حکم قرآنی "اَوْ رُدُّوْهَا" کی تعمیل کیلئے کافی ہے' جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے صرف ایک کلمہ پر اکتفاء فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے' اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گنہگار ہوگا' البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے' ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے' دوسرے یہ کہ بعینہ انہی الفاظ سے جواب دے دیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم واجب صراحتہ" بتلا دیا گیا ہے' لیکن ابتداء سلام کرنے کا کیا درجہ ہے' اس کا بیان صراحتہ" نہیں ہے' مگر" اِذَا حُيِّيْتُمْ" میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے' کیونکہ اس لفظ کو بصیغہ مجہول بغیر تعین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد' ترمذی' ابوداؤد میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتداء کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے بھی آپ سن چکے ہیں' ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سلام کرنا بھی سنت موکدہ سے کم نہیں تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت موکدہ ہے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا السلام تطوع والرد فريضة یعنی ابتداء سلام کرنے میں تو اختیار ہے' لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم ﷺ نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں' وہ بھی مختصر طور پر سن لیجئے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو لوگ

لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ
اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٨٧﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ ع ۱۱

قیامت کے دن اکٹھا کرے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں کون سچا ہو سکتا ہے۔[۱۴۹] ۸۷

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق بن گئے ہو حالانکہ اللہ

تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گزریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کیلئے بھی برکت ہوگی اور اس کے گھر والوں کیلئے بھی۔

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے۔ ترمذی ابوداؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ رضی اللہ عنہ و ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے' اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں' جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسد نماز ہے' اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے یا درس دے رہا ہے یا انسانی ضروریات و حوائج جیسے پیشاب' پاخانہ میں ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔ اختتام مضمون پر فرمایا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ "اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے جن میں انسانی اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جواب سلام کے سارے امور داخل ہیں ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لے گا۔ اس لئے کہ سلام اور جواب سلام انسانی حقوق میں داخل ہے اور اسلامی حقوق میں بھی۔ کتنی بدبختی کی بات ہے کہ آج ہم عملی طور پر اسے نہ انسانی حقوق میں داخل کرنے کیلئے تیار ہیں نہ اسلامی حقوق میں۔ اللہ سمجھ کی توفیق سلب کر لے تو عطا کرنے والا آخر کون ہے؟

اللہ کے سوا کوئی "الٰہ" نہیں' وہ تم سب کو "اکٹھا" کرے گا اور اللہ سے زیادہ کون "سچا" ہے۔

---

[۱۴۹] اس چھوٹی سی آیت میں تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے' تینوں باتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے' تینوں ہی ایک دوسرے سے زیادہ اہم ہیں' تینوں ہی اللہ تعالیٰ کے متعلق ہیں' تینوں ہی کا بیان بہت لمبا ہے اور تینوں ہی مختلف مقامات میں بیان کی جا چکی ہیں۔

۱۔ "اللہ کے سوا کوئی "الٰہ" نہیں ہے۔" الٰہ کا لفظ قرآن کریم میں ایک سو گیارہ بار استعمال ہوا ہے اور ہر مقام پر اس کا ترجمہ "الٰہ" یا "معبود" ہی سے کیا گیا ہے اور "الٰہ" اور "معبود" دونوں ہی عربی زبان کے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ "عبادت کے لائق" اس لئے پورے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں" یا "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں" یا "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" اور ان مختلف مقامات کا اگر مطالعہ کیا جائے جہاں جہاں "الٰہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ہر جگہ "الٰہ" کے معنی مختلف ہیں ایک نہیں۔ کسی آیت میں "الٰہ" کے دو مختلف معنی ہیں اور کسی میں دو سے بھی زیادہ اور سارے آپس میں مختلف ہیں اس طرح اگر ان سارے مختلف معنوں کو اکٹھا کیا جائے تو تقریباً اسی معنوں سے بھی متجاوز ہوتے ہیں اس لئے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے صفاتی ناموں پر "الٰہ" کا لفظ محیط ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے :

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (النمل ۲۷ : ۶۰) "بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کو اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا "الٰہ" بھی ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کا بیان ہوا۔ آسمانوں زمین کو پیدا کرنے والا۔ ۲۔ آسمان سے پانی برسانے والا۔ ۳۔ خوش نما باغ اگانے والا اور ان تینوں پر "الٰہ" کا لفظ ایک ہی بار استعمال فرما کر وضاحت فرما دی کہ "الٰہ" کے تین مختلف معنی اس آیت میں بیان ہیں یعنی "کوئی اللہ کے ساتھ "الٰہ" ہے؟" کے ایک معنی ہیں "کوئی اللہ کے ساتھ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟" دوسرے معنی ہیں "کوئی اللہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسانے والا ہے؟" تیسرے معنی ہیں "کوئی اللہ کے ساتھ خوش نما باغ اگانے والا ہے؟" غور کرو کہ کیا "کوئی اللہ کے ساتھ "عبادت" کے لائق ہے؟" یا "کوئی اللہ کے ساتھ "الٰہ" ہے یا "کوئی اللہ کے ساتھ "معبود" ہے؟" معنی کی کوئی مناسبت ہوتی ہے۔ اس سے ہر جگہ "الٰہ" کا وہی مفہوم و مطلب بیان کرنا جس کا مضمون مطالبہ کرتا ہے زیادہ صحیح نہیں ہوگا؟ اس طرح قرآن کریم کی ان آیات میں غور و فکر کرتے جاؤ جہاں "الٰہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے تو تم پر "الٰہ" کے سارے معانی خود بخود واضح ہوتے جائیں گے اور اس طرح ہر مقام پر "الٰہ" کے وہ معنی جو مضمون مطالبہ کرے گا لینے سے مطلب و مفہوم میں وہ شیرینی پیدا ہوگی جس کا بیان قلم کے احاطہ سے باہر ہے اور اس بے پایاں دریا میں غوطہ زن ہونے کو بار بار دل چاہے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر غوطہ میں ایک نیا لعل نکال لاؤ گے جس کی قیمت دنیا و مافیہا سے بہت زیادہ ہے۔ اب غوطہ پر غوطہ لگاؤ اور لعل پر لعل نکالتے جاؤ یہ خزانہ ختم ہونے والا نہیں۔

۲۔ "اللہ تم سب کو اکٹھا کر دے گا" یہ اس آیت کا دوسرا حصہ ہے یعنی وہ جو تمہارا "الٰہ" وہ تم سب

کو قیامت کے روز اکٹھا کرے گا" اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ اکٹھا ہونا کیوں ہے؟ تاکہ تمہارے رزلٹ کا اعلان کیا جائے۔ تمہارے اعمال کو تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے۔ تم میں سے انعامات حاصل کرنے والوں میں انعامات تقسیم کئے جائیں۔ تم میں سے مجرموں کو سزا سنائی جائے۔ تم میں سے رعایتی پاس ہونے والوں کو بھی اپنا کیا معلوم ہو۔ یہ مضمون قرآن کریم نے بہت جگہ بیان کیا ہے اور ہر جگہ اس کی افادیت بھی سمجھائی گئی ہے کہ تم کو اکٹھا کیوں کیا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے :

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ (التغابن ۶۴ : ۹) "جب جمع ہونے کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا۔"

جمع ہونے کا دن کونسا دن ہے؟ قیامت کا روز قرآن کریم میں جس دن کی سب دنوں سے زیادہ وضاحت کی گئی ہے اور سب کو اکٹھا کرنے سے مراد ہے۔ تمام ان انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کرنا جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس دن کو قرآن کریم میں کہیں "يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ" اور کہیں "يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ" فرمایا گیا اور کسی جگہ "يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ" اور اس جگہ فرمایا "يَوْمُ التَّغَابُنِ" تغابن غبن سے ہے اور اس کے معنی میں بہت وسعت ہے۔ اس وسعت کے پیش نظر اس کے معنی "ہار جیت" کے کئے گئے ہیں کیونکہ ہار جیت میں بھی بڑی وسعت ہے اس لئے کہ یہ ہر طرح کی فتح و شکست پر بولا جا سکتا ہے۔ جیسے دوڑ میں دوڑانے میں۔ لڑنے میں لڑانے میں کھیلنے میں کھلوانے میں۔ چلنے میں چلانے میں۔ یعنی جس جگہ چاہو اس کو فٹ کر سکتے ہو پھر دنیا میں تو تغابن ہوتا ہی رہتا ہے لیکن یہ تغابن اس روز کے تغابن سے بالکل مختلف ہے اصل تغابن تو روز قیامت ہوگا۔ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کما لے گیا۔ اصل میں کس کا حصہ کس کو مل گیا اور کون اپنے حصہ سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور ہوشیار کون نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایہ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر دیوالیہ ہوگیا اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے حاصل کر لئے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس روز اہل جنت اہل دوزخ کا وہ حصہ حاصل کر لے جائیں گے جو ان کو جنت میں ملتا اگر وہ جنتیوں کے سے کام کر کے آئے ہوتے اور اہل دوزخ جنتیوں کا وہ حصہ لے جائیں گے جو انہیں دوزخ میں ملتا اگر انہوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کئے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام صاحب کے کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص بھی جنت میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اسے دوزخ میں ملتا اگر وہ برے عمل کرتا تاکہ وہ مزید شکر گزار ہو اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اسے جنت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کئے ہوتے تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو۔" (بخاری کتاب

الرقاق)

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دن ایسا ہے کہ اس میں کسی کے پاس مال و زر تو نہیں ہوگا لیکن اس نے کسی پر جو ظلم کیا ہوگا اس کا حق ادا کرنے کیلئے زر مبادلہ اس آدمی کے اعمال ہی ہوں گے لہٰذا وہ اس مظلوم کا حق تو اس طرح ادا کرے گا کہ اپنے پلے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا ہوگا ان میں سے اس کا تاوان ادا کرے یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اوپر لے لے اور اس طرح اس کا جرمانہ ادا کرے اور یہ مضمون متعدد احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے ذمہ اپنے کسی بھائی کا کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اسے چاہئے کہ پہلے اس سے سبکدوش ہو لے کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے نہیں وہاں اس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی یا اگر اس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں گی تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔" (بخاری کتاب الرقاق)

اس طرح مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن انیس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی جنتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اس وقت تک نہ جا سکے گا جب تک کہ اس ظلم کا بدلہ چکا دیا جائے جو اس نے کسی پر کیا ہو حتیٰ کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہوگا۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جب کہ قیامت میں ہم ننگے دھڑنگے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چکانا ہوگا۔ "مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و متاع کچھ نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی اور کسی پر بہتان لگایا تھا اور کسی کا مال کھایا تھا اور کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مارا پیٹا تھا پھر ان سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چکایا جا سکے تو ان میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے گئے اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا۔ (مسلم)

اسی طرح کی بہت سی احادیث کتب احادیث میں موجود ہیں جن سب کا ماحصل یہ ہے کہ حقوق العباد کی کوتاہیاں اتنی بڑی کوتاہیاں ہیں جن کی معافی کی صورت صرف اور صرف یہ ہے کہ جن کے متعلق کوئی کوتاہی ہے اس سے یہ معاف کرانا یا اس کو بدلہ دینا ضروری ہے اور اگر اس کو مان لیا جائے تو یہ سارے معاشرے کے بگاڑ کا ایک ہی بہترین حل ہے جس سے بگاڑ ہو چکا ختم ہوگا اور پھر کبھی بھی بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔ کاش کہ ہمارے علماء، مذہبی راہنما اور سیاسی راہنما بھی اس پر ایمان لے آئیں اور ایمان پڑھ کر سر دھننے کا نام نہیں بلکہ پڑھے ہوئے کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔ اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور ان کے پیرو' چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے' رشوت خور اور ظالم افسروں اور ملازمین میں گٹھ جوڑ' بے ایمان تاجروں' صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ' شرارت اور خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی علمبردار حکومتیں اور قومیں سب کا باہمی ساز باز اس اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو ان پر یکایک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ' بھائی' بیوی' شوہر' اولاد' دوست' رفیق' لیڈر' پیر' مرید اور حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت و محبت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں گے۔ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ قرآن کریم میں یہ مضمون بھی جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ ۲ : ۱۶۷

۳ ۔ "اللہ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں۔" زیر نظر آیت جس کی یہاں تفسیر ہو رہی ہے اس کا یہ آخری حصہ ہے۔ ہر نبی و رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوا اور ہر نبی رسول کی مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی گویا یہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں داخل تھا اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر وعدے کا سچا اور کون ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس طرح تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ بھی انسان تھے اور ان کی نصرت و تائید کے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے جتنے وعدے اللہ نے ان سے کئے تھے وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی اس لئے آپ ﷺ کو بھی تسلی رکھنی چاہئے کہ اگر یہ لوگ جو آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہیں باز نہ آئے تو یقیناً ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ان سے پہلوں کا ہو چکا ہے اس لئے کہ تم اللہ کے رسول ہو اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسول کی مدد کرتا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کئے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچا لیا اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔" (الانبیاء ۲۱ : ۸'۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور یاد رکھو تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہو گئی۔ اس کی باتوں کا کوئی بدلنے

بِمَا كَسَبُوا ط أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ط وَمَن

نے ان بد عملیوں کی وجہ سے جو انہوں نے کمائی ہیں انہیں الٹا دیا ہے' کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھا دو جن پر اللہ نے راہ گم کر دی(۱۵۰)؟ اور یاد رکھو جس کسی پر اللہ راہ گم کر دے تو پھر

والا نہیں' وہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔" (الانعام ۶ : ۱۱۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے تو ہم انہیں باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدۂ حق ہے اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں سچا اور کون ہو سکتا ہے۔" (النساء ۴ : ۱۲۲) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور وہ کہیں گے شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو جنت کی زمین کا وارث بنا دیا۔ اب ہم جنت میں جہاں چاہیں آجا سکتے ہیں پس کتنا بہترین اجر ہے اچھے عمل کرنے والوں کا۔" (الزمر ۳۹ : ۷۴)

غور کیجئے کہ شیطانی کاروبار بھی سارے کا سارا اس کے وعدوں پر ہی چل رہا ہے پھر افسوس ہے کہ شیطان کے وعدوں پر تو یقین کیا جائے اور رحمٰن کے وعدوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔ شیطان کے وعدوں پر انسان کا یقین کیا کہہ دیا ہے؟ کہہ وہی دیا ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے اگر یقین نہیں آتا تو میں آپ کی انگلی رکھتا ہوں آپ اس آیت کو پڑھیں' ہاں! یہی فرمایا ہے

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ○ (النساء ۴ : ۱۲۰) "اور ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔" اس طرح کی بیسیوں آیات قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن آپ اس پر ذرا غور کر لیں کیا شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور امیدوں کے بل پر نہیں چل رہا؟

وہ جب انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر کسی غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو اس کے آگے ایک سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لطف و لذت اور کامیابیوں کی امید' کسی کو قومی سربلندیوں کی توقع' کسی کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین کسی کو صداقت تک پہنچ جانے کا اطمینان کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت' بس مر کر مٹی ہو جانا ہے۔ کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلیں گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔ آپ کو تعجب کیوں ہوا؟ کیا "آپ اور میں اس میں" شامل نہیں؟ رہی یہ بات کہ شیطان کے زیادہ وعدے نقد بہ نقد اور دھوکا و فریب ہیں اور اللہ کے زیادہ وعدے ادھار لیکن سچے اور صحیح ہیں۔ یہ جملہ یاد رکھیں کہ اس پر بات انشاء اللہ پھر ہوگی۔

قانون الٰہی جس کو فیل کر دے تم اس کو پاس کرنے والے کون ہو؟ بے فائدہ جھگڑا چھوڑ دو

۱۵۰ بلاشبہ اسلام نرمی کو پسند کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ہر معاملہ میں اعتدال پسند بھی ہے اس لحاظ سے ایسی نرمی جو جماعت و قوم کیلئے نقصان دہ ہو وہ نرمی نرمی نہیں رہتی بلکہ کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ لوگ جب اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد انہوں نے بھی ہجرت شروع کر دی تو ایسے بھی واقعات رونما ہوئے کہ کچھ سچے مسلمانوں کے ساتھ کچے لوگ بھی شامل ہوگئے اور یہ فطری بات تھی مثلاً ایک آدمی نے سچے دل سے ایمان قبول کیا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد مکہ میں ایک پل رہنا بھی گوارا نہیں کرتا وہ سب کچھ چھوڑ کر نکلنا چاہتا ہے لیکن اس گھر اور خاندان کے کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ایمان میں تو پکے نہیں لیکن اس اپنے آدمی کا ساتھ چھوڑنا بھی ان کو پسند نہیں ہے اس لئے وہ اس پکے مسلمان کے ساتھ ہجرت کر کے آجاتے ہیں تو صورت حال کیا پیدا ہوئی؟ وہ ایمان میں تو پکے نہیں تھے لیکن اپنے ایمان میں پکے آدمی کے ساتھ ہجرت کر کے آگئے اس طرح وہ مزاج کے لحاظ سے تو اسلام کے مزاج شناس نہیں لیکن ان میں کا ایک جو اسلام کا مزاج شناس ہے اس کو بھی ان سے فطری محبت ہے کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اس کے ساتھ مل کر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے ظاہر ہے کہ اس کے دل میں بھی ان کیلئے نرم گوشہ ہوگا۔ بس اس طرح کے کئی لوگ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے لیکن ان کی پوزیشن دوہری رہی ایسے لوگوں نے کافی حد تک بدمزگی پیدا کی کیونکہ وہ مدینہ ہجرت تو کر آئے لیکن وہاں کا نظام حیات' اخلاقی پابندیوں اور ساتھ ہی ساتھ دشمنوں کے حملہ کا خطرہ انہیں وہاں قیام نہ کرنے دیتا اور وہ آب و ہوا کی ناموافقت کا عذر کر کے واپس لوٹ جاتے۔ پھر اس طرح کے لوگوں کے متعلق مسلمانوں کی آراء مختلف تھیں بعض ان کو مسلمان سمجھتے اور بعض ان کو خارج اسلام سمجھتے اور اس طرح مسلمانوں کی گویا دو جماعتیں بن گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کے متعلق دو جماعتوں میں تقسیم کیوں ہوتے ہو وہ تو اپنی بد اعمالیوں کے باعث جدھر سے آئے تھے تو ادھر واپس چلے گئے اور تم نے خواہ مخواہ اس معاملہ میں جھگڑنا شروع کر دیا مفسرین نے ایسے بہت سے لوگوں کے نام بھی اور ان کے کام بھی اور ان کا انجام بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ان دو جماعتوں سے مسلمانوں کے مقابلہ میں منافقوں کی اس جماعت کا ذکر ہے جو عبداللہ بن ابی منافقین کے سردار کی پارٹی تھے جو احد کی جنگ میں مدینہ سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت واپس آگیا تھا۔ بہرحال اس جگہ اس تفصیل میں گئے بغیر مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ جو کچھ ہیں ان کو چھوڑو تم آپس میں اختلاف مت کرو۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اختلاف کسی حال میں بھی اچھا نہیں ہوتا یا یہ کہ اختلاف ہونے کے باوجود جماعت ہی میں رہنا بہتر ہوتا ہے اور جماعتی کاموں کی دلچسپی کو ذاتی اختلاف کی بناء پر نہ ترک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں بددلی کا اظہار کیا جا سکتا ہے بلکہ وسعت سے کام لے کر اس اختلاف کو برداشت کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اور اس جگہ یہی ہدایت دی جا رہی ہے۔

يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ

تم اس کیلئے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ۸۸ ۱۵۱

ان منافقوں کی دلی تمنا تو یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تم

قانون الٰہی میں ہدایت حاصل کرنے کے دو ہی راستے ہیں غور و فکر اور مشاہدہ و نظر

۱۵۱ فرمایا جا رہا ہے کہ غور کرو کہ جو لوگ نہ تو فکر سے کام لیتے ہوں اور نہ مشاہد و نظر سے ان کی ہدایت کی کوئی اور راہ بھی ہو سکتی ہے؟ اگر وہ فکر سے کام لیتے تو پیغمبر اسلام کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی کیونکہ وہ ان میں پیدا ہوا' انہی میں رہ کر جوان ہوا اور انہی میں سے ہے جو بذات سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر نظر و مشاہدہ سے کام لیتے تو آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ اس کی الوہیت' اس کی ہستی اور اس کے مقررہ قوانین خلقت کی شہادت دے رہا ہے اس لئے جب یہ دونوں باتیں ان کی ہدایت کا باعث نہ بن سکیں تو پھر تم ان کو ہدایت کس طرح دے لو گے؟ اور یہ مضمون قرآن کریم میں بار بار بیان فرمایا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ (الاعراف ۷ : ۱۸۶) "جس پر کامیابی کی راہ اللہ گم کر دے یعنی اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قانون نتائج کے مطابق کھویا جائے تو پھر اس کیلئے کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اللہ نے انہی چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (الاعراف ۷ : ۱۷۸) "جس پر اللہ کامیابی کی راہ کھول دے تو وہی راہ ہے اور جس پر کامیابی کی راہ گم کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں پڑے ہیں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"جس کسی کو اللہ سعادت و کامیابی کی راہ پر لگا دے فی الحقیقت وہی راہ پر ہے اور جس کسی پر اس نے راہ گم کر دی تو تم اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۹۷) ایک جگہ فرمایا :

"جس کسی پر وہ کامیابی کی راہ کھول دے تو وہی راہ پر ہے۔ جس پر وہ راہ گم کر دے تو تم کسی کو اس کا کارساز' اس کا راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے۔" (الکھف ۱۸ : ۱۷)

اس لئے تم یاد رکھو کہ جس کو قانون الٰہی فیل کر دے اس کو تم پاس نہیں کر سکتے اور تمہارا یہ جھگڑا تمہارے لئے نقصان دہ ہے اس سے تمہاری ہوا اکھڑے گی اور تم پریشان ہو گے اور اسلام لانے کے بعد یہ راہ چہ معنی دارد؟ یہ وہ وقت تھا جب کہ منافقوں کے چار گروہ بن چکے تھے گویا نفاق چار درجوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ۱۔ نام کے مسلم اور باطن کے کافر لیکن مسلمانوں میں شامل۔ ۲۔ مسلمانوں سے نکل کر اسلام کے دشمنوں

كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿٨٩﴾ إِلَّا

بھی کر لو اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔ پس دیکھو جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں، تمہیں چاہئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔[۱۵۲] پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں تو انہیں گرفتار کرو۔ جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور نہ تو کسی کو اپنا دوست بناؤ نہ کسی کو اپنا مددگار۔[۱۵۳] ۸۹

میں شریک ۳۔ اسلام لانے کے بعد کھلے کھلے مرتد ہو جانے والے جو معاہدین اسلام میں شامل ہوگئے۔ ۴۔ ظاہر و باطن میں نہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کافروں کے ساتھ۔

جو کچھ وہ ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی وہی ہو جاؤ، یہ دوست بنانے کے قابل نہیں ہیں

۱۵۲ منافقین کا یہ پہلا گروہ ہے جو بظاہر مسلمان ہیں لیکن ان کے دل اسلام سے دور ہیں۔ ایسے لوگوں کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جو ان کو مجبور کرتی ہیں اور اسلام کا نام لیتے ہیں لیکن اسلام پر ان کا دل نہیں جمتا کیوں؟ اس لئے کہ اسلام عمل چاہتا ہے وہ اس سے دور بھاگتے بھاگتے بھاگ ہی جاتے ہیں۔ ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ ہماری طرح سارے ہی بدعمل ہو جائیں تاکہ ہمیں اعمال پر مجبور نہ ہونا پڑے اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان بدعملوں کے ساتھ زیادہ راہ و رسم مت رکھو کیونکہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اور بروں کی صحبت سے برائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لوہار کے پاس بیٹھ گئے تو کپڑوں کی حفاظت مشکل ہو جائے گی کچھ نہ کچھ جلا لو گے۔ اونٹوں والوں سے دوستی لگاؤ گے تو دروازے اونچے کرنے پڑیں گے۔ اچھی بات یہی ہے کہ ان سے دور رہو اس میں سلامتی ہوگی۔ ہاں! وہ اگر دارا لکفر میں ہیں تو وہاں سے خود تمہارے قریب آجائیں بدعملیوں سے ہجرت کر کے نیک عملیوں کی طرف آجائیں تو دوسری بات ہے کیونکہ نفرت دراصل ان سے نہیں بلکہ ان کے اعمال سے ہے اگر وہ بدعمل نہ رہیں تو تم ان سے نفرت کیوں کرو گے؟ اگر وہ دل و جان سے اسلام میں داخل ہو جائیں تو سو بار قبول ہیں لیکن اگر وہ نفرت کر کے تم کو چھوڑ دیں تو تم کو بھی اپنی حالت پر غور کرنا ہوگا۔

الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

مگر ہاں! جو لوگ، کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور اس میں عہد و پیمان ہو چکا ہو یا[۱۵۴] ایسے لوگ ہوں کہ لڑائی سے دل برداشتہ ہو کر تمہارے پاس چلے آئیں۔ نہ تم سے لڑیں نہ اپنی

اگر وہ تم کو چھوڑ کر تمہارے دشمنوں سے مل گئے ہوں تو تم بھی ان کو دین کا دشمن سمجھو

۱۵۳ یہ ان منافقین کی دوسری حالت کا ذکر ہے جب وہ صرف منافق ہی نہیں رہے بلکہ وہ تم کو چھوڑ کر تمہارے دشمنوں کے ساتھ مل گئے ہیں اب تم کو ان سے پیار کرنا ہے؟ نہیں بلکہ تم کو بھی ان سے وہی کچھ کرنا جو کچھ تم دشمنوں کے ساتھ کر رہے ہو اس لئے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور ان کا دعویٰ اسلام بالکل غلط ہے۔ اس طرح کے لوگ مدینہ کے اردگرد موجود تھے جو مسلمانوں کا غلبہ دیکھ کر اسلام کا اظہار کرتے لیکن دشمنوں کا پلہ بھاری دیکھتے تو ان کے ساتھ مل جاتے۔ جب اسلام میں داخل ہوتے تو اسلام سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے اور جب اسلام سے نکلتے تو اکثر اسلام کا بہت کچھ نقصان کر جاتے جیسے عرینہ نے کیا آئے تو مریض کی صورت میں ان کو باقاعدہ طور پر علاج کی غرض سے اونٹوں کے باڑے میں رکھا گیا ان کی خوب خاطر مدارت کی گئی جب رو بصحت ہوئے تو نہ صرف یہ کہ خود بھاگ گئے بلکہ وہ اونٹ بھی ساتھ ہی بھگا کر لے گئے اور محافظوں کو قتل کر دیا۔ (بخاری)

فرمایا ایسے منافق جو اعلانیہ ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے ان کو پکڑو اور مارو جہاں کہیں بھی مل سکیں ان کے ساتھ قطعاً نرمی کا کوئی سلوک مت کرو جو کام انہوں نے کیا ہے وہ انسانیت سے بہت دور ہے وہ صرف منافق ہی نہیں رہے بلکہ قتل کے مرتکب بھی ہو چکے ہیں اس لئے وہ قابل احترام نہیں ہیں کہ ان کو اس طرح پھرنے دیا جائے۔ اس کی وضاحت پیچھے آیت ۴۵ میں گزر چکی ہے وہاں سے ملاحظہ کر لیں۔ (سورہ النساء ۴ : ۴۵)

ہاں! جو لوگ تمہارے معاہدین کی پناہ میں ہوں ان کا حکم الگ ہے

۱۵۴ یہ گویا منافقین کا تیسرا گروہ ہے جو اسلام لانے کے بعد اسلام سے حقیقتاً نکل چکا ہے لیکن ان کا رخ ان لوگوں کی طرف ہو گیا جو مسلمانوں کے معاہدین میں سے ہیں۔ یعنی ان کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ امن ہے۔ اس لئے کہ ایسے معاہدین سے یہ معاہدہ بھی شامل ہوتا تھا کہ معاہدین میں سے کوئی فریق جس کو امن کے معاہدہ میں شامل کرے وہ بھی گویا ضمناً اس معاہدہ میں شامل ہو گیا مثلاً "ا" کا "ب" سے معاہدہ ہے کہ ہم تم سے جنگ نہیں لڑیں گے۔ اب "ا" نے کسی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا یا "ب" نے اپنے ساتھ کسی کو شامل

لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

قوم کے ساتھ لڑیں اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوگئے اور جنگ نہیں کرتے نیز صلح کا پیغام بھی بھیج رہے ہیں تو پھر اللہ نے تمہارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی کہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرو۔ ۹۰ ۱۵۵

کر لیا تو اس طرح "ا" کے ضمنی معاہد بھی "ا" اور "ب" کے پہلے معاہدہ میں شامل تصور ہوں گے اس طرح "ب" نے جن سے ضمنی معاہدہ کر لیا وہ "ا" اور "ب" کے اصل معاہدہ میں شامل ہوگئے۔ اس طرح جن اہل کتاب یا کفار میں سے کسی گروہ کے ساتھ معاہدہ امن تھا یہ منافقین اس گروہ میں شامل ہوگئے تو ان سے جنگ نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس شرکت سے ان کو وہ حق مل گیا جو معاہدہ میں کفار سے طے پایا تھا ہاں! ان سے کوئی مطالبہ ہو تو وہ اس معاہد قوم سے بذریعہ بات چیت طے کیا جا سکتا ہے جس کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جو جنگ سے بھاگتے ہیں' اگر وہ سلامتی کے طالب ہیں تو ان سے درگزر کرو

۱۵۵ یہ وہ چوتھا فریق ہے جو اسلام سے نکل چکا ہے لیکن وہ کسی معاہد قوم کی طرف بھی نہیں گیا اور لڑائی کیلئے بھی تیار نہیں یعنی ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ وہ شریک جنگ نہیں ہونا چاہتے نہ تم سے اور نہ اپنی اصل قوم یعنی کفار و مشرکین سے۔ یعنی ہیں تو وہ بزدل یا بخیل کیونکہ جنگ جب لڑی جائے گی تو ظاہر ہے کہ مال بھی خرچ ہوگا اور جان کا خطرہ بھی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ بزدلی کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونے سے بھاگتے ہیں اور بخیل ہونے کی وجہ سے اس میں کچھ خرچ بھی نہیں کرنا چاہتے تو پھر تم بھی ان کو سلامتی کی ضمانت فراہم کر دو کیا ضروری ہے کہ مرے کو مارے شاہ مدار؟ یہ لوگ گویا مرنے سے پہلے ہی مر چکے ہیں۔ اگر وہ تمہارا ساتھ نہیں دے رہے تو تمہارا نقصان بھی تو نہیں کر رہے بہتر ہے کہ تم بھی ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اسلام جو صلح و آشتی کا داعی ہے وہ کسی کو تنگ کرنے کیلئے کسی حال میں بھی تیار نہیں جو اس کو نہ چھیڑنے کی سوگند کھاتا ہے وہ اس کو بھی کھلے دل سے قبول کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرتدین کو صرف اس صورت قتل کیا جا سکتا ہے جب وہ مرتد ہونے کے ساتھ کوئی ایسا جرم بھی کریں جس کی بناء پر ان کا قتل واجب ہو جائے اگر وہ مرتد ہو جائے تو اس ارتداد کی سزا ان کو وہی دے گا جس کے دین سے وہ پھرے۔ جن لوگوں نے اس حکم کو منسوخ تسلیم کیا ہے انہوں نے کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہو۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا
قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ
وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ

ان کے علاوہ کچھ لوگ تمہیں ایسے بھی ملیں گے جو تمہاری طرف سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے[۱۵۶] بھی لیکن جب کبھی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیئے جائیں تو اوندھے منہ اس میں گر پڑیں سو اگر ایسے لوگ کنارہ کش نہ ہو جائیں اور تمہاری طرف پیغام

کچھ لوگ ہیں جو اسلام کے قریب تو نہیں آئے لیکن مسلمانوں سے امن کے طالب ہیں

۱۵۶ حالات وقت کی نزاکتیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہی نزاکت کا دراصل بیان ہے یہ وہ وقت تھا کہ کفار جس پر ان کو مسلمان ہونے یا مسلمانوں کا ہمدرد ہونے کا شبہ ہوتا وہ اس کو پکڑ لیتے اور وہ مار دیتے کہ بڑوں بڑوں کے دل دہل جاتے۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو صرف اس بات سے خائف ہیں کہ ہم پر کہیں اسلام دوستی کا الزام نہ آجائے اور اس طرح ناکردہ گناہ میں ہماری کھلی اڈھیڑ دی جائے۔ یعنی بالکل وہی پوزیشن جو کچھ لوگوں کی آج ہے کہ کہیں امریکہ سرکار کو یہ نہ پتہ چل جائے کہ فلاں ملک بھی اسلحہ کے معاملہ میں خود کفیل ہے یا ہونے والا ہے۔ اگر ان کو پتہ چل گیا تو نہ ہمارا ملک رہے گا اور نہ ہم۔ مکہ والوں کا رعب اتنا تھا کہ ان کے ڈر سے کوئی شخص پسند نہ کرتا تھا کہ ہم اس طرح ظاہر ہو جائیں کہ مسلمانوں کے بدخواہ نہیں کیونکہ جواب طلبی ہو جائے گی کہ کیوں؟ اس لئے وہ مسلمانوں سے امن کا معاہدہ تو کرتے تھے لیکن جب پیچھے قریش کے سرداروں کو دیکھتے تو یہ بھول جاتے کہ ہمارا معاہدہ ہے کیونکہ ان پر وہ یہ بات ظاہر کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے لہٰذا چار و ناچار حالات کی نزاکت کے ساتھ وہ ان کا ساتھ دے جاتے اور ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور اس طرح وہ بھی دفع الوقتی کو پسند کرتے اور جو معاہدہ مسلمانوں سے کیا تھا اس کو ایسے وقت پس پشت ڈال دیتے اور وقت نکل جاتا تو وہ پھر عذر و بہانے لے کر پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف رجوع کرتے۔ اپنی مجبوریاں پیش کر کے ان کو بھی اسلام دوستی کی یقین دہانی کراتے اور ایسے لوگوں کی آج بھی کمی نہیں ہے اور اس طرح یہ کفر و اسلام کی جنگ ماشاء اللہ اسلام کے اندر لڑی جا رہی ہے۔ ہماری مذہبی اور سیاسی پارٹیاں اور پاکستان کے عوام بالکل یہی کچھ کر رہے ہیں جس کو "لوٹا" کہتے ہیں سمجھتے ہیں پھر اس "لوٹا" سے پانی پیتے اور اس "لوٹا" سے استنجا کرتے ہیں اور مولوی خود یہ مسئلہ جانتے ہیں کہ وضو کا بقیہ پانی کھڑے ہو کر پی لینا جائز ہے؛ پھر سمجھتے ہیں کہ "لوٹا" آخر ہوتا ہی کیوں ہے؟ پھر اس جواز کی خبر وہ دوسروں تک پہنچا کر اپنا حصہ ان سے

حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا
مُّبِينًا ﴿٩١﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَن
قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ

ع ۱۲ ۱۴ ۹

صلح نہ بھیجیں اور نہ لڑائی سے ہاتھ روکیں تو انہیں بھی گرفتار کرو اور جہاں کہیں پاؤ قتل کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے برخلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت جنگ دے دی ہے[۱۵۷]۔ ۹۱

اور دیکھو کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے مگر یہ کہ غلطی سے، اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے۔ اور جس کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے، قتل کر دیا ہو تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دے[۱۵۸]۔ اگر

وصول کر لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو محاورہ میں "غریب ظالم" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے

۱۵۷ یہ آیت درس دے رہی ہے کہ ایسے کمزور بہادروں کو بالکل مہلت نہ دو وہ امن خواہاں نہیں بلکہ ترازو کے پلڑے پر ان کی نظر ہے جس پلڑے کو وہ بھاری سمجھتے ہیں اس کو وہ حق سمجھتے ہیں۔ جبھی کوئی ان کی گردن پر ہاتھ رکھتا ہے تو رام رام کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو غیر جانبداری کے مدعی ہوتے ہیں لیکن یہ غیر جانبداری محض نمائش ہوتی ہے جب کوئی شرارتی ان پر دباؤ ڈالتا ہے یا مٹھی بند کر کے دکھاتا ہے تو یہ اس کی ساری شرارتوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں بلکہ ان کو کھلے دشمنوں کے ساتھ رکھو اگر یہ بدعہدی سے باز نہ آئیں، صلح جویانہ رویہ اختیار نہ کریں تو تم جہاں کہیں ان کو پاؤ ان کو گرفتار کرو اور قتل کرنے کا بھی تم کو اختیار ہے کیونکہ اس رویہ سے وہ تمہارے قتل کے مرتکب ہو چکے ہیں اور عام ظالموں سے یہ "غریب ظالم" زیادہ ظالم ہوتے ہیں کہ دیکھنے میں غریب اور عمل میں ظالم۔ چونکہ ایسے لوگ وہ ہیں کہ ان دیکھنے والوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جاتی ہیں اور ان کا ظلم بعض اوقات ان ہمدردیوں میں چھپ جاتا ہے اس لئے نہایت سخت الفاظ میں احکام صادر فرمائے۔ چنانچہ فرمایا :

"جب کبھی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیئے جائیں تو اوندھے منہ اس میں گر پڑیں سو اگر ایسے لوگ کنارہ کش نہ ہوں اور تمہاری طرف پیغام صلح نہ بھیجیں اور نہ لڑائی سے ہاتھ روکیں تو انہیں بھی گرفتار کرو اور جہاں

إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

مقتول کے وارث خون بہا معاف کر دیں تو کر سکتے ہیں[۱۵۹] اور اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جو

کہیں پاؤ ان کو قتل کرو یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے برخلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت جنگ دے دی ہے۔"

کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جائز نہیں اور اتفاقاً قتل ہو جائے تو اس کی سزا؟

۱۵۸ کسی مومن کیلئے یہ درست اور جائز نہیں یعنی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ اس فعل شنیع کا بسلامتی ہوش و حواس ارتکاب کرے کیونکہ کسی مومن کا عمداً قتل کرنا سارے گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ بے ارادہ اور نادانستہ اس سے یہ جرم سرزد ہو جائے۔ اس اسلوب بیان سے واضح ہوگیا کہ یہ جرم معمولی قسم کا نہیں بلکہ نہایت سنگین قسم کا جرم ہے۔ کسی مومن سے اس کا صدور حد درجہ قبیح ہے اور قتل عمد کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

خطاء کیا ہے؟ اگر قصور و ارادہ کے بغیر کوئی کام ہو جائے تو اسے خطا کہتے ہیں اور اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ جنگ جاری تھی گولیاں برس رہی تھیں اتفاقاً اس کی گولی سے کوئی مسلمان مارا گیا یا نشانہ لگایا تھا شکار کو اور جا لگا کسی انسان کو یہ سب قتل خطا کی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت جس کا اس جگہ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ مقتول مسلمان ہو تو قاتل ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور اس مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرے۔ اس دیت کی مقدار رسول اللہ ﷺ نے ایک سو اونٹ مقرر فرمائی تھی اور ہر زمانہ میں یہی رہے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص سو اونٹ نہ ادا کر سکتا ہوں تو سو اونٹوں کی قیمت کے برابر نقد روپیہ دے سکتا ہے۔ اسلامی حکومت مجاز ہے کہ وہ ایک اونٹ کی قیمت متعین کرے اور پھر اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک خاص وقفہ کے ساتھ اس میں کمی بیشی کرتی رہے اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا جائے اور اس معاملہ میں قانون سازی کی بڑی وسعت موجود ہے اور زمانہ کے ساتھ ساتھ قیمتوں کی کمی بیشی سے روپیہ کی کمی بیشی بھی ہو سکتی۔ اس لئے یہ سو اونٹ کا مقرر کر دینا اپنے اندر ان ساری بیماریوں کا علاج رکھتا ہے جن بیماریوں بد اعتدالیوں کا ایسے وقت میں خدشہ ہو سکتا ہے اور اس کے اندر اتنی حکمت پنہاں ہے کہ اس کے بیان کیلئے کئی صفحات درکار ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی شرف پر کسی صورت آنچ نہیں آسکتی زمانہ کہاں سے کہاں ترقی کرتے کرتے پہنچ جائے۔

مقتول کے وارثوں کو حق ہے کہ وہ چاہیں تو خون بہا معاف کر دیں

۱۵۹ انسانی جان کی قدر و منزلت کو بحال رکھنے کی دوسری صورت یہ بیان فرمائی کہ اگر مقتول کے ورثاء چاہیں تو خون بہا معاف کر سکتے ہیں۔ اس اعلان سے طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے رکھ دیا اور سارے اونچان

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن

تمہاری دشمن ہے اگر مومن ہو تو چاہئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے[۱۶۰] اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ صلح ہے تو چاہیئے کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی دے اور ایک مسلمان غلام بھی آزاد کرے[۱۶۱] اور جو کوئی غلام نہ پائے تو اسے چاہئے

نچلان قاعدوں کے سرپانی ڈال دیا۔ لیکن ان باتوں کیلئے اہم شرط ایک ہے کہ حکومت اسلامی اور قانون اسلامی ہو۔ جب حکومت بھی غیر اسلامی ہو اور قانون بھی غیر اسلامی ہو تو اس میں اسلام کی ایک چول لگا دی جائے یا ایک میخ ٹھونک دی جائے تو اس کا حشر وہی ہوگا جو آج اس ملک پاکستان میں ہو رہا ہے اور اگر یہ قانون اس حالت میں رہا کہ قانون غیر اسلامی اور اس میں ایک میخ اسلام کی تو آنے والی نسلیں کبھی اسلام کا نام بھی نہیں لیں گی اور ان اسلامی ججوں کی کرسیاں توڑ دی جائیں گی اور ان سب کا وہی حشر ہوگا جو ترکی میں ہوا۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے چشم بددور لیکن غور کر لیا جائے کہ کیا ترکی میں اس طرح دعا کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا تھا؟ اگر تھے تو قانون الٰہی کسی علاقے کے ساتھ خاص نہیں ہوتا اس لئے کہ اس ملک کا بھی وہی رب ہے جو ترکی کا ہے۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کو اب یہ دوسری بار عنقریب مار پڑنے والی ہے اور اس عنقریب کی مدت اسلام کی عمر متعین کر کے خود ہی لگا لیں۔ قوانین الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کو کتنی مہلت دی جاتی رہی ہے قرآن اس پر شاہد موجود ہے۔

مقتول دشمن حکومت کا فرد ہو تو اس کا حکم کیا ہے؟

۱۶۰ قتل خطا کی دوسری صورت یہ ہے کہ مقتول ہو تو مسلمان لیکن اس کی بود و باش غیر اسلامی مملکت میں ہو۔ اس صورت میں صرف ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے اس پر دیت لازم نہ ہوگی ہاں دو حکومتوں کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی معاہدہ طے ہو تو وہ دوسری بات ہے اور اس کی گنجائش یہاں موجود ہے اور یہ معاملہ قانون نافذ کرنے والے ادارہ کے ذمہ ہے اس معاملہ میں بڑی وسعت موجود ہے اور اسلامی حکومت اس میں قانون بنانے کی مجاز ہے۔ جہاں جہاں غلام آزاد کرنے کا ذکر ہے وہ بھی اپنے اندر بہت وسیع مطلب رکھتا ہے اور اسلامی حکومت اس کی وسعت سے بھی ان ضمنی دروازوں کو بند کر سکتی ہے جو حالات کے تحت کھلتے اور بنتے رہتے ہیں۔

لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ

لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کی طرف گویا توبہ کے طور پر ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔[۱۶۲] ۹۲

اور جو مسلمان کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو یاد رکھو اس کی سزا جہنم ہے

مقتول اگر معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا حکم

[۱۶۱] قتل خطا کی تیسری صورت یہ ہے کہ اگر مقتول اس قوم کا فرد ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ اس صورت میں قاتل مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو دیت بھی ادا کرے اور اس طرح ذمی یعنی اسلامی حکومت کو غیر مسلم رعایا کا بھی یہی حکم ہے مسلم' کافر' مجوس اہل کتاب سب کی دیت یکساں ہے۔ ہاں! اگر غیر مسلم قوموں نے اس مسلم حکومت سے کوئی اپنا خاص قانون اس سلسلہ میں پاس کرا لیا ہو تو اس کی صورت اپنی جگہ موجود ہے۔ کسی معاہد حکومت کے ساتھ اس معاملہ میں گفتگو کی حکومت اسلامی کو اجازت ہے؟

اگر مسلمان غلام میسر نہ آئے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

[۱۶۲] دراصل لونڈی غلاموں کو اس بے رحمانہ قانون سے نجات دلانے کیلئے اسلام نے جو جدوجہد کی ہے اس جدوجہد کا یہ حصہ ہے کہ اسلام نے قبل از وقت یہ بات واضح کر دی کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ غلام' لونڈی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا تو ایسی حالت میں اس کا بدل یہ بتا دیا کہ اس کے ازالہ کیلئے دو ماہ کے روزے رکھے اور وہ بھی شرعی عذر کے علاوہ پے درپے رکھے جائیں درمیان میں وقفہ نہ ہو اور اس حکم میں بھی توسیع موجود ہے۔

ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مقننہ دیانت و امانت کے ساتھ ان الٰہی قانونی ہدایات کو پیش نظر رکھ کر جہاں جہاں توسیع کی صورتیں ہیں وہ صرف اس لئے رکھی گئی ہیں کہ اس جگہ ایمان کی ساکٹ لگا کر دیانت کے رینچ سے کس لو تو تمہارے معاشرے میں اس گھناؤنے جرم کا کوئی مجرم تم کو نہیں ملے گا اور اس طرح معاشرہ میں "امن و امان قائم ہوگا جس کی مثال اس قانون کے علاوہ تم کو کہیں نہیں ملے گی اور جب یہ سب مجرموں کا سردار نہ رہا تو ضمنی جرائم میں بھی یقیناً کمی ہوگی۔ ان معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی

ہدایات کو جب ساتھ رکھ لیا جائے تو وہ ساری صورتیں جو مشکل سے مشکل سامنے آسکتی ہیں ان کا حل بڑا آسان ہو جاتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی قتل ہوگیا لیکن قاتل کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے؟ اس کا سارا حل اس کے اندر موجود ہے کہ قتل کی دیت مقتول کے وارثوں کو حکومت وقت ادا کرے گی۔ اس طرح اس کی ذمہ داری جب مقتول کے وارثوں سے اٹھ گئی کہ وہ نشاندہی کریں کسی کا نام لیں؟ جس جس پر شک ہے اس کی طرف اشارہ کریں تب ہی حکومت کا ادارہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور یہ سارے بکھیڑے حرام زدگیوں کیلئے ہیں جو حکومت نے غلط قانون کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والے ادارہ کیلئے خود قائم کئے ہیں۔ ایک تھانہ دار کو جس کے تھانہ میں ایسی واردات ہوئی ہو جب براہ راست حکومت پوچھے گی کہ قاتل دو ورنہ..... تو بس قتل واضح ہو جائے گا اور آئندہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔

یہاں کیا ہوتا ہے کہ ایسا قتل ہوگیا بلکہ ایسا قتل بنا دیا گیا تو آئی جی صاحب سے شروع ہو کر ایک تھانہ کے چپڑاسی تک سب کی عید لگ گئی یا گویا فصل پک گئی اور اس سے لاکھوں والوں نے لاکھوں کمائے اور ہزاروں والوں نے ہزاروں اور سینکڑوں کا اب نام مناسب نہیں کہ یہ چپڑاسی کی شان کے بھی خلاف ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ قانون اسلام کا نہیں ہے اور حکومت کا مقصد امن قائم کرنا نہیں بلکہ لوگوں کو مصروف رکھنا مقصود ہے کہ انہی کاموں پر حکومت قائم ہے۔ آج فی زمانا ایسے قتل جو دن دھاڑے سارے لوگوں کے سامنے ہو جاتے ہیں ان کو ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے چہ جائیکہ کہ وہ قتل جو رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر ہوں ان کو ثابت کرنے کی کوئی صورت بھی ہو؟ یہاں تو پھانسی اس کے گلے میں پڑتی ہے جس کے گلے میں فٹ آجائے حق و ناحق کا کوئی مسئلہ نہیں۔ قتل جیسے گھناؤنے کیسوں کے فیصلے بیس بیس سال تک پیچھا نہیں چھوڑتے مقتول کے ورثاء رقمیں خرچ خرچ کر آخر پھر قاتل بنتے ہیں اور علاوہ ازیں اس کا کوئی حل نہیں اور اگر وہ کسی وجہ سے قاتل نہ بن سکیں تو معاشرہ میں ان کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانیت سے خارج قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس ملک کی عدالتیں جرائم کے فیصلے کرنے کی بجائے جرائم کو جنم دیتی ہیں وہ ملک کی ابتدائی عدالتیں ہوں جو تھانوں اور تحصیلوں سے متعلق ہیں یا ملک کی آخری عدالتیں جن کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہاں! چھوٹی عدالتوں کے جرائم بھی ظاہر ہے کہ چھوٹے ہوں گے اور بڑی عدالتوں کے جرائم بھی اتنے ہی بڑے۔ پھر خصوصاً جب سے غیر اسلامی قانون میں اسلام کی میخ ٹھونک دی گئی تو حالات بد سے بد تر ہوتے چلے گئے ہیں اور ایسا ہونا بالکل فطری امر ہے کیونکہ پیوند کاری کیلئے دو جنسوں کا قریب قریب ہونا ضروری ہے۔ متضاد جنسوں کی پیوند کاری ناممکنات میں سے بلکہ ممتنعات میں سے ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ دونوں جنسوں کے مثلہ کر دینے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ کفر و اسلام دونوں متضاد جنسیں ہیں یہ قریب الجنس نہیں اس لئے یہ پیوند کاری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاں! طبقاتی زندگی کو پروان چڑھانے کیلئے ایک ایک فیڈر ان کے منہ میں دے دیا گیا جس سے یقیناً وہ چپ ہوگئے اور نتائج سے ہم

جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿۹۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہوا اور اس کی پھٹکار پڑی اور اس کیلئے اللہ نے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔[۱۶۳] ۹۳

اے مسلمانو! جب ایسا ہو کہ تم اللہ کی راہ میں باہر جاؤ تو چاہئے کہ اچھی طرح تحقیق کر لیا

ویسے ہی بے پرواہ ہو چکے ہیں اس لئے کہ نام کی جنت اور دوزخ ہمارے ایمان میں داخل ہے۔ کان کھول کر سن لو اگر ہماری حالت یہی رہی تو آسمان و زمین ہماری حالت پر کبھی گریہ کناں نہیں ہوں گے۔

پہلے قتل خطاء اور اس کی صورتوں کا ذکر تھا پھر اس کی سزا کا اور اب قتل عمد کا ذکر ہے

۱۶۳ قتل عمد میں اصل تو قصاص ہے اگرچہ ورثا کو قصاص معاف کرنے کا بھی حق ہے لیکن قتل عمد اتنا بڑا جرم ہے کہ سزا اخروی اس دنیوی سزا سے الگ کر کے بیان کر دی گئی۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ اس جرم کے عظیم ترین ہونے پر شاہد ہیں۔ قرآن کریم کی یہی آیت انسان غور سے پڑھے اور اس میں قاتل کی جو سزا بیان کی گئی ہے اگرچہ وہ خالصتہ" اخروی سزا ہے اس پر نگاہ ڈالے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں بشرطیکہ اس میں ایمان نام کی شے بھی کوئی موجود ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا کہ "دنیا کے فنا ہونے سے بھی بے گناہ مومن کا قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک شدید ترین ہے۔" یہ بحث کہ توبہ سے یہ سزا معاف ہوتی ہے یا نہیں؟ اس بحث کا یہ مقام نہیں۔ ہاں! یہ بات واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وہ تفسیر جس سے یہ الجھن اور بحث پیدا ہی نہیں ہوتی وہ زیادہ صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ متعمداً مستحلا مقتلہ یعنی جو شخص دانستہ طور پر اور مسلمان کے قتل کو حلال سمجھتے ہوئے قتل کرتا ہے اس کی یہ سزا ہے۔ رہی خالصتہ" دنیوی سزا جس کے احکام سورہ البقرہ ۱۷۸ میں گزر چکے ہیں اس کی تفصیل کیلئے تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول ص ۶۴۷ تا ۶۵۲ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ نمبر ۳۰۶ سے ۳۰۸ تک۔

اور قتل عمد کی اس اخروی سزا کو احادیث میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! ﷺ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کسی کو اللہ کی مثل قرار دینا حالانکہ اللہ ہی نے اس کو پیدا کیا۔ سائل نے پوچھا اس کے بعد' آپ ﷺ نے فرمایا کہ اولاد کو اس اندیشہ سے مار ڈالنا کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہو جائیں گے۔ الخ (صحیح بخاری و مسلم)

فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۗ

کرو کہ جو کوئی تمہیں سلام کرے تو یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو[۱۶۴]۔ کیا تم دنیا کے سروسامان زندگی کے طلبگار ہو۔ اگر یہی بات ہے تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت سی غنیمتیں موجود ہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاکت آفریں باتوں سے بچو اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سات چیزوں کی تفصیل بیان فرمائی تو اس میں ناحق کسی کو مار ڈالنے کو بھی شمار کیا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ ایک مومن جب کسی دوسرے مومن کو قتل کرتا ہے تو وہ بحالت ایمان قتل نہیں کرتا۔ (رواہ البخاری) اور اس سلسلہ میں بہت سی احادیث اس باب میں بیان کی گئی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی اس کو دوسرے مقامات پر واضح کیا ہے چنانچہ ایک جگہ مسلمانوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ :

"وہ لوگ ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنا بدلہ پائے گا' قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔" (الفرقان ۲۵ : ۶۸' ۶۹)

یعنی وہ لوگ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جو اکبر الکبائر میں سے ہیں جن میں اس وقت اہل عرب کثرت سے مبتلا تھے اور آج عالم اسلام کے پورے مسلمان بدقسمتی سے اسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایک شرک باللہ' دوسرے قتل ناحق اور تیسرے زنا۔ پھر اس پر مزید بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان تینوں کے جواز کی صورتیں بھی مختلف مکاتب فکر نے مختلف صورتوں میں روا رکھی ہیں چنانچہ شرک فی الصفات کی صورتیں عام ہیں اور متعہ اور عزل کے دلائل بھی بیان کئے جاتے ہیں اور علاوہ ازیں بھی بہت کچھ ہے۔

سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ہدایت کہ جتنا معاملہ اہم ہوگا اتنی ہی سوچ بھی گہری ہوگی

[۱۶۴] آیت کا حکم عام ہے اور قرآن کریم سب مسلمانوں کو مخاطب کر کے ہدایات دیتا ہے تاہم اس باب میں کسی خاص واقعہ کی طرف نسبت اس لئے بیان کی جاتی ہے کہ اس سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے انسانوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور ان سے معصوم صرف انبیاء کرام ہی کی ذات ہو سکتی ہے جن کا تعلق براہ راست اللہ سے ہوتا ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ روانہ فرمایا۔ کفار کو جب لشکر اسلام

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۹۴ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ

تمہاری حالت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی پھر اللہ نے تم پر احسان کیا پس ضروری ہے کہ لوگوں کا حال تحقیق کر لیا کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔[۱۶۵] ۹۴

مسلمانوں میں سے جو لوگ معذور نہیں ہیں اور بیٹھے رہے ہیں وہ ان لوگوں کے برابر

کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھاگ گئے لیکن مرداس نامی ایک شخص جو دراصل مسلمان ہو چکا تھا وہ اپنے مال مویشیوں کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ جب مسلمان وہاں پہنچے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا تو اس نے بھی جواب میں اللہ اکبر کہا اور کلمہ شہادت پڑھتا ہوا نیچے اتر آیا اور انہیں السلام علیکم کہا لیکن حضرت اسامہ نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے قتل کر دیا اور اس کا ریوڑ ہانک کر مدینہ طیبہ لے آئے اور خود ہی بارگاہ نبوت میں سارا قصہ بیان فرما دیا۔ نبی ﷺ نے جب یہ ماجرا سنا تو آپ ﷺ بہت رنجیدہ ہوئے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ آیت سابقہ میں مسلمانوں کو حالت امن میں مسلمان اور غیر مسلمان کو قتل کرنے سے منع فرمایا اور اس آیت میں حالت جنگ میں بھی بلاوجہ قتل و غارت سے روک دیا کہ جب تک تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ یہ لڑنا چاہتے ہیں اس وقت تک ہاتھ نہ اٹھاؤ یا یہ کہ محاربہ جاری تھا کہ کسی آدمی نے جو اس محاربہ میں شریک تھا کلمہ شہادت پڑھ لیا تو تم اپنا ہاتھ اس سے روک لو اور مال غنیمت کے حصول کیلئے اس کی شہادت کو رد نہ کرو۔ اس فنا پذیر دولت کی خاطر تم ایک مومن کی شہادت رد نہ کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رزق کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اگر تم اس کے حکم کی تعمیل کرو گے تو وہ کئی ایک ذریعوں سے تمہارے رزق کے دروازے کھول دے گا۔

ناجائز ذریعہ سے سامان زندگی حاصل کرنا ایمان باللہ کے سراسر خلاف ہے

[۱۶۵] دنیا کے سروسامان کی بلاشبہ ہر آدمی کو ضرورت ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن اس سروسامان کو ناجائز طریقوں سے حاصل کرنا ایمان باللہ کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اس طرح سروسامان حاصل کرنے والے نے عملاً ثابت کر دیا کہ اس کا رازق اللہ نہیں یا یہ کہ وہ اللہ کے کسی قانون کا پابند ہو کر رہنا نہیں چاہتا اور یہی نظریہ اسلام سے خارج کرنے کیلئے کافی ہے۔ اس سے اس آیت میں کھلے لفظوں میں ارشاد فرمایا کہ "کیا تم سروسامان زندگی کے طلب گار ہو کہ چاہتے ہو کہ جو کوئی بھی ملے اس سے لڑ کر مال غنیمت لوٹ لیں؟ اگر یہی بات ہے تو بھی اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت سی غنیمتیں موجود ہیں تم ظلم و معصیت کی راہ کیوں اختیار کرو؟ تمہاری اپنی حالت بھی تو پہلے ایسی ہی رہ چکی ہے اور بجز کلمہ اسلام کے اسلام کا اور کوئی ثبوت نہیں

الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ۝۹۵ دَرَجٰتٍ

نہیں ہو سکتے جو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہ اعتبار درجے کے فضیلت دی ہے اور اللہ کا وعدۂ نیک سب کیلئے ہے اور بیٹھ رہنے والوں کے مقابلہ میں جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بہت بڑا اجر عطا کیا ہے۔ ۹۵ ۱۶۶

رکھتے تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تم کو تمام باتیں اسلام کی حاصل ہو گئیں پس ضروری ہے کہ لڑنے سے پہلے لوگوں کا حال تحقیق کر لیا کرو۔" اس لئے کہ یہ جنگ جاری نہیں بلکہ جنگ کا جاری ہونا ہے اگر جنگ کی نوبت ہی نہ آئے اور فریق ثانی اس سے پہلے ہی کہ جنگ کرے جنگ سے باز آجائے تو کیا تم کو ضرور ہی جنگ کرنا ہے غور کرو کہ تم کو جنگ لڑنے کا نہیں بلکہ اپنے دفاع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تم کو دعوت اسلام پیش کرنا ہے اگر کوئی قبول نہیں کرتا بلکہ دعوت اسلام کی رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے اور تمہارے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے یا اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو تمہیں اجازت ہے کہ اس کے وہ ہاتھ توڑ دو جن سے اس نے تمہاری مزاحمت کی لیکن اگر وہ اٹھانے ہی نہ چاہے تو تم تو پہلے ہی امن کے داعی ہو اس پر ہاتھ کیوں کھولو گے اور آخر آیت میں ارشاد فرمایا "تم جو کچھ بھی کرتے ہو اس کی خبر اللہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔"

جہاد میں شریک ہونے والے اور شریک نہ ہونے والے لوگ برابر نہیں ہو سکتے

۱۶۶ یعنی کسی زیارت گاہ کی سجادہ نشینی، مجاوری اور چند نمائشی مذہبی اعمال کی بجا آوری جس پر دنیا کے سطحی لوگ بالعموم شرف اور تقدیس کا مدار رکھتے ہیں اللہ کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ اصل قدر و قیمت ایمان اور راہ الٰہی میں قربانی کی ہے۔ ان صفات کا جو شخص بھی حامل ہو وہ بلاشبہ قیمتی آدمی ہے خواہ وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی قسم کے امتیازی طرے اس کو لگے ہوئے ہوں۔ لیکن جو لوگ ان صفات سے خالی ہیں وہ محض اس لئے کہ بزرگ زادے ہیں۔ سجادہ نشینی ان کے خاندان میں مدتوں

سے چلی آرہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی مراسم کی نمائش وہ بڑی شان کے ساتھ کر دیا کرتے ہیں نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت "موروثی" حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی ادارے ان نالائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دیئے جائیں۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت خود ہی دوسرے مقامات پر کر دی ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ :

"کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر سمجھ لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخرت پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کیلئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔" (التوبہ ۹ : ۱۹، ۲۰)

آیت زیر نظر میں فرمایا کہ اجر کے مستحق تو دونوں ہیں لیکن ایک گروہ کا رتبہ دوسرے گروہ سے لازماً بلند تر ہے کیوں کہ اس نے زیادہ سخت حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاطر وہ خطرات مول لئے جو دوسرے گروہ کو پیش نہ تھے۔ اس نے ایسی حالت میں مال خرچ کیا جب دور دور کہیں یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ کبھی فتوحات سے اس خرچ سے تلافی ہو جائے گی اور اس نے ایسے نازک دور میں کفار سے جنگ کی جب ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن غالب آکر اسلام کا نام لینے والوں کو پیس ڈالیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم لوگ احد کے برابر سونا بھی خرچ کرو تو ان لوگوں کے اعمال کو نہ پہنچ سکو گے۔" درجہ میں یہ تفاوت خود رسول اللہ ﷺ نے فرما دی کیوں؟ اس لئے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سابق الاسلام ہیں لیکن خالد رضی اللہ عنہ بن ولید صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لائے ہیں۔ جس سے اصولاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کبھی اسلام پر ایسا وقت آجائے جس میں کفر اور کفار کا پلڑا بھاری ہو اور بظاہر اسلام کے غلبہ کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے ہوں اس وقت جو اسلام کی حمایت میں جانیں لڑائیں اور مال خرچ کریں ان کے مرتبے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو کفر و اسلام کی کشمکش کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جانے کے بعد قربانیاں دیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا :

"تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔" (الحدید ۵۷ : ۱۰)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کو جو اجر اور مرتبہ بھی دیتا ہے یہ دیکھ کر دیتا ہے کہ کس نے کن حالات

ع ۱۳ ۵ ۱۰

مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ۞ إِنَّ
الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۚ قَالُوْا
كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً

یہ درجات اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور اس کی طرف سے بخشش اور رحمت ہے اور وہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔[۱۶۷] ۹۶

جو لوگ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہے ہیں ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ جواب دیں گے ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں دبے ہوئے اور بے بس تھے[۱۶۸]' اس پر فرشتے کہیں گے' کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ

میں کس جذبے کے ساتھ کیا عمل کیا ہے۔ اس کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے وہ ہر ایک کا درجہ اور اس کے عمل کا اجر پوری باخبری کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اس لئے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو مصیبت بھی پیش آتی ہے وہ ان کیلئے ایک نیک عمل شمار کی جاتی ہے۔ ہر پیاس جو وہ جھیلتے ہیں' ہر محنت جو وہ اٹھاتے ہیں' ہر مخمصہ جس میں وہ پڑتے ہیں' ہر وہ قدم جو وہاں چلتا ہے جہاں چلنا کافروں کیلئے غیظ و غضب کا باعث ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو وہ دشمنوں سے پاتے ہیں یہ سب کچھ ان کیلئے عمل نیک ثابت ہوتا ہے کیونکہ اللہ نیک کرداروں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔" (التوبہ ۹ : ۱۲۰)

"اور اس طرح وہ اللہ کی راہ میں کوئی رقم نہیں نکالتے چھوٹی ہو یا بڑی اور کوئی میدان طے نہیں کرتے مگر یہ کہ اس کی نیکی ان کے نام لکھی جاتی ہے تاکہ اللہ ان کے کاموں کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔"

(التوبہ ۹ : ۱۲۱)

انعام الٰہی اس کے علاوہ بھی ان کیلئے موجود ہے

۱۶۷ یعنی اللہ کی رحمت بے پایاں ہے اس لئے اس کی رحمت و بخشش کی بارش جب شروع ہو جاتی ہے تو وہ جتنی چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق برسا دیتا ہے۔ وہ اپنی شان غفوریت کے تقاضا سے ان کا ہر عذر قبول کر لے گا اور شان رحیمیت کے تقاضا سے انہیں مزید اجر عنایت فرمائے گا کیونکہ اس کے قانون میں بے حساب عنایت کرنا موجود ہے۔ یعنی جہاں سے انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا وہ عطا فرما دیتا ہے۔

فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا
الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ
حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ

ہجرت کر کے چلے جاتے؟ غرض کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہوا اور کیا ہی بری جگہ ہے۔ ۱۶۹ ۹۷

مگر جو مرد، عورتیں، بچے ایسے مجبور اور بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں اور کوئی راہ نہ پاتے ہوں۔ ۹۸ تو امید ہے اللہ انہیں معاف کر دے اور اللہ معاف

زیاں کاروں کی موت کا منظر

۱۶۸ دشمنان حق کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر پیغمبر اسلام نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو قدرتی طور پر ملک عرب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا دارالہجرت اور دارالحرب۔ دارالہجرت مدینہ تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جمع ہوگئے تھے دارالحرب ملک کا وہ حصہ تھا جو دشمنوں کے قبضہ میں تھا اور اس کا صدر مقام مکہ تھا۔ دارالحرب میں جو مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ اعتقاد و عمل کی آزادی سے محروم تھے انہیں ہمیشہ دشمنوں کا ظلم و ستم سہنا پڑتا تھا اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اگر باوجود استطاعت کے ہجرت نہیں کریں گے تو اپنی کوتاہی عمل کے جواب دہ ہوں گے۔ اس جگہ اسی معاملہ کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا جو لوگ استطاعت نہ رکھتے ہوں وہ تو مجبور ہیں لیکن جو کوئی ہجرت کی استطاعت رکھتا ہو اور پھر بھی دشمنوں کی آبادی نہ چھوڑے اور اپنی محرومی و ذلت کی حالت پر قانع ہو جائے تو وہ سخت معصیت کا مرتکب ہوگا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

بے مقصد عذر کرنے والوں کا عذر قابل قبول نہیں ہوگا لیکن معذوروں کا خیال رکھا جائے گا

۱۶۹ جو لوگ اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کریں گے انہیں نئی نئی اقامت گاہیں اور معیشت کے نئے نئے سامان ملیں گے۔ اس طرح ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جو اب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے، ہجرت پر ابھارا ہے اور یہ گویا ان کیلئے آخری تنبیہہ ہے اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی کے اب تک دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں، اس حالت میں ان کو موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس اور مجبور تھے، فرشتے جواب دیں گے کیا اللہ کی زمین میں تمہارے لئے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم

عَنْهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۗ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ

کر دینے والا اور بخش دینے والا ہے۔[۱۷۰] ۹۹

اور دیکھو جو کوئی اللہ کی راہ میں میں ہجرت کرے گا تو اسے اللہ کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی اور کشائش پائے گا[۱۷۱] اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے اور پھر اسی راہ میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا

وہاں ہجرت کر جاتے' پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور ظاہر ہے کہ جہنم تو نہایت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو معذور متصور ہو سکتے ہیں

۱۷۰ ازیں بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقتہ" بے بس اور معذور ہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور صرف وہ مرد' عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہوں اور نہ ان کیلئے کوئی اور راہ کھل رہی ہو یہ لوگ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرما دے اور بے مقصد عذر پیش کرنے والوں کا عذر قابل قبول نہیں ہو گا بلکہ ان کی آہ و پکار کے باوجود ان کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا اور ان کی ایک نہیں سنی جائے گی۔

جو ہجرت کے پیش نظر گھر سے نکل کھڑا ہوا اللہ اس کا حامی و ناصر ہو گا

۱۷۱ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کیلئے اپنے گھر بار اور عزیز و اقارب چھوڑنے پر تیار ہو گئے فرمایا ان کی حمایت کیلئے اللہ کی ذات خود موجود ہے اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ اگر ساری دنیا مخالف ہو جائے لیکن اللہ کی ذات جس انسان کی حمایت میں ہو اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا اور مخالفین کو ناکوں چنے چبانے پڑتے ہیں اس لئے ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح فرمایا کہ :

"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہے' کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں کیسا بہترین انجام ان کا منتظر ہے۔ (النحل ۱۶ : ۴۱' ۴۲)

وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى
الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ
اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا
لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ

اور اللہ تو بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۷۲ ۱۰۰

اور اگر تم سفر میں نکلو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اگر نماز میں سے کچھ کم کردو۔ بلاشبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ ۱۷۳ ۱۰۱

اور اے پیغمبر اسلام! جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور تم ان کے لئے نماز قائم کرو تو

گھر سے نکلنے والے نے ہجرت کا اجر پالیا اگرچہ وہ دارالہجرت پہنچنے سے پہلے ہی وفات پاگیا

۱۷۲ آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کیلئے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دارالہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہو اور جو گھر سے نکل کھڑا ہوا اگر فوراً ہی اس کی موت آگئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہوگیا۔ ان آیات کریمات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کیلئے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا اور یہ بھی کہ اگر دارالسلام موجود ہو اور اس کی طرف ہجرت کی راہ کھلی ہو کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو بھی ایسے مقام سے ہجرت کر کے دارالسلام میں منتقل ہو جانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں اور ہجرت کے معاملے میں ہر عذر عذر نہیں ہے۔ معتبر عذر صرف اور صرف یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آرہی ہو نہ اس کیلئے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہرحال لازم ہے اگرچہ اس کو اصحاب کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑے۔

یاد رہے کہ ہجرت کا اجر جو آخرت میں ہے وہ تو ہے ہی، دنیا میں بھی مہاجر کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَاِذَا سَجَدُوْا

چاہیئے کہ ایک حصہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار لئے رہے۔ پھر جب وہ سجدہ کر

خاص عزت فراہم ہوتی ہے۔ اللہ کی زمین اس کیلئے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کیلئے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں اور اس آخری آیت میں یہ بات بھی ذہن نشین کرا دی گئی کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی مہاجر کو موت آجائے تو ہجرت کا اجر اس کیلئے لازم ہوگیا اور اب جہاد کی طرف سے رخ نماز کی طرف پھرنے والا ہے اس لئے کہ نماز ہی دراصل جہاد کی روح ہے۔

نماز قصر کرنے کے حکم سے دو باتوں کی اہمیت معلوم ہوگئی نماز کی بھی اور جہاد کی بھی

۱۷۳ نماز قصر کرنے کے حکم سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نماز وہ چیز ہے کہ جنگ کے خطرات کے اندر بھی یہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام میں جنگ خونریزی اور لوٹ مار کیلئے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ دوسرے مقامات سے واضح ہو چکا ہے صرف اور صرف اس لئے ہے کہ اللہ کی زمین سے اس ظلم و جبر کا خاتمہ کیا جائے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے روکنے کیلئے اللہ کے دشمنوں کی طرف سے برپا کیا جاتا ہے اس پہلو سے غور کیجئے تو جہاد کی اصل روح نماز ہی ہے اس سے جہاد اللہ کی عبادت بنتا ہے اگر اس کے اندر یہ روح نہ ہو تو یہ بھی اس طرح فساد فی الارض ہے جس طرح اللہ کے باغیوں کی ہر جنگ فساد فی الارض ہے اور اس بات کو واضح کرنے کیلئے کہ ایک ہی طرح کا فعل اللہ کے حکم کے مطابق ہونے سے عبادت اور اللہ کے حکم کے خلاف ہونے کے باعث مستوجب سزا ہو سکتا ہے نہیں بلکہ مستوجب سزا ہوتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ جماع اور زنا میں فرق کیا ہے؟ اور خصوصاً جبکہ وہ بالجبر بھی نہ ہو لیکن ہر انسان جو انسانیت سے نکل نہ گیا ہو ایک کو قابل ستائش اور دوسرے کو قابل سزا جانتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک اللہ کے حکم کے مطابق ہے اور دوسرا اللہ کے حکم کے خلاف۔

اس روح کے تحفظ کا یہ فطرتی تقاضا ہے کہ عین میدان جنگ میں بھی تا حد امکان نماز سے غفلت نہ ہو تاکہ ہر مجاہد کو اس حقیقت کی یاددہانی ہوتی رہے کہ اس کے میدان جنگ کی صفیں بھی اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے اس کی نماز کی صفوں سے مختلف نہیں ہیں۔ دوسری یہ کہ اس سے نماز باجماعت کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور میدان جنگ کی نماز کی شکل ایک ایسی بیان فرمائی ہے جس سے نماز باجماعت کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور دفاع کا بھی۔ نماز قصر کا حکم تو بلاشبہ جہاد ہی کی غرض اور جہاد ہی کے سفر کیلئے تھا لیکن اس کا حکم عام دے دیا گیا جو اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے واضح فرما دیا۔

فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا
مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

چکے تو پیچھے ہٹ جاؤ اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہ تھا تمہارے ساتھ شریک ہو جائے اور چاہیئے کہ پوری ہوشیاری رکھے اور اپنے ہتھیار لئے رہے[۱۷۴]۔ یاد رکھو جن لوگوں نے کفر کی راہ

نماز کا بیان جو صرف جنگ ہی سے مخصوص ہے

۱۷۴ اس آیت میں نماز کی وہ خاص شکل و صورت بیان ہوئی ہے جو نماز باجماعت کیلئے میدان جنگ میں اختیار کی جا سکتی ہے اور علاوہ ازیں نہیں۔ ہاں! جنگی مشقوں میں نماز کا وقت آجائے تو جنگی مشقیں کرانے والوں کو اس کی مشق کرانا بھی لازم ہے اس لئے یہ بے دھڑک کہا جا سکتا ہے کہ جنگی مشقوں میں اس ہیئت کے ساتھ میدان میں نماز ادا کرنا جائز اور درست ہے۔ بہرحال اس جگہ جو صورت حال بیان فرمائی گئی وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک گروہ اسلحہ سے لیس ہو کر امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کیلئے کھڑا ہو اور دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے۔ جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو وہ پیچھے ہٹ کر حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی ہے امام کے پیچھے اس مسلح حالت میں نماز کیلئے کھڑا ہو جائے۔ اس صورت میں نماز باجماعت کے قیام' امام کی اقتداء اور دفاع تینوں کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں لیکن مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہوگی؟ اس سوال کا جواب اس آیت میں پوری طرح واضح نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس باب میں علماء و فقہاء کی آراء میں اختلاف ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تو جس تفہیم کئے ہوئے حکم کے مطابق صلوٰۃ ادا کی گئی نماز بہرحال درست ہوگی اور نماز و جہاد جب دین میں ایک جیسی اہمیت رکھتے ہیں تو جہاد کی صورتوں میں تبدیلی واقع ہونے سے جہاد میں فی نفسہ کچھ فرق نہیں آتا اس طرح نماز میں بھی اس اختلاف سے جو ناگزیر ہے کسی طرح نماز ادا کر لینے سے فی نفسہ نماز ادا ہو جائے گی اس لئے کسی فریق کو دوسرے فریق پر فتویٰ صادر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور امام وقت جو کچھ حکم دے گا اس کی اطاعت لازم ہوگی حکم سے ہماری مراد نماز کی ادائیگی کا حکم ہے۔ جس طرح جہاد میں باقی احکام لازم و ضروری ہیں۔ ہاں! آیت کے ظاہری الفاظ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ بلاشبہ اس طرح ہے کہ امام قصر نماز دو رکعت ادا کرے اور مقتدیوں کے دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے پیچھے اور ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر کے اپنی نماز پوری کریں اور امام دوسری رکعت کیلئے کھڑا ہونے سے پہلے اتنا توقف کرے کہ پہلی جماعت اپنی دوسری رکعت اختصار سے پڑھ کر پیچھے ہٹ جائے اور دوسری جماعت اس کی جگہ لے سکے اور اس طرح جب مقتدی اور امام دونوں کی دو دو رکعتیں ہوں گی لیکن اگر مقتدی ایک ایک ہی رکعت پڑھ کر امام کی دونوں رکعت کے ساتھ

لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً
وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

اختیار کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامان جنگ سے ذرا بھی غفلت کرو تو یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں اور اگر تمہیں برسات کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں اگر ہتھیار اتار کر رکھ دو۔ لیکن اپنے بچاؤ کی طرف سے غافل نہ ہو جانا چاہیئے۔ اللہ نے منکرین حق کیلئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۷۵ ۱۰۲

پھر جب تم نماز پوری کر چکو تو چاہیئے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے

سلام پھیر دیں تو بھی قرآن کریم کی آیت کے خلاف نہیں ہوگا اور حالت جنگ میں اگر نماز اس صورت سے ادا کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا تو نماز کا وقت گزر جانے کے بعد قضا کرنی ہوگی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق میں کیا تھا (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اس طرح نماز کی ادائیگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم دشمن سے چوکنے رہو

۱۷۵ آیت زیر نظر میں جو حالت نماز کی بیان کی گئی ہے اس کا مطالبہ دراصل یہ ہے کہ جب میدان جنگ میں فریقین کا آمنا سامنا ہو لیکن جنگ جاری نہ ہو۔ جنگ جاری ہونے اور حالت جنگ میں ہونے میں بڑا فرق ہے اس لئے فرمایا کہ نماز ضرور ادا کرنا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ تم دشمنوں سے غافل ہو جاؤ نہیں بلکہ اس طرح کہ تمہارا رعب دشمن کے دلوں میں بیٹھ جائے وہ تمہاری اس طرح کی نقل و حرکت سے جب کہ تم اپنے اسلحہ سے بھی لیس ہو گے تو یقیناً ایک طرح کے رعب کا باعث ہوگا۔ اس لئے فرمایا کہ "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کی دلی تمنا تو یہ ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامان جنگ سے ذرا بھی غفلت کرو تو یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔ فرمایا اگر تمہیں برسات کی وجہ سے یا کسی تکلیف کے باعث ہتھیار اتارنا ہی پڑیں تو بھی حالات کے جائزہ کے ساتھ کہ حالات اس کی اجازت دیتے ہیں تو اتار دو لیکن اپنے بچاؤ کیلئے ہر وقت تیار رہو اس سلسلہ کی غفلت تمہاری قابل برداشت نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ نے منکرین حق کیلئے رسوا کن

قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ

۱۷۶

رہو پھر جب ایسا ہو کہ دشمن سے تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز قائم رکھو۔ بلاشبہ نماز مسلمانوں پر وقت

۱۷۷

کی قید کے ساتھ فرض کر دی گئی ہے ۱۰۳

اور دیکھو دشمنوں کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو۔ اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو جس طرح تم

عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حالت جنگ میں نماز ادا کرنے کے بعد ذکر الٰہی کی مشغولیت

۱۷۶ ہمارے ہاں معروف یہ ہے کہ ذکر اللہ کیلئے ضروری ہے کہ تسبیح ہاتھ میں ہو اور ایک کونہ میں الگ تھلگ بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہے کوئی مرے یا جئے اس کی بلا سے۔ آپ اس جگہ ذکر اللہ سے یہ مفہوم نہ نکالیں جب عین حالت نماز میں بھی جو ذکر اللہ کی ایک خاص الخاص حالت ہے اس میں بھی اپنے دفاع کی طرف غافل ہونے کو جرم قرار دیا ہے تو وہ نماز کے بعد اس طرح کا ذکر کیوں ارشاد فرمائے گا اس لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حالت جنگ میں ضروریات زندگی کے جس طرح سارے کام تم پورے کرتے ہو گویا کبھی تم کو لیٹنے کا موقع ملے گا کبھی کھڑے رہنے کا حکم ہوگا اور کبھی بیٹھ جانے کا کیونکہ یہ ساری صورتیں میدان جنگ میں پیش آسکتی ہیں اور آتی ہیں ان حالتوں میں سے آپ کسی حالت میں بھی ہوں تو اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہونا کیونکہ ہر معاملہ میں جب ہدایت کی راہنمائی کی ضرورت ہے تو ہدایت کہاں سے آئے گی اس کیلئے تو صرف اور صرف اللہ کی ذات کا تصور ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر حال میں راہنمائی کر سکتا ہے کیونکہ اسلام کی جنگ اندھا دھند جنگ نہیں جس کیلئے کوئی اصول ہی مقرر نہ ہو۔ اس میں تو قدم قدم پر راہنمائی کی ضرورت ہے کہ ذرا قدم پھسلا تو تباہی و بربادی لازم آگئی اور کیا کرایا سب برباد ہو گیا۔ اس لئے اس بات کی ہدایت فرمائی کہ نماز ادا ہو گئی تو باقی اوقات میں بھی ذکر اللہ کی اتنی ہی ضرورت ہے تاکہ اس مشکل وقت میں پڑھی گئی نماز کو کہیں ضائع نہ کر دیں۔ گویا اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ نماز کا ادا کرنا اور بات ہے اور نماز کی حفاظت اور شے ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی بار بار یہ ہدایت دی ہے کہ نمازوں کی حفاظت کرو۔

اس طرح زیر نظر آیت میں حکم ہوا کہ اگر تم دشمن کے خوف سے امن میں ہو جاؤ یعنی جنگ جب لڑی جا چکے یا جنگ لڑنے کی اگر نوبت ہی نہ آئے اور دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں بہرحال جس طریقہ سے بھی وہ خطرہ باقی نہ رہے بلکہ امن کا زمانہ میسر آئے تو معاً نماز کا حکم بھی اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ کر چلا

الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ
تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

دکھی ہوتے ہو وہ بھی دکھی ہوتے ہیں اور تم اللہ سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو انہیں میسر نہیں اور یاد رکھو اللہ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۰۴

آئے گا گویا اب نماز خوف ادا نہیں ہوگی بلکہ اگر سفر بھی درپیش ہے تو قصر ہوگی لیکن اگر اقامت گاہ پر پہنچ گئے ہو اب سفر درپیش نہیں رہا تو نماز پوری ادا کرنا ہوگی اور اس طرح نماز قصر ادا کرنے کا حکم باقی نہ رہے گا بلکہ اب پوری نماز ادا کرنا ہوگی۔

بلاشبہ نماز ہر مسلمان پر وقت مقرر کے ساتھ فرض کی گئی ہے

۱۷۷ مطلب یہ ہے کہ نماز اپنی فرضیت کے لحاظ سے ادا کرنا ضروری ہے جو کسی حال میں معاف نہیں ہے اور موقت ہونے کی وجہ سے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے اس لئے مخصوص حالات میں اس کی ہیئت میں جو فرق کیا گیا ہے اس سے فی نفسہ نماز میں کوئی فرق نہیں آتا اور ضرورت کے مطابق جو اس کو موخر یا وقت کے آنے کے ساتھ ہی ادا کرنا یا اس طرح دو نمازوں کو اکٹھا کرنا یعنی جمع کر لینے کی اجازت ہے وہ "کتاب موقوت" میں کوئی فرق نہیں پڑتا صرف اول و موخر سے وقت نکل جانا مراد نہیں لیا جا سکتا اور پھر سنت میں اس کی ہر لحاظ سے وضاحت بیان کر دی گئی ہے گویا آیت زیر نظر سے ایک تو یہ بات واضح ہوگئی کہ اوقات کی پابندی اوقات صلوٰۃ کی شرائط میں سے ہے دوسری یہ کہ نبی اعظم و آخر ﷺ نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے کیونکہ نمازوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اوقات کے اہتمام کے ساتھ فرض ہیں درآنحالیکہ اوقات نماز تمام تر نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ ہیں قرآن کریم میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ ارشادات مختلف مقامات پر کئے گئے ہیں۔

منکرین سے تم کو جو دکھ پہنچا ہے اس سے زیادہ تم ان کو دکھ پہنچا چکے ہو۔

۱۷۸ اشارہ اس طرف ہے کہ میدان احد میں اگر تم کو کفار سے تکلیف پہنچی ہے جو دراصل تمہاری ہی کوتاہی کا نتیجہ تھی تو تم کو یہ تو نہ بھول جانا چاہئے کہ تم اس سے پہلے میدان بدر میں ان کو اس سے دوگنی تکلیف پہنچا چکے ہو۔ پھر جب وہ اتنی تکلیف و مصیبت برداشت کر کے دوسرے ہی سال احد میں آدھمکے ہیں تو تم اتنے بددل کیوں ہو رہے ہو حالانکہ تم اللہ سے وہ امید بھی رکھتے ہو جو ان کو نہیں ہے۔ کیونکہ تم کو جو کچھ پیش آیا ہے وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے پیش آیا ہے اور یقیناً اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اگر کچھ

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ

اے پیغمبر! ہم نے تم پر "الکتاب" سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے تاکہ جیسا کچھ اللہ نے بتلایا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری میں نہ جھگڑو ۱۰۵۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو' بلاشبہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۰۶ اور جو لوگ اپنے اندر خیانت رکھتے ہیں تم ان کی طرف سے نہ جھگڑو۔ اللہ ایسے لوگوں

لوگ تمہارے جنگ احد میں کام آئے ہیں تو ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی بلکہ وہ خود تو کامیاب و کامران ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے اور اسی طرح وہ جنات کے وارث قرار پائے جن میں خوش و خرم ہیں۔ ان کی جتنی غلطیاں تھیں جتنے گناہ تھے سب معاف کر دیئے گئے اور پھر جو جی رہیں آخر وہ کیوں جیتے ہیں؟ یقین جانو کہ صرف مرنے کیلئے پھر ان کو مرنے کے بعد کیا ملے گا رضائے الٰہی کے خلاف لڑنے کی وجہ سے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے اس طرح خود ہی غور کرو کہ نقصان میں کون رہا اور فائدہ میں کون؟ اس کی پوری تفصیل پیچھے سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۴۰' ۱۷۲ میں گزر چکی ہے وہاں سے ملاحظہ فرمالیں۔

قرآن کریم حق و باطل میں فرق کر کے الگ الگ کر دینے والا ہے

۱۷۹ قرآن کریم کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کو چڑ نہیں چڑھاتا بلکہ ہر اس معاملہ میں جس میں کسی کو چڑ کھانے کا امکان ہوتا ہے اس کا رخ اپنے رسول ﷺ کی طرف پھیر دیتا ہے کیونکہ وہ صاحب وحی ہے اس کو مخاطب کر کے بات کرتا ہے تاکہ رسول جب ان لوگوں کے سامنے بیان کرے گا جو اس کے مخاطبین ہیں تو اللہ کا حکم بیان کرے گا جس کا بظاہر مخاطب تو وہی ہو گا اگرچہ اس سے سمجھانا مقصود امت کے لوگوں ہی کو ہے۔ اس کی مثال اس طرح سمجھ لو کہ جب حاکم اعلیٰ حکم کرتا ہے تو وہ اپنے نائبین کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہئے اگر اس میں تم نے کوتاہی کی تو اس کا نتیجہ تم کو بھگتنا ہو گا حالانکہ وہ ان کے ماتحتوں نے کرنا ہے اس نے بذاتہ نہیں کرنا ہے تاہم مخاطب وہی کیا جاتا ہے جو اس کام کو سرانجام دینے والوں کا افسر و نگران ہے اور اگر کوئی کوتاہی ہو تو وہ جواب دہ بھی ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں جو خطاب ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ فرمایا گیا اے پیغمبر اسلام یہ جو کتاب آپ ﷺ کو دی گئی ہے یہ کیا ہے؟ یہ حق و باطل کیلئے ایک کسوٹی ہے۔ تم اس پر پرکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرو جو اس پر پورے اتریں وہ

مومن و مخلص ہیں' جو اس پر کھوٹے ثابت ہوں وہ عہد شکن اور غدار ہیں تم اللہ کے حضور ان کے وکیل اور سفارشی نہ بنو اللہ ایسے بد عہدوں اور غداروں کو پسند نہیں کرتا۔ ہاں! آپ ان لوگوں کو ہدایت کی تلقین کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت کی دعا بھی جب تک کہ وہ زندہ ہیں کیونکہ ہدایت کا تعلق زندگی ہی کے ساتھ خاص ہے اور ہدایت یافتہ وہی ہو سکتا ہے جس نے خود توبہ کی اور برائیوں سے تائب ہو گیا۔

فرمایا آپ ﷺ پر الکتاب یعنی قرآن کریم نازل کیا ہے جو سراسر سچائی ہے۔ آپ ﷺ اس کے مطابق فیصلہ کریں اور کسی کی ناراضگی کی پروا نہ کریں کہ کون راضی رہتا ہے اور کون ناراض ہوتا ہے۔ الفاظ کا اشارہ اس طرف ہے کہ کسی کے دعویٰ اسلام کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جھوٹا ہو تو بھی اس کو سچا قرار دیا جائے اس لئے کہ اس نے اسلام کو قبول کر لینے کا دعویٰ کیا ہے اور کسی شخص کے جھوٹے ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اسلام و کفر کا مقام اپنا ہے کسی واقع اور کسی بات کا حق و ناحق ہونا اور بات ہے۔ اسلام سچ بولنے کی ہدایت تو دیتا ہے لیکن یہ نہیں کہتا کہ جو شخص دعویٰ اسلام رکھتا ہو وہ چاہے جو کرتا رہے وہ سچ ہی ہو گا۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور قرآن کریم کی ہدایت ہر سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کہتی ہے۔ کوئی شخص اللہ' اس کے رسول ﷺ اور قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اگر جھوٹ کا مرتکب ہو گا تو جھوٹا ٹھہرے گا اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن کریم میں سے کسی پر ایمان نہ لائے لیکن جس معاملہ میں وہ سچا ہے اس کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کریم کی یہی وہ تعلیم ہے جو دوسرے ادیان و مذاہب سے اس کو بالکل الگ کر دیتی ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس کو بالکل بھلا دیا ہے اور اس میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھا۔

بڑے بڑے علامہ و فہامہ' پیر و مفتی' قاری و قاضی دین کے ستون کہلانے والے جب اپنی پارٹی' اپنی فکر اور گروہ بندی کا نام آتا ہے تو ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ زیر نظر آیت اس بات کی ہدایت فرما رہی ہے کہ ایسا کرنا کھلی خیانت کا مرتکب ہونا ہے۔ سچ سچ ہے اور جھوٹ جھوٹ ہے خواہ کوئی بولے اور کوئی کہے۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ فکر و پارٹی کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ سچ اور جھوٹ کے پرکھنے کے جو اصول ہیں ان ہی پر رکھ کر پرکھا جا سکتا ہے۔ آیت زیر نظر کے شان نزول میں ایک نام کے مسلمان اور یہودی کے ایک فیصلہ کا ذکر بیان کیا ہے جس میں یہودی سچا اور مسلمان نام رکھنے والا جھوٹا تھا اور اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق تحقیق کر کے یہ بات واضح فرما دی کہ یہودی سچا ہے اور مسلمان نام رکھنے والا جھوٹا ہے۔ حالانکہ اس وقت نام کے مسلمان کو جس کا نام بشیر تھا مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل تھی جو یہودی کو نہیں تھی لیکن آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے جو سچ تھا اس کو سچ کہا اور مسلمانوں کی حمایت کی بھی کوئی پروا نہ کی اور یہی ہدایت قرآن کریم مسلمانوں کو دے رہا ہے کہ تم بھی وہی کرو جو پیغمبر اسلام نے کیا ہے' حق کی حمایت کرو اور حق ہی کو حق جانو اس کے کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ (اس واقعہ کی تفصیل ترمذی' حاکم' ابن مسعود اور ابن جریر میں موجود ہے۔)

أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ
النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا
يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَا أَنتُمْ

کو پسند نہیں کرتا جو خیانت اور معصیت میں ڈوبے ہوتے ہوں[۱۸۰]۔ ۱۰۷

یہ لوگ انسانوں سے چھپاتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے حالانکہ وہ راتوں کو مجلس بٹھا کر ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں تو اس وقت وہ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں[۱۸۱]۔ ۱۰۸

خیانت کرنے والا خائن ہے خواہ وہ کوئی ہو اور خائن کی حمایت ہر حال میں گناہ ہے

۱۸۰ یہ گویا تاکیدی حکم ہے کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جو دباؤ بھی پڑے اس کی پروا مت کرو اور ان کے معاملہ میں ذرا برابر بھی لچک اپنے قول و عمل میں مت رکھو کیونکہ وہ اللہ کو پسند نہیں اور قرآن کریم نے اس کی بار بار نشاندہی فرمائی کہ کہیں یہ ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے بلکہ ہر حال میں اس کی حفاظت کرنا ہے خواہ اس معاملہ میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے کوئی رہے یا جائے اس کی پروا مت کرو جو کھرا ہے وہ آخر جائے ہی گا کیوں؟ اور جو کھوٹا ہے اس کو رکھ کر کیا کرو گے؟ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کا کہا مت مانو' حقیقت میں حکیم و علیم تو اللہ ہی ہے۔ اس بات کی پیروی کرو جس بات کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تم کو کیا جا رہا ہے۔ اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ ہی اصل وکیل ہے اور اس کی وکالت کفایت کرنے والی ہے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۱)

نبی اعظم و آخر ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروا نہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے کہ ساری خیر اور مصلحت اس حکم کی تعمیل میں ہے اس کے بعد حکمت اور مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیل ارشاد کرنی چاہئے اللہ اس کیلئے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے وہ راہنمائی کیلئے بھی کافی ہے اور مدد کیلئے بھی اور وہی اس امر کا ضامن بھی ہے کہ اس کی راہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائج بد سے دوچار

نہ ہو۔ یعنی جو نتائج اس کے نکلیں وہ کبھی ان کو اپنے حق میں برا خیال کرے۔ اگرچہ سارا زمانہ ان کو برا کہے۔ اس لئے کہ علیم کل وہ ہے نہ کہ کوئی اور بندہ۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! ان کفار و منافقین سے کبھی نہ دبو اور نہ ان کی کوئی پروا کرو اور نہ ان کی اذیت کا خیال رکھو' اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ ہی اس کیلئے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے۔" وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (الاحزاب ۳۳ : ۴۸)

راتوں کو چھپ چھپ کر مشورے کرنے والے اللہ سے پوشیدہ نہیں ہیں

۱۸۱ راتوں کو مشورے کرنے کا رواج بہت پرانا ہے اور خصوصاً ایسی مجلسیں جن میں مخالفت کا عنصر غالب ہو رات کو جمائی جاتی ہیں تاکہ سرغنے سر جوڑ کر بیٹھ سکیں اور اپنی اپنی سکیمیں اور داؤ پیچ' ان کے طریقے اور پھر نتائج پر سیر حاصل بحث کر سکیں اور اس طرح جو قدم اٹھائیں وہ پیچھے نہ ہٹا سکیں۔ اگر خاندان کا مسئلہ ہے تو پورے خاندان کے سربراہان جمع ہوں گے اگر پارٹی کا مسئلہ ہے تو پوری پارٹی کے سرغنے جمع ہوں گے اس طرح اگر کسی مکتب فکر کا معاملہ ہے تو مکتب فکر کے راہنما مل بیٹھیں گے روایات میں آتا ہے کہ اس معاملہ کا پورا حال کھل جانے کے بعد بنی ابیرق نے مشورہ کر کے نام کے مسلمان بشر کی حمایت کرنے کا عزم کیا اور یہودی کی مخالفت محض اس کے یہودی ہونے کی وجہ سے کی گئی۔ فرمایا یہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ اپنے ہی جیسے آدمیوں سے تو شرماتے ہیں اس لئے چوری چھپاتے ہیں کہ ہمارے آدمی کی بدنامی ہوگی تو اس طرح پورے خاندان کی بدنامی ہے حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ سے شرمانے کا زیادہ حق تھا کیونکہ وہ تو دلوں کے راز جانتا ہے تو کیا ان کا آدمی جب چوری کا کرتوت کر رہا تھا وہ اس کو جان سکا؟ چاہئے تو یہ تھا کہ جب حق واضح ہوگیا تھا اس کو بسر و چشم قبول کرتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کر کے اس کے ازالہ کی کوشش کرتے لیکن ان کو خاندان کی عزت یاد آگئی اور پھر اللہ کے ہاں ان کی عزت و ناموس کا کون محافظ ہوگا جہاں کوئی راز بھی پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس طرح کی سرگوشیوں کا ذکر قرآن کریم نے کئی ایک مقامات پر کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو تنبیہہ رہے اور وہ حق و باطل میں امتیاز کریں لیکن افسوس کہ آج ان ساری ہدایت سے مسلمانوں نے منہ پھیر لیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو۔ یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ پھر خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے' اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" (المجادلۃ ۵۸ : ۷)

خیال رہے کہ یہ معیت درحقیقت اللہ جل شانہ کے علیم و خبیر اور سمیع و بصیر اور قادر مطلق ہونے کے

هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا

دیکھو تم وہ لوگ ہو کہ دنیا کی زندگانی میں تم نے ان کی طرف سے جھگڑا کر لیا لیکن قیامت کے دن ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ کون جھگڑے گا؟ یا کون ہے جو ان کا وکیل بنے؟ ۱۰۹ ۱۸۲

اور جو شخص کوئی برائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اللہ

طور پر ہے کہ ان کی سرگوشیوں کو وہ جانتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔ اس طرح بیان فرما کہ لوگوں کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی محفوظ مقامات پر خفیہ مشورہ کر رہے ہوں ان کی بات دنیا بھر سے چھپ سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپ سکتی اور وہ دنیا کی طاقت کی گرفت سے بچ سکتے ہیں کیونکہ اس سے بچنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔ اس مضمون پر ان لوگوں کو بھی غور کرنا لازم ہے جو جھوم جھوم کر اور گا گا کر پڑھتے ہیں ؎

جو پکڑے خدا چھڑائے محمدؐ محمدؐ کے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

حالانکہ مسلمانوں کو اس بات کی خاص ہدایت دی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اس طریقہ سے مت بلاؤ جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً تمہارے اعمال ضبط کر لئے جانے کا خطرہ اس میں موجود ہے لیکن ناسمجھوں نے ضد میں اپنے اعمال کی بربادی کا حکم بھی یاد نہ رکھا۔ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ ان سرگوشیوں سے باز آجاؤ اس میں تمہارا بہت بڑا نقصان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ :

"کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا "نُهُوا عَنِ النَّجْوٰى" پھر بھی وہ وہی حرکت کئے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول اللہ (ﷺ) کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں۔" (المجادلہ ۵۸ : ۸) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے بھی آپ ﷺ نے ان لوگوں کو اس حرکت سے باز رہنے کی ہدایت کی تھی لیکن آپ ﷺ کے دعویٰ رسالت کو مان لینے کا مطلب کیا نکلا؟ اور اس طرح مان لینے اور نہ ماننے میں کیا فرق رہا؟ نہ مان کر کافر تھے اور مان کر منافق ٹھہرے اور اس طرح جو نام کا فرق ہوا وہ بھی ان کے حق میں کوئی اچھا نہ ٹھہرا کیونکہ منافق کا انجام کافر سے بدتر ہے۔ اللہ معاف فرمائے اور سمجھ کی توفیق دے۔

پارٹی کا ساتھ دینے والوں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ آخرت میں یہ جھگڑا کون کرے گا؟

۱۸۲ حمایتیوں کے حمایتی ساتھ ملتے جاتے ہیں اور اس طرح پارٹی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی

ہے لیکن آخر کب تک؟ یہ پارٹی کب تک رہے گی اور پارٹی بازی کب تک؟ اس لئے یہ تنبیہہ کی گئی ہے کہ دنیا میں تو تم نے ان کی حمایت کر لی مگر معاملہ یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گا۔ قیامت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں معاملہ پیش ہوگا تو وہاں کون حمایت کرے گا۔ اس آیت میں ان لوگوں کو ملامت بھی کی گئی ہے جو حق و باطل کی تمیز کئے بغیر اپنی پارٹی' خاندان اور مکتبہ فکر کی حمایت کرتے ہیں اور آخرت کا خوف دلا کر ان کے فعل سے توبہ اور رجوع کی ترغیب بھی دی۔ اس جگہ آگے بڑھنے سے پہلے ایک بار پھر غور کر لو کہ جب مضمون شروع کیا تھا تو ارشاد فرمایا تھا ولا تجادل جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اس حساس مضمون کو بیان کرنے کا یہ الٰہی پیرایہ ہے کہ وہ اپنے رسول کو مخاطب کر کے امت کے لوگوں کو بات پہنچانا چاہتا ہے اور اس میں حساس پہلو یہ ہے کہ انسان جتنا کم علم ہوگا اتنا ہی تھوڑ دلا ہوگا اور جھگڑنے کیلئے کوئی نہ کوئی خواہ مخواہ راستہ بنا لے گا اور جتنا آدمی سلجھا ہوا علم رکھنے والا ہوگا اتنا ہی وہ حوصلہ مند اور جھگڑے سے دور رہے گا۔ ان علم کے کوروں اور تھوڑ دلوں کو مخاطب کرنے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کیا گیا اور جب بات آگے چل نکلی اور دلائل شروع ہوگئے بات سننے سنانے لگے تو براہ راست ان کو مخاطب کر لیا چنانچہ ارشاد فرمایا کہ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ "تم نے ان کی طرف سے جھگڑا کر لیا" جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں بھی دراصل خطاب انہی لوگوں سے تھا لیکن ابھی بات شروع ہو رہی تھی اس لئے بات کرتے ہی ان کو مخاطب نہیں فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات سننے کو تیار ہی نہ ہوں اور پہلے ہی منہ پھیر کر بیٹھ رہیں۔ تبلیغ کا یہ انداز بہت میٹھا اور بہت پیارا ہے لیکن کاش کہ ہمارے علمائے کرام بھی اس بات کو سمجھتے کہ چلو مخالفت ہی سہی نظریات میں فرق ہی سہی لیکن بات کا انداز تو درست رکھو کہ کوئی آدمی بات سننے کیلئے تیار ہو جائے گفتگو کرنے کے بھی آخر کچھ آداب ہوتے ہیں اور وہ آداب محمد رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمائے ہیں۔ بات کو نرم انداز میں پیش کرنا اور تفہیم کا طریقہ عام فہم رکھنا مخاطبین کی ذہنی و دماغی حیثیتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر بات کرنا تاکہ سامع کے دل و دماغ تک بات پہنچ جائے نہایت ضروری ہے۔ آستینیں چڑھانے' تُو تُو مَیں مَیں کرنے اور ایک دوسرے پر الزام تراشیوں سے بات سمجھ میں آنے کی بجائے مزید الجھ جائے گی اور تبلیغ کا مقصد فوت ہو جائے گا جس کا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے کہ اگر بات کسی وجہ سے قبول نہ بھی کی تو کم از کم نفرت تو نہ بڑھے۔ لیکن ہمارے پاس کافر' مشرک' گستاخ رسول' نجدی' وہابی جیسے خطابات کے سوا کچھ رکھا ہی نہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کفر کی ایک نہ ایک مہر موجود ہے قریب ہوتے ہی اس طرح لگا دیں گے کہ گویا پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ کاش کہ آج ہم بھی قرآن کریم کو پڑھتے اور اس کی ہدایات پر غور و فکر کرتے۔ افسوس کہ ہمیں تو صرف الفاظ قرآن پڑھنے تک محدود کر دیا گیا ہمارا ہر وہ آدمی قرآن خواں ہے جو قرآن کریم کے الفاظ کی ادائیگی اپنے اپنے فکری لہجے کے مطابق کر سکتا ہے۔ ترجمہ' مفہوم اور مطلب تو اس سے ہمیں کوئی غرض ہی نہیں رہی بلکہ اس کیلئے ہمیں سمجھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنا تو اللہ کے

أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱۱﴾

سے بخشش طلب کرتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحمت رکھنے والا پائے گا۔ ۱۱۰

اور جو کوئی برائی کماتا ہے تو وہ اپنی جان ہی کیلئے کماتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۱۱

"لنگ" کو ہاتھ ڈالنا ہے اور "لنگ" ہماری زبان میں عزت کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا کون ہوتا ہے سب کو معلوم ہے۔

اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر بیٹھنے والوں کیلئے ہدایت الٰہی

۱۸۳ فرمایا دن کا روٹھا اگر شام کو واپس آجائے تو اس کے روٹھنے کی سزا جو اس کو مل گئی وہی کافی ہے اب اس کو شرمسار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' کیوں؟ اس لئے کہ اس سے فائدہ کی بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ ضد بڑھے گی جس میں بار بار روٹھنے اور پھر بالکل روٹھ ہی جانے کا خطرہ موجود ہے۔ لہٰذا تم خاموش ہو جاؤ تو خود ہی گیا تھا خود ہی آگیا اس طرح اس نے نقصان کس کا کیا؟ اپنا نقصان کرنے والے کو اگر یہ احساس ہوگیا کہ میں نے نقصان کیا تو یہ احساس ہی اس کیلئے کافی ہے۔ فرمایا "جو شخص کوئی برائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اللہ سے بخشش طلب کرتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحمت رکھنے والا پائے گا۔"

برائی کرنے والا ہمیشہ اپنا نقصان کرتا ہے کیونکہ یقیناً وہ اس کے نتیجے سے دوچار ہوگا

۱۸۴ برے کو برا کہہ کہہ کر برا بنا دینا کوئی عقلمندی نہیں۔ ہاں! برائی کے انجام سے آگاہ کرنا اس کیلئے مفید ہو سکتا ہے اور آگاہی گالی' گلوچ برا بھلا کہنے سے نہیں ہوتی بلکہ اس طرح جو پشیمانی اس کو ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ "جو کوئی برائی کماتا ہے تو وہ اپنی جان ہی کیلئے کماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔" گنہگار ایک لحاظ سے مریض ہے اور مریض کا علاج مناسب ہے نہ کہ اس سے یہ بحث کہ تم مریض کیوں ہوئے؟ نہیں بلکہ اس کو مرض کا سبب بتاؤ اس کا ازالہ کرو' اس کو احساس دلاؤ' مرض کے بڑھتے بڑھتے کیا سے کیا ہو جانے کا خوف اس کو دلاؤ ایسا علاج کرو کہ اس کا مرض دور ہو جائے یکدم نہیں تو آہستہ آہستہ ہی سہی۔ ہو سکتا ہے تو مرض کے بڑھنے کو روکو تاکہ مرض مزید آگے نہ بڑھے۔ اس طرح

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ
بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ

اور جس کسی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے یا کسی گناہ کا مرتکب ہو اور پھر اسے کسی بے
گناہ کے سر تھوپ دے تو اس نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لیا۔ ۱۱۲

اور اے پیغمبر اسلام! اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو واقعہ یہ

قابو پاؤ اور علاج وہ تجویز کرو جو سستا اور عام ہو اگر تم حاذق ہو تو یہ بات کبھی نہ بھولو۔
برائی کرنے والے نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا جو کچھ اس نے بگاڑا وہ اپنا ہی بگاڑا پھر اپنا بگاڑنے والے کو جری نہ کرو کہ تمہارے سامنے اکڑ جائے کہ جو کچھ بگڑا ہے وہ میرا پھر تم کو کیا؟ اس لئے کہ اگر وہ بگڑ گیا تو اپنا نقصان تو وہ کر ہی چکا ہے تمہارا بھی کر گزرے گا۔

بہتان کیا ہے؟ خود گناہ کرنا اور دوسرے کے ذمہ لگا دینا

۱۸۵ اس آیت میں انسانی زندگی کیلئے بہت بڑی راہنمائی رکھی گئی ہے اگر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرلے فرمایا یہ ضابطہ الٰہی ہے کہ جو شخص خود کوئی جرم کرے اور پھر یہ اپنا جرم کسی بے قصور انسان کے ذمے لگا دے جیسے اس گزشتہ واقعہ میں ہوا کہ چوری بنو ابیرق کے ایک آدمی نے کی اور الزام لبید یا اس یہودی پر لگا دیا' فرمایا جس کسی نے بھی ایسا کیا تو سمجھ لو کہ اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لاد لیا۔ بہتان کیا ہے؟ یہ آیت بہتان کی تعریف متعین کر رہی ہے یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو یا جو قصور کسی آدمی نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا ایک بار الفاظ پر پھر دوبارہ نظر ڈال لو تاکہ اچھی طرح مفہوم ذہن نشین ہو جائے پھر نبی اعظم و آخر ﷺ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ غیبت کیا ہے؟ فرمایا ذکرک اخاک بما یکرہ "تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو" عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا
ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتہ "اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تُو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔" اس لئے یہ فعل ایک اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ بھی ہمارے اس خیال سے یقیناً متفق ہوں گے کیونکہ بہتان غیبت سے بھی ایک بڑا اور نہایت ہی

خطرناک جرم ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس بہتان جیسا بڑا جرم سیدنا یوسف علیہ السلام پر کس طرح لگا دیا گیا اور اس کی نفی کیوں نہ کی گئی کہ یوسف علیہ السلام جو اللہ کا ایک برگزیدہ نبی ہے اس جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا پھر ہمیں اس افسوس پر مزید افسوس ہے کہ اس بہتان کی نسبت براہ راست اللہ کی طرف کر دی گئی کہ یہ بہتان یوسف علیہ السلام کو اللہ نے سکھایا تھا۔ اس طرح گویا جو اللہ کے رسول پر "بہتان" کی تہمت رکھی گئی تھی اس میں اللہ کو بھی بڑی خوبصورتی سے شریک کر دیا گیا۔ چنانچہ سورہ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

یوسف علیہ السلام پر بہتان کا الزام عظیم غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟

"جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو تم لوگ چور ہو۔" بھائی کے سامان میں پیالہ کس نے رکھا؟ یوسف علیہ السلام نے چوری کا الزام کس پر آیا؟ کنعانی قافلہ کے لوگوں پر جو دراصل یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے۔ انجام کار پیالہ کہاں سے نکلا؟ جہاں رکھا گیا تھا کہاں رکھا گیا تھا؟ بنیامین کے سامان میں۔ کس نے رکھا تھا؟ یوسف علیہ السلام نے۔ جب چوری کا الزام ان پر آیا تو یوسف علیہ السلام کو اس الزام کی خبر ملی یا نہیں؟ ملی۔ پھر یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ پیمانہ میں نے رکھا تھا؟ نہیں، بہتان کس کو کہتے ہیں۔

بھائیوں نے اپیل کی کہ "اے سردار ذی اقتدار اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ہم آپ علیہ السلام کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے کہا اللہ کی پناہ! ہم دوسرے کسی شخص کو کیسے رکھ سکتے ہیں جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر اگر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے۔" بنیامین کے سامان میں پیمانہ رکھ کر، اس پر چوری کا الزام لگا کر، کنعانیوں کے قانون کے مطابق اس کو مصر روک کر تو وہ اللہ کے نبی رہے لیکن اگر ان کنعانیوں کی اپیل پر ان میں سے کسی کو روک کر اگر بنیامین کو چھوڑ دیں تو ظالم ہو جائیں۔ سبحان اللہ ہذا بہتان عظیم۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی یعنی یوسف علیہ السلام کو بنیامین کے سامان میں پیمانہ رکھنے کی تدبیر ہم نے یعنی اللہ ہی نے سکھائی تھی۔ یعنی پہلے تو اللہ کے رسول یوسف علیہ السلام کا اپنا فعل تھا اب وہ اللہ کی "تدبیر" کی وجہ سے اللہ کا ہو گیا۔ یعنی وہی کام جو آپ یا میں کریں تو "بہتان" ہے لیکن رسول کرے اور اللہ کرائے تو وہ چونکہ قادر مطلق ہے اس لئے وہ ایک خوبصورت "تدبیر" ہو جاتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن۔

کس خوبصورتی کے ساتھ ایک گناہ گھڑا گیا اور گناہ بھی "بہتان" کا پھر اللہ اور رسول اللہ یوسف علیہ السلام کو اس کا مرتکب ٹھہرایا گیا پھر قادر مطلق کی آڑ میں اس کو پوشیدہ کر کے نہ معلوم اس سے کیا کیا ضرورتیں پوری کی گئیں۔ ایک ایک کر کے اگر پردہ اٹھایا گیا تو اس کے نیچے سے معلوم نہیں کون کون نکل آئے

گا لیکن ہم پورے عزم سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ نے کبھی اپنے کسی رسول کو اس طرح کی خفیہ تدبیریں نہیں بتائیں جو عوام کالانعام کیلئے تو "گناہ" ہوں لیکن رسول ان کو کرے تو وہ عین اسلام ہو جائیں۔

اس ٹھوکر کا موجب کیا ہوا جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ جس کے معنی یہ کئے گئے کہ "اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا" کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ جو یوسف علیہ السلام نے رکھا تھا وہ تو "اَلسِّقَايَة" تھا اور جو گم ہوا وہ "صُوَاعَ الْمَلِكِ" تھا تو پھر "اَلسِّقَايَة" اور "صُوَاعَ الْمَلِكِ" ایک کیسے ہو گیا؟ اس کیلئے ایک کہانی گھڑنی پڑی کہ جس کے ساتھ غلہ ملا جاتا تھا وہ وہی تھا جس کے ساتھ بادشاہ سلامت پانی پیا کرتے تھے۔ کہاں ماپنے کا آلہ اور کہاں بادشاہ کے پانی پینے کا پیالہ غور کرو کہ کہاں کی اینٹ اور کہاں کا گارا جس سے تم نے یہ محل کھڑا کر دیا۔

دنیا میں اس کی کوئی ایک مثال؟ وہ تو بادشاہ وقت تھا کیا آپ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ پانی پیئیں اس کے ساتھ غلہ ماپیں۔ کیا پانی پینے کا پیالہ اور غلہ ماپنے کا آلہ برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک انسان کے پینے کا پیالہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے؟ اور وہ آلہ جس سے دنیا جہان کے انسانوں کو غلہ ماپ کر دینا ہے جس سے سینکڑوں ٹن روزانہ ملا جاتا ہے آخر ان کی آپس میں کوئی نسبت؟ تم اس کو مرصع کرنے لگے تو اس پر ہیرے اور جواہر جڑتے ہی چلے گئے۔ تم نے قیمت کا اندازہ شروع کیا تو دنیا و مافیہا کی قیمت سے اس کو بڑھا دیا اور ماپنے پر آئے تو اس سے ماپنا شروع کر دیا اور بادشاہ کو پانی دینے لگے تو تم کو وہی بادشاہ کا پیالہ نظر آنے لگا۔ چونکہ یہ ساری باتیں تمہارے خیال ہی خیال سے متعلق تھیں اس لئے تم کو جیسا خیال آیا تم اس کو بناتے چلے گئے اور پھر اتنے آگے بڑھے کہ کسی قاعدہ و کلیہ کے پابند نہ رہے۔

ایسا کیوں نہ ہوتا قاعدہ و کلیہ تو عقل و فکر چاہتا ہے اور تم نے تو پہلے ہی یہ بات کہہ دی ہے کہ دین کی باتوں اور دین کے کاموں میں عقل نہیں چلتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو تمہارے جی میں آئے تم کہہ سکو اور عقل و فکر سے بالکل کورے ہو کر کہو اس لئے دوسروں کو تلقین پہلے کر لو کہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ عقل کے احاطہ سے باہر ہے اس لئے تم عقل سے سمجھ کر مت مانو۔ بس جو ہم کہیں تم ہاں جی ہاں جی کہتے رہو۔ یاد رکھو کہ اگر تم نے زبان کھولی تو کافر ہو جاؤ گے کیونکہ مہر ہمارے پاس ہے تم آخر جاؤ گے کہاں؟ پھر اگر مہر لگ گئی تو دور ہی سے پہچان لئے جاؤ گے وہ "کافر" اور جب تمہاری پہچان ہو گئی تو پھر "دھر" لئے جاؤ گے اور کوئی تمہارا پرسان حال نہیں ہو گا۔

قرآن کریم کو اٹھاؤ اس سے پوچھو کہ "اَلسِّقَايَه" کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ "کیا تم نے ٹھہرا لیا کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور ان کیلئے سبیل لگا دینا کافی ہے۔ پانی پلانا یعنی خورد و نوش کا انتظام کرنا۔

قرآن کریم ہم کو کہتا ہے کہ جب کنعانیوں کا قافلہ دوسری بار آیا تھا جس میں بنیامین بھی شامل تھا تو یوسف علیہ السلام نے ان کو ٹھہرانے کا جو انتظام کیا تھا وہ کچھ اس طرح تھا کہ اس میں سب بھائی ایک جگہ اکٹھے

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ط وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک جماعت نے تو پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تمہیں غلط راستہ پر ڈال دیں ۱۸۶ یہ لوگ غلط راستہ پر نہیں ڈال رہے ہیں مگر خود اپنی جانوں کو' یہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں

نہ ٹھہرائے گئے اور اگر ٹھہرائے گئے تو بہرحال بنیامین ان کے ساتھ نہ ٹھہرایا گیا چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں : وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یوسف ۱۲ : ۶۹) "یہ لوگ یوسف کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ میں تیرا ہی بھائی ہوں جو کھو گیا تھا اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔"

اس فقرے میں وہ ساری داستان سمیٹ دی گئی جس میں بائیس تئیس سال گزر گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے مل کر جب سارے غم غلط کر لئے لیکن ابھی سب پر اظہار کر دینا خلاف مصلحت تھا اس میں بڑی حکمتیں ابھی پوشیدہ تھیں بہرحال جب ان کا سامان تیار کرایا تو آخری دعوت ان سب بھائیوں کی وہاں رکھ دی جہاں بنیامین کو ٹھہرایا گیا تھا جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ "یعنی ان کے خورد و نوش کا سارا انتظام اس جگہ کر دیا جہاں اپنے بھائی بنیامین کو ٹھہرا رکھا تھا "رحل"۔ بمعنی "شلیتہ" یا بوری یا خورجی نہیں بلکہ وہ مقام' ڈیرا اور جگہ ہے جہاں بنیامین کو رکھا گیا تھا اور اب اس کی نسبت اپنے بھائی کے ساتھ کر کے ساری داستان کا ماحصل بیان کر دیا "اَلسِّقَايَة" خورد و نوش کے خاص اہتمام کے لئے بولا گیا اور "رحل" اس مقام کو کہا گیا جہاں بنیامین کو ٹھہرایا گیا تھا اس لئے اس داستان کا اس میں کوئی ذکر موجود ہی نہ ہے جو دوستوں نے بنا لی۔ "رحل" کے معنی ٹھہرنے کی جگہ عام ہے جیسے اذان میں پکار پکار کر کہا گیا الا صلوا فی الرحال۔ الصلوٰۃ فی الرحال کیا بوریوں میں' شلیتوں میں اور خرجیوں میں نماز پڑھنا مراد ہے یا اپنے اپنے مقام پر پڑھنا مراد ہے جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں کہ رات اندھیری بھی ہے اور بارش و بادل کا عذر بھی ہے اس لئے ایک جگہ اکٹھے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اجازت دی گئی اور قانون صلوٰۃ میں اتنی نرمی کر دی کہ اپنے اپنے مقام پر ہی نماز ادا کر لو اور اس طرح ان کو اطلاع کر دی گئی جو آج بھی عند الضرورۃ دی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یوسف علیہ السلام نے اس پیمانہ کو نہیں رکھا تھا اور نہ ہی قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر ہے رہی یہ بات کہ وہ کیسے رکھا گیا؟ کس نے رکھا؟ ان کی اپیل کیوں نامنظور ہوئی؟ اور وہ کیا تدبیر تھی جو اللہ نے یوسف علیہ السلام کو سکھائی؟ تو ان ساری باتوں کا مع شے زائد اپنے وقت پر جواب آئے گا انشاء اللہ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا تھا کہ یوسف علیہ السلام کے ذمہ جو بہتان لگایا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کرنے کی سعی کی گئی وہ سارا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ قرآن کریم میں وہ بات نہیں تھی جو بنا کر گھڑ کر اس میں رکھ دی گئی اور اس طرح کی بیسیوں باتیں اور بھی ہیں جو اپنے اپنے مقامات پر بیان ہوتی آ رہی ہیں اور انشاء اللہ ہوتی رہیں گی۔

يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝۱۱۳

پہنچا سکتے کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کر دی ہے اور جو باتیں معلوم نہ تھیں وہ تمہیں سکھلا دی ہیں اور تم پر اس کا بہت ہی بڑا فضل ہے۔[۱۸۷] ۱۱۳

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع کہ آپ ﷺ کو راہ سے ہٹانے کی کوششوں میں وہ مصروف ہیں

۱۸۶ نبی اعظم و آخر ﷺ کو اطلاع اور آپ ﷺ کے توسط سے مسلمانوں کو تنبیہہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر خاص فضل و احسان ہے کہ تم ان منافقین کے شر سے محفوظ چلے آرہے ہو ورنہ ان کی ایک جماعت نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ وہ آپ ﷺ کو راہ راست سے ہٹا کر ہی دم لیں گے لیکن وہ ذات علیم و خبیر ہے جس نے آپ ﷺ کو ان کی ساری سازشوں سے محفوظ رکھا اور تمہیں کتاب و حکمت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے اس نے تم کو اس لغزش سے محفوظ رکھا ہے اس طرح مسلمانوں کو یہ تنبیہہ کر دی کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو راہ سے بے راہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں کیا وہ تم کو معاف کریں گے؟ پھر آپ ﷺ کا بچنا تو اس لئے بھی ہوا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن تم لوگوں کو تو یہ ایک تر لقمہ بنا سکتے ہیں اس لئے تم کو ان کی طرف سے ضرور چوکنا رہنا ہوگا اور پھر اس کی تدبیر بھی بتا دی کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب و حکمت کی جو نعمت تم کو ملی ہے اس کی سچے دل سے قدر کرو اور ان لوگوں کے چکموں کو قرآن کریم میں پڑھ کر یاد رکھو اور یہ جب بھی کوئی ایسا چکمہ دیں تو اس کو قبول نہ کرو بلکہ ان پر ثابت کر دو کہ ایک مسلم اللہ کی دی ہوئی روشنی سے دیکھتا ہے اور اس کی بصیرت و بصارت بہت تیز ہوتی ہے۔

یہ صیاد اپنے دام میں خود ہی پھنس کر رہ جائیں گے آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے

۱۸۷ فرمایا "یہ لوگ غلط راستہ پر نہیں ڈال رہے ہیں مگر اپنے آپ کو' یہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" یہ گویا اس حقیقت کا بیان ہے کہ راہ حق سے منحرف ہو کر چلنے والے اگر راہ حق پر چلنے والوں کو حق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر وہ اپنی ساری دانش فروشیوں کے باوجود صرف اور صرف اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں جادۂ حق پر سوار رہنے والوں کو وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو اور دیکھتے جاؤ کہ یہ خود تباہی کے کس کھڈ میں جا کر گرتے ہیں۔ اس لئے جو کنواں کھودتا ہے اس میں گرتا ہے۔ اب ذرا آیت ۱۰۵ سے ۱۱۳ تک کا مضمون بطور خلاصہ اپنی نظر میں رکھو اور اس سے راہنمائی حاصل کرتے رہو۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ

ان لوگوں کے پوشیدہ مشوروں میں سے اکثر مشورے بھلائی کے لئے نہیں ہوتے ہاں! جو کوئی خیرات کیلئے یا کسی نیک کام کیلئے حکم دے یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرا دینا چاہے اور جو کوئی اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اس طرح کے کام کرتا ہے تو ہم اسے بہت بڑا اجر عطا

ا۔ مسلمان قاضی کو چاہئے کہ ہر حال میں حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے' اس خیال سے کہ ایک فریق مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہے تو مسلمان فریق کی بھی طرفداری نہیں کرنی چاہئے۔

ب۔ ہمیشہ اللہ سے مدد طلب کرتا رہے کیونکہ قضاء کا معاملہ نہایت نازک ہے ایسا نہ ہو کہ طبیعت کے میلان سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے۔

ج۔ قاضی کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہئے جس سے کسی فریق کی وکالت کی بو آئے۔

د۔ مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ ہم مذہب ہونے کی وجہ سے یا اپنے خاندان و قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے کسی مجرم کی حمایت کریں اور سازش کر کے جتھا بندی کر لیں۔ دنیا کی نگاہیں نہ دیکھتی ہوں لیکن اللہ تو دیکھ رہا ہے کہ کون مجرم ہے' کون نہیں ہے؟

ہ۔ جو برائی کرتا ہے اس کی برائی اس پر ہے۔ پس یہ خیال مت کرو کہ یہ شخص ہمارا ہم مذہب' ہماری فکر کا' ہماری گروہ بندی کا ہے یا ہمارا رشتہ دار ہے۔ اس کا جرم ثابت ہو گیا تو ہم بھی اس کی زد میں آئیں گے اور لوگوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنیں گے۔

و۔ خود قصد کرنا اور اسے دوسرے کے سر تھوپ دینا ایک معصیت کے بعد دوسری معصیت کا ارتکاب کرنا ہے۔ تم دنیا کی عدالت کو دھوکا دے دو لیکن عدالت الٰہی کو کیونکر دھوکا دے سکتے ہو؟

ز۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت آپ ﷺ کے شامل حال نہ ہوتی تو یہ لوگ تو آپ ﷺ کو غلطی میں مبتلا کرنے کیلئے کوشش کر چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی وحی نے آپ ﷺ کو جادۂ حق پر قائم رکھا جو کچھ اللہ نے آپ ﷺ پر نازل فرمایا اس کو اس سے پہلے آپ ﷺ نہیں جانتے تھے۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔

ح۔ آپ ﷺ کو جو کچھ عطا ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا کسی انسان کی طرف سے کچھ نہ تھا اس لئے آپ ﷺ کا علم دنیا کے دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں کامل اور حقیقی تھا ظنی نہیں تھا اور آپ ﷺ کے مقابلہ میں دنیا کے دوسرے انسانوں کے پاس جتنا علم تھا یا ہے سب ظنی ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگوں نے آپ ﷺ کے علم حقیقی کی کیا قدر کی کہ آج علوم ظنی کے پیچھے اندھے ہوئے پھرتے ہیں لیکن علم حقیقی جو کائنات

فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا

فرمائیں گے۔ ۱۱۴

اور جس شخص پر "الھدیٰ" کھل جائے اور اس پر بھی وہ اللہ کے رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے تو ہم اسے اس طرف کو لے جائیں گے جس

کے نظام کے عین مطابق ہے اس کو چھو کر بھی نہ دیکھا۔

پوشیدہ مشورے کرنے والوں کے مشوروں میں بھلائی کم ہی ہوا کرتی ہے

۱۸۸ نجویٰ دراصل نجاۃ ہی سے ہے اور یہ خفیہ طور پر مشورہ کرنے کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ نجویٰ فی نفسہ بری چیز نہیں۔ وہ مذموم کیوں ہے؟ ہر نجویٰ مذموم بھی نہیں ہاں! منافقین جب کوئی خفیہ مشورہ کریں گے تو خود وہ ان کے مزاج کے باعث برا ہوگا کیونکہ ان کی باتوں میں اکثر خیر نہیں ہوتی جب وہ کوئی سوچ سوچیں گے کوئی مشورہ کریں گے تو اس میں بھلائی کیونکر ہوگی؟ اور ایسا مشورہ مسلمانوں اور خصوصاً آپ ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ ہی سے چھپ کر آخر کیسے ہوگا؟ کیا وہ لوگ آپ ﷺ سے زیادہ زیرک ہیں کہ آپ ﷺ سے پوشیدہ کوئی بات کریں گے۔ اس لئے فرمایا ان کے مشوروں میں خیر کم ہی ہوتی ہے مگر ہاں! جو وہ بات صدقہ و خیرات کی کریں کیونکہ کبھی جھوٹ کو چھپانے کیلئے سچ بھی بولنا پڑتا ہے لیکن یہ اسلام کا کمال ہے کہ وہ ہر اس بات کو سچ ماننے کیلئے تیار ہے جو فی الحقیقت سچ ہو ہاں وہ کہے گا تو یہ کہے گا کہ ان لوگوں نے بات تو سچی کہی ہے لیکن سچ بولنے میں بھی کسی داؤ پر ہیں اور وہ داؤ ان کا کبھی ظاہر بھی کر دیتا ہے اور کبھی یہ کہتا ہے کہ بات تو انہوں نے سچ کہی ہے لیکن ہیں وہ جھوٹے کیونکہ انہوں نے یہ سچ محض جھوٹ کو چھپانے کیلئے بولا ہے۔ بات ہو رہی تھی کہ نجوی بذاتہ بری چیز نہیں ہے کیوں؟ اس لئے کہ اگر وہ بری چیز ہوتی تو اسلام مسلمانوں کو اس سے منع فرما دیتا حالانکہ اس نے فی نفسہ نجویٰ سے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی باتیں نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور تم کو حشر میں پیش ہونا ہے۔" (المجادلہ ۵۸ : ۹)

فرمایا کہ یاد رکھو کہ برا "نجویٰ" وہ ہے جو شیطان سے ہو کیونکہ شیطان کے ہاں خیر نام کی شے ہی نہیں تو اس میں خیر کیونکر ہوگی؟ چنانچہ ارشاد فرمایا :

تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ

طرف کو جانا اس نے پسند کیا ہے اور اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے اور یہ پہنچنے کی کیا ہی بری جگہ ہے۔ ۱۱۵ اللہ یہ بات بخشنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا

"مسلمانوں سے چھپ کر سرگوشیاں تو شیطان کا کام ہے کیونکہ وہ کانا پھوسی کا عادی ہے اور وہ اس سے باز کیوں کر آسکتا ہے اور وہ کانا پھوسی جو کرتا ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ وہ ان کو رنجیدہ خاطر کرنا چاہتا ہے حالانکہ بے اذن الٰہی وہ کسی کا بھی کچھ نہیں کر سکتا اور مومن تو ہوتے ہی وہ ہیں جو ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھنے والے ہوں اور اللہ پر بھروسہ کرنے والا غلط بات کو دل میں جگہ دے ہی نہیں سکتا۔" (المجادلہ ۵۸ : ۱۰) فرمایا شیطان کے ساتھیوں کی بات تو اس طرح ہے کہ

"ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے نصیحت کی باتیں پے ہم آتی رہیں مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے ان کو جی لگا کر سنا ہو۔ وہ سنتے ہیں مگر اس طرح کہ گویا کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں اور دل ہیں کہ یک قلم غافل ہیں اور دیکھو ان ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہمارے ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں؟ پیغمبر نے فرمایا کہ آسمان و زمین میں جو بات بھی کہی جاتی ہے خواہ پوشیدہ کہی جائے یا اعلانیہ میرے پروردگار کو سب معلوم ہے وہ سننے والا جاننے والا ہے۔" (الانبیاء ۲۱ : ۲، ۳)

فرمایا "جو کوئی اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اس طرح کے کام کرتا ہے تو ہم اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔" اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا :

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو یہ تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے البتہ اگر تم صدقہ دینے کیلئے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا اگر تم ایسا نہ کرو یعنی نہ کر سکو تو اللہ نے تم کو معاف کر دیا، ہاں! تم نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔" (المجادلہ ۵۸ : ۱۲، ۱۳)

اس سے وقتی پابندی کا جواز بھی مل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مالدار اور غریب لوگوں کے درمیان یہ فرق ملحوظ رکھا جا سکتا ہے کہ مال والا اپنی وسعت مال کے مطابق جو خرچ کرے گا غریب لوگوں پر ضروری نہیں اس لئے کم آمدنی والوں کیلئے چھوٹ دی جائے اور مال والوں کو کوئی چھوٹ نہ دی جائے تو جائز ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اس کے برعکس سمجھ لیا گیا ہے اور ایسے قانون ملک میں نافذ ہیں کہ غریب آدمی پستا رہے اور مالدار عیش و آرام لیں اس لئے کہ آخر وہ مالدار ہیں؟

راہ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد جو گمراہی کی طرف بڑھیں تو ہمارا قانون ان کو نہیں روکتا

۸۹ے ایک واقعہ تو وہی ہے جو پیچھے گزر چکا کہ جب "بشیر" یا "اطعمہ" جو نام بھی اس کا تھا جو نام کا مسلمان تھا اور جس نے چوری کی تھی اور الزام ایک یہودی پر لگا دیا تھا جب نبی اعظم و آخر ﷺ نے فیصلہ اس کے خلاف صادر فرمایا تو وہ مدینہ سے بھاگ کر مشرکین مکہ سے جا ملا (ترمذی' حاکم اور ابن سعد) اس لئے ارشاد فرمایا گیا کہ "جس شخص پر دین حق کی راہ واضح ہو جائے اور پھر وہ دیدہ و دانستہ اس سے پھر جائے تو اس نے خود اپنی پسند سے سعادت کی راہ چھوڑ کر شقاوت کی راہ پسند کر لی اور جیسی کچھ راہ اس نے پسند کی ضروری ہے کہ ویسا ہی نتیجہ بھی اسے پیش آئے۔" اس لئے فرمایا کہ ہم اسے اس طرف لے جائیں گے جس طرف اس نے جانا پسند کیا یعنی ہم نے انسان کی سعادت و شقاوت کیلئے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا ہے کہ جو جیسی راہ پسند کرتا ہے ویسا ہی نتیجہ اسے پیش آتا ہے اور اس نتیجہ پر وہ پہنچا دیا جاتا ہے۔ جس نے جنت کی راہ اختیار کی اسے جنت میں داخل کیا جائے گا جس نے خود اپنے لئے دوزخ پسند کی یعنی دوزخیوں کے سے کام کئے اس کیلئے یقیناً دوزخ ہوگی۔ یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کر کے کوئی اس خوش فہمی میں ہو کہ وہ جنت میں چلا جائے گا تو یقیناً سوائے خوش فہمی کے اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا اور اسے وہ مار پڑے گی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے باغیوں کیلئے مقرر کر دی گئی ہے اور کوئی نہیں جو اس کو اس سے بچا لے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ :

"اے پیغمبر اسلام! اس گروہ میں سے جس نے زبان سے کہا کہ ہم ایمان لائے مگر اس کے دل مومن نہیں ہوئے' اسی گروہ میں سے جو یہودی ہوئے جو لوگ کفر کے شیوے میں تیز گام ہوئے تو ان کی حالت تمہیں غمگین نہ کرے' یہ لوگ جھوٹ کیلئے کان لگانے والے ہیں اور اس لئے کان لگانے والے ہیں کہ ایک دوسرے گروہ کو جو تمہارے پاس نہیں آیا خبریں پہنچائیں یہ تو رات کے کلموں کو باوجودیکہ ان کا صحیح محل ثابت ہو چکا ہے صحیح محل سے پھیر دیتے ہیں اور ان کا مطب کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں یہ لوگوں سے کہتے ہیں جو کچھ ہم نے تورات کا حکم بتلایا اگر یہی حکم دیا جائے تو قبول کر لو نہ دیا جائے تو اس سے اجتناب کرو اے پیغمبر اسلام! جن لوگوں کی شقاوت اس حد تک پہنچ چکی ہے وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں تم ان کے لئے بیکار کو غم نہ کھاؤ جس کسی کیلئے اللہ نے چاہا کہ آزمائش میں پڑے تو تم اس کیلئے اللہ سے کچھ نہیں پا سکتے یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کو پاک کرنا نہیں چاہتا' ان کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب موجود ہے۔" (المائدہ ۵ : ۴۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں نے تو اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے فریب دے کر اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھیں جو ہم نے بذریعہ وحی نازل کیا ہے اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اس کلام کی جگہ دوسری باتیں کہہ کر تو ہم پر افتراء پردازی کرے اور پھر اس سے خوش ہو کر یہ تجھے اپنا دوست بنا لیں اور اگر راہ حق میں ہم

يُشْرِكْ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۱۶ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ

جتنے گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے اور جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ
بھٹک کر سیدھے راستے سے بہت دور جا پڑا۔ ۱۱۶ یہ نہیں پکارتے مگر بیبیوں کو اور یہ نہیں

نے تجھے جما نہ دیا ہوتا تو ضرور ان کی طرف کچھ نہ کچھ میلان کر ہی بیٹھتا اور اس صورت میں ضرور ایسا ہوتا کہ ہم تجھے زندگی کا بھی دوہرا عذاب چکھاتے اور موت کا بھی اور پھر تجھے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ملتا۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۷۳، ۷۵)

یہ "سبیل المومنینؑ" کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عرف عام میں مومن کہلانے والے جو کرنا شروع کر دیں وہی "سبیل المومنین" ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور مہمل ہے اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دی ہوئی اور عطا کردہ راہ ہے وہی مومنوں کی راہ ہے یعنی "سبیل المومنین" ہے اور اس راہ سے جو بھٹک گیا وہ یقیناً بدنصیب ہوگیا کیونکہ اللہ کی رحمت و توفیق نے اس کی دستگیری چھوڑ دی اور اس طرح وہ شیطان کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا بن کر رہ گیا اور وہ جسے چاہتا ہے اسے تگنی کا ناچ نچاتا ہے۔

شرک پر مرنے والے کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا اس لئے وہ راہ ہدایت سے بہت دور نکل جاتا ہے

۱۹۰ یہی آیت اس سورہ النساء کی آیت ۴۸ بھی ہے اس لئے اس کی تشریح کیلئے آیت ۴۸ ملاحظہ کریں وہاں فرمایا تھا کہ "جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتا ہے۔" اور اس جگہ فرمایا "جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستے سے بہت دور جا پڑا۔" بات ایک ہی ہے لیکن وہاں ارشاد فرمایا تھا شرک بہت بڑا گناہ ہے جو قابل معافی نہیں ہے اور یہاں فرمایا کہ وہ قابل معافی اس لئے نہیں ہے کہ وہ یعنی مشرک گمراہی میں اس قدر دور نکل جاتا ہے کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔ گویا سرطان کا پھوڑا ہے جس کی جڑیں سارے جسم میں پھیل چکی ہیں اور اس کا انجام ہلاکت ہے آج ہوئی یا کل۔ اس کے باوجود اسلام نے اس کو قابل علاج سمجھا ہے اور ان کا علاج کیا ہے اور اللہ نے ان کو شفا بھی عطا کی ہے۔ جان لینا چاہئے کہ شرک قابل معافی نہیں لیکن کب؟ جب مشرک شرک پر مرگیا جب تک وہ زندہ ہے قابل علاج ہے یعنی اگر وہ شرک سے تائب ہو جائے اور توحید کو دل و جان سے تسلیم کر لے تو اس کی توبہ یقیناً قبول ہوگی۔ ہاں اس سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن گنہگار جو اپنے گناہوں سے توبہ کئے

وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ

پکارتے[191] ہیں مگر شیطان مردود[192] کو۔ ۱۱۷

اس پر اللہ لعنت[193] کر چکا ہے اور اس نے کہا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقررہ حصّہ

بغیر مرگیا اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو معاف فرمادے یہ اس کی رحمت و بخشش ہے اس لئے اس کی معافی کی امید کی جا سکتی ہے لیکن مشرک جب بغیر توبہ مرگیا تو اس کی بخشش کی کوئی امکانی صورت باقی نہ رہی کیوں؟ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اس کا اعلان عام ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا اور نہ ہونے دیتا ہے۔

مشرکین مکہ اللہ کے سوا جن کو اپنا حاجت روا جانتے تھے ان کو "اناث" کہتے تھے

۱۹۱ اناث کیا ہے؟ اناث انثی کی جمع ہے۔ یہ ارشاد اس لئے فرمایا کہ مشرکین مکہ جن ہستیوں کو اللہ کا شریک اور ساجھی ٹھہراتے تھے ان کے نام انہوں نے عورتوں ہی کے سے رکھے تھے جیسے لات' مناۃ اور عزیٰ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک بت تھا جسے وہ "انثی بن فلاں" کہتے تھے یعنی یہ فلاں قبیلہ کی دیوی ہے اور یہ گویا ان کی سفاہت و بے وقوفی کی نشانی تھی کہ وہ ان کو "اناث" کہتے تھے کیونکہ "اناث" میں قوت منفعلہ یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن کسی میں اثر کرنے کی قوت نہیں ہوتی اگرچہ علامہ بیضاوی کا یہ ارشاد اس وقت تو صحیح ہوگا جب وہ اس دنیا میں موجود تھے لیکن اگر وہ آج ہوتے تو شاید ایسا نہ کہتے کیونکہ اس وقت حالات بدل چکے ہیں اور "اناث" یعنی عورتوں میں اثر پیدا کرنے کی قوت موجود ہے جس کا زمانہ شاہد ہے۔ اس لئے ہم پہلی وجہ کو درست قرار دیتے ہیں لیکن دوسری کو نہیں۔ اور ہم اپنے خیال میں دوسری وجہ اس کی یہ قرار دیتے ہیں کہ مشرکین مکہ فرشتوں یعنی نیکی کی ان قوتوں کی پرستش بھی کرتے تھے جن کو وہ بزعم خویش "اناث" مانتے اور تسلیم کرتے تھے کیونکہ قرآن کریم نے جگہ جگہ ان کے اس شرک کو بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مشرکین مکہ "ملائکہ" کو اللہ کی "بیٹیاں" قرار دیتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے اس لئے کہ ان کے ہاں لڑکیوں کی عزت بنسبت لڑکوں کے زیادہ سمجھی جاتی تھی وہ اس طرح کہ اگر کسی آدمی کی لڑکی کسی دوسرے کے گھر کسی مقصد کیلئے چلی جاتی تو وہ اس مقصد کو پورا کرنا لازم و ضروری سمجھتے اور یہ کہتے کہ فلاں کی لڑکی ہمارے گھر آگئی اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کی بات نہ مانی جائے اور یہ بھی کہ اگر کسی شخص کے ہاں اس کی لڑکی کو لایا جائے تو وہ اپنی لڑکی کی بات مان لینے پر مجبور ہوتا کہ میری لڑکی کو وہ میرے گھر لے آئے اب ان کی بات رد نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس لڑکی کی بات رد نہیں ہوگی۔ پھر وہ فرشتوں کو اللہ کی لڑکیاں اس لئے قرار دیتے کہ اگر اللہ کے ہاں اللہ ہی کی لڑکیاں ہماری سفارش

کریں گی تو اللہ ان کی سفارش رد نہیں کرے گا۔ جب ایک انسان اپنی لڑکی کی سفارش کو رد نہیں کرتا تو اللہ اپنی لڑکیوں کی سفارش کیسے رد کرے گا؟ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ قرآن کریم میں ان کا یہ نظریہ بیان کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ تَسْمِیَۃَ الْاُنْثٰی وَمَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (النجم ۵۳ : ۲۷، ۲۸) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو عورتوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ میں ان کو کوئی علم حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور یہ اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، اس کیلئے پاکیزگی ہو، بھلا اللہ کیلئے بیٹیاں کیوں؟ پھر خود ان کیلئے کیا ہے؟ وہ جس کیلئے یہ بڑے خواہش مند ہیں یعنی بیٹے۔ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مارے رنج کے اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ غم میں ڈوب جاتا ہے گویا جس بات کی اسے خوشخبری دی گئی ہے وہ ایسی برائی کی بات ہوئی کہ وہ شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ ذلت قبول کر کے بیٹی کو لے رہے یا مٹی کے نیچے اس کو زندہ ہی گاڑ دے۔ افسوس ان پر کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔" (النحل ۱۶ : ۵۷ تا ۵۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو کیا یہ بات تم کو بھلی لگتی ہے کہ تمہارے رب کیلئے تو ہوں بیٹیاں اور ان کیلئے ہوں بیٹے۔ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے؟ اور یہ لوگ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب جان لو کہ یہ لوگ اپنی من گھڑت بات کہہ رہے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لئے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگا رہے ہو؟۔" (الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۴۹ تا ۱۵۲) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی؟ انہوں نے فرشتوں کو اللہ رحمٰن و رحیم کے خاص بندے ہیں عورتیں قرار دے لیا ہے۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی گئی ہے اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہوگی۔" (الزخرف ۴۳ : ۱۶ تا ۱۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟ کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کیلئے؟ یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہے! دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر

ں چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کیلئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ یقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔ الانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان جو کچھ چاہے اس کیلئے وہی حق ہے؟" (النجم ۵۳ : ۱۹ تا ۲۴)

غیر اللہ کو پکار کر وہ شیطان مردود کے تابع ہوگئے کیونکہ یہ فرمان اسی کا ہے

۱۹۲ یعنی مشرکین مکہ ہوں یا کوئی مشرک خواہ اس زمانہ کا یا اس زمانہ کا وہ یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ جس کو وہ پکارتا ہے اس کے پکارنے کا حکم اس پکارے جانے والے نے اس کو دیا۔ پھر وہ غیر اللہ کو کیوں پکارتا ہے؟ فرمایا اس لئے کہ شیطان ہی نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی۔ شیطان اور دل میں بات بٹھانے والا؟ ہاں ہاں بالکل اس لئے کہ اس طرح کے وساوس شیطان ہی ڈالا کرتا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ "وہ لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔" دل میں بات ڈالی جانے والی اگر اچھی اور نیکی کی ہے تو ہم اس کی نسبت اللہ کی طرف کریں گے اور بری ہے تو اس کی نسبت شیطان کی طرف۔ دل میں ڈالے جانے کا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ جو خیال واردہ بھی انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ اچھا ہوگا یا برا۔ اگر اچھا ہے تو "من اللّٰہ" ہے اور برا ہے تو "من الشیطان" ہے۔ غیر اللہ کی عبادت جب بھی ہوگی اور جس کی بھی ہوگی وہ دراصل شیطان ہی کی ہوگی؟ اس لئے کہ اس طرف راہنمائی کرنے والا شیطان ہی ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے کہ :

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (یاسین ۳۶ : ۶۰، ۶۱) "اے آدم زاد! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، صرف اور صرف میری ہی بندگی کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اس وقت کا ذکر کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! تو کیوں ایک چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے میرے ابو! میں سچ کہتا ہوں کہ علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی، پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر شیطان تو خدائے رحمٰن کا نافرمان ہو چکا۔ اے میرے ابو! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ کو عذاب آلگے اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے۔" (مریم ۱۹ : ۴۳ تا ۴۵)

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مشرکین مکہ اور دوسرے مشرک بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے اس کا رد قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ ہم اس سے پہلے کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ آج تک جب سے دنیا میں شرک پیدا ہوا کسی نے بھی بتوں کی پرستش نہیں کی۔ قبروں کی پرستش نہیں کی۔ پرستش ہمیشہ صاحب بت، صاحب قبر اور صاحب

درخت ہی کی کی گئی ہے۔ یہ لات' منات اور عزیٰ کیا تھے؟ انسان تھے' بدھ اور رام چندر کیا تھے؟ انسان تھے۔ علی ہجویری اور صابر کلیری کیا تھے؟ انسان تھے۔ مکہ والوں نے ان نیک انسانوں کے مرنے کے بعد ان کے بت تراشے تو یہ بت کیا ہوئے؟ ان نیک لوگوں کی یادگار کا ایک نشان تھے۔ بدھ اور رام چندر کے بت بھی ان کی یادگاری کا ایک نشان تھا اور بالکل اسی طرح یہ قبریں اور روضے بھی ان نیک لوگوں کی یادگاریں ہیں۔ پھر پرستش ان یادگاروں کی ہوئی؟ ہرگز نہیں پرستش ہمیشہ ان یادگار والوں کی ہوئی اور ان کی پرستش کچھ انسانوں کے وہم اور ظن و گمان کی پیداوار ہے ان لوگوں نے کبھی اپنی پرستش کا نہیں کہا بلکہ بعد میں آنے والوں نے ان کی عقیدت کی بناء پر ان کے بت' قبریں اور شبیہیں بنالیں اور جوں جوں زمانہ نے ترقی کی اب مقبرے اور تصویروں نے ان کی جگہ لے لی۔ اس طرح اس شرک کی جڑیں اتنی گہری چلی گئیں اور کچھ لوگوں نے اس قدر ان کی آبیاری کی کہ اب ان کا اکھاڑنا پچھلے زمانہ سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا۔

مختصر یہ کہ اس طرح کی ساری پرستش خواہ وہ کسی کی ہو نبی' ولی' پیر' مرشد اور فقیر یا کسی اوتار و گرو کی بہرحال اس کو شیطان ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ یہ صرف ہمارے رائے ہی نہیں بلکہ شروع سے اس کی تشریح اس طرح ہوتی آئی ہے آیئے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کریں کہ وہ اس سلسلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ کے معنی ہیں لَا تُطِيْعُوْهُ کہ اس کی اطاعت نہ کرو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو صرف سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی تابعداری کرنا بھی منع ہے اس لئے اس جگہ طاعت عبادت ہے۔" اس کے بعد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال اٹھایا ہے کہ اگر عبادت بمعنی اطاعت ہے تو کیا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ میں ہم کو رسول اور امراء کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ پھر اس کا جواب دیتے ہیں کہ ان کی اطاعت جب کہ اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اس کی اطاعت ہوگی۔ کیا دیکھتے نہیں کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو بطور قبلہ تسلیم کرتے ہوئے سجدہ کیا اور یہ سجدہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ تھی۔ امراء کی اطاعت ان کی عبادت صرف اس صورت میں ہوگی جب کہ ایسے معاملات میں ان کی اطاعت کی جائے جس میں اللہ نے ان کی اطاعت کا اذن نہیں دیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں اگر کوئی شخص تمہارے سامنے آئے اور تم کو کسی چیز کا حکم دے تو دیکھو کہ اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں؟ موافق نہ ہو تو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے اگر اس حالت میں تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے شیطان کی عبادت کی۔ اس طرح اگر تمہارا نفس تمہیں کسی کام کے کرنے پر اکسائے تو دیکھو کہ شرع کی رو سے وہ کام کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اجازت نہ ہو تو تمہارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ ہے۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم اس کی عبادت کے مرتکب ہوئے۔ پھر وہ فرماتے ہیں مگر شیطان کی عبادت کے مراتب مختلف ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضاء کے ساتھ اس کی زبان بھی اس کی موافقت کرتی ہے اور دل بھی اس میں شریک ہوتا

ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعضاء و جوارح سے تو آدمی ایک کام کرتا ہے مگر دل اور زبان اس کام میں شریک نہیں ہوتے۔ بعض لوگ ایک گناہ کا ارتکاب اس حال میں کرتے ہیں کہ دل ان کا اس پر راضی نہیں ہوتا اور زبان ان کی اللہ سے مغفرت کر رہی ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم یہ برا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض ظاہری اعضاء سے شیطان کی عبادت ہے۔ کچھ اور لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹھنڈے دل سے جرم کرتے ہیں اور زبان سے بھی اپنے اس فعل پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرتے ہیں..... یہ ظاہر و باطن دونوں میں شیطان کے عابد ہیں۔" (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۰۳، ۱۰۴) بلاشبہ اس وقت بھی دونوں قسم کے شیطان کے عابد موجود ہیں اگرچہ پہلی قسم سے دوسری قسم کے لوگ زیادہ ہیں۔"

شیطان ہی وہ جنس ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا جا چکا ہے

۱۹۳ اللہ کی رحمت سے دور ہو جانے کا نام اللہ کی لعنت کا مستحق قرار پانا ہے۔ شیطان کیا ہے؟ اس کے متعلق تفصیل عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ سے ۳۹ گیارہ آیات میں ذکر ہو چکی ہے آدم" فرشتہ اور ابلیس کی حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی وہاں سے ملاحظہ فرمائیں۔

شیطان لعنتی کیوں ہوا؟ رب کریم کی نافرمانی کے باعث۔ نافرمانی کی اور پھر ڈٹ گیا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح کیا۔ گویا نافرمانی کو اس نے حق سمجھا یہی وجہ تھی کہ وہ لعنت کا مستحق ٹھہرا جس سے اس بات کا ظاہر کرنا مقصود ہے کہ غلطی کا ہو جانا اتنا جرم نہیں جتنا کہ غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرنے کا جرم ہے اور پھر جب وہ غلطی اللہ کریم کے متعلق ہو تو اس غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرنا شرک کا مرتکب ہونا ہے اور مشرک کا شرک پر قائم رہنا اللہ کی رحمت سے دوری کا باعث ہے اور یہی کچھ شیطان نے کیا کہ وہ مستحق لعنت قرار پا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہوا "اور تیرے اوپر یوم الجزاء تک میری لعنت ہے۔ وہ بولا اے میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے اس وقت تک مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا اچھا تجھے اس روز تک کی مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔" (ص ۳۸ : ۷۸، ۷۹) معلوم ہوا کہ اللہ وہ بے نیاز طاقت ہے جو اپنے مخالفین کی صدائیں بھی اسی طرح سنتا ہے جس طرح اپنے فرمانبردار بندوں کی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس دنیوی زندگی میں یہ اس کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ آپ خود غور فرمائیں کہ شیطان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کوئی نافرمان؟ پھر اس نافرمان نے اللہ سے مہلت طلب کی اور مہلت اس کو دے دی گئی لیکن مشروط۔ وہ شرط کیا تھی؟ فرمایا "تجھے اس روز تک مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔" یعنی اس دنیا کے قائم رہنے تک۔ اللہ کو چھوڑ کر غیروں کو پکارنے والوں کو اس سے درس عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ کیا وہ شیطان سے بھی گئے گزرے ہیں؟

مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُ

۱۹۴ لے کر رہوں گا۔ ۱۱۸

اور ضرور انہیں بہکاؤں گا اور ضرور ایسا کروں گا آرزوؤں میں انہیں مشغول رکھوں اور

شیطان کا عزم و ارادہ اور اس کی تکمیل کے طریقوں کا اعلان

۱۹۴ مہلت مل جانے کے بعد وہ اللہ کے مقابلے میں اتر آیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کو یقین تھا کہ اللہ ایسا نہیں جو اپنا کیا ہوا وعدہ منسوخ کر دے اس لئے اس نے اللہ کی مخالفت کا اعلان کر دیا اور بڑے دھڑلے سے کہا کہ "تیرے بندوں سے ایک مقررہ حصہ لے کر رہوں گا۔" اس ایک فقرہ سے شیطان کے بندوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ شیطان شیطان ہونے کے باوجود جو سارے بندوں کو اللہ ہی کے بندے قرار دیتا ہے۔ لیکن کچھ بندے ایسے ہیں جو باوجود اللہ کے بندہ ہونے کے پھر غیروں کے بندے بننے کا شوق رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف غیروں کا بندہ ہی نہیں بلکہ غیروں کے "کتے" بننا پسند کرتے ہیں اور اس طرح وہ شیطان سے بھی بہت آگے نکل چکے ہیں یعنی گرو ایک "چھیل ہے تو چیلے ڈھائی چھیل ہیں۔"

غور کرو کہ شیطان کا عزم و ارادہ کیا تھا؟ یہی کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقررہ حصہ لے کر رہوں گا۔" قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے اس نے اس بات کی تصدیق فرمائی کہ کتنے لوگ ہیں کہ ان کے مقابلے میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اس کی یعنی شیطان کی پیروی کی' بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا۔" (سبا ۳۴ : ۲۰)

شیطان کے مقررہ حصہ کے بندوں کے اوصاف' تاکہ تم پہچان کر سکو

پھر شیطان کے اس مقررہ حصے کے لوگوں کے اوصاف بھی قرآن کریم نے جگہ جگہ بیان فرما دیئے تاکہ رحمٰن کے بندوں اور شیطان کے حصہ کے بندوں کا سب کو پتہ چل جائے اور وہ دور ہی سے پہچان لئے جائیں کہ یہ رحمٰن کے بندے ہیں اور یہ شیطان کے حصے کے بندے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا :

"اور دیکھو جو کچھ اللہ نے کھیتی اور مویشی میں پیدا کیا ہے اس میں سے ایک حصہ یہ اپنے زعم باطل کے مطابق اللہ کیلئے ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کیلئے ہے اور ایک حصہ ان کیلئے ٹھہراتے ہیں جنہیں انھوں نے اللہ کا ساجھی بنا رکھا ہے۔ پس جو کچھ ان کے ٹھہرائے ہوئے ساجھیوں کیلئے ہے وہ تو کسی صورت میں بھی اللہ کی طرف نہیں جا سکتا لیکن جو کچھ اللہ کیلئے ہے وہ ان کے ٹھہرائے ہوئے ساجھیوں کی طرف جا سکتا ہے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں؟ اور دیکھو اسی طرح بہت سے مشرک ہیں کہ ان کے ٹھہرائے ہوئے ساجھیوں نے ان کی نظروں میں قتل اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو بھی خوشنما کر دکھایا ہے تاکہ انہیں ہلاکت میں

ڈالیں اور ان کے دین کی راہ ان پر مشتبہ کر دیں۔ اے پیغمبر اسلام! اگر اللہ چاہتا تو یہ کام وہ نہ کرتے یعنی ان کی طاقت وہ سلب کر لیتا لیکن اس کی حکمت کا فیصلہ ان کو مجبور کر دینا نہ تھا اس لئے اس نے ایسا نہ کیا۔ پس آپ ﷺ بھی انہیں اور ان کی افترا پردازیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو' اس لئے کہ وہ آپ ﷺ کا کہا ماننے والے نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کھیت اور چارپائے ممنوع ہیں انہیں اس آدمی کے سوا کوئی نہیں کھا سکتا جسے ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں یعنی جس خانقاہ اور بزرگ کی وہ منت ہے وہ وہیں جائے گی' دوسرے کیلئے جائز نہیں اور اس طرح کچھ جانور ہیں کہ ان کی پیٹھ حرام ہے یعنی ان پر سوار ہونا ناجائز ہے جیسا کہ یہ حسین کے نام کا دلدل ہے یہ ٹانگے میں نہیں لگایا جا سکتا اور کچھ جانور ایسے بھی ہیں کہ ان پر اللہ کا نام نہیں لیتے بلکہ وہ کسی خاص بزرگ و پیر کے نام سے منسوب ہیں حالانکہ اس طرح اللہ پر افترا کر کے انہوں نے یہ طریقہ نکال لیا ہے سو جیسی کچھ یہ افتراء پردازیاں کرتے ہیں' قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی سزا دے۔" (الانعام ۶ : ۱۳۶' ۱۳۸)

اپنے زمانہ کے لوگوں کی اکثریت کے راہ و رسم کا مطالعہ کرتے جاؤ اور قرآن کریم کی اس دی ہوئی ہدایت پر رکھ کر دیکھتے چلے جاؤ تمہیں ایک ایک بات کی سمجھ آجائے گی کہ یہ بندے خالصتہ" اللہ کے ہیں اور وہ اللہ ہی کا رہنا پسند کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بندے ہونے کے باوجود غیر اللہ کے بندے بن کر رہ گئے ہیں اور یہ وہی ہیں جو شیطان کے "حصے کیلئے مقرر ہیں۔" اور ان کو اللہ کے بندے بن کر رہنا کسی حال میں بھی گوارا نہیں۔

قرآن کریم نے ان کے اوصاف کی بڑی وضاحت فرمائی اور جگہ جگہ ان کا ذکر کر کے پوری وضاحت کے ساتھ ان کے اوصاف کو بیان کر دیا فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے انعامات سے فائدہ حاصل کرنے کے باوجود حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتے بلکہ یہ جانوروں کی طرح کھاتے ہیں جن کو اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔" (محمد ۴۷ : ۱۲) "یہ انسان کاہے کے ہیں بلکہ وہ تو چارپائے ہیں نہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔" (الفرقان ۲۵ : ۴۴) یہ تو چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بالکل غافل ہو چکے ہیں۔" (الاعراف : ۱۷۹) "دنیا میں ہر چلنے پھرنے والوں میں برے ہیں اللہ کے نزدیک۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بہرے اور گونگے ہو کر رہ گئے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔" (الانفال ۸ : ۲۲) "اللہ کے نزدیک برے چلنے پھرنے والوں میں سے وہ لوگ ہیں جو منکر ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔" (الانفال ۸ : ۵۵) "ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے گدھا کہ اس پر کتابیں لادی جائیں تو سوائے ایک بوجھ کے وہ کیا محسوس کرے گا اور کیا فرق ہوگا اس کیلئے کتابوں اور پتھر میں یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو اللہ کی آیات پر صحیح معنوں میں ایمان نہیں لاتے حالانکہ وہ ان آیات کو پڑھتے بھی ہیں۔" (الجمعہ ۶۲ : ۵)

"اس بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کو اللہ نے نہیں ٹھہرایا اور نہ ہی کوئی اس طرح کا حکم دیا کہ تم ان کے

مِنْهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ

ضرور انہیں حکم دوں گا پس وہ جانوروں کے کان ضرور ہی چیریں گے[۱۹۵] اور میں انہیں حکم دوں گا

نام اس طرح رکھ لو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور پھر اس جھوٹ سے باز آنے والے بھی نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس جھوٹ کو جھوٹ نہیں سمجھتے بلکہ اللہ کے ذمہ لگاتے ہیں کہ انہیں اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ ان کی بے وقوفی کی کھلی نشانی ہے۔" (المائدہ ۵ : ۱۰۳)

شیطان کا اعلان عام اور اس کے نتائج

۱۹۵ شیطان نے ڈگڈگی بجائی اور اعلان عام کر دیا کہ "میں انہیں بہکاؤں گا اور ضرور ایسا کروں گا کہ آرزوؤں میں انہیں مشغول رکھوں گا اور ضرور حکم دوں گا' پس وہ جانوروں کے کان چیریں گے۔" گمراہیاں دو طریقوں ہی سے آسکتی ہیں اور انسان شیطانی اثر دو ہی شکلوں سے قبول کر سکتا ہے ایک عقل و فکر کی راہ سے دوسرے جذبات و احساسات کی راہ سے۔ یعنی وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دوں گا اور ان کے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی ابھار دوں گا اس طرح "ضلال" کے تحت ہر قسم کی عقلی' فکری اور نظری گمراہیاں آگئیں اور تمنی کے تحت میں معاصی و خواہش کی جانب میلان اور نظر سے ان کی مضرتوں کا غائب ہو جانا آگیا اور قرآن کریم نے اس کی بھی بڑی وضاحت فرما دی تاکہ بات کی پوری وضاحت ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا :

"اچھا تو جا! ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کیلئے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا اور مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا اور ان کو اپنے وعدوں کے جال میں پھانس یاد رکھ کہ شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا اور توکل کیلئے تیرا رب کافی ہے۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۶۳' ۶۵)

بات کس قدر واضح کر دی کہ اس کو حکم دیا گیا کہ میرے بندوں یعنی انسانوں پر تجھے یہ اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے تو فقط بہکانے اور پھسلانے اور غلط مشورے دینے اور جھوٹے وعدے کرنے کا مجاز کیا جاتا ہے مگر تیری بات کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان بندوں کا اپنا کام ہوگا تیرا ایسا تسلط ان پر نہ ہوگا کہ وہ تیری راہ پر جانا چاہیں یا نہ چاہیں بہرحال تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو گھسیٹ لے جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو لوگ اللہ پر اعتماد کریں اور جن کا بھروسہ اس کی راہنمائی اور توفیق اور مدد پر ہو ان کا بھروسہ ہرگز غلط ثابت نہیں ہوگا۔ انہیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اللہ ان کی ہدایت کیلئے بھی کافی ہوگا اور ان کی دستگیری و اعانت کیلئے بھی۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ

پس وہ اللہ کی خلقت میں ضرور ردوبدل کریں گے[۱۹۶] اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق و

"شیطان کو ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو صرف انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہانے سے شرک کرتے ہیں۔" (النحل ۱۶ : ۹۹، ۱۰۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے اللہ کی یاد ان کے دلوں سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں خبردار ہو جاؤ؟! شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔" (المجادلہ ۵۸ : ۱۹) تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۸۰ اور آیت ۱۱۱ کی تفسیر۔

وہ جانوروں کے کان کیوں چیرتے تھے؟ اس لئے کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچائے اور دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ یہ کسی بزرگ کی منت کا ہے جیسا کہ ایام جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ جو مادہ پانچ بچے جن لیتی اور پانچوں نر ہوتے تو اس کا کان چیر کر اس کو کھلا چھوڑ دیتے۔ اس پر سوار ہونا اور اس سے کام لینا منع جانتے کیوں؟ اس لئے کہ اس نے فلاں بزرگ کی دعا سے مسلسل پانچ بچے جنے ہیں اس لئے اب وہ جانور اس بزرگ کے نام کا ہوگیا ہے اور اس قسم کی رسومات اب بھی موجود ہیں اور یہ پیر جی کا بکرا اور گیارہویں شریف کی نیاز قسم کے سارے کام اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

خلقت الٰہی میں ردوبدل کر دینے کی شیطانی چال

۱۹۶ شیطان کا یہ حکم کہ وہ اللہ کی خلقت میں ضرور ردوبدل کریں گے کہ اللہ کی ساخت کو بدل کر رکھ دیں گے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کے بدلنے سے اصلاً مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا جس طرح توحید دین فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے چیلوں نے اس کو شرک سے بدل دیا سورہ الروم میں ارشاد الٰہی ہوا کہ "اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں یہ مضبوط دین ہے۔" (الروم ۳۰ : ۳۰) اس طرح خلق اللہ کی تبدیلی سے مراد دین الٰہی کی تبدیلی ہے اور یہی معنی حسن ضحاک اور مجاہد وغیرہ آئمہ تفسیر سے اس کے نقل کئے گئے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام اور حرام کی گئی چیزوں کو حلال کرنا بھی مخلوق کی تبدیلی کے مرادف ہے۔ یہ دونوں کام پہلے ہی ہوتے آئے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ کسی کا سر چھوٹا ہے تو یہ شاہ دولہ ولی نے دیا ہے اور کسی کا کان ڈوڈا ہے تو وہ ڈوڈے شاہ نے دیا ہوگا اور اس طرح کی ساری چیزیں علاقائی شرک سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہر علاقہ میں کوئی نہ کوئی جگہ ایسی ضرور بنا رکھی ہے جس کے ذمہ اس طرح کی باتیں لگائی گئی ہیں حالانکہ ان کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا یہ سارے وہمی مفروضے ہیں جو ایک جیسی ذہنیت کے

دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ
وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا

مددگار بناتا ہے تو یقیناً وہ تباہی میں پڑ گیا ایسی تباہی جو کھلی تباہی ہے۔ ۱۱۹ ۱۹۷

شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے اور آرزوؤں میں ڈالتا ہے اور شیطان ان سے جو کچھ وعدہ
کرتا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ۱۲۰ ۱۹۸ یہی لوگ ہیں جن کو ٹھکانا دوزخ ہوا

تراشیدہ ہیں۔

اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا مددگار بنانے والا ایسے گڑھے میں جا گرا جہاں سے نکلنا ممکن نہیں

۱۹۷ ایک طرف اللہ کی خداوندی کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سے پھرے ہوئے لوگوں کے احکام پر چلنا اور ان کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کی پابندی کرنا شیطان کو اپنا رفیق و مددگار بنانا ہے اور یہی اصلاً شرک بھی ہے۔ توحید تو یہ ہے کہ زندگی سراسر اللہ کی اطاعت میں بسر ہو اللہ کے ساتھ اگر دوسروں کو اعتقاداً مستقل بالذات مطاع مان لیا جائے تو یہ اعتقادی شرک ہے اور اگر عملاً ایسے لوگوں کی اطاعت کی جائے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود امر و نہی کے مختار بن گئے ہیں تو یہ یقیناً عملی شرک ہے اور پھر جو شخص اس گڑھے میں جا گرا اس کے نکلنے کی کوئی صورت اور کیسے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس گڑھے میں گرنے والوں کو زندہ نہیں کہا بلکہ فرمایا کہ وہ مردہ ہیں اور ان کی اس موت سے مراد جہالت اور بے شعوری کی حالت ہے اور زندگی سے مراد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت ہے۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہ راست کیا ہے؟ وہ طبیعات کے نقطہ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے۔ ہاں! وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے شکل و صورت سے بھی وہ انسان نظر آتا ہے مگر وہ انسان نہیں۔ ایک زندہ انسان تو صرف وہی شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شعور حاصل ہے۔

شیطان کا وعدہ ایک فریب ہے اس کے سوا کچھ نہیں اور اس کو بھی اس کا اقرار ہے

۱۹۸ شیطان مکار ضرور ہے لیکن کوئی بات سچ بھی کہہ جاتا ہے اس قبیل سے اس کی یہ بات ہوگی کہ وہ کہے گا کہ تمہارے سارے گلے شکوے اس حد تک تو صحیح ہیں کہ اللہ سچا ہے اور میں جھوٹا۔ اس واقعہ سے مجھے ہرگز انکار نہیں ہے۔ اللہ کے وعدہ اور اس کی وعیدیں تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان میں سے ہر ایک بات جوں کی توں سچی نکلی اور میں خود مانتا ہوں کہ جو بھروسے میں نے تمہیں دلائے، جن فائدوں کے لالچ تم کو

يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور یہ اس سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔[۱۹۹] ۱۲۱

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے تو ہم انہیں باغوں میں داخل کریں گے

دیئے جن خوشنما توقعات کے جال میں مَیں نے تم کو پھانسا اور سب سے بڑھ کر یہ یقین جو تمہیں دلایا کہ اول تو آخرت کچھ ہے ہی نہیں بلکہ صرف ایک ڈھکوسلہ ہے اور اگر ہوئی بھی تو فلاں صاحب کے تصدق سے تم صاف بچ نکلو گے۔ بس ان کی خدمت اقدس میں نذر و نیاز کی رشوت پیش کرتے رہو اور پھر جو چاہو کرتے پھرو' بس نجات کا ذمہ ان کا ہوگیا۔ یہ ساری باتیں مع شے زائد جو میں تم سے کہتا رہا اور اپنے چیلوں چانٹوں کے ذریعہ سے کہلواتا رہا یہ سب کا سب محض دھوکا تھا۔

وہ ضرور کہے کہ میرے دوستو! ایسا کوئی ثبوت رکھتے ہو کہ آپ خود راہ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر غلط راستے پر کھینچ لایا تھا تو ضرور اس کو پیش کرو جو چور کی سزا سو میری۔ لیکن آپ خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کہ دعوت حق کے مقابلہ میں اپنی دعوت باطل آپ کے سامنے پیش کی۔ سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ کی طرف آپ کو بلایا۔ نیکی کے مقابلہ میں بدی کی طرف آپ کو پکارا' ماننے اور نہ ماننے کے جملہ اختیارات آپ ہی حضرات کو حاصل تھے۔ میرے پاس آپ کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اب اپنی اس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں اور پاؤں گا مگر آپ نے خود اس پر لبیک کہا اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کیا ڈالنے چلے ہیں' اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہئے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا' اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا' میں اس سے بری الذمہ ہوں ایسے ظالموں کیلئے تو دردناک سزا یقینی ہے۔" (ابراہیم ۱۴ : ۲۲) مزید دیکھنا ہو تو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ ۲ : ۲۶۸ ملاحظہ فرمائیں۔

شیطان کے یاروں کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ اس سے بھاگ نہیں سکیں گے

[۱۹۹] قرآن کریم میں جگہ جگہ مومن کی دو متقابل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ مومن سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبود واحد مان کر اس قانون کی اطاعت اختیار کرنے جو اللہ نے اپنے

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا

جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے[۲۰۰]۔ اللہ کا وعدہ حق ہے اور

پیغمبروں کے ذریعہ سے بندوں تک بھیجا ہے۔ اس کے برعکس فاسق وہ ہے جو خراج از طاعت الٰہی بالفاظ دیگر بغاوت خود مختاری اور طاعت غیر اللہ کا رویہ اختیار کرے اور یہی لوگ وہ ہیں جو شیطان کے یار کہلاتے ہیں اور یقیناً ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جہاں سے ان کا نکل بھاگنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کا عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔" (حم السجدہ ۳۲ : ۲۰) اور یہ کہ وہ اس عذاب سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کریں گے لیکن یہ وہ وقت نہیں کہ جب کوئی اپنی کوشش سے اس چیز کو حاصل کر لے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایمان لانے والے اور ایمان کے بعد اچھے اعمالکرنے والے باغات میں داخل ہوں گے

۲۰۰ مطلب یہ ہے کہ شیطان کے وعدے اور اس کی پیدا کردہ آرزوئیں تو محض جھوٹ کا پلندہ ہیں جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں اور فریب کاری کی حقیقت ہوتی ہی کیا ہے؟ رہے وہ لوگ جو صحیح معنوں میں ایمان لانے والے ہیں اور اللہ کی رضا کیلئے اچھے اعمال کمانے والے ہیں ان کیلئے یقیناً جنت کے دروازے کھلنے والے ہیں اور وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کیونکہ ان کو وہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور ان کو اب نکالا بھی نہیں جائے گا۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان کی میزبانی کیلئے فردوس کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کا ان کا جی نہیں چاہے گا۔" (الکھف ۱۸ : ۱۰۷' ۱۰۸) اس لئے کہ اس حالت سے بہتر اور کوئی حالت ہوگی ہی نہیں کہ جنت کی زندگی کو اس سے بدل لینے کے لئے ان کے دلوں میں کوئی خواہش پیدا ہو۔ کیونکہ یہ فطری چیز ہے کہ خواہش ہمیشہ اس کی پیدا ہوتی ہے جس سے لطف و مزہ بڑھے۔ جنت کے انعامات اور آسائشیں اتنی ہیں کہ اگر ان کو گنایا جائے تو ممکن نہیں ہے کہ ان کو گنایا جا سکے۔ لیکن جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی' یاوہ گوئی' جھوٹ' غیبت' چغلی' بہتان' گالی گلوچ' لاف و گزاف' طنز و تمسخر اور طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوں گے۔ وہ بدتمیز اور بدزبان لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو کچھ بھی اللہ نے شائستگی اور مذاق سلیم سے نوازا ہے تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے

اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا
يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ

اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں سچا اور کون ہو سکتا ہے؟ ۱۲۲[۲۰۱]

مسلمانو! نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر' جو کوئی برائی کرے گا ضروری ہے کہ اس کا بدلہ پائے اور پھر اللہ کے سوا نہ تو اسے کوئی دوست ملے نہ مددگار۔[۲۰۲] ۱۲۳

انسان کو جنت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :
"وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے' جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔" (الواقعہ ۵۶ : ۲۵' ۲۶) اس میں یہ درس بھی مخفی ہے کہ دنیا میں ان چیزوں سے پرہیز کر کے ان سے بیزار رہ کر زندگی بسر کرو تاکہ ان چیزوں کے عادی نہ ہو جاؤ کیونکہ اگر تم ان کے عادی ہوگئے تو تم کو ان کے سوا لطف و مزہ آئے گا نہیں اور یہ چیزیں وہاں میسر نہیں ہوں گی جس کے نتیجہ میں تم کو جنت میں داخل ہی نہ کیا جائے گا کیونکہ جنت تو لطف و مزہ کی جگہ ہے پھر جہاں لطف و مزہ ہی نہ ہوا تو وہ جنت کاہے کی ہوگی؟

جنت کیا ہے؟ انعام خداوندی کا ایک وعدہ اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا

۲۰۱ کچھ لوگوں کو اس بات سے بڑی ضد ہے اور وہ پریشان سے ہو جاتے ہیں جب ان کو یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔ ان کی سوچ ایسی منفی اور اتنی پست ہے کہ فوراً اس انداز سے سوچنے لگتے ہیں کہ جو اللہ وعدے کا اتنا پابند ہو وہ قادر مطلق کیسے ہوا؟ وہ خیال کرتے ہیں کہ جو وعدے کا پکا ہو وہ تو مطلق العنان نہیں ہوتا۔ مطلق العنان تو وہ ہے کہ جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کو کون پوچھ سکتا ہے کہ تم نے کہا کیا تھا اور کر کیا رہے ہو؟ حالانکہ یہ مطلق العنانی کا نتیجہ نہیں بلکہ ڈھٹائی اور بے حیائی کا نتیجہ ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو زور آور ہونے کے ساتھ ساتھ بے غیرت بھی ہو۔ ہاں! اللہ یقیناً زور آور تو ہے لیکن اس سے بڑھ کر کوئی غیور بھی نہیں۔ اس لئے اس نے قرآن کریم میں بار بار یہ فرمایا کہ میرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا اور مجھ سے بڑے وعدے کا پکا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی یہی ارشاد فرمایا کہ "اللہ کا وعدہ حق ہے اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں سچا اور کون ہو سکتا ہے؟" اس کی مزید تشریح دیکھنا درکار

ہو تو سورہ النساء کی آیت ۸۷ ملاحظہ فرمائیں یعنی حاشیہ ۱۷۴ جنت اور انعامات جنت کا جہاں ذکر فرمایا وہیں یہ بات بھی ارشاد فرمائی کہ اللہ کی بات بڑی پکی اور سچی ہوتی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جنت کا وعدہ تو کر رہا ہے کل وقت آنے پر وہ کچھ دے گا بھی یا نہیں؟ جو اس نے کہہ دیا ہے وہ پتھر پر لکیر ہے۔

جنت ایک حقیقت ہے وہ خالی آرزوؤں کا نام نہیں

۲۰۲ مذاہب عالم کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ من حیث القوم دنیا میں ایک قوم بھی ایسی نہیں پائی گئی جو جنت کو نہ مانتی ہو وہ چاہے جو نام اس کا رکھے۔ پھر تعجب یہ ہے کہ ہر قوم نے وہ اپنی ہی ملکیت سمجھ رکھی ہے اس لئے وہ دوسری ساری قوموں کو اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔ قرآن کریم انہی مفروضوں کو وہمی اور بناوٹی قرار دیتا ہے اور زور دے کر کہتا ہے کہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نوع انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا یعنی اللہ کے اسی قانون کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی افکار و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اچھے فکر و عمل کا نتیجہ اچھا ہے اور برے فکر و عمل کا نتیجہ برا ہے لیکن لوگوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی اور دین و مذہب کو نسلوں، قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا ایک جتھا بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب انسان کی نجات و سعادت کی راہ یہ نہیں سمجھی جاتی کہ کسی کا اعتقاد و عمل کیسا ہے؟ بلکہ سارا دارومدار اس پر آکر ٹھہر گیا ہے کہ کون کس جتھے اور گروہ بندی میں داخل ہے؟ اگر ایک آدمی کسی خاص گروہ بندی میں داخل ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے اور دین کی سچائی اسے مل گئی ہے۔ اگر داخل نہیں ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اس پر بند ہو گیا اور دین کی سچائی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ گویا دین کی سچائی آخرت کی نجات اور حق و باطل کا معیار تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی گویا اعتقاد اور عمل کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر باوجودیکہ تمام مذاہب کا مقصود اصل ایک ہی ہے اور سب ایک ہی پروردگار عالم کی پرستش کرنے کے مدعی ہیں۔ لیکن ہر گروہ یقین کرتا ہے کہ دین کی سچائی صرف اس کے حصے میں آئی ہے باقی تمام نوع انسانی اس سے محروم ہے چنانچہ ہر مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے خلاف نفرت و تعصب کی تعلیم دیتے ہیں اور دنیا میں خدا پرستی کی راہ سرتاسر بغض و عداوت، نفرت اور دشمنی پر سمجھ لی گئی ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے پھر بوالعجبی یہ دیکھو کہ ایک ہی دین کے ماننے والے لوگوں نے دین کے اندر گروہ بندیاں قائم کر لیں اور اس طرح دین و مذہب ایک بکھیڑا بن کر رہ گیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جن اصولوں پر زور دیا ان میں تین اصولی باتیں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر، پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر اس گروہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے اور صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ دین اسلام کے اندر رہ کر گروہ بندی اللہ کی رحمت سے دوری کا نتیجہ ہے۔

يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ

اور جو کوئی اچھے کام کرے گا خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور رائی برابر بھی ان کے ساتھ بے انصافی ہونے والی نہیں۔ ۲۰۳ ۱۲۴

اور پھر اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر

وہ کہتا ہے تمام نوع انسانی کیلئے دین الٰہی ایک ہی ہے اور یکساں طور پر سب کو اس کی تعلیم دی گئی ہے پس یہ جو پیروان مذاہب نے دین کی وحدت اور عالمگیر حقیقت ضائع کر کے بہت متخالف اور متخاصم جتھے باندھ لئے ہیں یہ صریح گمراہی ہے اللہ نے سب کو "دین اسلام" ہی کی ہدایت دی ہے۔

وہ کہتا ہے اصل دین توحید ہے یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنا اور تمام بانیان مذاہب نے اس اصول پر انسانوں کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی ہے اور یہ کہ وہ بانیان مذاہب کون تھے؟ انبیائے کرام جو اللہ کے رسول یا نبی کہلائے اس کے خلاف جس قدر عقائد و اعمال اختیار کر لئے گئے وہ سب کے سب اس اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں اور پھر یہ کہ اس کا حل بھی صرف ایک ہے دوسرا کوئی نہیں وہ یہ کہ اس اصلیت کو تسلیم کر لیا جائے اور اس اصول کے ماتحت قدم اٹھیں جو اٹھیں۔

اچھے عمل کا بدلہ اچھا ہوتا ہے اور اچھا عمل وہی ہے جو ایمان کے ساتھ ہو

۲۰۳ یہاں اس بات کو واضح کر دیا کہ اعمال صالحہ کی قبولیت کیلئے ایمان کا ہونا شرط اولین ہے۔ آپ خود دیکھئے کہ ایک آدمی ایک قطعہ زمین کو ہموار کرتا ہے۔ اس سے جڑی بوٹی اکھاڑ کر باہر پھینکتا ہے' پھر اس کی آبپاشی کرتا ہے اور پھر عین وقت پر اس میں ہل چلا دیتا ہے اور رات دن اس کی نگرانی میں مصروف رہتا ہے لیکن اس میں وقت پر بیج نہیں ڈالتا تو کیا اس کی طویل محنت و مشقت کا کوئی نتیجہ برآمد ہو گا؟ جب بیج ہی نہیں تو ساری محنت رائیگاں جائے گی اس طرح اگر ایمان کا تخم نہیں تو دنیا جہان کی ساری نیکیاں برباد جائیں گی اس لئے کہ ان میں بار آور ہونے والی چیز موجود نہیں اور اگر ذرا دقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عمل صالح ہو ہی نہیں سکتا جب تک عامل میں صفت ایمان موجود نہ ہو کیونکہ ایمان کے بغیر ہر عمل کے پیچھے کوئی پست جذبہ کار فرما ہو گا مثلاً دنیاوی منفعت' شہرت اور ذکر دوام وغیرہ وغیرہ تو پھر جس عمل کا محرک ایسی پست چیز ہو وہ عمل صالح عمل کہلا ہی نہیں سکتا صرف ایمان ہی وہ قوت ہے جو ہر عمل کا رخ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک

دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ

اطاعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہے اور اس نے ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی بھی کی ہے جو ۲۰۴

لہٰ کی طرف موڑ دیتی ہے اور اسی نسبت کی برکت سے انسان کا ہر عمل صالح بن جاتا ہے اور اس پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان سے عامل کی زندگی کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کی قوم اور ملک کو بھی عزت و ناموری حاصل ہوتی ہے۔ غور کرو کہ مومن کون ہوا؟ وہی جس کے دل میں ایمان کا بیج موجود ہے۔ وہ ایمان کا بیج کیا ہے؟ رضائے الٰہی اور اس کے متعلقات خاص۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان کسی قوم' ملت اور گروہ کی میراث نہیں کہ اس قوم و ملت یا گروہ میں داخل ہوگئے تو ایمان مل گیا اور یہی بات آج تسلیم کرنا مشکل ہوگیا ہے اس لئے کہ نجات کا سارا دارومدار قوم و ملت اور گروہ بندی پر آکر ٹھہر گیا۔ گویا وہ چیز جو ایمان کے منافی تھی وہی عین ایمان قرار پائی۔ وہی جو زہر تھا تریاق مان لیا گیا۔ آپ کیا کریں؟ وہی جو اللہ نے کرنے کا حکم دیا فرمایا "جو کوئی اچھے کام کرے گا خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور رائی برابر بھی ان کے ساتھ بے انصافی ہونے والی نہیں۔"

چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔" (النحل ۱۶ : ۹۰)

اس آیت سے سارے گروہوں کے ان تمام کم نظر اور بے صبر لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی' دیانت اور پرہیزگاری کی روش اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت چاہے بن جاتی ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ جو لوگ حقیقت میں ایماندار اور پاکباز اور معاملہ کے کھرے ہوتے ہیں ان کی دنیوی زندگی بھی بے ایمان' بدعمل لوگوں کے مقابلہ میں صریحاً بہتر رہتی ہے جو ساکھ اور سچی عزت اپنی بے داغ سیرت کی وجہ سے انہیں نصیب ہوتی ہے۔ جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں ان کے حصے میں آتی ہیں وہ ان لوگوں کو میسر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بوریا نشین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں میں رہنے والے فساق و فجار نہیں پا سکتے دنیا کی ریل پیل ان کو خواہ کتنی ہی میسر آچکی ہو لیکن بد اطمینانی کا شکار رہنا ان کا مقدر بن جاتا ہے جو ان کی ساری فراوانیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ مزید تشریح کیلئے سورۃ آل عمران ۱۹۵ کی تفسیر دیکھیں جو اس جلد کی پچھلی سورت ہے۔

إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرٰهِيمَ خَلِيلًا ﴿١٢٥﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا ﴿١٢٦﴾

ع ۱۸ ۱۱ ۱۵

صرف اللہ ہی کا ہو رہا تھا اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست ۲۰۵ بنا لیا تھا۔ ۱۲۵

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کیلئے ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۲۰۶۔ ۱۲۶

اللہ کے آگے سر طاعت جھکانے والا ہی وہ شخص ہے جو نیک عمل کہلا سکتا ہے

۲۰۴ نیک عمل کی دو صورتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ انسان خود نیک عمل کرے اور دوسری یہ کہ نیک عمل کی دوسروں کو دعوت دے۔ یہ وہی کام ہے جو انبیاء علیہم السلام سرانجام دیتے رہے اور آج یہی وہ کام ہے جو خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے ذمہ لگایا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نبوت کا وہ عہدہ خاص بند کر دیا گیا جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا اور وہی ذمہ داری اس امت وسطیٰ کے ذمہ ڈال دی گئی۔ اس لئے ان کو اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کیلئے نہیں ہے یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصائب کو دعوت دینا ہے ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کیلئے اس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ وہ وقت وہ تھا کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کیلئے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے پھاڑ کھاؤ اس لئے فرمایا گیا کہ بتاؤ اس سے بہتر کون ہے جس نے اپنے آپ کو صرف اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ثابت کرنے کیلئے احسان کا درجہ اختیار کر لیا کہ خود بھی نیک عمل ہوا اور دوسروں کو بھی نیک عمل کی دعوت دی اور اس طرح اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا اور اس نے اسی ملت کے ساتھ وابستگی کا ثبوت دے دیا جو ملت ابراہیمی کہلاتی ہے اور ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہوا :

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس شخص کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور اعلان کیا کہ میں مسلمان ہوں۔" (حم السجدہ ۴۱ : ۳۳)

ابراہیمؑ وہ شخصیت ہیں جو سب سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ کے ہو رہے تھے

۲۰۵ فرمایا یہ ملت ابراہیمی کی دعوت کسی گروہ بندی کی دعوت نہیں بلکہ یہ ساری گروہ بندیوں کو

رخصت کر دینے کی دعوت ہے۔ اس لئے گروہ بندیاں اس وقت بھی موجود تھیں لیکن تاریخ کی ورق گردانی کر کے دیکھو کہ ابراہیم علیہ السلام نے کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا؟ تم پر روشن ہو جائے گا کہ وہ تو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک کا ہو کر رہ گیا تھا اس لئے اس کو "حنیف" کہا گیا۔ اس کا نتیجہ کیا رہا؟ فرمایا اللہ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔ سبحان اللہ کیا لطف ہے اس فقرۂ قرآنی میں کہ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا "اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا۔" یہ نہیں فرمایا کہ ابراہیمؑ نے اللہ کو دوست بنا لیا بلکہ فرمایا کہ اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا۔ خلیل کیا ہے؟ خلیل کا لفظ اس حبیب اور محب پر بولا جاتا ہے جس کے دل میں اپنے محبوب کی محبت یوں بس جائے کہ کسی غیر کی محبت کی گنجائش تک باقی نہ رہے اس لے "خل" سرکہ کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ زبان پر رکھنے والے کے روں روں میں اثر کر جاتا ہے اور یہی وہ حالت ہے کہ انسان کے ہاتھ وہی کرتے ہیں جو اللہ کی رضا ہو۔ انسان کی آنکھ وہی دیکھتی ہے جس کو دیکھ لینے کا حکم ہو۔ انسان کا قدم اسی طرف اٹھتا ہے جس طرح اللہ اٹھوانا چاہتا ہے اور اس سے کوئی فعل ایسا سرزد نہیں ہوتا جو مطلوب الٰہی نہ ہو لیکن اس سارے قرب کے باوجود اللہ اللہ ہوتا ہے اور بندہ بندہ نہ اللہ بندہ میں حلول کرتا ہے اور نہ بندہ اللہ میں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جبریلؑ کے پر جلتے ہیں اور بڑوں بڑوں کی عقل جواب دے جاتی ہے اور اللہ کا خاص فضل شامل نہ ہو تو قدم ایسا پھسلتا ہے کہ نہ دین باقی رہتا ہے نہ دنیا۔ جو سنبھل گیا وہ ابراہیمؑ کا متبع قرار پایا اور جس کے قدم ڈگمگائے وہ شیطان کا ساتھی ہو کر رہ گیا۔ زیادہ بلندی سے گرنے والا ہمیشہ زیادہ ہی چکنا چور ہوتا ہے۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول کی تفسیر سورہ البقرہ آیت ۱۱۲، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۳۱، ۱۳۵، ۲۵۶۔

آسمان و زمین کی ہر شے کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے

۲۰۶ قرآن کریم کا قاری جو قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھتا ہے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ مشرکین کو ہمیشہ دو صفات باری یعنی علم و صفت ملک و قدرت میں سب سے زیادہ ٹھوکر لگی ہے اس لئے قرآن کریم انہی دو صفات کا اثبات بار بار کرتا ہے یہاں بھی لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ میں اللہ تعالیٰ کی صفت کمال قدرت و وسعت سلطنت کا بیان ہے اور كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا میں کمال علم کا بیان ہے اور مطلب یہ ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز اس پوری کائنات میں سے نہ اس کی ملک و سلطنت سے باہر ہے اور نہ اس کے احاطہ علم سے۔

اور اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہر وقت اس کارگاہ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے، کسی کو مار رہا ہے اور کسی کو جلا رہا ہے، کسی کو اٹھا رہا ہے اور کسی کو گرا رہا ہے۔ کسی کو شفا دے رہا ہے اور کسی کو بیماری میں مبتلا کر رہا ہے۔ کسی ڈوبتے کو بچا رہا ہے اور کسی تیرتے کو ڈبو رہا ہے۔ بے شمار مخلوقات کو طرح طرح سے رزق دے رہا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل و صورت اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ

اور اے پیغمبر اسلام! لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، تم کہہ دو اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے[۲۰۷]، نیز وہ تمہیں یتیم عورتوں کی نسبت بھی حکم دیتا ہے جو تمہیں قرآن کریم میں سنایا جا رہا ہے، وہ یتیم عورتیں جو تمہاری سرپرستی میں ہوتی ہیں

خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے اور یہ سارا معاملہ اس کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے اس کا بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے کہ :

"زمین و آسمان میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اس سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔" (الرحمٰن ۵۵ : ۲۹)

لوگ آپ ﷺ سے عورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو آپ ﷺ ان کو جواب دے دیں

۲۰۷ اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ سے عورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کیا پوچھتے ہیں؟ ان کیلئے کیا حصہ مقرر ہوا ہے۔ کیوں پوچھتے ہیں؟ اس لئے کہ عربوں میں یتیم بچوں اور عورتوں کو میراث میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا جیسا کہ اس سورت کی آیت ۷، ۸ میں آپ پڑھ چکے ہیں اس لئے جب قرآن کریم میں عورتوں اور بچوں کے ورثہ پانے کے متعلق حکم آیا تو بعض لوگوں کو یقیناً ناگوار گزرا ہوگا، کیوں؟ اس لئے کہ لوگ ہمیشہ رواج کے خلاف جب کوئی بات پاتے ہیں تو اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کبھی اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر نہیں کرتے ہاں! آہستہ آہستہ اگر وہی بات رواج پا جائے جس سے وہ جز بز تھے تو کل رواج پا جانے کے بعد وہ ان کو بھلی لگے گی کیوں؟ محض اس لئے کہ اس وقت اس کا رواج نہیں تھا اور اب اس کا رواج ہو گیا اور ہر کوئی اس کو کرنے لگا تو اس طرح دیکھا دیکھی اس کا کرنا آسان ہو گیا۔

آگے چل کر ان عورتوں کو یتیم عورتوں کے خطاب سے بھی ان کے ساتھ بات کی گئی ہے اس لئے سمجھ لینا چاہئے کہ یتیم عورتیں کون ہیں؟ وہی عورتیں جن کے خاوند وفات پا چکے ہوں ان کو یتیم عورتیں کہا جائے گا اس لئے کہ جو لوگ ان کے لیے نان و نفقہ اور لباس و رہائش کے ذمہ دار ٹھہرے تھے وہ نہ رہے اس لئے ان عورتوں کو یتیم عورتوں کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ فرمایا گیا کہ وہ آپ سے اے پیغمبر اسلام ان یتیم عورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان عورتوں کے متعلق فتویٰ دیتا ہے کہ ان کی میراث ان کے حوالے کرو یعنی خاوند کی وفات کے بعد اگر خاوند کی کوئی اولاد موجود ہے خواہ اس بیوی سے یا کسی دوسری بیوی سے تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا اور اگر اس کی اولاد نہ ہوئی تو چوتھے حصہ کی وہ مالک

لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ
وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ
اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ﴿١٢٧﴾ وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا

اور ان کا وہ حق جو ٹھہرایا جا چکا ہے نہیں دیتے ہو اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو۔ نیز جو کچھ بے بس یتیموں کی نسبت قرآن میں سنایا جا رہا ہے کہ ان کے معاملہ میں حق و انصاف کے ساتھ قائم رہو اور تم بھلائی کے کاموں میں سے جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۲۷ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے سرکشی یا کنارہ کشی کا اندیشہ ہو تو شوہر اور

قرار پائے گی۔ بس یہ حصہ اس کا ادا کر دو کہ قانون الٰہی کی حفاظت ہو۔

یتیم عورتوں کو کسی کی سرپرستی میں دیئے جانے کا مطلب کیا ہے؟

۲۰۸ یتیم عورتوں کو خواہ وہ والدین کی وفات کی وجہ سے یتیم ہوئی ہوں اور خواہ اپنے خاوندوں کی وفات کی وجہ سے وہ یتیم کہلاتی ہوں بہرحال ان کے سرپرستوں کو یہ حق نہیں کہ وہ ان کے بارے میں جو چاہیں کریں یہ اس لئے فرمایا کہ عربوں میں رواج طے پا گیا تھا کہ اگر یتیم لڑکی خوبصورت ہوتی اور مالدار بھی تو ان کے نگران و سرپرست مقرر ہونے والے اگر چاہتے تو ان کے مال پر قبضہ کرنے کیلئے ان سے نکاح کر لیتے اس طرح گویا وہ ہم خرما و ہم صواب کے مستحق قرار پاتے کہ خوبصورت عورت بھی مل گئی اور مال بھی اور پھر جس طرح چاہتے وہ ان سے سلوک کرتے اور اگر وہ لڑکی خوبصورت نہ ہوتی اور وہ نکاح کرنا اس سے پسند نہ کرتے تو پھر کسی دوسرے سے نکاح کر دیتے اس شرط پر کہ وہ اس کے حق مہر کی رقم خود کھا جائیں' کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان کے نگران حال قرار پائے تھے۔ قرآن کریم نے اس رسم بد کو مٹانے کی کوشش کی اور ان کو اس زیادتی سے منع فرمایا اور ان کو شرم دلائی کہ تم کو ئلوں کی دلالی میں اپنا منہ کیوں کالا کرتے ہو۔ نکاح کا حق تم کو اس صورت حاصل ہے کہ ان کے مہر ادا کرو اور ان کا جو کچھ مال تمہارے قبضے میں دیا گیا تھا ان کو واپس کرو۔ ہاں! ان کی ملکیت میں رہتے ہوئے تم ان کی مرضی سے فائدہ حاصل کرو یہ دوسری بات ہے لیکن ان کی سرپرستی کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے اور ان کے مال کے مالک ہو گئے۔

یتیموں کی نسبت جو حکم تم کو قبل ازیں سنایا گیا تھا اس میں کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی

۲۰۹ قرآن کریم نے اس ظلم صریح سے اس سورہ النساء کے ابتداء ہی میں روک دیا تھا لیکن جو

أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ

بیوی پر کچھ گناہ نہ ہوگا اگر وہ صلح کرلیں[۲۱۰]۔ صلح ہی بہتر ہے اور مال کا لالچ بھی سبھی میں ہوتا ہے
اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور بچو تو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے[۲۱۱]۔ ۱۲۸
اور تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہش مند ہو لیکن یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ

بات رواج کے خلاف ہو وہ نظروں میں ضرور کھٹکتی رہتی ہے اور اس پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ بات چونکہ عربوں کے رواج کے خلاف تھی کہ عورتیں اور یتیم بچے میراث میں برابر کے شریک؟ اس لئے اب دوبارہ ان کو تاکیدی حکم سنایا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم کو قبل ازیں سنایا گیا تھا وہ من اللہ ہے اگر ان کمزوروں کے ساتھ تم نیک سلوک نہیں کر سکتے تو ظلم بھی تو نہ کرو جو ان کا حق مقرر کر دیا گیا ہے اس میں اب کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ بس تم ان کا حق ادا کرو اور ان کا حق مارنے کیلئے طرح طرح کے بہانے مت تراشا کرو یہ دنیا کا مال کیا ہے؟ "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔" تم کو جس بات سے روکا گیا ہے وہ ظلم و زیادتی کی بات ہے اس لئے تم کو منع کیا گیا ورنہ حق و انصاف کے ساتھ تم اس یتیم لڑکی سے نکاح کرنا چاہو جو تمہاری نگرانی میں دی گئی ہے تو اس کی رضامندی سے کر سکتے ہو اور اس طرح اس کا مال بھی اس کو واپس لوٹانا ہوگا اس لئے کہ اس کے ساتھ نکاح کر لینے کا مطلب یہ مت سمجھو کہ اس کی ملکیت میں اب کوئی چیز نہیں رہی بلکہ تم ہی اس کی ہر چیز کے مالک ہوگئے ہو۔ تعجب ہے کہ آج زمانہ کتنی ترقی کر گیا ہے تاہم اس معاملہ میں آج بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ عورت کو نہ میراث میں شریک کیا جاتا ہے یعنی اس کا جو حق ہے نہ وہ ادا کیا جاتا ہے اور اگر نکاح کے باعث خاوند کی طرف سے جو حصہ اس کو ملنا چاہئے تھا نہ اس کو ادا کیا جاتا ہے اور جہاں قانونی مجوریاں حائل ہوں وہاں ان مجبوریوں کا کوئی حل تلاش کیا جاتا ہے۔ سیدھے راستے پر قدم اٹھانے کیلئے کوئی تیار نہیں پھر لطف کی بات یہ ہے کہ معاشرہ میں اس برائی کو کوئی برائی نہیں سمجھتا بلکہ عین حق سمجھتا ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کی کوشش کرے تو سارا زمانہ اس کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے وہ عورت عورت ہی نہیں رہتی بلکہ ایک "چڑیل" بن جاتی ہے۔ بڑے سمجھدار اور عقل و فکر کے مالک، حاجی، نمازی، علامے، فہامے اور کٹر قسم کے مذہبی لوگ سب اس دریا میں غوطہ زن نظر آتے ہیں کیونکہ اس برائی کو کوئی برائی نہیں سمجھتا بلکہ عین نیکی تصور کرتا ہے۔ اگر برائی ہے تو اسلامی قانون پر عمل درآمد برائی تصور ہوتی ہے۔

مزید تفصیل کیلئے اس سورہ النساء کی آیت ۲، ۳، ۴ کا مطالعہ کریں مختصر یہ کہ یتیم بچیوں، بچوں اور عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اسلامی اصولوں کے مطابق اسلامی قانون کا وہ حصہ ہے جس کی پابندی ہر انسان پر لازم و ضروری اور حکومت اسلامی کا حق ہے کہ وہ اس سلسلہ میں جو بد اعتدالیاں کی جاتی ہیں ان کا سختی سے نوٹس لے کر ایسا قانون بنائے کہ اس کا نفاذ ہر حال میں لازم و ضروری ہو اور خلاف ورزی کرنے والوں اور رخنہ اندازیاں پیدا کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

میاں بیوی میں ایک دوسرے سے کنارہ کشی کا اندیشہ ہو تو اس میں اصلاح کا پہلو تلاش کرو

۲۱۰ نشوز کیا ہے؟ زیادتی ہے یا بے رغبتی کو کہا جاتا ہے اور یہ میاں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور بیوی کی طرف سے بھی۔ اگر خاوند کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ طلاق دینا چاہتا ہے اور بیوی کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاوند کی قوامیت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں یا وہ جدائی کی خواہش مند ہے۔ اس کی پوری تفصیل اس سورہ النساء کی آیت ۴۸ میں کی جا چکی ہے وہاں سے ملاحظہ فرمالیں۔

اس جگہ اس صورت کا ذکر ہے جب عورت کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو تو ظاہر ہے کہ یہ تعدد ازدواج یا کسی مالی صورت کے پیش نظر ہی ہونا ممکن ہے۔ یعنی خاوند دوسری شادی کرنا چاہے یا عورت کے پاس مال ہے اور مرد کسی طریقہ سے اس کو حاصل کرنا چاہے دونوں ہی صورتوں میں یہ جھگڑا کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہرحال جس طرح کا جھگڑا پیدا ہو اس کے ختم کرنے اور فریقین میں صلح و صفائی ہو جانے کی بڑی ضرورت ہے اس میں فریقین کو آپس میں جلد کسی فیصلہ پر پہنچنا چاہئے اگر فریقین کے لواحقین کو شامل کرنے کی ضرورت ہو تو کیا جا سکتا ہے لیکن اصلاح ہر حال میں ضروری ہے اس لئے کہ یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی تو اس کے اثرات دور تک پہنچیں گے۔ اسی سورت النساء کی آیت ۳۴ کی تفسیر بھی دیکھ لیں۔

مال کے لالچ سے بھی اس طرح کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اس معاملہ میں بھی غور و فکر کرو

۲۱۱ "الشح" مال ہی کے لالچ سے انسان اس بخل کا شکار ہو جاتا ہے پھر اندر حالات کچھ ہوتے ہیں اور باہر اظہار کا طریقہ کچھ اختیار کیا جاتا ہے اس لئے یہ صورت حال بھی بڑی نازک ہوتی ہے فرمایا اس کی طرف بھی دھیان دے لو کہ کہیں ایسی صورت نہ لاحق ہو چکی ہو کیونکہ مال کا لالچ چیز ہی ایسی ہے کہ انسان اس کو بعض اوقات ظاہر بھی نہیں کرتا اور ساری بیماری کی جڑ بھی وہی ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ہی گھر کے اندر رہنے والے میاں بیوی اور اولاد جن کی سوچ ایک نفع و نقصان ایک لیکن سارے الگ الگ اس مرض کے شکار۔ کوئی پوچھے کے مال میاں کے پاس ہوگا تو وہ کہاں لے جائے گا۔ بیوی کے پاس ہوگا تو وہ کیا کرے گی؟ لیکن سب کی اپنی اپنی گرہ اور اپنا اپنا بنک بیلنس، کیوں؟ اس لئے کہ یہ مال کا لالچ سب میں ہے پھر جائز حد تک تو برداشت لیکن کبھی کبھی یہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے اور اس سے حالات کی نزاکت بھی ظاہر ہے کہ بدل جاتی

تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۲۹ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ

عورتوں میں عدل کر سکو' بس ایسا نہ کرو کہ کسی ایک کی طرف جھک پڑو اور دوسری کو چھوڑ بیٹھو گویا "معلقہ"[۲۱۲] ہے اور دیکھو اگر تم درستگی پر رہو اور بچو تو اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔[۲۱۳] ۱۲۹

اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی کشائش سے دونوں کو بے نیاز کر دے گا اور اللہ

ہے۔ فرمایا اس حالت سے بچو اور یاد رکھو کہ جس چیز کو تم چھپا رہے ہو ایک دوسرے سے تو چھپا لو گے لیکن اللہ تعالیٰ تو وہ ذات ہے کہ اس کو ہر چیز کی خبر ہے اور اس سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ تفصیل کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ البقرہ کی آیت ۲۷۵ اور جلد دوم تفسیر سورہ النساء آیت ۳۵ تا ۴۳ کا مطالعہ کریں۔

دو یا زیادہ بیویوں کے درمیان عدل اتنا آسان بھی نہیں کہ تم اس کو معمولی بات سمجھ لو

۲۱۲ وہ عدل جو استطاعت انسانی سے باہر ہے اس کے متعلق کہنا کہ عدل کرو یہ قرین قیاس بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ عدل جس کے متعلق اتنا زور دیا گیا ہے وہ ظاہری حالات میں ممکن ہے کہ ایک سے زائد بیویاں ہونے کی صورت میں ان کے مکان' لباس اور خوراک میں اور معاشرت کے طور طریقوں میں انصاف سے کام لیا جائے۔ دل لگاؤ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں کوئی انسان بھی عدل نہیں کر سکتا۔ ایک بیوی کے ہاں اولاد زیادہ ہے' دوسری کے ہاں کم۔ ایک بیمار ہے اور دوسری صحت مند اور اس طرح کی اور بہت سی چیزیں ایسی ممکن ہیں کہ اگر ہر معاملہ میں عدل' عدل کی بات کی جائے تو کیا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کبھی ناممکنات کا حکم نہیں دیتا اور نہ ہی اس سلسلہ میں تم کو تکلیف مالایطاق دی گئی ہے۔ ہاں تم کو کہا یہ گیا تھا کہ ایک بیوی کی طرف جھک نہ جاؤ "فَلَا تَمِيْلُوْا" مَالَ يَمِيْلُ کے معنی ہیں جھک جانا ایسا کہ ایک جگہ ٹھہراؤ ممکن ہی نہ ہو۔ مال کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ایک جگہ رک نہیں سکتا بلکہ دوسرے کی طرف بڑھنے کی رغبت اور قوت رکھتا ہے۔ وہ روپیہ جو آج آپ کو ملا ہے کب تک اس کو سنبھال رکھو گے اور اس کو کون کون سنبھالتا آیا لیکن کسی کے پاس یہ رکا نہیں بلکہ اس کو قرار ہے ہی نہیں۔ فرمایا تم کو جس بات سے منع کیا گیا وہ یہ ہے کہ تم ایک طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری طرف کی پرواہ ہی نہ کرو علق کسی چیز کے لٹک جانے پر بولا جاتا ہے کہ عورت سے نکاح کر کے اس کو پابند کر دو اور خود آزادیاں لیتے پھرو اس بات سے تم کو روکا گیا

اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط

بڑی وسعت والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۳۰ ۲۱۴

اور یاد رکھو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کیلئے ہے' ہم نے یقیناً ان

ہے کہ ایسا کام مت کرو۔ سب سے پہلے انسانی حقوق ہیں تم انسان ہو تو تمہاری بیوی ظاہر ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ پھر آخر تم نے اس سے نکاح کیا ہے اور اس کی ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرو۔ نفرت نہ رکھو اور اس بات کو ذہن نشین رکھو کہ تعدد ازدواج ایک مشکل کا حل ہے اور ضرورت کا معاملہ ہے اگر ایسی ضرورت پیش آجائے کسی مشکل میں اس طرح پھنس جاؤ کہ اس کے سوا تم کو چارہ نہ ہو تو نکاح کی اجازت دی گئی ہے اور اس اجازت کا مطلب یہ نہیں کہ تم عیاشی شروع کر دو اور کسی انسان کو انسان نہیں بلکہ ایک جانور سمجھنا شروع کر دو اگر پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم رکھا گیا ہے تو وہ تمہاری سہولت کیلئے ہے پوری نماز کی بجائے قصر کی اجازت دی ہے تو اس کا سبب سفر ہے روزہ کی بجائے فدیہ ہے تو اس کی وجہ بیماری یا بڑھاپا ہے اس طرح غور کرو کہ جو سہولت تم کو دی گئی ہے محض اس لئے دی گئی ہے کہ تم کسی مشکل میں پھنس کر نہ رہ جاؤ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سہولت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا شروع کر دو۔ تفصیل کیلئے سورہ النساء کی آیت ۳' ۴ اور ۳۵ ملاحظہ فرمائیں۔

اختیاری باتوں میں درستگی سے عمل پیرا رہو اور اللہ کو غفور رحیم سمجھو

۲۱۳ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اصلاح پسند ہو تو کوئی قدم ایسا نہ اٹھاؤ جو اصلاح کا نہ ہو کیونکہ ایسا کرنا تمہارے دعویٰ کے بھی خلاف ہوگا۔ ازدواجی رشتہ قائم ہونے کے بعد کوشش تو یہی ہونی چاہئے کہ وہ ٹوٹنے نہ پائے اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ فریقین بھی چاہیں۔ کسی ایک فریق کی رضا نہ ہو تو اس تعلق کے بحال رہنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ تم کو جہاں تک اختیار ہے تمہارا قدم اصلاح کا ہونا چاہئے۔ لیکن ساری کوششوں کے بعد نتیجہ بہرحال اللہ کے سپرد ہونا چاہئے وہ غفور رحیم ہے اگر اصلاح کے باوجود کوئی فروگزاشت ہوگئی تو یقیناً وہ اپنے بندوں کو معاف کر دینے والا ہے۔

اگر اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو انجام کیا ہوگا؟ جدائی ہو جائے گی

۲۱۴ اصلاح کا مطلب کیا تھا؟ یہی کہ جدائی نہ ہو لیکن اصلاح ممکن نہ رہی تو کیا ہوگا؟ جدائی۔ فریقین نے اپنی طرف سے کوشش کی لیکن اس کے باوجود جدائی ہوگئی تو اب یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں اپنے اندر کسی قسم کا کینہ و بغض کو جگہ نہ دیں اور اپنا گناہ دوسرے پر تھوپنے کی کوشش نہ کریں۔ اللہ سے دعا کریں

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ
اتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ
وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَمِيدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي

لوگوں کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور خود تم کو بھی یہ حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو اور اگر نہ مانو گے تو نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ سو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کیلئے ہے ۲۱۵ وہ بے نیاز ہے اچھی تعریف کیا ہوا۔ ۱۳۱

اور اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کارسازی کیلئے

کہ اللہ دونوں کے حالات کو علیحدگی اختیار کر لینے کے بعد درست فرما دے اور فریقین کو جو تکلیف پہنچ گئی اس کا ازالہ ہو جائے۔ اگر میاں کی طرف سے اصلاح ممکن نہیں ہوئی تو ظاہر ہے کہ نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر عورت کی طرف سے وقت نہ گزرنے کی پہل ہوتی ہے تو نتیجہ خلع ہوگا اور پھر دونوں کا اصل مدعا تو فریقین کی جدائی ہے وہ ہوگئی۔ اب دوسرے معاملات میں جو یقیناً مال ہی کے متعلق ہوں گے ان میں بھی ایک دوسرے پر زیادتی کی کوشش نہیں ہونی چاہئے اگر طلاق میاں کی طرف سے ہوئی ہے تو اس کو کوئی حق نہیں کہ جو کچھ اس نے بیوی کو حق مہر کی صورت میں یا تحفہ و تحائف کی صورت میں دیا ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اگر ابتداء عورت کی طرف سے ہوئی ہے تو میاں کو حق ہے کہ وہ اپنا دیا ہوا مال واپس لینا چاہے تو لے لے لیکن بہتر پھر بھی یہی ہے کہ اپنا حق یعنی دیا ہوا مہر واپس نہ لے بلکہ اس کو چھوڑ دے۔ اصل چیز تو تعلقات تھے جب وہ کسی سبب بحال نہ رہ سکے تو مال دنیا کی کوئی حقیقت بھی ہے؟

اللہ نہ کرے اگر ایسے حالات پیدا ہو ہی جائیں تو فریقین اور فریقین کے لواحقین ایک دوسرے پر الزام دھرنے کی بجائے ایک دوسرے کیلئے مدد و معاون ہوں اور جو کچھ ہوا ہے اس کو "مِنَ اللّٰہِ" سمجھیں اور یقین جان لیں کہ اگر ان کا یہ تعلق کسی سبب سے قائم نہیں رہ سکا تو اس میں یقیناً کوئی بہتری ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو اصل حقیقت سے آگاہ ہو اگر آج ان کا یہ تعلق قائم نہیں رہا تو پیچھے سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ پھر جب بھی ایسا ہوا اور جہاں بھی ہوا اس کا نتیجہ فریقین کے لئے اچھا ہی رہا اس لئے جو تکلیف دونوں فریقوں کے مقدر میں تھی پہنچ گئی۔ اب اس کا ازالہ کرنے والی بھی واحد ذات رب کریم ہی کی ہے ہم دعا کر سکتے ہیں کہ فریقین کی اس تکلیف کا بھی وہ ازالہ فرما دے۔

تم کو اور تم سے پہلوں کو تقویٰ کی وصیت کی اور کہا کہ اگر کفر کرو گے تو نقصان تمہارا ہی ہو گا

۲۱۵ بار بار اس بات کا اعلان کہ "اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے" جیسا کہ آیت ۱۲۶ میں پھر اس آیت ۱۳۱ میں دوبارہ اور پھر یہی بات آیت ۱۳۲ میں آخر کیوں؟ قبل ازیں کئی بار یہ بات بیان کی گئی کہ قرآن کریم کا نزول عین اس زبان اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہے جو انسان روزمرہ بولتے ہیں۔ یہ فطرۃ انسانی کا مسئلہ ہے کہ جب ساری نصیحتیں کر چکتا ہے اور ایک بات کو بار بار بیان کر کے گویا تھک جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا اس کا اثر اتنا نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا تو وہ اپنے تنبیہہ کے فقرہ کو بار بار دھراتا ہے کہ اچھا اگر نہیں مانو گے تو میرا کیا نقصان ہے جو کچھ نقصان ہے وہ سراسر تمہارا ہی ہے۔ کوئی پوچھے کہ اگر تم کو آخر الکلام یہی کہنا ہے کہ جو نقصان ہے وہ سراسر تمہارا ہی ہے تو پھر ان کو نصیحت کیوں کرتے ہو؟ جب نقصان ان ہی کا ہے آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تو آخر ان کو بار بار یہ کہنے کا فائدہ؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نہ ماننے سے دراصل نقصان اس کا بھی ہے اگرچہ وہ نظر نہ آتا ہو وہ کیا؟ وہ یہ کہ ان کی ہدایت سے اس کو دلچسپی ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ ہدایت قبول کریں اور اپنا نقصان نہ کریں کیونکہ اس کی محبت اور پیار کا یہ تقاضا ہے اور ان کا نقصان یقیناً اس کو شاق گزرتا اور دکھ دیتا ہے لیکن جب اس کی بات قبول نہیں کی جاتی تو آخر الکلام افسوس کے ساتھ اس کے منہ سے یہ بار بار نکلتا ہے کہ ہدایت کو قبول نہ کر کے میرا کیا بگاڑو گے جو کچھ بگاڑو گے وہ تمہارا ہی ہو گا۔

بالکل یہی صورت حال یہاں ہے۔ مومنین، منافقین اور مخالفین اہل کتاب کو ہدایات دی گئیں اور اس سورۃ میں بھرپور ہدایات دی گئیں لیکن لوگوں نے ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ کیا جتنا کہ کرنا چاہئے تھا تو بات بات کے بعد فقرہ دہرایا گیا کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے۔" اگر تم نہیں مانتے تو وہ کتنی مخلوق ہے جو اللہ کی فرمانبرداری میں مصروف ہے حتیٰ کہ زمین و آسمان کی ساری مخلوق اس کی فرمانبردار ہے اگر تم اللہ کے نہیں بنتے تو نہ بنو اللہ ہی کا تو ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اگر تم نہیں مانو گے تو آخر اللہ کا کیا بگڑے گا؟ وہ تو بلا شرکت غیرے پوری کائنات کا خود مالک ہے اور ان فقرات میں گویا وہ تاسف اور درد مخفی ہے جو محبوب کو تکلیف میں دیکھ کر محب کے دل میں گزرتا ہے۔ انسان کی محبت اللہ کو یقیناً ہے اس لئے کہ پوری کائنات میں سے اس نے اسی کو منتخب کیا تھا اور اس کا بگاڑ اللہ کی رضا مطلق نہیں ہے بلکہ اللہ کو انسان کا دکھ اور مصیبت میں مبتلا ہونا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا لیکن جو قانون اس نے عذاب و نجات کا مقرر فرمایا ہے وہ بھی اس نے اپنے اختیار و ارادہ ہی سے مقرر فرمایا ہے پھر جو اس کے قانون کی زد میں آئے وہ اس کو اس سے بچانے کیلئے بھی تیار نہیں کیونکہ وہ ہر ایک کا رب ہے اور ہر ایک کا خالق ہے اور ایک کی رعایت سے دوسرے کا حق ضائع ہوتا ہے اور وہ یہ کام کسی حال میں بھی کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چونکہ اس کا اعلان عام ہے کہ "اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً تم کو اور زیادہ دیا جائے گا لیکن اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت

الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ
وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ
يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ

۲۱۶ اس کا کارساز ہونا کفایت کرتا ہے۔ ۱۳۲

۲۱۷ لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ ۱۳۳

جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے۔ وہ

ہے۔" اچھا شکر گزاروں کو زیادہ مل گیا اور اگر ناشکروں کو اور ناقدروں کو بھی اتنا ہی مل گیا تو اس اعلان الٰہی کا کیا ہوا؟ اعلان کیا تھا کہ اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔ اعلان الٰہی تو اس وقت ہی سچ ہوا جب شکر گزاروں کو ملنے کے ساتھ ساتھ ناشکر گزاروں کو عذاب بھی دیا جائے کیونکہ شکر گزاروں کا حق بھی اسی وقت ادا ہوتا ہے جب ایسا ہو پھر یہ ممکن کیوں کر ہوا کہ اب ایسا نہ ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا قانون نہ ہوا موم کی ناک ہوگئی کہ جدھر کو چاہو موڑ لیا۔

کارساز حقیقی وہی ہے اور آسمانوں اور زمین کی حکومت اس کی ہے یہ بات ایک مثال سے سمجھ لو

۲۱۶ ابھی بات سمجھ میں نہیں آئی آیئے ایک اور طریقے سے غور کریں۔ آپ کا مال چور لے بھاگے اور آپ کو زدوکوب بھی کیا اور بے عزت بھی اور مال بھی لوٹ لیا۔ حکومت کا فرض کیا ہے؟ چوروں کو تلاش کرے۔ آپ کا مال جو وہ اڑا لے گئے تھے وہ واپس کرائے اور آپ کو سامنے کھڑا کر کے ان کو اذیت اور تکلیف بھی پہنچائے جیسا کہ وہ آپ کو پہنچا چکے تھے۔ حکومت نے زور لگایا چور معلوم کر لئے آپ کا مال واپس کرا دیا اور چوروں کو بھی "الف" سے "ب" نہ کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کا حق ادا ہوگیا؟ آپ کا دل ٹھنڈا کیسے ہوتا ہے؟ ان کو کچھ نہ کہنے سے۔ ان کو چھوڑ دینے سے ظاہر ہے کہ آپ بھی کہیں گے کہ نہیں اور ہر صاحب عقل یہی کہے گا کہ نہیں بلکہ ان کو قرار واقعی سزا بھی ملنا ضروری ہے کم از کم وہ جو قانون کے اندر موجود ہے اگر وہ ان کو نہ ملے تو آپ کا حق صحیح معنوں میں ادا نہیں ہوتا۔ بس یہی مطلب یہاں سمجھ لو کہ اللہ قادر مطلق ہے لیکن وہ نہیں چاہتا کہ جو دوسروں نے تم کو اذیت پہنچائی اس کے عوض میں کم از کم اتنی اذیت ان کو نہ پہنچائے جتنی وہ تم کو پہنچا چکے۔ وہ آسمانوں اور زمین کا اکیلا مالک و مختار ہے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کی حکومت میں زیادتی کرنے والوں کو قرار واقعی سزا نہ ملے۔ ہاں! اس کے ہاں! دیر ضرور ہے کیونکہ یہ اس

کے قانون کا تقاضا ہے لیکن اندھیر بالکل نہیں۔ اس لئے یقیناً وہ وقت آنے والا ہے کہ ان کی جھوٹی پیشانیوں کو پکڑ لیا جائے اور وہ مار ان کو دی جائے جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔

لوگو! غافل نہ ہو تم کو لے جا کر دوسروں کو لا بسانے کا قانون بھی اس کے ہاں موجود ہے

۲۱۷ غور کرو گے تو اپنے گھر ہی سے تم کو اس کی شہادت میسر آجائے گی دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس گھر میں جس میں آج تم بس رہے ہو اگر تم کو یہ ورثہ میں ملا ہے تو آخر کیونکر ملا ہے۔ یہ وہی گھر ہے جو تمہارے باپ دادا نے بنایا تھا لیکن آج ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا اور آج تم اس کے مالک ہو۔ تم کو یقین نہیں آتا کہ کل تم نہیں ہو گے تو یہ گھر یہیں رہے گا لیکن اس کے مکین بدل چکے ہوں گے۔ یہی حال قومی زندگی کا ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرمانروائی کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمتی کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اس تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس رب کریم کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہو سکتا اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب نیکی کا پورا پورا اجر اور بدی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس مضمون کو بار بار دہرایا ہے اور گزشتہ قوموں کا ذکر فرما کر مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ وہ غور و فکر سے کام لیں اور اپنے انجام سے غافل نہ رہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے کہ

"قوم سبا کیلئے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں۔ فرمایا اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر بجا لاؤ۔ دیکھو یہ کتنا عمدہ اور پاکیزہ ملک ہے اور رب کریم ہے بخشش عنایت فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے دائیں بائیں والے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا سوائے ان بیریوں کے۔ یہ گویا ان کے کفر ہی کا بدلہ تھا جو ہم نے ان کو چکھایا اور ناشکرے انسانوں کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔" (سباء ۳۴ : ۱۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لئے بھلائی تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کیلئے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا

اللّٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۱۳۴﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ

سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱۳۴

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کیلئے

وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد بیت المقدس میں اس طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۳ تا ۷) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دین حق کو کچھ نقصان پہنچے گا قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ سچے مومنوں کا پیدا کر دے جنہیں اللہ دوست رکھتا ہو اور وہ بھی اللہ کو دوست رکھنے والے ہوں۔ مومنوں کے مقابلہ میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جان لڑا دیں گے اور وہ کسی کی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے اور وہ اپنے فضل میں بڑی ہی وسعت رکھنے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے۔" (المائدہ ۵ : ۵۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"موسیٰ علیہ السلام نے کہا قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں ملک میں اس کا جانشین بنائے پھر دیکھے اس جانشین کے بعد تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں؟" (الاعراف ۷ : ۱۲۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اگر تم قدم نہ اٹھاؤ گے تو یاد رکھو کہ وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کرے گا اور تم دفاع سے غافل ہو کر اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے اپنا ہی نقصان کرو گے اور اللہ تو ہر بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔" (التوبہ ۹ : ۲۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جس بات کیلئے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دی اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔" (ھود ۱۱ : ۵۷) ایک جگہ فرمایا :

"انسان کے آگے اور پیچھے ایک کے بعد ایک آنے والی قوتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے جب تک کہ وہ خود ہی اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے اور پھر جب اللہ چاہتا ہے کسی گروہ کو اس کی تغیر صلاحیت کی پاداش میں مصیبت پہنچے تو مصیبت پہنچ ہی کر رہتی ہے وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اس کا کارساز ہو۔" (الرعد ۱۳

: ۱۱۱) اگر مزید دیکھنے کا شوق ہو تو مندرجہ ذیل مقامات کا قرآن کریم میں سے مطالعہ کریں (سورہ الکہف ۱۸ : ۳۲، ۴۴) (۶۸ : ۱۷ تا ۳۳) (۷۶ : ۲۸) (۷۰ : ۴۰، ۴۱) (۵۶ : ۶۰، ۶۱) (۳۵ : ۱۵ تا ۱۷) (ابراہیم ۱۴ : ۱۹، ۲۰) (۲۴ : ۵۵، ۵۶) (الحج ۲۲ : ۳۹، ۴۱) (محمد ۴۷ : ۳۸)

اللہ کے پاس دنیا و آخرت کا ثواب موجود ہے وہ دیکھتا ہے کہ تمہاری چاہت کیا ہے؟

۲۱۸ دینے والے کا کام تو دینا ہی ہے لینے والے کے اپنے ظرف پر بھی اس کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر کوئی کچے گھڑے میں پانی ڈال لے تو آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ نہ گھڑا رہے گا اور نہ پانی؟ آخر دینے والے کا اس میں کوئی قصور؟ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو صرف دنیا ہی کے طلبگار ہوں اس لئے کہ جب دنیا ہی نہ رہی تو دنیا کا سروسامان کب رہا؟ قرآن کریم کا انداز حذف بھی بڑا عجیب ہے کہ جو جملے مذکور ہوتے ہیں وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ یہاں ایک جملہ محذوف بھی ہے پھر جب اس حذف کو کھول دیا جاتا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ اس آیت زیر نظر میں بھی ہے فرمایا مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا اس جگہ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابَ الدُّنْيَا کو حذف کر دیا گیا اور دوسرے میں وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ کو حذف فرما دیا دونوں جگہ مذکور جملے اپنے محذوف جملوں کی خود نشاندہی کر رہے ہیں اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں کثرت سے ملتی ہیں۔ ترجمہ میں ان باتوں کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے مضمون کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دنیا کا مالک بھی اللہ ہی ہے وہ اس میں سے اس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخرت کا صلہ بھی بھرپور عطا فرمائے گا۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہہ اور موعظت ہے جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر اللہ کی شریعت سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی سمجھ کی کمزوری ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو آخرت کا طلبگار ہو اس کو دنیا میں بھی ملا اور آخرت میں بھی بوجہ اس کی طلب کے یقیناً اس کو ملے گا مزید تفصیل کیلئے دیکھو آل عمران آیت ۱۴۷، ۱۴۸ یہی مضمون وہاں بھی بیان ہوا۔

انسان کی اپنی کوتاہ نظری اور کم ہمتی ہے کہ وہ بارگاہ رب العالمین سے صرف دولت، شہرت، عزت اور وجاہت ہی کا سوال کرے اور اس کے سوا اس کی کچھ طلب ہی نہ ہو۔ ورنہ اس رب کریم و رحیم اور وہاب کی جناب سے تو جو مانگا جائے وہ ملتا ہے انسان صرف فنا ہونے والی نعمتوں کے سوال پر کیوں اکتفا کرے؟ کیوں نہ اس کی محبت کا جام رنگیں مانگے اور اس کی رضا کیلئے دامن طلب پھیلائے۔ جب دینے والا بخیل نہیں تو مانگنے والا بخل کیوں کرے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ

سچی گواہی دینے والے ہو۔ ۲۱۹ اگر تمہیں خود اپنے خلاف یا اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے

مسلمانوں کو ہدایت کہ انصاف اور سچی گواہی کیلئے تیار رہو' آزمائش کسی وقت بھی ہو سکتی ہے؟

۲۱۹ اس آیت میں تمام مسلمانوں کو عدل و انصاف پر قائم رہنے اور سچی گواہی دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ پوری دنیا کے مقابلے میں دراصل سچی گواہی مسلمانوں ہی کے پاس ہے کہ وہی اس کتاب ہدیٰ کے وارث اور اللہ تعالیٰ کی آخری وحی کے مخاطب ہیں اور یہی وہ سچی گواہی ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جو چیزیں قیام عدل یا سچی گواہی میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں ان کو نہایت بلیغ انداز میں دور کر دیا گیا ہے۔ "اور انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے" فرما کر یہ ہدایت دی کہ انصاف کے علمبردار بنو' تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہ ہو بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کیلئے جس سہارے کی ضرورت ہے' اپنے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

دنیا میں یہ شہادت قائم کرنے کیلئے اللہ کے دین کے مددگار ہونا ضروری ہے اور دین کی مدد اس سے ممکن نہیں جو خود ہی کمزور ہو۔ اس لئے قوم مسلم اور کمزوری دو متضاد چیزیں ہیں۔ کاش کہ آج مسلمان بھی اس بات کو سمجھتے ہوتے۔ کہنے کو تو لوگ اس کو جو بیچارا اٹھنے بیٹھنے سے عاری ہے "پہلوان" کہہ دیتے ہیں۔ جس کے گھر میں بھوک کا ڈیرہ لگ جائے لوگ اس کو "سیٹھ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پرلے درجے کے جاہل اور عقل و دانش نام کی کوئی چیز جن میں موجود نہ ہو وہ لوگوں میں "میاں جی" اور "مولانا" کے خطابات سے مشہور ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بات حقیقت بھی ہے؟ اگر نہیں تو پھر سب جانتے ہیں کہ یہ ایک طرح کا مذاق اور استہزاء ہے کہ اس طرح سے ان کے نام رکھ دیئے گئے ہیں اور اب وہ انہی ناموں سے معروف ہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجنے کا اور پھر ان کے بعد دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجتے رہنے کا اور ان پر کتابیں نازل کرنے کا اہم مقصد یہی تھا کہ دنیا میں انصاف اور اس کے ذریعہ امن و انصاف قائم ہو اور ہر فرد انسانی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنا لے اور جو لوگ تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ عدل و انصاف کی طرف نہ آئیں بلکہ اپنی سرکشی پر اڑے رہیں ان کو قانونی سیاست اور تعزیر و سزا کے ذریعہ انصاف پر قائم رہنے کیلئے مجبور کیا جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا میں اللہ کے جتنے رسول بھی مبعوث کئے گئے وہ سب تین چیزیں لے کر

إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ

خلاف بھی گواہی دینی پڑے جب بھی نہ بھجکو۔ خواہ کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔[۲۲۳] پس ایسا نہ ہو کہ ہواءِ نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے اور اگر

آئے تھے۔ ۱۔ "بینات" ۲۔ "کتاب" اور ۳۔ "میزان" یہ اتحاد ثلاثہ کیوں کیا؟ فرمایا اس لئے کہ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ "تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔" پھر فرمایا جو لوگ ان تین اصولی چیزوں سے درست نہ ہوں ان کو سیدھا کرنے کیلئے ہم نے "لوہا نازل کیا ہے جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کیلئے منافع ہیں۔"

قرآن کریم کا انداز بیان سمجھو' لوہا کیا ہے؟ یہ سیاسی اور جنگی طاقت ہے اور اس طرح سے کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں کو قیام عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کیلئے مبعوث نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے۔ اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑا جا سکے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :

"ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب' میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کیلئے منافع ہیں۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ اس بات کو ظاہر کر دے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔" (الحدید ۵۷ : ۲۵)

گواہی کی اہمیت کو سمجھنے کیلئے زیر نظر آیت کا پڑھنا ہی نہیں سمجھنا بھی ضروری ہے

۲۲۰ مشہور ہے کہ پیسہ کمانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا خرچ کرنا مشکل ہے اور یہ حقیقت بھی ہے بالکل اسی طرح ایک بات کا جاننا یعنی علم رکھنا اور پھر اس بات کو بیان کرنا ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے جاننا تو مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے اور بیان کرنا گواہی طلب کرنے والے کے سوال کے جواب سے متعلق ہے اور اس کا تجربہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب ایک ہی واقعہ کے دیکھنے والوں سے پوچھا جائے تو ان کے جواب سے معلوم ہوگا کہ اس میں کتنا فرق پڑ سکتا ہے اور کیسے؟ پھر کسی مقدمہ کا سارا انحصار شہات پر رکھا گیا ہے' کیوں؟ اس لئے کہ اس کے سوا حق و ناحق معلوم کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ تم حق و انصاف پر اس مضبوطی سے قائم رہنے والے ہو جاؤ کہ دنیا کی کوئی چیز بھی تم کو اس سے نہ ہلا سکے۔ پھر ان ساری چیزوں سے بھی آگاہ کر دیا جو حق کی شہادت کے بیان کرنے میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں پہلے تو انسان کی اپنی جان ہے کہ وہ سب سے زیادہ شہادت حق بیان کرنے کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی ہے اور اسی کے

باعث انسان گواہی دینے سے کترا جاتا ہے کہ اس شہادت کے پیش کرنے سے اس کا اپنا یہ یہ نقصان ہو سکتا ہے اس لئے اس کو گواہی نہیں دینی چاہئے۔ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچائی خود ان کی اپنی ذات ہی کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور عزیز و اقارب کے خلاف ہو۔ ہدایت الٰہی تو یہی ہے کہ ایسے نازک حالات میں بھی بات وہی کی جائے جو حق ہے اور اس کے خلاف زبان کچھ نہ کہے۔ پھر سچی گواہی دینے کیلئے کسی مالدار کے مال اور صاحب اقتدار کے اقتدار اور کسی غریب و فقیر کی غربت اور فقر کا لحاظ نہ کیا جائے اور یہ بھی کہ جب گواہی طلب کی جائے تو اس سے باز نہ رہو بلکہ حق اگر تم جانتے ہو تو اس کو بیان کرو اور صاف صاف بیان کرو گھما پھرا کر کچھ نہ کہو جس سے حقیقت مشتبہ ہو جائے۔

یہ تو قرآن کریم کا حکم ہے اور پھر خصوصاً مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے اور آج بھی سب مسلمان ہیں اور ہم سب کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی سچی کتاب اور اس کے احکامات سے بڑھ کر کوئی سچا حکم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ کیا ہمارا عمل بھی اس عقیدہ کے مطابق ہے؟ کسی دہ میں' قصبہ میں' شہر میں' عوام میں' خواص میں' مذہبی راہنماؤں میں' سیاسی لیڈروں اور پورے ملک کی اہم ترین شخصیتوں میں۔ کیا گواہ ہونے اور گواہ بنائے جانے میں کوئی فرق ہے؟ آج گواہ ہوتے ہیں یا گواہ بنائے جاتے ہیں؟ شہادت دی جاتی ہے یا شہادت سکھائی اور پڑھائی جاتی ہے؟ ایف' آئی' آر درج کراتے وقت کیا ہوتا ہے؟ ایف' آئی' آر درج کرانے والے' درج کرنے والے' شہادت دینے والے اور شہادت دلوانے والے سب کون ہیں؟ قرآن کریم کا حکم ایک بار پھر سن لو ارشاد فرمایا "مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کیلئے سچی گواہی دینے والے ہو اگر تمہیں خود اپنے خلاف' یا اپنے ماں' باپ اور قرابت داروں کے خلاف بھی گواہی دینی پڑے جب بھی نہ جھجکو' اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے' پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے اور اگر تم گواہی دیتے ہوئے بات کو گھما پھرا کر کہو گے یا گواہی دینے سے پہلو تہی کرو گے تو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔" اور دوسری جگہ ارشاد الٰہی اس طرح ہے۔

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ اللہ کی سچائی کیلئے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کیلئے گواہی دینے والے ہو اور دیکھو ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی اس بات کیلئے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے" (المائدہ ۵ : ۸) اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اگر ان کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہئے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور ان کی شرارتوں کی کچھ پروا نہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (المائدہ ۵ : ۴۲) اور سورہ النساء ہی کی آیت ۵۸ پر یہ مضمون گزر چکا ہے وہاں سے بھی ملاحظہ فرمالیں۔

اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

تم بات گھرا پھرا کر کہو گے یا گواہی دینے سے پہلو تہی کرو گے تو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۲۲۱ ۱۳۵

مسلمانو! اللہ پر ایمان لاؤ۔ اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اس

ان ساری آیات کو بیان کرتے وقت چونکہ شان نزول کے طور پر ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مخزومیہ نے چوری کی تھی اس لئے ان لوگوں کو بڑی فکر ہوئی انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کرے' پھر فلاں کو مقرر کیا گیا' اس نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے سفارش کی سفارش قبول نہ کی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ تم نے حدود اللہ میں مداخلت کی کوشش کی وغیرہ وغیرہ تو ان واقعات کو پڑھ کر قرآن کریم کی ان آیات کو انہی گزشتہ واقعات کے ساتھ ہی وابستہ کر کے بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ کبھی خیال بھی نہ آیا کہ یہ حکم تو عام ہے آج جو ہم حرکات کر رہے ہیں یہ آیات ہم کو ان سے باز رکھنے کیلئے ہیں۔ یہ تو ہماری علمی صورت ہوئی اور عملی صورت یہ ہوئی کہ ان آیات کا درس دیا جاتا ہے ان پر وعظ کئے جاتے ہیں' تفاسیر لکھی جاتی ہیں' پڑھی جاتی ہیں لیکن ہم ان وعظ کہنے والوں' ان درس دینے والوں' ان تفاسیر لکھنے والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جب وقت آتا ہے تو یہ سب بھی وہی کرتے ہیں جو زمانے میں سارے لوگ کر رہے ہیں اس طرح نہ ہم کو علمی راہنمائی صحیح ملتی ہے اور نہ ہی عملی تو ہم سب ان آیات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کی آیات ہیں۔ ہم سب قرآن کریم کو ثواب کی خاطر پڑھتے ہیں اور اس طرح ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں کماتے ہیں اور ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ نیکی چیز کیا ہے؟ اور وہ کس کو کہتے ہیں؟ اور ایسے ایمان اور ایسے عقیدہ پر ہمیں کبھی تعجب نہیں ہوا۔

مسلمانوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کرنے کی حقیقت کیا ہے؟

۲۲۱ اس دنیا میں جتنے انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کیلئے آئے وہ سب کے سب داعیان اسلام ہی تھے اور سب کا اصل دین ایک ہی تھا۔ پیروان مذاہب نے اپنی اپنی پہچان کیلئے الگ الگ نام رکھ لئے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دین کی سچائی سب کے پاس تھی لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے۔ مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ جس طرح پہلے لوگوں نے اپنے نام "یہودیت" "عیسائیت" اور "صابیت" وغیرہ رکھ لئے ہیں تم بھی صرف اپنے دین کا نام "اسلام" رکھ کر مطمئن نہ ہو جاؤ کہ اب ہم

دوسرے گروہ سے نکل کر ایک نئے گروہ "اسلام" میں داخل ہوگئے تو بس مسلمان ہوگئے اس لئے کہ "اسلام" کسی گروہ بندی کا نام نہیں بلکہ ان ساری گروہ بندیوں سے نکل کر "اللہ کے رسول پر ایمان لانا اور اس کی کتاب پر ایمان لانا جو اس نے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائی ہے اور بالکل اسی طرح ان کتابوں پر جو اس سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر نازل کی تھیں اور یاد رکھو جس کسی نے اللہ سے انکار کیا اور اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان نہ رکھا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستے سے بہت دور جا پڑا۔"

مطلب بالکل صاف ہے کہ اس کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو کلمہ اسلام کا اقرار کر کے ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے مگر ایمان کے تقاضے پورا کرنے اور مومن کا سا طرز عمل اختیار کرنے سے پہلو تہی کر رہے تھے کہ تم اسلام لانے کے بعد اسلام کو ایک گروہ یا پارٹی نہ بنا لو کہ پہلے تین تھے تو اب چار ہوگئے بلکہ اسلام نام ہے صحیح معنوں میں اسلام کی ہدایات کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرنے کا۔ اگر تم نے وہ نہ کیا تو گویا اس طرح تم نے اس گروہ بندی میں جو اسلام سے پہلے موجود تھی ایک مزید گروہ کا اضافہ کر دیا۔ حالانکہ اسلام کی ہدایت تو یہ تھی کہ :

"جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں اس کا نتیجہ اللہ انہیں بتلا دے گا۔" (الانعام ۶ : ۱۶۰)

آپ کو معلوم ہے کہ آپ سے یعنی "اسلام" سے پہلے "یہود نے کہا کہ عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے اور اس طرح عیسائیوں نے کہا کہ یہود کے پاس کیا دھرا ہے حالانکہ دونوں ہی اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور پھر ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو ان مقدس کتابوں کا علم نہیں رکھتے' اچھا جس جس معاملہ میں وہ باہم دگر جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دے گا اور اس وقت حقیقت حال سب پر کھل جائے گی۔" (البقرہ ۲ : ۱۱۳)

پھر تعجب ہے کہ ایک دوسرے کو اس طرح نیچا دکھانے والوں نے جب دیکھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ اللہ کا دین اس کی اصل حقیقت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور ہر ایک کی بھلائی کو بھلائی تسلیم کرنے کے باوجود ہر ایک کی برائی کو بھی برائی سمجھتے ہیں اور کسی ایک گروہ بندی کا ساتھ نہیں دیتے تو فوراً دونوں اکٹھے ہو کر اسلام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس طرح اعلان کرتے ہیں کہ :

"اور یہود و نصاریٰ نے مل کر کہا کہ جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ یہودی یا عیسائی نہ ہو جائے یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی میں داخل نہ ہو' یہ ان لوگوں کی جاہلانہ امنگیں ہیں۔ اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے کہہ دو' اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں! حقیقت تو

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا

نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔ نیز ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کی تھیں اور دیکھو جس کسی نے اللہ سے انکار کیا اور اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان نہ رکھا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستے سے بہت دور جا پڑا۔ ۱۳۶ ۲۲۲

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے' پھر ایمان لائے پھر کفر میں

یہ ہے کہ جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا اس کیلئے نہ تو کسی قسم کا کھٹکا ہے اور نہ ہی کسی طرح کی نمگینی۔" (البقرہ ۲ : ۱۰۶) اور اس طرح قرآن کریم نے مسلمانوں کو خصوصاً ہدایت دی کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو' صرف دعویٰ ایمان نہیں عمل صالح بھی لازم ہے۔ جس طرح یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی گروہ بندی بنا لی تھی تم بھی اسی طرح کی ایک گروہ بندی نہ بنا لینا اس لئے کہ اس کے ساتھ نجات کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے آج ہم نے وہی کچھ کیا جس سے ہم کو منع کیا گیا تھا بلکہ اس سے بھی کہیں آگے نکل گئے۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ آیت ۶۲ جہاں اس کی بہت تفصیل کر دی گئی ہے۔

اقرار باللسان کا اعتبار اس صورت میں ہو گا جب تصدیق بالقلب بھی ہو گی

---

۲۲۲ زبان سے اقرار کرنے کے بعد اس بات کو بھول جانا کہ میں نے کیا اقرار کیا تھا؟ ایسے بھول جانے کے اقرار کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی بلکہ اس طرح خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے جب آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کس کا بندہ ہے تو لازماً وہ دنیا میں اپنی ایک غلط حیثیت متعین کر بیٹھتا ہے اور اس کی ساری زندگی اس بنیادی غلط فہمی کے باعث غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے تو وہ اس ایک کی بندگی تو نہیں کرتا جس کا وہ درحقیقت بندہ ہے اور ان بہت سوں کی بندگی کرتا رہتا ہے جن کا وہ فی الواقع بندہ نہیں ہے۔ یہ پھر ایک عظیم اور ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو اس کی ساری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان کا اصل مقام دنیا میں یہ ہے کہ وہ بندہ ہے آزاد و خودمختار نہیں ہے اور پھر یہ بھی کہ وہ بندہ ہے صرف ایک اللہ کا اس کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں ہے جو شخص اس

ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾

پڑ گئے اور پھر برابر کفر میں بڑھتے ہی گئے۔ اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ انہیں کوئی راہ دکھائے۔ ۱۳۷ ۹۲۲۳ اے پیغمبر اسلام! تم منافقوں کو یہ خوشخبری سنا دو کہ بلاشبہ ان کے لئے ۹۲۲۴ عذاب دردناک ہے۔ ۱۳۸

بات کو نہیں جانتا وہ حقیقت میں خود اپنے آپ کو نہیں جانتا جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے کہ وہ اقرار بالسان کے باوجود وہ کچھ کرتا رہتا ہے جو کچھ وہ اس اقرار سے پہلے تھا اور بظاہر جو تبدیلی ہوتی ہے وہ اتنی ہی ہوتی ہے کہ پہلے وہ کافر تھا اور اب اس کو منافق کہہ سکتے ہیں لیکن اس تبدیلی کا اس کو کچھ فائدہ؟

بندوں میں جو اپنا اعتبار کھو دیتا ہے اس پر قیاس کرلو جس کا اعتبار اللہ کے ہاں نہ رہا

۹۲۲۳ کیا لوگوں میں جس انسان کا کوئی اعتبار نہ رہے وہ عزت والا کہلاتا ہے؟ نہیں نہیں وہ تو بے عزت بھی ہوتا ہے اور بے غیرت بھی پھر جس کا اعتبار عند اللہ ہی کچھ نہ رہا اس کا کیا ہوگا؟ اور منافق کی یہی حالت ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اعتبار نہیں ہوتا اور وہ اپنے نفاق کی حالت کو جتنا چھپاتا ہے وہ ظاہر ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر ایمان کی راہ اختیار کرلی تھی مگر فی الحقیقت ایمان سے محروم تھے چنانچہ بار بار آئے اور بار بار الٹے پاؤں گئے۔ سو ایسا ایمان ایمان نہیں ہے فرمایا ایسے لوگوں کی نہ تو عنداللہ مغفرت ہوگی اور نہ ایسے لوگوں پر سعادت و کامیابی کی راہ کھلے گی۔ اس کی تفصیل چونکہ پیچھے اس جلد کی سورہ آل عمران کی آیات ۸۶ تا ۹۰ گزر چکی ہے اس لئے اس کو وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

منافقین کیلئے دردناک عذاب کی بشارت ہے وہ اچھی طرح سن لیں

۹۲۲۴ منافق منافقت کیوں کرتا ہے؟ دراصل وہ چاہتا ہے کہ اس کو فریقین عزت کی نگاہ سے دیکھیں یعنی کفر پر ڈٹے ہوئے لوگ بھی ان کی عزت کریں اور ایمان کی راہ اختیار کرنے والے بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور یہ بات وہ بالکل فراموش کر جاتے ہیں کہ دو کشتیوں پر سوار ہونے والا ایک پر کبھی سوار نہیں ہو سکتا اور پھر اس کا نتیجہ بھی وہی نکلتا ہے جیسا اس کا عمل ہوتا ہے۔ جس بات کے وہ متلاشی ہیں ان کو وہ فراموش کر بیٹھے ہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ "پیاز بھی کھاتے ہیں اور جوتے بھی" فرمایا جس عزت کی ان کو تلاش ہے وہ ان کو کبھی نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسوں کو عزت نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہیں اور آخرت میں بھی۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ
نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا

جو لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو اپنا رفیق و مددگار بناتے ہیں' تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کے پاس عزت ڈھونڈیں؟ تو عزت جتنی بھی ہے سب کی سب اللہ ہی کیلئے ہے۔[۲۲۵] ۱۳۹ اور دیکھو' اللہ اپنی کتاب میں تمہارے لئے یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم دیکھو اور

حقیقی عزت تو اللہ' اس کے رسول اور ایمان والوں ہی کیلئے ہے

۲۲۵ معاشرہ اسلامی نہ ہونے کے باعث اگر ان کو اس دنیوی زندگی میں کوئی مقام حاصل ہو بھی گیا تو آخرت جو ان کی برباد ہو گئی تو اس چار دن کی چاندنی میں ان کے حصے کیا آیا؟ اور کیا ہے جس پر وہ پھولے نہیں سماتے؟ عبداللہ بن ابی سردار المنافقین نے بھی یہی بات کہی تھی "مدینہ پہنچ کر جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ فرمایا اس نے کیا سمجھا؟ یعنی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کیلئے ہے مگر ان منافقوں کو اس بات کا علم نہیں۔"

اتفاق دیکھئے کہ جب وہ بات کہہ رہا تھا تو اس وقت زید بن ارقم اس مجلس میں موجود تھے اگرچہ وہ بچے تھے تاہم انہوں نے ابن ابی کی یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دی۔ آپ ﷺ نے اس وقت عبداللہ بن ابی کو طلب کیا اور اس سے یہ بات پوچھی وہ آیا اور اس بات کا صاف صاف انکار کر دیا اور اس پر قسم کھا گیا تو انصار کے بڑے بوڑھوں نے اور خود میرے اپنے چچا نے مجھے بہت ملامت کی زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس بات سے مجھ بہت دکھ ہوا اور میں دل گرفتہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر سورہ منافقون کی یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا کر ہنستے ہوئے میرا کان پکڑا اور فرمایا لڑکے کا کان سچا تھا اللہ نے اس کی خود تصدیق فرما دی (ابن جریر طبری) نتیجہ کیا نکلا؟ کہ مدینہ میں داخل ہونے لگے تو عبداللہ کے اپنے ہی بیٹے نے جس کا اسم گرامی بھی عبداللہ ہی تھا ننگی تلوار لے کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور باپ کو خبردار کیا کہ مدینہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تو تیرا سر قلم کر دیا جائے گا کیونکہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کیلئے ہے تیرے لئے نہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے مداخلت فرمائی اور اس کے راستے سے اس کے بیٹے کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔ زیر نظر آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ "منافق کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ کفار سے عزت کی تلاش کرتے

وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ

سنو کہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے تو جب تک کسی دوسری بات میں لوگ نہ لگ جائیں ان کے پاس نہ بیٹھو[۲۲۶] اگر بیٹھو گے تو تم بھی انہیں جیسے ہو جاؤ گے۔ بلاشبہ اللہ منافقوں کو اور منکرین حق کو سب کو جہنم میں اکٹھا کر دینے والا ہے[۲۲۷]۔ ۱۴۰

ان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ تمہاری حالت دیکھتے رہتے اور منتظر رہتے ہیں اگر تمہیں اللہ کی

ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ عزت جتنی بھی ہے سب کی سب اللہ ہی کیلئے ہے۔" اگر یہ فی الواقع عزت ہی کے متلاشی تھے تب ان کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے تھا۔

جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو اس مجلس میں مت بیٹھو

۲۲۶ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انہیں قائل کر کے ہی چھوڑنا ہے۔ ان کیلئے ہر لغو و مہمل اعتراض کا جواب ضرور دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنہیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہیں انہیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اتر آئیں تو اہل حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑنے میں اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کی بجائے انہیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہئے جو خود طالب حق ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھیں کہ ہر سوال کرنے والے کو اس طرح ٹال دیں اور یہ خیال ہی نہ کریں کہ ہم نے ان کے سامنے بات ہی کیا پیش کی ہے مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں فضول اور لغو باتیں بیان ہو رہی ہوں جن کا مقصد صرف دل لگی ہو جس طرح قصہ گو لوگ کرتے ہیں کہ ایک بات شروع کی جس کا نہ کوئی سر اور نہ پیر پھر اپنے ہی پاس سے باتیں بنانے لگے تو بناتے ہی چلے گئے اگر کہیں ایسی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہو تو پتہ چلنے پر فوراً اٹھ

کھڑے ہو اور اس ذہنی عیاشی میں حصہ مت ڈالو۔

ایسی دل لگی میں تم بھی لگ گئے تو گویا تم بھی وہی کچھ ہو گئے جو کچھ وہ ہیں

۲۲۷ بری صحبت کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہو سکتے مثل ہے کہ "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔" اللہ کی آیات کے ساتھ ٹھٹھہ اور مذاق کرنے والوں کے ٹھٹھہ میں تم بھی شریک ہوئے تو آخر ان میں اور تم میں فرق کیا رہا؟ ہم نوالہ و ہم پیالہ تو تم بھی ہو گئے۔ تمہارے ان یاروں کی صحبت کا اثر جو تم پر ہوا۔ آج نہیں تو کل تم بھی وہ کچھ ہو گے جو کچھ وہ ہیں۔ غزوۂ تبوک کے زمانہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اتنے لمبے سفر کیلئے نکل کھڑے ہونے کا ارادہ کیا منافقین کو معلوم ہوا تو وہ راتوں کو مجلسیں جماتے اور سادہ لوح مسلمانوں کو بھی مجلس میں بلا لاتے اور بیٹھ کر خوب گپیں ہانکتے اور اس طرح ان سادہ لوح مسلمانوں پر بھی اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے اور عجیب عجیب طرح کے فقرے کستے چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ مثلاً ایک محفل میں چند منافق بیٹھے گپ شپ لڑا رہے تھے ایک نے کہا "اجی رومیوں کو بھی تم نے کچھ عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ دیکھ لینا کہ کل یہ سب سورما جو لڑنے کیلئے تشریف لے جا رہے ہیں رسیوں سے بندھے ہوئے ہوں گے' اس پر دوسرا بولا تو کہنے لگا "مزا آجائے جو اوپر سے سو سو کوڑے بھی لگانے کا حکم ہو جائے۔" تیسرا بولا کہ ہاں! جی آپ کو "دیکھئے کہ اب روم و شام کے قلع فتح کرنے کیلئے جا رہے ہیں۔" چنانچہ ان کے اس رویہ اور اس طرح کی گفتگو کو محفوظ کر لیا گیا اور تاہم مسلمانوں کو حکم ہوا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو اور مذاق اڑاؤ اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کہ یہ تم کیا باتیں کر رہے تھے؟ تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کہو کہ کیا تمہاری ہنسی اور دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذر مت تراشو تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔" (التوبہ ۹ : ۶۴' ۶۵) اور ایک جگہ ارشاد فرمایا "اے پیغمبر اسلام! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ' جہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تم کو بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت آپ کو اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالموں کے پاس نہ بیٹھو ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے ہاں! ان کو نصیحت کر سکتے ہو تاکہ وہ غلط روی سے بچ جائیں۔" (الانعام ۶ : ۶۸' ۶۹) فرمایا تم میں یہ ہمت ہو کہ تم ان کو ان کی ایسی باتوں کا ڈٹ کر جواب دے سکتے ہو ان کی باتیں سن کر خاموش نہیں رہو گے تو اس مجلس میں ان کو دندان شکن جواب دو تاکہ وہ ایسی حرکت سے باز آجائیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھو عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ آیت ۱۴' ۱۵)

فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ
نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ
فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝۱۴۱ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ ع ۱۶

طرف سے فتح ملتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم بھی تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر منکرین حق کے لئے فتح مندی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم نے ایسا نہیں کیا کہ وہ بالکل غالب آگئے تھے پھر بھی تمہیں مسلمانوں سے بچالیا؟ تو یقین کرو اللہ قیامت کے دن تم میں اور ان میں فیصلہ کردے گا اللہ کبھی ایسا کرنے والا نہیں کہ کافر ایمان رکھنے والوں کے خلاف کوئی راہ پالیں۔[۲۲۸] ۱۴۱

منافق، اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اللہ نے ان کے دھوکا کو ضائع کر دیا ہے یعنی منافقین ہر وقت اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہارے متعلق کیا خبر گرم ہوتی ہے؟

۲۲۸ دو لڑنے والوں کیلئے ہار جیت تو لازم ہے کہ ایک ہارے گا تو دوسرا بہرحال جیتے گا۔ منافقین خود دور دور رہ کر اس بات کا انتظار کرنے کے عادی ہوتے ہیں کہ جہاں تک خالی بھڑکانے کا تعلق ہو دونوں طرف یہ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ بھڑک جائیں اور جب وہ وقت آجائے تو پھر وہ اس طرح غائب ہوتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ہاں! الگ تھلگ بیٹھ کر انتظار میں ہوتے ہیں اور بڑی شدت سے منتظر ہوتے ہیں کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک کی ہار ہوگی اور دوسرا جیت جائے گا۔ پھر جو طرف بھاری ہوگی یعنی جس کے حصہ میں جیت ہوگی یہ باتوں ہی باتوں میں اس کے ساتھی ہوں گے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ ان کو دو ٹوک سنایا کہ سن لو جس انتظار میں تم ہو ہمیں معلوم ہے لیکن یاد رکھو کہ مشیت میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہے گا لیکن ہمارا معاملہ صرف اس ظاہر ہار جیت پر ختم نہیں ہوتا ہماری کامیابی تو یقینی ہے اور ناکامی کا نام ہماری لغت میں موجود ہی نہیں تم صرف ظاہر داری کو دیکھتے ہو لیکن ہماری نظر صرف ظاہر داری پر نہیں ہمارے مقدر میں کبھی ایک نیکی ہوگی اور کبھی دو اور تم اس حقیقت سے ناآشنا ہو۔ ہم اگر میدان کارزار میں کام آئیں گے تو شہید ہو کر ابدی زندگی کی کامیابی پائیں گے اور اگر کامیاب ہوں گے تو غازی بھی ہوں گے اور مال غنیمت بھی ملے گا اور دونوں باتیں ہمارے لئے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ چنانچہ

ارشاد ہوا کہ :

"اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے' اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔" (التوبہ ۹ : ۵۲)

فرمایا یہ وہ لوگ ہیں کہ "اگر تم کو اللہ کی طرف سے فتح ملتی ہے تو اپنے کو تمہارا ساتھی ظاہر کرتے ہیں۔" اجی حضرت ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ماشاء اللہ جیت ہماری ہے۔ اگر ہم کو یہ عذر پیش نہ آیا ہوتا تو ہم تو سب سے آگے آگے ہوتے وہ تو ہماری بدقسمتی کہ ہم اس وقت اس کام کیلئے باہر چلے گئے تھے وقت پر حاضر نہ تھے ہمارا فلاں بیمار ہوگیا۔ ہمیں تو بڑا قلق تھا کہ ہم شریک نہ ہو سکے۔ اب کوئی ایسا موقع آئے گا تو ہم کو آپ پیش پیش پائیں گے ہم ڈرنے والے کب ہیں؟ ہم نے تو اتنا چندہ جمع کرایا تھا۔ عذر پر عذر پیش کریں گے اور قسموں پر قسمیں کھائیں گے یہ سارا کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ محض اس لئے کہ اس طرح ہمدردی ظاہر کر کے اس مال میں شریک ہو جائیں جو غنیمت میں اہل اسلام کے ہاتھ لگ گیا۔

فرمایا "اگر منکرین حق کیلئے کچھ حصہ نکل آتا ہے تو ان کی طرف دوڑے جاتے ہیں اور اپنا احسان جتانے کیلئے ان سے کہیں گے کیا ہم نے ایسا نہیں کیا کہ مسلمان تو تم پر بس غالب آئے کہ آئے تھے لیکن ہم نے اس طرح مداخلت کی اور تم کو مسلمانوں سے بچا لیا۔" آپ کو معلوم ہے ہمارے فلاں ساتھی ساتھ تھے ہم نے ان کو یہ بات سمجھا دی تھی انہوں نے وقت پر یہ یہ کام کیا تو مسلمانوں کو چھپنے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ ان کی خوب گت بنی ہے۔ اس طرح کی سینکڑوں باتیں بنائیں گے اور اس طرح ان کو یقین دہانی کرائیں گے کہ ہم نے پیچھے رہ کر دراصل تمہارا ساتھ دیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی یہ اس طرح کے کام کب تک کرتے رہیں گے۔ وہ دن تو کوئی دور نہیں اس لئے بس وہ آیا کہ آیا جب ان کا سارا کیا دھرا ظاہر ہو کر رہ جائے گا اور ان کو منہ چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی ہم ان کو اس طرح رسوا کرنے والے ہیں کہ یہ اپنوں اور پرائیوں کو منہ دکھانے کے نہیں رہیں گے۔ ہمارے قانون میں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر بالکل نہیں اور جب ہمارا پکڑنے کا وقت آئے گا تو ان کو کوئی مائی کا لال ہماری پکڑ سے نہیں بچا سکے گا۔

زیر نظر آیت میں ایک نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ میدان جنگ میں اگر کامیابی مسلمانوں کو ہوئی تو اس کو قرآن کریم نے "فتح" کے نام سے موسوم کیا لیکن اگر کفار کیلئے کوئی ایسی بات ظاہر ہوگئی تو اس کو "نصیب" سے موسوم فرمایا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو کچھ منکرین کے حصہ میں آیا وہ ایک وقتی چیز تھی جو دنیا کے لحاظ سے تو حقیر اس لئے تھی کہ اس کا تعلق آخرت کے ساتھ مطلق نہ تھا لیکن جو کچھ دنیا میں ان کے حصے میں آیا وہ بھی ایک معمولی بات تھی کہ اس سال یا اس وقت مسلمانوں کو کچھ تکلیف پہنچی تو صرف اس لئے کہ دوسرے مقام

خٰدِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ
وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ

مغلوب کر رہا ہے[۲۲۹] اور جب یہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔
محض لوگوں کو دکھانے کیلئے نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر برائے نام۔[۲۳۰] ۱۴۲

کفر اور ایمان کے درمیان متردد کھڑے ہیں کہ ادھر رہیں یا ادھر نہ تو ان کی طرف ہیں

پر یہی غلطی ان کو سبق سکھا دے تاکہ آئندہ وہ ایسی غلطی کے مرتکب نہ ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس طرح کی چالیں چل کر کیا منافقین اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟

۲۲۹ ان کی اس دوغلی پالیسی سے نقصان کس کا ہوگا؟ خود انہی کا تو ہوگا کیونکہ یہ اس راز سے واقف نہیں کہ دھوکہ دینے والا تو ہمیشہ خود ہی دھوکہ میں ہوتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ دھوکا میں جو کچھ کرتا ہے خود اپنی جان اور ذات پر کر رہا ہوتا ہے اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اس لئے کہ وہ اس قانون الٰہی سے انجان ہیں۔ پھر جو کسی دوسرے انسان کو دھوکہ دے جب وہ دھوکہ میں ہوتا ہے اس کے برعکس جو اللہ کو دھوکہ دے رہا ہو اس سے بڑھ کر بھی کوئی بے وقوف ہوگا کہ بھلا اللہ بھی کبھی دھوکا کھا سکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس طرح کی حرکت کر کے دھوکہ خود کھا رہا ہوتا ہے اور اپنی ناسمجھی سے وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ کو دھوکا دے رہا ہے۔ لیکن جب اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو یہ ہاتھ ملتا ہی رہ جائے گا کہ اس نے آسمان پر تھوک کر دراصل اپنے ہی منہ پر دھوکا ہے۔ اور جو منہ اس نے دیکھا ہے وہ دراصل اس کا اپنا ہی تھا کیونکہ اس کی نظر میں منہ تو تھا لیکن شیشہ اس کو نظر نہیں آیا۔

یہ لوگ اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں؟ غور کرو کہ دھوکہ دینے کا عمل کون کر رہا ہے؟ ان کو یہ معلوم نہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ لازم ہے کیا دھوکہ دینے کا عمل یہ کریں اور اس کا نتیجہ کوئی دوسرا بھگتے گا نہیں نہیں ہرگز نہیں "وَهُوَ خَادِعُهُمْ" وہ ان کو دھوکہ دینے کے عمل کا نتیجہ انہی کی طرف لوٹائے چلا جا رہا ہے کیونکہ اس قانون کے مقرر کرنے والا وہ دانا و بینا ہے جس سے بڑھ کر کوئی دانا و بینا نہیں ہو سکتا۔ غور کرو کہ وہ ان کو جو مہلت پر مہلت دیئے جا رہا ہے اور یہ ایسے بے وقوف ہیں کہ اپنے جہل و غرور سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ وہ مہلت پر مہلت کیوں دیتا ہے؟ اس لئے کہ اس کو پکڑتے کوئی دیر نہیں لگتی۔

یہ لوگ نمازوں میں شریک ہوتے ہیں تو ایسے جیسے کوئی مار' باندھ کر ان کو لے آیا ہے

۲۳۰ جس کام کو جی نہ چاہے لیکن انکار بھی ممکن نہ ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ آدمی شریک ہوتا

وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا

اور نہ ان کی طرف اور حقیقت یہ ہے کہ جس پر اللہ راہ گم کردے تو پھر ممکن نہیں تم اس کیلئے کوئی راہ نکال سکو۔ ۱۴۳ [۲۳۱]

ہے لیکن بے دلی کے باعث اس کا دل اچاٹ اچاٹ سا رہنے لگتا ہے۔ ان کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ نماز پڑھی تو پڑھی اور نہ پڑھی تو خیر ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہ میں درحقیقت نماز کوئی چیز نہیں بلکہ ایک قومی نشان ہے اگر وہ اس میں کبھی کبھار بھی شریک نہ ہوں تو قوم کیا کہے گی؟ پھر شریک ہوتے ہیں تو اس طرح کہ وقت ٹالتے رہتے ہیں اور بار بار اظہار کرتے ہیں کہ یار ابھی تو نماز بھی پڑھنا ہے اور اس طرح کا تذکرہ کرتے کرتے نہیں تھکتے اگر وہ وقت پر نماز ادا کرلیں تو اس طرح تذکرہ کیسے کریں گے؟ وقت ٹالتے ٹالتے جب بالکل قریب چلا گیا تو اٹھیں گے اور بھاگیں گے اور دو چار الٹی سیدھی ٹکریں ماریں گے۔ پوری نماز میں نہ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ انہوں نے کیا پڑھا ہے؟ نماز میں جی بالکل نہیں لگتا ہاں! کسی مجلس میں پھنس گئے جہاں لوگ نماز پڑھنے والے ہیں تو بہت جلدی کریں گے بار بار وقت دیکھیں گے اور بار بار وہی تذکرہ نماز کریں گے۔ کبھی اتنے ست کہ موذن اذان پکارتا ہے تو ان کے کان پر کبھی جوں بھی نہیں رینگتی اور کبھی اتنے پابند کہ وقت سے پہلے ہی گویا ان کا وقت نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کو دکھاوے کی ضرورت ہے وہ لوگوں کو یہ محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ وہ نمازی ہیں اور پھر ان سے داد بھی لینا چاہتے ہیں اور وہ اس طرح ان کو نہیں ملتی جب تک وہ اس طرح کا دکھاوا نہ کریں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ "وہ نمازوں کیلئے نہیں آتے مگر کسمساتے ہوئے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے مگر بادل نخواستہ" (التوبہ ۹ : ۹۴) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ منافق کی نماز ہے' یہ منافق کی نماز ہے' یہ منافق کی نماز ہے۔ عصر کے وقت بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے یعنی اس کے غروب کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے جس میں اللہ کریم کو کم ہی یاد کرتا ہے۔" (بخاری' مسلم و مسند احمد)

حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد یعنی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے والد سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے لوگوں کے متعلق پوچھا تھا جو نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کے وقت سے ٹال کر پڑھتے ہیں اور یہ حدیث ابن جریر' ابو یعلیٰ' ابن المنذر' ابن ابی حاتم' طبرانی فی الاوسط' ابن مردویہ اور بیہقی نے سنن میں بیان کی ہے اور اس بات کا ذکر زیر نظر آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "جب نماز کیلئے یہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو اپنا رفیق و مددگار بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو
کہ اللہ کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو؟ ۲۳۲ ۱۴۴ بلاشبہ منافقوں کیلئے

ساتھ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھانے کیلئے نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر برائے نام۔"

یہ مطلب کے یار ہیں نہ ادھر کے ہیں اور نہ ادھر کے

۲۳۱ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کو اسلام سے پیار ہے نہ کفر سے کوئی نفرت و بیر۔ ان کو اپنے مطلب سے غرض ہے۔ وہ جس طرف سے ان کا مطلب حل ہوتا ہے اس طرف کے ہوں گے۔ گویا وہ سیاسی لیڈر ہیں اور ان کو ووٹ درکار ہیں وہ خود بے رنگ ہیں اس لئے جس برتن میں داخل ہوں گے وہی ان کا رنگ خود بخود ہو جائے گا۔ وہ دو ریوڑوں کے درمیان کے "بھیڈو" ہیں کبھی اس ریوڑ میں کبھی اس ریوڑ میں۔ بے وقوف ہیں لیکن دوسروں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ غرض کے بندے ہیں اور وہ جہاں سے اور جیسے کیسے ان کی پوری ہونا چاہئے۔ ضرورت ہو تو وہ تمہارے اپنے ہیں اور ضرورت نہ ہو تو ان کی پہچان بہت کمزور ہے آج کل فی زمانہ ان لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے کہ ان کی پہچان مشکل ہو اس لئے اس گروہ کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کو ہدایت کہ کافروں کو دوست مت بناؤ

۲۳۲ زیر نظر آیت کا یہ مضمون بار بار دہراؤ۔ حرف حرف کر کے پڑھو اس کے ترجمہ کو نگاہ میں رکھو، کیوں؟ اس لئے کہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ "اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ۔" قوم کے مذہبی راہنما کیا کرتے ہیں کہ مومنوں کو کافر بناتے ہیں اور پھر اس آیت کو ان کافروں پر فٹ کر دیتے ہیں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کافروں کو دوست مت بناؤ۔ یہ دیوبندی کیا ہیں؟ اہل حدیث کیا ہیں؟ بریلوی کیا ہیں؟ اہل تشیع کیا ہیں؟ سپاہ صحابہ کیا ہیں؟ حسینی کون ہیں؟ ان میں مسلمان کون ہے اور کافر کون؟ غور کرو جو جواب تمہارا وہی ہمارا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے دوستی کے قابل کون ہے؟ ایک بھی نہیں، کیوں؟ ارشاد خداوندی ہے کہ "اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ۔" دوستی کیلئے سچے مسلمانوں کی ضرورت ہے۔ وہ کہاں سے ملیں گے؟ ایران سے؟ عراق سے؟ سعودی عرب سے؟ یمن سے؟ شام سے؟ لیبیا سے؟ بنگلہ دیش سے؟ کابل سے؟ پاکستان سے؟ نہیں، نہیں اور ہرگز نہیں، پھر آخر

فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ
تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ
مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٤٦﴾

یہی ہوتا ہے کہ دوزخ کے سب سے نچلے درجہ میں ڈالے جائیں اور کسی کو بھی تم ان کا رفیق و مددگار نہ پاؤ۔ ۲۳۳ ۱۴۵

ہاں! جن لوگوں نے توبہ کرلی اپنی عملی حالت سنوارلی' اللہ پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور اپنے دین میں صرف اسی کیلئے ہو گئے تو' ایسے لوگ' مومنوں کی صف میں ہوں گے اور قریب ہے کہ اللہ مومنوں کو اجر عطا فرمائے ایسا اجر جو بہت بڑا اجر ہوگا۔ ۲۳۴ ۱۴۶

ملیں گے کہاں سے؟ وہ تم کو ملیں گے امریکہ سے' برطانیہ سے' فرانس و جرمنی سے' روس و چین سے۔ یہی وہ امن گاہیں ہیں جہاں سے امن ملتا ہے اور یہی وہ اسلام کے مراکز ہیں جہاں سے اسلام نافذ ہوتا ہے۔ یہی ہمارا قبلہ ہیں اس لئے یہی دوستی کے قابل ہیں مسلمان ممالک کو دوستی کرنا ہے تو ان ممالک سے اور مسلمان ملکوں کے باشندوں کو دوستی کرنا ہے تو ان ملکوں کے باشندوں سے دیکھو اور قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے کہ "اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کو کافروں کو دوست مت بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی حجت صریح قائم کرلو؟" (مزید تفصیل کیلئے دیکھنا درکار ہو تو اس جلد میں سورہ ال عمران کی آیت ۲۸ ملاحظہ کریں۔" اس لئے کہ وہاں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ "جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو اپنا رفیق و مددگار بنائیں اور جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔"

منافقین کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو دوزخ کے سب سے نچلے حصہ کا مستحق ہے

۲۳۳ ہر منافق فی الحقیقت کافر ہی ہوتا ہے بلکہ ایک لحاظ سے وہ کافر سے زیادہ مجرم' کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے جرم کفر پر ایک مزید جرم مکر و فریب کا اضافہ کئے ہوئے ہوتا ہے اس لئے حق یہی ہے کہ اس کو ایک کھلے کافر سے بھی زیادہ سخت سزا ملنی چاہئے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو۔ ظاہر ہے کہ جرم اس کا ایک کھلے کافر سے بڑا ہے اس لئے اس کی سزا بھی قرآن کریم نے سخت بیان فرمادی کہ "منافق دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور یہ بات یاد رہے کہ اوپر کو بڑھنے کو "درج" اور نیچے کی طرف جانے

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝۱۴۷

لوگو! اگر تم شکر کرو اور اللہ پر ایمان رکھو تو اللہ کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ ۲۳۵ اللہ تو قدر شناس اور علم رکھنے والا ہے۔ ۱۴۷

کو "درک" کہتے ہیں اس لئے یہ بیان کیا گیا؟ کہ جنت میں تو درجات ہیں اور دوزخ میں درکات ہیں کہ جنت میں جنتیوں کے مقامات کو درجات میں بلند کیا جائے گا اور دوزخ کے عذاب میں دوزخیوں کے طبقات کو نیچے سے نیچے گہرائی میں ڈالا جائے گا۔ اور درک سمندر کی گہرائی کو بھی کہا جاتا ہے اور اس سے لفظ ادراک بھی ہے یعنی بات کی تہ تک پہنچ جانا۔

جو نفاق کے مرض سے شفا پا گیا اور سچا مومن ہو گیا اس کا اجر یقیناً محفوظ ہے

۲۳۴ قریب المرگ ہو کر اگر پھر کوئی کچھ وقت کیلئے موت کے منہ سے نکل آیا تو وہ یقیناً اللہ کے احسان کا مستحق ہو گیا۔ اب تو اس کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ نفاق کا مرض بھی بڑا مہلک مرض ہے اگر اس مرض سے کسی کو اللہ نے شفا بخش دی تو وہ بہت بڑے انعام کا مستحق قرار پایا اور اللہ نے اس پر بڑا فضل کیا کہ دوزخ کی آگ سے اس کو ایک طرح کا نکال لیا گیا۔ اس آیت نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ خالی ایمان کا دعویٰ بھی شاید دعویٰ کرنے والے کے لئے کچھ مفید ہو سکتا ہے فرمایا مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہو گا لیکن ہاں! جو شخص توبہ کر کے سچا ایمان قبول کر لے اور تذبذب سے باہر نکل کر ایمان کی زندگی قبول کر لے تو وہ یقیناً خوش بخت ہو گیا پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کی توبہ کیا ہے؟ توبہ یہ ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو دل و جان سے قبول کر لیں۔ بغیر کسی تذبذب اور ریا کے اگر یہ بات میسر آ گئی تو سمجھ لو کہ ان کا انجام بخیر ہو گیا اور وہ یقیناً مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے اور اس سچی توبہ کا اجر بھی عنداللہ پائیں گے۔ روٹھ کر جانے والا اگر ایک مدت گزرنے کے بعد بھی واپس آ جائے تو گھر والوں کو خوشی ہوتی ہے اور اس خوشی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کوئی گناہ ایسا نہیں جو پیدائشی اور موروثی ہو کہ وہ ناقابل اصلاح ہو جائے بلکہ ہر گناہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بہرحال اختیاری ہے اور اختیاری چیز کسی وقت بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔ یہ عذر کسی حال بھی درست نہیں کہ اس کا چھوڑنا ممکن نہ ہو۔ بات صرف ایمان و یقین کی ہے اور دل کے پختہ ارادہ کی۔ انسان جب بھی یہ سوچ لے وہ اس دلدل سے نکل سکتا ہے۔

اگر تم شکر گزاری اختیار کر لو تو اللہ آخر تم کو عذاب کیوں دے گا؟

۲۳۵ عذاب کی وعیدیں تم کو سنائی گئی ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تم اپنی اصلاح کر لو اور اس طرح ان وعیدوں کی زد سے بچ جاؤ اگر تم خود بچنے کا ارادہ کرو تو آخر تم پہلے جس حالت میں ہو خواہ وہ نفاق کی ہے یا کفر کی تو کسی نے مجبور کر کے تم کو اس پر لگایا ہے وہ بھی تو تمہاری اختیاری بات ہے اگر اب بھی تم اصلاح کر لو تو آخر اللہ تم کو عذاب کیوں دے گا؟ تم اپنے نفس کی اصلاح کر کے دیکھو کیا عذاب ٹلتا ہے یا نہیں بلکہ یقین جان لو کہ اللہ تعالیٰ تو کسی کو عذاب دے کر بالکل خوش نہیں اس کی تو رضا ہی یہ ہے کہ سب لوگ گناہوں سے بچ جائیں وہ ایک بالشت اللہ کی طرف بڑھیں تو اللہ ایک باع آگے بڑھتا ہے۔ لیکن جب تم اس کے متعلق کچھ سوچو ہی نہیں تو زور سے تو ہدایت نہیں دی جاتی کیونکہ یہ اللہ کا قانون نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی یہ ہے کہ جو یندہ یابندہ ہوتا ہے جو کوشش کرتا ہے وہ پالیتا ہے اور اللہ سے زیادہ بڑھ کر کون ہے جو انسان کا قدر شناس ہو سکتا ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا یعنی وہ تمہیں عذاب کیوں دے گا؟ اللہ تو انسانی اعمال کا قدر شناس اور ان کی حالت کا علم رکھنے والا ہے۔"

زیر نظر آیت کا بظاہر خطاب تو منافقوں کو ہے انہیں بتایا ہے کہ تمہیں سزا دینے پر اللہ تعالیٰ کا کوئی کام تو معلق ہے نہیں یہ تو محض تمہارا کفر اور وہ بھی خاص کر کفران نعمت ہے جو تمہیں جنت کی نعمتوں سے استفادہ کے ناقابل کر رہا ہے اگر تم اپنے ان عقائد کو چھوڑ دو تو رحمت حق تو خود بخود تمہیں آ لے گی۔ اس میں یہ تعلیم بھی خود بخود آگئی کہ اسلام کا خدا مشرک اور جاہل قوموں کے خونخوار و سفاک دیوی دیوتاؤں کی طرح نہیں جسے بندوں کی آزار دہی ہی میں لطف آتا ہو اور اس سے یہ استنباط بھی ہوتا ہے کہ مومن شکر گزار عذاب الٰہی سے بالکل دور رہے گا اور اس آیت سے مفسرین و فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ صاحب کبیرہ کو بھی اللہ تعالیٰ عذاب سے بچا لے گا۔ (کبیر)

اس آیت پر قرآن کریم کا پانچواں پارہ ختم ہو رہا ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تو آخر اللہ اس کو کیوں عذاب دے گا؟ اس لئے ہماری التجا ہے کہ اللہ کے ان بندوں کی سوانح کا مطالعہ انسان کو یقیناً شکر گزار بندہ بننے میں مدد دے سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے اور انہی بندوں میں سے ایک بندہ سیدنا ابراہیمؑ بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کی سرگزشت کا مطالعہ یقیناً شکر گزار بندہ بننے میں ممد و معاون ہوگا۔ پھر شریعت محمدیؐ میں جس طریقہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی ابراہیمؑ ہی کا طریقہ ہے چنانچہ ابراہیمؑ کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے "ابراہیم اپنی ذات میں پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے والا۔ اللہ نے اسی کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔" (النحل ۱۶ : ۱۲۰، ۱۲۱) اور یہی وہ نبی ہیں جو ہمارے مواحدین کے جد امجد ہیں۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ

اللہ کو پسند نہیں کہ تم برائی پکارتے پھرو۔ ہاں! یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔ ۲۳۶ ۱۴۸

تم بھلائی کی کوئی بات ظاہر طور پر کرو یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی سے درگزر کرو تو اللہ ۲۳۷

اللہ کے نزدیک منہ کھول کر کسی کی برائی پسندیدہ نہیں ہے ہاں! مظلوم کا حق محفوظ ہے

۲۳۶ جماعتی زندگی کے اہم مسائل میں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی برائی جنم لے چکی ہوتی ہے اور جڑ پکڑ چکی ہوتی ہے تو اس کا تدارک بلاشبہ ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کیلئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت' اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کا انجام قوم کے سامنے اس طرح کھول کر اور واضح طور پر رکھا جائے کہ جماعت کے افراد اس شر سے محفوظ رہیں لیکن اس کا انداز بیان ایسا ہو کہ جماعت کے عام افراد بعض افراد کو اپنے اندازہ اور اندیشہ سے نشانہ و ہدف نہ بنالیں کیونکہ اس سے بجائے فائدہ کے بعض اوقات نقصان کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ کلام الٰہی کا کمال یہ ہے کہ جب وہ قوم کی کسی ایسی بیماری کی وضاحت کرتا ہے تو ساتھ خاص ہدایات بھی دے دیتا ہے تاکہ اس کے مضرات سے بچا جا سکے۔ زیر نظر آیت میں بھی مسلمانوں کو تنبیہہ کی جا رہی ہے اور پیچھے بہت سی آیات میں منافقین کا مسلسل ذکر چلا آرہا ہے اور منافقت قومی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک اور بڑی بیماری ہے اس لئے اس کی وضاحت فرما دی کہ جوش میں آکر مسلمان منافقین سے الجھاؤ ہی نہ شروع کر دیں۔ ان کو جو سزا ملے گی وہ عنداللہ ہے لیکن جب وہ اسلام کا نام لے کر اس کے ساتھ وابستگی کا اعلان کر چکے ہیں اگرچہ ان میں عملی کمزوریاں موجود ہیں لہٰذا ان کی کمزوریوں کا مجمل یا مفصل بیان تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان افراد کو نام بنام کوئی ایسی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔ اس سے ضد بڑھتی ہے اور اسلام کا کام ضد بڑھانا نہیں بلکہ تفہیم کرانا ہے اور تفہیم کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی انسان کو نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کو سمجھنے کا موقع دیا جائے۔

چونکہ پیچھے بہت سی آیات میں منافقوں کا حال کھول کر بیان کیا گیا' کچھ ان کی چھپی ہوئی بدیاں اور کمزوریاں تھیں ان کو ظاہر کیا اب ان کا ذکر ختم کرتے ہوئے یہ بھی سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خفیہ بدیوں کا یوں اعلان کیا تو یہ محض اس لئے کہ انہوں نے مسلمانوں کو اپنی شرارتوں کا نشانہ بنایا چونکہ وہ مسلمانوں پر کھلا

ظلم کر رہے تھے اور ان کو تباہ کرنے کی سازش کے مرتکب ہوئے تھے چونکہ مسلمان اس لحاظ سے مظلوم تھے پھر ان کی زبان سے یہ باتیں بیان کی گئیں تو یہ محض اس لئے کہ وہ مظلوم تھے اور مظلوم کو حق ہے کہ وہ ظالموں کا نام لے کر اور ان کی پوری پوری نشاندہی کرا کر بات کو واضح کرائے۔ ابھی تک انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا بلکہ ان کی عام حرکات کا ذکر کیا کہ وہ اس اس طرح کرتے ہیں اس طرح دوسری طرف ان کو یہ بات بھی بتا دی کہ اگر تم نے اس کا غصہ ناجائز طریقہ سے نکالا تو تمہاری حالت کو مزید بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے بہتر ہے کہ آپ اپنی اصلاح کر لیں اور مسلمانوں کی برائی سوچنے کی بجائے اپنی بھلائی کا خیال رکھیں۔ اصلاح کا پہلو اس میں ہے نہ کہ مظلومین کے ناطقہ بند کرنے میں۔ اس کو کہتے ہیں کہ "ایک پنتھ دو کاج" کہ بات ایک ہی ہے لیکن ایسی کہ دونوں طرف کے لوگوں کی اصلاح ہو جائے اور انتشار نہ ہو بلکہ امن قائم ہو اور یہ اعتدال ہی کی راہ سے ممکن ہے۔

زیر نظر آیت میں "اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ" کے الفاظ قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں اس لئے سمجھ لینا چاہئے کہ "جَهْرَ" کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے وہ حاسہ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی سے اور قرآن کریم میں ان دونوں ہی صورتوں میں اس کا استعمال ہوا ہے پہلی کی مثال اس طرح ہے کہ قرآن کریم میں ہے "حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" (۲ : ۵۵) اور ایک جگہ ارشاد ہوا "اَرِنَآ اللّٰهَ جَهْرَةً" (۴ : ۱۵۳) اور دوسرے معنوں میں فرمایا "مَنْ اَسَرَّا لْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ" (۱۳ : ۱۰) اور "يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ" (۳ : ۵) اور "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا" (۱۷ : ۱۱۰) اور "وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ" (الحجرات ۴۹ : ۲) اور اس جگہ "اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ" دوسرے معنوں ہی میں استعمال ہوا ہے اور انہی آیات میں غور کرنے والوں کو "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا" کا مفہوم واضح ہو جائے گا کہ نماز میں کس "جہر" اور کس "خفی" سے منع کیا گیا ہے پھر "وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا" کے جملہ نے ساری کسر نکال دی ہے اور اس طرح شنوائی کے "جہر" میں جو اسباق پوشیدہ ہیں ان پر بھی نظر فرمالیں۔

مسلمانوں کیلئے مزید ہدایت کہ بھلائی کی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو لیکن بدی پر پردہ ہی بہتر ہے

۲۳۷ اصول یہ یاد رہنا چاہئے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اس لئے علاوہ انبیاء کرام کسی کو معصوم مت سمجھو ہاں! کسی کی بھلائی کی بات سنو تو اس کو فوراً بیان کرو یا خاموش رہو تمہاری مرضی کی بات ہے لیکن کسی کی بری بات سنو تو اس کو ہر حال میں چھپاؤ اس لئے کہ برائی کی اشاعت فی نفسہ بری چیز ہے لیکن حد اعتدال سے تجاوز کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہے تم کو برائی کی اشاعت سے روکا گیا ہے یہ نہیں کہ کسی کی برائی کا نام لینا ہی حرام ہے بلکہ بعض اوقات اس کا بیان ضروریات اسلام میں سے ہے اشاعت اور ضروریات کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ انسان اپنے نفس کو ٹٹولے تو اس کو نظر آئے گا کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا اس پر مال خرچ کرنے سے کہیں زیادہ شاق نفس پر یہ گزرتا ہے کہ کوئی ہمیں دکھ پہنچائے اور ہم اس سے درگزر کر جائیں

أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ

بھی قدرت رکھتا ہوا درگزر کرنے والا ہے۔ ۱۴۹ ۲۳۸

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں اللہ میں اور اس کے

اور انتقام نہ لیں اس لئے فعلِ خیر سے الگ اور ممتاز کر کے اس وصفِ چشم پوشی اور عدم انتقام کو بیان کیا ہے۔ (قرطبی)

مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کا نسخہ الٰہی! کوئی استعمال کر کے تو دیکھے

۲۳۸ اخلاقی حیثیت سے یہ تینوں مرتبے الگ الگ ہیں اور انہیں یہاں کیسی صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان نے نیکی کی اور ساتھ ہی وہ اس کا اظہار و اعلان بھی کر دیتا ہے' کیوں؟ اس لئے کہ خلق سے داد لینے کی خواہش ایک حد تک طبعی ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرے گا تو داد کیسے ملے گی؟ فرمایا نیکی تو یہ بھی ہے لیکن "اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا" اس لئے اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور خلق سے داد و صلہ کی پروا ہی نہ رکھے بلکہ اس کو خلق کے علم میں آنے ہی نہ دے بشرطیکہ اس کا علم میں آنا ضروری نہ ہو تو معلوم ہوا کہ اس کا مقصود تمام تر رضائے الٰہی ہے اخفا اس کا دوسرا درجہ ہے اس لئے اس کو اس کے بعد بیان فرمایا کہ "اَوْ تُخْفُوْهُ" تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ انہیں نظر انداز کر جائے اور برائی کرنے والے سے بدلہ نہ لے اور ظاہر ہے کہ یہ نفس کیلئے بہت ہی شاق ہے اس لئے اس کا مرتبہ پہلی دونوں نیکیوں سے بڑھ کر ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو "تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ" کے الفاظ سے بیان فرمایا۔ فرمایا اگر تم اس آخری مرتبہ پر فائز ہو گئے تو تم بہت ہی خوش قسمت ہوئے کیونکہ عَفُوًّا کی صفت تو اس مالک الملک کی ہے پھر کیا خوب ہے جو بندہ بھی اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگ لے! تم ہی بتاؤ کہ وہ خوش قسمت نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ پھر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کا بھی اظہار فرما دیا کہ اللہ ہی کی تو وہ ذات ہے جو قدیراً ہے انسان نے اگر درگزر کی تو وہ یہ بھی سوچے کہ آخر وہ بدلہ لے ہی کہاں تک سکتا ہے؟ انتقام پر قدرت کامل تو اللہ ہی کو حاصل ہے اور وہ اس کمال قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا ہے اور لیتا ہی رہتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ بندوں کو عفو و درگزر کی راہ پر لانے کا کتنا ہی موثر و حکیمانہ طریقہ ہے! امام رازی رحمہ اللہ جن کی نکتہ رسی قرآن فہمی میں قابل صد رشک ہے اس جگہ خوب فرما گئے کہ "آیت کے ان دو مختصر فقروں میں سارا خلاصہ اخلاق بند کر کے رکھ دیا گیا اور اب کوئی جتنا کھولنا چاہے کھولتا چلا جائے ان دونوں جملوں کی خوبی ختم ہونے والی نہیں اور شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی بیان القرآن کا یہ حصہ قابل دید ہے۔ اس مضمون کو قرآن

وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۵۰ اُولٰٓئِكَ

رسولوں میں تفرقہ کریں اور کہتے ہیں ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں بعض کو نہیں مانتے اور اس طرح چاہتے ہیں ایمان و کفر کے درمیان کوئی راہ اختیار کرلیں۔[۲۳۹] ۱۵۰ تو ایسے لوگ

کریم میں تصریف آیات کے ذریعہ بھی سمجھایا گیا ہے اور چونکہ انسان کا نفس' بیوی اور اولاد بعض اوقات ان اوصاف کے راستے کی رکاوٹیں ہیں اس لئے جی چاہتا ہے کہ ایک دو جھگوں کا اشارہ دے دیا جائے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہاری بیویوں' تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔" (التغابن ۶۴ : ۱۴' ۱۵)

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ اپنے رشتہ داروں' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔" (النور ۲۴ : ۲۲)

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی' ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں ایسے لوگوں کیلئے دردناک عذاب ہے ہاں! جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔" (الشوریٰ ۴۲ : ۴۰' ۴۳)

(مزید وضاحت کیلئے عروۃ الوثقیٰ جلد اول سورہ البقرہ کی آیت ۱۷۱' ۱۷۲ کا مطالعہ کریں۔)

اللہ اور اس کے رسولوں سے انکار کرنے والوں کا کردار کیا ہے؟

۲۳۹ اس مضمون کو بار بار قرآن کریم میں دہرایا گیا ہے کہ اللہ کی سچائی اس کی ساری باتوں کی طرح اس کی عالمگیر بخشش ہے وہ نہ تو کسی خاص زمانہ سے وابستہ کی جا سکتی ہے' نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لئے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

یقیناً[۲۴۰] کافر ہیں اور کافروں کیلئے ہم نے ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔[۲۴۱] ۱۵۱

بنا لی ہیں لیکن تم اللہ کی سچائی کیلئے کوئی ایسا امتیاز نہ گھڑو۔ اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے' نہ نسل ہے' نہ جغرافیائی حد بندی ہے اور نہ ہی جماعتی حلقہ بندی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد و بشر کو روشنی بخشتی ہے اگر تم اللہ کی سچائی کے طالب ہو تو وہ کسی نسل و قوم میں ہرگز تلاش نہ کرو اس لئے اس نے " تَفْرِيْقُ بَيْنَ الرُّسُلِ " یا "اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفرقہ" سے سختی سے منع کیا ہے وہ کہتا ہے کہ راہیں صرف دو ہیں ایمان کی اور کفر کی پھر ایمان کی راہ یہ ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے یعنی سب کو مانو اور انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کرو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اہل کتاب بلاشبہ اہل کتاب ہیں لیکن ان میں سے جو پکے کافر ہیں جن کے کفر میں کسی طرح کا شبہ نہیں ان کو صاحب ایمان اہل کتاب کی طرح سمجھنا بھی نادانی کی بات ہے۔ جن اہل کتاب سے مناکحت اور اس طرح کی دوسری باتوں اور میل جول کی اجازت ہے وہ وہ اہل کتاب نہیں ہو سکتے جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں جن کو " اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ " سے مخاطب کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ لوگ ہیں جو نام کے لحاظ سے اہل کتاب ہیں لیکن ان کے عقائد و اعمال اس بات پر گواہ ہیں کہ وہ کھلے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہ وہی ہیں جو انبیاء کرام کو قتل کرنے والے بعض کو نبی ماننے اور بعض کا انکار کرنے والے ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے گروہوں کو کفر کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کی نظر بھی اہل کتاب کے اس کھلے کفر کی طرف کیوں نہیں گئی اور انہوں نے سارے اہل کتاب کے ساتھ مناکحت اور میل جول کی اجازت کس ناطے سے دی ہے اور یہ چوک جہاں سے بھی ہوئی ہے رسالت اور عہد صحابہؓ کا دامن ان باتوں سے بالکل پاک ہے۔ جہاں بہت سی باتیں دین اسلام میں باہر سے لا کر اسلام میں داخل کر لی گئی ہیں حقیقت میں اس کا تعلق بھی انہیں میں سے ہے اسلام ایسے تسامح سے بالکل منزہ ہے۔ لیکن قومی نظریات جو گھڑ لئے جاتے ہیں ان میں فہم و بصیرت سے کام لیا جانا ممنوع قرار دیا جاتا ہے چونکہ یہ بیماری ہر قوم میں موجود ہے اس لئے اس معاملہ میں ساری قوموں کا اجتماع ہو جاتا ہے اور جب اجماع امت کے نام سے بد اعتدالیوں کا تدارک ممکن نہ ہو تو اس اجماع امم کے نام سے ادیان میں داخل ہونے والی چیزوں کا کوئی علاج کب ممکن ہو سکتا ہے؟ اس لئے صاحب عقل و دانش بھی انہیں کو کہا جاتا ہے جو امت کے یا امم کے ان نظریوں کی حمایت میں لب کشائی کرتے ہیں' دوسروں کے منہ میں ہمیشہ مٹی ہی ڈالی جاتی ہے اور ایسے رند کم ہی ہوتے ہیں جو کسی کے مٹی ڈالنے کی پروا نہ کریں کیونکہ ان مگرمچھوں سے بیر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ
اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۵۲

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا' تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ عنقریب ہم انہیں ان کا اجر عطا فرمائیں گے اور اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۵۲

لگا کر دریا میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ کون ہے جو مرنے کیلئے ہر وقت تیار رہے؟ اگرچہ مرنا سب کیلئے لازم ہی ہے۔

یہ لوگ اپنا نام کچھ رکھیں لیکن عنداللہ پکے کافر ہیں

۲۴۰ کہیں یہ سمجھ لیا جائے کہ ان اہل کتاب کہلانے والوں کا درجہ و مرتبہ کافروں سے تو بہرحال بہتر ہی ہوگا۔ فرمایا ایسا نہ سمجھ لینا اس لئے کہ یہ لوگ تو پکے کافر ہیں۔ جملہ کی ترکیب خود ہی زور پیدا کرنے کیلئے کافی ہے "حقا" کا اضافہ تاکید مزید کیلئے ہے (تفسیر کبیر) یہ "تفریق بین الرسل" اور "اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفرقہ" کے مرتکب کیوں ہوئے؟ اس لئے کہ ان کے خیالات و نظریات کی تہ میں اصل روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے شعوری یا لاشعوری طور پر' بہرحال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کی عقل و دانش وحی الٰہی کے مقابلہ میں زیادہ وزن دار ہے اور پیغمبروں سے نعوذ باللہ کچھ ایسی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں کہ وہ نبی کہلانے کے حق دار نہیں یا یہ کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ بنا لئے گئے۔ یا یہ کہ اللہ کچھ کہتا ہے اور اس کے رسول کچھ اور ہی فرماتے ہیں (نعوذ باللہ) انہوں نے اپنے روگ کو انبیاء کرام کے ذمہ کیسے لگا دیا؟ اس کی بہت تفصیل پیچھے گزر چکی ہے اگر خواہش ہو تو تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ کی درج شدہ آیات کی تفسیر ملاحظہ کریں بقرہ ۸۵' ۱۳۶' ۱۷۷' ۲۸۵۔

ان کے کفر کا فیصلہ کسی اسمبلی یا عدالت ملکی میں نہیں ہوا دوزخ ان پر لازم کر دی گئی ہے

۲۴۱ ان کے کافر ہونے کا فیصلہ قانون الٰہی کا براہ راست فیصلہ ہے جس قانون میں نہ ترمیم و تنسیخ ہے اور نہ ہی کوئی اپیل کا مقام ہے اس لئے کہ قانون الٰہی میں غلطی کا کوئی امکان موجود ہی نہیں۔ انہوں نے دین الٰہی اور اللہ کے رسولوں کو رسوا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اس لئے ان کیلئے رسوا کرنے والا عذاب ہی لازم کر دیا گیا ہے جو ان پر اس طرح چپکا دیا گیا ہے کہ کسی کے اتارنے سے وہ کبھی نہیں اترنے کا اس لئے کہ ان کے کفر کا فیصلہ کسی مذہبی جرگہ یا کسی ملک کی قومی یا صوبائی اسمبلی یا عدالت میں پاس نہیں ہوا بلکہ یہ براہ

يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسٰٓى أَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوٓا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً

اے پیغمبر اسلام! اہل کتاب، تم سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو تو یہ اس سے بھی بڑی بات کا سوال موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا ہمیں

راست اس احکم الحاکمین کا فیصلہ ہے جو بذات الصدور ہے اور وہ دلوں کے رازوں اور ان میں پیدا ہونے والے خیالوں سے بھی واقف ہے۔

ایمان والوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ "تفریق بین الرسل" کے قائل نہیں

۲۴۲ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب سرچشمہ ہدایت ایک ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چشمہ سے سیراب ہونے والے اپنی اپنی قوم کو الگ الگ ہدایت دیں اس طرح تسلیم کرنا تو گویا سرچشمہ ہدایت کا انکار ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والے اس گمراہی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ وہ اس سچائی کو مانتے ہیں جو پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور ان تمام سچائیوں پر بھی ان کا ایمان ہے جو ان سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور آخرت کی زندگی پر بھی ان کا پختہ یقین ہے کہ یہی تعلیم سارے انبیاء کرام کی تھی سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں کامیاب ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اس تمام کارخانہ ہستی کا خالق ایک اور صرف ایک ہی ہے وہی خالق ہے اور اس کے قانون کے سہارے یہ نظام چل رہا ہے جب اس کی اس کائنات ہستی کا نظام ایک ہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہی ہو۔ فرمایا "جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا یعنی کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ سچے مومن ہیں اور عنقریب ہم انہیں ان کے اجر عطا فرمائیں گے اور اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔"

اہل کتاب کا سوال پیغمبر اسلام سے اور ان کے سوال کا جواب خداوندی

۲۴۳ شرارتی ذہنیت کیا ہے؟ یہی کہ کوئی نہ کوئی نئی شرارت سوچ لی اور پھر اس کا خوب چرچا کیا۔ زیر نظر آیت میں یہود کی اسی ذہنیت کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی تاریخی شقاوتوں کی طرف اشارات کئے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کے مقابلہ میں انکار و شرارت کرنے والے برابر شرارت کرتے ہی رہے۔ اگر ان کو فرمائشی معجزات دکھلا بھی دیئے جائیں جب بھی وہ ماننے والے نہیں اس لئے وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ فرمایا یہ جو کچھ انہوں نے کہا کوئی نئی بات نہیں کہی انہیں لوگوں کی شرارت سے قبل ازیں اہل مکہ بھی یہ سوال اٹھا چکے

ہیں۔ فرمایا

"انہوں نے کہا' ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے پیغمبر اسلام! ان سے کہہ دو کہ پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" جو تم مجھ سے ایسی سفارشیں کر رہے ہو۔

مخالفین کا مطالبہ کیا تھا؟ یہ کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف ایک اشارہ کرو اور یکایک چشمہ پھوٹ پڑے یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دے اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آکھڑے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ ہم نے محمد ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے یا ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں یہ تھے وہ مطالبات جو انہوں نے کئے تھے اور ان کو جواب دیا گیا تھا کہ "ان سے کہو پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ یعنی بے وقوفو! کیا میں نے کہیں خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبہ مجھ سے کرنے لگے ہو؟ میرا دعویٰ تو اول روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو' میرے اخلاق کو' میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبہ کرنے لگے کہ زمین کو پھاڑو اور آسمان کو گراؤ؟ آخر ایک پیغمبر کا ان کاموں سے کوئی تعلق ہے؟ اور یہی اس جگہ ان یہود کو جواب دیا جا رہا ہے کہ "اے پیغمبر اسلام! اہل کتاب یعنی یہودی تم سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو تاکہ انہیں تصدیق ہو جائے کہ تم اللہ کے رسول ہو تو یہ فرمائش انہوں نے تم ہی سے نہیں کی ہے اس سے بھی بڑی بات کا سوال یہ موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے ہیں انہوں نے یعنی ان کے بزرگوں اور ہم مشربوں نے سینا کے میدان میں کہا تھا کہ ہمیں خدا آشکارا طور پر دکھلا دو یعنی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ خدا تم سے کلام کر رہا ہے تو اس طرح ان کی شرارتوں کی وجہ سے بجلی کی ہولناکی نے انہیں پکڑ لیا تھا۔"

فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا
مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ ۞ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا

اللہ آشکارا طور پر دکھلا دو' تو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی نے انہیں پکڑ لیا تھا پھر باوجودیکہ دین حق کی روشن دلیلیں ان پر واضح ہو چکی تھیں وہ بچھڑے کو لے بیٹھے' ہم نے اس سے بھی درگزر کیا[۲۴۳] اور موسیٰؑ کو ظاہر و واضح اقتدار دے دیا تھا۔ ۱۵۳

پھر عہد لینے کیلئے ہم نے ان کے سروں پر طور بلند کر دیا تھا' اس کے بعد ہم نے انہیں

آج اگر یہ لوگ آپ ﷺ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے آسمان پر جاؤ اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لاؤ جس کو ہم پڑھیں تو تم کو نبی مان لیں گے تو یہی لوگ کل موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ ہم کو اللہ دکھاؤ ہم اس کو رو در رو دیکھیں وہ ہمارے ساتھ بھی ہم کلام ہو یا کم از کم ہماری آنکھوں کے سامنے وہ تم سے بات چیت کرے پھر تم کو نبی مانیں گے۔ پھر اس ظلم کے باعث ان کو ایک سخت چیخ نے آن لیا اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے پھر کیا وہ شرارتوں سے باز آگئے تھے جو یہ آئیں گے۔ اُن کی اَن ہونی باتوں کا آپ ﷺ کچھ خیال نہ کریں یہ بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے جیسے ان کے پہلے پہنچ چکے ہیں۔

انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور نشانات الٰہی کی کوئی پروا نہ کی

۲۴۳ یہ وہی لوگ ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے ان سے ہم نے طور پہاڑ کے نیچے کھڑا کر کے عہد لیا تھا لیکن ان کو توڑتے ذرا دیر نہ لگی۔ ان کو ایک شہر کے دروازے سے گزرنے کا حکم دیا تھا کہ تم فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے اس میں داخل ہو جاؤ لیکن انہوں نے ایک نئی شرارت نکال لی کہ ہمارے کلام ہی کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور فرمانبرداری کے ساتھ انہوں نے "نا" کا سابقہ لگایا ان کو ہفتہ کے روز شکار سے منع کیا گیا تھا انہوں نے اس میں بھی ایک نئی حجت نکال ڈالی۔ انہوں نے برملا کہا کہ "ہمارے دل بند ہیں" آپ کی تعلیم ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے ماننے والے نہیں ان کی ساری شرارتوں کا تفصیلی ذکر پیچھے سورہ البقرہ میں گزر چکا ہے اس لئے تفصیل دیکھنا ہو تو تفسیر عروۃ الوثقیٰ جلد اول آیت ۴۸ تا ۵۳' آیت ۶۳' آیت ۵۷' آیت ۶۵ اور آیت ۸۲ کے حاشیے مطالعہ کریں۔ اس جگہ چونکہ ان کے مسیح علیہ السلام کے انکار اور سیدہ مریم پر تہمت رکھنے کا بیان کرنا مقصود تھا اس

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ
مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ
عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ

حکم دیا کہ شہر کے دروازے میں جھکے ہوئے داخل ہو اور ہم نے حکم دیا کہ سبت کے دن سے تجاوز نہ کر جاؤ۔ ہم نے ان سے ان باتوں پر پکا عہد و میثاق لے لیا تھا۔ ۱۵۴

پس ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتیں جھٹلانے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے یہی وجہ ہے کہ معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب ایمان سے محروم ہیں۔ ۱۵۵

اور اس بات کی وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور مریم کے خلاف ایسی بات کہی جو بڑے

لئے ان کی پچھلی شرارتوں کا حوالہ بھی دے دیا گیا جو ان کے باپ دادا کر چکے تھے اور اس طرح گویا قرآن کریم نے یہ تعلیم بھی دے دی کہ قومی نظریات ہمیشہ پیچھے سے چلے آرہے ہوتے ہیں اس لئے یہ سب سے بڑی دلیل ان کے پاس ہوتی ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یہ صرف آج ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ ہم نے تو اپنے باپ دادوں سے ایسا ہی سنا ہے اور اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ کیا پچھلے سارے غلط تھے اور آج تم اکیلے صحیح ہوگئے ہو؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ گویا ساری دلیلوں اور سارے نشانات سے بڑی دلیل اور بڑی نشانی ہے جو اس وقت ان کے پاس تھی اور آج ہمارے پاس بھی ہے کہ جب دلائل کا کوئی جواب نہ بن سکا تو یہ بات کہہ دی کہ کیا وہ سارے لوگ غلط تھے۔ آج تک تو کسی نے یہ بات نہ کہی آج تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی اور قرآن کریم نے ان کی اس گمراہی کا بھی بار بار ذکر کیا ہے کہ وہ جب بولتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں صرف ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طرح کہتے سنا تھا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اس لئے ہم تیرے کہنے پر باپ دادوں کی باتوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ اگرچہ ان کے

عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ

ہی بہتان کی بات[۲۴۵] تھی۔ ۱۵۶

اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو اللہ کے رسول تھے، قتل کر ڈالا۔[۲۴۶]

باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ لیکن آج ہم بھی بالکل وہی کہتے ہیں جو اس وقت یہود کہا کرتے تھے فرق صرف یہ ہے کہ کسی کی بات کرنا آسان ہوتی ہے اور اپنی طرف دھیان کم ہی جاتا ہے۔

یہود کی شقاوت کا بیان کہ انہوں نے سیدہ مریم پر بہتان باندھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

۲۴۵ سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کا تذکرہ سورہ آل عمران کی آیت ۵۳ تا ۴۶ میں کیا گیا ہے جس میں آپ کی طہارت و پاکیزگی و بزرگی کا بیان ہے لیکن یہود کی کتابوں میں ایسی گندی روایتیں اس پاک سرشت خاتون کی بابت لکھی ہوئی ہیں کہ ان صفحات کو بہ غرض رد بھی نقل کرنا پسند نہیں کیا جا رہا اور خصوصاً اس لئے کہ جب قرآن کریم نے بھی صرف ان کی طہارت و پاکیزگی کا بیان کرنا ہی پسند کیا ہے ان لغو بیانات کا ذکر صحیح نہیں سمجھا تو اس بات کو قابل ذکر نہ سمجھنا کوئی غلط نہیں بلکہ ان سے صرف نظر ہی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس سارے طومار خرافات کی طرف بکمال بلاغت، بہتان اور بہتان عظیم کے الفاظ لا کر اشارہ کر دیا۔ جیسا کہ اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عمران کی صاحبزادی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ تھیں نکاح حسب روایات تاریخی یوسف سے ہوا تھا جو نجاری کا کارخانہ قائم کئے ہوئے تھے اور دونوں ہی بڑے عابد اور خدا رسیدہ تھے۔

بہتان کیا ہے؟ بہتان وہی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے خود دوسری جگہ اشارہ کر دیا کہ "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کیلئے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لئے لیا ہے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۵۷، ۵۸)

بس یہ ؟ آیت بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہے یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو یا جو قصور انسان نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ غیبت کیا ہے؟ فرمایا ذکرک اخاک بما یکرہ "تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔" عرض کیا گیا اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتہ "اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ عیب اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔" یہ فعل صرف ایک

اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کا جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے اور یہ بات واضح ہوگئی کہ بہتان کیا ہے؟ یعنی وہ عیب جو اس میں موجود نہیں تھے ان کی نسبت سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی اس لئے قرآن کریم نے ان کو "بہتان" بتایا۔ یعنی جو کچھ بھی یہود نامسعود نے کہا وہ جھوٹ کا پلندہ تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کو یہود کا کفر قرار دیا۔

یہود نامسعود کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے سراسر جھوٹ ہے

۲۴۶ یہود کا دوسرا جرم جو اس جگہ پہلی دفعہ مذکور ہوا یہ ہے کہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح کو قتل کر دیا ہے اور قتل بھی سولی پر لٹکا کر کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے تھے یا نہیں؟ اگر مانتے تھے تو پھر انہوں نے قتل کیوں کیا؟ اور یہ بھی کہ اگر وہ اللہ کا رسول نہیں مانتے تھے تو پھر انہوں نے آپ کے رسول ہونے کا ذکر کیوں کیا؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو رسول مانتے تھے یا نہیں؟ قرآن کریم کا اسلوب بیان اور یہود کی تاریخ دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا سچا رسول نہیں مانتے تھے' کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا اقرار کیا تھا؟ نہیں رسالت کا انکار اس بات کی دلیل نہیں اس لئے کہ جن لوگوں کو انہوں نے رسول مانا تھا اور ان کی نبوت و رسالت کے اقراری تھے ان کے قتل کے وہ مرتکب ہو چکے تھے جیسے سیدنا زکریا علیہ السلام اور سیدنا یحییٰ علیہ السلام اور سیدنا یرمیاہ علیہ السلام اور یہی دوسرے سوال کا جواب بھی ہے بلکہ اس کی اصل دلیل یہ ہے کہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو صحیح النسب تسلیم نہیں کرتے تھے یہی بہتان انہوں نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا پر باندھا تھا اور اسی بہتان کا رد قرآن کریم نے کیا اور فرمایا عیسیٰ علیہ السلام "صحیح النسب" تھے اور مریم کے متعلق یہود نے یہ جھوٹ گھڑا تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی جیسے کچھ بدباطنوں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا حالانکہ انہوں نے جو کچھ منصوبہ بنایا تھا وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہ تھا اور قرآن کریم نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو "وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" کہہ کر یہود کے الزام کی تردید فرمائی اور ثابت کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام "صحیح النسب" اور ایک "مبارک ولد" تھے۔

رہا تیسرا سوال کہ اگر وہ رسول نہیں مانتے تھے تو انہوں نے "رسول اللہ" کے الفاظ کیوں استعمال کئے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کا رسول ہونے کا دعویٰ جو تھا اس لئے انہوں نے ان کے دعویٰ کے مطابق استہزاءً "رسول اللہ" کہہ دیا اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عزت و توقیر بیان کرنے کیلئے ارشاد فرمایا اور اس طرح یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ جملہ یہود کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ محقق ہے کہ وہ جن انبیاء کرام کو نبی و رسول مانتے تھے وہ بھی جب ان کو ان کی بداعتدالیوں کی نشاندہی کرتے تھے تو وہ ان کے درپے آزار ہو جاتے تھے نہ ان کو تکالیف پہنچانے سے چوکتے

عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ
وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ

حالانکہ نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہوگئی اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تو بلاشبہ وہ بھی شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ظن و ۵۲۴۷

تھے اور یہ ہی قتل کرنے میں کوئی جھجک محسوس کرتے تھے۔
یہود تو قتل کے دعویدار تھے ہی تعجب تو یہ ہے کہ نصاریٰ نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

۵۲۴۷ عجیب بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن یہود بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا اور سولی چڑھا دیا اور آپ کے ماننے والے اور پرستار یعنی نصاریٰ بھی یہی یقین رکھتے ہیں کہ یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دے دیا۔ گویا بیٹا سولی پر لٹکتے ہوئے "ایلی ایلی لما شبقتنی" تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا فریاد کرتا رہا اور باپ نے اس کی کچھ مدد نہ کی۔ جب دوست و دشمن اس بات پر متفق ہو چکے تھے تو قرآن کریم نے آکر حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت و جلالت شان کے اظہار کا بیڑا اٹھایا اور صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ یہودی اپنی سازش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس اللہ کے رسول کو اپنے اللہ کا پیغام سنانے کے باعث انہوں نے قتل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی اپنی مذہبی عدالت سے اس کو واجب القتل قرار دلوایا اور ملکی عدالت کو جو رومیوں کی حکومت کے تحت تھی اس حکم پر عمل درآمد کرانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اللہ رب العزت نے ان کی اس ناپاک سازش کو ناکام بنا دیا اور اپنے رسول کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیا۔ دونوں چیزوں کی نفی کر دی کہ یہودی نہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ سولی پر چڑھا کر تذلیل کر سکے۔
ہاں! ہم مانتے ہیں کہ اناجیل کی عبارتیں اس پر شہادت دیتی ہیں اور جو بات یہود کا مسلک تھا اس کو ایک لحاظ سے وہ تسلیم کرتی ہیں اور ہمارے بعض مفسرین نے بھی انہی اناجیل کی عبارات پر انحصار کر کے یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ سولی پر لٹکائے گئے تھے کچھ لوگوں نے ان کو مردہ سمجھ لیا تھا حالانکہ وہ مردہ نہیں تھے اور کچھ نے تسلیم کر لیا کہ عیسائیوں کے کہنے کے مطابق وہ تیسرے روز یا چند روز کے بعد زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے تھے اور بعض مفسرین اسلام نے یہ بھی بیان کیا ہے بلکہ اس طرح بیان کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے کہ یہود نے ایک دوسرے آدمی کو جو عیسیٰؑ تو نہیں تھا لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا اس کو قتل کر دیا تھا لیکن اصل عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لئے گئے۔
قرآن کریم نے بغیر تفصیل میں گئے اور جزوی طور پر ان کی ایک ایک بات کو بیان کر کے اس کی تردید کی بجائے دو لفظوں میں بات کو بالکل واضح اور صاف کر دیا اور قرآن کریم کا یہ سب سے بڑا اعجاز ہے کہ کسی کو

دکھ دیئے بغیر اپنا صاف صاف بیان دے جاتا ہے اور باتیں بنانے والوں کو قطعاً وہ نہیں چھیڑتا اور نہ ہی بات سے بات نکالتا ہے اور نہ اس طرح کے بیان کو وہ پسند کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سو سنار کی پر ایک ہی لوہار کی لگا کر آگے چلتا بنتا ہے لیکن سنار کو کچھ نہیں کہتا۔ اس جگہ بھی اس نے بالکل وہی کچھ کیا اور صاف صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا کہ "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ" نہ وہ قتل کر سکے اور نہ ہی سولی چڑھا سکے۔ پھر ہوا کیا؟ فرمایا "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" لیکن یہ بات ان پر مشتبہ ہو گئی۔ یہ شبہ کس نے ڈالا۔ کیوں ڈالا؟ اور کیسے ڈالا؟ اس نے اس کے متعلق کچھ نہ کہا' کیوں؟ اس لئے کہ اس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جاتا اللہ کے ہاں بے شک وہ سچ ہوتا لیکن نہ ماننے والوں کیلئے وہ کسی حال میں بھی بس نہیں ہو سکتا تھا اور اس طرح ضمنی سوالات و جوابات میں الجھ کر وہ اپنے اصل موقف سے بہت دور نکل جاتا اور قرآن کریم کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ ایسے مقامات پر بالکل خاموش رہتا ہے کیونکہ یہ کٹ حجتیوں کی لڑائی کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی اور وہ اپنے مقصد میں اس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ ایسی باتوں میں الجھا کر اصل مقصد سے دور لے جاتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب ایک نہ ہونے والی بات تسلیم کر لی جاتی ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے عیسائیوں نے یہودیوں کی باتوں میں آکر اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ہاں وہ "صلیب پر لٹکائے گئے" اس کے بعد انہوں نے کیا کچھ کہا اور وہ کہاں کے کہاں نکل گئے۔ پھر ان کو تیسرے روز زندہ کرنے' زندہ آسمان پر اٹھائے جانے' حواریوں کے ساتھ ملاقات کرنے' ایک دعوت میں شریک ہونے اور پوری قوم کے گناہوں کا کفارہ بننے۔ انسان کو لعنتی زندگی سے نکالنے۔ صلیب کو ایک مبارک نشان تسلیم کرنے کے کتنے عقائد گھڑنے پڑے یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے صلیب پر چڑھائے جانا تسلیم کر لیا حالانکہ ان کو اس کی کوئی دلیل بھی نہیں دی گئی تھی بلکہ انہوں نے اس نظریہ کو تسلیم کر کے خود دلیلیں گھڑنا شروع کیں اور اس طرح ایک ایسی بحث انہوں نے شروع کر لی جو استروں کی مالا سے کچھ کم نہ تھی۔ وہ جس طرف منہ پھیرتے زخمی ہوتے اور پھر ان زخموں کی مرہم پٹی میں وہ لگ جاتے اور یہود نے ان کا ناطقہ اس طرح بند کیا کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گئے اور آئے دنوں ان کی مجلسیں جما کر نئے نئے عقیدے بنانے اور پھر ان کی تشہیر کرنے سے کبھی فرصت نہ ہوئی اور انجام کار انہوں نے دین و دنیا کو بالکل الگ الگ کر کے ایک دوسرے سے اس طرح جدا کیا کہ اب دین میں وہ جس نظریات کے پابند ہیں ان کا دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ان کی دنیوی زندگی کیلئے کوئی ضابطہ الٰہی نہیں ہے بلکہ وہ بالکل آزاد ہیں جو ایک ناطق حیوان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور دین کی رسوم برائے نام باقی ہیں۔ حیوانی خواہشات میں وہ سوائے رضامندی کے کسی پابندی کو قبول نہیں کرتے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وہ سمجھ دار بندر کہلا سکتے ہیں۔ پھر اس پر مزید تعجب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو جو صحیح معنوں میں انسان کہلانے کے حقدار ہیں انگلیوں نچا رہے ہیں' ایسا کیوں؟ اس لئے کہ جن راستوں سے وہ گزر گئے ہیں مسلمان اب ان پر رواں دواں ہیں۔ ان کی دو سو سال کی مذہبی تاریخ کو اٹھا لو وہ

مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ
يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

۲۴۸
گمان کے سوا کوئی علم ان کے پاس نہیں اور یقیناً یہودیوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا۔ ۱۵۷

۲۴۹
بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ سب پر غالب رہنے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۵۸

آج تمہاری مذہبی تاریخ پر اس طرح منطبق ہوگی جیسے دو زاویوں کی مثلث برابر کے دو زاویوں کی مثلث پر منطبق ہوتی ہے کیونکہ تیسرا زاویہ اس کا خود بخود ہی ہوگا جو پہلی کا ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ ان پر حقیقت ہی مشتبہ ہوگئی کیا دال میں کچھ کالا تھا؟

---

۲۴۸ تفاسیر میں اگرچہ ایسی روایات کثرت سے مندرج ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرنے اور آپ کے بچ جانے اور کسی دوسرے انسان کو سولی چڑھائے جانے کی تفصیلات موجود ہیں لیکن محقق علمائے تفاسیر نے بھی صراحت کر دی ہے کہ کوئی روایت ان میں یقینی نہیں ہے اور نبی اعظم و آخر ﷺ سے اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔ اختلف الرواۃ فی کیفیۃ القتل والصلب ولم یثبت عن رسول اللہ ﷺ فی ذلک شی (بحر المحیط) بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے فلسطین کے رومی گورنر پیلاطس کی عدالت میں آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا' اس لئے کہ وہ اپنی مذہبی عدالت میں مسیح علیہ السلام کو پھانسی دلوانے کی سزا پاس کر چکے لیکن اس پر عمل درآمد ان کے بس کی بات نہ تھی یہ حکومت وقت کے اختیار میں تھا یہودیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ یعنی مسیح دین موسوی میں تحریف کرتے ہیں اور جھوٹی شہادتیں پیش کر کے حکومت وقت کو مجبور بھی کیا اور جب اسے پس و پیش کرتے دیکھا تو اس کو فتنہ بغاوت کی دھمکی بھی دی انجیل میں بھی لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں لیکن سب کی سب من گھڑت اور مختلف فیہ ہیں۔ اس بارے میں نصاریٰ کے مختلف اقوال کی تو حد ہی نہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے تین فرقوں کی آراء نقل کی ہیں ۱۔ نسطوریہ ۲۔ ملکانیہ ۳۔ یعقوبیہ۔ نسطوریہ کا یہ قول ہے کہ مسیح علیہ السلام کا ناسوت تو مصلوب ہوا لیکن ان کا لاہوت مصلوب نہیں ہوا۔ ملکانیہ کا خیال ہے کہ لاہوت بھی مصلوب ہوا لیکن بالذات نہیں بلکہ بواسطہ ناسوت اور یعقوبیہ کا نظریہ یہ ہے کہ ناسوت ولاہوت دونوں کو سولی دی گئی لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ان کی آراء کسی دلیل پر منطبق نہیں بلکہ سب کچھ ظن و گمان کی نقش آرائیاں ہیں۔
یہ اس وقت کے قصے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے معاصرین میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا چونکہ یہود کی مخالفت کے دھندلکے موجود تھے پچھلوں نے اپنے بزرگوں کی حمایت میں کہ جب انہوں نے

مخالفت کی تھی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مخالفت کر کے مخالفت میں ناکام ہوئے ہوں' انہوں نے طرح طرح کی باتیں گھڑنا شروع کر دیں اور ایسے وقت میں صرف مخالف فریق کو باتوں ہی باتوں میں چپ کرا دینا مقصود ہوتا ہے اس لئے دونوں فریقوں نے دل کھول کر باتیں بنائیں اور وہی باتیں جس طرح لوگوں میں مشہور تھیں مورخین نے ان کو تاریخوں میں درج کر دیا۔ چونکہ ہر قوم میں یہ بیماری موجود ہی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے کہ اس طرح کی روایات میں ایک طرح کی دلچسپی موجود ہوتی ہے اور وہ اس ناطے سے پروان چڑھتی رہتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ اس قدر پکی اور پختہ ہو جاتی ہیں کہ ان سے انکار ممکن ہی نہیں رہتا۔ آج بھی لوگوں کے ہاں اپنے اپنے پیروں اور بزرگوں کے نام سے ایسی ایسی باتیں مشہور ہیں کہ ان کو سن کر ہنسی آتی ہے لیکن وہی دین و مذہب کے معیار مقرر ہو کر رہ گئی ہیں۔

قرآن کریم نے واشگاف الفاظ میں یہ ارشاد فرما دیا کہ "اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تو بلاشبہ وہ بھی شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں ظن و گمان کے سوا کوئی علم ان کے پاس نہیں اور یقیناً یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔" وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا جس کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ سنت اللہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے نبی و رسول کی مخالفت کی اور وہ مخالفت میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ نے نبی کو کامیاب کیا اور نبی و رسول کے مقابلہ میں پوری قوم کو شکست دی اور ناکام کر کے رکھ دیا یہی کچھ یہاں بھی ہوا کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سچے رسول تھے چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کو پڑھو مخالفین نے کیا کچھ کیا اور اس کیلئے کیا کیا اسکیمیں بنائیں ابراہیم علیہ السلام نے پوری قوم کو دو ٹوک لفظوں میں یہ جواب دیا کہ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (الانبیاء ۲۱ : ۵۷) "اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا بخدا میں ضرور تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک چال چلوں گا جب تم سب پیٹھ پھیر کر چل دو گے۔" قرآن کریم کہتا ہے کہ قوم کے لوگوں نے بھی ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان کے بعد اپنا سارا زور لگایا اور ابراہیم علیہ السلام کو ناکام کرنے کی ساری تدبیریں کیں اور ساری سرگزشت کا نچوڑ اس طرح بیان فرمایا کہ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۷۰) "اور دیکھو انہوں نے چاہا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ایک چال چلیں لیکن ہم نے انہیں نامراد کر دیا۔" اس طرح انجام کار پوری قوم کے مقابلہ میں کامیابی کس کو ہوئی؟ ابراہیم علیہ السلام کو۔

صالح علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی کہ قوم نے صالح علیہ السلام کی تبلیغ کا مذاق اڑایا اور مخالفت میں اس قدر جھوٹے ہوگئے کہ کسی ضابطہ کی پابندی کو وہ قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوئے انجام کار صالح علیہ السلام نے ان کو چیلنج دے دیا اور وہ بھی اس قدر بڑھ چکے تھے کہ انہوں نے اس چیلنج کی بھی کوئی پروا نہ کی اور جس بات سے ان کو منع کیا گیا تھا انہوں نے وہی کر دکھایا قرآن کریم کہتا ہے کہ پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ "جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کا یہ حال ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے ان کو آلیا اور جب صبح ہوئی تو وہ سب

اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے گویا ان گھروں میں وہ کبھی بسے ہی نہ تھے۔" اَلَا اِنَّ ثَمُوْدَ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (ھود ۱۱ : ۶۸) "تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی اور ہاں! سن رکھو کہ ثمود کیلئے محرومی ہوئی۔"

اور نبی اعظم و آخر ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ "اے پیغمبر اسلام! اس طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار بنا دیئے تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں اور فی الحقیقت وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔" (الانعام ۶ : ۱۲۳) فرمایا جب کسی آبادی میں کوئی داعی حق کھڑا ہوتا ہے تو وہاں کے سردار محسوس کرتے ہیں کہ اگر دعوت حق کامیاب ہوگئی تو ان کے ظالمانہ اختیارات کا خاتمہ ہو جائے گا اس لئے انہیں ایک طرح کی ذاتی دشمنی اور کد ہو جاتی ہے وہ طرح طرح کی مکاریاں کرتے ہیں تاکہ لوگ دعوت حق قبول نہ کریں اور یہی کچھ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام سے کیا اور ان کے ساتھ سنت اللہ کے مطابق ہوا جو ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کی مکاریوں کا نشانہ بننے سے بچا لیا

۲۴۹ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں پھیلے ہوئے تمام نظریات کا اعلان کر کے اب قرآن کریم خود بتاتا ہے کہ وہ کہاں گئے۔ فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں اٹھا لیا' کہیں وہ خود بیٹھا تو ہے نہیں کہ وہاں بلا لیا ہو تو اس کا صاف جواب تو یہی ہے کہ یہودیوں کی مکاریوں سے صاف صاف بچا لینے کو ان الفاظ میں بیان فرما دیا۔ اس لئے کہ اصل مقصود اس بیان کا ان کی مکاریوں اور سازشوں سے بچانا ہی تھا خواہ وہاں سے ہجرت کرا کے بچایا ہو' خواہ فلسطینی حکومت نے مداخلت کر کے ان کی مذہبی عدالت کے فیصلہ کے نفاذ پر پابندی عائد کر دی ہو۔ خواہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو یہود کے مقابلہ میں کھڑا کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہوں۔ خواہ اس طرح کی کوئی اور تدبیر کر دی ہو جس کا ذکر صدیوں بعد کرنے سے کوئی ابہام پیدا ہوتا ہو اس لئے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ لیکن یہی وہ الفاظ ہیں جن سے ہم مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ یہ قائم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ عقیدہ عیسائیوں کا بھی یہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائی مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوئے اور پھر ان میں یہ اختلاف رونما ہوا کہ آیا صلیب پر مرے یا مرنے سے پہلے ہی صلیب سے اتار دیئے گئے اس طرح کچھ عیسائیوں نے مان لیا کہ وہ ایک بار مر گئے تھے لیکن تیسرے روز وہ زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے اور کچھ کا خیال ہے کہ وہ صحیح طور پر مرے ہی نہ تھے اور نیم مردہ حالت میں صلیب سے اتار لئے گئے اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہ بالکل تندرست ہوئے تو یہود کی مخالفت کے دوبارہ خطرہ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا لیکن ہم مسلمانوں کی اکثریت یہی مانتی ہے کہ ان کی شکل ایک انسان سے مشابہ کر دی گئی۔ یہود نے ان کی شکل والے ان ہی کے مصاحب کو سولی چڑھایا اور آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

لیکن خدا لگتی بات تو یہی ہے کہ اس عقیدہ کی بنیاد بھی اتنی ہی کمزور ہے جتنی دوسری قوموں کے عقائد کی بنیاد کمزور تھی یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے ہاں حیات مسیح کا عقیدہ متفق علیہ عقیدہ نہیں بلکہ بہت سے مسلمان حیات مسیح کے قائل نہیں تھے۔ اس سے فائدہ مرزا قادیانی نے اٹھایا اور انہوں نے وفات مسیح کی بنیاد پر کبھی مسیح موعود اور کبھی ظلی اور بروزی نبی اور علاوہ ازیں بھی بہت کچھ بننے کی ناکام کوشش کی تاہم انہوں نے اپنی نبوت کے ثبوت کے لئے وفات مسیح کو بطور اساس بنایا حالانکہ ختم نبوت کے مسئلہ کو حیات مسیح کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں اس طرح دراصل انہوں نے مسلمانوں کو ایک طرح کا دھوکا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی نبوت و مسیحیت کو ثابت کرتے جو ان کو بھی معلوم تھا کہ ثابت نہیں کی جا سکتی انہوں نے سارا زور وفات مسیح پر لگا دیا اور ان کے مقابلہ میں اہل اسلام کی اکثریت نے بھی ان کی نبوت و مسیحیت کے تار عنکبوت کو ایک ہی ہاتھ سے صاف کر دینے کی بجائے اپنا زور حیات مسیح پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کھینچا تانی میں مرزا جی کے جھوٹ کو کچھ دیر چلنے کا موقع مل گیا حالانکہ اس سانپ کو دم کی بجائے سر سے پکڑ لیا جاتا تو اس وقت بھی اس کا سر کچلا جا سکتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس فتنہ نے اس سے پہلے بھی کم از کم اکیس بائیس بار سر اٹھایا تھا لیکن ایک ہی ضرب سے اس کا سر کچل دیا جاتا رہا اور "حیات مسیح" اور "وفات مسیح" کا مسئلہ اس وقت بھی اسی طرح موجود تھا۔ اور "مُتَوَفِّیکَ" کے معنی "مُمِیتُکَ" صدر اول ہی ہوتے چلے آرہے تھے۔ اور حضرت خاتم النبیین ﷺ کے بعد کسی کا کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرنا آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ کا صریح انکار اور کفر ہے اور اس پر ملت اسلامیہ میں اس وقت سے لے کر آج تک کوئی اختلاف نہیں ہوا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ آج عوام تو عوام علماء کرام بھی یہ سمجھتے ہیں کہ "وفات مسیح" مرزائیوں کا مسئلہ ہے اس لئے جو "وفات مسیح" کا قائل ہو وہ گویا مرزائی ہوتا ہے حالانکہ یہ اتنا ہی بڑا جھوٹ ہے جتنا گدھے کے سر پر سینگ۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ مرزا جن کا نام ان کے والدین نے "غلام احمد" رکھا تھا جس طرح اور بھی بہت سے لوگ یہ نام رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں مرزا جی کے صاحبزادے نے بڑی چالاکی کے ساتھ سورہ الصف کی آیت اِذْ قَالَ عِیسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ "اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔" (الصف ۶۱ : ۵) مرزا کو بروزی نبی ثابت کرنے کی کوشش کی پھر اس ناطے سے "احمدی" کا نام مخصوص کر لیا اور "قادیانی" اور "مرزائی" کے نام سے گلو خلاصی کرائی اور "احمدی" نام کو پکا کر لیا پھر اس نام کو دونوں گروہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا دوسرے مسلمانوں نے کوئی تنقید نہ کی اور ان کو لاہوری اور قادیانی کہہ

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ

اور دیکھو اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے اس پر یقین نہ لے آئے

کر تخصیص دے لی اور آہستہ آہستہ وہ وقت آیا کہ یہ فتنہ اپنے انجام کو پہنچا تو قانون کے اندر "احمدی غیر مسلم" کے نام استعمال ہونے لگے اور اب مسلمانوں نے "وفات مسیح کی طرح" "احمدی" کے الفاظ بھی مرزائیوں کے سپرد کر دیئے اور یہ خیال نہ کیا ہمارا حق تو یہ ہے کہ ہم ثابت کر دیں کہ تم "احمدی" نہیں بلکہ "مرزائی" "قادیانی" یا چاہو جو نام اپنے لئے پسند کرو۔

مزید تعجب یہ ہوا کہ مرزائیوں نے قرآن کریم کی دو آیات کریمات کو استعمال کرنا شروع کر دیا "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ" "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" پھر ایک وقت آیا کہ جس کے گھر میں یہ آیت لکھی گئی ہو جس کے ہاتھ پر انگوٹھی ہو جس کے نگینہ میں "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ" کے الفاظ کندہ ہوں جس مکان پر "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" تحریر کیا گیا ہو اس کو مرزائی اور مرزائیوں کا مکان تصور کر لیا اور یہ تاثر اتنا پھیلا کہ یہ دونوں آیتیں تو اس طرح سمجھی جانے لگیں جیسے قرآن کی آیات نہ رہی ہوں۔ مرزائیوں کا نشان سمجھی جانے لگیں۔ یعنی ایسی ضد بنا دی گئی کہ مرزائی اگر دو اور دو کو چار کہیں گے تو ہم مسلمان تب ہی مسلمان رہ سکتے ہیں کہ ان کو پانچ کہیں یا کم از کم تین کہہ لیں لیکن چار نہیں کہیں گے اس لئے کہ یہ مرزائیوں نے کہنا شروع کر دیا ہے۔ اب ہم ان کو چار تب ہی مانیں گے جب حکومت اس پر بین لگائے کہ وہ چار کہنا چھوڑ دیں اور ظاہر ہے کہ یہ رومیوں کی حکومت تو ہے نہیں جو ڈٹ جائے یہ تو مسلمانوں کی اپنی حکومت ہے اور جو مسلمان کہیں گے حکومت کو بہرحال کہنا ہی پڑے گا ورنہ بس پھر ورنہ ہی ہو جائے گا۔

ہاں! یاد رہے کہ نزول مسیح کا مسئلہ احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے لیکن اس مسئلہ کا تعلق بھی "حیات مسیح" سے مطلق نہیں ہے ہاں! جن احادیث میں مسیح کی آمد کا ذکر ہے "ان میں تو مسیح کا نام' ولدیت' محل نزول اور جو جو کارہائے نمایاں آپ انجام دیں گے ان سب کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔" (ضیاء القرآن ج اول ص ۴۱۷) بہرحال اگر کوئی شخص "حدیث کو مانتا ہے تو اسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابن مریم ہوں گے اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اور چیز پر مبنی نہیں ہے۔ (تفہیم ج ۲ ص ۱۳۶) اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو اللہ انہیں زندہ اٹھا لانے پر قادر ہے اور دوبارہ اٹھانے کا اس کا قانون بھی ہے اعلان بھی اور سب کا دوبارہ اٹھنا بھی لازم و ضروری ہے اور اس زندگی میں ایک دوسرے کی پہچان ایک دوسرے سے گفتگو سب محقق ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت انشاء اللہ سورہ الاحزاب میں ہوگی جہاں خاتم النبیین کا موضوع بھی زیر بحث آئے گا اس وقت تو عرض یہ کرنا ہے کہ "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" کے الفاظ سے یہ بات حتمی

الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا

ایسا ہونا ضروری ہے[۲۵۰] اور قیامت کے دن وہ ان پر شہادت دینے والا ہو گا۔ ۱۵۹

الغرض یہودیوں کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں' جو حلال

ثابت نہیں ہوتی کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور یہ کہ "وفات مسیح" کا مسئلہ عالم اسلام کا اختلافی مسئلہ ضرور ہے لیکن مرزائیوں کا مسئلہ نہیں جیسا کہ اس کو سمجھ لیا گیا ہے۔

اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے اس پر یقین نہ لے آئے

[۲۵۰] اس آیت کے معنی ایک سے زیادہ طریقوں سے کئے گئے ہیں اور جس طریقہ پر سمجھ لئے جائیں صحیح اور درست ہیں اگرچہ بعض میں ابہام زیادہ ہے۔

۱۔ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا۔

۲۔ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا۔

۳۔ ہر اہل کتاب اپنی موت سے پہلے نبی اعظم و آخر ﷺ کی صداقت پر ایمان لے آئے گا اور نبی کریم ﷺ قیامت کے دن شہادت دیں گے کہ اے اللہ! میں نے انہیں پیغام حق پہنچا دیا تھا لیکن انہوں نے نہیں مانا۔

"قَبْلَ مَوْتِهٖ" کی ضمیر کا مرجع کون؟ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مرجع کتابی ہے۔ یعنی ہر اہل کتاب پر مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام نبوت و عبدیت منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اس پر ایمان لے آتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ یہ ایمان ان کیلئے مفید ثابت نہیں ہوتا' کیوں؟ اس لئے کہ یہ مرتے وقت کا ایمان ہوتا ہے جو مقبول نہیں ہوتا البتہ ان کو افسوس دلانے کیلئے اس بات سے جب پردہ ہٹایا جاتا ہے تو وہ افسوس و حسرت میں مبتلا ہوتے ہیں جو ایک طرح کا عذاب ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ کتابی سے کیا مراد ہے؟ یہودی یا عیسائی یا دونوں۔ پھر تفاسیر میں صرف یہودی مراد بھی لئے گئے ہیں' صرف عیسائی بھی مراد لئے گئے ہیں اور دونوں کو مراد لے کر تفسیر کی گئی ہے کیونکہ غلو دونوں ہی نے کیا ہاں! ایک تفریط کے مرتکب ہوئے ہیں جیسے یہودی تو دوسرے افراط کے جیسے عیسائی اس لئے کہا گیا ہے چونکہ صحیح ایمان دونوں ہی کا نہیں ہے اس لئے دونوں گروہ پر موت کے وقت وہ حالت جو حقیقی ہے منکشف کی جاتی ہے اور تیسرے مفہوم کے مطابق بھی تفسیر بیان کی گئی ہے اور اس پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں اور یہ

بھی کہا گیا ہے کہ "قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں پہلی ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہے اور دوسری کا مرجع محمد رسول اللہ ﷺ ہیں مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن کریم اور نبی اعظم و آخر ﷺ کی صداقت تسلیم کرنے کیلئے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن کریم فی الواقع اللہ کی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اس حیلے سے وہ تمام عقلی، نقلی، فطری اور تاریخی دلائل کو نظر انداز کر رہے ہیں جو قرآن کریم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت کے ثبوت میں موجود ہیں لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ یہود اور نصاریٰ قرآن کریم اور پیغمبر اسلام کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن کریم ان کیلئے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کیلئے ممکن نہیں رہے گا اگرچہ ایمان کی سعادت یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد حاصل نہ ہوگی۔ اس طرح "لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ" میں جو ایمان لانے کے متعلق خبر ہے وہ مجرد خبر ہی نہیں بلکہ بطور دلیل ہے اور اس کا مطلب ایمان بالیقین نہیں بلکہ ایمان بالمشاہدہ ہے یعنی وہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس کا انکار ممکن نہیں رہے گا۔ دل سے اس پر یقین اگرچہ وہ نہ رکھتے ہوں۔

یاد رہے کہ سلف میں سے حضرت عکرمہ پہلی ضمیر کا مرجع آنحضرت ﷺ کو مانتے ہیں لیکن مفسرین نے اس بعد کے سبب جو ایک طویل جملہ معترضہ نے پیدا کر دیا ہے اس قول کو کوئی اہمیت نہیں دی حالانکہ جملہ معترضہ سے جو بعد پیدا ہوتا ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہوتا ایسی صورت میں اس سے صرف نظر کر کے سلسلہ کلام کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "قیامت کے دن وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا" یہ اس شہادت کا ذکر ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ قیامت کے روز ان تمام لوگوں پر دیں گے جن پر آپ ﷺ نے اس دنیا میں دین حق کی شہادت دی ہے۔ اس شہادت کا ذکر اس سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور اس آیت کے تحت اس کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔ یہ شہادت بلاشبہ سارے انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں پر دیں گے اور سیدنا مسیح علیہ السلام جو شہادت اپنی امت پر دیں گے اس کا مخصوص ذکر بھی سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۶، ۱۱۷ میں کیا گیا ہے لیکن نبی اعظم و آخر ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ اور دوسری ساری امتوں پر وہ عربی ہوں یا عجمی سب پر واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین کیا ہے اس وجہ سے آپ ﷺ ہی کا یہ منصب ہے کہ آپ ﷺ قیامت کے دن یہ بتائیں کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا بتایا اور آپ ﷺ کی اس شہادت سے لوگوں پر حجت قائم ہوگی جیسا کہ اس کا ذکر پیچھے گزر چکا اور اس طرح گویا آپ ﷺ کی شہادت دنیا و آخرت دونوں جگہ اہل کتاب کے دونوں فریق پر قائم ہو جائے گی اور ان کیلئے مجال انکار باقی نہ رہے گا۔ اللھم صلی علی محمد و ال محمد۔

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ

تھیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے۔ ۱۶۰
اور ان کی یہ بات کہ وہ سود لینے لگے تھے حالانکہ اس سے روکے گئے تھے اور یہ بات کہ

یہود کی اس گمراہی کا ذکر جس کے نتیجہ میں ان پر حلال چیزوں کو حرام کر دیا گیا

۲۵۱ یہ مضمون قرآن کریم میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے سورہ آل عمران میں جہاں فرمایا "کھانے کی یہ ساری چیزیں جو شریعت محمدی و احمدی میں حلال ہیں بنی اسرائیل کیلئے بھی حلال تھیں' البتہ بعض چیزیں تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ "ان سے کہو کہ لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت اگر تم اپنے اعتراض میں سچے ہو۔" (ال عمران ۳ : ۹۳) اس زیر نظر آیت میں فرمایا "یہود کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے کتنی اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے حلال تھیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے۔" اور سورہ الانعام میں فرمایا کہ "ان کی سرکشیوں کی پاداش میں ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کئے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کیلئے حرام ٹھہرا دی۔" (الانعام ۶ : ۱۴۶) ان تینوں آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت محمدی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حلت و حرمت کے معاملہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے۔

ایک یہ کہ نزول تورات سے صدیوں پہلے یعقوب علیہ السلام نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی ان چیزوں کی تارک رہی حتیٰ کہ یہودی فقہاء نے ان کو باقاعدہ حرام سمجھ لیا اور ان کی حرمت تورات میں لکھ دی اور جن اشیاء کو تورات میں لکھ لیا گیا ان میں اونٹ اور خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائبل میں توراۃ کے جو اجزاء ہم کو ملتے ہیں ان میں ان تینوں چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ "جانوروں میں جن کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں اور وہ جگالی کرتے ہیں تم ان کو کھاؤ۔ مگر جو جگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں ان میں سے تم ان جانوروں کو نہ کھاؤ یعنی اونٹ کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں۔ سو وہ تمہارے لئے ناپاک ہے اور سافان کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے اور خرگوش کو کیونکہ وہ جگالی تو کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ تمہارے لئے ناپاک ہے اور سور کو کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھانا اور ان کی لاشوں کو نہ چھونا وہ تمہارے لئے ناپاک ہیں۔" (الاحبار ۱۱ : ۴ تا ۸) اور ایک جگہ ہے کہ "اور چوپایوں میں سے جس جس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں

اور وہ جگالی کرتا ہو تم اسے کھا سکتے ہو لیکن ان میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا ان کے پاؤں چرے ہوئے ہیں تم ان کو یعنی اونٹ اور خرگوش اور سافان کو نہ کھانا کیونکہ یہ جگالی کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں سو یہ تمہارے لئے ناپاک ہیں اور سور تمہارے لئے اس سبب سے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چرے ہوئے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ تم نہ تو ان کا گوشت کھانا اور نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگانا۔" (الاستثناء ۱۴ : ۷ تا ۸) لیکن قرآن کریم میں اس وقت یہودیوں کو چیلنج دیا گیا تھا کہ لاؤ توراۃ کو اور دکھاؤ جو یہ چیزیں کہاں حرام لکھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ توراۃ میں ان احکام کا اضافہ اس کے بعد کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس وقت توراۃ میں یہ احکام موجود ہوتے تو بنی اسرائیل فوراً لا کر پیش کر دیتے۔

اور دوسرا فرق اسی وجہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں یعنی شتر مرغ قاز اور بط وغیرہ دوسرے گائے اور بکری کی چربی بائبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام توراۃ میں داخل کر دیا گیا ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ "ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمہاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔" (احبار ۳ : ۱۷) سورہ النساء کی یہ آیت جس کی تفسیر یہ رہی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود پر پہلے یہ چیزیں حلال تھیں حرام نہ تھیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حرام ہوئیں اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ رہی یہ بات کہ پھر ان چیزوں کی متعلق اس جگہ اللہ تعالیٰ نے "حَرَّمْنَا" ہم نے حرام کیا کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ الٰہی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر اور کتاب کے ذریعہ سے کسی چیز کو حرام کر دے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے اور وہ ان طیبات کو حرام کر دیں پہلی قسم کی تحریم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طور پر ہوتی ہے اور یہ دوسری قسم کی تحریم اس کی پھٹکار اور سزا کی حیثیت سے ہوا کرتی ہے اور یہی کچھ یہاں ہوا۔

یہودیوں کو سود سے منع کیا گیا تھا لیکن وہی دنیا کی پہلی قوم ہے جس نے سود کے طریقے ایجاد کئے

۲۵۲ توراۃ میں تحریف ہونے کے باوجود آج تک سود کی حرمت اس میں موجود ہے چنانچہ تحریر ہے کہ "اور اگر تیرا کوئی بھائی مفلس ہو جائے اور وہ تیرے سامنے تنگ دست ہو تو اسے سنبھالنا..... تو اس سے سود یا نفع مت لینا بلکہ اپنے خدا کا خوف رکھنا تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگی بسر کر سکے تو اپنا روپیہ اسے سود پر مت دینا اور اپنا کھانا بھی اسے نفع کے خیال سے نہ دینا۔ (احبار ۲۵ : ۳۵، ۳۷) "تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا خواہ وہ روپے کا سود ہو یا اناج کا سود یا کسی ایسی چیز کا سود ہو جو بیاج پر دی جایا کرتی ہے۔" (استثناء

۲۳ : ۱۹، ۲۰) "میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ ہم سب سود لینا چھوڑ دیں۔" (نحمیاہ ۵ : ۱۳) "تو نے بیاج اور سود لیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا۔" (حزقی ایل ۲۲ : ۱۳) اس جگہ ان کی زیادتیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ اسلام کے دشمن کیوں ہیں؟ محض اس لئے کہ قرآن کریم ان کی ان زیادتیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کی انگلی پکڑ کر اس مقام پر رکھ دیتا ہے جس مقام میں انہوں نے ترمیم کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا تھا اور ان کو اس بات کی دلیل مہیا کر دی کہ جو شخص یا قوم اپنے رب کے ساتھ دھوکا سے باز نہیں آئی اس کو لوگوں کے ساتھ زیادتی کرتے کیا دیر لگے گی؟ اور اس طرح مسلمانوں کیلئے بھی اس میں بے شمار اسباق موجود ہیں کہ یہود و نصاریٰ کو جو سزا ملی وہ ان کی زیادتیوں کا نتیجہ تھی اور اگر تم نے زیادتی کی اس کا نتیجہ تم بھی دیکھ لو گے کیونکہ اللہ کے ہاں اندھیر نگری نہیں کہ کسی کے جرم میں اس کو سزا دے اور کسی کو ان کے جرم پر انعام و اکرام دیتا چلا جائے۔ کل انہوں نے اپنے اعمال کا بدلہ پا لیا تو آج یقیناً تم بھی اپنے اعمال سے دوچار ہو گے اور اگر غور کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آج ہماری کوتاہیوں اور بد عملیوں ہی کا نتیجہ ہے جو ہم بھگت رہے ہیں۔

یہود کی ان گمراہیوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر کیا گیا اور ہر جگہ یہ بات بھی سمجھائی گئی کہ ان کی انہی کوتاہیوں کے نتیجہ میں ان پر ضلالت آئی اور تم خیال رکھنا کہ ان امراض کو قریب نہ آنے دینا جو اس قوم کو لاحق ہو گئے تھے۔ پھر ان امراض کا بھی ذکر فرمایا جن میں سب سے بڑا مرض یہ قرار دیا گیا کہ ان کے علماء نے ان کو ان کوتاہیوں سے باز رہنے کا حکم دینا بھی چھوڑ دیا جیسا کہ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ گناہ اور ظلم اور مال حرام کھانے میں تیز گام ہیں' کیا ہی برے کام ہیں جو وہ شب و روز کر رہے ہیں۔ ان کے عالموں اور پیروں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہیں جھوٹ بولنے اور مال حرام کھانے سے روکتے نہیں؟ کیا ہی بری کار گزاری ہے جو یہ کر رہے ہیں۔" (المائدہ ۵ : ۶۲، ۶۳) ان علماء اور پیروں پر تو افسوس کیا جا رہا ہے جو قوم کو جھوٹ بولنے اور حرام مال کھانے سے روکتے نہیں تھے اور آج ان علماء پر کیا کیا جائے جو خود ہی جھوٹ بولتے اور حرام کھانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کیا پہلوں کو عذاب اور پچھلوں کو انعام دیا جائے گا؟ افسوس کہ ہم کو کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا ہو گئے؟

ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اے پیغمبر اسلام! یہ لوگ جھوٹ کیلئے کان لگانے والے اور برے طریقوں سے مال میں بے باک ہیں۔" (المائدہ ۵ : ۴۲) مثلاً سرکاری ملازم اور سیاسی لیڈر ہیں کہ رشوت لیتے ہیں اور رشوت کو رشوت نہیں کہتے بلکہ حق سمجھتے ہیں اور اس طرح علماء' پیر' مفتیان ہیں کہ نذرانے وصول کرتے اور فتوے بیچتے ہیں اور ذرا جھجک بھی محسوس نہیں کرتے۔ "یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کو کبھی پاک نہیں کرے گا ان کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب ہو گا۔" (المائدہ ۵ : ۴۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾
لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ

ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے لگے اور یاد رکھو ان میں جو لوگ، منکر ہوگئے ہم نے ان کیلئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۶۱

لیکن اے پیغمبر اسلام! ان میں سے جو لوگ، علم میں پکے ہیں ۲۵۳ وہ اور مسلمان اس کتاب

"اے ایمان لانے والو! "ان اہل کتاب کے" اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب کی بشارت ہے۔" (التوبہ ۹ : ۳۴) یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں۔ رشوتیں کھاتے ہیں وہ بھی دین و مذہب کے نام پر، نذرانے لوٹتے ہیں ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں اور ان کا مرنا اور جینا اور شادی و غم کچھ بھی ان کے کھلائے بغیر نہ ہو سکے اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکہ دار ان کو سمجھ لیں بلکہ مزید برآں اپنی اپنی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلق خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوت حق اصلاح کیلئے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ تو علمائے یہود کی حالت تھی ہم مسلمانوں کے اکثر مذہبی پیشوا، علامہ صاحب، مولانا صاحب، پیر جی، مفتی جی اور قاضی جی اور صاحبزادہ صاحب ان سے بہت آگے نکل چکے ہیں تاہم ان کا ذکر خیر صحیح ہے اور ہمارا نام لینا حرام ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں تحریف ہوتی ہے۔ لیکن کوئی پوچھے مخاطب تو ایمان والوں کو کیا گیا ہے اور ترجمہ میں جو "ان اہل کتاب کے" الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے؟ کیا یہ تحریف نہیں ہے ہمارا نام آئے تو تحریف ہوتی ہے کیونکہ یہ معاملہ "آر" کا نہیں "پار" کا ہے۔

"راسخ فی العلم لوگ" ایمان لاتے ہیں اور ہر ہدایت کو "من اللہ" سمجھتے ہیں

۲۵۳ یہود کی کثرت غالبہ اگرچہ ہدایت آسمانی کو عملی طور پر چھوڑ چکی تھی لیکن اس کے باوجود ابھی خال خال ایسے علماء حق موجود تھے جن کی معلومات اپنے دین کے متعلق سطحی قسم کی نہ تھیں وہ صرف رواجی اور رسمی علماء کہلانے والے اور پیشہ ور لوگ ہی نہ تھے بلکہ ٹھوس قابلیت کے مالک تھے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت ثعلبہ بن سعید، حضرت زید بن سعید، حضرت اسید بن عبید وغیرہ۔ تفصیل اس آیت کی پیچھے سورہ آل عمران کی آیت میں گزر چکی ہے۔ یہ سب لوگ وہی ہیں جو علم شریعت میں راسخ تھے اس لئے ان کو اپنی

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ
وَالْمُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ أُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٦٢﴾ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا

ع ۲۳ ۱۰ ۲

پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی ہے اور ان تمام کتابوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں تو ایسے لوگ ہیں جنہیں ہم عن قریب ان کا اجر عطا فرمائیں گے ایسا اجر جو بہت ہی بڑا اجر ہوگا۔ ۱۶۲

اے پیغمبر اسلام! ہم نے[۲۵۴] تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوحؑ پر اور ان

قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کیلئے کھڑے ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی تھی اس جگہ انہی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کیلئے بجائے علماء کے "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کے لقب سے مشرف فرمایا گیا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جو آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں تھے بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پر جمنے والے تھے۔ ان کے دلوں میں سچا ایمان موجود تھا وہ سچائی کو تسلیم کرنے والے تھے وہ اخلاق و کردار کے ستھرے لوگ تھے اور سوسائٹی میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے یہود کے قومی بگاڑ کی ہوا ان کو نہیں لگی تھی یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اس کو قبول کرنے کیلئے والہانہ طور پر آگے بڑھے۔ وہ ان ساری گمراہیوں سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے تھے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور ان تمام کتابوں پر بھی جو ان سے پہلے نازل ہو چکی تھیں وہ نمازوں کو قائم کرنے والے، زکوٰۃ کے ادا کرنے والے اور اللہ اور آخرت کے دن پر سچے دل سے ایمان لانے والے تھے۔ یقیناً ایسے لوگ ہیں جنہیں عنقریب ان کا اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ہے ایسا اجر جو بہت ہی بڑا اجر ہوگا۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت بھی وہی تھی جو دوسرے انبیاء کرام لائے تھے

۲۵۴ قرآن کریم کا شروع سے آخر تک مطالعہ کر کے دیکھ لو کوئی بات بھی قرآن کریم کے صفحوں میں اس درجہ نمایاں نہیں ہے جس قدر یہ بات ہے کہ اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور

إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ
وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ

نبیوں پر جو نوحؑ کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور جس طرح ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اولاد یعقوبؑ عیسیٰؑ ایوبؑ یونسؑ ہارونؑ اور سلیمانؑ پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ ۱۶۳

اور اللہ کے وہ رسول جن کا حال ہم پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں

متفقہ راہ ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ جس راہ کی میں دعوت ہوں وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے اور نہ سچائی کی راہ نئی ہو سکتی ہے۔ یہ وہی راہ ہے جو اول روز سے موجود ہے اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اس کی طرف بلایا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور دیکھو اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم تھا اور ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ کا ایک ہی دین ہے اس کو قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔" (الشوریٰ ۴۲ : ۱۳) سورہ الانعام میں سارے انبیاء کرام کے نام گنوا کر جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں بعد ازیں نبی اعظم و آخر ﷺ کو مخاطب کیا گیا اور فرمایا :

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہ حق دکھلائی پس اے پیغمبر اسلام تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔" (الانعام ۶ : ۹۰)

مزید تفصیل کیلئے دیکھو سورہ آل عمران کی آیت ۷۸

ہاں یاد رہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر مسلسل کیا گیا ہے اس میں ترتیب کے لحاظ سے نہیں کیا گیا اس لئے کسی کو یہ خیال نہ آئے کہ ان کا ذکر ترتیب زمانی کے لحاظ سے ہے ہرگز نہیں صرف بطور تذکرہ ذکر کیا گیا ہے اور مکمل فہرست بھی ایک جگہ نہیں دی گئی جن کا قرآن کریم نے تذکرہ کیا ہے ان میں سے بیشتر کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ ترتیب زمانی علماء نے قائم کی ہے وہ تقریباً اس طرح ہے۔

۱۔ ابو البشر آدمؑ ۲۔ حضرت نوحؑ ۳۔ حضرت ادریسؑ ۴۔ حضرت ہودؑ ۵۔ حضرت صالحؑ
۶۔ حضرت ابراہیمؑ ۷۔ حضرت اسماعیلؑ ۸۔ حضرت اسحٰقؑ ۹۔ حضرت لوطؑ ۱۰۔ حضرت یعقوبؑ
۱۱۔ حضرت یوسفؑ ۱۲۔ حضرت شعیبؑ ۱۳۔ حضرت موسیٰؑ ۱۴۔ حضرت ہارونؑ ۱۵۔ حضرت الیاسؑ
۱۶۔ حضرت الیسعؑ ۱۷۔ حضرت داؤدؑ ۱۸۔ حضرت سلیمانؑ ۱۹۔ حضرت ایوبؑ ۲۰۔ حضرت یونسؑ

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ

نہیں سنایا اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کہ واقعہ میں کلام کرنا ہوتا ہے۔ ۱۶۴

یہ تمام رسول، خوشخبری دینے والے اور متنبہ کرنے والے تھے کہ ان کے آنے کے بعد

۲۱۔ حضرت ذوالکفلؑ ۲۲۔ حضرت عزیرؑ ۲۳۔ حضرت زکریاؑ ۲۴۔ حضرت یحییٰؑ ۲۵۔ حضرت عیسیٰؑ

۲۶۔ حضرت نبی اعظم و آخر محمد رسول اللہ ﷺ

قرآن کریم میں بعض انبیاء کرام کا ذکر نام بنام آیا ہے اور بعض کا نہیں آیا

۲۵۵ وحدت دین کی اصل عظیم کا اعلان کر کے یہ بات واضح کی تھی کہ نوع انسانی کیلئے خدا کی سچائی ایک ہی ہے اور تمام راہنمایان اسلام نے اس کی تعلیم دی تھی۔ یہ پیروان مذاہب کی گمراہی ہے کہ انہوں نے گروہ بندیاں تشکیل دی ہیں اور اس طرح الگ الگ دین بنا لئے ہیں اور ایک دوسرے کو جھٹلانے لگے ہیں اب بتایا کہ قرآن کریم نے بعض کا ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا لیکن وہ سب کی تصدیق کرتا ہے اور سب پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے جن کے نام احادیث و روایات میں آتے ہیں جیسے یوشع بن نون علیہ السلام اور حزقیل علیہ السلام اور شموئیل علیہ السلام وغیرہ اور جن کے نام قرآن و حدیث میں نہیں قرآن کریم کہتا ہے کہ جب تک ختم نبوت کا اعلان کر کے نبوت کا دروازہ بند نہیں کر دیا گیا اس سے پہلے کوئی عہد اور کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اللہ نے نبی و رسول نہ بھیجے ہوں لیکن ان گنت رسولوں اور نبیوں کی تعلیم ایک ہی تھی اس لئے کسی ایک نبی سے انکار سارے انبیاء کرام کا انکار تصور ہوگا کیونکہ سب کی تعلیم ایک ہی طرح کی تھی اور ان سب کے ہاں اصول کبھی مختلف نہیں تھے اور سب کا کام دعوت الی الحق ہی تھا اور سارے کے سارے ایک ہی اللہ کی وحدانیت کا درس دینے والے تھے اور مزید وضاحت فرما کر صاف صاف کہہ دیا کہ ان سب کی تعلیم وہی تھی جو نبی اعظم و آخر ﷺ کی تعلیم ہے۔ اس بات کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک امت میں کوئی نہ کوئی نبی و رسول ضرور بھیجا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اے پیغمبر اسلام! آپ تو بس ایک خبردار کرنے والے ہیں ہم نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔" وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر ۳۵ : ۲۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اے پیغمبر اسلام! آپ ﷺ ایک خبردار کرنے والے راہنما ہیں اور ہر قوم کیلئے ایک راہنما ہوا ہے۔"

لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾

لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے ۲۵۶ جو وہ اللہ کے حضور پیش کر سکیں اور اللہ سب پر غالب اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۶۵

(الرعد ۱۳ : ۷) وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور ایک جگہ فرمایا :

"اور اے پیغمبر اسلام! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تم سے پہلے بھی پچھلے گروہوں میں پیغمبر بھیجے ہیں۔" وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ (الحجر ۱۵ : ۱۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا۔" (النحل ۱۶ : ۳۶) فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا فرمایا رسول کا کام کیا ہے؟

صرف یہ کہ پیغام پہنچا دینا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا سفیر ہوتا ہے اگر کوئی اس کی بات کو نہیں مانتا تو گویا اس نے احکم الحاکمین کی بات کو نہیں مانا اور جو وحی الٰہی کے باغی ہیں اللہ کے پاس ایسے باغیوں کا علاج موجود ہے۔ پیغام پہنچانے والے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ صاف صاف اور روشن طریقہ پر پیغام پہنچا دے اب اسے ماننا یا نہ ماننا یہ سننے والوں کو کام ہے پیام پہنچانے والے اس کیلئے ذمہ دار نہیں اور یہی مضمون سورہ الشعراء کی آیت ۲۰۸ میں بیان ہوا۔

زیر نظر آیت کے آخر میں فرمایا "اور اس طرح اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔" کلام تو سارے انبیاء کرام سے ہوا اس جگہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت باتیں کرنے کا ذکر مخصوص اس لئے کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کو "مثیل موسیٰ" بتایا گیا جیسا کہ سورہ المزمل میں ارشاد فرمایا اور صحیح بخاری میں ہے کہ هذا الناموس الذی نزل اللہ موسیٰ اس لئے چونکہ رسول اللہ ﷺ کو موسیٰ علیہ السلام سے خاص مماثلت ہے اور موسیٰ علیہ السلام پر سب سے زیادہ پیش گوئیاں نبی اعظم و آخر ﷺ کے بارے میں کی گئیں اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر مخصوص طور پر کر دیا گیا۔

انبیاء کرام کا ہر امت میں آنا اس لئے ضروری تھا کہ لوگوں کا کوئی عذر باقی نہ رہے

۲۵۶ جیسا کہ پیچھے آپ پڑھ چکے کہ دنیا کی ہر قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی نبی و رسول بھیجا' کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ کسی کو یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا اس لئے ضروری تھا کہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی ڈرانے والا ضرور آتا رہے۔ ان گنت قومیں اور ان گنت نبی و رسول اور یہ سلسلہ ابوالبشر آدم علیہ السلام سے چلا جو اس وقت پوری انسانیت کیلئے ہادی و راہنما بنائے گئے تھے اور پھر انسانوں کا سلسلہ جوں جوں پھیلتا چلا گیا وہ مختلف علاقوں اور قوموں میں تقسیم ہوتے گئے اور ہر قوم کیلئے ایک رسول و

نبی کا ہونا لازم قرار پایا لیکن پوری انسانیت کیلئے کوئی ایک نبی و رسول نہ بنایا گیا بلکہ ہر قوم و جماعت کیلئے الگ الگ نبی و رسول مبعوث کئے گئے اور ایک ہی قوم کے پاس کئی کئی نبی و رسول بھی تشریف لائے۔ قرآن کریم نے اس کا اتنی بار ذکر کیا کہ اگر شمار کیا جائے تو مشکل ہی سے شمار ہوگا۔ اس لئے کہ ہر ہادی و راہنما نے اللہ کا پیغام پہنچایا تو یہ بات لازماً کہی کہ میں وہی پیغام لے کر آیا ہوں جو میرے سے پہلے والے لائے تھے لیکن چونکہ تم نے اس کو بھلا دیا اس لئے مجھے بھیجا گیا کہ میں تم کو یاد دلاؤں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ :

"اے اولاد آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی برائیوں سے بچے گا اور اپنے آپ کو سنوار لے گا اس کیلئے کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔" (الاعراف ۷ : ۳۴، ۳۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"پھر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی پیام ہدایت آیا تو جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہوگا اور نہ ہی دکھ میں پڑے گا جو کوئی میری یاد سے روگرداں ہوگا اس کی زندگی ضیق میں گزرے گی اور قیامت کے روز بھی میں اسے اندھا ہی اٹھاؤں گا۔" (طہ ۲۰ : ۲۲، ۱۲۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا :

"اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ایک گروہ کو ہدایت دے کر پھر گمراہ کر دے تاوقتیکہ ان پر وہ ساری باتیں واضح نہ کر دے جن سے انہیں بچنا چاہئے۔ بلاشبہ اللہ کے علم سے کوئی بات باہر نہیں ہے۔" (التوبہ ۹ : ۱۱۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا؟ انہوں نے جواب دیا اس لئے نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں کہ ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا اور اس لئے بھی کہ شاید یہ لوگ باز ہی آجائیں۔" (الاعراف ۷ : ۱۶۴) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اے اہل کتاب! ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور ایک مدت سے بند تھا ہمارا رسول محمد رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس آیا وہ تم پر واضح کر رہا تھا تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا نہ بشارت دینے والا نہ ڈرانے والا اور اب بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔" (المائدہ ۵ : ۱۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"یہ لوگ بڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راہ راست پر ہوتے مگر جب خبردار کرنے والا ان کے پاس آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا یہ زمین پر اور زیادہ تکبر کرنے لگے اور بڑی بُری چالیں چلنے لگے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔" (فاطر ۳۵ : ۴۱، ۴۳) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶ اِنَّ الَّذِيْنَ

اے پیغمبر اسلام! اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ اسے نازل کر کے گواہی دیتا ہے کہ اس نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔[۲۵۷] ۱۶۶

"اے عرب کے بسنے والو! ہم نے یہ کتاب اس لئے نازل کی کہ تم یہ نہ کہو کہ خدا نے صرف دو جماعتوں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں پر کتاب نازل کی جو ہم سے پہلے تھے اور ہمیں ان کے پڑھنے پڑھانے کی خبر نہ تھی یا کہو اگر ہم پر بھی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان جماعتوں سے زیادہ ہدایت والے ہوتے سو دیکھو تمہارے پاس بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل ہدایت اور رحمت آگئی پھر بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم انسان کون ہے جو اللہ کی نشانیاں جھٹلائے اور ان سے گردن موڑے؟ یاد رکھو جو شخص بھی ہماری آیتوں سے گردن موڑے ہم اس کی پاداش میں عنقریب سخت عذاب دینے والے ہیں۔" (الانعام ۶ : ۱۵۷) ایک جگہ ارشاد ہوا :

"اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے سو دیکھ لو وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے آخر کار ہم وارث ہو کر رہے اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔" (القصص ۲۸ : ۵۵، ۵۶) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور اے پیغمبر اسلام! لوگوں کو اس دن کی آمد سے خبردار کر دے جبکہ ان پر عذاب نمودار ہو جائے گا' اس دن ظلم کرنے والے کہیں گے' اے پروردگار! تھوڑی سی مدت کیلئے ہمیں مہلت دے دے ہم تیری پکار کا جواب دیں گے اور پیغمبروں کی پیروی کریں گے لیکن انہیں جواب ملے گا کیا تم وہی نہیں ہو کہ اب سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہمیں کسی طرح کا زوال نہ ہوگا؟" (ابراہیم ۱۴ : ۴۴) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کئے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر اتر آئے تو وہ کہیں اے پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے۔" (القصص ۲۸ : ۴۷)

اگر یہ لوگ سچائی کے منکر ہیں تو اس سچائی کے گواہ اللہ اور اس کے فرشتے ہوں گے

۲۵۷ اگر یہ لوگ آپ ﷺ کی سچائی سے منکر ہیں تو ہوا کریں۔ عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ

لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہوں گے اس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں وہ سراسر حق تھا بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آجانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں یہ ایک بالکل سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملہ پر غور کئے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہل ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے بلکہ اس معنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھیں جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کی مالک بنا دیتی ہے اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلو میں ایک عظیم الشان مذہبی' اخلاقی' ذہنی' فکری' تہذیبی' سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبار دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں اس انقلاب نے وہ فضائل اخلاق فرمانرواؤں کی سیاست میں' انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں' فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں' ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیل داری میں اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اخلاق و کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اٹھایا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اس نے اوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو علمی' تحقیقی اور معقول طرز فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اس نے اجتماعی زندگی کے ان سارے امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس شہادت کا ذکر اس طرح کیا گیا فرمایا :

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟" (حم السجدہ ۴۱ : ۵۳) دوسری جگہ فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! کہہ کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کیلئے کافی ہے وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں ہیں۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا : (العنکبوت ۲۹ : ۵۲)

"اور اے پیغمبر اسلام! ہم نے ان لوگوں سے جن جن باتوں کا وعدہ کیا ہے ان میں سے بعض باتیں تجھے

كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا

جو لوگ منکر ہوئے اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ بھٹک[۲۵۸] گئے اور ایسے بھٹکے کہ دور دراز راہوں میں وہ گم ہوگئے۔ ۱۶۷

بلاشبہ[۲۵۹] جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم بھی تو اللہ انہیں کبھی بخشنے والا نہیں نہ انہیں کوئی راہ

دکھا دیں گے یا تیرا وقت پورا کر دیں گے لیکن بہرحال انہیں ہماری طرف لوٹنا ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر شاہد ہے اور یاد رکھو کہ ہر امت کیلئے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت میں اس کا رسول ظاہر ہوگیا تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ ناانصافی ہو۔" (یونس ۱۰ : ۴۷)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کی پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔" (الفتح ۴۸ : ۲۸) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کی روشنی اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کئے بغیر رہنے والا نہیں، اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔" (التوبہ ۹ : ۳۲) اللہ کے فرشتوں کی گواہی اللہ تعالیٰ کی وہ طاقتیں ہیں جو مخالفین کو نیچا دکھانے کیلئے ہمیشہ مددگار ہوتی ہیں اور اللہ کے بندوں کی ہمتیں بڑھا کر نہتوں کو ہتھوں والوں کے مقابلہ میں لے آتی ہیں اور کامیاب کرا کر دم لیتی ہیں۔

دین حق کے انکاری لوگ اللہ کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں

۲۵۸ فرمایا منکرین کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ وہ جو تدبیریں بھی اللہ اور اس کے رسول کے دین کے راستہ روکنے کیلئے کر رہے ہیں وہ سب کی سب ناکام و نامراد ہو جائیں گی اور جن کاموں کو انہوں نے اپنے نزدیک نیک سمجھ رکھا ہے اللہ ان سب کو ضائع کر دے گا اور آخرت میں ان کا کوئی اجر بھی وہ نہ پا سکیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ نیکی ان کی خوشیوں کا نام نہیں ہے وہ اللہ کی متعین کردہ راہ کا نام ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ نبی اعظم و آخر ﷺ کے اوصاف و کمالات جو تورات میں موجود تھے ان کا انکار کر کے انہوں نے دوسرے لوگوں کو بھی اسلام قبول کرنے سے روک دیا تو بلاشبہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور ایسے بھٹکے کہ دُور دراز راہوں میں گم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے نام اور کام کو پھیلا دیا اور اس طرح ان کی اس کوشش کو مٹی میں ملا دیا جس کیلئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا، ... رہے تھے۔

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور ظلم کیا ان کیلئے سیدھی راہ گم ہو گئی

۳۵۹ بعض کفر' کفر کرنے والوں تک محدود ہوتا ہے لیکن بعض کفر ایسے بھی ہوتے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہگار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں۔ کفر کے ساتھ ظلم کا لفظ جب بھی اور جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے یہ ایسے کفر کا ذکر ہے جو صرف کفر کرنے والے تک محدود نہیں ہوتا یہ وہی کفر ہوتا ہے جو پوری سوسائٹی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے یہ کفر وہی کفر ہے جس کے کرنے والے ہی اس کی زد میں نہیں آتے بلکہ یہ ان کیلئے بھی اتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے جتنا کرنے والوں کیلئے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جا سکتی ہے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا' زمین اور پانی ہر چیز میں پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں جو وباء آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندہ رہنے والے اور اسی گندے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال بھی ہے کہ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود ہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے' جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی جب اس کے درمیان برے اور بے حیاء اور بد اخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو اعلانیہ اچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور اچھے لوگ بد عملی اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر خاموش ہو جاتے ہیں تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہوتا ہے جس میں گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :

"بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہے "ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً" اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔" (الانفال ۸ : ۲۵)

اور اس ظلم سے مراد شرک بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بھی دراصل وبائی مرض ہے اور جس معاشرہ میں پھیلتا ہے پھیلتا ہی چلا جاتا ہے اور کوئی علاج بھی اس پر اتنا جلد اثر نہیں کرتا اس وبائی پھوڑے کا نشتر کے سوا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔" (الانعام ۶ : ۲۱) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹ بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔" (الانعام ۶ : ۱۴۴) ایک جگہ

لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿۱۶۸﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۱۶۹﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ

دکھائے گا۔ ۱۶۸

اور بجز جہنم کی راہ کے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کیلئے ایسا کرنا بالکل سہل ہے۔ ۲۶۰ ۱۶۹

اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ "الرسول" تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس

ارشاد فرمایا :

"اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بد ترین سزا دے کر رہیں گے۔"

(الانعام ۶ : ۱۰۷)

ظاہر ہے کہ اللہ کی آیات سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کریم کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جا رہے تھے اور وہ نشانیاں بھی جو نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آرہی تھیں اور وہ آثار کائنات بھی جنہیں قرآن کریم اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

فرمایا کہ "جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم میں بھی بے باک ہوگئے اور مرتے دم تک اسی حالت میں سرشار رہے تو خدا انہیں کبھی بخشنے والا نہیں نہ انہیں کامیابی کی کوئی راہ دکھائے گا۔" کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایسی راہ پر چلنے کیلئے تیار نہیں اور مجبور کر کے سیدھی راہ پر لگانا قانون الٰہی کے خلاف ہے اور اللہ اپنے قانون کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔

ہاں! جہنم کی راہ ان کیلئے کھلی ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رکھے جائیں گے۔

۲۶۰ جہنم کیا ہے؟ آپ یوں سمجھیں کہ جیسے "چوہوں کا پنجرا" کہ اس کا باہر کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے گویا دروازہ لگایا ہی نہیں گیا۔ لیکن اندر اتنی گہری کھائی ہے کہ جو داخل ہوگیا بس ہوگیا اب نکلنا اس کے اختیار کی بات نہ رہی۔ لیکن داخل ہونا؟ ہاں! داخل ہونا اس کے اختیار کی بات تھی۔ کسی نے اسے مجبور کر کے داخل نہیں کیا اس لئے کہ اس کا داخلہ تو ہر وقت کھلا ہے۔ جب چاہے اور جو چاہے داخل ہو جائے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ اجازت لینے کے عادی تو ہوتے ہی نہیں بلکہ اجازت لینا ان کی بڑائی کے بالکل خلاف ہے اس لئے وہ بے دھڑک داخل ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں تازہ حقہ بھی وہاں موجود ہے اور دوزخیوں کے بچھونے اور اوڑھنے بھی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :

الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

سچائی کے ساتھ آگیا ہے، پس ایمان لاؤ کہ تمہارے لئے اس میں بہتری ہے اور دیکھو اگر تم کفر کرو گے[۲۶۱] تو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔ ۱۷۰

"ان کیلئے جہنم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزاء جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔" (الاعراف ۷ : ۴۱) اور پیاسے اونٹ کی طرح پی جانے والی چیز کو میں نے حقہ کہہ دیا ہے اور قرآن کریم میں ہے "فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ دوزخی پیاسے اونٹ کی طرح پیئیں گے۔ (الواقعہ ۵۶ : ۵۰)

غور کر لو کہ ان کا کام ہی کیا تھا؟ "ظلم اور انکار" اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے تھا؟ وہی جو پیچھے ذکر کیا گیا۔ قانون الٰہی یہی ہے کہ گندم سے گندم پیدا ہوتی ہے اور جو سے جو اسی لئے کسی نے کہہ دیا ہے ؎

گندم از گندم بروید جوز جو واز مکافات عمل غافل مشو

فرمایا "اللہ کیلئے ایسا کرنا بالکل آسان ہے۔" قانون کے مطابق جو ہوتا ہے وہ ہمیشہ آسان ہی ہوتا ہے۔ مشکلات ساری قانون کی خلاف ورزی ہی میں ہیں۔ کاش کہ یہ بات مسلمانوں اور خاص کر آج کل کے راہنمایاں اسلام کی سمجھ میں بھی آجائے۔

سارے انسانوں کا رسول آگیا ماننے والے فائدہ میں اور منکرین خسارہ میں رہے

۲۶۱ اے پیغمبر اسلام! "ہم نے آپ ﷺ کو تمام ہی انسانوں کیلئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔" جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے اس وقت تک آپ کی نبوت و رسالت ہی رہے گی اور جو انسان آپ کی نبوت کے بعد کسی نبی کی نبوت کا دعویدار ہوگا یا کوئی اس کو تسلیم کرے گا وہ دائرہ انسانیت ہی سے خارج سمجھا جائے گا۔ جب تک انسانیت قائم ہے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت بھی قائم ہے۔ مطلب بالکل صاف ہے کہ اے رسول اللہ ﷺ تم صرف اسی شہر یا اسی ملک میں یا اسی زمانے کے لوگوں کیلئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کیلئے اور ہمیشہ کیلئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو مگر یہ تمہارے ہم عصر، اہل وطن تمہاری قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بعثت سے ان کو نوازا گیا ہے۔ یہ بات کہ نبی اعظم و آخر ﷺ صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوع بشری کیلئے مبعوث فرمائے گئے ہیں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ جیسے ارشاد الٰہی ہے کہ :

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۷ : ۱۵۸) "اے پیغمبر اسلام! کہہ دو کہ

اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء ۲ : ۱۰۷) "اے پیغمبر اسلام! ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر اور رحمت کے طور پر۔" ایک جگہ ارشاد فرمایا :

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان ۲۵ : ۱) "بڑی ہی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کیلئے متنبہ کرنے والا ہو۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام ۶ : ۱۹) "اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے میں تم کو متنبہ کروں اور ہر اس شخص کو بھی جسے یہ قرآن پہنچے۔"

وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْھِمُ الْعَذَابُ (ابراھیم ۱۴ : ۴۴) "اور اے پیغمبر اسلام! لوگوں کو اس دن کی آمد سے خبردار کر دو جبکہ ان پر عذاب نمودار ہو جائے گا۔" اور ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ انہیں بڑا اجر ملنے والا ہے اور نیز اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے ان کیلئے ہم نے عذاب دردناک تیار کر رکھا ہے۔" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۹، ۱۰) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ساری ستائشیں اللہ کیلئے ہیں جس نے اپنے بندے پر "الکتاب" اتاری یعنی قرآن کریم نازل فرمایا اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہ رکھی بالکل سیدھی بات اور اس لئے اتاری کہ لوگوں کو خبردار کر دے اللہ کی جانب سے ایک سخت ہولناکی جو ان پر آسکتی ہے اور مومنوں کو جو اچھے اچھے کام کرتے ہیں خوشخبری دے دے کہ یقیناً ان کیلئے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے وہ ہمیشہ اس میں خوشحال رہیں گے۔" (الکھف ۱۸ : ۱، ۳)

اور یہی مضمون خود نبی اعظم و آخر ﷺ نے بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً

"پہلے جو نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کیلئے مبعوث ہوا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

"میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں یہ فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اپنی دونوں انگلیاں اٹھائیں۔" (بخاری و مسلم)

"میں عمومیت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرے ہیں وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے۔" (مسند احمد عن عبداللہ بن عمرو بن العاص)

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو[۲۶۲] نہ کرو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ

اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میری ہی نبوت رہے گی۔

"میں کالے اور گورے سارے انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔" (مسند احمد عن ابوموسیٰ اشعری) اور منکرین کیلئے اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی بالکل تیار ہے وہ اس طرح ان کو دبوچ لے گا جس طرح بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے اس لئے فرمایا "اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے لیکن وہ اپنے بندوں کیلئے کفر کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے اور یاد رکھو کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔" (الزمر ۳۹ : ۷) اور فرمایا کہ اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ نبی اعظم و آخر تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس سچائی کے ساتھ آگیا ہے اور اس کی سچائی اب کسی کے جھٹلائے جھٹلائی نہیں جا سکتی پس ایمان لاؤ کہ تمہارے لئے اس میں بہتری ہے اور یاد رکھو کہ اگر تم کفر کرو گے تو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کیلئے ہے تمہاری شقاوت خود تمہارے ہی آگے آئے گی اور یاد رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرو

۲۶۲ تَغْلُوْا کی اصل غ ل و ہے اور "غلو" حد سے تجاوز کو کہتے ہیں خواہ وہ افراط ہو یا تفریط اور یہ لفظ تَغْلُوْا دو بار قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے اور دونوں بار اہل کتاب ہی مخاطب ہوئے ہیں ایک بار اس جگہ اور دوسری بار سورہ المائدہ کی آیت ۷۷ میں۔ اہل کتاب سے قرآن کریم میں دو گروہ ہی مراد لئے گئے ہیں ایک یہود اور دوسرے نصاریٰ۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے متعلق یہود نے تفریط سے کام لیا ہے اور نصاریٰ نے افراط سے۔ یہود نامسعود نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا' کیوں؟ اس لئے کہ سیدہ مریم ہیکل کی نذر مانی گئی تھیں اس لحاظ سے وہ منذورہ ہوئی یہود کی نظر میں منذور ہو یا منذورہ ان کیلئے تجرد لازم قرار دے لیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ سنت اللہ نہیں تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجرد کو لازم و ضروری قرار نہیں دیا تھا یہ گویا ان کی قومی رسم تھی اور اس طرح کی رسوم تقریباً اس وقت ہر قوم میں پائی جاتی تھیں اور آج بھی پائی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کے ذریعہ کسی قوم کو بھی اس کا حکم نہیں دیا تھا تاہم جو قوم بھی کوئی رسم اختیار کر لیتی ہے اس کا خلاف اس کو برداشت نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں آج بھی سینکڑوں خود ہم مسلمانوں میں موجود ہیں مثلاً آج قوم کی اکثریت رسم قل' تیجہ' دسواں' چالیسواں کرتی ہے۔ ان چیزوں کا آخر دین اسلام کے ساتھ کوئی واسطہ و تعلق بھی ہے؟ ہرگز نہیں لیکن یہ دین اسلام کے نام پر کی جاتی ہیں اور جو لوگ نہیں کرتے وہ آج بھی

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا

کہو[۲۶۳] مریم کا بیٹا عیسیٰ مسیح اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا رسول[۲۶۴] ہے اور اس کے کلمہ بشارت[۲۶۵] کا

نہایت اقلیت میں ہیں اور اس اقلیت میں ہونے کے باعث ان کو کوئی اچھی نظر نہیں دیکھتا۔

سیدہ مریم نے منذورہ ہونے کے باوجود احکام الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے نکاح کیا حالانکہ نکاح کرنا کسی شریعت میں بھی جرم نہیں تھا لیکن چونکہ یہود کی رسم کے خلاف تھا اس لئے وہ من حیث القوم اس کو برداشت نہ کر سکے اور اس طرح وہ بگڑتے بگڑتے اتنے بگڑ گئے کہ انہوں نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا پر اخلاقی کمزوری کا الزام لگایا جس کو قرآن کریم نے "بہتان" کے لفظ سے تعبیر کیا اور جب وہ مریم رضی اللہ عنہا کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے تو ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تو وہ کسی حال میں ایک اچھا اور بہتر انسان سمجھنے کیلئے تیار نہ تھے۔ قوموں کی زندگی میں یہ بات آج بھی پائی جاتی ہے جس کو وہ من حیث القوم اچھی نظر سے نہ دیکھتے ہوں اس کی کسی چیز کو بھی وہ اچھی نگاہ سے دیکھنے کیلئے تیار نہیں ہوتے انسان تو انسان لوگ اس کے جانوروں تک سے عداوت رکھتے ہیں۔ آخر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کیا تھی؟ ایک چار پایہ ہی تو تھی لیکن ان مخالفین کی نگاہ میں وہ کس طرح کھٹکتی تھی پھر انہوں نے اس اونٹنی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

مختصر یہ کہ سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کا بیٹا ہونے کی نسبت سے انہوں نے خصوصاً اس وقت جب انہوں نے حکم الٰہی سے نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا تو وہ ان کو ایک آنکھ نہ بھائے اور مخالفت میں اس حد تک بڑھے کہ طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اپنی مذہبی عدالت میں ان کو پھانسی دینے کا حکم صادر کر دیا چونکہ صلیب پر چڑھانا حکومتی عدالت کا کام تھا لہٰذا انہوں نے حکومت کو مجبور کیا لیکن جب حکومت نے مداخلت کرنے سے انکار کیا تو وہ حکومت سے بگڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر مزید بپھرے تا آنکہ سنت اللہ کے مطابق ان کے اٹھائے جانے کا وقت آگیا۔

اس کے مقابلہ میں اہل کتاب کی دوسری جماعت یعنی نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو انسانوں کی صف سے اٹھایا اور انسانوں سے ماورا کوئی مخلوق قرار دے کر اللہ' اللہ کا بیٹا اور اللہ کا تیسرا جزو بنا کر رکھ دیا اور سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو بھی (نعوذ باللہ) اللہ میاں کی والدہ ماجدہ قرار دے دیا اور اس قدر بڑھایا کہ ان کو انسانوں میں نہ رہنے دیا۔ اس طرح گویا یہود تفریط کے مرتکب ہوئے تو نصاریٰ نے افراط کی حد کر دی۔ ضد دراصل دونوں فریقوں کی اپنی تھی لیکن سیدہ مریم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیتیں متاثر ہوئیں۔ ایک فریق نے صحیح النسب انسان ماننے سے بھی گریز کیا اور دوسرے فریق نے اللہ یا اللہ کا بیٹا قرار دیا' خود مانا اور دوسروں کو ماننے پر مجبور کیا۔ زیر نظر آیت کے اسی ٹکڑے میں اس طرف اشارہ ہے کہ "اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔" یعنی حقیقت و اعتدال سے گزر نہ جاؤ اور دین کا اس طرح ستیاناس نہ کرو کہ اپنی خواہشات کا نام دین

رکھ رہے ہو باز آجاؤ۔

اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو ورنہ قانون خداوندی کی زد میں آجاؤ گے

۲۶۳ تعجب ہے کہ جن لوگوں نے مریم پر بہتان لگایا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو "صحیح النسب" انسان ماننے سے بھی انکار کیا انہوں نے یہ سب کچھ مذہب اور شریعت کے نام سے کیا اور جن لوگوں نے مریم کو اللہ کا ایک جز اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ اور اللہ کا بیٹا مانا انہوں نے بھی دین و مذہب ہی کے نام سے ایسا کیا اور ظاہر ہے کہ جب دین و مذہب کا نام آیا تو وہ اللہ ہی کے بارے میں گفتگو ہوگئی کیونکہ اللہ کی طرف سے دی گئی ہدایت ہی کا نام دین و مذہب ہے آج بھی اور اس وقت بھی۔ غور کرو کہ آج بھی ایک غیر اللہ کی نذر و نیاز کو حرام قرار دیتے ہیں اور دوسرے اس کو عین ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور متبرک کہہ کر کھاتے ہیں۔ حرام کہنے والے اپنی طرف سے اس کو حرام جانتے ہیں؟ ہرگز نہیں وہ سمجھتے ہیں بلکہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور کہا ہے اور یہی دین و مذہب ہے کہ اس کو حرام سمجھا جائے بالکل اسی طرح جس طرح سور حرام ہے اور فریق ثانی بھی اس کو دین و مذہب کے نام سے یاد کرتا ہے اور آخرت کا ثواب اس پر مرتب کرتا ہے اس میں آنہ دو آنہ خرچ کرنے کو بھی جنت کی ٹکٹ قرار دیتا ہے پھر اس طرح دونوں ہی فریق یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہیں کہا' رہا یہ فیصلہ کہ اس طرح قانون خداوندی کی زد میں کون آتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ اللہ ہی فرمائے گا ورنہ خدا لگتی کہنے والا بھی مطعون ہی ہوگا۔ ہاں! یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ نوبت فریقین کی ضد کی وجہ سے آئی اور جہاں چڑ ہو جائے گی حق وہاں یقیناً نہیں رہتا۔ اس چڑ اور ضد نے پہلوں کا کام خراب کیا اور یہی آج ہمارا ستیاناس کر رہی ہے اور حقیقت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ دیکھو جو حال یہود و نصاریٰ کا اس وقت تھا آج وہی حال تمہارا ہے۔ جب تک سانس تب تک آنس کے تحت یہی کہنا روا ہے کہ سمجھ جاؤ ابھی وقت ہے جب وقت نکل گیا تو گیا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔

مسیح عیسیٰ ابن مریم سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے

۲۶۴ دراصل اہل کتاب کی اس گمراہی کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ دین میں "غلو" کے مرتکب ہوئے ہیں یعنی حقیقت و اعتدال سے متجاوز ہو کر بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ اگر کسی کی محبت و تعظیم پر آئے تو اتنی تعظیم کی کہ اسے خدا کے درجہ تک کیا بلکہ خدا ہی بنا دیا اور مخالفت پر اتر آئے تو اس کی صداقت تو صداقت اس کو "صحیح معنوں میں انسان" بھی تسلیم نہ کیا۔ اگر زہد و عبادت کی راہ اختیار کی تو اتنی دور تک چلے گئے کہ رہبانیت تک پہنچ گئے اگر دنیا کے پیچھے پڑے تو اتنے چھوٹ ہوگئے کہ نیک و بد کی تمیز ہی اٹھا دی۔ چونکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی شخصیت میں بھی ان کا یہی رویہ تھا اس لئے دونوں گروہوں کو ایک طرح کی تعلیم دی کہ راہ حق سے تجاوز نہ کرو۔ حق تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نیک بندہ اور اللہ کی نیک بندی کا بیٹا ہے جو حسب و نسب کے لحاظ سے صحیح النسب ہے۔ ذریت ابراہیم علیہ السلام سے بھی اور ذریت داؤد علیہ السلام سے

بھی اس کا تعلق ہے اور اسی طرح اس کا شمار انبیاء کرام میں ہے جس طرح یحییٰ زکریا اور ایوب و یونس کا ہے اور جس طرح کے اسماعیل و اسحٰق اور ابراہیم علیہ السلام نبی تھے۔ ہم نے اسی طرح اس کو نبی و رسول بنایا جس طرح دوسرے انبیاء و رسول منتخب کئے تھے وہ اللہ کے برگزیدہ انسانوں میں سے ایک انسان تھا تم نے اس کو "صحیح النسب" ماننے سے بھی جو انکار کیا تو تفریط کی حد کر دی اور اس طرح تم "دین میں غلو" کے مرتکب ہوئے اور جو دین میں بے جا مداخلت کرنے والوں کا انجام ہوتا ہے وہی تمہارا بھی ہوگا۔ اہل کتاب کے دوسرے فریق یعنی نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو مانا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی لیکن ایسا مانا کہ ان کو انسانوں سے اٹھا کر اللہ کا خانوادہ بنا دیا اور ایسی ایسی توجیہات کیں کہ آج ان کو ایک صحیح العقل انسان پڑھے تو ہنس کر رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ جب بھی کسی شخص نے حق سے منہ پھیرا تو اس نے اس طرح کی رقیق توجیہات کیں اور اب بھی بالکل وہی صورتحال ہے جو اس وقت تھی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو پتہ نہیں کیا سوجھا کہ اس نے مسیح موعود کا دعویٰ کر دیا پھر معلوم نہیں کہ وہ کیا کیا دعویٰ کرتا رہا اور کیا کیا کچھ وہ بنا کیسے اور کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح کے اتار چڑھاؤ قوموں میں ہوتے آئے تھے اور اسی "غلو کا بڑے بڑے شکار ہوتے رہے اس نے بھی موقع کو غنیمت جانا اور بیک وقت کئی طرح کے دعوے شروع کر دیئے اور ایسے ایسے چور دروازے رکھے کہ اندر ہی اندر نہ معلوم کہاں سے کہاں نکلتا چلا گیا۔ آپ کو اندازہ کرنا ہو تو اس کی خودنوشت "کشتی نوح" پڑھیں۔ آپ دم بخود رہ جائیں گے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ رقم طراز ہے۔

"اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہین احمدیہ کے تیسرے حصے میں میرا نام مریم رکھا پھر جیسا کہ براہین احمدیہ سے ظاہر ہے دو برس تک صفت مریمیت میں میں نے پرورش پائی ..... پھر..... مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد' جو دس مہینے سے زیادہ نہیں بذریعہ اس الہام کے جو سب سے آخر براہین احمدیہ کے حصہ چہارم میں درج ہے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا۔" (کشتی نوح ص ۸۷' ۸۸' ۸۹)

حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے اس طرح کی رموز اس لئے اختیار کیں کہ سلوک کی کچھ منزلوں میں ولیوں اور بزرگوں کا حاملہ ہونا پھر حمل کا وضع ہونا اور حیض و نفاس کا آنا ساری چیزیں موجود تھیں اس نے ان سے فائدہ اٹھایا اور یکے بعد دیگرے دعوے کرتا رہا۔ انگریز کی شہ پر مسلمانوں کی سادگی سے خوب فائدہ اٹھایا اور خصوصاً "وفات مسیح" کے موضوع کو اس قدر بلند کیا کہ دوسرے مسلمان چڑ گئے اور وہ "حیات مسیح" کے ثابت کرنے میں لگ گئے اور مرزا کو اس طرح اتنا وقت مل گیا جو نہ اس کیلئے مفید رہا اور نہ ہی اس کی روحانی ذریت کیلئے۔

مسیح علیہ السلام کی کنیت "ابن مریم" رکھی گئی' کیوں؟ اس لئے کہ مریم کے نام سے یہودیوں کو چڑ تھی

اس لئے نصاریٰ نے ان کو اس کنیت سے پکارا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مریم عمران کی بیٹی تھی اور عمران کی نرینہ اولاد نہ تھی اور عمران کا گھرانا اس وقت کے لوگوں میں مذہبی گھرانا تھا جو سارے لوگوں کے ہاں برگزیدہ سمجھا جاتا تھا پھر مریم منذورہ ہوئیں حالانکہ یہود میں اس سے پہلے کوئی عورت کم ہی منذورہ ہوا کرتی تھی پھر اللہ نے مریم کا نام خود تجویز فرمایا تھا اور مریم کی ماں کو یہ کہا تھا کہ تیرا موعود لڑکا بھی اتنا باعث برکت نہ ہوتا جتنی باعث برکت تیری یہ لڑکی ہوگی؟ کیونکہ اس کے ذریعہ سے کئی بد رسمیں مٹائی جائیں گی اور پھر وہ سلسلہ بنی اسرائیل کے ختم کر دینے والے نبی کی ماں بننے والی تھیں اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی انسان کا جو لقب مشہور عام ہوتا ہے اس کو اس سے بلایا اور پکارا جاتا ہے اگرچہ اصلی نام کچھ اور ہو بلکہ بعض اوقات اصلی نام اس قدر پوشیدہ ہو جاتا ہے کہ کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ یہ ان کا نام ہے یا کنیت و لقب ہے۔ مثلاً ابو طالب، عبدالمطلب، ہاشم اور عبد مناف کی شخصیتوں سے کون واقف نہیں ہے ابو ہریرہ اور ابو بکر کو کون نہیں جانتا؟ لیکن یہ شاید ہی کسی کو معلوم ہوگا کہ یہ سارے نام نہیں بلکہ کنیتیں یا القاب ہی ہیں۔ یہ تسلیم کہ زیادہ تر کنیت باپ کے نام پر ہوتی ہے لیکن ماں کی طرف بھی کنیت رہی ہے اور اب بھی ہے نہ معلوم ایسی باتوں کو بحث موضوع کیوں بنا لیا جاتا ہے جن کا کوئی سر اور پیر نہ ہو وہ لوگ جو کچھ احادیث سے واقفیت رکھتے ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ابن ام مکتومؓ ابن الحنفیہؒ ابن الکواءؒ ابن بیضاءؒ ابن مرجانہؒ ابن سمیہؒ ابن بحینہؒ ابن ام ایمنؓ ابن عفراءؓ ابن الحنیفہؒ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ صحابہؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ میں شمار ہیں۔ کیا ان سب کے باپ نہیں تھے؟

مسیح کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے کلمہ بشارت کا ظہور ہے

۲۶۵ سورہ آل عمران میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ "اے مریم! اللہ تجھے "اپنے ایک فرمان" کی خوشخبری دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔" قرآن کریم کے الفاظ اسی طرح ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسی عیسیٰ علیہ السلام کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا کہ اللہ نے سیدہ مریم کو خوشخبری دی جس طرح اس سے قبل زکریا علیہ السلام کو دی گئی۔ ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی بیوی کو اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو دی گئی تھی۔

پھر جہاں جہاں خوشخبری دی گئی بالکل اسی طرح من و عن وہ حالات پیش آئے جن کا ظہور بعد میں ہوا لیکن ہوا بالکل اسی طرح جس طرح پیش گوئی میں بیان کیا گیا تھا۔ یہاں بھی سیدہ مریم کو جس "کلمہ" کی بشارت دی گئی تھی وہ اپنے وقت پر پوری ہوئی اور اللہ نے وہ مبارک لڑکا سیدہ مریم کو عطا کر دیا بیٹا کیا تھا؟ "اللہ کا ایک فرمان" ہی تو تھا کہ ناسازگار حالات میں خوشخبری دی لیکن ناسازگاریاں دور کرنے والے اللہ نے ان کی ناسازگاری دور فرما دی اور جس بات کا فرمان جاری کیا تھا وہ بات معرض وجود میں آگئی۔ کتنی مبارک ہے وہ ماں

إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ

ظہور ہے جو مریم پر القا کیا گیا تھا نیز ایک روح[۲۶۷] ہے اللہ کی جانب سے بھیجی گئی۔ پس چاہئے کہ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان[۲۶۸] لاؤ اور یہ بات نہ کہو کہ اللہ تین ہیں دیکھو ایسی بات کہنے

جس کے مبارک بیٹے کی خوشخبری بیٹے کے تولد ہونے کے حالات سے بھی پہلے دی تھی اور پھر اپنے وقت پر اس مالک الملک نے وہ مبارک بیٹا عطا بھی فرما دیا کیا مبارک بیٹا ہے عیسیٰ علیہ السلام جس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے اس کی نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔ علم میں تو ہر ہونے والی بات موجود ہے لیکن جو بات ہونے سے پہلے کہی گئی ہو کہ اس طرح ہوگا اور پھر وہ اسی طرح ہو جائے تو گویا اس طرح ایک خوشی نہ ہوئی بلکہ دوہری خوشی نصیب ہوگئی آدمؑ کے علاوہ سارے آدم زادے جو نبی ہونے والے تھے اپنی اپنی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا ہوئے لیکن کتنی مائیں تھیں جن کو ان کے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ ہمارا یہ بیٹا اللہ کا نبی ہوگا؟ ہاں! معلوم تھا اسحٰقؑ کی ماں کو، اسمٰعیلؑ کی ماں کو، یحییٰؑ کی ماں کو، موسیٰؑ کی ماں کو اور عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کو۔ نبی اعظم و آخر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعلق ارشاد فرمایا انا دعوۃ ابی ابراھیم

یعنی میں اپنے پدر بزرگوار ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں، کیا مطلب؟ یعنی دعا کا نتیجہ یا جواب ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا آپ ﷺ کی تشریف آوری کا سبب بنی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اپنی ذات پر دعا کا اطلاق فرما دیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر سورہ بقرہ میں گزر چکا ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جواب ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کے ماں باپ نہیں تھے اور اگر ماں باپ کو مان لیا تو دعا یا نتیجہ دعائے ابراہیمی کا انکار ہوگیا۔ حاشاء للہ اس کا یہ مطلب ہو۔ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام وہ بشارت ہیں جو سیدہ مریم کو دی گئی یہی آیت ہے یہی وہ کلمہ بشارت ہے۔

یہ "کلمہ" وہی تو ہے جو سیدہ مریم پر "القا" کیا گیا تھا

۲۶۶ یہ "کلمہ" وہی ہے جس کی بشارت سیدہ مریم کو سنائی گئی تھی بشارت کیا تھی وہ الہام الٰہی جو دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوا تھا بالکل اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے دل میں اللہ نے ایک بات ڈال دی تھی چونکہ وحی الہام پر القاء کا لفظ بولا جانا معروف ہے قرآن و حدیث میں بھی عام طور پر بولا گیا ہے گویا جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کیلئے "وحی" کا لفظ استعمال فرمایا سیدہ مریم یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کیلئے "القاء" کا فرمایا تھا وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ "ہم نے موسیٰ کی ماں کو یہ اشارہ کر دیا تھا" یہاں فرمایا أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ "اللہ نے مریم پر القاء کیا تھا" یہاں وضاحت کیا مطلوب ہے؟ واضح

رہے کہ ایک گروہ یعنی یہود سیدنا مسیح کی شخصیت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور قومی نظریات میں کسی کو اچھی نگاہ سے دیکھنا اور کسی کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھنا اس کے کئی وجوہ ہیں جن میں اسلام نے صرف ایک کو پسند کیا ہے اور باقی سب کا رد کر دیا ہے اچھی نگاہ صرف اس کیلئے نہیں ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول کا باغی ہوگا باقی لوگوں کیلئے بری نگاہ سے دیکھنا کسی حال میں بھی اسلام کی نظر میں جائز نہیں تاہم مسلمان کہلانے والے فرقوں میں بھی اچھی اور بری نگاہ کا معاملہ موجود ہے۔ کوئی پوچھے جو گروہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے ان صحابہ کرامؓ نے ان کا کیا نقصان کیا؟ اچھا ان کے کسی بڑے کا؟ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کا کیا بگاڑا؟ اچھا ان کے بزرگوں کا؟ حاشا اللہ نہ ان کا کچھ بگاڑا اور ان کے تسلیم شدہ بزرگوں کا لیکن ان بیریوں کو جو بیر ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں حالانکہ وہ مسلمان بھی کہلواتے ہیں۔

بہرحال جو لوگ سیدہ مریم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کو ان کے مبارک ہونے کی یقین دہانی کرائی گئی فرمایا یہ تو وہ مبارک بیٹا ہے جس کی بشارت سیدہ مریم پر القاء کی گئی تھی اور دوسری طرف نصاریٰ کو جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا تسلیم کر چکے تھے ان کو یقین دہانی کرانا مقصود ہے کہ یہ تو فانی مخلوق اللہ کا حکم یعنی طے شدہ فرمان ہے اس مخلوق کو تم نے خالق کے ساتھ کہاں ملا دیا اور اللہ کی اولاد تم کس بل بوتے پر قرار دیتے ہو حالانکہ اللہ تو اولاد سے پاک ہے اور جس کی اولاد ہو یا جو کسی کی اولاد کو لے کر اپنا متبنیٰ بنا لے وہ تو اللہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عقل کی گولی کھاؤ کہاں اندھے ہوئے جاتے ہیں پیار و محبت کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ بیوی کو ماں، بہن یا بیٹی بنا لیا جائے یا ماں، بہن اور بیٹی کو بیوی۔ تم نے کیا نشہ پی لیا؟ ہوش کہاں گم ہوگئی؟ وہ جو اللہ کا رسول ہے ماں کے بطن میں ڈالا گیا تھا جس طرح بچے ماؤں کے بطن میں ڈالے جاتے ہیں۔ ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے جس طرح ماؤں کے بطن سے بچے پیدا ہوتے ہیں تم نے اس مخلوق کو خالق کیسے مان لیا؟ یہ عیسیٰ مریم کا بیٹا جو مریم پر القا کیا گیا تھا سچی بات اس طرح ہے تم نہ معلوم کیوں شک کرتے ہو۔

وہ ایک "روح" ہے جو اس کی جانب سے بھیجی گئی ہے

۲۶۷ روح اور ریح ایک ہی مادہ سے ہیں روح کے معنی ہیں مابہ الحیاۃ جس کے ساتھ زندگی قائم ہو اور زندگی دو قسم کی ہوتی ہے حسی اور معنوی حسی زندگی وہ ہے جس کے ذریعے چلنا، پھرنا، بولنا، سننا اور سمجھنا اور یاد کرنا وغیرہ قسم کے افعال صادر ہوتے ہیں اور معنوی وہ ہے جس سے مکارم اخلاق، رحم، سخاوت، محبت وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اسی لئے قرآن کریم کو بھی کئی بار روح کہا گیا ہے کیونکہ وہ حیاۃ معنوی کا سبب ہے جیسے ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ ۴۲ : ۵۲) "اور اس طرح اے پیغمبر اسلام! ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی۔" یعنی آپ ﷺ پر قرآن کریم نازل کیا اور حضرت مسیح چونکہ دوسرے انبیاء کی طرح حیات حسی اور معنوی دونوں کے مظہر اتم تھے اس لئے آپ کو بطور مبالغہ روح

یعنی سراپا روح کہہ دیا جیسے ہم کسی بہت خوبصورت انسان کو "حسن مجسم" کہہ دیتے ہیں اور "روح" چونکہ مخلوق ہے اسی طرح نصاریٰ کے مسیح علیہ السلام کو اللہ' اللہ کا بیٹا اور اللہ کا تیسرا حصہ کہنے کا مکمل طور پر رد کر دیا اور دوسری طرف مخالفین یعنی یہود کا رد ہوگیا جو مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو "صحیح النسب" انسان بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے اس ایک ہی لفظ سے ان کو بھی بتا دیا کہ مسیح علیہ السلام تو وہ شخصیت ہیں جو حیات معنوی کا مظہر اتم ہیں۔

"روح منہ" سے جزئیت ثابت نہیں ہوتی غور کریں

اور پھر صرف "روح" بھی نہ فرمایا بلکہ "رُوْحٌ مِّنْهُ" فرمایا اور اس طرح سے روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف جزئیت کی نہیں کیونکہ اس کا رد مقصود ہے بلکہ تشریف و تفضیل کی ہے اور یہ اضافت قرآن کریم اور کلام عرب میں عام ہے مثلاً اللہ تعالیٰ شیطان کو فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر ۱۵ : ۴۲) "بلاشبہ جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔" غور کرو کہ بندے تو سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں مومن ہوں یا کافر۔ نیک ہوں یا بد۔ لیکن اطاعت اشعار بندوں کی اضافت اپنی طرف کی اور ان کو اپنا مخصوص اور مخلص بندہ ہونے کا شرف و عزت بخشی۔ یہاں بھی "رُوْحٌ مِّنْهُ" یا "رُوْحُ اللّٰهِ" کہنے سے اس خصوصی شرف و مقبولیت کا اظہار مقصود ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بارگاہ الٰہی میں حاصل ہے "مِنْهُ" کے لفظ سے یہ استدلال کرنا کہ قرآن کریم سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اللہ کا جزء ہیں بالکل ناحق ہے کیونکہ آپ اس طرح پر جزئیت ثابت کرنے پر بضد ہوں تو پھر اس میں حضرت عیسیٰ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی کیونکہ قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق صاف موجود ہے کہ وہ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ "کہ میں نے اپنی روح آدمؑ میں پھونک دی۔" (الحجر ۱۵ : ۲۹) اور پھر یہ آدم علیہ السلام کی بھی کوئی خصوصیت نہیں کہ بے باپ اور بلا باپ قرار دینے والے آدمؑ کے ذکر سے کوئی نئی بات یا نئی بحث نہ شروع کر دیں بلکہ تمام اولاد آدم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (الم السجدہ ۳۲ : ۸، ۹) "اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر بچہ آدم کو مادہ منویہ سے تخلیق کر کے اور اس کے اعضاء کو درست کر کے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔" پھر دیکھو کہ صرف آدم و بنی آدم ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کا جزو ماننا پڑے گا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ۴۵ : ۱۳) "اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا اور یہ سب کچھ اس سے ہے۔" اس لئے اگر "مِنْ رُّوْحِیْ" اور "مِنْ رُّوْحِهٖ" اور "مِنْهُ" کے الفاظ سے کسی چیز کی جزئیت ثابت نہیں ہوتی تو پھر اگر وہی لفظ حضرت مسیح علیہ السلام کیلئے استعمال ہوں تو ان سے جزئیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

"اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا" قرآن کریم کے الفاظ ہیں اور انجیل میں اس طرح بیان ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ انجیل میں آج باوجود تحریف ہونے کے تحریف بھی ایسی کہ اس سے خود نصاریٰ انکار نہیں کر سکتے ایسی عبارات موجود ہیں جن سے قرآن کریم کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مریم "محصنہ تھیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی" اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا چنانچہ انجیل میں ہے کہ "اس کے ماں باپ ہر برس عید فسخ پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے" اور "جتنے اس کی سن رہے تھے اس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اس سے کہا بیٹا تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھو تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔" (لوقا ۳ : ۴۱، ۴۹)

"دیکھو تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔" کے الفاظ پر غور کرو کہ اس لفظ "باپ" سے مراد اللہ تو نہیں ہو سکتا اگرچہ انجیل میں استعارۃً اللہ تعالیٰ کو "باپ" کے لفظ سے پکارا گیا ہے لیکن اس جگہ "باپ" سے مراد اللہ نہیں بلکہ وہی ہے جو مریم کا جائز اور شرعی خاوند تھا۔

چونکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق ایسا ہوا تھا کہ "اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسفؑ کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئیں۔" (انجیل متی ۱ : ۱۸)

اس لئے عیسائی یوسف علیہ السلام کو مریم کا جائز خاوند اور مسیح علیہ السلام کا باپ بھی تسلیم کرتے اور کہتے ہیں اور چونکہ عقیدہ یہ ہے کہ "ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی" اس لئے وہ مسیح علیہ السلام کو "بلا باپ" بھی مانتے ہیں اور اس سے ہم مسلمانوں کے ہاں یہ نظریہ لے لیا گیا ہے ہمارے علمائے کرام، مفسرین اور مورخین اپنے عوام کو یہی لفظ تعلیم کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام "بلا باپ" پیدا ہوئے تھے ہاں وہ "روح القدس کی قدرت" کی بجائے "اللہ کی قدرت" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن جب عوام سے ہٹ کر اپنی خاص مجلسوں میں بیٹھتے ہیں اور اس واقعہ کو تحقیق کی سان پر چڑھاتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں۔

مشاہیر علمائے اسلام کے ارشادات مسیح علیہ السلام کی پیدائش میں

"وکانت النفخة التی نفخها فی جیب درعها فنزلت حتی ولجت فرجها بمنزلة لقاح الاب الام"
(حافظ عماد الدین، ابن کثیر)

"وکان روح عیسیٰ من تلک الارواح التی اخذ عهدها و میثاقها فی زمن ادم فارسله الله تعالیٰ مریم فی صورة بشر فتمثل بشرا سویا قال ابی فدخل من فیها" (در منثور ج ۳ ص ۱۴۲)

فنفخ فی جیب درعها وکان مشقوقا من قدامها فدخلت النفخة صدرها فحملت (صفات البیہقی ص ۳۶۲)

اتاها جبرئیل متمثلا بصورة شاب امرد سوی الخلق لتستانسی بکلامه ولعله لیهیج شهوتها فتحدر نطفتها الی رحمها (قاضی بیضاوی)

" تمثل لها جبرئیل فی صورة ادمی شاب امرد وضیی الوجه جعد الشعر" (مدارک)

"فتمثل لها بشرا و نفخ فیها فاحدث نفخته التلقیح فی رحمها فحملت بعیسیٰ" (المنار سید رشید رضا)

" فکان نصفه بشراً و نصف الاخر روحا مطهر املکًا لان جبرئیل وهبه لمریم"

(فتوحات مکیہ ص ۵۷۵)

" فان نفخته لما دخلت فی فرجها کان ذلک بمنزلة لقاح الذکر للانثی من غیر ان یکون هنالک وطی (لوامع التنزیل علی حائری)

" "اتاها الملک علیه السلام فی صورة شباب امرد و ضیئی الوجه جعد الشعر فکان لمریم بمنزلة له الاب لسائر النوع فان نفخته لما دخلت فی فرجها کان ذلک بمنزلة لقاح الذکر الانثی من غیر ان یکون وطئی..... وذکر غیر واحد من السلف ان نفخ فی جیب درعها فنزلت النفخة الی فرجها من فورها کما تحمل المرأة بعد جماع زوجها" (الجواب الفصیح ج ۱ ص ۱۵۷)

ایک حوالہ فارسی زبان میں بھی ملاحظہ فرمالیں۔

"شبہ نیست در ایں کہ از قدیم عادت اللہ جاری برایں منوال است کہ او لاد از نطفتین منعقد می شود و متوالد می گیرد و بدوں آب منی تولد ولد حسب عادت جاریہ ممکن نیست۔ ما قبل آیت زیر بحث " فتمثل لها بشر سویا" نیز مؤید ہمیں مرام است کہ تا متمثل بشر نزد مریم نیاید حاملہ نشد..... بر فرض تسلیم تاہم تواند گفت کہ عیسیٰ ولد جبرئیل است و لوقدس می باشد پس بالیقین عیسیٰ غیر جنس است زیرا کہ از جہۃ ولادت جز جبرئیل است و اعتبار ابوت دارد نہ امومت واگر نہ ذو اعتبارین بشری من جہۃ الام و ذو اعتبار قدسی بجہت فرشتہ بودن اب اومی باشد تازہم بنص قرآن و زعم مسلماناں ثابت گردید کہ عیسیٰ فی الواقع بشر نیست" (تفسیر القرآن سید علی حائری)

جو عبارات اوپر درج کی گئی ہیں ان کا اردو ترجمہ ہم چھوڑ رہے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ہم اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتے اگرچہ جملہ معروف ہے کہ "نقل کفر کفر نباشد" بطور گواہ ایک چیز پیش خدمت ہے لیکن تاہم وہ زبان عربی تھی اور اردو زبان والوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس میں سے انہی کی زبان میں کچھ تحریر ہے اور یہ شتے از خروارے ملاحظہ فرمالیں۔

اردو خواں حضرات کیلئے مشاہیر علمائے اسلام کے ارشادات

"دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آدھے بشر اور آدھے روح تھے کیونکہ حضرت مریم کے پاس اپنی روح

یعنی جبرئیل کو بھیجا اور آپ کی پیدائش حضرت جبرئیل کی پھونک سے ہوئی اس لئے دونوں امور آپ میں موجود تھے۔" (جاء الحق مفتی احمد یار رضائی ص ۹۰)

"یعنی وہ مولود آدھا اسرائیلی اور آدھا غیر اسرائیلی ہوگا۔" (تفسیر کبیر میاں محمود احمد قادیانی) یہ صریحاً جھوٹ اور بہتان ہے۔

پہلے جو شخص بی بی مریم کے حمل سے واقف ہوا وہ یوسف نجار تھا اور بی بی کا خلیرا بھائی تھا اس لئے مریم سے کہا کہ اے مریم تیری پارسائی اور زہد میں مجھے شبہ ہے یہ حمل تو کہاں سے لائی ہے تب حضرت مریم صادقہ نے اس سے ساری حقیقت اپنے حمل کی بیان کی اور جب وقت ولادت کا قریب ہوا حسب الہام الٰہی مریم نے یوسف کو لے کر بیت المقدس سے نکل کر وہاں سے چھ کوس کے فاصلہ پر ایک قریہ بیت الحم کے نام سے مشہور ہے وہاں جاتے ہی دردزہ سے بیقراری ہوئی۔" (قصص الانبیاء مولوی غلام رسول راجن پوری ص ۳۷۹)

"پھر مریم میں شہوت سرایت کی اور مریم کے اصل پانی اور جبرئیل کے وہمی پانی سے جو اس نفخ کی رطوبت میں آیا تھا عیسیٰ علیہ السلام کا جسم بنا کیونکہ جسم حیوانی کے نفخ میں رطوبت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ارکان اربعہ سے پانی کا رکن ہوتا ہے کہ اس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کا جسم جبرئیل کے وہمی پانی سے اور مریم علیہا السلام کے اصلی پانی سے بنا اور عیسیٰ علیہ السلام دو جہت سے بشر کی صورت ہوئے ایک جہت ان کی ماں کی طرف سے تھی اور دوسری جہت جبرئیل سے تھی کیونکہ وہ بشر کی صورت پر ظاہر ہوئی تھی اور یہ دو جہتیں اس واسطے ہوئیں کہ اس نوع انسانی میں تکوین خلاف عادت نہ واقع ہو۔" (فصوص الحکم)

"پھر حضرت مریم کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری جاری ہونے کے زمانہ میں ماہواری کے دن آئے جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے ایک الگ مکان میں غسل کرنے کیلئے گئیں اور پردہ ڈال کر کپڑے اتار دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبرئیل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا اور حضرت مریم نے ان کو دیکھا اور خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور میں دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی طبیعت میں قوائے نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت) کی کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے جیسے کبھی کسی کی نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے اور نفس کو اللہ تعالیٰ سے التجا تھی اور اس کے ساتھ تمسک تھا یہاں تک کہ وہ غائب سے فائض ہونے والی پاک دامنی کی حالت میں مالا مال ہوگئیں۔ صورت انسانیہ کی یہ حالت تھی کہ جبریل کے اختلاط سے عنقریب ظاہر ہونے والی تھی۔

جب جبرئیل علیہ السلام نے ان سے یہ کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں کہ دے جاؤں تجھ کو لڑکا ستھرا تو مریم خوش و خرم اور مانوس ہوگئیں اور حضرت جبرئیل نے جب ان کے حال کو دیکھا تو ان کے ستر میں

پھونک لگا دی اس پھونک سے اس میں تاثر ہوا اور وہ منزل ہوگئیں۔ حضرت مریم کے نطفے میں مرد کے نطفے جیسی قوت تھی اس لئے وہ حاملہ ہوگئیں اور جو بات سیدہ مریم میں تھی وہ سب اس بچہ میں آگئی۔ مثلاً اللہ سے تمسک کرنا' اس کی طرف التجا کرنا اور ملکی ہیبت سے خوش و خرم ہونا۔ کیونکہ حضرت مریم کی حالت اس کے نفس کی ہر قوت مصورہ اور مولودہ تک اس میں سرایت کر گئی تھی اور بات وہی ہے جو اطباء کہتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اس کے لڑکا پیدا ہو تو وہ جماع کے وقت لڑکے کا تصور پیدا کرے۔

حضرت جبرئیل کی پھونک سے اس لڑکے میں عالم مثال کا حکم اور روح کے خواص آگئے تھے کیونکہ صورت بننے کا سبب وہی تھا اس سے حضرت مسیحؑ کی جبلت میں مشابہ ایک راسخ ملکہ پیدا ہوا اور حضرت مسیحؑ کی روح القدس کے ساتھ تائید کا یہی مقصد ہے۔ (ماہنامہ الرحیم ماہ دسمبر ۱۹۸۷ اداریہ)

علامہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ پیدائش عیسیٰؑ کے متعلق

علامہ عنایت اللہ المشرقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے کون واقف نہیں وہ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ :

"عیسیٰ علیہ السلام بے پدر پیدا ہوئے تھے" تکملہ ص ۱۹۰ اول' تکملہ جلد ۲ ص ۴۰۵ پھر وضاحت اس طرح فرمائی کہ "اس نے اگر بن باپ اولاد پیدا کر کے انسان کو اپنے لائحہ عمل کے متعلق اشارہ کرنے کی غرض سے کسی نئے قانون فطرت کے رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا (امر کا ترجمہ) تو اس قانون کو کہتا ہے کہ ناموافق حالات میں بھی ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" ص ۱۹۰ اور پھر فرمایا

"میرے چھوٹے سے دماغ میں تو کم از کم نہیں آسکتا کہ خدا کیونکر ایسے انسان سے ملاقات کو گوارا کرے گا جس کو اس نے خود ناپاک نطفہ منی سے پیدا کیا جس کی پیدائش کی جگہ عورت کی پیشاب کی جگہ کو قرار دیا۔" (ص ۳۸۵ ج ۱) پھر فرمایا :

"جس طرح اس روح ربی کو حضرت مریم کے جسم میں پھونک دینے سے وہ مرد کی ہمبستری سے بے نیاز ہوگئی اس طرح انسان بھی اپنے ارتقاء کی آخری مرحلوں میں جب خدا کا مماثل بنتا جائے گا کسی ایسے اعضائی انقلاب کا حامل ہو کر رہے گا جس اعضائی انقلاب کے باعث اس کو حاجت ہی نہ رہے گی کہ وہ اپنی پیدائش مرد و عورت کی مجامعت سے کرے اور یہ مرحلہ وہ ہوگا کہ نطفہ "منی" کے سوا "کن" کے طریق پیدائش سے نکل کر ایسے باعزت طریق پیدائش کی طرف آئے گا جو مریم علیہا السلام کو خدا کے حضور سے ارزاں ہوا تھا۔" (حدیث القرآن ص ۲۷۲)

قرآن کریم کا بیان موجودہ انسانوں کی پیدائش کے متعلق

موجودہ طریق پیدائش کو اللہ پاک نے اَحْسَنِ تَقْوِیْم سے تعبیر فرمایا ہے دوسرے تو کیا سارے انبیاء کرام کو بھی اسی طریقہ سے پیدا کیا اور یہ طریقہ پیدائش اگر خدا سے ملاقات میں حائل ہے تو سارے نبیوں اور

رسولوں کا قصہ بھی پاک ہوگیا۔ پھر لے دے کر رہ جائیں گے تو وہ عیسیٰ علیہ السلام ہی ہوں گے لیکن "آدھے ناپاک" تو وہ بھی ہوگئے کہ وہ بھی اس پیشاب گاہ سے پیدا ہوئے جو طریقہ "ناپاک" ہے اور اس ناپاکی سے بچایا تو شیعوں نے اپنے اماموں کو بچایا کیونکہ انہوں نے اماموں کی پیدائش کا مقام ماں کی ران کو دیا ہے' پیشاب کی جگہ کو نہیں۔ مشرقی صاحب نے نہ معلوم ان کا ذکر کیوں نہیں کیا اور سارے نبیوں اور رسولوں کا معاملہ بھی اپنے ہی ساتھ صاف کر دیا اور ایک نظریہ کی حمایت میں اصل عقیدہ اسلام پر پانی پھیر دیا۔

حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے ارشادات پیدائش عیسیٰؑ میں

حضرت العلام حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث و رئیس المدرسین مدینہ یونیورسٹی امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث رقم طراز ہیں کہ :

"سنئے ولد بلا والدہ نہیں ہو سکتا اور ولد بلا اصلین متصورہ نہیں اور ولد کیلئے اصلین کے ساتھ انفکاک مادہ کی بھی ضرورت ہے گویا ولد کا لفظ بلحاظ استعمال یہ معنی دیتا ہے کہ دو اصلین کے توسط سے بانفکاک مادہ پیدا ہونے والا۔ جہاں کہیں لفظ ولد کلام عرب میں استعمال کیا گیا ہے وہاں اصلین اور انفکاک مادہ ضروری ہے۔ ایک اصل اگر والد ہے تو دوسری اصل جو ولد ہونے کیلئے ضروری ہے وہ عرف میں اس کی والدہ ہوگی جو اس کے باپ کی جورو ہوگی..... پس مسیح پر چونکہ لفظ ولد مریمؑ کا اطلاق کرتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کی والدہ ہو اور وہ مریم ہے اور دوسرا اصل جس کے اتصال کے علاوہ مسیح نہ پیدا ہوا ہم اہل اسلام کے نزدیک جبرئیل ہے جسے دوسری جگہ قرآن مجید میں "روح القدس" سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ بمنزلہ والد کے ہے کیونکہ نفخ جبرئیل کے قبل اور روح القدس کی قوت کے ظہور سے پہلے مریمؑ سے مسیح علیہ السلام ظاہر اور متولد نہ ہوئے۔" (اثبات التوحید ص ۴۵)

"عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت جبرئیل اور مریمؑ کے درمیان واقعہ ہوئی اس لئے وہ آسمان پر اب تک کچھ کھائے پیئے اور پیشاب و پاخانہ اور نیز دیگر بشری ضرورتوں کو پورا کئے بغیر جبرئیل و دیگر فرشتوں کی طرح زندہ ہے۔" (اثبات التوحید ص ۴۰)

"عربی زبان میں لفظ ولد کا حقیقی اطلاق جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اس کیلئے اصلین کا ہونا ضروری ہے اور ولد کیلئے اگر اس کی ماں کی طرف نسبت ہو تو دوسرا اس کا باپ ہونا چاہئے۔ پس ولد کی ماں ولد کے باپ کیلئے صاحبہ (بیوی) ہوگی نیز ولد کیلئے ضروری ہے کہ اصلین کے مادہ سے منفک ہو کر تیار ہو یعنی ولد کیلئے اصلین کی ضرورت ہے اور مادہ منفک بھی لازم ہے..... پس لفظ ولد کے معنی ہیں جزء خاص جس کی جزئیت میں دو شخصوں کو دخل ہو اس طرح لفظ ابن بھی عربی زبان میں حقیقی طور پر ولد کا مترادف ہے اس کے اطلاق کیلئے بھی یہی شرائط ہیں چونکہ مسیح کو ابن مریم سے قرآن کریم میں تعبیر کیا گیا ہے اس کیلئے بھی اصلین کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ان کی ماں مریم دوم جبرئیل علیہ السلام جن کو دوسرے لفظوں میں روح القدس سے تعبیر کرتے ہیں

جو حمل مسیح کا باعث ہوئے۔" (اثبات التوحید ص ۱۹)

سید مودودی رحمہ اللہ کی تشریح میں ولد کیا ہے؟

قرآن کریم سے یہ بات واضح ہے کہ مسیح علیہ السلام ولد تھے اور "اولاد کا کوئی تصور اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ نر و مادہ میں اتصال ہو اور کوئی مادہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔" (سید مودودی رحمہ اللہ)

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس میں ہماری طرف سے کچھ نہیں کہا گیا ہم نے تو مشاہیر علمائے اسلام کے ارشادات کو صرف جمع کر دینے کی سعی کی ہے تاکہ قارئین کی سمجھ میں بات آجائے اور وہ اپنے نظریہ کی حفاظت کر سکیں۔ حاشا للہ کہ ہم کسی کو کوئی بری بات کہیں چھوٹا منہ بڑی بات۔ کسی پر کوئی فتویٰ کسی کی کوئی تنقیص؟ ہمارے پیش نظر ان باتوں میں سے ایک بھی نہیں ہم تو یہ سوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے متعلق یہود نے تفریط کی اور نصاریٰ نے افراط سے کام لیا؟ بالکل صحیح لیکن ہم مسلمانوں نے کیا کیا؟ یہ افراط ہے تفریط ہے یا اعتدال ہے کیا ہے؟ اگر میرا موقف ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو میں یہ کہہ سکتا ہو کہ ؎

من از بیگان گاں ہرگز نہ نالم کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

اس طرح میں جبرئیل علیہ السلام سیدہ مریم رضی اللہ عنہا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی پوزیشن کو گڈمڈ کر دوں؟ نہی کر سکتا اور ہرگز نہیں کر سکتا یہ میرے ایمان و ایقان کا معاملہ ہے اس کیلئے مجھے تختہ دار پر چڑھنا پڑے تو واللہ میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوا چڑھنے کو تیار ہوں۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں تفصیل دیکھنا ہو تو "عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ بن مریم" کا مطالعہ کریں اور "ذلک عیسیٰ ابن مریم" کا انتظار کریں جو انشاء اللہ عن قریب طبع ہوگی۔ مزید تفصیل کیلئے سورہ آل عمران کی آیت ۴۲ سے ۵۴ تک پر ایک نظر ڈال لیں۔ نیچے دو تین مزید اقتباس پیش خدمت ہیں ان کو ملاحظہ فرمالیں۔

سید مودودی رحمہ اللہ کی تفہیمات برائے تفہیم حقیقت

"دنیا کے کسی پیشوائے دین کی زندگی کو لے لو، تم دیکھو گے کہ اس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے انہوں نے اس پر اپنے تخیلات و اوہام کے اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا ہی محال ہوگیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کی محرف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ اس کی اصل تعلیم کیا تھی؟ بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا ہے؟ اس کی پیدائش میں اجو بگی اس کی طفولیت میں اجو بگی، اس کی جوانی اور بڑھاپے میں اجو بگی، اس کی زندگی کی ہر بات میں اجو بگی اور اس کی موت تک میں اجو بگی غرض ابتداء سے لے کر انتہاء تک وہ ایک افسانہ نظر آتا ہے اور اس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خدا کا بیٹا تھا یا خدا اس میں حلول کر گیا تھا یا کم از کم یہ

وہ خدائی میں کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔" (تفہیمات سید مودودی صاحب رحمہ اللہ)

جن بزرگوں کی نبوت معلوم و مسلم ہے ان میں سب سے بڑھ کو ظلم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے سب انسان ہوا کرتے ہیں۔ بشریت کی تمام خصوصیات ان میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت و حکمت اور اعجاز کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کیلئے معمور فرمایا تھا لیکن اول تو ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجود مسعود کو برداشت نہ کر سکی یہاں تک کہ عین عالم شباب میں انہیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر جب وہ ان کے بعد ان کی عظمت کی قائل ہوئی تو اس قدر حد سے تجاوز کر گئی کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا اور یہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیح کی شکل میں اس لئے نمودار ہوا تھا کہ صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے کیونکہ انسان فطرۃ گنہگار تھا اور خود اپنے عمل سے اپنے لئے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔" (معاذ اللہ) (تفہیمات سید مودودی رحمہ اللہ)

"دنیا میں صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے ان انبیاء کرام میں سے ایک ایک کی پوزیشن صاف کی اور ان کے اصل مرتبہ و مقام سے دنیا کو روشناس کیا۔ اگر قرآن کریم نہ آتا تو آج کوئی شخص ان بزرگوں کو نبی ماننا تو درکنار عزت سے ان کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتا بنی اسرائیل چاہے اس احسان کو نہ مانیں مگر احسان کا احسان ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ اس کا اعتراف بھی ہو۔" (تفہیمات سید مودودی رحمہ اللہ)

"جب قرآن کریم نے اس قوم کے انبیاء کرام کی صفائی پیش کی اور اس کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں سے دھویا تو یہ خوش ہونے کی بجائے مقابلے پر اتر آئے اور انہوں نے ان سب داغوں کو جنہیں قرآن کریم نے دھویا تھا پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن جب نازل ہوا تو مدینہ میں یہودی موجود تھے اور نزول قرآن سے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں میں پھیلتے چلے گئے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا ان لوگوں نے ہر نبی کے متعلق وہی تمام پرانے قصے جو ان کے اپنے ہاں موجود تھے مسلمانوں میں پھیلا دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی بہت سی تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھیں ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔" (تفہیمات سید مودودی رحمہ اللہ)

دو تحریکوں کا مقابلہ جو باقی موجودہ تحریکوں پر روشنی ڈالتا ہے

یہ عبارات تفہیمات کی ہیں لیکن جب "تفہیم" کا وقت آیا تو مولانا نے وہی کچھ فرمایا جو متداول تفاسیر میں فرمایا گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اگر کسی نے پوچھا ہے تو وہ بتا دے ہم تو چلیں گے تو پوچھیں گے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا جی کو کچھ دعویٰ کرنا تھا انہوں نے "وفات مسیح" کا چکر چلایا باقی باتیں گول کر گئے اور مولانا کو

حکومت کا خیال تھا اس لئے وہ "دین" "الٰہ" اور "رب" کی تشریحات میں مصروف رہے اور باقی معاملہ پردے میں رکھا اگر کہیں بات کرنی چاہی تو رمز' اشارہ اور تلمیح سے کام لیا اور اس وقت ماشاء اللہ آپ کی تفسیر بھی متداول تفاسیر میں سے ایک ہے۔ رہی مرزا جی کی "نبوت" اور سید صاحب کی "حکومت" کہ وہ کہاں تک چلی تو اس کا حال سب کو معلوم ہے۔

پس چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا کہا گیا ہے

۲۶۸ اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ اے اہل کتاب! ایسا طریقہ مت اختیار کرو کہ کسی نبی کو مانو اور کسی کا انکار کرو یاد رکھو کہ کسی ایک نبی کا انکار بھی ایسا ہی ہے جیسے سارے انبیاء کرام کا انکار۔ ایک کے جھٹلانے سے سب کا جھٹلانا سمجھا جائے گا۔ یہ بات تعصب اور حمیت جاہلیہ کی ہے حالانکہ تم کو ان دونوں باتوں سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ دنیا میں جہاں' جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے اس کے برحق ہونے کی شہادت دو اگر تم نے ایسا کیا تو یہی ایمان باللہ ہے اور یہی عہد رسالت ہے اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو پھر تم نے گویا اللہ اور اس کے سارے رسولوں کا انکار کر دیا۔ یہود کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کا انکار کر کے صرف مسیحؑ ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بھی منکر ہوگئے' کیسے؟ ایسے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی ان پیشگوئیوں کو جھٹلا دیا جن میں عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت تھی اور پھر ان پیش گوئیوں کی بھی تکذیب کی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق بیان کی گئی تھیں اور ان کا یہ انکار اللہ کی کتاب کا انکار ہوا اور اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب کو جھٹلانا گویا اللہ تعالیٰ ہی کو جھٹلانا ہے۔ چنانچہ خود نبی اعظم و آخر ﷺ کے متعلق اہل مکہ سے بھی اس طرح کہا گیا کہ "کیا یہ اپنے رسول سے کبھی واقف نہ تھے کہ ان جانے آدمی ہونے کے باعث اسے مان لینے کیلئے تیار نہیں۔" (المومنون ۲۳ : ۶۹) مطلب یہ ہے کہ کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل اجنبی آدمی جس سے یہ کبھی واقف نہ تھے اچانک ان کے درمیان آکھڑا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے نبی مان لو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی نہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ پیش کر رہا ہے وہ اس وقت کا ہے جب ابھی نبوت کے بند ہونے کا اعلان نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے برعکس اس کے آنے کی خبریں یہود و نصاریٰ دونوں دے رہے تھے۔ وہ ان کی اپنی برادری کا آدمی ہے۔ اس کی نسبی شرافت و وجاہت ان سے مخفی نہیں۔ اس کی ذاتی زندگی ان سے چھپی ہوئی نہیں۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی سرحد تک وہ ان کے سامنے پہنچا ہے۔ اس کی صداقت سے' اس کی راست بازی سے۔ اس کی امانت و دیانت سے۔ اس کی بے داغ سیرت سے یہ خوب واقف ہیں۔ اس کو خود امین کہتے رہے ہیں۔ اس کی دیانت پر ان کی ساری برادری بھروسہ کرتی رہی ہے۔ اس کے بدترین دشمن تک یہ مانتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کی پوری جوانی عفت و پاکدامنی کے ساتھ گزری ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ نہایت شریف اور نہایت نیک آدمی ہے۔ حلیم ہے' حق پسند ہے' امن پسند ہے' جھگڑوں سے کنارہ کش ہے؟ معاملے میں کھرا

ہے' قول و قرار کا پکا ہے' ظلم نہ خود کرتا ہے نہ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے' کسی حق دار کا حق ادا کرنے میں اس نے کوتاہی نہیں کی ہے' ہر مصیبت زدہ' ہر بے کس اور ہر حاجت مند کیلئے اس کا دروازہ ایک رحیم و شفیق و ہمدرد کا دروازہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبوت کے دعویٰ سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ کسی دعویٰ کی تیاریاں کی جا رہی ہیں اور جس روز اس نے یہ دعویٰ کیا اس کے بعد سے آج تک وہ ایک ہی بات کہتا رہا ہے۔ کوئی تبدیلی اس نے نہیں کی ہے۔ کوئی ردوبدل اپنے دعویٰ اور دعوت میں اس نے نہیں کیا ہے۔ کوئی تدریجی ارتقاء اس کے دعوؤں میں نظر نہیں آتا کہ کوئی یہ گمان کر سکے کہ آہستہ آہستہ قدم جما جما کر دعووں کی وادی میں پیش قدمی کی جا رہی ہے پھر اس کی زندگی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جو کچھ اس نے دوسروں سے کہا ہے وہ پہلے خود کر کے دکھایا ہے۔

اس کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کے پاس ہاتھی کے دانت نہیں ہیں کہ دکھانے کے اور ہوں اور کھانے کے اور ہوں اور چبانے کے اور۔ وہ دینے کے باٹ الگ اور لینے کے الگ نہیں رکھتا۔ ایسے جانے بوجھے اور جانچے پرکھے آدمی کے متعلق وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ صاحب دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ بڑے بڑے فریبی آتے ہیں اور دل موہ لینے والی باتیں کرتے ہیں اول اول اعتبار جما لیتے ہیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سب محض چکمہ ہی چکمہ تھا یہ صاحب بھی کیا خبر اصل میں کیا ہوں اور بناوٹ کا ملمع اترنے کے بعد کیا کچھ ان کے اندر سے نکل آئے اس لئے ان کو مانتے ہوئے ہمارا تو ماتھا ٹھنکتا ہے۔" یہ ساری باتیں جو بیان کیں رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلنے والے جواہر پاروں کا ترجمہ و مفہوم ہیں جو انبیاء کرام کے متعلق اور خصوصاً سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمائے گئے ہیں اور آپ میں بدرجہ اتم یہ سب کے سب موجود تھے اور ان کی حقیقت و اصلیت بیان کرنے کی ہمارے قلم میں طاقت نہیں۔ غور کیجئے کہ ہرقل عیسائی قیصر روم ابوسفیان سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق دریافت کرتا ہے کہ " کیف نسبه فیکم" وہ حسب و نسب کے لحاظ سے کیسا ہے؟ تو ابوسفیان نے جواباً کہا کہ "هو فینا ذو نسب" وہ بہت شریف النسب ہے" تو ہرقل نے کہا کہ "وکذ لک الرسل تبعث فی نسب قومها" اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ انبیاء کرام شریف النسب ہی ہوتے ہیں۔ گویا آپ ﷺ کی سچائی کی ایک دلیل ہے اور یہی دلیل سارے انبیاء کرام کی سچائی کی ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ)

فتح الباری پارہ ۱۸ ص ۱۴۱ میں ہے کہ نسب کبیر و حسب رفیع..... نسب الوجه الذی یحصل له الاولاد من جهة الاباء اور اس طرح سیرت ابن ہشام ص ۱۸۱ ج ۱ اور دلائل النبوۃ ص ۸۲' ابونعیم میں ہے کہ بعث الله الینا رسولًا منا تعرف نسبه و صدقه و امانته وعفافه اور خصائص الکبریٰ ج اول ص ۲۹ بحوالہ بیہقی اور البدایہ والنہایہ میں بحوالہ ابن اسحٰق اس طرح مروی ہے کہ قد عرفنا وجه ونسبه قد بعثه الله الینا

اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ

سے باز آجاؤ کہ تمہارے لئے بہتری ہے۔ ۲۶۹ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ ہی اکیلا

کما بعث الرسل الی من قبلنا "یہ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اللہ نے ہماری طرف ایک ایسا رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے ہم خوب واقف ہیں۔ جیسا کہ ہم سے پہلے انبیاء کرام کے حسب و نسب معروف ہوا کرتے تھے۔"

باز آجاؤ ایسی بات نہ کہو کہ اللہ تین ہیں' یاد رکھو کہ اللہ ایک ہی ہے

۲۶۹ قرآن کریم نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی ہستی کے متعلق جو صدیوں سے ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی صاف صاف الفاظ میں صراحت فرما دی کہ وہ مریم کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں' اللہ کی طرف سے کلمۂ بشارت ہیں جو سیدہ مریم کی طرف القاء کی گئی تھی' ان کی پیدائش ایسے ہوئی تھی جیسے عام انسانوں کی پیدائش ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی مقرب روحوں میں سے ایک مقدس روح ہیں۔ اب ان الفاظ سے جو زیر بحث ہیں یعنی وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ عیسائیوں کو ان کے غلط عقیدہ سے باز رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی ایک اور روشن دلیل ہے کہ "ثلثة" جو خبر ہے اس کا ذکر کیا اور اس کے مبتداء کو محذوف کر دیا کیونکہ تثلیث میں تو عیسائیوں کے تقریباً تمام فرقے متحد ہیں لیکن ان کی تفصیل میں ان کا باہمی اتنا اختلاف اور تضاد ہے کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک بھی ایک چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اگر کوئی ایک مبتداء بیان کر دی جاتی تو تثلیث کی ایک صورت تو ممنوع ہو جاتی اور دوسری اقسام کا حکم معلوم نہ ہو سکتا اس لئے خبر کے ذکر پر اکتفا کیا تاکہ موقع اور محل کے مطابق مبتدا مقدر مان لی جائے۔ یہاں یہ تو ممکن نہیں کہ عیسائیوں کے تمام فرقوں کا تثلیث کے بارے میں جو جو عقیدہ ہے ان سب کو بیان کیا جائے لیکن ان کے چند اہم فرقوں کے نظریات بیان کرنے کی ضرور جسارت کی جاتی ہے۔

اس بات پر تو تقریباً سب عیسائی فرقے متفق الرائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بحیثیت جوہر ہونے کے واحد ہے اور بحیثیت اقانیم تین ہیں۔ وجود علم اور حیات کو اقانیم کہتے ہیں اور اقانیم کا واحد اقنوم ہے جس کا معنی شخص اور اصل ہے۔ وجود کو باپ' علم کو بیٹا اور حیات کو روح القدس کہتے ہیں۔ ان کا اختلاف اس میں ہے کہ ان تین اقانیم کا تعلق جوہر یعنی اللہ سے کیا ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ

ا۔ ایک فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ تین اقانیم اور جوہر قدیم الگ الگ ہیں اور ہر ایک ان میں سے خدا ہے اور اقنوم ثانی یعنی علم حضرت مسیح کے جسم سے متحد ہو گیا ہے جیسے شراب اور پانی ملنے کے بعد یک جان ہو جاتے ہیں اور مسیح بھی ازل قدیم ہے اور مریم نے ازل قدیم کو جنا ہے۔

ب۔ اور ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ بیٹا یعنی مسیح کی دو حیثیتیں ہیں ایک لاہوتی اور ایک ناسوتی اس حیثیت

سے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے وہ خدائے کامل ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کا ظہور اس جسد عنصری میں ہوا انسان کامل ہے اس لئے یہ قدیم بھی ہے اور حادث بھی اور قدیم و حادث کا یہ اتحاد نہ قدیم کی قدامت کو متاثر کرتا ہے اور نہ حادث کے حدوث کو۔

ج۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ کلمہ یعنی اقنوم ثانی گوشت اور خون میں بدل گیا اور خدا مسیح کی شکل میں بدل گیا یا رونما ہوا۔

د۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ الٰہ قدیم کے جوہر اور انسان حادث کے جوہر میں یوں امتزاج ہوا جیسے نفس ناطقہ کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دونوں ایک چیز بن جاتے ہیں۔ اس طرح جوہر قدیم اور جوہر حادث کے مجموعہ کا نام مسیح ہے اور وہی خدا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ خدا انسان نہ بن سکا لیکن انسان خدا بن گیا جیسے اگر آگ کوئلہ نہیں بن سکتی تو کوئلہ تو آگ بن جاتا ہے۔

اس سلسلہ کو اتنا طول دیا گیا ہے کہ اس کا بیان اتنا جلدی ختم ہونے والا نہیں ہے یہ مشتے نمونہ از خروارے بس است۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے عقل سمجھ سکے یا صحیح معنوں میں کسی دوسرے کو سمجھا سکے اس لئے مذہب کا پلہ بھاری بنانے کیلئے اتنی بات کہہ دینا کافی ہے کہ عقل کو مذہب میں دخل نہیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بہرحال ایک چیز واضح ہوگئی کہ ان تمام اختلافات کے باوجود تثلیث کے عقیدہ پر سب متفق ہیں گو عنوان جدا جدا ہیں لیکن معنوں میں ایک ہی ہیں اور یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنے کیلئے عیسائیت کے بڑے بڑے مدبروں اور دانشوروں نے سر توڑ کوشش کی لیکن نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ آخر ایک ہی چیز کو قدیم اور حادث' خدا اور بندہ اور لاہوت و ناسوت کا مجموعہ کیسے تصور کر لیا جائے۔ اگر تاریخ مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو تثلیث کا عقیدہ تمام مشرکانہ مذاہب میں مشترک نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں "تری مورتی" یعنی برہما' وشنو اور شیو کی عبادت کی جاتی ہے جن کیلئے وہ ان تین حروف (ا۔ و۔ م کو بطور رمز استعمال کرتے ہیں چین میں "تاؤ" ایک ایسا خدا ہے جس کی تین اقانیم ہیں۔ مصر قدیم میں معبد منفیس کے قسیس ثالوث مقدس کی تعلیم دیتے تھے اور یہ بتاتے تھے کہ پہلے نے دوسرے کو اور دونوں نے مل کر تیسرے کو پیدا کیا ہے۔ ان کے اعتقاد میں اقنوم ثانی کو کلمہ نیز دوسرا خدا اور اللہ کا پلوٹھی کا بیٹا کہا جاتا بالکل ویسے ہی جیسے اب عیسائی کلمہ کو ابن اللہ اور الٰہ مانتے ہیں اور فارس میں بھی ایک ایسے الٰہ کی پرستش کی جاتی تھی جو مثلث الاقانیم تھا جن کے نام یہ تھے ازمرد' مترات اور اہرمن۔ مترات کو وہ بھی ابن اللہ کہا کرتے تھے اور خود یورپ میں مسیحیت سے پہلے تثلیث کا عقیدہ رائج تھا۔ چنانچہ یونانی ایک ایسے خدا کے قائل تھے جس کی تین اقانیم تھیں اور روم کے قدیم بت پرست بھی تثلیث کے قائل تھے اور اللہ' کلمہ اور روح پر ایمان رکھتے تھے اس مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں کہ جب عیسائیت مشرق اوسط سے یورپ میں پہنچی اور قسطنطین شاہ روم نے اسے قبول کیا تو وہی تثلیث جو اہل یورپ کے عقیدہ میں غیر معلوم زمانہ سے

وَلَدٌ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے کوئی بیٹا ہو۔[۲۷۰] آسمان میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کیلئے ہے۔ کارسازی کیلئے اللہ کا کارساز ہونا بس ہے۔[۲۷۱] ۱۷۱

چلی آرہی تھی منتقل ہو کر ایک ایسے دین میں آگئی جو سراسر توحید خالص کا علم بردار تھا۔ انجیل مقدس کی یہ آیت اب بھی اعلان کر رہی ہے کہ اس دین حق کا اور اس کے پیغمبر کا دامن شرک کی ان آلودگیوں سے پاک ہے چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔" (انجیل یوحنا ۱۷ : ۳)
اللہ ہی اکیلا معبود ہے' وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو

۲۷۰ عیسائیوں نے ابتداءً مسیح کی شخصیت کو انسانیت اور الوہیت کا مرکب قرار دیا اور اس طرح جو غلطی کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کیلئے یہ مسیح کی حقیقت ایک معمہ بن کر رہ گئی جسے ان کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوششیں کیں اتنے ہی زیادہ الجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکب شخصیت کے جزو انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کے ابن اللہ ہونے اور تین مختلف خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا اور جس کے ذہن پر جزو الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے ہی کی حیثیت سے مسیح کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنہوں نے نکالنی چاہی انہوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیح کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے' یہ کیوں؟ اس لئے کہ کوئی قوم جب من حیث القوم ایک عقیدہ اختیار کر لیتی ہے پھر اس کا خلاف کرنے والے اس قوم میں شمار نہیں کئے جا سکتے اور قوم سے اخراج آخر کون پسند کر سکتا ہے؟ اس لئے انہوں نے ساری کوشش اس میں صرف کر دی کہ خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ اس طرح آج ہم بھی کہیں۔ پنج تن کو کہیں بارہ کو کہیں چار کو جو جس کو مان لیتا ہے وہ اس کوشش میں مصروف ہے کہ ان کی شخصیتیں الگ الگ بھی رہیں اور نام بھی الگ الگ ہی چلتے رہیں اور پھر یہ سب ایک بھی ہوں خواہ "مع اللہ" ہو کر رہیں یا کوئی دوسرا طریقہ ہو جس کی کوئی تعبیر نکل آئے اور کہیں "علی" کو "اللہ" کہہ کر بھی تسکین حاصل کرتے ہیں اور "احد" کو "احمد" مان کر بھی دل کے ارمان نکالتے ہیں البتہ وہ عیسائی اور ہم مسلمان ہیں۔ پھر عیسائیوں کے متعلق قرآن کریم میں موجود ہے کہ :

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو کہ

اگر اللہ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔"
(المائدہ ۵ : ۱۷)

اور ہم مسلمان اب اس بات سے بے نیاز ہیں کہ کہیں ہمیں مخاطب کر کے اللہ ایسی بات نہ کہہ دے جیسی اس نے عیسائیوں کو کہی اس لئے کہ اب نہ بانس موجود ہے نہ بانسری بجے گی۔ اس لئے ہماری راہیں کشادہ ہیں کہ جس جس کو چاہیں خدا بنائیں۔ دین و اسلام میں کوئی خلل نہیں آسکتا۔

یہ پیچھے بڑی وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ آخر لوگوں کو اللہ کی اولاد بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی لڑکیاں بنائیں ان کے وہم نے ان کو ایسا کیوں مجبور کیا؟ اور وہ کیا عوامل تھے جن کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا اور وہی صورت جو ان کو درپیش تھی آج ہم کو بھی درپیش ہے تو پھر آخر ہم ایسا کیوں نہ کریں جو وہ کر چکے؟ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اللہ کی اولاد قرار دینے والوں سے یہ استفسار بھی کیا ہے کہ تم نے جو اللہ کی اولاد ٹھہرائی ہے تو اس کیلئے آخر تمہارے پاس دلیل کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○
(الانعام ۶ : ۱۰۱) "وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" اور اس سے کون پوچھے کہ اللہ میاں تو نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا تھا اور اس طرح اگر تو نے بغیر بیوی کے اولاد پیدا کر لی ہے تو آخر اس پر تعجب کی بات کیا ہے؟ لیکن اس نے بغیر پوچھے ہی جواب دے دیا کہ میں نے تو مخلوق کیلئے ایک ضابطہ مقرر کر دیا ہے اور ہر چیز اس میرے ضابطے کے مطابق پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے اور میں جانتا ہوں کہ میں نے تو اپنے ضابطہ کے خلاف نہ کرنے کا عہد باندھا ہوا ہے اور وہ بھی اپنی ذاتی مرضی سے اس لئے میں نے تو اس کا خلاف نہیں کیا آخر انہوں نے اولاد کہاں سے نکال لی؟ اور کیسے نکال لی؟ اس لئے علمائے اسلام نے سارا زور لگایا کہ جبرئیل کو درمیان میں رکھ کر ضابطہ کی خانہ پری کی اور اس کو بمنزلہ والد ٹھہرایا اور چونکہ وہ انسان نہیں تھا اس لئے مسیح علیہ السلام کو "بے پدر" بھی تسلیم کیا اور یہ ہمارا من حیث القوم ایک مقبولہ عقیدہ ہے اس لئے اس کا خلاف کہہ کر آخر قوم سے نکلنا کون برداشت کر سکتا ہے۔ اور من حیث القوم عیسائیوں کی مذہبی تہذیب پرانی تھی اور ہماری نئی ہے۔

نئی تہذیب سے وقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم "فقط" ایمان جاتا ہے

ہاں! قوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ حاشا اللہ! قرآن کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھہر گئی تھی لیکن قرآن کریم نے اس گمراہی کو مٹایا اور اس نے خدا پرستی کیلئے عقلی تصور پیدا کیا۔ اس کی تمام تر بنیاد تعقل و تفکر پر ہے اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائنات خلقت کا مطالعہ و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات خلقت کے مطالعہ و تفکر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کرے گا تو عرفان حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی اور جہل و کوری کی گمراہی سے نجات پا جائے گا۔ آیئے اس سلسلہ میں قرآن کریم ہی سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ارشاد فرماتا ہے۔

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ایک خاص حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کیلئے معرفت حق کی ایک بڑی ہی نشانی ہے۔" (العنکبوت ۲۹ : ۴۴) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض کھیل اور تماشا کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے ہم نے انہیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔" (الدخان ۴۴ : ۳۸، ۳۹) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کیلئے ایک مقرر وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔ (الروم ۳۰ : ۸)

فرمایا کہ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، اس لئے کہ اولاد کا کوئی تصور اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ نر و مادہ میں اتصال ہو اور کوئی مادہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کر لے۔ پس اللہ کیلئے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ وہ ایک مادی اور جسمانی وجود ہو اس کی ہم جنس کوئی اس کی بیوی ہو اور اس کے جسم سے کوئی مادہ بھی خارج ہو۔

توالد و تناسل کا سلسلہ جہاں بھی ہے اس کی علت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور ان کی جنس کے باقی رہنے کیلئے ناگزیر ہوتا ہے کہ ان سے اولاد پیدا ہو جس سے ان کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کیلئے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذات خود معاذ اللہ فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذات خدا نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ خدا کی بھی کوئی ابتداء اور انتہاء ہو

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ

مسیحؑ کو ہرگز اس بات میں عار نہیں کہ وہ اللہ کا بندہ سمجھا جائے اور نہ اللہ کے مقرب

کیونکہ توالد و تناسل پر جن اجناس کی بقاء کا انحصار ہوتا ہے ان کے افراد نہ ازلی ہوتے ہیں نہ ابدی۔

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اس اللہ ہی کا ہے' اس کا کارساز ہونا بس کرتا ہے

۱۷۱ ایک سادہ سی بات ہے جس کو ایک بدوی' ایک دیہاتی اور میرے جیسا ایک موٹی سمجھ کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ معمولی گھر کا نظام بھی چار دن بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحب خانہ ہوں اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیاروں تک ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ کیلئے بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں کے درمیان تناسب اور توازن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی اٹل اور غالب و قاہر ضابطہ ان بے شمار اشیاء اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم تعاون کرتے رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے مطلق العنان فرمانبرواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے؟ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مستلزم ہے۔ قانون اور ضابطہ کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات کی شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے اور یہ استدلال عقلی ہے۔

جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اس منظم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے اس کیلئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا نے ہمیں اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اب یہ امر واقعہ ہے کہ ہم اس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا اس کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ بنا کر ٹھیکہ پر دے دیا ہے تو وہ سمجھتا رہے کیا اس کے سمجھنے سے حقیقت بدل جائے گی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اکیلا ہی اس سارے نظام کا محافظ و نگہبان ہے اور اس کی کارسازی سے یہ سب کچھ چل رہا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جو اس نظام کا چلانے والا ہو ہاں! چلانے والا ہی یہ بھی جانتا ہے کہ اس کو کب تک چلائے رکھنا منظور ہے وہ خود دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے کہ "کیا ہم اس پہلی تخلیق سے تھک چکے ہیں یا عاجز آگئے ہیں؟" نہیں نہیں جب تک اس کا چلانا چاہیں گے چلائیں گے اور جب چاہیں گے اس کو توڑ پھوڑ کر نیا نظام قائم کر دیں گے۔

الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ
اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

فرشتوں[۲۷۲] کو اس سے ننگ و عار ہے جو کوئی اللہ کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گھمنڈ کرے تو وہ
وقت دور نہیں کہ اللہ سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ ۱۷۲
اس دن ایسا ہوگا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کئے ہیں تو ان کی نیکیوں کا پورا

مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بندہ ہونے سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی فرشتوں کو

۲۷۲ دنیا میں جن کی کثرت سے پرستش کی گئی ان ہی میں سے مسیح علیہ السلام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وہ طاقتیں بھی جن کو فرشتہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ حالانکہ مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم تھی اور نہ ہی کسی فرشتہ نے اپنی عبادت کا آکر لوگوں کو کہا ہے۔ لوگوں کو اپنی ہی وہم پرستی کے سبب یہ ہوا اور اب بھی جو کچھ ہو رہا ہے لوگوں ہی کی وہم پرستی سے ہو رہا ہے۔ فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کیلئے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعتراف اور اپنے بندہ ہونے کا اعتراف باعث ہزار فخر و نازش ہے وہ بھلا کیوں اس کو عار سمجھیں اور حقیقتہً یہی انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے کہ اپنے معبود حقیقی کو پہچان لے اور اپنے گلے میں اس کی بندگی کا طوق ڈال کر اس کی جناب میں حاضر ہو۔ اناجیل میں جہاں بے شمار تحریف ہو چکی ہے وہاں اب بھی مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم موجود ہے "یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی ۴ : ۱۰) اور قرآن کریم میں ہے کہ "ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا۔" (الزخرف ۴۳ : ۵۷) مسیح علیہ السلام کو نصاریٰ نے اللہ کا بیٹا کہا اس سے مراد ان کی کیا تھی اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ کا جو جی میں آتا وہ کہہ لیتے اس کو اپنا عقیدہ قرار دے لیتے جیسے انہوں نے ملک صدق کے متعلق اس سے بھی عجیب کہا لیکن اس کے باوجود اس کو نہ اللہ کہا نہ اللہ کا بیٹا اور بیان اس طرح دیا کہ وہ گویا اس کو ازلی ابدی خدا قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ عبرانیوں میں ہے کہ

"اور یہ ملک صدق سالم کا بادشاہ خدا تعالیٰ کا کاہن ہمیشہ کاہن رہتا تھا۔" "اس کو ابراہیم نے وہ یکی دی۔ یہ اول تو اپنے نام کے معنی کے موافق راست بازی کا بادشاہ ہے اور پھر سالم یعنی صلح کا بادشاہ۔ یہ بے باپ' بے ماں' بے نسب نامہ ہے نہ اس کی عمر کا شروع نہ زندگی کا آخر بلکہ خدا کے بیٹے کے مشابہ ٹھہرا۔" (عبرانیوں ۷ : ۱' ۳' ۴) یہ جس کو چاہیں جس صفت سے نوازیں' کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے قوم سے یہ منوا

فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ

پورا بدلہ انہیں دے گا اور اپنے فضل سے اس میں زیادتی بھی فرمائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے

لیا ہے کہ اللہ کا کلام عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا اور جو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اللہ سے کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ پھر قوم نے اسی نظریہ کو قبول کر لیا اور جب قوم کو بھی وہ نظریہ قبول ہے اور عقل سے کام لینا بھی حرام ہے تو اب جو چاہیں وہ بیان کریں ان کو اختیار ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے بھی انہی کا دیا ہوا یہ اصول کس طرح قبول کر لیا اور قرآن و حدیث میں یہ کہاں تحریر ہے جو ہماری زبانوں پر عام ہے کہ "دین عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا"

چونکہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ نصاریٰ نے بھی اور دوسری قوموں نے بھی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر ان کے ذمہ بہت کام لگائے ہوئے تھے قریش مکہ بھی نبی اعظم و آخر ﷺ کی بعثت سے پہلے ایسا خیال رکھتے تھے اور فرشتوں کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا قرار دیتے تھے اس لئے ساتھ ہی فرشتوں کا ذکر کر دیا اور فرمایا کہ "مسیح کو ہرگز اس سے عار نہیں کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے اور نہ ہی خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے اور جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گھمنڈ کرے تو وہ وقت دور نہیں کہ خدا سب کو اپنے حضور جمع کرے گا" بات کا فیصلہ تو اس وقت یقیناً ہو جائے گا لیکن ایسا ہونا ان کے حق میں مفید تو نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان کو نہ دوبارہ اس جگہ آنا ہے اور نہ اس وقت معافی مانگنا ان کیلئے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے اور جو علم فائدہ مند ثابت نہ ہو اس میں اور جہالت میں کیا فرق رہا؟

"استنکف" اور "استکبر" دونوں کا مادہ ن ک ف اور ک ب ر لیکن معنی کے لحاظ سے ایک ہی ہیں یعنی ازراہ نخوت و غرور کسی چیز سے رک جانا اور چونکہ یہاں ذکر مسیح علیہ السلام کا تھا ورنہ کسی نبی کو بھی اللہ کا بندہ ہونے سے ہرگز ہرگز انکار نہیں بلکہ فخر ہے۔ نبی اعظم و آخر ﷺ معراج میں جب اللہ تعالیٰ کے نشانیوں کو دیکھ رہے تھے اور مقام قرب کی انتہا پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے پوچھا "بما اشرفک" اے سراپا ستائش و خوبی! میں آج آپ ﷺ کو کس اعزاز سے مشرف کر دوں تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا " بنسبتی الیک بالعبودیۃ" مجھے اپنا بندہ ہونے کا شرف عطا فرما معلوم ہوا کہ انسانیت کا سارا شرف حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی ہی میں ہے اس سے زیادہ بڑا اشرف اور کوئی نہیں۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے اس انسان کا شرف کیا سمجھا جس سے بڑا اشرف کوئی اور موجود ہی نہ تھا اور انبیاء کرام کے انسان یا بشر ہونے سے انکار کر کے کس قدر توہین کے وہ مرتکب ہوئے اور کس طرح انہوں نے انبیاء کرام کو ان کے اصلی مرتبہ سے گرا دیا اور اس غلطی کے مرتکب ہوئے جس کے اس سے پہلے نصاریٰ مرتکب ہو چکے تھے۔

اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ

بندگی کو ننگ و عار سمجھا اور گھمنڈ کیا تو انہیں ایسا عذاب دے گا جو دردناک عذاب ہوگا اور اس دن انہیں اللہ کے سوا نہ تو کوئی رفیق ملے گا نہ مددگار۔ ۱۷۳

لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان آگئی اور ہم نے تمہاری طرف

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ان کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا بلکہ وہ انعام بھی پائیں گے

۲۷۳ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی نیکی بھی ضائع نہیں کی جائے گی۔ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی آدمی اللہ کی رضا کیلئے ایک کام کرے اور پھر اس کے اجر سے محروم رہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں! اپنی نیکیوں کو خود کوئی برباد کر جائے تو وہ دوسری بات ہے۔ نیکیاں برباد کس طرح ہوتی ہیں؟ اس کی تشریح پیچھے بہت سے مقامات پر گزر چکی ہے۔ مثلاً روپیہ پیسہ خرچ کیا لیکن دکھاوے کیلئے پیسہ خرچ ہو گیا اور دکھاوا بھی ہو گیا اس لئے کہ جن کو دیکھنے کے لئے بلایا گیا تھا وہ خوب داد دے گئے۔ اس طرح بلاشبہ اس کا صلہ اس نے حاصل کر لیا تاہم اس کی وہ نیکی اگر اس کو دکھا دی جائے اور اس کا اجر بھی اور پھر اس اجر کی اضاعت بھی تو اس کیلئے کیا ہوگا؟ آخر افسوس ہی تو ہوگا لیکن اس افسوس کا باعث کون ہوا؟ وہ خود ہی تو ہوا گویا نیکی کی اور اس کو برباد کر دیا۔

جن لوگوں نے انکار و تکبر کی راہ اختیار کی ان کیلئے عذاب الٰہی بھی تیار کھڑا ہے

۲۷۴ فرمایا جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ پھر ان کے اس داخلہ کا بھی ذکر فرمایا گیا کہ ان کے جانے سے پہلے جہنم کے دروازے کھلے نہ ہوں گے بلکہ بند ہوں گے جس طرح جیل کے دروازے بند ہی رہتے ہیں اور پھر جیل میں داخل کرنے والے کیلئے دروازہ کھولا جاتا ہے اور اندر داخل کر کے دروازہ پھر بند کر دیا جاتا ہے ان کے پہنچنے پر بھی دوزخ کے دروازے کھولے جائیں گے

تکبر کرنے والے جن سہاروں پر تکبر کرتے رہے وہ سب توڑ کر رکھ دیئے جائیں گے

۲۷۵ دوسروں کے آسرے اور سہارے پر برائیاں اور تکبر کرنے والوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ جن جن آسروں اور سہاروں کے ذریعہ تکبر کرتے رہے اور ان کو یقین تھا کہ ہمیں کوئی پوچھ نہیں سکتا فرمایا جب پوچھنے والے ان کے پاس حاضر ہو جائیں گے تو اس وقت یہ سہارے ٹوٹ چکے ہوں گے اور ایک بھی ماں

جَآءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾

چمکتی ہوئی روشنی بھیج دی۔ ۱۷۴

کا لال ایسا نہیں ہوگا جو کھڑا ہو کر یہ کہہ دے کہ یہ میرے سہارے پر ایسا کرتے رہے تھے اور ان کو چھوڑنا ہوگا ہرگز نہیں وہاں کس کی مجال کہ ایسی حرکت کر سکے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی تو پڑی ہوگی۔

اے لوگو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے "برہان" آچکی

۲۷۶ برھان کیا ہے؟ برہان دلیل کو کہتے ہیں جس سے ہر طرح کا شک و شبہ زائل ہو جائے اور کسی طرح کا کوئی شک باقی نہ رہے اور نہ ہی کوئی شک ڈالنے والا شک ڈال سکے۔ ہاں وہ مانے یا نہ مانے تسلیم کرے یا نہ کرے یہ اس کی مرضی رہی لیکن اس کے پاس نہ ماننے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ یہاں اس برہان سے کیا مراد ہے؟ نبی اعظم و آخر ﷺ کی ذات اقدس مراد ہے۔ جن کی آمد کی گواہی اور شہادت تورات و انجیل میں موجود ہے اور باوجود اس کے کہ ان دونوں ہی کتابوں میں بے شمار تحریف ہو چکی لیکن اس "برہان" کی پیش گوئیاں اسی طرح قائم و دائم رہیں اور اب تک ہیں اور تاقیامت رہیں گی۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے "بھائیوں" میں سے آنے کی دلیل جو ابھی پیچھے گزری کتنی صاف اور واضح ہے اور پھر یہ بات کہ وہ "ابد تک" رہے گا آپ کی ختم نبوت کی کھلی نشانی کے طور پر ہے "سارے انسانوں" کیلئے آنے کی پیش گوئی جو کسی دوسرے نبی کیلئے ممکن ہی نہیں "بھائیوں" میں سے ہونے سے کتنی بڑی وضاحت کی کہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ "بنی اسمٰعیل" میں سے ہوگا۔ آپ ﷺ کا حسب و نسب اس کی کھلی نشانی موجود ہے پھر لطف یہ ہے کہ یہ سارے دعوے اہل کتاب کی الہٰی کتابوں میں موجود ہیں اور ان کے سارے شارحین اپنے درمیان سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اختلافات رکھنے کے باوجود اس پیشگوئی پر متفق ہیں اور اس طرح گویا مخالفین کی دعویٰ پر آپ ﷺ بذاتہ دلیل و برہان ہیں اور پھر دلیل و برہان بھی ایسی کہ اس کا انکار مخالفین بھی نہیں کر سکے۔ جنہوں نے تسلیم نہیں کیا وہ بھی اس بات کا رد نہ کر سکے۔ یہ تو مخالفین کی شہادت تھی جو آج بھی حرف بحرف موجود ہے۔

آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مکہ والوں نے آپ ﷺ کی مخالفت کی مدت تک آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا آپ ﷺ کے دعویٰ کی تردید نہ کر سکے۔ آپ ﷺ نے وہ کلام پیش کیا جو آپ ﷺ کے سینہ اقدس پر نازل کیا گیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ اس جیسی صرف ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور پھر سورہ کی نشاندہی کی تو صرف تین آیتوں کی سورۃ جو چند جملوں پر مشتمل ہے اور قرآن کریم کی ساری سورتوں میں سے چھوٹی ہے۔ کوئی مقابلہ پر آیا؟ عیسیٰ علیہ السلام کی امت کہلانے والے میدان میں اترے کتنے طمطراق سے آئے اور باعث نزاع بھی صرف عیسیٰ علیہ السلام کی "الوہیت" تھی لیکن اس طرح ذلیل و خوار ہو کر بھاگے کہ واپس

آنے کی ہمت نہ ہوئی اور جو دعویٰ لے کر آئے تھے اپنی زبانوں میں اس کی تردید کر گئے۔

پھر ان سے زیادہ ڈھیٹ مقابلہ پر اترے جنہوں نے نہ ماننے کی قسم کھائی تھی اور یہ قوم سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ ہم "ہاں" نہیں کریں گے وہ ڈٹ گئے لیکن انہوں نے ہاں بھی فی الواقع نہ کی پیغمبر اسلام ﷺ نے دعوت دی کہ دلیل نہ ماننے والوں کیلئے بھی ہم ایک دلیل رکھتے ہیں آؤ خود بھی اور اپنے بال بچوں کو بھی لے آؤ ہم بھی آتے ہیں اور ایک جگہ اکٹھے ہو کر اللہ سے جس کو ایک لحاظ سے تم بھی مانتے ہو دعا کرتے ہیں کہ "اے اللہ! ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس کے جھوٹ کو واضح فرما" ہاں یہ قسم کھانے والے اس پر "نہیں" کہہ کر بھاگ گئے اور یہ آخری دلیل ان پر بھی کامیاب ہو کر رہی۔ اب بھی رسول اللہ ﷺ کے "برہان" ہونے میں کوئی شک رہا۔ مدت سے سنتے آرہے تھے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ قربان جائیں پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت پر کہ لات بھی نہیں اٹھائی اور سچ کو منوا کر دکھا دیا تو ہاں سچ سچ ہے اس کا مقابلہ کوئی جھوٹ بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ یہ اتنا کھرا سچ ہے کہ جھوٹ کو قریب ہی نہیں جانے دیتا۔ موسیٰ علیہ السلام بھی سچ لے کر میدان میں اترے تھے لیکن کم از کم ان کے مقابلہ کیلئے فرعون اور اس کے ساتھی میدان میں تو اترے لیکن یہاں تو میدان میں کوئی اترنے کیلئے تیار ہی نہ ہوا' کیوں؟ اس لئے کہ وہاں سچ اور جھوٹ کا ٹکھار تھا اور یہاں جھوٹ کو جان ہی سے ہاتھ دھونا تھے۔ اس لئے سچ کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ بھاگ جانے میں پھر بھی امان ہے یہاں سے تو بھاگ کر جا ہی نہیں سکیں گے۔ وہاں تو اژدھا ان کے بنائے ہوئے جادو کو کھا گیا لیکن نبی اعظم و آخر ﷺ کا اژدھا صرف جادو اور جھوٹ ہی کو نہیں نگلے گا بلکہ وہ سارے جادوگروں اور سارے جھوٹوں کو بھی ساتھ ہی نگل جائے گا۔ موسیٰ و ہارون دو نبی تھے اور قرآن نے فرمایا ہے کہ ان کو "برھانان" یعنی دو دلیلیں دی تھیں لیکن یہاں ایک ہی "دلیل" اور ایک ہی "برہان" ایسی ہے جو ساری دنیا پر چھا گئی اور کسی کو مقابلہ میں اترنے کی جرات نہ ہوئی۔

کمال معجزہ ہے نبی اعظم و آخر ﷺ کا جو اللہ نے عطا فرمایا اور رہتی دنیا تک وہ اپنا کام کرتا رہے گا کہ آپ ﷺ کی نبوت کے بعد جو بھی آیا اور جس نے بھی دعویٰ کیا خواہ وہ کتنے ہی بکھیڑے کرتا رہا کہ میں بروزی ہوں۔ ظلی ہوں۔ نبی نہیں ہوں مہدی موعود ہوں لیکن "برہان" الٰہی نے اس طرح نکال پھینکا جس طرح مکھن سے بال نکالا جاتا ہے کہ اس کا اس جگہ کیا کام۔ یہاں تو وہ ذات اقدس جس کی تعلیم نے ہر مشکل کو آسان اور ہر پتھر کو پانی کر دیا اس کے بعد کسی نئے یا پرانے کی قطعاً ضرورت نہیں اور "نور مبین" سے مراد قرآن کریم ہے اور یہ کہہ کر اس کے عملی پہلو کو واضح کر دیا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور اس نور اور روشنی کی بدولت انسان کو غلط بینی' غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچاتا ہے اس لئے کہ ان کے نتائج سے محفوظ رہتا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾ یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ

پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور ان کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سائے میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھا دے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔ ۲۷۷ ۱۷۵

چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا کہ :

"اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔" (المائدہ ۵ : ۱۵، ۱۶) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اے پیغمبر اسلام! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔" (ابراہیم ۱۴ : ۱)

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔" (ابراہیم ۱۴ : ۵) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے پیغمبر اسلام! ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟" (الرعد ۱۳ : ۱۶)

مخصوص رحمت انہی لوگوں کیلئے ہے جو ایمان لائے اور اس پر قائم رہے

۲۷۷ اللہ تعالیٰ کی مخصوص رحمت کیا ہے؟ وہ ہدایت ہے' جس کو ہدایت حاصل ہوگئی وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا مستحق ہوگیا اور پھر جس چیز کا نام ہدایت رکھ دیں وہ ہدایت ہوگی؟ ہرگز نہیں "ہدایت وہی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔" (الانعام ۶ : ۷۱) اور وہ ہے "سب سے منہ موڑ کر تمام جہانوں کے پروردگار کے سامنے سر عبودیت جھکا دینا۔" خیال رہے کہ قرآن کریم ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک

قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور متخالف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں اور سعادت و نجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنا لی گئی ہے وہ برملا کہتا ہے کہ انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہو سکتیں ہدایت کی راہ تو وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے جس کو "الدین" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کا نام اس نے "الاسلام" رکھا ہے اور اس کو "دین خالص" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ قرآن کریم بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا کے جتنے پیغمبر پیدا ہوئے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی کونے میں ہوئے ہوں سب کی راہ ایک ہی راہ تھی اور یہی راہ ہدایت کہلائی۔ اس نے بار بار اعلان کیا کہ:

"بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا جس نے یہی کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔" (النحل ۱۶ : ۳۸) فرمایا "اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔" (الانبیاء ۲۱ : ۲۴)

فرمایا کہ "پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سائے میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھا دے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔" اور وہ وہی راہ ہے جو کسی گروہ بندی کی راہ نہیں۔ یاد رہے کہ ہر جماعت و گروہ نے کھرے کے ساتھ کھوٹا ملایا ہے تب ہی وہ گروہ در گروہ ہوئے ہیں۔ بس کھوٹے اور کھرے کی پہچان کر لو اور کھرا جہاں سے بھی ملے لے لو اور کھوٹا جہاں سے بھی دیکھو بالکل چھوڑ دو اور یہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہی دراصل وہ مخصوص ہدایت خداوندی ہے جو صرف اور صرف اس کو مل سکتی ہے جو کسی گروہ بندی کا ہو کر نہ رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے رسول اعظم و آخر ﷺ کو بھی یہی ہدایت فرمائی کہ "جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں' ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرو۔" (الانعام ۶ : ۱۵۹) بس یہی ہدایت ہے اور یہی وہ راہ ہے جس راہ پر گامزن کرنے کے لئے رسول عربی ﷺ تشریف لائے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"فرمایا میری رحمت کا حال یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس ان لوگوں کیلئے رحمت لکھ دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ان کیلئے جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے۔" (الاعراف ۷ : ۱۵۶) "جو الرسول یعنی نبی اعظم و آخر کی پیری کرتے ہیں کہ وہ نبی امی ہے اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرتا ہے۔ گندی چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے نیچے دبے ہوئے ہیں ان پھندوں سے نکالتا ہے جن میں گرفتار ہیں۔ جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کیلئے روک ہوئے راہ حق میں اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے سو وہی ہیں جو کامیابی پانے

قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ
وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا

اے پیغمبر اسلام! لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں کلالہ کے متعلق تم کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے[۲۷۸] میں حکم دیتا ہے اگر کوئی ایسا مرد مرجائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو جو کچھ مرنے والا چھوڑ مرا ہے اس کا آدھا[۲۷۹] حصہ بہن کو ملے گا اور بہن مرجائے او راس کے

والے ہیں۔"

"اے پیغمبر اسلام! تم لوگوں سے کہو کہ اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اس کیلئے ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ایک ذات وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے۔ پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ وہ اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کرو تاکہ راہ ہدایت تم پر کھل جائے۔" (الاعراف ۷ : ۱۵۶، ۱۵۷)

کلالہ کیا ہے اور اس کا حکم کیا؟

۲۷۸ کلالہ کا ذکر اس سورت النساء کی آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے اور اس کی تعریف بھی وہاں بیان کر دی گئی ہے۔ اُس آیت میں اور اِس آیت میں جو فرق ہوا ہے وہ صرف اخیافی بہن بھائی ہونے کی وجہ سے ہے آیت ۱۲ میں جس بہن بھائی کا ذکر ہے وہ اخیافی تسلیم کئے گئے ہیں اور اس زیر نظر آیت میں بہن بھائی سے مراد علاتی اور حقیقی بہن بھائی ہیں۔ اخیافی وہ جو صرف ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں اور علاتی وہ جو ماں کی طرف سے الگ لیکن باپ کی طرف سے بہن بھائی ہوں اور حقیقی وہ جو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہوں۔ دونوں جگہ پر کلالہ سے مراد وہ میت ہے جس کے والدین میں کوئی بھی زندہ نہ ہو اور اولاد بھی موجود نہ ہو نہ لڑکی اور نہ لڑکا۔ لیکن کلالہ کی تعریف میں اور بھی بہت کچھ بیان ہوا ہے اور اس میں بہت اختلاف بھی پایا جاتا ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

کلالہ کے اگر صرف ایک بہن ہو تو اس کا حکم حصہ میراث میں

۲۷۹ جس مرنے والے کے والدین اور اولاد نہ ہو لیکن اس کی ایک بہن موجود ہو تو مرنے والے کے ذوی الفروض میں اگر کوئی ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سے اس کو آدھا ملے گا اور بقیہ نصف اگر اس کا کوئی عصبہ ہوا جیسے چچا یا چچا زاد بھائی وغیرہ تو وہ اس کو مل جائے گا اگر عصبہ نہ ہو تو یہ نصف بھی اس

وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا
إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ

اولاد نہ ہو تو اس کا وارث وہ بھائی ہی ہوگا۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں، تو انہیں ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر بھائی بہن، کچھ مرد کچھ عورتیں ہوں تو پھر مرد کیلئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہوگا۔

بہن کی طرف لوٹ جائے گا۔ اس جگہ جن ذوی الفروض کا احتمال ہے وہ مرنے والی اگر عورت ہے تو اس کا خاوند ہے اور مرنے والا اگر مرد ہے تو اس کی بیوی ہو سکتی ہے اور ان کے حصص کا تعین میراث میں کیا جا چکا ہے۔ اس پر عمل ہوگا۔

کلالہ اگر عورت ہے اور اس کا صرف ایک بھائی موجود ہو تو اس کا حکم

۲۸۰ مرنے والی ایسی عورت ہے جو کلالہ ہے یعنی اس کی اولاد نہ ہو اور نہ ہی والدین تو اگر اس کا ذوالفرض یعنی خاوند ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سارے مال کا وہ یعنی مرنے والی کا بھائی وارث قرار پائے گا اس لئے کہ ایسی صورت میں مرنے والی کا چچا یا چچا کا بیٹا عصبہ نہیں ہو سکتا اور اگر مرنے والا مرد ہو جو کلالہ بھی ہے یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ ہی والدین ہیں تو اس کے ذوالفروض میں اس کی بیوی ہو سکتی ہے اگر ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی جو کچھ ہوگا وہ بھی اس کا بھائی لے جائے گا اس لئے کہ اس صورت میں بھی اس کا عصبہ چچا یا چچا کا بیٹا نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ موجود ہوں۔

کلالہ کے اگر دو بہنیں ہوں تو ان کا حکم حصہ میراث میں

۲۸۱ جس مرنے والے کے والدین اور اولاد نہ ہوں لیکن اس کی دو بہنیں موجود ہوں تو مرنے والے کے ذوی الفروض میں اگر کوئی ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی ان کو دو تہائی ملے گا اور بقیہ ایک تہائی اگر ان کا کوئی عصبہ موجود ہوا جیسے چچا زاد بھائی وغیرہ تو وہ اس کو مل جائے گا اور اگر عصبہ نہ ہوا تو یہ ۱/۳ حصہ بھی انہیں کی طرف لوٹ آئے گا۔ اس جگہ جن ذوی الفروض کا احتمال ہے وہ مرنے والی اگر عورت ہے تو اس کا خاوند ہے اور مرنے والا اگر مرد ہے تو اس کی بیوی ہو سکتی ہے اور ان کے حصے کا تعین میراث میں کیا جا چکا ہے اس پر عمل ہوگا۔ کلالہ اگر عورت ہے اور اس کے دو بھائی ہوں وہ کلالہ کا اگر خاوند ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سارے مال کے برابر برابر حصہ دار ہیں اور کلالہ اگر مرد ہے اور اس کے دو بھائی ہیں تو اس کی ذوی الفروض اس کی بیوی ہو سکتی ہے اگر ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سارے مال کے وہ

اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اللہ تمہارے لئے اپنے احکام واضح کر دیتا ہے تاکہ گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۷۶

مالک ہیں اور برابر کے شریک ہیں۔

کلالہ کے اگر بہنیں اور بھائی دونوں ہوں تو اس کی میراث کا حکم

۲۸۲ مرنے والا کلالہ ہو خواہ وہ مرد ہے یا عورت اور اس کی بہنیں اور بھائی دونوں اصناف موجود ہوں تو حق یعنی بھائی کا حصہ دو عورتوں یعنی بہنوں کے برابر ہوگا اس طرح بھی مرنے والے کے اگر ذوی الفروض میں سے کوئی ہے تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سارا مال اس اصول کے مطابق ان میں تقسیم ہو جائے گا اور ذوی الفروض کے احتمال کا جو ذکر اوپر کیا جا چکا ہے وہی اس جگہ بھی موجود ہے۔ اس طرح اس سورہ مبارکہ کا مضمون جس مسئلہ سے شروع ہوا تھا اس پر اس کا اختتام ہوگیا اور اس آخری آیت میں میراث کے بہت سے مسائل کا حل پوشیدہ کر دیا گیا۔ مسئلہ میراث کے معاملہ میں یہ آیت ایک بہت بڑا دفینہ ہے جس پر اس قدر مسائل بند ہیں کہ ہر مشکل مسئلہ کے وقت اس پر غور کرنے سے اس مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے۔ پھر وہ روایات جو صحیح بخاری، مسلم اور دوسری کتب احادیث میں اس آیت کے متعلق بیان ہوئی ہیں ان کو ساتھ ملایا جائے تو کوئی مشکل نہیں رہتی اس سے صحابہ کرامؓ تابعین عظامؒ اور تبع تابعین رحمہم اللہ نے بہت کچھ اخذ کیا ہے اور بہت کچھ ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

"فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنے احکام واضح کر دیئے ہیں تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔" یعنی احکام میراث کو اتنی وضاحت اور تفصیل سے بیان کرنے کی غرض بتا دی کہ تم اپنی خود ساختہ مصلحتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہیں گمراہ نہ ہو جاؤ۔ لیکن اگر کوئی گمراہی سے بچنا ہی نہ چاہے تو اس کا کوئی حل ہے تو وہ اللہ ہی کے پاس ہے یقیناً وہ اس کے مقررہ وقت پر اس کے سامنے آجائے گا لیکن اس وقت سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی اس صفت "علم" سے میں اقرار کرتا ہوں کہ اصل علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو میں نے پڑھا اور سمجھا ہے اس کو پوری دیانت و امانت کے ساتھ بغیر خوف و خطر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس پر عروۃ الوثقیٰ کی دوسری جلد کا اختتام ہو رہا ہے۔

تمت سورۃ النساء ولله الحمد اوله اخره

عبدالکریم اثری

۲۸ / اپریل ۱۹۹۵ء



